تفسیر

سورۃ النساء

تحقیق وترتیب

بندۂ خاکسار

محمد طاہر ہاشمی

تفسیر النساء

انتساب

اُن مخدومہ ٔ کائنات کے نام

جن کی آغوش میں وہ ہستی ٔعظیم پروان

چڑھی جس نے کائنات میں

قدرِ نساء آشکار کی

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ایسا مرقع تیار ہوا جس میں تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بیان ہوا۔ میری کوشش تو بس یہی رہی کہ موجودہ کتب تفاسیر سے رس اس طرح لیا جائے کہ مفہوم و معانی نہایت شفاف طریقے سے مجتمع ہو سکیں۔

اللہ کریم اس کوشش کو بار آور فرمائے۔ اور نورِ قرآن کو عام فرما دے۔

ہمارے نوجوانوں کو اس سے بہرہ مند کرے۔ اور سب کے لئے اسے توشۂ آخرت بنا دے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ

ناشر:	یکے از خانوادہ بنی ہاشم
تعداد	برقی
ہدیہ	دعائے برائے امت محمدیہ
الطبع	2023 جولائی

فہرست

سورۃ النساء

تعارف سورۃ النساء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اس سورۃ پاک کا نام النساہے۔ باتفاق علما مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔اس کی آیتوں کی تعداد 176 ہے۔الفاظ تین ہزار پینتیس اور حروف 16030 ہیں۔اور 34 رکوع ہیں۔اور مقامِ نزول: مدینہ منورہ۔(خازن،النساء،۱/۳۴۰)

یہ سورۃ پاک بڑی اہم اور دوررس اصلاحت پر مشتمل ہے۔ جنہیں اگر دین اسلام کا طرہ امتیاز کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔
گھریلو زندگی۔اس سورۃ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے پر دی گئی ہے کیونکہ گھر ہی قوم کی خشت اول ہے۔ گھر ہی وہ گہوارہ ہے جہاں قوم کے مستقبل کے معمار پرورش پاتے ہیں۔ گھر ہی وہ مدرسہ ہے۔ جہاں اخلاق و کردار کی جو قدریں اچھی یا بری، بلند یا پست لوح قلب پر لکھ دی جاتی ہیں ان کے نقوش کبھی مدھم نہیں پڑتے۔ صرف جذبات کتنے پاکیزہ اور معصوم کیوں نہ ہوں حقائق کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں لاسکتے۔قرآن حقائق کو حقائق کی حیثیت سے دیکھتاہے۔اس لیے گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے مبہم نصیحتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے واضح اور غیر مبہم قاعدے اور ضابطے متعین فرمادیئے۔
ا۔ یتیم بچے۔ جس گھر میں یتیم بچوں پر زیادتیاں کی جائیں اور ان کے سرپرست ان کی دولت کو خرد برد کرنے کے لیے سازش وفریب کے جال بنتے رہیں اس گھر کی فضا کبھی صحت مند نہیں ہوسکتی اور اس خاندان کے افراد کبھی سچی مسرت کی لذتوں سے آشنا نہیں ہو سکتے۔اس لیے قرآن حکیم نے اپنے ماننے والوں کو صاف الفاظ میں حکم فرمایا کہ وہ یتیم بچوں اور بچیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ان کے حقوق کی نگہبانی اور ان کے اموال کی حفاظت کریں بلکہ ان کے احساسات تک پاس رکھیں۔اور جو بھی ان بیکسوں کے ورثہ میں جائز تصرف کرے گا وہ خوب جان لے کہ وہ آتش جہنم سے اپنے پیٹ کو بھر رہاہے۔
ب۔ عورت کا مقام۔ عرصہ ہائے دراز سے یہ صنف نازک ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ قدرت نے اگرچہ اسے مرد کی طرح ذی روح اور ذی شعور بنایا تھا لیکن اس کے ساتھ برتاؤ مٹی کی بے جان مورتیوں کا سا کیا جاتا تھا۔جوامیں داؤ پر اسے لگایا جاسکتا تھا۔خاوند کی لاش کے ساتھ قانوناً اسے جل کر راکھ ہو ناپڑتا تھا۔ کہیں اسے تمام برائیوں کی جڑ اور انسان کی ساری بدبختیوں کا سرچشمہ یقین کیا جاتا تھا اور کہیں چوٹی کے نامور فلسفی اس کے انسان ہونے کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔اس کو ملکیت کے حقوق حاصل نہ تھے۔اسے ازدواجی بندھنوں میں مقید کرنے سے پہلے اس سے کوئی رائے لینے کا تصور تک نہ تھا۔ یہ بلکہ اسے بھی بدتر حالات تھے جن میں اسلام سے پہلے یہ صنف نازک

گرفتار تھی۔ جہاں کنبہ کے نصف افراد کی بے بسی کا یہ عالم ہو وہاں خوشی اور مسرت کا گزر کہاں ؟قرآن نے پہلی مرتبہ اعلان کیا کہ جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہیں اسی طرح عورت کے حقوق بھی مرد پر ہیں۔اس کی رائے ہے اور قانون اس کی رائے کا احترام کرتا ہے۔اس کو اپنے والدین، اپنے خاوند، اپنی اولاد کا وارث تسلیم کیا گیا۔اس کو ملکیت کے حقوق تفویض کئے گئے۔
کیونکہ مرد اور عورت کا اولین رشتہ ازدواج کا رشتہ ہے اس لیے اس میں جو بے راہ رویاں پائی جاتی تھیں ان کی اصلاح کی۔ تعدد ازواج پر پابندیاں لگائیں۔اور اس کی اجازت دی تو بڑی شروط وقیود کے ساتھ۔ مرد کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور اگر اس کی کوئی چیز پسند خاطر نہ ہو تو اس پر صبر کرنے کی ہدایت کی۔اگر باہمی تعلقات کشیدہ ہو جائیں تو اصلاح حال کی تدبیر بتائی۔ لیکن عورت کو یہ تمام حقوق دینے کے بعد گھر کی سرداری اور نظم ونسق کی ذمہ داری مرد کو سونپی۔ کیونکہ اسی کی فطری صلاحیتیں اس بار گراں کو اٹھا سکتی ہیں اور یہی حقائق کی نگہداری اور ہر بات میں میانہ روی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ کیونکہ اس میں تفریط کا گزر نہیں تو افراط کا بھی نشان نہیں۔

ج۔ تیسری چیز جو گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ مالی حقوق کی منصفانہ تقسیم ہے۔اس میں معمولی سی کوتاہی بھائی کو بھائی سے جدا کر دیتی ہے۔اس لیے تقسیم میراث کا مفصل قانون نازل فرمایا۔اسلام کے نظام میراث کی جو امتیازی خصوصیات ہیں ان کا جائزہ تو اپنے اپنے مقام پر لیا جائے گا لیکن ایک بے مثل تبدیلی یہ کی کہ عورت (ماں۔بیٹی اور بیوی) کو بھی مرد کی طرح وارث قرار دیا۔
2 ۔حق و باطل کی جنگ جس کا آغاز بدر سے ہوا تھا ابھی جاری تھی۔احد میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کے شہید ہونے کے باعث منافق، یہودی اور مشرک قبائل کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔اس سورۃ میں بھی مسلمانوں کو حق کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگانے کا حکم دیا گیا اور ان کے حوصلوں کو بلند کیا گیا اور منافقوں کے مختلف گروہوں کے ساتھ ہر ایک کے مناسب حال رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔
3 ۔انفرادی کردار کی تعمیر کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی ہے اور ان قوموں کی اقتدا سے روکا گیا ہے جو عمل سے جی چراتی ہیں حق کے لیے کسی جانی اور مالی قربانی کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں اور اس کے باوجود اپنے آپ کو انعامات خداوندی کا واحد حقدار سمجھتی ہیں۔امت مصطفویہ کو صاف صاف بتادیا گیا کہ اس رزم گاہ حیات میں جیت اسی کی ہو گی جو اپنے پیہم اور نتیجہ خیز عمل سے اپنی فوقیت اور برتری ثابت کر دے۔ خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کے باہمی برتاؤ کا دارومدار احسان اور مہربانی پر ہونا چاہیے۔ جتنی قرابت زیادہ ہو گی اتنی ہی اس کے ساتھ مہربانی اور احسان زیادہ ہونا چاہیے۔
4 ۔اطاعت رسول : اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور فلاوربک (اے محبوب تیرے رب کی قسم) کے پر جلال الفاظ سے قسم اٹھا کر بتایا کہ کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ میرے رسول کے ہر فیصلہ کو خواہ وہ اس کے خلاف بھی ہو دل و جان سے بخوشی قبول نہ کرے۔
5 ۔زمانہ نزول : علماء محققین کی رائے میں اس سورۃ کے نزول کا آغاز جنگ احد (شوال 3ھ) کے بعد ہوا جب کہ ستر مسلمانوں کی شہادت کے بعد یتیموں کی کفالت اور ورثہ کی تقسیم کے مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ نماز خوف غزوہ ذات الرقاع میں پڑھی گئی اور یہ غزوہ 4ھ میں ہوا۔اور تیمّم کی اجازت غزوہ بنی مصطلق میں دی گئی اور یہ غزوہ 5ھ میں پیش آیا۔ان واقعات اور سنین سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس سورۃ کا آغاز احد کے بعد ہوا تو اس کا سلسلہ نزول 5ھ کے اوائل تک جاری رہا۔ (ضیاء القرآن)

سورۃ نساء کے فضائل

(1)۔۔ سورۃ نساء کی ایک آیت مبارکہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے ارشاد فرمایا "مجھے قرآن مجید پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالانکہ یہ تو آپ پر نازل فرمایا گیا ہے! ارشاد فرمایا "ہاں (تم پڑھ کر سناؤ)۔ چنانچہ میں نے سورۃ نساء پڑھی حتّٰی کہ جب میں اس آیت پر پہنچا فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا (ۚ ۴۱) (نساء: ۴۱) تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "بس کرو، اب تمہارے لیے یہی کافی ہے۔ میں حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

(بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب قول المقرىء للقارئ: حسبک، ۴۱۶/۳، الحدیث: ۵۰۵۰)

(2)۔۔ حضرت عمر فاروق (رض) فرماتے ہیں "سورۃ بقرہ، سورۃ نسائ، سورۃ مائدہ، سورۃ حج اور سورۃ نور سیکھو کیونکہ ان سورتوں میں فرض علوم بیان کئے گئے ہیں۔ (مستدرک، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ النور، ۱۵۸/۳، الحدیث: ۳۵۴۵)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "جس نے سورۃ نساء پڑھی تو وہ جان لے گا کہ وراثت میں کون کس سے محروم ہوتا ہے اور کون کس سے محروم نہیں ہوتا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفرائض، ما قالوا فی تعلیم الفرائض، ۳۲۴/۷، الحدیث: ۵)

(4)۔۔ حضرت عمر فاروق (رض) فرماتے ہیں "جس نے سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء پڑھی تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حکمت والے لوگوں میں سے لکھا جائے گا۔

(شعب الایمان، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی فضائل السور والآیات، ۴۶۸/۲، الحدیث: ۲۴۲۴)

سورۃ النساء کی سورۃ آل عمران کے ساتھ مناسبت اور ارتباط

(۱) سورۃ آل عمران تقویٰ اختیار کرنے کے حکم پر ختم ہوتی ہے۔ (آیت) واتقوا اللہ لعلکم تفلحون"۔ (آل عمران: ۲۰۰)
اور سورۃ النساء تقویٰ اختیار کرنے کے حکم سے شروع ہوتی ہے۔ (آیت) "واتقوا اللہ الذی تساء لون بہ والارحام" (النساء: ۱)

(۲) ان دونوں سورتوں میں یہود اور نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے،

(۳) ان دونوں سورتوں میں منافقین کے متعلق بھی قتال کے ضمن میں آیتیں ہیں۔

(۴) ان دونوں سورتوں میں قتال کے متعلق بھی آیتیں ہیں۔

(۵) آل عمران میں غزوہ احد کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں اور اس سورت میں بھی (آیت) "فما لکم فی المنافقین فئتین" میں غزوہ احد کا ذکر ہے۔

(٦) سورۃ آل عمران میں غزوہ حمراء الاسد کا ذکر ہے اور اس سورت میں بھی (آیت) "ولا تھنوا فی ابتغاء القوم" میں اس کا ذکر ہے۔

(۷) انسان کو چار چیزوں سے بنیادی فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں علم ،شجاعت ،عدل اور عفت ،سورۃ آل عمران میں علم اور شجاعت کو اہمیت سے بیان کیا ہے۔ علم کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔ (آیت) "نزل علیک الکتاب بالحق۔ (ال عمران : ۳)
(آیت) "ومایعلم تاویلہ الااللہ والراسخون فی العلم یقولون " (ال عمران : ۷) اور شجاعت کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔ (آیت) "ولا تھنواولا تحزنواوانتم الاعلون ان کنتم مومنین (ال عمران : ۱۳۱) (آیت) "فماوھنوالمااصابھم فی سبیل اللہ (ال عمران : ۱۴۶) علم اور شجاعت کا ذکر سورۃ آل عمران کی بہت سی آیتوں میں کیا گیا ہے اور سورۃ النساء میں عدل اور عفت کے متعلق بہت آیات میں جیسا کہ عنقریب اس کے مطالعہ سے انشاء اللہ واضح ہو جائے گا۔
(۸) سورۃ آل عمران میں جنگ بدر اور جنگ احد کے واقعات کے ضمن میں مخالفین کے ساتھ سلوک کا ذکر تھا سورۃ النساء میں اپنوں کے ساتھ سلوک کا ذکر ہے مثلاً یتیموں رشتہ داروں اور بیویوں کے ساتھ۔
یوسف بن ماھک بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ (رض) کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ آپ کے پاس ایک عراقی آیا اور اس نے پوچھا کونسا کفن بہتر ہوتا ہے ؟ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا خیر تو ہے ،تمہیں کیا تکلیف ہے ؟ اس نے کہا اے ام المومنین مجھے اپنا مصحف دکھایئے ؟ آپ نے فرمایا کیوں ؟ اس نے کہا شاید میں اس کے مطابق قرآن کو جمع کروں کیونکہ اب قرآن مجید کو غیر منظّم طور سے پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا اس سے پہلے جو تم نے پڑھا اس سے تمہیں کیا نقصان ہوا۔ ؟ آپ نے فرمایا پہلے مفصل کی سورتیں نازل ہوئی تھیں اگر ابتداء میں یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب کو نہیں چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی بھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن مجید نازل ہوا اس وقت میں کھیلنے والی بچی تھی۔
(آیت) "بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر "۔ (القمر : ۴۶)
ترجمہ : بلکہ ان سے اصل وعدہ قیامت کا ہے اور قیامت بڑی آفت اور بہت کڑوی ہے۔
حضرت عائشہ (رض) نے اس کے لیے مصحف نکالا اور اس کی سورت کی آیتیں لکھوائیں۔ (صحیح البخاری ،رقم الحدیث : ۴۹۹۳)

الطوال، مئین، مثانی اور مفصل سے مراد

قرآن مجید کی پہلی سات بڑی سورتوں کو السبع الطوال کہتے ہیں وہ یہ ہیں : القرہ ،آل عمران ،النساء ،المائدہ ،الانعام ،الاعراف ،الانفال ،اور جن سورتوں میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہوں ان کو مئین کہتے ہیں اور جن سورتوں میں ایک سو سے آیتیں ہوں ان کو مثانی کہتے ہیں اور مثانی کے بعد مفصل ہیں۔ سورۃ حجرات سے سورۃ بروج تک کی سورتوں کو طوال مفصل کہتے ہیں۔ سورۃ بروج سے سورۃ لم یکن تک اوسط مفصل ہیں اور لم یکن سے لے کر آخر قرآن تک قصار مفصل ہیں۔

سورۃ نساء کے مضامین

اس سورت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس میں یتیم بچوں اور عورتوں کے حقوق اور ان سے متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں جیسے یتیم بچوں کے مال کو اپنے مال میں ملا کر کھا جانے کو بڑا گناہ قرار دیا گیا۔ ناسمجھ یتیم بچوں کا مال ان کے حوالے کرنے سے منع کیا گیا اور جب وہ شادی کے قابل

اور سمجھدار ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دینے کا حکم دیا گیا۔ یتیموں کے مال ناحق کھا جانے پر وعید بیان کی گئی۔ اسی طرح عورتوں کا مہر انھیں دینے کا حکم دیا گیا اور مہر سے متعلق چند اور مسائل بیان کئے گئے۔ میراث کے مال میں عورتوں کے باقاعدہ حصے مقرر کئے گئے۔ ان عورتوں کا ذکر کیا گیا جن سے نسب، رضاعت اور مصاہرت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے اور جن عورتوں سے کسی سبب کی وجہ سے عارضی طور پر نکاح حرام ہے۔ ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے احکام بیان کئے گئے اور نافرمان عورت کی اصلاح کا طریقہ ذکر کیا گیا۔ اس کے علاوہ سورۃ نساء میں یہ مضامین بیان ہوئے ہیں۔

(1)۔۔ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی اور دور کے پڑوسیوں، مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے کا حکم دیا گیا۔

تو کیسا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اے حبیب! تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہبان بنا کر لائیں گے۔

(2)۔۔ میراث کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے۔

(3)۔۔ کن لوگوں کی توبہ مقبول ہے اور کن کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

(4)۔۔ شوہر، بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق اور ازدواجی زندگی کے رہنما اصول بیان کئے ہیں۔

(5)۔۔ مال اور خون میں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے احکام بیان کئے گئے۔

(6)۔۔ کبیرہ گناہوں سے بچنے کی فضیلت بیان کی گئی، حسد سے بچنے کا حکم دیا گیا نیز تکبر، بخل اور ریاکاری کی مذمت بھی بیان کی گئی۔

(7)۔۔ جہاد کے بارے میں احکامات بیان کئے گئے۔

(8)۔۔ قاتل کے بارے میں احکام، ہجرت کے بارے میں احکام اور نماز خوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

(9)۔۔ نیک اعمال کرنے اور گناہوں سے توبہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے

(10)۔۔ اخلاقی اور ملکی معاملات کے اصول اور جنگ کے بعض احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(11)۔۔ منافقوں، عیسائیوں اور بطور خاص یہودیوں کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔

(12)۔۔ اس سورت کے آخر میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں عیسائیوں کی گمراہیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت مبارکہ:

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾

لغۃ القرآن:

[يَآيُّهَا النَّاسُ : اے لوگو] [اتَّقُوْا : تم تقویٰ اختیار کرو] [رَبَّكُمُ : اپنے رب کا] [الَّذِيْ : جس نے] [خَلَقَكُمْ : پیدا کیا] [تم کو] [مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ : ایک ہی جان سے] [وَّخَلَقَ : اور (اس نے) پیدا کیا] [مِنْهَا : اس سے] [زَوْجَهَا : اس کا جوڑا] [وَبَثَّ : اور (اس نے) پھیلائے] [مِنْهُمَا : ان دونوں سے] [رِجَالاً كَثِيْرًا : بہت سے مرد] [وَّنِسَآءً : اور عورتیں] [وَاتَّقُوا : اور تم بچو] [اللّٰهَ الَّذِيْ : اس اللہ (کی ناراضگی) سے] [تَسَآءَلُوْنَ : تم لوگ باہم مانگتے ہو] [بِهٖ : جس (کے حوالے) سے] [وَالْاَرْحَامَ : اور رشتہ داروں (کی حق تلفی) سے] [اِنَّ : یقینا] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [رَقِيْبًا : نگران]

ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش (کی ابتداء) ایک جان سے کی پھر اسی سے اس کا جوڑ پیدا فرمایا پھر ان دونوں میں سے بکثرت مردوں اور عورتوں (کی تخلیق) کو پھیلا دیا، اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتوں (میں بھی تقویٰ اختیار کرو)، بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔ (عرفان القرآن)

تشریح: سورۃ النساء کا آغاز "اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ" سے ہوتا ہے۔ اسم رب میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اظہار ہوتا ہے جس میں شفقت ' الفت اور قربت کا تصور پایا جاتا ہے۔

اس سورۃ میں انسانی معاشرے کے ابتدائی یونٹ کو مضبوط بنانے کے لیے اس کے بنیادی حقوق وفرائض کا بیان ہوا ہے۔ سورۃ النساء کے ابتدائی الفاظ اور کلمات میں توحید اور وحدت انسانی کا سبق دیا گیا ہے کہ جس طرح تم سب ایک ہی خالق کی مخلوق اور اسی کی ربوبیت کے مرہون منت ہو۔ اسی طرح تم ایک ہی خاندان کے افراد اور ارکان ہو جس کی ابتدا دو کی بجائے ایک سے ہوئی۔ پھر اس ایک سے دوسرے کو یعنی آدم (علیہ

السلام) سے اس کی بیوی حوا کو پیدا کیا گیا پھر بیشمار مرد اور عورتیں پیدا کرنے کا سلسلہ جاری فرمایا جو قیامت تک جاری رہے گا۔ اس رب سے ڈرو جو تمہارا اللہ ہے جس کی عظمت و تقدیس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال اور ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ساتھ رشتے داریوں کو توڑنے سے بھی ڈرو اور اجتناب کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگران کی حیثیت سے قائم دائم ہے۔

لفظ ارحام کا واحد رحم ہے۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رحم کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا۔

(إِنَّ الرَّحِمَ شَجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهٗ)

[رواہ البخاری: کتاب الأدب، باب من وصل وصلہ اللّٰہ]

"رحم رحمٰن سے نکلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحم سے فرمایا جو تجھے ملائے گا میں اسے ملاؤں گا۔ جس نے تجھے کاٹ دیا میں اسے کاٹ دوں گا۔"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ بھی فرمان ہے:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ) [رواہ البخاری: کتاب الأدب، باب إثم القاطع]

"رشتے داریوں کو توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"

صلہ رحمی کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرمایا کرتے تھے۔

(لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا) [رواہ البخاری: کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافی]

"ادلے کا بدلہ صلہ رحمی نہیں بلکہ صلہ رحمی یہ ہے کہ دوسرا آدمی صلہ رحمی نہ بھی کرے تجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے۔" (فہم)

معاشرہ زندگی کی مسرتوں سے تب لطف اندوز ہو سکتا ہے جب ہر خاندان کے افراد میں باہمی محبت و پیار ہو۔ اس کے لیے صلہ رحمی، رواداری اور حسن سلوک کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ اسی کے متعلق اس سورۃ میں واضح احکام اور روشن ہدایت دی گئیں۔ لیکن ان احکام و ہدایات کے ذکر سے پہلے دو باتوں کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ ایک تو یہ کہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ دوسرا یہ کہ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ جب سب ایک خدا کی مخلوق ہیں تو سب کو اس کے ہر حکم کی تعمیل اور اس کی نافرمانی سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور جب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں تو انھیں آپس میں محبت پیار کرنا چاہیے۔ نیز اس ارشاد سے انسانی مساوات کا درس دیا اور انسانی برادری میں طرح طرح کے امتیازات پر ضرب کاری لگائی جن کے باعث انسان اعلیٰ اور ادنیٰ میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ (ضیاء)

ابو البشر حضرت آدم سے جن کو بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا تھا انسان کی ابتدائے پیدائش کا بیان کر کے قدرت الٰہیہ کی عظمت کا بیان فرمایا گیا اگرچہ دنیا کے بے دین بد عقلی و نافہمی سے اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں لیکن اصحاب فہم و خرد جانتے ہیں کہ یہ مضمون ایسی زبردست برہان سے ثابت ہے جس کا انکار محال ہے مردم شماری کا حساب پتہ دیتا ہے کہ آج سے سو برس قبل دنیا میں انسانوں کی تعداد آج سے بہت کم تھی اور اس سے سو برس پہلے اور بھی کم تو اس طرح جانب ماضی میں چلتے چلتے اس کمی کی حد ایک ذات قرار پائے گی یا یوں کہئے کہ قبائل کی کثیر تعداد ہیں ایک شخص کی طرف منتہی ہو جاتی ہیں مثلاً سید دنیا میں کروڑوں پائے جائیں گے مگر جانب ماضی میں ان کی نہایت سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک ذات پر ہو گی اور بنی اسرائیل کتنے بھی کثیر ہوں مگر اس تمام کثرت کا مرجع حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی ایک ذات ہو گی اسی طرح اور اوپر کو چلنا شروع کریں تو انسان کے تمام شعوب و قبائل کی انتہا ایک ذات پر ہو گی اس کا نام کتب الٰہیہ میں آدم (علیہ السلام) ہے اور ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک شخص توالد و تناسُل کے معمولی طریقہ سے پیدا ہو سکے اگر اس کے لیے باپ فرض بھی کیا جائے تو ماں کہاں

سے آئے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی پیدائش بغیر ماں باپ کے ہو اور جب بغیر ماں باپ کے پیدا ہوا تو بالیقین انھیں عناصر سے پیدا ہوگا جو اس کے وجود میں پائے جاتے ہیں پھر عناصر میں سے جو عنصر اس کا مسکن ہو اور جس کے سوا دوسرے میں وہ نہ رہ سکے لازم ہے کہ وہی اس کے وجود میں غالب ہو اس لیے پیدائش کی نسبت اسی عنصر کی طرف کی جائے گی یہ بھی ظاہر ہے کہ توالد و تناسل کا معمولی طریقہ ایک شخص سے جاری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے ساتھ ایک اور بھی ہو کہ جوڑا ہو جائے اور وہ دوسرا شخص انسانی جو اس کے بعد پیدا ہو مقتضائے حکمت یہی ہے کہ اسی کے جسم سے پیدا کیا جائے کیونکہ ایک شخص کے پیدا ہونے سے نوع موجود ہو چکی مگر یہ بھی لازم ہے کہ اس کی خلقت پہلے انسان سے توالد معمولی کے سوا کسی اور طریقہ سے ہو کیونکہ توالد معمولی بغیر دو کے ممکن ہی نہیں اور یہاں ایک ہی ہے لہٰذا حکمت الٰہیہ نے حضرت آدم کی ایک بائیں پسلی ان کے خواب کے وقت نکالی اور ان سے ان کی بی بی حضرت حوّا کو پیدا کیا چونکہ حضرت حوّا بطریق توالد معمولی پیدا نہیں ہوئیں اس لیے وہ اولاد نہیں ہو سکتیں جس طرح کہ اس طریقہ کے خلاف جسم انسانی سے بہت سے کیڑے پیدا ہوا کرتے ہیں وہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتے ہیں خواب سے بیدار ہو کر حضرت آدم نے اپنے پاس حضرت حوّا کو دیکھا تو محبت جنسیّت دل میں موجزن ہوئی ان سے فرمایا تم کون ہو انہوں نے عرض کیا عورت فرمایا کس لیے پیدا کی گئی ہو۔ عرض کیا آپ کی تسکین خاطر کے لیے تو آپ ان سے مانوس ہوئے۔ (خزائن)

خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے بیویوں ' بچوں ' یتیموں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنے ' ان پر شفقت کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی حفاظت اور وراثت کا حکم دیا ہے۔ طہارت حاصل کرنے ' نماز پڑھنے اور مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اور ان تمام احکام پر عمل صرف خوف خدا سے ہو سکتا ہے اس لیے اس سورت کے اول ہی میں فرمادیا : اے لوگو اپنے رب سے ڈرو ' اس کے بعد فرمایا جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا ' اس سورت کے اول ہی میں فرمادیا : اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو ' اس کے بعد فرمایا جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا ' اس میں یہ تنبیہ ہے کہ تم کو عدم سے وجود میں لانے والا ' اور تمہارا خالق اور مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تم اس کے مملوک ہو اور مملوک پر حق ہے کہ وہ اپنے مالک کی اطاعت کرے اس وجہ سے تم بھی اللہ کے احکام کی اطاعت کرو ' نیز تمام احکام کا دارو مدار دو چیزوں پر ہے خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت سو پہلے اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا پھر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان سے قطع تعلق کرنے سے منع فرمایا۔

اسلام میں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں ہے۔

اس آیت میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنے اور قطع تعلق کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی یہ علت بیان فرمائی کہ تم سب لوگ ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کئے گئے ہو کیونکہ انسان سرخ ' سفید اور سیاہ رنگ میں مختلف ہیں۔ قد اور قامت میں مختلف ہیں۔ خوب صورت اور بدصورت ہونے اور نسل اور نسب میں مختلف ہیں اس کے باوجود سب انسانوں کی بنیادی شکل و صورت اور وضع قطع ایک ہے اور یہ اس کی

دلیل ہے کہ سب ایک ہی شخص سے پیدا کیے گئے ہیں اور سب اس کی اولاد ہیں اس لیے رنگ اور نسل میں اختلاف کے باوجود ان سب کو ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے :

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارا رب واحد ہے اور باپ واحد ہے اور کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر تقوی کے سوا کسی اور وجہ سے فضیلت حاصل نہیں ہے۔ (المعجم الاوسط ' رقم الحدیث : ۴۷۴۶ ج ۵ ص ۲۸۹)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارا رب واحد ہے اور باپ واحد ہے اور تمہارا دین واحد ہے اور تمہارا باپ آدم ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔ (کشف الاستار عن زوائد البزار ' رقم الحدیث : ۲۰۴۴ ' ج ۲ ص ۴۳۵)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ امام بزار کی سند صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۸۴)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ان کے دو غلام تھے ایک حبشی تھا اور دوسرا نبطی۔ وہ آپس میں لڑ پڑے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے ایک نے کہا اے حبشی دوسرے نے کہا اے نبطی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایسا نہ کہو تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب میں سے ہو۔ (مسند ابو یعلی رقم الحدیث : ۴۱۳۱ ' ج ۴ ص ۱۶۴ ' المعجم الصغیر رقم الحدیث : ۵۷۳ ' ج ا ص ۳۴۵ ' ۳۴۴)

بعض لوگ کہتے ہیں کی سادات کا نکاح غیر سادات میں جائز نہیں ہے ' ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

رشتہ داروں سے تعلق توڑنے پر وعید اور تعلق جوڑنے پر بشارت :

حضرت جبیر بن مطعم (رض) روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (صحیح البخاری۔ رقم الحدیث ۵۹۸۴ صحیح مسلم رقم الحدیث : ۲۵۵۶ ' جامع ترمذی رقم الحدیث : ۱۹۰۹)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا رحم ' رحمٰن کے آثار میں سے ایک اثر ہے اللہ تعالیٰ نے (رحم سے) فرمایا جو تجھ سے وصل کرے گا میں اس سے واصل کروں گا اور جو تجھ کو قطع کرے گا میں کو قطع کروں گا۔ (صحیح البخاری۔ رقم الحدیث ۵۹۸۸ صحیح مسلم رقم الحدیث : ۲۵۵۴ ' جامع ترمذی رقم الحدیث : ۱۹۰۷)

جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر بڑھائی جائے اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس سے بری موت کو دور کیا جائے وہ اللہ سے ڈرے اور صلہ رحم کرے (رشتہ داروں سے تعلق جوڑے) (کشف الاستار عن زوائد البزار ' رقم الحدیث ۱۸۷۹، ج ۲ ص ۳۷۴ ' المعجم الاوسط ' رقم الحدیث ۵۶۲۲ ج ۶ ص ۲۹۱) (تبیان)

انسانوں کی ابتداء کس سے ہوئی؟

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انسانوں کی ابتداء حضرت آدم (علیہ السلام) سے ہوئی اور اسی لیے آپ (علیہ السلام) کو ابوالبشر یعنی انسانوں کا باپ کہا جاتا ہے۔ اور حضرت آدم (علیہ السلام) سے انسانیت کی ابتداء ہونا بڑی قوی دلیل سے ثابت ہے مثلاً دنیا کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے دنیا میں انسانوں کی تعداد آج سے بہت کم تھی اور اس سے سو برس پہلے اور بھی کم تو اس طرح ماضی کی طرف چلتے چلتے اس کمی کی انتہاء ایک ذات قرار پائے گی اور وہ ذات حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں یا یوں کہیئے کہ قبیلوں کی کثیر تعداد ایک شخص پر جاکر ختم ہو جاتی

ہیں مثلاً سیّد دنیا میں کروڑوں پائے جائیں گے مگر ان کی انتہا رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک ذات پر ہو گی، یونہی بنی اسرائیل کتنے بھی کثیر ہوں مگر اس تمام کثرت کا اختتام حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی ایک ذات پر ہو گا۔ اب اسی طرح اور اوپر کو چلنا شروع کریں تو انسان کے تمام کنبوں، قبیلوں کی انتہا ایک ذات پر ہو گی جس کا نام تمام آسمانی کتابوں میں آدم (علیہ السلام) ہے اور یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک شخص پیدائش کے موجود طریقے سے پیدا ہوا ہو یعنی ماں باپ سے پیدا ہوا ہو کیونکہ اگر اس کے لیے باپ فرض بھی کیا جائے تو ماں کہاں سے آئے اور پھر جسے باپ مانا وہ خود کہاں سے آیا؟ لٰہذا ضروری ہے کہ اس کی پیدائش بغیر ماں باپ کے ہو اور جب بغیر ماں باپ کے پیدا ہوا تو بالیقین وہ اس طریقے سے ہٹ کر پیدا ہوا اور وہ طریقہ قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مٹی سے پیدا کیا جو انسان کی رہائش یعنی دنیا کا بنیادی جز ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ایک انسان یوں وجود میں آ گیا تو دوسرا ایسا وجود چاہیے جس سے نسل انسانی چل سکے تو دوسرے کو بھی پیدا کیا گیا لیکن دوسرے کو پہلے کی طرح مٹی سے بغیر ماں باپ کے پیدا کرنے کی بجائے جو ایک شخص انسانی موجود تھا اسی کے وجود سے پیدا فرما دیا کیونکہ ایک شخص کے پیدا ہونے سے نوع موجود ہو چکی تھی چنانچہ دوسرا وجود پہلے وجود سے کچھ کم تر اور عام انسانی وجود سے بلند تر طریقے سے پیدا کیا گیا یعنی حضرت آدم (علیہ السلام) کی ایک بائیں پسلی ان کے آرام کے دوران نکالی اور ان سے ان کی بیوی حضرت حوا (رض) کو پیدا کیا گیا۔ چونکہ حضرت حوا (علیہ السلام) مرد وعورت والے باہمی ملاپ سے پیدا نہیں ہوئیں اس لیے وہ اولاد نہیں ہو سکتیں۔ خواب سے بیدار ہو کر حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنے پاس حضرت حوا (علیہ السلام) کو دیکھا تو ہم جنس کی محبت دل میں پیدا ہوئی۔ مخاطب کر کے حضرت حوا (علیہ السلام) سے فرمایا تم کون ہو؟ انھوں نے عرض کیا: عورت۔ فرمایا: کس لیے پیدا کی گئی ہو؟ عرض کیا: آپ (علیہ السلام) کی تسکین کی خاطر، چنانچہ حضرت آدم (علیہ السلام) ان سے مانوس ہو گئے۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱، ۱/۳۴۰)

یہ وہ معقول اور سمجھ میں آنے والا طریقہ ہے جس سے نسل انسانی کی ابتداء کا پتہ چلتا ہے۔ بقیہ وہ جو کچھ لوگوں نے بندروں والا طریقہ نکالا ہے کہ انسان بندر سے بنا ہے تو یہ پرلے درجے کی نامعقول بات ہے۔ یہاں ہم سنجیدگی کے ساتھ چند سوالات سامنے رکھتے ہیں۔ آپ پر ان پر غور کر لیں، حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان بندر ہی سے بنا ہے تو کئی ہزار سالوں سے کوئی جدید بندر انسان کیوں نہ بن سکا اور آج ساری دنیا پوری کوشش کر کے کسی بندر کو انسان کیوں نہ بنا سکی؟ نیز بندروں سے انسان بننے کا سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟ کس نے یہ بنتے دیکھا تھا؟ کون اس کا راوی ہے؟ کس پرانی کتاب سے یہ بات مطالعہ میں آئی ہے؟ نیز یہ سلسلہ شروع کب ہوا اور کب سے بندروں پر پابندی لگ گئی کہ جناب! آئندہ آپ میں کوئی انسان بننے کی جرأت نہ کرے۔ نیز بندر سے انسان بنا تو دم کا کیا بنا تھا؟ کیا انسان بنتے ہی دم جھڑ گئی تھی یا کچھ عرصے بعد کاٹی گئی یا گھسٹ گھسٹ کر ختم ہو گئی اور بہر حال جو کچھ بھی ہوا، کیا اس بات کا ثبوت ہے کہ دم والے انسان پائے جاتے تھے۔ الغرض بندروں والی بات بندر ہی کر سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ دنیا بھر میں جس بات کا شور مچایا ہوا ہے اس کی کوئی کل سیدھی نہیں، اس کی کوئی کڑی سلامت نہیں، اس کی کوئی تاریخ نہیں۔ بس خیالی مفروضے قائم کر کے اچھے بھلے انسان کو بندر سے جا ملایا۔

{ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ : اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو۔ } ارشاد فرمایا کہ اس اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو یعنی کہتے ہو کہ اللہ کے واسطے مجھے یہ دو، وہ دو۔ نیز رشتے داری توڑنے کے معاملے میں اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرو۔

رشتے داری توڑنے کی مذمت

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں رشتہ داری توڑنے کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :
وَالَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡ بَعۡدِ مِیۡثٰقِهٖ وَیَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ (رعد: ۲۵)

اور وہ جو اللہ کا عہد اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جسے جوڑنے کا اللہ نے حکم فرمایا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کیلئے لعنت ہی ہے اور ان کیلئے برا گھر ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس قوم میں رشتہ داری توڑنے والا ہوتا ہے اس پر رحمت نہیں اترتی۔
(شعب الایمان، السادس والخمسون من شعب الایمان، ۶/۲۲۳، الحدیث : ۷۹۶۲)

اور حضرت ابو بکرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس گناہ کی سزا دنیا میں بھی جلد ہی دیدی جائے اور اس کے لیے آخرت میں بھی عذاب رہے وہ بغاوت اور قطع رحمی سے بڑھ کر نہیں۔ (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، ۵۷۔ باب، ۴/۲۲۹، الحدیث : ۲۵۱۹)

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ رشتے داری توڑنے سے بچے اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات جوڑ کر رکھنے کی بھرپور کوشش کرے۔ (صراط)

مسائل
۱۔ لوگوں کو اپنے رب سے ڈر کر رشتے داریوں کا احترام کرنا چاہیے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کی نگرانی فرما رہا ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَهُمۡ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوۡبًا كَبِیۡرًا ﴿۲﴾

لغۃ القرآن: [وَاٰتُوا : اور تم پہنچاؤ] [الۡیَتٰمٰی : یتیموں کو] [اَمۡوَالَہُمۡ : ان کے مال] [وَلاَ تَتَبَدَّلُوا : اور تم مت بدلو] [الۡخَبِیۡثَ : گندے کو] [بِالطَّیِّبِ : پاکیزہ سے] [وَلاَ

تَاْكُلُوْآ : اور تم مت كهاؤ] [اَمْوَالَہُمْ : ان كے مال] [اِلٰى اَمْوَالِكُمْ : اپنے مالوں ميں شامل كر كے] [اِنَّہٗ: يقينا يہ] [كَانَ : ہے] [حُوْبًا كَبِيْرًا : ايک بڑا جرم]

ترجمہ: اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور بری چیز کو عمدہ چیز سے نہ بدلا کرو اور نہ ان کے مال اپنے مالوں میں ملا کر کھایا کرو، یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (عرفان)

تشریح: اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک شخص کی نگرانی میں اس کے یتیم بھتیجے کا بہت زیادہ مال تھا، جب وہ یتیم بالغ ہوا اور اس نے اپنا مال طلب کیا تو چچا نے دینے سے انکار کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جسے سن کر اس شخص نے یتیم کا مال اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرتے ہیں۔ (بیضاوی، النساء، تحت الآیۃ: ۲، ۲/۱۴۱)
یتیم اس بچے یا بچی کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو جائے اور ابھی نابالغ ہو۔ اس آیت میں یتیم کے سرپرست کو حکم دیا جا رہا ہے یتیم کو جو مال اپنے فوت ہونے والے باپ سے ورثہ میں ملا ہے وہ تمہارے پاس امانت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یتیم کی عمدہ چیزیں تم خود رکھ لو اور اپنی گھٹیا چیزیں اس کے مال میں شامل کر دو یا یتیم کا مال اپنے مال میں خلط ملط کر کے کھا جاؤ۔ ایسی خیانت کرنا سخت گناہ ہے۔ اسی سورت کی آیت نمبر 10 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جو لوگ یتیم کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں اور عنقریب انھیں بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینکا جائے گا"۔ لٰہذا سرپرست کا فرض ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائے تو اس کا مال پوری دیانتداری کے ساتھ اس کے سپرد کر دے کیونکہ یتیم اپنی بے کسی اور بے بسی کے باعث زیادہ شفقت کا مستحق ہے۔

یتیموں کی سرپرستی

1۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو۔
(ابن ماجہ: 3679: ابواب الادب: باب 6)
2۔ حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی یتیم کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرے تو جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ گزرے گا ہر بال کے بدلے اسے نیکیاں ملیں گی اور جس نے کسی یتیم بچے یا بچی کے ساتھ حسن سلوک کیا، میں اور وہ جنت میں ان (دو انگلیوں) کی طرح ہوں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی دو انگلیوں یعنی درمیانی اور شہادت کی انگلی کے درمیان فاصلہ کیا۔ (مسند احمد: جلد 5: ص 250)

3۔ امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے سری سے روایت کیا ہے : جو شخص یتیم کا مال ناجائز طریقہ سے کھاتا ہے جب وہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اس کے منہ، ان کے کانوں، اس کی ناک اور اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے اور اسے دیکھ کر ہر شخص پہچان لے گا کہ یہ یتیم کا مال کھانے والا ہے۔ (تفسیر در منثور : سورۃ نساء : زیر آیت نمبر 10) (امداد)

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب یتیم اپنا مال طلب کریں تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو جب کہ دیگر شرعی تقاضوں کو پورا کر لیا ہے اور اپنے حلال مال کے بدلے یتیم کا مال نہ لو جو تمہارے لیے حرام ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ اپنا گھٹیا مال یتیم کو دے کر اس کا عمدہ مال لے لو۔ یہ تمہارا گھٹیا مال تمہارے لیے عمدہ ہے کیونکہ یہ تمہارے لیے حلال ہے اور یتیم کا عمدہ مال تمہارے لیے گھٹیا اور خبیث ہے کیونکہ وہ تمہارے لیے حرام ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یتیم کا مال اپنے مال سے ملا کر کھانا حرام ہوا یعنی گھٹیا معاوضہ دے کر کھانا بھی حرام ہے تو بغیر معاوضہ کے کھالینا تو بطریق اولیٰ حرام ہوا۔ ہاں شریعت نے جہاں ان کا مال ملا کر استعمال کی اجازت دی وہ جدا ہے جس کا بیان سورۂ بقرہ آیت 220 میں ہے۔

یتیموں سے متعلق چند اہم مسائل

یتیم اس نابالغ لڑکے یا لڑکی کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو جائے۔ آیت مبارکہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں یتیموں سے متعلق چند اہم مسائل بیان کئے جاتے ہیں :

(1)۔۔ یتیم کو تحفہ دے سکتے ہیں مگر اس کا تحفہ لے نہیں سکتے۔

(2)۔۔ کوئی شخص فوت ہو اور اس کے ورثاء میں یتیم بچے بھی ہوں تو اس ترکے سے تیجہ، چالیسواں، نیاز، فاتحہ اور خیرات کرنا سب حرام ہے اور لوگوں کا یتیموں کے مال والی اس نیاز، فاتحہ کے کھانے کو کھانا بھی حرام ہے۔ یہ مسئلہ بہت زیادہ پیش آنے والا ہے لیکن افسوس کہ لوگ بے دھڑک یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں۔

(3)۔۔ ایسے موقع پر جائز نیاز کا طریقہ یہ ہے کہ بالغ ورثاء خاص اپنے مال سے نیاز دلائیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہاں وہ دعوت مراد نہیں ہے جو تدفین کے بعد یا سوئم کے دن کی پکائی جاتی ہے کیونکہ وہ دعوت تو بہر صورت ناجائز ہے خواہ اپنے مال سے کریں۔ مسئلہ : تیجہ، فاتحہ کا ایصال ثواب جائز ہے لیکن رشتے داروں اور اہل محلّہ کی جو دعوت کی جاتی ہے یہ ناجائز ہے، وہ کھانا صرف فقراء کو کھلانے کی اجازت ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے فتاویٰ رضویہ کی 9 ویں جلد سے ان دو رسائل کا مطالعہ فرمائیں (1) اَلْحُجَّۃُ الْفَائِحَۃ لِطِیْبِ التَّعْیِیْنِ وَالْفَاتِحَۃ۔ (دن متعین کرنے اور مروجہ فاتحہ، سوئم وغیرہ کا ثبوت) (2) جَلِیُّ الصَّوْتْ لِنَھْیِ الدَّعْوَۃِ اَمَامَ مَوْتْ۔ (کسی کی موت پر دعوت کرنے کی ممانعت کا واضح بیان) (صراط)

یتیم کا مال کھانے اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی مذمت اور حسن سلوک کی تعریف

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو ' عرض کیا گیا : یارسول اللہ ! وہ کیا کیا ہیں ؟ آپ نے فرمایا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ' جادو کرنا ' جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو

ناحق قتل کرنا ،سود کھانا ،یتیم کا مال کھانا ،جہاد سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا ،مسلمان پاک دامن بے قصور عورت پر تہمت لگانا۔ (صحیح البخاری۔ رقم الحدیث ۶۸۵۷ ،صحیح مسلم رقم الحدیث : ۸۹ ،سنن ابوداؤد رقم الحدیث ۲۸۷۴ ،سنن نسائی رقم الحدیث : ۳۶۷۳)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جائے۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۳۶۷۹ ، ج ۴ ص ۱۹۳ ،مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ،۱۴۱۶)

اس حدیث میں امام ابن ماجہ منفرد ہیں اس کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن ابی سلیمان ہے ،امام بخاری نے کہا وہ منکر الحدیث ہے ،(تاریخ الکبیر ج ۸ ص ۲۹۹۹) امام ابوحاتم نے کہا وہ مضطرب الحدیث ہے (الجرح والتعدیل ج ۹ ص ۶۳۸) امام ابن حبان نے اس کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (کتاب الثقات ج ۹ ص ۲۶۴)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے دل کی سختی کی شکایت کی آپ نے فرمایا : یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۸۷ ،۲۶۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اس حدیث کی سند صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۶۰) (تبیان)

یتیم کا مال ہڑپ کرنے کے لیے اپنے مال کے ساتھ ملانے کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔ ایسا کرنے والا حرام کو حلال کے ساتھ ملاتا ہے جس سے نفرت دلانے کے لیے خبیث کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ خبیث ناپاک اور گندی چیز کو کہتے ہیں۔ لفظ خبیث استعمال کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ پاک ذہن اور باضمیر شخص یتیم کا مال کھانے کا تصور بھی نہ کر سکے۔ اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام (رض) نے اس پر اتنی سختی اور جلدی کے ساتھ عمل کیا کہ آپ کی محفل سے اٹھے اور گھر جانے کے بعد جن کے ہاں یتیم پرورش پا رہے تھے۔ ان کا کھانا پینا اور برتن الگ کر دیے۔ جسے یتیموں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ماجرا عرض کیا۔ تب

قرآن مجید میں اس کی وضاحت نازل ہوئی

(وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ) [البقرۃ : ۲۲۰]

"اور وہ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیں کہ ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر تم انھیں اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ مصلح اور مفسد کو جانتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا یقیناً اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ "

(عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ (رض) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ یَا أَبَا ذَرٍّ إِنِّیْ أَرَاکَ ضَعِیْفًا وَإِنِّیْ أُحِبُّ لَکَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَأَمَّرَنَّ عَلَی اثْنَیْنِ وَلَا تَوَلَّیَنَّ مَالَ یَتِیْمٍ) [رواہ مسلم : کتاب الإمارۃ، باب کراھۃ الإمارۃ بغیر ضرورۃ]

"حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابوذر ! میں تجھے کمزور پاتا ہوں اور میں تمہارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں، تم دو آدمیوں کے امیر نہ بننا اور نہ ہی یتیم کے مال کا والی بننا۔ "

(عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ خَیْرُ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْہِ یَتِیْمٌ یُحْسَنُ إِلَیْہِ وَشَرُّ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْہِ یَتِیْمٌ یُسَاءُ إِلَیْہِ) [رواہ ابن ماجۃ : کتاب الأدب، باب حق الیتیم]

"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا مسلمانوں میں بہترین گھرانہ وہ ہے جس میں یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو۔ مسلمانوں میں بدترین گھروہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کے ساتھ پیش آیا جاتا ہو۔"

(عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ لَا اَجِدُ شَيْءًا وَلَيْسَ لِيْ مَالٌ وَلِيْ يَتِيْمٌ لَهٗ مَالٌ قَالَ كُلْ مِنْ مَالِ يَتِيْمِكَ غَيْرَ مُسْرِفٍ وَلَا مُتَاثِّلٍ مَالًا قَالَ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ وَلَا تَقِيْ مَالَكَ بِمَالِهٖ) [ابن ماجۃ: کتاب الوصایا، باب قولہ ومن کان فقیرا فلیأکل بالمعروف]

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک آدمی نے آکر کہا میرے پاس کوئی مال نہیں البتہ میرے پاس ایک یتیم ہے جس کا مال بھی ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے یتیم کے مال سے فضول خرچی اور اپنے مال کے ساتھ نہ ملاتے ہوئے اس کے مال میں سے کھالیا کر۔ راوی کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا اپنا مال اس کے مال کے ذریعے نہ بچانا۔" "(فہم)

مسائل

۱۔ یتیموں کا مال واپس کرنا چاہیے۔

۲۔ یتیموں کا مال کھانا بڑا گناہ ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾

لغات القرآن:

[وَاِنْ : اور اگر] [خِفْتُمْ : تم ڈرو] [اَلَّا : کہ نہ] [تُقْسِطُوْا : انصاف کرسکوگے] [فِي : میں] [الْيَتٰمٰى: یتیموں] [فَانْكِحُوْا : تو نکاح کرلو] [مَا : جو] [طَابَ : پسند ہو] [لَكُمْ : تمہیں] [مِّنَ : سے] [النِّسَآءِ : عورتیں] [مَثْنٰى: دو ، دو] [وَثُلٰثَ : اور تین تین] [وَرُبٰعَ : اور چار، چار] [فَاِنْ : پھر اگر] [خِفْتُمْ : تمہیں اندیشہ ہو] [اَلَّا : کہ نہ] [تَعْدِلُوْا : انصاف کرسکو گے] [فَوَاحِدَةً : تو ایک ہی] [اَوْ مَا : یا جو] [مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

: لونڈی جس کے تم مالک ہو] [ذٰلِكَ : یہ] [اَدْنٰٓی: قریب تر] [اَلَّا : کہ نہ] [تَعُوْلُوْا : جھک پڑو]

ترجمہ : اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لیے پسندیدہ اور حلال ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار (مگر یہ اجازت بشرط عدل ہے)، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (زائد بیویوں میں) عدل نہیں کرسکو گے تو صرف ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا وہ کنیزیں جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں آئی ہوں، یہ بات اس سے قریب تر ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو

تفسیر و تشریح:

یتامٰی میں بھی یتیم بچیوں کا خیال رکھنے کا حکم ہے کیونکہ یتیم لڑکا تو کسی نہ کسی طریقے سے گزارہ کرلیتا ہے لیکن یتیم بچی جائے تو کدھر جائے۔ اگر بالغ ہو جائے تو اسے تحفظ فراہم کرنے کے لیے اس سے مشروط نکاح کی ترغیب دی گئی ہے۔

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے یتیموں کے بعض سرپرست محض اس کے مال پر قبضہ کرنے کے لیے یتیم لڑکی کے بالغ ہونے پر اس کا نکاح اپنے یا اپنے بیٹے کے ساتھ کردیتے۔ ایسا ہی واقعہ آپ کی بعثت کے بعد پیش آیا۔

(عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلًا كَانَتْ لَهُ يَتِيمَةٌ فَنَكَحَهَا وَكَانَ لَهَا عَذْقٌ وَكَانَ يُمْسِكُهَا عَلَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ لَهَا مِنْ نَفْسِهِ شَيْءٌ فَنَزَلَتْ (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى۔۔) [رواہ البخاری : کتاب تفسیر القرآن، باب وإن خفتم إلا تقسطوا]

”حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں ایک آدمی کی پرورش میں ایک یتیم لڑکی تھی جس کی ملکیت میں کھجور کا ایک باغ تھا اسی باغ کی وجہ سے وہ اس کی پرورش کرتا رہا۔ حالانکہ اس کو اس سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔“

یعنی اگر تم یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہیں کرسکتے تو پھر دوسری عورتوں کے ساتھ اپنی پسند کے مطابق دو دو، تین تین ' چار چار نکاح کرسکتے ہو۔ اس میں بھی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے درمیان عدل نہیں کرپاؤ گے تو پھر ایک سے ہی نکاح کرو۔ البتہ تم لونڈیاں رکھ سکتے ہو۔ عدل و انصاف کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ کہیں تم ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ۔

(عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقْسِمُ فَيَعْدِلُ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ) [رواہ ابوداؤد : کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء]

”حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باری تقسیم کرنے میں عدل کرتے اور یہ فرماتے تھے اے اللہ ! یہ میری تقسیم ہے جس کا مجھے اختیار ہے اور مجھے ملامت نہ کر اس میں جس کا تو مالک ہے اور کیونکہ اس پر مجھے اختیار نہیں (یعنی دل)۔ “

چار بیویوں کا مسئلہ

غیر مسلموں نے قرآن مجید کے اس فرمان پر بڑے اعتراضات اور سوالات اٹھائے ہیں وہ اس آیت کی خود ساختہ تشریح کرتے ہوئے کہتے اور لکھتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو چار بیویاں کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ قرآن مجید نے چار بیویاں کرنے کا حکم نہیں دیا۔ چار بیویاں کرنے کی صرف رخصت عنایت فرمائی ہے۔ اس میں بھی ہر قسم کا عدل و انصاف قائم رکھنا ضروری ہے ورنہ اسلامی حکومت ایسے شخص کا نوٹس لے سکتی ہے۔

(عَنۡ اَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِذَاکَانَ عِنۡدَ الرَّجُلِ امۡرَاَتَانِ فَلَمۡ یَعۡدِلۡ بَیۡنَھُمَا جَاءَ یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ وَشِقُّہٗ سَاقِطٌ) [رواہ الترمذی: کتاب النکاح، باب ماجاء فی التسویۃ بین الضرائر]

"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس آدمی کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے۔ وہ قیامت کے دن فالج زدہ جسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا۔"

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ: اور اگر تمہیں ڈر ہو۔} اس آیت کے معنیٰ میں چند اقوال ہیں۔

(1)۔۔ امام حسن بصری (رح) کا قول ہے کہ پہلے زمانہ میں مدینہ کے لوگ اپنی زیر سرپرستی یتیم لڑکیوں سے ان کے مال کی وجہ سے نکاح کر لیتے حالانکہ ان کی طرف انھیں کوئی رغبت نہ ہوتی تھی، پھر ان یتیم لڑکیوں کے حقوق پورے نہ کرتے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے اور ان کے مال کے وارث بننے کے لیے ان کی موت کے منتظر رہتے، اس آیت میں انھیں اس حرکت سے روکا گیا۔ (صاوی، النساء، تحت الآیۃ: ۳، ۳۵۹/۲)

(2)۔۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لوگ یتیموں کی سرپرستی کرنے سے تو ناانصافی ہو جانے کے ڈر سے گھبراتے تھے لیکن زنا کی پروانہ کرتے تھے، انھیں بتایا گیا کہ اگر تم ناانصافی کے اندیشہ سے یتیموں کی سرپرستی سے گریز کرتے ہو تو زنا سے بھی خوف کرو اور اس سے بچنے کے لیے جو عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں ان سے نکاح کرو اور حرام کے قریب مت جاؤ۔

(تفسیر کبیر، النساء، تحت الآیۃ: ۳، ۴۸۵/۳)

(3)۔۔ تیسرا قول یہ ہے کہ لوگ یتیموں کی سرپرستی میں تو ناانصافی کرنے سے ڈرتے تھے لیکن بہت سے نکاح کرنے میں کچھ خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے، انھیں بتایا گیا کہ جب زیادہ عورتیں نکاح میں ہوں تو ان کے حق میں ناانصافی سے بھی ڈرو جیسے یتیموں کے حق میں ناانصافی کرنے سے ڈرتے ہو اور اتنی ہی عورتوں سے نکاح کرو جن کے حقوق ادا کر سکو۔

(مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۳، ص۲۰۹)

(4)۔۔ حضرت عِکْرِمَہ (رض) نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت کیا کہ قریش دس دس بلکہ اس سے زیادہ عورتیں کرتے تھے اور جب ان کا بوجھ نہ اٹھا سکتے تو جو یتیم لڑکیاں ان کی سرپرستی میں ہوتیں ان کے مال خرچ کر ڈالتے۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۳، ۳۴۰/۱)

اس آیت میں فرمایا گیا کہ اپنی مالی پوزیشن دیکھ لو اور چار سے زیادہ نہ کرو تاکہ تمہیں یتیموں کا مال خرچ کرنے کی حاجت پیش نہ آئے۔

نکاح سے متعلق 2 شرعی مسائل:

(1)۔۔ اِس آیت سے معلوم ہوا کہ آزاد مرد کے لیے ایک وقت میں چار عورتوں تک سے نکاح جائز ہے۔

(2)۔۔ تمام امّت کا اجماع ہے کہ ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں رکھنا کسی کے لیے جائز نہیں سوائے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور یہ بات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیات میں سے ہے۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اسلام قبول کیا، اس کی آٹھ بیویاں تھیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ان میں سے صرف چار رکھنا۔ (ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعندہ نسائٌ۔۔ الخ، ۳۹۶/۲، الحدیث: ۲۲۴۱)

{ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوا : پھر اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا ڈر ہو۔ } آیت میں چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی صورت میں سب کے درمیان عدل نہیں کر سکو گے تو صرف ایک سے شادی کرو۔ اسی سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی چار میں عدل نہیں کر سکتا لیکن تین میں کر سکتا ہے تو تین شادیاں کر سکتا ہے اور تین میں عدل نہیں کر سکتا لیکن دو میں کر سکتا ہے تو دو کی اجازت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا فرض ہے، اس میں نئی، پرانی، کنواری یا دوسرے کی مُطَلَّقہ، بیوہ سب برابر ہیں۔ یہ عدل لباس میں، کھانے پینے میں، رہنے کی جگہ میں اور رات کو ساتھ رہنے میں لازم ہے۔ ان امور میں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہو۔

آیت مبارکہ:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓـــًٔا ﴿۴﴾

لغات القرآن: [وَاٰتُوا : اور دے دو] [النِّسَآءَ : عورتیں] [صَدُقٰتِهِنَّ : ان کے مہر] [نِحۡلَةً : خوشی سے] [فَاِنۡ : پھر اگر] [طِبۡنَ : خوشی سے چھوڑ دیں] [لَكُمۡ : تم کو] [عَنۡ شَىۡءٍ : کچھ] [مِّنۡهُ : اس سے] [نَفۡسًا : دل سے] [فَكُلُوۡهُ : تو اسے کھاؤ] [هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓـــًٔا: مزیدار ، خوشگوار]

ترجمہ : اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے ادا کیا کرو، پھر اگر وہ اس (مَہر) میں سے کچھ تمہارے لیے اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو تب اسے (اپنے لئے) سازگار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔

تفسیر و تشریح:

عورتوں کے اخلاقی 'ازدواجی حقوق بیان کرنے کے بعد ان کا حق مہر اور مالی حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ ان کے معاشی تحفظ کے ساتھ شخصی وقار میں اضافہ ہو جائے۔

اسلام سے پہلے عورتوں پر یہ ظلم بھی ہوتا تھا کہ انھیں حق مہر سے محروم کر دیا جاتا اس ظلم کی چار شکلیں تھیں۔

۱۔ یتیم اور کمزور گھرانوں کی بچیوں کا سرے سے حق مہر مقرر ہی نہیں کیا جاتا تھا۔

۲۔ بعض دفعہ عورت کا ولی حق مہر خود ہی کھا جاتا تھا۔

۳۔ حق مہر مقرر کرنے کے باوجود عورت کو حق مہر نہ دیا جاتا یا ادا کرنے میں کئی کئی سال اجتناب کیا جاتا۔ تاآنکہ عورت کے مطالبہ پر میاں بیوی کے درمیان تلخیاں پیدا ہو جاتیں۔

۴۔ خاوند ایسا رویّہ اختیار کرتا جس سے مجبور ہو کر عورت اپنا حق مہر چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی تھی۔

قرآن مجید نے "نِحْلَةً" کا لفظ استعمال فرما کر اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ حق مہر دل کی خوشی اور رغبت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ حق مہر خاوند کی طرف سے بیوی کے لیے شب زفاف کا تحفہ اور محبت کا اظہار ہے۔ اس سے آدمی کو پہلے دن ہی ازدواجی زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے حق مہر خاوند کو معاف کر دے تو خاوند کو چاہیے کہ وہ اس انداز سے اسے استعمال کرے۔ جس سے اس کی استغناء ظاہر ہوتی ہو۔ ایسا کرنے سے آدمی ہلکے پن اور لالچی ہونے کے الزام سے بچ جائے گا۔ بصورت دیگر عورت کی نظر میں خاوند کا ہلکا پن اور اس کے لالچی ہونے کا شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ اسے کھاؤ مگر خوشگوار طریقے کے ساتھ۔

حق مہر کا تعیّن

لڑکے اور لڑکی کے نکاح کی صورت اس وقت ہی پیش آتی ہے جب دونوں خاندانوں کے درمیان قربت اور مودّت پیدا ہو جائے۔ اس قربت اور مودّت کو آگے بڑھانے اور دونوں خاندانوں اور افراد کو مالی بوجھ سے بچانے کے لیے شریعت نے اپنی طرف سے حق مہر کا تعین کرنے کی بجائے لڑکے، لڑکی اور اس کے ولی پر معاملہ چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مالی استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے خوشگوار ماحول اور باہمی رضامندی سے حق مہر کا تعین کریں۔ اس لیے حدیث کے مقدس ریکارڈ میں بیوی کو چند آیات حفظ کروانے سے لے کر حق مہر میں بھاری رقم دینے کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن مجید نے حق مہر کے لیے "قِنْطَاراً" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ خزانہ ہے۔ اس سے مراد کثیر رقم ہے۔ لہٰذا جو علماء شرعی حق مہر 32 روپے یا اپنی طرف سے کسی قسم کی رقم کا تعین کرتے ہیں۔ دین میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ عورت پر زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چند صحابہ (رض) میں تشریف فرما تھے ایک عورت نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو نکاح کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموش رہے۔ اتنے میں ایک شخص عرض کرنے لگا اگر آپ آمادہ نہیں تو میں اس عورت کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ تیرے پاس حق مہر کے لیے کچھ ہے ؟ اس نے عرض کیا یہ چادر جو میں نے لپیٹ رکھی ہے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا کہ چادر اپنے پاس رکھو اور حق مہر کے لیے لوہے کی انگوٹھی ہی لے آؤ۔ کوشش کے باوجود اسے انگوٹھی بھی میسر نہ ہو سکی۔ وہ خالی ہاتھ واپس آیا۔ آپ پوچھتے ہیں کہ تجھے قرآن مجید یاد ہے ؟ تو اس نے عرض کی کہ مجھے فلاں فلاں سورتیں یاد ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ سورتیں حق مہر کے طور پر اپنی بیوی کو یاد کروا دینا۔ [بخاری : کتاب النکاح، باب تزویج المعسر]

ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمر (رض) نے خطبہ جمعہ میں فرمایا :

(إِلَا لَا تُغَالُوا صَدُقَةَ النِّسَاءِ فَإِنَّهَا لَوْ كَانَتْ مَكْرُمَةً فِي الدُّنْيَا أَوْ تَقْوٰى عِنْدَ اللّٰهِ لَكَانَ أَوْلَاكُمْ بِهَا نَبِيُّ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا عَلِمْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نَكَحَ شَيْئًا مِنْ نِسَاءِهِ وَلَا أَنْكَحَ شَيْئًا مِنْ بَنَاتِهِ عَلٰى أَكْثَرَ مِنْ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ أُوقِيَّةً) [رواہ الترمذی : کتاب النکاح، باب منہ]

"خبر دار ! عورتوں کے حق مہر بڑھاچڑھا کر مقرر نہ کیا کرو۔ اگر یہ بات عظمت اور تقوی کا باعث ہوتی تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی کسی بیوی یا بیٹی کا حق مہر بارہ تولے چاندی سے زیادہ نہیں تھا۔"
حضرت عمر (رض) کے فرمان کا مقصد حق مہر میں اعتدال قائم رکھنے کی طرف توجہ دلانا تھا۔ اس کے باوجود کسی شخص کو عورتوں کے حق مہر کی رقم متعین کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت عمر کے خطبہ کے دوران ایک عورت نے کہا تھا کہ امیر المومنین آپ حق مہر کی رقم مقرر نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قنطار کا لفظ استعمال فرما کر حق مہر کے مسئلہ کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اگر کوئی آدمی حق مہر میں خزانہ بھی دینا چاہے تو کوئی حرج نہیں امیر المومنین نے اس عورت کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت کو مسئلہ یاد رہا اور مجھ سے خطا ہوئی۔ [عون المعبود]

مسائل

۱۔ عورتوں کے حق مہر ادا کرنے چاہئیں عورت خود معاف کر دے تو اسے اچھے طریقے سے کھانا چاہیے تھا۔
۲۔ حق مہر مقرر کرتے وقت اعتدال قائم رکھنا چاہیے۔

آیت مبارکہ:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

لغۃ القرآن: [وَلاَ تُؤْتُوا : اور تم مت دو] [السُّفَہَآءَ : نادانوں کو] [اَمْوَالَكُمُ : اپنے مال الَّتِیْ : جن کو] [جَعَلَ : بنایا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [قِیٰمًا : کھڑے ہونے کا ذریعہ (معیشت میں)] [وَّارْزُقُوْہُمْ : اور رزق دو ان کو] [فِیْہَا : اس میں سے] [وَاكْسُوْہُمْ : اور پہناؤ ان کو] [وَقُوْلُوْا : اور کہو] [لَہُمْ : ان سے] [قَوْلاً مَّعْرُوْفًا : بھلی بات]

ترجمہ: اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انھیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو۔

تشریح: سابقہ فرامین میں یتامیٰ اور عورتوں کے مالی حقوق کی ادائیگی کا حکم تھا۔ اب فرمایا کہ یتیموں کو ان کا مال واپس لوٹاتے ہوئے اچھی طرح اندازہ کر لو کہ کہیں وہ ناتجربہ کاری یا صغر سنی کی وجہ سے اپنا مال ضائع نہ کر بیٹھیں۔

قرآن مجید نے دوسری آزمائشوں کے ساتھ مال کو بھی آدمی کے لیے ایک بڑی آزمائش اور فتنہ قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رزق حلال کو اللہ تعالیٰ کا فضل ' نعمت ' زندگی کا لازمہ اور اسے تقویت کا باعث ٹھہرایا ہے۔

یتیموں کے لیے بالخصوص مال سہارا اور تقویت کا باعث ہوتا ہے کیونکہ عام طور پر ان کا کمانے والا کوئی نہیں ہوتا بلکہ ان کی جائیداد کا بھی کوئی دوسرا نگران ہوتا ہے۔

یہاں یتیموں کے سرپرست کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ان کے مال کو اپنا تصور کرتے ہوئے اس کی حفاظت اور نگرانی کرے اور جب تک یتیم میں فہم و شعور اور مال سنبھالنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ اس وقت تک ان کا سرپرست ان کے مال سے ان کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام کرتا رہے۔ ان کی طرف سے اگر کوئی مطالبہ یا غلط فہمی پیدا ہو تو نہایت محبت اور پیار کے ساتھ ان کو بہلاتا اور سمجھاتا رہے۔ یہاں تک کہ یتیم اپنا مال سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔ یتیموں کے لیے ناسمجھ کا لفظ دو وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ ایک تو یہ مال کی حفاظت اور اس کو استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نو عمر اور یتیم ہونے کی وجہ سے یہ لوگوں کے پروپیگنڈہ کا شکار ہو کر اپنے سرپرست اور خیر خواہ سے اکثر بد ظن ہو کر مال واپس لے کر اسے ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

(اِلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيْمًا لَّہٗ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكْہُ حَتّٰى تَاْكُلَهُ الصَّدَقَةُ) [رواہ الترمذی: کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی الزکوۃ من مال الیتیم]

"خبردار! جو کسی یتیم کا سرپرست بنے اور یتیم کے پاس مال ہو تو وہ اس کے مال کو کاروبار میں لگائے۔ کہیں آہستہ آہستہ زکوۃ سے اس کا مال ختم نہ ہو جائے۔"

یتیموں کے مال کی حفاظت کے پیش نظر یہ اصول

یتیموں کے مال کی حفاظت کے پیش نظر یہ اصول بھی قائم فرمایا کہ جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں اور ان میں مالی معاملات سمجھنے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ ان کا مال اس وقت تک نہیں لوٹانا چاہیے جب وہ شعور کو پہنچ جائیں تو انھیں ان کا مال لوٹاتے ہوئے اس پر گواہ بنا لینے چاہئیں تاکہ جس آدمی نے سرپرستی کی صورت میں ان کی خدمت کی ہے وہ ہر قسم کے الزامات سے محفوظ رہ سکے۔

سرپرست کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر وہ امیر ہے تو یتیموں کے مال کی نگرانی اور سرپرستی کے عوض ان کے مال سے کچھ نہ لے اور اگر اس کی اپنی گزران تنگ ہے تو مناسب طریقے سے اس میں سے کھا سکتا ہے۔ یتیم اور ان کے سرپرست کو ہر دم خیال رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے حساب و کتاب کو خوب جانتا ہے اور اس کے ہاں تمام معاملات لکھے اور پیش کیے جاتے ہیں اور قیامت کے دن پائی پائی کا حساب لے گا۔ (فہم)

اس آیت میں چند احکام بیان فرمائے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جن بچوں کی پرورش تمہارے ذمہ ہے اور ان کا مال تمہارے پاس ہے اور وہ بچے اتنی سمجھ نہیں رکھتے کہ مال کا مصرف پہچانیں بلکہ وہ اسے بے محل خرچ کرتے ہیں اور اگر ان کا مال ان پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جلد ضائع کر دیں

گے حالانکہ مال کی بہت اہمیت ہے کہ اسی کے ساتھ زندگی کی بقا ہے لہٰذا جب تک مال کی اچھی طرح سمجھ بوجھ انھیں حاصل نہ ہو جائے تب تک ان کے مال ان کے حوالے نہ کرو بلکہ ان کی ضروریات جیسے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات وغیرہ ان کے مال سے پورے کرتے رہو۔ البتہ ان سے اچھی بات کہتے رہو جس سے ان کے دل کو تسلی رہے اور وہ پریشان نہ ہوں مثلاً ان سے کہو کہ بھائی ! مال تمہارا ہی ہے اور جب تم ہوشیار، سمجھدار ہو جاؤ گے تو یہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔

(مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۵، ص ۲۱۰)

اچھی بات کہنے کا معنیٰ یہاں مفسرین نے وہ لیا ہے جو اوپر بیان ہوا البتہ مطلقًا اچھی بات میں بہت سی چیزیں داخل ہیں، یہ بھی اس میں داخل ہے کہ ان کو آدابِ زندگی سکھاؤ، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے سب کاموں میں ان کی تربیت کرو۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور کم عقلوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ نے تمہاری گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے۔

کم عقلوں کو مال نہ دینے اور یتیم کے مال کو ولی کا مال فرمانے کی توجیہہ

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا یتیموں کا مال ان کے حوالے کردو اور عورتوں کا مہر ان کے حوالے کر دو۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب یتیم یا تمہاری منکوحہ عاقل بالغ ہو اور جب وہ عاقل بالغ نہ ہوں تو ان کے اموال کو اپنے پاس حفاظت سے رکھو اور جب وہ بالغ ہو جائیں اور ان کی عقل پختہ ہو جائے تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

اس آیت میں یہ فرمایا ہے اور کم عقلوں کو اپنے مال نہ دو حالانکہ مراد یہ ہے کہ کم عقلوں کو ان کے مال حوالے نہ کرو حتیٰ کہ وہ عاقل بالغ ہو جائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یتیم کا مال اس کے ولی اور سرپرست کی تحویل میں رہتا ہے۔ اس ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے یتیم کے مال کی اس کے سرپرست کی طرف نسبت کر دی گئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں یتیم کے مال کو ولی کا مال اس لیے فرمایا ہے تاکہ ولی یتیم کے مال کی اس طرح حفاظت کرتے جس طرح وہ اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ اس کو فضول اور بے دریغ خرچ نہ کرے اور اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرے اور یتیم کے مال کی اپنے مال کی طرح حفاظت کرے۔

مال کم عقل کی ملک کرنا اس آیت کے منافی نہیں :

سفہاء 'سفیہ کی جمع ہے سفیہ کم عقل کو کہتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ یہاں سفہاء سے کون مراد ہیں :

سعید بن جبیر نے کہا سفہاء سے مراد یتیم اور عورتیں ہیں۔ حسن بصری نے کہا اس سے مراد نابالغ ہیں۔ امام طبری کا مختار یہ ہے کہ اس سے کم عقل مراد ہے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی بالغ ہو یا نابالغ۔ (جامع البیان ج ۴ ص ۱۶۵ 'مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ۱۴۰۹ھ)

اس آیت میں نابالغ بچوں کو مال دینے سے منع فرمایا ہے اور احادیث سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر (رض) روایت کرتے ہیں کہ میرے والد مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے کر گئے اور کہا میں نے اپنے اس بیٹے کو مال ہبہ کیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تو اس سے رجوع کر لو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : ۲۵۸۶ 'صحیح مسلم 'رقم الحدیث ۱۶۲۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کم عمر بچوں کو ہبہ کرنا صحیح ہے البتہ ان میں مساوی ہبہ کرنا چاہیے اور اس آیت میں کم عمر بچوں کو دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں نا سمجھ بچوں کو مال ہبہ کرنے اور ان کی ملکیت میں دینے سے منع فرمایا بلکہ تصرف کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں میں مال دینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرنے اور اس کو صحیح محل پر خرچ کرنے کے طریقوں پر مطلع نہیں ہوتے۔

حجر (قولی تصرف سے روکنا) کا لغوی اور شرعی معنی

حجر کا لغوی معنی ہے منع کرنا اور روکنا ' اور اصطلاحی معنی ہے ولی یا قاضی کا کسی کم عقل بچہ ' مجنون یا غلام کو قولی تصرف (مثلاً خریدنا ' بیچنا ' ہبہ کرنا) سے روکنا ' اس کا سبب صغر ' جنون اور غلام ہونا ہے اس لیے بچہ ' مجنون اور مغلوب العقل کی دی ہوئی طلاق نافذ نہیں ہوگی اور اس کا اقرار کرنا صحیح نہیں ہے ' اگر بچہ یا مجنون کو بیع وشراء کی سمجھ ہو اور اس کے ولی نے ان کو اجازت دی ہو اور اس بیع وشراء میں غبن فاحش نہ ہو تو ان کی بیع وشراء صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ کسی کے پاس اجرت پر کام کریں تو ان کی اجرت واجب ہو جائے گی اور جس عقد میں ان کے لیے نفع محض ہو وہ صحیح ہے۔ اس لیے ان کا صدقہ اور ہبہ قبول کرنا صیح ہے جو شخص آزاد ' عاقل اور بالغ ہو لیکن اس کی عقل کم ہو امام اعظم کے نزدیک اس کو قولی تصرف سے روکنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی آزادی اور بلوغ کے منافی ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اس کو روکنا صحیح ہے تاکہ اس کا مال محفوظ رہے۔ ورنہ وہ اس کو بے جا خرچ کر کے ضائع کر دے گا اور فتوی امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول پر ہے۔ (در مختار رد المختار ج ۵ ص ۹۳ ' ۸۹ ملخصا مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت ۱۴۰۷ھ)

حجر کے ثبوت میں قرآن اور سنت سے دلائل

نابالغ بچہ اور کم عقل کو مالی تصرف سے روکنے پر قرآن مجید کی زیر تفسیر آیت دلیل ہے جس میں فرمایا ہے:

اور کم عقلوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ نے تمہاری گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے اور ان سے خیر خواہی کی بات کہو ' اور یتیموں کا (بطور تربیت) امتحان لیتے رہو حتی کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور تم ان میں سمجھ داری (کے آثار) دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو (النساء: ۶۔۵)

اور حجر (قولی تصرف سے روکنے) کے ثبوت میں یہ احادیث بھی ہیں:

حضرت علی (رض) نے فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم کہ تین شخصوں سے قلم (تکلیف) اٹھالیا گیا مجنون سے حتی کہ وہ تندرست ہو جائے ' بچہ سے حتی کہ وہ بالغ ہو جائے اور سوئے ہوئے سے حتی کہ وہ بیدار ہو جائے۔ حضرت علی (رض) نے فرمایا: مغلوب العقل کے سوا ہر شخص کی طلاق جائز ہے۔ (صحیح البخاری ' کتاب الطلاق باب: ۱۱ رقم الحدیث: ۵۲۶۸)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین شخصوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے سوئے ہوئے سے حتی کہ بیدار ہو جائے ' مجنون سے حتی کہ شفایاب ہو جائے اور بچہ سے حتی کہ وہ بڑا ہو جائے۔ (سنن ابو داؤد: ۴۳۹۸ ' سنن ترمذی:

۱۴۲۸ ،سنن نسائی: ۳۴۳۲ ،سنن ابن ماجہ: ۲۰۴۱ ،سنن کبری للنسائی: ۶۳۴۷ ،مسند احمد: ج ا ص ۱۱۸ ،۱۴۰ ج ۶: ص ۱۰۱ ،۱۰۰ ،سنن دارمی: ۲۲۹۶)

ان حدیثوں میں مجنون اور نابالغ کے قولی تصرفات کو روکنے کی دلیل ہے اور جو آزاد عاقل بالغ ہو لیکن کم عقل ہو اس کو روکنے پر سورۃ نساء کی زیر تفسیر آیت میں بھی دلیل ہے اور اس حدیث میں بھی اس پر دلیل ہے:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کی بیع اور شراء میں کچھ کمزوری تھی اور وہ بیع کرتا تھا اس کے گھر والوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آکر عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو حجر (منع) کیجئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بلا کر منع فرمایا اس نے کہا یارسول اللہ میں بیع کرنے سے صبر نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا جو تم بیع کرو تو کہو یہ چیز اتنے اور اتنے کی ہے اور کوئی دھوکا نہ کیا جائے۔ (سنن ترمذی ،رقم الحدیث: ۱۲۵۴ ،صحیح البخاری ،رقم الحدیث: ۲۹۶۴ ،سنن ابوداؤد ،رقم الحدیث: ۳۵۰۱ ،سنن نسائی ،رقم الحدیث: ۴۴۹۷)

جو کسی منصب (اسامی) کے نااہل ہوں ان کو اس کی ذمہ داری نہ سونپی جائے

حجر یعنی قولی تصرفات سے روکنا ،اس کا تعلق ولی سے بھی ہے اور قاضی سے بھی ،اور حجر کا سبب کم عقلی ہے اور نااہلی بھی اس کے قریب ہے۔ اس لیے جو شخص کسی عہد کا اہل نہ ہو اور وہ اس عہدہ پر کام کرے تو قاضی ،سلطان یا حکومت وقت پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر سے بچانے کے لیے اسے اس عہدہ پر کام کرنے سے روک دے مثلا ان پڑھ ،عطائی حکیم اور بے سند ڈاکٹر۔ ان کو لوگوں کی جانوں سے کھیلنے کے لیے علاج معالجہ سے روکنا لازم ہے۔ بعض جگہ کمپاؤڈر حضرات محلّہ میں ایک چھوٹی سی کلینک کھول کر طب کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض مساجد میں پانچ وقتی امام جو نماز کے مسائل سے بھی بمشکل واقف ہوتے ہیں وہ لوگوں کو نکاح ،طلاق ،حلال اور حرام کے مسائل غلط سلط بتاتے رہتے ہیں۔ اس لیے علاج کے معاملہ میں مستند اور تجربہ کار ڈاکٹر سے اور دینی مسائل میں کسی دینی دارالعلوم کے مفتی سے رجوع کرنا چاہیے۔ اسی طرح باقی معاملات میں بھی ہر فن کے ماہر سے رجوع کرنا چاہیے اور کسی اناڑی اور ناتجربہ کار کے ہاتھ میں اپنا کوئی معاملہ نہیں دینا چاہیے۔

ہمارے زمانہ میں حجر کو صحیح طریقہ سے جاری کرنے کی حکومت سے کوئی امید نہیں ہے کیونکہ تمام سرکاری اداروں میں حکومت نے سیاسی وابستگی ،رشوت اور سفارش کی بنیاد پر ہر شعبہ میں بکثرت نااہل افراد بھرتی کردیئے ہیں۔ اب کسی منصب کے لیے اہلیت اور قابلیت معیار نہیں ہے بلکہ سرکاری افسروں کے ساتھ تعلقات یا پھر زیادہ سے زیادہ روپوں کی پیش کش معیار ہے اس لیے ہر ادارہ میں اکثریت ان ملازموں کی ہوتی ہے جو ان ملازمتوں کے نااہل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے جس طرح حکم دیا ہے کہ کم عقل لوگوں کو ان کا مال نہ دو کیونکہ وہ اس مال کو ضائع کردیں گے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ جو شخص کسی منصب کا اہل نہ ہو اس کو اس منصب کی ذمہ داری نہ سونپی جائے لیکن ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں اس کے صریح خلاف عمل ہو رہا ہے کئی انگوٹھا چھاپ پیسے کے زور پر اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں اور وزارت کے اہل ہوجاتے ہیں۔ (تبیان)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے لیے استحکام کا ذریعہ بنایا ہے۔
۲۔ یتیموں سے نرم لہجے میں پیش آنا چاہیے۔
۳۔ یتیموں کا مال کھانا منع ہے۔
۴۔ یتیموں کو آزمانے اور ان میں سمجھداری دیکھنے کے بعد ان کا مال ان کے سپرد کرنا چاہیے۔
۵۔ یتیموں کا کفیل مالدار ہو تو اسے ان کے مال سے کچھ نہیں لینا چاہیے۔
۶۔ یتیموں کا کفیل تنگ دست ہو تو معروف طریقے سے ان کے مال میں سے کھا سکتا ہے۔
۷۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾

لغات القرآن: [وَابْتَلُوا : اور آزماتے رہو] [الْيَتٰمٰى : يتيم (جمع)] [حَتّٰى : يہانتک کہ] [اِذَا : جب] [بَلَغُوا : وه پہنچیں] [النِّكَاحَ : نكاح] [فَاِنْ : پھر اگر] [اٰنَسْتُمْ : تم پاؤ] [مِّنْهُمْ : ان میں] [رُشْدًا : صلاحیت] [فَادْفَعُوْۤا : تو حوالے کردو] [اِلَيْهِمْ : ان کے] [اَمْوَالَهُمْ : ان کے مال] [وَلَا : اور نہ] [تَاْكُلُوْهَاۤ : وه کھاؤ] [اِسْرَافًا : ضرورت سے زیادہ] [وَّبِدَارًا : اور جلدی جلدی] [اَنْ : کہ] [يَّكْبَرُوْا : کہ وه بڑے ہوجائینگے] [وَمَنْ : اور جو] [كَانَ : ہو] [غَنِيًّا : غنی] [فَلْيَسْتَعْفِفْ : بچتا رہے] [وَمَنْ : اور جو] [كَانَ :

ہو] [فَقِيْرًا : حاجت مند] [فَلْيَاْكُلْ : تو کھائے] [بِالْمَعْرُوْفِ : دستور کے مطابق] [فَاِذَا : پھر جب] [دَفَعْتُمْ : حوالے کرو] [اِلَيْهِمْ : ان کے] [اَمْوَالَهُمْ : ان کے مال] [فَاَشْهِدُوْا : تو گواہ کرلو] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [وَكَفٰى : اور کافی] [بِاللّٰهِ : اللہ] [حَسِيْبًا : حساب لینے والا]

ترجمہ : اور یتیموں کی (تربیۃً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اور حسن تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو، اور ان کے مال فضول خرچی اور جلد بازی میں (اس اندیشے سے) نہ کھا ڈالو کہ وہ بڑے ہو (کر واپس لے) جائیں گے، اور جو کوئی خوشحال ہو وہ (مال یتیم سے) بالکل بچا رہے اور جو (خود) نادار ہو اسے (صرف) مناسب حد تک کھانا چاہیے، اور جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنا لیا کرو، اور حساب لینے والا اللہ ہی کافی ہے

تفسیر و تشریح:

سابقہ آیت میں حکم فرمایا کہ یتیموں کے مال انھیں واپس کر دو۔ اس آیت میں مال کی واپسی کا وقت اور اس کی شرائط کا ذکر ہے۔ جب یہ دو چیزیں بلوغ اور رشد ان میں پائی جائیں تو ان کے اموال ان کے حوالہ کر دو۔ رشد سے مراد مال انتظام اور کاروبار کی سوجھ بوجھ ہے۔ یتیموں کی صلاحیت اور قابلیت کو آزمانے کا ایک تو یہ طریقہ ہے کہ ابتدا میں انھیں ان کے مال کی قلیل سی مقدار دے دی جائے۔ اگر اس میں تصرف سے ان کی ہونہاری کے آثار نمایاں ہوں تو سارا مال ان کے سپرد کر دو۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان سے وقتاً فوقتاً کاروبار اور نظم و نسق کے سلسلہ میں مشورہ طلب کیا جائے اور ان کی رائے میں سنجیدگی اور عقلمندی پائی جائے تو ان کی چیز ان کے حوالہ کر دو۔ کورٹ آف وارڈز (Court of Wards) کا قانون انھیں آیات سے ماخوذ ہے۔

ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام اگرچہ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ناجائز استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر کوئی شخص اپنی دولت کو یوں خرچ کرنا شروع کر دے جس سے اس کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور قوم کا نظام اخلاق اس کی بے راہ روی سے داغدار ہو رہا ہو تو حکومت کو حق پہنچتا ہے بلکہ حکومت پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس مطلق العنانی کو مقید کر دے۔

یتیم کا سرپرست جو اس کی تربیت اور اس کے مال کا نظم و نسق کرتا ہے کیا وہ کسی اجرت کا مستحق ہے؟ اس کے متعلق بتایا کہ سرپرست اگر غنی ہے تو اسے یتیم کے مال سے کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہیے اور یہ سب خدمت حسبۃً للہ کرنی چاہیے اور اگر وہ تنگدست ہے پھر اسے اپنی جائز ضروریات (کھانا، کپڑا وغیرہ) مناسب طریق سے پوری کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اکثر علما نے بطور احتیاط یہ حکم دیا ہے کہ اس حالت میں بھی قرضہ حسنہ کی نیت سے لے اور یہ ارادہ کرے کہ جب مولیٰ نے اسے خوشحال کیا تو وہ یہ قرض ادا کر دے گا۔ حضرت فاروق اعظم (رض) کا یہی مسلک تھا۔ بالمعروف کا یہ معنی ہے کہ اگر اس خرچ کو کسی غیر جانبدار آدمی کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اسے ناجائز قرار نہ دے۔

ایک واضح ارشاد فرمایا کہ جب مال یتیم کو واپس کرنے لگو تو چپکے چی کے پوشیدہ طور پر واپس نہ کرو بلکہ گواہوں کی موجودگی میں ایک ایک چیز انھیں لوٹا دو۔ اس طرح کسی قسم کی غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہو گی اور آئندہ کسی جھگڑے کا خدشہ بھی ختم ہو جائے گا۔

آخر میں تنبیہ فرما دی کہ تم لوگوں کی آنکھوں میں خاک ڈال سکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ سے تمہارا کوئی فعل پوشیدہ نہیں۔ اگر تم نے ان کے مال میں خیانت کی تو یاد رکھو اس کے حضور پائی پائی کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

یہاں یہ بات یاد رہے:

لڑکے اور لڑکی کی بلوغت کا معیار

لڑکے کے بلوغ کی علامت احتلام اور انزال ہے اور لڑکی کے بلوغ کی علامت احتلام ،حیض اور حمل ہے۔اگران دونوں میں ان میں سے کوئی علامت نہ پائی جائے توان دونوں کو پندرہ سال کی عمر میں بالغ قرار دیا جائے گا اسی پر فتوی ہے۔(اس سے یہ معلوم ہوا کہ زیر ناف بالوں کے ظہور کا بلوغ میں اعتبار نہیں ہے ،پندرہ سال کی عمر ،امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے اور ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی مذہب ہے ،اور امام اعظم کے نزدیک لڑکے کے لیے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لیے سترہ سال بلوغت کا معیار ہے جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی عمر جنگ احد میں چودہ سال تھی وہ جہاد کے لیے آئے توآپ نے قبول نہیں کیا اور ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں جنگ خندق میں پیش ہوئے توآپ نے قبول فرمالیا۔شامی) اور لڑکے کی بلوغ کے لیے کم از کم عمر بارہ سال ہے اور لڑکی کی نوسال عمر ہے۔اگر وہ اس عمر میں بلوغ کا دعوی کریں اور مشاہدہ ان کے دعوی کی تکذیب نہ کرے توان کے دعوی کو مان لیا جائے گا۔(در مختار مع ردالمختار ج ۵ ص ۹۷)

یتیم کے مال کے بارے فقہاء

علامہ ابو بکر جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ نے بیان کیا ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک یتیم کے ولی کے لیے یتیم کا مال کھانا جائز نہیں ہے۔بطور قرض نہ بطور تبرع۔نیز انھوں نے لکھا ہے کہ یتیم کے ولی کو قاضی اور عامل پر قیاس نہیں کیا کھانا جائز نہیں ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ وصی اور ولی بغیر کسی شرط کے بطریق تبرع اور احسان یتیم کے مال کی دیکھ بھال کرتا ہے اس لیے اس کی اجرت واجب نہیں ہے اور اس کو یتیم کے مال سے لینا جائز نہیں ہے بطور قرض نہ بطور غیر قرض۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ،۶۸ مطبوعہ سہیل اکیڈمی ،لاہور ،۱۴۰۰ھ)

فوائد

1۔پہچان اس طرح کہ انھیں کچھ پیسے خرچ کرنے کو دو کچھ سودا سلف ان سے منگواؤتا کہ پتہ لگے کہ ان میں سمجھ سوچ پیدا ہوئی کہ نہیں اور آئندہ مال کو سنبھال سکیں گے یا نہیں۔معلوم ہوا کہ مال کمانا کمال نہیں مال خرچ کرنا کمال ہے، کمانا سب جانتے ہیں۔خرچ کرنا کوئی کوئی جانتا ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کے ساتھ دنیا بھی بچوں کو سکھانا ضروری ہے۔

2۔اس آیت میں صاحبین کی دلیل ہے کہ اگر بچہ ہوکر بھی مال نہ سنبھال سکے تو اس کا مال کبھی اس کے سپرد نہ کیا جائے امام صاحب کے نزدیک پچیس سال کی عمر میں سپرد کردیا جائے، اٹھارہ برس بلوغ کی انتہائی مدت ہے، سات سال اور انتظار دیکھو۔(روح) دلائل کتب فقہ میں مذکور ہیں، بہر حال اس آیت سے معلوم ہوا کہ مال کی حفاظت بہت اہم ہے کہ اس پر دین و دنیا کے بہت سے کام موقوف ہیں۔

3۔بعض اولیاء یتیم کی شادی ان کے مال سے بہت دھوم سے کرتے ہیں، جن میں بہت ناجائز خرچ کر ڈالتے ہیں وہ ان یتیموں کے دشمن ہیں اور اسی آیت میں داخل ہیں اور جو غریب اولیاء یتیم کے مال سے حق پرورش حق سے زیادہ لیں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

4۔ اس سے اشارۃ معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت دینی خدمت پر بھی اجرت لینا جائز ہے، دیکھو یتیم کا پالنا دینی کام ہے مگر فقیر وارث کو حق ہے کہ یتیم کے مال سے اس کی اجرت لے اسی لیے خلفائے راشدین نے خلافت پر اجری لی۔ سوا عثمان غنی کے، للذا امامت، دینی مدرسے پر اجرت لے سکتے ہیں۔

5۔ یہ امر استحبابی ہے، ہر مالی معاملہ جس میں جھگڑے کا اندیشہ ہو اس میں گواہ بنانا بہت اچھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر امر وجوب کے لیے نہیں ہوتا، کبھی وجوب کے علاوہ اور معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیت مبارکہ :

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۷﴾

لغات القرآن: [لِلرِّجَالِ : مردوں کے لیے] [نَصِيْبٌ: حصہ] [مِّمَّا : اس سے جو] [تَرَكَ : چھوڑا] [الْوَالِدٰنِ : ماں باپ] [وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور قرابت دار] [وَلِلنِّسَآءِ : اور عورتوں کے لیے] [نَصِيْبٌ: حصہ] [مِّمَّا : اس سے جو] [تَرَكَ : چھوڑا] [الْوَالِدٰنِ : ماں باپ] [وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور قرابت دار] [مِمَّا : اس میں سے] [قَلَّ : تھوڑا] [مِنْهُ : اس سے] [اَوْ كَثُرَ : یا زیادہ] [نَصِيْبًا : حصہ] [مَّفْرُوْضًا : مقرر کیا ہوا]

ترجمہ: مردوں کے لیے اس (مال) میں سے حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے (بھی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں سے حصہ ہے۔ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ (اللہ کا) مقرر کردہ حصہ ہے

تفسیر و تشریح:

پہلے عورتوں اور یتیموں کے مالی اور سماجی حقوق کے تحفظ کا حکم دیا۔ اب قانون وراثت کے ذریعے سب کے مالی حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔
قبل از اسلام اور آج بھی دنیا میں تقسیم وراثت کے بارے میں چار قانون نافذ العمل ہیں۔

۱۔ عورتوں کو مالی حقوق سے یکسر محروم رکھنا۔

۲۔ خاوند فوت ہونے کے بعد بیوہ اور بیٹیوں کو متروکہ جائیداد سے خارج کر دینا۔

۳۔ باپ کے فوت ہونے کے بعد صرف بڑے بیٹے کو وراثت کا حقدار ٹھہرانا۔

۴۔ باپ کی وراثت میں صرف بیٹوں کا ہی حق دار قرار پانا۔
عرب میں میراث کی تقسیم کا یہ قاعدہ تھا کہ عورتیں اور چھوٹے بچے اپنے والے باپ اور خاوند وغیرہ کی وراثت سے یکسر محروم کر دیئے جاتے تھے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی کہ جو میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کے قابل نہیں وہ میراث پانے کا بھی حقدار نہیں۔ بھارت میں بھی عورت وارث شمار نہیں کی جاتی تھی۔ اور یورپ میں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔ صرف بڑا لڑکا وارث بنتا دوسرے لڑکے بھی محروم رہ جاتے۔ یہ حالت تھی جب قرآن کی یہ انقلاب آفرین آیت نازل ہوئی۔ جس نے عورتوں کو مردوں کی طرح وارث قرار دیا۔ بڑے لڑکے کی تخصیص ختم کر کے سب لڑکوں کو اپنے متوفی باپ کی وراثت میں برابر کا شریک بنایا۔ چھوٹی اور بڑی تمام جائیدادوں میں ورثا کو حسب حصہ حقدار تسلیم کیا۔ نصیبا مفروضا کے الفاظ سے واضح کر دیا کہ یہ حصے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں۔ اس میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں۔

اسلام نے اس استحصال کو یکسر ختم کر کے حکم دیا کہ مرد ہو یا عورت ٗ چھوٹا ہو یا بڑا جو اس کے والدین اور اقرباء چھوڑ جائیں اس میں شریعت کے مقرر کردہ قریبی رشتہ داروں کا حصہ ہے۔ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ حصہ ہر کسی کو ملنا چاہیے۔ اخلاقی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے یہ بھی حکم دیا کہ تقسیم کے وقت غریب رشتہ دار ٗ یتیم اور مسکین اگر موجود ہوں وہ جائیداد میں حصہ دار تو نہیں لیکن انھیں کھانے پینے کے لیے کچھ ضرور دینا چاہیے۔
ان کی حاضری کو گراں سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ منفی رویہ اختیار کرنے کے بجائے ان کے ساتھ مروّت اور اچھے انداز میں گفتگو کی جائے۔
اس کے بعد فوت ہونے والوں کو تلقین فرمائی کہ وہ مرنے کے قریب اس طرح شاہ خرچ نہ بنیں جس سے ان کے چھوٹے چھوٹے بچے مالی طور پر کنگال ہو جانے کی وجہ سے دوسروں کے دست نگر ہو جائیں۔
کچھ مفسّرین نے یہ حکم میّت کے لواحقین پر لاگو کیا ہے کہ انھیں یتیموں کے ساتھ تلخ رویّہ اور ان کے مال میں زیادتی کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے بچوں کو اس حالت میں چھوڑ جائیں تو ان کے کیا احساسات ہوں گے ؟ لہٰذا یتیموں کے ساتھ گفتگو نہایت نرم اور محبت آمیز لہجہ میں کرنا چاہیے۔ وراثت کا مسئلہ شروع کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر یتیموں کے بارے میں حکم دیا ہے کہ ان کا مال ظلم کے ساتھ نہ کھاؤ۔ یہ کھلم کھلا پیٹ میں آگ کے انگارے ڈالنے کے مترادف ہے۔ یتیم کا مال کھانے والے عنقریب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ وہاں ان کے آگے پیچھے اور اوپر نیچے آگ ہی آگ ہو گی۔
حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) فتح مکہ کے موقع پر سخت بیمار ہوئے۔ انھوں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی کہ میرے پاس بہت سا مال ہے ایک بیٹی کے علاوہ کوئی وارث نہیں۔ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے انھیں اجازت عنایت نہ فرمائی۔ پھر انھوں نے نصف کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک تہائی کی اجازت مانگی تو آپ نے یہ فرما کر اجازت دی کہ یہ بھی زیادہ ہے۔ اپنی اولاد کو مال دار چھوڑ نا ان کو محتاج چھوڑنے سے کہیں بہتر ہے۔ [رواہ البخاری : کتاب الفرائض، میراث البنات]

شان نزول

حضرت اوس بن ثابت (رض) کا انتقال ہو گیا وہب ہت سا مال چھوڑ گئے ان کی بیوی ام کتمہ اور تین لڑکیاں تھیں۔ چچا کے دو لڑکے سوید اور عرفجہ نے ان کے تمام مال پر قبضہ کر لیا حضرت اوس کی بیوی اور بچیوں کو کچھ نہ دیا اس زمانہ میں عورتوں کو میراث نہیں دی جاتی تھیں ان کا کہنا تھا کہ جو میراث پائے وہ جنت میں جائے۔ حضرت اوس کی بیوی نے سوید اور عرفجہ سے کہا کہ اگر تم ان یتیم بچیوں کا مال لیتے ہو تو ان کو اپنے عقد میں لے لیا انھوں نے انکار کر دیا، کیونکہ یہ بچیاں خوبصورت نہ تھیں۔

حضرت ام سلمہ اوس (رض) کی بیوی دربار رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر آئیں اور تمام واقعہ عرض کیا اور فریاد کی ان بچیوں کی پرورش کیوں کر کروں۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سوید اور عرفجہ کو طلب فرمایا اور اس ظلم کی وجہ دریافت کی انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں عورتوں اور نابالغوں کی میراث نہیں دیا جاتا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور وہ مال محفوظ کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ پر یوصیکم اللہ فی اولادکم کا حکم ہوا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت اوضی (رض) کے مال کی اس طرح تقسیم فرمائی۔

حضرت اوس کی بیوی کو آٹھواں حصہ اور بیٹیوں کو دو تہائی باقی جو بچا وہ سوید اور عرفجہ کو تقسیم کیا۔ (کبیر)

زمانہ جاہلیت میں کفار عورتوں اور بچوں کو ورثہ نہ دیتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ عزوجل نے ان کی رسم کو غلط قرار دیا۔ پھر مزید مراعات بطور امر استحبابیہ، کہ اگر تقسیم ترکہ کے موقع پر برادری کا غریب یتیم ایسا آجائے جس کا حصہ متروکہ میں نہ ہو تو اسے بھی کچھ دے دیا جائے تو یہ مستحب ہے۔

اور قولوا لھم قولاً معروفا۔ فرما کر طرز تکلم مہذب بنایا اور اخلاق مسلمین کو حسن کیا۔ آیت بالا میں عذر جمیل، وعدہ حسنہ، دعائے خیر کی بھی تعلیم دی گئی اور میت کے ترکہ سے غیر وارث رشتہ والے اور یتیم مسکین کو بطور صدقہ دینے اور قول معروف سے تکلم کرنے کا حکم امر تادیبی کی شکل میں دیا گیا۔

چنانچہ صحابہ کرام علیہم رضوان میں اس پر عمل تھا۔ محمد بن سرین سے مروی ہے کہ ان کے والد نے تقسیم میراث کے وقت ایک بکری ذبح کرا کے کھانا پکایا اور قریبی بعیدی رشتہ والوں کو کھلایا اور مساکین اور یتیموں کو بھی دیا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ابن سیرین (رح) نے یہی مضمون عبیدہ سلمانی (رح) سے بھی روایت کیا اس میں یہ اور ہے کہ آپ نے فرمایا اگر یہ آیت نہ آئی ہوتی تو یہ صدقہ میں اپنے مال سے کرتا۔ چنانچہ تیجہ جسے سوم کہتے ہیں اور عام مسلمین میں مروج ہے اور بھی اس آیت کریمہ کے اتباع میں ہے کہ اس تیجہ میں بھی رشتہ دار، یتامی، مساکین ہی شرکت کرتے ہیں۔ کلمہ کا ختم دیتے ہیں تلاوت قرآن مجید کر کے دعا قول معروف کی تعمیل میں کی جاتی ہے۔

اس کے بعد وصی اور یتیم کے ولی اور وہ لوگ جو قریب موت مرنے والے کے پاس موجود ہوں انھیں ہدایت کی کہ اللہ عزوجل سے ڈرتے رہو۔ تم پر بھی ایسا وقت آنا ہے۔ پھر یتیموں کا مال کھا جانے کے خوگر لوگوں کو تو بیخاً فرمایا کہ وہ مال نہیں کھاتے بلکہ خالص آل سے اپنے شکم پر کرتے ہیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ یتیموں کا مال کھانے والے بروز قیامت اسی طرح اٹھائے جائیں گے کہ ان کی قبروں سے ان کے منہ اور کانوں سے دھواں نکلتا ہوگا۔ لوگ انھیں جان لیں گے کہ یہ یتیم کا مال کھانے والے ہیں۔

مسائل

۱۔ مردوں کے لیے ان کے والدین اور اقرباء کے ترکہ میں حصہ ہے۔

۲۔ عورتیں بھی اپنے والدین اور اقرباء کی وراثت میں حصے دار ہیں۔

۳۔ وراثت تقسیم کرتے وقت یتیموں اور مسکینوں کو کچھ نہ کچھ کھلانا پلانا چاہیے۔

۴۔ وراثت کے بارے میں واضح ہدایت دینا چاہیے۔

۵۔ یتیموں کا مال زیادتی کے ساتھ کھانے والے آگ کے انگارے نگلتے ہیں۔

۶۔ یتیموں کا مال کھانے والے جہنم میں داخل ہوں گے۔

آیت مبارکہ:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

لغات القرآن: [وَإِذَا : اور جب] [حَضَرَ : حاضر ہوں] [الْقِسْمَةَ : تقسیم کے وقت] [أُولُوا الْقُرْبٰى : رشتہ دار] [وَالْيَتٰمٰى: اور يتيم] [وَالْمَسٰكِيْنُ : اور مسكين] [فَارْزُقُوْهُمْ : تو انہیں کھلادو (دیدو)] [مِّنْهُ : اس سے] [وَقُوْلُوْا : اور کہو] [لَهُمْ : ان سے] [قَوْلًا : بات] [مَّعْرُوْفًا : اچھی]

ترجمہ:

اور اگر تقسیم (وراثت) کے موقع پر (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے کچھ انھیں بھی دے دو اور ان سے نیک بات کہو

تفسیر و تشریح:

قانون میراث کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ایک اخلاقی ضابطہ کا ذکر بھی کردیا کہ متروکہ جائیداد کے وارث تو وہی ہیں جن کا ذکر تفصیلاً آگے آرہاہے۔ لیکن اگر تقسیم کے وقت غیر وارث رشتہ دار، محلّہ کے یتیم بچے، بستی کے غریب لوگ جمع ہو جائیں تو ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو اور ترش لب و لہجہ میں ان سے گفتگو نہ کرو جس سے ان کی دل شکنی ہو۔

وارث اللہ کی طرف سے طے ہیں

وراثت میں ہر حصہ دار کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے اور وارث بھی اللہ کی جانب سے طے فرما دیئے گئے ہیں۔ اب نہ کوئی نیا وارث بن سکتا ہے اور نہ کسی کے حصے میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ بات بہر حال ممکن ہے کہ جب مال وراثت تقسیم کیا جانے لگے تو جن رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کا حق اس مال وراثت میں نہیں وہ بے خبری کے باعث یا تنگدستی کے سبب اس تقسیم کے وقت پہنچ جائیں۔ لاریب ان کے آجانے سے وراثت کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور وارث اپنا اپنا حصہ وصول کرنے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اگرچہ مال وراثت میں حصہ نہیں رکھتے لیکن وہ قرابت داری کا تعلق تو رکھتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان سے زیادہ قریب قرابت داری کا تعلق رکھنے والوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ وراثت سے محروم رہ گئے۔ لیکن اپنی قرابت داری کے باعث اس بات کے مستحق تو ضرور ہیں کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ اسی طرح جو یتیم بچے اور مسکین لوگ ضرورت کے تحت کچھ امیدیں لے کر آگئے ہیں ان کی دل شکنی کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں اس لیے اس آیت کریمہ میں ایک طرح سے سفارش کی جارہی ہے کہ جن قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کا تمہارے مال وراثت میں کوئی حق نہیں لیکن وہ اپنی نسبتوں کے باعث کچھ امیدیں لے کر آگئے ہیں تو دل بڑا کر کے ان کو اپنے اپنے حصے سے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کیجیے۔ پروردگار نے بغیر کسی مشقت اور محنت کے تمہیں مال وراثت کی صورت میں بہت کچھ عطا فرمایا ہے تو تم ان ضرورت مندوں کو خالی ہاتھ مت لوٹاؤ، تھوڑا تھوڑا کر کے بھی دو گے تو ہو سکتا ہے ان کی دلجوئی کا سامان ہو سکے۔ لیکن اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ انھیں بھی پورا حصہ ملنا چاہیے تو تم انھیں مناسب طریقے اور شیریں کلامی سے سمجھانے کی کوشش کرو، کوئی سخت جملہ کہہ کر ان کی دل آزاری مت کرو۔ کس قدر حکیمانہ قرآنی نظام ہے کہ ایک طرف میراث کے حوالے سے ایسے احکام دیئے جارہے ہیں جو سراسر عادلانہ ہیں لیکن ساتھ ہی ان ضرورت مندوں کی دل جوئی کا بھی حکم دیا جارہا ہے جو اگرچہ وراثت میں اپنا حصہ تو نہیں رکھتے لیکن ان کی حالت کی رعائیت بہر حال ضروری ہے۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو کچھ بھی دیا جائے وہ مجموعی مال میں سے نہ دیا جائے کیونکہ وارثوں میں تو نابالغ وارث بھی شامل ہوں گے۔ وہ جب تک بالغ نہ ہوں، اس وقت تک ان کے حصے میں سے کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے جو بالغ ورثا ہوں، وہ اپنے اپنے حصے میں سے جو دینا چاہیں دل کھول کر دیں، اللہ ان کو جزا دے گا۔

اس آیت میں غیر وارثوں کو وراثت کے مال میں سے کچھ دینے کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ دینا مستحب ہے۔ امام محمد بن سیرین (رح) سے مروی ہے حضرت عبیدہ سلمانی (رح) نے میراث تقسیم کی تو اسی آیت پر عمل کرتے ہوئے ایک بکری ذبح کروا کر کھانا پکوایا پھر یتیموں میں تقسیم کر دیا اور کہا اگر یہ آیت نہ ہوتی تو میں یہ سب خرچہ اپنے مال سے کرتا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۸، ۳۴۸/۱)

تفسیر قرطبیؒ میں یوں ہے کہ "یہ عمل عبیدہ سلمانی اور امام محمد بن سیرین (رح) دونوں نے کیا۔

(قرطبیؒ، النساء، تحت الآیۃ: ۸، ۳۶/۳، الجزء الخامس)

در منثور میں ایک روایت یہ ہے کہ "حضرت عبد الرحمٰن بن ابو بکر (رض) نے جب اپنے والد کی میراث تقسیم کی تو اسی مال سے ایک بکری ذبح کروا کر کھانا پکوایا، جب یہ بات حضرت عائشہ صدیقہ (رض) کی بارگاہ میں عرض کی گئی تو انھوں نے فرمایا: عبد الرحمٰن (رض) نے قرآن پر عمل کیا۔ (در منثور، النساء، تحت الآیۃ: ۸، ۴۴۰/۲)

اس مستحب حکم پر یوں بھی عمل ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات کوئی بیٹا یتیم بچے چھوڑ کر فوت ہو جاتا ہے اور اس کے بعد باپ کا انتقال ہوتا ہے تو وہ یتیم بچے چونکہ پوتے بنتے ہیں اور چچا یعنی فوت ہونے والے کا دوسرا بیٹا موجود ہونے کی وجہ سے یہ پوتے دادا کی میراث سے محروم ہوتے ہیں تو دادا کو چاہیے کہ ایسے پوتوں کو وصیت کر کے مال کا مستحق بنادے اور اگر دادا نے ایسا نہ کیا ہو تو وارثوں کو چاہیے کہ اوپر والے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے حصہ میں سے اسے کچھ دے دیں۔ اس حکم پر عمل کرنے میں مسلمانوں میں بہت سستی پائی جاتی ہے بلکہ اس حکم کا علم ہی نہیں ہوتا۔ البتہ یہ یاد رہے کہ نابالغ اور غیر موجود وارث کے حصہ میں سے دینے کی اجازت نہیں۔

جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کے ترکہ کے ساتھ چار حقوق متعلق ہوئے اول یہ کہ میانہ روی کے ساتھ اس کی تجہیز اور تکفین کی جائے ثانی یہ کہ اس کے ترکہ سے اس کا قرض ادا کیا جائے اگر قرض ہو۔ اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو وہ بھی میت پر قرض ہے اور تقسیم ترکہ سے پہلے ادا کیا جائے گا۔ ثالث یہ کہ اس کے ثلث (ایک تہائی) مال سے اس کی وصیت پوری کی جائے اگر اس نے وصیت کی ہو۔ رابع یہ کہ اس کے باقی ماندہ مال کو اس کی ورثاء میں قرآن ' حدیث اور اجماع کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

تقسیم میں اصحاب الفرائض سے ابتداء کی جائے۔ اصحاب الفرائض وہ ہیں جن کے حصص قرآن مجید میں مقرر کر دیئے گئے ہیں مثلاً ایک بیٹی کو نصف مال ملے گا دو یا دو سے زائد بیٹیوں کو دو ثلث (دو تہائی) اور ان کے لینے والے بارہ ہیں۔ چار مرد ہیں: باپ ' جد صحیح (دادا اور نانا ' نانا ' جد فاسد ہے) اخیافی بھائی (ماں کی طرف سے) اور خاوند ' اور آٹھ عورتیں ہیں: بیوی بیٹی ' پوتی ' عینی بہن (سگی بہن) اخیافی بہن ' علاتی بہن (باپ کی طرف سے) ماں اور جدہ صحیحہ (نانا کی ماں جدہ فاسدہ ہے) ان کے حصوں کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

اصحاب الفرائض کو ان کا حصہ دینے کے بعد اگر ترکہ بچ رہے ' یا اصحاب الفرائض نہ ہوں تو پھر وہ تمام ترکہ عصبات کو دیا جاتا ہے۔ باپ کی طرف سے قرابت داروں کو عصبات کہا جاتا ہے عصبات بنفسہ چار ہیں: بیٹا پوتا ' باپ یا دادا ' بھائی اور چچا ' عصبات میں جو قریب ہو اس کو ملے گا اور بعید محروم ہو گا۔ اگر بیٹے کے ساتھ بیٹیاں بھی ہوں تو وہ عصبات بالغیر ہیں ' اور اگر بیٹیوں کے ساتھ بہنیں بھی ہوں تو وہ عصبات مع الغیر ہیں۔ اگر عصبات نہ ہوں تو پھر تمام مال ذوی الارحام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ' ذوی الارحام وہ ہیں جو ماں کی طرف سے میت کے رشتہ دار ہوں ان کے چار درجات ہیں پہلا درجہ ہے بیٹی کی اولاد اور پوتی کی اولاد۔ دوسرا درجہ ہے: جد فاسد اور جدات فاسدہ یعنی نانا اور نانا کی ماں ' اور تیسرا درجہ ہے۔ بہنوں کی اولاد اور عینی اور علاتی بھائیوں کی بیٹیاں اور اخیافی بھائی کی اولاد ' اور چوتھا درجہ ہے پھوپھیاں ' اخیافی چچا اور ماموں اور خالہ ان میں درجہ بدرجہ ترتیب ہے اور اقرب کے مقابلہ میں ابعد محروم ہو گا۔

اگر ذوی الارحام نہ ہوں تو پھر میت کا ترکہ اس شخص کو دیا جائے گا جس کے لیے میت نے کل مال کی وصیت کی ہو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر میت کا ترکہ بیت المال یعنی سرکاری خزانہ میں دال کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہم نے ترکہ کی تقسیم میں لونڈی ' غلام ' مولی الموالات اور مقرلہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اب ان کا رواج نہیں ہے ہم نے اکثر پیش آمدہ صورتیں بیان کی ہیں جو حضرات پوری تفصیل جاننا چاہیں وہ سراجی اور شریفیہ وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

رشتہ داروں اور ضرورت مندوں کو دینا احسان نہیں ان کا حق پہنچانا ہے

اب اس آیت کی تفسیر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فوت ہو گیا اور اس کا ایک بیٹا ' دو بیٹیاں اور اس کا ایک چچا اور بھانجا ہو تو اس صورت میں بیٹا عصبہ بنفسہ ہے اور بیٹیاں عصبہ بالغیر ہیں۔ چچا بھی عصبہ ہے مگر بیٹے کی بہ نسبت بعید ہے اور بھانجا ذوی الارحام کے تیسرے درجہ میں ہے۔ اس صورت میں کل ترکہ کے چار حصے کئے جائیں گے دو حصہ ایک بیٹے کو اور ایک ایک حصہ دو بیٹیوں کو ملے گا۔ چچا عصبہ بعید ہونے کی وجہ سے محروم ہو گا اور بھانجا عصبہ کی موجودگی میں ذوالارحام ہونے کی وجہ سے محروم ہو گا تاہم چچا اور بھانجہ کو ورثاء انسانی ہمدردی کے تحت اپنی طرف سے تبرعا کچھ دے دیں تو یہ اس آیت پر عمل ہو گا اسی طرح اگر کوئی اور مسکین ہو تو اس کو بھی دے دیا جائے اور ان سے نرم اور ملائم گفتگو کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(آیت) "وات ذالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا"۔ (بنواسرائیل : ٢٦)

ترجمہ : اور رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرو اور مسکینوں اور مسافروں کو اور فضول خرچ نہ کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں کو کچھ دے رہا ہے تو ان پر احسان نہیں کر رہا بلکہ ان کا حق ان تک پہنچا رہا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

(آیت) "وفی اموالھم حق للسآئل والمحروم"۔ (الذاریات : ١٩)

ترجمہ : اور ان کے اموال میں سوال کرنے والے اور محروم کا حق ہے۔

آیت مبارکہ:

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

لغات القرآن: [وَلْيَخْشَ : اور چاہیے کہ ڈریں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ] [لَوْ تَرَكُوْا : اگر چھوڑ جائیں] [مِنْ : سے] [خَلْفِهِمْ : اپنے پیچھے] [ذُرِّيَّةً : اولاد] [ضِعٰفًا : ناتواں] [خَافُوْا : انہیں فکر ہو] [عَلَيْهِمْ : ان کا] [فَلْيَتَّقُوا : پس چاہیے کہ وہ ڈریں] [اللّٰهَ : اللہ] [وَلْيَقُوْلُوْا : اور چاہیے کہ کہیں] [قَوْلًا : بات] [سَدِيْدًا : سیدھی]

ترجمہ : اور (یتیموں سے معاملہ کرنے والے) لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑ جاتے تو (مرتے وقت) ان بچوں کے حال پر (کتنے) خوفزدہ (اور فکر مند) ہوتے، سو انھیں (یتیموں کے بارے میں) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور (ان سے) سیدھی بات کہنی چاہیے

تفسیر و تشریح:

کتنا موثر اور دلنشیں انداز نصیحت ہے!

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کیلئے ایک موثر انداز تعلیم و تبلیغ: پس جو بھلائی اور خیر خواہی تم لوگ اپنے ان بے سہارا یتیم بچوں کیلئے چاہو، اسی کا معاملہ تم دوسروں کے ان یتیم بچوں کے ساتھ بھی کرو، جو تمہاری کفالت اور پرورش میں ہوں، جس طرح تم چاہتے ہو کہ تمہارے پیچھے رہ جانے والے بچوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ ہو، اس طرح تم ان کے بارے میں بھی ایسا ہی چاہو کہ جس طرح آج یہ بچے یتیم اور بے سہارا ہیں اسی طرح کل تمہارے بچے بھی ہو سکتے ہیں، سو جو لوگ یہ بات اپنے پیش نظر رکھیں گے وہ دوسروں کے یتیم بچوں کا کبھی کوئی حق نہیں مار سکتے، اور ان کے ساتھ کبھی کسی زیادتی کا ارتکاب نہیں کر سکتے، بہر کیف اس ارشاد سے یہ ہدایت فرمائی گئی کہ آدمی کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جس طرح دوسروں کے بچے یتیم ہوتے ہیں، اس کے بچے بھی یتیم ہو سکتے تھے، اور ہو سکتے ہیں، تو انسان سوچے کہ ایسی صورت میں اس کو اپنے بچوں کے بارے میں کیا کچھ اندیشے ہو سکتے تھے اور ہو سکتے ہیں، سو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اس کو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ سو یتیموں کے ساتھ حسن سلوک ایک اہم مطلب ہے۔ و باللہ التوفیق۔

قریب المرگ بیمار کے پاس اوپر والے لوگ ایسی ایسی صلاحیں دیا کرتے تھے کہ وہ حق دار وارثوں کا حق مار کر غیروں کے نام پر تیسرے حصہ سے زیادہ نام و نمود کے لیے وصیت کرے۔ ان کی ممانعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دن فرمایا کہ قیامت کے دن ایک گروہ خلقت کا قبروں سے اٹھے گا تو ان کے منہ، آنکھ، ناک اور کانوں سے آگ کے شعلے نکلتے ہوں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ حضرت وہ کون لوگ ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: "یتیموں کا مال کھانے والے" اور وصیت میں بے احتیاطی کی ممانعت فرمائی۔ آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔

یتیموں کے مال کھانے والوں کو تہدید

جو لوگ یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یا زبردستی اور ظلم سے ان کے مال پر قبضہ کر لیتے ہیں وہ ممکن ہے اس کو مالی فتوحات میں شمار کرتے ہوں اور اسے اپنے لیے بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہوں لیکن انھیں اندازہ نہیں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا بھی ہے۔ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ یتیموں کا مال چاہے کسی صورت میں بھی ہو حقیقت میں جہنم کے انگارے ہیں۔ جو قیامت کے دن اپنی اصل شکل میں بھڑک اٹھیں گے۔ اکثر اہل علم اسے مجاز اور کنایہ کہتے ہیں۔ لیکن بعض اہل تحقیق ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مجاز یا کنایہ نہیں بلکہ حقیقت ہے یہ الگ بات ہے کہ آج ہمیں وہ آگ دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن قیامت کے دن جب ہر چیز اپنی اصل شکل میں سامنے آجائے گی تو تب پتہ چلے گا کہ یہ آگ ہی تھی جو یتیموں کے مال کی صورت میں ہم نے ہتھیائی تھی۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ دیا سلائی کو جلنے سے پہلے آگ نہیں کہا جاتا لیکن اس کے آگ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ سنکھیے کو کھانے سے پہلے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ موت ہے۔ لیکن جس کی نگاہ اس کے اثر اور نتیجے پر ہے وہ یقین سے جانتا ہے کہ وہ موت ہی کا باعث ہے۔ آج

اگر کسی کمرے میں سوئی گیس بھر جائے تو بدبو سونگھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کمرے میں سوئی گیس بھر گیا ہے لیکن ایک شعلہ جلنے کی دیر ہے جب بھک سے آگ بھڑکے گی تب پتہ چلے گا کہ جسے ہم سوئی گیس کہہ رہے تھے وہ توآگ تھی۔ اسی طرح یتیموں کا مال بھی درحقیقت آگ ہی ہے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کے دن دیئے جانے والے عذاب کی ایسی ہی خبریں دی ہیں۔ جن میں اس تعبیر کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر کی آگ کی لپٹیں اس کے منہ ناک اور کانوں اور آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔ ایک اور حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ سے آگ بھڑک رہی ہو گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کون لوگ ہوں گے ؟ آپ نے فرمایا: تم نے قرآن کریم میں نہیں پڑھا اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا۔ الخ

یتیموں کو اپنی اولاد کی طرف سمجھا جائے۔

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں:

(۱) بعض لوگ مریض سے یہ کہتے ہیں کہ تمہاری اولاد تمہارے مرنے کے بعد نیکیاں نہیں کرے گی جن سے تم کو آخرت میں ثواب پہنچے تو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے دو یا صدقہ و خیرات کر دو ' یا کسی نیک کام میں صرف کردو ' یہ لوگ مرنے والے کو وصیت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کی اولاد کو ترکہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم بھی صاحب اولاد ہو تم یہ سوچو کہ اگر کوئی شخص تمہاری اولاد کو تمہارے ترکہ سے محروم کرنے کی کوشش کرتا تو تم پر کیا گزرتی ؟

(۲) حضرت ابن عباس (رض) کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں یتیم کے ولی سے یہ فرمایا ہے کہ وہ یتیم کی جان اور مال کے ساتھ انصاف اور احسان کریں اور یتیم کے مال کو جلدی جلدی ہڑپ کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ان کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اگر وہ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جائیں تو ان کے یتیم بچوں کا ولی ان کے ساتھ حسن سلوک کرے اس لیے وہ اپنے انجام سے ڈریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں اور ہمیشہ سچی اور صحیح بات کہیں۔ (جامع البیان ج ۴ ص ۱۸۳۔ ۱۸۱ 'ملخصا 'مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ' ۱۴۰۹ ھ)

فوائد

1۔ یعنی یتیموں کے ولی اور وصی جن کے ذمہ یتیموں کی پرورش ہے یہ سمجھ کر پرورش کریں کہ اگر ہمارے بچے یتیم رہ جائیں تو کوئی انھیں پرورش کرے تو وہ کیسی پرورش چاہتے ہیں۔ ایسی ہی پرورش وہ دوسرے کے یتیم کی کریں۔ یہ آیت کریمہ اخلاق کی بہترین تعلیم ہے، ہمیشہ دوسرے کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اپنے ساتھ چاہتے ہو، جو اپنے لیے پسند نہ کرو وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو۔

2۔ یعنی مرنے والے کے پاس بیٹھنے والے سیدھی بات کریں کہ اسے صدقہ اور اچھی وصیت کا مشورہ دیں اور اولاد کے لیے ترکہ چھوڑ جانے کے فضائل اسے بتائیں جان کنی کے وقت کلمہ طیبہ کی تلقین کریں، یتیموں سے سیدھی بات یہ ہے کہ یتیم کا ولی یا وصی اس سے اچھا برتاؤ کرے اچھی تعلیم دے کمانا سکھائے، غرضیکہ اس سے وہ معاملہ کرے جو اپنی اولاد سے کرتا ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾

لغات القرآن:

[اِنَّ : بیشک] [الَّذِیْنَ : جو لوگ] [یَاْكُلُوْنَ : کھاتے ہیں] [اَمْوَالَ : مال] [الْیَتٰمٰی: یتیموں] [ظُلْمًا : ظلم سے] [اِنَّمَا : اس کے سوا کچھ نہیں] [یَاْكُلُوْنَ : وہ بھر رہے ہیں] [فِيْ : میں] [بُطُوْنِهِمْ : اپنے پیٹ] [نَارًا : آگ] [وَسَیَصْلَوْنَ : اور عنقریب داخل ہوں گے] [سَعِیْرًا : آگ (دوزخ)]

ترجمہ : بیشک جو لوگ یتیموں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں نری آگ بھرتے ہیں، اور وہ جلد ہی دہکتی ہوئی آگ میں جا گریں گے

تفسیر و تشریح:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا : بیشک وہ لوگ جو ظلم کرتے ہوئے یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔} اس سے پہلی آیات میں یتیموں کا مال ناحق کھانے سے منع کیا گیا اور اس آیت میں یتیموں کا مال ناحق کھانے پر سخت وعید بیان کی گئی ہے اور یہ سب یتیموں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کیونکہ وہ انتہائی کمزور اور عاجز ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے مزید لطف و کرم کے حقدار تھے۔اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "وہ اپنے پیٹ میں بالکل آگ بھرتے ہیں "اس سے مراد یہ ہے کہ یتیموں کا مال ناحق کھانا گویا آگ کھانا ہے کیونکہ یہ مال کھانا جہنم کی آگ کے عذاب کا سبب ہے۔
(تفسیر کبیر، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰، ۳/۵۰۶)

یتیموں کا مال ناحق کھانے کی وعیدیں

احادیثِ مبارکہ میں بھی یتیموں کا مال ناحق کھانے پر کثیر وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے 3 وعیدیں درج ذیل ہیں۔
(1)۔۔ حضرت بریدہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن ایک قوم اپنی قبروں سے اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے مونہوں سے آگ نکل رہی ہو گی۔ عرض
کی گئی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، وہ کون لوگ ہوں گے؟ ارشاد فرمایا "کیا تم نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھا "اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ﴿۱۰﴾ "بیشک وہ لوگ جو ظلم کرتے ہوئے یتیموں کا

مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بالکل آگ بھرتے ہیں اور عنقریب یہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں جائیں گے۔ (کنزالعمال، کتاب البیوع، قسم الاقوال، ۹/۲، الجزء الرابع، الحدیث: ۹۲۷۹)

(2)۔۔ حضرت ابوسعید خدری (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "میں نے معراج کی رات ایسی قوم دیکھی جن کے ہونٹ اونٹوں کے ہونٹوں کی طرح تھے اور ان پر ایسے لوگ مقرر تھے جو ان کے ہونٹوں کو پکڑتے پھر ان کے مونہوں میں آگ کے پتھر ڈالتے جو ان کے پیچھے سے نکل جاتے۔ میں نے پوچھا: اے جبرائیل! عَلَیۡہِ السَّلَام، یہ کون لوگ ہیں؟ عرض کی: "یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے تھے۔ (تہذیب الآثار، مسند عبداللہ بن عباس، السفر الاول، ذکر من روی عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہ رائ، ۴۶۷/۲، الحدیث: ۷۲۵)

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "چار شخص ایسے ہیں جنہیں جنت میں داخل نہ کرنا اور اس کی نعمتیں نہ چکھانا اللہ تعالیٰ پر حق ہے۔ (1) شراب کا عادی۔ (2) سود کھانے والا۔ (3) ناحق یتیم کا مال کھانے والا۔ (4) والدین کا نافرمان۔

(مستدرک، کتاب البیوع، انّ اربی الربا عرض الرجل المسلم، ۳۳۸/۲، الحدیث: ۲۳۰۷)

یتیم کا مال کھانے سے کیا مراد ہے؟

یتیم کا مال ناحق کھانا کبیرہ گناہ اور سخت حرام ہے۔ قرآن پاک میں نہایت شدت کے ساتھ اس کے حرام ہونے کا بیان کیا گیا ہے۔ افسوس کہ لوگ اس میں بھی پروا نہیں کرتے۔ عموماً یتیم بچے اپنے تایا، چچا وغیرہ کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں، انھیں اس حوالے سے غور کرنا چاہیے۔ یہاں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ یتیم کا مال کھانے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی باقاعدہ کسی بری نیت سے کھائے تو ہی حرام ہے بلکہ کئی صورتیں ایسی ہیں کہ آدمی کو حرام کا علم بھی نہیں ہوتا اور وہ یتیموں کا مال کھانے کے حرام فعل میں مُلَوَّث ہو جاتا ہے جیسے جب میت کے ورثاء میں کوئی یتیم ہے تو اس کے مال سے یا اس کے مال سمیت مشترک مال سے فاتحہ تیجہ وغیرہ کا کھانا حرام ہے کہ اس میں یتیم کا حق شامل ہے، لہٰذا یہ کھانے صرف فقراء کیلئے بنائے جائیں اور صرف بالغ موجود ورثاء کے مال سے تیار کئے جائیں ورنہ جو بھی جانتے ہوئے یتیم کا مال کھائے گا وہ دوزخ کی آگ کھائے گا اور قیامت میں اس کے منہ سے دھواں نکلے گا۔

یتیم کی اچھی پرورش کے فضائل

جس کے زیر سایہ کوئی یتیم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس یتیم کی اچھی پرورش کرے، احادیث میں یتیم کی اچھی پرورش کرنے کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے 4 فضائل درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔ حضرت سہل (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ پھر اپنی شہادت والی اور درمیان والی انگلی سے اشارہ فرمایا اور انھیں کشادہ کیا۔ (بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان، ۴۹۷/۳، الحدیث: ۵۳۰۴)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، امام الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے مسلمانوں کے کسی یتیم بچے کے کھانے پینے کی ذمہ داری لی، اللہ عَزَّوَجَلَّ اسے جنت میں داخل فرمائے گا مگر یہ کہ وہ ایسا گناہ کرے جس کی معافی نہ ہو۔
(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "مسلمانوں کے گھروں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم سے اچھا سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم سے برا سلوک کیا جائے۔ (ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الیتیم، ۴/۱۹۳، الحدیث: ۳۶۷۹)
(4)۔۔ حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت ہے، رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے یتیم کے سر پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا کیلئے ہاتھ رکھا تو اس کے لیے ہر بال کے بدلے جن پر اس کا ہاتھ گزرا نیکیاں ہیں۔
(مسند امام احمد، مسند الانصار، حدیث ابی امامۃ الباہلی، ۸/۳۰۰، الحدیث: ۲۲۳۴۷)

باب الفرائض

اسلام میں ہر فرد کے حقوق متعین ہیں

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت دو باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، اول نسب دوم سبب، نسب کی بنیاد پر وراثت کے استحقاق کی وجہ سے وہ نابالغوں اور عورتوں کو وارث قرار نہیں دیتے تھے، صرف ان لوگوں کو وراثت کا حق دار سمجھتے تھے جو گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑائیوں میں حصہ لے سکیں اور مال غنیمت سمیٹ سکیں۔ حضرت ابن عباس (رض) اور سعید بن جبیر نیز دوسرے حضرات سے یہی مروی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (ویستفتونک فی النساء قل اللہ یفتیکم فیھن، لوگ آپ سے عورتوں کے متعلق فتوی پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں ان کے متعلق فتوی دیتا ہے) تا قول باری (والمستضعفین من الولدان، اور ان بچوں کے متعلق جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ نیز یہ آیت نازل فرمائی (یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین، اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہو)

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد بھی لوگ شادی بیاہ، طلاق اور میراث کے سلسلے میں زمانہ جاہلیت کے طور طریقوں پر قائم رہے۔ حتی کہ وہ وقت بھی آگیا کہ وہ یہ طور طریقے چھوڑ کر شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں اور طریقوں کی طرف منتقل ہوگئے۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء بن ابی رباح سے دریافت کیا کہ آیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ طلاق یا نکاح یا میراث کے سلسلے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کو ان ہی طریقوں پر چلنے دیا تھا جن پر آپ نے انھیں پایا تھا یعنی زمانہ جاہلیت کے طور طریقے، عطاء نے جواب میں کہا کہ ہمیں یہی اطلاع ملی ہے۔

حماد بن زید نے ابن عون سے، انھوں نے ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ مہاجرین اور انصار اپنے نسب کی بیاد پر جس کا زمانہ جاہلیت میں اعتبار کیا جاتا تھا ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں اس طریقے پر باقی رہنے دیا تھا۔ البتہ ربوا، یعنی سود کا معاملہ اس سے خارج تھا۔

اسلام آنے کے بعد جن سودی رقموں پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ راس المال قرض خواہ کو واپس کر دیا گیا اور سود کی رقم ختم کر دی گئی، حماد بن زید نے ایوب سے، انھوں نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا اور لوگ زمانہ جاہلیت کے طور طریقوں پر چلتے رہے حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب انھیں بہت سی باتوں کے کرنے کا حکم ملا اور بہت سی باتوں سے روک دیا گیا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ زمانہ جاہلیت کے طور پر طریقوں پر چلتے رہے۔ اسی مفہوم کی وہ روایت ہے جو حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ، جو چیز اللہ نے حلال کر دی وہ حلال ہے اور جو چیز اس نے حرام کر دی وہ حرام ہے۔ اور جس چیز کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی وہ قابل گرفت نہیں ہے۔ اس طرح لوگوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد بھی ایسی باتوں پر بحالہ قائم رہنے دیا گیا جو عقلی طور پر ممنوع نہیں تھیں۔

فوائد

ف 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب میت کے یتیم یا غائب وارث ہوں تو مال مشترک میں سے اس کی فاتحہ تیجہ وغیرہ حرام ہے کہ اس میں یتیم کا حق شامل ہے، بلکہ پہلے تقسیم کرو، پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصہ سے یہ سارے کام کرے ورنہ جو بھی وہ کھائے گا دوزخ کی آگ کھائے گا، قیامت میں اس کے منہ سے دھواں نکلے گا۔

ف 2۔ حدیث شریف میں ہے کہ یتیم کا مال ظلما کھانے والے قیامت میں اس طرح اٹھیں گے کہ ان کے منہ، کان اور ناک سے بلکہ ان کی قبروں سے دھواں اٹھتا ہو گا جس سے وہ پہچانے جائیں گے کہ یہ یتیموں کا مال ناحق کھانے والے ہیں۔

آیت مبارکہ:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

لغات القرآن: [يُوْصِيْكُمْ : تمہیں وصیت کرتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [فِيْٓ: میں] [اَوْلَادِكُمْ : تمہاری اولاد] [لِلذَّكَرِ : مرد کو] [مِثْلُ : مانند (برابر] [حَظِّ : حصہ] [الْاُنْثَيَيْنِ : دو عورتیں] [فَاِنْ : پھر اگر] [كُنَّ : ہوں] [نِسَآءً : عورتیں] [فَوْقَ : زیادہ] [اثْنَتَيْنِ : دو] [فَلَهُنَّ : تو ان کے لیے] [ثُلُثَا : دوتہائی] [مَا تَرَكَ : جو چھوڑا (ترکہ)] [وَاِنْ : اور اگر] [كَانَتْ : ہو] [وَاحِدَةً : ایک] [فَلَهَا : تو اس کے لیے] [النِّصْفُ : نصف] [وَلِاَبَوَيْهِ : اور ماں باپ کے لیے] [لِكُلِّ وَاحِدٍ : ہر ایک کے لیے] [مِّنْهُمَا : ان دونوں میں سے] [السُّدُسُ : چھٹا حصہ 2/1)] [مِمَّا : اس سے جو] [تَرَكَ : چھوڑا (ترکہ)] [اِنْ كَانَ : اگر ہو] [لَهٗ وَلَدٌ: اس کی اولاد] [فَاِنْ : پھر اگر] [لَّمْ يَكُنْ : نہ ہو] [لَّهٗ وَلَدٌ: اس کی اولاد] [وَّوَرِثَهٗٓ: اور اس کے وارث ہوں] [اَبَوٰهُ : ماں باپ] [فَلِاُمِّهِ : تو اس کی ماں کا] [الثُّلُثُ : تہائی (3/1)] [فَاِنْ : پھر اگر] [كَانَ لَهٗٓ: اس کے ہوں] [اِخْوَةٌ: کئی بہن بھائی] [فَلِاُمِّهِ : تو اس کی ماں کا] [السُّدُسُ : چھٹا (6/1)] [مِنْۢ بَعْدِ : سے بعد] [وَصِيَّةٍ : وصیت] [يُّوْصِيْ بِهَآ : اس کی وصیت کی ہو] [اَوْ دَيْنٍ : یا قرض] [اٰبَآؤُكُمْ : تمہارے

باپ] [وَاَبْنَاۗؤُكُمْ : اور تمہارے بیٹے] [لَا تَدْرُوْنَ : تم کو نہیں معلوم] [اَيُّھُمْ : ان میں سے کون] [اَقْرَبُ لَكُمْ : نزدیک تر تمہارے لیے] [نَفْعًا : نفع] [فَرِيْضَةً : حصہ مقرر کیا ہوا] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ کا] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ : اللہ تمہیں تمہاری اولاد (کی وراثت) کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے، پھر اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں (دو یا) دو سے زائد تو ان کے لیے اس ترکہ کا دو تہائی حصہ ہے، اور اگر وہ اکیلی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے، اور مورث کے ماں باپ کے لیے ان دونوں میں سے ہر ایک کو ترکہ کا چھٹا حصہ (ملے گا) بشر طیکہ مورث کی کوئی اولاد ہو، پھر اگر اس میت (مُورِث) کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث صرف اس کے ماں باپ ہوں تو اس کی ماں کے لیے تہائی ہے (اور باقی سب باپ کا حصہ ہے)، پھر اگر مورث کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے (یہ تقسیم) اس وصیت (کے پورا کرنے) کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض (کی ادائیگی) کے بعد (ہو گی)، تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تمہیں معلوم نہیں کہ فائدہ پہنچانے میں ان میں سے کون تمہارے قریب تر ہے، یہ (تقسیم) اللہ کی طرف سے فریضہ (یعنی مقرر) ہے، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

تفسیر و تشریح:

ترکہ یا وراثت

فوت ہونے والا شخص اپنے پیچھے جو اپنا مال، زمین، زیور وغیرہ چھوڑ جاتا ہے اسے ترکہ، وراثت یا ورثہ کہتے ہیں۔ کسی مرنے والے مرد یا عورت کی اشیاء اور وسائلِ آمدن وغیرہ کے بارے یہ بحث کہ کب، کس حالت میں کس وارث کو کتنا ملتا ہے شرعی اصلاح میں اسے علم الفرائض کہتے ہیں۔ علم الفرائض (اسلامی قانون وراثت) اسلام میں ایک نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے فرائض کے جاری نہ کرنے پر سخت عذاب سے ڈرایا ہے۔ چونکہ احکام وراثت کا تعلق براہ راست روزمرہ کی عملی زندگی کے نہایت اہم پہلو سے ہے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے بھی صحابہ کو اس علم کے طرف خصوصاً توجہ دلائی اور اسے دین کا نہایت ضروری جزء قرار دیا۔ صحابہ کرام میں سیدنا علی ابن ابی طالب، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا عبد اللہ بن مسعود، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا علم الفراض کے ماہرین میں شمار ہوتا ہے۔ صحابہ کے بعد زمانے کی ضروریات نے دیگر علوم شرعیہ کی طرح اس علم کی تدوین پر بھی فقہاء کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اسے فن کی حیثیت دی اس کے لیے خاص زبان اور اصلاحات وضع کیں اور اس کے ایک ایک شعبہ پر قرآن و سنت کی روشنی میں غور و فکر کر کے تفصیلی و جزئی قواعد مستخرج کیے۔ اہل علم نے اس علم کے متعلق مستقل کتب تصنیف کیں۔

اس علم کو جملہ تفصیلات کے ساتھ جاننا فرض کفایہ ہے، لیکن کم از کم اتنا جاننا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ میت کی جائداد کو کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے مستحقین تک پہنانا ضروری ہے۔

حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد شاہ الازہریؒ نے انتہائی خوبصورت پیرائے میں اس آیہ مبارکہ کی تشریح اس انداز میں فرمائی:

اسلام نے صحت مند معاشرہ کو معرض وجود میں لانے کے لیے کنبہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کے افراد کے مفاد کو یوں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا کہ محبت و قرابت کا باہمی رشتہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔ اس کے لیے جو وسائل اختیار کئے ہیں انھیں میں سے ایک نظام میراث ہے۔ زندگی میں اگر کنبہ کا کوئی فرد افلاس و غربت کا شکار ہو جائے تو دوسرے افراد پر اس کے نفقہ کو فرض قرار دیا۔ اسی طرح موت کے بعد متوفی کے قریبی رشتہ داروں میں اس کی جائیداد کو تقسیم کرنے کا حکم دیا تاکہ زندگی اور موت میں کنبہ کا مفاد یوں باہم پیوستہ رہے کہ جدائی کا خیال ہی ان میں راہ نہ پا سکے۔ کنبہ کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے نظام وراثت میں قرابت کا اصول پیش نظر رکھا گیا۔ میراث میں حصہ کے ملنے یا نہ ملنے اور حصہ کے کم یا زیادہ ہونے میں رشتہ کی نزدیکی اور دوری کو بہت بڑا دخل ہے۔ دوسرا اصول ضرورت ہے۔ یعنی قریبی رشتہ داروں میں حصہ کی کمی بیشی کا مدار ضرورت کو قرار دیا۔ جتنی کسی کی ضروریات زیادہ اور ذمہ داریاں کثیر ہوں گی اسی لحاظ سے اس کا حصہ مقرر کیا جائے گا۔ مثلاً متوفی کے والدین اور اس کی اولاد کی قرابت بالکل مساوی نوعیت کی ہے۔ لیکن اولاد جو زندگی کے سفر کا آغاز کر رہی ہے اس کی ضرورت والدین کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں جو اس طویل سفر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔ نیز والدین کے پاس تو زندگی بھر کا کچھ نہ کچھ اندوختہ ہوتا ہی ہے اور اولاد بالکل خالی ہاتھ ہے۔ یہی فرق لڑکی اور لڑکے میں ہے۔ لڑکی پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں۔ شادی سے پہلے اس کے والدین اس کی تمام ضروریات کے کفیل ہیں اور شادی کے بعد اس کی رہائش، لباس، خورد و نوش کی تمام تر ذمہ داری خاوند پر ہے۔ اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے جملہ مصارف بھی اس کے خاوند کے ذمہ ہیں۔ مزید برآں عملی زندگی کی سرگرمیاں جس سرمایہ کی محتاج ہیں اس کا مہیا کرنا بھی مرد کی ذمہ داری ہے۔ یہ حقائق ہیں جن کے پیش نظر اسلام نے والدین اور اولاد، عورت اور مرد کے حصوں میں فرق کیا ہے۔ اور یہ فرق ہی عین عدل ہے۔ ان امتیازات کی موجودگی میں ان کے حصوں کو مساوی رکھنا مساوات تو ہو گی لیکن کھوکھلی اور ظالمانہ، اور اسلام صرف اس مساوات کا علمبردار ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ تیسرا اصول تقسیم دولت ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے اور وراثت کی تقسیم میں بھی اس اصول کو ملحوظ رکھا۔ اس لیے صرف بڑے لڑکے یا صرف لڑکوں کو ہی وارث تسلیم نہیں کیا بلکہ تمام اولاد لڑکے اور لڑکیاں اور ان کے علاوہ کئی اور رشتہ داروں کو وارث قرار دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ دولت تقسیم ہو۔ یہ وہ تین اصول ہیں (قرابت، ضرورت، تقسیم دولت) جن پر اسلام کا یہ بے نظیر نظام وراثت قائم ہے۔ (ان سطور میں میں نے اپنے استاد اور مصر کے شہرہ آفاق عالم شیخ محمد ابو زہرہ کے مقالہ "شریعۃ القرآن" کا حاصل پیش کیا ہے جو ماہنامہ "المسلمون" رجب 1371ھ میں شائع ہوا تھا۔ اب حضرت الاستاذ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ کریم انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

اولاد کے وارث ہونے کی چار صورتیں ہیں

: (1) لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی اس صورت میں لڑکے کو دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ ملے گا۔ (2) صرف ایک لڑکی ہو۔ اس صورت میں لڑکی نصف جائیداد کی وارث ہو گی۔ (3) صرف دو لڑکیاں ہوں۔ (4) یا دو سے زائد اور لڑکا کوئی نہ ہو۔ ان دونوں صورتوں میں لڑکیوں کو جائیداد کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

والدین کے وارث بننے کی تین مختلف صورتیں ہیں۔ (1) ماں باپ بھی موجود ہوں اور اولاد بھی ہو خواہ لڑکا یا لڑکی ایک یا زیادہ، اس صورت میں ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور بقایا 4/6 اولاد میں حسب قاعدہ تقسیم ہو گا۔ (2) صرف ماں باپ وارث ہوں۔ میت کی اولاد بھی نہ ہو اور بہن بھائی بھی نہ ہوں اس صورت میں ماں کا 1/3، اور بقیہ دو تہائی باپ کا۔ یہاں بہن بھائی کے نہ ہونے کی تصریح نہیں کی کیونکہ تیسری صورت میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔ (3) میت کی اولاد تو نہ ہو لیکن اس کے بھائی یا بہن ہوں۔ اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ اور بقیہ 5/6 باپ کو۔ بھائی بہن خواہ عینی ہوں یعنی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں خواہ علاتی یعنی باپ ایک مائیں الگ الگ یا اخیافی یعنی ماں ایک باپ الگ الگ۔ ان سب حالتوں میں ایک ہی حکم ہے۔ باپ کے باعث بھائی بہنوں کو حصہ نہ ملے گا۔

سابقہ حصص بیان کرنے کے بعد یہ وضاحت فرمادی کہ ان حصص کو خدائے علیم وخبیر نے اپنی حکمت کاملہ سے مقرر فرمایا ہے۔ تمہیں یہ اختیار نہیں کہ ان میں ردوبدل کرو۔ اور اگر یہ بات تمہاری صوابدید پر چھوڑی جاتی تو تم اپنی عارضی اور وقتی مصلحتوں اور مفاد کے زیر اثر معلوم نہیں کیا کیا ترمیمیں کرتے رہتے۔ (ضیاء)

مزید تفصیل ایک مرتبہ پھر

ورثا میں وراثت کا مال تقسیم کرنے کی صورتیں

(1)۔۔ باپ کی تین صورتیں ہیں: (۱) اگر میت کا باپ ہو اور ساتھ میں بیٹا بھی ہو تو باپ کو 6/1 ایک بٹا چھ ملے گا۔ (۲) اگر میت کا باپ ہو اور ساتھ میں بیٹا نہ ہو بلکہ صرف بیٹی ہو تو باپ کو 6/1 ایک بٹا چھ ملے گا اور بقیہ ورثاء کو دینے کے بعد اگر کچھ بچ جائے تو وہ باپ کو بطور عصبہ کے ملے گا۔ (۳) اگر میت کا باپ ہو اور ساتھ میں نہ کوئی بیٹا ہو اور نہ کوئی بیٹی ہو تو باپ کو بطور عصبہ کے ملے گا۔

(2)۔۔ ماں شریک بھائی کی تین صورتیں ہیں: (۱) اَخیافی بھائی اگر ایک ہو تو اخیافی بھائی کو 6/1 ایک بٹا چھ ملے گا۔ (۲) اخیافی بھائی اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں خواہ بھائی ہو یا بہنیں یا دونوں مل کر تو انھیں 3/1 ایک بٹا تین ملے گا۔ (۳) باپ، دادا، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی کے ہوتے ہوئے اخیافی بھائی محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اخیافی بہن کے بھی یہی تین احوال ہیں۔

(3)۔۔ شوہر کی دو صورتیں ہیں: (۱) اگر فوت ہونے والی کی اولاد ہے تو شوہر کو 4/1 ایک بٹا چار ملے گا۔ (۲) اگر فوت ہونے والی کی اولاد نہیں تو شوہر کو 2/1 ایک بٹا دو ملے گا۔

(4)۔۔ بیوی کی دو صورتیں ہیں: (ا) اگر فوت ہونے والے کی اولاد ہے تو بیوی کو 8/1 ایک بٹا آٹھ ملے گا۔ (۲) اگر فوت ہونے والے کی اولاد نہیں ہے تو بیوی کو 4/1 ایک بٹا چار ملے گا۔

(5)۔۔ بیٹی کی تین صورتیں ہیں: (ا) اگر بیٹی ایک ہو تو 2/1 ایک بٹا دو یعنی آدھا مال ملے گا۔ (۲) اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو 3/2 دو بٹا تین ملے گا۔ (۳) اگر بیٹیوں کے ساتھ بیٹا بھی ہو تو بیٹیاں عصبہ بن جائیں گی اور لڑکے کو لڑکی سے دوگنا دیا جائے گا۔

(6)۔۔ ماں کی تین صورتیں ہیں: (ا) اگر میت کا بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی یا کسی بھی قسم کے دو بہن بھائی ہوں تو ماں کو کل مال کا 6/1 ایک بٹا چھ ملے گا۔ (۲) اگر میت کا بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی کوئی نہ ہو اور بہن بھائیوں میں سے دو افراد نہ ہوں خواہ ایک ہو تو ماں کو کل مال کا 3/1 ایک بٹا تین ملے گا۔ (۳) اگر میت نے (بیوی اور ماں باپ) یا (شوہر اور ماں باپ) چھوڑے ہوں تو بیوی یا شوہر کو اس کا حصہ دینے کے بعد جو مال باقی بچے اس کا 3/1 ایک بٹا تین ماں کو دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ دو اہم اصول

(1)۔۔ بیٹے کو بیٹی سے دگنا ملتا ہے اور جہاں بھائی عصبہ بنتے ہوں وہاں انھیں بہنوں سے دگنا ملتا ہے اور کئی جگہ بہنیں بھی عصبہ بن جاتی ہیں اور اصحاب فرائض کو دینے کے بعد بقیہ سارا مال لے لیتی ہیں۔

(2)۔۔ ایک اور اہم قاعدہ ہے کہ قریبی کے ہوتے ہوئے دور والا محروم ہو جاتا ہے جیسے بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا، باپ کے ہوتے ہوئے دادا، بھائی کے ہوتے ہوئے بھائی کی اولاد وغیرہ۔

وراثت کے تفصیلی احکام

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر وارثت کے احکام بیان فرمائے تھے: مردوں کے لیے اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو خواہ وہ (مال) کم ہو یا زیادہ۔ یہ (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا ہوا حصہ ہے (النساء: ۷) اور اب اللہ تعالیٰ نے تفصیلی طور پر وراثت کے احکام شروع فرمائے۔ وراثت کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ذکر سے احکام شروع فرمائے کیونکہ انسان کا سب سے زیادہ تعلق اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے حضرت مسور بن مخرمہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (سیدتنا) فاطمہ (رض) میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۳۶۷) اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وراثت کے احکام میں سب سے پہلے اولاد کے حصص بیان فرمائے۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں بنو سلمہ میں اپنے گھر کے اندر بیمار تھا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میری عیادت کے لیے تشریف لائے میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی ﷺ! میں اپنے مال کو اپنی اولاد کے درمیان کس طرح تقسیم کروں؟ آپ ﷺ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: اللہ تمہاری اولاد (کی وراثت کے حصوں) کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے کہ میت کے ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۰۳ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۴۱۴ھ)

اولاد کے احوال

اولاد کئی صورتوں میں وارث ہوتی ہے ' ایک حال یہ ہے کہ میت کی اولاد کے ساتھ میت کے والدین بھی ہوں اور دوسرا حال یہ ہے کہ میت کی وارث صرف اس کی اولاد ہو اور اس کی تین صورتیں ہیں:

1۔ فوت ہونے والے فرد کے ہاں بیٹے ہوں اور بیٹیاں بھی ہوں اس صورت میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں وارث ہوں گے۔

2۔ فوت ہونے والے فرد کی صرف بیٹیاں ہوں

3۔ فوت ہونے والے فرد کے صرف بیٹے ہوں

اب اگر میت نے بیٹے اور بیٹیاں دونوں چھوڑے ہیں تو اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ ملے گا مثلاً اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی ہے تو امور متقدمہ علی الارث کے بعد میت کے ترکہ کے تین حصے کریں دو حصص بیٹے کو اور ایک بیٹی کو ملے گا۔ علی ہذاالقیاس اسی میں دوسری صورت

دوسری صورت یہ کہ اگر میت نے زوجہ 'ماں باپ اور بیٹے اور بیٹیوں کو چھوڑا ہو تو اس صورت میں زوجہ اور ماں باپ اصحاب الفرائض ہیں یعنی ان کے حصص مقرر ہیں زوجہ کا آٹھواں حصہ 'ماں کا چھٹا حصہ اور باپ کا بھی چھٹا حصہ 'تو اصحاب الفرائض کو ان کے حصص دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ سب اولاد میں تقسیم کر دیا جائے گا کیونکہ اولاد عصبات ہیں اور اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ عصبات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔اس حدیث مبارکہ میں اس کی وضاحت دی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کتاب اللہ کے مطابق مال کو اصحاب الفرائض کے درمیان تقسیم کرو اور اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ (میت کے) سب سے اقرب مرد کو دو۔ (سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث: ۲۷۴۰ 'صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۷۳۲ '۶۷۳۵ '۶۷۳۷ 'صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۴۱۷ 'سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۰۹۸)

سو اس صورت میں کل ترکہ کے ۲۴ حصص کئے جائیں اس میں سے ۳ حصے اس کی بیوی کو '۴ '۴ حصے اس کے باپ اور ماں کو اور باقی ماندہ ۱۳ حصص اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیں کہ بیٹے کو دو اور بیٹی کو ایک حصہ ملے۔

(یہاں یہ واضح ہونا چاہئے کہ: **اصحاب فرائض:** (مقررہ حصوں والے) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا میراث میں معیّن حصہ قرآن وحدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ان کو اصحاب فرائض کہتے ہیں اور ذوی الفروض بھی کہا جاتا ہے۔

عصبات: عصبہ کی جمع یعنی وہ لوگ جن کے حصے) میراث میں) مقرر شدہ نہیں البتہ اصحاب فرائض سے جو بچتا ہے انھیں ملتا ہے اور اگر اصحاب فرائض نہ ہوں تو تمام مال (ترکہ) انہی میں تقسیم ہو جاتا ہے۔)

اگلی صورت یہ ہے کہ میت نے صرف بیٹیاں چھوڑی ہوں اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو دو ثلث (دو تہائی) ملیں گے اور اگر صرف ایک بیٹی چھوڑی ہو تو اس کو کل ترکہ کا نصف ملے گا اور اس کے بعد جو ترکہ بچے گا تو وہ دیگر اصحاب الفرائض کو ملے گا اور اگر وہ نہ ہوں تو پھر میت کے عصبات کو مل جائے گا

اگلی صورت: اگر میت نے صرف بیٹے چھوڑے ہوں تو وہ تمام مال کے وارث ہوں گے اور اگر بیٹوں کے ساتھ اصحاب الفرائض بھی ہوں تو اصحاب الفرائض کو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی تمام مال بیٹوں کو دے دیا جائے گا۔

مرد کو عورت سے دگنا حصہ دینے کی وجوہات

عورت کو وراثت میں مرد کے حصہ کا نصف ملتا ہے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عورت مرد کی بہ نسبت پیسوں کی زیادہ محتاج ہے کیونکہ مرد آزادی کے ساتھ بے خوف وخطر گھر سے باہر نکل سکتا ہے اور عورت اپنے شوہر یا والدین کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل نہیں سکتی اور اگر باہر جائے تو اس کی عزت اور عصمت کے لیے متعدد خطرات ہیں نیز چونکہ اس کی عقل کم ہوتی ہے اس لیے اگر وہ خرید وفروخت کرے تو اس کے لٹ جانے یا دھوکا کھانے کا بہت اندیشہ ہے اور جسمانی طور پر وہ کمزور صنف ہے اس لیے اگر اس کو مرد سے دگنا حصہ نہ دیا جائے تو کم از کم برابر حصہ دینا چاہیے۔

اس سوال کے حسب ذیل متعدد جوابات ہیں:

(۱) مرد کے بہ نسبت عورت کے اخراجات کم ہوتے ہیں کیونکہ مرد پر اپنی اپنی بیوی اور بچوں کی اور اپنے بوڑھے والدین کے مصارف کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کے برخلاف عورت پر کسی کی پرورش کی ذمہ داری نہیں ہے اور جب عورت کی بہ نسبت مرد کے اخراجات زیادہ ہیں تو مرد کا حصہ بھی عورت سے دگنا ہونا چاہیے۔

(۲) سماجی کاموں کے لحاظ سے مرد کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ امام اور قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ملک اور وطن کے نظم ونسق چلانے کی ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ملک اور وطن کے دفاع کے لیے جہاد کی ذمہ داری بھی مرد پر ہے۔ حدود اور قصاص میں وہی گواہ ہو سکتا ہے اور کاروباری معاملات میں بھی مرد کی گواہی عورت سے دگنی ہے سو جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اس کا وراثت میں حصہ بھی دگنا ہونا چاہیے۔

(۳) عورت چونکہ صنفا کمزور ہوتی ہے اور اس کو دنیاوی معاملات کا زیادہ تجربہ نہیں ہوتا اس لیے اگر اس کو زیادہ پیسے مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ اس کے وہ سب پیسے ضائع ہو جائیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے یہ بحث ذکر کی ہے کہ ایک بیٹی کا وراثت سے نصف حصہ قطعی ہے اور جس حدیث میں ہے کہ ہم گروہ انبیاء مورث نہیں بنائے جائیں گے وہ ظنی ہے تو حضرت ابو بکر (رض) نے ظنی حکم کے مقابلہ میں قطعی کو کیوں ترک کر دیا اور حضرت سیدتنا فاطمہ (رض) کو وراثت سے حصہ کیوں نہیں دیا ' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ہمارے لئے ظنی ہے حضرت ابو بکر (رض) نے چونکہ اس کو زبان رسالت ﷺ سے سنا تھا اس لیے ان کے لیے یہ حدیث قرآن مجید کی طرح قطعی تھی

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر میت کی اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اگر میت کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے (اور باقی سب باپ کا حصہ ہے) اور اگر میت کے (بہن) بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔ (النساء: ۱)"

والدین کے احوال

اولاد کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں پر ہوتا ہے اس لیے میت کے ماں باپ کے ساتھ اگر اولاد ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں :

''پہلی صورت یہ ہے'' : کہ ماں باپ کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا ،

''دوسری صورت یہ ہے'' : کہ میت کی صرف ایک بیٹی ہو اور ماں باپ ہوں تو بیٹی کو نصف ملے گا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا البتہ باقی مال بھی باپ کو بہ طور عصبہ ہونے کے مل جائے گا۔

''تیسری صورت'' : اگر میت کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کو تہائی مل جائے گا اور باقی دو تہائی مال باپ کو بطور عصبہ دے دیا جائے گا اور اس صورت میں مرد (باپ) کو عورت (ماں) سے دگنا حصہ مل جائے گا۔

اگر میت کے (بہن) بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ والدین کے احوال میں سے تیسرا حال ہے، جس میں میت نے والدین کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کو بھی چھوڑا ہو ، اس پر اتفاق ہے کہ ایک بہن یا بھائی ماں کے تہائی حصہ کے لیے حاجب بن کر اس کو چھٹا نہیں کرتے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب بہن یا بھائی کا عدد تین کو پہنچ جائے تو وہ ماں کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور اگر دو بہنیں یا دو بھائی ہوں تو اس میں اختلاف ہے اکثر صحابہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بھی ماں کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں دو بہنیں ماں کا حصہ تہائی سے کم نہیں کرتیں۔ فقہاء احناف کا مذہب اکثر صحابہ کے قول کے مطابق ہے ، یہ بھی واضح رہے کہ دو بہنیں کسی قسم کی ہوں سگی یا سوتیلی خواہ ماں کی طرف سے خواہ باپ کی طرف سے۔ اسی طرح سے بھائی بھی۔ وہ ماں کے لیے حاجب ہیں اور اس کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور ایک بہن ہو یا ایک بھائی وہ ماں کے لیے حاجب نہیں ہیں خواہ وہ بہن یا بھائی عینی ہوں علاتی ہوں یا اخیافی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : (یہ تقسیم) اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد ، اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد ہے۔ (النساء : ۱۱)

آیت مبارکہ :

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ۭ

لغات القرآن: [وَلَكُمْ : اور تمہارے لیے] [نِصْفُ : آدھا] [مَا تَرَكَ : جو چھوڑ مریں] [اَزْوَاجُكُمْ : تمہاری بیبیاں] [اِنْ : اگر] [لَّمْ يَكُنْ : نہ ہو] [لَّهُنَّ : ان کی] [وَلَدٌ: کچھ اولاد] [فَاِنْ : پھر اگر] [كَانَ : ہو] [لَهُنَّ وَلَدٌ: ان کی اولاد] [فَلَكُمُ : تو تمہارے لیے] [الرُّبُعُ : چوتھائی] [مِمَّا تَرَكْنَ : اس میں سے جو وہ چھوڑیں] [مِنْۢ بَعْدِ : بعد] [وَصِيَّةٍ : وصیت] [يُّوْصِيْنَ : وہ وصیت کرجائیں] [بِهَآ : اس کی] [اَوْ دَيْنٍ : یا قرض] [وَلَهُنَّ : اور ان کے لیے] [الرُّبُعُ : چوتھائی] [مِمَّا : اس میں سے جو] [تَرَكْتُمْ : تم چھوڑ جاؤ] [اِنْ : اگر] [لَّمْ يَكُنْ : نہ ہو] [لَّكُمْ وَلَدٌ: تمہاری اولاد] [فَاِنْ : پھر اگر] [كَانَ لَكُمْ : ہو تمہاری] [وَلَدٌ: اولاد] [فَلَهُنَّ : تو ان کے لیے] [الثُّمُنُ : آٹھواں] [مِمَّا تَرَكْتُمْ : اس سے جو تم چھوڑ جاؤ] [مِّنْۢ بَعْدِ : بعد] [وَصِيَّةٍ : وصیت] [تُوْصُوْنَ : تم وصیت کرو] [بِهَآ : اس کی] [اَوْ : یا] [دَيْنٍ : قرض] [وَاِنْ : اور اگر] [كَانَ : ہو] [رَجُلٌ: ایسا مرد] [يُّوْرَثُ : میراث ہو] [كَلٰلَةً : جس کا باپ بیٹا نہ ہو] [اَوِ امْرَاَةٌ: یا عورت] [وَّلَهٗٓ: اور اس] [اَخٌ: بھائی] [اَوْ اُخْتٌ: یا بہن] [فَلِكُلِّ : تو تمام کے لیے] [وَاحِدٍ مِّنْهُمَا : ان میں

سے ہر ایک] [السُّدُسُ : چھٹا] [فَاِنْ : پرھ اگر] [كَانُوْٓا : ہوں] [اَكْثَرَ : زیادہ] [مِنْ ذٰلِكَ : اس سے (ایک سے)] [فَهُمْ : تو وہ سب] [شُرَكَاۗءُ : شریک] [فِي الثُّلُثِ : تہائی میں (1/3)] [مِنْۢ بَعْدِ : اس کے بعد] [وَصِيَّةٍ : وصیت] [يُّوْصٰى بِهَآ : جس کی وصیت کی جائے] [اَوْ دَيْنٍ : یا قرض] [غَيْرَ مُضَاۗرٍّ : نقصان نہ پہنچانا] [وَصِيَّةً : حکم] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ سے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [عَلِيْمٌ: جاننے والا] [حَلِيْمٌ: حلم والا]

ترجمہ : اور تمہارے لیے اس (مال) کا آدھا حصہ ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں بشر طیکہ ان کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمہارے لیے ان کے ترکہ سے چوتھائی ہے (یہ بھی) اس وصیت (کے پورا کرنے) کے بعد جو انھوں نے کی ہو یا قرض (کی ادائیگی) کے بعد، اور تمہاری بیویوں کا تمہارے چھوڑے ہوئے (مال) میں سے چوتھا حصہ ہے بشر طیکہ تمہاری کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو ان کے لیے تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ہے تمہاری اس (مال) کی نسبت کی ہوئی وصیت (پوری کرنے) یا (تمہارے) قرض کی ادائیگی کے بعد، اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی وراثت تقسیم کی جارہی ہو جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ کوئی اولاد اور اس کا (ماں کی طرف سے) ایک بھائی یا ایک بہن ہو (یعنی اخیافی بھائی یا بہن) تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے، پھر اگر وہ بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے (یہ تقسیم بھی) اس وصیت کے بعد (ہو گی) جو (وارثوں کو) نقصان پہنچائے بغیر کی گئی ہو یا قرض (کی ادائیگی) کے بعد، یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے، اور اللہ خوب علم و حلم والا ہے

تفسیر و تشریح:

بیوی کی وراثت تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں

1۔ متوفیہ بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو نہ لڑکی نہ لڑکا نہ تم سے اور نہ کسی دوسرے خاوند سے۔ اس صورت میں نصف خاوند کو ملے گا اور بقیہ نصف دوسرے وارثوں میں حسب قاعدہ شرعی تقسیم ہو گا۔

2۔ اس کی کوئی اولاد ہو تو اس صورت میں چوتھائی خاوند کو ملے گی اور بقیہ دوسرے وارثوں کو۔

خاوند کی وراثت تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں۔

1۔ خاوند کی کوئی اولاد نہ ہو نہ لڑکا نہ لڑکی نہ موجودہ بیوی سے نہ کسی دوسری بیوی سے چوتھائی بیوی کو ملے گا خواہ ایک ہو یا زیادہ اور اگر خاوند کی اولاد ہو (جیسے پہلے بیان ہوا) تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ ایک ہو یا زیادہ۔ بقیہ دیگر وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

1. ”کلالہ اس مرد یا عورت کو کہا جاتا ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ اس کے والدین زندہ ہوں۔ اگر اس کے وارث عینی یا علاتی۔
2. عینی (سگی سگا) بہن بھائی ہے ماں باپ ایک ہوں۔
3. علاتی (باپ کی طرف سے) بہن بھائی باپ کی طرف سے شریک ہوں مگر ماں دوسری ہو۔
4. اخیافی (ماں کی طرف سے) بہن بھائی ماں کی طرف سے شریک ہوں مگر باپ دوسرا ہو“۔

بہن بھائی ہوں تو ان کا ذکر آخر سورۃ میں آئے گا۔ اور اگر اس کے اخیافی (یعنی ماں کی طرف سگے) بہن بھائی ہوں تو ان کا حکم یہاں ذکر فرمایا۔ اس کی دو صورتیں ہیں

1۔ یا تو ایک بھائی یا ایک بہن وارث ہوگی تو اس صورت میں اس کو چھٹا حصہ ملے گا۔

2۔ اور اگر وہ ایک سے زائد ہوں تو سب کو تہائی حصہ ملے گا اور سب میں برابر تقسیم ہوگا۔

شریعت اسلامیہ کا یہ حکم ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو تجہیز و تکفین کے بعد سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے بعد ازاں اس کی وصیت پر عمل کیا جائے اور اس کے بعد بقیہ ترکہ حسب احکام قرآنی وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ قرض کی ادائیگی کا مقدم ہونا تو عین انصاف ہے۔ وصیت کے بارے میں شریعت نے چند ایک قیود عائد کی ہیں۔ اور اسلام سے پہلے وصیت کے بارے میں جو طریقہ رائج تھا اس میں اصلاح کر دی تاکہ اس طریقہ میں جو بے راہ روی رونما ہو چکی تھی اس کا سد باب کر دیا جائے۔ اہل عرب کا یہ دستور تھا کہ مرنے والا اپنی جائیداد کی ایسے لوگوں کے نام وصیت کر جاتا جن سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا تھا اور اپنی اولاد کو محروم کر دیتا اور اس فعل کو شرافت و سخاوت کا کمال شمار کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے راہ روی کے انسداد کے لیے احکام وراثت نازل فرمائے اور تمام رشتہ داروں کے حصے مقرر کر دیئے اور ان میں رد و بدل اور کمی بیشی کرنے سے صاف الفاظ میں منع فرما دیا لیکن بسا اوقات کوئی اجنبی یا غیر وارث رشتہ دار وارثوں سے کہیں بڑھ کر کسی کی خدمت کرتا ہے اور وہ شخص اس کا معاوضہ اسے دینا چاہتا ہے یا کسی کار خیر میں حصہ لینا چاہتا ہے تو اس سے بھی اسے محروم نہیں کیا گیا بلکہ جائیداد کے 1/3 مقرر فرما دی اور وصیت کی اجازت صرف ان لوگوں کے لیے دی گئی ہے جو وارث نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر وارث کے لیے بھی وصیت جائز رکھی جاتی تو پھر قواعد میراث بالکل معطل ہو کر رہ جاتے۔ اس لیے حضور رحمۃ للعلمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حصہ عطا فرما دیا ہے اس لیے اب کسی وارث کے لیے وصیت کی اجازت نہیں۔ بعض لوگ وارث کو وصیت سے محروم کرنے اور وصیت کو 1/3 تک محدود کرنے پر بڑے برافروختہ ہوتے ہیں کاش وہ اسلام کے حکیمانہ نظام میں غور کریں۔۔

اگرچہ یہ قید تمام سابقہ آیات میں بھی ملحوظ ہے لیکن یہاں تصریح کی اس لیے زیادہ ضرورت ہوئی کہ جب انسان کی اولاد یا والدین نہیں ہوتے تو وہ اپنے دوسرے وارثوں کو محروم کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے کرتا ہے۔ کسی کو بلاوجہ وصیت کر دی، کسی کا فرضی قرضہ اپنے اوپر تسلیم کر لیا تاکہ اس کی جائیداد بٹ جائے اور اس کے وارثوں کو نہ ملے اس لیے یہاں مضار کے الفاظ صراحۃً ذکر فرما دیئے۔ (ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمہاری بیویوں کے ترکہ میں سے تمہارے لیے آدھا حصہ ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لیے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے۔ ان کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ' اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے۔ ان کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ' اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے اور اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہارے ترکہ میں سے ان کا آٹھواں حصہ ہے تمہاری وصیت پوری کرنے اور تمہارا قرض ادا کرنے کے بعد۔

شوہر اور بیوی کے احوال

اولاد کی ماں باپ کے ساتھ اور ماں باپ کی اولاد کے ساتھ نسبی قرابت ہے ' اور یہ بلاواسطہ قرابت ہے اور شوہر کی بیوی کے ساتھ اور بیوی کی شوہر کے ساتھ نکاح کے سبب سے قرابت ہے اور یہ بھی بلاواسطہ قرابت ہے ' ان کے علاوہ جو قرابتیں ہیں مثلا بھائی بہن وغیرہ وہ بالواسطہ قرابتیں ہیں کیونکہ بھائی ' بہن وغیرہ کی قرابت ماں باپ کے واسطہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے بلاواسطہ قرابت داروں کے احکام وراثت بیان فرمائے اور پھر بالواسطہ قرابت داروں کے احکام بیان فرمائے ' اور بلاواسطہ قرابت میں نسبی قرابت سببی قرابت سے قوی ہے اس لیے پہلے نسبی قرابت داروں میں اولاد اور ماں باپ کے حصص بیان فرمائے اس کے بعد سببی قرابت میں شوہر اور بیوی کے حصص بیان فرمائے اور یہ نہایت عمدہ ترتیب ہے۔

اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ

1۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ نصف (آدھا) ہے۔

2۔ اگر اولاد ہو تو اس کا حصہ چوتھائی ہے

3۔ اگر شوہر کی اولاد نہ ہو تو بیوی کا حصہ ربع (چوتھائی) ہے

4۔ اگر اولاد ہو تو اس کا حصہ ثمن (آٹھواں) ہے اس سے واضح ہوا کہ شوہر کا حصہ بیوی کے حصہ سے دگنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہوتا ہے۔

اس آیت میں اولاد سے مراد عام ہے خواہ ایک ہو یا زیادہ ' مذکر ہو یا مونث ' نیز وہ اولاد باواسطہ ہو جیسے بیٹا یا بیٹی یا بالواسطہ ہو جیسے پوتا اور پوتی ' اور جب بیوی شوہر کی وارث ہو تو شوہر کی اولاد عام ہے خواہ اسی بیوی سے ہو یا کسی اور بیوی سے۔ اسی طرح جب شوہر بیوی کا وارث ہو تب بھی اولاد عام ہے خواہ وہ اسی شوہر کی اولاد ہو یا اس کے پہلے شوہر کی اولاد ہو ' اسی طرح بیوی ایک ہو یا کئی بیویاں ہوں سب کا حصہ ثمن (آٹھواں) ہے اور آٹھواں حصہ ان سب بیویوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ تقسیم کرنا ہو جس کا نہ والد ہو اور نہ اولاد اور (اس کا ماں کی طرف سے) بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ (بھائی یا بہن) ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کا تہائی حصہ ہے اس شخص کی وصیت پوری کرنے اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد وصیت میں نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا ' بہت حکمت والا ہے۔

کلالہ کا معنی اور اس کے مصداق کی تحقیق

کلالہ کی کئی تفسیریں ہیں لیکن مختار یہ ہے کہ کلالہ اس مورث میت (مرنے والے شخص) کو کہتے ہیں جس کا نہ والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو ' یہ تفسیر حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے اور یہی تفسیر مختار ہے۔

یہ سورۃ النساء کی آخری آیت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کلالہ کی تفسیر میں اسی آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

معدان ابو بکر (رض) کا ذکر کیا اور کہا میں اپنے بعد کلالہ سے اہم اور کوئی چیز چھوڑ کر نہیں جارہا اور میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جتنا کلالہ کے متعلق پوچھا ہے اور کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا اور آپ ﷺ نے جتنی سختی اس میں کی ہے اور کسی چیز میں نہیں فرمائی حتی کہ آپ ﷺ نے میرے سینہ میں انگلی چبھوئی اور فرمایا اے عمرؓ کیا تم کو سورۃ النساء کی آخری آیت کافی نہیں ہے ؟ (صحیح مسلم ٗ رقم الحدیث : ۱۶۱۷) (تبیان)

خلاصہ

۲۔ اگر عورت مر جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو تو اس کے مال سے نصف خاوند کو ملیگا۔

۳۔ اگر اس مرنے والی عورت کی کوئی اولاد ہے تو خاوند کا چوتھائی 4/1 ہے۔

۴۔ یہ تقسیم قرض ادا کرنے اور وصیت پر عمل کے بعد ہو گی۔

۵۔ اگر مرد فوت ہو جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو تو اس کی بیوی کو خاوند کے مال سے چوتھائی 4/1 حصہ ملیگا۔

٦۔ اگر مرحوم کی کوئی اولاد ہو تو بیوی کو آٹھواں 8/1 حصہ ملیگا۔

۱۔ قرض ادا اور وصیت کے بعد میراث تقسیم ہو گی۔

۲۔ کلالہ وہ شخص ہے جس کے اصول یعنی ماں باپ دادا دادی نہ ہو اور اولاد بیٹا بیٹی پوتا، پوتی وغیرہ نہ ہو۔

۳۔ ماں کی طرف سے اس کے بہن بھائی ہوں تو ان میں ایک اور دو کی نسبت نہ ہو گی بالکل مرد و عورت کو برابر ملے گا ایک بہن کو ایک بھائی کو 6/1۔6/1۔

۴۔ ماں کا حصہ میت کے مال سے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ماں کی اولاد کو بھی اس سے زیادہ نہ ملے گا۔ 3/1 میں سے ہی سب اخیافی بہن بھائیوں میں برابر تقسیم ہو گا۔

۵۔ ایسی وصیت پر عمل نہیں ہو گا جو ناجائز ہو۔ یعنی وارث کے حق میں وصیت یا ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت یا حرام کاموں پر خرچ کی وصیت وغیرہ۔

٦۔ میراث کے احکام اللہ کی طرف سے ہیں اور وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔

آیت مبارکہ:

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ‌ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا‌ ؕ وَذٰ لِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۳﴾

لغات القرآن:

[تِلْكَ : یہ] [حُدُوْدُ : حدیں] [اللّٰهِ : اللہ] [وَمَنْ : اور جو] [يُّطِعِ اللّٰهَ : اللہ کی اطاعت کرے] [وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کا رسول] [يُدْخِلْهُ : وہ اسے داخل کرے گا] [جَنّٰتٍ : باغات] [تَجْرِيْ : بہتی ہیں] [مِنْ تَحْتِهَا : ان کے نیچے] [الْاَنْهٰرُ : نہریں] [خٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہیں گے] [فِيْهَا : ان میں] [وَ : اور] [ذٰلِكَ : یہ] [الْفَوْزُ : کامیابی] [الْعَظِيْمُ : بڑی]

ترجمہ : یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمان برداری کرے اسے وہ بہشتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے

تفسیر و تشریح: تِلْکَ حُدُودُاللہِ : یہ اللہ کی حدیں ہیں۔}

وراثت کے مسائل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حدود قرار دیا

اور ان کے توڑنے کو اللہ کی حدیں توڑنا قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ میراث کی تقسیم میں ظلم کرنا عذاب الٰہی کا باعث ہے۔ اس سے ان مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو لڑکیوں یا دوسرے وارثوں کو وراثت سے محروم کرتے ہیں۔ حدیث مبارکہ ہے "جو اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت میں اس کے حصے سے محروم کر دے گا۔

(ابن ماجہ، کتاب الوصایا، باب الحیف فی الوصیۃ، ۳/۳۰۴، الحدیث : ۲۷۰۳)

{ وَمَن یُّطِعِ اللہَ وَرَسُولَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ : اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے تو اللہ اسے جنتوں میں داخل فرمائے گا۔ } اس آیت میں سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت پر جنت کا وعدہ ہے اور اگلی آیت میں حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی پر جہنم کی وعید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت فرض ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی حرام ہے۔ نیز کسی بھی حدِ شرعی کو توڑنا حرام ہے لیکن تمام حدود کو توڑنے والا کافر ہی ہے یعنی جو ایمان کی حد بھی توڑ دیتا ہے اور اگلی آیتوں میں یہی مراد ہے کیونکہ وہاں نافرمان کیلئے ہمیشہ جہنم میں داخلے کی وعید ہے اور جہنم میں ہمیشہ کافر ہی رہے گا مسلمان نہیں۔

ربط کلام :

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے میراث کے احکام کو اپنی حدود قرار دینے کے بعد اسکے ماننے والوں کو جزا اور نہ ماننے والوں کو سزا سنائی ہے۔

ان آیات میں ماں باپ، اولاد اور ان کے قریبی رشتہ داروں کے درمیان میّت کی چھوڑی ہوئی متروکہ جائیداد کی وراثت کے بارے میں اصول متعین کر کے انھیں میت کا وارث بنایا گیا۔ لیکن حدیث میں کچھ جرائم کے مرتکب افراد کو بعض حالتوں میں وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سر فہرست مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا یعنی ایک آدمی پہلے کافر تھا اب مسلمان ہوا لہٰذا نئے دین میں شامل ہونے کی وجہ

سے دوسرے دین کے حامل کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص پہلے مسلمان تھا بد قسمتی سے عیسائی ٗ یہودی یا کسی اور مذہب میں داخل ہو گیا تو وہ بھی وراثت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ [رواہ البخاری : کتاب الفرائض]

۲۔ باپ کا قاتل بیٹا ہو یا بیٹی وہ وراثت سے محروم ہو جائیں گے۔

۳۔ قاتل اگر مقتول کی وراثت میں حصہ دار ہے تو قتل عمد کی صورت میں وہ بھی اپنے حصہ سے محروم ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کی حدود کے بارے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے :

(إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمُهُ أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)

[رواہ مسلم : کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات]

”یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو شبہات میں واقع ہوا وہ حرام میں داخل ہو گیا۔ یہ اس چرواہے کی طرح ہے جو چراگاہ کے قریب جانور چراتا ہے ہو سکتا ہے وہ جانور چراگاہ میں چرنا شروع ہو جائیں۔ خبردار ! ہر بادشاہ کی چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ سنو ! یقیناً جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے یاد رکھنا ! وہ دل ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی حدود کا خیال رکھنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ دنیا میں اس نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی لذّت اور مفاد کو چھوڑا۔ آخرت میں اس کا بدلہ جنت ہے جس میں نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی جس نے حدود اللہ کا لحاظ اور احترام نہ رکھا وہ حقیقت میں باغی انسان ہے جس کو جہنم کے دہکتے ہوئے انگاروں میں جھونکا جائے گا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اس کو اذیّت ناک اور ذلیل کر دینے والا عذاب ہو گا۔

تاہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدود اللہ اور کبیرہ گناہ کے بارے میں یہ صراحت فرمائی ہے کہ موحّد ہونے کی صورت میں تزکیہ یعنی سزا بھگتنے کے بعد اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا :

(عَنْ أَبِي سَعِيدِنِ الْخُدْرِيِ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى أَخْرِجُوا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيمَانٍ فَيُخْرَجُونَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوا فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً)

[رواہ البخاری : کتاب الایمان، باب تفاضل اہل الایمان فی الاعمال]

”حضرت ابو سعید خدری (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ جنت والے جنت اور جہنم والے جہنم میں داخل ہو جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے آگ سے ہر اس آدمی کو نکال لیا جائے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے۔ فرشتے آگ سے لوگوں کو نکالیں گے جو جل کر سیاہ ہو چکے ہوں گے انھیں نہر حیات میں غسل دیا جائے گا وہ ایسے نمو پائیں گے جس طرح سیلاب کے کنارے دانہ بہترین حالت میں اُگتا ہے۔“

مسائل

۱۔ وراثت کے مسائل اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والے کو جنت نصیب ہو گی۔
۳۔ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور حدود سے تجاوز کرنے والے کو ذلیل ترین عذاب ہو گا۔

آیت مبارکہ:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾

لغات القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّعْصِ : نافرمانی] [اللّٰهَ : الله] [وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کا رسول] [وَيَتَعَدَّ : اور بڑھ جائے] [حُدُوْدَهٗ : اس کی حدیں] [يُدْخِلْهُ : وہ اسے داخل کرے گا] [نَارًا : آگ] [خَالِدًا : ہمیشہ رہے گا] [فِيْهَا : اس میں] [وَلَهٗ : اور اس کے لیے] [عَذَابٌ: عذاب] [مُّهِيْنٌ: ذلیل کرنے والا]

ترجمہ:

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے تجاوز کرے اسے وہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے ذلت انگیز عذاب ہے

تفسیر و تشریح: اس آیت میں کسی حکم کی نافرمانی کرنے اور حدود سے تجاوز کرنے پر دائمی عذاب کی وعید ہے جب کہ دائمی عذاب صرف کفار کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے اللہ کی اہانت اور اس کے رسول کی نافرمانی کی یا حلال سمجھ کر اللہ اور اس کے رسول کی حدود سے تجاوز کیا ' یا جمیع حدود سے تجاوز کیا وہ کافر ہو گیا ' اور اس آیت میں یہی تاویل ہے۔
جنتیوں کے بیان میں خلود کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے اور دوزخیوں کے ذکر میں خلود کا ذکر واحد کے صیغہ کے ساھت ہے کیونکہ اطاعت گزار اپنے ساتھ ان کو بھی جنت میں لے جائیں گے جن کی وہ شفاعت کریں گے اس لیے جمع کے صیغہ کا ذکر کیا اور کافر دوزخ میں اکیلا جائے گا ' دوسری وجہ یہ ہے کہ جنت میں خلود انس کا سبب ہو گا اس لیے جمع کا صیغہ کے صیغہ کا ذکر کیا ' اور دوزخ میں خلود وحشت کا سبب ہو گا اور دوزخی اس وحشت میں اکیلا ہو گا اس لیے واحد کا صیغہ ذکر کیا۔
حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں جو شخص کسی وارث کی میراث سے بھاگا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی وراثت کو منقطع کر دے گا (سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۷۰۳)

حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کا انجام نہایت ہول ناک۔ والعیاذ باللہ : سو اس سے واضح فرمادیا گیا کہ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والوں کیلئے دوزخ کی آگ اور رسوا کن عذاب ہے کہ انھوں نے اپنے تکبر و غرور کی بناء پر حق سے منہ موڑا تھا (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) اس لیے اب اس کو اس رسوا کن عذاب کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو یہ عذاب مہین (رسوا کن عذاب) ایسے شخص کیلئے ہے جو تجاوز حدود یعنی حدوں کے پھلانگنے کے اس جرم کو حلال جانتا ہو، اور اس کی پرواہی نہ کرتا ہو، کہ ایسا کرنا کفر ہے جس کی سزا عذاب مہین یعنی رسوا کن عذاب ہے۔ رہ گئے وہ لوگ جن سے بشری تقاضوں کی بناء پر ایسے ہو جائے اور وہ اس پر اصرار کرنے کی بجائے توبہ و استغفار کرلیں وہ اس زمرے میں نہیں آتے، (مدارک التنزیل وغیرہ) بہر حال دین سارے کا حاصل اور خلاصہ اللہ تعالیٰ کی مقرر فرمودہ حدود کا التزام اور ان کی پابندی ہے اور ان سے خروج اور تجاوز جو کہ اصل میں نتیجہ ہوتا ہے استکبار و اعراض اور اتباع ہویٰ کا، وہ دارین کی ہلاکت و تباہی کا باعث ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہر مرض سے ہمیشہ محفوظ رکھے اور ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔

جلال الدین سیوطیؒ اپنی تفسیر جلالین میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے اس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانون وراثت کو تبدیل کریں یا ان دوسری قانونی حدود کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں، لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدود کو توڑا اس قسم کی جسارت خدا کے ساتھ کھلی بغاوت ہے، کہیں عورتوں کو مستقل طور پر میراث سے محروم کیا گیا کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق قرار دیا گیا، کہیں سرے سے تقسیم میراث کے طریقہ کو ہی چھوڑ کر مشترکہ خاندانی جائداد کا طریقہ اختیار کر لیا گیا، کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا گیا۔

عبدالرحمٰن کیلانی صاحب نے جدیدیت پسند افراد کا بہترین محاسبہ کیا ہے فرماتے ہیں :

احکام کے مطابق تقسیم نہ کرنے والے

:۔ اگرچہ یہاں میراث کے احکام بیان ہو رہے ہیں مگر حکم عام ہے۔ خواہ احکام یتامیٰ کے حقوق کے متعلق ہوں یا عورتوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ وصیت سے تعلق رکھتے ہوں یا کوئی دوسرے ضابطے ہوں۔ جو بھی اللہ تعالیٰ نے حدود مقرر کر دی ہیں اگر ان سے کوئی تجاوز کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب میں مبتلا رہے گا اور ربط مضمون کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ جو شخص اس قانون وراثت کو توڑے، عورتوں کو ورثہ سے محروم رکھے یا صرف بڑے بیٹے کو مستحق وراثت قرار دے یا عورت مرد کو برابر کا حصہ دار قرار دے یا جائیداد کو سرے سے تقسیم ہی نہ کرے اور اسے مشترکہ خاندانی جائیداد قرار دے دے تو ایسے سب لوگ حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے اور اسی عذاب الیم کے مستحق ہیں۔

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ :۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں یتیموں سے خیر خواہی، ان سے انصاف اور ان کے حقوق کی نگہداشت کی بڑی تفصیل سے تاکید فرمائی۔ لیکن یہ ذکر نہیں فرمایا۔ کہ یتیم پوتا بھی وراثت کا حقدار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود عبدالمطلب کی وفات کے وقت ان کے یتیم پوتے تھے لیکن آپ کو وراثت سے حصہ نہیں ملا۔ نہ ہی اللہ نے اس کا کہیں ذکر فرمایا۔ حالانکہ اگر یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دلانا اللہ کو منظور ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق بھی قرآن میں کوئی واضح حکم نازل فرما دیتے۔

اور ایسے حکم کا نازل نہ ہونا ہی اس بات کی قوی دلیل ہے۔ کہ یتیم پوتا اپنے چچا یا چچاؤں اور پھوپھیوں وغیرہ کی موجودگی میں وراثت کا حق دار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے مرنے والے باپ کی وراثت کا ہی حقدار ہوتا ہے۔

وراثت صرف اسے ملتی ہے جو میت کی وفات کے وقت موجود ہو:۔ اب یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے بعض متجددین کے واویلا کی بنا پر ہماری حکومت پاکستان نے قانون وراثت میں یتیم پوتے کو بھی حصہ دار قرار دیا ہے۔ اور یہ بات عقلی اور نقلی دونوں طرح سے غلط ہے۔ عقلی لحاظ سے اس طرح کہ کسی درخت کے پھل کو اس درخت کے ذریعہ زمین سے غذا اسی وقت تک ملتی ہے جب تک وہ درخت پر لگا رہے۔ اور جب درخت سے گر جائے تو اسے غذا نہیں مل سکتی۔ اور نقلی لحاظ سے اس طرح کہ تقسیم وراثت کے دو اصول ہیں۔ اور یہ دونوں کتاب اللہ سے مستنبط ہیں۔ پہلا یہ کہ وراثت میں حصہ صرف اس کو ملے گا۔ جو میت کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو۔ اور جو میت کی زندگی میں مر چکا اس کا کوئی حصہ نہیں۔

الاقرب فالاقرب کا اصول:۔ دوسرا الاقرب فالاقرب کا اصول ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار وراثت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور قریبی سے مراد یہ ہے جس میں کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ جیسے میت کی صلبی اولاد۔ اس لحاظ سے بھی یتیم پوتا اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں کی موجودگی میں وراثت کا حقدار قرار نہیں پاتا۔

یتیم پوتے کو وراثت میں حقدار ثابت کرنے والے اس معاملہ کو ایک شاذ قسم کی اور جذباتی قسم کی مثال سے سمجھانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ مثلاً زید کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بکر دوسرا عمر۔ زید کی وفات کے وقت بکر تو زندہ ہوتا ہے مگر عمر مر چکا ہوتا ہے۔ البتہ عمر کا ایک لڑکا خالد زندہ ہوتا ہے۔ اور سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بکر کو تو سارا ترکہ مل جائے اور عمر کے بیٹے خالد کو کچھ نہ ملے۔ حالانکہ وہ یتیم ہے اور مال کا زیادہ محتاج ہے۔ کیا اس کا جرم یہی ہے کہ اس کا باپ مر چکا ہے؟ پھر ان حضرات نے یتیم پوتے کو حقدار بنانے کے لیے قائم مقامی کا اصول وضع کیا۔ یعنی خالد اپنے باپ عمر کا قائمقام بن کر اپنے دادا کے ترکہ سے آدھا ورثہ لینے کا حقدار ہے۔

قائم مقامی کا اصول:۔ غور فرمائیے کہ اسلام کے پورے قانون وراثت میں آپ کو کہیں یہ 'قائم مقامی کا اصول' نظر آیا ہے۔ دراصل اس اصول کے موجد پرویز صاحب کے استاد محترم حافظ اسلم جیراج پوری ہیں۔ پھر اسی نظریہ کی پرویز صاحب نے آبیاری فرمائی۔ اس سے پہلے آپ کو یہ اصول پوری اسلامی شریعت میں اور اسلامی تاریخ میں کہیں نظر نہ آئے گا۔ وجہ یہ ہے کہ حق وراثت تو مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر جب حق وراثت ہی ختم ہو چکا تو قائم مقامی کس بات کی؟

پھر اس اصول کو تسلیم کرنے کے مفاسد بیشمار ہیں۔ مثلاً میت کی بیوی اس سے پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب اس نظریہ قائم مقامی کی رو سے بیوی کے اقربین جائز طور پر ترکہ سے حصہ طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی طرح میت اگر عورت ہے جس کا خاوند پہلے ہی فوت ہو چکا ہے تو خاوند کے رشتہ دار قائم مقام ہونے کی حیثیت سے ترکہ سے حصہ طلب کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ورثہ کے حقدار صرف بیٹے ہی نہیں بیٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ اور کسی بھی فوت شدہ بیٹی کی اولاد (یعنی بھانجے بھانجیاں بھی اس قائم مقامی کے اصول کے تحت ورثہ کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آگے چلتا ہی جاتا ہے۔ پھر اسے آخر کس قاعدہ کے تحت صرف یتیم پوتے تک ہی محدود رکھا جا سکتا ہے؟

اس اصول کا دوسرا مفسدہ یہ ہے کہ مثلاً زید کے دونوں بیٹے بکر اور عمر فوت ہو چکے ہیں۔ بکر کی اولاد صرف ایک بیٹا ہے مگر عمر کے پانچ بیٹے ہیں۔ اور میت کا اقرب ہونے کے لحاظ سے سب ایک درجہ پر ہیں۔ اور سارے ہی ایک جیسے قائم مقام ہیں۔ تو کیا ورثہ ان میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا؟ یا بکر کے بیٹے کو ۱/۲ اور عمر کے بیٹوں کو صرف دسواں دسواں حصہ ملے گا؟ ان میں سے کون سی تقسیم درست ہو گی اور کیوں؟

قائم مقامی کے اصول کے حق میں ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر دادا باپ کے فوت ہونے کی صورت میں باپ کا قائم مقام بن کر ترکہ سے حصہ پا سکتا ہے تو پوتا اپنے فوت شدہ باپ کا قائم مقام بن کر دادا سے کیوں حصہ نہیں پا سکتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تقسیم بھی قائم مقامی کے اصول کے تحت نہیں ہوتی۔ بلکہ الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت ہی ہوتی ہے۔ بالائی یا آبائی جانب میں باپ کے بعد صرف دادا ہی اقرب ہو سکتا ہے جب کہ ابنائی جانب میں میت کے اقرب اس کے بیٹے ہوتے ہیں نہ کہ پوتے۔ ہاں اگر صلبی اولاد کوئی بھی زندہ نہ ہو تو پھر پوتے بھی وارث ہو سکتے ہیں۔

ان حضرات کا اصل ہدف یتیم کی خیر خواہی نہیں بلکہ سنت میں کیڑے نکالنا اور اس کی مخالفت ہے۔ اور وہ بھی کسی قرآن کی آیت سے نہیں بلکہ اپنی وضع کردہ اصول قائم مقامی کی بنا پر جس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ مرے ہوئے رشتہ داروں کو زندہ تصور کر کے قائم مقامی کا حق قائم کیا جاتا ہے۔ ورنہ کتاب و سنت میں یتیم سے ہمدردی کی بہت سی صورتیں موجود ہیں۔ مثلاً مرنے والا خود اس کے لیے ایک تہائی ورثہ وصیت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یتیم پوتا وارث نہیں اور وصیت ہوتی ہی غیر وارث کے لیے ہے۔ وارث کے لیے وصیت نہیں ہو سکتی اور اگر مرنے والا وصیت نہیں کر سکا۔ یا اس کے حق میں وصیت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ بقیہ وارث اسے خود اپنی رضا سے اس میں شریک بنا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر مناسب سمجھیں تو اسے اپنی مرضی سے سارے کا سارا ترکہ بھی دے سکتے ہیں اور ان باتوں کا انھیں بھی ایسا ہی حق ہے جیسا مرنے والے کو وصیت کرنے کا حق ہے۔ پھر اگر مرنے والا دادا کو بھی اس سے کوئی ہمدردی نہ ہو اور نہ ہی دوسرے وارثوں کو ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا پوتا ہمدردی کا حقدار ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے اپنے مرنے والے باپ سے اسے اتنا مال و دولت مل گیا ہو کہ دوسرے اسے دینے کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔ اس صورت میں آپ کی ہمدردی اس کے کس کام آ سکتی ہے؟ (تفسیر تیسر القرآن)

آیت مبارکہ:

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾

لغۃ القرآن: [وَالّٰتِیۡ : اور جو عورتیں] [یَاۡتِیۡنَ : کرتی ہیں] [الۡفَاحِشَۃَ : بے حیائی] [مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ : تمہاری عورتوں میں سے] [فَاسۡتَشۡہِدُوۡا : تو گواہ طلب کرو] [عَلَیۡہِنَّ : ان پر] [اَرۡبَعَۃً : چار] [مِّنۡکُمۡ : تم میں سے] [فَاِنۡ : پھر اگر] [شَہِدُوۡا : وہ لوگ گواہی

دیں] [فَاَمْسِكُوْهُنَّ : تو تم لوگ روکو ان کو] [فِی الْبُیُوْتِ : گھروں میں] [حَتّٰی : یہاں تک کہ] [یَتَوَفّٰهُنَّ : پورا پورا لے لے ان کو] [الْمَوْتُ : موت] [اَوْ : یا] [یَجْعَلَ : بنائے] [اللّٰهُ : اللہ] [لَهُنَّ : ان کے لیے] [سَبِیْلاً : کوئی راہ]

ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کاارتکاب کر بیٹھیں توان پر اپنے لوگوں میں سے چار مردوں کی گواہی طلب کرو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں توان عورتوں کو گھروں میں بند کر دو یہاں تک کہ موت ان کے عرصہ حیات کو پورا کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ (یعنی نیا حکم) مقرر فرمادے

تشریح:

سابقہ آیات میں ان مفاسد کا سد باب کیا گیا ہے جو حد سے بڑھی ہوئی حبِ دنیا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے معاشرے میں ابتری پیدا ہوتی اور قطع رحمی کا راستہ کھلتا ہے۔ پیش نظر آیات میں ان مفاسد کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے جو صنفی انتشار اور جنسی بے راہ روی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ جس طرح مال سے حد سے بڑھی ہوئی محبت سے پیدا ہونے والے مفاسد انسانی معاشرہ کے لیے تباہ کن ہیں اسی طرح جنسی بے راہ روی، صنفی جذبات کی بے قیدی، اور شرم وحیا کے بندھن ڈھیلے پڑ جانے کے باعث جو انتشار اور انار کی پیدا ہوتی ہے اور قومی خصوصیات کو نقصان پہنچتا ہے وہ اس سے بھی ہول ناک ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ گزشتہ آیات میں اگر اسلامی معاشرے کو ایک طرح کی اخلاقی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرح کی اخلاقی خرابیوں سے بھی بچانے کی کوشش کی جاتی۔

عارضی تعزیراتی احکام

ان آیات میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں انھیں پڑھنے سے پہلے یہ بات یاد رہے کہ یہ اسلام کے قانون تعزیرات کے مستقل احکام نہیں ہیں بلکہ یہ وہ عارضی احکام ہیں جو مستقل قانون تعزیرات کے آنے سے پہلے مسلمان معاشرے کو صنفی جذبات کی بے قیدی سے بچانے کے لیے دیئے گئے۔ مسلمان معاشرہ وجود میں آچکا اور آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اسے اسلامی معاشرے میں ڈھالنے کے لیے جس مستقل قانون کی ضرورت تھی ابھی اس کے لیے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کیونکہ ابھی اس معاشرے میں نظم واستحکام پیدا نہیں ہوا تھا۔ مدینہ طیبہ کے اندر صرف مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم بھی آباد تھے۔ ان میں یہود خاص طور پر اپنا ایک مذہب اور قانون رکھتے تھے۔ ان پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا اور خود اوس اور خزرج جن کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی ابھی تک مکمل طور پر اسلام کی آغوش میں نہیں آئے تھے۔ پھر مدینہ کے اطراف میں غیر مسلم قبائل بھی موجود تھے وہ مسلمانوں سے تعلق تو رکھتے تھے لیکن پوری طرح اسلام کے زیر نگیں نہیں تھے۔ اس لحاظ سے نہ تو مسلمان ریاست میں ابھی اتنی قوت آئی تھی کہ وہ پورے مدینہ اور اس کے مضافات میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کر دیں اور نہ خود مسلمان ابھی قانونی پابندیوں کا بوجھ اٹھانے کے خوگر ہوئے تھے۔

ان حالات میں اسلام کا قانون تعزیرات نافذ کرنا سراسر حکمت اور مصلحت کے خلاف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام جس طرح شرک کو برداشت نہیں کرتا اسی طرح بے حیائی اور صنفی آوارگی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ نامساعد حالات میں بھی یہ بات تصور میں نہیں لائی جاسکتی کہ مسلمانوں کو اباحیت پسند بنادیا جائے یا ان کی اخلاقی اقدار میں دراڑیں آنے دی جائیں ان حالات میں ایک ہی راستہ تھا کہ مسلمانوں کو کچھ ایسے عارضی احکام دیئے جائیں جس سے ایک طرف اخلاقی اقدار کا تحفظ ہو سکے مسلمان اپنی امتیازی خصوصیات کو پہچان سکیں اور ساتھ ہی ساتھ اصل قانون تعزیرات کے لیے ذہنوں کو تیار ہونے کا موقعہ بھی ملے۔ چنانچہ ان دونوں آیتوں میں اسلامی حدود و تعزیرات کے حوالے سے عارضی اور ابتدائی احکام دیئے گئے ہیں اور جن کی جگہ بعد میں سورۃ النور میں مستقل احکام دیئے گئے۔ اس طرح سے مسلمان سوسائیٹی کا اخلاقی اعتبار سے تحفظ بھی ہو گیا اور مسلمان معاشرے میں کسی قانونی بحران کا خطرہ بھی پیدا نہیں ہوا۔

ان دونوں آیتوں میں ان عورتوں اور مردوں کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں جن سے زنا کا صدور ہوا ہے۔ فاحشۃ کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں اوز نا کے لیے اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اس عورت کے متعلق حکم دیا گیا ہے جو مسلمان ہو اور زنا کا ارتکاب کرے لیکن اس گناہ میں شریک مرد مسلمان معاشرے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو سزا دی جائے کیونکہ عورت تو مسلمان ہونے اور مسلمان معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اسلامی احکام کی پابند ہے۔ لیکن ایک ایسا غیر مسلم جو غیر مسلم معاشرے میں رہتا ہے، لیکن مسلمانوں میں اس کا آنا جانا، مسلمانوں سے سابقہ تعلقات کی بنا پر ابھی تک جاری ہے اور انھیں تعلقات نے یہ گل کھلایا ہے اور مسلمان معاشرہ ابھی ابتدائی سٹیج پر ہے۔ جس میں نہ حجاب کے احکام آئے ہیں، نہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تعلقات کی تہذیب کی گئی ہے اور نہ پوری طرح مسلمان آبادیوں میں اسلام پھیل سکا ہے۔ مسلمانوں کے اندر ابھی تک غیر مسلم گھرانے آباد ہیں اور ان سے قرابت داری کے رشتے بھی ہیں۔ ایسی صورتحال میں مرد و عورت دونوں کو قانونی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ اس لیے صرف عارضی طور پر مسلمان عورت کے بارے میں قانون دیا گیا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر تمہیں شبہ ہو کہ مسلمان عورتوں میں سے کسی عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، تو محض شبہ پر کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ اربابِ حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس گناہ کا ثبوت تلاش کریں۔ ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ طلب کیے جائیں، گواہ ایسے ہوں جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں یعنی مسلمان ہوں، مرد ہوں، بالغ ہوں، عاقل ہوں، آزاد ہوں اور کبائر سے بچنے والے ہوں، ان کی تعداد کسی طرح چار سے کم نہ ہو۔ چار سے کم کی گواہی قبول نہیں ہو گی۔ اسی طرح ایسے معاملے میں عورتوں سے بھی گواہی نہیں لی جاسکتی۔ عام معاملات میں شریعت دو گواہوں کا حکم دیتی ہے لیکن زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ ضروری ٹھہرائے گئے ہیں کیونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ جس سے عزت و عفت مجروح ہوتی ہے اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ضروری تھا کہ کڑی شرائط رکھی جائیں، گواہی کا نصاب دوگنا ہو تاکہ کوئی شخص کسی کی عزت و عفت پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ زنا کے معاملے میں چار گواہوں کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ اس معاملے میں دو افراد ملوث ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ایک ہی معاملہ دو معاملوں کے قائم مقام ہے اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا ایسا معاملہ جو دو معاملوں کے برابر ہے اس پر چار گواہ ہی ہونے چاہئیں۔ اگر چار گواہ گواہی دے دیں اور جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا یہ بیان فرمائی کہ ایسی بد چلن عورتوں کو گھروں میں بند کر دو اور ان کی موت آنے تک ان کی یہ سزا ختم نہ ہونے پائے یا تو انھیں موت اٹھالے اور یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور حکم نازل فرمادے۔ یہ آیت کا آخری جملہ خود بول رہا ہے کہ اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، وہ عارضی ہے۔ چنانچہ سورۃ نور میں بالآخر تفصیلی احکام نازل کر دیئے گئے اور ان

احکام میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی بلکہ دونوں اگر غیر شادی شدہ ہوں گے تو سو سو کوڑے لگیں گے اور اگر شادی شدہ ہوں گے تو سنگسار کیے جائیں گے۔

عورتوں کے بارے میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ انھیں موت تک گھروں میں بند رکھا جائے جبکہ مردوں کے بارے میں یہ سختی روا نہیں رکھی گئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مرد عورت کے ساتھ جرم میں شریک ہے وہ اسلامی معاشرے کا فرد نہیں اور پھر مرد میں قدرت نے نیکی اور بدی دونوں اعتبار سے قوت اور صراحت رکھی ہے۔ وہ عموماً عورت کو گناہ پر اکساتا ہے اور آگے بڑھ کر گناہ کا راستہ کھولتا ہے۔ اگر عورت کو گھر سے نکلنے کی آزادی حاصل رہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ اپنے آشنا سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گی اور اس کا آشنا موقعہ پا کر اپنی دوست خاتون سے ربط وضبط کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر اس خاتون نے دل سے توبہ نہ کی ہو تو وہ اس بہکاوے میں آکر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے، خفیہ طریقوں سے ملاقاتیں جاری رکھ سکتی ہے، وہ مرد بھی موقعہ پا کر اغوا کی واردات کر سکتا ہے۔ ان تمام قباحتوں سے بچانے کے لیے پابندی لگادی گئی کہ ایسی عورت کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوسری آیت میں زانی اور زانیہ یعنی مرد اور عورت دونوں کی سزا کا ذکر فرمایا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ انھیں ایذا پہنچائی جائے یعنی انھیں زجر و توبیخ کی جائے، ڈانٹ ڈپٹ کی جائے، تحقیر و تذلیل کی جائے، ضروری ہو تو مارنے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ کوئی ایک طریقہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ ایذا دہی کا جو طریقہ ارباب حل وعقد مناسب سمجھیں عمل میں لائیں۔ اگر وہ اس ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے بعد محسوس کریں کہ انھوں نے اپنے گناہ سے توبہ کر لی ہے اور اپنا چال چلن درست کر لیا ہے، تو پھر ان سے اعراض کریں، یعنی ان سے درگزر کریں اور یہ امید رکھیں کہ آئندہ وہ ایسی کوئی نازیبا حرکت نہیں کریں گے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ عارضی حکم تھا جو سورۃ نور کے نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا۔ البتہ شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا۔ (روح)

دوسری برائیوں کی طرح زنا بھی جاہلیت میں عام تھا۔ پیشہ ور عورتیں اپنے مکانوں پر مخصوص پرچم لہرایا کرتیں۔ اس فعل شنیع کے ارتکاب کو (چند ذی شرف خاندانوں کی مستورات کے علاوہ) چنداں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس فعل بد کی روک تھام کے لیے وعظ و نصیحت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے سزا اور سزا بھی سنگین مقرر کی۔ لیکن ابتدا ہی میں اس سنگین سزا کا نفاذ نہیں فرمایا بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً۔ ان دو آیتوں میں ابتدائی زمانہ میں جو سزا مقرر ہوئی اس کا ذکر ہے۔ سدی، قتادہ اور کئی دوسرے ائمہ تفسیر کے نزدیک پہلی آیت شادی شدہ عورتوں کے متعلق ہے کہ اگر وہ اس جرم کا ارتکاب کریں تو انھیں ان کے گھروں میں بطور سزا بحکم حاکم نظر بند کر دیا جائے یہاں تک کہ ان کی زندگی ختم ہو جائے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی دوسرا حکم نازل فرمادے۔ (یہ آخری کلمات اس بات کا صاف پتہ دیتے ہیں کہ یہ عمر قید کی سزا عارضی سزا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری سزا تجویز ہونے والی ہے) اور دوسری آیت میں غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا کا ذکر ہے۔ لیکن یہ سزا تب دی جائے گی جب جرم ثابت ہو جائے اور اس جرم کا تعلق کیونکہ عزت وآبرو سے ہے اس لیے اس کے اثبات کے لیے دو نہیں چار گواہوں کی ضرورت ہے۔ چاروں گواہ مسلمان ہوں، مرد ہوں، عاقل ہوں اور آزاد ہوں۔ کچھ عرصہ بعد سورۃ نور کی آیت (الزانیۃ والزانی) نازل ہوئی جس میں غیر شادی شدہ زناکار عورت اور مرد کی سزا بیان کی گئی اور سنت صحیحہ نے شادی شدہ عورت و مرد کی سزا رجم مقرر فرمائی۔ (اس کا تفصیلی بیان سورۃ نور میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ)۔ (ضیاء)

عورتوں کی بدکاری پر ابتدائی سزا کا بیان

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا تھا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی بدکاری پر انھیں سزا دینے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی در حقیقت ان کے ساتھ حسن سلوک ہے کیونکہ سزا ملنے کے بعد جب وہ بدکاری سے باز آجائیں گی تو آخرت کی سزا سے بچ جائیں گی ' دوسری وجہ یہ بتلانا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا معنی یہ نہیں ہے کہ انھیں بے حیائی کے لیے بے لگام چھوڑ دیا جائے اور تیسری وجہ یہ بتانا ہے کہ احکام شرعی اعتدال پر مبنی ہیں ' ان میں افراط اور تفریط نہیں ہے نہ یہ کہ عورت کو بالکل دبا کر رکھا جائے اور اس کے حقوق سلب کر لیے جائے اور نہ یہ کہ اسے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کی بے راہ روی پر بھی اس سے محاسبہ اور مواخذہ نہ کیا جائے۔

جمہور مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں بدکاری سے مراد زنا ہے کیونکہ جب عورت کی طرف زنا کی نسبت کی جائے تو اس کا ثبوت اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے خلاف چار مسلمان مرد گواہی دیں۔ اسلام میں ابتداء اس کی یہ سزا تھی کہ ایسی عورت کو تاحیات گھر میں قید کر دیا جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ پیدا کر دے ' اور وہ راہ یہ ہے کہ کنواری عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں اور شادی شدہ کو رجم کر دیا جائے اور اس راہ کا بیان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حدیث میں فرمایا ہے :

حضرت عبادہ بن صامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھ سے لو ' مجھ سے لو ' اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے راہ پیدا کر دی ' اگر کنوارہ مرد کنواری عورت کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے لگاؤ اور ایک سال کے لیے شہر بدر کر دو اور اگر شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ بدکاری کرے تو ان کو سو کوڑے لگاؤ اور ان کو سنگسار کر دو۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث : ۱۶۹۰ ' سنن ترمذی رقم الحدیث : ۱۴۳۹ ' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : ۲۵۵۰ ' سنن کبری للبیہقی ج ۸ ص ۲۲۲ ' صحیح ابن حبان ج ۱۰ ' ص ۴۴۲۵)

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت اس وقت منسوخ ہوگئی جب زنا کی حد کے احکام نازل ہوگئے اور ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ان کے نزدیک عورتوں کی بدکاری یا بے حیائی کے کام سے مراد زنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عورتوں کا اپنی جنس کے ساتھ لذت حاصل کرنا ہے ' لیکن ابو مسلم اصفہانی کا یہ قول اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس کے علاوہ اور کسی نے یہ تفسیر نہیں کی اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے کہ اللہ نے عورتوں کے لیے راہ پیدا کر دی۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۶۷ مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۳۹۸ ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : تو ان کے خلاف اپنے چار (مسلمان آزاد) گواہ طلب کرو۔

حدود میں عورتوں کی گواہی نامعتبر ہونے کے دلائل

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔

زہری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے بعد دونوں خلیفوں کے زمانہ میں یہ سنت تھی کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں۔

حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں۔

عامر بیان کرتے ہیں کہ حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔

سفیان بیان کرتے ہیں کہ میں نے حماد سے سنا ہے کہ حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔
شعبی بیان کرتے ہیں کہ حدود میں عورت کی گواہی جائز ہے نہ غلام کی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۶۰۔ ۵۹ 'مصنف عبدالرزاق ج ۷ ص ۳۳۰۔۳۲۹)
علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔
زنا کے ثبوت کے لیے چار مسلمان آزاد مردوں کی گواہی ضروری قرار دی ہے تاکہ زنا کے ثبوت کے لیے بار ثبوت سخت ہو زنا کے ثبوت کے لیے یہ کڑی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے تاکہ لوگوں کی عزتیں محفوظ رہیں اور کوئی شخص دو جھوٹے گواہ پیش کر کے کسی کو بلاوجہ متہم نہ کر سکے 'اگر کوئی شخص چار مسلمان گواہ پیش نہ کر سکا تو اس پر حد قذف لگے گی جو اسی (۸۰) کوڑے ہیں اور جس نے کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور اس پر چار گواہ نہ ہوں تو بندوں کا پردہ رہے گا 'یا اس لیے کہ زنا کا ارتکاب مرد اور عورت کرتے ہیں اور ہر دو کو سزا ملتی ہے اس لیے اس میں چار گواہ مقرر کئے گئے تاکہ ہر ایک کے حق میں دو دو گواہ ہوں اور نصاب شہادت مکمل ہو جائے لیکن یہ کوئی قوی وجہ نہیں ہے۔

حد زنا میں چار مردوں کی گواہی پر اعتراض کا جواب

چار مرد گواہوں کی شرط پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مثلا لڑکیوں کے ہوسٹل میں ایک لڑکی کی جبرا اور ظلما عصمت دری کی گئی اور موقع پر صرف لڑکیاں ہیں یا کسی صورت میں کوئی بھی نہیں ہے وہ لڑکی کیسے انصاف حاصل کرے گی 'اس کا جواب یہ ہے کہ سزا اس وقت دی جاتی ہے جب قانونی تقاضے پورے ہوں مثلا اگر جنگل میں جہاں کوئی نہ وہاں کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو گواہ نہ ہونے کی وجہ سے قاتل کو سزا نہیں ملے گی ایسی صورتوں میں مجرم دنیاوی سزا سے تو بچ جائے گا لیکن اخروی سزا کا مستحق ہو گا۔
کیا زانی کے خلاف استغاثہ کرنے والی لڑکی پر حد قذف لگے گی؟
ایک وحشت زدہ کنواری لڑکی جس کا لباس تار تار اور خون آلود ہے روتی اور آنسو بہاتی ہوئی پولیس کے پاس پہنچتی ہے اور کہتی ہے کہ فلاں شخص نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا ہے۔اس شخص کو فورا موقع واردات پر گرفتار کر لیا جاتا ہے اور میڈیکل رپورٹ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس لڑکی سے دخول کیا گیا ہے اور اس شخص کی منی اس لڑکی کے اندام نہانی میں موجود ہے تو اب سوال یہ ہے کہ اس قرینہ کی وجہ سے اس شخص پر زنا کی حد لازم ہو گی یا بغیر چار مرد گواہوں کے اس شخص کی طرف زنا کی نسبت کرنے کی وجہ سے اس لڑکی پر حد قذف لگائی جائے گی؟اس کا حل یہ ہے کہ ثبوت زنا کے لیے یقینا یہ قوی قرینہ ہے لیکن اس شخص پر حد لگانے کے بجائے اس کو تعزیرا سزا دی جائے جیسا کہ فقہاء شراب کی بو کی بناء پر شراب کی حد تو جاری نہیں کرتے لیکن تعزیرا سزا دیتے ہیں 'باقی رہا یہ سوال کہ بغیر چار مرد گواہوں کے کسی شخص کی طرف زنا کی نسبت کرنا قذف ہے اور اس کو تہمت لگانا ہے اس لیے اس لڑکی پر حد قذف لگنی چاہیے؟اس کا جواب یہ ہے کہ قذف اس وقت ہو گا جب کوئی شخص کسی کو متہم اور بدنام کرنے کی حیثیت سے مسلمانوں میں ایک فحش بات کو پھیلانے کی غرض سے اس پر زنا کی تہمت لگائے 'اس کے علاوہ اگر کسی غرض صحیح کی وجہ سے کوئی شخص کسی کی طرف زنا کی نسبت کرے تو یہ قذف نہیں ہے مثلا ایک شخص حاکم کے سامنے اعتراف جرم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں عورت کے ساتھ زنا کیا ہے اس لیے مجھ پر حد جاری کی جائے۔اب اس کے اعتراف سے اس پر تو زنا کی حد لازم ہو جائے گی لیکن اس کے اعتراف سے اس عورت پر اس وقت تک حد لازم نہیں ہو گی جب تک کہ وہ عورت خود اعتراف نہ کرے اور اس شخص نے جو اعتراف جرم کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس نے فلاں عورت کے ساتھ زنا کیا ہے اور اس عورت کی طرف زنا کی

نسبت کی ہے یہ قذف نہیں ہے ' اور نہ ان کلمات سے اس شخص پر حد قذف لازم ہو گی کیونکہ ان کلمات سے اس شخص کا مقصود اپنے جرم کا اعتراف کرنا ہے نہ کہ کسی کو بدنام اور متہم کرنا مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور تم میں سے جو دو شخص بے حیائی کا ارتکاب کریں تو تم ان کو اذیت پہنچاؤ پس اگر وہ توبہ کرلیں تو ان سے در گزر کرو۔

"دو شخصوں کی بے حیائی "کی تفسیر میں متعدد اقوال :

اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے کہا اس سے مراد کنوارہ مرد اور کنواری عورت ہے اور اس سے پہلی آیت میں شادی شدہ عورتیں مراد تھیں اس کی دلیل یہ ہے :

سدی نے کہا اس آیت میں کنواری لڑکیاں اور کنوارے لڑکے مراد ہیں جن کا نکاح نہیں ہوا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کو (مار پیٹ سے) ایذا پہنچاؤ۔ ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔

بعض نے کہا پہلی آیت میں زناکار عورتیں مراد تھیں اور ان کو مار پیٹ سے ایذا پہنچاؤ ' اس کی دلیل یہ ہے کہ مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا ہے اس آیت سے زناہ کرنے والے مرد مراد ہیں ' اور بعض نے کہا اس آیت میں مرد اور عورت دونوں مراد ہیں خواہ وہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو مار پیٹ کر ایذا پہنچائی جائے یہ عطا اور حسن بصری کا قول ہے۔ (جامع البیان ج ۴ ص ۲۰۰ ' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ' ۱۴۰۹ھ)

ایذاء پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس بے حیائی پر ملامت کی جائے اور ڈانٹ ڈپٹ کی جائے اور مار پیٹ کی جائے۔ حسن بصری کا قول یہ ہے کہ عورتوں کو پہلے ملامت کی جائے اور مارا جائے اور پھر گھروں میں قید کر دیا جائے اور اس آیت کا حکم مقدم ہے اور اس سے پہلی والی آیت کا حکم موخر ہے ' بہر حال جمہور مفسرین کے نزدیک ان دونوں آیتوں کا حکم سورۃ نور سے منسوخ ہو گیا جس میں کنواروں کے لیے زنا کی حد سو کوڑے بیان کی گئی ہے اور احادیث متواترہ سے جن میں شادی شدہ زانیوں کی حد رجم (سنگسار کرنا) بیان کی گئی ہے البتہ ابو مسلم کے نزدیک پہلی آیت سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنی جنس کے ساتھ شہوانی لذت حاصل کرتی ہیں اور دوسری آیت سے مراد وہ مرد ہیں جو ایک دوسرے سے عمل قوم لوط (اغلام) کر کے لذت حاصل کرتے ہیں۔ ابو مسلم کے نزدیک یہ دونوں آیتیں منسوخ نہیں ہیں لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ صحابہ کرام اور فقہاء تابعین نے عمل قوم لوط کی حرمت پر اس آیت سے استدلال نہیں کیا تاہم چونکہ یہاں اغلام کی بحث آ گئی ہے اس لیے ہم اغلام کی حرمت پر قرآن مجید اور احادیث سے دلائل کا ذکر کریں گے۔

اغلام کی حرمت پر قرآن مجید کی آیات

(آیت) "ولوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ ما سبقکم بہا من احد من العلمین، انکم لتاتون الرجال شہوۃ من دون النسآء بل انتم قوم مسرفون"۔ (الاعراف : ۸۱۔۸۰)

ترجمہ : لوط کو بھیجا جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کی، بیشک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرتے ہو بلکہ تم (انسانیت کی) حد سے تجاوز کرنے والے ہو۔

" (آیت) "ولوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ وانتم تبصرون، ائنکم لتاتون الرجال شہوۃ من دون النسآء بل انتم قوم تجھلون"۔ (النمل : ۵۵۔ ۵۴)

ترجمہ : اور لوط کو (یاد کیجئے) جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تم (آپس میں) دیکھتے ہوئے بے حیائی کرتے ہو، بیشک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرتے ہو بلکہ تم جاہل لوگ ہو۔

"(آیت) "وامطرنا علیھم مطرافسآء مطرالمنذرین"۔ (النمل : ۵۸)

ترجمہ : اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی سو جو لوگ ڈرائے ہوئے تھے ان پر کیسی بری بارش ہوئی۔

"(آیت) "فلماجآء امرنا جعلنا عالیھا سافلھا وامطرنا علیھا حجارۃ من سجیل منضود، مسومۃ عند ربک وماھی من الظالمین ببعید"۔ (ھود : ۸۳۔ ۸۲)

ترجمہ : اور جب ہمارا عذاب آپہنچا تو ہم نے (قوم لوط کی) بستی کے اوپر کے حصہ کو نچلا حصہ کردیا اور ہم نے ان پر لگاتار کنکر پتھر برسائے جو آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے ' اور پتھر برسانے کی یہ سزا ظالموں کے لیے مستعبد نہیں ہے۔

اغلام کی حرمت پر احادیث اور آثار

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس چیز کا مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف ہے وہ قوم لوط کا عمل (اغلام ' مرد کا اپنی جنس کے ساتھ بدفعلی کرنا) ہے۔ (یہ حدیث حسن ہے) (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۴۵۷ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۵۶۳ ' المستدرک صحیح الاسناد : ج ۴ ص ۳۵۷)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص کو تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۴۴۶۲ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۴۵۶ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۵۶۱ ' شعب الایمان ' رقم الحدیث : ۵۳۸۶)

حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں ان میں قتل (عام) ہوجاتا ہے اور جن لوگوں میں بےحیائی پھیل جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان میں موت کو مسلط کردیتا ہے اور جو لوگ زکوۃ نہیں دیتے ان سے بارش کو روک لیا جاتا ہے۔ یہ حدیث امام مسلم کی شرح کے مطابق صحیح ہے۔ (المستدرک ج ۲ ص ۱۲۶ ' امام ذہبی نے بھی اس حدیث کی موافقت کی ہے)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے سات آدمیوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت کرتا ہے ' اور ان میں سے ایک شخص پر تین بار لعنت کرتا ہے اور ہر ایک پر ایسی لعنت کرتا ہے جو اس کو کافی ہوگی۔ فرمایا : جو قوم لوط کا عمل کرے وہ ملعون ہے ' جو قوم لوط کا عمل کرے وہ ملعون ہے جو قوم لوط کا عمل کرے وہ ملعون ہے '۔ جو غیر اللہ کے لیے ذبح کرے وہ ملعون ہے ' جو کسی جانور سے بدفعلی کرے وہ ملعون ہے ' جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کرے وہ ملعون ہے ' جو شخص ایک عورت اور اس کی بیٹی کو نکاح میں جمع کرے وہ ملعون ہے ' جو شخص زمین کی حدود میں تبدیلی کرے وہ ملعون ہے ' جو شخص اپنے مولا کے غیر کی طرف منسوب ہو وہ ملعون ہے '(محرز بن عارون کے سوا اس حدیث کی سند صحیح ہے جمہور کے نزدیک وہ ضعیف ہے ' لیکن امام ترمذی نے اس کی حدیث کو حسن کہا ہے ' حاکم نے اس حدیث کو کہا یہ صحیح الاسناد ہے) (المعجم الاوسط ' رقم الحدیث : ۸۴۹۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چار آدمی اللہ کے غضب میں صبح کرتے ہیں اور اللہ کے غضب میں شام کرتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ مرد جو عورت کی مشابہت کریں اور وہ عورتیں جو مردوں کی مشابہت کریں اور جو شخص جانوروں سے بدفعلی کرے اور جو مرد ' مرد سے بدفعلی کرے۔

اس حدیث کے ایک راوی محمد بن سلام خزاعی کی حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت غیر معروف ہے ' امام بخاری نے کہا اس حدیث میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔ امام ابن عدی نے کہا محمد بن سلام کی وجہ سے یہ حدیث منکر ہے ' ہرچند کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن ترہیب میں معتبر ہے۔ (المعجم الاوسط ' رقم الحدیث: ٦٨٥٤ ' شعب الایمان ' رقم الحدیث: ٥٣٨٥ ' کامل ابن عدی: ج ٦ ص ٢٢٣٣)

محمد بن منکدر بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیق (رض) کو لکھا کہ عرب کے بعض قبائل میں ان کو ایک مرد ملا جو مرد کے ساتھ بدفعلی کرتا ہے حضرت ابوبکر (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کو جمع کیا جن میں حضرت علی بھی تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) حضرت علی نے فرمایا یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کو صرف ایک امت نے کیا تھا اور تمہیں معلوم ہے اللہ نے ان پر کیسا عذاب بھیجا ' میرے رائے ہے کہ اس شخص کو آگ میں جلادیا جائے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام اصحاب نے اس پر اتفاق کرلیا کہ اس شخص کو آگ میں جلادیا جائے ' پھر حضرت ابوبکر (رض) نے اس شخص کو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ (یہ حدیث حسن ہے) شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٣٨٩)

امام بخاری نے عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی (رض) کے پاس کچھ زندیق لائے گئے انھوں نے ان کو جلادیا۔ حضرت ابن عباس (رض) کو یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا اگر میں وہاں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا ' کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے عذاب کے ساتھ سزا دینے سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح بخاری ' رقم الحدیث: ٦٩٢٢) چونکہ وہاں پر موجود حضرت علی (رض) تک یہ حدیث نہیں پہنچی تھی اس لیے حضرت علی (رض) نے یہ مشورہ دیا اور دیگر صحابہ نے اس مشورہ کی تائید کی۔

عمل قوم لوط کی حد یا تعزیر میں مذہب اربعہ

درر غرر میں مذکور ہے کہ جو شخص عمل قوم لوط کرے اس کو تعزیر لگائی جائے گی مثلا اس کو آگ میں جلادیا جائے۔

اور اس پر دیوار گرادی جائے گی ' اور اس کو کسی بلند جگہ سے الٹا کرکے گرادیا جائے گا اور اس پر پتھر مارے جائیں گے اور الحاوی میں مذکور ہے کہ اس کو کوڑے مارنا زیادہ صحیح ہے ' فتح القدیر میں مذکور ہے اس پر تعزیر ہے اور اس کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے حتی کہ وہ مرجائے یا توبہ کرلے ' اور اگر وہ دوبارہ یہ عمل کرے تو اس کو امام سیاستہ قتل کردے ' امام کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ (النہر والبحر) اسی طرح استمناء حرام ہے ' صحیح مذہب یہ ہے کہ جنت میں عمل قوم لوط نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے اور اس کو قبیح اور خبیث فعل قرار دیا ہے اور جنت میں اس عمل سے پاک ہے (فتح القدیر) الاشباہ والنظائر میں مذکور ہے کہ اس فعل کی حرمت عقلی ہے اس لیے جنت میں اس کا وجود نہیں ہوگا ایک قول یہ ہے کہ اس کی حرمت شرعی ہے ' البحر میں مذکور ہے کہ اس کی حرمت عقلا شرعا اور طبعا زنا سے زیادہ شدید ہے اور زنا کی حرمت طبعا نہیں ہے کیونکہ جس عورت کی طرف طبیعت راغب ہو اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ کنیز ہو تو اس کو خرید کر اس سے شہوت پوری کی جاسکتی ہے ' اس کے برخلاف اگر کسی لڑکے پر طبیعت راغب ہو تو اس سے قضاء شہوت کا کوئی جائز ذریعہ نہیں ہے ' امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر حد نہیں ہے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ یہ کم درجہ کا جرم ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حد

مجرم کو جرم سے پاک کر دیتی ہے (یہ امام شافعی کا قول ہے) بلکہ حد نہ ہونا اس جرم کی شدت کی وجہ سے ہے اور جو شخص اس عمل کو جائز سمجھے وہ جمہور کے نزدیک کافر ہے۔ (الدر مختار علی ھامش رد المختار ج ۳ ص ۵۶۔ ۱۵۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

زیادات میں مذکور ہے اس کے فاعل کی سزا امام کی رائے پر موقوف ہے جب کہ فاعل عادی ہو خواہ اس کو قتل کر دے خواہ اس کو مارے اور قید کر دے 'الاشباہ میں مذکور ہے جب تک وہ بار بار یہ فعل نہ کرے امام اعظم کے نزدیک اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ علامہ بیری نے کہا ہے کہ دو بار اس فعل کے کرنے پر اس کو قتل کر دیا جائے گا فتح القدیر میں ہے کہ اس کو بلندی سے گرانے کی سزا اس لیے ہے تاکہ قوم لوط کی سزا سے مشابہت ہو کیونکہ ان کی زمین کو الٹ پلٹ کر دیا گیا تھا۔ ابن الولید معتزلی نے کہا جنت میں اس فعل کے اندر کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ دنیا میں اس فعل سے اس لیے منع کیا گیا ہے اس سے نسل منقطع ہوتی ہے اور یہ فعل کے اندر کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ دنیا میں اس فعل سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اس سے نسل منقطع ہوتی ہے اور یہ فعل محل نجاست میں ہوتا ہے اور جنت میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں 'اس لیے جنت میں شراب حلال ہے کیونکہ اس میں نشہ نہیں ہوگا اور نہ عقل زائل ہوگی 'امام ابو یوسف نے جواب دیا کہ مردوں کی طرف جنسی میلان کرنا ان کے لیے باعث عار ہوتا ہے اور یہ فی نفسہ قبیح ہے کیونکہ ان کو اس عمل کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اسی وجہ سے اس فعل کو کسی شریعت میں جائز نہیں کیا گیا 'اس کے برعکس شراب بعض شریعتوں میں جائز تھی اور جنت کو باعث عار اور قابل نفرت کاموں سے پاک رکھا گیا ہے 'لیکن ابن الولید نہیں مانا اس نے کہا عار کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نجاست کے ساتھ تلویث ہے اور جب جنت میں نجاست نہیں ہوگی تو عار بھی نہیں ہوگا 'اس کے ثبوت کے لیے دو گواہ کافی ہیں نہ کہ چار اور اس میں صاحبین کا اختلاف ہے۔ (رد المختار ج ۳ ص '۱۵۶۔ ۱۵۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت ۱۴۰۷ھ)

عمل قوم لوط سب سے بڑی بے حیائی کا کام ہے اس لیے اس پر سب سے بڑی حد ہے اس میں دو قول ہیں :

(۱) امام شافعی نے کہا ہے کہ شادی شدہ ہو یا کنوارہ اس کو پتھر مار مار کر قتل کر دیا جائے (کتاب الام ج ۷ ص ۸۳)

حضرت عبداللہ بن عباس 'سعید بن مسیب 'امام مالک 'امام احمد اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ قتل کرنے کے دو طریقے ہیں یا تو رجم کر دیا جائے یہ فقہائے بغداد کا قول ہے یا تلوار سے قتل کر دیا جائے یہ فقہائے بصرہ کا قول ہے۔

(۲) شادی شدہ کو رجم کر دیا جائے اور کنوارے کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اس کو ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا جائے۔ اس کی حد میں فاعل اور مفعول بہ برابر ہیں البتہ اگر مفعول نابالغ ہو تو اس پر تعزیر ہے۔ (الحاوی الکبیر ج ۱۷ ص ۶۲ ملخصا مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۴ھ)

امام احمد بن حنبل کے نزدیک عمل قوم لوط کرنے والے کی حد یہ ہے کہ اس کو رجم کر دیا جائے خواہ وہ شادی شدہ ہو خواہ کنوارہ۔ امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ کنوارے کو کوڑے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا۔ (المغنی ج ۹ ص '۵۸ مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ' ۱۴۰۵ھ ')

جس شخص نے قوم لوط کا عمل کیا ہو تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو رجم کر دیا جائے خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ 'فاعل کی اس بات میں تصدیق نہیں کی جائے گی کہ اس نے خوشی سے یہ فعل کیا تھا یا مجبوراً اگر مفعول بہ کے ساتھ جبراً یہ فعل کیا گیا یا بچہ کے ساتھ اس کی خوشی سے کیا گیا ہو تو اس کو رجم نہیں کیا جائے گا 'اور صرف فاعل کو رجم کیا جائے گا اس کے ثبوت کے لیے بھی چار گواہ ضروری ہیں جس طرح زنا میں چار مرد گواہوں کی شرط ہے۔ (الخرشی علی مختصر سید خلیل ج ۸ ص ۸۲ 'مطبوعہ دار صادر بیروت)

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس عمل پر حد ہے اور بظاہر اس کا ثبوت بھی چار گواہوں سے ہوگا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر تعزیر ہے کیونکہ اس کی سزا حد زنا کی طرف معین اور قطعی نہیں ہے نیز امام ابو حنیفہ کے نزدیک حد کا نہ ہونا تخفیف کے لیے نہیں بلکہ تغلیظ کے لیے ہے۔ (تبیان)

فوائد

1۔ جب فاحشہ معرفہ ہو کر آئے تو اس سے مراد زنا ہوتی ہے، لہٰذا یہاں الفاحشہ سے مراد زنا ہے۔
2۔ یعنی ان کو گواہ بنالو، اس صورت میں تو عام مسلمانوں سے خطاب ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ احکام بیویوں کے متعلق ہیں لونڈیوں کے یہ حکم نہیں اس لیے نسائکم فرمایا گیا۔
3۔ اس آیت سے سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ نمبر ا زنا کے گواہ چار ہوں گے۔ نمبر ۲ چاروں مرد ہوں کوئی عورت نہ ہو۔ نمبر ۳ چاروں متقی آزاد ہوں جیسا کہ منکم سے معلوم ہوا۔ نمبر ۴ جب خاوند اپنی بیوی کے زنا پر چار گواہ بنائے تو پھر لعان نہ ہوگا بلکہ عورت پر زنا کی سزا یعنی رجم ہوگی، اگر گواہ کوئی خاوند کے پاس نہ ہو تو لعان ہے۔ نمبر ۵ فاسقہ عورت کو طلاق دے دینا واجب نہیں بلکہ فسق سے روکنا واجب ہے جیسا کہ فامسکوھن سے معلوم ہوا۔
4۔ یعنی اپنی زانیہ بیویوں کو گھروں میں ایسا قید کرو کہ باہر نہ نکل سکیں، یہاں تک کہ ان کی زندگی ختم ہو جاوے یا زنا کی سزا نازل ہو۔
5۔ یہ آیت حدود اور سزاؤں کی آیت سے منسوخ ہے اور نسخ کی طرف اسی آیت میں اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ انھیں موت آنے یا سزا کا قانون بننے تک قید میں رکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیات اور احکام میں نسخ جائز بلکہ واقع ہے۔

آیت مبارکہ:

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

لغات القرآن: [وَالَّذٰنِ : اور جو دو مرد] [يَاْتِيٰنِهَا : مرتکب ہوں] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [فَاٰذُوْهُمَا : تو انہیں ایذا دو] [فَاِنْ : پھر اگر] [تَابَا : وہ توبہ کریں] [وَاَصْلَحَا : اور اصلاح کرلیں] [فَاَعْرِضُوْا : تو پیچھا چھوڑ دو] [عَنْهُمَا : ان کا] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [تَوَّابًا : توبہ قبول کرنے والا] [رَّحِيْمًا : نہایت مہربان]

ترجمہ : اور تم میں سے جو بھی کوئی بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو ایذا پہنچاؤ، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں تو انھیں سزا دینے سے گریز کرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔

تفسیر و تشریح:

معاشرتی اور معاشی استحاصل ختم کرنے کے احکامات کے بعد اخلاقی بے راہ روی کے خاتمہ کا حکم

نزول اسلام سے پہلے روم ' ایران اور دیگر ممالک کے ساتھ عرب معاشرہ میں ایک طبقہ پرلے درجے کی بے حیائی ' فحاشی اور بدکاری میں مبتلا تھا۔ بعض شہروں میں جن میں مدینہ بھی شامل تھا باقاعدہ فحاشی کے اڈے قائم ہو چکے تھے۔ بے حیائی کا ارتکاب کرنے والی عورتیں اپنے گھروں پر جھنڈا نما کپڑا لٹکایا کرتی تھیں تاکہ بے حیا لوگ آسانی کے ساتھ راغب ہو سکیں۔ یہ دھندہ کنواری عورتیں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتیں بھی کیا کرتی تھیں۔ اسلام نے اس بے حیائی کو روکنے اور ایسے مقدّمات کی تحقیق کے لیے ایک نظام اور طریق کار وضع فرمایا کہ جرم ثابت ہونے پر پہلے نسبتاً ہلکی سزا تجویز کی گئی کہ اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت بدکاری کا ارتکاب کرے تو اس پر چار عادل گواہ پیش کیے جائیں جو صرف عادل مردوں سے ہونے چاہئیں اگر وہ اسلامی تقاضوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک گواہی دیتے ہیں تو پھر ایسی عورتوں کو ان کے گھروں میں اس وقت تک محصور رکھا جائے جب تک اللہ تعالیٰ کوئی اور حکم نازل نہیں فرماتے یا پھر انھیں اس حالت میں موت آجائے۔
اس تقدیر پر یہ آیتیں منسوخ الحکم ہیں اور ان میں امام ہمام ابو حنیفہ (رض) کے لیے دلیل ظاہر ہے کہ لواطت میں تعزیر ہے حد نہیں۔
انما التوبۃ علی اللہ۔ بیشک توبہ۔ انما حصر کے لیے توبہ کے قبول کی خبر دی گئی۔ توبہ کے لفظی معنی ہیں لوٹنا، پلٹ کر آجانا، جب کوئی گناہ کرے تو اللہ کے حضور اپنی غلطی کا اقرار کرے اور سچے دل سے عہد کرے کہ وہ باز رہے گا۔
للذین یعملون السوء بجھالۃ۔ اللہ توبہ انھیں لوگوں کی قبول کرتا ہے جو کام جہالت سے کرتے ہیں۔ جو لوگ نادانی و حماقت سے گناہ کرتے ہیں پھر موت سے پہلے توبہ کرلیں تو ان کی توبہ ضرور ہی قبول ہو جاتی ہے۔
ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا
پھر جلدی سے توبہ کرتے ہیں تو انھیں اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا اور حکمت والا ہے۔
حضرت ابو سعید خدری (رح) سے روایت ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ شیطان نے بارگاہ رب العزت میں کہا تیری عزت و جلال کی قسم میں ابن آدم کو جب تک ان میں جان رہے گی بہکاتا رہوں گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم جب تک وہ مجھ سے بخشش طلب کرتے رہیں گے میں ان کو بخشتا رہوں گا۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابو یعلی رحمہم اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔
اس کے بعد اس امر کی وضاحت کی گئی کہ توبہ کس کی مقبول ہے اور کس کی مردود تاکہ توبہ ایک رسمی فعل نہ ہو جائے۔
ابن بحر (رح) کہتے ہیں کہ پہلی آیت والتی یاتین الفاحشۃ میں ان عورتوں کے لیے حکم ہے جو عورتوں کے ساتھ مساحقت یعنی چپٹی کرتی ہیں اور دوسری آیت والذان سے لواطت کرنے والے مردوں کا حکم ہے اور زانی اور زانیہ کا مفصل حکم سورۃ نور میں بیان فرمایا گیا۔

توبہ کے بعد ملامت نہ کرو

یعنی اس کے بعد اگر وہ بدکاری سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اپنے اعمال کی درستی کرلیں تو اب ان کے پیچھے مت پڑو اور زجر وملامت سے ستانا چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے اور ان پر مہربانی فرمانے والا ہے تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی لونڈی بدکاری کرے تو اس کا مالک اسے حد لگادے اور ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے یعنی حد لگ جانے کے بعد پھر اسے عار نہ دلایا کرے کیونکہ حد کفارہ ہے۔

چار گواہ

پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزدہ ہوجائے تو اس کے ثبوت کے لیے چار گواہ مرد طلب کیے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوت زنا کے لیے وہ چار گواہ طلب کریں جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

زنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے جس سے عزت اور عفت مجروح ہوتی ہے اور خاندانوں کے ننگ وعار کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے اولاً تو یہ شرط لگائی کہ کہ مرد ہی گواہ ہوں عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا، ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے جس کا وجود میں آنا شاذونادر ہی ہوسکتا ہے یہ سختی اس لیے اختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی بہن ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگائیں یا دوسرے بدخواہ لوگ دشمنی کی وجہ سے الزام اور تہمت لگانے کی جرات نہ کرسکیں کیونکہ اگر چار افراد کم لوگ زنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیے جاتے ہیں اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے، ان پر حد قذف جاری کردی جاتی ہے۔

سورۃ نور میں واضح طور پر ارشاد فرمایا (لولا جاؤ علیہ باربعۃ شھداء فاذلم یاتو بالشھداء فاولئک عنداللہ ھم الکاذبون۔ کہ جو لوگ چار گواہ نہ لاسکیں وہ جھوٹے ہیں۔ بعض اکابر نے چار گواہوں کی ضرورت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس معاملہ میں چونکہ دو افراد ملوث ہوتے ہیں مرد اور عورت تو گویا کہ یہ ایک ہی معاملہ تقدیر دو معاملوں کے حکم میں ہے اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا اس کے لیے چار گواہ ضروری ہوں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے تعرض مت کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دینے کے بعد اگر انھوں نے توبہ کرلی تو پھر انھیں ملامت مت کرو اور مزید سزا مت دو، یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہوگئی اس لیے یہ توبہ سزا کے بعد مذکور ہے جیسا کہ فاء کی تفریع سے ظاہر ہے ہاں اگر توبہ نہ کی ہو تو سزاء کے بعد بھی ملامت کرسکتے ہیں۔

شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی سزا:

حضرت ابن عباس (رض)، سبیل، کی تفسیر فرماتے ہیں، یعنی الرجم للثیب والجلد للبکر، کہ شادی شدہ کے حق میں زنا کی حد اس کو سنگسار کردینا ہے اور غیر شادی شدہ کے لیے اس کو کوڑے مارنا (بخاری وکتاب التفسیر، ص 657) مرفوع احادیث میں بھی اس سبیل کا بیان رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے اور شادی شدہ، غیر شادی شدہ ہر ایک کے لیے الگ الگ حکم بیان کیا گیا ہے، رسول کریم نے حضرت ماعز بن مالک (رض) اور قبیلہ ازد کی ایک عورت پر زنا کی حد جاری فرمائی تھی، اور یہ دونوں چونکہ شادی شدہ تھے اس

لیے ان کو سنگسار کر دیا گیا تھا نیز ایک یہودی کو بھی زنا کی وجہ سے رجم کیا تھا، اور اس کے حق میں یہ فیصلہ توراۃ کے حکم پر کیا گیا تھا، غیر شادی شدہ کا حکم خود قرآن کریم کی سورت نور میں مذکور ہے، الزانیۃ والزانی فاجلدو کل واحد منھمامائۃ جلدۃ، زناکار عورت اور زناکار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، حضرت عمر (رض) کا ارشاد ہے : اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی بر حق بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب بھی نازل فرمادی جو کچھ وحی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی، اس میں رجم کی آیت بھی تھی، رسول اللہ نے رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے رجم کیا، رجم کا حکم اس شخص کے لیے ثابت ہے جو زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت

لواطت کی سزا

احادیث وآثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے : حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے اور ان سات میں سے ایک پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے اور باقی پر ایک دفعہ فرمایا، ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے۔ (الترغیب والترہیب)۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہ کے غضب میں ہوتے ہیں، اور شام کو بھی، اللہ جل شانہ، ان سے ناراض ہوتے ہیں میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مرد جو عورت کی طرح بنتے ہیں اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے اور وہ جو مرد سے قضاء شہوت کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے فرمایا، رسول اللہ نے ارشاد فرمایا، جس کو تم قوم لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھ لو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔ حافظ زکی الدین نے ترغیب وترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن الزبیر، اور ہشام بن عبدالملک نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلاڈالا تھا۔

مذکورہ روایات میں قوم لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت لوط جس قوم کی طرف مبعوث کیے گئے تھے وہ قوم کفر وشرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی، اور جب حضرت لوط (علیہ السلام) کی دعوت و تبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اٹھالیا تھا، اور اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا جس کا ذکر ورہ اعراف میں آئے گا، ان شاء اللہ۔

بیویوں سے غیر فطری فعل

مندرجہ بالا روایات استلذاذ ابالجنس سے متعلق تھیں روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ جل شانہ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے۔ خزیمہ بن ثابت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا، اللہ جل شانہ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے یہی الفاظ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے (پھر فرمایا عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو)۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ کا راشاد ہے وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے (الترغیب ولترھیب)۔ حضرت ابوہریرہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا غیر فطری طریقہ سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب سے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے تو اسی سے لوگ اس دین سے منکر ہوگئے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا۔ اس قبیح فعل کے لیے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں توفقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ

آیت مبارکہ:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

لغات القرآن: [اِنَّمَا : اس کے سوا نہیں] [التَّوْبَةُ : توبہ قبول کرنا] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر (اللہ کے ذمے)] [لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے] [يَعْمَلُوْنَ : وہ کرتے ہیں] [السُّوْٓءَ : برائی] [بِجَهَالَةٍ : نادانی سے] [ثُمَّ : پھر] [يَتُوْبُوْنَ : توبہ کرتے ہیں] [مِنْ قَرِيْبٍ : جلدی سے] [فَ اُولٰٓئِكَ : پس یہی لوگ ہیں] [يَتُوْبُ : توبہ قبول کرتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلَيْهِمْ : ان کی] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ: اللہ نے صرف انہی لوگوں کی توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جو نادانی کے باعث برائی کر بیٹھیں پھر جلد ہی توبہ کرلیں پس اللہ ایسے لوگوں پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرمائے گا، اور اللہ بڑے علم بڑی حکمت والا ہے

تفسیر و تشریح: قرآن مجید کے اسلوب بیان میں بیشمار لطافتیں اور حکمتیں ہیں ان میں یہ بھی حکمت ہے کہ یہ محض قانون اور ضابطوں کی کتاب نہیں کہ جس میں پھیکا پن، جرم کی تفصیل اور صرف سزاؤں کا تذکرہ ہو قرآن مجید کی لطافت و بلاغت یہ ہے کہ وہ کسی قانون اور سزا کو محض ضابطے کے طور پر نہیں بلکہ اسے نصیحت اور خیر خواہی کے طور پر بیان اور نافذ کرتا ہے۔ بدکار لوگوں کی سزا کا ذکر کرنے کے فوراً بعد توبہ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ جہالت سے سرزد ہونے والے گناہ کے فوراً بعد توبہ کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ ضرور قبول فرمائے گا۔ البتہ ان لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی جو پے در پے گناہ کرتے رہے یہاں تک کہ موت نے انھیں آلیا یا وہ کفر کی حالت میں مرے ان کے لیے نہایت ہی تکلیف دہ عذاب تیار کیا گیا ہے۔ (روح)

توبہ کا لغوی معنی رجوع کرنا اور لوٹ آنا ہے یعنی جس سمت میں آپ چلے جارہے ہیں ادھر سے منہ پھیر کر دوسری سمت میں چل پڑیں۔ توبہ شرعی میں بھی یہی معنی ملحوظ ہے کہ انسان گناہ و معصیت کی جس راہ پر اپنی کم عقلی اور کج فہمی کے باعث بھاگا چلا جارہا ہے اس سے رخ موڑ کر نیکی اور تقویٰ کی شاہراہ پر گامزن ہوجائے۔ اسی لیے محققین نے توبہ کی قبولیت کے لیے متعدد شروط بیان فرمائی ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔ (1) ندامت (2) اس گناہ سے اسی وقت باز آجانا (3) دوبارہ یہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ (4) وان یکون ذلک حیاء من اللہ تعالیٰ لا من غیرہ۔ یعنی یہ سب کچھ اللہ جل مجدہ سے شرمسار ہو کر کرے۔ ایسی توبہ کو قبول فرمانے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ جھالۃ کا معنی نہ جاننا ہے اور اس سے مراد وہ کیفیت ہے کہ جب انسان رذیل خواہش ہوائے نفس اور غصہ سے یوں مغلوب ہوجائے کہ اپنے اعمال کے نتائج اس سے پوشیدہ ہوجائیں۔ (ضیاء)

اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کرنے پر معاف فرمادیتا ہے اور موت کے وقت تک توبہ قبول فرماتا ہے۔ یہاں فرمایا گیا کہ جو گناہ کرکے تھوڑی دیر میں توبہ کرلیں تو یہاں تھوڑی دیر سے مراد ایک آدھ گھنٹا یا دو چار سال نہیں بلکہ موت سے پہلے جب بھی توبہ کرلی وہ قریب ہی شمار ہوگی۔ ہاں جب موت کا عالم طاری ہوجائے اور غیب کا معاملہ ظاہر ہوجائے تو اس وقت توبہ مقبول نہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا : اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ } اسلام میں توبہ کا قانون بنانا عین حکمت و علم پر مبنی ہے۔ جن دینوں میں توبہ نہیں ان کے ماننے والے گناہ پر زیادہ دلیر ہوتے ہیں کیونکہ مایوسی جرم پر دلیر کردیتی ہے اور معافی کی امید توبہ پر ابھارتی ہے۔ جس شخص کو پھانسی کی سزا سنادی گئی ہو اسے سب سے جدا قید میں رکھا جاتا ہے تاکہ کسی اور کو قتل نہ کردے کیونکہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا ہے اور جسے ایک مقررہ مدت تک سزا کے بعد رہائی کا حکم ہو اسے دیگر مجرموں کے ساتھ قید میں رکھا جاتا ہے، اس سے یہ خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ اسے رہائی کی امید ہے۔ (صراط)

حضرت ابو ذر غفاری نے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے میری امت کی خطاء نسیان اور جس کام پر اس کو مجبور کیا جائے اس سے درگزر فرمالیا۔ (سنن ابن ماجہ ، رقم الحدیث : ۲۰۴۳) نیز قرآن اور حدیث کی دیگر تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً گناہ کرنے پر بھی توبہ قبول ہوجاتی ہے۔ (تبیان)

اس مقام پر جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معصیت کا ارتکاب ہی جہالت ہے خواہ وہ معصیت جان بوجھ کر کی جائے یا بے جانے بوجھے۔ چنانچہ اس اجماع صحابہ کا قول کیا گیا ہے کہ ہر معصیت جہالت ہے خواہ عمداً ہو یا بغیر عمد کے تو اس صورت میں آیت کریمہ میں جہالت کی قید اتفاقی ہوگی نہ کہ احترازی تو ایسے لوگ جو جہالت اور نادانی میں گناہ کر بیٹھیں۔۔۔

(پھر توبہ کرلیں جلدی سے) جیسے ہی اپنی غلطی کا علم ہو تو فوراً توبہ کرلیں اور تاخیر سے کام نہ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے دل میں گناہ کی محبت پیدا ہوجائے توبہ کے لیے اپنی صحت و تندرستی کے ختم ہونے کا انتظار نہ کریں، اور اس کے پہلے کہ موت کے آثار طاری ہوجائیں جناب الٰہی میں صدق دل سے توبہ کرلیں (تو) یہ لوگ (وہ ہیں کہ توبہ قبول فرمالے گا) (اللہ تعالیٰ) اپنے فضل و کرم سے (ان کی اور) ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ (اللہ تعالیٰ) (ہے علم والا) وہ توبہ کرنے والوں کی توبہ کو خوب جانتا ہے اور (حکمت والا ہے) اور اس کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہے کہ وہ حکم کرے کہ توبہ کرنے والوں پر عذاب نہ ہو۔

جہالت کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کے شاگرد حضرت عکرمہ (رض) فرمایا کرتے تھے جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی تابعداری سے خارج ہو وہ جہالت تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا جس شخص سے گناہ سرزد ہو اسے فوراً توبہ کرنی چاہیے۔ (فہم)

یہ ذہن نشین رہے کہ آیت کریمہ کے پہلے جزء میں توبہ کی توفیق مراد ہے اور دوسرے جزء میں اللہ کا اپنے کرم سے حتماً توبہ کا قبول کرنا مراد ہے اور یہ صرف اللہ کے کرم سے ہے اس میں بندے کا کوئی استحقاق نہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کی توفیق دینا صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے گناہ کر بیٹھیں، پھر عنقریب توبہ کرلیں، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے حتماً قبول فرماتا ہے۔ (اشرفی)

یہاں توبہ کے لیے جو انداز کلام اختیار کیا گیا ہے 'اس سے پیش نظر کوئی اور مقصد ہے۔ یہاں زیادہ زور اس پر ہے کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے؟ وہ توبہ جسے اللہ قبول کرتا ہے اور جس کی قبولیت اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر دی ہے۔ (از راہ کرم) وہ توبہ وہ ہے جو نفس کی گہرائیوں سے اٹھے جس سے معلوم ہو کہ اس نفس انسانی نے ایک نیا جنم لیا ہے 'ندامت نے اسے گہرائیوں تک جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اسے اس قدر ہلایا ہے کہ وہ اپنی سمت بدل گیا ہے 'وہ اللہ کی طرف مڑ گیا ہے توبہ اس معنی میں پوری عمر کے لیے رجوع ہے 'ایک نئی امید کی کرن ہے۔ اس میں پاکیزگی اختیار کرنے کا عزم جدید ہوتا ہے۔ اور ایک حقیقی نیت پائی جاتی ہے کہ توبہ کرنے والا جدید راہوں پر صدق دل سے چلے گا۔ (ظلال)

توبہ کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات

۱۔ توبہ کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور ہر شخص کی توبہ نزع کے وقت سے پہلے قبول ہو سکتی ہے۔ نزع سے مراد موت کی وہ گھڑی ہے جب مرنے والے کو دنیا کی بجائے آخرت نظر آنے لگتی ہے۔

۲۔ (كُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّآءِيْنَ التَّوَّابُوْنَ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ]

"آدم کی ساری اولاد خطا کار ہے اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔"

۳۔ (مَنْ تَابَ قَبْلَ اِنْ يُغَرْغِرَ نَفْسُهٗ قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ) [احمد: کتاب باقی مسند المکثرین، باب اِحادیث رجال من اِصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

"جس نے موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کر لی اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔"

۴۔ (اَلتَّاءِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزھد]

"گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔"

توبہ کی شرائط

توبہ کرنے والا اپنے گناہ پر نادم، آئندہ رک جانے کا عہد اور گناہ کے اثرات کو مٹانے کی کوشش کرے۔

۔ اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو جس کا حق غصب کیا ہے اس کا ازالہ کرے اور جس کے ساتھ زیادتی کی ہے اس سے معافی مانگے، نیز نماز، روزہ اور زکوۃ وغیرہ میں کوتاہی ہوئی ہو تو حسب استطاعت ان کے تدارک کا بھی انتظام کرے (امداد)

نوجوان، بوڑھوں سے عبرت حاصل کریں:

توبہ ہر عمر کے مرد اور عورت کی ضرورت ہے لیکن جوانی میں اکثر انسان غفلت کا شکار رہتا ہے حالانکہ انسانی زندگی کا یہی وہ اہم ترین وقت ہے جس میں توبہ کی زیادہ ضرورت ہے اور اگر ساٹھ سال کی عمر میں توبہ کرنے کے بعد بیوی بچوں کو نیکی اور نماز کی ترغیب دے گا تو بیوی کہہ سکتی ہے کہ میں تیس سال سے تیرے ساتھ رہ رہی ہوں تو ہمیشہ گناہوں میں ڈوبا رہا اور میرے حقوق بھی پامال کرتا رہا۔ آج نیکی کا خیال کیسے آ گیا؟ اور بچے بھی کہہ سکتے ہیں: اباجان! آپ نے ساٹھ سال کی عمر تک عیاشی کی ہے، لہٰذا ہمیں بھی ابھی چالیس پچاس سال مزید عیاشی کر لینے دو، پھر ہم بھی توبہ کر لیں گے، اگرچہ بیوی بچوں کا یہ جواب درست نہیں ہے (کیونکہ توبہ کی سعادت جس عمر میں نصیب ہو جائے غنیمت ہے اور

موت جوانی میں بھی آسکتی ہے ساٹھ سال کی عمر کا انتظار غلط فہمی ہے) مگر یہ جوابات اس ساٹھ سالہ بوڑھے کے لیے لمحہ فکریہ ہیں اگر وہ جوانی میں توبہ کرلیتا تو اولاد پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے اور بڑھاپے میں ان دل آزار باتوں سے بھی واسطہ نہ پڑتا۔ (امداد)

مسائل

۱۔ جہالت کی وجہ سے گناہ کرنے والا توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جاننے والا ' حکمت والا ہے۔

۳۔ موت کے وقت توبہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

۴۔ کفار کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فوائد

1 ۔ موت سے پہلے کا وقت قریب ہی میں داخل ہے، خیال رہے کہ کفر سے توبہ نزع کے وقت بلکہ موت دیکھ کر قبول نہیں اور گناہ سے توبہ اس وقت بھی قبول ہے جہالت سے مراد حماقت ہے۔ نادانی، بیوقوفی ہے، عالم جب گناہ کرے تو وہ عملاً جاہل ہے۔

2 ۔ لہٰذا اسلام میں توبہ کا قانون بنانا عین حکمت و علم پر مبنی ہے، جن دینوں میں توبہ نہیں اس کے پیروکار گناہ پر زیادہ دلیر ہوتے ہیں کیونکہ مایوسی جرم پر دلیر کردیتی ہے۔ معافی کی امید توبہ کراتی ہے، پھانسی والے مجرم کو علیحدہ کوٹھڑی میں بند کرتے ہیں کہ کوئی اور خون نہ کردے کیونکہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓٮِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

لغۃ القرآن:

[وَلَيْسَتِ : اور (ثابت) نہیں ہے] [التَّوْبَةُ : توبہ (اللہ پر)] [لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے جو] [يَعْمَلُوْنَ : عمل کرتے رہتے ہیں] [السَّيِّاٰتِ : برائیوں کا] [حَتّٰىٓ : یہاں تک کہ] [اِذَا : جب] [حَضَرَ : سامنے آتی ہے] [اَحَدَہُمُ : ان کے کسی ایک کے] [الْمَوْتُ : موت

] [قَالَ : تو وہ کہتا ہے] [اِنِّیْ تُبْتُ : بیشک میں توبہ کرتا ہوں] [الْـٰٔنَ : اب] [وَلاَ الَّذِیْنَ : اور نہ ہی ان کے لیے جو] [یَمُوْتُوْنَ : مرتے ہیں] [وَ : اس حال میں کہ] [ہُمْ : وہ] [کُفَّارٌ : کفر کرنے والے ہیں] [اُولٰٓئِکَ : یہ لوگ ہیں] [اَعْتَدْنَا : ہم نے تیار کیا] [لَہُمْ : جن کے لیے] [عَذَابًا اَلِیْمًا : ایک دردناک عذاب]

ترجمہ: اور ایسے لوگوں کے لیے توبہ (کی قبولیت) نہیں ہے جو گناہ کرتے چلے جائیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آ پہنچے تو (اس وقت) کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ ہی ایسے لوگوں کے لیے ہے جو کفر کی حالت پر مریں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

تشریح: اوپر والی آیت میں توبہ کی قبولیت کا جو وعدہ گزرا اس کی وضاحت کر دی گئی، اب ان افراد کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ جن کی توبہ قبول نہ ہو گی۔ آیت میں ''سَیِّاٰت'' سے مراد گناہ ہوں تو معنی یہ ہو گا کہ جو لوگ کفر کے علاوہ دیگر گناہوں میں مُلَوَّث رہے جب موت کے آثار ظاہر ہوئے، عذاباتِ الٰہی کا مشاہدہ کر لیا اور روح حلق تک آ پہنچی، اب توبہ کریں تو مقبول نہیں لیکن یہ وقت آنے سے ایک لمحہ پہلے بھی اگر توبہ کر لی تو قبول ہے اور اگر ان مسلمانوں کی توبہ مقبول نہ بھی ہو تب بھی وہ افراد ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے اللہ تعالیٰ چاہے تو انھیں بخش دے، چاہے تو سزا دے لیکن سزا پوری ہونے کے بعد جنت میں جائیں گے البتہ وہ لوگ جو کافر مرے قیامت کے دن ان کی توبہ قبول نہیں یعنی کسی صورت نجات نہ پائیں گے، ہمیشہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت میں ''سَیِّاٰت'' سے مراد کفر ہے، اس صورت معنی یہ ہو گا کہ وہ کفار جو موت کے آثار دیکھ کر یعنی غیب کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے کفر سے توبہ کریں اور اپنے ایمان کا اقرار کریں تو ان کی یہ توبہ اور اقرارِ ایمان قابلِ قبول نہیں، ایسی توبہ تو فرعون نے بھی کی تھی یونہی وہ لوگ جو حالتِ کفر میں مر گئے یعنی بوقتِ موت بھی توبہ نہ کی تو وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی سزا پائیں گے۔

(تفسیر قرطبی، النساء، تحت الآیۃ: ۱۸، ۳/۶۶، الجزء الخامس، تفسیر کبیر، النساء، تحت الآیۃ: ۱۸، ۴/۸، ملتقطاً)

کافر کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا شرعی حکم

جو کسی کافر کے لیے اس کے مرنے کے بعد اس کے کفر کا علم ہونے کی صورت میں دعائے مغفرت کرے یا کسی مردہ مرتد کو مرحوم یا مغفور کہے یا کسی مرے ہوئے ہندو کو بیکنٹھ باشی (یعنی جنتی) کہے وہ خود کافر ہے۔

(بہار شریعت، حصہ اول، ایمان و کفر کا بیان، ۱/۱۸۵)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْ وَسَلَّمَ کے بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمْ اَنَّہُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ (۱۱۳) (توبہ: ۱۱۳)

نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہوں جبکہ ان کے لیے واضح ہو چکا ہے کہ وہ دوزخی ہیں۔ (صراط)

غرغرہ موت کے وقت توبہ کا قبول نہ ہونا

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ جو لوگ گناہ کرنے کے بعد جلد توبہ کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیتا ہے اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں اور توبہ کرنے میں تاخیر کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کی نزع روح کا وقت آجاتا ہے اور وہ امور غیبیہ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس وقت ان کو اضطراری طور پر اللہ کے حق ہونے کا یقین ہو جاتا ہے اس وقت وہ ایمان لے آئیں یا توبہ کر لیں تو وہ ایمان اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ اپنے اختیار سے اللہ کو حق ماننے اور توبہ کرنے کا نام ایمان ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تک غرغرہ موت (نزع روح) کا وقت نہ آئے اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ قبول کرتا رہتا ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۳۵۴۸ 'سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۴۲۵۳ 'شرح السنۃ ' رقم الحدیث : ۱۳۰۶ ' صحیح ابن حبان : ج ۲ ص ۶۲۸ ' مسند احمد : ج ۲ ص ۱۳۲ ' ۱۵۳ ' ج ۳ ص ۴۲۵)
امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے فرشتوں کو دیکھنے سے پہلے توبہ کرلی وہ اس کی عنقریب توبہ ہے۔ امام ابن جریر اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں ضحاک سے روایت کیا ہے کہ موت سے پہلے ہر چیز عنقریب ہے۔ موت کے فرشتے کو دیکھنے سے پہلے توبہ مقبول ہوتی ہے اور موت کے فرشتہ کو دیکھنے کے بعد توبہ مقبول نہیں ہوتی (الدرالمنثور ج ۳ ص ۱۳۰ 'مطبوعہ ایران)
فرعون چونکہ موت کے فرشتے اور عذاب کو دیکھنے کے بعد ایمان لایا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ایمان قبول نہیں فرمایا:
(آیت) " حتیٰ اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنوا اسرآئیل وانا من المسلمین، آلئن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین "۔ (یونس : ۹۱۔ ۹۰)
ترجمہ : حتی کہ فرعون کو جب غرق نے گھیر لیا تو اس نے کہا میں اللہ پر ایمان لایا جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (فرمایا) تو اب ایمان لایا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا تھا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ (تبیان)
موت کے قریب تو کافر بھی توبہ کر لیتا ہے جب عذاب کے فرشتے نظر آتے ہیں تو انی تبت الن (میں اب توبہ کرتا ہوں) کہنے لگتا ہے اس کی توبہ اس کا ایمان مقبول نہیں جیسے فرعون بھی غرق کے گرداب میں آکر پکارنے لگا تھا امنت انہ لا انہ الا الذی امنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین (میں اس پر ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس اللہ کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمان بر داروں سے ہوں) تو یہ ایمان الٹا اس کے منہ پر مار دیا گیا اور فرمایا الئن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین (اب ایمان لاتا ہے ؟ اور پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور تو فسادی تھا)
توبہ کی قبولیت پر دو شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ گناہ نادانی کی بنا پر کیا گیا ہو دوم یہ کہ توبہ کی طرف جلد رجوع کیا گیا ہو دانستہ یا نادانستہ گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً عزوجل کی طرف رجوع کیا جائے بندہ ایک قدم اس کی طرف بڑھتا ہے تو اس کی رحمت دس قدم بڑھتی ہے۔ (حسنات)

آیت مبارکہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿١٩﴾

لغات القرآن:

[يَآيُّهَا : اے] [الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : جو لوگ ایمان لائے (ایمان والے)] [لَا يَحِلُّ : حلال نہیں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [اَنْ تَرِثُوا : کہ وارث بن جاؤ] [النِّسَآءَ : عورتیں] [كَرْهًا : زبردستی] [وَلَا : اور نہ] [تَعْضُلُوْهُنَّ : انہیں روکے رکھو] [لِتَذْهَبُوْا : کہ لے لو] [بِبَعْضِ : کچھ] [مَآ : جو] [اٰتَيْتُمُوْهُنَّ : ان کو دیا ہو] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : یہ کہ] [يَّاْتِيْنَ : مرتکب ہوں] [بِفَاحِشَةٍ : بےحیائی] [مُّبَيِّنَةٍ : کھلی ہوئی] [وَعَاشِرُوْهُنَّ : اور ان سے گزران کرو] [بِالْمَعْرُوْفِ : دستور کے مطابق] [فَاِنْ : پھر اگر] [كَرِھْتُمُوْھُنَّ : وہ ناپسند ہوں] [فَعَسٰٓى: تو ممکن ہے] [اَنْ تَكْرَهُوْا : کہ تم کو ناپسند ہو] [شَـيْـــًٔـا : ایک چیز] [وَّيَجْعَلَ : اور رکھے] [اللّٰهُ : اللہ] [فِيْهِ : اس میں] [خَيْرًا : بھلائی] [كَثِيْرًا : بہت]

ترجمہ : اے ایمان والو ! تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ، اور انھیں اس غرض سے نہ روک رکھو کہ جو مال تم نے انھیں دیا تھا اس میں سے کچھ (واپس) لے جاؤ سوائے اس کے کہ وہ کھلی بدکاری کی مرتکب ہوں، اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے برتاؤ کرو، پھر اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے

تفسیر و تشریح: اسلام سے پہلے اہل عرب کا یہ دستور تھا کہ لوگ مال کی طرح اپنے رشتہ داروں کی بیویوں کے بھی وارث بن جاتے تھے پھر اگر چاہتے تو مہر کے بغیر انھیں اپنی زوجیت میں رکھتے یا کسی اور کے ساتھ شادی کر دیتے اور ان کا مہر خود لے لیتے یا انھیں آگے شادی نہ کرنے دیتے بلکہ اپنے پاس ہی رکھتے تاکہ انھیں جو مال وراثت میں ملا ہے وہ ان لوگوں کو دیدیں اور تب یہ ان کی جان چھوڑیں یا عورتوں کو اس لیے روک رکھتے کہ یہ مر جائیں گی تو یہ روکنے والے لوگ ان کے وارث بن جائیں۔ الغرض وہ عورتیں ان کے ہاتھ میں بالکل مجبور ہوتیں اور اپنے اختیار سے کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں اس رسم کو مٹانے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی گئی۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب لایحلّ لکم ان ترثوا النساء کرہاً، ۲۰۳/۳، الحدیث: ۴۵۷۹، تفسیر قرطبی، النساء، تحت الآیۃ: ۱۹، ۶۷/۳، الجزء الخامس، ملتقطاً)

{ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ : تاکہ جو مہر تم نے انھیں دیا تھا اس میں سے کچھ لے لو۔ } حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا یہ آیت اس شخص کے متعلق ہے جو اپنی بیوی سے نفرت رکھتا ہو اور اس کے ساتھ بد سلوکی اس لیے کرتا ہو کہ وہ پریشان ہو کر مہر واپس کر دے یا مہر معاف کر دے، اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ لوگ عورت کو طلاق دیتے پھر رجوع کر لیتے پھر طلاق دیتے اس طرح عورت کو مُعَلَّق (لٹکا ہوا) رکھتے تھے، وہ نہ ان کے پاس آرام پا سکتی نہ دوسری جگہ شادی کر کے گھر بسا سکتی، اس کو منع فرمایا گیا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱۹، ۳۶۰/۱)

بیویوں پر ظلم و ستم کرنے والے غور کریں

یہاں جو حالات زمانہ جاہلیت کے بیان کئے جارہے ہیں ان پر غور کریں کہ کیا انہی حالات پر اس وقت ہمارا معاشرہ نہیں چل رہا۔ بیویوں کو تنگ کرنا، جبری طور پر مہر معاف کروانا، ان کے حقوق ادا نہ کرنا، ذہنی اذیتیں دینا، کبھی عورت کو اس کے ماں باپ کے گھر بٹھا دینا اور کبھی اپنے گھر میں رکھ کر بات چیت بند کر دینا، دوسروں کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کرنا، لتاڑنا، جھاڑنا وغیرہ۔ عورت بیچاری شوہر کے پیچھے پیچھے پھر رہی ہوتی ہے اور شوہر صاحب فرعون بنے آگے آگے جارہے ہوتے ہیں، عورت کے گھر والوں سے صراحتاً یا بیوی کے ذریعے نت نئے مطالبے کئے جاتے ہیں، کبھی کچھ دلانے اور کبھی کچھ دلانے کا۔ الغرض ظلم و ستم کی وہ کون سی صورت ہے جو ہمارے گھروں میں نہیں پائی جارہی۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ کرے کہ قرآن کی یہ آیتیں ان لوگوں کو سمجھ آجائیں اور وہ اپنی اس بری رَوِش سے باز آجائیں۔ نیز ان آیات کی روشنی میں وہ لوگ بھی کچھ غور کریں جو اسلام سے شرمندہ شرمندہ سے رہتے ہیں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں پر بہت سختیاں ہیں۔ وہ دیکھیں کہ اسلام میں عورتوں پر سختیاں کی گئی ہیں یا انھیں سختیوں سے نجات دلائی گئی ہے؟ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا: تو ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو۔} گھروں کو امن کا گہوارا بنانے کیلئے ایک بہت عمدہ نفسیاتی طریقہ بیان کیا جارہا ہے۔ بیوی کے حوالے سے فرمایا کہ اگر بد خلقی یا صورت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے عورت تمہیں پسند نہ ہو تو صبر کرو اور بیوی کو طلاق دینے میں جلدی نہ کرو کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی بیوی سے تمہیں ایسی اولاد دے جو نیک اور فرمان بردار ہو، بڑھاپے کی بیکسی میں تمہارا سہارا بنے۔

مثبت ذہنی سوچ کے فوائد

یہ طریقہ صرف میاں بیوی کے تعلقات میں نہیں بلکہ زندگی کے ہزاروں معاملات میں کام آتا ہے۔اس طریقے کو "مثبت ذہنی سوچ "کہتے ہیں یعنی اگر کسی کام یا چیز میں خرابی کی کوئی صورت پائی جارہی ہے تو اس کے اچھے پہلوؤں پر بھی غور کرلو۔ ہوسکتا ہے کہ اچھے پہلو زیادہ ہوں یا اچھا پہلو زیادہ فائدے مند ہو مثلاً کسی کی بھی بیوی بد صورت ہے لیکن اسی سے آدمی کو نیک اولاد حاصل ہے، یہاں اگر بد صورتی کو گوارا کرلے تو اس کی زندگی امن سے گزرے گی لیکن اگر طلاق دیدے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ بیوی تو چھوٹ ہی جائے گی لیکن اس کے ساتھ بچے بھی چھوٹ جائیں گے اور ساری زندگی ایسی تلخیوں، ذہنی اذیتوں، اولاد کے حصول کی جنگ اور حقوق کی لڑائی میں گزرے گی کہ چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔ یونہی کسی آدمی کو ادارے میں رکھا ہوا ہے جو کسی وجہ سے ناپسند ہے لیکن اسی کی وجہ سے نظام بہت عمدہ چل رہا ہے، اب اس آدمی کو رکھنا اگرچہ پسند نہیں لیکن صرف ناپسندیدگی کی وجہ سے اسے نکال دینا پورے نظام کو تباہ کردے گا تو ایسی جگہ فوائد پر نظر رکھتے ہوئے اسے برداشت کرلینا ہی بہتر ہے۔ یہ دو مثالیں عرض کی ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی کے بہت سے معاملات کو حل کیا جاسکتا ہے۔ صرف "مثبت ذہنی سوچ "پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ہماری زندگی کی بہت سی تلخیاں خود بخود ختم ہوجائیں گی۔اسی "مثبت ذہنی سوچ "کا ایک پہلو یہ ہوتا ہے کہ آدمی پریشانیوں کی بجائے نعمتوں کو سامنے رکھے یعنی آدمی اگر ایک تکلیف میں ہے تو اسی وقت میں وہ لاکھوں نعمتوں اور سینکڑوں کامیابیوں میں بھی ہوتا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ پریشانی اور ناکامی کی یاد تو اپنا وظیفہ بنالے اور خوشی اور کامیابی کو بھولے سے بھی نہ سوچے۔اس نسخے پر عمل کرکے دیکھیں اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر جائیں گی۔ (صراط)

حضرت عمر (رض) نے بر سر منبر حکم فرمایا کہ عورتوں کے مہر گراں نہ باندھو ایک عورت نے کھڑے ہو کر یہی آیت سنائی اور عرض کیا ابن خطاب اللہ ہمیں دیتا ہے اور آپ منع کرتے ہیں یہ سنتے ہی امیر المومنین عمر (رض) نے فرمایا اے عمر تجھ سے ہر شخص زیادہ سمجھ والا ہے اور اعلان فرمایا میں اپنا اعلان واپس لیتا ہوں جتنا چاہو مہر مقرر کرو۔

لیکن جہاں مہر کی گرانی کی آزادی ہے۔ وہاں دیئے ہوئے مہر سے واپس لینے کی ممانعت بھی ہے۔

آیت کے آخر میں اس عادت قبیحہ کا رد ہے جو جاہلیت میں تھا کہ جب کوئی اور عورت پسند آئے۔ تو پہلی عورت پر الزام لگاتے۔ انواع واقسام تہمتیں لگاتے تاکہ وہ پریشان ہو کر جو کچھ لے چکی ہے واپس دے کر اپنا راستہ صاف کرلے اس کی ممانعت فرمائی اور اسے اثم عظیم کہا۔اس کے بعد منکوحۃالاب کے حرمت کا قانون نافذ ہوا۔ (حسنات)

من مرضی کا سلوک کرتے جس کی چار صورتیں تھیں۔

۱۔ بیوہ کو جبراً نکاح میں لینا یہاں تک کہ بعض قبائل میں لوگ اپنی سوتیلی والدہ کو بیوی بنالیا کرتے تھے۔

۲۔ عورت کو طلاق دینے کے باوجود آگے نکاح کرنے سے روکنا۔

۳۔ عورت کی جائیداد اور حق مہر پر قبضہ کرنا۔

۴۔ ذاتی اور قومی عصبیت کی بنیاد پر بیوہ یا مطلقہ کو نکاح سے روکنا۔

یہاں صرف ایک صورت میں عورت کا حق مہر لینے کی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی انتہاء درجے کی گستاخ ہو یا اس نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہو تو ایسی صورت میں خاوند کو حق ہے کہ وہ سزا کے طور پر اس کا حق مہر ضبط کرلے۔اس آیت میں دوسرا حکم یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے ان میں اگر کوئی عادت تمہیں پسند نہیں تو بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بیوی کی وجہ سے تمہیں خیر

کثیر عطا فرمائے۔ خیر کثیر سے مراد نیک اولاد، بیوی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ رزق میں برکت اور عزت میں اضافہ فرمادے اور بیوی خاوند کی خیر خواہ ہو اور اپنی اولاد کی تربیت کا خصوصی خیال رکھنے والی ہو۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ فَاِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهٗ کَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَکْتَهٗ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ)

[رواہ البخاری: کتاب اَحادیث الانبیاء، باب خلق آدم وذریتہ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ کیونکہ یہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور سب سے ٹیڑھی پسلی اوپر والی ہوتی ہے اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے تو اسے توڑ دے گا اور اگر تو اسے چھوڑ دے گا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“

(عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِذَا صَلَّتِ الْمَرْاَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ زَوْجَهَا قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الْجَنَّةَ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ)

[مسند احمد: کتاب مسند العشرۃ المبشرین بالجنتہ، باب حدیث عبدالرحمٰن بن عوف]

”حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب عورت پانچ نمازیں ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عفت کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو اسے کہا جائے گا کہ تو جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جا۔“

مسائل

۱۔ عورتوں کی وراثت پر قبضہ کرنا حرام ہے۔

۲۔ عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔

آیت مبارکہ:

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾

لغات القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [اَرَدْتُّمُ : تم چاہو] [اسْتِبْدَالَ : بدل لینا] [زَوْجٍ : ایک بی بی] [مَّكَانَ : جگہ (بدلے)] [زَوْجٍ : دوسری بی بی] [وَّاٰتَيْتُمْ : اور تم نے دیا ہے] [اِحْدٰىهُنَّ : ان میں سے ایک کو] [قِنْطَارًا : خزانہ] [فَلَا تَاْخُذُوْا : تو نہ (واپس) لو]

[مِنْهُ : اس سے] [شَيْئًا : کچھ] [اَتَاْخُذُوْنَهٗ : کیا تم وہ لیتے ہو] [بُهْتَانًا : بہتان] [وَّاِثْمًا : اور گناہ] [مُّبِيْنًا : صریح (کھلا)]

ترجمہ:

اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ واپس مت لو، کیا تم ناحق الزام اور صریح گناہ کے ذریعے وہ مال (واپس) لینا چاہتے ہو

تفسیر و تشریح: اہل جاہلیت کی عادت کے مطابق جن کی روش یہ تھی کہ اگر کسی عورت سے شادی کر لینے کے بعد ان میں کسی دوسری عورت سے شادی کی رغبت پیدا ہو جاتی تو پھر پہلی عورت پر بہتان تراشی شروع کر دیتے اور قسم قسم کے الزام و فواحش کی نسبت سے اسے تنگ کر دیتے تاکہ وہ مجبور ہو کر کچھ دے کر۔۔ یا۔۔ کم از کم وہی حق مہر معاف کر کے طلاق کی خواہش مند ہو جائے، تاکہ اسے طلاق دے کر اس جدید عورت سے جس کے ساتھ اسے رغبت ہے نکاح کر لے،

اس طرح سے بہتان باندھ کر کسی سے کچھ حاصل کرنا کیا ظلم صریح نہیں؟ یتم ایک طرف بہتان تراشی سے اور دوسری طرف کھلے گناہ سے ایسا کر کے کھلم کھلا گناہ کرنے والے بننا چاہتے ہو؟۔ (اشرفی)

سابقہ آیت کریمہ میں بتایا گیا تھا کہ بیوی کی ناپسندیدگی کے باوجود پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ نبھانے کی کوشش کی جائے۔ طلاق بالکل آخری چارہ کار ہے جسے ناگزیز حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے آپ نے فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لایحب الذواقین والذواقات "نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھنورے کی طرح پھول پھول کا مزہ چکھتے پھریں"۔ (روح)

مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا یہ کسی بھی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ چہ جائیکہ آدمی اپنی پہلی بیوی پر بہتان باندھے اور اس کی عزت کو محض چند ٹکوں کی خاطر خاک میں ملا دے۔

دوسری آیت کریمہ میں نہایت تعجب سے مرد کی مردانگی کو غیرت دلا کر فرمایا کہ تم کیسے اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور ایک دوسرے کے سامنے بے حجاب ہو چکے ہو۔ اور اس طرح تم نے ایک مدت تک یک جان اور دو قالب ہو کر زندگی گزاری ہے۔ کیا علیحدگی کی تلخیاں اتنی شدید ہیں کہ تنہائیوں کے سارے تقاضے بھول جائیں؟ اور مال کی محبت میں بیوی جو تنہائیوں کی امین رہ چکی ہے، اسے بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بنا دیا جائے۔ اسی سلسلے میں مزید فرمایا کہ تم علیحدہ ہوتے ہوئے اس بات کو بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری بیوی نے تم سے ایک مضبوط عہد لیا تھا۔ تم نے آپس میں ایک میثاق غلیظ باندھا تھا یعنی ایک مضبوط عہد و پیمان کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ دینے کے وعدے کیے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جب تم آپس میں نکاح کی شکل میں یہ عہد کر رہے تھے تو اگرچہ اس میثاق کے الفاظ نہائیت سادہ اور مختصر تھے لیکن اس کے پیچھے جو عزم پوشیدہ تھا اور اس کے اندر جو مضمرات اور تضمنات مخفی تھے اسے تم بھی جانتے تھے اور تمہارے دونوں خاندان بھی جانتے تھے۔ دونوں خاندان اس عہد و میثاق کی پشت پر تھے اور دونوں اس کے گواہ تھے۔ پھر تم نے اللہ کا نام لے کر اس عہد و پیمان کی گرہ باندھی تھی اور مخلوق کے ساتھ ساتھ تم

نے اپنے خالق کو بھی اپنے اس عہد کا گواہ بنایا تھا۔ ذرا غور کیجیے! ایسے مضبوط عہد و پیمان کا انجام یہی ہونا چاہیے کہ وہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جائیں۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں یہ ایک مضبوط عہد و پیمان ہے جو میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی عہد و پیمان کے نتیجے میں مرد کو حقوق ملتے ہیں، تو عورت کو بھی ملتے ہیں۔ ان حقوق کو جو بھی پامال کرنے کی کوشش کرے گا وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوگا۔ (روح)

اگر عورت کی غلطی اور کوتاہی کی وجہ سے طلاق ناگزیر ہوگئی ہو تو خاوند کو اپنا مہر واپس لینے کا حق ہے لیکن اگر عورت کا کوئی قصور نہ ہو اور پھر بھی تم اسے چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہو تو تمہیں یہ حق حاصل نہیں کہ جو تم پہلے خوشی سے عورت کو دے چکے ہو خواہ اس کی مقدار بہت زیادہ ہو واپس لو۔ امام رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ زمانہ جہالت کی ایک رسم یہ تھی کہ جب کوئی آدمی دوسری شادی کرنا چاہتا تو وہ پہلی بیوی پر زنا کی تہمت لگاتا۔ اس طرح اس کو مجبور کر دیتا کہ وہ اس کو مال دے کر طلاق حاصل کرے۔ اس سے بھی مسلمانوں کو روکا گیا (یورپ آج بھی وہی کر رہا ہے جو اسلام سے پہلے جاہل عرب کیا کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت خواہ نئی ہو یا پرانی اس کا مزاج ایک ہی ہے۔ (ضیاء)

مروت وفتوت کا ایک اہم مقتضیٰ

سو ارشاد فرمایا گیا کہ کیا تم لوگ اس کو واپس لوگ بہتان اور کھلے گناہ کا ارتکاب کر کے؟ اور استفہام یہاں پر انکار اور تقبیح کے لیے ہے۔ یعنی ایسا مت کرو، کہ ایسا کرنا تمہاری شان کے لائق نہیں۔ اور جن اخلاق عالیہ پر تم لوگوں کو ہونا چاہیے یہ طریقہ ان سے میل نہیں کھاتا۔ اور یہ اس مروت وفتوت کے بھی خلاف ہے جس پر تم لوگوں کو ہونا چاہیے کہ ایمان و یقین کے جس نور سے تم لوگ مشرف و سرفراز ہو اس کی شان بہت بڑی ہے۔ اور "میثاق غلیظ"، "پختہ عہد" سے یہاں پر مراد عقد نکاح کی ذمہ داری ہے۔ سو اس سے اس کا یہ پہلو بھی واضح ہو جاتا ہے کہ عقد نکاح کی اصلی، عرفی، اور شرعی حیثیت یہی ہے کہ وہ میاں بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک پختہ معاہدہ ہوتا ہے۔ سو ان ذمہ داریوں کا نبھانا اس عہد کا اہم تقاضا ہے۔ (مدنی)

قنطار کا معنی ہے مال کثیر، مراد ہے مہر میں دیا ہوا مال کثیر، ابن جریر نے حضرت انس کی روایت سے قنطار کی تشریح میں رسول اللہ کا فرمان نقل کیا ہے کہ ایک ہزار دو سو (قنطار) ہے۔

مہر کی مقدار

شارع کے نزدیک کثرت مہر کی کوئی حد بندی نہیں۔ اسی پر اجماع ہے۔ جب حضرت عمر (رض) نے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کی تو ایک عورت نے اسی آیت سے کثرت مہر کے جواز پر استدلال کیا۔ حضرت عمر (رض) نے اس دلیل کو سن فرمایا عمر (رض) سے ہر شخص دینی سمجھ زیادہ رکھتا ہے یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں بھی۔

مہر کی زیادتی:

اجماعاً مستحب یہ ہے کہ مہر میں زیادتی نہ کی جائے حضرت عمر (رض) نے فرمایا تھا خبر دار عورتوں کے مہر میں کثرت نہ کرنا اگر مہر کی کثرت دنیا میں عزت اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کی چیز ہوتی تو رسول اللہ سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ نے اپنی کسی بی بی سے یا کسی بیٹی کا بارہ اوقیہ سے زائد مہر پر نکاح کیا ہو۔ (رواہ احمد واصحاب السنن الاربعۃ والدارمی)

بہترین عورت

خطابی نے اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے کہا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بہترین عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے زیادہ سہل (الاداء) ہو۔ ابن حبان نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بی بی کے امور (نفقات وغیرہ) کا آسان ہونا اور مہر کا کم ہونا اس کی برکت ہے۔ احمد اور بیہقی کی روایت میں ہے سب سے بڑی برکت والی وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے آسان (یعنی کم) ہو اس روایت کی سند عمدہ ہے۔

ازواج مطہرات کا مہر

ابو سلمہ (رض) : کا بیان ہے میں نے حضرت عائشہ (رض) سے پوچھا کہ رسول اللہ کا (یعنی حضور (رض) کی بیبیوں کا) مہر کتنا تھا؟ فرمایا: رسول اللہ کی بیبیوں کا مہر ۱۲اوقیہ اور نش تھا تم جانتے ہو کہ نش کتنا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں فرمایا: نس آدھا اوقیہ ہوتا ہے۔ بارہ اوقیہ اور ایک نش کے پانچ سو درہم ہوتے ہیں حضرت ام حبیبہ (رض) کے علاوہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمام بیبیوں کا مہر یہی تھا۔ حضرت ام حبیبہ کا مہر چار ہزار درہم تھا کیونکہ حضور کی طرف سے نجاشی نے یہ مہر ادا کیا تھا۔ ابن اسحاق نے ابو جعفر کی روایت سے چار سو دینار لکھا ہے۔ خلاصہ السیر میں حضرت خدیجہ کے نکاح کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آپ کا مہر بارہ اوقیہ طلائی مقرر کیا تھا ایک طلائی اوقیہ کے سات مثقال ہوتے ہیں۔ احمد وابو داؤد نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ جویریہ ثابت بن قیس بن شماس اور ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں مشترکاً آئی تھیں مدینہ میں ثابت کے کچھ کھجور کے درخت تھے ثابت نے چچازاد بھائی کو وہ درخت دے کر جویریہ کو منفرداً خود لے لیا اور مکاتب بنادیا۔ رسول اللہ نے ان کا بدل کتابت اپنے پاس سے ادا کر دیا اور خود ان سے نکاح کر لیا اور بدل کتابت ہی ان کا مہر قرار پایا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ ثابت اور ان کے چچازاد بھائی نے مشترکاً جویریہ کو مکاتب کیا تھا اور نو اوقیہ طلائی بدل کتابت مقرر کیا تھا۔ (گلدستہ)

(نوٹ: فقہا کے نزدیک اوقیہ: ایک پیمانہ جس سے اشیاء تولی جاتی ہیں۔ اس کی مقدار علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اندازاً اس کی مقدار یہ ہے: چاندی کا اوقیہ 1920 رتی = 40 درہم = 119 گرام۔ سونے کا اوقیہ: 29.75 گرام۔ سونے اور چاندی کے علاوہ کسی اور شے کا اوقیہ = 127 گرام۔ آج کل مختلف علاقوں کے اعتبار سے اس کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ مصر میں یہ 24 گرام کا ہے، جنوبی شام میں 200 گرام کا اور شمالی شام میں یہ 333 گرام کا ہے۔)

آیت مبارکہ :

وَ كَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۲۱﴾

لغات القرآن: [وَكَيۡفَ: اور کیسے] [تَاۡخُذُوۡنَهٗ: تم اسے لوگے] [وَقَدۡ: اور البتہ] [اَفۡضٰى: پہنچ چکا] [بَعۡضُكُمۡ: تم میں ایک] [اِلٰى بَعۡضٍ: دوسرے تک] [وَّاَخَذۡنَ: اور انہوں نے لیا] [مِنۡكُمۡ: تم سے] [مِّيۡثَاقًا: عہد] [غَلِيۡظًا: پختہ]

ترجمہ:

اور تم اسے کیسے واپس لے سکتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے سے پہلو بہ پہلو مل چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد (بھی) لے چکی ہیں

تفسیر و تشریح:

ازواج کا اپنے شوہروں سے ایک پختہ عہد

ارشاد فرمایا گیا کہ "تم ان سے اپنا دیا ہوا مال کس طرح واپس لو گے جبکہ وہ تم سے ایک پختہ عہد لے چکی ہیں"۔ عقدِ نکاح کی صورت میں۔ کہ یہ ایسا پختہ عہد ہے کہ اگر شوہر طلاق نہ دے تو کوئی طاقت اس پختہ عہد کو توڑ نہیں سکتی۔ سو اللہ پاک کا نام بہت عظمت والا ہے۔ اس لیے اس کے نام پاک کے حوالے سے کیا جانے والا عہد اس قدر پختہ اور مضبوط ہوتا ہے، کہ اس جیسا دوسرا کوئی عہد ہو سکتا ہی نہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "تم اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے ذریعے حاصل کیا ہے، اور اللہ کے کلمہ کے ذریعے تم نے ان کی شرم گاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے" (صحیح مسلم، ابن کثیر، محاسن التاویل، اور صفوۃ البیان، وغیرہ)۔ سو اس "پختہ عہد"، "میثاق غلیظ" کو نبھانا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا دین وایمان اور عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ اور یہ "پختہ عہد"، "میثاق غلیظ" جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیے میں بھی گزرا کہ یہ میاں بیوی کے درمیان ایک ایسا پختہ عہد اور مضبوط معاہدہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور اس عقد اور بندھن کے نتیجے میں ان میں سے ہر ایک دوسرے پر خاص حقوق بھی حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے لیے اپنے ذمہ خاص فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے۔ سو بظاہر اس میثاق کے الفاظ اگرچہ نہایت سادہ اور بہت مختصر ہوتے ہیں لیکن ان کے مضمرات و تضمنات بہت بڑے اور ان کے نتائج و ثمرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ جن سے آگے ایک مستقل خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور زوجین سے متعلق خاندانوں کی بہتری اور ان کی عزت اور راحت کا دار و مدار بھی اسی نئے عقد اور بندھن پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے تقاضوں کو پورا کرنا عقل و نقل دونوں کا تقاضا ہے۔ و باللہ التوفیق۔

افضی افضاء سے ہے۔ فراء امام لغت نے اس کا معنی کیا ہے مرد و عورت کا تنہائی میں ملنا خواہ صحبت کے بغیر ہو۔ اور امام ابو حنیفہ (رح) کے نزدیک اسی کو خلوت صحیحہ کہتے ہیں۔ اس سے سارا مہر واجب ہو جاتا ہے۔ (ضیاء)

وجوب مہر

یعنی جب مرد اور عورت نکاح کے بعد مل چکے اور صحبت کی نوبت آچکی تو اس کے معاوضہ میں تمام مہر دینا مرد پر واجب ہو چکا تو اب کس وجہ سے اس مہر کو واپس لے سکتا ہے اور در صورت مہر ادانہ کرنے کے کیسے اس کے مہر کو دبا سکتا ہے اب تو بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر بیٹھے کوئی صورت رستگاری کی نہیں ہو سکتی اور وہ عورتیں تو بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار تم سے لے چکیں جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ اور تصرف میں آچکیں اور تم ان سے پورے منتفع ہو چکے نہیں تو تم کو ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا۔ اب اس قدر تکمیل اور قبضہ ء کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا ان کا مہر نہ دینا کیسے ہو سکتا ہے۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ جیسا مجامعت کے بعد تمام مہر زوج کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے، ایسا ہی اگر مجامعت کی تو نوبت نہ آئے مگر خلوت صحیحہ ہو گئی تو بھی پورا مہر واجب الادا ہو گا، ہاں اگر خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہ آئی اور زوج نے طلاق دے دی تو پھر نصف مہر ادا کرنا ہو گا۔

مسئلہ: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خلوت صحیحہ سے (پورا) مہر پختہ ہو جاتا ہے خواہ جماع نہ کیا ہو۔ بیہقی نے بروایت احنف بیان کیا ہے کہ حضرت عمر (رض) اور حضرت علی (رض) نے فرمایا: کہ اگر دروازہ بند کر لیا اور پردہ چھوڑ دیا تو عورت کے لیے پورا مہر لازم ہو گیا اور عدت بھی ضروری ہو گئی۔ یہ روایت منقطع ہے۔

موطا میں یحییٰ بن سعد کی وساطت سے سعید بن مسیب کی روایت آئی ہے کہ حضرت عمر (رض) نے فرمایا: جب پردے چھوڑ دیئے گئے (یعنی کامل خلوت ہو گئی) تو مہر واجب ہو گیا۔ عبدالرزاق نے مصنف میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بھی حضرت عمر (رض) کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جب دروازہ بند کر دیا اور پردہ چھوڑ دیا اور ستر کو دیکھ لیا تو شوہر پر مہر واجب ہو گیا۔
(تفسیر مظہری اردو جلد دوم)

اسلام نے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا انسداد کیا

ان تین آیتوں میں ان مظالم کی روک تھام ہے جو اسلام سے پہلے صنف نازک پر روا رکھے جاتے تھے، ان میں ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورتوں کی جان و مال کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے، عورت جس کے نکاح میں آگئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملک سمجھتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے چاہیں تو وہ خود اس سے نکاح کر لیں یا دوسرے کسی سے مال لے کر اس کا نکاح کر دیں شوہر کا لڑکا جو دوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو اپنے نکاح میں لا سکتا تھا اور جب عورت کی جان ہی اپنی ملک سمجھ لی گئی تو مال کا معاملہ ظاہر ہے اور اس ایک بنیادی غلطی کے نتیجہ میں عورتوں پر طرح طرح کے صدہا مظالم ہوا کرتے تھے، مثلاً:

ایک یہ ظلم تھا کہ جو مال عورت کو کہیں سے وراثت میں ملا یا اس کے میکہ والوں کی طرف سے بطور ہدیہ تحفہ ملا، بیچاری عورت اس سب سے محروم و بے تعلق رہتی اور یہ سب مال سسرال کے مرد ہضم کر لیتے تھے۔

دوسرا ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر عورت نے اپنے حصہ مال پر کہیں قبضہ کر ہی لیا تو مرد اس کو نکاح کرنے سے اس لیے روکتے تھے کہ یہ اپنا مال باہر نہ لے جا سکے بلکہ یہیں مر جائے اور مال چھوڑ جائے تو ہمارے قبضہ میں آجائے۔

تیسرا ظلم کہیں کہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود محض طبعی طور پر وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی تو شوہر اس کے حقوق زوجیت ادانہ کرتا، مگر طلاق دے کر اس کی گلوخلاصی بھی اس لیے نہیں کرتا کہ یہ تنگ آکر زیور اور زر مہر جو وہ اسے دے چکا ہے واپس کر دے، یا اگر ابھی نہیں دیا تو معاف کر دے تب اسے آزادی ملے گی۔۔ اور بعض اوقات شوہر طلاق بھی دیدیتا لیکن پھر بھی اپنی اس مطلقہ کو کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرنے دیتا تاکہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مہر واپس کر دے یا واجب الادا مہر کو معاف کر دے۔

چوتھا ظلم بعض اوقات یوں ہوتا تھا کہ شوہر مر گیا، اس کے وارث اس کی بیوہ کو نکاح نہیں کرنے دیتے، یا جاہلانہ عار کی وجہ سے یا اس طمع میں کہ اس کے ذریعہ کچھ مال وصول کریں۔

یہ سب مظالم اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کا بھی اپنے آپ کو مالک سمجھا جاتا تھا، قرآن کریم نے اس فساد کی اس جڑ کو اکھاڑ ڈالا اور اس کے تحت ہونے والے تمام مظالم کے انسداد کے لیے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو ! تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مالک بن بیٹھو۔

جبراً کی قید اس جگہ بطور شرط کے نہیں کہ عورتوں کی رضامندی سے ان کا مالک بن جانا صحیح قرار دیا جائے بلکہ بیان واقعہ کے طور پر ہے کہ عورتوں کی جان ومال کا بلاوجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھناظاہر ہے کہ جبراًہی ہو سکتا ہے، اس پر کوئی ہوش وعقل والی عورت راضی کہاں ہو سکتی ہے (بحر محیط) اسی لیے شریعت نے اس معاملہ میں اس کی رضا کو موثر نہیں قرار دیا، کوئی عورت بیوقوفی سے کسی کی مملوک بننے پر راضی بھی ہو جائے تو اسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد انسان کسی کا مملوک ہو جائے۔

ظلم وفساد کی ممانعت کا عام طریقہ یہ ہے کہ بصیغہ نہی اس سے منع کر دیا جائے، لیکن اس جگہ قرآن کریم نے اس عام طریقہ کو چھوڑ کر لفظ لایحل سے اس کو بیان فرمایا، اس میں اس معاملہ کے شدید گناہ ہونے کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی نے کسی بالغ عورت سے بغیر اس کی رضاء واجازت کے نکاح کر بھی لیا تو وہ نکاح شرعاً حلال نہیں، بلکہ کالعدم ہے، ایسے نکاح سے نہ ان دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور نہ وراثت یا نسب کے احکام اس سے متعلق ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے اپنا دیا ہوا مہر واپس لے لیا یا واجب الادا مہر کو جبراً معاف کرالیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً معتبر نہیں نہ اس سے لیا ہوا مال مرد کے لیے حلال ہوتا ہے نہ کوئی حق واجب معاف ہوتا ہے اور اسی مضمون کی مزید توضیح کے لیے ارشاد فرمایا
:

ولاتعضلوھن لتذھبوابیعض ما اتیمتموھن، یعنی عورتوں کو اپنی مرضی کا نکاح کرنے سے نہ روکو، اس خیال پر کہ جو مال تم نے یا تمہارے عزیز نے ان کو بطور مہر کے یا بطور ہدیہ تحفہ کے دے دیا ہے وہ اس سے واپس لے لو مہر دینے اور واپس لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ جو مہر دینا مقرر کر چکے ہیں اس کو معاف کرایا جائے، غرض دیا ہوا مہر جبراًواپس لیں یا واجب الادا کو جبراًمعاف کرائیں، یہ سب ناجائز اور حرام ہیں، اسی طرح جو مال بطور ہدیہ تحفہ کے مالکانہ طور پر بیوی کو دیا جاچکا ہے، ان کا واپس لینانہ خود شوہر کے لیے حلال ہے نہ اس کے وارثوں کے لئے، مالکانہ طور پر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر شوہر نے کوئی زیور یا اور کوئی استعمال چیز بیوی کو محض عاریۃً استعمال کے لیے دی ہے مالک بنا کر نہ دی ہو تو وہ بیوی کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوتی، اس لیے اس کی واپسی بھی ممنوع نہیں۔

اس کے بعد الاان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فرما کر بعض ایسی صورتوں کو مستثنیٰ فرمایا دیا گیا ہے، جن میں شوہر کے لیے اپنا دیا ہوا مال مہر وغیرہ واپس لینا جائز ہو جاتا ہے۔

معنی یہ ہیں کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی ناشائستہ حرکت ایسی صادر ہو جائے جس کی وجہ سے طلاق دینے کے لیے آدمی طبعاً مجبور ہو جائے، تو ایسی صورت میں مضائقہ نہیں کہ شوہر اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک یہ اس کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔

اور اس جگہ لفظ فاحشہ یعنی ناشائستہ حرکت سے مراد حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ اور حضرت ضحاک وغیرہ کے نزدیک تو شوہر کی نافرمانی اور بدزبانی ہے۔

اور ابو قالبہ حسن بصری نے فاحشہ سے مراد اس جگہ بے حائی اور زنا لیا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر ان عورتوں سے کوئی بے حیائی کا کام سرزد ہو گیا، یا وہ نافرمان اور بدزبانی کے پیش آتی ہیں، جس سے مجبور ہو کر مرد طلاق پر آمادہ ہو رہا ہے، تو چونکہ قصور عورت کا ہے، اس لیے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس وقت تک اپنے نکاح میں روکے رکھے جب تک اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس وصول نہ کرے یا مقرر کردہ مہر مہر معاف نہ کرا لے۔

اگلی دو آیتوں میں بھی اسی مضمون کا تفصیلی بیان ہے، ارشاد ہے کہ جب عورت کی طرف سے کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لیے موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال بھی اس کو دے چکا ہے اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس سے دیئے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق کے معاوضہ میں واپس لے یا واجب الادا مہر کو معاف کرائے کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں اور جس سبب سے مہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے، یعنی عقد نکاح بھی ہو گیا اور دونوں آپس میں بے حجابانہ مل بھی چکے ہیں تو اب دیا ہوا مال واپس لینے یا واجب الادا مہر کے معاف کرانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔

سب سے بہتر شخص

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی گھر والی کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہو، میں اپنی بیویوں سے بہت اچھی گھرداری برتتا ہوں (ابن کثیر)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں "بہترین شخص" کے ٹائٹل کا مستحق وہ ہے جس کا سلوک اپنی گھر والی کے ساتھ بہترین ہو: خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَهْلِهِ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِأَهْلِیْ (سنن الترمذی: 4062)

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ازدواجی معاملات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے؛ لیکن اگر سنجیدگی سے اس چیز کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ بہترین شخص کے انتخاب کے لیے گھر والی کے ساتھ سلوک سے بہتر کوئی معیار نہیں ہے، یہ اتنی جامع اور وسیع کسوٹی ہے جس پر کسی کو بھی پرکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی وہ بہترین شخص ہے یا اس نے شرافت کا محض مکھوٹا لگایا ہے؛ اس لیے کہ لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہوتے نہیں ہیں؛ بلکہ ظاہر تو کبھی کبھی اتنا پرفریب ہوتا ہے کہ اس سے اچھے خاصے جہاں دیدہ اور تجربہ کار لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں؛ چنانچہ بہت سے لوگ دینداری کا لبادہ اس مہارت کے ساتھ اوڑھتے اور تقویٰ وطہارت کی مصنوعی کریم سے اپنی صورت کو اس قدر پرکشش اور چمکدار بنا لیتے ہیں کہ لوگ ان کی شرافت ودینداری کی قسمیں کھانے میں بھی نہیں جھجکتے ؛لیکن اگر ان کی عائلی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ظاہری شرافت ودینداری سب گھر سے باہر ہے، گھر کے اندر یہ شخص انتہائی بدتمیز، خود غرض اور شقی القلب ہے، باہر شرافت ومروت کا دم بھرنے والا گھر میں انتہائی وحشی ہے اور ہر دن ظلم وبربریت کی ایک نئی داستان رقم کرتا رہتا ہے، اسے نہ اللہ ورسول کے احکام وتعلیمات کی پرواہ ہے اور نہ ہی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر کو منور کر کے اسے جنت کا ایک ٹکڑا بنا

نے کی فکر، جہاں اضطراب کے بجائے سکون کاڈیرا ہو، نحوست کے بجائے سعادت کا بسیرا ہو، تنگی کے بجائے فراخی، نفرت کے بجائے محبت اور کراہت کی تیرگی کے بجائے انسیت کے دیپ جھلملاتے ہوں۔

اس طرح بیوی کے ساتھ سلوک ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص کی اصلی تصویر نظر آجاتی ہے؛اس لیے کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی بالادستی کے جوہر عموماً کمزوروں کے سامنے ہی دکھانا پسند کرتا ہے، صنف نازک سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیویاں عام طور پر کمزور وبے بس وبے کسی کا پیکر ہوتی ہیں، اپنے عزیز واقارب اور حامی وناصر سے دور بڑی حد تک شوہر اور اس کے گھر والوں کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تھوڑی سی کوتاہی شوہر کے آتش غضب کو بھڑکا دیتی ہے وہ ان کی معمولی سی غفلت سے چراغ پا ہو جاتا ہے، عام طور پر وہ بیوی کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس خیال سے کہ اس کے ٹکروں اور چیتھڑوں پر پلنے والی ہستی کی حیثیت ہی کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ توہین آمیز رویہ اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، نازیبا کلمات کا استعمال تو عام سی بات ہے، بعض گھروں میں تو معاملہ گالی گلوج اور مار پیٹ تک پہنچ جاتا ہے، اس معاملہ میں جاہل اور تعلیم یافتہ کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، اس حمام میں سبھی ننگے ہیں، بعض تعلیم یافتہ افراد اپنے اس طرح کے رویہ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے بعض اقوال کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتے، جیسے یہ کہ شوہر کی حیثیت مجازی خدا کی ہے، اسلام میں اگر اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو بیویوں کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنا پڑتا، وہ اس ہندو فلسفہ کے قائل ہوتے ہیں جو بیویوں کو داسی اور شوہروں کو سوامی قرار دے کر بیویوں کے ساتھ کسی بھی سلوک کی اجازت دیتا ہے، جب کبھی عورتوں کے حقوق کی بات اٹھتی ہے تو مسلمان یہ کہہ کر اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ اسلام نے اس طرح تمام حقوق آج سے پندرہ سو سال قبل عورتوں کو دے دیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے عورتوں کو معاشرہ میں جو عزت واحترام اور وسیع وجامع حقوق عطا کیے ہیں، مغرب اپنی طویل جدوجہد کے باوجود اس تک نہیں پہنچ سکا ہے؛ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کے عطا کردہ حقوق مسلم خواتین کو حاصل ہیں، اس کا جواب یقینا نفی میں ہے، ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں کچھ استثناء ات ہوں؛ لیکن عام طور پر مسلم خواتین کے حالات غیر مسلم خواتین سے اچھے نہیں ہیں، وہ بھی انھیں کی طرح گھریلو تشدد کا شکار ہیں، مظلومیت ان کا مقدر ہے اس سے بعض خوش نصیب کو ہی نجات مل پاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین شخص ہونے کے لیے جو معیار متعین فرمایا ہے، اس کی روشنی میں اگر حیاتِ طیبہ کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس حوالہ سے بھی عالمِ انسانیت کے لیے مثالی نمونہ ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں اتاریں اور اس سے اپنی عائلی زندگی کو سنواریں۔

رشتۂ ازدواج میں اللہ تعالیٰ نے مودت ورحمت کا تخم فطری طور پر ڈال دیا ہے، جو لوگ اس کی آبیاری ودیکھ بھال کرتے ہیں، وہ نہ صرف اس کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کی گھنی وٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے سفر کو آسان وسہانا بنالیتے ہیں، اس کے برعکس جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے، وہ اس کے فیضان وبرکات سے بہت حد تک محروم ہی رہتے ہیں، یہ رشتہ اپنی پائیداری اور برگ وبار کے لیے باہمی اعتماد، تعاون وہمدردی، ایثار وقربانی، عزت واحترام اور پیار ومحبت کا محتاج ہوتا ہے، آپ کی ازدواجی زندگی پر اس کی گہری چھاپ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اپنی شریک حیات کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ ومشفقانہ ہوا کرتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دلجوئی واحترام میں کبھی کوئی کمی نہیں کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھتے تھے، ایک سفر میں جب انجشہ نامی غلام نے اس اونٹ کو تیز چلانے کی کوشش کی جس پر بعض ازواج مطہرات سوار تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آہستہ چلانے کا حکم دیا اس خیال سے کہ کہیں وہ ڈر نہ جائیں یا انہیں کوئی تکلیف نہ ہو (صحیح بخاری: 6159)

"حضرت صفیہ ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، انھوں نے اس بات پر رونا شروع کر دیا کہ وہ جس اونٹنی پر سوار تھیں وہ بہت آہستہ چلتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو پوچھے اور دلاسہ دیا" (سنن النسائی :9072) آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیویوں کی تعریف میں بھی کمی نہیں کرتے؛ بلکہ برملا اس کا اظہار کیا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا "خدیجہ سے مجھے شدید محبت ہے" (صحیح مسلم: 6231) حضرت عائشہ کے بارے میں فرمایا: "عائشہ کی فضیلت دیگر عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی دیگر کھانوں پر" (صحیح البخاری: 3341) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پلیٹ میں اس جگہ سے کھانا کھاتے تھے، جہاں سے عائشہ کھاتی تھیں" (صحیح مسلم: 466) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کی دلجوئی کا اس حد تک خیال رکھتے تھے کہ جب ایک ایرانی پڑوسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ڈش "مرق" بنایا اور آپ اکو دعوت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو قبول نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہا آنے کے لیے کہا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوارہ نہ تھا کہ شریک حیات کے بغیر دعوت میں جائیں، لہٰذا جب اس نے آپ کے ساتھ عائشہ کو بھی دعوت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت قبول فرمائی اور تشریف لے گئے" (صحیح مسلم:5268) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کا نہ صرف حد درجہ خیال رکھتے تھے؛ بلکہ ان کے مزاج شناس تھے اور ان کے چشم وابرو کے اشارے کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے؛ چنانچہ ایک مرتبہ "عائشہ سے فرمایا: میں یہ جان جاتا ہوں کہ کب تم مجھ سے ناراض ہو اور کب خوش؟ انھوں نے دریافت کیا: وہ کیسے یارسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو: رب ابراہیم علیہ السلام کی قسم اور جب خوش رہتی ہو تو کہتی ہو: رب محمد کی قسم" (صحیح مسلم:6238)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج کے ساتھ اس حد تک عزت واحترام کا معاملہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت "صفیہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد نبوی میں ملنے آئیں تو جب وہ واپس جانے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم احتراما انھیں مسجد کے دروازہ تک چھوڑنے کے لیے تشریف لائے" (بخاری: 2011) (صفا)

اسلام کا نور چمکنے سے پہلے بیویوں پر بہت زیادہ ظلم وستم ڈھائے جاتے تھے، انہیں مارا پیٹا جاتا تھا، ان کے حقوق دبالئے جاتے تھے، جب رسولِ اکرم، نورِ مجسم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ واٰلِہٖ وَسَلَّمَ اس دنیا میں رحمت بن کر جلوہ گر ہوئے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ واٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے شوہروں کو بیویوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک کرنے کی نہ صِرف تاکید فرمائی بلکہ اُن سے حُسنِ سُلوک کرنے کے فضائل بھی بیان فرمائے۔آیئے! بیویوں سے حُسنِ سُلوک کرنے پر مشتمل 3 فرامینِ مُصْطَفٰے صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ واٰلِہٖ وَسَلَّمَ سنتے ہیں:

بیویوں سے حسنِ سلوک پر مشتمل 3 فرامین مُصْطَفٰے **صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ واٰلِہٖ وَسَلَّمَ**

(1) تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہترین ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔ (ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل ازواج النبی، ۵/۴۷۵ حدیث: ۳۹۲۱)

(2) تم سب میں بہترین وہ ہے جو اپنی عورتوں اور بچیوں کے ساتھ اچھا ہو۔ (شعب الایمان ، باب فی حقوق الاولاد والاہلین، ۴۱۵/۶ ، حدیث :۸۷۲۰)

(3) کوئی مؤمن کسی مؤمنہ بیوی کو دشمن نہ جانے، اگر اس کی کسی عادت سے ناراض ہو تو دوسری عادت سے راضی ہوگا۔ (مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء، ص۷۷۵ حدیث: ۱۴۶۹)

حکیمُ الاُمّت حضرت مفتی احمد یار خان رَحْمَۃُ اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ اِس حدیثِ پاک کے تحت فرماتے ہیں: سُبْحٰنَ اللہ! کیسی نفیس (یعنی بہترین) تعلیم (ارشاد فرمائی ہے)، مقصد یہ ہے کہ بے عیب بیوی ملنا ناممکن ہے، لہٰذا اگر بیوی میں دو ایک برائیاں بھی ہوں تو اسے برداشت کرو کہ

کچھ خوبیاں بھی پاؤ گے۔یہاں (صاحبِ) مرقات (رَحْمَۃُ اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ) نے فرمایا کہ جو شخص بے عیب ساتھی کی تلاش میں رہے گا وہ دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے گا، ہم خود ہزار ہا برائیوں کا چشمہ ہیں، ہر دوست عزیز کی برائیوں سے در گزر کرو، اچھائیوں پر نظر رکھو، ہاں اصلاح کی کوشش کرو، بے عیب تو رسولُ اللہ) صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ (ہیں۔) مرآۃ المناجیح، ۸۷/۵)

یقیناً ہر شخص کی تمام ہی عادات بری نہیں ہوتیں، اگر کچھ بری ہوتی ہیں تو کچھ اچھی بھی ہوتی ہیں۔لہٰذا بیوی کی معمولی باتوں پر غصہ کرنے، مار دھاڑ کرنے، طلاق دینے یا گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دینے کے بجائے بیوی کی اچھائیوں کو بھی یاد رکھے، مثلاً اس طرح سوچے کہ اگر مجھے اپنی بیوی کی کچھ باتیں بُری لگتیں ہیں تو بعض اچھی بھی تو ہیں! پھر بیوی سے تعلق رکھنا بھی ضروری ہے اور ہر وقت کا لڑائی جھگڑا ان تعلقات پر اثر انداز ہو گا، تو اگر اپنی بیوی کی تکلیفوں پر صبر کروں گا تو ثواب کا حق دار بن جاؤں گا۔اسی طرح بیوی بھی شوہر کی جانب سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کر کے اجر کمائے۔چنانچہ

صبرِ اَیُّوب و آسیہ کے اَجر کی مثل ثواب

تمام نبیوں کے سلطان، رحمتِ عالمیان صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنی بیوی کے برے اخلاق پر صبر کیا تو اللہ کریم اسے حضرت ایوب عَلَیْہِ السَّلَام کے مصیبت پر صبر کرنے کی طرح ثواب عطا فرمائے گا، اگر عورت اپنے شوہر کے برے اخلاق پر صبر کرے تو اللہ کریم اسے فرعون کی بیوی آسیہ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہا کے ثواب کی طرح اجر عطا فرمائے گا۔" (الکبائر للذہبی، الکبیرۃ السابعۃ والاربعون، ص۲۰۶)

آیت مبارکہ:

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًاؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿۲۲﴾

لغات القرآن:

[وَلَا : اور نہ] [تَنْكِحُوْا : نکاح کرو] [مَا نَكَحَ : جس سے نکاح کیا] [اٰبَآؤُكُمْ : تمہارے باپ] [مِّنَ : سے] [النِّسَآءِ : عورتیں] [اِلَّا : مگر] [مَا قَدْ سَلَفَ : جو گزر چکا] [اِنَّهٗ : بیشک وہ] [كَانَ : تھا] [فَاحِشَةً : بےحیائی] [وَّمَقْتًا : اور غضب کی بات] [وَسَآءَ : اور برا] [سَبِیْلًا : راستہ (طریقہ)]

ترجمہ : اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نکاح کر چکے ہوں مگر جو (اس حکم سے پہلے) گزر چکا (وہ معاف ہے)، بیشک یہ بڑی بے حیائی اور غضب (کا باعث) ہے اور بہت بری روش ہے

تفسیر و تشریح:

ربط کلام:

عورت کی عفت و تکریم کے تحفظ ، گھر کے ماحول میں آزادی کی نعمت اور باہمی شرم و حیا اور حد درجہ احترام کے لیے کچھ رشتے مستقل طور پر اور چند رشتوں کو حسد و بغض سے بچانے اور تقدس کے تحفظ کی خاطر مخصوص مدت کے لیے حرام قرار دیا۔ جیسے ایک سابقہ آیت میں گزرا ہے کہ زمانہ جہالت میں باپ کے مرنے کے بعد لڑکا اپنی سوتیلی ماں سے جبراً شادی کر لیا کرتا تھا۔ اس آیت کے نزول سے جبراً شادی تو بند ہو گئی لیکن جانبین کی رضامندی سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس آیت میں بالکل ممانعت کر دی گئی۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں بہت سے لوگوں کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کئے اور ان سے ان کی اولاد بھی ہوئی۔

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ سوتیلی ماں سے نکاح کر لیا کرتے تھے یہاں اس بات کی ممانعت کی گئی ہے اس لیے کہ باپ کی بیوی بمنزلہ ماں کے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں حقیقی ماں کے سوا باپ کی منکوحہ کو مفروشہ بنانا جائز سمجھتے تھے اور باپ کے بعد بیٹا بیاہ لیتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ موطوۃ الادب بمنزلہ ماں ہے اس سے بیٹے کو نکاح کرنا حرام ہے۔ پھر یہ امر بھی آخر کو واضح ہو جاتا ہے کہ باپ نے جس سے وطی کر لی خواہ بعد نکاح یا بلا نکاح بطریق زنا وہ بہر صورت بیٹے پر حرام ہے اس لیے کہ نکاح کے معنی ہی وطی ہیں اور وہ نکاح جو عرف میں نکاح کہلاتا ہے وہ عقید کہلاتا ہے۔

سوتیلی ماں اور دیگر محرمات سے نکاح کی ممانعت

جاہلیت والے اپنی سوتیلی، ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے جس کا تذکرہ ابھی گزرا، اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح مت کرو یہ بے حیائی اور اللہ کے غضب اور نفرت کرنے کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی سمجھ دار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو نکاح مقت اور اس نکاح سے جو اولاد ہوتی اس کو مقتی کہتے تھے۔ سو ایسے نکاح جو ہو چکے ہو چکے آئندہ کو ہرگز ایسا نہ ہو۔

فائدہ: باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اسی حکم میں دادے اور نانے کی منکوحہ بھی داخل ہے کتنا ہی اوپر کا دادا اور نانا کیوں نہ ہو۔

شان نزول

ابن ابی حاتم، فریابی اور طبرانی نے حضرت عدی بن ثابت کی وساطت سے یہ قصہ ایک انصاری کی روایت سے نقل کیا ہے اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو قیس بن سلمہ کا انتقال ہو گیا ابو قیس بڑا نیک انصاری تھا اس کے بیٹے نے ابو قیس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا عورت نے قیس سے کہا میں تو تجھے اپنا بیٹا جانتی ہوں اور تو قوم کے نیک لوگوں میں سے بھی ہے (پھر نکاح کیسا) اس کے بعد عورت نے حاضر ہو کر رسول اللہ کو واقعہ کی اطلاع دیدی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اب تو اپنے گھر چلی جا (اور حکم کا انتظار کر) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

سوتیلی ماں سے نکاح کی سزا

حصرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ میرا اماموں جھنڈا لیے میری طرف سے گذرا میں نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟اس نے جواب دیا ایک شخص نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔اس کا سر لانے کے لیے رسول اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔ (رواہ الترمذی)
ارشاد باری تعالیٰ عزوجل ہے کہ اس قسم کے واقعات وہ ہو چکے ہیں فاحشۃ بے حیائی ہے۔

اللہ کی ناراضگی وناپسندیدگی

آیت کے اگلے حصے میں عقد کی حیثیت بتلادی۔اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً (کہ یہ بے حیائی ہے اور قباحت میں انتہاء کو پہنچنے والی ہے) وَّمَقْتًا (اور ناراضگی میں) میں۔اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض اور ایمان والوں کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ ہے۔بعض لوگ عورتوں کی ناراضی کے باوجود اپنے وقار کے لیے ایسا کرتے تھے اور اس کو نکاح مقت کہتے تھے۔اور اس سے جو اولاد پیدا ہوتی اس کا لقب المقتی مشہور ہوتا۔وَسَآئَ سَبِیْلًا (اور یہ بہت برا راستہ ہے) (مدارک)
اس تحریم کی حکمت کے حوالے سے دو تین باتیں ذہن میں آتی ہیں اگرچہ انسان کے لیے یہ تو ناممکن ہی نہیں ہے کہ وہ شرعی احکام کی تمام حکمتوں اور رازوں کا احاطہ کر سکے۔ہمارے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ اللہ نے یہ قانون بنایا ہے جو ہمارے لیے بنادیا ہے۔اور ہمیں یقین ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت اور مصلحت ہوگی بہرحال جو تین چیزیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ سوتیلی ماں بھی ماں ہوتی ہے ٫یہ کہ باپ کی جگہ بیٹے کا آنا سوئے ادب ہے کیونکہ اس شکل میں وہ باپ کا مساوی اور شریک ہو جاتا ہے۔فطرۃ ایک انسان اپنی بیوی کے پہلے خاوند کو ناپسند کرتا ہے۔یوں وہ اپنے باپ کو بھی ناپسند کرنے لگے گا۔تیسری بات یہ ہے کہ منکوحہ اب کے ساتھ والد کے ترکہ کے تصورات کی وابستگی ہو سکتی ہے جبکہ جاہلیت میں ایسے رواجات بھی تھے۔اور یہ ایک ایسا کریہہ تصور ہے جو بیک وقت مرد اور عورت دونوں کے لیے مکروہ ہے۔کیونکہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کیے گئے ہیں اور ایک کی توہین دوسرے کی توہین ہے۔
یہ ہیں وہ ظاہری وجوہات جن کی بناپر اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو مکروہ ناپسندیدہ اور شنیع اور بد چلنی قرار دیا ہے جبکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب اور حکمتیں ہو سکتی ہیں،ہاں اور جاہلیت میں جو نکاح ہوئے وہ معاف ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔
اس نکاح کی ممانعت کے لئے قرآن مجید نے تین لفظ استعمال کئے ہیں اور تینوں سے الگ الگ اشارے ہیں۔
فاحشۃ، (بے حیائی) اس لئے کہ اس قسم کا نکاح عقلی لحاظ سے بھی بجائے خود بڑی بے حیائی کی بات ہے۔
مقتا، (غضب) غصے اور غضب کے علاوہ یہ لفظ ہر ایسی بری چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے دیکھ کر طبیعت میں گھن پیدا ہو۔چنانچہ صحیح مذاق آدمیوں کے لئے یہ بڑی گندی چیز ہے۔
سآء سبیلا، (بدچلن) سآء (برا) ان معنوں میں لفظ سوء بھی استعمال ہوتا ہے۔
سبیلا، (چلن) لفظیش معنے راستے کے ہیں۔اسی مناسبت سے یہاں چال چلن کے معنویں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسلام نے اس کو فوجداری جرم قرار دیا ہے اور قابل دست اندازی پولیس ٹھہرایا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا جرم کرنے والوں کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے موت اور جائیداد کی ضبطی کا حکم دیا۔ ابن ماجہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا: من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ "جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دیا جائے۔"

آیت مبارکہ:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآٮِٕكُمۡ وَرَبَآٮِٕبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآٮِٕكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَاۤٮِٕلُ اَبۡنَآٮِٕكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۲۳﴾

لغات القرآن:

[حُرِّمَتْ : حرام کی گئیں] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اُمَّهٰتُكُمْ : تمہاری مائیں] [وَبَنٰتُكُمْ : اور تمہاری بیٹیاں] [وَاَخَوٰتُكُمْ : اور تمہاری بہنیں] [وَعَمّٰتُكُمْ : اور تمہاری پھوپھیاں] [وَخٰلٰتُكُمْ : اور تمہاری خالائیں] [وَبَنٰتُ الْاَخِ : اور بھتیجیاں] [وَبَنٰتُ : بیٹیاں] [الْاُخْتِ : بہن] [وَاُمَّهٰتُكُمُ : اور تمہاری مائیں] [الّٰتِيْٓ: وہ جنہوں نے] [اَرْضَعْنَكُمْ : تمہیں دودھ پلایا] [وَاَخَوٰتُكُمْ : اور تمہاری بہنیں] [مِّنَ : سے] [الرَّضَاعَةِ : دودھ شریک] [وَ : اور] [اُمَّهٰتُ نِسَاۗىِٕكُمْ : تمہاری عورتوں کی مائیں] [وَرَبَاۗىِٕبُكُمُ : اور تمہاری بیٹیاں] [الّٰتِيْ : جو کہ] [فِيْ حُجُوْرِكُمْ : تمہاری پرورش میں] [مِّنْ : سے]

[نِّسَاۗىِٕكُمْ : تمہاری بیبیاں] [الّٰتِيْ : جن سے] [دَخَلْتُمْ : تم نے صحبت کی] [بِهِنَّ : ان سے] [فَاِنْ : پس اگر] [لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ : تم نے نہیں کی صحبت] [بِهِنَّ : ان سے] [فَلَا جُنَاحَ : تو نہیں گناہ] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَحَلَاۗىِٕلُ : اور بیویاں] [اَبْنَاۗىِٕكُمُ : تمہارے بیٹے] [الَّذِيْنَ : جو] [مِنْ : سے] [اَصْلَابِكُمْ : تمہاری پشت] [وَاَنْ : اور یہ کہ] [تَجْمَعُوْا : تم جمع کرو] [بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ : دو بہنوں کو] [اِلَّا مَا : مگر جو] [قَدْ سَلَفَ : پہلے گزر چکا] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [غَفُوْرًا : بخشنے والا] [رَّحِيْمًا : مہربان]

ترجمہ : تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری (وہ) مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضاعت میں شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں (سب) حرام کر دی گئی ہیں، اور (اسی طرح) تمہاری گود میں پرورش پانے والی وہ لڑکیاں جو تمہاری ان عورتوں (کے بطن) سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو (بھی حرام ہیں)، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں) کوئی حرج نہیں، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی تم پر حرام ہیں) جو تمہاری پشت سے ہیں، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ (نکاح میں) جمع کرو سوائے اس کے کہ جو دور جہالت میں گزر چکا۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے

تفسیر و تشریح:

حرمت

یہاں سے ان عورتوں کا تفصیلاً ذکر ہوتا ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ یہ حرمت تین طرح کی ہے۔ حرمت نسب، حرمت رضاعت اور حرمت مصاہرت۔ پہلے ان عورتوں کا ذکر ہے جن کی حرمت کا سبب نسب ہے ان کی تعداد سات ہے :۔

1۔ ماں (اس میں دادی، نانی اور اس سے اوپر سب داخل ہیں)۔

2۔ بیٹی (اس میں پوتی۔ نواسی نیچے تک سب داخل ہیں)۔

3۔ بہن (سگی اور سوتیلی) (4) پھوپھی (5) خالہ (6) بھتیجی (7) بھانجی

یہاں سے ان محرمات کا ذکر ہے جو رضاع کی وجہ سے حرام ہے۔ ساتوں رشتے جو نسب سے حرام تھے وہی رضاع سے حرام ہیں۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "یحرم من الرضاع مایحرم من النسب"۔

اب ان عورتوں کا ذکر ہے جو علاقہ نکاح کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کے ساتھ اس وقت تک نکاح حرام ہے جب تک اس کی بیوی اس کے نکاح میں ہے۔ پہلی قسم بیوی کی ماں اور اس بیوی کی بیٹی جس سے صحبت کی جا چکی ہو۔ لیکن اگر صحبت سے پہلے بیوی کو طلاق دے دی تو اس کی بیٹی سے نکاح درست ہو گا۔ اور بیٹوں کی بیویاں بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی

ہیں۔ یہی حکم پوتوں اور نواسوں کی بیویوں کا ہے۔ دوسری قسم بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی ہیں۔ جب تک بیوی زندہ ہے یا نکاح میں ہے اس وقت تک ان سے نکاح درست نہیں۔ اور اگر بیوی مر جائے یا اسے طلاق دے دے تو پھر ان سے نکاح کرنا درست ہے۔ اور اگر بیوی مر جائے یا اسے طلاق دے دے تو پھر ان سے نکاح کرنا درست ہے۔

یعنی ان بیٹوں کی بیویاں حرام ہیں جو تمہاری پشت سے ہوں۔ یہ قید اہل عرب کی ایک غلط رسم کو مٹانے کے لیے بڑھادی گئی ہے کہ وہ جن کو متبنیٰ بنایا کرتے ان کی بیویوں کے بیوہ یا مطلقہ ہونے کے بعد بھی ان سے نکاح کرنا حرام خیال کرتے۔

دو بہنوں کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا رضاعی ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ اور حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کا ایک عقد میں جمع کرنا ممنوع فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ رشتے محبت وپیار کے رشتے ہیں اگر یہ ایک دوسرے کی سوکنیں بن جائیں گی تو محبت وانس کی جگہ حسد وعناد جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے رونما ہو جائے گا۔ انکم اذا فعلتم ذلک قطعتم ارحامکم (قرطبیؒ)

ایک دفعہ پھر دیکھ لیں کہ

مستقل طور پر حرام کردہ رشتے درج ذیل ہیں :

۱۔ ماں ' دادی ' نانی ' اوپر تک۔

۲۔ بیٹیاں ' پوتیاں نیچے تک اور نواسیاں۔

۳۔ سگی بہنیں۔

۴۔ باپ یا ماں کی طرف سے یعنی سوتیلی بہنیں جنہیں علاتی اور اخیافی بہنیں کہا جاتا ہے۔

۵۔ پھوپھیاں۔

۶۔ خالائیں ' خواہ یہ سگی ہوں یا اخیافی یا علاتی۔

۷۔ بھتیجیاں اور ان کی بیٹیاں۔

۸۔ بھانجیاں اور ان کی بیٹیاں۔

۹۔ رضاعی مائیں۔

۱۰۔ رضاعی بہنیں اور رضاعت کی بنیاد پر وہ سب رشتے حرام ہیں جو رشتہ نسب کی بنیاد پر حرام ہیں۔

۱۱۔ ساس اور سالیاں جب تک ان کی بہن نکاح میں ہو۔

۱۲۔ سوتیلی بیٹیاں ' جن کی ماں کے ساتھ خلوت ہو چکی ہو۔ اگر اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو تو پھر اس کی پہلی بیٹیوں کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔

۱۳۔ حقیقی بیٹے کی بیوہ یعنی بہو سے نکاح حرام ہے۔

۱۴۔ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

۱۵۔ تمام شوہر والی عورتیں بھی حرام ہیں۔

اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "نکاح الید ملعون" (عنایۃ القاضی ج ۱ ص ۹۴۴) ہاتھ سے نکاح کرنے والا (مجلّوق۔ ہاتھ سے منی نکالنے والا) ملعون ہے ' یہاں نکاح سے مراد عقد نہیں ہو سکتا اس مراد بھی وطی اور مباشرت ہے ' اور جن آیات میں نکاح عقد

کے معنی میں ہے مثلا (آیت) "فانکحوا ماطاب لکم من النساء"۔ (النساء: ۳) یا جس طرح آپ نے فرمایا "النکاح سنتی"۔ (الجامع الکبیر ج ۸ ص ۸) وہاں نکاح مجازا عقد کے معنی میں ہی ہے۔

(عَنْ عَائِشَۃَ (رض) اِنَّھَا اَخْبَرَتْہُ اِنَّ عَمَّھَا مِنَ الرَّضَاعَۃِ یُسَمّٰی اِفْلَحَ اسْتَاذَنَ عَلَیْھَا فَحَجَبَتْہُ فَاَخْبَرَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ لَھَا لَا تَحْتَجِبِیْ مِنْہُ فَاِنَّہٗ یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَۃِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ)

[رواہ مسلم: کتاب الرضاع، باب تحریم الرضاعۃ من ماء الفحل]

"حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ ان کا رضاعی چچا جس کا نام افلح تھا اس نے ان کے پاس آنے کی اجازت چاہی تو انھوں نے اس سے پردہ کیا پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ واقعہ بتلایا آپ نے فرمایا اس سے پردہ نہ کر کیونکہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں رضاعت کے سبب بھی حرام ہیں۔"

قابل حرمت ان عورتوں کو کہا جاتا ہے جن سے نکاح جائز نہ ہو اسی لیے حرمت ارشاد فرمایا گیا۔

وہ نسبی رشتے جو حرام ہیں سات ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی۔ ان سب سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

اول قاعدہ کلیہ

ہر وہ عورت جس کی طرف باپ یا ماں کے ذریعہ سے نسب رجوع کرتا ہو یعنی نانیاں خواہ قریب کی ہوں یا دور کی۔ سب مائیں ہیں اور اپنی حقیقی والدہ کے حکم میں داخل ہیں۔

دوسرا قاعدہ کلیہ

پوتیاں نواسیاں کسی درجہ کی ہوں بیٹیوں میں داخل ہیں۔

تیسرا قاعدہ کلیہ

بھانجہ، بھانجی، بھتیجا، بھتیجی سگے ہوں یا سوتیلے یہ سب حرام ہیں۔

یہ تمام رشتے نسبی ہیں۔ اس کے بعد ان رشتوں کا ذکر ہے جو سبب سے حرام ہو جاتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے دودھ پلانے والی کا ذکر ہے اس لیے کہ یہ اگر غیر تھی تو دودھ پلانے سے پہلے حلال تھی اس میں سبب حرمت دودھ پلانا ہے دودھ کے رشتے کے لیے شیر خواری کی مدت میں قلیل دودھ پینا یا کثیر دودھ پینا دونوں برابر ہیں۔

مدت شیر خواری حضرت امام ابو حنیفہ (رح) کے نزدیک تیس مہینہ تھے مگر صاحبین کے نزدیک دو سال ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ شیر خواری دو سال کے بعد اگر ہو گی تو حرمت رضاعت کو مسلزم نہیں۔

شیر خواری سے جو حرمت ہے اسے اللہ تعالیٰ عزوجل نے نسب کے قائم مقام رکھا حرم بالرضاعۃ ماحرم بانصب قاعدہ کلیہ ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ماں اور اس کی لڑکی کو شیر خوار کی بہن کہا گیا اسی طرح رضاعی ماں کا شوہر شیر خوار کا باپ ہے اور اس کا باپ اس کا دادا ہو گا۔ رضاعی ماں کی بہن شیر خوار کی خالہ ہو گی۔

اور رضاعی ماں کا ہر بچہ جو دودھ پلانے والی کے سوا اور کسی سے ہو خواہ قبل شیر خواری کے پیدا ہوا ہو یا اس کے بعد وہ سب اس کے سوتیلے بھائی بہن ہیں اور دودھ پلانے والے کی ماں شیر خوار کی نانی اور اس کی بہن اس کی خالہ اور اس شوہر سے اس کے جو بچے پیدا ہوں وہ شیر خوار کے رضاعی بھائی بہن ہیں اور اس شوہر کے علاوہ دوسرے شوہر سے جو ہوں وہ اس کے سوتیلے بھائی بہن۔

کیونکہ حدیث میں صاف حکم آ چکا کہ رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں اس لیے شیر خواہ پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے نسبی و رضاعی اصول و فروع سب حرام ہیں۔

محرمات بالصہر کا بیان ہے

وہ تین ہیں۔

بیویوں کی مائیں۔ بیویوں کی بیٹیاں بغیر ربیبہ۔ ربیبہ وہ ہے جو پہلے خاوند سے یہ عورت لڑکی لائے اور بیٹوں کی بیویاں۔ بیویوں کی مائیں یعنی ساس صرف عقد نکاح سے حرام ہو جاتی ہیں خواہ وہ بیویاں مدخولہ ہوں یا غیر مدخولہ یعنی ان سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اور لڑکی کا گود میں ہونا غالب حال کے لیے بیان ہوا نہ کہ حرمت کے لیے شرط۔ فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم کا مطلب یہ ہے کہ ان ربیبہ لڑکیوں کی ماؤں سے طلاق یا موت کے ذریعہ سے قبل از صحبت اگر جدائی ہو گئی ہو تو ایسی صورت میں ان لڑکیوں سے نکاح جائز ہے اور حلائل ابنائکم میں اس امر کی تصریح ہے کہ حقیقی بیٹوں کی بیویاں تم پر حرام ہیں کہ نہ کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں جسے متبنّٰی کہتے ہیں اور جب کہ نسلی طور پر یہ حرمت ہے تو رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہو گئی کیونکہ نسبی کے حکم میں داخل ہے اور پوتے پر پوتے بیٹوں میں داخل ہیں۔

جمع بین الاختین تو حرام ہی ہے کہ نص صریح موجود ہے اور اگر جہاد میں دو بہنیں ایسی صورت میں آئیں کہ دونوں ایک ہی کے مالک ہوں تو ان سے وطی جائز نہ ہو گی اور حدیث شریف میں پھوپھی بھتیجی، خالہ بھانجی کا بھی نکاح میں جمع کرنا حرام فرمایا گیا اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ نکاح میں ہر ایسی دو عورتوں کا جمع کرنا حرام ہے جن سے ایک کو مرد فرض کر لیا جائے تو دوسری اس کے لیے حلال نہ ہو جیسے پھوپھی بھتیجی کہ اگر پھوپھی کو مرد فرض کیا جائے تو وہ چچا بنا اور چچا اور بھتیجی حرام ہے اور اگر بھتیجی کو مرد فرض کیا جائے تو دوسری پھوپھی ہو گی۔ تو پھوپھی اس پر حرام ہو گی گویا کہ حرمت دونوں طرف سے ہے۔

اگر یہ حرمت صرف ایک طرف ہو تو جمع حرام نہیں جیسے کہ عورت اور اس کے شوہر کی لڑکی کہ ان دونوں کو جمع کرنا حلال ہے کیونکہ شوہر کی لڑکی کو مرد فرض کیا جائے تو اس کے لیے باپ کی بیوی تو حرام ہے مگر دوسری طرف سے یہ بات نہیں یعنی شوہر کی بیوی کو اگر مرد فرض کیا جائے تو یہ اجنبی ہو گی اور کوئی رشتہ ہی نہ رہے گا۔

الحمد للہ چوتھا پارہ ختم ہو گیا۔ اور پانچواں پارہ شروع ہوا۔

آیت مبارکہ:

وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ‌ۚ وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰ لِكُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ‌ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰ تُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً‌ ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۲۴﴾

لغات القرآن: [وَّ : اور] [الْمُحْصَنٰتُ : خاوند والی عورتیں] [مِنَ : سے] [النِّسَآءِ : عورتیں] [اِلَّا : مگر] [مَا : جو۔ جس] [مَلَكَتْ : مالک ہوجائیں] [اَيْمَانُكُمْ : تمہارے داہنے ہاتھ] [كِتٰبَ اللّٰهِ : اللہ کا حکم ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَاُحِلَّ : اور حلال کی گئیں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [مَّا وَرَآءَ : سوا] [ذٰلِكُمْ : ان کے] [اَنْ : کہ] [تَبْتَغُوْا : تم چاہو] [بِاَمْوَالِكُمْ : اپنے مالوں سے] [مُّحْصِنِيْنَ : قید (نکاح) میں لانے کو] [غَيْرَ : نہ] [مُسٰفِحِيْنَ : ہوس رانی کو] [فَمَا : پس جو] [اسْتَمْتَعْتُمْ : تم نفع (لذت) حاصل کرو] [بِهٖ : اس سے] [مِنْهُنَّ : ان میں سے] [فَاٰتُوْهُنَّ : تو ان کو دو] [اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً : ان کے مہر مقرر کیے ہوئے] [وَلَا : اور نہیں] [جُنَاحَ : گناہ] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [فِيْمَا : اس میں جو] [تَرٰضَيْتُمْ : تم باہم رضا مند ہوجاؤ] [بِهٖ : اس سے] [مِنْۢ بَعْدِ : اس کے بعد] [الْفَرِيْضَةِ : مقرر کیا ہوا] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ : اور شوہر والی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) سوائے ان (جنگی قیدی عورتوں) کے جو تمہاری ملک میں آ جائیں، (ان احکام حرمت کو) اللہ نے تم پر فرض کر دیا ہے، اور ان کے سوا (سب عورتیں) تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں تاکہ تم اپنے اموال کے ذریعے طلب نکاح کرو پاک دامن رہتے ہوئے نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے، پھر ان میں سے جن سے تم نے اس (مال) کے عوض فائدہ اٹھایا ہے انھیں ان کا مقرر شدہ مہر ادا کر دو، اور تم پر اس مال کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مہر مقرر کرنے کے بعد باہم رضامند ہو جاؤ، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

تفسیر و تشریح :

محصنت

جن عورتوں کے خاوند موجود ہوں وہ بھی حرام ہیں۔ البتہ جو عورتیں جنگی قیدی یعنی لونڈیاں بن کر تمہاری ملک (capture) میں آ جائیں اور ان کے خاوند دار الحرب میں رہ جائیں تو وہ عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔ کیونکہ قیدی ہونے کی وجہ سے ان کا سابقہ نکاح ختم تصور ہو گا۔ (جمیل)

یعنی جو عورتیں میدان جنگ میں پکڑی جائیں اور ان کے خاوند دار الحرب میں رہ جائیں تو ان کا سابقہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور حکومت اسلامیہ اس عورت کو جس سپاہی کے حصہ میں دے وہ اس سے ہم بستری کر سکتا ہے۔ جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہمیشہ سے حکومتوں کے لیے دردِ سر کا سبب بنا رہا ہے۔ اسلام نے اپنی فطری سادگی سے اس کا حل پیش کیا ہے کہ اگر جنگ میں دشمن قوم کے مرد اور عورتیں اسیر بن کر آئیں تو حکومت اسلامیہ کو اختیار ہے چاہے تو انھیں آزاد کر دے۔ چاہے تو ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دے۔ چاہے تو مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کا تبادلہ کر لے اور اگر مصلحت عامہ کا تقاضا یہ ہو کہ انھیں اسیر ہی رکھا جائے تو پھر اس کی اجازت ہے لیکن کیسے؟ امریکہ، جاپان، جرمنی اور روس کے قیدی کیمپوں کا یہاں کوئی وجود نہیں جہاں انھیں بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہو۔ انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہوں اور ان سے رات دن جبری مزدوری لی جاتی ہو۔

فی زمانہ جنگی قیدیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، ان پر جو ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں ان کا تَصوُّر تک لرزا دینے والا ہوتا ہے۔ اسلام نے جنگی قیدیوں کے مسئلے میں ایسا بہترین حل پیش کیا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی، وہ یہ کہ جنگ میں قید ہونے والے مردوں کو غلام بنا لیا جائے اور عورتوں کو لونڈیاں، پھر انھیں بھوکا پیاسا رکھنے، طرح طرح کی اذیتیں دینے یا دن رات ان سے جبری مزدوری لینے کی بجائے ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی، بلکہ فدیہ لیے بغیر یا فدیہ لے کر ہی سہی انھیں چھوڑ دینے کی ترغیب بھی دی، آزاد کرنے پر ثواب کی بیشمار بشارتیں سنائیں، جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا لازمی قرار نہیں دیا بلکہ مکافات عمل کے طور پر صرف اجازت دی کیونکہ اس دور میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا رواج تھا جس کو اوپر بیان کردہ طریقوں کے مطابق تدریجاً ختم کیا گیا۔ (صراط)

بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر سپاہی اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھے۔ جو اسیر عورت کسی کے حصہ میں آئے وہ ایک ماہواری گزرنے کے بعد اس سے صحبت کر سکتا ہے۔ اگر اس کے شکم سے اولاد پیدا ہوئی تو اس کے حقوق بالکل ویسے ہیں گے جیسے دوسری اولاد کے۔ اب وہ اس لونڈی کو فروخت بھی نہیں کر سکتا اور اس کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد بھی ہو جائے گی۔ (ضیاء)

مذکورہ عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہاں نکاح کا مقصد بیان فرمایا کہ یہ کام عیاشی کے لیے نہیں بلکہ بدکاری سے بچنے کے لیے ہونا چاہیے بشرطیکہ آزاد عورتوں کے حق مہر ادا کیے جائیں۔ حق مہر کی ادائیگی کے معاملہ میں باہمی رضامندی سے کچھ طے کرلیا جائے تو اس میں گناہ کی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ یاد رکھو! اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کس حد تک اس کے احکام کی پابندی کرنے والے ہو۔

قیدیوں کے بارے میں حالات کے مطابق چار صورتوں میں سے کوئی صورت اسلامی حکومت اختیار کرسکتی ہے

بلامعاوضہ آزاد کردیا جائے۔
فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔
قیدیوں کا باہمی تبادلہ کرلیا جائے۔
قومی مصلحت کے تحت ان کے شرعی واخلاقی حقوق ادا کرتے ہوئے غلام بناکر رکھا جائے۔
اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق ٗرازق اور مالک ہے اس کا حق اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اور اس کی غلامی میں زندگی گزارے۔ جو شخص یا قوم اللہ کی غلامی سے انکار اور اس کے حکم سے سرتابی کرتی ہے۔ وہ دنیا میں دنگا و فساد کا موجب بنتی ہے۔ اسے اخلاقی حدود میں رکھنے اور امن قائم کرنے کے لیے پہلے تبلیغ اور آخر میں قتال فی سبیل اللہ فرض قرار دیا گیا ہے۔
معرکہ حق و باطل میں ضروری نہیں ہر بار مسلمان ہی غالب آئیں۔ بسا اوقات مسلمان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہزیمت کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جانی ٗمالی نقصان کے ساتھ ایک دوسرے کے مرد وزن قیدی بنالیے جاتے ہیں۔ اس صورت میں کوئی چارہ کار نہ تھا کہ بامر مجبوری غلامی کی کوئی ایک صورت ایک حد تک باقی رکھی جائے۔
چنانچہ گھمبیر حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قیدیوں کے متعلق تین باتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ فدیہ لے کر چھوڑنا۔ قیدیوں کا باہمی تبادلہ۔ شخصی غلامی یا ملک کے جیل خانہ میں رکھنا۔
(۱) اگر فدیہ لے کر چھوڑنا قومی اور دینی مصلحت کے خلاف ہو جیسا کہ بدر کے قیدیوں کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرزنش ہوئی تھی تو عادی اور بھاری مجرموں کو قتل کردیا جائے گا۔
[رواہ مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب الإمداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر]
(۲) باہمی تبادلہ کی صورت نہ بن پڑے تو پھر مسئلہ کا حل غلامی کے بغیر نہیں رہتا۔ اس صورت میں بھی قومی مصلحت کے تحت فیصلہ ہوگا کہ عام جیل خانہ میں رکھنا چاہیے یا قومی بوجھ سے بچنے اور قیدیوں کی دینی ٗاخلاقی تربیت کے لیے شخصی غلامی میں دینا چاہیے۔ شخصی غلامی کی صورت میں درج ذیل پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔
کیا کوئی غیور مسلمان یہ گوارا کرسکتا ہے کہ ہمارے قیدی تو دشمن کے قبضہ میں رہیں اور دشمن کے قیدی چھوڑ دیے جائیں۔ مسلمان تو درکنار کوئی قوم بھی اس طرح کرنے کا تصور نہیں کرسکتی۔ اس ناگزیر صورت حال میں اسلام نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھنے کے احکامات

جاری فرمائے اور جن پر ہر دور کے مسلمانوں نے عمل کیا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ غلامی کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ جو قیدی جس کے ہاتھ میں آئے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے حالانکہ اس پکڑ دھکڑ کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خادم آپ کی سواری کا پلان سیدھا کر رہا تھا کہ دشمن کا تیر لگنے سے موقعہ پر فوت ہو گیا۔ صحابہ (رض) نے تبصرہ کیا کہ کتنا خوش قسمت ہے کہ ابھی چند دن ہوئے مسلمان ہوا اور شہادت کا رتبہ پالیا۔ نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ہر گز نہیں میں اسے آگ میں لپٹا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

علامہ قرطبیؒ (رح) نے محصنین کا معنی متعففین عن الزنا کیا ہے یعنی پاکباز بنتے ہوئے اور غیر مسافحین کا معنی غیر زانین۔ ان کلمات سے نکاح کی غرض وغایت کی طرف اشارہ فرمایا۔

{ وَاُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ : ان کے علاوہ سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ } یعنی جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کے علاوہ تمام عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مزید کچھ عورتیں ایسی ہیں کہ جن کا ذکر مذکورہ بالا آیات میں اگرچہ نہیں مگر ان سے نکاح حرام ہے جیسے چار عورتوں کے نکاح میں ہوتے ہوئے پانچویں سے نکاح، مُشرکہ عورت سے نکاح، تین طلاقیں دینے کے بعد حلالہ سے پہلے اسی عورت سے دوبارہ نکاح، اسی طرح پھوپھی بھتیجی، خالہ بھانجی کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا یونہی طلاق یا وفات کی عدت میں نکاح کرنا حرام ہے البتہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام نہیں، نکاح میں جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہونے کے بعد ان سے نکاح ہو سکتا ہے۔

{ اَن تَبْتَغُوا بِاَمْوٰلِكُم : تم اپنے مالوں کے ذریعے تلاش کرو۔ } عورت سے نکاح مہر کے بدلے کیا جائے اور اس نکاح سے مقصود محض لذت نفس اور شہوت پورا کرنا نہ ہو بلکہ اولاد کا حصول، نسل کی بقا اور اپنے نفس کو حرام سے بچانا مقصود ہو۔ یہاں زانی کو تنبیہ کی جارہی ہے کیونکہ اس کے پیش نظر یہ باتیں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا مقصود صرف نفسانی خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اور یوں وہ اپنے نطفہ اور مال کو ضائع کر کے دین و دنیا کے خسارے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

مہر کے چند ضروری مسائل

اس آیت میں مہر کا ذکر ہوا اس مناسبت سے یہاں مہر سے متعلق چند ضروری مسائل ذکر کئے جاتے ہیں:

(1)۔۔ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے، چاندی میں اس کا وزن دو تولے ساڑھے سات ماشے ہے، اس کی جو قیمت بنتی ہو وہ مہر کی کم از کم مقدار ہے، زیادہ کی کوئی حد نہیں باہمی رضامندی سے جتنا چاہے مقرر کیا جاسکتا ہے لیکن یہ خیال رکھیں کہ مہر اتنا مقرر کریں جتنا دے سکتے ہوں۔

(2)۔۔ مہر کا مال ہونا ضروری ہے اور جو چیز مال نہیں وہ مہر نہیں بن سکتی، مثلاً مہر یہ ٹھہرا کہ شوہر عورت کو قرآن مجید یا علم دین پڑھادے گا تو اس صورت میں مہر مثل واجب ہو گا۔

(3)۔۔ نکاح میں مہر کا ذکر ہی نہ ہوا یا مہر کی نفی کر دی کہ مہر کے بغیر نکاح کیا تو نکاح ہو جائے گا اور اگر خلوت صحیحہ ہو گئی یا دونوں میں سے کوئی مر گیا اور نکاح کے بعد میاں بیوی میں کوئی مہر طے نہیں پایا تھا تو مہر مثل واجب ہے ورنہ جو طے پایا تھا وہ واجب ہے۔ مہر سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے بہار شریعت حصہ 7 کا مطالعہ کیجئے۔

{ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهٖ مِنْهُنَّ : تو ان میں سے جن عورتوں سے نکاح کرنا چاہو۔ } یعنی جن عورتوں سے تم شرعی نکاح کر کے جماع وغیرہ کا فائدہ حاصل کرنا چاہو تو انھیں ان کے مقرر کردہ مہر ادا کرو۔

عورت سے نفع اٹھانے کی جائز صورتیں:

یادرہے کہ اسلام میں عورت سے نفع اٹھانے کی صرف دوصورتیں جائز ہیں جو قرآن پاک میں بیان کی گئی ہیں: (1) شرعی نکاح کے ذریعے۔ (2) عورت جس صورت میں لونڈی بن جائے۔ لہٰذا اس کے علاوہ ہر صورت حرام ہے۔ شروع اسلام میں کچھ وقت کیلئے نکاح سے کچھ ملتا جلتا معاہدہ کرکے فائدہ اٹھانے کی اجازت تھی لیکن بعد میں تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے قیامت تک کے لیے حرام فرمادیا۔ جیسا کہ حضرت سَبُرَہ جُہَنی (رض) سے روایت ہے، حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے (متعہ کی صورت میں) نفع اٹھانے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لیے حرام کردیا ہے تو جس کے پاس کوئی ایسی عورت ہو وہ اسے چھوڑ دے اور جو انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ نہ لو۔

(مسلم، کتاب النکاح، باب نکاح المتعۃ وبیان انّہ ابیح ثمّ نسخ۔۔ الخ، ص ۷۲۹، الحدیث: ۲۱(۱۴۰۶))

اور حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے روایت ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے متعہ سے منع فرمادیا۔ (ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی نکاح المتعۃ، ۳۶۵/۲، الحدیث: ۱۱۲۴) (صراط)

اگر بیوی کے ساتھ مباشرت یا خلوت صحیحہ ہوجائے تو سارا مہر ادا کرنا لازم ہوجاتا ہے اور اگر اس سے پیشتر ہی جدائی ہوجائے تو پھر صرف نصف مہر ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس آیت سے متعہ روافض پر استدلال کرنا سراسر باطل ہے کیونکہ محصنین غیر مسافحین کے الفاظ اس کی صراحۃ تردید کرتے ہیں نیز حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسے حجۃ الوداع کے موقع پر قیامت تک کے لیے حرام کردیا تھا۔ تفصیلی بحث سورۃ المومنون میں ملاحظہ فرمایئے۔

ہاں اگر بیوی اپنی خوشی سے سارا مہر یا اس کا کچھ حصہ بخش دے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ (ضیاء)

شان نزول

حضرت ابوسعید خدری (رض) نے فرمایا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ اوطاس میں جو فتح مکہ کے دن یا اس کے متصل ہوئی اسلامی لشکر بھیجا وہاں کے کفار مروڑ کی بیماری میں مبتلا ہوگئے اور پہاڑیوں گھاٹیوں میں چھپ گئے۔ ان کی بہت سی عورتیں گرفتار ہوکر مسلمانوں کے پاس آئیں۔

مجاہدین اسلام نے خیال کیا کہ ان کے خاوند زندہ ہیں اور انھوں نے ان کو طلاق بھی نہیں دی اس لیے ان سے صحبت حرام ہوگی۔ ان مجاہدین نے بارگاہ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر آکر دریافت کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور لونڈیوں کے ساتھ جماع کی اجازت دی گئی۔ کیونکہ لونڈی بعض احکام میں مثل جانور کے مانی گئی ہے اس لیے مافرمایا جو غیر عاقلوں کے لیے آتا ہے۔

امام اعظم (رح) کے نزدیک یہ جب ہوگا کہ صرف عورتیں ہی قید ہوکر آئیں خاوند نہ آئیں۔ اس کے بعد حلال عورتوں کے لیے کلیۃً حکم ہوا اور ارشاد ہوا۔

واحل لکم ماوراء ذلکم۔ اور حلال ہیں تم پر ان کے ماسوا جن کا ذکر ہوگیا اور یہ حلت نکاح اور ملک یمین دونوں پر حاوی ہیں۔

احل۔ کا مادہ حل ہے اس کے معنی کھلنا۔ کیونکہ جائز چیز سے پابندی دور کردی جائے اسی لیے اسے حلال کہتے ہیں۔ اس سے چند مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

ا۔ نکاح میں مہر ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان تبتغوا باموالکم فرمایا گیا جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنے مالوں کے عوض تلاش کرو اور اگر مہر معین نہ کیا ہو جب بھی مہر واجب ہے۔

۲۔ مہر مال سے ہوتا ہے نہ کہ خدمت سے جیسا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی شریعت میں تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھتین علی ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرا فمن عندک۔ میرا ارادہ ہے کہ میں ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے دوں اس مہر پر کہ آٹھ سال تک تم میری خدمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہارا احسان ہے۔ شریعت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں شریعت موسوی منسوخ ہو گئی اور خدمت سے مہر پورا تسلیم نہ ہوا بلکہ مہر کے لیے مال ہی شرط ہے۔

۳۔ اتنا قلیل مہر جسے مال نہ کہا جائے مہر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حضرت جابر اور حضرت علی اسد اللہ (رض) سے مروی ہے کہ مہر کی ادنٰی مقدار دس درہم ہیں ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے اس حساب سے ساڑھے تین ماشہ چاندی کی قیمت لگالی جائے ورنہ زیادہ جتنا بھی مقرر ہو بتراضی طرفین وہ جائز ہے۔

اور ہمارے زمانہ میں ساڑے بتیس روپے مہر شرعی یہ محض تصوراتی بات ہے، یا ممکن ہے کہ شاہان مغلیہ کے عہد کا ایک تعین ہو اور تاہم اسے شرعی کہنا صحیح نہیں آگے ارشاد ہے۔

محصنین غیر مستفحین۔ نیک چلن نہ کہ شہوت رانی کے لئے۔

محصنین۔ احصان سے بنا اس کے معنی پرہیزگاری و عفت ہیں یعنی نفس کو ان چیزوں سے محفوظ رکھنا جو ملامت کا موجب بنے۔

مسفحین۔ سفح سے بنا اس کے معنی بہانا۔ اصطلاح میں سفاح کے معنی زنا کے ہیں کیونکہ زانی صرف مادہ بہاتا ہے۔ نسل یا اولاد کا مقصد نہیں ہوتا اس لیے زنا کو سفاح کہتے ہیں۔

اس سے حرام کاری مراد ہے اور اس تعبیر میں تنبیہ ہے کہ زانی محض شہوت رانی کرتا ہے اور اس کا یہ فعل قبیح غرض صحیح اور مقصد حسن سے خالی ہے اس نہ اولاد حاصل کرنا نہ نسل و نسب محفوظ رکھنا اپنے نفس کو حرام سے بچانا منظور رہے اور وہ اپنے نطفہ سے مال کو ضائع کر کے دین و دنیا میں خسارہ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کرتا آگے مہر معین میں سے تراضی طرفین واپس لینے کی اجازت دی گئی چنانچہ فرمایا۔

مَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَـ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

تو جن عورتوں سے نکاح کر کے ان کے مقررہ مہر سے انھیں دو اور مقرر ہو جانے کے بعد اگر تمہارے آپس میں رضامندی ہو جائے تو اس میں گناہ نہیں بیشک اللہ علم و حکمت والا ہے۔

استمتعتم۔ استمتاع مصدر ہے اس کے معنی حاصل کرنا ہے۔

اجورھن۔ ان کے حقوق۔ اجور کا واحد اجر ہے۔ اس کے معنی بدلہ اس سے مہر مراد ہے۔ نکاح کے بعد اگر خلوت صحیحہ ہو جائے تو شوہر پورا مہر ادا کرے گا اور اگر صرف نکاح ہو اور رخصتی نہ ہو تو تخلیہ ہو تو اس صورت میں مہر نصف ہو گا۔

اس میں اجازت ہے کہ عورت اگر مہر مقررہ میں سے کچھ کم کر دے یا بالکل بخش دے اسی طرح مرد مقرر مہر کی مقدار زیادہ کر دے دونوں جائز ہیں۔

اس کے بعد وہ کنیزیں جو جہاد میں آئیں ان کا حکم ہے اور کم استطاعت لوگوں کے لیے آسانی کا پہلو بتایا گیا۔ (حسنات)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ع

لغات القرآن:

[وَمَنْ : اور جو] [لَّمْ يَسْتَطِعْ : نہ طاقت رکھے] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [طَوْلًا : مقدور] [اَنْ يَّنْكِحَ : کہ نکاح کرے] [الْمُحْصَنٰتِ : بیبیاں] [الْمُؤْمِنٰتِ : مومن (جمع)] [فَمِنْ : تو ۔ سے] [مَّا : جو] [مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : تمہارے ہاتھ مالک ہوجائیں] [مِّنْ : سے] [فَتَيٰتِكُمُ : تمہاری کنیزیں] [الْمُؤْمِنٰتِ : مومن ۔ مسلمان] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [اَعْلَمُ : خوب جانتا ہے] [بِاِيْمَانِكُمْ : تمہارے ایمان کو] [بَعْضُكُمْ : تمہارے بعض] [مِّنْ : سے] [بَعْضٍ : بعض (ایک دوسرے سے] [فَانْكِحُوْھُنَّ : سو ان سے نکاح کرو تم] [بِاِذْنِ : اجازت سے] [اَھْلِهِنَّ : ان کے مالک] [وَاٰتُوْھُنَّ : اور ان کو دو] [اُجُوْرَھُنَّ : ان کے مہر] [بِالْمَعْرُوْفِ : دستور کے مطابق] [مُحْصَنٰتٍ : قید (نکاح) میں آنے والیاں] [غَيْرَ : نہ کہ] [مُسٰفِحٰتٍ : مستی نکالنے والیاں] [وَّلَا : اور نہ] [مُتَّخِذٰتِ : آشنائی کرنے والیاں] [اَخْدَانٍ : چوری چھپے] [فَاِذَآ : پس جب] [اُحْصِنَّ : نکاح میں آجائیں] [فَاِنْ : پھر اگر] [اَتَيْنَ : وہ کریں] [بِفَاحِشَةٍ : بےحیائی] [فَعَلَيْهِنَّ : تو ان پر] [نِصْفُ

: نصف] [مَا : جو] [عَلَي : پر] [الْمُحْصَنٰتِ : آزاد عورتیں] [مِنَ : سے] [الْعَذَابِ : عذاب (سزا)] [ذٰلِكَ : یہ] [لِمَنْ : اس کے لیے جو] [خَشِيَ : ڈرا] [الْعَنَتَ : تکلیف (زنا)] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [وَاَنْ : اور اگر] [تَصْبِرُوْا : تم صبرو کرو] [خَيْرٌ: بہتر] [لَّكُمْ : تمہارے لیے] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [غَفُوْرٌ: بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ: رحم کرنے والا]

ترجمہ : اور تم میں سے جو کوئی (اتنی) استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو ان مسلمان کنیزوں سے نکاح کرلے جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں ہیں، اور اللہ تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو خوب جانتا ہے، تم (سب) ایک دوسرے کی جنس میں سے ہی ہو، پس ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور انھیں ان کے مہر حسب دستور ادا کرو درآنحالیکہ وہ (عفت قائم رکھتے ہوئے) قید نکاح میں آنے والی ہوں نہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ درپردہ آشنائی کرنے والی ہوں، پس جب وہ نکاح کے حصار میں آجائیں پھر اگر بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی آدھی سزا لازم ہے جو آزاد (کنواری) عورتوں کے لیے (مقرر) ہے، یہ اجازت اس شخص کے لیے ہے جسے تم میں سے گناہ (کے ارتکاب) کا اندیشہ ہو، اور اگر تم صبر کرو تو (یہ) تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تفسیر و تشریح:

ان آیات کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مالی حالت نہائیت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر آدمی آزاد خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ طول "غنااور قدرت" کو کہتے ہیں کہ تم میں سے جو شخص آزاد خاندانی عورت سے نکاح کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آزاد خاندانی عورت کا حق مہر بھی زیادہ ہو گا، اس کی زندگی کے باقی اخراجات کی کفالت بھی اس کے خاندانی مالی حالات کے مطابق ہو گی، تو ایک غریب آدمی یقینا اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ اسلام نے برائی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں، دلوں میں احساسات کو بیدار کر دیا ہے۔ جو نکاح کرنے پر قادر نہیں وہ گناہ کی زندگی بھی اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے؟ اسے کوئی سہولت ملنی چاہیے اگر متعہ کی کچھ بھی اجازت ہوتی تو اس موقعہ پر ایسے لوگوں کو اس کی اجازت ملنی چاہیے تھی۔
اس آیت میں غلبہ شہوت رکھنے والے شخص کے لیے صرف دو طریقے تجویز کئے گئے ہیں ایک یہ کہ وہ باندیوں سے نکاح کرے دوسرا یہ کہ وہ ضبط نفس کرے اور تجرد کی زندگی گزارے اگر متعہ ہوتا تو کنیزوں سے نکاح کی طاقت نہ رکھنے کی صورت میں اس کو متعہ کی ہدایت دی جاتی ' لیکن ایسا نہیں کیا گیا پس معلوم ہوا کہ کوئی شخص متعہ نہیں کر سکتا اسے نکاح ہی کرنا پڑے گا خواہ باندیوں سے کرے اور اگر ان سے بھی نکاح کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر اسے صبر کرنا پڑے گا۔ متعہ کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
(آیت) "ولیستعفف الذین لایجدون نکاحا حتی یغنیھم اللہ من فضلہ"۔ (النور: ۳۳)
ترجمہ: اور جو لوگ نکاح کی طاقت نہیں رکھتے ان پر لازم ہے کہ وہ ضبط نفس کریں حتی کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم الفاظ میں واضح فرمادیا ہے کہ اگر نکاح نہیں کر سکتے تو ضبط نفس کرو اگر متعہ جائز ہوتا تو نکاح کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں متعہ کی اجازت دے دی جاتی 'جب کہ متعہ کی اجازت کی بجائے ضبط نفس کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اسلام میں متعہ کے جواز کا کوئی تصور نہیں ہے۔ (تبیان)

(آیت) "محصنین غیر مسافحین"۔ (النساء : ۲۴)
ترجمہ : درآں حالیکہ تم ان کو قلعہ نکاح کی حفاظت میں لانے والے ہو نہ محض عیاشی کرنے والے۔
اور یہ واضح ہے کہ متعہ میں محض عیاشی ہوتی ہے اس میں متعہ والی عورت کا مرد پر نفقہ ہوتا ہے نہ اس کی طلاق ہے نہ عدت اور نہ وہ مرد کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے یہ محض عیاشی ہے۔ حفاظت نکاح میں ہوتی ہے۔

حرمت متعہ پر احادیث سے دلائل

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ خیبر کے دن عورتوں سے متعہ اور پالتو گدھوں کے گوشت کو حرام کردیا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۴۲۱۶ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۴۰۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۱۲۴)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کے ساتھ غزوہ تبوک میں گئے ہم ثنیۃالوداع پر اترے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چراغوں کو دیکھااور عورتوں کو روتے ہوئے دیکھاآپ نے پوچھا یہ کیا ہے ؟ بتایا گیا کہ جن عورتوں سے متعہ کیا گیا تھا وہ رو رہی ہیں آپ نے فرمایا نکاح ' طلاق ' عدت اور میراث نے متعہ کو حرام کردیا۔ (مسند ابویعلی ' رقم الحدیث : ۶۵۹۴ ' مؤسسۃ علوم القرآن بیروت ' ۱۴۰۸ھ)
کیونکہ متعہ میں نہ طلاق ہوتی ہے نہ عدت اور نہ میراث ' نہ اس کو نکاح کہا جاتا ہے بلکہ اس میں عورت کا نان نفقہ بھی واجب نہیں ہوتا جیسا کہ کتب شیعہ سے باحوالہ گزر چکا ہے اور نہ متعہ والی عورت پر بیوی کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بیویوں کی وارثت بیان کی گئی ہے اور متعہ والی عورت وارث نہیں ہوتی۔ (تبیان) تبیان القرآن میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث ہے۔مزید تحقیق کے لئے وہاں سے استفادہ کریں۔
سن لو (اور) یاد رکھو کہ (اللہ تعالیٰ) (اچھی طرح جانتا ہے تمہارے ایمان کو) لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مانوس ہونے اور ان کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، یعنی تمہارے عبد اور تمہاری باندیوں کے متعلق اسلامی شعور کو تفصیل سے وہی جانتا ہے بسا اوقات اسلامی معاملات لونڈیوں میں بہ نسبت آزاد عورت کے زیادہ اچھے ہوتے ہیں اسی طرح بعض اوقات عورتوں میں مردوں سے اسلامی طور واطوار زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ یہ جان لو کہ (تم میں سے) ہر ایک (ایک دوسرے سے ہے) تم سب حضرت آدم (علیہ السلام) سے کی اولاد ہو، اور تم سب کا دین اسلام ہی ہے تمہارے اور تمہارے مملوکوں یعنی غلاموں اور کنیزوں کے مابین ایمانی، دینی اور اسلامی بھائی چارہ ہے آزاد بندے کو اگر کچھ فضیلت ہے تو وہ بعض دینی اسلامی امور کے لحاظ سے ہے ورنہ دونوں برابر ہیں۔
۔۔ لہٰذا تم لونڈیوں کو حقیر نہ سمجھو اور ان سے نکاح کرنے میں نفرت نہ کرو (تو) اگر تمہارے دل میں ان میں اچھا معاملہ دیکھ کر ان سے نکاح کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور پھر تم ان سے نکاح کرنے کا ارادہ کرلو تو بیشک (ان لونڈیوں سے نکاح کرلو) لیکن یہ خیال رہے کہ یہ کام (اجازت سے ان کے مالکوں کی) انجام دو۔ ان کی اجازت کے بعد یہ نکاح تم جب چاہو خود بخود کرسکتے ہو، یہ تمہارے لیے جائز رہے گا اور نکاح

کے بعد (دے ڈالو) بلاتاخیر (ان کو ان کے مہر حسب دستور) انھیں دکھ اور تکلیف پہنچائے بغیر ان کا حق مہر دیدو اور ان کے لیے ایسی تنگی پیدا نہ کرو کہ وہ عاجز ہو کر مہر فدیہ کے طور پر دینے پر مجبور ہو جائیں۔
نکاح سے پہلے ہی سمجھ لو کہ جن سے نکاح کرنا چاہتے ہو وہ عورتیں پاکدامن ہوں اور (عفت کے قلعہ کی رہنے والیاں) ہوں (نہ کہ مستی بہانے والیاں) اور کھلم کھلا زنا کرنے والیاں اور اپنی بدکاری میں مست و سرشار رہنے والیاں نہ ہوں (اور نہ) ہی (چھپے یار بنانے والیاں) ہوں۔ جاہلیت کے زمانہ میں زنا دو طریقوں سے ہوتا تھا: ایک بطریق سفاح، یعنی جو شخص کسی عورت سے زنا کی رغبت کرتا اسے اجر و مزدوری دے کر زنا کرتا، دوسرے بطریق مخادنت، یعنی کسی مخصوص دوست سے سے زنا کرنا۔ پہلے طریق میں کھلم کھلا زنا ہوتا ہے اور دوسرے طریق میں پوشیدہ طور پر، اسے وہ اپنی اصطلاح میں زنا میں بھی شمار نہ کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان فرمایا کر واضح فرمادیا کہ یہ دونوں ہر طرح سے زنا ہیں اور دونوں حرام ہیں۔ (اشرفی)

لیکن اس کی بجائے یہ فرمایا: تم کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کرلو۔ اس کا حق مہر یقینا تھوڑا ہوگا اس کے اخراجات بھی ایک غریب عورت کے اخراجات ہوں گے، جسے ایک غریب آدمی برداشت کر سکتا ہے۔ البتہ! یہ لازمی شرط ہے کہ اسے مومنہ ہونا چاہیے، کافر لونڈی سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ذہنوں میں یہ خیال آئے کہ لونڈی کے ایمان کا کیا اعتبار؟ اس لیے فرمایا کہ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے آزاد ہونا ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ نہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جو لونڈی ہو اس کے ایمان میں بھی کمزوری ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ایمان میں آزاد عورتوں سے بلکہ تم سے بھی بہتر ہو۔ باقی رہا اس کا لونڈی ہونا تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم سب انسان ہو آزاد بھی انسان ہے اور غلام بھی انسان ہے۔ حالات کے پھیر نے بعض لوگوں کو غلامی تک پہنچادیا ہے۔ حقیقت میں تو سب حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اصل کے اعتبار سے تم میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے لونڈیوں سے نکاح کرتے ہوئے تمہیں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ یہ بات یاد رکھو! ان سے نکاح کرتے ہوئے ایمان کے ساتھ ساتھ مزید تین باتوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

1۔ جس لونڈی سے تم نکاح کرنا چاہتے ہو تم نکاح کی بات چیت اس کے مالک اور اس کے آقا سے کرو گے۔ وہ اگر اجازت دے تو نکاح ہوگا اور اگر اجازت نہ دے تو نکاح نہیں ہو سکتا۔
2۔ آزاد عورت کی طرح لونڈی کا بھی حق مہر ہے اور اس کا ادا کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔ اس لیے اگر نکاح کرلو تو ان کے مہر بھی فرض سمجھ کر ادا کرو۔ مہر کی کمیت میں فرق ہو سکتا ہے لیکن اس کے فرض ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے اگر تم اس کا مہر ادا کرنے کی نیت نہیں رکھتے تو پھر اس نکاح کا بھی کوئی جواز نہیں۔
3۔ ان کو نکاح میں لانے کے لیے بھی تمہارے ارادے پختہ اور نیک ہونے چاہئیں۔ ان کے ساتھ نکاح انھیں جذبات کے ساتھ کیا جائے جن جذبات کے ساتھ ایک آزاد عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی بیوی کو نکاح میں لا کر عفت و عصمت کا ایک حصار تیار کرنا ہے اور لونڈی کو بھی یہ بات اچھی طرح دل و دماغ میں اتارنی ہے کہ میں شوہر کی حمائیت اور حفاظت میں جارہی ہوں۔ میرا اس کے ساتھ زندگی بھر کا رشتہ ہے، اب وہی میری عزت کا محافظ ہے اور میں اس کی پرائیویسی (Privacy) کی محافظ ہوں۔ اس نکاح سے مقصود محض عیاشی کرنا اور انرجی

ضائع کرنا نہیں اور نہ ایسا ہے کہ نکاح کرنے والی لونڈیاں چھپ چھپ کر آشنائی کرنے والی ہوں، نہائیت پاکیزہ جذبات کے ساتھ یہ رشتہ وجود میں آنا چاہیے۔

عرب میں باندیوں کے ساتھ نکاح کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا اور ان کے شکم سے جو اولاد ہوتی اس کو "ھجین" کہا جاتا۔ یہ بتا کر کہ تم سب ایک آدم کی اولاد ہو اس خیال کی تردید کر دی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمٰنِكُمْ ؕ: اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔} اہل عرب اپنے نسب پر فخر کرتے اور لونڈیوں سے نکاح کو باعث عار سمجھتے تھے، ان کے اس خیال کی تردید کی گئی کہ نسب میں تم سب برابر ہو کہ سبھی حضرت آدم (علیہ السلام) سے اولاد ہو لہٰذا لونڈیوں سے نکاح کرنا باعث شرم نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ تم سب ایمان میں مُشترَک ہو کہ تمہارا دین اسلام ہے اور ایمان والا ہونا بڑی فضیلت کا حامل ہے بلکہ فضیلت کا دارومدار تو ایمان اور تقویٰ پر ہے اس لیے جب لونڈیوں سے نکاح کی حاجت ہو تو شرماؤ نہیں، ان کا ایمان والا ہونا کافی ہے۔

نکاح کا شرعی حکم

مرد کے لیے نکاح کا شرعی حکم یہ ہے کہ اعتدال کی حالت میں یعنی نہ شہوت کا زیادہ غلبہ ہو اور وہ نامرد بھی نہ ہو، نیز مہر اور نان نفقہ دینے پر قدرت رکھتا ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا سنت مؤکّدہ ہے۔ لیکن اگر اسے زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہے اور وہ زوجیت کے حقوق پورے کرنے پر قادر ہے تو اس کے لیے نکاح کرنا واجب ہے اور اگر اسے زنا میں پڑنے کا یقین ہو تو اس پر نکاح کرنا فرض ہے۔ اگر اسے زوجیت کے حقوق پورے نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو اس کا نکاح کرنا مکروہ اور حقوق پورے نہ کر سکنے کا یقین ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا حرام ہے۔ (بہار شریعت، حصہ ہفتم، ۲/۴-۵، ملخصاً)

عورت کے لیے نکاح کا شرعی حکم یہ ہے کہ جس عورت کو اپنے نفس سے اس بات کا خوف ہو کہ غالباً وہ شوہر کی اطاعت نہ کر سکے گی اور شوہر کے واجب حقوق اس سے ادا نہ ہو سکیں گے تو اسے نکاح کرنا ممنوع و ناجائز ہے، اگر کرے گی تو گناہ گار ہو گی۔ اگر اسے ان چیزوں کا خوف یقینی ہو تو اسے نکاح کرنا حرام قطعی ہے۔ جس عورت کو اپنے نفس سے ایسا خوف نہ ہو اسے اگر نکاح کی شدید حاجت ہے کہ نکاح کے بغیر مَعَاذَ اللہ گناہ میں مبتلاء ہو جانے کا ظنِ غالب ہے تو ایسی عورت کو نکاح کرنا واجب ہے اور اگر نکاح کے بغیر گناہ میں پڑنے کا یقین کلی ہو تو اس پر نکاح کرنا فرض ہے۔ اگر حاجت کی حالت اعتدال پر ہو یعنی نہ نکاح سے بالکل بے پروائی ہو، نہ اس شدت کا شوق ہو کہ نکاح کے بغیر گناہ میں پڑنے کا ظنِ غالب ہو تو ایسی حالت میں اس کے لیے نکاح کرنا سنت ہے جبکہ وہ اپنے آپ پر اس بات کا کافی اطمینان رکھتی ہو کہ اس سے شوہر کی اطاعت ترک نہ ہو گی اور وہ شوہر کے حقوق اصلاً ضائع نہ کرے گی۔ (فتاویٰ رضویہ، ۱۲/۲۹۱-۲۹۳، ملخصاً) (صراط)

اس حصن نکاح میں آ جانے کے بعد ایک لونڈی محصنہ بن جاتی ہے۔ اب وہ اپنے شوہر کی حفاظت میں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا ایک تعلق اپنے آقا سے بھی ہے۔ اس کا آقا نکاح ہو جانے کے بعد اس سے تمتع تو نہیں کر سکتا لیکن خدمت کے لیے اسے طلب کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کبھی وہ اپنے خاوند کے گھر میں ہو گی اور کبھی اپنے آقا کے گھر میں۔ خاندان کا وہ تحفظ جو ایک عورت کی جائے پناہ ہوتا ہے اور ماں باپ کا گھر جو اس کے لیے جنت ہوتا ہے وہ یقیناً اس لونڈی کو میسر نہیں۔ شوہر کا تحفظ اسے ضرور ملا ہے لیکن آقا کے رشتے نے اسے مکمل نہیں ہونے دیا۔ لیکن فی الجملہ اسے ایک پناہ گاہ مل گئی ہے۔ اس وجہ سے اب اس کے طور اطوار ہر طرح سے ایک مومنہ عورت کے ہونے

چاہئیں۔ جس میں کسی بداخلاقی کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر وہ کوئی بدکاری کا ارتکاب کرتی ہے تو اب چونکہ وہ مسلمان معاشرے کا ایک فرد بن گئی ہے۔ اسے برائی کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا، اب اسے سزا ملے گی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسے ایک آزاد عورت جیسا خاندانی تحفظ حاصل نہیں اور اس کی ذمہ داری دو گھروں میں تقسیم ہونے کے باعث اس تحفظ کو اور بھی کمزور کرچکی ہیں۔ اس لیے اللہ کی صفت عدل نے اس کی اس کمزوری پر رحم فرمایا اور اس کی سزا میں تخفیف کردی اور حکم دیا کہ اس کی سزا ایک غیر شادی شدہ آزاد لڑکی سے نصف ہونی چاہیے یعنی اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں گے تاکہ وہ آئندہ کے لیے ایسی کسی برائی کا سوچ بھی نہ سکے۔ (روح)

ان دو تین آیتوں میں محصنات اور محصنین کے الفاظ کا کئی بار تکرار ہوا ہے۔ لیکن کسی جگہ اس کا معنی شادی شدہ کہیں پاکباز کہیں آزاد اور کہیں کنوارہ کیا گیا ہے۔ جس سے اگر کسی نوآموز کے ذہن میں تردد پیدا ہو جائے تو کچھ بعید نہیں کہ ایک لفظ ہے اور قدم قدم پر اس کے معانی بدلتے چلے جارہے ہیں۔ اس لیے اس تردد کے ازالہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان الفاظ کی تحقیق کی جائے۔ ان الفاظ کا ماخذ احصان ہے۔ اس کا لغوی معنی روکنا اور حفاظت کرنا ہے۔ اسی لیے قلعہ کو حصن کہتے ہیں کیونکہ وہ دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور مضبوط زرہ کو درع حصینۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حریف کے وار سے جسم کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے جو مرد یا عورت بدکاری سے اپنی حفاظت کرے اسے بھی محصن اور محصنۃ کہتے ہیں۔ اس حفاظت کے متعدد اسباب ہیں۔ اسلام، آزادی، طبعی عفت، بکارت اور زواج۔ ان میں سے ہر ایک چیز انسان کو بدکاری سے روکنے والی ہے۔ اس لیے موقع اور محل کی مناسبت سے اس لفظ کا معنی متعین کیا جائے گا۔ خصوصا معنی کا وہ تعین جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے وہ قطعی ہوگا اس میں ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ یہاں محصنات کا معنی آزاد باکرہ لڑکیاں ہیں اور یہاں محصنات کا یہ معنی حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا متعین کردہ ہے کیونکہ سنت نبوی کے مطابق انھیں کی سزا سو درے ہے جس نصف پچاس درے مسلمان لونڈی کی سزا ہے۔ دوسرے قوانین میں مراعات اور گنجائشیں ان لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو صاحب جاہ و ثروت ہوں اور سوسائٹی میں کوئی بلند مقام رکھتے ہوں۔ لیکن اس دین فطرت میں ان مراتب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ انسان کی فطری کمزوریوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جہاں پھسلنے کے امکانات زیادہ اور بچنے کے وسائل کم ہیں۔ وہاں سزا میں تخفیف کردی گئی۔ غلاموں، باندیوں، غیر شادی شدہ اور شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی سزا میں کمی بیشی کا یہی راز ہے (جرم زنا کی سزا پر تفصیلی بحث سورۃالنور میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ)۔ (ضیاء)

آیت کے آخر میں فرمایا کہ لونڈی سے شادی کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو ہے جو آزاد خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت نہ رکھتے ہوں اور ساتھ ہی انھیں یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر میں نے نکاح نہ کیا تو شائد میں بند تقویٰ کو ٹوٹنے سے نہ بچاسکوں، ممکن ہے کسی گناہ میں آلودہ ہو جاؤں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ لونڈی سے نکاح کرنا کوئی فروتر بات ہے۔ نہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لونڈی اپنے آقا کی بھی خدمت کرے گی اور اپنے شوہر کی بھی۔ عین ممکن ہے کہ اس کا شوہر اس منقسم زندگی سے مطمئن نہ رہے اور اس کا اس کے آقا کے پاس جانا اسے اچھا نہ لگے اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی آسودگی کے لیے پھانس بن جائیں۔ اس لیے فرمایا: اگر تم صبر کرو اور اچھے حالات کا انتظار کرو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

تخفیف سزا کی بنیادی وجوہات یہ ہیں

ا۔ آزاد عورت کو اپنے خاوند، خاندان اور والدین کی حفاظت و نگرانی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ لونڈی پر اتنی نگرانی نہیں ہوتی۔

۲۔ لونڈی کسی کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے کہ مالک اسے جہاں اور جن لوگوں کے پاس چاہے کام کے لیے بھیج سکتا ہے جب کہ آزاد عورت اس طرح مجبور نہیں ہوتی۔

۳۔ کسی کی لونڈی ہونے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر خاوند کا رعب اور وقار اتنا نہیں سمجھتی جتنا آزاد عورت سمجھتی ہے کیونکہ یہ لونڈی اپنے مالک کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان وجوہات کی وجہ سے لونڈی سے بدکاری ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے جس وجہ سے سزا میں بھی تخفیف کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آزاد عورتوں کو چھوڑ کر لونڈیوں سے شادی کرنے کی دو وجوہ بیان کی ہیں انھیں ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

ا۔ آزاد عورت سے شادی کے اخراجات برداشت نہ کر سکتا ہو۔

۲۔ آدمی اپنے آپ میں کسی گناہ میں ملوث ہونے کا خوف محسوس کرتا ہو۔

ان دو وجوہات کے علاوہ اسے لونڈی سے شادی کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

لونڈی سے نکاح کرنے کی قباحتیں :

ا۔ غیور آدمی کو یہ بات مسلسل کھٹکتی رہے گی کہ میری بیوی دوسرے کی لونڈی ہے۔

۲۔ لونڈی کی اولاد اس کے خاوند کی بجائے شرعی طور پر آقا کی ملکیت ہوتی ہے۔

۳۔ لونڈی اپنے خاوند کے حق زوجیت ادا کرنے کے علاوہ باقی معاملات میں اپنے آقا کی پابند ہوتی ہے۔ (فہم)

اہم نقطہ

آیت بالا کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذکر آیا ہے ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں جو کافر مرد و عورت جہاد کے موقع پر قید کر لیے جاتے تھے اور امیر المومنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ قیدی غلام باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی (باستثناء بعض صورتوں کے) جن کا تفصیلی ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے جب سے مسلمانوں نے شرعی طوپر جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے اور اپنے جہاد اور صلح وجنگ کا مدار دشمنان دین کے اشاروں پر رکھ دیا اور غیر شرعی اصولوں کے پابند ہوگئے ہیں اس وقت سے غلام اور باندی سے بھی محروم ہوگئے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ آزاد ہیں۔

بعض علاقوں میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

باندی سے نکاح کی کراہت کی وجہ :

حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو سعید (رض) کی روایت سے اور ابن ماجہ ' بزار اور بیہقی نے حضرت عبداللہ (رض) بن عمر (رض) کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ باندیوں سے نکاح کی کراہت اس وجہ سے ہے کہ اولاد غلام ہوگی اور غلامی موت کے حکم میں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اپنے نطفوں کے لیے انتخاب کرو ' کفو سے نکاح کرو اور کفوا سے نکاح کراؤ۔ رواہ ابوداؤد والحاکم۔ بیہقی نے اس حدیث کی تصحیح کی۔ یہ حدیث حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے آئی ہے۔ (گلدستہ)

مسائل

ا۔ یہاں محصنٰت سے مراد غلامی سے محفوظ یعنی آزاد غیر شادی شدہ عورتیں۔
۲۔ اپنی لونڈی سے نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے کسی دوسرے شخص کی لونڈی سے نکاح ہو سکتا ہے۔
۳۔ لونڈی سے نکاح اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔
۴۔ پاک دامن عورتیں ہوں۔ بدکاری کرنے والیاں نہ ہوں اور غیروں سے ناجائز تعلقات رکھنے والیاں نہ ہو۔
۵۔ غیر شادی شدہ آزاد عورت کو زنا کی سزا 100 کوڑے ہے۔ شادی شدہ یا غیر شادی شدہ لونڈی کی زنا پر سزا 50 کوڑے۔
ا۔ کوڑے کی سزا کے ڈر سے زنا سے بچتے رہیں۔ اور زنا کے خوف سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لیں۔
۲۔ اگر تم برداشت کرو تو لونڈی سے نکاح بھی نہ کرنا پڑے اور سزا ملنے والا کام بھی نہ کریں تو بہتر ہے۔

آیت مبارکہ:

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾

لغات القرآن:[يُرِيْدُ : چاہتا ہے] [اللّٰهُ : الله] [لِيُبَيِّنَ : تاکہ بیان کردے] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [وَيَهْدِيَكُمْ : اور تمہیں ہدایت دے] [سُنَنَ : طریقے] [الَّذِيْنَ : وہ جو کہ] [مِنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے] [وَيَتُوْبَ : اور توجہ کرے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَاللّٰهُ : اور الله] [عَلِيْمٌ: جاننے والا] [حَكِيْمٌ: حکمت والا]

ترجمہ : اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (اپنے احکام کی) وضاحت فرمادے اور تمہیں ان (نیک) لوگوں کی راہوں پر چلائے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تمہارے اوپر رحمت کے ساتھ رجوع فرمائے، اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

تفسیر و تشریح:

اس آیت میں بتایا گیا کہ اللہ عزوجل کی مرضی یہ ہے کہ احکام واضح کرے اور انبیاء و صالحین جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کی راستوں سے مطلع کرے اور جو خواہشات کے پیرو ہیں وہ تمہیں حرام میں مبتلا کر کے گمراہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم ان کی طرح خراب ہو جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ عزوجل اپنے احکام تم پر بعض امتوں سے ہلکے نافذ فرمانا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ انسان ضعیف البنیان ہے اس کو عورتوں سے صبر مشکل ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عورتوں میں بھلائی نہیں اور ان کی طرف سے صبر بھی نہیں نیکوں پر وہ غالب آتی ہیں اور بد ان پر غالب آتا ہے۔

انسانی زندگی کے اہم مسئلے مثلاًر شتہ ازواج وغیرہ کے احکام ارشاد فرمائے مثلاً زنا کی مذمت۔اس سے توبہ۔ عورتوں کے احکام۔ محرمات کا ذکر۔ نکاح کا مہر۔

انسان کو اپنی کمزوریوں کے باعث ان احکام کی اطاعت ناگوار ہوتی ہے اس لیے ان احکام پر زور دیا گیا ہے۔

شانِ نزول

یہود، علاتی بہنوں اور بھتیجیوں، بھانجیوں سے نکاح جائز سمجھتے تھے۔اسلام نے ان عورتوں کو حرام کیا تو یہود نے کہا کہ اسلام نے خالہ۔ پھوپھی کو حرام کیا ہے لیکن ان کی بیٹیاں حلال ہیں۔ ایسے ہی وہ بھائی بہن حرام ہیں ان کی بیٹیاں حلال ہونی چاہیے تھیں۔اس کا رد فرمایا گیا کیونکہ یہ حکم توراۃ میں نہ تھا بلکہ یہ محض ان کی نفسانی خواہشات تھیں اس لیے فرمایا کہ یہ خواہشات کی اتباع کرتے ہیں۔

اس کے بعد غیر کے مال کو اپنے مال میں ملا کر کھانے کی ممانعت ہے۔

عورتوں کے حقوق اور دیگر مسائل کے بارے میں دنیا کے دو بڑے مذاہب یہود و نصاریٰ نے بہت سے حقائق چھپا رکھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کو کھول کھول کر بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کھول کر بیان کیے ہیں تاکہ تمہیں پہلے انبیاء اور صلحاء کا راستہ دکھلایا جائے اور تمہیں معلوم ہو کہ اللہ کے برگزیدہ لوگوں کی زندگی کا کیا اسلوب ہوا کرتا ہے تاکہ تم صالح زندگی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے حقدار بن جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے کرم و فضل کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کے پجاری، خواہشات کے بندے اور رسومات کے غلام بن چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم صراطِ مستقیم اور اللہ کے کرم سے محروم ہو جاؤ۔ یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی جو تمہاری قوت عمل سے باہر ہو۔ دینی احکام کو اس لیے آسان رکھا گیا کیونکہ انسان نہایت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

(عَنۡ اِبِیۡ هُرَیۡرَةَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ الدِّیۡنَ یُسۡرٌ وَلَنۡ یُّشَادَّ الدِّیۡنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ فَسَدِّدُوۡا وَقَارِبُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالۡغُدۡوَةِ وَالرَّوۡحَةِ وَشَیۡءٍ مِّنَ الدُّلۡجَةِ) [رواہ البخاری: کتاب الایمان، باب الدین یسر]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دین آسان ہے کوئی شخص اسلام پر غالب نہیں آسکتا بلکہ دین ہی غالب ہوگا۔ اجر و ثواب کا راستہ اور میانہ روی اختیار کرو، لوگوں کو خوشخبریاں دو، صبح و شام اور رات کے کچھ حصے میں اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہو۔"

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) کے بعد کچھ نام نہاد علماء نے مصنوعی تقویٰ، گروہی تعصّبات اور دنیوی مفادات کی خاطر دین اسلام میں بے پناہ اضافے کیے (خارجی، قرامطی، جبریہ، قدریہ، اسماعیلی وغیرہا)۔ مذہبی پیشواؤں کی مجرمانہ حرکت، لوگوں کی بے علمی اور دین سے عدم دلچسپی کی وجہ سے آسان ترین دین آج لوگوں کو مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ دین نہایت ہی آسان اور فطرت انسانی کے مطابق بنایا ہے۔ عادی مجرموں، پیشہ ور ظالموں اور اس پر جان بوجھ کر عمل نہ کرنے والوں کے سوا سب کے لیے دین آسان ہے۔ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے گا اسے نہ صرف دین آسان دکھائی دے گا بلکہ اس کی دنیا و آخرت کی مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ اجتماعی ضابطوں پر اجتماعی طور پر اور انفرادی قوانین پر انفرادی سطح پر عمل پیرا ہوا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے :

یقینا اسلام فطرت کے موافق اور آسان بنایا گیا ہے۔ انسانی طبائع کیونکہ ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں۔ دنیاوی ترغیبات، معاشرتی اور کاروباری مشکلات انسان پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں جن کی وجہ سے آدمی سستی، کم ہمتی اور بے توجہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے سستی سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیے۔ گرامی قدر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بڑے اہتمام کے ساتھ اللہ کے حضور یہ دعائیں کیا کرتے تھے:

(اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ) [رواہ ابوداؤد: کتاب الصلاۃ]

"الٰہی! اپنے ذکر، شکر اور اچھی طرح عبادت کرنے پر میری مدد فرما۔"

(اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَالْھَرَمِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ) [رواہ الترمذی: کتاب الدعوات]

"اے اللہ! میں سستی، بڑھاپے، بزدلی اور بخیلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت دینا اور ان کی توبہ قبول کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ بدکار لوگ نیک لوگوں کو بے حیا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ انسان کی کمزوری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں آسانی پیدا فرمائی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

لغات القرآن: [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [يُرِيْدُ : چاہتا ہے] [اَنْ : کہ] [يَّتُوْبَ : توجہ کرے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَيُرِيْدُ : اور چاہتے ہیں] [الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ : جو لوگ پیروی کرتے ہیں] [الشَّهَوٰتِ : خواہشات] [اَنْ : کہ] [تَمِيْلُوْا : پھر جاؤ] [مَيْلًا : پھرجانا] [عَظِيْمًا : بہت زیادہ]

ترجمہ: اور اللہ تم پر مہربانی فرمانا چاہتا ہے، اور جو لوگ خواہشات (نفسانی) کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے بھٹک کر بہت دور جا پڑو

تفسیر و تشریح:

اسلامی منہاج

ان گوناگوں اصلاحات نے عرب کے پرانے طرز تمدن و معاشرت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اب لڑکیوں کو بھی اپنے بھائیوں کی طرح ورثہ ملنے لگا تھا۔ عورت اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد اپنے سوتیلے بیٹے کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دی گئی تھی بلکہ عدت گزرنے کے بعد اسے اختیار تھا کہ جس سے چاہے نکاح کرے۔ سوتیلی ماں سے نکاح کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ زنا کو جرم قرار دے دیا گیا تھا اور اس کے لیے سنگین سزا مقرر کر دی گئی تھی۔ اسی طرح متعدد ایسے قوانین نافذ کر دیئے گئے تھے جو ان کے قدیم رسم و رواج کے سراسر خلاف تھے۔ ایک طبقہ اپنی دیرینہ جہالت سے اندھی عقیدت کے باعث ان اصلاحات پر آتش زیر پا ہو گیا۔ اور وہ لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کے لیے ان قوانین کا سہارا لینے لگا۔ اس کے علاوہ یہودی بھی یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کے نافذ کردہ من گھڑت قوانین میں کسی قسم کا ردوبدل کیا جائے کیونکہ اس میں ان کی علمی برتری کی ہتک تھی اور منافقین کا تو محبوب مشغلہ ہی یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیمات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی جائیں۔ یہ سب لوگ مسلمانوں کو احکام الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنے اپنے مخصوص حیلے اختیار کرتے اللہ تعالیٰ اس آیت میں مسلمانوں کو ان کے مکر و فریب سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرما رہے ہیں۔

اس مختصر اور ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے کیا چاہتے ہیں اور کیسے نظام کے ذریعے چاہتے ہیں کس طریقے سے چاہتے ہیں؟ اور جو لوگ نظام زندگی کو صرف جنسی تعلقات (Sex) پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور جو انسانوں کو اسلامی نظام زندگی سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ انسان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی منہاج سے ہٹ کر کسی دوسرے منہاج کو اختیار کرتے ہیں ان کا نظام شہوات پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف ایک اسلامی نظام زندگی ہی ہے جو سنجیدگی ' سچائی راستی اور احساس ذمہ داری پر مبنی ہے۔ باقی جس قدر نظام ہیں وہ اتباع نفس ' اطاعت شہوت اور فسق و فجور اور کج روی و گمراہی پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے منہاج سے اچھی طرح آگاہ کر رہا ہے اپنے طریقے تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ انسانوں پر رحمت اور شفقت کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ تمہیں راہ راست کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے کہ زندگی کی راہوں میں فلاں مقامات ہیں جہاں پھسلنے کا خطرہ ہے۔ وہ سربلندی اور ترقی میں تمہاری امداد کرنا چاہتا ہے تاکہ تم بلندی کی انتہاؤں کو چھو سکو۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اپنے نظاموں کو صرف شہوات کی تلاش پر رکھتے ہیں اور وہ لوگوں کے لیے شہوت پر مبنی نظامہائے زندگی تجویز کرتے ہیں اور انھیں خوب سجاتے ہیں جن کی اسلامی نظام حیات کی رو سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے ان کی اجازت دی ہے نہ اسے جائز قرار دیا ہے۔ یہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان راہ راست سے ہٹ کر دور تک گمراہی کی راہوں پر نکل جائیں اور اسلامی نظام زندگی اور اس کی انتہائی بلندیوں سے محروم ہو جائیں۔

زندگی کے اس شعبے میں جس کی سابقہ آیات میں ہدایات دی گئیں ' یعنی خاندان کی شیرازہ بندی ' سوسائٹی کی طہارت ' مرد و زن کے باہمی تعلقات کے لیے واحد پاک و صاف طریقہ کار کے تعین اور اس کے سوا تمام طریقوں کے ساتھ جنسی ملاپ کی حرمت ' ان کی مذمت اور مسلمانوں کی فکر و نظر میں ان کی گراوٹ و قباحت کا شعور پیدا کرنے کے لیے اس شعبے میں اللہ تعالیٰ کا منصوبہ کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے جو صرف شہوت رانی پر انسانی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتے ہیں؟

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے 'اس کا بیان تو سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ کر دیا گیا 'جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرد وزن کے اس تعلق کو منظّم کرنا چاہتے ہیں۔اس تعلق کو پاک وصاف اور مقدس بنانا چاہتے ہیں اور اسے اس طرح استوار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جماعت مسلمہ کے لیے ہر حال میں خیر ہی خیر ہو۔

رہے وہ لوگ جو صرف شہوت رانی چاہتے ہیں تو وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ فطری میلانات ہر طرح سے بے قید ہو جائیں۔ان پر نہ کوئی دینی پابندی ہو 'نہ اخلاقی پابندی ہو اور نہ کوئی اجتماعی پابندی ہو۔وہ چاہتے ہیں کہ شہوت کی یہ بھٹی بلاروک وٹوک گرم سے گرم تر ہوتی چلی جائے اس پر کسی قسم کا قدغن نہ ہو 'اور وہ اس قدر گرم ہو کہ ہر دل بے قرار ہو جائے 'اعصاب پر کوئی کنٹرول نہ رہے اور اس طرح کوئی گھر مطمئن نہ ہو۔کسی کی عزت محفوظ نہ رہے 'کسی خاندان کا وجود باقی نہ رہے اور انسانوں کی حالت یہ ہو جائے کہ ہو جانووں کا گلہ بن جائیں اور پھر ان کے نر (MAle) جانور مادہ (FemAle) جانوروں کو دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں ان کے لیے قوت 'وسائل اور تدبیر کے سوا کوئی ضابطہ نہ ہو 'یوں پورا معاشرہ ہل جائے۔ہر طرف فساد ہی فساد ہو 'آزادی کے نام پر ہر طرف شر وفساد برپا ہو آزادی کا اگر صرف یہ ہی مفہوم ہے تو وہ صرف آزادی شہوات ہے اور اس پر مبنی نظام صرف شہوانی نظام ہے۔

یہ ہے وہ گمراہی اور کج روی جس سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ڈراتا ہے 'وہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ اس شہوانی نظام حیات کے داعی انھیں کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں شہوانی نظام کے داعی اس وقت یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ نوخیز اسلامی معاشرے کو پلٹا کر دوبارہ اخلاقی بے راہ روی کے نظام کی طرف لے جائیں جس میں وہ بہت دور جا نکلے تھے 'اور اسلام کے پاک وصاف اور مستحکم معاشرتی نظام کی وجہ سے وہ اس میں اکیلے رہ گئے تھے 'اور یہی وہ ہدف ہے جس کی طرف آج کے یہ بے راہ قلمکار اور ادیب دعوت دے رہے ہیں اور جس میں آج کے تمام ذرائع ابلاغ و تفریح رات دن مصروف ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ آج اسلامی معاشرے میں 'حیوانی شہوت رانی کی راہ میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں ہیں انھیں بھی ختم کر دیں، یہ حقیقت ہے کہ اس حیوانیت سے انسان کو صرف اسلامی نظام زندگی ہی نجات دے سکتا ہے جب اسلام کی انقلابی قوتیں اگر اللہ نے چاہا اس نظام کو دنیا میں نافذ کر دیں گی۔' (قطب)

اتباع ہویٰ باعث ہلاکت و تباہی۔ والعیاذ باللہ :

سو اس سے واضح فرما دیا گیا کہ خواہشات نفس کی پرستش و پیروی، ہلاکت و تباہی کی راہ ہے۔۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ :۔ سو ایسے لوگ جانتے ہیں کہ خواہشات کی پیروی میں تم لوگ حیوانیت سافرہ اور بہیمیت مطلقہ کی اس راہ پر چلو جو تم لوگوں کو شرف انسانیت سے محروم کر دے۔اور اس طرح تم لوگ دائمی ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں جا گرو۔ سو اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ خواہشات نفس کی پیروی انسان کو راہ حق و صواب سے دور اور اتنا دور لے جاتی ہے کہ اس کے لیے راہ حق و صواب کی طرف واپسی بہت مشکل، بلکہ بعض حالات میں ناممکن ہو جاتی ہے۔اور اس طرح وہ دائمی ہلاکت و تباہی کے ہول ناک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ تو پھر کیا خیال ہے آپ کا چہار سو پھیلے ان مادہ پرست معاشروں کے بارے میں کہ جن کی زندگی کی اساس وبنیاد ہی خواہش پرستی پر قائم ہے ؟ اور خواہش نفس ہی کو انھوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے ؟ اور ان کی ساری تگ و دو خواہشات نفس کی پوجا و پرستش کے محور کے گرد گھومتی ہو اور وہ علم کے باوجود ضلالت و گمراہی کے ہول ناک گڑھوں میں جا گرے ہوں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں اس بارے میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا { اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ } الٰایۃ (الجاثیہ : 23) سو ایسوں کو حق و ہدایت کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی کہ اتباع ہوا کی بناء پر ایسوں کے کانوں اور ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں، دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے۔ سو جن کے دل و دماغ ماؤف و

معطل اور ان کی آنکھیں اور کان بند ہو جائیں ان کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے اور کون دے سکتا ہے ؟ { وَخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِہٖ وَقَلۡبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنۡ یَّہۡدِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰہِ ؟ } جبکہ ہدایت سے سر فرازی کے لیے اولین اساس اور بنیادی شرط طلب صادق اور رجوع الی اللہ ہے۔ وباللہ التوفیق لما یحب ویرید — (مدنی)

اس آیت میں ایسے تمام لوگ داخل ہیں جو اپنی عقل سے احکام شرع پر اعتراض کرتے ہیں مثلاً مردوں کو عورتوں کے مساوی کیوں نہیں رکھا ' نابالغ لڑکی کا نکاح کرنا کیوں جائز ہے ' یتیم پوتے کو دادا کی میراث سے ترکہ کیوں نہیں ملتا ' تجارتی سود تو نفع کا متبادل ہے اس کو کیوں حرام کیا گیا ہے ' پردہ کی قیود سے عورتوں کا حق آزادی مجروح ہوتا ہے ' موسیقی تو روح کی غذا ہے اس کو کیوں ناجائز کیا گیا ' اور اس قسم کے تمام احکام کو ملا کی رجعت پسندی اور فرسودگی قرار دیتے ہیں اور بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ عورت کو طلاق کا حق کیوں نہیں ہے ' اور عورت کو بیک وقت چار خاوندوں سے نکاح کی اجازت کیوں نہیں ہے وغیرہ وغیرہ نعوذ باللہ من تلک الخرافات (ضیاء)

اس اختتامیہ کی آخری جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس کی ان کمزوریوں ہی کی وجہ سے اللہ کو اس پر رحم آتا ہے ۔ اس لیے اللہ اس کے لیے جو منہاج حیات وضع کرتا ہے اور جو قانون بناتا ہے اس میں وہ ضعف کو ملحوظ رکھتا ہے اس لیے ہلکے پھلکے احکام نازل کرتا ہے ' اس کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے بجائے اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حرج مشقت مضرت سے بچاتا ہے۔

آیت مبارکہ:

یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ ۚ وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾

لغات القرآن: [یُرِیْدُ : چاہتا ہے] [اللّٰهُ : الله] [اَنْ : کہ] [یُّخَفِّفَ : ہلکا کردے] [عَنْكُمْ : تم سے] [وَخُلِقَ : اور پیدا کیا گیا] [الْاِنْسَانُ : انسان] [ضَعِیْفًا : کمزور]

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے، اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے

تفسیر و تشریح:

اللہ تعالیٰ ہی انسان کا خالق ہے اور وہ انسان کی فطری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے احکام کا مکلّف نہیں بنایا جو اس کی طاقت سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر انسان کے اندر جنسی رغبت کا مادہ رکھا گیا ہے۔ اب اگر ہر انسان کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سنت کا پابند کیا جاتا کہ چونکہ انھوں نے شادی نہیں کی اس لیے کوئی اور بھی شادی نہ کرے تو اس حکم کی اطاعت کرنے میں سنگین مشکلات پیش آتیں اور نسل انسانی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا، اس لیے اسلام نے عورتوں سے نکاح کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب دی اور نکاح کو دین کا نصف حصہ قرار دیا۔

نیز انسان پیدائشی طور پر کمزور تو ہے ہی، لیکن جس قدر قیامت قریب آتی جا رہی ہے اسی قدر انسان کی کمزوری بھی بڑھتی جا رہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں پر جو احکام نازل فرمائے مسلمانوں پر ان میں بھی تخفیف فرما دی جیسے سفر اور بیماری میں روزہ نہ رکھنے کی، پانی پر قدرت نہ ہونے

سے تیمّم کی اور تمام روئے زمین پر نماز پڑھنے کی رخصت عطا فرمائی جس کی پہلی امتوں میں اجازت نہیں تھی۔ الغرض شریعت کے سارے احکام میں انسان کی سہولتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام آسانی کا درس دیتا ہے۔

آیات :

۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ (قرآن : 286:2)

۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا۔

(قرآن : 185:2)

احادیث :

۔ حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، ان پر سختی نہ کرو، لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور (انھیں دین سے) متنفر نہ کرو۔

(بخاری : 69 : کتاب العلم : باب 12)

۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی کھڑا ہوا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں سے فرمایا : اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دو کیونکہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تمہیں تنگی پیدا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ (بخاری : 220 : کتاب الوضوئ : باب 61)

۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : بیشک دین آسان ہے اور جو شخص دین کے کاموں میں شدت اختیار کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا، لہٰذا تم درست کام کرو اور دین کے قریب رہو اور ثواب کی خوشخبری دو اور صبح وشام اور رات کے کچھ حصہ میں عبادت سے مدد حاصل کرو۔ (بخاری : 39 : کتاب الایمان : باب 30)

۔ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے زیادہ آسان چیز کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا اور اگر گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے ہوتے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا لیکن جب کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود کی خلاف ورزی کرتا تو آپ ﷺ اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے انتقام لیتے۔ (بخاری : 6126 : کتاب الادب : باب 80)

۔ ایک دفعہ نجران کے چودہ عیسائی حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کرنے مدینہ منورہ آئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور انھیں اپنے عیسائی طریقہ کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دی، چنانچہ عیسائی حضرات نے مسجد نبوی کے ایک کونے میں مشرق کی طرف رخ کر کے اپنی عبادت کی۔

(تفسیر قرطبیؒ : سورۃ آل عمران : زیر آیت نمبر 2، طبقات ابن سعد : جلد اول : ص 307)

۔ حضرت عمر فاروق (رض) کا ایک عیسائی غلام تھا، آپ (رض) نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے قرآن مجید کا حوالہ دیا کہ دین میں جبر نہیں ہے اور اس سے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور حضرت عمر فاروق (رض) کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو حضرت عمر فاروق (رض) نے اس عیسائی غلام کو آزاد کر دیا۔ (عمر بن خطاب : ابن جوزی : ص 169)

اسلام ایک آسان دین ہے، لہٰذا جب کسی مسئلہ میں سلف صالحین کے اقوال مختلف ہوں تو اہل علم حضرات کو وہی راستہ واضح کرنا چاہیے جو مسلمانوں کے لیے آسان ہو بشر طیکہ وہ گناہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انسانوں کے لیے آسانی کو ترجیح دی ہے۔ (امداد)

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر آسانی کرے

اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنے بندوں پر آسانی چاہتا ہے اسی لیے انھیں نرم احکام عطافرماتا ہے اور کئی جگہ رخصتیں عطافرماتا ہے، لوگوں کی طاقت کے مطابق ہی انھیں حکم دیتا ہے اور ان کے فطری تقاضوں کی رعایت فرماتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان فطری طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اسی فطری کمزوری کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد عورت کی طرف بڑی جلدی مائل ہو جاتا ہے، اس کے لیے عورت اور شہوت سے صبر دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرماتے ہوئے مردوں کے لیے عورتوں سے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے نفع اٹھانے کی اجازت دی اور صرف ان عورتوں سے منع کیا جن سے نفع اٹھانے میں فساد عظیم اور بڑے نقصان کا خدشہ تھا۔ اسی لیے مُتّقی، پرہیزگار اور گناہوں کا تقاضا اور موقع موجود ہونے کے باوجود گناہوں سے بچ رہنے والے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں بڑے محبوب ہیں کہ انھوں نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا کیلئے اپنی کمزوری کا مقابلہ کیا اور اپنی خواہشات کو پس پشت ڈالا۔ ترغیب کیلئے ایک ایسے ہی متقی بزرگ کا واقعہ پیش خدمت ہے۔

مشک کی خوشبو میں بسے ہوئے بزرگ

بصرہ میں ایک بزرگ مسکی یعنی "مشک کی خوشبو میں بسا ہوا" کے نام سے مشہور تھے، کسی نے بَاِصرار اس خوشبو سے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا "میں کوئی خوشبو نہیں لگاتا، میرا قصہ بڑا عجیب ہے، میں بغداد معلّٰی کا رہنے والا ہوں، جوانی میں بہت حسین و جمیل تھا اور صاحب شرم وحیاء بھی۔ ایک کپڑے والے کی دوکان پر میں نے ملازمت اختیار کی، ایک روز ایک بڑھیا آئی اور اس نے کچھ قیمتی کپڑے نکلوائے اور دوکاندار سے کہا: میں ان کپڑوں کو گھر لے جانا چاہتی ہوں، اس نوجوان کو میرے ساتھ بھیج دیں، جو کپڑے پسند آئیں گے وہ رکھ لیں گے پھر ان کی قیمت اور بقیہ کپڑے اس نوجوان کے ہاتھ بھیج دیں گے۔ چنانچہ مالک دکان کے کہنے پر میں بڑھیا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے ایک عالیشان کوٹھی پر لے آئی اور مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا، پھر میرے قریب بیٹھ گئی، میں گھبرا کر نگاہیں نیچی کئے فوراً وہاں سے ہٹ گیا مگر اس پر شہوت سوار تھی وہ میرے پیچھے پڑ گئی، میں نے بہت کہا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈر، وہ ہمیں دیکھ رہا ہے لیکن وہ میرے ساتھ منہ کالا کرنے پر مُصِرّ تھی۔ میرے ذہن میں اس گناہ سے بچنے کی ایک تجویز آئی تو میں نے اس سے کہا: مجھے بیت الخَلاء جانے دو، اس نے اجازت دے دی۔ میں نے بیت الخلاء میں جا کر دل مضبوط کر کے وہاں کی نجاست اپنے ہاتھ منہ اور کپڑوں پر مل لی، اب جوں ہی باہر آیا تو میری عاشقہ گھبرا کر بھاگی اور کوٹھی میں "پاگل، پاگل" کا شور اٹھا۔ میں نے وہاں سے بھاگ کر ایک باغ میں پناہ لی، غسل کیا اور کپڑے پاک کر کے وہاں سے چل دیا۔ رات جب میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ کوئی آیا ہے اور میرے چہرے اور لباس پر اپنا ہاتھ پھیر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟ سنو! میں جبرائیل (علیہ السلام) ہوں۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرے سارے بدن اور لباس میں خوشبو آ رہی تھی جو آج تک قائم ہے اور یہ سب حضرت سیدنا جبرائیل (علیہ السلام) کے ہاتھ کی برکت ہے۔ (روض الریاحین، الحکایۃ السابعۃ عشرۃ بعد الاربع مائۃ، ص ۳۳۴۔۳۳۵) (صراط)

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

لغات القرآن: [يَآَيُّهَا : اے] [الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : جو لوگ ایمان لائے (مومن)] [لَا تَاْكُلُوْٓا : نہ کھاؤ] [اَمْوَالَكُمْ : اپنے مال] [بَيْنَكُمْ : آپس میں] [بِالْبَاطِلِ : ناحق] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ تَكُوْنَ : یہ کہ ہو] [تِجَارَةً : کوئی تجارت] [عَنْ تَرَاضٍ : آپس کی خوشی سے] [مِّنْكُمْ : تم سے] [وَلَا تَقْتُلُوْٓا : اور نہ قتل کرو] [اَنْفُسَكُمْ : اپنے نفس (ایکدوسرے)] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [بِكُمْ : تم پر] [رَحِيْمًا : بہت مہربان]

ترجمہ : اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو، اور اپنی جانوں کو مت ہلاک کرو، بیشک اللہ تم پر مہربان ہے

تفسیر و تشریح:

حرمت رشتہ اور حرمت اموال کا باہم معنوی تعلق ہے کیونکہ دونوں کا خیال نہ رکھنے سے رنجشیں پیدا ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حرمت پامال ہوتی ہے۔

سورت کی ابتدا میں اب تک خاندان، یتامیٰ اور لونڈیوں کے معاشرتی و مالی حقوق کا ذکر اور ان کے ساتھ مقدس رشتوں کی حرمت و تکریم کا بیان ہوا ہے۔ اب مالی حقوق کو قدرے وسعت کے ساتھ یوں بیان فرمایا کہ تم اپنے ہی مال آپس میں باطل طریقے کے ساتھ نہ کھایا کرو۔ البتہ باہمی رضا مندی کے ساتھ ایک دوسرے سے لین دین کے ذریعے مال لینا اور کھانا جائز ہے۔ جس طرح تم اپنے مال ناجائز طریقے سے نہیں کھاسکتے اسی طرح تمہیں اپنے آپ کو قتل بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ مہربانی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مہربانی کا یہ تقاضا ہے کہ تم بھی مالی، اخلاقی اور جسمانی ظلم کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور مہربانی کا سلوک کرو۔ جذبہ اخوت کو بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کے مال جیسے الفاظ استعمال کرنے کی بجائے ایسی ضمیریں استعمال فرمائی ہیں۔ جن سے باہمی قربت و شفقت کا احساس بیدار ہو سکے۔ جو شخص اس حکم اور نصیحت کے باوجود کسی پر مالی اور جانی ظلم کرے گا دنیا میں شاید وہ اس کی سزا سے بچ جائے لیکن آخرت کی سزا سے ہر گز نہیں بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے

ایسے ظالموں کو سزا دینا ذرّہ برابر بھی مشکل نہیں۔ دنیا تو نہایت مختصر اور جلد ہی ختم ہو جانے والی ہے اور اس کے بعد اسے جہنم کے دہکتے ہوئے انگاروں میں جھونک دیا جائے گا۔ وہاں نہ ان جرائم کی معافی ہو گی اور نہ ہی سزا کے بغیر تلافی ہو سکے گی۔ آپ نے دھوکا دہی، ملاوٹ، ناپ تول میں کمی وبیشی، حرام چیزوں کی خرید وفروخت اور رشوت سے منع فرمایا۔ اب ہم احادیث کے حوالہ جات سے قدرے تفصیل کے ساتھ جائز اور ناجائز طریقوں کا ذکر کریں گے۔ قتل کے بارے میں سورۃ المائدۃ میں تفصیل بیان ہو گی۔ (فہم)

کسب حلال

کسب حلال پر قرآن نے جتنا زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ایسے موقعوں پر قرآن کا انداز بیان بڑا اثر انگیز ہوا کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ دوسروں کے مال ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ بلکہ فرمایا اپنے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔ اس سے یہ حقیقت واضح کرنا مطلوب ہے کہ امت کے کسی فرد کا مال پرایا مال نہیں بلکہ اپنا ہی مال ہے۔ اس میں ناجائز تصرف کرنا دھوکا فریب سے اس کو ہڑپ کرنا اپنے آپ سے ہی دھوکہ کرنا ہے۔ ہاں اگر تم آپ سے تجارت کرو اور تجارت میں کسی کی سادہ لوحی یا مجبوری سے ناروا فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو بلکہ فریقین نے راضی خوشی سے لین دین کیا ہو۔ اور اس طرح تمہیں نفع حاصل ہو تو یہ نفع حلال ہے۔ عن تراض کے کلمات پر مزید غور فرمائیے۔ اسلام جس صاف ستھری تجارت کی اجازت دیتا ہے اس کے خدو خال آپ پر واضح ہو جائیں گے۔

اس آیت میں خودکشی کی ممانعت بھی آگئی

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جو پہاڑ سے خود گر کر اپنے آپ کو ہلاک کردے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں گرتا رہے گا اور اگر کسی ہتھیار سے ہلاک کرے تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہو گا جس کو وہ دوزخ میں ہمیشہ مارتا رہے گا۔ (مسلم)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ پہلی امت میں ایک شخص کا عضو زخمی ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر چھری نکال کر اپنا ہاتھ کاٹ لیا اس سے خون نہ رکا یہاں تک کہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بندے نے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی جلدی کی میں نے اس پر جنت کو حرام کردیا۔ (حسنات)

اور کسی مسلمان بھائی کو بلاوجہ قتل کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ انفسکم کہہ کر بتادیا کہ اگر تم کسی مسلمان بھائی کو قتل کرو گے تو اس کا نقصان تمہیں ہی پہنچے گا۔ تمہاری ہی ایک مومن بہن بیوہ ہو گی۔ تمہاری ہی ملت کے معصوم بچے یتیم ہوں گے۔ تمہارے مسلم معاشرہ کا ہی ایک گھر غم واندوہ کے اندھیروں میں ڈوب جائے گا۔ علامہ بیضاوی علیہ الرحمۃ نے اس کا ایک اور لطیف معنی بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ لاتقتلوا انفسکم باقتراف مایذلھا ویردیھا فانہ القتل الحقیقی للنفس۔ یعنی ایسی مذموم حرکتیں اور ذلیل اعمال مت کرو جو لوگوں کی نگاہ میں تمہیں ذلیل ورسوا کردیں۔ کیونکہ یہ ذلت ورسوائی ہی تو نفس کی حقیقی ہلاکت وتباہی ہے۔ سبحان اللہ! کیا لطیف بات کہی ہے۔

جسم کے کسی حصے کو بھی تکلیف پہنچتی ہے تو جسم کا ہر ہر حصہ مظطرب و بے قرار ہو جاتا ہے ایک آنکھ کھلی کا درد دوسری آنکھ کو بھی سونے نہیں دیتا۔۔ یا۔۔ اپنے کو ہلاکت وخطرات کے محل میں نہ ڈالو یا ایسے کام کے مرتکب نہ ہو جس سبب سے قتل کیے جاؤ یا گناہوں کے ارتکاب سے ۔۔ یا۔۔ حرام کا۔۔ مال کھانے کے سبب سے یا خواہش نفسانی کی پیروی کرنے سے۔ (اشرفی)

اس آیت میں باطل طریقے سے مراد وہ طریقہ ہے جس سے مال حاصل کرنا شریعت نے حرام قرار دیا ہے جیسے سود، چوری، اور جوئے کے ذریعے مال حاصل کرنا، جھوٹی قسم، جھوٹی وکالت، خیانت اور غصب کے ذریعے مال حاصل کرنا اور گانے بجانے کی اجرت یہ سب باطل طریقے میں داخل اور حرام ہے۔ یونہی اپنا مال باطل طریقے سے کھانا یعنی گناہ و نافرمانی میں خرچ کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۲۹، ۱/۳۷۰)

اسی طرح رشوت کا لین دین کرنا، ڈنڈی مار کر سودا بیچنا، ملاوٹ والا مال فروخت کرنا، قرض دبا لینا، ڈاکہ زنی، بھتہ خوری اور پرچیاں بھیج کر ہراساں کر کے مال وصول کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ (صراط)

اسی طرح ہبہ ٗوراثت اور کسی چیز کو بنا کر اس کا مالک ہو نا جائز ہے ٗ اور جواسٹہ ٗسود ٗغصب ٗچوری ٗڈاکہ ٗخیانت ٗجھوٹی قسم کھا کر اور جھوٹی گواہی کے ذریعہ اور رشوت سے دوسرے کا مال کھانا ناجائز ہے۔ (تبیان)

سود اور اس کی تمام قسمیں حرام ہیں

سورۃ البقرۃ کی آیت 275 میں سود کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے اس کی تفصیل مذکورہ آیت کے ضمن میں دیکھیں اور ہر وہ کاروبار ناجائز ہو گا جس میں سود یا اس کی کوئی شکل پائی جاتی ہو۔

۱۔ حضرت ابوامامہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص جھوٹی قسم اٹھا کر کسی مسلمان کا حق کھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم لازم اور جنت حرام کر دیتے ہیں۔ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا اگرچہ یہ حق تلفی تھوڑی ہو؟ فرمایا اگرچہ وہ پیلو کے درخت کی ایک ٹہنی ہی کیوں نہ ہو۔ [رواہ مسلم: کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع الخ]

۲۔ حضرت ابوذر غفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے ہم کلام نہیں ہو گا اور نہ ہی انھیں نظر کرم سے دیکھے گا اور نہ انھیں گناہوں سے پاک کرے گا بلکہ انھیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! وہ کون ہیں؟ ایسے لوگ تو نامراد اور خسارے میں پڑ گئے۔ آپ نے فرمایا ٹخنوں سے نیچے تہ بند لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال بیچنے والا۔ [رواہ مسلم: کتاب الایمان]

ماپ تول میں کمی کرنا

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم اس جرم کی وجہ سے دنیا سے نیست و نابود کر دی گئی۔ [الأعراف: ۸۵]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کو فرمایا یقیناً تم دو ایسے کاموں کے ذمہ دار بنائے گئے ہو۔ جن میں کوتاہی کی وجہ سے پہلی قومیں تباہ ہو گئیں۔ [رواہ الترمذی: کتاب البیوع، باب فی المکیال والمیزان]

ایک مرتبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بازار تشریف لے گئے ایک تولنے والے کو دیکھا کہ وہ کوئی جنس تول رہا ہے۔ اسے فرمایا تو لیے مگر جھکتا ہوا۔ [رواہ النسائی: کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن]

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام قرار دی ہے۔ [رواہ البخاری: کتاب البیوع، باب بیع المیتۃ والأصنام]

حضرت ابو مسعود انصاری (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ذکر کرتے ہیں کہ آپ نے کتے کی قیمت، فاحشہ کی کمائی اور نجومی کی اجرت سے منع فرمایا۔ [رواہ البخاری: کتاب البیوع، باب ثمن الکلب]

تجارت میں دھوکا دینا حرام ہے

واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے کوئی عیب دار چیز عیب بتلائے بغیر فروخت کی وہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں مبتلا رہے گا اور فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ [رواہ ابن ماجۃ: کتاب التجارات]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے سودا کرنے والے جب تک آپس میں جدا نہ ہوں انھیں سودا منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر انھوں نے سچ بولا اور صاف گوئی سے کام لیا تو ان کی تجارت میں برکت ہوگی اگر اس کا عیب چھپایا اور جھوٹ بولا تو سودے سے برکت اٹھالی جائے گی۔ [رواہ البخاری: کتاب البیوع، باب إذا بین البیعان۔۔۔]

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دن منڈی تشریف لے گئے اور ایک غلے کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو انگلیوں پر نمی محسوس فرمائی۔ غلہ کے مالک سے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کی کہ اللہ کے رسول رات بارش ہوئی تو میں نے گیلا اناج نیچے کر دیا آپ نے فرمایا تجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جس نے دھوکا دیا وہ ہم سے نہیں ہے۔

[رواہ مسلم: کتاب الایمان، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من غشنا فلیس منا]

کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا غلط ہے

حضرت علی (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجبور آدمی کی تجارت سے فائدہ اٹھانے، دھوکے کی تجارت اور پھلوں کے پکنے سے پہلے سودا کرنے سے منع فرمایا۔ [رواہ ابوداؤد: کتاب البیوع، باب فی بیع المضطر]

ابو حرہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خبردار کسی پر ظلم نہ کرو۔ کسی کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہوتا ہے۔ [مسند احمد: کتاب: اول مسند البصریین، باب حدیث عم ابی حرہ]

چوری کا مال خریدنا

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے جس شخص نے اپنا مال کسی کے پاس پایا وہ اس سے واپس لینے کا زیادہ حقدار ہے جس نے مسروقہ مال خریدا ہے وہ اس کے چور کو تلاش کرے۔ [رواہ النسائی: کتاب البیوع، باب الرجل یبیع السلعۃ فیستحقھا مستحق]

یہاں یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ:

تجارت اور محنت سب سے افضل ہے:

دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے،

حضرت رافع بن خدیج (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال وطیب ہے ؟آپ نے ارشاد فرمایا:

یعنی انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی بیع وشراء (جس میں جھوٹ فریب نہ ہو۔)

حضرت ابوسعید خدری (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

سچاتاجر جو امانت دا ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا؟

اور حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔

سچاتاجر قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہوگا۔ (گلدستہ)

دوسری طرف یہ جاننا بھی از بس ضروری ہے:

ذخیرہ اندوزی

مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کرے اور پھر اس کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ کر کے فروخت کرنے لگے، چونکہ بازار میں دوسری جگہ ملتی نہیں، گاہک مجبور ہے کہ مہنگی سستی جیسی بھی یہ فروخت کرے وہ اس کو خریدے،

اس صورت میں اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے، لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری کے تحت ہے، اس لیے کالعدم ہے۔

اسی طرح کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ معاشرت کی ایسی صورتیں پیدا کردے کہ وہ اپنا مہر معاف کرنے پر مجبور ہو جائے تو گو معافی کے وقت وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے لیکن درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی۔

یا کوئی آدمی جب یہ دیکھے کہ میرا جائز کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہوگا وہ رضامندی کے ساتھ رشوت دینے کے لیے آمادہ ہو تو چونکہ یہ رضامندی بھی درحقیقت رضامندی نہیں اس لیے شرعاً کالعدم ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم سے بیع شراء اور تجارت کی صرف انہی صورتوں کا جواز ثابت ہوا جس کا جواز رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو منضبط کردیا ہے اور جتنی صورتیں بیع وشراء اور تجارت کی شرعاً ممنوع وناجائز ہیں وہ سب اس سے خارج ہیں، قرآن کریم کے اس ایک لفظ نے فقہ کی پوری کتاب البیوع اور کاتب الاجارہ کا مکمل بیان کردیا۔

امام احمد اور حاکم رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن شبل نے بیان کیا میں نے خود سنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): فرمارہے تھے تاجر ہی فاجر ہیں۔ صحابہ (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کیا اللہ نے بیع کو حلال نہیں کیا ہے۔ فرمایا حلال کیوں نہیں کیا ہے مگر تاجر (بیچتے وقت) قسمیں کھاتے ہیں اور گناہ گار ہو جاتے ہیں باتیں کرتے ہیں تو جھوٹی کرتے ہیں۔ حاکم نے حضرت رفاعہ بن رافع کی روایت سے بیان کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تاجروں کو قیامت کے دن بدکاروں (کے گروہ) میں اٹھایا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈرتے ہوں اور نیکی کرتے ہوں اور (بیع کے وقت) سچ بولتے ہوں۔

حضرت رافع بن خدیج رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے فرمایا اپنے ہاتھ کی کمائی اور پاک بیع۔ رواہ احمد۔ حضرت مقدام بن معدی کرب (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اپنی ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کسی نے کوئی کھانا نہیں کھایا ' اللہ کے نبی داؤد بھی اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔ رواہ البخاری۔ حضرت عائشہ (رض) راوی ہیں کہ (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم جو کچھ کھاتے ہو اس میں پاکیزہ ترین وہ ہے جو تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو اور تمہاری اولاد کی (کمائی) بھی تمہاری کمائی ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

اختیار فسخ

حضرت ابن عمر (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیع و شراء کرنے والوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف اختیار (فسخ) ہے جب تک دونوں میں تفرق (جدائی) نہ ہو جائے۔ متفق علیہ۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مجلس سے جدا ہونے سے پہلے ہی بیع کی تکمیل اور مبیع و ثمن میں تصرف کرنے کے جواز پر آیت ضرور دلالت کر رہی ہے مگر حق فسخ کی نفی پر دلالت نہیں کر رہی ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ جس طرح امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تکمیل بیع کے بعد بھی خیار رویت اور خیار غیب ثابت رہتا ہے اسی طرح تکمیل بیع کے بعد مجلس سے جدا ہونے سے پہلے خیار مجلس ہونے کا اقرار کیا جائے تاکہ صحیح حدیث پر عمل ترک نہ ہونے پائے۔
حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بغیر باہمی رضامندی کے دونوں (عقد کر کے) جدا نہ ہوں۔ رواہ ابوداؤد۔ حضرت جابر (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک اعرابی کو (مجلس کے اندر) بیع کے بعد (بھی فسخ کرنے کا) اختیار دیا تھا۔ رواہ الترمذی وقال صحیح غریب۔ یہ احادیث صراحتاً بتارہی ہیں کہ تکمیل بیع کے بعد بھی اس جگہ سے جدا ہونے کے پہلے فسخ بیع جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

رحمت الٰہی

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے کہ بلاوجہ کسی کے مال یا جان میں تصرف کرنے کو منع فرمادیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جن میں سراسر تمہارے لیے بہبودی اور خیریت ہے۔
خودکشی :
یعنی تم میں سے کوئی اپنے کو خود قتل نہ کرے۔ حضرت ثابت بن ضحاک (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جو شخص دنیا میں کسی چیز سے خودکشی کرے گا قیامت کے دن اسی چیز کے ذریعہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ رواہ البغوی من طریق الشافعی۔
حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جائے گا ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر دوزخ میں لڑھکتا ہی چلا جائے گا اور جو شخص کسی لوہے سے خودکشی کرے گا وہ وہی لوہا ہاتھ میں لیے دوزخ کے اندر ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر اپنے کو مارتا رہے گا۔ الفاظ کی کچھ تقدیم و تاخیر کے ساتھ بخاری اور مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ اور ترمذی نے یہ

حدیث نقل کی ہے۔ اور نسائی نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں آیا ہے جس نے زہر ڈکارا 'وہ جہنم کی آگ میں زہر ہاتھ میں لیے زہر ڈکارتا رہے گا۔ حضرت جندب (رض) بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا گزشتہ اقوام میں سے ایک آدمی کے اعضاء پر زخم ہو گیا اس سے برداشت نہ ہو سکا اور چھری نکال کر اس نے خود اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا آخر مرتے دم تک خون نہ رکا 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے جان دینے میں جلدی کی میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔ رواہ البغوی۔

رشوت کی تعریف 'وعید اور شرعی احکام

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

کوئی شخص حاکم یا کسی اور افسر مجاز کو کوئی چیز دے تاکہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دے یا حاکم کو اپنی منشاء پوری کرنے پر ابھارے۔ (تاج العروس ج ۱۰ص '۱۵۰ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ 'مصر '۱۳۰٦ھ)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ 'ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ مسروق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے پوچھا گیا کہ سحت کا کیا معنی ہے؟ انھوں نے کہا رشوت ' پھر سوال کیا گیا کہ فیصلہ پر رشوت لینے کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا یہ کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے (نازل کردہ) احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (المائدہ: ۴۴) (سنن کبری ج ۱۰ص ۱۳۹ مطبوعہ نشرالسنۃ ملتان)

(تبیان)

۔الغرض۔۔ جو کام غضب الٰہی کا سبب ہوں ان کو انجام دے کر اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔۔ المختصر۔۔ ہر حال میں شرع محمدی کی شمشیر سے قتل ہونے سے اپنے کو بچاتے رہو اور یقین کر لو کہ (بے شک اللہ تعالیٰ) تمہاری توبہ قبول فرمانے والا ہے اور (تم کو بخشنے والا ہے) وہ جو امر و نہی فرماتا ہے یہ بھی اس کی نہایت مہربانی ہے تاکہ بندہ اس پر عمل کر کے اپنے کو کسی نہ کسی حد تک اس کی بخشش کا مستحق بنالے۔ (اشرفی)

کسی پر ظلم کرنے کے لیے یا کوئی ناجائز کام کرانے کے لیے کچھ دینا رشوت ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے یا خود کو ظلم سے بچانے کے لیے کچھ دینا یہ رشوت نہیں ہے۔

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیبر کا مال غنیمت تقسیم کیا اور بڑے بڑے عطایا دیئے اور عباس بن مرداس کو بھی کچھ مال دیا تو وہ اس پر ناراض ہو گیا اور شعر پڑھنے لگا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (کچھ اور مال دے کر) ہمارے متعلق اس کی زبان بند کر دو 'پھر اس کو کچھ اور مال دیا حتیٰ کہ وہ راضی ہو گیا۔ (احکام القرآن ج ۲ص '۴۳۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی 'لاہور '۱۴۰۰ھ)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ 'ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب وہ حبشہ کی سرزمین پر پہنچے تو ان سے ان کا کچھ سامان چھین لیا گیا تو انھوں نے اس سامان کو اپنے پاس رکھا اور دو دینار دے کر وہ سامان چھڑا لیا۔

وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ جس کام میں رشوت دینے والا گناہ گار ہوتا ہے یہ وہ نہیں ہے جو اپنی جان اور مال سے ظلم اور ضرر دور کرنے کے لیے دی جائے، رشوت وہ چیز ہے کہ تم اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے کچھ دو جو تمہارا حق نہیں ہے اس میں دینے والا گناہ گار ہوتا ہے۔

(سنن کبری ج ۱۰ ص ۱۳۹ مطبوعہ نشر السنتہ ملتان)

قاضی خاں اوز جندی حنفی متوفی ۵۹۴ھ نے رشوت کی چار قسمیں لکھی ہیں:

(۱) منصب قضاء کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا اس میں رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں۔

(۲) کوئی شخص اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے رشوت دے یہ رشوت جانبین سے حرام ہے خواہ وہ فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہو یا نہ ہو ' کیونکہ فیصلہ کرنا قاضی کی ذمہ داری اور اس پر فرض ہے۔

(۳) اپنی جان اور اپنے مال کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا یہ لینے والے پر حرام ہے دینے والے پر حرام نہیں ہے 'اس طرح اپنے مال کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے

(۴) کسی شخص کو اس لیے رشوت دی کہ وہ اس کو سلطان یا حاکم تک پہنچادے تو اس کا دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیہ ج ۲ ص ۳۶۳ ' ۳۶۲ 'مطبوعہ مصر 'فتح القدیر 'ج ۶ ص ۳۸۵ 'طبع سکھر 'بنایہ شرح ہدایہ الجزء الثالث ص ۲۶۹ 'طبع فیصل آباد 'البحر الرائق ج ۶ ص ۲۶۲۔۲۶۱ 'طبع مصر)

اپنے آپ کو قتل کرنے کی ممانعت کے تین محمل:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بیشک اللہ تم پر بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (النساء: ۲۹)

اس آیت کے تین معنی ہیں ایک معنی یہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو قتل نہ کریں کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمام مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں (صحیح مسلم 'رقم الحدیث: ۲۵۸۶) اس لیے اگر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو قتل کیا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے اپنے آپ کو قتل کیا۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کرو جس کے نتیجہ میں تم ہلاک ہو جاؤ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن العاص (رض) ایک سرد رات میں جنبی ہوگئے تو انھوں نے تیمّم کیا اور یہ آیت پڑھی "ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما"۔ تم اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو بیشک اللہ تم پر بے حد رحم فرمانے والا ہے "پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے (ان کو) ملامت نہیں کی۔ (صحیح البخاری: کتاب التیمم باب ۷ سنن ابو داؤد 'رقم الحدیث: ۳۳۴)

اس آیت کا تیسرا معنی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے خودکشی کرنے سے منع فرمایا ہے اور اسی آیت کی بناء پر خودکشی کرنا حرام ہے۔

خودکشی کرنے والے کے عذاب کا بیان:-

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص ہتھیار سے خودکشی کرے گا تو دوزخ میں وہ ہتھیار اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ شخص جہنم میں اس ہتھیار سے ہمیشہ خود کو زخمی کرتا رہے گا 'اور جو شخص زہر سے خودکشی کرے گا وہ

جہنم میں ہمیشہ زہر کھاتا رہے گا اور جو شخص پہاڑ سے گر کر خود کشی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ گرتا رہے گا۔ (صحیح مسلم : رقم الحدیث : ۱۰۹)

اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ خود کشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ کفر نہیں ہے اور اس کے ارتکاب سے انسان دائمی عذاب کا مستحق نہیں ہوتا پھر خود کشی کرنے والا دائمی عذاب میں کیوں مبتلا ہوگا ؟ اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔

اول : یہ کہ یہ حدیث اس شخص کے متعلق ہے جس کو خود کشی کے حرام ہونے کا علم تھا اس کے باوجود اس نے حلال اور جائز سمجھ کر خود کشی کی ' دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں خلود کا استحقاق بیان کیا گیا ہے اور یہ جائز ہے کہ مستحق خلود ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے یا پھر خلود مکث طویل کے معنی میں ہے۔

خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے کا شرعی حکم

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں :

جس نے خود کو قتل کر لیا خواہ عمدا اس کو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اسی پر فتوی ہے اگرچہ دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کی بہ نسبت یہ زیادہ بڑا گناہ ہے ' امام ابن ہمام نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے خود کشی کی تھی آپ نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (الدر المختار ج ا ص ۵۸۴ ' علی ہامش رد المختار)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں :

اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم نے خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور بظاہر یہ ہے کہ آپ نے اس پر نماز جنازہ زجرا نہیں پڑھی جس طرح آپ نے مقروض کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی ' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ میں سے بھی کسی نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی کیونکہ دوسروں کی نماز آپ کی نماز کے برابر نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آپ کی صلوۃ ان کے لیے سکون ہے۔ شرح المنیہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے اور اہل سنت و جماعت کے قواعد پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کی توبہ مقبول نہیں ہے ' کیونکہ مطلقا گناہ گار کی توبہ مقبول ہوتی ہے بلکہ کافر کی توبہ بھی کفر سے قطعاً مقبول ہوتی ہے حالانکہ اس کا گناہ زیادہ ہے ' ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ نزع روح کے وقت توبہ مقبول نہیں ہوتی اور جس نے ایسے فعل سے خود کشی جس سے فورا مر جائے (مثلا کنپٹی پر پستول رکھ کر فائر کر دینا) تو اس کو توبہ کا وقت ہی نہیں ملا، یا نزع روح کے وقت چند لمحے ملے اور اس وقت کی توبہ مقبول نہیں ہے اور جس نے اپنے آپ کو کسی آلہ سے زخمی کر لیا اور اس کے بعد وہ کچھ دن زندہ رہا اور اس نے توبہ کر لی تو اس کی توبہ کی قبولیت کا یقین رکھنا چاہیے یہ ساری بحث اس کے متعلق ہے جس نے عمدا خود کو قتل کیا اور جس نے خود کو خطاء قتل کیا اس کو شمار شہداء میں ہوگا۔ (رد المختار ج ا ص ۵۸۵ ' ۵۸۴)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی بڑے عالم اور مفتی کو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھانا چاہیے اور عام مسلمان کو چاہیے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھا دے۔ (تبیان)

مسائل

1: اس سے معلوم ہوا کہ حرام کام کی اجرت حرام ہے کہ وہ باطل ذریعہ سے حاصل ہوئی۔ لہٰذا گانا، جھوٹی وکالت، ڈاڑھی مونڈنے، تصویر سازی کی اجرتیں حرام ہیں کہ یہ حرام ذریعوں سے حاصل ہوئیں۔ اس سے ہزارہا مسائل معلوم ہوئے۔ جوا، شراب کی قیمت، خیانت، سود، سب حرام ہیں

2: اس سے معلوم ہوا کہ جبری بیع درست نہیں۔ لہٰذا حکومت کے ضبط کیے ہوئے مالوں کا نیلام خریدنا حرام ہے کہ یہ بیع رضا سے نہیں، کیونکہ وہاں مالک راضی نہیں ہوتا اور حاکم مالک نہیں۔ دیوالیے کے مال کا نیلام کچھ شرائط کے ماتحت جائز ہے۔ یوں ہی کسی کی دکان، زمین پر جبراً قبضہ کر لینا اور تھوڑا کرایہ مالک کی مرضی کے خلاف دینا بھی حرام ہے کیونکہ معاملات میں رضائے فریقین شرط ہے۔

3: اگر حلال سمجھ کر خودکشی کرے تو کفر ہوا اور دائمی عذاب میں گرفتار ہوگا۔ اور اگر حرام جانتے ہوئے کی تو جہنم کا داخلہ عارضی ہوگا۔ لہٰذا خودکشی، بھوک ہڑتال سے مرنا حرام ہے۔

آیت مبارکہ:

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِيۡهِ نَارًا ‌ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۳۰﴾

لغات القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّفْعَلْ : کرے گا] [ذٰلِكَ : یہ] [عُدْوَانًا : سرکشی (زرد)] [وَّظُلْمًا : اور ظلم سے] [فَسَوْفَ : پس عنقریب] [نُصْلِيْهِ : اس کو ڈالیں گے] [نَارًا : آگ] [وَكَانَ : اور ہے] [ذٰلِكَ : یہ] [عَلَي : پر] [اللّٰهِ : اللہ] [يَسِيْرًا : آسان]

ترجمہ: اور جو کوئی تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے (دوزخ کی) آگ میں ڈال دیں گے، اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے

تفسیر و تشریح: اسلامی نظام حیات نفس انسانی کو اس کے ایک وسیع دائرے تک لے جاتا ہے یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دونوں جہانوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے لیے ضابطہ بندی کی جاتی ہے اور اسے ہدایات دی جاتی ہیں۔ نفس انسانی کے اندر ایک بیدار اور محتاط چوکیدار بٹھایا جاتا ہے جو ہر ہدایت کو بسر و چشم قبول کرتا ہے اور ہر اسلامی قانون کو بطیّب خاطر نافذ کرتا ہے۔ پھر اسلامی سوسائٹی میں بھی ہر شخص کو دوسرے کے لیے نگران بنایا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اجتماعی طور پر بھی مسؤل ہیں۔ اگر ظلم ہوگا تو سوسائٹی کے تمام افراد گویا قتل ہوں گے اور ان پر تباہی آئے گی، یعنی اس دنیا میں اور آخرت میں تمام ان لوگوں سے محاسبہ ہوگا جنھوں نے اپنی سوسائٹی کو ظالمانہ روش پر رہنے دیا اور اس کے باطل طور طریقوں کے بدلنے کے لیے جدوجہد نہ کی۔ (آیت) "وکان ذلک علی اللہ یسیرا"۔ (۴ : ۳۰)"

" اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے"۔ اسے دنیاوی تباہی لانے اور آخری محاسبہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ نہ اس کی راہ میں کوئی حائل ہو سکتا ہے اور جب تباہی کے اسباب مہیا ہو جائیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ پھر وہ آکر رہتی ہے۔

لیکن اگر تم لوگ ممنوعات میں سے بڑی بڑی ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرو ' جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اموال کو ظالمانہ طریقے سے کھانا اور ان کا استحصال کرنا چھوڑ دو ' تو اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال رہے گی۔ تمہارے ساتھ نرم سلوک کیا جائے گا تمہارے دلوں کے اطمینان کے لیے اور آگ سے تمہیں بچانے کے لیے تمہارے وہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے جو کبائر نہیں ہیں بشرطیکہ تم ارتکاب ظلم اور ارتکاب فواحش سے اجتناب کرو۔ (ظلال)

اے ایمان والو ! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق اور غیر شرعی طور مت کھاؤ اور ان کو مت استعمال کرو مگر ہاں وہ مال جو آپس کی تجارت اور خرید وفروخت سے باہمی رضامندی کے ساتھ ہو تو اس کے کھانے اور استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں اور دیکھو تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے اور جو شخص ازراہ زیادتی اور ظلم ان افعال ممنوعہ کا ارتکاب کرے گا تو ہم عنقریب اس کو جہنم کی آگ میں داخل کریں گے اور یہ سزا دینا اور کسی مجرم کو جہنم کی آگ میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان اور بہت سہل ہے۔ (تیسیر)

مطلب یہ ہے کہ یتامیٰ اور بیوگان کے مال پر کیا موقوف ہے کہ کوئی مال بھی جو غیر مباح طور پر حاصل ہو وہ نہ کھاؤ اس کا کھانا حرام ہے۔ باطل کے معنی ہم نے غیر شرعی کئے ہیں تاکہ غیر مباح اور مکروہ اور حرام وغیرہ سب کو شامل ہو جائے۔ البتہ ان اموال کے کھانے کی اجازت ہے جو مثلاً کسی تجارت کے ذریعہ حاصل ہوں اور وہ تجارت بھی باہمی رضامندی کے ساتھ ہو اس میں مبادلۃ المال بالمال کے دوسرے عقود بھی داخل ہو گئے بشرطیکہ یہ تجارت اور دوسرے معاملات قواعد شرعیہ کی پابندی کے ساتھ کئے جائیں جس معاملہ میں شرعی احکام کی پابندی کو نظر انداز کر دیا جائے گا وہی باطل میں داخل ہو جائے گا اور اس کا کھانا اور برتنا حرام ہو گا۔ یہاں بھی مال کے ساتھ کھانا فرمایا کیونکہ مال کے اہم منافع اور مقاصد میں کھانے پینے کو بڑا دخل ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں۔ اور اسی لیے ہم نے کھانے کے ساتھ استعمال کرنے کا لفظ بڑھا دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حرام کا مال صرف کھانا ہی حرام نہیں بلکہ کسی اور مصرف میں استعمال کرنا بھی حرام ہے۔

لا تقتلوا انفسکم سے مراد خود کشی تو ظاہر ہی ہے اور یہ اسلام کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے دنیا کی تمام قوموں کو خود کشی کی برائی سے آگاہ کیا ورنہ دنیا کی تہذیبیں اس کو جرم ہی نہیں سمجھتی تھیں اور جان کو اپنا سمجھ کر اس کو تلف کر دینا اپنا قانونی حق خیال کرتی تھیں۔ یہ بات اسلام نے ظاہر کی کہ اپنی جان کو تلف کر دینا بھی جرم ہے۔

جیسا کہ احادیث میں تفصیل موجود ہے کہ جو شخص اپنی جان کو چھری سے قتل کرے گا یا پہاڑ سے گرا کر اپنے کو ہلاک کرے گا یا کسی اور دھار دار چیز سے خود کشی کرے گا تو وہ قیامت تک عالم برزخ میں اسی قتل قتل کیا جاتا رہے گا۔ اور اگر ولا تقتلوا انفسکم کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو کیونکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو قتل کرنا بھی اپنے ہی کو قتل کرنا ہے تو اس کی حرمت اور گناہ تو ظاہر ہی ہے۔ جیسا کہ اسی پارے میں اس کی تفصیل آجائے گی۔ اور یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی اور بندہ نوازی ہے کہ اس نے انسان کی جان کو تلف کرنے سے روکنے کی شکل نکالی اور ایسا قانون بنا دیا جس سے قتل کو جرم قرار دیا گیا۔

آگے مزید تنبیہ فرمائی کہ جو مذکورہ بالا گناہ کا ارتکاب کرے گا اور ارتکاب بھی ظلم وعدوان کے طور پر کرے گا۔ تو اس کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اگرچہ دخول جہنم قیامت کے دن ہو گا لیکن قیامت چونکہ کچھ دور نہیں ہے اس لیے عنقریب فرمایا۔

عدوان کے معنی حد سے تجاوز کرنا ہے ہم نے اس کا ترجمہ زیادتی کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کا مال زیادتی اور ظلم سے کھالیا یا کسی کو ظلم اور زیادتی سے قتل کر دیا یا کسی وارث کی میراث کو ظلم اور زیادتی سے دبالیا یا کسی کی منکوحہ کو ظلم وزیادتی سے لے بھاگا تو ایسے لوگوں کی سزا جہنم ہے۔

بعض مفسرین نے اس وعید کا تعلق صرف قتل سے بیان کیا ہے ہو سکتا ہے کہ قتل نفس کی اہمیت کے لحاظ سے صرف قتل ہی پر وعید فرمائی ہو اگرچہ عموم بہتر ہے۔ بہر حال اس صورت میں عدوان کا مطلب یہ ہوگا کہ قتل خطا اور غلطی سے نہ ہو یعنی مارتا تھا کسی اور کو اور تیر کسی اور کو لگ گیا یا کسی حاکم نے کوئی غلط فیصلہ کر دیا اور ایک بے گناہ کو پھانسی ہو گئی بلکہ قصداً زیادتی اور ظلم سے کسی کو ناحق قتل کیا ہو تو اس وعید کا مستحق ہوگا اور دوزخ میں ڈال دینا اور آگ میں داخل کر دینا اللہ تعالیٰ کو کچھ شکل نہیں خواہ کوئی کافر ہو یا عاصی مسلمان ہو بلکہ یہ جہنم کی سزا دینا اس پر بالکل آسان اور سہل ہے جہنم کو اس نے اس کام کے لیے پیدا کر رکھا ہے۔

حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جس گناہ کے عذاب کو اللہ تعالیٰ نے آگ یا غصہ یا لعنت یا عذاب کے ساتھ تمام کیا وہ کبیرہ گناہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا سات چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں ان سے بچو۔ صحابہ علیہم رضوان نے عرض کی وہ کیا ہیں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ جادو کرنا۔ قتل کرنا۔ سود کھانا۔ یتیم کا مال کھانا۔ جہاد میں پیٹھ موڑ کر آنا۔ ایماندار پاک دامن عورت پر تہمت لگانا۔ (بخاری)

نکفر عنکم سیاتکم۔ نکفر۔ تکفیر۔ سے بنا اس کے معنی چھپانا۔ مٹانا۔

سیات۔ سیءۃ۔ کی جمع ہے۔ ناپسند چیز۔ یہاں گناہ صغیرہ مراد ہے۔

ند خلکم مدخلاً کریماً۔ کریم سے مراد اعلیٰ۔ عزت والی۔ ہم تمہارے گناہ صغیرہ مٹا دیں گے۔ (حسنات)

عدوان کیا ہے؟ زور وزبردستی سے دوسرے کے مال وجان پر دست درازی کرنے والا کیا کرتا ہے؟ عدوان کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کو ہماری زبان میں دھونس کہتے ہیں اور ہر دھونس کرنے والا دھاندلی بھی ضرور کرتا ہے۔ بس یہ دھونس عدوان ہے اور دھاندلی ظلم۔ فرمایا جب یہ دھاندلی مچانے والا دھونس پر اتر آیا ہے کہ اب اس کی دھاندلی کا کائی نام بھی نہیں لے سکتا گویا اتنی ترقی کر گیا ہے تو آؤ اس کا نام ہم رکھ دیتے ہیں کہ وہ عاد ہو کر ظلم کی حدود سے بھی تجاویز کر گیاہ۔ فرمایا اچھا! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم اس کو آتش دوزخ میں ڈال دیں گے اور ہمارے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل امر نہیں کیونکہ ہم کچھ کر ہی نہیں رہے ہم نے تو صرف اس کے اپنے کئے ہوئے کاموں کے نتائج اس کے سامنے رکھے ہیں اور ان نتائج میں ہم نے کوئی زرہ برابر بھی زبردستی نہیں کی پھر کیا اس کے اعمال اس کے سامنے پیش کرنا ہمارے لیے کوئی مشکل بات ہے؟ (عروہ)

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کی صفات عدل ورحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا ان پر بڑا مہربان ہے، اس لیے سب بخش دے گا۔ قرآن نے یہود کا قول 'سَیُغۡفَرُ لَنَا' جو نقل کیا ہے، وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا ہے، لیکن ان کی حیلہ جو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی۔ حالانکہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا۔ اس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو ان کے ہاتھوں زندگی بھر

ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم وعدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کو جہنم میں جھونک دینا خدائے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا، اس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے، اسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔ (تدبر)

ڈاکٹر اسرار صاحب نے بڑی عمدہ بات کی ہے:

انسانی تمدن کے دو بہت اہم مسائل بیان ہو رہے ہیں ' جو بڑے گہرے اور فلسفیانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا مسئلہ گناہوں کے بارے میں ہے ' جن میں کبائر اور صغائر کی تقسیم ہے۔ بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک اور پھر کفر ہے۔ پھر یہ کہ جو فرائض ہیں ان کا ترک کرنا اور جو حرام چیزیں ہیں ان کا ارتکاب کبائر میں شامل ہوگا۔ ایک ہیں چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں جو انسان سے اکثر ہو جاتی ہیں ' مثلاً آداب میں یا احکام کی جزئیات میں کوئی کوتاہی ہو گئی ' یا بغیر کسی ارادے کے کہیں کسی کو ایسی بات کہہ بیٹھے کہ جو غیبت کے حکم میں آ گئی ' وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں صحت مندانہ رویہ یہ ہے کہ کبائر سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے کہ اس سے انسان بالکل پاک ہو جائے۔ فرائض کی پوری ادائیگی ہو ' محرمات سے مطلق اجتناب ہو ' اور یہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں ان کے بارے میں نہ تو ایک دوسرے پر زیادہ گرفت اور نکیر کی جائے اور نہ ہی خود زیادہ دل گرفتہ ہوا جائے ' بلکہ ان کے بارے میں توقع رکھی جائے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ ان کے بارے میں استغفار بھی کیا جائے اور یہی صغائر ہیں جو نیکیوں کے ذریعے سے خود بخود بھی ختم ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ اعضائے وضو دھوتے ہوئے ان اعضاء کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جو شخص وضو کرتا ہے تو جب وہ کلی کرتا ہے اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اس کے منہ اور ناک سے اس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے اس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں ' یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ دھل جاتے ہیں۔ جب وہ سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر اور کانوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں ' یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ پھر اس کا مسجد کی طرف چلنا اور نماز پڑھنا اس کی نیکیوں میں اضافہ بنتا ہے۔ (۱)

یہ صغیرہ گناہ ہیں جو نیکیوں کے اثر سے معاف ہوتے رہتے ہیں ' از روئے الفاظ قرآنی: (اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط) (ھود: ۱۱۴) یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں "۔ ان برائیوں سے مراد کبائر نہیں ' صغائر ہیں۔ کبائر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے (اِلّاماشاء اللہ!) ان کے لیے توبہ کرنی ہوگی۔ اور جو اکبر الکبائر یعنی شرک ہے اس کے بارے میں تو اس سورت میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ ط) (آیت ۴۸ و ۱۱۶) بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے ' اور اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا "۔ لیکن ہمارے ہاں مذہب کا جو مسخ شدہ (perverted) تصور موجود ہے اس سے ایک ایسا مذہبی مزاج وجود میں آتا ہے کہ جو کبائر ہیں وہ تو ہو رہے ہیں ' سود خوری ہو رہی ہے ' حرام خوری ہو رہی ہے ' مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نکیر ہو رہی ہے۔ ساری گرفت ان باتوں پر ہو رہی ہے کہ تمہاری داڑھی کیوں شرعی نہیں ہے ' اور تمہارا پائنچہ ٹخنوں سے نیچے کیوں ہے؟ قرآن مجید میں اس معاملے کو تین جگہ نقل کیا گیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں درگزر سے بھی کام لو اور یہ کہ بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہو۔ اس معاملے میں باہمی نسبت وتناسب پیش نظر رہنی چاہیے۔ (بیان)

خلاصہ یہ کہ قانون کی خلاف ورزی بہر حال خلاف ورزی ہے۔ کوئی مسلمان ہو یا کافر۔ اگر کوئی مسلمان فاسق ہو اور توبہ کر کے نہ مرا ہو تو بہر حال وہ سزا کا مستحق ہے اور جب تک اہل حق معاف نہ کرے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ (کشف)

آیت مبارکہ:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَنُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا ﴿۳۱﴾

لغات القرآن: [اِنْ : اگر] [تَجْتَنِبُوْا : تم بچتے رہو] [کَبَآئِرَ : بڑے گناہ] [مَا تُنْهَوْنَ : جو منع کیے گئے] [عَنْهُ : اس سے] [نُكَفِّرْ : ہم دور کردیں گے] [عَنْكُمْ : تم سے] [سَيِّاٰتِكُمْ : تمہارے چھوٹے گناہ] [وَنُدْخِلْكُمْ : اور ہم تمہیں داخل کردیں گے] [مُّدْخَلًا : مقام] [كَرِيْمًا : عزت]

ترجمہ : اگر تم کبیرہ گناہوں سے جن سے تمہیں روکا گیا ہے بچتے رہو تو ہم تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں مٹادیں گے اور تمہیں عزت والی جگہ میں داخل فرمادیں گے

تفسیر و تشریح:

رشتوں کی حرمت کو پامال کرنا اور حرام کھانا کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ جو کبیرہ گناہوں سے بچے گا اس کے لیے چھوٹے گناہوں سے بچاؤ آسان ہو جاتا ہے۔ اگر چھوٹے گناہ بتقاضائے بشریت سرزد ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یقیناً معاف فرمادیں گے۔

یہاں تین چیزیں غور طلب ہیں:۔

ا۔ اجتناب کا کیا معنی ہے؟

ا۔ کسی ایسے کام کو جس کے دواعی اور اسباب موجود ہوں اسے اپنے ارادہ اور مرضی سے نہ کرنے کو اجتناب کہا جاتا ہے۔

ب۔ گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں؟

ب۔ گناہ کبیرہ کے متعلق علما سے کئی اقوال منقول ہیں لیکن علامہ بیضاوی کا پسندیدہ قول یہ ہے کہ ہر وہ فعل جس کے لیے شارع نے کوئی حد مقرر کی ہو یا اس پر عذاب کی دھمکی دی ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔ والاقرب ان الکبیرۃ کل ذنب رتب الشارع علیہ حدا او صرح بالوعید فیہ۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مندرجہ ذیل گناہوں کو کبیرہ شمار کیا ہے:۔

(1) اللہ تعالیٰ ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ (2) قتل بے گناہ۔ (3) پاکباز عورت پر بہتان۔ (4) یتیم کا مال کھانا۔ (5) زنا۔ (6) میدان جہاد سے فرار۔ (7) اور والدین کی نافرمانی۔ اس شمار سے مقصود حصر نہیں ہے۔ احادیث میں ان کے علاوہ کئی اور امور کو بھی کبیرہ کہا گیا ہے۔
ان کے علاوہ

کبیرہ گناہ

کبیرہ گناہوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں :
شرک، قتل ناحق، خود کشی، بدکاری، لواطت، پاکباز عورت پر بہتان، والدین کی نافرمانی، یتیم کا مال کھانا، فرائض (نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ) کا ترک کرنا، قرآن مجید یاد کر کے بھلا دینا، جادو کا عمل کرنا، شراب پینا، جھوٹی گواہی دینا، حیوان کو جلانا، صحابہ کرام کو گالیاں دینا، علمائے کرام کی توہین کرنا، بلاعذر خنزیر یا مردار کا گوشت کھانا وغیرہ۔

صغیرہ گناہ

صغیرہ گناہوں کی بھی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں :
اجنبی عورت کو دیکھنا، فاسقوں سے دوستی رکھنا، قبلہ رخ رفع حاجت کرنا، واجبات کا ترک کرنا وغیرہ
نوٹ : جو انسان کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے اور فرائض و واجبات ادا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، نیز چھوٹے گناہوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ان پر اصرار اور دوام ان کو بڑے گناہ بنا دیتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے گناہ کی مثال کچھ اس طرح سمجھی جاسکتی ہے جیسے آگ کا بڑا انگارہ اور چھوٹی چنگاری کہ انسان ان دونوں میں سے کسی ایک کی تلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی (آگ کا انگارہ یا چنگاری) پورے گھر کو جلانے کا سبب بن سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ انگارہ جلدی جلا سکتا ہے اور چنگاری سے اگر کچھ دیر لاپرواہی برتی جائے تو وہ بھی پورے گھر کو جلا سکتی ہے۔ (امداد)
ج۔ تکبیر سیئات کا کیا مطلب ہے ؟
ج۔ اب رہا تکفیر سیئات کا مسئلہ۔ اس کے متعلق عام مفسرین نے تو یہی فرمایا ہے کہ نکفر کا معنی نمحو (مٹا دینا) اور نغفر (بخش دینا) ہے۔ لیکن حجۃ الاسلام امام غزالی (رح) فرماتے ہیں کہ جب انسان گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے اس کی پاکیزہ اور معصوم فطرت متاثر ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ گناہوں سے اس کی نفرت ان سے انس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی شخص بڑے بڑے گناہوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے اور ساری آسانیوں بلکہ اشتعال انگیزیوں کے باوجود وہ اپنا دامن بچانے کی سعی کرتا ہے تو اس کشمکش سے اس کے دل کے آئینہ سے زنگار دور ہونے لگتا ہے۔ طبیعت پھر اپنی کھوئی ہوئی صحت واپس لے لیتی ہے گناہوں سے پھر اس کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ اسی حالت کو " تکفیر سیئات " کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (المنار)۔ (ضیاء)
کبیرہ گناہوں کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے چنانچہ 7، 10، 17، 40 اور 700 تک بیان کی گئی ہے۔
گناہوں سے متعلق 3 احادیث :

(1)۔۔ حضرت ابو ثعلبہ خُشَنی (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں لہٰذا تم انھیں ہرگز ضائع نہ کرو، کچھ چیزیں حرام کی ہیں انھیں ہرگز ہلکا نہ جانو، کچھ حدیں قائم کی ہیں تم ہرگز ان سے تجاوز نہ کرو، اور اس نے تم پر رحمت فرماتے ہوئے جان بوجھ کر کچھ چیزوں کے متعلق کچھ نہیں فرمایا تو ان کی جستجو نہ کرو۔ (دار قطنی، کتاب الرضاع، ۴/۲۱۷، الحدیث: ۴۳۵۰)

(2)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے، جب وہ اس گناہ سے باز آجاتا ہے اور توبہ واستغفار کرلیتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو وہ نقطہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔
(ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ ویل للمطففین، ۵/۲۲۰، الحدیث: ۳۳۴۵)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: "اے گناہ گار! تُو گناہ کے انجام بد سے کیوں بے خوف ہے؟ حالانکہ گناہ کی طلب میں رہنا گناہ کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے، تیرا دائیں، بائیں جانب کے فرشتوں سے حیا نہ کرنا اور گناہ پر قائم رہنا بھی بہت بڑا گناہ ہے یعنی توبہ کئے بغیر تیرا گناہ پر قائم رہنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے، تیرا گناہ کرلینے پر خوش ہونا اور قہقہہ لگانا اس سے بھی بڑا گناہ ہے حالانکہ تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ کیا سلوک فرمانے والا ہے، اور تیرا گناہ میں ناکامی پر غمگین ہونا اس سے بھی بڑا گناہ ہے، گناہ کرتے ہوئے تیز ہوا سے دروازے کا پردہ اٹھ جائے تو تو ڈر جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اس نظر سے نہیں ڈرتا جو وہ تجھ پر رکھتا ہے تیرا یہ عمل اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔
(الزواجر، مقدمۃ فی تعریف الکبیرۃ، ۱/۲۷)

چالیس گناہ

یہاں مسلمانوں کے فائدے کیلئے ہم چالیس گناہوں کی ایک فہرست بیان کرتے ہیں جن میں اکثر کبیرہ ہیں تاکہ کم از کم یہ تو علم ہو کہ یہ گناہ ہیں اور ہمیں ان سے بچنا ہے۔ (1) اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ٹھہرانا۔ (2) ریاکاری۔ (3) کینہ۔ (4) حسد۔ (5) تکبر۔ (6) اور خود پسندی میں مبتلا ہونا۔ (7) تکبر کی وجہ سے مخلوق کو حقیر جاننا۔ (8) بدگمانی کرنا۔ (9) دھوکا دینا۔ (10) لالچ۔ (11) حرص۔ (12) تنگدستی کی وجہ سے فقراء کا مذاق اڑانا۔ (13) تقدیر پر ناراض ہونا۔ (14) گناہ پر خوش ہونا۔ (15) گناہ پر اصرار کرنا۔ (16) نیکی کرنے پر تعریف کا طلبگار ہونا۔ (17) حیض والی عورت سے صحبت کرنا۔ (18) جان بوجھ کر نماز چھوڑ دینا۔ (19) صف کو سیدھا نہ کرنا۔ (20) نماز میں امام سے سبقت کرنا۔ (21) زکوۃ ادا نہ کرنا۔ (22) رمضان کا کوئی روزہ چھوڑ دینا۔ (23) قدرت کے باوجود حج نہ کرنا۔ (24) ریشمی لباس پہننا۔ (25) مرد و عورت کا ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کرنا۔ (26) عورتوں کا باریک لباس پہننا۔ (27) اترا کر چلنا۔ (28) مصیبت کے وقت چہرہ نوچنا، تھپڑ مارنا یا گریبان چاک کرنا۔ (29) مقروض کو بلاوجہ تنگ کرنا۔ (30) سود لینا دینا۔ (31) حرام ذرائع سے روزی کمانا۔ (32) ذخیرہ اندوزی۔ (33) شراب بنانا، پینا، بیچنا۔ (34) ناپ تول میں کمی کرنا۔ (35) یتیم کا مال کھانا۔ (36) گناہ کے کام میں مال خرچ کرنا۔ (37) مشترکہ کاروبار میں ایک شریک کا دوسرے سے خیانت کرنا۔ (38) غیر کے مال پر ظلماً قابض ہو جانا۔ (39) اجرت دینے میں تاخیر کرنا۔ (40) اور امانت میں خیانت کرنا۔ یہ چند باطنی اور ظاہری گناہ ذکر کئے ہیں، ان سب گناہوں کی معلومات حاصل کرنا اور ان کے احکام سیکھنا
{ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: ہم تم سے دوسرے گناہ مٹادیں گے۔} ارشاد فرمایا کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے اور اس کے ساتھ دیگر عبادات بجالاتے رہو گے تو ہم تمہارے دوسرے صغیرہ گناہوں کو اپنے فضل سے معاف فرمادیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ یعنی جنت میں داخل کریں

گے۔ یاد رہے کہ یہ معاملہ بھی اللہ عَزَّوَجَلّ کی مَشِیَّت اور مرضی پر ہے۔ یہ بیان صغیرہ گناہوں کے متعلق ہے، کبیرہ گناہ توبہ ہی سے معاف ہوتے ہیں ،البتہ حجِ مقبول پر بھی یہ بشارت ہے۔ (صراط)

بعض عرفاء نے کہا ہے کہ یہ مت سوچو کہ گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ' یہ غور کرو کہ تم کس ذات کی نافرمانی کر رہے ہو اور اس اعتبار سے تمام گناہ گناہ کبیرہ ہیں۔ قاضی ابو بکر بن طیب 'استاد ابو اسحٰق اسفرائنی 'ابوالمالی 'ابو نصر عبدالرحیم قشیری وغیرھم کا یہی قول ہے۔ انھوں نے کہا کہ گناہوں کو اضافی طور پر صغیرہ یا کبیرہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً زنا کفر کی بہ نسبت صغیرہ ہے اور بوس وکنار زنا کی بہ نسبت صغیرہ ہے اور کسی گناہ سے اجتناب کی وجہ سے دوسرے گناہ کی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ تمام گناہوں کی مغفرت اللہ کی مشیت کے تحت داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) "ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشآء "۔ (النساء : ۴۸)

ترجمہ : بیشک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو اس سے کم (گناہ) ہو اسے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔

اور یہ جو قرآن مجید میں ہے

(آیت) "ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیاتکم "۔ (النساء : ۳۱)

اس آیت میں کبائر سے مراد انواع کفر ہیں 'یعنی اگر تمام انواع کفر سے بچو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا 'نیز صحیح مسلم اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے قسم کھا کر کسی مسلمان شخص کا حق مارا اللہ تعالیٰ اس آدمی پر دوزخ واجب کر دے گا اور اس پر جنت حرام کر دے گا 'ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ! ہر چند کہ (اس شخص کا حق) تھوڑی سی چیز ہو ؟ آپ نے فرمایا : ہر چند کہ وہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو ! پس معمولی معصیت پر بھی ایسی شدید وعید ہے جیسی بڑی معصیت پر وعید ہے۔

علامہ قرطبیؒ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے کہا ہے کہ جن چیزوں سے منع کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس ممانعت کو جہنم یا غضب یا لعنت یا عذاب کے ذکر پر ختم کیا ہے اور گناہ کبیرہ ہے 'حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا سورۃ نساء کی تینتیس (۳۳) آیتوں میں جن چیزوں سے منع کیا ہے اور پھر فرمایا ہے (آیت) "ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ "۔ وہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔ طاؤس کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) سے سوال کیا گیا کہ کیا کبائر سات (۷) ہیں فرمایا یہ ستر کے قریب ہیں اور سعید بن جبیر (رض) سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس (رض) سے پوچھا کیا کبائر سات ہیں فرمایا یہ سات سو کے قریب ہیں البتہ استغفار کے بعد کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا اور اصرار سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا (بلکہ کبیرہ ہو جاتا ہے) (تبیان)

اللہ تعالیٰ ہمارا معبود برحق اور حاکم حقیقی ہے وہی ہماری آنکھوں کی روشنی اور دلوں کے سکون کا باعث ہے۔ ہم ہر حال میں اس کے احکام کے پابند ہیں اور اس کی رضا کا حصول ہماری منزل ہے۔ ہماری حیثیت اس کے سامنے ایک بندہ محض کی ہے جسے صرف بندگی زیب دیتی ہے۔ وہ اپنی حیثیت کے حوالے سے اپنے آقا کی کسی بھی معصیت اور سرتابی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسے ہرگز یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس کا کوئی حکم توڑے یا اس کی خوشنودی کے خلاف کوئی کام کرے، اسے بہر صورت اپنے اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنی ہے۔ بات کوئی چھوٹی ہو یا بڑی اسے کسی طرح بھی معصیت اور نافرمانی کا کوئی حق نہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات کے حوالے سے ایسی ہے جیسے آگ کا بڑا انگارہ اور چھوٹی چنگاری۔ لیکن کوئی عقل مند انسان دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کر سکتا۔ اس لیے حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا۔ اور سلف صالحین نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے

جو انسان کو کافرانہ اخلاق و اعمال کی طرف دعوت دیتا ہے۔ لیکن یہ اللہ کا انتہائی فضل و احسان ہے کہ ایک بندہ ہوتے ہوئے ہمارے لیے کسی گناہ کا کوئی موقع نہیں۔ لیکن اس نے گناہوں میں تقسیم فرمادی کہ کچھ گناہ کبیرہ ہیں اور کچھ صغیرہ۔ اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو تو ہم اپنے فضل و کرم سے تمہارے صغائر کو معاف فرمادیں گے یعنی جو احکام تم پر فرض و واجب کیے گئے ہیں تم ان کی بجاآوری میں کبھی کمی نہ کرو کیونکہ ان کا بجانہ لانا بجائے خود ایک کبیرہ گناہ ہے۔ فرائض و واجبات کی پابندی کے ساتھ ساتھ اگر تم کبائر سے بچنے میں کامیاب ٹھہرے تو اللہ تعالیٰ فرائض و واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ تمہارے صغیرہ گناہ معاف فرمادے گا۔ ہمیں احادیث مبارکہ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔
حضور نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ جب کوئی شخص نماز کے لیے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ چہرہ دھویا تو آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، کلی کی تو زبان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دھل گئے، پھر جب وہ مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص کبائر سے پرہیز پوری طرح نہیں کرتا اس کے صغائر بھی معاف نہیں ہوتے کیونکہ عملی زندگی میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا وہ کسی کے پانچ روپے بھی کبھی نہیں دبا سکتا۔ لیکن جو لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور کبائر کے ارتکاب سے نہیں بچتے وہ ساری زندگی مچھر چھانتے رہتے اور اونٹ نگلتے رہتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ قرآن و سنت میں کبیرہ گناہ کسے کہا گیا ہے؟ تو اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تشریح فرمائی ہے۔
"گناہ کبیرہ کی تعبیر قرآن و حدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے۔ وہ سب گناہ کبیرہ ہیں اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہو گا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے"۔ (روح)
ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس جہان میں پاک و صاف نفوس پیدا کئے جائیں اور پھر ان نفوس طیبہ سے ایک پاک و صاف معاشرہ وجود میں لایا جائے۔
لیکن یہ دعوت دیتے وقت اور یہ حدود و قیود عائد کرتے وقت انسان کی ضعیفی اور اس کی فطری کوتاہیاں بھی پیش نظر رکھی گئی ہیں۔ یہ فرائض و واجبات اس کی فطری طاقت کے دائرے کے اندر اندر ہیں۔ ان میں اس کی فطرت ' اس کی طاقت کے حدود اور اس کے رجحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ نیز انسانی زندگی کی راہوں کے نشیب و فراز کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں ' فرائض و واجبات عائد کرتے وقت ان فرائض اور انسانی مقدرت کے اندر ایک حسین امتزاج اور توازن رکھا گیا ہے۔ انسانی ضروریات اور انسانی خواہشات کے درمیان بھی توازن موجود ہے۔ میلانات اور رکاوٹوں کے درمیان بھی توازن ہے ' اوامر اور نواہی کے درمیان بھی توازن ہے۔ ترغیب اور ترہیب کے درمیان توازن ہے ' اور اسی طرح ایک طرف عذاب الٰہی سے سخت ڈراوا ہے۔ اگر معصیت کا ارتکاب کیا گیا اور دوسری جانب اگر کوئی پیشمان ہو جائے اور واپس لوٹنا چاہیے تو اس کے لیے بھی معافی کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

گناہوں کی معافی کیلئے ایک عظیم الشان ضابطہ و اصول :

کہ کبیرہ گناہوں سے تم بچتے رہو صغیرہ ہم معاف کردیں گے۔ اور یہ اس لیے کہ نیکیاں صغیرہ گناہوں کو مٹادیتی ہیں، جیساکہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا { اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْہِبْنَ السَّیِّاٰتِ } الآیۃ (ھود: 114) اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ "ایک نماز دوسری نماز تک، ایک جمعہ دوسرے جمعے تک، اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک، درمیانی مدت کیلئے کفارہ ہیں، جبکہ انسان صغیرہ گناہوں سے بچتا رہے"۔ سو اس آیت کریمہ سے اس صحیح اور عظیم الشان طریقے کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، جو عقل و فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، کہ کبیرہ گناہوں سے تم بچتے رہو، صغیرہ گناہ اللہ پاک اپنی رحمت و عنایت سے خود معاف فرمادے گا کہ وہ غفور اور رحیم بھی ہے، اور ستار و کریم بھی۔ مگر الٹی کھوپڑی کے لوگوں نے اس کے برعکس یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ صغائر کے ارتکاب پر تو گویا آسمان سر پر اٹھالیں گے مگر کبائر پر بولیں گے بھی نہیں۔ مثلاً جو فرض نمازوں کا تارک ہوگا اس کو تو کچھ نہیں کہیں گے، مگر جو نفل نہ پڑھے گا اس کو کہتے ہیں کہ یہ ایسا اور ویسا ہے۔ گویا کہ ایسے لوگ مشہور مثل کے مطابق مچھر چھانتے ہیں اور ہاتھی نگل جاتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو اصولی تعلیم بہرحال یہی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے تم بچتے رہو، صغیرہ اللہ پاک کی رحمت و عنایت سے خود معاف ہوتے جائیں گے۔ اللہ ہمیشہ اور ہر طرح کے گناہ سے محفوظ رکھے اور ہمیشہ اپنی رحمت و عنایت کے سائے میں رکھے اور نفس و شیطان کے ہر حملے سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔ (مدنی)

دین اسلام کا حقیقی مطلوب و مقصود صرف یہی ہے کہ وہ نفس انسانی کا قبلہ درست کر کے اس کا رخ اللہ کی طرف موڑ دے ' اور اس قبلہ رخی میں اسے مخلص ہونا چاہیے۔ وہ حتی المقدور اپنے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرے۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت ضعیف و ناتواں سب کے شامل حال رہتی ہے ' وہ تقصیرات در گزر کرتی ہے ' وہ توبہ قبول کرتی ہے ' کمزوریوں سے صرف نظر کرتی ہے ' گناہ معاف کرتی ہے اور واپس آنے والوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیتی ہے اور بڑے انس و محبت سے آنے والوں کا استقبال کرتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم کبائر سے اجتناب کرو۔ گناہ کبیرہ ہمیشہ واضح ' کھلے اور عظیم ہوتے ہیں ' اس لیے کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا جن کا اسے علم نہ تھا کہ یہ گناہ ہیں ' یا وہ سمجھا ہی نہیں ہے اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہے ' اس لیے کہ جو شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے ' وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے گناہ سے بچنے اور اجتناب کرنے کی سعی کی ہے ' یا اس نے اس کے ارتکاب کے خلاف پورا مقابلہ کیا ہے لیکن ان گناہوں کے ارتکاب کے بعد بھی اگر ایک شخص صحیح طرح پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو بھی اللہ کے ہاں معافی ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(آیت) "والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم و من یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون"۔ (۳: ۱۳۵)"

" اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔۔ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کے گناہ معاف کر دے گا۔ "اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے متقیوں میں شمار فرمایا ہے۔

یہاں ہم حضرت عمر بن خطاب (رض) کا واقعہ نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں ' حضرت عمر (رض) معصیت کے معاملے میں بے حد حساس اور سخت تھے اور وہ معاصی سے سخت اجتناب فرماتے تھے، اس واقعے سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے ان کے اس تیز احساس کو کس طرح سیدھے

راستے پر ڈال دیا تھا ' اور ان کے ہاتھ میں یہ ترازو ' حساس ہونے کے باوجود کس قدر اعتدال پر تھا ' خصوصا جبکہ ان کا واسطہ اجتماعی امور اور انسان کے نفسیاتی معاملات سے پڑا کرتا تھا۔

ابن جریر نے یعقوب ابن ابراہیم ، ابن علی ' ابن عون اور۔۔ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ مصر میں بعض لوگوں نے عبداللہ ابن عمرو سے پوچھا کہ ہم اللہ جل شانہ کی کتاب میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ ان پر عمل کیا جائے ' لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاتا ' اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں امیر المومنینؓ سے ملیں۔ چنانچہ عبداللہؓ بن عمرو مدینہ آئے اور وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے اور حضرت عمر (رض) سے ملے۔ انھوں نے پوچھا تم کب آئے ہو؟ انھوں نے کہا میں فلاں فلاں تاریخ کو آیا ہوں ' حضرت عمر (رض) نے پوچھا کہ کیا تم اجازت لے کر آئے ہو؟ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ اس سوال کا حضرت عبداللہ ابن عمرو (رض) نے کیا جواب دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ امیر المومنینؓ! مجھے مصر میں بعض لوگ ملے تھے ' انھوں نے سوال کیا تھا کہ ہم قرآن کریم میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا ' تو ان لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں آپؓ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا: آپ ان لوگوں کو میرے لیے جمع کریں۔ انھوں نے ان لوگوں کو جمع کیا۔ ابو عون نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اس نے کہا بیٹھک میں جمع کیا۔ اس پر انھوں نے ان میں سے ادنی تر آدمی سے بات کی اور کہا: میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور اسلام کا آپ پر جو حق اس کو مد نظر رکھتے ہوئے تم سے پوچھتا ہوں: "کیا تم نے پورے قرآن مجید کو پڑھ لیا ہے؟ "اس نے جواب دیا: "ہاں "اس پر انھوں نے فرمایا: "کیا وہ پورا تمہارے ذہن میں ہے؟ ' اس نے جواب دیا: "خدا جانتا ہے نہیں۔ "اگر یہ شخص کہتا ہاں سب قرآن میرے ذہن میں ہے تو حضرت عمر یہیں سے اس کے ساتھ مباحثہ شروع کر دیتے۔ اس کے بعد حضرت عمر (رض) نے کہا: "کیا سب قرآن تمہارے پیش نظر ہے؟ "کیا سب قرآن لفظ "تمہیں یاد ہے؟ کیا سب قرآن پر تم عمل پیرا ہو؟ غرض ایسے ہی سوالات انھوں نے سب سے کئے اور آخری شخص تک وہ سب سے یہ سوالات کرتے چلے گئے ، اس کے بعد حضرت عمر (رض) نے فرمایا: "تمہیں تمہاری ماں روئے: کیا تم عبداللہؓ بن عمرو کو اس بات کا مکلّف بناتے ہو کہ وہ لوگوں کو مکمل طور پر قرآن کریم کے مطابق استوار کر دے۔ ہمارے اللہ کو یہ معلوم تھا کہ ہم میں گناہ گار بھی ہوں گے۔ "اس کے بعد حضرت عمر (رض) نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

(آیت) "ان تجتنبوا کبآئر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیاتکم "۔ (۴: ۳۱) "

" اگر تم کبائر سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔ "

اس کے بعد حضرت عمر (رض) نے فرمایا: "کیا اہل مدینہ جانتے ہیں۔ "یا فرمایا: "کیا کسی ایک شخص کو معلوم ہے کہ تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ "تو انھوں نے کہا: "نہیں۔ "تو فرمایا اگر اہل مدینہ کو علم ہوتا تو میں تمہیں ضرور وعظ کرتا۔ " (لفظ احصیۃ فی اثر ک کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم نے اپنی پوری زندگی میں قرآن کو نافذ کر دیا ہے۔ (ظلال)

(عَنْ اَبِیْ ذَرٍ (رض) اِنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَرَجَ فِی زَمَنِ الشِّتَآءِ وَالْوَرَقُ یَتَھَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَیْنِ مِنْ شَجَرَۃٍ قَالَ فَجَعَلَ ذٰلِکَ الْوَرَقُ یَتَھَافَتُ قَالَ فَقَالَ یَا اَبَاذَرٍّ! قُلْتُ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ لَیُصَلِّی الصَّلَاۃَ یُرِیْدُ بِھَا وَجْہَ اللّٰہِ فَتَھَافَتُ عَنْہُ ذُنُوْبُہٗ کَمَا یَتَھَافَتُ ھٰذَا الْوَرَقُ عَنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ) [مسند احمد: کتاب مسند الانصار، باب حدیث ابی ذر (رض)]

"حضرت ابوذر غفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سردیوں کے موسم میں باہر تشریف لائے اور پتے گر رہے تھے آپ نے درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا جس سے ٹہنی کے پتے زمین پر گر پڑے پھر فرمایا ابوذر! میں نے عرض کی کہ حاضر ہوں! اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا مسلمان آدمی جب اخلاص کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ایسے ہی گر جاتے ہیں جس طرح اس درخت کے پتے گر رہے ہیں۔"

اس طرح بعض اذکار کے فوائد بیان فرمائے کہ ان سے گناہ معاف اور پڑھنے والے کے مرتبے بلند ہوتے ہیں۔ البتہ کبیرہ گناہ سچی توبہ اور اس کے تقاضے پورے کرنے سے ہی معاف ہوتے ہیں۔ آپ نے امت کو ایسے گناہوں سے بچنے کے لیے کبیرہ گناہوں کی ایک فہرست پیش کی ہے۔ ان گناہوں کے ساتھ علماء نے قرآن وسنت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر اس گناہ کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔ جنہیں کرنے والا اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر اور تکبر سے کرتا ہے بظاہر وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ کچھ علماء نے ان گناہوں کو بھی کبیرہ گناہ شمار کیا ہے جن کے کرنے پر لعنت کی گئی ہے۔ تاہم یہاں ان گناہوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کا نام لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں کبیرہ گناہ قرار دیا ہے

(عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ (رض) قَالَ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الْکَبَآءِرَ فَقَالَ الشِّرْکُ باللّٰہِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ فَقَالَ اِلَآ اُنَبِّءُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَاءِرِ قَالَ شَھَادَۃُ الزُّوْرِ)

[رواہ البخاری: کتاب الأدب، باب عقوق الوالدین من الکبائر]

آیت مبارکہ:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

لغات القرآن: [وَلَا : اور نہ] [تَتَمَنَّوْا : آرزو کرو] [مَا فَضَّلَ : جو بڑائی دی] [اللّٰهُ : اللہ] [بِهٖ : اس سے] [بَعْضَكُمْ : تم میں سے بعض] [عَلٰي : پر] [بَعْضٍ : بعض] [لِلرِّجَالِ : مردوں کے لیے] [نَصِيْبٌ: حصہ] [مِّمَّا : اس سے جو] [اكْتَسَبُوْا : انہوں نے کمایا (اعمال)] [وَلِلنِّسَآءِ : اور عورتوں کے لیے] [نَصِيْبٌ: حصہ] [مِّمَّا : اس سے جو] [اكْتَسَبْنَ : انہوں نے کمایا (ان کے عمل)] [وَسْـَٔلُوا : اور سوال کرو (مانگو)] [اللّٰهَ :

اللّٰہ] [مِنْ فَضْلِهٖ : اس کے فضل سے] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللّٰہ] [كَانَ : ہے] [بِكُلِّ : ہر] [شَيْءٍ : چیز] [عَلِيْمًا : جاننے والا]

ترجمہ : اور تم اس چیز کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا، اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا، اور اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو، بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے

تفسیر و تشریح : بعض انسان دوسرے انسانوں سے باعتبار صحت، شکل و صورت، قوت و توانائی، ذہانت و فطانت، حسب و نسب اور جاہ و منزلت برتر اور افضل ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے ان جیسا بننے کی حسرت سے اپنی زندگی کو تلخ نہ بنالو۔ یہ امور نہ تو انسان کے لیے حقیقی شرف و عزت کا معیار ہیں اور نہ انھیں قرب الٰہی میں کچھ دخل ہے۔ عزت و شرف کا حقیقی معیار اور قرب الٰہی کا صحیح راستہ تو تمہاری ذاتی جدو جہد میں مضمر ہے۔ اگر آپ نیک عمل کریں گے تو تمہیں قرب الٰہی نصیب ہو گا قطع نظر اس سے کہ تمہاری رنگت کیا ہے۔ تمہاری جسمانی قوت اور ذہانت کا معیار کیا ہے اور تم کس خاندان کے چشم و چراغ ہو تو تم مرد ہو یا عورت۔ اور تمہارے چہرے کی دلکشی تمہارے حسب و نسب کی برتری یا کوئی دوسری خوبی تمہیں خالق و مخلوق کی نگاہوں میں کوئی عزت نہیں بخش سکے گی۔ اس لیے کرنے کا کام تو یہ ہے کہ اپنے حسن عمل سے اپنی برتری ثابت کرو۔ دوسروں کے کمالات دیکھ کر ان جیسا بننے کے فقط خواب دیکھتے رہنا تو ایک مومن کے شایان شان نہیں۔ یہ عادت تو انسان میں حسد اور عناد کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ علامہ بیضاوی (رح) نے کیا خوب لکھا ہے ای لکل من الرجال والنساء فضل ونصیب بسب ما اکتسب و من اجلہ فاطلبوا الفضل بالعمل لا بالحسد والتمنی یعنی ہر مرد اور ہر عورت کو بلاامتیاز اس کی جدو جہد کا ثمر ملے گا۔ اس لیے اگر تم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طلبگار ہو تو عمل سے طلب کرو۔ کسی سے حسد کرنا یا صرف اس جیسا بننے کی خواہش ہی کرتے رہنے سے کیا حاصل۔ عورتوں کے دلوں میں عام طور پر یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش وہ مرد ہوتیں۔ اس کا بھی ازالہ فرمادیا کہ تکوینی مصلحتوں کے پیش نظر کسی کو مرد اور کسی کو عورت ضرور ہونا تھا اس لیے اس خیال خام کو اپنے دلوں سے نکال دو۔ حصول کمال اور قرب الٰہی کے دروازے تمہارے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں آگے بڑھو اور اپنے حسن کردار اور خوبی عمل سے بلند سے بلند مقام حاصل کرلو۔

نیز اس آیت سے یہ بھی بتادیا کہ دولت کمانے کا حق جس طرح مرد کو ہے اسی طرح عورت کو بھی ہے۔ مرد بھی اپنی کمائی ہوئی دولت کا مالک ہوتا ہے۔ اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرسکتا ہے اور اس سے استفادہ کرسکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حقوق حاصل ہیں۔ اس ارشاد گرامی سے مرد و زن میں جو بے جا تفریق صدیوں سے قائم تھی اس کا قلع قمع کردیا۔

صرف خیالی پکاؤ پکانے اور حسد کرنے کی عادت کو ترک کردو اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دامن پھیلادو۔ وہ اپنی جود و سخا سے تمہیں سب کچھ عطا فرمانے پر قادر ہے۔ اس کے خزانے ختم ہونے والے نہیں۔ وہ کثرت سوال سے اکتا نہیں جاتا بلکہ خوش ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے سلوا اللہ من فضلہ فانہ یحب ان یسأل و افضل العبادۃ انتظار الفرج۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کا سوال کیا کرو وہ اس کو دوست رکھتا ہے اور بہترین عبادت مصیبت کے دور ہونے کے لیے منتظر رہنا ہے۔ (ضیاء)

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو دین یا دنیا کی جہت سے جو نعمت عطا کی اسے اس پر راضی رہنا چاہیے۔

شان نزول:

جب آیت میراث میں "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" والا حصہ نازل ہوا اور میت کے ترکہ میں مرد کا حصہ عورت سے دگنا مقرر کیا گیا تو مردوں نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ آخرت میں نیکیوں کا ثواب بھی ہمیں عورتوں سے دگنا ملے گا اور عورتوں نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ گناہ کا عذاب ہمیں مردوں سے آدھا ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو فضیلت دی وہ عین حکمت ہے بندے کو چاہیے کہ وہ اس کی قضا پر راضی رہے۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۳۲، ۱/۳۷۲)

دل کے صبر و قرار کا نسخہ

دل کے صبر وقرار کا نسخہ ہی اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا پر راضی رہنا ہے ورنہ دنیا میں کوئی شخص کسی نعمت کی انتہاء کو نہیں پہنچا ہوا اور اگر بالفرض کوئی پہنچا بھی ہو تو کسی دوسری نعمت میں ضرور کم تر ہوگا تو اگر دل کو انہی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بنا کر رکھا تو ہزاروں نعمتوں کا مالک ہو کر بھی دل کو قرار نہیں مل سکتا، جیسے ایک آدمی ایک ارب روپے کا مالک ہے لیکن خوبصورت نہیں تو اگر وہ خوبصورتی کی تمنا کرتا رہے گا تو جینا دو بھر ہو جائے گا اور اگر ایک آدمی خوبصورت ہے لیکن جیب میں پیسہ نہیں اور وہ پیسے کو روتا رہے گا تو بھی بے قرار رہے گا اور جس کے پاس پیسہ اور خوبصورتی کچھ نہ ہو لیکن وہ کہے کہ میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا پر راضی ہوں اور پھر وہ صبر کر کے آخرت کے ثواب کو پیش نظر رکھے تو یقیناً ایسا آدمی دل کا سکون پالے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں بھی ہوں تو وہ یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس تیسری وادی بھی ہو اور اس کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا جو توبہ کرے۔

جس طرح بڑے گناہ آدمی کو ہلاک کر دیتے ہیں اسی طرح حسد بھی آدمی کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار اور دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے لوگوں کے درمیان تفاوت اور اونچ نیچ رکھی ہے تا کہ انسان ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کر کے باہمی تعاون اور احترام کریں۔ جس کو نعمت میسر آئی ہے وہ شکر ادا کرے اور جسے محروم رکھا گیا ہے وہ صبر کرے۔ چھوٹے بڑے کا فرق عام انسانوں کے علاوہ بسا اوقات ایک باپ کی اولاد میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک خوبصورت دوسرا عام صورت ہے 'ایک تنومند اور طویل قد و قامت لیے ہوئے، جبکہ دوسرا پست قد اور ناتواں جسم کا مالک ہے 'ایک معمولی محنت کے بعد دولت میں کھیل رہا ہے دوسرا سخت مشقت اٹھانے کے باوجود غربت کے تھپیڑے کھا رہا ہے 'ایک دانا دوسرا نادان ہے۔ اس فطری تفاوت کے بارے میں حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جلنے اور حسد کرنے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سمجھ کر قبول کرو۔ یاد رکھو کہ تمہارے رب کے نزدیک طاقتور اور کمزور، گورے اور کالے، غریب اور امیر، شاہ اور گدا، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی بارگاہ میں چہرے نہیں دل دیکھے جاتے ہیں۔ نعرے نہیں آدمی کا کردار دیکھا جاتا ہے۔ اسی کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوں بیان فرمایا:

(یَآاَیُّهَا النَّاسُ ! اِلَآاِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اِلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اِعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اِسْوَدَ وَلَا اِسْوَدَ عَلٰى اِحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى) [مسند احمد: کتاب مسند الانصار، باب حدیث رجل من اصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

"اے لوگو! خبردار یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے خبردار! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ پر سوائے تقویٰ کے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غریبوں کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:
(يَدْخُلُ فُقَرَاءُ الْمُسْلِمِينَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَاءِ هِمْ بِنِصْفِ يَوْمٍ وَّهُوَ خَمْسُ ماءَةِ عَامٍ) [رواہ الترمذی: کتاب الزھد، باب ماجاء إن فقراء المھاجرین یدخلون الجنتہ قبل إغنیاء ھم]
"غریب مسلمان امیر لوگوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔"
لہٰذا قدرت کے فرق کو مٹانے یا حسد کے ساتھ آگے بڑھنے میں اپنی صلاحیتیں ضائع نہ کرو۔ بلکہ اپنے آپ کو سنوارنے اور آخرت بنانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل کے طلب گار اور اس کا قرب تلاش کرنے والے ہو جاؤ۔ اس کے خزانے لامحدود، اس کی رحمت بے کراں اور اس کا فضل بے حد و حساب ہے۔ وہاں مرد وزن میں فرق کیے بغیر ہر کسی کے اعمال اور اس کی نیت و کردار کے مطابق اجر دیا جائے گا۔
(عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا) [رواہ البخاری: کتاب الأدب]
"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ بدگمانیوں سے بچو کیونکہ گمان سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے اور نہ ٹوہ لگاؤ، نہ جاسوسی کرو، نہ پیٹھ پیچھے باتیں کرو اور نہ ہی آپس میں بغض رکھو اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ (فہم)

(بخاری، کتاب الرقاق، باب ماینتقی من فتنۃ المال، ۲۲۸/۴، الحدیث: ۶۴۳۶)
حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اور جو تم سے اوپر ہو اسے نہ دیکھو، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اپنے اوپر نعمت کو حقیر جانو۔
(مسلم، کتاب الزہد والرقائق، ص ۱۵۸۴، الحدیث: ۹ (۲۹۶۳))
{لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا: مردوں کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے۔} میاں بیوی میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے نیک اعمال کی جزا ملے گی، دونوں کا نیک اور پرہیزگار ہونا انھیں اعمال سے بے نیاز نہ کرے گا۔
شانِ نزول
اُمّ المومنین حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا کہ ہم بھی اگر مرد ہوتے تو جہاد کرتے اور مردوں کی طرح جان فدا کرنے کا ثواب عظیم پاتے۔
(جلالین، النساء، تحت الآیۃ: ۳۲، ص ۷۲)
اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انھیں تسکین دی گئی کہ مرد جہاد سے ثواب حاصل کرسکتے ہیں تو عورتیں شوہروں کی فرمان برداری اور پاکدامنی سے ثواب حاصل کرسکتی ہیں۔
بعض علماء نے کہا ہے اس آیت کا یہ معنی ہے کہ کوئی مرد یہ تمنا نہ کرے کہ کاش وہ عورت ہوتا اور کوئی عورت یہ تمنا نہ کرے کہ کاش وہ مرد ہوتی 'اور بعض علماء نے یہ کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دگنا کیا تو بعض عورتوں نے کہا ہم چونکہ صنف ضعیف ہیں اور ہم کو مال کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ہمارا حصہ دگنا ہونا چاہیے تھا 'تب یہ آیت نازل ہوئی مردوں کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق تین روایات ہیں:
مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ (رض) نے عرض کیا: یارسول اللہ مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم جہاد نہیں کرتی اور ہمارے لیے آدھی میراث ہے

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ عورتوں نے جہاد کا سوال کیا اور انھوں نے کہا ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ ہم بھی مردوں کی طرح جہاد کریں اور ہمیں بھی ان کی طرح اجر ملے۔

قتادہ اور سدی نے بیان کیا ہے کہ مردوں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم کو وراثت میں دگنا حصہ دیا جاتا ہے ہماری عبادتوں کا بھی ہم کو عورتوں سے دگنا اجر ملے اور عورتوں نے کہا ہم یہ چاہتی ہیں کہ ہمارے آدھے گناہ مردوں پر ڈال دیئے جائیں ' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی مردوں کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے۔ (الدر المنثور ج ۲ ص ۱۴۹۔ مطبوعہ ایران) (تبیان)

اس کے بعد فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو ' یعنی اللہ سے اپنے اعمال کا صلہ نہ مانگو اور نہ اللہ تعالیٰ سے اس کے عدل کی بناء پر سوال کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو

{ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ : اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ } سُبْحَانَ اللہ، دلوں کے قرار کا کتنا پیارا بیان فرمایا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ سے اس کا فضل مانگو کہ حقیقت میں سب سے بڑی چیز اللہ کریم کا فضل و کرم ہے۔ اعمال میں کسی کو دوسرے سے لاکھ گنا زیادہ بھی ثواب ملتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل ہی کا محتاج ہے کیونکہ اس کا جنت میں داخلہ تو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل ہی سے ہوگا۔ بغیر فضل کے اپنے عمل سے کوئی جنت میں نہیں جائے گا لہٰذا اللہ عَزَّوَجَلَّ سے اس کا فضل مانگنا چاہیے۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

لغات القرآن: [وَلِكُلٍّ : اور ہر ایک کے لیے] [جَعَلْنَا : ہم نے مقرر کیے] [مَوَالِيَ : وارث] [مِمَّا : اس سے جو] [تَرَكَ : چھوڑ مریں] [الْوَالِدٰنِ : والدین] [وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور قرابت دار] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ جو کہ] [عَقَدَتْ : بندھ چکا] [اَيْمَانُكُمْ : تمہار عہد] [فَاٰتُوْهُمْ : تو ان کو دے دو] [نَصِيْبَهُمْ : ان کا حصہ] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلٰي : اوپر] [كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز] [شَهِيْدًا : گواہ (مطلع)]

ترجمہ: اور ہم نے سب کے لیے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے مال میں حق دار (یعنی وارث) مقرر کر دیئے ہیں، اور جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے سو انھیں ان کا حصہ دے دو، بیشک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے (عرفان)

تفسیر و تشریح : مردوں اور عورتوں کے معاشرتی اور اخلاقی حقوق بیان کرنے کے بعد مالیاتی حقوق کا تحفظ فرمایا گیا ہے۔

اوپر کی آیت میں مرد اور عورت کی کمائی کو الگ الگ تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہاں عربوں کے اس رواج کی اصلاح کی گئی ہے جس میں مرنے والا اپنے حقیقی وارثوں کو محروم کر کے کسی دوست یا رشتہ دار کے نام اپنی جائیداد وقف کر دیتا تھا۔ فرمایا کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کا حصہ اور اس کے وارثوں کا تعیّن کر دیا گیا ہے۔ اب ان کے حصہ میں کمی و بیشی کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ سوائے اس کے جو اس فرمان کے نازل ہونے سے پہلے تم نے کسی کے ساتھ عہد کیا ہو۔ اسے عہد کے مطابق اتنا حصہ دے سکتے ہو۔ لیکن اس کے بعد ایسا کرنے کی اجازت نہ ہو گی۔ اس فرمان کے نازل ہونے سے پہلے انصار اپنے مہاجر بھائیوں کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا کرتے تھے۔ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اور فرمایا کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) فتح مکہ کے موقع پر سخت بیمار ہوئے۔ انھوں نے رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ میرے پاس بہت سا مال ہے ایک بیٹی کے علاوہ کوئی وارث نہیں۔ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے انھیں اجازت عنایت نہیں فرمائی۔ پھر انھوں نے نصف کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی اس کے بعد انھوں نے ایک تہائی کی اجازت مانگی تو آپ نے یہ فرما کر اجازت دی کہ یہ بھی زیادہ ہے۔ اپنی اولاد کو مالدار چھوڑنا ان کو محتاج چھوڑنے سے زیادہ بہتر ہے۔ [رواہ البخاری : کتاب الفرائض، باب میراث البنات] (فہم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور ہم نے ہر شخص کے ترکہ کے لیے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اولاد "قرابت دار اور وہ لوگ جن سے تمہارا عہد ہو چکا ہے سو تم انھیں ان کا حصہ دو بیشک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ (النساء : ٣٣)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس انسان کا مال اور ترکہ ہے ہم نے اس کے لیے وارث بنا دیئے ہیں پھر ان وارثوں کا بیان فرمایا وہ اس کی اولاد اور اس کے قرابت دار ہیں اور وہ لوگ ہیں جن سے تمہارا عہد ہو چکا ہے۔

امام ابن جریر نے قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کوئی شخص دوسرے شخص سے (جس سے اس کی نسبی قرابت نہیں ہوتی تھی) یہ عہد کرتا کہ میرا خون تمہارا خون ہے اور میرا نقصان تمہارا نقصان ہے تم میرے وارث ہو گے اور میں تمہارا وارث ہوں گا تم مجھ سے مطالبہ کرنا اور میں تم سے مطالبہ کروں گا پھر زمانہ اسلام میں اس کا چھٹا حصہ مقرر کر دیا گیا اس کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ورثہ میں ترکہ تقسیم کیا جاتا تھا پھر جب سورۃ انفال میں یہ آیت نازل ہوئی :

(آیت) "واولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ"۔ (الانفال : ٧٥)

ترجمہ : اور قرابت دار ایک دوسرے کے ساتھ اللہ کی کتاب میں زیادہ حقدار ہیں۔

اس آیت کے نزول کے بعد جس شخص سے کسی نے عہد کیا تھا اس کی وراثت منسوخ ہو گئی۔ (جامع البیان ج ٥ ص ٣٤) (تبیان)

یعنی کہ

عہد جہالت کی ایک رسم یہ تھی کہ جن لوگوں کی آپس میں دوستی ہوتی تھی یا جس کو وہ اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا کرتے وہ بھی ان کی وراثت میں حصہ دار بن جاتا۔ اس آیت میں وضاحت فرما دی کہ وراثت کے حقدار تو وہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وارث ٹھہرایا ہے۔ جن کے ساتھ ان کا معاہدہ ہوا کرتا ان کو پہلے 1/6 حصہ دیا جاتا۔ بعد میں اولوالارحام کی آیت سے یہ بھی منسوخ ہو گیا۔ (ضیاء)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:
امام ابو حنیفہ (رح) کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی شخص نے کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ اس کی دیت ادا کرے گا اور اس کا وارث ہوگا تو اس کا دیت ادا کرنا صحیح ہے اور اگر اس کا کوئی اور نسبی وارث نہ ہو تو پھر وہ شخص اس کا وارث ہوگا۔ (روح المعانی ج ۵ ص ۲۲)

اس آیت کی تفسیر میں چار قول ہیں

(۱) جاہلیت میں جو لوگ ایک دوسرے سے ایک دوسرے کا وارث ہونے کا عہد کرتے اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں اور سورۃ انفال کی آیت سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔
(۲) اس سے وہ مہاجرین اور انصار مراد ہیں جن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دوسرے کا بھائی بنادیا تھا۔
(۳) اس سے وہ لوگ ہیں مراد ہیں جن کو زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنا بیٹا بنالیا کرتے تھے حالانکہ وہ کسی اور کے بیٹے ہوتے تھے ' پہلے قول کے متعلق امام شافعی ' امام مالک اور امام احمد کا یہ مذہب ہے وہ سورۃ انفال کی آخری آیت سے منسوخ ہوگیا۔
" (۴) امام ابو حنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ یہ حکم اب بھی باقی ہے البتہ عصبات اور ذوالارحام اس شخص پر مقدم ہیں جس سے عہد کیا گیا وہ نہ ہوں تو اس کو عہد کرنے والے کی وراثت ملے گی۔
اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس شخص سے تم نے وراثت کے علاوہ مدد کرنے اور خیر خواہی کا معاہدہ کیا ہے اس معاہدہ کو پورا کرو ' کیونکہ زمانہ جاہلیت میں صرف ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ ہوتا تھا اس کے سوا نہیں ہوتا تھا اور اسلام نے اس کو متغیر نہیں کیا بلکہ اور پختہ کیا ہے۔ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے اور یہ آیت محکم ہے۔ (زاد المسیر ج ۲ ص ۷۲)
قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں:
جاہلیت کے زمانہ میں بعض آدمی کسی دوسری برادری سے جا کر مل جاتے تھے اس برادری والے اس شخص سے معاہدہ کر لیتے تھے کہ تو ہم میں سے ہے ضرر ہو یا فائدہ یا خون (دیت وغیرہ) بہر طور تو ہماری برادری کا ایک فرد ہوگیا اس شخص سے یہ لوگ اسی طرح کا قول کرا لیتے تھے لیکن ضرورت کے وقت اگر وہ شخص امداد کا طالب ہوتا تھا تو وہ لوگ اپنوں کی طرح اس کی مدد نہیں کرتے تھے اور اگر اس پر کوئی وقت پڑتا تھا۔ تو قوم میں سے کوئی تو اس کو دیتا تھا اور کوئی نہیں دیتا تھا غرض اس کی ویسی امداد نہیں کرتے تھے جیسی اس سے لیتے تھے ' دور اسلام میں ان کو اس میں کچھ خرابی محسوس ہوئی اور انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ جاہلیت کے زمانہ میں جو ہم نے معاہدے کر لیے ہیں ان کا کیا حکم ہے اس پر آیت وَالَّذِیۡنَ عَاقَدَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَاٰتُوۡہُمۡ نَصِیۡبَہُمۡ نازل ہوئی یعنی مخالفین سے لین دین برابر کا رکھو (جتنا حق ان پر اپنا سمجھتے ہو اتنا ہی حق ان کا اپنے اوپر سمجھو) عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے دوسری سند سے ابو مالک کا قول نقل کیا ہے کہ وہ قوم کا حلیف ہوتا ہے جو قوم کے تمام معاملات اور مشوروں میں اپنی موجودگی کی درخواست کرتا تھا۔ عبد بن حمید اور ابن جریر نے حضرت ابن عمر (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے دن فرمایا جاہلیت کے حلف کو پورا کرو ' اسلام اس حلف کی مزید قوت پیدا کرتا ہے مگر حالت اسلام میں جدید معاہدہ تحالف نہ کرو۔ احمد اور مسلم نے حضرت جبیر بن مطعم (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اسلام میں تحالف (کا جواز) نہیں

لیکن جو تحالف جاہلیت کے زمانہ میں ہو گیا ہو اسلام اس میں مزید قوت پیدا کرتا ہے۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس (رض) کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ عہد جاہلیت میں جو تحالف ہوا 'اسلام نے اس میں مزید قوت اور شدت پیدا کر دی عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اسلام میں تحالف (جائز نہیں)۔]
یہاں یہ بات ضرور سمجھنی چاہئیے

میراث میں سے ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے کی ہدایت ہے

سو ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے ہر شخص کے وارث مقرر کر دیے ہیں اس مال میں سے جس کو چھوڑ کر مریں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار۔ پس تم لوگ ان کی میراث انہی وارثوں میں بقدر حصص تقسیم کرو، اور اللہ کے مقرر فرمودہ ان حصوں میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی مت کرو۔ اور اللہ کی تقسیم چونکہ نہایت علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے اس میں کمی بیشی کا حق کسی کو نہیں ہو سکتا۔ لفظ " موالی " جمع ہے مولیٰ کی۔ اور " مولیٰ " کا لفظ عربی زبان میں بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے ان مختلف معانی میں سے ہر معنیٰ کی تعیین موقع و محل اور قرینے کی بناء پر ہوتی ہے۔ یہاں پر سیاق وسباق اور موقع و محل اور قرینے کی دلیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں پر ایک مراد پر مورث کے وارث ہیں۔ سو ارشاد عالی کا مطلب یہ ہوا کہ ہر مورث کے مال کے وارث مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس کے مطابق جس کا جو حق بنتا ہے وہ اس کو دے دیا جائے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔
سو ارشاد فرمایا گیا اور حرف تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اس لیے ہمیشہ اس کی بازپرس سے بچتے اور ڈرتے رہو، کہ یہ بات سب سے اہم اور سب سے مقدم ہے۔ اور اس وحدہ لاشریک سے تمہاری کوئی حالت اور کیفیت چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس کی رضا کو ہمیشہ اور ہر حال میں پیش نظر رکھو۔ مگر افسوس کہ آج کے غافل انسان کا معاملہ اس سے یکسر مختلف اور اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ مختلف انسانوں کی رضا اور ناراضگی کا تو پورا پورا خیال رکھے گا مگر اپنے خالق ومالک اور اس رب علیم وخبیر کے حقوق اور اس کی رضا اور ناراضگی کی اس کو کوئی پروا نہیں ہو گی۔ الا ماشاء اللہ والعیاذ باللہ العظیم۔

مسائل
وراثت کی تقسیم شریعت کے مطابق ہونی چاہیے۔
اس حدیث میں غیر شرعی باتوں پر حلف اٹھانے کی ممانعت ہے اور ایک دوسرے کا وارث بنانے پر حلف اٹھانے کی ممانعت ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے جو حلف اٹھایا جائے اس حلف کی شدت میں اور اضافہ کیا ہے۔

آیت مبارکہ:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

لغات القرآن: [اَلرِّجَالُ : مرد] [قَوّٰمُوْنَ : حاکم ۔ نگران] [عَلَي : پر] [النِّسَآءِ : عورتیں] [بِمَا : اس لیے کہ] [فَضَّلَ : فضیلت دی] [اللّٰهُ : اللہ] [بَعْضَهُمْ : ان میں سے بعض] [عَلٰي : پر] [بَعْضٍ : بعض] [وَّبِمَآ : اور اس لیے کہ] [اَنْفَقُوْا : انہوں نے خرچ کیے] [مِنْ : سے] [اَمْوَالِهِمْ : اپنے مال] [فَالصّٰلِحٰتُ : پس نیکو کار عورتیں] [قٰنِتٰتٌ: تابع فرمان] [حٰفِظٰتٌ: نگہبانی کرنے والیاں] [لِّلْغَيْبِ : پیٹھ پیچھے] [بِمَا : اس سے جو] [حَفِظَ : حفاظت کی] [اللّٰهُ : اللہ] [وَالّٰتِيْ : اور وہ جو] [تَخَافُوْنَ : تم ڈرتے ہو] [نُشُوْزَهُنَّ : ان کی بدخوئی] [فَعِظُوْهُنَّ : پس امن کو سمجھاؤ] [وَاهْجُرُوْهُنَّ : اور ان کو تنہا چھوڑ دو] [فِي الْمَضَاجِعِ : خواب گاہوں میں] [وَاضْرِبُوْهُنَّ : اور ان کو مارو] [فَاِنْ : پھر اگر] [اَطَعْنَكُمْ : وہ تمہارا کہا مانیں] [فَلَا تَبْغُوْا : تو نہ تلاش کرو] [عَلَيْهِنَّ : ان پر] [سَبِيْلًا : کوئی راہ] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلِيًّا : سب سے اعلی] [كَبِيْرًا : سب سے بڑا]

ترجمہ : مرد عورتوں پر محافظ و منتظم ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے (بھی) کہ مرد (ان پر) اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس نیک بیویاں اطاعت شعار ہوتی ہیں شوہروں کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت کے ساتھ (اپنی عزت کی) حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں، اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی و سرکشی کا اندیشہ ہو تو انھیں نصیحت کرو اور (اگر نہ سمجھیں تو) انھیں خواب گاہوں میں (خود سے) علیحدہ کردو اور (اگر پھر بھی اصلاح پذیر نہ ہوں تو) انھیں (تادیباً ہلکا سا) مارو، پھر اگر وہ تمہاری فرماں بردار ہو جائیں تو ان پر (ظلم کا) کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بیشک اللہ سب سے بلند سب سے بڑا ہے

تفسیر و تشریح:

شانِ نزول:

حضرت سعد بن ربیع (رض) نے اپنی بیوی حبیبہ کو کسی خطا پر ایک طمانچہ مارا جس سے ان کے چہرے پر نشان پڑ گیا، یہ اپنے والد کے ساتھ حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں اپنے شوہر کی شکایت کرنے حاضر ہوئیں۔ سرورِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قصاص لینے کا حکم فرمایا، تب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قصاص لینے سے منع فرمادیا۔ (بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۳۴، ۱/۳۳۵)
لیکن یہ یاد رہے کہ عورت کو ایسا مارنا ناجائز ہے۔ (صراط)
معاشرتی 'مالی حقوق اپنی جگہ مسلّم لیکن خاندانی یونٹ کو متوازن اور مستحکم رکھنے کے لیے مرد کو گھر کا ناظم مقرر کیا گیا ہے اگر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ ہو جائے تو اس کا طریقہ کار بھی طے کر دیا گیا ہے۔

قوام

قرآن مجید نے گھریلو زندگی کو ایک یونٹ قرار دے کر مرد کو اس کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ جس کے لیے "قَوَّامَ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا معنی ہے ہر قسم کی نگرانی اور انتظام کرنے والا۔ گھر کا منتظم اس لیے مقرر کیا تاکہ گھر کا نظام مضبوط اور صحت مند خطوط پر چلتا رہے۔
کسی چیز کی ضروریات کو مہیا کرنے والے، اس کی نگہبانی اور حفاظت کرنے والے اور اس کی اصلاح و درستگی کے ذمہ دار کو عربی میں قوام کہا جاتا ہے۔ جیسے ہر فوج کا ایک کمانڈر اور ہر مملکت کا ایک فرماں روا ہونا ضروری ہے جو نظام قائم رکھے اور فوج اور رعایا اس کے حکم کی تعمیل کرے۔ اسی طرح گھر کی ریاست کا بھی ایک حاکم اعلیٰ ہونا چاہیے جو گھر کی تمام ضروریات کا کفیل اور اس کی خوشحالی کا ذمہ دار ہو اور اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔ ورنہ گھر کی یہ مختصر مگر اہم ریاست کا سکون و اطمینان برباد ہو کر رہ جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری کس کو سونپی جائے۔ اور اس بارِ گراں کو اٹھانے کی بہترین صلاحیت کس میں ہے۔ اس کے دو ہی امیدوار ہیں ماں اور باپ۔ قرآن حکیم نے باپ کو اس ذمہ داری کا اہل قرار دیا ہے اور ساتھ ہی وجہ بھی بتادی ہے کہ اس میں دو خوبیاں ہیں ایک وہبی ہے اور دوسری کسبی۔ انھیں کے باعث وہ گھر کی مملکت کا رئیس مقرر کیا گیا ہے۔ پہلی خوبی تو یہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرد اپنی جسمانی قوت، ذہنی برتری، معاملہ فہمی اور دور اندیشی میں بلاشبہ عورت سے بڑھا ہوا ہے۔ اس چیز کو قرآن نے یوں اپنے مختصر الفاظ میں بیان فرمایا بما فضل اللہ بعضہم علی بعض۔ اور مرد کی دوسری خوبی یہ ہے کہ بیوی بچے کے جملہ اخراجات اور ان کے آرام و آسائش اور ان کی حفاظت و صیانت کی تمام تر ذمہ داری اس پر عائد ہے۔ اس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا۔ وبما انفقوا من اموالہم۔ اس لیے اپنی فطری اور کسبی برتری کے باعث مرد ہی اس امر کا مستحق ہے کہ وہ گھر کی ریاست کا امیر ہو۔ کوئی کج فہم یہ نہ سمجھے کہ عورت کے گلے میں مرد کی غلامی کا طوق ڈالا جا رہا ہے۔ نہیں ان انتظامی امور کے علاوہ عورت کے اپنے حقوق ہیں جو مرد پر ایسے ہی واجب ہیں جیسے مرد کے حقوق عورت کے ذمہ واجب ہیں۔ لھن مثل الذی علیہن۔ اور قربِ الٰہی کے دروازے دونوں صنفوں کے لیے برابر کشادہ ہیں۔ اس لیے یہاں عورت کی غلامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو جو مقام اسلام نے معاشرہ میں بخشا ہے اس کی نظیر نہیں۔ ویسے کوئی آنکھیں بند رکھنے پر ہی ادھار کھائے بیٹھا ہو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔ (ضیاء)

ایسااس لئے کہ عورت باہر کی الجھنوں سے بچ کر سکون کے ساتھ خاوند کی خدمت ، بچوں کی تربیت اور صنف نازک ہونے کی وجہ سے آرام کی زندگی گزار سکے۔ اگر غور سے سوچا جائے تو عورت کی گھریلو مصروفیات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ باہر کے کاموں کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتی۔ چہ جائیکہ اس پر ملازمت یا کاروبار کی دوہری ذمہ داری ڈال دی جائے۔ معاشرہ اس بات کا گواہ ہے کہ جو عورتیں کسی مجبوری یا محض گھریلو بجٹ میں اضافہ کرنے کے لیے ملازمت کرتی ہیں۔ انھیں گھر اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے کوئی ملازمہ رکھنا پڑتی ہے۔ بصورت دیگر ان کے گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ان کے پاس کھانا پکانے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایسے جوڑے اپنی ڈیوٹی سے گھر آتے وقت کھانا بھی ہوٹل سے لاتے ہیں۔ ان مسائل کی بنا پر عورت کو گھر کی ملکہ اور خاوند کو مشکل معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ جب سے مسلمان خواتین نے بلا مجبوری مرد کی ذمہ داریوں میں حصہ لینا شروع کیا ہے اس وقت سے عورت میں خودسری اور نخوت پیدا ہونے کے ساتھ مسلمان معاشرہ توڑ پھوڑ کا شکار، گھروں کا سکون برباد اور اولاد ماں باپ کی نافرمان ہو چکی ہے۔ کتنا ہی بہتر ہوتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تقسیم کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے تو اولاد کی نافرمانیوں ، گھروں کی بربادی اور معاشرتی بے حیائی سے محفوظ رہتے۔ (فہم)

نیک بیوی کے اوصاف اور فضائل

نیک بیوی کے کردار میں دو خوبیاں نمایاں ہونی چاہئیں۔ خاوند کی مطیع اور اس کی عزت و ناموس، مال اور اولاد کی حفاظت کرنے والی ہو۔

نیک عورتوں کی صفات کا بیان :۔

ارشاد ربانی کی مزید وضاحت حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس فرمان سے ہوتی ہے خیر النساء امرأۃ اذا نظرت الیھا سرتک واذاامرتھا اطاعتک واذا غبت عنھا حفظتک فی نفسھا ومالک۔ یعنی بہترین بیوی وہ ہے جس جب تو دیکھے تو تو مسرور ہو جائے۔ اسے حکم کرے تو وہ تیری اطاعت کرے اور اگر تو کہیں باہر جائے تو وہ تیری غیر حاضری میں اپنی عصمت کی اور تیرے مال کی حفاظت کرے۔ (ابن جریر۔ ابی ہریرہ)۔

کثیر احادیث میں نیک اور پارسا بیویوں کے اوصاف اور ان کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے 2 احادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔ حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " تقویٰ کے بعد مومن کے لیے نیک بیوی سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ اگر وہ اسے حکم دے تو وہ اطاعت کرے اور اگر اسے دیکھے تو خوش کر دے اور اس پر قسم کھا بیٹھے تو قسم سچی کر دے اور کہیں چلا جائے تو اپنے نفس اور شوہر کے مال میں بھلائی کرے۔

(ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب افضل النساء، ۲/۴۱۴، الحدیث : ۱۸۵۷)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " جسے چار چیزیں ملیں اسے دنیا و آخرت کی بھلائی ملی۔ (1) شکر گزار دل۔ (2) یادِ خدا کرنے والی زبان۔ (3) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن (4) ایسی بیوی کہ اپنے نفس اور شوہر کے مال میں گناہ کی متلاشی (یعنی اس میں خیانت کرنے والی) نہ ہو۔ (معجم الکبیر، طلق بن حبیب عن ابن عباس، ۱۱/۱۰۹، الحدیث : ۱۱۲۷۵)

ایک مسلمان خاتون کو جن خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہیے۔ اور جن پاکیزہ صفات سے متصف ہونا چاہیے ان کا ذکر کتنے دلنشین کلمات میں کیا گیا ہے۔ بیوی کا اس سے بلند معیار تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ خود سوچئے اسلام ایک بیوی سے کیا توقع رکھتا ہے۔ اور اس طرح اس کے مقام کو کتنا بلند کر دیتا ہے۔ اور اس مرد سے بھی زیادہ کوئی خوش نصیب ہو سکتا ہے جس کی رفیقہ حیات ان خوبیوں کی مالک ہو۔ (ضیاء)

لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں۔ اچھی خواتین کے ساتھ ساتھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو تند مزاج اور کج سرشت ہوا کرتی ہیں۔ ان کی اصلاح کا طریقہ تعلیم کیا جارہا ہے۔ عورت کے از راہ غرور و نفرت خاوند کی اطاعت سے سرتابی کرنے کو "نشوز" کہتے ہیں۔ خوف سے مراد وہم و گمان نہیں بلکہ علم و یقین ہے (قرطبّی) یعنی اگر تمہیں ان کی نافرمانی کا پورا علم ہو جائے تو پہلے ہی غصہ سے بے قابو ہو کر انتہائی اقدام نہ کرو۔ بلکہ پہلے انھیں نرمی سے سمجھاؤ۔ اور اگر فہمائش موثر ثابت نہ ہو تو پھر ان سے الگ رات بسر کیا کرو۔ اور محبت بھری باتیں کرنا ترک کردو۔ وہ عورت جس میں شرافت کی حس ابھی زندہ ہے وہ اس سرزنش سے ضرور اپنی اصلاح کرلے گی۔ لیکن اگر یہ طریقہ کار بھی مفید ثابت نہ ہو تو پھر تم اس کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن مار ایسی سخت نہ ہو جس سے جسم پر چوٹ آجائے۔ والضرب فی ھذہ الایۃ ضرب الادب غیر المبرح (قرطبّی) اور حضرت ابن عباس سے تو یہ تصریح مروی ہے کہ اگر مارنے کی نوبت آئے تو مسواک یا اس قسم کی کسی ہلکی پھلکی چیز سے مارے۔ آج کل جہلاء اپنی بیویوں کو بھینسوں کی طرح پیٹتے ہیں اس کی اجازت قطعاً اسلام نے نہیں دی۔

سرکشی اور عورت

اگر عورت اپنی سرکشی سے باز آجائے اور اپنے شوہر کی فرماں بردار بن جائے تو پھر شوہر پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے پہلے رویہ کو یکسر بدل دے اور اس پر دست درازی سے کلیتہً باز آجائے۔ یہ حکم اس خدا کا ہے جو سب سے بالا اور سب سے بڑا ہے اور اس کے حکم کی سرتابی کے نتائج بڑے المناک ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے گھر کی نگرانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر عورت مرد کے مقابلے میں آئے اور اس کی بغاوت کرے تو اسے بہتر الفاظ اور اچھے انداز میں نصیحت کرنی چاہیے۔ ٹکراؤ کی صورت میں گھریلو زندگی بے چینی اور عدم توازن کا شکار ہو گی بلکہ اولاد پر بھی برے اثرات مرتب ہوں گے۔ خاص کر بیٹیوں کے مستقبل پر اس کے نہایت ہی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

نفع و نقصان سمجھانے کے باوجود بیوی اگر اپنی روش ترک کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو خاوند کو اس کے ساتھ اپنی قربت ختم کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جس کے لیے قرآن مجید نے بستر الگ کر دینے کا حکم دیا ہے جو حیادار اور خاندانی عورت کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ عورت میں اگر معمولی عقل اور حیا ہو گی تو وہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گی کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بیگانگی اور ایک دوسرے سے بیزاری اچھی نہیں۔

بصورت مجبوری تیسرا اور آخری اقدام یہ ہے اسے ہلکی پھلکی جسمانی سزا دی جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل جائیں کہ اب گھر کی ملکہ کے بجائے میں لونڈی کے مقام پر آکھڑی ہوں اور میرا گھر عقوبت خانہ اور اس کا ماحول میرے لیے اچھوت بن چکا ہے۔ کوئی عورت اگر اس قدر جاہل اور ہٹ دھرم ہو کہ وہ سدھرنے کا نام نہ لے تو پھر دونوں خاندانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قریبی رشتہ داروں سے دو آدمی ثالث مقرر کریں۔ ثالثوں کا دونوں طرف سے رشتہ دار ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف کھل کر بات چیت اور معاملات سلجھا سکتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ میاں بیوی اور خاندان کی عزت بھی سلامت رہ سکے گی۔ بالفاظ دیگر گھر کا معاملہ گھر ہی میں نمٹ جائے گا۔ اگر ثالث اور میاں بیوی اخلاص کے ساتھ معاملہ سدھارنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں ہمت اور توفیق نصیب فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان میں کون زیادہ قصوروار اور کون اخلاص کے ساتھ صلح کی کوشش کر رہا ہے؟

(عَنْ حَکِیْمِ بْنِ مُعَاوِیَۃَ الْقُشَیْرِیِّ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَاحَقُّ زَوْجَۃِ اَحَدِنَا عَلَیْہِ قَالَ اَنْ تُطْعِمَھَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَکْسُوَھَا اِذَا اکْتَسَیْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْہَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَھْجُرْ اِلَّا فِی الْبَیْتِ)

[رواہ ابو داؤد: کتاب النکاح، باب فی حق المراۃ علی زوجھا]

"حضرت حکیم بن معاویہ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم پر ہماری بیویوں کے کیا حقوق ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تو کھانا کھائے تو اسے بھی کھلائے جب تو کپڑے پہنے اسے بھی پہنائے منہ پر نہ مارے 'نہ گالی دے اور اسے نہ چھوڑ مگر گھر میں۔"

اس بات پر ذرا مزید غور فرمالیجئے کہ

مرد کے عورت سے افضل ہونے کی وجوہات مزید کیا ہیں؟

مرد کے عورت سے افضل ہونے کی وجوہات کثیر ہیں، ان سب کا حاصل دو چیزیں تو ہیں ہی یعنی علم اور قدرت۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد عقل اور علم میں عورت سے فائق ہوتے ہیں، اگرچہ بعض جگہ عورتیں بڑھ جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر ابھی بھی پوری دنیا پر نگاہ ڈالیں تو عقل کے امور مردوں ہی کے سپرد ہوتے ہیں۔ یونہی مشکل ترین اعمال سرانجام دینے پر انھیں قدرت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ مرد عقل و دانائی اور قوت میں عورتوں سے فَوقیّت رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ جتنے بھی انبیاء، خلفاء اور ائمہ ہوئے سب مرد ہی تھے۔ گھڑسواری، تیر اندازی اور جہاد مرد کرتے ہیں۔ امامتِ کُبریٰ یعنی حکومت و سلطنت اور امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت یونہی اذان، خطبہ، حدود و قصاص میں گواہی بالاتفاق مردوں کے ذمہ ہے۔ نکاح، طلاق، رجوع اور بیک وقت ایک سے زائد شادیاں کرنے کا حق مرد کے پاس ہے اور نسب مردوں ہی کی طرف منسوب ہوتے ہیں، یہ سب قرائن مرد کے عورت سے افضل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ مردوں کی عورتوں پر حکمرانی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد عورتوں پر مہر اور نان نفقہ کی صورت میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اس لیے ان پر حاکم ہیں۔ خیال رہے کہ مجموعی طور پر جنس مرد، جنس عورت سے افضل ہے نہ کہ ہر مرد ہر عورت سے افضل۔ بعض عورتیں علم و دانائی میں کئی مردوں سے زیادہ ہیں جیسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رض)، ہم جیسے لاکھوں مرد ان کے نعلین کی خاک کے برابر بھی نہیں۔ یونہی صحابیہ عورتیں غیر صحابی بڑے بڑے بزرگوں سے افضل ہیں۔

فَالصّٰلِحٰتُ: نیک عورتیں۔} نیک اور پارسا عورتوں کے اوصاف بیان فرمائے جارہے ہیں کہ جب ان کے شوہر موجود ہوں تو ان کی اطاعت کرتی اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں مصروف رہتی اور شوہر کی نافرمانی سے بچتی ہیں اور جب موجود نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔

نکاح کیسی عورت سے کرنا چاہیے؟

نکاح کے لیے عورت کے انتخاب کے وقت اس کی دینداری دیکھ لی جائے اور دین والی ہی کو ترجیح دی جائے۔ جو لوگ عورت کا صرف حسن یا مالداری یا عزت و منصب پیش نظر رکھتے ہیں وہ اس حدیث پر غور کرلیں، حضرت انس (رض) سے روایت ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو کسی عورت سے اس کی عزت کے سبب نکاح کرے، اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کی ذلت میں زیادتی کرے گا اور جو کسی عورت سے اس کے مال کی وجہ سے نکاح کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی محتاجی ہی بڑھائے گا اور جو اس کے حسب (خاندانی مرتبے) کے سبب نکاح کرے گا تو اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کے کمینہ پن میں زیادتی کرے گا۔ (معجم الاوسط، من اسمہ ابراہیم، ۱۸/۲، الحدیث: ۲۳۴۲)

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَہُنَّ : اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں ڈر ہو۔} اس آیت میں نافرمان عورت کی اصلاح کا طریقہ بڑے احسن پیرائے میں بیان فرمایا گیا ہے۔

شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں

عورت اور مرد دونوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں، اس سلسلے میں 5 احادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت عمرو بن احوص (رض) سے روایت ہے، حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”میں تمہیں عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، وہ تمہارے پاس مُقَیَّد ہیں، تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو البتہ یہ کہ وہ کھلم کھلا بے حیائی کی مُرتکب ہوں، اگر وہ ایسا کریں تو انھیں بستروں میں علیحدہ چھوڑ دو، (اگر نہ مانیں تو) ہلکی مار مارو، پس اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان کے خلاف کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تمہارے ذمہ کچھ حقوق ہیں۔ تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو تمہارے ناپسندیدہ لوگوں سے پامال نہ کرائیں اور ایسے لوگوں کو تمہارے گھروں میں نہ آنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ تمہارے ذمے ان کا حق یہ ہے کہ ان سے بھلائی کرو، عمدہ لباس اور اچھی غذا دو۔ (ترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حقّ المرأۃ علی زوجھا، ۲/۳۸۷، الحدیث: ۱۱۶۶)

(2)۔۔ حضرت معاذ بن جبل (رض) سے روایت ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”جب عورت اپنے شوہر کو دنیا میں ایذا دیتی ہے تو حورِعین کہتی ہیں: خدا عَزَّوَجَلَّ تجھے قتل کرے، اسے ایذا نہ دے، یہ تو تیرے پاس مہمان ہے، عنقریب تجھ سے جدا ہو کر ہمارے پاس آجائے گا۔ (ترمذی، کتاب الرضاع، ۱۹۔ باب، ۲/۳۹۲، الحدیث: ۱۱۷۷)

(3)۔۔ اُم المومنین حضرت ام سلمہ (رض) سے روایت ہے، سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”جو عورت اس حال میں مری کہ اس کا شوہر اس پر راضی تھا وہ جنت میں داخل ہو گئی۔

(ترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حقّ الزوج علی المرأۃ، ۲/۳۸۶، الحدیث: ۱۱۶۴)

(4)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”میں تمہیں عورتوں کے بارے میں بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں تم میری اس وصیت کو قبول کرو۔ وہ پسلی سے پیدا کی گئیں اور پسلیوں میں سے زیادہ ٹیڑھی اوپر والی ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے چلے تو توڑ دے گا اور اگر ویسی ہی رہنے دے تو ٹیڑھی باقی رہے گی۔ (بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء، ۳/۴۵۷، الحدیث: ۵۱۸۵)

(5)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”عورت پسلی سے پیدا کی گئی وہ تیرے لیے کبھی سیدھی نہیں ہوسکتی اگر تو اسے برتنا چاہے تو اسی حالت میں برت سکتا ہے اور سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ دے گا اور توڑنا طلاق دینا ہے۔ (مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء، ص ۵۷۷، الحدیث: ۶۱ (۱۴۶۸))

{ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ : پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں۔} یعنی جب گناہ کے بعد توبہ کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمالیتا ہے تو تمہیں بھی چاہیے کہ تمہاری زیردست عورت جب قصور کرنے کے بعد معافی طلب کرے اور نافرمانی چھوڑ کر اطاعت گزار بن جائے تو اس کی معذرت قبول کرلو اور توبہ کے بعد اسے تنگ نہ کرو۔

بیوی جب اپنی غلطی کی معافی مانگے تو اسے معاف کر دیا جائے

اس آیت سے ان لوگوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے جو عورت کے ہزار بار معذرت کرنے، گڑگڑا کر پاؤں پڑنے، طرح طرح کے واسطے دینے کے باوجود اپنی ناک نیچی نہیں کرتے اور صنف نازک کو مَشقِ ستم بنا کر اپنی بزدلی کو بہادری سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن بہادروں کو عاجزی اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عورت کی سربراہی

بعض نام نہاد دانشور غیر مسلموں سے متاثر ہو کر نا صرف اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ عورت کو مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہیے بلکہ وہ مغربی جمہوریت کی پیروی میں عورت کو ملک کا سربراہ بنانے میں حرج نہیں سمجھتے۔ اس کے لیے "سورۃ النمل" سے ملکہ سبا کی حکومت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایسے دانشور یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ مملکت سبا کی ملکہ بلقیس اس وقت تک ہی اپنے ملک کی حکمران رہی تھی جب تک وہ کافرہ تھی۔ جو نہی وہ اپنے وقت کے نبی حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر ایمان لائی تو اس نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد اس کی حکمرانی کا تاریخ میں ثبوت نہیں ملتا۔ کچھ لوگ جنگ جمل میں حضرت عائشہ (رض) کی سربراہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بھی انصاف کے ترازو پر پوری نہیں اترتی۔ کیونکہ حضرت عائشہ (رض) نے زندگی بھر کبھی مسلمانوں کی خلیفہ بننے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ تو شدید ہنگامی حالات میں مسلمانوں کے درمیان صلح کی غرض سے نکلی تھیں۔ لیکن حالات کی پیچیدگی میں پھنس کر رہ گئیں۔ اس لیے وہ زندگی بھر اپنے اس اقدام پر پریشان اور پشیمان رہیں۔ جب بھی قرآن مجید کی اس آیت (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) [الاحزاب: ۳۳] کی تلاوت کرتیں تو زار و قطار رویا کرتی تھیں۔ [طبقات ابن سعد]

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تمہارے حکام نیک ہوں، تمہارے اغنیاء سخی ہوں، اور تمہاری حکومت باہمی مشورہ سے ہو، تو تمہارے لیے زمین کے اوپر کا حصہ اس کے نچلے حصہ سے بہتر ہے اور جب تمہارے حکام بدکار ہوں، اور تمہارے اغنیاء بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے لیے زمین کا نچلا حصہ اس کے اوپر کے حصہ سے بہتر ہے۔ (سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۲۲۷۳)

حضرت ابوبکرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ کو فتح کی خوش خبری سنائی اور یہ بھی بتایا کہ دشمن کی سربراہی ایک عورت کر رہی تھی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مرد عورتوں کی اطاعت کرنے لگیں تو وہ تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے امام بخاری اور مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ (حافظ ذہبی نے بھی اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا ہے۔) (المستدرک ج ۴ ص ۲۹۱)

عورت کی حکمرانی اور اسلام

امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت حکومت یا انتظامیہ کی سربراہ یا قاضی نہیں بن سکتی 'کیونکہ سربراہ مملکت کو جہاد قائم کرنے اور مسلمانوں کے معاملات نمٹانے کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے اور قاضی کو مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے باہر جانے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت واجب الستر ہے اس کا گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ (شرح السنۃ ج ۱۰ ص ۷۷ 'مطبوعہ بیروت '۱۴۰۰ھ) عورت سربراہی کی اس لیے اہل نہیں ہے کہ حکومت اور سربراہی سے یہ غرض ہوتی ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے قومی معاملات کو سلجھایا جائے ملت کی جائے اور مالی محاصل حاصل کرکے ان کی مستحقین میں تقسیم کیا جائے اور یہ تمام امور مرد انجام دے سکتا ہے عورت یہ کام انجام نہیں دین سکتی کیونکہ عورت کے لیے مردوں کی مجالس میں جانا اور ان سے اختلاط کرنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ اگر وہ عورت جوان ہے تو اس کی طرف دیکھنا اور اس سے کلام کرنا حرام ہے اور اگر وہ سن رسیدہ عورت ہے تب بھی اس کا بھیڑ بھاڑ میں جانا مخدوش ہے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۴۵۸ 'ملخصا 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت)

بعض ملکہ بلقیس کی حکومت سے استدلال کرتے ہیں اس کا جواب

قرآن کریم میں ملکہ بلقیس کے واقعے کا جس قدر ذکر ہے اس میں اس کی حکومت کے خاتمہ کا ذکر ہے 'اسلام قبول کرنے کے بعد پھر اس کی حکومت کے تسلسل کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس واقعہ میں عورت کی سربراہی کا ادنیٰ جواز بھی موجود نہیں ہے اور اگر بالفرض بلقیس کے اسلام لانے کے بعد اس کی حکومت کو ثبوت ہو بھی تو وہ شریعت سابقہ ہے ہم پر حجت نہیں ہے۔

جنگ جمل کے واقعہ سے عورت کی سربراہی پر استدلال کا جواب

بعض متجدد علماء جنگ جمل میں حضرت عائشہ (رض) کی شرکت سے عورت کی سربراہی کے جواز پر استدلال کرتے ہیں لیکن یہ استدلال قطعاً باطل ہے اول تو حضرت عائشہ (رض) امارت اور خلافت کی مدعیہ نہیں تھیں ہاں وہ امت میں اصلاح کے قصد سے اپنے گھر سے باہر نکلیں لیکن یہ ان کی اجتہادی خطا تھی اور وہ اس پر تاحیات نادم رہیں 'امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عائشہ (رض) (آیت) "وقرن فی بیوتکن "تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو "کی تلاوت کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آپ کا دوپٹہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ (طبقات کبری ج ۸ ص ۸۱ 'مطبوعہ دار صادر بیروت)

مسائل

۱۔ پاک دامن، حیادار اور باپردہ۔ (المائدۃ: ۵، القصص: ۲۵)
۲۔ اللہ نے تخلیق میں مردوں کو کمال عقل، وسعت علم عظمت جسم وزیادتی قوت واستعداد سے عورتوں پر برتری عطا کی۔
۳۔ مرد کی برتری کا ایک سبب یہ بھی ہے مرد عورت کی ضروریات کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور کرنا چاہیے۔
۴۔ نیک عورتیں اللہ کی فرمانبردار اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنے مردوں کی غیر موجودگی میں مال وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔
۵۔ جن عورتوں کی بددماغی کی وجہ سے نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ۔

۶۔ زبانی سمجھانے پر نہ سمجھیں تو ان کے بستر الگ کر کے انہیں سوچنے کا موقع دو پھر بوقت ضرورت و مجبوری ان کی مناسب پٹائی کر کے سمجھاؤ۔

۷۔۔ اگر وہ مان جائیں اور درست ہو جائیں تو پھر انہیں طعنہ وغیرہ دے کر پریشان نہ کرو۔

۸۔۔ بلاوجہ تم اپنے ماتحتوں پر زیادتی نہ کرو۔ کہ اللہ تم پر غالب ہے اور وہ سزا و جزا دے سکتا ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

لغۃ القرآن:

[وَاِنْ : اور اگر] [خِفْتُمْ : تمہیں خوف ہو] [شِقَاقَ بَيْنِهِمَا : ان دونوں کے درمیان باہمی مخالفت کا] [فَابْعَثُوْا : تو کھڑا کرو] [حَكَمًا : ایک منصف] [مِّنْ اَہْلِہٖ : اس (مرد) کے گھر والوں سے] [وَحَكَمًا : اور ایک منصف] [مِّنْ اَہْلِہَا : اس (عورت) کے گھر والوں سے] [اِنْ يُّرِيْدَآ : اگر وہ دونوں ارادہ کریں گے] [اِصْلَاحًا : اصلاح کرنے کا] [يُّوَفِّقِ : تو مطابقت پیدا کرے گا] [اللّٰہُ : اللہ] [بَيْنَہُمَا : ان کے درمیان] [اِنَّ اللّٰہَ : یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [خَبِيْرًا : باخبر]

ترجمہ:

اور اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان مخالفت کا اندیشہ ہو تو تم ایک منصف مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے مقرر کر لو، اگر وہ دونوں (مُنصِف) صلح کرانے کا ارادہ رکھیں تو اللہ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرما دے گا، بیشک اللہ خوب جاننے والا خبر دار ہے

تشریح:

اصلاح احوال کی کوشش

یعنی جب دیکھو کہ شوہر کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں اور معاملہ جدائی اور افتراق تک پہنچا چاہتا ہے تو اب میاں بیوی کے قبیلہ برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اس کی عملی صورت یہ ہو کہ ایک پنچ میاں کے رشتہ داروں سے منتخب کیا جائے۔ دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسااوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیر خواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں خطاب جمع کے صیغے سے ہے جس کے مخاطب میاں بیوی کے خاندان بھی ہو سکتے ہیں اور پورا اسلامی معاشرہ بھی جن کی نمائندہ حکومت ہوتی ہے۔ یہ تینوں درجہ بدرجہ اس کے مکلّف ٹھہرائے گئے ہیں۔ ہمارے فقہائے کرام نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ جو ثالث مقرر کیے جائیں گے ان کے اختیارات کیا ہوں گے ؟ جو بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر تو میاں بیوی انھیں صرف اس لیے منصف مان رہے ہیں کہ وہ جانبین کے معاملات سن کر صرف مشورہ دیں یا تصفیہ کی کوئی سفارش کریں تو ایسی صورت میں یقیناً ان کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہوں گے۔ ہاں ! اگر زوجین نے انھیں طلاق یا خلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے میں اپنا وکیل بنایا ہو تو اب ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہو گا اور اگر یہ معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو پھر حضرت عثمان (رض) اور حضرت علی (رض) کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات حکم مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے انھیں حاکمانہ اختیارات بھی دیتے تھے۔ حضرت عقیل ابن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عقبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان کی عدالت میں پیش ہوا تو انھوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابن عباس کو اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو پنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان دونوں کے درمیان تفریق کر دینا ہی کافی ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علی نے حکم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملادیں اور چاہیں جدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطور خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے البتہ اگر میاں بیوی اس پر راضی ہوں یا عدالت ان کو مقرر کرتے وقت اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہو گا۔ گزشتہ دونوں آیات پر اگر آپ مجموعی طور پر تدبر کی نگاہ ڈالیں تو دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ میاں بیوی کا باہمی رشتہ اور تعلق انتہائی نزاکت احساس کا حامل ہے۔ اسی طرح ان کے باہمی اختلافات نہایت خطرناک نتائج کا سبب بن سکتے ہیں۔ بنابریں یہ ضروری ہے کہ ان اختلافات کو حتی الامکان باہر نکلنے اور لوگوں کی زبانوں پر چڑھنے سے روکا جائے۔ اس لیے سب سے پہلے تو یہ حکم دیا کہ شوہر اپنے تینوں اختیارات یکے بعد دیگرے استعمال کر کے گھر ہی میں اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر یہ معاملہ ان کے اپنے قابو سے نکل گیا ہے تو پھر دونوں گھروں کے ذمہ دار لوگ اس میں مداخلت کریں اور جانبین میں سے ایک ایک حکم مقرر کر کے خاندانوں ہی میں ان اختلافات کو حل کر کے دفن کر دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر معاملہ عدالت تک پہنچنا ناگزیر ہو جائے تو پھر عدالت کے معاملے میں بھی اسلام کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی میاں بیوی کے خاندانوں کے ذمہ دار لوگوں کے واسطے سے ان اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت فاروق اعظم (رض) نے اپنے قاضیوں کے نام ایک فرمان جاری فرمایا تھا اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا تھا :

ردواالقضاء بین ذوی الارحام حتی یصطلحوا فان فصل القضاء یورث الضغائن

(رشتہ داروں کے مقدمات کو انھیں میں واپس کر دو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکالیں کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ و عداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے)

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میاں بیوی کا تعلق ایک گھر کو بسانے یا اجاڑنے کا باعث ہے۔ اس کی کامیابی سے خاندان وجود میں آتا ہے اور اسی خاندان کی ترقی یافتہ صورت مسلمان معاشرہ اور اسلام کا سیاسی نظام ہے۔ اس لیے تمام دینی اور شیطانی قوتوں کا ہمیشہ یہ ہدف رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس رشتے میں دراڑیں پیدا کریں۔ چنانچہ اس شیطانی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے وہ اپنی تمام ممکن مساعی کو صرف کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں کیونکہ ایک گھر اجاڑنے میں ان کی کامیابی درحقیقت اسلامی معاشرے کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس کبھی کبھی سمندر میں پانی کی سطح پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنا دربار منعقد کرتا ہے، اس کے تمام کارندے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ ابلیس ان سب سے ان کی کارکردگی کی رپورٹیں سنتا ہے۔ ایک چیلا اپنی کارگزاری سناتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد کی طرف جارہا تھا میں نے درمیان میں اس کو ایک ایسے کام میں پھنسا دیا جس سے اس کی نماز چھوٹ گئی ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ اسی طرح ہر چیلا مختلف لوگوں کے گمراہ کرنے اور اچھے کام روکنے کی کارگزاری سناتا ہے، ابلیس سب کو شاباش دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک چیلا آکر بیان کرتا ہے کہ دو میاں بیوی باہمی اتفاق اور محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے میں نے جا کر ایک ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں دونوں میں لڑائی ہو گئی اور لڑائی کے نتیجے میں دونوں میں جدائی واقع ہو گئی۔ ابلیس یہ سنتے ہی خوشی کے مارے تخت پر کھڑا ہو جاتا ہے اس چیلے کو گلے لگاتا اور معانقہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو صحیح معنی میں میرا نمائندہ ہے اور تو نے جو کام کیا وہ اصل میں حقیقی کارنامہ ہے جس پر مجھے فخر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ گھر کی آسودگی اور اس کا پرسکون ماحول خاندان کی بقا اور اس کے کردار کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت ہے۔ اس لیے شریعت نے خاتون خانہ پر آخری ذمہ داری یہ ڈالی ہے کہ مرد جب تک بیرون خانہ اپنی ذمہ داریوں اور اجتماعی فرائض ادا کرنے میں مشغول ہے وہ گھر اور اہل و عیال کے تمام امور کی نگران بنائی گئی ہے اور اس کے بارے اسے عنداللہ جوابدہی بھی کرنا ہو گی کیونکہ اگر وہ ذمہ داری ادا کرنے میں تساہل یا تغافل کا ثبوت دے گی تو گھر کے معاملات بگڑ جائیں گے۔ بچوں کی تربیت متاثر ہو گی۔ نتیجتاً شوہر گھر میں الجھ کر باہر کی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

اَلْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیتِ زَوجِھَا وَھِیَ مَسْئُولَۃٌ

(عورت اپنے خاوند کے گھر پر نگران ہے اور جوابدہ ہے)

اس اعتبار سے عورت کی بڑی ذمہ داری گھر کی تنظیم بچوں کی تربیت اور خاندان کے وقار کی حفاظت ہے اور ایسا ہی خاندان ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ہے جہاں ایک زندہ اولوالعزم اور آبرومند قوم وجود میں آتی ہے۔ (روح)

واقعہ

یہ واقعہ سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی اس طرح مذکور ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں جب یہ حکم تجویز کر دیے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا

کرنا ہے ؟ سن لو ! اگر تم دونوں میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہو جاؤ تو ایسا ہی کرلو اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہو سکتی یا قائم نہیں رہ سکتی اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہو جائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حکم قانون الٰہی کے موافق جو فیصلہ کریں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے۔ لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی حکم کو ایسا ہی اختیار دینا چاہیے جیسا عورت نے دیدیا۔

فیصلہ مقدمات کا آسان طریقہ

قرآن کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا، جس کے ذریعہ عدالت وحکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ برادریوں کی پنچایت میں ہو سکتا ہے۔

دوسرے جھگڑوں میں پنچائیت کے ذریعہ صلح کرائی جائے :

حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ باہم صلح کرانے کے لیے دو حکموں کے بھیجنے کی یہ تجویز صرف میاں بیوی کے جھگڑوں میں محدود نہیں، بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور لینا چاہیے، خصوصاً جب کہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز ورشتہ دار ہوں، کیونکہ فیصلوں سے وقتی جھگڑا تو ختم ہو جاتا ہے، مگر وہ فیصلے دلوں میں کدورت وعداوت کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم نے اپنے قاصدوں کے لیے یہ فرمان جاری فرمادیا تھا کہ : ردالقضاء بین ذوی الارحام حتی یصطلحوا فان فصل القضاء یورث الضغائن (معین الحکام، ص 214) رشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں واپس کردو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ وعداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔

فقہائے حنفیہّ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن سحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو ایسے پنچایتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت وحکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کردیا کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے، کیونکہ باہمی کدورت اور عداوت سے سب ہی مسلمان کو بچانا ہے، اس لیے حکام اور قضاۃ کے لیے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کرلیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔

حسن نیت کا صلہ

یعنی اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرادے گا بیشک اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم اور اطلاع ہے۔ رفع نزاع اور حصول اتفاق کے اسباب اور کیفیات اس کو خوب معلوم ہیں اس لیے نزاع زوجین کے رفع ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی انشاء اللہ۔

منصفین کے اختیارات

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا مجھے اور معاویہ (رض) کو پنچ بنا کر بھیجا گیا اور ہم سے کہہ دیا گیا کہ تمہاری رائے میں نبھاؤ ممکن ہو تو ملاپ کرا دینا اور جدائی بہتر ہو تو علیحد گی کرا دینا۔ حضرت عثمان (رض) نے (اپنے دور خلافت) میں یہ حکم دیا تھا۔ جمہور کا مسلک ہے کہ جب تک مرد طلاق کا اور عورت خلع کا اختیار نہ دیں پنچ از خود نہ تفریق کرا سکتے ہیں نہ خلع۔ بغیر اختیار دیئے تو ان کا فرض سلجھاؤ کرانا اور بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے اگر دونوں میں سے کوئی اپنی ضد پر قائم رہے تو پنچوں کا کام یہ ہے کہ حاکم کو اپنی تحقیقات کی رپورٹ کر دیں اور حاکم شوہر کو حسن سلوک کے ساتھ اور دستور کے مطابق عورت کو رکھنے یا طلاق دینے کا حکم دے اور عورت کو مجبور کرے کہ وہ یا مرد کی نافرمانی چھوڑ دے یا خلع کرالے اور بدل خلع ادا کرے۔ رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فیصلہ تو اس میں صاف موجود ہے کہ آپ نے شوہر سے فرمایا جب تک تو ایسا اقرار نہ کرے جیسا عورت نے کیا ہے۔ تیسرا قول غلط ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ طلاق کے لیے مرد کی رضامندی شرط ہے پنچوں کو از خود طلاق و تفریق کا اختیار نہیں ہے۔ اگر پنچ از خود ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ تفریق نافذ نہ ہو گا۔

توالد و تناسل کی صلاحیت میں فرق

ضرورت مند کے لیے یہ امر مخفی نہیں کہ خداوندی حکمت کا مقتضاء ہے کہ مرد و عورت کے مابین نوع انسانی کا توالد و تناسل ہوتا ہے اس کے افراد بڑھتے رہیں اور اس طرح پر یہ نوع جب تک خدا کو منظور ہو باقی رہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی نقیض ثابت ہو گی اور ہمارے ذمہ واجب ہو گا کہ مختلف ذریعوں سے توالد و تناسل کی تقلیل اور انسان کے نیست و نابود کرنے میں کوشش کریں، حالانکہ یہ بات واقع کے خلاف ہے، اب یہ دیکھئے کہ توالد و تناسل مرد کے حاملہ کرنے اور عورت کے تخم سے انجام پاتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مرد میں حاملہ کرنے کی ہمیشہ صلاحیت باقی رہتی ہے اگرچہ سو برس کا کیوں نہ ہو جائے اور اس عمر کو پہنچ جانا ممکن بلکہ موجود ہے کوئی نادر بات نہیں، یہاں تک بعض حکماء اس کے قائل ہیں کہ اگر انسان کو موت جلدی ہی نہ آ گھیرے تو اس کی خلقت اور قدرتی ساخت کا مقتضا یہ ہے کہ سو برس تک زندہ رہے، (بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ انسان کی عمر طبعی ایک سو بیس برس کی ہے) رہی عورت پس چونکہ جنین کا بار اٹھانے، وضع حمل کی مصیبت برداشت کرنے اور دودھ پلانے اس کی قوت ضائع ہو جاتی ہے اور ان سب باتوں کی وہ اسی وقت متحمل ہو سکتی ہے جب کہ اس کا جسم اس قدرت قوت کو پہنچ جائے۔ لہٰذا خداوندی حکمت اس بات کو مقتضی ہوئی کہ عورت میں بچہ جننے کی استعداد سن احتلام (سن بلوغ) سے لے کر پچاس برس کے سن تک ہے اس میں بچہ جننے کی قابلیت رہ سکتی ہے، اور یہاں سے چونکہ اس کی طبعی قوت زائل ہونا شروع ہوتی ہے اس لیے باری تعالیٰ حمل کو اس سے روک دیتا ہے اور اس کا خون حیض منقطع کر دیتا ہے جو کہ جنین کی غذا ہے اور بمقتضائے لطف و احسان تخم سے جس سے بچہ بنتا ہے اس کو محروم کر دیتا ہے۔

پس عورت میں بچہ جننے کی قابلیت کل پنتیس سال رہتی ہے اس لیے اکثر وہ پندرہ برس میں بالغ ہوتی ہے اور جب یہ بات ٹھہر چکی تو اب ہم کہتے ہیں کہ عورت اپنے بچہ جننے کی قابلیت کی مدت میں جب بالغ مرد کے پاس رہے گی تو خواہ اس کی عمر کا کوئی زمانہ کیوں نہ ہو تو مرد میں برابر حاملہ کرنے کی استعداد پائے گی، اور وہ اس امر سے قاصر نہ رہے گا، ہاں اگر کوئی غیر طبعی و عارضی سبب ہو جائے تو بات ہی دوسری ہے۔ رہا مرد اس کی یہ حالت ہے کہ جب وہ عرت کے پاس دونوں کے بالغ ہو جانے کے بعد رہے اور ایک ہی عورت کا ہو رہے تو بسا اوقات اسے اپنی

عمر کی کچھ مدت نسل سے معطل رہناپڑے گا، اپنی تخم ریزی کا کوئی نتیجہ حاصل نہ کر سکے گا، بیان اس کا یہ ہے کہ اگر دونوں ایک دوسرے کے پاس رہنادونوں کے ابتدائے بلوغ سے فرض کیاجائے تو عورت کے سن ایاس تک دونوں سے توالد وتناسل ہو نا ممکن ہے اور اس کے سن ایاس کو پہنچنے کی مدت پچاس.برس ہیں۔ پس اگر دونوں ساٹھ.برس تک زندہ رہیں گے تو مرد پر عورت دس.برس معطل رہے گی یعنی عورت کی وجہ سے مرد کو دس.برس تک معطل رہناپڑے گا، اگر دونوں ستر.برس جئیں گے تو مرد پر بیس سال معطل رہے گی، اسی طرح یہاں تک کہا جاسکتاہے کہ اگر دونوں سوبرس جئیں تو مرد پر اس کو پچاس.برس معطل رہناپڑے گا، وار ایساہی اس وقت بھی کہا جاتاہے کہ جب مرد عورت دونوں ہم سن ہوں اور عورت سن ایاس کو پہنچ گئی ہو اور اس وقت کسی وجہ سے دونوں میں مقارنت ہوئی ہو اور جب یہ صورت لی جائے کہ سن کے اعتبار سے دونوں میں مخالفت ہو تو مرد کو عورت سے.بڑا فرض کرنے کی بناء پر غالب یہ ہے کہ عورت اس وقت بھی مرد پر معطل ہی رہے گی حتیٰ کہ اگر یہ بھی فرض کرلیاجائے کہ جس وقت عورت اور مرد میں مقارنت ہوئی ہے اس وقت مرد پچاس کا اور عورت پندرہ.برس کی تھی اور پھر دونوں کی عمر سو.برس کی ہوئی تب بھی عورت مرد پر پندرہ.برس تک معطل رہے گی، لیکن اگر عورت عمر میں مرد سے.بڑی فرض کی جائے تو اب مرد کا بہت.بڑا نقصان ہو گا اور اسوقت معطل رہنے کا زمانہ مرد و عورت کے سن بلوغ کے فرض کرنے کے اعتبار سے متفاوت نکلے گا اور زیادہ سے زیادہ جو یہاں متصور ہو سکتاہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی سبب سے اس وقت مرد و عورت میں مقارنت ہوئی ہو جب کہ مرد پندرہ.برس کا اور عورت کا سن ایاس سے کچھ پہلے ہو۔ پس اگر یہ عورت اس سے مرد سے ایک بچہ جن کر آئسہ ہو جائے گی تو مرد کی سو.برس کی عمر فرض کرنے کی بناء پر عورت پچاس.برس تک اس پر معطل رہے گی۔

ایک سے زائد شادیاں

پس اگر مرد کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ مقارنت کے مباح کرنے کے سوائے اس تفاوت کے اور کوئی سبب مقتضی نہ ہوتا تب بھی یہ بالکل کافی تھا اس لیے کہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ مرد اپنی تولید کے قابلیت کے زمانہ میں عورت پر ایک دن بھی معطل نہیں ہوتا اور وہ بھتیرے.برسوں تک اس پر معطل رہتی ہے پس مرد کے لیے ایک سے زیادہ مقارنت مباح کر دینے سے اسے جو معطل رہنے کا احتمال تھا اس کا تدراک کرنا ممکن ہو گا۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ بنظر اس کے کہ خدا نے بخلاف عورت کے مرد ہی کو کمانے کی قوت اور اس کے شدائد کے تحمل کی طاقت عنایت کی ہے۔ اس لیے مرد ہی اہل و عیال کا خبر گیراں قرار دیا گیاہے اور عورت کے نان نفقہ کا سامان بھی اسی کے ذمہ ہے اور اس کے مقابل میں عورت کے متعلق یہ کام کیا گیاہے کہ خانہ داری کا انتظام اور اولاد کی پرورش کرے اور یہ بات انسان کے لیے ایک طبعی امر کی طرح ہو رہی ہے اور بعض جو اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ نظام خداوندی اور اس طریق کے خلاف چلتے ہیں جس کے ساتھ عام طور پر طبعیتیں مالوف ہو رہی ہیں اور یہی معلوم ہے کہ محتاج اور ایسے لوگ جو زوجہ کے نان و نفقہ کے بار اٹھانے سے قاصر ہیں بہ نسبت مالداروں کے جو اس کی قدرت رکھتے ہیں اکثر ممالک میں بکثرت ہیں۔ اگرچہ بعض بعض ممالک میں سب سے قریب قریب درجہ کے مالدار بھی موجود ہیں۔

پس جو ممالک پہلی قسم کے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کے بھتیرے محتاج آدمی عورت کے نان و نفقہ کے بار اٹھانے کے خوف سے شادی نہیں کرتے بلکہ عادل شریعت جب وہ اپنی نسبت یہ جانتے ہوں کہ نان و نفقہ سے عاجز ہونے کے باعث وہ عورت کی حق تلفی کریں گے تو ان کو شادی کرنے سے روکتی اور منع کرتی ہے اور بعض ائمہ کے نزدیک تو جبکہ خاوند عورت کے نان و نفقہ سے عاجز ہو تو اس ظلم کے دفع

کرنے کے لیے جس کو عقلیں ناگوار سمجھتی ہیں حاکم کو یہاں تک حق حاصل ہے کہ ان دونوں میں تفریق کردے اور ان ایام میں ہم ایسے عاجز مردوں کی زیادہ تعداد دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ فوجی آدمیوں کو ملالیں تو مجرد آدمیں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ فوج میں نوکری کرنے والے اس خوف سے شادی کرنے سے باز رہا کرتے ہیں کہ فوجی کام کی انجام دہی کے زمانہ میں انھیں اپنی زوجہ کو بلاکسی خبر گیراں کے چھوڑ ناپڑے گا۔ پس جب مرد کے لیے ایک عورت سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا جائز نہ رکھا جائے گا تو وہ عورتیں جو ان مجرد مردوں کے مقابلہ میں بچیں گی توالد و تناسل سے معطل رہیں گی اور جو خداوندی حکمت نوع انسانی کی زیادتی اور اس کے ازدیار کے باقی رکھنے کے بارہ میں تھی وہ باطل ہو جائے گی۔ لیکن جب مرد کے لیے یہ بات مباح کردی جائے کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکے تو جو لوگ نان ونفقہ پر قدرت رکھتے ہوں گے تو وہ عورتوں کی اس تعداد میں سے جو نسل سے معطل ہونے کو تھیں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکیں گے اور اس وقت ان بے چاروں میں جو توالد و تناسل کی استعداد پائی جاتی تھی وہ ضائع نہ جائے گی وار نظام خداوندی مختل ہونے سے محفوظ رہے گا اور بغیر اس کے ان مصیبت زدہ عورتوں کی اسی طرح عمر گزر جائے گی اور نوع انسانی کو اس سے ثمرہ حاصل نہ ہو سکے گا جو کہ یادگار رہ سکے۔ بسااوقات یہاں تک نوبت پہنچ جائے گی کہ ایک سال تو مرد کے لیے بہتیری عورتوں سے شادی کرنا جائز کر دیا جائے گا اور اس کے بعد والے سال میں اس سے روکنا پڑے یا اس کے بالعکس معاملہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ مملکت ایک ہی سال میں مالدار ہو جائے اور پھر محتاج بھی بن جائے یا اس کا الٹا معاملہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس مرتبہ کے نہیں ہو سکتے کہ آئے دن بدلا کریں اور ان میں تبدل و تغیر کے ایسے ابواب نہیں کھل سکتے جس سے خود غرض اور شہوت راں انسان ان احکام کو کھیل بنا سکیں۔ پس تقریر سابق سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہو متعدد زوجات کا جائز ہونا ہی امر طبعی اور عقل سلیم کے موافق ہے۔

نان و نفقہ سے عاجزی آدمی شادی کرنے سے باز رہا کرتا ہے اور جو اس پر قادر ہوتا ہے وہ اس پر پیش قدمی کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تلاش و استقرار سے کسب معاش کے چار ہی قسم کے عادی ذریعے نکلتے ہیں، حکومت، تجارت، صناعت اور زراعت۔ پس گو یا باری تعای نے ہر ہر سبب کے مقابلہ میں ایک ایک زوجہ جائز رکھی۔ پس جب کسی مرد کو سارے اسباب میسر آجائیں گے تو وہ چار عورتوں کو رکھ سکے گا، اور جب ان ذرائع میں سے کوئی ذریعہ اس سے مفقود ہو جائے تو وہ تین ہی عورتوں پر اقتصار کرے گا۔ یہاں تک کہ جب کسی سے سارے ذرائع مفقود ہو جائیں تو وہ شادی نہ کرے اور یہ امر مالداروں کے حوالہ کردے اور جب کسی کو ایک ہی ذریعہ سے اس قدر فراغت نصیب ہو جائے کہ دوسرے ذریعہ کے قائم مقام ہو سکے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو تو وہ بقدر اپنی وسعت کے شادیاں کر سکے گا، مرد کو لونڈیوں میں سے چار سے زیادہ عورتوں کو سریہ بنانا (یعنی ان کو جماع کے لیے متعین کرلینا کیوں جائز کیا گیا، اس لیے کہ ایسی عورتیں جس مملکت میں لائی جاتی ہیں وہاں ان کے مقابلہ میں مردوں کی تعداد نہیں پائی جاتی۔ پس جس حالت میں نادار لوگ ان کے مالک بننے کی قدرت نہیں رکھتے اور مالداروں کے لیے بھی ان میں سے کئی عورتیں جائز نہ ہوتیں تو وہ نسل سے معطل رہ جاتیں۔ پس مالداروں کے لیے لونڈیوں میں سے کئی عورتیں جائز نہ ہونا عین حکمت ہے اور اس قدر بیان سوچنے سمجھنے والے آدمی کے لیے بالکل کافی معلوم ہوتا ہے۔

اجنبی مردوں سے پردہ

اجنبی مردوں سے پردہ کرنا تو ایک ایسی بات ہے جسے عقل سلیم ضروری سمجھتی ہے اور جو کہ انسانیت، نظام خداوندی اور قانون طبعی سب کے نزدیک مستحسن ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ ہم پیشتر ذکر کر چکے ہیں یہ نان و نفقہ کے سامان کی تکلیف طبعی طور پر مرد ہی کو دے دی گئی ہے۔

رہی عورت وہ صرف انتظام خانہ داری اور اولاد کی پرورش کی مکلّف ہے اور یہی علی العموم مالوف طریقہ ہے اور اسی کو عقلیں بھی مستحسن شمار کرتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط میں بے حیائی کے ارتکاب کرنے کے بہت سے سبب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ دونوں طرف سے اس کا پورا مقتضی موجود ہوتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ دیکھنے بھالنے کو اس امر قبیح کے ارتکاب میں بڑا دخل ہوتا ہے جس کو کہ تمام شریعتیں حرام بتاتی ہیں اور عقلیں برا سمجھتی ہیں کیونکہ اس سے نسب مختلط ہو جانے میں اور باہمی ہمدردی کو ضعف لاحق ہوتا ہے اور اس کی برائی اس قدر ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں اور اس کے ثبوت میں اتنا ہی کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بہت سی امتوں کو اس فعل شنیع کے ارتکاب کے باعث سے ہلاک کر ڈالا ہے۔

پس جس قانون سے کہ اس کی کثرت رک سکتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ اجنبی مردوں اور عورتوں کو باہمی اختلاط سے روکا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ امر بغیر اس کے کہ دونوں میں سے ایک فریق کو گھر کے رہنے کا پابند کر دیا جائے انجام نہیں پاسکتا، اور جب ہم مردوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو گھر کے باہر تمام مصارف خانہ داری حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے اس لیے وہ تو گھر میں رہنے کے پابند نہیں کیے جاسکتے البتہ بنظر اس کے کہ عورتیں خانہ داری کے اندرونی انتظامات کی مکلّف ہیں تو گھروں کے اندر رہنے کا پابند ہونا انہی کے مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس کام کی عورتیں مکلّف ہیں یہ اس کے موافق ہے۔ پس عورتوں کا گھر کے اندر ہی رکھنا عین حکمت ہے اور اگر کہا جائے کہ عورتوں کو گھروں کے اندر ہی رکھنے سے ان کو ضرر پہنچے گا تو ہم کہیں گے کہ اس سے کیسا کچھ ضرر کیوں نہ فرض کر لیا جائے لیکن مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے جو ضرر ہوگا وہ ضرر اس سے کہیں بڑھ کر اور نہایت شدید ہوگا اور دو ضرروں میں ادنی سے درجہ کے ضرر کا ارتکاب کر لینا معقول بات ہے اور شرع کے بھی موافق ہے اس لیے شریعت نے عورتوں پر پردہ کا حکم لگایا ہے اور یہ حکم عورتوں کی مصلحت کے جس کی کہ وہ مکلّف ہیں اور نیز نوع انسانی کی مصلحت یعنی حفاظت نسب کے بالکل موافق ہے۔

علاوہ بریں جو عورتیں اپنے بچپن سے پردہ میں پڑی ہوئی ہیں ان پر تو اس ضرر کا نام ونشان بھی نہ پایا جائے گا اور یہ اس لیے کہ یہ امر ان کی عادت مالوفہ میں داخل ہو جائے گا اور یہ مخفی نہیں کہ عادت سے ایسی ایسی چیزیں قبول کر لینے کی انسان میں قابلیت آجاتی ہے جن سے کہ عادت نہ ہونے کی صورت میں وہ بالکل عاجز ہوتا ہے۔ پس ہم عورتوں کو جو پردہ کی عادی ہو رہی ہیں دیکھتے ہیں کہ وہ پردہ میں رہنے پر فخر کرتے ہیں اور اس کو اپنی آبرو کی حفاظت کا بہت بڑا سبب شمار کرتی ہیں اور بے پردہ عورتوں کو جو پردہ کا خیال نہیں کرتیں اور ان کے بے حیائی اور اپنی آبرو کی حفاظت نہ کرنے کی جانب منسوب کرتی ہیں اس کی وجہ سوائے اس کی اور کچھ نہیں کہ وہ پردہ کی عادی ہو رہی ہیں اور اس کے ساتھ مالوف ہو گئی ہیں اور بے پردگی کے ساتھ پھرنے سے پردہ کو انھوں نے اپنے حق میں بہتر پایا ہے، پس جب یہ بات ظہری تو ظاہر ہو گیا کہ عورتوں پر پردہ کا حکم ان کے حقوق کو تلف نہیں کرتا اور نہ ظلم و سنگدلی شمار کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ طلاق

رہا طلاق کا مسئلہ اب ہم ایسی تقریر بیان کرتے ہیں جس سے یہ امر مدلل ہو جائے کہ طلاق کا جائز ہونا عقل کے موافق ہے منع کرنا نظام خداوندی وار ترتیب طبعی کے منافی ہے سوائے اپنی بڑائی کے زعم میں ہٹ دھرمی کرنے والے کے اس کو کوئی مخالف نہیں ہو سکتا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ اس رسالہ کے شروع میں پیشتر یہ بات بیاں ہو چکی ہے کہ حکمت الٰہی اس امر کو مقتضی ہے کہ نوع انسانی میں توالد و تناسل جاری ہے اور اس کی کثرت ہوتی رہی اور یہ کہ مرد میں سن احتلام سے لے کر مرتے دم تک تولید کی استعداد و قابلیت رہتی ہے اور عورت میں سن احتلام

سے لے کر صرف ایاس ہی تک تولید کی قابلیت پائی جاتی ہے اس کے بعد نہیں رہتی اور اس مدت کی کل مقدار پنتیس سال ہوتے ہیں پس جب خاوند زوجہ میں مقارنت ہو اور ان دونوں میں توالد و تناسل نہ پایا جائے اور یہ بہت ہوتا ہے تو اس صورت میں اتنے احتمال ہوں کہ اس کا مانع یا تو خاوند کی جانب سے ہے پس جس حالت میں طلاق ممنوع ہو تو ان دونوں کی ساری عمر بلا نسل کے گزر جائے گی اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں تولید کی استعداد موجود ہو گی تو اسے نسل سے ناحق معطل رہنا پڑے گا، اور کبھی کبھی اس معطل رہنے کی مدت پچاسی برس تک متصور ہو سکتی ہے لیکن جب طلاق جائز ہو گی تو وہ کچھ دن صبر کرنے کے بعد اس عورت کو طلاق دے کر دوسری عورت سے مقارنت کر سکے گا، اور اس عورت کو بھی دوسرے مرد سے مقارنت کرنا ممکن ہو گا۔

پس ان دونوں میں سے جس تولید کی استعداد ہو گی اس وقت وہ نسل سے کامیاب ہو سکے گا اور معطل نہ رہے گا، اور جس میں استعداد نہ ہو گی اس پر اپنی حقیقت حال کے ظاہر ہو جانے سے اس کے دل و کراحت نصیب ہو جائے گی، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں میں تولید نسل کی استعداد موجود ہوتی ہے لیکن ان دونوں کے آلہ تناسل متوافق نہیں ہوتے۔ پس جب دونوں میں مفارقت ہو جائے گی تو ان میں سے ہر ایک کو ممکن ہو گا کہ کسی دوسرے سے مقارنت کر کے نسل حاصل کر سکے اور اپنی تولید کی استعداد کے ثمرہ سے محروم نہ رہے۔ جب مرد اس عورت کو طلاق دینے میں توقف کرنا چاہے جو کہ اس سے حاملہ نہیں ہوئی تو اسے (تعدد ازواج) کی بناء پر ممکن ہو گا کہ اس بات کے ظاہر کرنے کی غرض سے حمل کا مانع کس کی جانب سے ہے کسی دوسری عورت سے مقارنت کرلے۔ پس اگر وہ مانع زوجہ کی جانب سے ظاہر ہو تو اس عورت میں اگر وہ چاہے گا تو اسے بدستور عقد میں باقی رہنے دے اور اس فضل و احسان کو جو اس کے اور زجہ کے مابین ہے نہ بھولے۔ اس لیے کہ اب اس کے طلاق دینے سے کیا فائدہ۔ کیونکہ وہ دوسرے سے مقارنت کر کے نسل تو حاصل کر ہی نہیں سکتی اس لیے کہ اس میں سبب مانع حمل موجود ہے، اب اس کے حق میں یہ خاوند اور دوسرا شخص دونوں برابر ہیں، اس لیے اگر خاوند چاہے تو اسے اپنے پاس رہنے دے) اور اگر یہ ظاہر ہو کہ حمل کا مانع خود اسی خاوند کی ہی جانب سے ہے تو اسے اس عورت کے اپنے پاس رکھنے کا اختیار ہے اور ہم قانون سابق کے مقتضا کے موافق نہیں یہ کہہ سکتے کہ اسے اس وقت طلاق دینا واجب ہے تاکہ وہ عورت دوسرے سے مقارنت کر سکے۔ کیونکہ اس عورت میں استعداد تولید کا پایا جانا ہی متیقن نہیں ہے بلکہ اس میں شک ہے کہ کیونکہ ممکن ہے کہ عورت میں بھی استعداد تولید موجود نہ ہو اور احکام شک پر مبنی نہیں ہوا کرتے۔

پھر جب کبھی طلاق کے جائز کیے جانے کا ایک اور بڑا مہم اور ضروری سبب پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ خاوند زوجہ میں نفرت پیدا ہو جائے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی مزمن مرض کا لاحق ہو نا بد صورت ہو جانا، آلہ تناسل کا معطل ہونا، عورت کا اپنے خاوند کی اولاد کے نسب محفوظ رکھنے کے بارہ میں اس طرح سے اس سے خیانت کرنا کہ اس کو خاوند ظاہر نہ کر سکتا ہو اور حاکم کے روبرو ثابت کرنا اسے ممکن نہ ہو۔ پس اگر طلاق ممنوع ہو گی تو اس حالت میں دونوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی، اور دونوں کے دونوں اپنی تمام عمر اس تلخی کا مزہ چکھتے رہیں گے اور ان دونوں کی آنکھوں میں فساد اور بے حیائی کے دروازے کھل جائیں گے لیکن جب طلاق جائز ہو گی تو دونوں اس تنگی سے اس بے لطفی سے چھٹکارا پانے کا قصد کریں گے اور بے حیائی کے ارتکاب سے اور نیز دیوث بننے سے محفوظ اور پاک اوصاف رہ سکیں گے۔

طلاق کا اختیار خاوند کو کیوں ہے

باقی رہا یہ امر کی طلاق صرف خاوند ہی کے ہاتھ میں کیوں رکھی گئی عورت کے اختیار میں کیوں نہ ہوئی، اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی عقل عورت سے زیادہ درست اور ثابت ہوا کرتی ہے اور عورتوں کے خیالات ذرا سی بات میں فورا بدل جاتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ یہ امر علی العموم مسلم ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ عورت کے نان و نفقہ کی مرد ہی کو تکلیف دی گئی ہے، پس جب عورت سے اس کو کسی قسم کی نفرت پیدا ہو جائے گی تو مرد کے نزدیک راجح یہی امر ہو گا کہ اور جہاں تک ہو سکے اس کو برداشت کرلے۔ اس نظر سے کہ اس کی عقل ثابت اور قوی ہے اور نیز اسے یہ خوف بھی لگا ہو گا کہ جو کچھ اس نے عورت پر خرچ کیا ہے کہیں ضائع اور برباد نہ ہو جائے، پس اس وجہ سے اسے طلاق دینے اور اس کی مفارقت اختیار کرنے سے حتی المقدور باز رہے گا۔
رہی عورت چونکہ وہ ان دونوں سے (یعنی قوت عقل اور خوف ہلاک نفقہ) خالی ہے نہایت قریب ہے کہ جب ذرا بھی کوئی نفرت کا باعث پایا جائے گا تو وہ بلا تامل طلاق دینے اور اس کی مفارقت اختیار کر لینے پر آمادہ ہو جائے گی اور اس کو چھوڑ دوسرے کو جاڈھونڈے گی۔ پس اسی واسطے خداوندی حکمت کا یہ مقتضا ہوا کہ طلاق مرد ہی کے ہاتھ میں رہے نہ کہ عورت کے قبضہ میں اور یہی عین حکمت ہے پس سمجھدار سوائے اس حالت کے وہ بالکل مضطر ہو جائے طلاق دینے پر کبھی پیش قدمی نہ کرے گا، رہا بعض بعض بیوقوفوں کا ذرا ذرا سی بات میں طلاق دینے پر پیش قدمی کرنا یہ بات حکم شرعی اور نظام عقلی کے خلاف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا جیسا کہ ائمہ اعلام نے اس کی تصریح کی ہے۔
منصف کے لیے اس قدر بیان کافی ہے اب ہم اس زمانہ کے متمدن (سویلائزڈ) فرقوں کے کچھ حالات جس سے کہ ہماری تقریر کی تائید ہوتی ہے ذکر کر کے اپنے کلام کو ختم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ فرقے جو اشیاء ہماری شریعت نے مباح کی ہیں ان کو مستحسن شمار کرنے لگے ہیں چنانچہ ان فرقوں میں بعضوں نے دو شادیاں جائز کر دی ہیں لیکن دوسری زوجہ اور اس کی اولاد کی بڑی بدنصیبی یہ کہ کیونکہ نہ اس کو یہ لوگ مذہبی زوجہ شمار کرتے ہیں اور نہ اس کی اولاد ہی کو مذہبی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ (رسالہ حمیدیہ)۔ (گلدستہ)

آپس میں اختلاف شدید ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں کیا کہا۔ ایک دم طلاق مت دے ڈالو۔ اب ایک پنچایت قائم کرو۔ لڑکے کے گھر والوں میں سے بھی مقرر ہوں اور لڑکی کے گھر والوں میں سے بھی۔ یعنی ماں باپ بہن بھائی۔ یا کوئی مخلص خیر خواہ ہمدرد۔ گھر بچنے کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ بیشک اللہ علم رکھنے والا بھی ہے اور خبر والا بھی۔ اس سے کیا پتہ چلتا ہے کہ جب تینوں طریقے فیل ہو جائیں تو یہ چوتھا طریقہ اختیار کرو۔ تالف کا۔ یعنی کچھ اور لوگ بیچ میں پڑ کر صلح کرائیں۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں گھر کو بچانے کی اور گھر کی خوشحالی کی کس قدر اہمیت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عورت بھی مرد کو مار سکتی ہے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام کرے۔ کیونکہ نشوز مرد کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ تو وہ بھی مار سکتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک روایت آتی ہے کہ سعد بن ربیع (رض) جو جنگ احد میں شہید ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو تھپڑ مارا اور وجہ یہ تھی کہ اس نے کوئی گستاخی کی تھی۔ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آگئی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عورت اپنا بدلہ دے دے۔ جوابا مارے۔ تو یہ آیت اتری۔ وہ ابھی جا ہی رہی تھیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہم نے ایک بات چاہی اللہ نے کچھ اور بات چاہی۔ تو جو اللہ نے چاہا وہی

بہتر ہے۔ وہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے روک دیا۔ کیونکہ عورت جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور ہے۔ اگر ایک مارے گی تو کئی کھائے گی۔ اور ہر ایک زیادہ زور دار بھی ہو گی۔ ہڈی پسلی تڑوا بیٹھے گی تو عورت کی خیر خواہی میں اس کو روک دیا گیا۔

35۔ اگر تم ڈرو شقاق سے۔ ایسا اختلاف جو سلجھایا نہ جا سکے۔ شقاق مشق سے ہے۔ دونوں کے درمیان اتنی نفرت ہو گئی ہے یا اتنی سختی ہو گئی ہے کہ وہ آپس میں کسی نتیجے پر پہنچتے ہی نہیں۔ اکثر کیا ہوتا ہے کہ جب میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے اور ایک دوسرے فریق کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا سنتا ہی نہیں ہے۔ لڑ لڑ کے دونوں اتنے تھک جاتے ہیں کہ کسی فیصلہ پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ حکم مقرر کرے جس سے حالات درست ہو جائیں۔ اللہ علم والا خبیر ہے۔ خبیر کے معنوں میں تجربہ کار کے معنی بھی آتے ہیں۔ خبیر کے معنی ہم باخبر کے کرتے ہیں خبیر ماہر بہت ہی زیادہ ماہر ہے وہ ان سے معاملات کو بہت ہی اچھے طریقے سے سمجھتا ہے وہ جیسے کسی بیماری میں ایک ماہر specialist سے رجوع کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ جو remnedy اور آسان حل جس نے تمہیں بتایا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو کسی سے دشمنی ہو کہ عورتوں سے دشمنی تھی تو ایسا حل تجویز کیا۔ نہیں مرد اور عورت دونوں اس کے پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا اس ہی کی طرف توجہ کرو۔ اسی کو مانو۔ اس میں پھر بھلا ہے سب کا۔

35۔ اب اگر کہیں تم لوگوں کو میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ خفتم میں تم کون ہیں۔ خاندان والے۔ اب کیا ہوا کہ معاملہ گھر میں نہیں سلجھ سکا۔ ابھی بھی Court میں نہ جائیں۔ گھر کی چار دیواری سے معاملہ نکل کر خاندان کے اندر آ گیا۔ تو یہ خفتم۔ یہ خاندان والے ہیں۔ (عربی پڑھنی ہے) ترجمہ۔ ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے۔

حکم کی بات کی گئی ہے۔ حکم اور حاکم اس میں فرق ہوتا ہے۔ حاکم عدالت میں ہوتا ہے۔ اور حکم خصوصی فیصلہ کرنے والے۔ جو کہ گھر میں ہو سکتے ہیں۔ اب کیا ہوا گھر کی حد تک معاملہ نہیں سلجھ سکا۔ شوہر نے ہر طرح کوشش کر ڈالیں تو اب خاندان والے بیچ میں آ کر معاملہ سلجھانے کی کوشش کریں اور بات پھر بھی نہیں نبھ رہی تو جانے دو۔ اب سمجھانے کا stage گزر گیا۔ یہ شوہر سے کہا جا رہا ہے کہ اب جب تمہارے سمجھانے سے بیوی نہیں سمجھ رہی تو بات ختم اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب خاندان کے عقل مندوں میں سے کسی کو لے آؤ۔ بات حل کرنے کی آخری کوشش کرو۔ اب دیکھیں اگر ساری زندگی بیوی کو مار مار کر درست رکھنا ہوتا شوہر کو تو اس چوتھی بات کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ once in a life time ہوا۔

اب پھر بھی نہ معاملہ سلجھ سکا۔ اب تمہارا اختیار ختم۔ اب خاندان والوں سے خطاب ہے کہ اگر تم کو ڈر ہے شقاق کا۔ شقاق۔ ش ق ق۔ ایسا اختلاف جو سلجھایا نہ جا سکے۔ خاندان والوں میں سے جو لوگ down ڈالنا والے ہیں ان میں سے ایک ایک کو لے آؤ۔ شرط کیا رکھی ہے۔ عقل کی۔ حکمت والے کی۔ زیادہ عمر کی شرط نہیں رکھی۔ صرف زیادہ عمر کا ہونا ضروری نہیں کہ انسان کے اندر حکمت بھی پیدا کروا دے۔ ہو سکتا ہے کہ عمر زیادہ نہ ہو خاندان میں کسی کی مگر معاملہ فہمی۔ مزاج شناسی۔ حکمت عقل زیادہ ہو۔ تو عقلمندوں کو لے کر آنا ہے۔ بعض دفعہ لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن ان کے اندر بزرگی نہیں آتی۔ ٹھہراؤ نہیں آتا۔ تو ان کو مت پڑھ۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ زیادہ بگڑے۔ اور اب اگر دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے اللہ کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ اللہ حکمت والا اور باخبر ہے۔ (تنویر)

مسائل

۱۔ جب بڑوں کو معلوم ہو کہ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہیں اور ان میں اصلاح نہیں ہو رہی اور جھگڑا مزید بڑھ رہا ہے۔

۲۔ فریقین سے ذمہ دار و سمجھ دار دو آدمی مقرر کئے جائیں جن پر ان کا اعتماد ہو۔

۳۔ اگر دونوں نمائندے اس بات پر اتفاق کریں کہ فریقین میں صلح اور اتفاق ہو جانا بہتر ہے اور اس کے لئے کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا اور اگر وہ سمجھیں کہ اب جدائی بہتر ہے تو یہ اللہ تعالیٰ آسان کر دیگا۔

آیت مبارکہ:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۨ ﴿۳۵﴾

لغات القرآن:[وَاعْبُدُوا : اور تم عبادت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [وَلَا تُشْرِكُوْا : اور نہ شریک کرو] [بِهٖ : اس کے ساتھ] [شَيْـًٔـا : کچھ ۔ کسی کو] [وَّ : بِالْوَالِدَيْنِ : ماں باپ سے] [اِحْسَانًا : اچھا سلوک] [وَّ : اور] [بِذِي الْقُرْبٰى: قرابت داروں سے] [وَالْيَتٰمٰي : اور یتیم (جمع)] [وَالْمَسٰكِيْنِ : اور محتاج (جمع)] [وَالْجَارِ : ہمسایہ] [ذِي الْقُرْبٰى: قرابت والے] [وَالْجَارِ : اور ہمسایہ] [الْجُنُبِ : اجنبی] [وَالصَّاحِبِ بالْجَنْۢبِ : اور پاس بیٹھنے والے (ہم مجلس)] [وَ : اور] [ابْنِ السَّبِيْلِ : مسافر] [وَمَا : اور جو] [مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : تمہاری ملک (کنیز ۔ غلام] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ] [لَا يُحِبُّ : دوست نہیں رکھتا] [مَنْ : جو] [كَانَ : ہو] [مُخْتَالًا : اترانے والا] [فَخُوْرَا ۨ : بڑ مارنے والا]

ترجمہ: اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے) اور نزدیکی ہمسائے اور اجنبی پڑوسی اور ہم مجلس اور مسافر (سے)، اور جن کے تم مالک ہو چکے ہو، (ان سے نیکی کیا کرو)، بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبّر کرنے والا (مغرور) فخر کرنے والا (خود بین) ہو (عرفان)

تفسیر و تشریح: میاں بیوی کے حقوق کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت بلاشرکت غیرے کرنے کا حکم نیز والدین قریبی رشتہ داروں اور مستحق لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین۔ گویا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بیک مقام تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسلامی زندگی اپنی اصل حقیقت اور حیثیت کے اعتبار سے دو چیزوں سے عبارت ہے۔

۱۔ حقوق اللہ ۲۔ حقوق العباد

حقوق العباد کی اسلام میں بہت تاکید کی گئی ہے اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن حقوق العباد کا تصور وجود میں نہیں آسکتا اور اگر مصنوعی طریقے سے اسے وجود دے بھی دیا جائے تو اس کی ادائیگی کی کوئی ضمانت نہیں تاوقتیکہ اللہ کے حقوق کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اللہ کا سب سے پہلا حق جو اس کے تمام حقوق کی بنیاد ہے وہ اس پر ایمان اور اس کی عبادت ہے اسی ایمان اور عبادت کی آخری شکل تقویٰ ہے۔

سب سے پہلا حق اللہ کا حق عبادت ہے

چنانچہ قرآن کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب بھی اپنے بندوں کو احکام سے نوازتا ہے تو سب سے پہلے انھیں بنیادی باتوں کا حوالہ دیتا ہے۔ کبھی اپنی ذات اور اپنے احسانات کا ذکر فرماتا ہے کبھی اپنی بندگی اور عبودیت کی دعوت دیتا ہے اور کبھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر اس حقیقت پر ذرا بھی غور کر لیا جائے تو یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ انسان جس طرح اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح ہر حیثیت سے اس کا بندہ بھی ہے۔ اس کی زندگی میں جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول جاتا یا نظر انداز کرتا ہے۔ وہ بجائے اپنے آپ کو بندہ سمجھنے کے جب آقائی کرنے لگتا ہے بجائے بندگی اور عبادت کرنے کے لوگوں سے بندگی کروانے لگتا ہے تو وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور وہیں سے فساد فی الارض کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم بار بار انسان کو اس کی اصل حیثیت یاد دلاتا ہے کیونکہ اصل حیثیت کا یاد نہ رہنا ہر سطح پر خرابی کا باعث بنتا ہے۔ ماتحت اپنے آپ کو افسر سمجھنے لگے، مزدور اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے، شاگرد استاد کی کرسی پر بیٹھ جائے، استاد پرنسپل کا منصب سنبھال لے، ہر چھوٹا بڑا بن جائے اور ہر بڑا اپنی بڑائی کے تقاضوں کو بھلا دے تو اجتماعی زندگی کا کوئی ادارہ اپنی جگہ کام نہیں کر سکتا۔ جس گھر میں میاں بیوی اپنی اپنی حیثیت کو بھول جائیں اور اولاد خود سر ہو جائے اس گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ یہی حال پوری انسانی زندگی بلکہ پوری کائنات کا ہے۔ ہم جو ہر طرف فساد مچا ہوا دیکھ رہے ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ بندوں کو اپنے حقوق یاد ہیں۔ لیکن اللہ کے حقوق جس کے نتیجے میں بندوں کے حقوق پیدا ہوتے ہیں انھیں ہم یکسر نظر انداز کر چکے ہیں۔

چنانچہ اس سورۃ کے آغاز میں اصلاح معاشرہ کی ہدایات دینے سے پہلے اللہ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی حدود سے تجاوز مت کرو اور ان آیات میں جب حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم دیا تو پھر سب سے پہلے اپنا حق یعنی عبادت کا ذکر فرمایا کیونکہ جو شخص اللہ کے حق عبادت اور اپنے بندہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے حکم سے بندوں کے حقوق کیسے ادا کرے گا؟ اللہ کی ذات و صفات اور اس کی عبادت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ دیکھو اس کے ساتھ

کسی کو شریک مت کرو۔ جس طرح اللہ کی حیثیت کا انکار در حقیقت اپنی حقیقت اور حیثیت کا انکار ہے اسی طرح اس کی ذات وصفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک کرنا ایک ایسا جرم ہے جس سے پورا نظام تکوین اور نظام تشریع تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

انسان اس وقت تک کسی کے حقوق اخلاص کے ساتھ پوری طرح ادا نہیں کر سکتا جب تک صحیح معنوں میں اپنے آپ کو بلاشرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی غلامی اور تابعداری میں نہ لے آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کبھی احکامات جاری کرنے کے بعد اور کبھی ان کی ابتدا میں اپنی توحید اور تقویٰ یاد دلاتے ہیں تاکہ انسان اپنے آپ کو اس کے حضور مکمل طور پر سرنگوں کر دے۔

اللہ کے احکام تکوینیہ (تخلیقیہ اور خطریہ) اور احکام تشریعیہ (اوامر ونواہی) کا مرتبہ ایک جیسا ہو (یعنی جس طرح اللہ کے احکام تخلیقیہ میں بندہ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں اسی طرح اللہ کے احکام تشریعیہ کی پابندی کے لیے بھی وہ اپنے کو مجبور سمجھے)

اللہ نے فرمایا ہے جب اللہ اور اللہ کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیتے ہیں تو پھر کسی مومن مرد و عورت کی اپنی اختیاری مرضی نہیں رہتی

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں دراز گوش پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا آپ نے فرمایا: اے معاذ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں ' آپ نے فرمایا: اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں ' اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ جو اس کے ساتھ بالکل شرک نہ کرے وہ اس کو عذاب نہ دے ' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خوشخبری نہ دوں؟ آپ نے فرمایا ان کو خوش خبری نہ دو ورنہ وہ اسی پر توکل کر کے بیٹھ جائیں گے (عمل نہیں کریں گے) (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ٢٨٥٦ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ٣٠ ' سنن ترمذی: ٢٦٥٢ ' مسند احمد ج ٥ ص ٢٣٤ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ٤٢٩٦ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث: ٢١٠ ' مسند ابو عوانہ: ج ١ ص ١٧)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو اللہ پر بندوں کے حق کا ذکر فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل اور کرم سے شرک نہ کرنے والوں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے ورنہ عمل کی وجہ سے کسی بندہ کا اللہ پر کوئی حق نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ کو یہ حدیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا لیکن بعد میں خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بشارت دے دی تو حضرت معاذ (رض) نے موت سے پہلے اس حدیث کو بیان فرمادیا تاکہ علم کو چھپانے پر جو وعید ہے اس میں داخل نہ ہوں۔

حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک اعرابی آیا اس نے کہا اے اللہ کے نبی ﷺ مجھ کو وصیت کیجئے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو خواہ تمہیں کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے اور کسی وقت کی نماز ترک نہ کرو اور شراب نہ پیو کیونکہ وہ برائی کی کنجی ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ٤٠٣٤ ' الترغیب والترہیب ج ١ ص ١٩٥ ' مجمع الزوائد: ج ٤ ص ٢١٧۔ ٢١٦) (روح)

ذات کبریا کے بعد والدین ہی انسان کے سب سے زیادہ ہمدرد، محسن، مربّی اور قریب ہوتے ہیں۔ انسان ماں کی آغوش میں باپ کی کمائی سے نشوونما پاتا ہے۔ اس لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد آدمی کی اطاعت کے سب سے زیادہ حقدار اس کے والدین ہیں۔

حقوق الوالدین

اپنا حق ذکر فرمانے کے بعد سب سے پہلے والدین کے حق کا ذکر فرمایا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا خالق ومالک تو یقینا خالق کائنات ہے لیکن بظاہر انسان کے دنیا میں آنے کا سبب اس کے والدین ہیں۔اس لیے اللہ کی صفت تخلیق اور ربوبیت کے بعد اگر کسی کے احسانات سب سے زیادہ ہیں تو وہ ہر شخص کے والدین ہیں۔ بچہ اپنی پیدائش کے بعد اس قدر بے بس ہوتا ہے کہ نہ اس کے حواس کام دیتے ہیں اور نہ اس کا جسم ساتھ دیتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی مخلوق پیدا ہونے کے جلدی بعد اپنے ضروری معمولات انجام دینے کے قابل ہو جاتی ہے مرغی کے بچے ماں کے پیچھے چلتے پھرتے اور دانکا دنکا چنتے ہیں۔ بلی کے بچے آنکھیں کھلتے ہی اپنی ماں کے پستان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بھینس کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد لڑکھڑاتا ہوا ماں کے نیچے پہنچ کر دودھ پینے لگتا ہے۔ لیکن انسان کا بچہ مہینوں تک اپنے ماں باپ کو پہچانتا نہیں۔اس بے بسی کی حالت میں اس کی ماں اسے سنبھالتی، کھلاتی پلاتی، موسم کی شدت سے بچاتی اور ہر طرح کے آرام اور راحت کا سامان کرتی ہے۔ غریب سے غریب باپ بھی اپنے بچے کے لیے آنکھیں بچھاتا ہے، اس کے کندھے اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے بے چین اور بے تاب ہوتے ہیں۔اس لیے ماں باپ کے احسانات کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب سے پہلے ان کے حق کا ذکر کیا جائے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ وہ اپنی ساری خدمات اور تمام تر احسانات کے باوجود بچے پر یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ ان کی عبادت کرے بلکہ ان کا زیادہ سے زیادہ حق یہ ہے کہ اولاد ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس حسن سلوک کو کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے :

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما و قل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ و قل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا

(اور تمہارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرو (یعنی خفا نہ ہو) اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے جھکائے رکھو اور اللہ سے دعا کرو کہ اے ہمارے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن سے مجھے پالا) (روح)

(آیت) "ووصینا الانسان بوالدیہ، حملتہ امہ وھنا علی وھن وفصالہ فی عامین ان ش کرلی ولوالدیک الی المصیر"۔ (لقمان : ۱۴)

ترجمہ : ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے ' اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے اس کو پیٹ میں اٹھایا اور اس کا دودھ چھوٹنا دو برس میں ہے (اور ہم نے یہ حکم دیا کہ) میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو میری طرف لوٹنا ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ کون لوگ میرے اچھے سلوک کے مستحق ہیں؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں ' کہا پھر کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں ' کہا پھر کون ہے؟ فرمایا پھر تمہاری ماں ' کہا پھر فرمایا تمہارا باپ۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۲۵۴۸ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۳۹ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۰۴ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۷۰۶ ' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۵۴۱ ' الادب المفرد ' رقم الحدیث : ۵۹۷۱ ' سنن کبری للبیہقی ج ۸ ص ۲ شرح السنۃ ' رقم الحدیث : ۳۴۱۶) (تبیان)

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور اپنے شکر کے بعد ماں باپ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ انسان کے حق میں سب سے بڑی نعمت اس کا وجود اور اس کی تربیتت اور پرورش ہے اور اس کے وجود کا سبب حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور ظاہری سبب اس کے والدین ہیں ' اسی طرح اس کی تربیت اور پرورش میں حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہے اور ظاہری سبب اس کے والدین ہیں۔ نیز جس طرح اللہ بندے کو نعمتیں دے کر اس سے اس کا عوض نہیں چاہتا اسی طرح ماں باپ بھی اولاد کو بلا عوض نعمتیں دے دیتے ہیں ' اور جس طرح اللہ بندہ کو نعمتیں دینے سے تھکتا اور اکتاتا نہیں والدین بھی اولاد کو نعمتیں دینے سے تھکتے اور اکتاتے نہیں ' اور جس طرح بندے گناہ گار ہوں پھر بھی اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کا دروازہ بند نہیں کرتا ' اسی طرح اگر اولاد نالائق ہو پھر بھی ماں باپ اس کو اپنی شفقت سے محروم نہیں کرتے ' اور جس طرح اللہ اپنے بندوں کو دائمی ضرر اور عذاب سے بچانے کے لیے ہدایت فراہم کرتا ہے ماں باپ بھی اپنی اولاد کو ضرر سے بچانے کے لیے نصیحت کرتے رہتے ہیں۔

ماں باپ کے ساتھ اہم نیکیاں یہ ہیں کہ انسان ان کی خدمت کے لیے کمربستہ رہے ' ان کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرے ' ان کے ساتھ سختی سے بات نہ کرے ' ان کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کرے ' اپنی حیثیت اور وسعت کے مطابق ان پر اپنا مال خرچ کرے ' ان کے ساتھ عاجزی اور تواضع کے ساتھ رہے ' ان کی اطاعت کرے اور ان کو راضی رکھنے کی کوشش کرے خواہ اس کے خیال میں وہ اس پر ظلم کر رہے ہوں ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے ' ماں کے بلانے پر نفل نماز توڑ دے البتہ فرض نماز کسی کے بلانے پر نہ توڑے ۔ (تبیان)

نیز باپ کے ساتھ یہ بھی نیکی ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ نیکی کرے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت خدیجہ (رض) کی سہیلیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے اور ان کو تحائف بھیجتے تھے ' جب بیویوں کی سہیلیوں کا یہ درجہ ہے تو باپ کے دوستوں کا مقام اس سے زیادہ بلند ہے ' نیز ماں باپ کی وفات کے بعد ان کے لیے استغفار کرنا بھی ان کے ساتھ نیکی ہے ' ایک شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور پوچھا ماں باپ کے فوت ہونے کے بعد میں ان کے ساتھ کس طرح نیکی کروں ؟ آپ نے فرمایا ان کی نماز جنازہ پڑھو ' ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو ' انھوں نے لوگوں سے جو وعدے کئے تھے ان کو پورا کرو ' ان کے دوستوں کی عزت کرو اور جن کے ساتھ وہ صلہ رحم کرتے تھے ان کے ساتھ صلہ رحم کرو۔ (عارضۃ الاحوذی ج ۸ ص ۹۴ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ ھ) (فہم)

والدین کے تین حقوق

اس آیت کے مضمون پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے تین حقوق بیان فرمائے ہیں۔

پہلا حق ہے حسن سلوک، دوسرا ہے اطاعت اور تیسرا ہے دعا۔ حسن سلوک چونکہ ادائے حق سے ایک بالاتر چیز ہے اس لیے اس کا تو حقیقی تعلق اولاد کی فرمان برداری کے حسن ذوق سے ہے جتنا کسی کا ذوق اس لحاظ سے پاکیزہ اور نازک ہوگا وہ اتنا ہی حسن سلوک میں آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن یہاں آیت قرآنی میں اس حسن سلوک کی طرف راہنمائی بھی کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ اگر ماں باپ تمہاری زندگی میں بوڑھے ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ بڑھاپا آ جانے کے بعد انسان کے اندر دو طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں۔

ا۔ قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اپنی مرضی سے بعض دفعہ چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے حرکت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں حسن سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں نوکروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے یا ان کی طرف سے لاپرواہی نہ برتی جائے بلکہ اولاد کی ذمہ داری ہے کہ امکانی حد تک خود ان کی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا مداوا بننے کی کوشش کریں۔

۔۲ دوسری تبدیلی ذہن اور عقل کی تبدیلی ہے۔ بڑھاپے میں بعض دفعہ آدمی ٹھیک بات کہنے اور سمجھ کر گفتگو کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ بڑھاپے میں آدمی دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔ جو حرکتیں بچے کرتے ہیں وہی بوڑھا آدمی کرنے لگتا ہے۔ ان دونوں تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ دیکھنا ایسی صورتحال میں اپنے ماں باپ کو اف تک بھی نہ کہنا۔ یعنی اظہار بیزاری نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے منہ سے رال ٹپک رہی ہو، ناک بہہ رہی ہو، آنکھیں تلچھٹ سے بھری ہوں۔ ممکن ہے وہ رفع حاجت بھی خود نہ کر سکیں، ایسی حالت میں خدمت سے تنگ آ جانا انسانی فطرت سے بعید نہیں۔ دیکھنا ایسے وقت میں بیزاری کا اظہار نہ کرنا، اف اف کر کے تنفر کا اظہار نہ کرنا، ان سے لاتعلّقی ظاہر کر کے انھیں ان کے حال پر نہ چھوڑ دینا۔ اگر وہ عقل اور ذہن کے فتور کے باعث بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگیں یا بلاوجہ کسی بات کی ضد کریں۔ بار بار کوئی بات پوچھیں تو دیکھنا ان کو جھڑکنا نہیں۔ ان سے ناراض نہیں ہونا بلکہ جس طرح انھوں نے نہایت محبت اور پیار سے تمہیں اس وقت پالا جب تم گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح تھے۔ ہر طرح کی عقل اور سمجھ سے خالی، بستر پر گندگی، نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا سلیقہ لیکن اس کے باوجود ماں باپ نے کیسی محبت سے تمہیں پالا اور بڑا کیا۔ تم بھی اسی محبت کے جذبے سے ان کی دیکھ بھال کرنا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب بوڑھے ہو گئے ایک دن گھر کے لان میں بیٹھے تھے کہ جوان بیٹا آ گیا۔ جوان بیٹے کو پاس بٹھایا۔ دیوار پر ایک کوا بیٹھا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا بیٹا یہ کیا ہے؟ بیٹے نے جواب دیا ابا جان کوا ہے۔ انھوں نے پھر پوچھا یہ کیا ہے بیٹے نے پھر جواب دیا کہ یہ کوا ہے۔ جب انھوں نے تیسری بار پوچھا تو بیٹے کے لہجے میں تیزی آنے لگی حتیٰ کہ جب پانچویں دفعہ یہی سوال کیا تو بیٹے نے جھڑک کر کہا کہ ابا جان یہ کیا ایک ہی سوال آپ بار بار کیے جا رہے ہیں۔ میں کتنی دفعہ آپ کو جواب دے چکا ہوں یہ صاحب اٹھے اندر سے اپنی ڈائری اٹھا لائے۔ ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ میرا بیٹا چھوٹا سا تھا اسی صحن میں بیٹھے ہوئے اس نے مجھ سے دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اس کو جواب دیا لیکن وہ بار بار مجھ سے پوچھتا، ابا جان یہ کیا ہے؟ میں جواب دیتا بیٹے یہ کوا ہے۔ اس نے پچیس دفعہ سوال کیا اور پچیس دفعہ ہی میں نے جواب دیا اور اتنی دفعہ جواب دینے کے بعد مجھے ناگواری نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا بار بار پوچھتا ہے اور ہر دفعہ اس کا منہ چومتا۔ اندازہ کیجیے! باپ پچیس دفعہ جواب دیتا ہے تو اس کی محبت اور پیار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ قرآن کریم کی اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اسی جذبہ سے اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور ہر طرح کی بات برداشت کرنا۔

دوسرا حق جو اس میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے ہر حال میں اپنے ماں باپ کی اطاعت کرنا اور ہر جائز حکم کو بجالانا۔ ان کی مالی ضروریات کو پورا کرنا اور ہر جائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اس میں یہاں تک وسعت کی گئی ہے کہ تمہارے والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں وہ تمہیں کوئی اسلام کے خلاف بات کہیں تو اسے ہرگز نہ ماننا لیکن ویسے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰاكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

(اور اگر تیرے والدین تجھے مجبور کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت مت کرنا لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)

پھر والدین کے اس رشتے کو اسلام نے رضاعی والدین تک وسعت دے دی ہے یعنی جس خاتون کا دودھ پیا ہے وہ دودھ پینے والے کی رضاعی ماں کہلاتی ہے اور اس کا شوہر رضاعی والد بن جاتا ہے اور ساتھ دودھ پینے والا دوسرا بچہ رضاعی بھائی کہلاتا ہے۔ جس طرح حضرت حلیمہ سعدیہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رضاعی والدہ تھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف فرما تھے کہ آپ کی رضاعی والدہ یعنی حضرت حلیمہ سعدیہؓ تشریف لے آئیں۔ آپ سید عالم ﷺ نے اپنی وہ چادر بچھادی جسے خود خالق کائنات کہیں فرماتا ہے يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (اے بالا پوش اوڑھنے والے) اور کہیں يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (**اے چادر اوڑھنے والے**) کہ اس پر تشریف رکھیں۔ پھر آپ ﷺ کے رضاعی والد آئے تو آپ ﷺ نے اپنی چادر کا دوسرا حصہ ان کے لیے بچھادیا۔ اتنے میں آپ کے رضاعی بھائی بھی پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے ان کو ماں باپ کے درمیان بٹھایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں ماں باپ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ نافرمانی سے منع فرمایا بلکہ نافرمانی سے روکنے کو قانونی حق کے طور پر تسلیم کیا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ عُقُوۡقَ الۡاُمَّهَات

(اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کر دیا)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا:

یارسول اللہ ماحق الوالدین علی ولدھما قال ھما جنتك ونارك

(اے اللہ کے رسول! والدین کا ان کی اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا وہ دونوں تمہاری جنت ہیں اور تمہاری جہنم ہیں)

یعنی اطاعت کرو گے تو جنت کے مستحق ٹھہرو گے اور نافرمانی کرو گے تو اس کی وجہ سے جہنم میں جانا ہو گا۔ ایک دوسری حدیث ہے:

عن ابی ھریرہ قال، قال رسول اللہ رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ قیل من یارسول اللہ قال من ادرك والدیہ عندالکبر احدھما اوکلاھما ثم لم یدخل الجنة

(حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو ہے یعنی وہ ذلیل ہو۔ پوچھا گیا کون اے اللہ کے رسول؟ فرمایا جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا، ان میں سے ایک کو یا دونوں کو اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باپ کی رضامندی کو اللہ کی رضامندی ٹھہرایا باپ کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی قرار دیا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رِضَی الرَّبِّ فِی رِضَی الوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فی سخط الوالد

(رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے)

پھر والدین کی نافرمانی کو نہ صرف اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ والدین کی نافرمانی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں ہی اس کی سزا نہ دے دی جائے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

کل الذنوب یغفر اللہ تعالیٰ منھا ماشاء الا عقوق الوالدین فانہ یجعل لصاحبہ فی الحیاۃ قبل الممات

(اللہ تعالیٰ تمام گناہوں میں سے جس کو چاہے گا معاف فرمائے گا مگر والدین کی نافرمانی کو معاف نہیں فرمائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ نافرمان کو موت سے پہلے زندگی میں ہی سزا دے ڈالے)

اولاد پر ماں باپ کا تیسرا حق دعا کرنا ہے۔اس کا تعلق والدین کی زندگی سے بھی ہے اور والدین کی زندگی کے بعد سے بھی۔ جب تک والدین زندہ رہیں تو آدمی حتی المقدور ماں باپ کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتا رہے۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا

(اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا)

اس میں اشارہ دو باتوں کی طرف ہے۔ ایک تو یہ کہ جو آدمی اپنے والدین کی خدمت کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اس طرح دل سے دعا مانگے گا تو یقیناً اس کے دل میں اپنے ماں باپ کی خدمت بوجھ نہیں بنے گی اور پھر اس دعا سے ماں باپ کی محبت کا جذبہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور وہ امکانی حد تک کبھی اس خدمت سے دریغ نہیں کرے گا اور دوسرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا میں ہر آدمی کے لیے بہت سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں جن میں دوست احباب ہیں، بیوی ہے، بچے ہیں، ان کی دعاؤں میں یقیناً اخلاص بھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بے لوث اور بے غرض دعا سوائے والدین کے اور کوئی نہیں مانگتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ماں باپ کے اٹھ جانے سے بے لوث اور بے غرض دعائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اولاد چاہے کتنے پیار سے ہی دعا مانگے لیکن کوئی نہ کوئی خواہش کہیں نہ کہیں چھپی ہوتی ہے۔ یہی حال بیوی اور دوست احباب کا بھی ہے۔ لیکن والدین جب دعا مانگتے ہیں تو اپنی ذات کی مکمل نفی کر کے دعا کرتے ہیں۔ تو یہاں خدمت کے ساتھ ساتھ جو دعا کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ والدین کا حوالہ بھی ہے تو اس میں شاید اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ دیکھو! تمہارے والدین نے جب تمہاری تربیت کی تھی اس میں جہاں ہر طرح کی دیکھ بھال، خیر خواہی، ہمدردی اور ایثار کا جذبہ کارفرما تھا وہیں اس میں تمہارے لیے بے لوث دعائیں بھی شامل تھیں۔ جن کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخری سانس تک قائم رہا۔ وہ اپنے آپ کو بھول کر ہمیشہ تمہاری بھلائی اپنے رب سے مانگتے رہے۔ دیکھنا تم بھی ایسے ہی جذبے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کرنا اور جہاں تک زندگی کے بعد دعاؤں کا تعلق ہے ہے اسے بھی آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماں باپ کے بعد از وفات حقوق میں شامل فرمایا۔ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں :

عن ابی السید الساعدی قال بینما نحن عند رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اذ جاء رجل من بنی سلمۃ فقال یارسول اللہ هل بقی من بر ابوی شیء ابرهما من بعد موتهما ؟ قال نعم الصلوۃ علیهما والاستغفار لهما وانفاذ عهدهما وصلة الرحم التی لا توصل الا بهما واکرام صدیقهما

(ابو سعید الساعدی سے روایت ہے کہ ایک وقت جب ہم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھے بنی سلمہ میں سے ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا میرے ماں باپ کے مجھ پر کچھ ایسے بھی حقوق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد مجھے ادا کرنے چاہئیں ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ! ان کے لیے خیر و برکت اور رحمت کی دعا کرتے رہنا، ان کے واسطے اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگنا ان کا اگر کوئی عہد معاہدہ کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا ان کے تعلق سے جو رشتے ہیں ان کا لحاظ رکھنا اور ان کا حق ادا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام اور احترام کرنا۔ اس حدیث میں ماں باپ کے لیے دعا اللہ سے ان کی بخشش کی طلب بندوں میں سے کسی کے ساتھ اگر کوئی عہد معاہدہ ہو تو اسے پورا کرنا ماں باپ کے تعلق سے جو جو رشتے بھی ہیں ان کا لحاظ کرنا اور ان کا حق ادا کرنا اور زندگی میں ان کے جن کے ساتھ دوستی کے تعلقات تھے ان کا اکرام واحترام کرنا)

یہ وہ حقوق ہیں جو ماں باپ کی وفات کے بعد بھی اولاد پر باقی رہتے ہیں۔ تو ان میں سب سے پہلا حق ان کے لیے دعائے خیر و برکت کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے کہ جب بھی موقع ملے تو آپ اپنے والدین کے لیے یہ دعا کرتے رہا کریں۔

اللھم اغفر لھما وارحمھما

(اے اللہ! میرے والدین کو بخش دے اور ان پر رحمت فرما)

اس کا فائدہ اس کے والدین کو قبر میں اور آخرت میں انشاء اللہ جو ہو گا سو ہو گا خود اولاد کو بھی اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ نافرمان اولاد کو بھی اس دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرمان بردار اولاد میں شامل فرما دیتے ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔

عن انس قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان العبد لی موت والداہ او احدھما وانہ لھما لعاق فلا یزال یدعولھما ویستغفر لھما حتی یکتبہ اللہ بارا

(حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے اور اولاد زندگی میں ان کی نافرمان اور رضامندی سے محروم ہوتی ہے لیکن یہ اولاد ان کے انتقال کے بعد سچے دل سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و رحمت کی دعا مانگتی اور بخشش کی التجا کرتی رہتی ہے (اور اس طرح اپنے قصور کی تلافی کرنا چاہتی ہے) تو اللہ تعالیٰ نافرمان اولاد کو فرمان بردار قرار دے دیتا ہے اور پھر وہ ماں باپ کی نافرمانی کے وبال اور عذاب سے بچ جاتی ہے)

ذوی القربیٰ کے حقوق

اس آیت کریمہ میں والدین کے حقوق کے بعد قرابت داروں کے حقوق کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت والدین کے تعلق اور حقوق سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں کیونکہ خاندان کی بنیاد زوجین ہیں۔ یہی دونوں جب والدین کی شکل اختیار کرتے ہیں تو خاندان کی نمود و پراخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اولاد خاندان کے ارتقاء کی علامت اور والدین کی آرزوؤں کا پھل ہے۔ پھر والدین کے حوالے سے ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار اس خاندان کے شجر سایہ دار کی شاخیں اور تنوں کی صورت میں خاندان کی وسعت کا سبب بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاندان کے ارکان اربعہ زوجین، والدین، اولاد اور اہل قرابت ہیں۔ اگر زوجین کے نازک رشتے کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو خاندان کی بنیاد ہل جاتی ہے اور اگر والدین کے احترام اور ان کی حیثیت میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو خاندان کا ارتقا اگرچہ جاری رہتا ہے لیکن یہ خاندان کے لیے تقویت کا باعث بننے کی بجائے مفاسد کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور خاندان کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔ یہ تینوں ادارے اگر اپنی جگہ ٹھیک کام کرتے ہیں تو یقینا ایک خاندان پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ گردوپیش میں بے تعلّقی، خود غرضی، نفسا نفسی اور انانیت کی چلنے والی تیز ہوائیں اس خاندان کے کسی حصے کو بھی نقصان پہنچا دیں ضروری ہے کہ تحفظ کی دیواریں اس خاندان کے گرد کھڑی کی جائیں تاکہ یہ خاندان ایک شجر سایہ دار کی طرح اپنے زیر سایہ رہنے والوں کو حفاظت اور محبت کی ٹھنڈک مہیا کر سکے۔ حفاظت کی یہ دیواریں اصل میں قرابت کے تعلقات ہیں جو خاندان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور خاندان کی وسعت کو مزید پھیلانے میں مدد بھی دیتے ہیں اور جب خاندان کا کوئی ایک فرد حالات کی ستم ظریفی سے زخم کھا کر گرنے لگتا ہے تو یہی اس کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔

انسانی فطرت کو دیکھتے ہوئے ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے جس سے رشتہ وقرابت کی اہمیت افادیت اور ضرورت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ بڑی اجتماعیت میں شریک ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور اپنے حصے کے فرائض انجام دینے کے لیے تو ایک بڑی حوصلہ مندی کی ضرورت ہے اور زندگی کے وسیع تجربات کے بعد آدمی اس میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن ایک محدود سطح پر مل جل کر رہنا، مل جل کر بہت سے کام انجام دینا یہ انسانی فطرت کا اولین تقاضا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر بچہ کھیلنے کے لیے ہمجولی تلاش کرتا ہے، سکول میں بچے اپنے ہم عمر بچوں سے پیار کرتے ہیں، جماعت کا اشتراک، مضامین کا اشتراک، ان میں باہمی تعلقات کا سبب بنتا ہے۔ جب آدمی عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو خیالات کی ہم آہنگی، پیشے کی یکسانی، ہمسائیگی، ہم وطنی، ہم مذاقی، یہ جو اشتراک کی مختلف صورتیں ہیں یہ باہم مل کر چلنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور ایک ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کالج کے پڑھے ہوئے لوگ ہمیشہ کالج کے انتساب کو اور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل یونیورسٹی کے انتساب کو تعلقات کی بنیاد قرار دے کر اپنی یادیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی دنیا میں، سیاسی جماعتوں میں شرکت کی بنیاد پر تعلقات کی بنیاد وجود میں آتی ہے۔ مختصر یہ کہ محدود یا وسیع سطح پر مل کر رہنا، مل کر چلنا، مشترک اعمال بجالانا، یہ یکسانی کی صورتیں ہیں جو انسانی فطرت کا تقاضا ہیں اور ان کی بنیاد پر اجتماعیت کی مختلف شکلیں وجود میں آتی ہیں اور انسان انہی کو اپنے لیے زندگی کا سہارا سمجھتا ہے۔ اسلام اشتراک کی ان تمام صورتوں اور تعلقات کی ان تمام بنیادوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ ساری بنیادیں اور سارے اشتراکات مصنوعی اور تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ لیکن حقیقی اشتراک کی وہ گرہ جو اللہ نے تمہارے درمیان باندھ رکھی ہے اور جسے تم کھولنا بھی چاہو تو کھول نہیں سکتے اور پھر جو جذبات کی شدت ان سے وجود میں آسکتی ہے ظاہر ہے کوئی اور بندھن اور کوئی اور تعلق اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس گرہ کو مضبوط باندھنے کی کوشش کرو اور اسی تعلق کو تمام تعلقات کی بنیاد جانو اور یہ تعلق کیا ہے؟ وہی ہے جس کو ہم قرابت کا تعلق کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خون کا رشتہ ہے جو تمام رشتوں سے افضل واعلیٰ ہے۔ عربی زبان میں اسی قرابت کے تعلق کی قدر کرنے کو اور قرابت کا حق ادا کرنے کو "وصل رحم یا صلہ رحمی" کہا گیا ہے۔

حق قرابت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل چند باتوں سے ہو سکتا ہے۔

1 قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق اور اس کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ساتھ ہی اہل قرابت کے حقوق کا ذکر ضرور کیا۔ اس سے حق قرابت کی عنداللہ اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى

(اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کرو)

2 قرآن کریم نے پہلی امتوں بالخصوص بنی اسرائیل کے حوالے سے کئی جگہ اس بات کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک عہد وپیاں لیا تھا اور اپنی تمام عنایات کو اس کے ساتھ مشروط ٹھہرایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر تم اس عہد وپیان کو پورا کرو گے تو ہم بھی تم پر اپنی عنایات کی بارش کریں گے لیکن اگر تم نے اپنے عہد وپیان اور میثاق کی پروانہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی تمہاری پروا نہیں فرمائے گا۔ اس عہد وپیان میں جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر ہے وہیں اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى

(اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کرنا)

3 حقِ قرابت کی اسلام میں اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کی اصلاح اور ان کو دعوت اسلام دیتے ہوئے جو تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں اور اس راستے میں جس طرح زخم پر زخم برداشت کیے وہ امت پر ایسا احسان ہے جس کی تلافی امت کبھی نہیں کرسکتی۔ لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس احسان و کرم کا جو ہدایت تعلیم اور اصلاح کے ذریعے اس امت پر فرمایا معاوضہ اور بدلہ اپنی امت سے اگر کوئی طلب فرمایا ہے تو صرف یہ کہ میری امت کو اپنے رشتے داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرنا چاہیے اور ان سے لطف و محبت سے پیش آنا چاہیے۔ قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت سے یہ کہئے :

قل لااسئل۔کم علیہ اجراالاالمودۃفی القربی

(کہہ اے پیغمبر! میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کہ ناتے اور قرابت میں محبت اور پیار کرو)

4 جیسے پہلے ذکر ہو چکا کہ عربی زبان میں قرابت کو رحم یا رحم کہتے ہیں اور قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم یا صلہ رحمی کہا جاتا ہے اس صلہ رحمی کا مقام اور اہمیت اللہ کی نگاہ میں کیا ہے؟ اس کا اندازہ چند احادیث سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

الرحم شجنۃ من الرحمٰن قال اللہ تعالیٰ من وصلک وصلتہ ومن قطمک قطعتہ

(رحم (حقِ قرابت) مشتق ہے رحمان سے اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا)

یعنی انسانوں کے باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمٰن سے اور اس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے اس کا عنوان رحم مقرر کیا گیا۔ اسی خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے عنداللہ اس کی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو صلہ رحمی کرے گا یعنی قرابت اور رشتہ داری کا حق ادا کرے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اپنے سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا اور جو کوئی اس کے برعکس قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے کاٹ دے گا اور بے تعلق کر دے گا۔ یہی بات ایک دوسری حدیث میں بھی فرمائی گئی۔ (روح، تبیان، و دیگر)

عن عبدالرحمٰن بن عوف قال سمعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یقول قال اللہ تبارک وتعالی انااللہ واناالرحمٰن خلقت الرحم وشققت لھا من اسمی فمن وصلھا وصلتہ ومن قطع بت۔تہ

(حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرماتے تھے: اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں الرحمٰن ہوں، میں نے رشتہ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دے دیا ہے۔ پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات اور مشیت سے پیدائش کا ایسا انتظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ پھر ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے "رحم" مقرر کیا، جو اس کے نام "رحمٰن" سے گویا مشتق ہے۔ یعنی دونوں مادوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ پس جو بندہ انسان کی فطرت میں رکھے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ان حقوق اور

تقاضوں کو ادا کرے گا یعنی صلہ رحمی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ اس کو جوڑے گا یعنی اس کو اپنا بنالے گا اور فضل وکرم سے نوازے گا۔اس کے برعکس کوئی قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اور قرابت کے ان حقوق کو پامال کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور انسان کی فطرت میں رکھے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا یعنی اپنے قرب اور اپنے رحم وکرم سے محروم کردے گا۔اس مفہوم کو استعارہ کے گہرے رنگ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک اور طریقے سے بھی بیان فرمایا،اس حدیث میں کلام کے تیور بہت تیکھے ہیں جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صلہ رحمی کس قدر اہمیت کی حامل ہے اور قطع رحمی کس قدر خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے :

(اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔جب پروردگار اس سے فارغ ہوئے تو رحم یعنی قرابت نے اٹھ کر پروردگار کا دامن پکڑ لیا۔پروردگار نے فرمایا بتا کیا بات ہے ؟ حقِ قرابت نے کہا یہی جگہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ لینے کی ہے۔پروردگار نے فرمایا : کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ جو تجھے جوڑے میں اسے جوڑوں اور جو تجھے توڑے میں اسے توڑ دوں ؟ حقِ قرابت نے کہا : کیوں نہیں،اے رب ! میں اس پر راضی ہوں۔ پروردگار نے فرمایا پھر یہی کچھ ہوگا)

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق

سورۃالنساء کی اس آیت کریمہ میں معاشرتی حقوق کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اس میں اہل قرابت کے بعد یتیموں اور مسکینوں کا ذکر ہے کیونکہ یتیم اور حاجت مند لوگ اہل قرابت میں سے بھی ہو سکتے ہیں او دیگر مسلمانوں میں سے بھی اس لیے اس کی ٹھیک جگہ اہل قرابت کے پہلو میں ہی ہونی چاہیے۔

یتیم "اکیلے اور منفرد " کو کہتے ہیں۔جس سیپ میں ایک ہی موتی ہو اسے در یتیم کہتے ہیں۔اس لحاظ سے یتیم وہ ہے جو بچپن یا لڑکپن میں یعنی بلوغ سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے اکیلا اور تنہا رہ جائے۔قریبی عزیزوں کے رحم وکرم پر ہو یا معاشرہ کی ہمدردی و خیر خواہی کا محتاج ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔

مسکین "مسکنت " سے ہے۔مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بیچارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں مگر نہ توان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے :

المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه ولا یقوم فسال الناس

(مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے، گویا وہ ایک شریف خوددار اور غریب آدمی ہے)

یتیم اور مسکین دونوں ہی اپنی بے کسی اور بے چارگی اور درماندگی کی وجہ سے یکساں طور پر امداد واعانت اور ہمدردی و خیر خواہی کے مستحق ہیں۔ لیکن یتیم مسکنت اور بے چارگی کے ساتھ ساتھ کم عمری اور صغر سنی کے باعث زیادہ ہمدردی اور خیر خواہی کا مستحق ہے اور پھر مساکین میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہو سکتی ہے جنھیں یتیمی کی بے چارگی میں معاشرے نے سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد

نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کا بوجھ تو کسی نہ کسی طرح اٹھائے پھرے مگر ذلت ومسکنت سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اس لیے قرآن کریم اگرچہ یتامیٰ اور مساکین دونوں کے حقوق پر زور دیتا ہے لیکن یتامی کا ذکر پہلے کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی اہمیت اور بے چارگی کے باعث یقینا اولیت کے مستحق ہیں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی قرآن کریم کی طرح اپنے ارشادات عالیہ میں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی اور اسے مسلمان معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

انا وكافل اليتيم له ولغيره في الجنة هكذا واشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئا

(میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا آدمی جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے اور آپ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتلایا اور ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی)

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھا کر کہ ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مرد مومن کے مقام میں ہو گا جو اللہ کے لیے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے۔ خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو جیسے پوتا یا بھتیجا وغیرہ یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک اور ارشاد دیکھئے:

من قبض يتيما من بين المسلمين الى طعامه وشرابه ادخله الجنة البتة الا ان يكون قد عمل ذنبا لا يغفر

(اللہ کے جس بندے نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچے کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا۔ الا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو نا قابل معافی ہو)

ایک اور حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

من مسح راس يتيم لم يمسحه الا الله كان له بكل شعرة يمر عليها يده حسنات ومن احسن الى يتيمة او يتيم عنده كنت انا وهو في الجنة كهاتين وقرن بين اصبعية

(جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کو نیکیاں ملیں گی اور جس نے اپنے زیر کفالت کسی یتیم بچی یا یتیم بچے کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو میں اور وہ آدمی جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا یعنی ان دو انگلیوں کی طرح بالکل پاس پاس ہوں گے)

اندازہ فرمایئے! کہ محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا کتنی بڑی سعادت اور لاکھوں نیکیوں کے حصول کا سبب ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک پیار اور محبت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قرب کا ذریعہ ہے وہ بھی جنت میں۔ یعنی جنت میں داخلہ بجائے خود کتنی بڑی خوش بختی ہے اور پھر اس کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرب۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مزید فرمایا:

خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن اليه وشر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساء اليه

(مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے)

یعنی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کسی گھر کو اللہ کی نگاہ میں عزت و وجاہت کا حامل بنا دیتا ہے اور یتیم کے ساتھ بد سلوکی کسی گھر کو قابل نفرت بنا دیتی ہے لوگ عزت و ذلت کے اسباب اور ذرائع نہ جانے کیا کیا گمان کرتے ہیں لیکن اللہ کی نگاہ میں بالکل دوسرے معیارات ہیں اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ جو گھر اللہ کے یہاں بہتر ہے اسی پر اس کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے وہیں رزق میں برکت ہوتی ہے اور اسی گھر کے مکینوں کو نیکیوں کی توفیق ہوتی ہے اور جو گھر اس کے یہاں برا ہے وہ خیر و برکت سے محروم اور توفیق خداوندی سے دور ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مساکین کے ساتھ مروت و خیر خواہی کو اتنی بڑی نیکی قرار دیا ہے جو سراسر اللہ کا کرم ہے ورنہ آدمی کبھی اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ارشادِ نبوی ہے:

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ واحسبہ قال کالقائم لایفتر و کالصائم لایفطر

(کسی بے چاری بے شوہر والی عورت یا کسی مسکین حاجت مند کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ اللہ کے نزدیک اور اجر و ثواب میں راہ خدا میں جہاد کرنے والے بندے کی طرح ہے)

(راوی کہتا ہے) اور میرا گمان ہے کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ اس قائم اللیل (یعنی شب زندہ دار) بندے کی مانند ہے جو (عبادت اور شب خیزی میں) سستی نہ کرتا ہو اور اس قائم الدھر بندے کی مثل ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو کبھی ناغہ نہ کرتا ہو۔

یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال بلند ترین عمل ہے اسی طرح کسی بندے کا یہ حال کہ اس کی راتیں عبادت میں کٹتی ہوں اور دن ہمیشہ روزہ رکھتا ہو بڑا ہی قابل رشک حال ہے۔ لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی درجہ اور مقام ان لوگوں کا بھی ہے جو کسی حاجت مند مسکین یا کسی ایسی لاوارث عورت کی خدمت و اعانت کے لیے جس کے سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو دوڑ دھوپ کریں۔

مختصر یہ کہ اسلام نے مختلف اسالیب سے یتامیٰ و مساکین کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مقام کے تعین اور بعثت نبوی کے وقت ان مظلوم گروہوں سے متعلق دنیا کی ذہنیت کی تبدیلی کے لیے حیرت انگیز کام کیا جس سے فی الواقع یتامیٰ اور مساکین کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا معاشرتی مقام نصیب ہوا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محض تذکیر و ترغیب سے لائی ہوئی تبدیلی دیرپا اور مستقل نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام نے اسی پر اکتفا کرنے کی بجائے یتامیٰ اور مساکین کو قانونی تحفظ بھی دیا اور ان بے کسوں پر ہونے والے مظالم کا قانونی عمل سے انسداد کر کے رکھ دیا۔

پڑوسیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ نیکی کرنے کا بیان

ایک مسلمان کی زندگی میں ایمان سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔ وہ ایک مومن بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے اور مومن بن کر ہی مرنا چاہتا ہے اور اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کسی چیز کے نہ کرنے سے میرے ایمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہو سکتی اور اگر اسی خطرے کا اظہار آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے نہائیت پرخطر طریقے سے اور

تاکیدی انداز میں فرمایا جائے تو پھر اس کے خطرناک ہونے اور اس کے ثابت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ آپ ذرا اس حدیث کو ملاحظہ فرمایئے! اور اندازہ فرمایئے کہ اس میں کلام کے تیور کتنے تیکھے ہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ بات فرماتے ہوئے کس قدر جلال میں دکھائی دیتے ہیں۔

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لا یومن واللہ لَا یُؤمِنُ وَاللہِ لَا یُؤمِنُ قِیلَ مَنْ یَا رَسُولَ اللہ؛ قَالَ الَّذِی لَا یَاْمَنُ جَارُہُ بَوَائِقَہ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم وہ شخص مسلمان نہیں، اللہ کی قسم اس میں ایمان نہیں، اللہ کی قسم وہ صاحب "ایمان نہیں عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون شخص؟ یعنی حضور کس بدنصیب شخص کے بارے میں قسم کے ساتھ ارشاد فرمارہے ہیں کہ وہ مومن نہیں اور اس کا ایمان نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور اس کی فتنہ پردازیوں سے مامون اور بے خوف نہیں ہیں۔"

اندازہ کیجیے! آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کس قدر حتمی انداز میں اس آدمی کے صاحب ایمان ہونے سے انکار فرمارہے ہیں۔ جس آدمی کا رویہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ اس طرح کا ہے کہ وہ اس کی شرارتوں اور اس کی دل آزاریوں سے پریشان ہیں۔ یعنی ہمسایہ ہمسائے کے لیے قوت اور راحت کا سامان ہونا چاہیے اور اگر اس کے برعکس اس نے اپنے ہمسائے کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے تو وہ یقینا ایمان کے اعتبار سے کوئی بہتر آدمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دو خواتین کے بارے میں بتایا گیا کہ حضور ایک خاتون بہت عبادت گزار، شب زندہ دار، راہ اللہ میں مال صرف کرنے والی اور بہت نیک ہے لیکن اس کے ہمسائے اس کی زبان درازیوں سے بہت پریشان ہیں۔ لیکن دوسری خاتون جو بہت زیادہ عبادت گزار نہیں صرف فرائض کی پابند ہے لیکن اس کے ہمسائے اس کے سلوک اور اس کی مروت سے بہت خوش ہیں اور بہت تعریف کرتے ہیں تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ پہلی خاتون کا نیکی میں کوئی حصہ نہیں اور وہ اپنی زبان درازیوں کے باعث جہنم میں جائے گی اور دوسری خاتون اپنے ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے جنت میں داخل کی جائے گی۔ اسی طرح ایک اور حدیث کے مطابق آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمسائے کے حقوق ادا نہ کرنے والے کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ ایسے شخص نے معلوم ہوتا ہے مجھے مانا ہی نہیں۔ ذرا حدیث کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

عن انس قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ما امن بی من بات شبعان وجارہ جائع الی جنبہ وھو یعلم بہ

(حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا یعنی اس نے مجھے مانا ہی نہیں جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو بے فکری سے سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکے ہونے کی خبر ہو)

پڑوسی کے معاشرتی حقوق

اس سلسلے میں آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات غایت درجہ، پر مغز اور از بس لطیف واقع ہوئے ہیں۔ ان ارشادات میں آپ نے معاشرتی حقوق کو بھی بیان فرمایا اور اصلاحی اور دعوتی حقوق کی بھی تاکید فرمائی معاشرتی حقوق کے حوالے سے آپ کا ارشاد گرامی ہے:

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حق الجار ان مرض عدتہ وان مات شیعتہ وان استقرضک اقرضتہ وان اعور سترتہ وان اصابہ خیر ھناتہ وان اصابتہ مصیبتہ عزیتہ ولاترفع بناء ک فوق بناہ فتسد علیہ الریح ولاتوذیہ بریح قدرک الاان تغرف لہ منھا

(رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو اور انتقال کر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ) اور اگر وہ اپنی ضرورت کے لیے قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اسے قرض دو اور اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارکباد دو اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو اس کی کوشش کرو کہ) تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے (اور اس کے بچوں کے لیے) باعث ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اس کے گھر تک نہ جائے) الا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا کچھ اس کے گھر بھی بھیج دو)

اس حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پڑوسی کے معاشرتی حقوق بیان فرمائے ہیں۔ ہم انھیں اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پڑوسی سے حسن سلوک کرنے اور حق جوار کی رعایت کرنے کی مطلقاً تو جا بجا تاکید فرمائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عام معمول کے تعلقات اور روزمرہ کے معمولات میں پڑوسی کے ساتھ مروت اور شائستگی سے پیش آنا اور دونوں کا ایک دوسرے کے لیے تقویت اور اکرام وراحت کا ذریعہ بن کر زندگی گزارنا تو ایک مستقل وتیرہ ہونا چاہیے لیکن مخصوص حالات میں تعین کے ساتھ مخصوص احکام دیئے، مثلاً حکم دیا

1۔ اگر پڑوسی بیمار ہو جائے تو دوسرے پڑوسی کا فرض ہے کہ وہ اس کی تیمارداری عیادت اور خبر گیری کرے۔ یعنی بیماری کے دنوں میں اسے جس طرح کی مدد اور دلجوئی کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرے۔ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تو دیکھ بھال کرے۔ ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہو تو ہسپتال لے کر جائے، وہ تہی دامن ہے تو ادویہ مہیا کرے اور بقدر استطاعت جتنی مدد اور اعانت کر سکتا ہو اس میں دریغ نہ کرے اور ایسا رویہ اختیار کرے کہ اسے اپنے تنہا ہونے کا احساس نہ ہو۔

2۔ اور اگر خدانخواستہ پڑوسی انتقال کر جائے تو جنازے کے ساتھ جائے اگر اس کے تکفین اور تدفین میں مدد کی ضرورت ہو یعنی کفن خریدنا پڑے تو کفن خریدے۔ قبر کھدوانے کی ضرورت ہو تو قبر کھدوائے۔ پھر تدفین میں ساتھ رہے۔ مرحوم کے اہل خانہ کے لیے کھانے کا انتظام کرے کیونکہ وہ غم کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی دور دراز کے مہمان آئے ہوں تو ان کی بھی دیکھ بھال کرے۔ مرحوم کے اہل خانہ کی ہمدردی اور دلجوئی کی پوری کوشش کرے اور ان پر ذمہ داری کا بار کم سے کم کرنے کی کوشش کرے۔

3۔ اگر پڑوسی کبھی حالات کی نامساعدت یا کسی ناگہانی آفت سے مجبور ہو کر قرض مانگے تو اس کے پڑوسی کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ بقدر استطاعت مدد اور اعانت سے دریغ نہ کرے کیونکہ مالی احتیاج بعض دفعہ جسمانی احتیاج سے بھی شدید تر ہوتی ہے اور ایسی صورت میں دستگیری نہ کرنا اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سنگین نتائج کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ایک آدمی کا اصل امتحان مالی معاملات میں ہی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو وقت اور ہمت صرف کرنے میں فیاض ہوتے ہیں لیکن مالی ایثار میں کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان حقوق میں ہر طرح کے تعاون اور ایثار کو شامل فرمایا ہے۔

4۔اگر پڑوسی سے کوئی برائی ہو جائے تو دوسرے پڑوسی کو پردہ پوشی سے کام لینا چاہیے۔غلطیوں اور فرو گزاشتوں سے کون مبرا ہے۔کتنے گناہ گار ہیں جن کے گناہوں پر رحمت حق نے پردہ ڈال رکھا ہے۔پڑوسی کو پڑوسی کے لیے رحمت بننا چاہیے۔غایت اتصال اور اکثر اوقات کی آگاہی کے باعث ایک دوسرے کے عیوب کی اطلاع اکثر اوقات ممکن ہے اس لیے اصلاح کے حوالے سے اور تعلقات کے استحکام کے لیے بھی ضروری ہے کہ عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔

5۔تعلقات میں گہرائی اور گیرائی محبت اور اخلاص اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب پڑوسی دوسرے پڑوسی کے احساسات میں بھی شریک اور حصہ دار بن جائے یعنی اگر پڑوسی بھائی کو کوئی نعمت میسر آئے، کوئی خوشی اور مسرت کا لمحہ نصیب ہو مثلاً اللہ گھر میں بچہ دے یا کوئی بچہ امتحان میں کامیاب ہو یا کسی کو نوکری ملے، ملازمت میں ترقی ہو، کاروبار پھلے پھولے، غرضیکہ بہتری اور خوشی کی کوئی بھی صورت پیدا ہو تو دوسرے پڑوسی کو تہنیت اور مبارکباد پیش کرنے کے لیے ضرور جانا چاہیے۔اس طرح اس کی خوشی دو چند ہو جائے گی اور دونوں کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گی اور استحکام آئے گا۔

6۔جس طرح دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہونے سے تعلقات میں قربت آتی ہے اس طرح مصیبت اور غم کے موقع پر ہمدردی اور غمخواری کرنے سے قلبی رشتے قائم ہوتے ہیں بلکہ مصیبت اور درد کے رشتے خوشی کے تعلقات سے زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پڑوسی کا یہ حق رکھا ہے کہ اگر تمہارے پڑوسی کو کوئی دکھ پہنچے تو تمہارا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کے دکھ اور غم میں شرکت کرو۔اس کا غم بٹانے کی کوشش کرو۔اس سے ہمدردی اور خیر خواہی کرو۔اس طرح اس کی مصیبت کو بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور انسانیت پر جانبین کا اعتقاد مستحکم ہو جائے گا۔

7۔پڑوسی کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کے مکان سے دوسرا پڑوسی اپنے مکان کی دیوار اتنی بلند نہ کرے کہ اس کی ہوا رک جائے اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں جیل کی دیواروں کے پیچھے بیٹھا ہوں۔آج بجلی کی سہولت کی وجہ سے شائد اس نصیحت کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہ ہو سکے لیکن جن پسماندہ دیہات اور علاقوں میں آج بھی یہ سہولت نہیں ہے ان سے پوچھئے کہ پڑوسی کی بلند دیواروں کا کیا مفہوم ہے ؟اور ان سے کیسی اذیت ہوتی ہے۔البتہ ! ہوا بند ہونے کے علاوہ ان بلند دیواروں یا غیر ذمہ دار اور غیر شائستہ پڑوسی سے ایسی اذیتیں بھی وقوع پذیر ہوتی ہیں جن کا آج سے پہلے تصور بھی ممکن نہیں تھا۔لیکن ان کا تعلق چونکہ صرف دیواروں کی بلندی سے نہیں اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کا الگ سے ذکر فرمایا

8۔مندرجہ بالا حدیث میں آخر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے پڑوسی کو ایذا اور تکلیف مت پہنچاؤ اپنی ہنڈیا کی مہک سے یعنی ایسی ہنڈیا مت پکاؤ جس کی مہک اور خوشبو غریب پڑوسی تک پہنچے اور اسے اور اس کے بچوں کو یہ خوشبو اپنی محرومیوں کی یاد دلانے لگے اور بچے چونکہ اپنی محرومیوں کا ذمہ دار بالعموم اپنے والد کو سمجھتے ہیں تو ایسے مواقع پر زبانیں خاموش بھی رہیں لیکن خشمگین نگاہیں والد کو ضرور گھورتی ہیں اور دل میں دبا ہوا احساس لاوے کی طرح کھولنے لگتا ہے۔اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہدایت فرمائی کہ اس کی کسی حد تک تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو پر تکلف پکوان گھر میں تیار ہوا ہے اس میں سے کچھ ہمسائے کے گھر بھی بھیجو تا کہ وہ تمہیں بھی اپنا سمجھیں اور ان کے دلوں میں رشک و حسد کی بجائے اپنائیت کے جذبات پیدا ہوں۔

پیشِ نظر آیت کریمہ میں اب تک چھ قسم کے لوگوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں جو خونی رشتوں یا ہمسائیگی کے تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ قربت رکھتے تھے۔ اب دو طرح کے ایسے لوگوں کے حقوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نہ تو خونی رشتوں سے منسلک ہیں اور نہ ہمسائیگی کی وابستگی رکھتے ہیں۔ ان میں ایک "اِبْنِ السَّبِيْلِ " ہیں اور دوسرا "وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ"

اِبْنِ السَّبِيْلِ کا معنی ہے "مسافر"۔ اندرونِ ملک یا بیرون ملک سے آنے والا کوئی شخص یا چند اشخاص جو کسی بھی نیک ارادے سے گھر سے نکلے ہوں یہ تمام لوگ مسافر ہیں۔ ان میں دونوں طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں وہ بھی جو اپنے پاس سفر کی ضروریات کے لیے کافی سرمایہ رکھتے ہیں اور وہ بھی جو واجبی سا خرچ لے کر نکلے ہیں اور کسی وقت بھی ضروریات میں کمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ بظاہر اپنے ساتھ زرِ کثیر یا سہولیات کی ایک بڑی مقدار لے کر آئے ہیں یہ اندیشہ تو ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے کہ وہ کسی نقصان یا کسی حادثے کا شکار ہو جائیں۔ سامان چوری ہو جائے، راستے میں ایکسیڈنٹ ہو جائے، کار تباہ ہو جائے، جسمانی طور پر کسی نقصان کا شکار ہو جائیں، تو باوجود اس کے کہ یہ لوگ اپنی ذات میں مالدار اور معزز لوگ ہیں لیکن اب چونکہ حالات نے انھیں ضرورت مند اور حاجت مند بنا دیا ہے تو اسلام نے ان کو وہ حقوق عطا کیے ہیں جو ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کے لیے ہیں اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے وہی فضائل ہیں جو کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے فضائل ہو سکتے ہیں۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ ان کی کوئی مالی مدد کر کے ان کو سفر کے قابل بنا دیں یہ بھی عین سعادت کی بات ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختلف ارشادات میں اور قرآن کریم نے اپنی مختلف آیات میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ننگوں کو کپڑا پہنانے کی بہت فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معاشرے کے پاس بطور مہمان آ جائیں اور معاشرہ انھیں اپنے پاس مہمان ٹھہرا کر ان کو سنبھالا دینے کی کوشش کرے۔

وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا معنی ہے "وہ جو تمہارے زیر دست ہیں"، "تمہارے ہاتھ جن کے مالک ہیں"۔ نزولِ قرآن کے وقت تک اس طبقے کی زنجیریں کٹنے کی بجائے مضبوط ہوتی رہی تھیں۔ ہر دور میں فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوموں کے افراد کو غلامی کی زنجیریں پہنائی ہیں اور اپنی خواہشات اور قوت واقتدار کے لیے ہمیشہ ان کو ایندھن بنایا۔ شاہوں اور ظالم امراء کے چراغ ہمیشہ ان مظلوموں کے پسینے اور خون سے جلتے رہے۔ ہندوؤں میں اچھوت اسی ظلم کی یادگار ہیں، مصر میں بنی اسرائیل کے ساتھ یہی ظلم ہوتا رہا، رومیوں کے بحری جہاز اسی مظلوم طبقے کی توانائیوں کو نچوڑتے رہے، ان کے کھیلوں کے میدان درندوں کے جبڑوں میں انھیں تڑپتا دیکھ کر تالیوں سے گونجتے رہے، عربوں میں بھی یہی مظلوم طبقہ اپنی محرومیوں کی تصویر بنا زندگی کا رتھ کھینچتا رہا۔ مذہب جب بھی دنیا میں آیا اس نے ہمیشہ مظلوموں کی دادرسی کی اور کمزوروں کو طاقت اور خود اعتمادی دے کر جبر واستبداد کا شکنجہ توڑا۔

بعثتِ نبوی کے وقت دنیا میں جو بین الاقوامی قوانین جنگ نافذ تھے ان میں قیدیوں کے تبادلے یا فدیہ وغیرہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کی بجائے مفتوح قوم کے افراد کو غلام بنا لینے کا عام چلن تھا۔ اسلام کو بادل نخواستہ اس کو قبول کرنا پڑا۔ لیکن اسے ایک تدبیر کے طور پر اختیار کیا گیا۔ اسے اسلامی نظام کا جزو یا اسلامی اہداف میں سے ایک ہدف قرار نہیں دیا۔ علاوہ ازیں اس میں ایسی اصلاحات کیں جس سے غلامی استحصل کا ذریعہ بننے کی بجائے تربیت و تشکیل کردار کا ذریعہ بن گئی۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کو جب مسلمان گھرانوں میں رہ کر مسلمانوں کے سیرت و کردار کو قریب سے دیکھنے کا اور اسلام اور اس کے اثرات کو براہ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تو ان کی عظیم اکثریت نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ ان میں سے ایک قابل ذکر تعداد وعلماء، فضلا اور مجاہدین کی ایسی تیار ہوئی جس پر ہمیشہ مسلمانوں کی تاریخ فخر کرتی رہے گی۔

مزید برآں اسلام نے اس عقدہ کو حل کرنے کے لیے ایسی اصلاحات تجویز کیں جس نے پہلے مرحلے میں غلاموں کو ایک مظلوم طبقے کی بجائے عام انسانوں کی طرح زندگی کے سفر میں شرکت کے قابل بنایا۔ کسی کو عبد کہہ کر بلانے پر پابندی لگادی۔ تمام امتیازی علامات کا خاتمہ کر دیا۔ ان کی معاشرتی زندگی کو برابر کی سطح پر لانے کے لیے حکم دیا کہ غلاموں کو اپنے بھائی سمجھو اور ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرو۔

عن ابی ذر قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن جعل اللہ اخاہ تحت یدیہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا یکلفہ من العمل ما یغلبہ ان کلفہ ما یغلبہ فلیعنہ علیہ

(حضرت ابو ذر (رض) کہتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہ غلام تمہارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری زیر نگرانی دے دیا ہے جس کے بھائی کو اللہ تعالیٰ اس کی تحویل میں دے دے اسے چاہیے کہ جو خود کھائے اسے کھلائے جو خود پہنے اسے پہنائے اور اس کی ہمت سے بڑھ سے اسے کام کی تکلیف نہ دے اور اگر کسی مشکل کام کا بار اس پر ڈالے تو اس میں خود اس کی مدد کرے)

دوسرے مرحلے میں غلاموں کو آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا اور اسے اس قدر اہمیت دی کہ قرآن کریم نے اسلامی زندگی اختیار کرنے اور اس راستے میں شریعت کی طرف سے عائد کردہ فرائض وواجبات کو باحسن طریق ادا کرنے کو گھاٹی سر کرنے سے تعبیر کیا اور اس عظیم مہم کے پہلے مرحلے کو "فَكُّ رَقَبَةٍ " کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا قرار دیا پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہ کثرت ارشادات میں اس کی ترغیب فرمائی۔ انھیں میں ایک ارشاد حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے۔ آپ سید عالم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، شرمگاہ کے بدلے شرمگاہ۔

حضرت سیدنا علی بن حسین (امام زین العابدین) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابوہریرہ (رض) سے یہ حدیث خود سنی ہے۔ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر امام زین العابدینؓ نے اپنے سب سے قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے ان کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ مزید برآں کفارہ کی مختلف شکلوں میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قتل خطا، عمداً روزہ توڑنے اور بیوی سے ظہار وغیرہ میں غلام کی موجودگی میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح غلام اگر آزادی حاصل کرنے کے لیے شریعت کی عطا کردہ قانونی صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرنا چاہے تو غلام کے مالک کو اسے قبول کر لینے کا حکم ہے۔

انہی ترغیبات اور تعلیمات کا نتیجہ کا یہ ہوا کہ مسلمانوں میں غلامی کو ختم کرنے غلاموں کی فلاح و بہبود اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کا ایک دینی ذوق پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے ہر مالدار شخص اس نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ حضرت حکیم بن حزام فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمانوں ہوئے آپ نے ایک سو غلام آزاد کیے۔ حضرت عثمان غنی (رض) ہر جمعہ کو دس غلام آزاد کرتے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) نے مجموعی طور پر تیس ہزار غلام آزاد کیے۔ ایسی ہی کاوشوں کے نتیجے میں نہ صرف غلامی ختم ہو گئی بلکہ ماضی کے غلام مستقبل میں حکمران بن کر اٹھے۔ (روح)

جو پڑوسی رشتہ دار ہو اس کا ایک حق اسلام ہے اور ایک رشتہ داری کا حق ہے اور ایک پڑوسی کا حق ہے ' اور جو پڑوسی اجنبی ہو اس کے ساتھ اسلام اور پڑوسی کا حق ہے۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کے گھر ایک بکری ذبح کی گئی تو انھوں نے دوبارہ پوچھا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے ہدیہ بھیجا یا نہیں ' میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جبرائیل مجھ کو ہمیشہ پڑوسی کے متعلق وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے یہ گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو میراوارث کردے گا۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۴۹ ' صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ۶۰۱۴ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۲۶۲۴ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۵۱ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۳۶۷۳)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنے دوستوں کے نزدیک اچھا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے ' اور جو شخص اپنے پڑوسیوں کے نزدیک اچھا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۵۱ ' الادب المفرد ' رقم الحدیث : ۱۱۵ ' سنن دارمی ' ج ۲ ص ۲۱۵)

حضرت عائشہ (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ ! میرے دو پڑوسی ہیں ' میں ان میں سے کس کے ساتھ ابتداء کروں ' فرمایا جس کا دروازہ تمہارے دروازہ کے زیادہ قریب ہو۔ اس حدیث کو امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ (الوسیط ج ۴ ص ۵۰ ' صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ۶۰۲۰)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت معاویہ بن حیدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پڑوسی کا مجھ پر کیا حق ہے ؟آپ نے فرمایا اگر وہ بیمار ہو تو تم اس کی عیادت کرو ' اگر وہ مرجائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو ' اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اس کو قرض دو ' اگر وہ بدحال ہو تو اس پر ستر کرو ' اگر اس کو کوئی اچھائی پہنچے تو اس کو مبارک باد دو ' اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس کی تعزیت کرو ' اپنے گھر کی عمارت اس کی عمارت سے بلند نہ کرو کہ اس کی ہوا رک جائے۔ (المعجم الکبیر : ج ۱۹ ص ۴۱۹)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص سالن پکائے تو اس میں شوربا زیادہ کرے۔ پھر اپنے پڑوسی کو بھی اس میں سے دے۔ (المعجم الاوسط ' رقم الحدیث : ۳۶۱۵ ' کشف الاستار عن زوائد ' رقم الحدیث : ۱۹۰۱ ' مسند احمد ' رقم الحدیث : ۱۳۶۸)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جو شخص پیٹ بھر کر رات گذارے اور اس کو علم ہو کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہے اس کا مجھ پر ایمان نہیں ہے۔ (المعجم الکبیر ' رقم الحدیث : ۷۵۱ ' کشف الاستار عن زوائد البزار ' رقم الحدیث : ۱۱۹)

علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ ھ نے لکھا ہے کہ جس شخص کا گھر یا دکان تمہارے گھر یا دکان سے متصل ہو وہ تمہارا پڑوسی ہے ' بعض علماء نے چالیس گھروں تک اتصال کا اندازہ کیا ہے۔ (اکمال اکمال المعلم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور اپنے غلاموں کے ساتھ نیکی کرو۔

غلاموں اور خادموں کے ساتھ نیکی کرنے کا بیان

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (یہ) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا ماتحت کردیا ہے۔ سو جو تم کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ اور ان کے ذمہ ایسا کام نہ لگاؤ جو ان پر بھاری ہو اور اگر تم ان

کے ذمہ ایسا کام لگاؤ تو تم ان کی مدد کرو۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۳۰ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۴۳۸۹ ' سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۵۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۵۲ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۳۶۹۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابوالقاسم نبی التوبہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے اپنے غلام کو تہمت لگائی حالانکہ وہ اس تہمت سے بری تھا ' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر حد قائم کرے گا ' سوا اس کے کہ وہ بات صحیح ہو ' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۵۴ ' صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ۶۸۵۸ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۶۶۰ ' سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۶۵)

حضرت ابو مسعود انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا میں نے سنا کوئی شخص میرے پیچھے کھڑا یہ کہہ رہا تھا ابو مسعود تحمل کرو ' ابو مسعود تحمل کرو ' میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے ' آپ نے فرمایا جتنا تم اس پر قادر ہو اللہ تم پر اس سے زیادہ قادر ہے۔ سنن ابو داؤد میں یہ اضافہ ہے میں نے عرض کیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ اللہ کے لیے آزاد ہے ' آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ میں جاتے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۵۵ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۶۵۹ ' سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۵۹)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا ' یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اپنے خادم کو دن میں کتنی بار معاف کروں ' آپ نے فرمایا ہر دن میں ستر بار۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث : ۱۹۵۶)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے خادم کو مارے اور اس کو خدا یاد آجائے تو اس کو مارنا چھوڑ دے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۹۵۷)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے اپنے ایک غلام کو آزاد کردیا وہ ایک تنکے سے زمین کرید رہے تھے انھوں نے کہا اس عمل میں ایک تنکے کے برابر بھی اجر نہیں ہے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اپنے غلام کو طمانچہ مارا یا پیٹا اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے۔ (سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۵۱۶۸)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے غلام آزاد کیا اللہ اس غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس کو عضو دوزخ سے آزاد کردے گا حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلہ میں اس کی فرج آزاد کردے گا۔

اسلام میں غلامی کو ختم کرنے کے لیے بہت سے طریقے مقرر کیے گئے قتل خطا کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے ' قسم توڑنے کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے ظہار کا کفارہ بھی غلام آزاد کرنا ہے ' عمدا روزہ توڑنے کا کفارہ بھی غلام آزاد کرنا ہے اور جس کے پاس غلام نہ ہوں تو وہ کفارہ قسم میں تین دن روزے رکھے گا ' اور باقی صورتوں میں دو ماہ کے روزے رکھے گا۔

ان کے بعد معاشرے میں ہمسایہ اور بے سہارا ہونے والے طبقات یعنی، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور غلاموں کا ذکر ہوا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جبرائیل امین (علیہ السلام) اس قدر ہمسایوں کے بارے میں مجھے تلقین کرتے رہے کہ میں نے سمجھا شاید پڑوسی کو وراثت میں شریک بنادیں گے۔ " [رواہ مسلم : کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار والإحسان إلیہ]

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استفسار کیا کہ میرے دو پڑوسی ہیں میں پہلے کس کو تحفہ بھیجوں؟ آپ نے فرمایا جس کا دروازہ تیرے زیادہ قریب ہے۔[رواہ البخاری: کتاب الادب، باب حق الجوار فی قرب الأبواب]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک موقع پر تین مرتبہ قسم اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کون مومن نہیں؟ فرمایا جس کی تکلیف سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہ ہو۔

[رواہ البخاری: کتاب الادب، باب إثم من لا یأمن جارہ بوائقہ]

مسافر کے حقوق

رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں بالخصوص عرب میں شہر اور بستیاں ایک دوسرے سے بہت ہی دور ہوا کرتی تھیں اور آج کی طرح ہوٹلوں کا انتظام نہیں تھا۔ مسافر لوگ اونٹوں، گھوڑوں اور گدھوں پر سفر کرتے اور اپنا زاد راہ ساتھ رکھا کرتے تھے۔ بسا اوقات راستہ بھول جانے یا مسافت کا اندازہ کرنے میں غلطی ہو جانے کی وجہ سے زاد راہ ختم ہو جاتا۔ بعض اوقات پینے کا پانی بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ ایسے سفر کے بارے میں ہمارے لیے کیا حکم ہے:

(عَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ (رض) اِنَّہٗ قَالَ قُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ إِنَّکَ تَبْعَثُنَا فَنَنْزِلُ بِقَوْمٍ فَلَا یَقْرُوْنَنَا فَمَا تَرٰی، فَقَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَأَمَرُوْا لَکُمْ بِمَا یَنْبَغِیْ لِلضَّیْفِ فَاقْبَلُوْا، فَإِنْ لَمْ یَفْعَلُوْا فَخُذُوْا مِنْہُمْ حَقَّ الضَّیْفِ الَّذِیْ یَنْبَغِیْ لَہُمْ) [رواہ البخاری: کتاب الادب، باب إکرام الضیف وخدمتہ إیاہ بنفسہ]

"حضرت عقبہ بن عامر (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ آپ ہمیں کسی مہم پر روانہ کرتے ہیں اگر ہم ایسے لوگوں کے پاس سے گزریں یا اتریں جو ہماری مہمان نوازی کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اس صورت حال میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر لوگ تمہارا خیال رکھیں تو اچھی بات ہے بصورت دیگر تمہیں ان سے اپنی مہمانی کا حق وصول کرنا چاہیے۔"

مراد یہ ہے کہ بھوکا مرنے کے بجائے ان سے کھانا پینا مانگا جاسکتا ہے۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا "اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا"

اس آیت کریمہ کی وضاحت میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق عبادت کو بیان کرنے کے بعد بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا حکم دیا ہے اور بندوں کے معاملے میں جن رشتوں اور جن وابستگیوں کی اہمیت بنیادی ہے بطور خاص ان کے لیے ادائے حقوق کی تاکید کی گئی ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ ادائے حقوق اور احسان کی ادائیگی کے لیے ایک خاص ذہنیت اور خاص مزاج کی ضرورت ہے، جس میں اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری اور بندوں کے ساتھ معاملات میں تواضع کا جذبہ کارفرما ہو۔ یہی جذبہ انسان کو ادائے حقوق اور احسان پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس انسان کے اندر وہ رویہ پیدا ہو جائے جس سے گھمنڈ اور فخر پیدا ہوتا ہے اور جس سے انسان میں تکبر کو راہ ملتی ہے۔ تو ایسے انسان سے کبھی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرے گا، جن کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے گا، لوگوں سے حسن سلوک سے پیش آئے گا کیونکہ تکبر اور گھمنڈ انسان کے اندر بالکل اس سے متضاد اخلاق پیدا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسانیت مجروح ہوتی اور انسانی رشتے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ناشکروں

اور کم ظرفوں کی اللہ کے ہاں کیا پذیرائی ہوسکتی ہے ؟اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا یعنی میں ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ اس رویے سے انسان کے اندر چند خصوصیات جنم لیتی ہیں جو انسانیت کے لیے بدنما داغ سے کم نہیں۔اگلی آیت کریمہ میں انھیں کا ذکر فرمایا جارہاہے۔اب ہم ایک ترتیب سے انھیں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسائل

۱۔اللہ تعالیٰ کی بلا شرکت غیرے عبادت کرنا، والدین اور دیگر رشتہ دار، تعلق داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا لازم ہے۔

۲۔اللہ متکبر کو پسند نہیں کرتا۔

3۔نہ جاندار کو نہ بے جان کو نہ اس کی ربوبیت میں نہ اس کی عبادت میں۔

4۔ادب و تعظیم کے ساتھ اور ان کی خدمت میں مستعد رہنااور ان پر خرچ کرنے میں کمی نہ کرو۔ مُسلِم شریف کی حدیث ہے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین مرتبہ فرمایااس کی ناک خاک آلود ہو حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا کس کی یارسول اللہ فرمایا جس نے بوڑھے ماں باپ پائے یاان میں سے ایک کو پایااور جنّتی نہ ہو گیا

5۔حدیث شریف میں ہے رشتہ داروں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے والوں کی عمر دراز اور رزق وسیع ہوتا ہے۔(بخاری ومسلم)

6۔حدیث : سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اور یتیم کی سرپرستی کرنے والا ایسے قریب ہوں گے جیسے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی (بخاری شریف) حدیث : سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیوہ اور مسکین کی امداد و خبر گیری کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کے مثل ہے۔

7۔سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے ہمیشہ ہمسایوں کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کرتے رہے اس حد تک کہ گمان ہوتا تھا کہ ُان کو وارث قرار دیں (بخاری ومسلم)

8۔یعنی بی بی یا جو صحبت میں رہے یا رفیق سفر ہو یا ساتھ پڑھے یا مجلس ومسجد میں برابر بیٹھے۔

9۔اور مسافر و مہمان حدیث : جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھے اسے چاہیے کہ مہمان کا اکرام کرے۔(بخاری ومسلم)

10۔کہ انھیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اور سخت کلامی نہ کرو اور کھانا کپڑا بقدر ضرورت دو۔حدیث : رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جنت میں بدخلق داخل نہ ہو گا۔(ترمذی)

11۔مُتکبِّر خود بیں جو رشتہ داروں اور ہمسایوں کو ذلیل سمجھے۔(نور)

آیت مبارکہ:

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿ۚ۳۷﴾

لغات القرآن: [الَّذِيْنَ : جو لوگ] [يَبْخَلُوْنَ : بخل کرتے ہیں] [وَيَاْمُرُوْنَ : اور حکم کرتے (سکھاتے) ہیں] [النَّاسَ : لوگ (جمع)] [بِالْبُخْلِ : بخل] [وَيَكْتُمُوْنَ : اور چھپاتے ہیں] [مَآ : جو] [اٰتٰىهُمُ : انہیں دیا] [اللّٰهُ : اللہ] [مِنْ : سے] [فَضْلِهٖ : اپنا فضل] [وَاَعْتَدْنَا : اور ہم نے تیار کر رکھا ہے] [لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے] [عَذَابًا : عذاب] [مُّهِيْنًا : ذلت والا]

ترجمہ: جو لوگ (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں اور اس (نعمت) کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہے، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح: اس سے پہلے والدین، عزیز و اقارب، یتامی، مساکین، پڑوسیوں اور مسافروں کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا حکم ہے۔ اس لیے یہاں بخل کی مذمت کی گئی ہے۔

بخل

اس فرمان میں اللہ تعالیٰ نے مال واسباب کو اپنا فضل قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے سرفراز فرمائے ان کا فرض ہے کہ وہ بخل کرنے کی بجائے سخاوت کا مظاہرہ کریں۔ بخل کا ماحول پیدا کرنے یا مستحق حضرات پر خرچ نہ کرنے کا حکم دینے اور مال کو چھپا کر رکھنے کی بجائے لوگوں کو صدقہ و خیرات کرنے کی تلقین کرنی چاہیے۔ مال چھپا چھپا کر رکھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرنا چاہیے۔ جو لوگ بخل کرنے کے ساتھ دوسروں کو بخل کے لیے کہتے ہیں ایسے ناشکروں اور نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی رسوا کن عذاب تیار کیا ہے۔ (فہم)

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ : وہ لوگ جو خود بخل کرتے ہیں۔} لغتِ عرب میں بخل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو مال دیا اس میں سے سائل کو نہ دینا اور بخل کی شرعی تعریف یہ ہے کہ جو چیز ذمہ میں واجب ہو اسے ادا نہ کرنا۔

(بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ۱/۳۳۹)

صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی (رح) فرماتے ہیں: بخل یہ ہے کہ خود کھائے دوسرے کو نہ دے۔ شُحّ یہ ہے کہ نہ کھائے نہ کھلائے۔ سَخایہ ہے کہ خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے، جود یہ ہے کہ آپ نہ کھائے دوسرے کو کھلائے۔ (خزائن العرفان، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ص ۱۶۶، مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ص ۲۲۷)

یہاں بخل سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے توراۃ میں مذکور اوصاف بیان کرنے میں بخل کرنا اور اس کا حکم دینا۔ شان

نزول:

یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو توراۃ میں مذکور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف بیان کرنے میں بخل کرتے اور چھپاتے تھے۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ۱/۳۷۹)

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مال خرچ کرنے میں بخل کرنا ہے۔ (تفسیر کبیر، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ۴/۷۸)

حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے، سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "دو خصلتیں کسی مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں، بخل اور بد خلقی۔

(ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی البخل، ۳/۳۸۷، الحدیث: ۱۹۶۹)

تنبیہ: اس سے موجودہ زمانے کے ان علماء کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف حمیدہ خود بھی بیان نہیں کرتے اور بیان کرنے والوں کو بھی طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت (رح) فرماتے ہیں:

ذکر روکے فضل کاٹے نقص کا جویاں رہے پھر کہے مَرْدَک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

نوٹ: بخل کے بارے میں کافی تفصیل سورۂ آلِ عمران آیت 180 میں گزر چکی ہے۔

{ وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اور اللہ نے جو انھیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔} اللہ عَزَّوَجَلَّ جو نعمت عطا فرمائے اسے اچھی نیت کے ساتھ موقع محل کی مناسبت سے حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے ظاہر کرنا چاہیے۔ حضرت ابو الاحوص (رض) فرماتے ہیں، میرے والد پراگندہ بال اور ناپسندیدہ ہیئت میں سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کیا تیرے پاس مال نہیں؟ عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، مجھے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مال عطا فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے کو جب کوئی نعمت عطا فرمائے تو اس کا اثر بندے پر دیکھنا پسند فرماتا ہے۔

(مسند امام احمد، مسند المکیین، حدیث مالک بن نضلۃ ابی الاحوص (رض)، ۵/۳۸۴، الحدیث: ۱۵۸۹۲)

مسئلہ: اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نعمت کا اظہار اخلاص کے ساتھ ہو تو یہ بھی شکر ہے اور اس لیے آدمی کو اپنی حیثیت کے لائق جائز لباسوں میں بہتر پہننا مستحب ہے۔ (صراط)

یہاں صرف خرچ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو لوگ نمود و نمائش اور دوسروں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں در حقیقت وہ لوگ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کا اللہ اور آخرت پر یقین ہوتا تو یہ بطور احسان، نمود و نمائش اور لوگوں سے خوشامد کی صورت میں اپنے صدقہ کا معاوضہ نہ لیتے۔ اگر ان کا آخرت پر یقین ہوتا تو یہ دنیا میں عارضی شہرت کی خاطر آخرت کا دائمی اجر ضائع نہ کرتے۔ اس ہلکے پن اور جلد بازی کا حقیقی سبب شیطان کا پھسلانا اور اکسانا ہے۔ شیطان تو آدمی کا بدترین ساتھی ہے۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَثَلَ الْبَخِیْلِ وَالْمُتَصَدِّقِ كَمَثَلِ رَجُلَیْنِ عَلَیْهِمَا جُبَّتَانِ مِنْ حَدِیْدٍ قَدِ اضْطُرَّتْ اَیْدِیْهِمَا اِلٰی ثُدِیِّهِمَا وَتَرَاقِیْهِمَا فَجَعَلَ الْمُتَصَدِّقُ كُلَّمَا تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ انْبَسَطَتْ عَنْهُ حَتّٰی تَغْشٰی اَنَامِلَهٗ وَتَعْفُوَ اَثَرَهٗ وَجَعَلَ الْبَخِیْلُ كُلَّمَا هَمَّ بِصَدَقَةٍ قَلَصَتْ

وَاِنْحَدَّتْ كُلُّ حَلْقَةٍ بِمَكَانِهَا قَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ (رض) فَاَنَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُوْلُ بِاِصْبَعِہٖ ھٰکَذَا فِیْ جَیْبِہٖ فَلَوْ رَاَیْتَہٗ یُوَسِّعُھَا وَلَا تَتَوَسَّعُ) [رواہ البخاری : کتاب اللباس، باب جیب القمیص من عند الصدر وغیرہ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بخیل اور صدقہ دینے والے کی مثال دی کہ اس کی مثال دو آدمیوں کی طرح ہے جو ہاتھ، سینے اور حلق تک فولادی قمیص پہنے ہوئے ہوں۔ صدقہ دینے والا جب بھی صدقہ کرتا ہے تو اس کا جبہ کشادہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کی انگلیوں تک بڑھ جاتا ہے اور قدموں کو ڈھانک لیتا ہے اور بخیل جب صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا جبہ اس سے چمٹ جاتا ہے یہاں تک ہر حلقہ اپنی جگہ پر جم جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا آپ اپنی انگلیوں سے اپنے گریبان کی طرف اشارہ کر کے بتا رہے تھے کہ تم دیکھو گے کہ وہ اس کو کھولنا چاہے گا لیکن وہ نہیں کھلے گا۔“

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) اَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَا مِنْ یَوْمٍ یُّصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْہِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُھُمَا اَللّٰھُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰھُمَّ اَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا) [رواہ البخاری : کتاب الزکوۃ، باب قول اللّٰہِ تعالیٰ فَاَمَّا من اَعطی واتقی وصدق بالحسنٰی]

”حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک یہ آواز لگاتا ہے اے اللہ ! خرچ کرنے والے کو اور عطا فرما۔ دوسرا یہ آواز لگاتا ہے اے اللہ ! نہ خرچ کرنے والے کا مال ختم کر دے۔“

عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْہِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُہُمَا اللّٰھُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ اللّٰھُمَّ اَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ ! بخیل کو (مال و دولت کی) تباہی سے ہمکنار کر۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نصیحت

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّہَا جَاءَتْ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰہُ عَلَیْکِ ارْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ (بخاری و مسلم)

حضرت اسماء (رض) سے روایت ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اے اسماء ! خیر کے راستہ میں خرچ کیا کرو اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کر دے گا اور انفاق سے بچنے کے لیے بہت زیادہ حفاظت نہ برتو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا شروع کر دے گا اور کم از کم جو تجھ سے ہو سکے اس کے دینے سے دریغ نہ کرو۔

سخی کی فضیلت

عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِنَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِنَ الْجَنَّۃِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِنَ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِنَ الْجَنَّۃِ بَعِیْدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّارِ وَلَجَاہِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ عَالِمٍ بَخِیْلٍ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ سخی اللہ سے بھی قریب ہے جنت سے بھی قریب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے، اور جہنم کی آگ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے بھی دور ہے جنت سے بھی دور ہے لوگوں سے بھی دور ہے اور آگ سے قریب ہے اور جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہو) اس کنجوس سے بہتر ہے جو عبادت گذار ہو۔ (گلدستہ)

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ج

(جو خود بھی بخل کرتے اور لوگوں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے) (النسآء : ۳۷)

ایک مومن بخیل نہیں ہوتا

1 اکڑنے والے اور تکبر کرنے والوں میں تکبر کے باعث جو مذموم خصوصیات پیدا ہوتی ہیں ان میں پہلی خصوصیت بخل کرنا ہے اسلامی زندگی میں بخل کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ دو عادتیں کسی مومن میں جمع نہیں ہوتیں " بخل اور بداخلاق "۔ جس طرح اسلامی معاشرے میں ہر طرح کی بداخلاقی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں باہمی تعلقات میں بخل نہایت قابل نفرت چیز ہے کیونکہ بخل بجائے خود کوئی بیماری نہیں وہ انسان کے اس بگاڑ کا اظہار ہے جس کی جڑیں اس کے دل و دماغ میں ہیں۔ آدمی جب یہ سمجھتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے یہ میری دماغی صلاحیت اور دست و بازو کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے بجا طور پر مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی ذات کے سوا کہیں اور خرچ نہ کروں اور اسے سینت سینت کر رکھوں تاکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے۔ یہ وہ قارونی ذہنیت ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد اللہ سے تعلق نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ یہی اعتماد ہے جو جب تکبر کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو پھر اس کی نگاہوں میں انسانی رشتے قابل لحاظ نہیں رہتے۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں ایسا اسیر ہوتا ہے کہ اسے اپنی ذات کے باہر نہ تو کوئی رشتہ نظر آتا ہے نہ کوئی ضرورت نظر آتی ہے، حتیٰ کہ ہمدردی اور خیر خواہی جیسے الفاظ اس کے نزدیک بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اللہ سے مانگنے کا تصور بھی اس کے دل و دماغ سے نکل جاتا ہے۔ اسلام کے تمام تصورات کی اساس توحید ہے جس ذہنیت سے اس بنیادی اساس کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کے بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ کی نگاہ میں کس قدر مبغوض ہوگی۔ ایسی ذہنیت والے آدمی کو آپ اللہ کا نام لے کر یا انسانیت کا نام لے کر کسی بھلائی کے لیے آمادہ نہیں کر سکتے۔ وہ ایک طرف اگر اللہ کی ذات سے کٹ جاتا ہے تو دوسری طرف انسانیت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ صرف لکشمی دیوی (دھن) کی پوجا کرتا ہے اور یہ دھن کی محبت اس کی پوری ذات کا اس طرح احاطہ کرلیتی ہے کہ وہ انسانیت کی بڑی سے بڑی ضرورت اور اخلاق کی بڑی سے بڑی قدر کو بھی ہمیشہ درہم و دینار کے ترازو میں تولتا ہے۔ وہ ہر بھلائی کے تصور سے کٹ کر دولت کے تصور سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ معدہ ہی اس کا چکر گاہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے پر جب بھی غور کرے گا دولت دنیا کے حوالے سے غور کرے گا۔ اس کی تمام ترجیحات دولت کے کم و بیش ہونے سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بخیل کس شخص کو کہتے ہیں؟

لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ بخیل اس آدمی کو نہیں کہتے جو اپنی ذات پر خرچ کرنا پسند نہ کرتا ہو بلکہ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو اور کسی بھی خیر کے موقعہ پر اس کا ہاتھ کھلنے کی بجائے گردن سے حمائل ہو جاتا ہو۔ اگرچہ اسلام نے دولت اور نعمت کے ہوتے ہوئے اپنی ذات پر بے جا سختی کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ جس شخص کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رہن سہن، اپنے لباس اور میل جول سے اس کا اظہار بھی کرے۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو بہت سادہ رکھ کر سب کچھ اللہ کے راستے میں یا اللہ کے بندوں پر خرچ کر دیتا ہے تو اسے بخل نہیں کہتے اور نہ یہ اللہ کے نزدیک مذموم ہے بلکہ اگر اس سے کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہ ہو تو اسے محمود ہی کہا جائے گا۔ بالخصوص وہ لوگ جو تخت اقتدار پر فائز ہوں یا بڑے عہدہ و منصب کے مالک ہوں یا امیر کبیر ہونے کی شہرت رکھتے ہوں تو ایسے لوگوں کی سادگی اور اپنے آپ پر کم سے کم خرچ کرنے کی عادت نہ صرف کہ کوئی برائی نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک بھی باعث اجر ہے اور بندوں کی نگاہ میں بھی مادہ اور مادی زندگی کو حقیر جاننے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔ جس کے اثرات ہمیشہ دیکھنے والوں پر اچھے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ خلفائے راشدین کا نہایت سادہ زندگی گزارنا، موٹا جھوٹا کھانا، پیوند زدہ کپڑے پہننا، آج تک ایک قابل تعریف عمل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ہماری قریبی تاریخ میں آخری نظام حیدرآباد دکن اپنے سیاسی فیصلوں کے علاوہ اپنی اس خوبی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انھوں نے بڑی بڑی مساجد اور بڑے بڑے اداروں کو دل کھول کر سرمایہ فراہم کیا لیکن ان کا اپنا لباس اور اپنی ضرورت کی چیزیں ایک عام آدمی کی سطح سے زیادہ نہیں تھیں۔ ہماری قریبی تاریخ میں ایک مشہور سرجن گزرے ہیں جو ڈاکٹر امیر الدین مرحوم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھیں ایک دفعہ جب ان کے داماد نے بتایا کہ اگر ایک اے۔ سی (A.C.) بند کر دیا جائے تو کئی غریب گھروں کو بجلی مل سکتی ہے۔ تو وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور انھوں نے اے۔ سی بند کر دیا۔ اس کے بعد برسوں زندہ رہے لیکن پھر کبھی اے۔ سی نہیں چلایا۔ انھیں جب بھی توجہ دلائی جاتی کہ گرمی بہت ہے آپ اے۔ سی چلانے کی اجازت دے دیں تو وہ ہمیشہ اپنے داماد کی بات دہراتے۔ اس طرح کی بیشمار مثالیں آپ اپنے گردوپیش میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن بخل میں جو چیز نہایت قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی سے ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ اپنی کوتاہی کے مطابق بخیل کہا جائے گا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی عادت بد کو مسلمانوں سے دور رکھنے کے لیے بارہا بخل کی مذمت فرمائی۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے، اے اللہ! بخیل کو تباہی سے ہمکنار کر۔ (بخاری و مسلم)
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت اسماء (رض) سے فرمایا: بھلائی کے راستے میں خرچ کیا کر اور گن گن کر نہ دیا کر ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کر دے گا۔

بخل معلوم ہوتا ہے ایک حالت پر اکتفا کرنے والی بیماری نہیں بلکہ اس کی نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں اور سرطان کی طرح یہ ناسور پھیلتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے جو دوسری برائی جنم لیتی ہے۔

2 اس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا: وَیَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ "وہ لوگوں کو بخل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں"۔ یعنی ان کی عادت بد اپنے بخل کی حد تک قناعت نہیں کرتی بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بخل کریں تاکہ ان کے بخل پر پردہ پڑا رہے۔ ایک آدمی جب دوسروں

کے حقوق ادا نہیں کرتا تو وہ اپنے عزیزوں اور اپنے ملنے والوں سے بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی دوسروں کے حقوق دبائے رکھیں کیونکہ جب اس کے گردوپیش میں ایک ہی طرح کی ذہنیت کے لوگ ہوں گے تو کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھائے گا کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ افراد کے ضمیر تو سو جاتے ہیں اجتماعی زندگی کا ضمیر نہیں مرتا۔ ان میں کچھ نہ کچھ ایسے رہتے ہیں جو برائی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور برائی کرنے والوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔ سخاوت اور بخل کا تعلق چونکہ عام انسانی معاملات سے ہے جس طرح سخاوت نیک نامی کا باعث بنتی ہے اسی طرح بخل سے بدنامی پھیلتی ہے اور کبھی نہ کبھی بخیل کو اس بدنامی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بخیل کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گردوپیش میں رہنے والے لوگوں میں اپنی ذہنیت پیدا کردے تاکہ اسے کبھی اس صورتحال سے واسطہ نہ پڑے۔ چنانچہ اس کی سب سے واضح مثال قرآن کریم میں منافقین کا وہ رویہ ہے جس کا ذکر پروردگار نے "سورۃ المنافقون" میں فرمایا ہے۔ ایک غزوہ میں حضرت عمر فاروق (رض) کے ملازم اور ایک انصاری کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا دونوں نے اپنے اپنے حمائیتیوں کو پکارا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بروقت پہنچ گئے اور لڑائی کا خطرہ ٹل گیا آپ نے اس پر برہمی کا اظہار فرمایا اور اصلاح کے لیے نصیحتیں فرمائیں۔ لیکن منافقین جو اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھے ان کے رئیس عبداللہ بن ابی کو جیسے ہی ان کے ساتھ تخلیہ میں بیٹھنے کا موقعہ ملا تو اس نے کہا یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم نے ان مہاجرین کو اپنے یہاں پناہ دی او اپنے گھر ان کے لیے کھول دیئے، اب وہ تمہیں ہی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کتے کو کھلاؤ پلاؤ کہ وہ تمہیں پر بھونکے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی اس یاوہ گوئی کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اسے بلا کر پوچھا تو صاف مکر گیا۔ "سورۃ المنافقون" نے نازل ہو کر اس کا سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ چنانچہ جو کچھ انھوں نے کہا ان میں سے ایک بات کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا

(یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جو لوگ ہیں ان پر مت خرچ کرو تاکہ یہ لوگ چلتے بنیں۔)

ان الفاظ پر غور کیجیے! یہ ایک اجتماعی بخل کی مثال ہے اور جس کے پیچھے صرف مال و دولت کی محبت کارفرما نہیں بلکہ منافقت کے جذبات، باطل سے گہرا تعلق اور اسلام دشمنی بھی اپنا کام دکھا رہی ہے۔ یہ بخل کی بدترین مثال ہے اس کے آئینہ میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بخل کا حکم دینا یا بخل کا مشورہ دینا کسے کہتے ہیں ورنہ آدمی یہ الفاظ پڑھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ اپنے مال و دولت کے معاملے میں بخیل ہوتے ہیں لیکن وہ دوسروں کو اس کا حکم دیتے ہیں یا مشورہ دیتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مثال سے اسے بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں ہماری قریبی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود رہی ہیں۔ روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو تیس لاکھ کے قریب مہاجرین ہمارے ملک میں آگئے۔ انھوں نے ایک اسلامی ملک میں اپنی جانیں اور عزتیں بچانے کے لیے پناہ لی۔ اہل پاکستان کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ ان مہاجرین کے لیے انصار کا کردار ادا کریں۔ لیکن آپ اخباروں کے فائل اٹھا کر دیکھیں آپ کو ایسے مضامین کی بڑی تعداد ملے گی جس میں ان مہاجرین پر خرچ کرنے سے روکا گیا ہے اور بار بار ملکی وسائل کی کمی کا حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ اصل حقیقت بائیں بازو سے تعلق لادینی قوتوں کی ایجنٹی اور اسلامی اخوت سے دشمنی تھی۔ اس لیے کیسے کیسے دانشور اپنی حکومت کو بخل کے مشورے دے رہے تھے۔

گزشتہ دو سال سے امریکہ نے اسلامی ملکوں میں جو حالات پیدا کر دیئے ہیں اور جس نے دو مسلمان ملکوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اسلامی رشتے کے حوالے سے ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ہم اسلام کے رشتے سے ہر طرح کے مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دیتے ان کی جانیں اور عزتیں بچاتے اور ان کے لیے انصار ہونے کا ثبوت دیتے۔ لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ نہ صرف کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے جانی دشمن

ہوگئے ہیں بلکہ جہاں جہاں بھی خیر کے مراکز ہیں جہاں سے اسلام کو کسی طرح بھی سپورٹ (Support) مل رہی ہے، ہمیں باہر اور اندر سے یہ مشورے دیئے جارہے ہیں کہ آپ ایسے تمام مراکز اور اداروں کی مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور اگر آپ ایسا نھیں کریں گے تو آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ قرآن کریم کے یہ الفاظ جو کل تک ہمارے لیے ناقابل فہم تھے آج ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہیں۔ منافقت نے آج تک کبھی اتنی صراحت اور جرأت کے ساتھ گھونگھٹ نہیں الٹا ہوگا۔ ایک عرصہ دراز سے غیر مسلم قوتیں مسلمانوں کے ساتھ منافقت کا کھیل کھیل رہی تھیں اور خود مسلمانوں کے اندر چھپے ہوئے منافق پانچویں کالم کا کردار ادا کر رہے تھے۔ لیکن اب انھوں نے براہ راست مسلمانوں کی زندگی کے سرچشموں پر حملہ کردیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے امت مسلمہ کی اکثریت کو اصل مقصد اور اصل اہداف سے دور کرچکے ہیں۔ لیکن ایک محدود اقلیت ابھی تک دینی مدارس میں پڑھ رہی ہے اور ابھی مسلمانوں میں اس کے اثرات باقی ہیں۔ ان کی مساجد کو وہیں سے کارکن میسر آتے ہیں۔ ان کی دینی زندگی کی راہنمائی وہیں سے ہوتی ہے۔ وہاں سے نکلنے والے اپنی دنیا برباد کرکے دین کی آبادی کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں کے دم سے نوجوانوں میں روح محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باقی ہے اور انھیں کی وجہ سے غیرت دینی کو ابھی تک ختم نہیں کیا جاسکا۔ ایک طرف تو دہشت گردی کا لیبل لگا کر ان پر ہاتھ ڈالنے کا راستہ نکالا اور دوسری طرف علم دین کے سرچشموں کو خشک کرنے کے لیے دولت مندوں کو حکم دیا کہ ان اداروں کو امداد دینا بند کردیں۔ ملک میں اگر کپڑے کی قلّت پیدا کرنی ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ کپڑا جلانا شروع کردیا جائے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی کپڑے کی صنعت اور کپڑے کا خام مال دستیاب ہوتا ہے اسے برباد کردو۔ دینی مدارس علم دین کی فیکٹریاں ہیں، یہاں سے علم دین بھی پروڈیوس Produce ہوتا ہے اور رجال دین بھی۔ اگر انھیں وسائل سے تہی دامن کردیا جائے تو یہ خود بخود بند ہوجائیں گی اور رفتہ رفتہ نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے پڑھنے پڑھانے والے ختم ہوجائیں گے۔ کاش! ہمیں اندازہ ہوتا کہ یہ کتنا بڑا خطرناک اقدام ہے جو غیر مسلم قوتوں اور اپنے ملک کے منافقین کی طرف سے ہورہا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سب سے پہلے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صفہ کا ایک چبوترا بنایا جس میں رات دن قران وسنت کا علم حاصل کرنے والے پڑے رہتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جہاں ان کی تربیت فرماتے تھے وہیں ان کی ساری ضروریات کے کفیل بھی تھے۔ پہلے آپ ﷺ ان کی ضروریات کا انتظام فرماتے بعد میں اپنے گھر کی خبر لیتے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگاہ میں ان لوگوں کی کس قدر اہمیت تھی اور آپ ﷺ کے دل میں ان کے لیے کس قدر شفقت تھی اس کا اندازہ آپ اس سے کرلیجیے کہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس آکر اس حال میں لیٹ گئے کہ بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ کو نیند نہیں آرہی تھی اور ہمارا حال بھی ابتر تھا۔ اتنے میں ایک شخص دودھ کا ایک بڑا پیالہ لے کر آیا کہا مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب حضور ﷺ مجھے بھی اس میں سے حصہ عطا فرمائیں گے۔ لیکن آپ ﷺ نے مجھے ہی حکم دیا کہ جاؤ جاکر تمام اصحاب صفہ کو بلالاؤ۔ اس وقت ان کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ وہ سب آگئے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید حضور ﷺ سب سے پہلے مجھے ہی پینے کا حکم دیں۔ لیکن اس وقت تو میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوہریرہؓ ان سب کو باری باری پلاؤ۔ میں نے ان کو پلانا شروع کیا تو ستر افراد ایک ایک کرکے سیر ہوکر پی گئے لیکن پیالہ ویسے کا ویسے بھرا رہا۔ اب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا کہ ابوہریرہؓ تم پیو، میں نے سیر ہوکر پیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر حکم دیا اور پیو، میں نے اور پیا۔ آپ ﷺ نے مزید پینے کے لیے فرمایا لیکن اب میرے پیٹ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پیا تو پیالہ ختم ہوگیا۔ اندازہ فرمایئے! جن لوگوں کا بچا ہوا اور جھوٹا سرکار رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیتے ہیں اب انھیں کے راستے پر چلنے والوں اور انھیں کی

سنت زندہ کرنے والوں کے لیے احکام جاری کیے جارہے ہیں کہ ان کا ناطقہ بند کردو، ان کے ذرائع کی تلاشی لو۔ مقصود صرف یہ ہے کہ علم کے یہ سوتے خشک ہوجائیں۔ یہ بخل کا حکم دینے کی بدترین مثال ہے۔

وَیَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰـہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ

(اور اللہ نے اپنے فضل میں سے انھیں جو کچھ دے رکھا ہے اسے چھپاتے ہیں)

3 یہ ان متکبروں اور خودپسندوں میں پیدا ہونے والی تیسری بری خصوصیت ہے جو درحقیقت بخل ہی کی ایک صورت ہے کہ ایسے لوگ جب لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اپنی بدنامی سے بچنے کے لیے دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ گردوپیش میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا نہ رہے۔ لیکن آخری کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان کی دولت کی خبر کسی شخص تک نہ پہنچنے پائے۔ لوگ انھیں ایک دولت مند آدمی ضرور سمجھیں تاکہ ان کا ایک رعب بھی باقی رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی یقین رکھیں کہ یہ شخص سب کچھ رکھتا ہوا بھی اس قدر مجبور ہے کہ کسی دوسرے کی مدد کرنے کے قابل نہیں کیونکہ ایسے لوگ ہر ملنے جلنے والے اور ہر مدد کے خواہش مند کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور سائلوں کی کثرت کا اس طرح دکھڑا روتے ہیں کہ سننے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ شخص ہے تو بڑا دریا دل اور بڑا فیاض لیکن ذمہ داریوں کے بوجھ نے اس کا ہاتھ روک رکھا ہے چونکہ اس کے پاس بچتا کچھ نہیں اس لیے وہ کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں۔

اپنے مال و دولت کو چھپانا بعض لوگوں کے یہاں ایک اور طریقے سے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، لباس، سواری اور گھر رکھنے کے معاملے میں اس طرح کا رویہ اختیار رکھتے ہیں کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ نہایت خستہ حال لوگ ہیں وہ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں گے، نہ لوگوں کی مدد کریں گے، نہ نیک کاموں میں حصہ لیں گے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے لوگوں کو بھی تنبیہ فرمائی۔ آپ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَنۡعَمَ نِعۡمَۃً عَلٰی عَبۡدٍ اَحَبَّ اَنۡ یَّظۡھَرَ اَثَرُھَا (اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو)۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن اور اس کی داد ودہش ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا اظہار ہو۔

وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّھِیۡنًا

(ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے)

ایسے بخیل لوگ جو خود بھی اپنے خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کریں اور اپنی دولت کو ہوا تک نہ لگنے دیں قیامت کے دن ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس لیے رسواکن عذاب دیں گے کیونکہ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ پہچانی اس کے شکر گزار بندے بننے کی بجائے اترانے والے اور تکبر کرنے والے بنے۔ انھوں نے اپنی دولت سے عیاشیاں کیں لیکن انسانیت ان کے سامنے ذلیل ہوتی رہی۔ اب ان کی سزا صرف عذاب ہی نہیں بلکہ رسوائی بھی ہونی چاہیے تاکہ یہ پوری طرح اپنے انجام کو پہنچیں۔

مسائل

۱۔ بخل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ذلت آمیز عذاب دیں گے۔

۲۔ نمود و نمائش کے لیے خرچ کرنے والے شیطان کے ساتھی ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

لغات القرآن:[وَالَّذِيْنَ : اور جو لوگ] [يُنْفِقُوْنَ : خرچ کرتے ہیں] [اَمْوَالَهُمْ : اپنے مال] [رِئَآءَ : دکھاوے کو] [النَّاسِ : لوگ] [وَ : اور] [لَا يُؤْمِنُوْنَ : نہیں ایمان لاتے] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَلَا : اور نہ] [بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ : آخرت کے دن پر] [وَمَنْ : اور جو۔ جس] [يَّكُنِ : ہو] [الشَّيْطٰنُ : شیطان] [لَهٗ : اس کا] [قَرِيْنًا : ساتھی] [فَسَآءَ : تو برا] [قَرِيْنًا : ساتھی]

ترجمہ : اور جو لوگ اپنے مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر، اور شیطان جس کا بھی ساتھی ہو گیا تو وہ برا ساتھی ہے۔

تفسیر و تشریح:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ : اور وہ لوگ جو اپنے مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔} بخل کی برائی بیان فرمانے کے بعد اب ان لوگوں کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ جو محض دکھاوے اور شہرت کے لیے مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا کا حصول ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں جو اوپر گزرا۔

ریاکاری کی مذمت

اس سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے کہ جو نیک کاموں میں لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن مقصد صرف واہ واہ کروانا ہوتا ہے، بکثرت خیرات کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ اخبار میں خبر اور تصویر ضرور آنی چاہیے، اسی طرح شادیوں کی فضول رسومات میں لاکھوں روپے اڑا دینے والے بھی عبرت حاصل کریں جو صرف اس لیے رسمیں کرتے ہیں کہ اگر یہ رسمیں بھرپور انداز میں نہ کی گئیں، تو لوگ کیا کہیں گے، فلاں نے اتنا خرچ کیا تھا، میں کیوں پیچھے رہوں وغیرہ۔ حضرت محمود بن لُبَید (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "مجھے تم پر سب سے زیادہ شرک اصغر یعنی دکھاوے میں مبتلا ہونے کا خوف ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو ان کے حساب کے وقت ارشاد فرمائے گا کہ ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کے لیے دنیا میں تم دکھاوا کرتے تھے اور دیکھو کہ کیا تم ان کے پاس کوئی جزا پاتے ہو؟ (مسند امام احمد، حدیث محمود بن لبید (رض)، ۱۶۱/۹، الحدیث : ۲۳۶۹۷)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "بیشک جہنم میں ایک وادی ہے جس سے جہنم روزانہ چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ وادی اُمتِ محمدیہ کے ان ریاکاروں کے لیے تیار کی ہے جو قرآن پاک کے حافظ، راہ خدا میں

صدقہ کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے گھر کے حاجی اور راہ خدا عَزَّوَجَلَّ میں نکلنے والے ہوں گے (لیکن یہ سارے کام صرف ریاکاری کیلئے کررہے ہوں گے۔) (1)

(معجم الکبیر، الحسن عن ابن عباس، ۱۲/۱۳۶، الحدیث: ۱۲۸۰۳)

{ وَمَن يَكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِينًا : اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے۔} دنیا میں شیطان کا ساتھی اس طرح ہوگا کہ وہ شیطانی کام کر کے اسے خوش کرے کیونکہ جو شیطان کو خوش کرتا ہے شیطان اس کے ساتھ رہتا ہے حتّٰی کہ کھانے پینے، رات بسر کرنے اور دیگر کئی معاملات میں شریک ہو جاتا ہے اسی لیے یہ حکم ہے کہ ہر جائز کام بِسْمِ اللّٰہ پڑھ کر شروع کیا جائے تاکہ شیطان کے لیے روک ہو اور آخرت میں شیطان کا ساتھی ہونا یوں ہوگا کہ وہ ایک شیطان کے ساتھ آتشی زنجیر میں جکڑا ہوگا۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۳۸، ۱/۳۷۹)

یہ وعید خاص گناہوں کے ذریعے شیطان کا ساتھی بننے والے کے بارے میں ہے اور جس کا ساتھی شیطان ہو وہ اپنے انجام پر خود ہی غور کرلے کہ کیسا ہوگا۔

شیطان کے بہکانے کا انداز

شیطان مختلف انداز سے انسان کو بہکانے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت وفرمان برداری کرنے سے روکتا ہے جیسے شیطان پہلے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت سے روکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ انسان کو شیطان سے محفوظ کرلیتا ہے تو انسان شیطان کو یہ کہہ کر دور کردیتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کی بہت سخت ضرورت ہے کیونکہ مجھے اس دار فانی سے آخرت کے لیے توشہ اور زاد راہ تیار کرنا بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر آخرت کا سفر ممکن نہیں۔ جب انسان شیطان کے اس مکر سے بچ جاتا ہے تو شیطان اسے اس طرح بہکانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے عبادت کرنے میں کاہلی اور سستی کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آج رہنے دو کل کرلینا۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس سے بھی محفوظ کرلیتا ہے تو وہ شیطان کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ میری موت میرے قبضے میں نہیں، نیز اگر میں آج کا کام کل پر چھوڑوں گا تو کل کا کام کس دن کروں گا کیونکہ ہر دن کے لیے ایک کام ہے۔

جب شیطان اس حیلے سے بھی ناامید ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے انسان! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت جلدی جلدی کرو تاکہ فلاں فلاں کام کے لیے فارغ ہو سکو۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس حیلے سے بھی بچالے تو انسان شیطان کو یہ کہہ کر دفع کردیتا ہے کہ تھوڑی اور کامل عبادت زیادہ مگر ناقص عبادت سے کہیں بہتر ہے۔

اگر شیطان اس حیلے میں بھی ناکام و نامراد ہو جاتا ہے تو وہ انسان کو ریاکاری کے ساتھ عبادت کرنے کی ترغیب دیتا اور اسے ریاکاری میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس حیلے سے محفوظ ہو گیا تو وہ یہ کہہ کر ریاکاری کے وسوسے کو ٹھکرا دیتا ہے کہ میں کسی اور کی نمائش اور دکھاوے کے لیے عبادت کیوں کروں، کیا اللہ تعالیٰ کا دیکھ لینا میرے لیے کافی نہیں۔

جب شیطان اپنے اس ہتھکنڈے سے بھی ناکام ہو جاتا ہے تو وہ انسان کو خود پسندی میں مبتلاء کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے کتنا عمدہ کام کیا اور تم نے کتنی زیادہ شب بیداری کی۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس بار بھی محفوظ رہا اور خود پسندی میں مبتلاء ہونے سے بچ گیا تو وہ شیطان کے اس وسوسے کو یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی اور بزرگی نہیں، یہ تو سب اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے مجھ

جیسے گناہ گار کو خاص توفیق عطافرمائی اور یہ بھی اسی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے میری حقیر اور ناقص عبادت کو شرف قبولیت عطافرمایا، اگر اس کا فضل و کرم شامل حال نہ ہوتا تو میرے گناہوں کے مقابلے میں میری ان عبادتوں کی حیثیت ہی کیا تھی۔

جب لعین شیطان ان تمام تدبیروں سے ناکام ہو جاتا ہے تو پھر یہ حربہ استعمال کرتا ہے جو سب سے زیادہ خطرناک ہے اور شیطان کے اس حربے سے بہت عقلمند اور ہوشیار دل شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں بچ سکتا، چنانچہ شیطان کہتا ہے کہ اے نیک بخت انسان! تم لوگوں سے چھپ چھپ کر نیکیاں کرنے میں کوشاں ہو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ان نیکیوں کو عنقریب تمام لوگوں میں مشہور کر دے گا تو لوگ تمہیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ کہہ کر یاد کیا کریں گے۔ اس طرح شیطان اسے ریاکاری میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے انسان کو شیطان کے اس حربے سے بھی محفوظ فرمادے تو وہ شیطان کو یہ کہہ کر ذلیل و خوار اور نامراد کر دیتا ہے کہ اے ملعون! ابھی تک تو تو میرے پاس میرے اعمال کو فاسد و بے کار کرنے آیا کرتا تھا اور اب ان اعمال کی اصلاح و درستی کے لیے آتا ہے تاکہ میرے اعمال کو بالکل ختم کر دے، چل دفع ہو جا، میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، وہی میرا آقا و مولیٰ ہے، میں اپنی نیکیوں کی شہرت کا مشتاق اور طلبگار نہیں ہوں، میرا پروردگار چاہے میرے اعمال ظاہر و مشہور کر دے چاہے پوشیدہ رکھے، چاہے مجھے عزت و مرتبہ عطافرمائے چاہے مجھے ذلیل و رسوا کر دے۔ سب کا سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے میرے اعمال کا اظہار فرمائے یا نہ فرمائے۔ انسانوں کے قبضے میں کوئی چیز نہیں ہے۔

اگر انسان شیطان کے اس وار سے بھی بچ جائے تو وہ انسان کے پاس آکر کہتا ہے کہ تجھے اعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ انسان کے نیک اور بد ہونے کا فیصلہ تو روز اول میں ہو چکا ہے، اس دن جو برا ہو گیا وہ برا ہی رہے گا اور جو اچھا اور نیک ہو گیا وہ نیک ہی رہے گا اس لیے اگر تجھے نیک بخت پیدا کیا گیا ہے تو اعمال کو چھوڑنا تمہارے لیے نقصان دہ نہیں اور اگر تجھے بد بخت و شقی پیدا کیا گیا ہے تو تمہارا عمل تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو شیطان کے اس وار سے بچالیا تو انسان شیطان مردود سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ میں تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں اور بندے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آقا و مولیٰ کے احکام بجالائے اور اللہ تعالیٰ سارے جہان کا پروردگار ہے، جو چاہتا ہے حکم کرتا اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یقیناً اعمال میرے لیے فائدہ مند ہیں کسی صورت میں بھی نقصان دہ نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے علم میں نیک بخت ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زیادہ ثواب کا محتاج ہوں اور اگر خدانخواستہ علم الٰہی میں میرا نام بد بختوں میں ہے تو بھی عبادت کرنے سے اپنے آپ پر ملامت تو نہیں کروں گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے طاعت و عبادت کرنے پر سزا نہ دے گا اور کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ نافرمان ہو کر دوزخ میں جانے سے فرماں بردار ہو کر دوزخ میں جانا بہتر ہے اور پھر یہ کہ سب محض اِحتِمالات ہیں ورنہ اس کا وعدہ بالکل حق ہے اور اس کا فرمان بالکل سچ ہے اور اللہ تعالیٰ نے طاعت و عبادت پر ثواب عطافرمانے کا بیشمار مقامات پر وعدہ فرمایا ہے تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان اور طاعت کے ساتھ حاضر ہو گا وہ ہرگز ہرگز جہنم میں داخل نہ ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے سچے و مقدس وعدے کی وجہ سے جنت میں جائے گا۔ لہٰذا (اے لوگو!) تم خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ، شیطان کے حیلوں سے ہوشیار رہو، ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو اور شیطان مردود سے اسی کی پناہ مانگتے رہو کیونکہ تمام معاملات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہی توفیق عطافرمانے والا ہے، گناہوں سے بچنے اور طاعت و عبادت کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ملتی ہے۔ (صراط)

(منہاج العابدین، العقبۃ الثانیۃ، العائق الثالث: الشیطان، ص ۶۱۔ ۶۲)

جو لوگ ایمان کے ان پہلوؤں سے محروم ہو جاتے ہیں ان کی سوچ میں نہایت خطرناک تبدیلی آتی ہے۔ وہ پھر اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اسی دنیا کی خوشیاں اصل خوشیاں ہیں اور اسی کے غم حقیقی غم ہیں۔ جو آدمی اللہ پر ایمان کھو دیتا ہے اور دولت اور اقتدار کو سب سے بڑی قوت سمجھتا ہے اور آخرت میں جواب دہی کے احساس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کی دولت اللہ اور اس کے بندوں کی دولت نہیں بلکہ

شیطان کی دولت بن جاتی ہے وہ مختلف سکیموں کے ذریعے دولت بھی کمائے گا اور سود کی لعنت بھی عام کرے گا۔ وہ مختلف اداروں پر خرچ کرے گا لیکن وہاں کسی خیر کا گزر نہیں ہوگا۔ وہاں ہر برائی اور ہر بے حیائی کو فروغ ملے گا۔ ہر وہ کام کرے گا جس سے اس کی دولت بڑھے اور اس کے ساتھ ساتھ شیطنت بھی پھیلے۔ اب اس کی خواہشات کی باگ دوڑ شیطان کے ہاتھ میں ہوگی۔ وہ جس راستے کی اسے ترغیب دے گا وہ ادھر چلے گا۔ اس کی مثال اس سوار کی ہوگی جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آچکا ہو اور لگام اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہو۔ اب گھوڑا اسے کھینچے پھرے گا۔ کچھ خبر نہیں کہ وہ اسے کس کھائی میں پھینکتا ہے۔ گھوڑا ایک جانور ہے جو اپنے مالک کو بچا بھی سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے۔ اس میں اگر بہیمیت کی وجہ سے نقصان رسانی کے پہلو ہیں تو اپنے مالک سے وفاداری کی وجہ سے بہتر امید بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن جو شخص شیطان کو اپنا دوست بنالے اور وہ ہر کام میں شیطان کی راہنمائی کو قبول کرلے اور شیطان کی انگیخت کو ہی اپنے نفس کا مطالبہ سمجھ بیٹھے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلے تو ایسے شخص کی تباہی کے بارے میں دورائے نہیں ہوسکتیں کیونکہ شیطان ازل سے انسان کا دشمن ہے اس نے جنت میں حضرت آدم (علیہ السلام) سے دشمنی کی حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ان کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کے باعث اسے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا اور ذلت سے اسے وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس نے آدم کی اولاد سے اس کا انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر اس نے اپنے اس ارادے کو چھپایا نہیں بلکہ اللہ کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا اس لیے قرآن کریم نے انسانوں کو اس سے باخبر کرتے ہوئے بتایا: اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ (یہ شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے)۔ ایسا خطرناک دشمن جس کا ساتھی بن جائے وہ یقیناً اسے کسی ایک کھائی میں نہیں بلکہ زندگی کی ہر کھائی میں پھینکے گا اور جب تک اسے تباہ و برباد نہ کردے اسے چین نہیں آئے گا کیونکہ شیطان کی جو خصوصیات اور اس کے عزائم ہمیں قرآن و سنت سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو وہ شیطان ہے جس کا نام ابلیس ہے اور ایک شیطانوں کی فوج ہے جو اس کی کمانڈ میں کام کرتی ہے اور جس کے سپاہی جنات میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہ اس کا تمام لاؤلشکر نہایت مستعدی کے ساتھ جن وانس کو بگاڑنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی چالیں اور گھاتیں اس قدر گہری اور اس قدر پراسرار ہیں کہ عام انسانوں کے لیے اس کا سمجھنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ وہ برائی کو برائی کی صورت میں اور برائی کا نام دے کر بہت کم متعارف کراتا ہے۔ بالخصوص ان لوگوں میں جو نیک ہونے کے باعث برائی کے نام سے چڑتے ہیں ان کے لیے تو ایسے خوبصورت قالب اور ٹائٹل کے ساتھ برائی کو پیش کرتا ہے کہ اس پر نیکی کا گمان ہوتا ہے اور پھر اس کام پر اس کی پوری فوج اس دیانت، اخلاص اور مستعدی سے کام کرتی ہے کہ انسانوں میں اس کا تصور بہت کم ہے۔ اس کے اور نیک لوگوں کے مقابلے کو دیکھتے ہوئے بعض دفعہ کچھوے اور خرگوش کی کہانی یاد آتی ہے، جو سکولوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہے کہ دونوں نے آپس میں ریس لگائی۔ خرگوش یہ سوچ کر بے فکری سے سوگیا کہ میں چونکہ انتہائی تیز رفتار ہوں جب اٹھوں گا چھلانگتا پھلانگتا اس سے آگے نکل جاؤں گا اور کچھوا اپنی سست رفتاری کو محسوس کرکے مسلسل چلتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرگوش اس وقت نیند سے جاگا جب کچھوا منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد اور اپنے مقصد سے لاپرواہی اور بے نیازی اسے لے بیٹھی۔ اسلامی اور شیطانی قوتوں کے مقابلے کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطانی قوتیں خرگوش کی مانند ہیں اور اسلامی قوتیں کچھوے کی طرح ہیں اور تشویشناک بات یہ ہے کہ کچھوا سو رہا ہے اور خرگوش جاگ رہا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کا دوست شیطان بن جائے اس کی دین سے بیزاری اور لادینیت سے محبت ہر خیر کے کام سے نفرت اور ہر شر کی طرف رغبت کا عالم کیا ہوگا؟ یوں تو جو بھی شخص اللہ کے ذکر اور اس کی بندگی سے اعراض کرتا ہے، پروردگار فرماتے ہیں: ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں لیکن جو لوگ اپنا مال و دولت اللہ کے راستے میں اور اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے کی بجائے اسراف اور تبذیر میں اڑاتے ہیں اور لوگوں کے دکھلاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں ایسے تبذیر کرنے والوں کو تو قرآن کریم نے شیطان

کا بھائی قرار دیا ہے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کو قرین اور دوست ٹھہرایا گیا ہے اور ساتھ ہی فرمایا جس شخص کا دوست شیطان بن جائے وہ نہایت برا دوست ہے۔ (روح)

فوائد

1 : بخل کا ذکر ہو چکا۔ اب فضول خرچی کا ذکر ہے۔ اس میں دکھاوے کے لیے خیرات، نام نمود کے لیے شادی بیاہ کی بے جا رسموں میں خرچ وغیرہ سب ہی اسراف یعنی فضول خرچی میں داخل ہیں

2 : دنیا میں تو اس طرح کہ جو شیطان کو خوش کرے شیطان اس کے ساتھ رہتا ہے۔ حتی کہ اس کے ساتھ کھاتا پیتا صحبت کرتا ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ ہر جائز کام کو بسم اللہ سے شروع کرے اور آخرت میں اس طرح کہ وہ شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں بندھا ہو گا۔

آیت مبارکہ:

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

لغات القرآن: [وَمَاذَا : اور کیا] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [لَوْ اٰمَنُوْا : اگر وہ ایمان لاتے] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ : یوم آخرت پر] [وَاَنْفَقُوْا : اور وہ خرچ کرتے] [مِمَّا : اس سے جو] [رَزَقَهُمُ : انہیں دیا] [اللّٰهُ : اللہ] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [بِهِمْ : ان کو] [عَلِيْمًا : خوب جاننے والا]

ترجمہ : اور ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انھیں دیا تھا اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرتے، اور اللہ ان (کے حال) سے خوب واقف ہے۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح : ریاکاری اور بخل سے اجتناب اور انفاق فی سبیل اللہ تبھی قبول ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین کامل ہو کہ جو کچھ صدقہ وہ کرے یا کوئی عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضائع نہیں کرتا قیامت کو اس کو پورا پورا اجر ملے گا۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِّنْ کَسْبٍ طَیِّبٍ وَّلَا یَقْبَلُ اللّٰہُ اِلَّا الطَّیِّبَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتَقَبَّلُھَا بِیَمِیْنِہٖ ثُمَّ یُرَبِّیْھَا لِصَاحِبِہٖ کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فُلُوَّہٗ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ)

[رواہ البخاری : کتاب الزکوة، باب الصدقة من کسب طیب]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو آدمی کھجور کے برابر اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ کے ہاں صرف پاک چیز ہی قبول ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اس کو اس طرح پالتا اور بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی بچھڑے کو پالتا ہے حتیٰ کہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد : آخر ان پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے اور اللہ انھیں خوب جاننے والا ہے۔ (النساء : ٣٩)

جبریہ کارد اور ایمان میں تقلید کا کافی ہونا

اس آیت سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اللہ پر اور قیامت پر ایمان لانے میں کیا نقصان ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ سراسر فائدہ ہے ' اس سے ان منافقوں کو زجر و توبیخ اور ان کو ملامت کرنا اور ان کی مذمت کرنا مقصود ہے۔

اس آیت میں جبریہ کارد اور ابطال ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ بندوں کو کسی چیز کا اختیار نہیں ہے ' اگر بندے مجبور محض ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو ایمان نہ لانے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر ملامت نہ فرماتا ' آج کل بھی بہت سے پڑھے لکھے لوگ گناہ کرنے کے بعد کہتے ہیں ہم نے وہی کیا جو ہمارے لیے مقدور ہو چکا تھا اگر اللہ چاہتا تو ہم یہ گناہ نہ کرتے ' حالانکہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیار سے کرتا ہے اس کو کسب کہتے ہیں اور جس چیز کا وہ کسب کرتا ہے اللہ اسکو پیدا کر دیتا ہے ' اسی لیے کہتے ہیں کہ بندہ کاسب اور اللہ خالق ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان لانا بہت آسان اور سہل ہے ' اسی وجہ سے مقلد کا ایمان لانا معتبر ہے ' کیونکہ اللہ کی الوہیت اور وحدانیت پر دلائل قائم کرنا اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور امور آخرت پر دلائل قائم کرنا آسان اور سہل نہیں ہے ' عام لوگ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں اور ماں باپ کے اسلام کی وجہ سے ان کی تقلید میں مسلمان ہوتے ہیں اور ہر شخص ان دلائل میں غور و فکر کرنے کا اہل نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ صحت ایمان کے لیے تقلید کافی ہے اور استدلال ضروری نہیں ہے۔

وَمَاذَا عَلَیْھِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَھُمُ اللّٰہُ ط وَکَانَ اللّٰہُ بِھِمْ عَلِیْمًا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ج وَاِنْ تَکُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا

(اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور اللہ نے ان کو جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے اور اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اگر ایک نیکی ہو تو اس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے)

(النسآء : ٣٩ تا ٤٠)

متکبروں، بخیلوں، تنگ دلوں اور دکھاوے کے لیے خرچ کرنے والوں پر پوری طرح بات کھول دینے اور ان کو آخری تنبیہ کر دینے کے بعد اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی اور سرزنش کے بعد بھی اپنی بدنصیبی کا احساس نہیں ہوا اور وہ اپنی حالت بدلنے پر تیار نہیں تو لہجہ بدل کر فرمایا کہ نادانوں تم اس ایک پہلو پر بھی غور کر کے دیکھو کہ ایمان سے محرومی اور انفاق سے کوتاہی نے تمہارے سیرت و کردار میں جو کانٹے بوئے ہیں اور تمہارے باہمی تعلقات میں جو ڈائنامیٹ بچھ گئے ہیں کہ تمہاری سماجی اور معاشرتی زندگی کھیل کھیل ہو کر رہ گئی ہے اور تم خود اپنی پیدا کردہ قیامت کا سامنا کر رہے ہو۔ کاش ! تم اپنی اس حالت پر غور کرتے اور تم اپنی حالت کو بدلنے پر آمادہ ہوتے اور اس بے ایمانی کے رویے کو ترک کر کے تم ایمان کی روش اختیار کرتے اور اللہ کے راستے میں انفاق کا فیصلہ کرتے تو ذرا سوچو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی ہے اور خود اپنے لیے مشکلات پیدا کی ہیں۔ تم نے ہرگز نہیں سوچا کہ ایمان کے مقابلے میں بے ایمانی، یقین کے مقابلے میں بے یقینی، انفاق کے مقابلے میں بخل، آخر تمہیں اور معاشرے کو کیا دے سکتے ہیں۔ اگر تم ایمان لے آتے تمہارے اندر کی بے اطمینانی نکل جاتی، تمہارے معاشرے میں یکسانی اور یک سوئی پیدا ہوتی، تم روشنی کے مسافر ہوتے، تمہیں اپنی منزل کا یقین ہوتا۔ اندازہ کرو ! اس سے تمہاری سوچ اور زندگی کے عمل میں کتنی خوبصورت تبدیلی واقع ہوتی اور پھر تم اگر بخل کی بجائے انفاق کا راستہ اختیار کرتے اور یہ سوچتے کہ میں جو بھی خرچ کر رہا ہوں وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کر رہا ہوں کیونکہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی دین اور اس کی امانت ہے۔ میں نے اگر دولت کے حصول میں محنت کی ہے تو محنت کا جذبہ بھی اسی کی عطا ہے اور اگر میں نے صلاحیت سے کام لیا ہے تو صلاحیت بھی تو اسی کی بخشی ہوئی ہے۔ جن عوامل نے میری دولت بڑھانے میں کردار ادا کیا ہے ان میں سے کوئی سی چیز بھی اللہ کے علم اور اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ جب میں ان احساسات کے ساتھ اس کے راستے میں خرچ کروں گا اور یہ سمجھ کر خرچ کروں گا کہ اللہ میرے ایک ایک عمل سے باخبر ہے اس کا علم بے حد و بے نہایت ہے۔ اس کی نگاہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ میری نیت سے بھی واقف ہے، اور اس کا کرم یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر خرچ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نوازتا ہے۔ میں اگر ایک پائی خرچ کروں تو وہ نجانے اس کے بدلے میں مجھے کیا کچھ عطا کر دے کیونکہ اس کا ارشاد یہ ہے : اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ (اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا) کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ حق تلفی نہ کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ جتنا کسی نے خرچ کیا ہے اور جتنے اخلاص سے کیا ہے اتنا اسے واپس کر دے۔ لیکن اس کے کرم اور فضل کا عالم تو یہ ہے کہ وہ فرماتا ہے : وَاِنۡ تَ-کُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا وَیُؤۡتِ مِنۡ لَّ-دُنۡ-ہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (اگر ایک نیکی ہو تو وہ اس کو دوگنا چوگنا کر دیتا ہے اور پھر اپنی طرف سے اجر عظیم عطا فرماتا ہے) کسی نیکی پر دس گنا اجر دینا تو اس کا عام معمول ہے۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے اعمال بھی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بیس لاکھ گنا اجر عطا فرماتے ہیں۔ نیکی میں جیسے جیسے اخلاص بڑھتا جاتا ہے اللہ پر اعتماد اور یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی طرف سے نیکی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہم چونکہ انھیں محض آخرت کی باتیں سمجھتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تو دے گا ہی کیونکہ وہی حقیقت میں دار الجزا ہے۔ لیکن بعض دفعہ وہ دنیا میں بھی اسی طرح عطا کرتا ہے۔

واقعہ

سیالکوٹ کے ایک مخلص اور مخیّر دوست جن کا وسیع کاروبار ہے انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جب اپنا کاروبار شروع کیا تو میں نے اپنے اللہ سے وعدہ کیا کہ یا اللہ ! میں اپنے کاروبار میں سود کا مال شامل نہیں ہونے دوں گا۔ سود پر قرض نہیں لوں گا اپنی فیکٹریوں میں کوئی ناجائز کام

نہیں ہونے دوں گا۔ آپ میرے کاروبار میں برکت عطا فرمائیں۔ شریعت کی پابندی کرنا اور حرام مال سے اجتناب کرنا اور حلال طریقوں پر چلنا یہ میری ذمہ داری ہے اور کاروبار میں برکت دینا یہ آپ کی عطا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چند سالوں تک تو اللہ تعالیٰ نے خوب میرے اخلاص کا امتحان لیا اور خوب مجھے جھٹکے دیئے لیکن میں نے جب اپنے وعدے پر استقامت دکھائی اور مسلسل اپنے پروردگار سے مانگتا رہا تو آج نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ پروردگار نے مجھے اتنا عطا فرمایا ہے کہ میں کبھی اس حد تک سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میرا جتنا کاروبار ہے اس میں بینک کا کوئی حصہ نہیں۔ جبکہ بیشتر کاروبار کرنے والے بینکوں کے سودی سرمائے سے کاروبار کرتے ہیں۔ اسی طرح کی سینکڑوں مثالیں آپ کو اپنے گردوپیش میں ملیں گی۔ لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم اللہ کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم قرآن کریم کو پڑھتے ضرور ہیں لیکن اس کی ہر بات ہمارے دل میں یقین پیدا نہیں کرتی۔ صحابہ میں اور ہم میں صحابیت کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ وہ جس حکم کو سنتے تھے اس پر یقین لاتے تھے پھر عمل کے لیے کمربستہ ہو جاتے تھے، بالآخر اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیتے تھے۔ حضرت ابوالدحداح (رض) ایک صحابی ہیں۔ انھوں نے سنا کہ قرآن کریم کی ایک آیت اتری ہے۔ جس میں پروردگار نے فرمایا ہے کہ جو اللہ کو قرض دے گا اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا حضور میں نے سنا ہے اللہ نے قرض مانگا ہے اور پھر اس پر اجر کبیر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک سنا، انھوں نے کہا حضور اپنا ہاتھ بڑھایئے، آپ نے ہاتھ آگے بڑھایا تو صحابی نے حضور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: حضور میرے دو باغ ہیں ایک زیادہ قیمتی ہے، اسی میں میری رہائش ہے۔ آپ گواہ رہیں میں نے وہ باغ اپنی رہائش سمیت اللہ کو قرض دے دیا۔ پھر وہاں سے اٹھے اور باغ کے کنارے کھڑے ہو کر اپنی بیوی ام الدحداح کو آواز دی کہ بچوں کو لے کر باہر آ جاؤ۔ انھوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ آپ اندر تشریف کیوں نہیں لا رہے؟ انھوں نے کہا: میں نے یہ باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ بیوی بھی صحابیہ تھیں اور رسول پاک کی تربیت یافتہ۔ سن کر کہنے لگیں ابوالدحداح مبارک ہو آپ نے بہت اچھا سودا کیا۔ یہی وہ انفاق ہے جو سچے ایمان کا نتیجہ ہے کیونکہ جب تک اللہ پر ایمان نہ ہو کہ رزق کے خزانے اسی کے ہاتھ میں ہیں وہ جب چاہتا ہے رزق میں کشادگی پیدا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ چاہے تو غریب کو دولت مند اور بے کس کو تخت وتاج کا مالک بنا دے اور جب چاہے قارون جیسے دولت مند کو اس کے خزانوں سمیت زمین میں غرق کر دے۔ اس وقت تک اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا ایمان نصیب ہو جانے کے بعد جب اسے انفاق کے لیے کہا جاتا ہے تو فوراً ایمان اس کے اندر سے بولتا ہے کہ یہ میرا مال و دولت اللہ کی ہی عطا ہے۔ میں جتنا اس کے راستے میں خرچ کروں گا اس کا وعدہ ہے کہ اتنا ہی اس میں اضافہ کرے گا۔ وہ یہ اضافہ دنیا میں بھی کرتا ہے اور آخرت میں بھی کرے گا۔ یہ سوچ اس کے ہاتھ کو رکنے نہیں دیتی۔ اس کے کانوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں بلال اللہ کے راستے میں خرچ کر اور اس سے تنگی کا شکوہ نہ کر۔ اور یہ بھی کہ لوگو! اگر تم اللہ کے راستے میں گن گن کر دوگے تو وہ بھی تمہیں گن گن کر دے گا، بے حساب دوگے تو وہ بھی بے حساب دے گا۔ اس آیت کا آخری جملہ ایک مومن کی سرخوشی کے لیے ایسا مژدہ جاں فزا ہے جس پر جتنا بھی اظہار مسرت کیا جائے تھوڑا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (وہ اپنی طرف سے اجر عظیم عطا فرماتا ہے) سوال یہ ہے کہ یہ اجر عظیم کیا ہے؟ لفظی معنی تو ہے بڑا اجر لیکن بڑے اجر یا بڑے معاوضے کا کوئی ایک پیمانہ نہیں۔ اس پیمانے کا دارومدار اس کے کہنے والے پر ہے۔ اگر ایک چھوٹا آدمی یہ کہتا ہے کہ میں تمہیں بہت بڑا معاوضہ دوں گا تو ظاہر کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق دے گا۔ لیکن جب ایک بڑا آدمی کوئی نواب یا بادشاہ کسی سے کہتا ہے کہ ہم تمہیں بڑا اجر عطا کریں گے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے ہاں بڑے اجر کا کیا مفہوم ہوگا۔

نواب عبدالرحیم خان خاناں مغلیہ دور کے ایک عظیم نواب گزرے ہیں۔ یہ بادشاہ کے نورتنوں میں سے تھے۔ ان کی حوصلہ مندی اور فیاضی ضرب المثل کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ دہلی سے آگرہ جانے کے لیے نکلے، امرا، مصاحب اور فوج کا ایک حصہ ساتھ تھا۔ آگرہ دہلی سے پندرہ منزل کے فاصلے پر ہے اور یہ ہر منزل یعنی پندرہ میل پر پڑاؤ ڈالتے تھے۔ رات وہاں گزارتے اور اگلے دن پھر سفر شروع کر دیتے۔ پہلی ہی منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ دربار سجا۔ امرا اور مصاحب اپنی اپنی مسندوں پر فروکش ہو گئے۔ نواب اپنی مسند خاص پر نہایت تمکنت کے ساتھ آ کر بیٹھے کہ اچانک ایک درویش بارگاہ کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوا اور اس نے بلند آواز سے ایک شعر پڑھا۔

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم کا معنی تو مالدار اور سخی ہوتا ہے۔ لیکن نواب کو اسوقت بادشاہ کی جانب سے منعم خاں کا لقب بھی عطا ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اور بھی محظوظ ہوئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ منعم یعنی ایک بڑا آدمی پہاڑ، جنگل اور صحرا میں بھی مسافر نہیں ہوتا وہ جہاں بھی جاتا ہے خیمہ لگاتا اور دربار سجاتا ہے۔ نواب نہایت خوش ہوا اور اسی وقت اس درویش کو ایک لاکھ روپے دینے کا حکم دیا۔ دوسرے روز اگلی منزل پر دربار لگایا۔ خیمے آراستہ ہوئے، تو پھر وہی درویش آیا اور اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پھر وہی شعر پڑھا۔ نواب نے خوش ہو کر پھر ایک لاکھ روپے دینے کا حکم دیا۔ چار پانچ منزلوں تک یہ درویش آتا رہا اور ہر بار یہی شعر پڑھتا اور ایک لاکھ روپیہ انعام حاصل کر کے چلا جاتا۔ لیکن چھٹے دن وہ نہیں آیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اتنا انعام آج تک کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیا، ایسا نہ ہو نواب بگڑ کر سارا انعام چھین لے۔ اس لیے زیادہ حرص اچھی نہیں جو میں لے چکا ہوں وہی بہت ہے۔ اس دن نواب نے دیر تک دربار جاری رکھا۔ شام ہو گئی اور وہ درویش نہیں آیا، تو نہایت افسوس سے کہنے لگے کہ درویش کم ظرف نکلا اسے نجانے کس خیال نے روک لیا ہم نے تو پہلے ہی دن پندرہ لاکھ روپیہ الگ رکھنے کا حکم دے دیا تھا تاکہ روزانہ اس درویش کو ایک لاکھ روپیہ دیا جاتا رہے۔ اندازہ کیجیے ! جس انعام کو ایک درویش غیر معمولی اور بہت بڑا سمجھتا ہے وہ نواب کی نگاہوں میں کوئی بڑا انعام نہیں۔ تو اللہ جیسے کریم کے بارے میں کون اندازہ کر سکتا ہے کہ جب وہ کسی کو اجر عظیم عطا فرمائے تو اس اجر کی عظمت کا حال کیا ہو گا۔

مسائل

ا۔ لوگوں کو اخلاص کے ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کرنا چاہیے

آیت مبارکہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

لغات القرآن:[إِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : الله] [لَا يَظْلِمُ : ظلم نہیں کرتا] [مِثْقَالَ : برابر] [ذَرَّةٍ : ذرہ] [وَإِنْ : اور اگر] [تَكُ : ہو] [حَسَنَةً : کوئی نیکی] [يُّضٰعِفْهَا : اس کو کئی گنا کرتا ہے] [وَيُؤْتِ : اور دیتا ہے] [مِنْ لَّدُنْهُ : اپنے پاس سے] [أَجْرًا : ثواب] [عَظِيْمًا : بڑا]

ترجمہ : بیشک اللہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے

تفسیر و تشریح:

اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وہ کسی پر ایک ذرے جتنا بھی ظلم فرمائے۔ یہاں یہ بات اس معنیٰ میں ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کسی کے نیک اعمال بغیر کسی وجہ کے ضائع فرما کر ان کی جزا سے محروم کر دے یا کسی مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دیدے، یہ اس کی شان کے لائق نہیں بلکہ اپنے فضل ورحمت سے نیکی کا ثواب عمل کے مقابلے میں بہت زیادہ عطا فرماتا ہے۔ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے مومن نیکی کرتا ہے تو دنیا میں رزق اور آخرت میں جنت کی صورت میں ثواب پاتا ہے اور کافر کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے بدلے دنیا میں ہی اسے رزق دے دیا جاتا ہے اور قیامت کے دن اس کے پاس کوئی نیکی نہ ہوگی جس پر اسے کوئی جزا ملے۔

(مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب جزاء المومن بحسناتہ فی الدنیا والآخرۃ۔۔۔ الخ، ص ۱۵۰۸، الحدیث : ۵۶ (۲۸۰۸))

اللہ کے ظلم نہ کرنے کا معنیٰ

ظلم کا معنیٰ ہے کسی چیز کو اس کے مخصوص محمل کے سوا 'کمی یا زیادتی کر کے کسی اور جگہ رکھنا سو اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ کسی کی نیکیوں کے ثواب میں کمی کرتا ہے نہ کسی کی برائیوں کے عذاب میں کمی کرتا ہے 'اس لیے بندوں کو چاہیے کہ ان کو جس چیز کا حکم دیا ہے اس پر عمل کریں اور جس کام سے منع کیا ہے اس سے رک جائیں۔

ظلم کا یہ معنیٰ بھی ہے : غیر کی ملک میں تصرف کرنا 'اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے اور مالک اپنی ملک میں جو تصرف بھی کرے وہ ظلم نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا لیکن پھر بھی بفرض محال اگر وہ تمام مخلوق کو دوزخ میں ڈال دے تو یہ ظلم نہیں ہوگا کیونکہ سب اس کے مملوک ہیں اور وہ مالک علی الاطلاق ہے ہم نے بفرض محال اس لیے کہا ہے کہ وہ نیکی کرنے والوں کو اجر و ثواب دینے کا وعدہ فرما چکا ہے اور اپنے وعدے کے خلاف کرنا اس کے حق میں محال ہے کیونکہ انعام کا وعدہ کر کے انعام نہ دینا عیب ہے اور عیب اللہ کے لیے محال ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل ظلم نہیں ہو سکتا

وہ خالق کل ہے مالک الملک ہے اگر بغیر جرم کے سارے جہان کو عذاب دے تب بھی ظلم نہ ہو گا پس اس کی شان میں کسی فعل پر ظلم کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا اس لیے آیت کی مراد یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی ظلم ہو سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کوئی ایسا کام بھی نہیں کرے گا کہ دوسرے اگر وہی کام کریں تو اس کو ظلم کہا جائے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کسی کی طاعت کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی کے گناہ میں بیشی کرے گا۔

کئی گنا اجر

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ برابر بھی ضائع نہیں فرماتا سو ان کافروں پر جو عذاب ہو گا وہ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے۔ اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہو گی تو اضعاف مضاعف اس کا اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اس کو عنایت کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب بڑھانے کا معنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اگر کوئی نیکی ہو تو وہ اس کو دگنا کر دیتا ہے ' اس کا معنی یہ ہے کہ بندہ ایک نیکی پر دس گنے اجر کا مستحق ہے تو اللہ اس کو بیس گنا اجر عطا فرمائے گا یا تیس گنا اجر عطا فرمائے گا یا اس سے بھی زیادہ عطا فرمائیگا۔

زاذان بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعود (رض) کے پاس گیا انھوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اولین اور آخرین کو جمع فرمائیگا ' پھر اللہ کی طرف سے ایک منادی یہ ندا کرے گا کہ جس شخص نے اپنا حق لینا ہو آئے اور اپنا حق لے لے ' بخدا اگر بچے کا اپنے باپ پر یا کسی کا اپنے بیٹے پر یا اپنی بیوی پر جو بھی حق ہو گا وہ لے لے گا ' خواہ وہ چھوٹا حق ہو ' اور اس کا مصداق کتاب اللہ میں یہ آیت ہے :

(آیت) " فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتسآء لون "۔ (المؤمنون : ۱۰۱)

ترجمہ : پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان اس دن رشتے (باقی) نہیں رہیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے۔

ایک شخص سے کہا جائے گا ان لوگوں کے حقوق ادا کرو وہ شخص کہے گا اے رب ! دنیا تو گذر چکی ہے میں ان کے حقوق کہاں سے ادا کروں ؟ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیگا اس شخص نے نیک اعمال کو دیکھو ' اور مستحقین کو اس کی نیکیاں دیدو ' پھر جب اس کی ایک ذرہ کے برابر نیکی رہ جائے گی تو فرشتے کہیں گے ' (حالانکہ اللہ کو خوب علم ہے) اے ہمارے رب ہم نے ہر حقدار کو اس کی نیکی دیدی اب اس کی صرف ایک نیکی رہ گئی ہے ' اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیگا میرے اس بندہ کی نیکی کو دگنا چوگنا کر دو ' اور اس کو میرے فضل اور رحمت سے جنت میں داخل کر دو ' اور اس کا مصداق یہ آیت ہے ' اور اگر وہ بندہ شقی ہو اور اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں تو فرشتے عرض کریں گے کہ اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کی صرف برائیاں رہ گئی ہیں اور لوگوں کے حقوق باقی ہیں اللہ تعالیٰ فرمائیگا حقداروں کے گناہ اس کے نامہ اعمال میں ڈال دو اور اس کے لیے جہنم کا پروانہ لکھ دو۔ (نعوذ باللہ منہ)

ابو عثمان النھدی بیان کرتے ہیں کہ میری حضرت ابو ھریرہ (رض) سے ملاقات ہوئی میں نے کہا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک نیکی کا اجر بڑھا کر ایک بڑھا کر ایک کروڑ درجہ کر دیا جاتا ہے ‘ انھوں نے کہا تم کو اس پر کیوں تعجب ہے بہ خدا میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو ہزار ضرب ہزار (ایک کروڑ) درجہ تک پہنچا دے گا۔ (جامع البیان ج ۵ ص ۵۸۔ ۵۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا فرماتا ہے ‘ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ بندہ کا عمل اتنے اجر کا مقتضی نہیں ہے یہ اجر اللہ اپنے پاس سے عطا فرماتا ہے ‘ دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کا اجر وثواب بڑھاتا ہے جس سے بندہ کو جنت میں جسمانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا فرماتا ہے جس سے بندہ کو روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں اور یہ روحانی لذتیں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے حاصل ہوتی ہے اور یہ جنت میں حاصل ہونے والی سب سے عظیم نعمت ہے۔ (تبیان)

مومن و کافر کی نیکی

بغوی نے حضرت انس (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مومن کی کسی نیکی (کے اجر) کو کم نہیں کیا جائے گا دنیا میں اس کے عوض رزق (زیادہ) ملے گا اور آخرت میں بھی اس کی اچھی جزا ملے گی اور کافر کی نیکی کا بدلہ اس کو بصورت رزق دنیا میں ہی ملے گا آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی ہی نہ رہے گی کہ ثواب پا سکے۔ رواہ احمد و مسلم۔ (تفسیر مظہری جلد سوم)

مومنین کی دوزخ سے رہائی

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مومن دوزخ سے نجات پا کر مامون ہو جائیں گے تو اپنے ان بھائیوں کے متعلق جو دوزخ میں داخل کر دیئے گئے ہوں اپنے رب سے اتنا سخت جھگڑیں گے کہ اتنا سخت جھگڑا تم میں سے کوئی اپنے حق کے متعلق بھی کسی سے نہیں کرتا۔ عرض کریں گے پروردگار وہ ہمارے بھائی ہیں ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے اللہ فرمائے گا جاؤ اور جس کو پہچانتے ہو دوزخ میں سے نکال لو مومن جا کر چہروں سے پہچان لیں گے کیونکہ چہروں کو آگ نے نہ کھایا ہوگا۔ کسی کے نصف پنڈلیوں تک آگ نے جلایا ہوگا اور کسی کے ٹخنوں تک۔ یہ ان کو نکال لیں گے اور عرض کریں گے کہ پروردگار تو نے جن کو نکالنے کا حکم دیا تھا ‘ ہم نے ان کو نکال لیا ‘ اللہ تعالیٰ فرمائے گا (پھر جاؤ) اور جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہو اس کو بھی نکال لو (مؤمن حکم کی تعمیل کریں گے) پھر (حکم ہوگا) جس کے دل میں نصف دینار کے برابر ایمان ہو (اس کو بھی نکال لو مومن حکم کی تعمیل کریں گے آخر) یہاں تک (حکم ہوگا کہ) جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو (اس کو بھی نکال لو۔ راوی نے کہا اگر کوئی اس بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ وَّاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا مؤمن عرض کریں گے پروردگار تو نے جن کو نکال لینے کا حکم دیا تھا ان کو ہم نے نکال لیا اب دوزخ میں کوئی بھی ایسا نہیں رہا جس کے (دل کے) اندر کوئی بھی خیر ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ملائکہ سفارش کر چکے انبیاء سفارش کر چکے ‘ مومن سفارش کر چکے اور ارحم الراحمین باقی رہا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر اللہ دوزخ کے اندر سے ایک مٹھی بھر یا دو مٹھی بھر ایسے لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے اللہ کے لیے کبھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی اور جل کر کوئلہ ہوگئے ہوں ان کو لا کر آب حیات ان پر ڈالا جائے گا جس کی وجہ سے وہ ایسے اگیں گے جیسے سیلاب کے کیچڑ میں دانہ اگتا ہے اور موتی کی طرح ان کے بدن جھلکنے لگیں گے ان کی گردنوں پر مہر لگی ہوگی کہ یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں (یعنی ان کی کوئی نیکی ہی نہیں تھی) حکم ہوگا جنت میں داخل ہو جاؤ تمہاری جو تمنا ہو اور جس چیز پر تمہاری نظر پڑے وہ تمہاری ہے وہ عرض کریں گے پروردگار تو نے ہم کو ایسا کچھ عطا فرمایا جو کسی کو جہاں میں نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ' میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی بڑھ کر (نعمت) ہے وہ عرض کریں گے پروردگار وہ کیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری خوشنودی آئندہ کبھی میں تم سے غصے نہ ہوں گا۔ رواہ البغوی بسندہ بخاری و مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے لیکن اس میں حضرت ابو سعید (رض) : کا یہ قول نہیں ہے کہ اگر کوئی اس بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے۔ (گلدستہ)

اللہ تعالیٰ کے نام کا وزن

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے علی الاعلان لائے گا اس کے اعمال ناموں کے ننانوے دفتر کھولے جائیں گے ہر دفتر اتنا لمبا ہوگا جتنی دور نظر پہنچتی ہے اور اللہ فرمائے گا کیا تجھے اس میں سے کسی چیز کا انکار ہے کیا میرے نگراں کاتبوں نے تیری کوئی حق تلفی کی ہے بندہ عرض کرے گا نہیں میرے مالک (کوئی حق تلفی نہیں کی نہ مجھے اس کا انکار ہے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا (گناہ کرنے کا) تیرے پاس کوئی عذر یا تیری کوئی نیکی اور ہے (جو لکھنے سے رہ گئی ہو) بندہ لاجواب اور متحیر ہو کر عرض کرے گا نہیں پروردگار۔ اللہ فرمائے گا کیوں نہیں۔ ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے تجھ پر آج ظلم نہ ہوگا اس کے بعد ایک چھوٹا سا پرچہ نکالا جائے گا جس میں : اشہد ان لاالٰہ الا اللّٰہ وان محمد عبدہ ورسولہٗ لکھا ہوگا اللہ فرمائے گا وزن کے وقت تو موجود رہنا ' بندہ عرض کرے گا میرے مالک ! یہ چھوٹا سا پرچہ ان لمبے دفتروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری حق تلفی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد تمام دفتروں کو ایک پلڑے میں اور پرچہ کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو دفتروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا اور پرچہ والا پلڑا بھاری نکلے گا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔ رواہ ابن ماجہ وابن حبان والحاکم۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

ایک سے ہزاروں :

حضرت ابوہریرہ (رض) نے قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے سنا کہ کوئی شک نہیں کہ اللہ ایک نیکی کو بڑھا کر ہزاروں ہزار نیکیاں کر دے گا۔ رواہ ابن جریر وابن ابی شیبہ۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا قیامت کا دن ہوگا تو اللہ اگلوں پچھلوں کو جمع کرے گا اور ایک منادی ندا دے گا۔ خبردار ہو جاؤ جس کسی کا کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے آجائے یہ سن کر آدمی خوش ہوگا کہ باپ یا اولاد یا بھائی پر اس کا جو حق ہوگا وہ اس کو ملے گا خواہ حق کتنا ہی تھوڑا ہو اور رشتہ داروں سے حق وصول کرنے کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ الخ۔

خوش بخت و بد بخت

اور (ہر) شخص کو طلب کیا جائے گا اور ایک منادی تمام اگلوں پچھلوں کے سامنے ندا دے گا یہ فلاں شخص ہے جس کا اس پر حق ہو وہ اپنا حق لینے آ جائے پھر اس شخص سے کہا جائے گا ان کے حقوق ادا کر وہ شخص کہے گا میرے رب دنیا جاتی رہی اب کہاں سے دوں اللہ فرشتوں سے فرمائے گا اس کے اعمال دیکھو ان میں سے ان لوگوں کے حقوق دے دو۔ اب اگر ذرہ برابر نیکی رہ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک اس کی ذرہ برابر نیکی باقی رہی ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندہ کے لیے اس کو چند گنا کر دو اور اس کو میری رحمت کے طفیل جنت میں داخل کر دو۔ اس کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا اور اگر بندہ بد بخت ہو گا اور فرشتے کہیں گے کہ اے ہمارے معبود اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور حقدار ابھی باقی ہیں تو اللہ فرمائے گا ان کی کچھ بدیاں لے کر اس کے گناہوں میں بڑھا دو پھر اس کے لیے دوزخ کا پروانہ کاٹ دو (یا اس کو خوب مارتے ہوئے دوزخ کو لے جاؤ) رواہ البغوی وابن المبارک وابو نعیم وابن ابی حاتم۔

آیت مبارکہ:

فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾

لغات القرآن: [فَكَيْفَ : پھر کیسا ۔ کیا] [اِذَا : جب] [جِئْنَا : ہم بلائیں گے] [مِنْ : سے] [كُلِّ اُمَّةٍ : ہر امت] [بِشَهِيْدٍ : ایک گواہ] [وَّجِئْنَا : اور بلائیں گے] [بِكَ : آپ کو] [عَلٰي : پر] [هٰٓؤُلَاۤءِ : ان کے] [شَهِيْدًا : گواہ]

ترجمہ: پھر اس دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب ﷺ !) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے (عرفان)

تفسیر و تشریح: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اللہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا یعنی کافر کو جو عذاب دے گا وہ ظلم نہیں ہو گا ' اور مومنوں کو بشارت دی تھی کہ ان کی نیکیوں کے اجر کو بڑھا دے گا ' اب اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ جزا اور سزا نبیوں اور رسولوں کی گواہی پر مترتب ہو گی جس کے خلاف وہ گواہی دیں گے اس کو سزا ملے گی اور جس کے حق میں گواہی دیں گے اس کو اجر و ثواب بیش از بیش ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے سامنے قرآن پڑھو ' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کو قرآن سناؤں حالانکہ آپ پر تو خود قرآن مجید نازل ہوا ہے ' آپ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میں کسی اور سے قرآن سنوں ' میں نے سورۃ النساء پڑھی جب میں آیت پر پہنچا (آیت) " فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھؤلاء شھیدا (النساء: ۴۱)

میں نے سر اٹھا کر دیکھا یا کسی نے میرے پہلو میں ٹھوکا دیا اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۸۰۰)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رونا خوف خدا کے غلبہ سے تھا کیونکہ اس سے پہلی آیت میں ہے اللہ تعالیٰ کسی پر ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں فرمائیگا۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شہادت دینے کا معنی یہ ہے کہ آپ انبیاء صادقین (علیہم السلام) کے صدق پر گواہی دیں گے ' یا انبیاء سابقین کی تقویت کے لیے ان کی امت کے کافروں کے خلاف شہادت دیں گے ' اور اس میں ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم فضیلت ہے کیونکہ تمام نبیوں اور رسولوں کی شہادت آپ کی شہادت سے مانی جائے گی۔ (تبیان)

قیامت کے دن تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کے احوال و اعمال پر شہادت دیں گے اور حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انبیائے کرام کی شہادت کے درست ہونے کی گواہی دیں گے۔ اور ھولاء کا مشار الیہ امت مصطفویہ کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے احوال پر گواہی دیں گے۔ وقیل الاشارۃ الی جمیع امتہ۔ علامہ قرطبیؒ نے اس قول کی تائید کے لیے حضرت سعید بن مسیب کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لیس من یوم الا تعرض علی النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امتہ غدوۃ وعشیۃ فیعرفھم بسیماھم واعمالھم فلذلک یشھد علیھم (القرطبیؒ) یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہر صبح وشام حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت پیش کی جاتی ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ہر امتی کا چہرہ اور اس کے اعمال کو پہچانتے ہیں۔ اسی علم کامل کے باعث حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کے روز سب کے گواہ ہوں گے۔ (ضیاء)

اس آیت میں حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا کی تمام اقوام امتوں پر گواہی دینے والا بیان فرمایا۔ ھولاء کے مفہوم میں دنیا کے تمام نبی۔ رسول (علیہم السلام) امتیں شامل ہیں خواہ انھوں نے ان کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔

حضرت سعید بن مسیب سے ابن مبارک رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے کہ ہر روز صبح وشام حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر آپ کی امت پیش ہوتی ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے عملوں سے ان کو پہچانتے ہیں۔ (حسنات)

محشر کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس میں کئی مراحل ہوں گے ہر مرحلہ دنیا کے سینکڑوں سالوں کے برابر ہوگا۔ ان مراحل میں ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا کہ جب مجرم قسمیں اٹھا اٹھا کر اس بات کا انکار کریں گے کہ الٰہی ہم نے تیری ذات کا نہ انکار کیا اور نہ ہی کسی کو تیرا شریک ٹھہرایا۔ ہمارے ذمہ جو اعمال لگائے گئے ہیں ہم نے یہ ہرگز نہیں کیے۔ انبیاء کے بارے میں کہیں گے کہ انھوں نے ہمیں ایک بار بھی نہ سمجھایا۔ اس دروغ گوئی کی وجہ سے ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی۔ اب ان کے اعضاء گواہی دیں گے۔ اس کے بعد اور شہادتیں پیش کی جائیں گی جن میں سب سے بڑی اور معتبر شہادت انبیاء کی ہوگی۔ وہ عرض کریں گے اے رب ذوالجلال! ہم نے تیرا پیغام مِن وعَن پہنچا دیا تھا لیکن مجرم پھر بھی نہیں مانیں گے۔ اس پر سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گواہی دیں گے کہ اے رب کریم! انبیاء کرام نے تیرا پیغام ٹھیک طریقے سے پہنچایا تھا۔ (فہم)

اس شہادت کے بارے میں حجۃالوداع کے موقعہ پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے لوگوں سے پوچھا: "اِلَا هَلْ بَلَّغْتُ "کیا میں نے پہنچا دیا؟ تو لوگوں نے کہا کیوں نہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں اللہ کے احکام پہنچادیئے۔ اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ
"اے اللہ! گواہ رہنا ' اے اللہ! گواہ رہنا۔ "
[رواہ البخاری: کتاب الحج، باب الخطبۃ ایام منی]

اُمت محمدیہ کی گواہی

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يُدْعٰى نُوحٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ لَهُ هَلْ بَلَّغْتَ فَيَقُولُ نَعَمْ فَيُدْعٰى قَوْمُهُ فَيُقَالُ لَهُمْ هَلْ بَلَّغَكُمْ فَيَقُولُونَ مَا أَتَانَا مِنْ نَذِيرٍ أَوْ مَا أَتَانَا مِنْ أَحَدٍ قَالَ فَيُقَالُ لِنُوحٍ مَنْ يَشْهَدُ لَكَ فَيَقُولُ مُحَمَّدٌ وَأُمَّتُهُ قَالَ فَذٰلِكَ قَوْلُهُ (وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا كُمْ أُمَّةً وَّسَطًا)

[مسند أحمد: كتاب باقي مسند المكثرين، باب: مسند أبي سعيد الخدري]

"حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا روز قیامت نوح (علیہ السلام) کو پوچھا جائے گا کہ کیا تو نے میرا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں پھر ان کی قوم کو بلا کر پوچھا جائے گا کیا انھوں نے تمہیں تبلیغ کی اور میرا پیغام پہنچایا۔ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو ڈرانے والا کوئی نہیں آیا۔ حضرت نوح (علیہ السلام) سے کہا جائے گا آپ کی گواہی کون دے گا؟ وہ کہیں گے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کی امّت۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ (**اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا**)۔"

حساب کے وقت حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک کے منکر لوگوں سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ باوجود انبیاء (علیہم السلام) کی ہدایتوں کے تم لوگ منکر کیوں رہے، یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کا انکار کر کے صاف مکر جاویں کے، اس پر سب انبیاء علیہم السلام کہیں گے کہ حضرت محمد آخر الزماں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، ان کی شریعت میں ہر زمانہ کے نبی کی ہدایت کرنے کی تصدیق موجود ہے، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ ﷺ کی امت کے لوگ حاضر کئے جاویں گے وہ گواہی دیں گے۔ اس پر نادم ہو کر یہ منکر لوگ جانوروں کی خاک ہوتا ہوا دیکھ کر اپنے خاک ہونے کی آرزو کریں گے۔ اس گواہی کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کی نیکیوں کی گواہی قیامت تک کی ادا فرماویں گے۔ اسی واسطے امت کے اعمال آپ کے روبرو پیش ہوتے رہتے ہیں، تاکہ گواہی کے لیے آپ کو امت کے اعمال کی اطلاع رہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جمعہ کے روز تم لوگ درود زیادہ پڑھا کرو اس دن تمہارے درود روبرو پیش ہوتے ہیں۔ (مظہر)

مسائل

۱۔ قیامت کے دن ہر امت کا رسول اس پر گواہ ہوگا اور حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امت محمدیہ اور پہلے انبیاء کے بارے میں گواہی دیں گے۔

۲۔ قیامت کے دن کافر اور رسول کا نافرمان مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کی آرزو کرے گا۔
۳۔ کہ تم نبی الانبیاء اور سارا عالم تمہاری امت۔

آیت مبارکہ:

يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ؑ

لغات القرآن: [يَوْمَىِٕذٍ : اس دن] [يَّوَدُّ : آرزو کریں گے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ] [كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا] [وَعَصَوُا : اور نافرمانی کی] [الرَّسُوْلَ : رسول] [لَوْ تُسَوّٰى: کاش برابر کردی جائے] [بِهِمُ : ان پر] [الْاَرْضُ : زمین] [وَلَا : اور نہ] [يَكْتُمُوْنَ : چھپائیں گے] [اللّٰهَ : اللہ] [حَدِيْثًا : کوئی بات]

ترجمہ: اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش (انہیں مٹی میں دبا کر) ان پر زمین برابر کر دی جاتی، اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

تفسیر و تشریح: اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہو گا اور پیغمبر علیہم السلام کا کہنا نہ مانا ہو گا آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین کا پیوند ہو جائیں یعنی جن لوگوں نے رسول ﷺ کی رسالت کا انکار کیا ہو گا اور رسول ﷺ کا حکم نہ مانا ہو گا یا صرف ایک جرم کیا ہو گا یعنی انکار کیا ہو گا یا رسول اللہ ﷺ کا کہنا نہ مانا ہو گا وہ آرزو کریں گے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ سما جائیں اور پھر زمین برابر کر دی جائے یا خاک کے ساتھ خاک ہو گئے ہوتے اور جانوروں کی طرح معدوم کر دیا جاتا۔
اوّل مطلب قتادہ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے اور دوسرا مطلب کلبی نے بیان کیا ہے کلبی نے لکھا ہے کہ چوپایوں ،مویشیوں ،درندوں اور پرندوں کو اللہ حکم دے گا خاک ہو جاؤ وہ فوراً خاک ہو کر زمین میں مل جائیں گے اس وقت کافر بھی یہی تمنا کرے گا۔ (مظہری)

اس آیت میں رسول اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کا کافروں پر عطف (واو سے الگ کیا) کیا گیا ہے اور عطف، مغائرت (غیر ،الگ) کو چاہتا ہے ،(الگ مطلب چاہتا ہے) اس سے یہ واضح ہوا کہ کفر الگ گناہ ہے اور رسول اللہ کی نافرمانی کرنا الگ گناہ ہے اور کافروں کو کفر کی وجہ سے بھی عذاب ہو گا ،اور کافروں کو رسول کی نافرمانی کی وجہ سے اسی وقت عذاب ہو گا جب یہ مانا جائے کہ کافر فروعی احکام کے بھی مخاطب ہیں۔ نیز

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اس روز کافر یہ تمنا کریں گے کہ ان پر زمین برابر کر دی جائے اس کا ایک معنی یہ ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ ان کو زمین میں دفن کر دیا جائے ' دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کو دوبارہ زندہ نہ کیا جاتا اور وہ اسی طرح زمین مدفون رہتے ' تیسرا معنی یہ ہے کہ جب وہ دیکھیں گے کہ جانوروں کو مٹی بنا دیا گیا ہے تو وہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کو بھی مٹی بنا دیا جائے۔

پھر فرمایا اور وہ اللہ سے کسی بات کو نہیں چھپا سکیں گے ' اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے دن جب مشرکین دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما رہا ہے جنہوں نے شرک نہیں کیا تو وہ کہیں گے۔ (آیت) "واللہ ربنا ما کنا مشرکین"۔ (الانعام : ٢٣) "ہمیں اپنے پروردگار کی قسم ہم شرک کرنے والے نہیں تھے "اس وقت ان کے منہ اور ہاتھ اور پیر ان کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ اللہ سے کسی بات کو چھپا نہیں سکیں گے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سورۃ الانعام میں یہ مذکور ہے کہ کفار یہ کہیں گے کہ ہم شرک کرنے والے نہیں تھے اور اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ وہ اللہ سے کسی بات کو چھپا نہیں سکیں گے اور یہ تعارض ہے ' اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن مختلف احوال ہوں گے ' ایک وقت میں وہ کہیں گے کہ (آیت) "ما کنا نعمل من سوء"۔ (النحل : ٢٨) "ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے "اور کہیں گے کہ ہم شرک کرنے والے نہیں تھے اور ایک وقت ہوگا کہ (آیت) "شہد علیہم سمعھم وابصارھم وجلودھم بما کانوا یعملون"۔ (حم السجدہ : ٢٠) "ان کے کان ' ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف ان کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے "اس وقت وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکیں گے اور یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان پر زمین برابر کر دی جائے۔ (تبیان)

عطاء نے کہا کہ لا یکتمون کا عطف تسوی پر ہے اور مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے یعنی وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں سما جاتے مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف و حالات (جو توراۃ میں مذکور ہیں) انھوں نے نہ چھپائے ہوتے۔ جمہور کے نزدیک لایکتمونکا عطف یود الذین پر ہے یعنی وہ اپنی کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپا نہ سکیں گے۔ اللہ سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ان کے ہاتھ پاؤں خود شہادت دیں گے۔

سعید بن جبیر (رض) : کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس (رض) سے عرض کیا۔ قرآن کی چند آیات میں مجھے اشتباہ ہے باہم اختلاف نظر آتا ہے۔ فرمایا پیش کرو تم کو کیا اشتباہ ہے۔ اس نے عرض کیا آیت فلا انساب بینہم یومئذ ولا یتساء لون (سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس روز کوئی کسی کو نہیں پوچھے گا) اور آیت اقبل بعضہم علی بعض یتساء لون (سے باہم پوچھ تاچھ کا ثبوت مل رہا ہے) اور آیت ولا یکتمون اللہ حدیثا (میں نفی اخفاء کی صراحت ہے) اور آیت واللہ ربنا ما کنا مشرکین (سے دل میں اظہار کے خلاف مطلب کو چھپائے رکھنا ثابت ہو رہا ہے) اور آیت ام السماء بناھا۔۔ والارض بعد ذلک دحاھا میں آسمان کی تخلیق پہلے اور زمین کی تخلیق پیچھے ذکر کی ہے لیکن آیت ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین الخ میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کو پیدا کرنے کا ذکر کیا ہے اور آیت کان اللہ غفورا رحیما میں لفظ کان بتا رہا ہے کہ اللہ غفور رحیم تھا۔ اب نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے جواب میں فرمایا آیت فَلَا اَنْسَابَ کے مصداق کا حدوث پہلا صور پھونکا جانے کے بعد ہوگا جب کہ صور کی آواز سے سب بے ہوش جائیں گے پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا تو (اٹھ کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کرے گا۔ (لہٰذا سوال اور عدم سوال میں کوئی تضاد باقی نہیں رہا) رہا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ اور ولا یکتمون اللّٰہ حدیثا کا تعارض (تو یہ بھی حقیقت میں تعارض نہیں ہے)۔

جب مشرک اور کافر مسلمانوں کے گناہ معاف ہوتے اور مشرکوں کے جرائم معاف نہ ہوتے دیکھیں گے تو بخشش کی امید میں مشرک ہونے سے انکار کر دیں گے پھر اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے اور ان کے اعمال کو ظاہر کر دیں گے اس وقت رسول

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نہ ماننے والے اور رسالت کا انکار کرنے والے تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں سما جائیں اور اللہ سے کوئی بات (یعنی اپنا شرک) مخفی نہ رکھ سکیں گے۔ (مظہری)

باقی تخلیق زمین وآسمان کے اوّل بعد ہونے کا مسئلہ تو اس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ نے دو روز میں زمین کو پیدا کیا ' پھر دو روز میں سات آسمان پیدا کئے ' پھر دو روز میں زمین کو بچھایا اور ہموار کیا۔
اس حساب سے زمین اپنی موجودات سمیت چار روز میں پیدا کی گئی۔ رہا کان اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا تو (اس میں کان بمعنی ماضی نہیں ہے بلکہ بمعنی استمرار ہے) اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے غفور رحیم ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ تم کو قرآن پاک میں اشتباہ نہ ہونا چاہیے یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ کذا اخرجہ البخاری وغیرہ۔
حسن نے (آیات کے ظاہری اختلاف کو دور کرنے کے لئے) فرمایا کہ ان آیات میں مختلف مواقع کے واقعات کا اظہار کیا گیا ہے ایک موقع پر وہ بات نہیں کر سکیں گے اور لَا تَسۡمَعُ اِلَّا ہَمۡسًا اور سوائے پھس پھس کے کچھ سنائی نہیں دے گا۔ دوسرے مقام پر وہ بول سکیں گے اور جھوٹ بولیں گے اور کہیں گے مَا کُنَّا مشرکین ما کنا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡءٍ ایک موقع پر وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے فاعترفوا بذنبہم ایک جگہ پر وہ باہم سوال نہیں کریں گے اور دوسرے موقع پر دنیا میں دوبارہ لوٹائے جانے کی درخواست کریں گے اور سب سے آخری موقع پر ان کی زبانوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے وہ کوئی بات چھپا نہ سکیں گے ولا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا۔ (مظہری)
یہ آیت تو کافروں کے بارے میں نازل ہوئی لیکن بہر حال دنیا میں تو ہر آدمی کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے یہی وجہ ہے قیامت کی ہولناکی اور عذاب جہنم کی شدت کے پیش نظر ہمارے اکابر اسلاف اور بزرگان دین بھی تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔ امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے ایک بار پرندے کو دیکھ کر ارشاد فرمایا: اے پرندے! کاش! میں تمہاری طرح ہوتا اور مجھے انسان نہ بنایا جاتا۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق (رض) کا فرمان ہے: میری تمنا ہے کہ میں ایک مینڈھا ہوتا جسے میرے اہل خانہ اپنے مہمانوں کے لیے ذبح کر دیتے۔ حضرت ابو ذر (رض) کا قول ہے: کاش! میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنی (رض) فرمایا کرتے: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ مجھے وفات کے بعد نہ اٹھایا جائے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رض) فرمایا کرتے: کاش! ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔ امُ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رض) فرمایا کرتیں: کاش! میں کوئی بھولی بسری چیز ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرمایا کرتے کاش! میں راکھ ہوتا۔ (قوت القلوب، الفصل الثانی والثلاثون، شرح مقام الخوف ووصف الخائفین۔۔ الخ، ۱/۴۵۹۔۴۶۰، ملخصاً)
یہ کلمات ان ہستیوں کے ہیں جو زبان رسالت سے قطعی جنتی ہونے کی بشارت سے بہرہ مند ہوئے، جبکہ اب کے لوگوں کی حالت یہ ہے کہ عمل نام کی کوئی چیز پلے نہیں اور بے حساب مغفرت کا یقین دل میں سجائے بیٹھے ہیں۔ اے کاش! ہمیں بھی حقیقی معنوں میں ایمان پر خاتمے کی فکر، قبر و حشر کے پُر ہَول لمحات کی تیاری کی سوچ، عذابِ جہنم سے ڈر اور جبّار وقہّار رب عَزَّوَجَلَّ کا خوف نصیب ہو جائے۔ (صراط)

مسائل
1: یعنی ان کے عقیدے اور اعمال دونوں خراب ہوئے۔ عقیدے کی خرابی کفروا میں اور عمل کی خرابی عصوا الرسول میں مذکور ہے۔ انسان کو چاہیے کہ عقیدہ اور اعمال دونوں کو درست کرے ورنہ آگے چل کر مصیبت پڑے گی۔

2: جیسا کہ جانور ایک دوسرے کا بدلہ دلوا کر مٹی کر دیئے جاویں گے۔ ایسا ہی کفار کی تمنا ہو گی کہ میں بھی مٹی کر دیا جاتا۔ رب فرماتا ہے ویقول الکافر یلیتنی کنت ترابا۔

آیت مبارکہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

لغات القرآن: [يٰۤاَيُّهَا : اے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [لَا تَقْرَبُوا : نہ نزدیک جاؤ] [الصَّلٰوةَ : نماز] [وَاَنْتُمْ : جبکہ تم] [سُكٰرٰى: نشہ] [حَتّٰى: یہاں تک کہ] [تَعْلَمُوْا : سمجھنے لگو] [مَا : جو] [تَقُوْلُوْنَ : تم کہتے ہو] [وَلَا : اور نہ] [جُنُبًا : غسل کی حاجت میں] [اِلَّا : سوائے] [عَابِرِيْ سَبِيْلٍ : حالتِ سفر] [حَتّٰى: یہاں تک کہ] [تَغْتَسِلُوْا : تم غسل کرلو] [وَاِنْ : اور اگر] [كُنْتُمْ : تم ہو] [مَّرْضٰۤى: مریض] [اَوْ : یا] [عَلٰي : پر۔ میں] [سَفَرٍ : سفر] [اَوْ جَآءَ : یا آئے] [اَحَدٌ: کوئی] [مِّنْكُمْ : تم میں] [مِّنَ : سے] [الْغَآئِطِ : جائے ضرور] [اَوْ : یا] [لٰمَسْتُمُ : تم پاس گئے] [النِّسَآءَ : عورتیں] [فَلَمْ تَجِدُوْا : پھر تم نے نہ پایا] [مَآءً : تو تیمم کرو] [فَتَيَمَّمُوْا : تو تیمم کرو] [صَعِيْدًا : مٹی] [طَيِّبًا : پاک] [فَامْسَحُوْا : مسح کرلو] [بِوُجُوْهِكُمْ : اپنے منہ] [وَاَيْدِيْكُمْ : اور اپنے ہاتھ] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [كَانَ : ہے] [عَفُوًّا : معاف کرنے والا] [غَفُوْرًا : بخشنے والا]

ترجمہ : اے ایمان والو ! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم وہ بات سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ حالت جنابت میں (نماز کے قریب جاؤ) تاآنکہ تم غسل کرلو سوائے اس کے کہ تم سفر میں راستہ طے کر رہے ہو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے لوٹے یا تم نے (اپنی) عورتوں سے مباشرت کی ہو پھر تم پانی نہ پاسکو تو تم پاک مٹی سے تیمّم کرلو پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر مسح کرلیا کرو، بیشک اللہ معاف فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے

تفسیر و تشریح : اس سورۃ کی ابتداء حفاظت حقوق سے ہوئی اور جانی ومالی نقصان پہنچانے کی ممانعت فرمائی گئی، معیشت کی تعلیم دی گئی، حسن سلوک کے طریقے بتائے گئے۔ جو چیزیں انسان کی سیرت کی بربادی کا باعث ہیں ان سے روکا گیا۔ اس سلسلہ میں تکبر، بخل، ریا سے ڈرایا گیا، ایمان نہ لانے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے کے مصر نتائج سے آگاہ کیا گیا۔ جس طرح ایمان نہ لانے سے جہل کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بخل، نفس پرستی کو ترقی دیتا ہے۔ اب نماز کے آداب، حضور، طہارت کی طرف رجوع کیا جارہا ہے تاکہ نماز عبادت بنے غفلت نہ ہو۔

اس رکوع کے آغاز میں آپ نے دیکھا کہ اللہ ہی کی عبادت اور والدین، اقربا اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ احسان اور انفاق کرنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ جو چیزیں عبادت، احسان اور انفاق کو باطل کرنے والی تھیں مثلاً شرک، ریا اور تکبر وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ اس آیت کریمہ میں نماز کا اس حوالے سے ذکر کیا جارہا ہے کہ یہ عبادت کا سب سے اہم رکن اور اہم جز ہے۔ اس سے جہاں اللہ کے حق عبادت کی وضاحت ہوگی وہیں اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر فرمایا جو نماز کے لیے مفسدات کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جانا۔ (روح)

شان نزول

آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک روز حضرت عبدالرحمٰن (رض) بن عوف کے ہاں کئی صحابہ مدعو تھے۔ کھانے کے بعد دور شراب چلا۔ جب وہ اس کے نشہ سے جھوم رہے تھے تو مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ ایک صاحب امامت کے لیے آگے بڑھے اور اتفاق سے سورۃ الکافرون پڑھنا شروع کردی۔ اور بے ہوشی میں لااعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون پڑھ گئے۔ جس سے معنی بالکل بدل گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور نشہ کی حالت میں نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس سے پہلی آیت میں قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں حاضری کا ذکر گزرا۔ اس آیت میں بارگاہ الٰہی میں حاضری کے آداب سکھائے جارہے ہیں تاکہ قیامت کی حاضری آسان ہو۔ بتایا کہ باادب و ہوشیار ہر اس احکم الحاکمین کی خدمت میں حاضر ہو۔ مدہوشی کی حالت میں حاضری آداب شاہانہ کے خلاف ہے۔ آیت کے دوسرے حصہ میں بتایا کہ دل کے حضور کے ساتھ ساتھ جسم کی طہارت ونظافت بھی لازمی ہے۔ (ضیاء)

صلوٰۃ کا مفہوم

صَلٰوۃ کے معنی اگرچہ نماز کے ہیں۔ لیکن اس جملے کے الفاظ پر غور کرنے سے ایک اور بات کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے وہ یہ کہ یہاں فرمایا گیا: لَاتَقْرَبُواالصَّلٰوۃَ "نماز کے قریب نہ جاؤ" حالانکہ نماز ادا کی جاتی ہے یا پڑھی جاتی ہے اس کے قریب جانے یا نہ جانے کا کوئی مفہوم نہیں۔ جو آدمی نماز نہیں پڑھتا وہ نماز سے دور ہے اور جو پڑھتا ہے وہ نماز کے قریب ہے، درمیان کی کوئی منزل نہیں۔ اس لیے جب بھی کسی کو نماز کا حکم دیا جاتا ہے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے نماز کے قریب جانے کا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نماز کے ساتھ کسی اور بات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح ہم ظرف بولتے ہیں تو بعض دفعہ اس کا مظروف بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نہر چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پانی چلتا ہے، اسی طرح کبھی مظروف بھی ظرف کے مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ صَلٰوۃ مظروف ہے اور مسجد اس کا ظرف ہے۔ یہاں اگرچہ صلوٰۃ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے مفہوم میں مسجد بھی شامل ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم نشے کے حال میں نماز کے لیے مسجد میں مت جاؤ اور نماز کے بغیر بھی مسجد کے قریب مت پھٹکو یعنی اس سے گزرنے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں! اگر کوئی اور راستہ نہ ہو اور گزرنا بہت ضروری ہو تو: اِلَّاعَابِرِیْ سَبِیْلٍ کہہ کر گزرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ بعض فقہا نے یہ شرط عائد کی ہے کہ وضو کر لینا چاہیے۔

سکر نشہ کو کہتے ہیں یعنی وہ دماغی کیفیت کہ انسان کے حواس میں خلل آ جائے اور عقلی توازن صحیح نہ رہے یہ کیفیت نشہ کے علاوہ غضب شدید کے غلبہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ (رض) فرماتی ہیں کہ جب نماز کی حالت میں نین کا غلبہ ہو جائے تو وہ سو جائے حتیٰ کہ نیند جاتی رہے تاکہ بد، حواسی میں غلط بات منہ سے نہ نکل جائے۔ (حسنات)

حدیث پاک میں ہے کہ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اگر نماز پڑھتے وقت تم پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو نماز چھوڑ دو اور جا کر سو رہو۔ اور نیند پوری کرنے کے بعد جب ہوش و حواس درست ہو جائیں تو نماز ادا کرو۔ اذا نعس احدکم وھو یصلی فلینصرف فلینم حتی یعلم ما یقول (بخاری عن انس)

شراب کی حرمت تدریج کے ساتھ

اسلام کی بعثت سے پہلے عرب لوگ بہت ساری بری عادتوں میں مبتلا تھے۔ انھیں میں سے ایک عادت شراب پینا بھی تھی اور یہ ایسی بری عادت تھی کہ جنھیں عربوں سے چھڑوانا آسان کام نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قبیلے اسلام لانے کے لیے اس شرط پر اصرار کرتے تھے کہ ہمیں شراب پینے کی اجازت دی جائے۔ لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے تسلیم نہیں فرمایا۔ دنیا کا تجربہ بھی یہی ہے کہ سب سے مشکل جو عادت چھٹتی ہے وہ شراب پینے کی عادت ہے۔ امریکہ میں غالباً 1908ء میں شراب کی حرمت کا بل پاس کیا گیا اور لوگوں کے دلوں میں شراب کی نفرت پیدا کرنے اور اس کے ترک کے فوائد بیان کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ پراپیگنڈہ پر صرف کیا گیا۔ لیکن آٹھ سال کے بعد جو رپورٹ ملی وہ نہایت تشویشناک تھی کہ ملک میں شراب نوشی پہلے سے کہیں بڑھ گئی، بھٹیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ اب بظاہر شراب کی بھٹیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن گھروں میں یہ کاروبار جاری تھا۔ مایوس ہو کر پارلیمنٹ کو شراب کی حرمت کا بل واپس لینا پڑا۔ اس انسانی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے پروردگار نے شراب کو یک لخت حرام نہیں فرمایا بلکہ اس کے احکام تدریجاً

نازل فرمائے۔ ابتداء میں صرف اتنا اشارہ کیا کہ یہ مضر اور نقصان دہ چیز ہے۔ اس سے بعض لطیف طبائع نے شراب چھوڑ دی۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اوقات نماز میں شراب کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دن میں شراب کا استعمال بند ہو گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد ہی لوگ اس سے شوق کرتے کچھ مدت بعد سورۃ المائدہ میں شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف (رض) کے ہاں کئی صحابہ موجود تھے کھانے کے بعد شراب کا دور چلا، جب وہ اس کے نشہ سے جھوم رہے تھے تو مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب امامت کے لیے آگے بڑھے اور اتفاق سے سورۃ الکافرون پڑھنا شروع کر دی اور بے خودی میں لااعبد ماتعبدون کی جگہ اعبد ماتعبدون پڑھ گئے، جس سے معنی بالکل بدل گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور نشہ کی حالت میں بارگاہ الٰہی میں حاضری سے روک دیا گیا۔ اس سے پہلی آیت میں قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں حاضری کا ذکر گزرا اس آیت میں بارگاہ الٰہی میں حاضری کے آداب سکھائے جا رہے ہیں تاکہ قیامت کی حاضری آسان ہو۔

حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ کا مفہوم

حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور نماز میں جو پڑھنا چاہیے وہی پڑھ رہے ہو ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کریم کی بجائے کوئی غزل شروع کر دو اور تسبیح و تہلیل کی بجائے گانا شروع کر دو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم جو پڑھ رہے ہو تمہیں اس کا ترجمہ آنا چاہیے۔ ترجمہ کا تعلق علم سے ہے اور علم تو حاصل کیے بغیر نہیں آتا اور جو کچھ آدمی کہتا ہے اس کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس کا تعلق ہوش و حواس اور سلامتی عقل سے ہے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے بعض لوگوں نے بلاوجہ اس سے دوسرے مطالب نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مزید یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح یہ حکم شراب کے بارے میں دیا ہے۔ (روح)

بیوی سے صحبت کرنے سے یا حالت نیند میں انزال ہو جانے سے انسان جنبی ہو جاتا ہے۔ اس کی طہارت صرف وضو سے نہیں ہوتی بلکہ غسل فرض ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس حالت میں انسان کے جسم کے سارے اعصاب پر ایک درماندگی اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس سے کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ لیکن جب پانی کے ٹھنڈے چھینٹے پڑتے ہیں تو نشاط سرور کی رو سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور افسردگی اور درماندگی شگفتگی سے بدل جاتی ہے۔ انسان ایک نئی تازگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ نماز سے پہلے غسل کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں یہ حاضری ایسی حالت میں ہو جب تم تر و تازہ اور شگفتہ خاطر ہو۔

غسل کا طریقہ

بعض علماء کے نزدیک جن میں امام شافعی (رح) بھی ہیں الصلوٰۃ سے مراد مسجد ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہو گا کہ جنابت کی حالت میں مسجدوں میں نہ جاؤ۔ ہاں اگر مجبوراً گزرنا پڑے اور دوسرا کوئی راستہ نہ ہو تو صرف گزرنے کی اجازت ہے لیکن وہاں ٹھہرو نہیں۔ اور بعض علماء نے صلوٰۃ سے مراد نماز ہی لی ہے۔ تو اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ سفر کی حالت میں جنبی کو اجازت ہے کہ وہ تیمّم کر کے غسل کے بغیر نماز پڑھ لے۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنبی ہونے کی حالت میں پہلے جسم کا مخصوص حصہ یعنی شرمگاہ دھوتے اور اس کے بعد نماز جیسا وضو کرتے اور بعدازاں اپنے سر پر تین چلو پانی ڈالتے اس کے بعد جسم کے دائیں حصہ سے غسل کا آغاز کرتے اور اس کی تکمیل کرتے۔ "[رواہ البخاری: کتاب الغسل]

حضرت اُمّ سلمہ (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کہ میں غسل واجب کرتے ہوئے اپنے سر کے بال کھول دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ [رواہ مسلم: کتاب الحیض] (بالوں کا خلال ہی کافی ہے) (فہم)

اس آیت میں ان صورتوں کا بیان ہو رہا ہے جن میں تیمّم کی اجازت ہے۔ پہلی صورت بیماری۔ اگر انسان بیمار ہو اور اسے یہ اندیشہ ہو کہ اگر میں نے غسل کیا یا وضو کیا تو میری بیماری میں اضافہ ہو جائے گا تو تیمّم کرلے۔ دوسری صورت سفر۔ اگر مسافر ہے اور غسل کی ضرورت پڑ گئی اور پانی کا ملنا دشوار ہے تو تیمّم کرلے۔ یہ تیمّم کی اجازت دونوں حالتوں میں ہے۔ وضو کے لیے بھی اور غسل کے لیے بھی۔ قضائے حاجت کے لیے جاء من الغائط کے الفاظ اور صحبت کے لیے لمستم النساء کے کلمات کتنے لطیف ہیں۔ نازک سے نازک طبعی پر بھی گراں نہیں گزرتے۔ یہی حسن تعبیر تو اس کلام خداوندی کا اعجاز ہے۔

اشیائے تیمم

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ تیمّم کس چیز سے ہوسکتا ہے اور اس کی صورت کیا ہے۔ دونوں چیزیں اس آیت میں مذکور ہیں۔ پہلی چیز کے متعلق تو فرمایا کہ صعید طیب سے کرو۔ صعید کا معنی ہے "وجہ الارض کان علیہ التراب اولم یکن "زمین کی بالائی سطح خواہ اس پر گرد ہو یا نہ ہو۔ امام صاحب کے نزدیک مٹی اور مٹی کی جنس کی سب چیزوں مثلاً پتھر، ریت وغیرہ سے بھی تیمّم جائز ہے بشرطیکہ وہ پاک ہوں۔ وضو اور غسل کا بدل تیمّم کیونکر ہوا۔ اور مٹی کے ساتھ تیمّم کرنے کا حکم دینے میں کیا حکمتیں ہیں اس پر حکمائے اسلام نے سیر حاصل بحث کی ہے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں

طریقہ تیمم

دل سے پاکی حاصل کرنے کی نیت کرے اس لیے کہ تیمّم میں نیت بالاجماع شرط ہے۔ پھر مٹی یا مٹی کی جنس گرد۔ ریتا۔ پتھر پر دو ضربیں ماری جائیں۔ پہلی ضرب مار کر چہرہ پر پھیر لیں۔ دوسری ضرب مار کر ہاتھوں پر کہنیوں تک ہاتھ پھیریں۔

چند مسائل متعلق تیمم

پانی کے ساتھ طہارت اصل ہے اور تیمّم پانی سے عاجز ہونے کی صورت میں اس پورا پورا قائم مقام ہے جس طرح حدث پانی سے زائل ہوتا ہے اسی طرح تیمّم سے حتیٰ کہ ایک تیمّم سے جتنے فرائض و نوافل چاہیں پڑھ سکتے ہیں یعنی جیسے وضو سے ایسے ہی تیمّم سے اداء الصلوٰۃ ہوگی۔ تیمّم کرنے والے کی اقتداء میں غسل و وضو کرنے والے کی نماز ہو جائے گی۔

آیہ کریمہ کا شان نزول

غزوہ بنی مصطلق میں لشکر اسلام ایسے بیابان میں اترا جہاں پانی نہ تھا۔ صبح وہاں سے کوچ تھا۔ ام الم مومنین حضرت صدیقہ (رض) کا ہار گم ہو گیا۔ اس کی تلاش میں حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوچ میں تاخیر فرمائی۔ صبح ہو گئی پانی نہ تھا وضو کی فکر ہوئی تو اللہ تعالیٰ عزوجل نے آیت تیمّم نازل فرمائی۔ اس کے بعد یہود کے اخلاق اور کتمان حق کی مذمت فرمائی گئی۔ (حسنات)

فوائد

1۔ اس سے پتہ لگا کہ نشہ یا بے ہوشی میں کفریہ بات منہ سے نکلنے سے کافر نہ ہو گا۔

ف 2: اس کا تعلق حتی تغتسلوا سے ہے یعنی جنابت کی حالت میں بغیر غسل کیے نماز کے قریب نہ جاؤ لیکن اگر مسافر ہو اور پانی نہ پاؤ تو تیمّم کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہو۔ مسافر کی قید اس لیے ہے کہ پانی نہ ملنا اکثر سفر ہی میں ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

ف 3: ایسی بیماری جس میں پانی کا استعمال مضر ہوتا ہے یا تو تجربہ سے یا طبیب حاذق کے بتانے سے۔

ف 4: یعنی شہر سے باہر جہاں پانی موجود نہ ہو۔ لہٰذا سفر سے مراد شرعی سر نہیں۔

ف 5: اس سے معلوم ہوا کہ فقط عورت کو چھونے یا ذکر کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں جاتا کیونکہ یہاں جیسے پاخانہ یا ذکر کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں جاتا کیونکہ یہاں جیسے پاخانہ سے آنے سے مراد پاخانہ پھر کر آنا ہے، ایسے ہی عورت کو چھونے سے مراد یا صحبت کرنا ہے چمٹنا، برہنہ ہو کر صحبت کرنے سے غسل فرض ہوتا ہے اور ننگا چمٹنے سے وضو۔ غرضیکہ صرف ہاتھ لگانا مراد نہیں۔

ف 6: مٹی کی جنس بھی مٹی میں سے ہی ہے جنس مٹی ہر وہ چیز ہے جو زمین سے پیدا ہو اور آگ میں نہ گلے نہ راکھ بنے۔ جیسے کان کوئلہ اور پہاڑ کا نمک پتھر وغیرہ۔ ان سب سے تیمّم جائز ہے پانی کا نمک اگرچہ گلتا جلتا نہیں مگر پانی سے بنتا ہے۔ لہٰذا تیمّم کے لائق نہیں

ف 7: شان نزول: غزوہ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ کا ہار گم ہو گیا۔ اس کی تلاش کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تمام لشکر وہاں جنگل ہی میں ٹھہر گئے۔ نماز کا وقت آیا پانی نہ تھا تب یہ آیت اور تیمّم کا حکم آیا۔ حضرت اسید ابن حضیر نے عرض کیا کہ اے آل ابو بکر یہ تمہاری پہلی برکت نہیں تمہاری برکت سے مسلمانوں کو بہت آسانیاں ہوتی ہیں۔ اس واقعہ سے حضرت عائشہ صدیقہ کی عظمت کا پتہ لگا۔

ف 8: اس سے معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کا تیمّم ایک ہی طرح ہو گا کیونکہ رب نے دونوں نجاستوں حدث اصغر اور اکبر کا ذکر فرما کر طریقہ تیمّم ایک ہی بیان فرمایا۔

آیت مبارکہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾

لغات القرآن: [اَلَمْ تَرَ : کیا تم نے نہیں دیکھا] [اِلَى : طرف] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اُوْتُوْا : دیا گیا] [نَصِيْبًا : ایک حصہ] [مِّنَ : سے] [الْكِتٰبِ : کتاب] [يَشْتَرُوْنَ : مول

لیتے ہیں] [الضَّلٰلَةَ : گمراہی] [وَیُرِیْدُوْنَ : اور وہ چاہتے ہیں] [اَنْ : کہ] [تَضِلُّوا : بھٹک جاؤ] [السَّبِیْلَ : راستہ]

ترجمہ : کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب کا ایک حصہ عطا کیا گیا وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم (بھی) سیدھے راستے سے بہک جاؤ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

سورت کی ابتدا میں تمام انسانوں کو اس کے بعد مسلمانوں کو اور اب اہل کتاب کو مخاطب کیا جارہا ہے۔

اس سورۃ کا آغاز "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ" کہہ کر کیا اور باور کروایا کہ تم ایک ہی ماں، باپ کی اولاد اور ایک ہی اللہ کی مخلوق ہو لہٰذا تمہیں اپنے خالق سے ڈرتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو میاں بیوی کے حوالے سے اور پھر ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے کے احکام جاری فرمائے۔ اب اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کی نشاندھی کرنے کے بعد نہایت ہی خیر خواہی کے انداز میں سمجھانے کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے کردار پر کڑی نظر رکھنے اور اپنے آپ کو گمراہی سے بچانے کی تلقین کی گئی ہے اور تسلی دی ہے کہ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کے لیے کافی ہے۔ خصوصی توجہ کے لیے فرمایا کہ کیا تم نے ان لوگوں کے کردار پر غور نہیں کیا؟ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ کئی مرتبہ استعمال فرمائے ہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا۔ ان الفاظ کے اہل علم نے تین مفہوم بیان کیے ہیں۔ کچھ حصہ سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے تورات اور انجیل کے کافی حصہ کو اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر ضائع کر دیا تھا۔ جو ان کے ہاں کتابی شکل میں تورات اور انجیل پائی جاتی ہے اس میں بھی بیشمار ترامیم و اضافے کیے۔ اس لحاظ سے تورات اور انجیل کے حقیقی اجزاء تھوڑے ہی باقی تھے۔ یہ کہ تمہیں تورات اور انجیل کی شکل میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ اپنے وقت کے مطابق کافی تھے لیکن ان سے دین مکمل نہیں ہو جاتا کہ تم انھیں پر جم کر بیٹھے رہو۔ وہ نامکمل دین تھا لہٰذا اب جامع دین نازل ہو رہا ہے جو عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ اس لیے تمہیں جامع اور اکمل دین کی پیروی کرنی چاہیے۔ لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنے مفاد اور عناد کی خاطر نہ صرف اس دین سے انحراف کر رہے ہو بلکہ گمراہی کے خریدار بن کر مسلمانوں کی گمراہی کے درپے ہو چکے ہو۔ اس صورت حال سے آگاہ کر کے مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں اور ان کے عزائم کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بشرطیکہ تم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت پر ثابت قدم رہو۔ اللہ تمہارا سرپرست خیر خواہ اور مددگار ہے۔ (فہم)

اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کا مفہوم

یہود کے حوالے سے سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب کا ایک حصہ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم انھیں دوسرے مواقع پر اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے اہل کتاب تو وہی ہو گا جس کے پاس کتاب کا حصہ نہیں بلکہ کتاب موجود ہو۔ لیکن قرآن کریم کوئی لفظ بلاوجہ استعمال نہیں کرتا اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس پر غور کریں۔ مختلف اہل علم نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ بعض اہل علم کا گمان ہے کہ دراصل گزشتہ آسمانی صحیفوں اور قرآن کریم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے۔ جس میں مکمل انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔ اعتقادات، معاملات، اسلوب حکومت اور آداب زندگی میں سے ہر ضرورت کو قیامت تک کے لیے پورا کر دیا گیا ہے اور پہلی کتابوں میں جو احکام دیئے گئے تھے ان میں آئندہ زمانوں کے لیے جو مفید تھے انھیں تکمیلی شکل دے دی گئی ہے اسی وجہ سے اب قیامت تک انسانوں کو کسی اور پیغمبر اور کسی اور کتاب کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہو گی۔ اس لحاظ سے قرآن کریم کو ایک مکمل کتاب کہنا ہر لحاظ سے بجا ہے۔ لیکن باقی آسمانی صحیفے اس کے مقابلے میں اجزا اور حصص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہود آگے بڑھ کر قرآن کریم کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تو انھیں احساس ہوتا کہ اللہ نے ہمیں کتاب کی صورت میں جو نعمت عطا فرمائی تھی وہ اپنی تکمیلی شان میں تو اب نازل ہوئی ہے تو ان کے لیے لازم تھا کہ یہ دوسروں سے بڑھ کر اس کتاب کی قدر کرتے۔

بعض دوسرے اہل علم کا خیال ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ انھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے پہلی نسلوں نے اس کتاب الٰہی کے نجانے کس کس حصے کو ضائع کر ڈالا کیونکہ تورات کی پانچویں کتاب، "کتاب تثنیہ" انھوں نے ایسی گم کی کہ جو کئی صدیوں کے بعد انھیں دوبارہ مل سکی۔ اس کے علاوہ نجانے اور وہ کیا کیا گم کر چکے ہیں کیونکہ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ یہ کتاب تین دفعہ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اور جو کچھ کتاب میں سے ان کے پاس موجود بھی ہے اس کے مقصد اور روح کو اگر دیکھا جائے تو اس سے تو وہ بالکل بے گانہ ہو چکے ہیں ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب رکھتے ہوئے بھی دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دینداری کے جوہر سے محروم ہیں۔ (روح)

یہودیوں کی چالاکیاں

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو نازل کی ہوئی کتاب تورات میں تبدیلیاں کرتے ہیں۔ اس کے لفظ بدل دیتے ہیں اور معنی اور مفہوم میں بھی ردوبدل کرتے ہیں۔

رسول االلہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب انھیں اللہ کا حکم سناتے تو وہ جواب میں کہتے کہ ہم نے سن لیا یعنی کہ ہم نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن آہستہ سے منہ میں کہتے کہ ہم نے یہ حکم نہیں مانا۔ یعنی ہم نے آپ کا حکم فقط کان سے سنا ہے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ زبانی اقرار محض دھوکا دینے کے لئے کیا۔

یہودیوں کی ایک شرارت یہ بھی تھی کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب کرتے تو ایسے لفظ بولتے جن کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی کے اعتبار سے تو دعا یا تعظیم ہو لیکن دوسرے معنی کی رو سے بددعا یا تحقیر ہو۔ چنانچہ وہ ایسے الفاظ بھی بولتے جو بظاہر ہر دعائے خیر ہوتے

مثلاً تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے، تجھے کوئی شخص بری اور خلاف بات نہ منا سکے لیکن ان جملوں کا برا مطلب ان کے دل میں یہ ہوتا تھا کہ تو بہرا ہو جائے اور کسی کی بات نہ سن سکے۔

یہودی جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آتے تو کہتے "راعنا "اس کے دو معنی ہیں۔ایک اچھے دوسرے برے۔اچھے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری رعایت کرو اور ہم پر شفقت کی نظر کرو تاکہ ہم آپ کا مطلب سمجھ لیں اور جو آپ سے پوچھنا ہو آپ سے پوچھ سکیں اور برے معنی یوں نکلتے کہ وہ زبان کو دبا کر "راعینا "کہتے لعیاذ باللہ!

یہودی لوگ ان کلمات کو اپنی گفتگو میں رلا ملا کر ایسے انداز سے کہتے کہ سننے والے ان کے اچھے ہی معنی لیتے۔برے معنوں کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا۔ لیکن یہودی دل میں برے معنی لیتے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نعوذ باللہ یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا مکر وفریب ضرور معلوم کرلیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فریب کا پردہ چاک کر دیا۔اب ہمیں چاہیے کہ ان کی دوستی کا دم نہ بھریں۔ انھیں رازدان نہ بنائیں اور ان کا کہنا نہ مانیں۔(آسٹریلیا)

یہود و نصاریٰ کو آسمانی کتب سے بہرہ ور کیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور مال وجاہ حاصل کرنے کی خاطر احکام الٰہیہ کو نظر انداز کر دیا جو ان کی سعادت وفلاح کے ضامن تھے۔لیکن وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ تمہیں بھی گمراہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔بظاہر تمہارے خیر خواہ اور دوست بنے ہوئے ہیں در حقیقت یہ تمہارے بدترین دشمن ہیں جو تمہیں راہ حق سے بہکا دینا چاہتے ہیں ان سے خبر دار رہو۔ان کے دام فریب میں پھنس کر خداوند کریم کے نافرمان نہ بنو۔اللہ کریم کو ہی اپنا دوست اور مددگار بناؤ۔اس کے احکام کی پیروی کرو۔ اگر تمہیں اس کی دوستی اور نصرت نصیب ہو گئی تو پھر کوئی دشمن تمہیں گزند نہیں پہنچا سکے گا۔(ضیاء)

گمراہی کے خریدار

دنیا میں گمراہی خریدنے کی کئی شکلیں ہیں:

اللہ تعالیٰ کے احکامات کو مقدم اور بہتر سمجھنے کی بجائے دنیا کے مفاد کو مقدم اور اپنے لیے بہتر تصور کرنا۔

بے حیائی اور برائی کے کاموں کو فروغ دے کر شہرت اور دولت حاصل کرنا۔

دین کو سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

شریعت کے حرام کردہ کاروبار کو اختیار کرنا۔

مسائل

۱۔ اہل کتاب گمراہی کے خریدار ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ اللہ ہی مسلمانوں کا حمایتی اور مددگار ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ‌ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا ﴿۴۵﴾

لغات القرآن:[وَاللّٰهُ : اور اللہ] [اَعْلَمُ : خوب جانتا ہے] [بِاَعْدَآئِكُمْ : تمہارے دشمنوں کو] [وَكَفٰى : اور کافی ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ] [وَلِيًّا : بطور کارساز کے] [وَّكَفٰى : اور کافی ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ] [نَصِيْرًا : بطور مددگار کے]

ترجمہ : اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، اور اللہ (بطور) کارساز کافی ہے اور اللہ (بطور) مددگار کافی ہے

تفسیر و تشریح : اللہ کے کمال علم کا حوالہ و ذکر : سو ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو۔ اور تم لوگوں سے بھی کہیں زیادہ اور اچھی طرح جانتا ہے۔ پس تم لوگ ہمیشہ اسی وحدہ لاشریک کے بتانے پر اعتماد و یقین رکھو۔ اور اسی کی ہدایات و تعلیمات پر صدق دل سے عمل کرو۔ اور تمہارے جن دشمنوں کی اس نے اپنی رحمت و عنایت سے تمہارے لیے نشاندہی فرمادی ہے ان کو تم اپنا دشمن ہی سمجھو اور ان کی عداوت و دشمنی سے بچنے کی فکر و کوشش میں رہو۔ سو اس جملے میں مسلمانوں کے لیے تسلی و تسکین کا سامان ہے کہ اللہ تمہارے دشمنوں اور ان کی چالوں سے بے خبر نہیں۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ پس تم اسی سے اپنا معاملہ صحیح رکھو۔ و باللہ التوفیق۔(مدنی)
اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمایت اور اس کی نصرت تم کو دوسروں سے مستغنی کر دے گی۔ خصوصا یہودیوں سے جن کی نصرت کی تم توقع رکھتے ہو ' زجاج نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ خبر دی ہے کہ یہود اور دوسرے کافروں کی دشمنی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی جب کہ اللہ تعالیٰ کی حمایت اور نصرت تمہارے ساتھ ہے۔(تبیان)

یہودیوں کی بعض بداعمالیاں

ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور ان کے مکر وفریب کا بیان ہے اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو اور نیز دوسروں کو مطلع کرنا ہے تاکہ ان سے علیحدہ رہیں چنانچہ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا) سے لیکر (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى) تک یہود کے قبائح مذکور ہو چکے ہیں۔ بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت فرما کر پھر یہود کے قبائح کا بیان ہے۔
یہود کو کتاب سے کچھ حصہ ملا یعنی لفظ پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو اصل مقصود تھا نہیں ملا اور گمراہی خرید کرتے ہیں یعنی پیغمبر آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حالات اور اوصاف کو دنیا کی عزت اور رشوت کے واسطے چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی دین سے پھر کر گمراہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ۔(گلدستہ)

مسلمانوں سے خطاب

اے مسلمانو تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔ تم ایسا ہر گز نہیں جانتے سو اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم کو نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے لیے کافی ہے اس لیے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ مت کرو اور دین پر قائم رہو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: { وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَلِيّاً وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ نَصِيراً . اور خدا کافی ہے سرپرست کے طور پر اور خدا کافی ہے مددگار کے طور پر }
اور معنی یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں سے ان کی دشمنی کی شدت کو واضح کیا اور واضح کیا کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ مسلمانوں کا نگہبان اور ان کا مددگار، اور جو خدا اس کا نگہبان اور مددگار ہے اسے مخلوق کی دشمنی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور آیت میں سوالات ہیں: پہلا سوال: اللہ کا حکم بندے کے لیے اس کی فتح ہے، چنانچہ اس نے ولی کا بار بار ذکر کرنے کے بعد حمایتی کا ذکر کیا۔ کیوں؟
جواب: ولی وہ ہے جو چیز میں تصرف کرے اور تصرف کرنے والے کو اس کا حامی نہیں ہونا چاہیے تصرف بغیر تعصب سے کرے اس لیے تکرار ختم ہو گئی۔
دوسرا سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں نہیں فرمایا: اللہ ہی کافی ہے محافظ اور مددگار؟ آپ کے اس قول کو دہرانے کا کیا فائدہ: { اور اللہ کافی ہے } ؟۔
جواب: ایسی جگہ تکرار دل پر زیادہ اثر کرتی ہے اور زیادہ مبالغہ آرائی سے تشفی میسر آتی ہے اس لئے تکرار کی تاکہ مسلمانوں کے دل کو اطمینان حاصل ہو۔ (کبیر)

فوائد

1: لہٰذا رب نے جس کے متعلق فرمادیا کہ یہ تمہارا دشمن ہے اسے دشمن جانو اگرچہ وہ تمہارا ظاہری دوست یا اولاد یا بیوی ہو۔ رب فرماتا ہے ان من ازواجکم واولادکم عدوالکم فاحذروھم اس سے معلوم ہا کہ بے دین، اگرچہ عزیز اور قریبی رشتہ دار ہو مگر مومن کا دشمن ہے اور مومن اگرچہ اجنبی ہو مومن کا دوست ہے۔
2: یعنی تمہیں ان کے داؤ سے محفوظ رکھے گا اس سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضور ﷺ کے صحابہؓ گمراہی سے محفوظ رہے۔ بلکہ جن پر صحابہ کرامؓ کی نظر عنایت ہو جائے وہ رب کے فضل و کرم سے گمراہی سے بچا رہتا ہے۔ اور اہلبیت سبحان اللہ! وہ اہل قرابت بھی ہیں، آل بھی ہیں اور صحابہ بھی ان کا معاملہ بڑھ کر ہے اللہ کا فضل اور الکوثر کا مصداق ہیں۔

آیت مبارکہ:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٤٦﴾

لغات القرآن:[مِنَ الَّذِيْنَ ہَادُوْا : جو یہودی ہوئے ان میں وہ بھی ہیں] [يُحَرِّفُوْنَ : جو پھیرتے ہیں] [الْكَلِمَ : کلاموں کو] [عَنْ مَّوَاضِعِہٖ : ان کے رکھنے کی جگہوں سے] [وَيَقُوْلُوْنَ : اور کہتے ہیں] [سَمِعْنَا : ہم نے سنا] [وَعَصَيْنَا : اور ہم نے نافرمانی کی] [وَاسْمَعْ : اور (کہتے ہیں) تو سن] [غَيْرَ مُسْمَعٍ : نہ سنایا ہوا ہوتے ہوئے] [وَّرَاعِنَا : اور (کہتے ہیں) راعنا] [لَيًّا : مروڑتے ہوئے] [بِاَلْسِنَتِہِمْ : اپنی زبانوں کو] [وَطَعْنًا : اور طعنہ دیتے ہوئے] [فِي الدِّيْنِ : دین میں] [وَلَوْ اَنَّہُمْ : اور یہ کہ اگر وہ] [قَالُوْا : کہتے] [سَمِعْنَا : ہم نے سنا] [وَاَطَعْنَا : اور ہم نے اطاعت کی] [وَاسْمَعْ : اور (کہتے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سنیے] [وَانْظُرْنَا : اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مہلت دیں ہم کو] [لَكَانَ : تو یقینا وہ ہوتا] [خَيْرًا : بہتر] [لَّہُمْ : ان کے لیے] [وَاَقْوَمَ : اور زیادہ پائیدار] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [لَّعَنَہُمُ : لعنت کی ان پر] [اللّٰهُ : اللہ نے] [بِكُفْرِہِمْ : ان کے کفر کے سبب سے] [فَلاَ يُؤْمِنُوْنَ : پس وہ ایمان نہیں لائیں گے] [اِلاَّ : مگر] [قَلِيْلاً : تھوڑا]

ترجمہ: اور کچھ یہودی (تورات کے) کلمات کو اپنے (اصل) مقامات سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے سن لیا اور نہیں مانا، اور (یہ بھی کہتے ہیں:) سنیئے! (معاذ اللہ!) آپ سنوائے نہ جائیں، اور اپنی زبانیں مروڑ کر دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے "رَاعِنَا" کہتے ہیں، اور اگر وہ لوگ (اس کی جگہ) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور (حضور! ہماری گزارش) سنیئے اور ہماری طرف نظرِ (کرم) فرمائیے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا اور (یہ قول بھی) درست اور مناسب ہوتا، لیکن اللہ نے ان کے کفر کے باعث ان پر لعنت کی سو تھوڑے لوگوں کے سوا وہ ایمان نہیں لاتے (عرفان)

تفسیر و تشریح:

گزشتہ آیات میں یہودیوں کی چند خرابیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ مثلاً انھوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی مول لی۔ اللہ کے کلام میں لفظی اور معنوی تبدیلیاں کیں۔ زبان سے ذو معنی فقرے نکالے جن سے بظاہر اچھے معنی نکلتے تھے مگر ان کا مقصد برے معنی ہوتے تھے جن سے حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین نکلتی۔

اس آیت میں انھیں ہدایت کی جارہی ہے کہ ان کا یہ رویہ حد درجہ غیر مناسب ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا ذو معنی اور برے لفظوں کی جگہ واضح مناسب اور درست لفظ استعمال کرتے۔ مثلاً

1) عصینا کی جگہ اطعنا (ہم نے فرمان برداری کی)

2) اسمع غیر مسمع کی جگہ صرف اسمع (تو سن) اور

3) راعنا کے بجائے انظرنا (ہماری طرف توجہ کیجئے)

خدا نے انھیں ان کے کفر کے باعث اپنی رحمت اور ہدایت سے دور کر دیا وہ مفید اور سیدھی باتیں نہیں سمجھتے اور ان میں سوائے چند آدمیوں کے باقی ایمان نہیں لاتے ان ایماندار یہودیوں میں حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ شامل ہیں جو یہودیوں کی خباثتوں اور شرارتوں سے بچتے رہے اور اللہ کی لعنت سے محفوظ رہے۔ (آسٹریلیا)

گزشتہ آیت کریمہ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن اس میں گھبرانے کی بات نہیں تمہارے سر پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہے وہ تمہارا ولی بھی ہے نصیر بھی۔ اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہود کے مختلف گروہ تھے اور ان کی گمراہیاں اور ان کی خباثتیں قدر مشترک رکھتے ہوئے الگ الگ بھی تھیں۔ ان میں سے وہ گروہ جو آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس مبارک میں آتا جاتا تھا۔ وہ جس طرح زبان آوری کے پردے میں اور الفاظ کا چکمہ دے کر اور لہجہ اور پیرایہ بدل کر اپنی خباثت نفس کا اظہار کرتا اور اس طرح سے آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقام و مرتبہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں ان کا چہرہ بے نقاب کیا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی شرافت نفس سے ان کے باقاعدہ آنخضرت کی مجالس میں آنے کے باعث خوش فہمی کا شکار تھے اور اگر کوئی بات کھٹکتی بھی تھی تو خود ہی اس کی تاویل بھی کر لیتے تھے اور یا ان کی طرف سے تاویلات پر اعتماد کر لیتے تھے۔ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ آپ کی ذہانت اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ نبوت کا نور بھی کارفرما تھا آپ کو یقینا معلوم تھا کہ وہ دبی دبی زبان میں کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے علو مرتبت، کرامت نفس اور اعلیٰ اخلاقی تحمل کے باعث ان کی باتوں کا نوٹس لینے پر بھی تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ مسلسل نظر انداز فرما رہے تھے پروردگار نے اپنے علم کامل کی وجہ سے ایک تو ان کی نام نہاد شرافت کا پردہ چاک کیا اور دوسرا اپنے ولی اور نصیر ہونے کا اس طرح ثبوت دیا کہ ان کی ان خباثتوں پر گرفت فرمائی جن سے حضور برابر غض بصر سے کام لے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی عزت و حرمت کے معاملے میں نہایت متحمل ثابت ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی ذات کا انتقام کبھی کسی سے نہیں لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہاں اس کے پیغمبر خاموش رہتے ہیں وہ خود مداخلت فرما کر پیغمبر کی عزت کی حفاظت فرماتا ہے۔ اور ان لوگوں پر لعنت فرماتا ہے جو اللہ کے نبی کی عزت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری جگہ میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ "جو لوگ اللہ اور اس کے

رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں جیسے یہود اپنی زبانی خباثت سے پہنچاتے تھے اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے"۔ چنانچہ یہاں بھی اللہ کی غیرت وحمیت اپنا کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ (روح)

یہودی اہل علم کی خیانت

یعنی یہود میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو توراۃ میں نازل فرمایا اس کو اپنے ٹھکانے سے پھیرتے اور بدلتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ توراۃ میں اللہ نے جو لفظ رکھے ہیں یہودی ان الفاظ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور بدل ڈالتے ہیں۔ الکلم سے مراد ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ توراۃ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حلیہ اس طرح تھا وہ سرمگیں کشادہ چشم میانہ قامت گھونگریالے بالوں والے خوبصورت ہوں گے۔ جب مدینہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے تو علماء یہود جل گئے اور انھوں نے کتاب کے اندر مندرجہ حلیہ بدل ڈالا اور کہنے لگے ہم اپنے پاس نبی کا حلیہ یہ نہیں پاتے بلکہ ان کا حلیہ اس طرح ہوگا۔ دراز قامت 'نیلگوں چشم اور لٹکتے ہوئے بالوں والے اور اپنے زیردست لوگوں سے کہا کہ یہ ویسا نہیں ہے۔ زیردستوں کو دھوکا دینے کی وجہ یہ ہے کہ عوام سے ان کی روزی وابستہ تھی ان کو اندیشہ ہوا کہ ان کے زیر اثر یہودی اگر مسلمان ہو جائیں گے تو ان کی روزی بند ہو جائے گی۔ (گلدستہ)

بیباکی اور گستاخی، تصنع اور تملق اور کلام الٰہی میں اپنی مرضی کے مطابق کانٹ چھانٹ اور احکام خداوندی کی من مانی تاویلیں یہود کی خصوصیات بن کر رہ گئی تھیں۔ جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف وتوصیف جس سے توراۃ کے صفحات مزین تھے جان بوجھ کر وہ ان کا انکار کرتے اور ان کے من گھڑت معانی بیان کرتے۔ گفتگو کے وقت بارگاہ نبوت میں بڑی دریدہ دہنی سے کام لیتے۔ طبعی خست کے باعث ذومعنی کلمات استعمال کرتے جن میں مدح وذم کے دونوں پہلو ہوتے اور اپنی زبانوں کو بل دے کر ان کا ایسا تلفظ کرتے جس سے ذم کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا۔ اور اگر ٹوکا جاتا تو فوراً کہہ دیتے کہ نہیں صاحب ہمارا مدعا یہ تھا۔ حضور سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کوئی حکم فرماتے تو سمعنا بلند آواز سے کہتے اور اسی سانس میں چپکے سے وعصینا بھی کہہ جاتے۔ غیر مسمع کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ دعا کے لیے بھی۔ یعنی کوئی ناگوار بات آپ کو نہ سننی پڑے اور بددعا کے لیے بھی کہ آپ کچھ نہ سن سکیں۔ اور وہ یہ کلمہ بولتے وقت دوسرا معنی مراد لیتے۔ راعنا کہتے وقت زبان کو لچک دیتے تاکہ راعینا ہو جائے۔ اس لفظ کے متعلق پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ یہ ان کے اطوار تھے۔ یہ ان کا رویہ تھا اس فخر عالم وعالمیاں کے ساتھ جس کے دربار میں فرشتے بھی حاضر ہوتے تو تصویر ادب بن کر۔ (ضیاء)

یہاں ایک اور حقیقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اللہ کے نبیوں اور اس کے نیک بندوں سے طبعی تنفر، ان کی توہین کرنے کی کوشش اور دنیا میں ہر خیر کے سرچشمے کو ناکام کر دینے کا جذبہ جس طرح ہم یہود میں دیکھتے ہیں اسی طرح عیسائیت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تو یہ کہنا چاہیے کہ یہ خصائل بد یہودیت کی شناخت نہیں بلکہ یہ کفر کے آثار ہیں۔ جو ہمیں یہود میں بھی نظر آتے ہیں اور عیسائیوں میں بھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھیں بار بار اس بات سے تشویش لاحق ہوتی ہے اور وہ اسے بدلنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں کہ پاکستان میں پیغمبروں کی عزت کے تحفظ کا جو قانون بن چکا ہے اسے کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے۔ انھیں کے زیر اثر ہمارے وہ دانشور اور وہ حکمران جو سراسر مغرب کے پروردہ ہیں اور امریکہ کے زلہ خوار ہیں وہ بھی انھیں کی جگالی کرنے لگتے ہیں حالانکہ نہایت سادہ سی بات ہے کہ ہم اگر اپنے رسول پاک کی عزت وحرمت پر کسی طرح کا غبار آنا بھی برداشت نہیں کرتے بلکہ ہم تمام انبیاء کرام کی عزت وحرمت کے پاسبان ہیں تو

اس میں آخر ان کا کیا نقصان ہے ؟انبیاء ورسل کی حفاظت یا ان کی عزت کرنے سے ان کا کیا بگڑ جاتا ہے ؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم انھیں اس کی کھلی چھٹی دے دیں کہ یہ ہمارے رسول پاک کے بارے میں جو چاہیں یا وہ گوئی کریں ؟ مسلمان تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے ایمان اور اس کی غیرت کا تقاضا ہے۔ بفرض محال اگر انھیں اس کی آزادی مل جائے تو انھیں اس سے آخر ملے گا کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا قومی نفسیاتی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس طرح بچھو کسی کو ڈسے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح یہ لوگ جب تک اللہ کے نبیوں کی توہین نہ کرلیں ان کے خبث باطن کو تسکین نہیں ملتی۔

عیسائی بھی یہود کے ہمنوا ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ یہود کی تو یہ فطرت بن چکی ہے لیکن عیسائی اس معاملے میں ان کے ہمنوا کیوں ہیں ؟ جس آدمی کی نظر عیسائیت کی تاریخ پر ہو اس کے لیے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے۔ عیسیٰ (علیہ السلام) پر بڑی محدود تعداد میں لوگ ایمان لائے۔ آپ نے اپنے بارہ حواریوں کو دینی ذمہ داریاں سونپیں۔ یہی لوگ عیسیٰ (علیہ السلام) کی علمی اور دینی وارثت کے امین اور جانشین ٹھہرے۔ لیکن عیسیٰ (علیہ السلام) کے اٹھائے جانے کے بعد جس شخص نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے دین کو عیسائیت کی شکل دے دی جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عیسائیت نہیں اسلام لے کر آئے تھے۔ وہ وہ تھا جو عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی میں سینٹ پال کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ ایک یہودی عالم تھا اور اپنے مذہبی خیالات میں نہایت متعصب تھا۔ عیسیٰ (علیہ السلام) جب تک دنیا میں اپنی دعوت پیش کرتے رہے اس شخص نے اس دعوت کو ناکام کرنے کے لیے عیسیٰ (علیہ السلام) کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ لیکن جیسے ہی عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان پر اٹھالیے گئے یا یہود اور نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق انھیں سولی پر چڑھادیا گیا تو اس کے تھوڑے عرصے بعد اس شخص نے ایک ڈھونگ رچایا کہ میں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بادلوں میں دیکھا ہے میں ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا ہوں اور انھوں نے مجھے اپنا جانشین قرار دیا ہے چونکہ آدمی نہایت ہوشیار، پڑھا لکھا اور بااثر تھا اس لیے تمام حواریوں پر غالب آگیا۔ وہ بچارے چیختے ہی رہے لیکن اس نے یہودیت ہی کو ایک نئی شکل دے کر عیسائیت کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس منظّم طریقے سے اس کا پرچار کیا کہ لوگوں نے اسی کو حقیقت جانا اور بعد میں ایمان لانے والے اسی پر ایمان لاتے رہے اور حواریوں کی جو مرتب کردہ انجیلیں ان کے تصورات کے خلاف تھیں ان کو مٹادیا گیا۔ اس طرح سے یہودیت، عیسائیت کے نام پر عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والوں کے دل و دماغ میں اتار دی گئی اور آج تک عیسائی اسی عیسائیت پر چل رہے ہیں۔ لیکن یہ عیسائیت وہ مذہب یا وہ دین نہیں جسے سیدنا مسیح (علیہ السلام) لے کر آئے تھے۔ ان کا عقیدہ تثلیث، ان کا کفارہ کا عقیدہ، دین و دنیا میں جدائی وغیرہ وہ تصورات ہیں جو انھوں نے یہودیت سے لیے اور بعض محققین کے مطابق ہندومت سے لیے اور انھیں عیسائیت میں شامل کرلیا اور یہ سب کچھ ایک یہودی نے کیا جس نے عیسائی ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں باوجود الگ الگ مذہب ہونے کے مسلمانوں کے معاملے میں یک رنگی کیوں ہے ؟ اور کیوں اللہ کے نبیوں کے بارے میں دونوں ہی دشمنی کا رویہ رکھتے ہیں ؟ اور انھیں ایسا ہر قانون کھٹکتا ہے جس میں اللہ کے نبیوں کی عزت کا تحفظ کیا گیا ہو۔ میں نے جو بات عرض کی ہے اگر اس حقیقت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر بعض باتوں کا جواب ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً عیسائی عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں کیونکہ کوئی مرد ان کا باپ نہیں۔ لیکن یہود ان کے نسب پر طعن کرتے ہیں اور نہ صرف کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایک بے نسب آدمی سمجھتے ہیں بلکہ ان کی والدہ کو بھی نعوذ باللہ من ذلکبد چلن عورت خیال کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا الزام اور اس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ کوئی بھی غیرت رکھنے

والی قوم اس طرح کے الزام لگانے والوں سے کوئی تعلق رکھنے کی روادار نہیں ہوسکتی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ قرآن کریم جس نے آکر عیسیٰ (علیہ السلام) کی عزت وحرمت واضح کی ان کو اللہ کا نبی ثابت کیا، ان کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کیا اور ان کی والدہ محترمہ کو عفت مآب اور صدیقہ قرار دیا۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کے اس احسان کے باوجود جب بھی کوئی تعلق قائم کرتے اور رشتہ جوڑتے ہیں تو وہ یہود سے جوڑتے ہیں اور دونوں ملکر مسلمانوں سے دشمنی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت اور نصرانیت اصل میں ایک ہی شجر سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت کے اس رشتے کو سمجھیں اور اپنی خارجہ پالیسی طے کرتے ہوئے اس نقطے کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ (روح)

بے باکی کی سزا

بارگاہ رسالت میں بے باکی کرنے والوں کی سزا ہی یہ ہے کہ وہ در رحمت سے دور کر دیئے جاتے ہیں۔ ہدایت کی توفیق ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ حق شناسی کی قوت ان سے چھین لی جاتی ہے۔ یہی سزا یہود کو دی گئی۔ اور قیامت تک ایسے بے باکوں کو یہی سزا دی جائے گی۔

فوائد

ا۔ بعض اہل علم یہودی نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان چھپانے کے لئے تورات کی آیات میں ہیرا پھیری کرتے ہیں۔

۲۔ یہود ایسے ذو معنی الفاظ بولتے جن سے ادب اور بے ادبی کے دونوں پہلو نکلتے۔ اس طرح وہ کہتے کہ سنو ہماری بات اور ساتھ یہ کہ وہ آپ نہ سن سکیں۔

۳۔ راعنا۔ بھی ذو معنی لفظ ہے۔ جس سے یہ بھی معنی نکلتا ہے کہ ہماری رعایت کریں اور بے ادبی کا معنی (ہمارا چرواہا) بھی نکلتا ہے۔ وہ ان الفاظ کو زبان مروڑ کر بولتے اور غلط مفہوم لیتے۔ کہ دین حق پر طعن کرتے۔

۴۔ اگر وہ ادب واحترام کے دائرہ میں رہتے ہوئے حق کو تسلیم کر لیتے تو ان کے لئے بہت بہتر تھا۔

۵۔ ان کے کفر وبے ادبی کے سبب لعنت کی مہر لگ گئی ہے اور ان کی اکثریت کفر پر ہی قائم رہے گی۔

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

لغات القرآن:[يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جن کو] [اُوْتُوا : دی گئی] [الْكِتٰبَ : کتاب] [اٰمِنُوْا : تم ایمان لاؤ] [بِمَا : اس پر جو] [نَزَّلْنَا : ہم نے اتارا] [مُصَدِّقًا : تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے] [لِّمَا : اس کی جو] [مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہے] [مِّنْ قَبْلِ : اس سے پہلے] [اَنْ : کہ] [نَّطْمِسَ : ہم بگاڑ دیں] [وُجُوْهًا : کچھ چہروں کو] [فَنَرُدَّهَا : پس ہم لوٹا دیں ان کو] [عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ : ان کی پیٹھوں پر] [اَوْ : یا] [نَلْعَنَهُمْ : پھر ہم لعنت کریں] [كَمَا : جیسے کہ] [لَعَنَّآ : ہم نے لعنت کی] [اَصْحٰبَ السَّبْتِ : ہفتے کے دن والوں پر] [وَكَانَ : اور ہوتا ہے] [اَمْرُاللّٰهِ : اللہ کا حکم] [مَفْعُوْلاً : کیا ہوا]

ترجمہ : اے اہل کتاب ! اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو ہم نے (اب اپنے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر) اتاری ہے جو اس کتاب کی (اصلًا) تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے، اس سے قبل کہ ہم (بعض) چہروں (کے نقوش) کو مٹادیں اور انھیں ان کی پشت کی حالت پر پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت کریں جیسے ہم نے ہفتہ کے دن (نافرمانی کرنے) والوں پر لعنت کی تھی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے

تفسیر و تشریح : اس آیت کا معنی ہے اہل کتاب قرآن مجید کی تصدیق کرو جو توحید ' رسالت ' مبداء اور معاد (آغاز وانجام، خدا اور آخرت) اور بعض احکام شرعیہ میں توراۃ کے موافق ہے ' اس سے پہلے کہ ہم بعض چہروں کے نقوش مٹادیں ' یعنی آنکھوں اور ناک کی بناوٹ کے ابھار کو دھنسا کر چہرے کو بالکل سپاٹ بنادیں یا چہرے کو گدی کی جانب لگادیں ' اس میں اختلاف ہے کہ یہ وعید دنیا کے متعلق ہے یا آخرت کے۔
امام ابن جریر نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے کہا اس آیت کا معنی ہے کہ اے اہل کتاب ! قرآن مجید پر ایمان لے آؤ اس سے پہلے کہ تم کو ہدایت سے پھیر کر گمراہی کی طرف لوٹا دیا جائے۔ (تبیان)

طمس

کسی چیز کا نام و نشان مٹا دینے کو عربی میں طمس کہتے ہیں۔ اور چہرہ کا حلیہ بگاڑ دینا اس کے نقش و نگار کو خراب کر دینا "طمس الوجہ" کہلاتا ہے۔ یہ اس کا لغوی معنی ہے۔ اور اہل زبان صلاحیتوں کے مسخ ہو جانے کے لیے بھی طمس کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ بیضاوی،

قرطبیؒ اور دوسرے جلیل القدر مفسرین نے اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے یعنی یہود جن پر اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں تھی اور پھر بھی وہ انکار پر مصر تھے انھیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ باز آ جاؤ۔ یہ ضد اچھی نہیں۔ اور اگر تم حق کے سامنے جھک نہ گئے۔ تو یاد رکھو حق پذیری کی صلاحیت سے ہی محروم کر دیئے جاؤ گے۔ تمہاری آنکھیں دیکھ تو رہی ہوں گی لیکن حق پہچان نہیں سکیں گی۔ تمہارے کان سن تو رہے ہوں گے لیکن حق بات کو نہیں سنیں گے بیضاوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ من قبل ان نطمس وجوھا بان نعمی البصار عن الاعتبار ونصم الاذان عن الاصغاء الی الحق بالطبع ونردھا من الھدایۃ الی الضلالۃ۔ بعض علماء نے وجود کا معنی چہروں کی بجائے رؤسا کیا ہے یعنی ہم تمہارے سرداروں کے چہرے بگاڑ دیں گے یعنی اب ان کے چہروں پر جو رونق اور تروتازگی ہے وہ چھین لی جائے گی۔ ان کے چہرے بے نور اور بے رونق ہو کر رہ جائیں گے جس پر نامرادی اور ناکامی کی گرد پڑ رہی ہو گی۔ اور نردھا کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھیں مدینہ طیبہ سے جلاوطن کر کے پھر سینا کے بے آب وگیاہ صحرا میں لوٹا دیا جائے گا۔ (ضیاء)

شان نزول

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبداللہ بن صوریا 'کعب بن اسد اور دیگر علماء یہود سے فرمایا: اے یہود! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ بخدا تم کو یقین ہے کہ میں جس دین کی دعوت لے کر آیا ہوں وہ حق ہے 'انھوں نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم اس دین کو نہیں جانتے انھوں نے انکار کیا اور کفر پر اصرار کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن سلام (رض) کا قبول اسلام:

حضرت عبداللہ بن سلام (رض) جو بہت بڑے یہودی عالم تھے، انہوں نے ملک شام سے واپس آتے ہوئے راستے میں یہ آیت سنی اور اپنے گھر پہنچنے سے پہلے اسلام لا کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں نہیں خیال کرتا تھا کہ میں اپنا منہ پیٹھ کی طرف پھر جانے سے پہلے اور چہرے کا نقشہ مٹ جانے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں گا یعنی اس خوف سے انھوں نے ایمان لانے میں جلدی کی کیونکہ توراۃ شریف سے انھیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رسول برحق ہونے کا یقینی علم تھا۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۴۷، ۱/۳۹۰۔۳۹۱)

حضرت کعب احبارؓ کا قبول اسلام

حضرت کعب احبار (رض) جو علماء یہود میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے انھوں نے ایک رات کسی شخص سے یہی آیت سنی تو خوفزدہ ہوئے اور حضرت عمر فاروق (رض) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

(فتوح الشام، ذکر فتح مدینۃ بیت المقدس، ص ۲۳۴۔۲۳۵، الجزء الاول)

المختصر۔۔ اے اہل کتاب سمجھ سے کام لو اور (مان جاؤ جو ہم نے اتارا) رسول عربی پر اور جو (تصدیق کرنے والا ہے اس اصل کتاب کا جو تمہارے پاس ہے یعنی توحید رسالت، مبداء معاد اور بعض احکام شرعیہ میں توراۃ کے موافق ہے (اس سے پہلے کہ ہم بگاڑ دیں) بعض (چہروں کو، تو ان کو پلٹ دیں ان کی پشت پر) اور چہروں کے نقوش مٹا دیں، یعنی آنکھوں اور ناک کی بناوٹ کے ابھار کو دھنسا کر چہرے کو بالکل سپاٹ بنا دیں ۔۔ یا۔۔ چہرے کو گدی کی جانب لگا دیں۔

یہ دنیا میں بھی ہو سکتا ہے اور آخرت میں بھی، اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ جہاں چاہے اور جو چاہے کرے وہ ہر چاہے پر قدرت والا ہے اس آیت کا بطور اشارہ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اے اہل کتاب قرآن مجید پر ایمان لاؤاس سے پہلے کہ تم کو ہدایت سے پھیر کر گمراہی کی طرف لوٹا دیا جائے۔۔اور پھر اس طرح تمہاراایمانی چہرہ بگڑ کر الٹ پلٹ ہو جائے اور اپنا حسن و جمال کھو بیٹھے۔

(یا معلون کر دیں ان) بگڑے ہوئے چہرے والوں کو یعنی اپنی رحمت سے انھیں دور کر دیں نیز انھیں بندر و خنازیر بنا کر رسوا کر دیں (جس طرح ملعون کر دکھایا) گزشتہ دور میں (سبت والوں کو) جنھوں نے حکم الٰہی میں انحراف کیا اور ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار میں مشغول ہوئے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیے گئے اور انھیں بندر و خنزیر بنا کر رسوال کر دیا گیا، ہاں، ان میں سے بعض وہ لوگ جن کو دولت ایمان نصیب ہو گئی اور وہ اس وعید مذکور سے محفوظ ہو گئے کیونکہ ہر وعید کا وقوع اسی کے لیے جو ایمان نہ لایا ہو، ایمان والا ہو جانے کی صورت میں وہ وعید اس ایمان والے کے لیے نہیں رہتی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ایک ہے کفار پر لعنت دوسری ہے مومنین پر ان کے کسی عمل کی خرابی کی وجہ سے لعنت، تو پہلی لعنت کا معنی یہ ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بالکلیہ دور کر دیا جائے اور دوسری لعنت کا معنی یہ ہے کہ مومنین کو مقربین اور ابرار کے درجہ سے دور کر دیا جائے۔

۔۔الحاصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید نازل فرمائی جاتی ہے اور جو حکم خدا کا ہوتا ہے وہ واقع ہو کر رہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ضرور بالضرور ہونے والا ہے تو اے ایمان والو! تمہیں ایسی وعید سے ڈرنا چاہیے اور ایمان پر ثابت قدم رہنا چاہیے اور ہر وقت توبہ واستغفار میں مشغول رہنا چاہیے کہ تاکہ تمہارا وہ حشر نہ ہو جو اصحاب سبت کا ہوا۔

اس مقام پر بحر بن عمر، نعمان بن روفی جیسے بعض یہودی علماء کی یہ خوش فہمی، کہ وہ بچوں کی طرح مرحوم ومغفور ہیں ان کے رات کے گناہ دن میں اور دن کے گناہ رات میں بخش دیے جاتے ہیں، یا تو ان کی کوتاہ فکری اور لاعلمی کا ثمرہ ہے یا پھر ان کی ہٹ دھرمی، گمراہی کا نتیجہ ہے ان کی نظر اپنے ان صغائر کبائر پر تو ہے جو کفر و شرک سے نیچے درجے میں ہیں مگر وہ اپنی گوسالہ پرستی اور حضرت عزیر کی عبادت و پرستش اور ان کے سوادوسرے کفر کی نظریات واعمال کو سنگینی کو سمجھنے سے قاصر ہیں جن کی وجہ سے ان کی مغفرت ہو ہی نہیں سکتی۔ (اشرفی)

دعاء کیجئے:۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے انتہا شکر واحسان ہے کہ جس نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو کفر و شرک سے بچا کر اسلام اور ایمان سے نوازا۔اے اللہ ہم کو اس نعمت اسلام کی قدر دانی نصیب فرمااور ہم کو اپنے اور اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جملہ احکام کا فرمان بردار بنا کر زندہ رکھا اور اسی پر موت نصیب فرما۔ یا اللہ ہم سے جو اب تک گناہ اور خطائیں سرزد ہو چکی ہیں ان کو اپنی رحمت سے معاف فرمادے اور اپنی مغفرت ورحمت سے ہم سب کو دین و دنیا میں نواز دے۔ یا اللہ آپ کا شکر واحسان ہے کہ آپ نے ہم کو سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امت میں شامل ہونا نصیب فرمایا۔ اور اپنے تمام انبیاء اور کتب پر ایمان رکھنا نصیب فرمایا۔ یا اللہ ہم کو ایمان حقیقی نصیب فرمااور اپنی ذات پاک کی صفات کی معرفت کاملہ عطافرمااور اس امر کا یقین کامل نصیب فرما کہ بیشک آپ کا جو حکم ہوتا ہے وہ صادر ہو کر رہتا ہے آپ کے فیصلہ کو نہ کوئی روک سکتا ہے نہ ٹال سکتا ہے۔ یا اللہ ہمارے حق میں ہدایت اور دین و دنیا کی صلاح وفلاح کا فیصلہ اور حکم فرمادے اور ہمارے لیے دائمی ٹھکانا اپنی رضا کے مقام جنت عالیہ میں مقدر فرمادے اور جہنم کے آزار جو کفار ومشرکین کے لیے مقدر ہو چکے ان سے ہمیں بچالے۔آمین۔ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

فوائد

1: یعنی قرآن تمہاری کتابوں کو سچا کہتا ہے یا سچا کرتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی آمد کی خبر دی تھی۔ اگر قرآن نہ آتا تو وہ تمام کتب جھوٹی ہو جاتیں یا سچا کہلواتا ہے کہ صرف وہی کتب اور صحیفے اور وہی نبی دنیا میں چمکے جن کو قرآن نے چمکایا۔ باقی کو دنیا بھول گئی۔

2: معلوم ہوا کہ مسخ وغیرہ عذاب خصوصی طور پر قیامت تک آتے رہیں گے۔ حضور کی تشریف آوری پر عام مسخ ختم ہو گیا۔

3: یعنی جیسے سر کا پچھلا حصہ یکساں ہے ایسے ہی اسے بھی کر دیں کہ اس میں نہ آنکھیں رہیں نہ ناک منہ وغیرہ۔

4: جن یہودیوں نے ممانعت کے باوجود ہفتہ کو بہانہ سے مچھلی کا شکار کیا وہ بندر بنا دیئے گئے یہ مسخ قیام کے قریب واقع ہو گا۔ دنیا میں ہی یا قیامت میں واقع ہو گا۔ اس میں فرق نہیں ہو سکتا۔

آیت مبارکہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

لغات القرآن: [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : الله] [لَا يَغْفِرُ : نہیں بخشتا] [اَنْ : کہ] [يُّشْرَكَ بِهٖ : شریک ٹھہرائے اس کا] [وَيَغْفِرُ : اور بخشتا ہے] [مَا : جو] [دُوْنَ ذٰلِكَ : اس کے سوا] [لِمَنْ : جس کو] [يَّشَآءُ : وہ چاہے] [وَمَنْ : ور جو۔ جس] [يُّشْرِكْ : شریک ٹھہرایا] [بِاللّٰهِ : الله کا] [فَقَدِ افْتَرٰٓى: پس اس نے باندھا] [اِثْمًا : گناہ] [عَظِيْمًا : بڑا]

ترجمہ: بیشک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم تر (جو گناہ بھی ہو) جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے واقعۃً زبردست گناہ کا بہتان باندھا

تفسیر و تشریح: یہودی اخلاقی جرائم کے ساتھ شرک جیسے بدترین گناہ میں ملوث تھے اور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہیں اور اس نے ہمارے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں۔

اخلاقی جرائم کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد شرک کے بارے میں واضح کیا ہے کہ جو شخص شرک کی حالت میں فوت ہو گا اسے ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا۔ تمام انبیاء کرام کے کلمے کے پہلے جز میں شرک کی نفی اور دوسرے جز میں توحید کا اثبات ہے۔ اس لیے ان کی دعوت کا آغاز یہاں سے ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور عبادات میں کسی قسم کا شرک نہ کیا جائے۔ شرک نام ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی کو ملانا یا اس کی صفات و عبادات میں دوسرے کو برابر یا حصہ دار تصور کرنا۔ یہودیوں نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کو اس لیے اللہ کا بیٹا قرار دیا کہ وہ

سو سال فوت ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کیے گئے، عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی غیر معمولی ولادت، بے مثال معجزات اور ان کی والدہ کی کرامات دیکھ کر انھیں اللہ کا جزء قرار دیا۔ (روح)

شرک کا لغوی معنی ہے دو یا دو سے زیادہ لوگ کسی ایک معین چیز کے مالک ہوں تو وہ دونوں اس کی ملکیت میں شریک ہیں ' اور دین میں شرک یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کا شریک ٹھیرائے اور یہ سب سے بڑا کفر ہے اور شرک صغیر یہ کہ بعض کاموں میں اللہ کے ساتھ غیر اللہ کی بھی رعایت کرے جیسے ریاء اور نفاق۔ (المفردات)

شرک کرنے کی تعریف یہ ہے

کسی شخص کو الوہیت میں شریک ماننا جیسے مجوس اللہ کے سوا واجب الوجود مانتے ہیں یا اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق مانتے ہیں جیسا کہ بت پرست اپنے بتوں کو عبادت کا مستحق مانتے ہیں۔ (شرح عقائد نفسی ص ٦١ ' مطبوعہ مطبعہ یوسفیہ ہند)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو واجب بالذات یا قدیم بالذات ماننا ' یا اللہ کے سوا کسی کی کوئی صفت مستقل بالذات ماننا (مثلا یہ اعتقاء رکھنا کہ اس کو از خود علم ہے یا از خود قدرت ہے) یا کسی کو اللہ کے سوا عبادت کا مستحق ماننا (مثلا اللہ کے ساتھ خاص ہیں ان کو غیر اللہ کے لیے بجالانا ' مثلا کسی بزرگ کی نذر ماننا یا کسی کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اپنی قدرتت سے رزق اور اولاد دیتا ہے ' بارش برساتا ہے ' بلاؤں کو ٹالتا ہے نفع پہنچانا اور ضرر دینا اس کی ذاتی قدرت میں ہے۔ حانث ہونے کے قصد سے کسی کے نام کی قسم کھانا یہ تمام امور شرک ہیں (تبیان)

اللہ کی ذات صحفات میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے یعنی اللہ کی ذات اور اس کی صفات اس کی ذات سے ہیں۔ دوسروں کی ذات و صفات اللہ کا عطیہ ہے وہ بالذات نہیں۔ ایک صفت بھی کسی بندے میں بالذات سمجھنا شرک ہے یوں تو ہر بندہ سنتا ہے، دیکھتا ہے اللہ بھی سمیع و بصیر ہے لیکن ہمارے سننے اور دیکھنے کی صفت اللہ کی دی ہوئی ہے ہماری ذاتی نہیں جب چاہے لے لے۔ جب یہ سمجھ گئے تو جان لو کہ کسی کو خدا سمجھ کر کچھ بھی مانگنا شرک ہے۔ لیکن اللہ نے جس کو جو دیا ہے اس سے وہ مانگنا شرک نہیں۔ روز ہی دنیا میں ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہو اللہ غنی ہے ہم سب محتاج ہیں۔ اللہ علت اور سبب سے پاک ہو۔ ہمیں اسباب کی ضرورت ہے۔ اسباب میں پڑنا گناہ نہیں سبب الاسباب کو بھول جانا گناہ ہے۔ (فیوض)

علامہ ابو عبداللہ الانصاری القرطبیؒ نے اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں شرک کے متعلق بہترین بحث کی ہے جس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ شرک کے تین مرتبے ہیں اور تینوں حرام ہیں :۔ (1) (اصلہ اعتقاد شریک للہ فی الوھیتہ وھو الشرک الاعظم وھو شرک الجاھلیۃ)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی انسان، جن شجر و حجر کو الہ (معبود) یقین کرنا یہی شرک اعظم ہے اور عہد جاہلیت کے مشرکین یہی شرک کیا کرتے تھے (جیسے سورۃ الصفت میں ان کے متعلق ہے (واذا قایل لہم لا الہ الا اللہ یستکبرون ویقولون ء انا لتار کوا الھتنا لشاعر مجنون)۔ جب انھیں یہ بتایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی خدا نہیں تو تکبر کرتے اور کہتے کیا اس شاعر دیوانہ کے کہنے پر ہم اپنے خداؤں کو چھوڑ دیں)۔ (2) (ویلیہ فی الرتبۃ اعتقاد شریک للہ تعالیٰ فی الفعل وھو من قال ان موجودا ما غیر اللہ تعالیٰ یستقل باحداث فعل وایجادہ وان لم یعتقد کونہ الھا۔) یعنی شرک کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی کے متعلق یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ مستقل طور پر اور بالذات اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی

کام کر سکتا ہے اگرچہ اس شخص کو الہ نہ مانتا ہو۔ (3) (و یلی ھذہ الرتبۃ الشرک فی العبادۃ وھو الریاء) (181:5) یعنی کسی کو عبادت میں شریک کرنا اور یہ ریا ہے اور یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ اب آپ انصاف فرمایئے کہ کوئی مسلمان کسی کے متعلق خواہ ذات پاک مصطفٰی علیہ الطیب التحیۃ واجمل الثناء ہی ہو یہ اعتقاد رکھتا ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر وہ صاحبان جو مسلمانوں کو مشرک ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں اور وہ تمام آیات جو مشرکین مکہ اور کفار عرب کے حق میں نازل ہوئیں جن کے شرک کی کیفیت اوپر مذکور ہوئی سمجھے بے سمجھے مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں کیا انھیں خدا کا خوف نہیں۔ وہ ڈریں کہیں ان کا شمار یحرفون الکلم عن معواضعہ کے زمرہ میں نہ ہو۔

شرک کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب اس پر غور فرمایئے کہ شرک کیوں ظلم عظیم ہے۔ اور کیوں اس جرم کی بخشش نہیں ہو گی۔ شرک اس قادر مطلق اور شہنشاہ کائنات کے خلاف بغاوت ہے۔ اس کی بادشاہی اور فرماں روائی میں کسی کو شریک کرنا اس کو حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق تسلیم کرنے کے منافی ہے۔ ظاہری حکومتیں سنگین سے سنگین جرم کرنے والے کے لیے عفو و در گزر کا دروازہ کھلا رکھتی ہیں۔ لیکن علم بغاوت بلند کرنے والا گردن زونی ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی دنیوی حکمران کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار اتنا بڑا جرم ہے تو آپ خود اندازہ لگائیں کہ اس حقیقی بادشاہ جو مالک بھی ہے اور خالق بھی، میرا بھی اور تیرا بھی، بلندی کا بھی اور پستی کا بھی، اس کی الوہیت کا جو انکار کرے یا اس جیسا کسی کو مجھے اس سے بڑا جرم بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت جب اسی حالت کفر و شرک پر موت آجائے۔ اور اگر وہ شرک سے تائب ہو جائے اور توحید کو دل و جان سے تسلیم کرلے تو اس کی توبہ قبول ہو گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ گار مومن جو اپنے گناہوں سے توبہ کئے بغیر مر جائے اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی رحمت سے اس کو بھی بخش دے۔ (ضیاء)

(عَنْ اَبِی مُوسٰی (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُعْطِیتُ خَمْسًا بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ طَھُورًا وَمَسْجِدًا وَاُحِلَّتْ لِیَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِمَنْ کَانَ قَبْلِی وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ شَھْرًا وَاُعْطِیتُ الشَّفَاعَۃَ وَلَیْسَ مِنْ نَبِیٍّ اِلَّا وَقَدْ سَاَلَ شَفَاعَۃً وَاِنِّی اخْتَبَاْتُ شَفَاعَتِی ثُمَّ جَعَلْتُھَا لِمَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِی لَمْ یُشْرِکْ بِاللّٰہِ شَیْئًا) [مسند احمد]

”حضرت ابی موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے پانچ خصوصیات عطا کی گئی ہیں مجھے ساری دنیا کے لیے نبی بنایا گیا ہے اور ساری زمین میرے لیے پاک ہے اور مسجد بنادی گئی ہے اور میرے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں اور میری مدد کی گئی ہے ایک مہینے کی مسافت سے اور مجھے شفاعت کا حق دار قرار دیا گیا ہے اور کوئی بھی نبی ایسا نہیں مگر اس نے سفارش کا سوال کیا اور بیشک مجھے شفاعت کے لیے چن لیا گیا اور میں اپنی امت میں سے ہر اس شخص کی سفارش کروں گا جس نے شرک نہیں کیا ہو گا۔“

مغفرت کی امید پر گناہ کرنا بہت خطرناک ہے

یہ یاد رہے کہ کفر کے علاوہ قیامت کے دن ہر گناہ کے بخشے جانے کا امکان ضرور ہے مگر اس امکان کی امید پر گناہوں میں پڑنا بہت خطرناک ہے بلکہ بعض صورتوں میں گناہ کو ہلکا سمجھنے کی صورت میں خود کفر ہو جائے گا۔ کتنا کریم ہے وہ خدا عَزَّوَجَلَّ جو لاکھوں گناہ کرنے والے بندے کو معافی کی امید دلا رہا ہے اور کتنا گھٹیا ہے وہ بندہ جو ایسے کریم کے کرم و رحمت پر دل و جان سے قربان ہو کر اس کی بندگی میں لگنے کی بجائے اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہے۔

حضرت وحشیؓ کا قبول اسلام

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ وحشی جس نے حضرت حمزہ (رض) کو شہید کیا تھا وہ سلطان دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے امان دیجئے تاکہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خدا کا کلام سنوں کہ اس میں میری مغفرت اور نجات ہے۔ ارشاد فرمایا: مجھے یہ پسند تھا کہ میری نظر تم پر اس طرح پڑتی کہ تو امان طلب نہ کر رہا ہوتا لیکن اب تو نے امان مانگی ہے تو میں تمہیں امان دیتا ہوں تاکہ تو خدا عَزَّوَجَلَّ کا کلام سن سکے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَالَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ (الفرقان: ٦٨)

اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے۔

وحشی نے کہا: میں شرک میں مبتلا رہا ہوں اور میں نے ناحق خون بھی کیا ہے اور زنا کا بھی مرتکب ہوا ہوں کیا ان گناہوں کے ہوتے حق تعالیٰ مجھے بخش دے گا؟ اس پر سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خاموشی اختیار فرمائی اور کوئی کلام نہ فرمایا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا (الفرقان: ٧٠)

مگر جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھا کام کرے۔

وحشی نے کہا: اس آیت میں شرط کی گئی ہے کہ گناہوں سے مغفرت اسے حاصل ہوگی جو توبہ کرلے اور نیک عمل کرے، جبکہ میں نیک عمل نہ کرسکا تو میرا کیا ہوگا؟ تب یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ (النساء: ٤٨)

بیشک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔

اب وحشی نے کہا: اس آیت میں مغفرت مَشِیَّتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، ممکن ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ حق تعالیٰ کی مشیت مغفرت وابستہ نہ ہو، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ (الزمر: ٥٣)

تم فرماؤ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

یہ آیت سن کر وحشی نے کہا: اب میں کوئی قید اور شرط نہیں دیکھتا اور اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

(مدارج النبوہ، قسم سوم، باب ہفتم: ذکر سال ہفتم وفتح مکہ، ٣٠٢/٢)

مدارج کے علاوہ بقیہ کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ یہ عرض معروض نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں نہ ہوئی بلکہ دوسرے ذریعے سے ہوئی۔

فوائد

1: یہاں شرک، بمعنی کفر ہے لہٰذا حضور کا ہر منکر مشرک ہے خواہ رب کو ایک مانے یا چند۔ رب فرماتا ہے ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا جو کفر پر مر جاوے اس کی بخشش ناممکن ہے۔ اس لیے کافر کو مرحوم وغیرہ کہنا منع ہے۔ قرآن میں شرک بمعنی کفر آتا ہے۔

2: مقصد یہ ہے کہ جو کفر پر مرے گا اس کی بخشش ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ بڑے سے بڑا گناہ بخشش کے قابل ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا حق العبد ہو یا حق اللہ مگر بخشش کی نوعیتوں میں فرق ہے اللہ کے حق کی بخشش اور طرح ہو گی، بندے کے حق کی بخشش اور طرح۔ حق العبد بندے سے معاف کرادیئے جاویں گے، باقی حقوق کچھ شفاعت سے کچھ دوزخ میں عارضی طور پر داخل کرکے۔

3: یہاں بھی شرک سے مراد کفر ہی ہے۔ ہر کافر بڑا طوفان باندھنے والا ہے۔ روح البیان میں فرمایا کہ یہ دونوں آیتیں حضرت وحشی (قاتل امیر حمزہ) کے حق میں آئیں جنھوں نے حضور کی خدمت میں کہلوا کر بھیجا کہ میں اسلام لانا چاہتا ہوں مگر یہ آیت مجھے اسلام سے روکتی ہے والذین لا یدعون مع اللہ الھا اخر الخ میں تو مشرک بھی ہوں اور مومن کا قاتل بھی۔ اس پر یہ آیت اور چند دوسری آیات اتریں۔

آیت مبارکہ:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾

لغات القرآن: [اَلَمْ تَرَ : کیا تم نے نہیں دیکھا] [اِلَی: طرف (کو)] [الَّذِيْنَ : وہ جو کہ] [يُزَكُّوْنَ : پاک۔ مقدس کہتے ہیں] [اَنْفُسَهُمْ : اپنے آپ کو] [بَلِ : بلکہ] [اللّٰهُ : اللہ] [يُزَكِّيْ : مقدس بناتا ہے] [مَنْ : جسے] [يَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے] [وَلَا يُظْلَمُوْنَ : اور ان پر ظلم نہ ہوگا] [فَتِيْلًا : دھاگے برابر]

ترجمہ: کیا آپ نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو خود کو پاک ظاہر کرتے ہیں، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک فرماتا ہے اور ان پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا

تفسیر و تشریح: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے آپ کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کا بیٹا اور اس کا پیارا بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں نہ داخل ہو گا اور یوں اپنی تعریف آپ کرتے تھے اور وہ بھی جھوٹی۔

خود پسندی کی مذمت

اس آیت کریمہ میں خود پسندی کی مذمت کا بیان ہے۔ خود پسندی یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دینی یا دنیاوی کوئی نعمت عطا کی ہو وہ یہ تَصوُّر کرے کہ اس نعمت کا ملنا میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے اور اس پر ناز کرنے لگے۔

(کیمیائے سعادت، رکن سوم: مہلکات، اصل نہم، حقیقت عجب وادلال، ۲/۷۲۵)

خود پسندی ایک مذموم باطنی مرض ہے اور فی زمانہ مسلمانوں کی اکثریت اس میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اپنے علم و عمل پر ناز کرنا، کثرت عبادت پر اترانا، عزت، منصب اور دولت پر نازاں ہونا، فنی مہارت پر کسی کی انگشت نمائی برداشت نہ کر سکنا، کسی اور کو خاطر میں ہی نہ لانا بہت عام ہے۔ ایسے حضرات کو چاہیے کہ ان روایات کا بغور مطالعہ کریں:

(1)۔۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے کسی نیک عمل پر اپنی تعریف کی تو اس کا شکر ضائع ہوا اور عمل برباد ہو گیا۔ (کنز العمال، کتاب الاخلاق، قسم الاقوال، العجب، ۲۰۶/۲، الجزء الثالث، الحدیث: ۷۶۷۴)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، سرکارِ عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "تین چیزیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں: (1) لالچ جس کی اطاعت کی جائے (2) خواہش جس کی پیروی کی جائے (3) بندے کا اپنے عمل کو پسند کرنا یعنی خود پسندی۔ (معجم الاوسط، من اسمہ محمد، ۲۱۲/۴، الحدیث: ۵۷۵۴)

(3)۔۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اے سراقہ! کیا میں تمہیں جنتی اور جہنمی لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ عرض کی: یارسول اللہ! ضرور بتائیے۔ ارشاد فرمایا: "ہر سختی کرنے والا، اترا کر چلنے والا، اپنی بڑائی چاہنے والا جہنمی ہے جبکہ کمزور اور مغلوب لوگ جنتی ہیں۔ (معجم الکبیر، علی بن رباح عن سراقۃ بن مالک، ۱۲۹/۷، الحدیث: ۶۵۸۹) (صراط)

یہود اپنی اعتقادی، اخلاقی اور عملی گوناگوں خرابیوں کے باوجود اپنے آپ کو مقدس اور پاکباز یقین کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے کہ نحن ابناؤاللہ واحباؤہ۔ ہم اللہ کے فرزند اور اس کے لاڈلے ہیں۔ جنت ہماری جاگیر ہے جو جی میں آئے کرتے رہیں ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یونہی شیخی بگھارنے اور اپنے تقدس و پاکبازی کے قصیدے پڑھنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ پاک و مقدس تو وہ ہے جو بارگاہ خداوندی میں مقدس ہے۔ (ضیاً)

یہودیوں اور عیسائیوں کا زعم

ہے کہ ہم انبیاء (علیہ السلام) کی اولاد ہونے کی بنا پر پوری دنیا سے ممتاز اور پاک لوگ ہیں اور عیسائی سمجھتے ہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سولی پر لٹک کر ہمارے گناہوں کا کفارہ بن چکے ہیں۔

یہاں یہود و نصاریٰ کے حوالے سے ہر آدمی کو سمجھایا گیا ہے کہ کوئی بزرگوں سے نسبت کی بنیاد یا کسی کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھ کر اپنی پاک دامنی کا دعویٰ نہ کرے کیونکہ ہر آدمی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ انبیاءؑ کی اولاد ہونے یا کسی کے ساتھ عقیدت و محبت کی بنیاد پر آدمی پاک دامن نہیں ہو جاتا۔ جب تک وہ عقیدے کے اعتبار سے موحّد اور عمل کے لحاظ سے نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کرنے والا نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی آدمی کا یہ عقیدہ بھی ہونا چاہیے کہ صرف ظاہری نیکی کی بنیاد پر انسان کا دل پاک نہیں ہو سکتا جب تک وہ نیکی کی روح کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جس کا نام اخلاص اور تقوی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور توفیق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پاک وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے پاک کر کے جہنم سے محفوظ فرما دیا ہو۔ اس کے باوجود لوگ یہ ذہن رکھتے ہیں کہ ہم بزرگوں سے نسبت اور ان کے طفیل جہنم سے بچ جائیں گے۔ یہودی توراۃ سے، عیسائی انجیل سے، بد عقیدہ مسلمان قرآن وسنت سے غلط استدلال کرتے ہیں۔ گویا کہ یہ بالواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ پر کذب بیانی کرتے ہیں۔ یہ گناہ انھیں جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مصنوعی تقویٰ اور ایسے نام رکھنے سے منع فرمایا ہے جس سے خواہ مخواہ پاکدامنی کا اظہار ہوتا ہو۔ اولیاء اللہ

مقربین ہوتے ہیں ان سے تمسک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر تقویٰ و طہارت پیدا ہو۔ مسلمان برائیوں سے بچے اور اللہ کے قرب کے لئے اپنے اندر سے تمام معائب نکالے اور اخلاق انبیاء علیہم السلام پیدا کرے۔

چونکہ اولیاء کاملین روحانی طبیب ہوتے ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو (صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

تم ان سے کہو:) ہم نے خود کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا' اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو گا؟ اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں) میں ڈھالا ہوتا ہے۔ اس لئے انسے منسلک شخص بھی ان کے طریق پر یہ روحانی استفادہ کرتا ہے۔ باقی اعمال حسنہ سے ہی چھٹکارا ہے۔

(عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَطَاءٍ قَالَ سَمَّيْتُ ابْنَتِي بَرَّةَ فَقَالَتْ لِي زَيْنَبُ بِنْتُ اَبِي سَلَمَةَ (رض) اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نَهٰى عَنْ هٰذَا الْاِسْمِ وَسُمِّيْتُ بَرَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ فَقَالُوْا بِمَ نُسَمِّيْهَا قَالَ سَمُّوْهَا زَيْنَبَ) [رواہ مسلم : کتاب الآداب]

" محمد بن عمرو بن عطاء (رح) کہتے ہیں میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ رکھا۔ مجھے زینب بنت ابو سلمہ (رض) نے کہا کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نام رکھنے سے منع کیا ہے۔ میرا نام بھی برہ رکھا گیا تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے آپ کو پاک نہ گردانو۔ اللہ جانتا ہے تم میں سے کون پاک ہے۔ انھوں نے پوچھا ہم اس کا کیا نام رکھیں ؟ آپ نے فرمایا اس کا نام زینب رکھو۔ "

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي بَكْرَةَ عَنْ اَبِيهِ (رض) قَالَ اَثْنٰى رَجُلٌ عَلٰى رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ وَيْلَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ، قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ مِرَارًا ثُمَّ قَالَ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَادِحًا اَخَاهُ لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ اَحْسِبُ فُلَانًا، وَاللّٰهُ حَسِيبُهُ، وَلَا اُزَكِّي عَلَى اللّٰهِ اَحَدًا، اَحْسِبُهُ كَذَا وَكَذَا اِنْ كَانَ يَعْلَمُ ذٰلِكَ مِنْهُ

[رواہ البخاری : کتاب الشھادات، باب إذا زکی رجل کفاہ]

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک آدمی نے آکر کسی کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا تونے اپنے بھائی کی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ آپ نے یہ کلمات تین دفعہ دہرا کر فرمایا اگر کوئی ضرور کسی کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو یہ کہے کہ فلاں آدمی کے بارے میں میرا یہ خیال ہے اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت خوب جانتا ہے اور وہ یہ الفاظ تبھی کہہ سکتا ہے جب حقیقتاً اس شخص کو ایسا پائے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تم کسی کی گارنٹی نہیں دے سکتے۔ (روح)

فوائد

1۔ معلوم ہوا کہ اپنے نام کے ساتھ صاحب یا القاب خود لکھنا منع ہے کہ یہ اپنی ستھرائی بیان کرنے میں داخل ہے۔ ایسے ہی اپنی تعریف اپنے منہ سے بیان کرنا درست نہیں۔ ہاں رب کی نعمت کے اظہار کے لیے جائز ہے۔ حضور فرماتے ہیں۔ انا سید ولد آدم۔

2۔ اہل کتاب اپنے آپ کو گناہوں سے پاک تصور کرتے ہیں اور اس طرح غرور و تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔

3۔ اللہ جس کا چاہتا ہے تزکیہ کرتا ہے اور اصلاح حال کر دیتا ہے۔ اندرونی و بیرونی آلائشیں ختم کرتا ہے۔ کسی کے ثواب میں کمی نہ کرے گا اور کسی کو بلاوجہ عذاب نہ دے گا۔

آیت مبارکہ:

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾

لغات القرآن: [اُنْظُرْ : دیکھو] [كَيْفَ : کیسا] [يَفْتَرُوْنَ : باندھتے ہیں] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر] [الْكَذِبَ : جھوٹ] [وَكَفٰى: اور کافی ہے] [بِهٖٓ : یہی] [اِثْمًا : گناہ] [مُّبِيْنًا : صریح
]

ترجمہ: آپ دیکھئے وہ اللہ پر کیسے جھوٹا بہتان باندھتے ہیں، اور (ان کے عذاب کے لئے) یہی کھلا گناہ کافی ہے (عرفان)

تفسیر و تشریح:

"انظر" میں خطاب یا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے یا ہر قرآن پڑھنے والا مسلمان اس سے مراد ہے آنکھ سے دیکھنا یا دل سے غور کرنا

افتراء و بہتان

افتراء کے معنی ابھی پچھلی آیت میں بیان ہو چکے۔ عَلَی اللہ کا تعلق یفترون سے ہے کَذِب اس کا مفعول یعنی اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم یا اے قرآن پڑھنے والے مسلمان غور تو کرو وہ یہ کس بے باکی اور جرات و ہمت سے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور غلط بات اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں یہ جھوٹے کہتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنتی نہیں ہے۔ ہیں گناہوں میں لتھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو پاک صاف کہتے ہیں حالانکہ اللہ کی بارگاہ میں مردود ہیں لیکن اپنے آپ کو محبوب کہتے ہیں۔ (نعیمی)

شان نزول

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ واقعہ احد کے بعد کعب بن اشرف ستر یہودیوں کو لے کر قریش کے پاس مکہ کو گیا تاکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف قریش سے امداد وحمایت کا عہد وپیان کرے اور جو معاہدہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہودیوں نے کر رکھا تھا اس کو توڑ دے مکہ پہنچ کر کعب ابوسفیان کے پاس جا کر ٹھہرا اور دوسرے یہودی قریش کے مختلف اشخاص کے پاس اترے ' اہل مکہ نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی اہل کتاب ہیں اور تم بھی اہل کتاب ہو ہم کو اعتبار نہیں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تمہاری چال نہ ہو۔ اگر تم ہم کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کرنا چاہتے ہو تو ان دونوں بتوں کو سجدہ کرو ان کو مانو۔ کعب نے سجدہ کر لیا۔ پھر بولا تدبیر یہ ہے کہ تیس آدمی ہمارے اور تیس آدمی تمہارے کعبہ سے چمٹ کر معاہدہ کرلیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ کرنے کی ہم مل کر کوشش کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (مظہری)

اس سے پہلے کی آیت میں ان کے جس شرک کی مثال دی گئی ہے جس شرک کی وجہ سے ان کی پوری زندگی عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بے گانہ ہو کر رہ گئی ہے، اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے کہ ذرا دیکھئے! یہ اپنے اس شرک کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح اپنے آپ کو عمل کی ذمہ داریوں سے فارغ کیا ہے اسے اپنی بے عملی یا بے دینی ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ نے اپنے چہیتا ہونے کی سند عطا کی ہے۔ ہم اللہ کے بیٹے ہیں تو اسکے بیٹے اور چہیتے ہونے کی وجہ سے اللہ ہی نے ہمیں ان ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اس طرح سے وہ اللہ پر کتنا بڑا جھوٹ باندھتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ ان کا اللہ کی طرف یہ جھوٹا انتساب یہود کے دوسرے جرائم سے قطع نظر ان کے مجرم ہونے کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ کا نام لے کر اس کی نافرمانی کا جواز پیدا کرنا ایک انسان کے لیے اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک ان قوموں نے کیا جو اللہ اور آخرت کو مانتے تھے۔ یہود نے حضرت عزیر (علیہ السلام) اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا بنایا جبکہ بنو اسماعیل نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اس پس منظر میں یہ ایک معجزہ ہے کہ امت محمد) ﷺ (تاحال شرک بالذات سے بچی ہوئی ہے 'لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسروں کو شریک کرنے کے جرم سے ہم لوگ بھی نہ بچ سکے۔ اس لیے اس نوٹ میں ہم شرک فی الصفات کے متعلق کچھ اصولی باتیں سمجھیں گے تاکہ اس کو پہچاننے کی صلاحیت حاصل ہو جائے۔

شرک فی الصفات میں مغالطہ لاحق ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہی الفاظ مخلوق کی صفات کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ سمیع ہے تو ہم بھی سنتے ہیں، اللہ بصیر ہے اور ہم بھی بصیر ہیں' اللہ عالم ہے تو ہم بھی عالم ہیں وغیرہ۔ اس سبب سے پیدا ہونے والے مغالطے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ اور مخلوق کی صفات میں تین بنیادی فرق ذہن میں رکھیں تاکہ شرک فی الصفات سے بچ سکیں۔

(1) پہلا فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذاتی ہیں 'کسی نے اس کو دی نہیں' جبکہ مخلوق کی صفات ان کی ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہیں تو ان کو ملی ہیں۔

(2) دوسرا فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اسے ہمیشہ سے حاصل ہیں اور ہمیشہ رہیں گی' جبکہ مخلوق کی صفات حادث بھی ہیں اور فانی بھی۔ حادث کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں صفات پہلے نہیں تھیں' اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے اسے حاصل ہوئیں۔ فانی کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کی صفات ختم ہو جاتی ہیں۔

(3) تیسرا اور بہت اہم فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لا محدود ہیں جبکہ مخلوق کی صفات محدود ہیں۔ مثلاً جو آواز فاصلے پر ہو' اسے ہم نہیں سن سکتے۔ آواز اگر ہلکی ہو تو آواز کا احساس ہوتا ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ہمارے سامنے کئی افراد بیک وقت ایک دوسرے سے بات (cross talk) شروع کر دیں تو سب کی آواز ہمارے کان میں آئے گی لیکن بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ سب کچھ ہماری صفت سماعت کے محدود ہونے کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت سماعت کے لا محدود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فاصلے اس کے لیے بے معنی ہیں۔ بندہ چاہے قطب شمالی پر ہو یا قطب جنوبی پر' وہ سب کی سنتا ہے۔ آواز کا تیز یا ہلکا ہونا بھی اس کے لیے بے معنی ہے' وہ تو دل میں آنے والے خیال بھی سن لیتا ہے۔ اگر پوری دنیا کے انسان اسے بیک وقت پکاریں تو وہ ہر ایک کی سن لیتا ہے۔ اسی طرح ہم بقیہ صفات کے محدود اور لا محدود ہونے کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ایک پیمانہ (yard stick) ہے جس پر رکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ کیا شرک ہے اور کیا شرک نہیں ہے۔ اب یہ بھی نوٹ کر لیں کہ قرآن مجید میں شرک سے متعلق آیات کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور ان میں اکثر شرک فی الصفات سے متعلق ہیں۔

(دیکھو) ان یہودیوں کو عناد کی وجہ سے (کیسا طوفان برپا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ) پر جھوٹ کا) جو کہتے ہیں کہ خدا ہمارے دن رات کے گناہ بخش دیتا ہے (اور یہ) افتراء اور جھوٹ ان کا کافی اور (کھلا) ہوا (گناہ ہے) جو کسی پر پوشیدہ نہ رہے گا۔ (مطالعہ)

اس مقام پر یہ خیال رہنا چاہیے کہ جس خود ستائی کو ارشاد مذکور میں ممنوع و معیوب قرار دیا گیا ہے یہ اس وقت ہے جب انسان کسی پر اپنا تفوق اور برتری ظاہر کرنے کے لیے اپنی بڑائی بیان کرے۔

حضرت مقداد (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں حکم دیا کہ ہم تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹی ڈال دیں "ان نحثو فی وجوہ المداحین التراب (صحیح مسلم، کتاب الزھد) ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک آدمی کو ایک دوسرے آدمی کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (ویحک قطیت عنق صاحبک) افسوس ہے تجھ پر تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی پھر فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کو کسی کی لا محالہ تعریف کرنی ہے تو اس طرح کہا کرے، میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں۔ اللہ پر کسی کا تزکیہ بیان نہ کرے (صحیح بخاری)

لیکن۔۔ جب اس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار مقصود ہو۔۔ یا کسی عیب اور الزام سے اپنی برات بیان کرنا مطلوب ہو یا کسی جگہ اپنی پاکدامنی کا اظہار کرنا مقصود ہو یا اپنا حق اور اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے اپنے محامد بیان کرنے مقصود ہوں تو پھر اپنے محامد اپنے فضائل اپنی برات اور اپنی پاکیزگی کو بیان کرنا جائز ہے۔

یہودیوں کی روش بالکل اس سے الگ تھی، وہ صرف دوسروں پر اپنی برتری اور اپنا تفوق جتانے کے لیے اپنی بڑائی بیان کیا کرتے تھے ارشاد مذکور میں اسی طرح کی خود ستائی کو معیوب و ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اے محبوب ﷺ ! یہ اپنی بے جا خود ستائی کرنے والے بھی عجیب طرز عمل والے لوگ تھے۔ کیونکہ یہودی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور پیارے کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں ہمارے دن کے گناہ رات کو اور رات کے گناہ دن کو بخش دیئے جاتے ہیں۔ (اشرفی)

اللہ پر جھوٹ باندھنے کے جرم کی شدت وہولناکی

سو ارشاد فرمایا گیا کہ کافی ہے [ان لوگوں کی ہلاکت و تباہی کے لیے] یہ کھلم کھلا گناہ۔ یعنی اللہ پر جھوٹ گھڑنا اتنا بڑا شدید اور سنگین جرم ہے، کہ ایسے جرم کے مرتکب کی تباہی و بربادی کیلئے کسی اور جرم کی ضرورت ہی نہیں۔ یہی گناہ ایسے لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کیلئے کافی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ حضرت حق۔ جل مجدہ۔ کی ذات اقدس واعلیٰ پر افتراء میں صحت کا کوئی شائبہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایسے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ (المراغی وغیرہ)۔ سو اپنی صاحبزادگی اور بڑائی کا دعویٰ کرنا، اور اپنی پاکیزگی کا گھمنڈ رکھنا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا اللہ پاک پر افتراء کرنا اور اس پر جھوٹ گھڑنا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ کیونکہ اس نے محض حسب و نسب کی بناء پر کسی کو بڑائی اور بندگی کی کوئی سند نہیں دی۔ اور کسی کا اپنے لیے اس طرح کا دعویٰ کرنا دراصل اپنے آپ کو بندگی کے دائرہ سے نکال کر الوہیت کے دائرے میں داخل کرنا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے عزت وعظمت اور بزرگی و بڑائی کا مدار وانحصار ایمان و عمل اور تقویٰ و پرہیزگاری پر رکھا ہے { ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم } سو تقوی و پرہیزگاری کے اسی وصف مطلوب کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ و باللہ التوفیق ــ (مدنی)

آیت مبارکہ:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَۤاءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ﴿۵۱﴾

لغات القرآن: [اَلَمْ تَرَ : کیا تم نے نہیں دیکھا] [اِلَی: طرف (کو)] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [اُوْتُوْا : دیا گیا] [نَصِیْبًا : ایک حصہ] [مِّنَ : سے] [الْکِتٰبِ : کتاب] [یُؤْمِنُوْنَ : وہ مانتے ہیں] [بِالْجِبْتِ : بت (جمع)] [وَالطَّاغُوْتِ : اور سرکش (شیطان)] [وَیَقُوْلُوْنَ : اور کہتے ہیں] [لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا : جن لوگوں نے کفر کیا (کافر)] [هٰٓؤُلَاۗءِ : یہ لوگ] [اَهْدٰی: راہ راست پر] [مِنَ : سے] [الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : جو لوگ ایمان لائے (مومن)] [سَبِیْلًا : راہ]

ترجمہ : کیاآپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب کا حصہ دیا گیاہے (پھر بھی) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نسبت یہ (کافر) زیادہ سیدھی راہ پر ہیں

تفسیر و تشریح:

اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی بھی عبادت اور اطاعت کی جائے وہ طاغوت کی عبادت اور اطاعت ہو گی۔ غزوہ احد میں مسلمانوں کو وقتی طور پر ہزیمت اٹھانی پڑی لیکن اس کے باوجود یہودی سمجھتے تھے کہ مسلمان دن بدن آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے مدینے کا ایک وفد کعب بن اشرف کی سرکردگی میں مکہ معظّمہ پہنچا تاکہ کفار کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جاسکے۔ لیکن ابوسفیان اور اہل مکہ یہودیوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے یہ شرط پیش کی کہ جب تک تم ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اکٹھے رہنے کا یقین نہیں دلاتے ہم آپ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہودی مشرک ہونے کے باوجود بتوں کی پوجا سے نفرت کرتے تھے بالخصوص کعب بن اشرف بتوں کو سجدہ کرنے کا سخت مخالف تھا لیکن اہل مکہ کو اعتماد دلانے کے لیے اس نے بتوں کے سامنے سجدہ کیا۔ اس موقعہ پر ابوسفیان نے کعب سے پوچھا کہ ہم تو اتنا علم نہیں رکھتے آپ بتائیں کہ ہم راہ راست پر ہیں یا محمد ؟ کعب بن اشرف اور اس کے وفد نے کہا کہ تم زیادہ ہدایت یافتہ ہو جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم نے ان لوگوں کے کردار پر غور نہیں کیا جو اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود بتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حسد و بغض میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلے میں اہل کفر کو یقین دہانی کروا رہے ہیں کہ تم مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ باطل عقائد رکھنے والوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ جس کی مثال آج بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ یہودی اور عیسائی اہل کتاب ہونے کے باوجود باطل مذاہب کے اس قدر دشمن نہیں ہیں جس طرح مسلمانوں کے دشمن ہیں یہی حالت مسلمانوں کے اندر باطل عقائد رکھنے والوں کی ہے۔ وہ اہل توحید اور سنت پر عمل کرنے والوں کی زیادہ مخالفت کرتے ہیں۔ طاغوت کی پوجا کرنے کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ (فہم)

جبت وطرق

جبت لغت میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بیکار محض ہو۔ الذی لا خیر فیہ۔ اس کا اطلاق جادو، جادو گر، جوتش، رمل اور فال گری وغیرہ خرافات پر ہوتا ہے۔ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد ہے۔ "اطرق والطیرۃ والعیافۃ من الجبت " (قرطبیؒ عن ابی داؤد)
کنکریاں پھینک کر فال پکڑنے کو طرق کہتے ہیں اور الطیرۃ کا معنی بدشگونی ہے اور العیافۃ پرندوں کے ناموں، آوازوں اور ان کے گزرنے سے فال پکڑنے کو کہا جاتا ہے (حاشیہ قرطبیؒ) یہ سب اوہام پرستی کی اقسام ہیں۔ صاحب المنار لکھتے ہیں فالمعنی الجامع للجبت ھو الدجل والاوھام والخرافات یعنی مکر وفریب، وہم پرستی اور خرافات کو جبت کہا جاتا ہے اور طاغوت کی تعریف ادب ولغت کے امام جوہری نے یہ کی ہے۔
والطاغوت الکاہن والشیطان وکل راس فی الضلال۔ یعنی طاغوت کا اطلاق کاہن اور شیطان پر بھی ہوتا ہے اور اس شخص کو بھی طاغوت کہتے ہیں جو کسی گمراہی کا سرغنہ ہو۔ (ضیاء)

اس آیت میں "طاغوت "کا لفظ آیا ہے۔ یہ "طَغٰی "سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے "سرکشی "۔ جو ربّ عَزَّوَجَلَّ سے سرکش ہو اور دوسروں کو سرکش بنائے وہ طاغوت ہے خواہ شیطان ہو یا انسان۔ قرآن کریم نے سرداران کفر کو بھی طاغوت کہا ہے۔ چونکہ طاغوت کے لفظ میں سرکشی کا مادہ موجود ہے اس لیے مُقَرَّبینِ بارگاہِ الٰہی کیلئے یہ لفظ ہر گز استعمال نہیں ہو سکتا بلکہ جو ان کیلئے یہ لفظ استعمال کرے وہ خود "طاغوت "ہے۔ (صراط) مزید وضاحت

جبت اور طاغوت کا معنیٰ

ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے وہ جبت ہے (تفسیر الزجاج ج ۲ ص ۶۴)
بغوی نے اپنی سند سے حضرت قبیصہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عیافت (پرندوں کے نام آواز اور گزرنے سے شگون حاصل کرنا) اور طرق (پتھریاں مارنا اور اس کو شگون جاننا) اور پرندوں کے دائیں بائیں سے اڑ کر جانے کو اپنے مقصد کے لیے اچھا برا اور مضر مفید سمجھنا (یا عام بدشگونی) جبت میں سے ہے جس کے اندر کوئی خیر نہیں۔ (۱) [عیافۃ پرندوں کے ناموں آوازوں اور اڑنے کے راستوں سے اچھا برا شگون لینا عاف یَعِیْفُ عَیْفًا (باب ضرب) بدشگونی لی۔ گمان کیا ظن کیا (نہایہ) طَرْقٌ پتھریاں اور کنکریاں پھینکنا (اور اس کو شگون قرار دینا) جیسے عورتیں کرتی ہیں (نہایہ) طیرۃ بدشگونی لینا اصل میں اسی لفظ کا معنی ہے دائیں بائیں سے پرندوں یا ہرنوں کے گزرنے سے اچھا یا برا شگون لینا (عرف عام میں عام بدشگونی پر اطلاق ہونے لگا) نہایۃ خبلجنون تباہی۔ اصل میں اس کا معنی ہے نقصان خرابی 'پھر ہر تباہی کو خبال کہنے لگے۔ (نہایہ) (مظہری)
بعض دیگر اہل علم کا خیال ہے کہ جِبْت سے مراد اعمال سفلیہ مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔ اعمالِ سفلیہ کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواح خبیثہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطانی قوتوں اور ارواح خبیثہ سے مدد مانگنی پڑتی ہے اور بعض دفعہ وہ اپنے معمول کو بھی ایسے وظائف بتاتے ہیں جس میں ان قوتوں سے مدد مانگنا شامل ہوتا ہے۔ اس وضاحت کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اس آیت کریمہ میں انہی قوتوں کو طاغوت کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

عطیہ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جبت سے مراد بت ہیں اور طاغوت سے مراد بتوں کے ترجمان ہیں جو بتوں کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور بتوں کی طرف منسوب کر کے لوگوں سے جھوٹی اور من گھڑت باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو گمراہ کریں 'حضرت عمر (رض) نے فرمایا جبت سے مراد ساحر ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے 'مجاہد نے کہا طاغوت سے مراد وہ شیطان ہے جو انسان کی صورت میں آتا ہے اور لوگ اس کے پاس اپنے مقدمات پیش کرتے ہیں 'مجاہد نے ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ طاغوت سے مراد کاہن ہے اور جبت سے مراد ساحر ہے 'حضرت ابن عباس (رض) سے ایک تفسیر یہ ہے کہ جبت سے مراد ایک یہودی عالم حی بن اخطب ہے اور طاغوت سے مراد ایک یہودی سردار اور عالم کعب بن اشرف ہے۔ (جامع البیان: ج ۵ ص ۸۴۔ ۸۳)

کعب بن اشرف یہودی نے بتوں کو سجدہ کیا

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ واقعہ احد کے بعد کعب بن اشرف ستر یہودیوں کو لے کر قریش کے پاس گیا تاکہ رسول اللہ کے خلاف قریش سے امداد و حمایت کا عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ رسول اللہ سے یہودیوں نے کر رکھا تھا اس کو توڑ دے، مکہ پہنچ کر کعب ابو سفیان کے پاس جا کر ٹھہرا اور دوسرے یہودی قریش کے مختلف اشخاص کے پاس اترے، اہل مکہ نے کہا کہ (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) بھی اہل کتاب ہیں اور تم بھی اہل کتاب ہو ہم کو اعتبار نہیں، اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تمہاری چال نہ ہو۔ اگر تم ہم کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کرنا چاہتے ہو تو ان دونوں کو سجدہ کر و اور ان کو مانو۔ کعب نے سجدہ کر لیا۔ پھر بولا تدبیر یہ ہے کہ تیس آدمی ہمارے اور تیس آدمی تمہارے کعبہ سے چمٹ کر معاہدہ کر لیں کہ محمد کے خلاف جنگ کرنے کی ہم مل کر کوشش کریں گے اس پر آیت نازل ہوئی۔

امام احمد اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب کعب بن اشرف (یہودی) مکہ میں پہنچا تو قریش نے اس سے کہا دیکھو یہ ناٹھا نگوڑا اپنی قوم سے کٹا ہوا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج کے متولی ہیں کعبہ کے دربان ہیں اور حاجیوں کو پانی پلانے والے ہیں کعب نے کہا تم اس سے بہتر ہو اس پر آیت : اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ نازل ہوئی اور مندرجہ ذیل آیت بھی اتری۔ بغوی نے لکھا ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی بیان کیا کہ ابو سفیان نے جب کعب سے مذکورہ بالا سوال کیا تو کعب نے کہا میرے سامنے اپنا مذہب پیش کرو۔ ابو سفیان نے کہا۔ ہم حاجیوں کے لیے کوہان والی اونٹنیاں ذبح کرتے ہیں۔ ان کو پانی پلاتے ہیں مہمانوں کو ٹھہراتے ہیں ' قیدیوں کو رہا کراتے ہیں۔ رشتہ داری کو جوڑ رکھتے ہیں۔ اپنے رب کے گھر کو آباد رکھتے ہیں اور اس کا طواف کرتے ہیں اور ہم اہل حرم ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا۔ رشتہ داریاں کاٹ دیں۔ حرم کو چھوڑ گیا۔ ہمارا مذہب قدیم ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذہب نیا ہے یہ سن کر کعب بولا خدا کی قسم تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے راستے سے زیادہ صحیح راستہ پر ہو۔ (تفسیر مظہری اردو جلد سوم) و (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۳۵) (جلالین)

عزیٰ کی موت

بیہقی نے حضرت ابوالطفیل کی روایت سے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خالد بن ولید (رض) : کو عزیٰ کو ڈھا دینے کے لیے بھیجا۔ خالد (رض) نے جا کر ببول کے درخت کاٹ دیئے اور واپس آکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کو اطلاع دے دی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تجھے کوئی چیز بھی دکھائی دی ' خالد (رض) نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو تو نے عزیٰ کو ڈھایا ہی نہیں خالد دوبارہ لوٹ کر گئے۔ پجاریوں نے جب خالد (رض) : کو دیکھا تو پہاڑ پر چلے گئے اور بھاگتے میں یہ کہتے جا رہے تھے۔ عزیٰ اس کو پٹ کر دے ورنہ ذلت کے ساتھ مر جا! اتنے میں ایک کالی ننگی عورت برآمد ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنے سر اور چہرہ پر خاک اڑا رہی تھی۔ خالد (رض) نے یہ کہتے ہوئے تلوار سونتی۔ عزیٰ اب میں تیرا منکر ہوں۔ تیری پاکی کا اقرار نہیں کر سکتا۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔ پھر تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور واپس آکر رسول اللہ : (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اطلاع دے دی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں وہ عزیٰ تھی اب ہمیشہ کے لیے تمہارے ملک میں اپنی پوجا کی جانے سے ناامید ہو گئی۔ کذا فی سبیل الرشاد۔ (مظہری) (گلدستہ)

مشرک اور کافر جس طرح چاہیں آپس میں گٹھ جوڑ کر لیں اللہ تعالیٰ کے بغیر ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہی کچھ ہوا کہ ٹھیک دو سال کے بعد غزوہ خندق سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں کو ہمیشہ کے لیے جزیرہ عرب سے نکال دیا۔

(۱) (عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ (رض) قَالَ دَخَلَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَکَّۃَ وَحَوْلَ الْکَعْبَۃِ ثَلَاث مِاءَۃٍ وَّسِتُّوْنَ نُصُبًا فَجَعَلَ یَطْعَنُھَا بِعُوْدٍ فِیْ یَدِہٖ وَجَعَلَ یَقُوْلُ (جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ) الآیۃ) [رواہ البخاری : کتاب المظالم والغصب، باب ھل تکسر الدنان التی فیھا الخمر]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں داخل ہوئے اور کعبے کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے آپ انھیں اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے گراتے اور کہتے : (حق آچکا اور باطل بھاگ گیا)۔"

(۲) (عَنْ اَبِی الْھَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ (رض) اَلَّا اَبْعَثُکَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ) [رواہ مسلم : کتاب الجنائز]

"ابوالھیاج اسدی کہتے ہیں مجھے علی بن ابی طالب (رض) نے کہا کیا میں تجھے اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھیجا تھا کہ ہر تصویر کو مٹادے اور جو اونچی قبر دیکھے اسے برابر کردے۔

فوائد

1۔ معلوم ہوا کہ کتاب الٰہی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ علم و عمل اللہ دونوں نصیب فرماوے۔ عمل کے بغیر علم وبال ہے۔

2 : طاغوت، طغی سے بنا۔ بمعنی سرکشی جو رب سے سرکش ہو اور سرکش بنائے وہ طاغوت ہے خواہ جنی شیطان ہو یا انسانی شیطان۔ قرآن کریم نے سرداران کفر کو بھی طاغوت کہا۔ جو نبی کو طاغوت کہے وہ بے دین ہے جیسے حسین علی واں بھچرانوالہ۔ (نور)

3۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر ان کے دجل وفریب کی مذمت کی۔ روح المعانی)

آیت مبارکہ:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ ۭ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ﴿۵۲﴾ؕ

لغات القرآن: [اُولٰٓئِکَ : یہی لوگ] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [لَعَنَھُمُ : ان پر لعنت کی] [اللّٰہُ : اللہ] [وَمَنْ : اور جس پر] [یَّلْعَنِ : لعنت کرے] [اللّٰہُ : اللہ] [فَلَنْ : تو ہرگز] [تَجِدَ لَهٗ : تو پائے گا اس کا] [نَصِیْرًا : کوئی مددگار]

ترجمہ : یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اس کے لیے ہر گز کوئی مددگار نہ پائے گا

تفسیر و تشریح:

یعنی یہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور طریقہء کفر کو طریقہء اسلام سے افضل بتلایا ان پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر لعنت کرے اللہ اس کا دنیا اور آخرت میں کوئی حامی اور مددگار نہیں ہو سکتا۔ سو اب انھوں نے اپنی اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی بالکل لغو ہے۔ چنانچہ دنیا میں یہود نے از حد ذلتیں اٹھائیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

شانِ نزول:

یہ آیت کعب بن اشرف وغیرہ علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی جو ستّر سواروں کی جمعیّت لے کر قریش سے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جنگ کرنے پر حلف لینے پہنچے، قریش نے ان سے کہا چونکہ تم کتابی ہو اس لیے تم سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ زیادہ قرب رکھتے ہو ہم کیسے اطمینان کریں کہ تم ہم سے فریب کے ساتھ نہیں مل رہے ہو اگر اطمینان دلانا ہو تو ہمارے بتوں کو سجدہ کرو تو انھوں نے شیطان کی اطاعت کر کے بتوں کو سجدہ کیا پھر ابو سفیان نے کہا کہ ہم ٹھیک راہ پر ہیں یا محمد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعب بن اشرف نے کہا تمہیں ٹھیک راہ پر ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی کہ انھوں نے حضور کی عداوت میں مشرکین کے بتوں تک کو پوجا۔ (خزائن)

لعنت

لفظ لعنت عربی زبان کا اسم مؤنث ہے۔ جس کے معنی پھٹکار، نفرتیں، سرزنش، دھتکار، سخت سست اور برا بھلا کے ہیں۔

(فیروز الدین، فیروز اللغات: 115، فیروز سنز لاہور راولپنڈی۔ کراچی)

قرآن وحدیث میں بھی کئی بار استعمال ہوا ہے۔

دراصل لعن کا اصلی معنی ہے غصے سے دھتکارنا اور دور کرنا۔ اس بناء پر خدا کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ بندوں سے اپنی وہ رحمت اور تمام عنایات وبرکات دور کر دے جو اس کی جانب سے انہیں پہنچتی ہیں۔

اللہ کی لعنت دنیا اور آخرت میں رسوائی کا سبب ہے

لعنت نام ہے اللہ کی رحمت سے دوری کا اور انتہائی رسوائی اور ذلت کا، جس پر اللہ کی لعنت ہو وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے بارے میں اتنی سخت وعید آئی ہے کہ فرمایا: ملعونین اینما ثقفوا اخذوا و قتلوا تقتیلًا "جن پر اللہ کی لعنت ہے وہ جہاں کہیں بھی ملیں ان کی گردن اڑائی جائے "یہ تو ان کی دنیاوی رسوائی ہے، اور آخرت کی رسوائی تو اس سے بھی سخت ہو گی۔

یہاں دیکھنا ہو گا کہ وہ کون سی خصلتیں تھیں جن کی وجہ سے یہود پر اللہ کی لعنت ہوئی۔

تو قرآن مجید کے مطالعہ سے وہ خصلتیں یہ تھیں: اس آیت میں ماسابق آیات کے تحت لعنت کی وجوہات بیان ہو چکی ہیں۔ مزید معائب کو دیکھنا بھی ضروری ہے تاکہ ان سے بچا جا سکے۔

1۔ مسلمانوں اور مؤمنوں کے ساتھ سب سے زیادہ سخت بغض رکھنے والے

2۔ فضول استفسار کرنا

3۔ضد بازی

4۔اللہ کی کتابوں میں تحریف کرنا

5۔دنیاوی زندگی سے محبت اور بزدلی دکھانا

6۔جھوٹ کا سننا اور سود کا لین دین

7۔دھوکہ اور خیانت

8۔دل پتھر سے بھی سخت تھے

9۔غرور اور تکبر سے بھرے ہوئے

10۔سیدہ مریم علیہا السلام پر بہتان تراشنے والے

11۔نبیوں کو قتل کرنا

12۔عہد شکنی کرنے والے

13۔اختلافات اور تفرقہ بازی میں بٹے ہوئے

14۔اللہ تعالی کیساتھ بے ادبی کرنے والے

15۔امر بالمعروف نہی عن المنکر کا چھوڑ دینا

یہود اس دنیا کے بدترین مخلوق میں سے ہیں کیونکہ روئے زمین یہود سے زیادہ اللہ اور اس کے رسولوں کی نافرمان قوم نہ کبھی آئی ہے اور نہ آئے گی اس وقت ارض فلسطین میں یہود نے بدترین تخریب کاری، نسل کشی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں۔

اس وقت یہودی مسلمانوں کی ماؤں بہنوں کی عزت سے کھیلنے کو شرف سمجھ بیٹھے ہیں اور ادھر ہمارے مسلمان حکمران؟ اللہ کریم ہدایت کی دولت سے مسلمانوں کو بہرہ مند کرے۔ آمین

قرآن و سنت کے مطالعہ سے

اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟:۔

ومن یلعن اللہ فلن تجد لہ نصیراًاس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، اب غور طلب یہ بات ہے کہ اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سود دینے والے، سود کھانے والے اس کے لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت کی ہے اور وہ سب گناہ میں برابر ہیں (رواہ مسلم بحوالہ مشکوۃ)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: ملعون من عمل عملا قوم لوط (رواہ رزین بحوالہ مشکوۃ) "یعنی جو آدمی لوط (علیہ السلام) کی قوم کے جیسا عمل کرے وہ لعنتی ہے۔ " (یعنی مرد سے بدفعلی کرنے والا) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سارق (چور) پر لعنت بھیجتا ہے، جو انڈے اور رسی جیسی حقیر چیز کی چوری تک سے گریز نہیں کرتا، جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ (متفق علیہ بحوالہ مشکوۃ)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: لعن اللہ اکل الربو و موکلہ والواشمۃ والمستوشمۃ والمصور (رواہ البخاری بحوالہ مشکوۃ)

"اللہ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر اور ان عورتوں پر جو اپنے جسم کو گودنے والی (یعنی سوئی کے ناکہ سے جسم میں سوراخ کر کے سرمہ ڈالتی ہیں تاکہ زینب ہو) یا گدوانے والی ہیں، اور ایسے ہی تصویر کھینچنے والوں پر لعنت کی ہے۔ "

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں شراب پر اور اس کے پینے والے پر، پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے، خریدنے والے، اس کے نچوڑنے والے، اس کے اٹھانے والے اور منگوانے والے سب پر (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ بحالہ مشکوۃ)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارشاد فرماتے ہیں کہ چھ آدمی ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت بھیجی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی مستجاب الدعوات ہوتا ہے وہ چھ آدمی یہ ہیں۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا (۲) اور وہ شخص جو جبر و قہر سے اقتدار حاصل کر کے اس آدمی کو عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا اور جس کو اللہ نے عزت عطاء کی ہو اس کو ذلیل کرے (۳) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا (۴) اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنے والا (۵) میری اولاد میں وہ آدمی جو محرمات کو حلال کرنے والا ہو (۶) اور میری سنت کو چھوڑنے والا (رواہ البیہقی فی المدخل بحوالہ مشکوۃ)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: لعن اللہ الناظر والمنظور الیہ۔ "یعنی جو کوئی نامحرم پر بری نظر ڈالے اور اس کے اوپر نظر ڈالے (بشرطیکہ جس پر بری نظر پڑی ہے اس کے ارادہ اور اختیار کو اس میں دخل ہو) ان پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے لعن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الرجل یلبس لبستۃ المرۃ والمرءۃ تلبس لبستۃ الرجل، "یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا سا لباس پہنے اور ایسی عورت پر لعنت کی جو مرد کا سا لباس پہنے (مشکوۃ)

"حضرت عائشہ سے کسی نے عرض کیا کہ ایک عورت (مردانہ) جوتا پہنتی ہے حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول نے ایسی عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں کے طور طریق اختیار کرے۔ "

"حضرت ابن عباس سے روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لعنت کی ان مردوں پر جو عورتوں کی طرح شکل و صورت بنا کر ہیجڑے بنیں اور لعنت کی ان عورتوں پر جو شکل و صورت میں مردانہ پن اختیار کریں اور ارشاد فرمایا ہے ان کو اپنے گھروں سے نکال کر دو۔ "

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا کہ:

"یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے والیوں پر اور گودوانے والیوں پر اور جو (ابرو یعنی بھوؤں کے بال) چنتی ہیں (تاکہ بھویں باریک ہو جائیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو حسن کے لیے دانتوں کے درمیان کشادگی کرتی ہیں جو اللہ کی خلقت کو بدلنے والی ہیں۔ "

لعنت کے احکام

لعنت جس قدر بری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں، کسی مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے اور کافر پر بھی صرف اس صورت میں کی جاسکتی ہے جبکہ اس کا کفر پر مرنا یقینی ہو، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات اس کے متعلق یہ ہیں۔"
حدیث میں ہے:

"حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہ مومن وہ نہیں ہے جو طعنہ باز اور لعنت باز ہو اور نہ ہی بدگو۔"

"حضرت ابو درداؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے سنا کہ جب بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، جس پر آسمان کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، پھر وہ زمین کی طرف اترتی ہے تو زمین کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، (یعنی زمین اس لعنت کو قبول نہیں کرتی، پھر وہ دائیں بائیں گھومتی ہے جب کہیں اس کو راستہ نہیں ملتا تو جس پر لعنت کی گئی ہے اس کے پاس پہنچتی ہے اگر وہ واقعی لعنت کا مستحق ہے تو اس پر پڑتی ہے، ورنہ پھر اپنے کہنے والے پر پڑ جاتی ہے۔"

"حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ ہوا نے ایک آدمی کی چادر اڑالی تو اس نے ہوا پر لعنت کی اس پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تو اس پر لعنت نہ کر اس لیے کہ وہ اللہ کی جانب سے مامور ہے (یاد رکھئے) کہ جو آدمی ایسی چیز پر لعنت کرے جس کی وہ مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت اس کو کہنے والے ہی پر لوٹتی ہے۔"

مسئلہ:۔ کسی معین شخص کے بارے میں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی ہے اس پر لعنت جائز نہیں اگرچہ وہ فاسق ہی ہو، اسی اصول کی بناء پر یزید پر لعنت کرنے سے علامہ شامی نے منع کیا ہے، لیکن معین کافر پر جس کی موت کفر پر ہونے کا یقین ہو، مثلاً ابو جہل، ابو لہب پر جائز ہے (شامی، ج ۲ ص ۶۳۸)

جہاں تک یزید پر لعنت کا تعلق ہے ایک موقف جو دیوبندی اور کچھ علمائے اہل سنت کا تھا وہ علامہ شامی کا قول بیان کردیا لیکن کثیر علمائے اہل سنت یزید پر لعنت کے قائل ہیں اس پر شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری دام برکاتہم العالیہ نے زبردست تحقیق کی ہے وہ ان کی کتاب **اَلْقَوْلُ الْمَتِیْن فِی اِمْرِیَزِیْدَ اللَّعِیْن (یزید کے کفر اور اس پر لعنت کا مسئلہ؟) میں دیکھی جاسکتی ہے۔**

مسئلہ:۔ کسی کا نام لیے بغیر اس طرح لعنت کرنا جائز ہے کہ ظالموں پر یا جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

مسئلہ:۔ لغۃً لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے کے ہوتے ہیں، شرعاً کفار کے حق میں اس کے معنی اللہ کی رحمت سے بعید ہونے کے ہیں اور مومنین کے حق میں ابرار (صلحاء) کے درجہ سے نیچے گرنے کے ہیں (نقلہ الشامی عن القہتانی، ج ۲ ص ۶۳۸) اس لیے کسی مسلمان کے لیے اس کے نیک عمل کم ہوجانے کی دعا بھی جائز نہیں۔ (معارف)

آیت مبارکہ:

اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ﴿۵۳﴾

لغات القرآن:

[اَمْ : کیا] [لَھُمْ : ان کا] [نَصِیْبٌ: کوئی حصہ] [مِّنَ : سے] [الْمُلْکِ : سلطنت] [فَاِذًا : پھر اس وقت] [لَّا یُؤْتُوْنَ : نہ دیں] [النَّاسَ : لوگ] [نَقِیْرًا : تل برابر]

ترجمہ : کیاان کا سلطنت میں کچھ حصہ ہے ؟ اگر ایسا ہو تو یہ (اپنے بخل کے باعث) لوگوں کو تل برابر بھی (کوئی چیز) نہیں دیں گے

تفسیر و تشریح:

یہود کا یہ گمان تھا کہ پیغمبری ہماری میراث ہے جو ہر زمانہ میں ہمیں ہی ملنی چاہیے اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کو عار سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ آخر کار حکمت ہم کو ہی مل کر رہے گی۔ان کے اس دعویٰ کا رد فرمایا گیا کہ یہ ایسے بخیل ہیں کہ اگر یہ حاکم ہو جائیں تو یہ لوگوں کو تل برابر بھی خیرات نہ کریں گے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے گھرانے میں کتاب۔ علم اور عظیم ملک عطافرمایا وہ حسد و بغض کرتے ہیں جو جائز نہیں

فمنھم من امن بہ و منھم من صد عنہ۔ وکفی بجھنم سعیرا۔

پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے اس سے منہ پھیرا اور دوزخ بھڑکتی آگ کافی ہے۔ (حسنات)

نقیر

نقیر کھجور کی گٹھلی کے شگاف کا گڑھا۔ مراد حقیر چیز جیسے فتیل (دوانگلیوں کے درمیان بٹی ہوئی میل کی بتی یا ذرا سا بٹا ہوا دھاگا مگر مراد حقیر چیز ہوتی ہے) یعنی اگر ان کو حکومت و سلطنت کا کوئی حصہ مل جاتا تو انتہائی کنجوسی کی وجہ سے یہ لوگوں کو حقیر ترین ذرا سی چیز بھی نہ دیتے ایسی حالت میں اللہ ان کو سلطنت کیسے عنایت کر سکتا ہے۔ (مظہری)

(1)۔ نقیر : کھجور کی گٹھلی کے اوپر جو چھلکا ہوتا ہے، مراد حقیر ترین چیز، ذرہ بھر، رتی بھر۔

سو بات کی ایک بات کہ بنی اسرائیل بنی اسماعیل سے جلے بھنے ہیں :

پہلے دو باتیں جان لیں

1 ۔ نبوت اور حکومت میں تلازم ہے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں چنانچہ جب تک نبوت بنی اسرائیل میں رہی وہ حکومت کرتے رہے پھر جب نبوت بنی اسماعیل میں منتقل ہوئی تو حکومت بھی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔

2۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ابوالانبیاء ہیں ان کے بعد آسمانی کتابیں اور پیغمبری ان کی اولاد میں دائر ہوئی، سورۃ العنکبوت آیت نمبر 27 میں ہے "وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتب "اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب رکھ دی۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے آٹھ بیٹے تھے (قصص القرآن) کسی بیٹے کی تخصیص نہیں تھی سب ذریت کے لیے یہ انعام عام تھا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ایک بیٹے حضرت اسحاق (علیہ السلام) تھے ان کے بیٹے حضرت یعقوب (علیہ السلام) تھے ان کا لقب اسرائیل تھا ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی تھی عرصہ تک ان میں نبوت جاری رہی اور آسمانی کتابیں نازل ہوتی رہیں پھر دور آخر میں بنی اسماعیلؑ میں خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوئے اور ان پر اللہ کا کلام قرآن کریم نازل ہوا تو حکومت بھی ان کی طرف منتقل ہوگئی۔

یہی بات بنی اسرائیل کے لیے جلن کی وجہ بن گئی ان کے ایمان کے راستے کا روڑا بن گئی اب ان آیات پر یہود سے گفتگو مکمل ہو رہی ہے اور

ان آیات میں چار باتیں ارشاد فرمائی ہیں

1۔ حکومت پر کسی کی اجارہ داری نہیں اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے جس کو چاہیں حکومت دیں اللہ تعالیٰ نے پہلے حکومت بنی اسرائیل کو دی اب بنی اسماعیل کو تفویض کی ہے اگر حکومت پر بنی اسرائیل کا کچھ بھی اختیار ہوتا تو وہ کبھی اپنے اندر سے حکومت کو نکلنے نہ دیتے بنی اسماعیل کو رت بھر نہ دیتے، مگر ان کا کیا اختیار ہے سارا اختیار اللہ کا ہے وہ جس کو چاہیں نواز دیں،

2۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو اپنے فضل نبوت سے نوازا تو یہود جل کر کباب ہوگئے۔

4۔ اب کچھ یہودی تو اسماعیل نبی پر ایمان لائے ہیں اور کچھ اینٹھے ہوئے ہیں، وہ جہنم کی دہکتی آگ کا ایندھن بنیں گے۔ (ہدایت)

ابھی تو یہودیوں کے پاس کوئی اقتدار اور اختیار نہیں۔ اگر ان کے پاس اقتدار اور اختیار ہو تو یہ کسی کو دمڑی بھی نہ دیں اور نہ ہی کسی کو دم مارنے دیں۔ اہل کتاب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کے یتیم کو نبوت کا تاج اور قوموں کی قیادت کیوں عطا فرمائی ہے جو روز بروز عملاً غلبہ پا رہی ہے۔ یہ جس قدر چاہیں حسد کا مظاہرہ کریں۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں آپ کو عزت وعظمت، امامت و قیادت اور دین کو غلبہ دے گا۔ جس طرح ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کو امامت و حکومت اور نبوت عطا کی تھی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں پھینکنے اور وطن سے نکالنے والے بالآخر ناکام ہوئے تھے اسی طرح انجام کے لحاظ سے یہ بھی ناکام ہوں گے۔ چنانچہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بات لوگوں کو اس وقت بتلائی جب خندق کھودنے کے دوران کچھ صحابہ کو ایسی چٹان سے واسطہ پڑا جس کو توڑنا ان کے لیے مشکل ہوا۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں اس پریشانی کا اظہار کیا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر اتنے زور سے کدال ماری کہ پہلی اور دوسری ضرب پر پتھر سے چنگاریاں نکلیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میرے صحابہ خوش ہو جاؤ! اللہ تعالیٰ نے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی چابیاں مجھے عطا فرما دیں ہیں۔ [مسند احمد: کتاب اول مسند الکوفیین، باب حدیث البراء بن عازب]

رہی بات ان لوگوں کی جو آپ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ابراہیم (علیہ السلام) کی آل میں بھی ایسے لوگ رہے ہیں جنہوں نے حسد و بغض اور باہمی مخالفت کی بنیاد پر اپنے باپ دادا کے دین سے انحراف کیا تھا۔ یہ لوگ بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کے ساتھ نسبت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود آپ کی ذات اور دعوت سے انکاری ہیں۔ ایسے بغیض اور حاسدوں کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) اَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ: اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ) [رواہ ابوداوٗد: کتاب الادب، باب فی الحسد]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔"

(عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یُؤْتٰی بِاَنْعَمِ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ اَھْلِ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَیُصْبَغُ فِی النَّارِ صَبْغَۃً ثُمَّ یُقَالُ یَا ابْنَ آدَمَ ھَلْ رَاَیْتَ خَیْرًا قَطُّ ھَلْ مَرَّ بِکَ نَعِیْمٌ قَطُّ فَیَقُوْلُ لَا وَاللّٰہِ یَا رَبِّ وَیُؤْتٰی بِاَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِی الدُّنْیَا مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیُصْبَغُ صَبْغَۃً فِی الْجَنَّۃِ فَیُقَالُ لَہٗ یَا ابْنَ آدَمَ ھَلْ رَاَیْتَ بُؤْسًا قَطُّ ھَلْ مَرَّ بِکَ شِدَّۃٌ قَطُّ فَیَقُوْلُ لَا وَاللّٰہِ یَا رَبِّ مَا مَرَّ بِیْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَاَیْتُ شِدَّۃً قَطُّ) [رواہ مسلم : کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب صبغ انعم اہل الدنیا فی النار وصبغ اشدھم بؤسا فی الجنۃ]

"حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا روز قیامت دنیا میں سب سے زیادہ ناز و نعمت میں پلنے والے جہنمی کو لا کر آگ میں غوطہ دیا جائے گا پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تو نے کبھی کوئی خیر دیکھی؟ کیا کبھی تجھے کوئی نعمت میسر ہوئی؟ تو وہ کہے گا نہیں اللہ کی قسم! میرے رب میں نے کوئی نعمت نہیں دیکھی۔ پھر ایک جنتی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ تکلیفوں میں رہا اسے جنت میں داخل کر کے پوچھا جائے گا اے ابن آدم! کیا تو نے کبھی کوئی تکلیف اور سختی دیکھی تو وہ جواباً کہے گا نہیں اللہ کی قسم! مجھے کبھی کوئی تکلیف اور مصیبت نہیں آئی۔" (فہم)

مسائل

١۔ آدمی کو حسد سے بچنا چاہیے۔

٢۔ یہودی بدترین قسم کے بخیل ہوتے ہیں۔

٣۔ یہودی دوسروں پر حسد کرتے ہیں۔

٤۔ اہل کتاب لوگوں کو ہدایت سے روکتے ہیں۔

٥۔ لوگوں کو ہدایت سے روکنے والے جہنم میں جائیں گے۔

آیت مبارکہ:

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ﴿٥٤﴾

لغات القرآن: [اَمْ : یا] [یَحْسُدُوْنَ : وہ حسد کرتے ہیں] [النَّاسَ : لوگ] [عَلٰی : پر] [مَآ اٰتٰھُمُ : جو انہیں دیا] [اللّٰہُ : اللہ] [مِنْ : سے] [فَضْلِہٖ : اپنا فضل] [فَقَدْ اٰتَیْنَآ : سو ہم نے دیا] [اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ : آل ابراہیم] [الْکِتٰبَ : کتاب] [وَالْحِکْمَۃَ : اور حکمت] [وَاٰتَیْنٰھُمْ : اور انہیں دیا] [مُّلْکًا : ملک] [عَظِیْمًا : بڑا]

ترجمہ : کیا یہ (یہود) لوگوں (سے ان نعمتوں) پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں، سو واقعی ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ہم نے انھیں بڑی سلطنت بخشی

تفسیر و تشریح : حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) کی روز افزوں عظمتیں اور کامیابیاں دیکھ کر یہود مدینہ حسد سے جل اٹھے اور کہنے لگے کہ نبوت اور دنیاوی سلطنت جمع نہیں ہو سکتیں کیونکہ حکومتی معاملات فرائض نبوت کی انجام دہی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔اس پر یہ آیات نازل ہوئی کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے حضرت داؤد (علیہ السلام)، حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کو بھی نبوت اور سلطنت دونوں عطا کی گئیں اور انھوں نے نبوت کے فرائض پورے پورے ادا کیئے۔ (تفسیر خازن)

یہ لوگ اس سے قبل اپنی کتابوں میں حضور کی بعثت آپ کے اوصاف، اور آپ کی نبوت کے حالات کے متعلق پڑھا کرتے تھے۔
بلکہ یہ لوگ آخری نبی کی بعثت پر عربوں کو قتل کی دھمکی دیتے تھے اس لیے کہ ان کے خیال میں عرب کے لوگ اس نبی کی پیروی پر تیار ہونے والے نہیں تھے نیز ان کا یہ بھی گمان تھا کہ اس نبی کی بعثت بنی اسرائیل میں ہوگی، لیکن جب اللہ نے حضور کی بعثت بنواسماعیل میں کردی تو ان لوگوں نے ایک طرف عربوں سے حسد کرنا شروع کردیا اور دوسری طرف حضور کی تکذیب پر کمربستہ ہوگئے اور جن حقائق کا انھیں اپنی کتابوں کے ذریعے علم ہوا تھا ان سے صاف مکر گئے۔
چنانچہ ارشاد باری ہے (وکانوا من قبل یستفحوان علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عرفوا کفروبہ)، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ نیز ارشاد باری ہے، (ود کثیر من اھل الکتاب لویردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم، اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں۔اپنے نفس کے حسد کی بناپر تمہارے لیے ان کی یہ خواہش ہے)۔
عربوں کے ساتھ یہودیوں کی عداوت اور دشمنی حضور کی بعثت کے وقت سے ہی ظاہر ہوگئی تھی، اس دشمنی کی بنیاد پر اس حسد پر تھی کہ حضور کی بعثت عربوں میں کیوں ہوئی بنی اسرائیل میں کیوں نہیں ہوئی۔اسی بناپر مقولہ ہے، تم ہر شخص کو راضی کرسکتے ہو لیکن حاسد کو راضی نہیں کرسکتے کیونکہ وہ تو صرف نعمت کے زوال اور اس کے چھن جانے پر ہی راضی ہوسکتا ہے، حسد کے مقابلے میں غبطہ مذموم نہیں ہے جس میں کسی نعمت کی تمنا کی جائے لیکن دوسرے سے اس نعمت کے چھن جانے کی خواہش کا پہلو نہ ہو بلکہ اس کے ہاں اس نعمت کی بقاء پر اس تمنا کرنے والے کو خوشی اور سرور محسوس ہوتا ہو۔ (احکام القرآن جصاص)

حسد کی تعریف، حکم اور اس کی مضرتوں کا بیان

علامہ نووی شارح مسلم، حسد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔ الحسد تمنی زوال النعمۃ (مسلم ج ۲) یعنی دوسرے آدمی کی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا حسد کہلاتا ہے۔ "اور یہ حرام ہے۔

"تم آپس میں بغض اور حسد نہ کرو اور نہ ہی ایک دوسرے سے پشت پھیرو بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بن جاؤ اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لیے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔

""حضرت زبیر نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہ تمہاری طرف (بھی) پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے اور وہ حسد ہے اور بغض ایسی خصلت ہے جو مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔" (معارف)

یہود حسد کے مریض تھے

یہود کی دشمنی کا اصل سبب یہ ہے جسے اس آیت میں منکشف فرمایا گیا ہے کہ ان کی تمام فتنہ پروری اور ان کی مسلمان دشمنی پر مبنی یہ تمام حرکتیں اور سازشیں اس سبب سے ہیں کہ ان کے اندر کے حسد کی آگ انھیں چین نہیں لینے دیتی۔ حسد زوال نعمت کی تمنا کرنے کو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی شخص کو کسی کمال سے نوازا ہے، کسی نعمت سے مالا مال کیا ہے، کوئی خاص اس پر کرم فرمایا ہے، تو دوسرا آدمی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب اس سے چھن جائے۔ اور یہ بالکل قلاش، نادار، اور حقیر آدمی ہو کر رہ جائے۔ اس خواہش کا نام "حسد" ہے۔ اگر تو صرف یہ خواہش ہو کہ جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے وہ اس کے پاس بھی رہے اور مجھے بھی پروردگار عطا فرمائے تو اسے رشک کہتے ہیں۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن دوسرے کی نعمت پر جلنا اور اس کے زوال کی دعائیں یا تدبیریں کرنا یہ وہ کمینگی ہے جسے حسد کہا جاتا ہے اور جو اسلام کی نگاہ میں بدترین حرکت ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب

(تم حسد سے بچو اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے)

حسد ایک ایسی کمینی عادت ہے کہ جس میں مبتلا شخص دوسروں کا کچھ بگاڑے یا نہ بگاڑے لیکن اپنا کردار اپنی صحت اور اپنا سکون ضرور غارت کر لیتا ہے۔ اس کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ ٹھیک کہا کسی نے۔

حسد کی دنیا بری ہے اس کا ثمرہ بھی برا۔ اس مرض والے کی یکساں ہے حیات اور موت بھی۔

یہود قوم اپنی اسی جبلت کے باعث صدیوں سے عبرت کا مرقع بنی ہوئی ہے۔ اس کی تمام کاوشیں ڈیڑھ ہزار سال سے دوسروں کی تباہی اور بربادی پر صرف ہو رہی ہیں جو اس کا رویہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں تھا وہی آج بھی ہے۔ اسی رویے کے باعث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ انھیں زعم یہ تھا کہ نبوت بنی اسرائیل کا حق ہے، یہ جب بھی آتی ہے یا آئے گی بنی اسرائیل کے ہاں آئے گی۔ گویا وہ نبوت کو اپنی میراث سمجھتے تھے اور اس پر اپنا اختیار گمان کرتے تھے کہ یہ ہمارے ارادے اور اختیار کے بغیر کسی کو نہیں مل سکتی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک امی شخص کو جس کا تعلق آل اسماعیل سے تھا اس عظیم منصب سے بہرہ ور فرمایا تو انھیں آگ لگ گئی اور یہ صدمہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے من حیث القوم یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اس نبی کی نبوت چلنے نہیں دیں گے۔ میں گزشتہ کسی جگہ حضرت صفیہ (رض) کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ ان کے والد نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ یقیناً وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے لیکن اس کے باوجود جب تک میری جان میں جان ہے میں ان کی نبوت چلنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ اسی حسد کے باعث انھوں نے اپنی قومی زندگی کو تباہ کیا۔ دو قبیلوں کو مدینے سے نکلنا پڑا تیسرا قتل کے گھاٹ اتر گیا۔ دور فاروقی میں بالآخر انھیں جزیرہ عرب سے بھی نکال دیا گیا۔ لیکن ان کے حسد کی آگ برابر بھڑکتی رہی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت

کریمہ میں فرمارہے ہیں کہ تم اگر اس حسد کی آگ میں جلنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو جلتے رہو ہم نے توآل ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی دے دی اور انھیں ملک عظیم سے بھی نواز دیا۔

یہود اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت اور حکومت کتاب اور نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی قوم میں نبی اور رسول بھیجتے ہیں اور پھر انھیں کتاب اور حکمت سے نوازتے ہیں تو وہ قوم اگر رسول کے ہاتھ پر ایمان لاکر اور کتاب الٰہی کے احکام کے مطابق عمل کر کے اپنے آپ کو حزب اللہ بنالیتی ہے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ایسی امت کو حکومت اور سلطنت بھی عطا کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مختلف ادوار اس حقیقت کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ یہود مسلمانوں کی مخالفت صرف اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ وہ ایک نئی نبوت کو کیوں مان رہے ہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس نبوت اور کتاب کے نتیجے میں مسلمانوں کو ایک ایسا اقتدار ملنے والا ہے جس کے بعد ہمارا زوال اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔

آل ابراہیم سے کون مراد ہے؟

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کتاب و حکمت اور ملک عظیم دینے کا جو اعلان فرمایا ہے وہ آل ابراہیم کے لیے ہے اور آل ابراہیم جس طرح آل اسماعیل ہیں اسی طرح آل اسحاق اور بنی اسرائیل بھی ہیں۔ تو پھر اس میں مسلمانوں یا آل اسماعیل کی تخصیص کا کیا معنی ہے؟ گر ان آیات پر معمولی تدبر سے بھی کام لیا جائے تو اس اعتراض کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ ذرا غور فرمائیے! ان آیات میں تنقید کس پر ہو رہی ہے؟ اور ان تمام تنبیہات کا ہدف کون ہے؟ ظاہر ہے وہ بنی اسرائیل ہیں۔ انھیں سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ تم اپنے حسد اور بغض کی آگ میں جلتے ہو تو جلتے رہو ہم نے توآل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم سے نواز دیا ہے۔ جن کو یہ تنبیہ کی جارہی ہے اور جنھیں سرزنش کی جارہی ہے کیا یہ نعمتیں بھی انھیں دی جارہی ہیں؟ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو چکا ہو۔ بنی اسرائیل تو اس تنقید اور سرزنش کے باعث اس نعمت سے محروم ہو گئے اور آل ابراہیم کا دوسرا حصہ صرف آل اسماعیل ہے تو خود بخود یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ یہاں آل ابراہیم سے آل اسمٰعیل ہی مراد ہیں۔

علاوہ ازیں! گزشتہ آیت سے پیوستہ آیت میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر لعنت فرمائی ہے۔ اور لعنت کا مفہوم کیا ہے؟ اللہ کی رحمت اور نعمت سے دور کر دینا"۔ تو جس قوم کو دو آیتیں پہلے رحمت سے دور کر دیا گیا اور وہ لعنت کی مورد ٹھہری ہے کیا اب کتاب و حکمت اور ملک عظیم اسے دیا جائے گا؟ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر خود بخود یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آل ابراہیم سے مراد اس آیت کریمہ میں آل اسماعیل ہیں۔

مزید برآں! یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی بجائے ہمیشہ حضرت اسحاق سے ہی منسوب کیا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ ابراہیم کی اولاد اسحاق کے نام سے پکاری جائے گی۔ اس کے برعکس اہل عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے اس انتساب پر فخر کیا اور اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا وارث سمجھا۔ اور وہ یہ بھی بجا طور پر دعویٰ کرتے تھے کہ ہم جس گھر کے مجاور ہیں اسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بنایا تھا اور جس شہر کے رہنے والے ہیں وہ شہر حضرت ابراہیم کی دعاؤں سے بسا تھا اور ایک مدت تک ان کا مسکن رہا۔ یہ تمام واضح شہادتیں ہیں جس سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہاں آل ابراہیم سے مراد اہل عرب، آل اسماعیل اور قریش ہیں۔ (روح)

فوائد

1۔اس سے معلوم ہوا کہ ایمان، تقوی، نبوت اللہ کا فضل ہے اس میں کسی کی شیخی نہیں۔

2۔اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ نبوت اور علم دین اللہ کی بڑی ہی نعمت ہیں کہ رب نے حضرت ابراہیم کے فضائل میں اس کا ذکر فرمایا۔ دوسرے یہ کہ نبوت حضرت ابراہیم کے بعد ان کی اولاد میں خاص کر دی گئی کہ کوئی غیر ابراہیمی نبی نہ ہوا۔ للہذا مرزا قادیانی نبی نہیں کیونکہ وہ سید نہیں بلکہ مغل تھا تیسرے یہ کہ بزرگوں کی اولاد ہونا اور اعلی خاندان سے ہونا بھی خدا کی نعمت ہے۔ دیکھو حضور کے بعد خلافت قریش سے مخصوص کر دی گئی کہ فرمایا الخلافۃ فی القریش بلکہ صواعق محرقہ میں ہے کہ قطب الاقطاب ہمیشہ سید ہی ہو گا امام مہدی سیدوں میں سے ہوں گے۔

3۔دنیاوی سلطنت جیسے حضرت یوسف و داؤد سلیمان علیہم السلام۔ کہ اللہ نے انھیں نبوت اور سلطنت دونوں بخشیں۔ ایسے ہی اگر ہم نے اپنے محبوب کو نبوت و سلطنت بخشی تو کو کیوں برا لگا۔ (نور)

آیت مبارکہ:

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

لغات القرآن:[فَمِنْهُمْ : پھر ان میں سے] [مَّنْ اٰمَنَ : کوئی ایمان لایا] [بِهٖ : اس پر] [وَمِنْهُمْ : اور ان میں سے] [مَّنْ : کوئی] [صَدَّ : رکا رہا] [عَنْهُ : اس سے] [وَكَفٰى: اور کافی] [بِجَهَنَّمَ : جہنم] [سَعِيْرًا : بھڑکتی ہوئی آگ]

ترجمہ : پس ان میں سے کوئی تو اس پر ایمان لے آیا اور ان میں سے کسی نے اس سے رو گردانی کی، اور (رو گردانی کرنے والے کے لئے) دوزخ کی بھڑکتی آگ کافی ہے

تفسیر و تشریح : ربِّ کریم عَزَّوَجَلَّ کا فضل جاری وساری رہا، اس نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سر پر رسالت کا تاج سجایا، کتاب عطا فرمائی اور انھیں عزت و غلبہ سے نوازا۔ پھر کسی کو تو ایمان لانے کی توفیق مل گئی جیسے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) اور ان کے ساتھ والے ایمان لے آئے اور کئی محروم رہے جیسے کعب بن اشرف وغیرہ۔ تو جو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان نہ لایا اس کیلئے جہنم کی بھڑکتی آگ کافی ہے۔ (صراط)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر یا ان کی آل میں سے جو انبیاء اور رسول علیہم السلام مبعوث ہوئے ان پر سب لوگ ایمان نہیں لائے ،بعض ایمان لائے اور بعض ایمان نہیں لائے تو بعض کا ایمان نہ لانا حضرت ابراہیمؑ کی نبوت اور ان کی نسل میں سے دوسرے

انبیاءؑ کی نبوت کے لیے موجب نقصان نہیں ہے تو اگر کچھ لوگ آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تو اس سے آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت میں کیا فرق پڑے گا۔ (تبیان)

یہاں آل اسماعیل مراد ہیں

اس آیت کریمہ کا تعلق آل اسماعیل سے ہے۔آل اسماعیل میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوا جنھیں ہم اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ مکہ معظّمہ سے آنے والے مہاجرین بھی ہیں اور مدینہ منورہ کے انصار بھی اور یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کی نشرواشاعت اس کی حفاظت اس کے غلبے یاباآخر نظام زندگی کے طور پر اس کے نفاذ کی ایک ایک ذمہ داری کو ادا کیا اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ابھی تک اس سے منہ موڑے ہوئے ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ان منہ موڑنے والوں میں بہت سے لوگ اسلام کی آغوش میں آجائیں گے اور وہی لوگ آئندہ اسلامی تحریک اور اسلامی انقلاب کے لیے قوت ثابت ہوں گے۔ لیکن جو لوگ آخر حد تک اسلام کی دولت سے محروم رہیں گے یا تو وہ جزیرہ عرب سے نکل بھاگیں گے یا ختم ہو جائیں گے۔ ان بد نصیبوں اور محروموں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب اس کا رسول اس قوم پر جس کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے، اتمامِ حجت کر دیتا ہے اور وہ قوم پھر بھی نہیں مانتی تو اللہ تعالیٰ بالعموم اس قوم پر عذاب بھیج کر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ ان کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔ ان پر عذاب نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر جانے کے بعد بھی قبول اسلام کا سلسلہ رکا نہیں۔ دھیرے دھیرے لوگ اسلام کی آغوش میں اترتے چلے گئے لیکن فتح مکہ کے بعد جن لوگوں کو اسلام کی دولت نصیب نہ ہوسکی وہ یا تو تحلیل ہوگئے یا ملک چھوڑ گئے۔ دنیا میں تو یہ اللہ کے عذاب سے بچے رہے کیونکہ یہ اسلام کا راستہ نہ روک سکے اور ان کی انفرادی سرکشی اور غیر موثر مخالفت کے باوجود دنیا میں چھوٹی موٹی سزا ان کو دینا ضروری نہیں سمجھا گیا اس لیے فرمایا کہ ان کے لیے آخرت کی سزا کافی ہے اور وہ ایک ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے کہ جس کے بعد کسی اور سزا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی سزا کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔ (روح)

یہ اسی بیان کا تتمہ ہے کہ باوجود اس کے ہم نے خاندان ابراہیم (علیہ السلام) کو خصوصاً نسل اسحاق واسرائیل کو کتاب یعنی ظاہر شریعت وحکمت یعنی علم اسرار اور ملک عظیم یعنی قدرت دی تھی۔ اس پر بھی ان میں سے کچھ لوگ تو خداپرست تھے اور کچھ منکر اور مخالف رہے (جیسا کہ تاریخ بنی اسرائیل سے واضح ہوتا ہے) پھر جب ان کا اپنے ایسے انبیاء کی نسبت یہ حال تھا تو اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی نسبت انکار اور نکتہ چینی جس قدر ہو وہ اس بدبخت قوم کے حسد کے خیال سے کچھ بھی زیادہ نہیں ہم ایسے بدبختوں کو جہنم میں جلاویں گے۔ جس طرح دنیا میں آتش حسد اور عناد میں یہ نئے نئے رنگ بدلتے ہیں اسی طرح عالم آخرت میں ان کے عذاب کی صورت ہوگی کہ جب آگ سے ایک جلد جل جاوے گی تو دوسری جلد یعنی چمڑی اور پیدا ہو جاوے گی۔ اس سے یہ غرض ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ (اگر وہ جہنم میں ڈالے جاویں گے۔ آخر وہ آگ ہے گھڑی دو گھڑی میں جل بھن کر مر جاویں گے۔ یہ تکلیف منقطع ہو جاوے گی) بلکہ وہ جہنم میں ہمیشہ جلتے رہیں گے اور ایک جسم کے بعد پھر وہی جلنے کے لیے مبدئ غیب سے پیدا ہوگا تا کہ پورا عذاب چکھیں اور اس زندگی کو کوئی طبیب محال اور فانی نہ سمجھے بلکہ یہ سب ممکن اور اس کے قبضہ قدرت

میں ہے کیونکہ ان اللّٰہ کان عزیزا حکیما کہ وہ زبردست بھی ہے یعنی قادر مطلق ہے اور تادیر قائم رہنے کی اس کو سینکڑوں تدبیریں معلوم ہیں کیونکہ وہ حکیم ہے۔

قرآن کی عادت ہے کہ جہاں کہیں مخالفوں کے لیے عذاب وغیرہ عقوبات دنیا وآخرت بیان کئے ہیں۔اس کے ساتھ ہی مطیع لوگوں کے لیے ثواب اور جنت کے نعماء بھی بیان ہوتے ہیں تاکہ مخاطب کے لیے کامل ترغیب وترہیب حاصل ہو کر عذاب سے ڈر کر ثواب پر نظر کر کے دنیا اور اس کے لذائذ فانیہ سے نفرت اور نیک روی اور عالم باقی کا شوق دل میں پیدا ہو۔ یہاں ان کے لیے کہ جو ایمان لا کر اچھے کام کرتے ہیں۔ یہ وعدہ ہے کہ ہم ان کو ایسے باغوں میں (نہ دنیا کے باغ بلکہ عالم قدس کے باغوں میں) بسادیں گے کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور یہ عیش ان کے لیے دنیا کے عیش کی طرح یا عالم شباب کی طرح چند روزہ نہ ہوگا بلکہ دائمی اور وہاں ان کے لیے انس کے لیے عالم قدس کی بیویاں بھی ہوں گی اور دراز سایہ میں رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جنت میں دور تک درخت متصل ہوں گے۔اس لیے ان کا سایہ بھی دراز ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ سایہ دراز سے خدا کی مہربانی اور دائمی عنایت مراد ہے جو اس کے تقرب کی طرف اشارہ ہے۔(حقانی)

اعجاز قرآنی کا ایک نمونہ ومظہر

سو اس سے واضح فرمادیا گیا کہ درد والم کا تعلق صرف ظاہری جسم اور کھال سے ہوتا ہے سو یہ قرآن حکیم کے اعجاز کا ایک اور نمونہ ومظہر ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ درد والم کے احساس کا اصل تعلق جلد اور کھال ہی سے ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کی کھالیں بدلی جاتی رہینگی، تاکہ یہ عذاب کا مزہ برابر چکھتے ہی رہیں۔ والعیاذ باللہ۔اس بات کا علم سائنسی ایجاد وتحقیق کو اب کہیں جا کر ہوا ہے، کہ درد والم اور احساس کا تعلق ظاہری جسم اور کھال سے ہی ہوتا ہے، لیکن قرآن حکیم نے پندرہ سو سال قبل اس کی خبر کر دی تھی۔ سُبحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔ بہر کیف اس ارشاد سے ایک طرف تو اس حقیقت کو آشکارا فرمادیا گیا کہ کافروں اور منکروں کو ایک بڑی ہی ہولناک اور دہکتی بھڑکتی آگ میں داخل کیا جائے گا اور دوسرے نمبر پر اس حقیقت کو بھی واضح فرمادیا گیا کہ جب بھی ان کی کھالیں جل کر ختم ہو جائیں گی ان کو نئی کھالیں پہنا دی جائیں گی تاکہ یہ بدبخت عذاب کا مزہ برابر اور لگاتار چکھتے رہیں۔ پھر کھالوں کی یہ تبدیلی حقیقت پر بھی محمول ہو سکتی ہے کہ حقیقتاً ان کی کھالوں کو نئی کھالوں سے بدل دیا جائے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی صفت کو تبدیل کر دیا جائے۔ (محاسن التاویل)۔ بہر کیف اہل کفر و باطل وہاں پر ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ والعیاذ باللہ جل وعلا۔

آیت مبارکہ:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾

لغات القرآن: [اِنَّ : بیشک] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ] [کَفَرُوْا : کفر کیا] [بِاٰیٰتِنَا : ہماری آیتوں کا] [سَوْفَ : عنقریب] [نُصْلِیْهِمْ : ہم انہیں ڈالیں گے] [نَارًا : آگ] [کُلَّمَا : جس وقت] [نَضِجَتْ : پک جائیں گی] [جُلُوْدُهُمْ : ان کی کھالیں] [بَدَّلْنٰهُمْ : ہم بدل دیں گے] [جُلُوْدًا : کھالیں] [غَیْرَهَا : اس کے علاوہ] [لِیَذُوْقُوا : تاکہ وہ چکھیں] [الْعَذَابَ : عذاب] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [کَانَ : ہے] [عَزِیْزًا : غالب] [حَکِیْمًا : حکمت والا]

ترجمہ : بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کفر کیا ہم عنقریب انھیں (دوزخ کی) آگ میں جھونک دیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم انھیں دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ (مسلسل) عذاب (کامزہ) چکھتے رہیں، بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے

تفسیر و تشریح : پہلے بھی عرض کیا ہے کہ قرآن مجید کا یہ مستقل اسلوب ہے کہ برے لوگوں کے مقابلے میں نیک لوگوں کا اور جہنم کی سزاؤں کے مقابلے میں جنت کی عطاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ تاکہ قرآن کی تلاوت کرنے والا اپنے انجام کا موقع پر ہی فیصلہ کر سکے۔ چنانچہ جو لوگ کفر کی حالت میں کوچ کریں گے وہ مرنے کے بعد جہنم کے گھاٹ اتریں گے۔ جہاں ان کو آگ میں جلایا جاتا رہے گا۔ جب ان کی چمڑیاں جل جائیں گی تو سزا کے لیے ان کے جسموں کو بار بار تبدیل کیا جائے گا تاکہ ان کو پوری پوری سزا مل سکے۔ وہ جہنم سے بھاگ سکیں گے اور نہ ہی جل کر راکھ ہوں گے۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ضِرْسُ الْکَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَغِلَظُ جِلْدِهٖ مَسِیْرَةُ ثَلَاثٍ)

[رواہ مسلم : کتاب الجنتہ، باب النار یدخلھا الجبارون والجنتہ یدخلھا الضعفاء]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کافر کی ڈاڑھ احد پہاڑ کے برابر اور اس کی جلد تین دن کی مسافت کے مساوی موٹی ہوگی۔"

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَا بَیْنَ مَنْكِبَیِ الْكَافِرِ مَسِیْرَةُ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ لِلرَّاكِبِ الْمُسْرِعِ)

[رواہ البخاری: کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار]

"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا کافر کے دونوں کندھوں کا درمیانی فاصلہ تیز ترین گھوڑے کے تین دن دوڑنے کے برابر ہوگا۔"

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ نَارُكُمْ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِیْنَ جُزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَتْ لَكَافِیَةً قَالَ فُضِّلَتْ عَلَیْهِنَّ بِتِسْعَةٍ وَّسِتِّیْنَ جُزْءًا كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا) [متفق علیہ: وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِیِّ] وَفِیْ رِوَایَةِ مُسْلِمٍ نَارُكُمُ الَّتِیْ یُوْقِدُ ابْنُ اٰدَمَ وَفِیْهَا عَلَیْهَا وَكُلُّهَا بَدَلَ عَلَیْهِنَّ وَكُلُّهُنَّ۔

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہاری آگ، دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک ہے آپ سے عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! جلانے کو تو دنیا کی آگ ہی کافی تھی۔ آپ نے فرمایا دوزخ کی آگ کو دنیا کی آگ سے انہتر ڈگری بڑھا دیا گیا ہے۔ ہر ڈگری دنیا کی آگ کے برابر ہوگی۔ (بخاری ومسلم) یہ بخاری کے الفاظ ہیں اور مسلم کی روایت میں ہے "کہ تمہاری آگ جسے ابن آدم جلاتا ہے۔ نیز اس میں عَلَیْهِنَّ وَكُلُّهُنَّ کی بجائے عَلَیْهَا وَكُلُّهَا کے الفاظ ہیں۔"

(عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَّنْ لَّهٗ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَّارٍ یَغْلِیْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا یَغْلِی الْمِرْجَلُ مَا یَرٰی اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَّاِنَّهٗ لَاَهْوَنُهُمْ عَذَابًا)

[رواہ مسلم: کتاب الایمان، باب اہون اہل النار عذابا]

"حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ یقیناً دوزخیوں میں سب سے معمولی عذاب پانے والے کے پاؤں میں آگ کے جوتے اور تسمے ہوں گے۔ جس کی وجہ سے اس کا دماغ ہنڈیا کی طرح کھول رہا ہوگا۔ وہ یہ خیال کرے گا کہ کسی دوسرے شخص کو اس سے زیادہ عذاب نہیں ہو رہا، حالانکہ وہ سب سے ہلکے عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

عذاب، روح اور جسم دونوں پر ہونے کی دلیل

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سے پیچھے رہ گئے، آپ ہم سے آملے اس وقت ہم نے نماز میں تاخیر کردی تھی، ہم نے وضوء کیا اور پیروں پر مسح کرلیا، تو آپ نے دو یا تین مرتبہ بلند آواز سے فرمایا: (خشک) ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہوگا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ٦٠)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ آگ دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت کو لوٹ جاؤ پس وہ لوٹ جائیں گے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہنم کا عذاب کس قدر ہولناک، کس قدر تکلیف دہ اور کس قدر شدید ہوگا اور اس شدت پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جو جہنم کا خالق ہے وہ عزیز اور زبردست ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے اور جیسا چاہے پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اس نے دنیا کی آگ

میں جو جلن رکھی ہے انسان کے لیے وہ بھی نا قابل برداشت ہے اور جہنم کی آگ میں جلن کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بخاری کی روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

(اہلِ جہنم میں سب سے کم عذاب کے اعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چنگاریاں ہوں گی جس کی وجہ سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولتا ہوگا) (روح)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روح اور بدن دونوں کو عذاب ہوتا ہے۔

امت کے تمام متقدمین اور ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ عذاب روح اور بدن دونوں کو ہوتا ہے۔ (لوامع الانوار ج ۲ ص ۲۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت '۱۴۱۱ھ)

عذاب جسم اور روح دونوں کو ہوتا ہے اس سلسلہ میں علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے علامہ سفیری کی شرح بخاری سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن روح اور بدن میں بحث ہوگی 'روح جسم سے کہے گی کہ گناہ تم نے کیے ہیں میں تو ایک ہوا کی مانند تھی اگر تم نہ ہوتے تو میں کوئی عمل نہیں کرسکتی تھی 'اور جسم کہے گا تم نے مجھے کام کرنے کا حکم دیا تھا اگر تم نہ ہوتیں تو میں درخت کے تنے کی طرح ہوتا اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کو کبھی حرکت نہ دیتا 'تب اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ایک فرشتہ بھیجے گا وہ کہے گا تم دونوں کی مثال ایک لنجے اور ایک اندھے کی ہے یہ دونوں ایک باغ میں گئے لنجے نے اندھے سے کہا میں یہاں پھل دیکھ رہا ہوں لیکن ان کو توڑ نہیں سکتا 'تو اندھے نے کہا تم مجھ پر سوار ہو جاؤ پھر جہاں پھل ہوں تو دیکھ کر توڑ لینا 'سو دونوں مجرم ہیں اور دونوں سزا کے مستحق ہی لنجابہ منزلہ روح ہے اور اندھا بمنزلہ جسم ہے۔

مسائل

۱۔ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرنے والوں کو جہنم میں جلایا جائے گا۔

۲۔ ان کی کھالوں کو بار بار بدلا جائے گا تاکہ ان کو پوری پوری سزا مل سکے۔

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ حضور کا انکار رب کی تمام آیتوں کا انکار ہے اور انکار ہے اور انکار کا انجام نار ہے۔

2: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ اگرچہ دوزخ کی آگ کافر کے ہر عضو پر پہنچے گی مگر صرف کھال جلے گی۔ رب فرماتا تطلع علی الافئدۃ۔ دوسرے یہ کہ اتنی سخت آگ میں رہنے کے باوجود انھیں موت نہ آوے گی۔ بلکہ ہر بار کھال پکنے کے بعد دوسری کھال ایسے بن جاوے گی جیسے آج چھالے کے نیچے نئی کھال تیار ہو جاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کا عذاب کافروں کو ہوگا مومن گناہ گار کے عذاب کی نوعیت یہ نہ ہوگی۔

3: یہ کہ وہ ہر قسم کے عذاب دینے پر قادر ہے اور ہر عذاب میں اس کی حکمت ہے، وہ اس پر قادر ہے کہ ایسی سخت آگ میں رہ کر بھی کافر کو موت نہ آئے۔ دیکھو کہ زمین میں لوہے بلکہ فولاد کو دفن کردو تو اسے گلا کر فنا کر دیتی ہے مگر دانہ کو فنا نہیں کرتی۔ یہ اس کی قدرت ہے۔

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

لغات القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [وَعَمِلُوا : اور انہوں نے عمل کیے] [الصّٰلِحٰتِ : نیک] [سَنُدْخِلُهُمْ : عنقریب ہم انہیں داخل کریں گے] [جَنّٰتٍ : باغات] [تَجْرِيْ : بہتی ہیں] [مِنْ تَحْتِهَا : ان کے نیچے] [الْاَنْهٰرُ : نہریں] [خٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہیں گے] [فِيْهَآ : اس میں] [اَبَدًا : ہمیشہ] [لَهُمْ : ان کے لیے] [فِيْهَآ : اس میں] [اَزْوَاجٌ: بیبیاں] [مُّطَهَّرَةٌ: پاک ستھری] [وَّنُدْخِلُهُمْ : اور ہم انہیں داخل کریں گے] [ظِلًّا : چھاؤں] [ظَلِيْلًا : گھنی]

ترجمہ : اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ہم انھیں بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو بہت گھنے سائے میں داخل کریں گے (عرفان)

تفسیر و تشریح:

کافروں کے عذاب اور جہنم کے ذکر کے بعد ایمان والوں پر کرم نوازیوں اور جنتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ قرآن پاک کا ایک انداز ہے کہ کافروں کے افعال و عذاب کے ذکر کے ساتھ اہل ایمان کے اعمال و جزا کا ذکر عموماً ہوتا ہے۔ چنانچہ مومنوں کے متعلق فرمایا کہ انھیں باغوں میں داخل کیا جائے گا جہاں انھیں پاکیزہ بیویاں ملیں گے اور وہاں دھوپ نہیں ہو گی بلکہ رب کریم عَزَّوَجَلَّ کے نور کی تجلّی کی روشنی ہو گی اور درخت ہوں گے اور ایسی رحمت ہو گی کہ اس کی راحت و آسائش انسانی فہم اور بیان سے بالاتر ہے۔ (صراط)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ اسلوب ہے کہ وعد کے بعد وعید یا وعید کے بعد وعد کا ذکر فرماتا ہے ' اس لیے پہلے آخرت میں کفار کے عذاب کا ذکر فرمایا تھا اور اب آخرت میں مومنوں کے ثواب کا ذکر فرمایا۔ (تبیان)

جو لوگ ایمان لائے اور صالح کردار کے حامل ہوئے جو نہی وہ دنیا کے امتحانات سے نکل کر عالم عقبیٰ میں پہنچیں گے ان کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن میں نہریں اور آبشاریں چلتی ہوں گی۔ صاحب ایمان اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں نہایت پاک و صاف، وفادار اور جانثار بیویاں ہوں گی۔ انھیں سر سبز و شاداب اور لہلہاتے ہوئے باغوں کے گھنے سایوں میں داخل کیا جائے گا۔

جنت۔ ایسے باغ جن میں گھنے درخت ہو یہ ابدی نعمت ہے کبھی اس کو زوال نہ ہو گا۔

ازواج مطھرۃ۔ یعنی ایسی پاک بیویاں جو ہر نجاست و گندگی اور نفرت والی چیزوں سے پاک ہیں۔ اور سایہ ہی سایہ ایسا کہ جس کی رحمت وآسائش فہم وادراک کے احاطہ سے بالاتر ہے۔

ظلاظلیلا۔ وہاں سورج کی تپش نہ ہو گی ایمان والے چین وآرام کی زندگی پائیں گے (حسنات)

جنت کی بیویوں کی عظمت شان کا ایک پہلو

کہ ان کو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک کر دیا گیا ہو گا۔ سو "طاہرہ" اور "مطہرہ" میں فرق ہے اور یہاں پر "طاہرہ" نہیں "مطہرہ" فرمایا گیا ہے، جو کہ اسم مفعول ہے تطہیر سے۔ جس کے معنی پاک کرنے کے آتے ہیں۔ یعنی جنت کی ان عورتوں کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کے نقص و عیب سے پاک و صاف کر دیا گیا ہو گا، جیسا کہ دوسری نصوص میں اس کی تفصیل و تصریح مذکور و موجود ہے۔ پس عام طور پر اس کا جو ترجمہ پاکیزہ بیویوں جیسے الفاظ سے کیا جاتا ہے وہ اس لفظ کا پورا ترجمہ نہیں لگتا اس لیے ہم نے ترجمہ ان الفاظ سے کیا ہے۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ جَلَّ وَعَلَا۔ بہر کیف اہل جنت کی ان پاکیزہ اور بے مثال عورتوں کو حیض و نفاس، بول و براز اور دوسرے تمام ظاہری اور باطنی عیوب و نقائص سے پاک کر دیا گیا ہو گا۔ (ابن جریر، ابن کثیر، محاسن التاویل اور مدارک التنزیل وغیرہ)۔ کہ وہاں پر ان کو ایک نئی زندگی اور نئی اٹھان ملی ہو گی۔ (مدنی)

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اللّٰہُ اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ فَاقْرَءُ وْا اِنْ شِءْتُمْ (فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ) [رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جو کچھ تیار کیا ہے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں خیال پیدا ہوا چاہو تو اللہ کا فرمان پڑھ لو "کوئی بھی نہیں جانتا کہ جنتیوں کے لیے کیا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے۔"

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ فِی الْجَنَّۃِ لَشَجَرَۃً یَسِیْرُ الرَّاکِبُ فِیْ ظِلِّھَا مِاءَۃَ سَنَۃٍ وَاقْرَءُ وْا اِنْ شِءْتُمْ (وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) [رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ۔۔۔]

"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں ایک سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی ختم نہ ہو گا اگر چاہو تو اللہ کا فرمان (وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) پڑھو۔"

(عَنْ اَنَسٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غَدْوَۃٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ رَوْحَۃٌ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا وَلَوْ اَنَّ امْرَاَۃً مِّنْ نِّسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ اطَّلَعَتْ اِلَی الْاَرْضِ لَاَضَاءَتْ مَا بَیْنَھُمَا وَلَمَلَاَتْ مَا بَیْنَھُمَا رِیْحًا وَلَنَصِیْفُھَا عَلٰی رَاْسِھَا خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا) [رواہ البخاری: کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اللہ کی راہ میں نکلنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔ اگر اہل جنت کی عورتوں سے کوئی ان کی طرف جھانک لے تو مشرق و مغرب اور جو ان کے درمیان ہے روشن اور معطر ہو جائے۔ نیز اس کے سر کا دوپٹہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے قیمتی ہے۔"

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً یَسِیْرُ الرَّاکِبُ فِیْ ظِلِّهَا مِائَةَ سَنَةٍ وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ (وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) وَلَقَابُ قَوْسِ اَحَدِکُمْ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ اَوْ تَغْرُبُ)

[رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ اگر کوئی سوار اس کے سایہ میں سو سال چلتا رہے تب بھی اس کو عبور نہ کر سکے گا۔ اگر تم چاہو تو اللہ کا یہ فرمان پڑھ لو "لمبے لمبے سائے" "اور یقیناً جنت میں تم میں سے کسی ایک شخص کی کمان کے برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے۔ جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔"

جنت میں دھوپ ہو گی ہی نہیں تو پھر وہاں سورج اور اس کی کرنوں کا سوال ہی کیا ہے۔

۔۔ الغرض۔۔ وہاں کے درختوں کا سایہ دنیاوی درختوں کے سائے کی طرح نہیں جو سورج کی کرنوں کے رہین منت اور جہاں اگر دائمی طور پر سایہ رہے اور سورج کی کرن نہ پہنچ سکے تو وہاں کی ہوا بدبودار فاسد اور مہلک ہو جائے۔

۔۔ المختصر۔۔ جنت میں چونکہ سورج اور اس کی دھوپ ہی نہیں گی تو وہاں کے درختوں کے سائے سے مراد وہ آرام و راحت اور فرحت و سکون ہے جو جنتی درختوں کے نیچے میسر آنے والے ہیں۔۔ الغرض۔۔ جنت میں بہار کا خوشگوار موسم ہو گا جہاں نہ گرمی نہ سردی اور ایسے بہترین کمرے ہوں گے جہاں نہ سختی نہ نرمی اور جہاں کسی طرح کے ملال کا گزر نہیں۔ الحاصل ۔۔ ظل ظلیل سے حمایت الٰہی اور عنایت خداوندی کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیشہ جنتیوں کے سر پر مبسوط رہے گی اور یہ سایہ زوال سے مبرا اور نقص اور انتقال سے منزہ اور معرا ہے۔ اس سے پہلی آیتوں میں اللہ نے کفار کے بعض احوال بیان فرمائے اور وعید اور وعد کا ذکر فرمایا اس کے بعد پھر احکام تکلیفیہ کا ذکر شروع فرمایا۔۔ نیز۔۔ اس سے پہلے یہود کی خیانت کا ذکر فرمایا تھا کہ ان کی کتاب میں سیدنا محمد کی نبوت پر جو دلائل ہیں وہ ان کو چھپا لیتے ہیں اور لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرتے تو اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو امانت داری کا حکم دیا خواہ مذہب میں ہو، عقائد میں ہو معاملات میں ہو۔۔ یا۔۔ عبادات میں ہو۔ (اشرفی)

شان نزول:

فتح مکہ کے وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عثمان بن طلحہ خادم کعبہ سے کعبہ معظّمہ کی کنجی لے لی، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے وہ کنجی انھیں واپس دے دی اور فرمایا کہ اب یہ کنجی ہمیشہ تمہاری نسل میں رہے گی۔ اس پر عثمان بن طلحہ اسلام لائے۔ مطلب یہ ہے کہ اصحاب کو امانتیں دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے اور فیصلوں میں انصاف کرنے کا حکم دیا اور فرائض نبھانا، اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں ان کی ادائیگی بھی اس حکم میں داخل ہے۔ (مظہر القرآن)، (مظہری)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ذکر کر کے واضح کر دیا کہ ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ایمان، عمل صالح کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے پھول مگر خوشبو کے بغیر، درخت ہو لیکن بغیر ثمر۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خیر القرون کے دوسرے مسلمانوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ان کی زندگیاں ایمان کے پھل۔ اعمال صالحہ سے مالا مال تھیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص

ایسے عمل کرتا ہے جو اعمال صالحہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً راست بازی، امانت و دیانت، ہمدردی و غم گساری اور دیگر اخلاقی خوبیاں۔ لیکن ایمان کی دولت سے محروم ہے تو اس کے یہ اعمال، دنیا میں تو اس کی شہرت و نیک نامی کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی اس لیے کہ ان کا سرچشمہ ایمان نہیں ہے جو اچھے اعمال کو عنداللہ بارآور بناتا ہے بلکہ صرف اور صرف دنیاوی مفادات یا قومی اخلاق و عادات ان کی بنیاد ہے۔ (مکہ)

مسائل

۱۔ صاحب ایمان و کردار جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۔ جنتیوں کے لیے پاک بیویاں اور گھنے سائے ہوں گے۔

۳۔ ایمان جنت میں جانے کا سبب ہے اور عمل صالح درجات کی بلندی کا باعث ہیں۔ اگر ایمان نہ لائیں تو جنت میں داخلہ نہ ہو سکے گا۔ جنت میں داخلہ ہمیشہ کے لئے ہوگا کہ وہ دارالخلد (ہمیشہ رہنے کی جگہ) ہے۔

۴۔ ہر جنتی کو کئی جنتیں دی جاویں گی۔ مختلف اعمال کی مختلف جنتیں پھر کفار کے حصے کی جنت کے بھی یہ ہی وارث ہوں گے جیسے نہریں بہت ایسے ہی ہر جنتی کی جنتیں بہت۔

۵۔ ہر جنتی کو کئی کئی بیویاں عطا ہوں گی۔ اپنی دنیا کی مومنہ بیوی، حور عین اور دنیا کی وہ مومنہ عورتیں جن کے خاوند دوزخ میں گئے کہ یہ تمام بیویاں، حیض، نفاس، تھوک، رینٹ، میل، کج خلقی وغیرہ تمام جسمانی و قلبی گندگیوں سے پاک و صاف ہوں گی۔

۶۔ اس طرح کہ وہاں دھوپ ہوگی ہی نہیں کیونکہ سورج نہ ہوگا۔ رب کے نور کی تجلی ہوگی یہ مطلب نہیں کہ دھوپ ہو پھر درخت سایہ کرے۔

۷۔۔ظِلًّا۔ سائیہ، ظَلِیلًا صیغہ صفت (بروزن فعیل) ظل سے بنا ہے۔ یہاں تاکید کا مفہوم دیتا ہے کہ بہت گہرا سایہ ہوگا۔

آیت مبارکہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَاۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

لغات القرآن: [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [يَاْمُرُكُمْ : تمہیں حکم دیتا ہے] [اَنْ : کہ] [تُؤَدُّوا : پہنچا دو] [الْاَمٰنٰتِ : امانتیں] [اِلٰٓى: طرف (کو)] [اَهْلِهَا : امانت والے] [وَاِذَا : اور جب] [حَكَمْتُمْ : تم فیصلہ کرنے لگو] [بَيْنَ : درمیان] [النَّاسِ : لوگ] [اَنْ : تو]

[تَحْكُمُوْا : تم فیصلہ کرو] [بِالْعَدْلِ : انصاف سے] [اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [نِعِمَّا : اچھی] [يَعِظُكُمْ : نصیحت کرتا ہے] [بِهٖ : اس سے] [اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ] [كَانَ : ہے] [سَمِيْعًۢا : سننے والا] [بَصِيْرًا : دیکھنے والا]

ترجمہ : بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، بیشک اللہ تمہیں کیا ہی اچھی نصیحت فرماتا ہے، بیشک اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بعض احوال بیان فرمائے اور وعید اور وعد کا ذکر فرمایا ' اس کے بعد پھر احکام تکلیفیہ کا ذکر شروع فرمایا ' نیز اس سے پہلے یہود کی خیانت کا ذکر فرمایا تھا کہ ان کی کتاب میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر جو دلائل ہیں وہ ان کو چھپا لیتے ہیں اور لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرتے اور اس میں خیانت کرتے ہیں تو اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو امانت داری کا حکم دیا۔
امانت ادا کرنے کا حکم عام ہے خواہ مذاہب میں ہو ' عقائد میں ہو معاملات میں ہو یا عبادات میں ہو۔ (تبیان)
علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں ھذہ الایۃ من امھات الاحکام تضمنت جمیع الدین والشرع یعنی یہ آیت قرآن کریم کے اہم ترین احکام سے ہے۔ اس کے ضمن میں دین اور شریعت کی تمام تفصیلات سمیٹ کر رکھ دی گئی ہیں۔ اور قرطبیؒ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کیونکہ ادائے امانت سے مراد یہاں صرف یہی نہیں کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں واپس کر دے بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ عبادات بھی امانت ہیں۔ ان کو صحیح وقت پر اخلاص نیت سے شرائط و قیود کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا اس امر کی تعمیل ہے۔ اگر آپ کو اقتدار و حکومت حاصل ہے تو غریب و امیر، قوی و ضعیف میں مساوات قائم کرنا، عدل کے ترازو کو تمام مخالف رجحانات کے باوجود برابر رکھنا، حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے کنبہ پروری اور دوست نوازی کی بجائے صرف اہلیت و قابلیت کو معیار قرار دینا بھی اس حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں۔ والاظھر فی الایۃ انھا عامۃ فی جمیع الناس فھی تتناول الولاۃ فیما الیھم من الامانات فی قسمۃ الاموال ورد الظلامات والعدل فی الحکومات۔ (ضیاء)

اسلامی تعلیمات کے شاہکار

یہ دونوں حکم اسلامی تعلیمات کے شاہکار ہیں اور امن وامان کے قیام اور حقوق کی ادائیگی میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کی کچھ تفصیل یوں ہے۔

(1)۔۔امانت کی ادائیگی :

امانت کی ادائیگی میں بنیادی چیز تو مالی معاملات میں حقدار کو اس کا حق دیدینا ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں امانت کی ادائیگی میں داخل ہیں۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو مسلمانوں کا حاکم بنا پھر اس نے ان پر کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر کیا جس کے بارے میں یہ خود جانتا ہے کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کتاب وسنت کا عالم مسلمانوں میں موجود ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور تمام مسلمانوں سے خیانت کی۔

(معجم الکبیر، عمرو بن دینار عن ابن عباس، ۱۱/۹۴، الحدیث : ۱۱۲۱۶)

شان نزول:

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے، یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے کعبہ کی خدمت بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی تھی، اور بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا حضرت عباس (رض) کے سپرد تھی، جس کو سقایہ کہا جاتا تھا، اسی طرح بیت اللہ کی کلید برادری کی خدمت عثمان بن طلحہ کے سپرد تھی، اس کو حجابت اور سدانت کہا جاتا تھا، اور یہ خدمت پشتہا پشت سے خاندان بنو طلحہ میں چلی آرہی تھی جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت ہوئی تو اس وقت یہ خدمت عثمان بن طلحہ سے متعلق تھی، اب آگے اس واقعہ کی روداد خود عثمان بن طلحہ کی زبانی سنئے۔

عثمان بن طلحہ کی کہانی خود ان ہی کی زبانی: ہجرت سے قبل ایک روز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے ملے اور مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، میں نے نہایت گستاخانہ جواب دیا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے جواب پر کچھ نہ فرمایا اور نہ ناگواری کا اظہار فرمایا، میرا یہ دستور تھا کہ پیر اور جمعرات کے دن عام زیارت کے لیے بیت اللہ کو کھولا کرتا تھا، ایک روز کسی موقعہ پر بیت اللہ کھلا ہوا تھا لوگ زیارت کر رہے تھے آپ نے بھی اندر جانا چاہا میں نے اس موقعہ پر جو کچھ میرے منہ میں آیا خوب بکا، آپ نے اس پر بھی سکونت فرمایا، صرف اسقدر فرمایا کہ عثمان! ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک روز بیت اللہ کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہوں اور میں جسے چاہوں دوں، میں نے کہا یہ تو تب ہی ہوسکتا ہے کہ قریش پامال ہوچکے ہوں، آپ نے فرمایا نہیں بلکہ وہ آبرومند ہوچکے ہوں گے، آپ اس قدر فرما کر بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے ادھر میرا دل بے قابو ہوگیا مجھے یقین ہوگیا کہ جو کچھ فرما دیا گیا بس وہی ہوگا۔ (تفسیر هدایت القرآن ملخصا)

عثمان بن طلحہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی وقت اسلام لانیکا ارادہ کرلیا، لیکن جب میں نے اپنی قوم کے تیور بدلے ہوئے دیکھے اور سب کے سب مجھے ملامت کرنے لگے تو میں اپنا ارادہ پورا نہ کرسکا، جب مکہ فتح ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی میں نے پیش کردی۔ (جلالین)

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر 298/2 میں لکھا ہے حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا: شہادت تمام گناہ مٹادیتی ہے سوائے خیانت کے۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید ہوجانے والا ایک آدمی قیامت کے دن پیش ہوگا تو اسے حکم ہوگا امانت ادا کرو۔ وہ عرض کرے گا کہاں سے ادا کروں وہ تو دنیا میں رہ گئی تھی؟ چنانچہ وہ امانت اسے جہنم کی گہرائی میں دکھائی جائے گی یہ نیچے جائے گا اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر لا رہا ہوگا کہ وہ پھر نیچے کر جائے گی اب ہوگا یہ کہ وہ نیچے ہی نیچے جا رہی ہوگی اور یہ بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ نیچے سے نیچے جا رہا ہوگا۔

راوی حدیث حضرت زاذان فرماتے ہیں میں حضرت براء (رض) کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں یہی حدیث سنائی تو انھوں نے فرمایا میرے بھائی نے سچ فرمایا۔ پھر یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا۔ (ابن مسعود)

عثمان بن طلحہ کہتے ہیں کہ جب یہ کنجی لے کر میں خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا کہ کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بیشک آپ کا ارشاد پورا ہوا اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

حضرت فاروق اعظم (رض) فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی۔ اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس وقت جوف کعبہ میں آپ پر نازل

ہوئی۔ بیت اللہ کی نگرانی اور اس کی چابی بر داری اگرچہ عثمان کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اب تمام حقوق کا سر چشمہ اللہ اور اس کے رسول کی ذات تھی وہ جس کو جو عطا فرما دیتے وہی اس کا حق بن جاتا۔ لیکن آپ نے عثمان کے ظاہری حق کو دیکھتے ہوئے جو خاندانی طور پر اس کے پاس تھا آپ نے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے چابی اس کے حوالے کر دی حالانکہ اس وقت حضرت عباس اور حضرت علی (رض) نے آپ سے درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت، سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے، یہ کنجی بر داری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرما دیجیے۔ مگر آپ نے ان کی درخواست رد کر کے کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمائی۔

یہ واقعہ بظاہر حقِ امانت کی ادائیگی کی بہترین مثال ہے کہ آج جبکہ تمام حقوق اور امانتیں آنحضرت کی تحویل میں ہیں لیکن آپ پرانے حوالوں کی بھی قدر فرما رہے ہیں۔ لیکن مراد اس آیت سے صرف یہی حکم دینا نہیں بلکہ جوف کعبہ میں اس آیت کا نزول بطور خاص یہ بتلانے کے لیے کافی ہے کہ آج فتح مکہ کے بعد اللہ نے اسلام کو ایک ریاست میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج آپ جس طرح ایک حامل دعوت امت کے رسول اور قائد ہیں اسی طرح ایک ملک عظیم کے مالک اور ایک ریاست کے سربراہ بھی ہیں۔ آپ نے اس ریاست کو ایسی بنیادیں فراہم کرنی ہیں اور ان طریقوں پر چلانا ہے جو آئندہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہوں گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو چند باتوں کا حکم دے رہا ہے جن پر عمل کرتے ہوئے آپ اس ریاست کو نمونے کی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ (روح القرآن)

نجدی تسلط کے ظالمانہ عہد سے پہلے تک یہ چابیاں حضرت عثمان بن طلحہ ہی کی نسل کے قبضے میں رہیں، سرکار آیہ رحمت نے حضرت عثمان سے اس تعلق سے فرمادیا تھا کہ اے عثمان! لو یہ کنجی اور اے بنی طلحہ سن لو! کہ نہ پھیرے گا کوئی تم سے مگر ظالم۔ الغرض۔ اے ایمان والو! تم اپنے کو خیانت و ناانصافی کے اعمال سے بچاتے رہو (اور جب فیصلہ کیا) کرو (لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے) جس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو (بے شک اللہ تعالیٰ) (کیا ہی خوب ہے) اور کیا ہی اچھی ہے وہ (جس کی اللہ تعالیٰ) (نصیحت فرماتا ہے تم کو) یہ کہ امانتیں ادا کرتے رہو اور ناانصافی کرنے سے خود بچاتے رہو اور جان لو کہ (بے شک اللہ تعالیٰ) خزانہ داروں کی باتیں (سننے والا) ہے اور امانت داروں کے ہر عمل کو (دیکھنے والا ہے) (اشرفی)

(2)۔۔ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا:

نظامِ عدل و عدالت کی روح ہی یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ فریقین میں سے اصلاً کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ علماء نے فرمایا کہ حاکم کو چاہیے کہ پانچ باتوں میں فریقین کے ساتھ برابر سلوک کرے۔ (1) اپنے پاس آنے میں جیسے ایک کو موقع دے، دوسرے کو بھی دے۔ (2) نشست دونوں کو ایک جیسی دے۔ (3) دونوں کی طرف برابر مُتَوَجِّہ رہے۔ (4) کلام سننے میں ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طریقہ رکھے۔ (5) فیصلہ دینے میں حق کی رعایت کرے جس کا دوسرے پر حق ہو پورا پورا دِلائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ انصاف کرنے والوں کو قربِ الٰہی میں نور کے منبر عطا کئے جائیں گے۔

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل۔۔ الخ، ص ۱۰۱۵، الحدیث: ۱۸ (۱۸۲۷))

قاضی شریحؒ کا عادلانہ فیصلہ

مسلمان قاضیوں نے اسلام کے عادلانہ نظام اور بر حق فیصلوں کی ایسی عظیم الشان مثالیں قائم کی ہیں کہ دنیا ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، اس موقع پر ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے: جنگ صفین کے موقع پر حضرت علی المرتضیٰ (رض) کی ایک زِرَہ گم ہو گئی، بعد میں جب آپ (رض) کوفہ تشریف

لائے تو وہ زرہ ایک یہودی کے پاس پائی، اسے فرمایا: یہ زِرَہ میری ہے، میں نے تمہیں بیچی ہے نہ تحفے میں دی ہے۔ یہودی نے کہا: یہ زِرہ میری ہے کیونکہ میرے قبضے میں ہے۔ فرمایا: ہم قاضی صاحب سے فیصلہ کرواتے ہیں، چنانچہ یہ قاضی شُرَیح (رض) کی عدالت میں پہنچے، حضرت علی المرتضٰی (رض) ان کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ قاضی شریح (رض) نے کہا: اے امیر المومنین! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا: اس یہودی کے قبضے میں جو زرہ ہے وہ میری ہے، میں نے اسے نہ بیچی ہے نہ تحفے میں دی ہے۔ قاضی شریح (رض) نے یہودی سے فرمایا: اے یہودی! تم کیا کہتے ہو؟ یہودی بولا: یہ زِرَہ میری ہے کیونکہ میرے قبضے میں ہے۔ قاضی صاحب (رض) نے حضرت علی المرتضٰی (رض) سے کہا: اے امیر المومنین! کیا آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟ فرمایا: ہاں، قنبر اور حسن دونوں اس بات کے گواہ ہیں۔ قاضی صاحب (رض) نے کہا: (کہ حسن آپ کے بیٹے ہیں اور شرعی اصول یہ ہے کہ) بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز نہیں۔ جب اس یہودی نے قاضی صاحب کا عادلانہ فیصلہ سنا تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا: اے امیر المومنین! آپ مجھے قاضی صاحب کے پاس لے کر آئے اور قاضی صاحب نے آپ ہی کے خلاف فیصلہ کر دیا! میں گواہی دیتا ہوں کہ یہی مذہب حق ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ حضرت علی المرتضٰی (رض) اس کے اسلام قبول کرنے سے بہت خوش ہوئے، وہ زرہ اور ایک گھوڑا اسے تحفے میں دے دیا۔ (تاریخ الخلفاء، ابوالسبطین: علی بن ابی طالب، فصل فی نبذ من اخبار علی۔۔الخ، ص ۱۸۴۔۱۸۵، الکامل فی التاریخ، سنۃ اربعین، ذکر بعض سیرتہ، ۲۶۵/۳) (صراط)

نااہل آدمی کو ذمہ داری دینے کا معاملہ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری دی جائے اور وہ صرف تعلق اور قرابت کی بنیاد پر کسی نااہل آدمی کو منصب سونپ دے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے اور اس کی نفلی اور فرضی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ [جمع الفوائد بحوالہ معارف القرآن]

صحیح مشورہ دینا امانت ہے

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ ایک طرح سے امین ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی سمجھ اور معلومات کے مطابق بلا رعایت صحیح مشورہ دے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر غلط مشورہ دیا تو اس کے نتائج کا ذمہ دار ہوگا آپ نے اس کو جامع الفاظ میں یوں بیان فرمایا:

(اَلْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَنٌ) [رواہ الترمذی: کتاب الأدب، باب إن المستشار موتمن]

"جس سے مشورہ لیا جائے وہ صاحب امانت ہوتا ہے۔"

مجالس بھی امانت ہوتی ہیں

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہی شخص امانت دار ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ یا کوئی سامان رکھا جائے حالانکہ قرآن وسنت میں دیانت وامانت کا وسیع تصور پایا جاتا ہے۔ جس کی تفسیر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ باضابطہ مجالس بھی امانت ہوتی ہیں کیونکہ بسااوقات مال واسباب کا نقصان آدمی برداشت کرلیتا ہے یا اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر کسی اجلاس اور مجالس کا راز افشا کردیا جائے تو فرد اور خاندان ہی نہیں قوموں اور ملکوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

(اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ) [رواہ ابوداؤد: کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث]

"مجالس امانت ہوا کرتی ہیں۔" (فہم)

فوائد

1۔ امان خواہ مال کی ہو یا اعمال کی علم کی یا علم کی یا اسرار الٰہی کی۔ جو اس کے اہل ہوں انھیں سپرد کی جاوے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ عثمان ابن طلحہ جو کعبہ کے کلید بردار تھے ان سے فتح مکہ کے دن کعبہ کی چابی لی گئی۔ پھر دوسرے صحابہ نے خواہش کی کہ یہ خدمت ہمارے سپرد کی جائے اور چابی ہم کو عنایت ہو اس پر یہ آیت اتری اور چابی حسب سابق عثمان ابن طلحہ کو عطا ہوئی اور آج تک انہی کی اولاد میں یہ چابی ہے۔ عثمان ابن طلحہ کی یہ امانتداری ملاحظہ کرکے ایمان لے آئے مگر تفسیر خزائن العرفان میں حضرت صدرالافاضل مرادآبادی قدس سرہ نے فرمایا کہ صحیح تر یہ ہے کہ عثمان ابن طلحہ 8ھ میں یعنی فتح مکہ سے قریباً دو سال پہلے اسلام لاچکے تھے واللہ اعلم۔ بہرحال نزول اگرچہ خاص موقعہ پر ہوا مگر حکم عام ہے۔

2: علماء فرماتے ہیں کہ حاکم پانچ باتوں میں مدعی علیہ کے درمیان برابری کرے اپنے پاس آنے جانے کی اجازت میں۔ نشست میں کہ دونوں یکساں دے۔ توجہ میں کہ دونوں کی طرف یکساں کرے۔ کلام سننے میں فیصلہ دینے میں کہ حق کا فیصلہ دے۔

3: لہٰذا اے حاکمو! خیال رکھو کہ تمہارا بھی کوئی حاکم ہے جو تمہارے فیصلوں کو دیکھ رہا ہے تمہاری باتیں سن رہا ہے کل تمہیں بھی اس کے دربار میں پیش ہونا ہے۔ (نور)

مسائل

۱۔ مسلمان اہل لوگوں کو اپنے معاملات کا ذمہ دار بنائیں۔

۲۔ ذمہ دار لوگوں کا فرض ہے کہ وہ عدل وانصاف قائم کریں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بہت ہی اچھی نصیحت فرماتا ہے۔

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ۧ

لغات القرآن: [يٰٓاَيُّهَا : اے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے (ایمان والے)] [اَطِيْعُوا : اطاعت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [وَاَطِيْعُوا : اور اطاعت کرو] [الرَّسُوْلَ : رسول] [وَاُولِي الْاَمْرِ : صاحب حکومت] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [فَاِنْ : پھر اگر] [تَنَازَعْتُمْ : تم جھگڑ پڑو] [فِيْ شَيْءٍ : کسی بات میں] [فَرُدُّوْهُ : تو اس کو رجوع کرو] [اِلَى اللّٰهِ : اللہ کی طرف] [وَالرَّسُوْلِ : اور رسول] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ : تم ایمان رکھتے ہو] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَالْيَوْمِ : اور روز] [الْاٰخِرِ : آخرت] [ذٰلِكَ : یہ] [خَيْرٌ: بہتر] [وَّاَحْسَنُ : اور بہت اچھا] [تَاْوِيْلًا : انجام]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ امر کی، پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، (تو) یہی (تمہارے حق میں) بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ (عرفان القرآن)

تفسیر و تشریح:

امانتوں کی ادائیگی اور اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کا حکم دینے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اس لیے فوری ذکر کیا ہے تاکہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی اپنے اختیارات میں آزاد ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کی خاطر "اُولِی الْاَمْرِ" کے لیے لفظِ "اطاعت" استعمال کرنے کے بجائے فقط واؤ کے عطف سے اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ راعی اور رعیت، امیر اور مامور اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر اپنے آپ کو صرف اللہ اور اس کے رسول کے تابع فرمان سمجھیں۔ (فہم)

اطیعوا، اطاعۃ۔

سے بنا طوع بمعنی خوشی، اصطلاح میں بخوشی کسی حکم کا ماننا اور قبول کرنا اطاعت کہلاتا ہے۔ آیہ کریمہ کا مفہوم واضح ہے۔ اللہ عزوجل و رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت ہی اطاعت ہے۔ بخاری مسلم کی حدیث ہے حضور سید یوم النشور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس

میں نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اس حدیث میں ارشاد ہے جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم امراء و حکام کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ وہ حق کے خلاف حکم نہ کریں اور اگر حق کے خلاف حکم کریں تو ان کی اطاعت نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ احکام تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہر کتاب یعنی قرآن کریم سے ثابت ہوں۔ دوسرے وہ جو ظاہر حدیث سے۔ تیسرے وہ جو قرآن و حدیث کی طرف بطریق قیاس رجوع کرنے سے۔ اولی الامر۔ میں امام، امیر، بادشاہ، حاکم، قاضی سب داخل ہیں۔ خلافت کاملہ علی منہاج النبوۃ تو زمانہ رسالت کے تیس سال بعد تک رہی۔ اب خلافت ناقصہ رہی وہ خلفاء عباسیہ میں تھی اور اب تو امامت بھی مفقود ہے اس لیے کہ امام کے لیے قرشی ہونا شرط ہے اور یہ اکثر مقامات میں معدوم ہے۔ البتہ سلطنت و امارت باقی ہے اور چونکہ سلطان و امیر بھی اولوالامر میں داخل ہیں اس لیے ان کی اطاعت بھی بحد شریعت ہم پر لازم ہے۔

شان نزول

حضرت خالد بن ولید (رض) ایک لشکر کے امیر بنائے گئے۔ اسی لشکر کے ایک سپاہی حضرت عمار بن یار (رض) تھے جس مقام پر حملہ ہونا تھا وہاں حملہ کی خبر مل گئی اور وہ لوگ اپنا مال لے کر راتوں رات بھاگ گئے اور وہ علاقہ خالی کر گئے۔ صرف ایک شخص باقی رہ گیا تھا جو رات کے اندھیرے میں حضرت یاسر سے ملا۔ اس نے حضرت یاسر کو بتایا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور اس کی قوم بھاگ گئی ہے اور وہ صرف تنہا رہ گیا ہے کیا اس کا اسلام لانا مفید ہو گا یا نہیں؟ حضرت یاسر (رض) نے فرمایا کہ تیرا اسلام تجھ کو نفع دے گا۔ لہٰذا تو اطمینان سے رہ میں ضمانت دیتا ہوں۔ وہ شخص مطمئن ہو گیا صبح جب لشکر اسلام نے بستی پر حملہ کیا تو سوائے اس شخص کے کسی کو نہ پایا۔ حضرت خالد (رض) نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس کا مال اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جب حضرت عمار (رض) کو خبر ملی تو انھوں نے خالد (رض) کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ حضرت خالد (رض) نے فرمایا کہ امیر لشکر میں ہوں امان کا حق مجھے ہے اس پر حضرت خالد اور عمار میں اختلاف ہو گیا۔ جب یہ دونوں حضرات مدینہ پہنچے تو معاملہ دربار رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پیش ہوا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عمار کے حق میں فیصلہ دیا اور اس شخص کو چھوڑ دیا اور حضرت عمار کو ہدایت فرمائی کہ آئندہ بغیر اجازت امیر کسی کو امان نہ دیا کریں۔ حضرت خالد (رض) نے عرض کی یا رسول اللہ عمار جیسے غلام کو میرے مقابلہ کی اجازت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو عمار کو برا کہے اللہ تعالیٰ اس کو برا کرے جو عمار سے بغض رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو حضرت عمار (رض) بارگاہ نبوت سے فیصلہ لے کر چلے تو حضرت خالد (رض) ان کے پیچھے پیچھے چلے اور دامن پکڑ کر لپٹ گئے اور ان کو راضی کر لیا۔ (روح المعانی، خازن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کے علاوہ مسلمان امرا اور حکام کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس دار فانی میں زیادہ دیر اقامت گزیں نہیں ہونا تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد امور مملکت کی ذمہ داری خلفاء اور امراء نے سنبھالنی تھی اس لیے ان کی اطاعت کرنے کے متعلق بھی تاکید فرمائی۔ لیکن اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اطاعت امیر میں ایک بین فرق ہے۔ نبی معصوم ہوتا ہے۔ جملہ امور میں خصوصاً احکام شرعی کی تبلیغ میں اس سے خطا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کی اطاعت کا جہاں حکم دیا غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا۔ مثلاً ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ جو کچھ تمہیں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔ رسول کا ہر حکم واجب التسلیم اور اٹل ہے اس

میں کسی کو مجال قیل و قال نہیں خلیفہ کا معصوم ہونا ضروری نہیں۔اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اس لیے اس کی مشروط اطاعت کا حکم دیا کہ اس کے حکم کو خدااور رسول کے فرمان کی روشنی میں پرکھو۔اگراس کے مطابق ہے تو اس پر عمل کرو ورنہ وہ قابل عمل نہیں۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کاارشاد ہے۔لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ اللہ۔اس لیے حاکم وقت کی اطاعت کا حکم فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر تمہارے درمیان تنازع رونما ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف۔یعنی اس حکم کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لو۔اگراس کے مطابق ہے تو اس پر عمل کرو ورنہ تم پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ (ضیاء)

کتاب 'سنت 'اجماع اور قیاس کی حجیت پر استدلال

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ دلائل شرعیہ چار ہیں۔کتاب 'سنت 'اجماع 'اور قیاس 'اطیعوااللہ 'سے مراد کتاب اللہ کے احکام ہیں۔اطیعوا الرسول سے مراد سنت ہے اور اولی الامر منکم سے مراد اجماع ہے یعنی ہر زمانہ کے علماء حق کی اکثریت کیونکہ علماء حق کی اکثریت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی اور (آیت) "فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللہ والرسول "اس سے مراد قیاس ہے یعنی جس مسئلہ کی کتاب اور سنت صاف تصریح نہ ہو اس کی اصل کتاب اور سنت سے نکال کر اس کو کتاب اور سنت کی طرف لوٹا دو اور اس پر وہی حکم جاری کردو۔

اولی الامر کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مصنف کا مختار

حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا: (آیت) "اولی الامر منکم "۔سے مراد امراء اور حکام ہیں 'ابن وہب نے کہا اس سے مراد سلاطین ہیں 'مجاہد نے کہا اس سے مراد اصحاب فقہ ہیں حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس سے مراد اہل دین اور اہل فقہ ہیں یعنی دیندار علماء عطاء بن سائب نے کہا اس سے مراد صاحبان علم اور اصحاب فقہ ہیں 'حسن بصری نے کہا اس سے مراد علماء ہیں 'مجاہد سے ایک روایت یہ ہے کہ اس سے مراد صحابہ ہیں امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ ھ نے فرمایا ان اقوال میں اولی یہ ہے کہ (آیت) "اولی الامر "سے مراد ائمہ اور حکام ہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عنقریب میرے بعد حکام ہوں گے (ان میں) نیک حاکم بھی ہوں گے اور فاسق بھی 'تم ان کے احکام سننا اور ان کا جو حکم حق کے موافق ہو اس میں ان کی اطاعت کرنا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اگر وہ نیک کام کریں گے تو اس میں تمہارا اور ان کا نفع ہے اور اگر وہ برے کام کریں گے تو تم کو نفع ہوگا اور ان کو ضرر 'اور حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان شخص پر حکم کی اطاعت لازم ہے خواہ اس کو وہ حکم پسند ہو یا ناپسند 'ہاں اگر اس کو اللہ کی معصیت کا حکم دیا جائے تو خالق کی معصیت میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں ہے۔ (جامع البیان ج ۵ ص ۹۵۔ ۹۳ 'ملخصا مطبوعہ بیروت '۱۴۰۹ ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ ھ نے فرمایا (آیت) "اولی الامر منکم "کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ (۱) خلفاء راشدین۔ (۲) عہد رسالت میں لشکروں کے حاکم (۳) وہ علماء حق جو احکام شرعیہ کے مطابق فتوی دیتے ہیں اور لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں یہ قول حضرت ابن عباس (رض) 'حسن بصری اور مجاہد سے مروی ہے اور روافض سے مروی ہے کہ اس سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۲۴۳ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت '۱۳۹۸ ھ)

ہماری رائے یہ ہے کہ (آیت) "اولی الامر منکم "سے مراد علماء حق ہیں جو قرآن اور سنت سے مسائل استنباط کرتے ہیں اور پیش آمدہ مسائل میں فتوے دیتے ہیں اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے :

(آیت) "ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم "۔ (النسآء : ۸۳)

ترجمہ : اور اگر وہ اس معاملہ کو رسول اور اپنے اولی الامر کی طرف لوٹا دیتے تو اس کا (حل) وہ لوگ ضرور جان لیتے تو ان میں سے کسی مسئلہ کو مستنبط کر سکتے ہیں۔

اور خلفاء راشدین کے دور کے بعد ہر زمانہ میں مسلمان ' امراء اور حکام کے مقابلہ میں ائمہ فتوی کی پیروی کرتے ہیں۔ آج بھی اگر عدالت کسی عورت کا یک طرفہ فیصلہ کر کے اس کا نکاح فسخ کر دیتی ہے تو مسلمان اس فیصلہ کو ائمہ فتوی کے پاس لے جاتے ہیں اگر وہ اس کی تائید کر دیں تو اس فیصلہ پر عمل کر کے عورت کا نکاح کر دیتے ہیں ورنہ نہیں کرتے ' اور خلفاء راشدین خود اصحاب علم اور ائمہ فتوی تھے اس سے معلوم ہوا کہ (آیت) "اولی الامر منکم "سے مراد ہر دور میں ائمہ فتوی اور علماء اور فقہاء ہی ہیں۔

اللہ اور رسول کی اطاعت مستقل ہے اور (آیت) "اولی الامر "کی اطاعت بالتبع ہے۔

اس آیت میں (آیت) "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول"۔ فرمایا ہے اور (آیت) "اولی الامر منکم "سے پہلے "اطیعوا "کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس کا پہلے اطیعوا 'پر عطف کیا گیا تاکہ ان کی اطاعت بالتبع ہو اس میں یہ نکتہ ہے کہ اللہ کی مستقل اطاعت ہے اور رسول کی بھی مستقل اطاعت ہے اور علماء اور حکام کی مستقل اطاعت نہیں ہے جب ان کے احکام اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق ہوں تو ان کی اطاعت ہے ورنہ نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک لشکر بھیجا اور ان پر ایک شخص کو امیر بنا دیا اس نے آگ جلائی اور لشکر سے کہا اس میں داخل ہو جاؤ ' بعض لوگوں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا دوسروں نے کہا ہم آگ ہی سے بھاگ کر (اسلام میں) آئے ہیں ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا گیا تو جن لوگوں نے آگ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا آپ نے ان سے فرمایا اگر تم آگ میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک اس آگ ہی میں رہتے اور دوسروں کی آپ نے تعریف کی اور فرمایا اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں ہے اطاعت صرف نیکی میں ہے (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۸۴۰)

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ اقوال صحابہ پر مقدم ہیں

نیز اس آیت میں فرمایا : پھر اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ اللہ اور رسول کی ارشادات باقی تمام لوگوں پر مقدم ہیں ' ہم اس سے پہلے باحوالہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود (رض) جنبی کو تیمّم کرنے سے منع کرتے تھے لیکن چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنبی کیلیے تیمّم کو مشروع کیا ہے اس لیے جمہور صحابہ ' فقہاء تابعین اور مجتہدین اسلام نے حضرت عمر (رض) اور حضرت ابن مسعود (رض) کی جلالت شان کے باوجود ان کے قول کو قبول نہیں کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحیح حدیث کو مقدم رکھا۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر (رض) زخمی ہوگئے تو حضرت صہیب (رض) روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے ہائے میرے بھائی 'ہائے میرے صاحب 'حضرت عمر (رض) نے فرمایا اے صہیب تم مجھ پر رو رہے ہو حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے میت کے گھر والوں کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۱۲۸۷) جب حضرت عائشہ ام المومنین (رض) کے سامنے حضرت عمر (رض) کا یہ قول بیان کیا گیا تو حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا اللہ تعالیٰ عمر پر رحم فرمائے 'خدا کی قسم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نہیں فرمایا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے اور تمہارے لیے قرآن مجید کی یہ آیت کافی ہے۔

(آیت) "ولا تزر وازرۃ وزر اخری"۔ (الزمر : ۷)

ترجمہ : اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۱۲۸۸)

حضرت عائشہ (رض) نے بیان کیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا گزر ایک یہودیہ (کی قبر) سے ہوا جس پر لوگ رو رہے تھے 'آپ نے فرمایا یہ اس پر رو رہے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۱۲۸۹)

حضرت عائشہ (رض) نے قرآن مجید کو حضرت عمر کے قول پر مقدم رکھا اور فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ عام قاعدہ نہیں بیان کیا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے کیونکہ کسی کے گناہ کا دوسرے کو عذاب نہیں ہوتا 'بلکہ آپ نے ایک خاص واقعہ میں ایک یہودی عورت متعلق یہ فرمایا تھا 'مرتبہ صحابیت میں حضرت عمر (رض) کا مرتبہ حضرت عائشہ (رض) سے بہت زیادہ ہے لیکن حضرت عائشہ (رض) نے اللہ اس کے رسول کے ارشاد کو حضرت عمر (رض) کے قول پر مقدم رکھا۔

اسی طرح حضرت عمر (رض) اور حضرت عثمان حج تمتع سے منع کرتے تھے لیکن چونکہ حج تمتع رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے ثابت ہے اس لیے جمہور صحابہ اور فقہاء تابعین اور علماء اسلام نے آپ کی سنت ثابتہ کے مقابلہ میں ان کے قول کو قبول نہیں کیا : مروان بن الحکم بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عثمان اور حضرت علی (رض) کے پاس حاضر تھا 'حضرت عثمان تمتع اور حج اور عمرہ کو جمع کرنے سے منع کرتے تھے 'جب حضرت علی (رض) نے یہ دیکھا تو آپ نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اور کہا لبیک بعمرۃ وحجۃ "میں نبی کریم کی سنت کو کسی کے بناء پر ترک نہیں کروں گا۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۱۵۶۳)

حضرت عمران (رض) نے کہا ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن نازل ہوتا رہا اور ایک شخص نے اپنی رائے سے جو کہا سو کہا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : ۱۵۷۱)

سالم بن عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ اہل شام سے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے حج تمتع (الگ الگ احرام کے ساتھ حج اور عمرہ جمع کرنے) کے متعلق سوال کیا 'حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا وہ جائز ہے 'اس نے کہا آپ کے باپ تو اس سے منع کرتے تھے 'حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے فرمایا یہ بتاؤ کہ میرے باپ حج تمتع سے منع کرتے ہوں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حج تمتع کیا ہو تو میرے باپ کے حکم پر عمل کیا جائے گا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حکم پر ! اس شخص نے کہا بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم پر عمل کیا جائے گا حضرت عبداللہ (رض) نے فرمایا بیشک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حج تمتع کیا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۸۲۵)

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ اکابر کا کوئی قول اگر قرآن مجید اور حدیث صحیح کے خلاف ہو تو اصاغر کے لیے یہ جائز ہے کہ اس قول سے اختلاف کریں اور اللہ اور رسول کے مقابلہ میں ان کے قول کو قبول نہ کریں اور اس میں ان کی کوئی بے ادبی اور گستاخی نہیں ہے بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول کی بڑائی کا اظہار ہے اور سورۃ نساء کی اس آیت پر عمل ہے : پھر اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

ائمہ اور فقہاء کے اقوال پر احادیث کو مقدم رکھنا ان کی بے ادبی نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ائمہ مجتہدین میں سے کسی کا قول حدیث صحیح کے خلاف ہو تو حدیث صحیح پر عمل کیا جائے گا اور اس میں کسی امام کی بے ادبی نہیں ہے بلکہ اس آیت پر عمل ہے ' امام ابو حنیفہ نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے کو مطلقاً مکروہ قرار دیا ہے خواہ متصل روزے رکھے جائیں یا منفصل تاکہ فرض پر زیادتی کے ساتھ تشبیہ نہ ہو 'لیکن حدیث صحیح میں اس کی فضیلت اور استحباب ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو یہ ہمیشہ روزے رکھنے کی مثل ہے۔ (صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ۱۱۶۴)

لیکن چونکہ امام اعظم (رح) کا یہ قول حدیث صحیح کے خلاف ہے اس لیے علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی متوفی ۹۷۰ھ نے لکھا ہے کہ لیکن عام متاخرین فقہاء کے نزدیک شوال کے چھ روزے رکھنے میں مطلقاً کوئی کراہت نہیں ہے۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵۸)

لیکن چونکہ بہ کثرت احادیث سے عقیقہ کا سنت ہونا ثابت ہے اس لیے امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ نے لکھا ہے کہ عقیقہ سنت ہے۔ (فتاوی رضویہ ج ۸ ص ۵۴۲ 'مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

دلائل کی بناء پر اکابر سے اختلاف کرنا ان کی بے ادبی نہیں ہے

اسی طرح امام احمد رضا قادری کے بعد کے علماء نے امام احمد رضا قادری سے بھی اختلاف کیا ہے۔

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ بدھ کے دن ناخن کاٹنے کے متعلق لکھتے ہیں :

نہ چاہیے حدیث میں اوس سے نہی (ممانعت) آئی کہ معاذ اللہ مورث برص ہوتا ہے بعض علماء رحمھم اللہ نے بدھ کو ناخن کتروائے کسی نے برنباء حدیث منع کیا 'فرمایا صحیح نہ ہوئی فورا برص ہو گئے۔ (فتاوی رضویہ ج ۱۰ ص ۳۷ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی قادری متوفی ۱۳۷۶ھ لکھتے ہیں :

ایک حدیث میں ہے جو ہفتہ کے دن ناخن ترشوائے اس سے بیماری نکل جائے گی اور شفا داخل ہو گی اور جو اتوار کے دن ترشوائے فاقہ نکلے گا ' اور توانگری آئے گی 'اور جو پیر کے دن ترشوائے جنون جائے گا اور صحت آئے گی اور جو منگل کے دن ترشوائے مرض جائے گا اور شفا آئے گی اور جو بدھ کے دن ترشوائے وسواس وخوف نکلے گا اور امن وشفا آئے گی الخ۔ (در مختار۔ رد المختار) (بہار شریعت ج ۱۶ ص ۱۲۲ 'مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکشنز لاہور)

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں :

انگریزی رقیق دوائیں جو ٹنچر کہلاتی ہیں ان میں عموماً اسپرٹ پڑتی ہے اور اسپرٹ یقیناً شراب بلکہ شراب کی نہایت بد تر قسموں سے ہے وہ نجس ہے ان کا کھانا حرام لگانا حرام بدن یا کپڑے یا دونوں کی مجموع پر ملا کرا گر روپیہ بھر جگہ سے زیادہ میں ایسی شے لگی ہوئی ہو نماز نہ ہو گی۔ (فتاوی رضویہ ج ۱۱ص ۸۸ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

مفتی محمد مظہر اللہ دہلوی متوفی ۱۹۶۶ء لکھتے ہیں :

لیکن ہم نے جہاں تک ڈاکٹروں کی زبانی سنا یہی معلوم ہوا کہ یہ (اسپرٹ) بھی شراب سے نہیں بنائی جاتی جس کو شرعاً خمر کہا جاتا ہے بلکہ یہ (اسپرٹ) ایسی شراب کا جوہر ہے جو گنے وغیرہ سے بنائی گئی ہے پس اگر یہ صحیح ہے تو اس کا استعمال بغرض صحیح (اس مقدار میں جو مسکر نہیں ہے) حرام نہیں اور اس کی بیع وشراء بھی جائز ہے۔ (فتاوی مظہریہ ص ۲۸۹ 'مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی)

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ سید مہدی حسن مارہرہ کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :

حضور عورتوں کو لکھنا سکھانا شرعاً ممنوع وسنت نصاری وفتح یاب ہزاراں فتنہ اور مستان سرشار کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے (فتاوی رضویہ ج ۱۰ ص ۱۵۴ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

فقیہ اعظم مفتی نور اللہ نعیمی متوفی ۱۴۰۳ھ لکھتے ہیں :

پھر حدیث صحیح سے بھی یہ مسئلہ تعلیم الکتابہ للنساء ثابت ہے مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۷۲ 'سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۶ 'مستدرک حاکم ج ۴ ص ۵۷ 'سنن بیہقی ج ۹ ص ۳۴۹ 'میں حضرت شفابنت عبداللہ (رض) سے بکلمات متقاربہ ثابت ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت حفصہ (رض) کے پاس تشریف لائے اور میں بھی حاضر تھی تو مجھے فرمایا کی تو اس کو رقیہ النملۃ کی تعلیم نہیں دیتی جیسے اس کو کتابت کی تعلیم تم نے دی ہے حاکم نے کہا یہ حدیث بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ (فتاوی نوریہ ج ۳ ص ۴۷۴ 'مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء)

نیز امام احمد رضا قادری نے سماع مع المزامیر کو حرام لکھا ہے اور استاذ العلماء مولانا حافظ عطا محمد چشتی دامت برکاتھم اور حضرت غزالی زماں امام اہل سنت سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ نے اس کو جائز لکھا ہے۔

علماء اور مجتہدین حضرات معصوم نہیں دلائل کے ساتھ ان سے اختلاف کرنا جائز ہے۔

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے سوا کچھ بشر معصوم نہیں اور غیر معصوم سے کوئی نہ کوئی کلمہ غلط یا بیجا صادر ہونا کچھ نادر کالمعدوم نہیں پھر سلف صالحین وائمہ دین سے آج تک اہل حق کا یہ معمول رہا ہے کہ ہر شخص کا قول قبول بھی کیا جاتا ہے۔ اور اس کو رد بھی کیا جاتا ہے جاتا ہے ماسوا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے 'جس کی جو بات خلاف حق وجمہور دیکھی وہ اسی پر چھوڑی اور اعتقاد وہی رکھا جو جماعت کا ہے (فتاوی رضویہ ج ۶ ص ۲۸۳ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی) (تبیان)

نیز فرماتے ہیں :

ویابی اللہ العصمۃ الالکلامہ ولکلام رسولہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالی اپنے کلام اور اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کلام کے سوا کسی کے کلام کو معصوم قرار دینے سے انکار فرماتا ہے (پھر فرمایا) انسان سے غلطی ہوتی ہے مگر رحمت ہے اس پر جس کی خطا کسی امر دینی مہم پر زد نہ ڈالے۔ (الملفوظ ج ۴ ص ۳ 'مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی) حضرت فقیہ اعظم قدس سرہ سے سوال کیا گیا کہ اعلی حضرت مجدد مائتہ حاضرہ نے گھڑی کے چین اور عورتوں کی کتابت اور انگریزی لباس وغیرہ کو ناجائز لکھا ہے اور آپ نے ان کو جائز لکھا ہے کیا وہ فتوی وقتی اور عارضی تھا اور اب یہ امور جائز ہوگئے ہیں ؟ حضرت فقیہ اعظم قدس سرہ نے اس کے جواب میں لکھا :

(۱) ہاں مجدد وقت کی ایسی ہدایات و تصریحات (جو کتاب وسنت سے مستنبط ہیں) کی روشنی میں یوں ہو سکتا ہے؟ بلکہ عملاً خود مجدد وقت ہی اس کا سبق بھی دے چکے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ خالصا لوجہ اللہ تعالیٰ ہو 'تعجب ہے کہ خود مستفتی صاحب کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ حضرت امام اعظم (رض) کے محققانہ اقوال و فتاوائے شرعیہ کی موجودگی میں حضرات صاحبین وغیرہما اجلہ تلامذہ بلکہ متاخرین کے بھی بکثرت ایسے اقوال و فتاوی ہیں 'جو ان کے خلاف ہیں جن کی بنا قول صوری و ضروری وغیرہ اصول ستہ پر ہے جس کی تفصیل فتاوی رضویہ ج ا ص ۳۸۵ وغیرہا میں ہے بلکہ یہ بھی اظہر من الشّمس ہے کہ خود ہمارے مجدد برحق کے صدہا نہیں بلکہ ہزارہا تطفلات ہیں جو صرف متاخرین نہیں بلکہ متقدمین حضرات فقیہ النفس امام قاضی خاں وغیرہ کے اقوال و فتاوی شرعیہ پر ہیں جن میں اصول ستہ کے علاوہ سبقت قلم وغیرہ کی صریح نسبتیں بھی مذکور ہیں اور یہ بھی نہاں نہیں کہ ہمارے مذہب مہذب میں مجددین حضرات معصوم نہیں تو تطفلات کا دروازہ اب کیوں بند ہو گیا ؟ کیا کسی مجدد کی کوئی ایسی تصریح ہے یا کم از کم اتنی ہی تصریح ہو کہ اصول ستہ کا زمانہ اب گزر گیا للذا الکیر کا فقیر بننا فرض عین ہو گیا 'کیا تازہ حوادثات و نوازل کے متعلق احکام شرعی موجود نہیں کہ ہم بالکل صم بکم بن جائیں اور عملاً اغیار کے ان کافرانہ مزعومات کی تصدیق کریں کہ معاذ اللہ اسلام فرسودہ مذہب ہے 'اس میں روز مرہ ضروریات زندگی کے جدید ترین ہزارہا تقاضوں کا کوئی حل ہی نہیں " 'ولا حوال ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اسی ایک جواب سے نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے جواب میں واضح ہیں البتہ یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہے کہ کسی ناجائز اور غلط چیز کو اپنے مفاد ومنشا سے جائز و مباح کہنا ہرگز ہرگز جائز نہیں مگر شرعا اجازت ہو تو عدم جواز کی رٹ لگانا بھی جائز نہیں 'غرضیکہ ضد اور نفس پرستی سے بچنا نہایت ہی ضروری ہے 'کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے ذمہ دار علماء کرام محض اللہ کے لیے نفسانیت سے بلند و بالا سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایسے جزئیات کے فیصلے کریں 'مثلا یہ کہ وہ لباس جو کفار یا فجار کا شعار ہونے کے باعث ناجائز تھا کیا اب بھی شعار ہے تو ناجائز ہے یا اب شعار نہیں رہا تو جائز ہے 'مگر بظاہر یہ توقع تمنا کے حدود طے نہیں کر سکتی اور یہی انتشار آزاد خیالی کا باعث بن رہا ہے۔ " فانا للہ وانا الیہ راجعون "۔ (فتاوی نوریہ ج ۳ ص ۴۰۷۔۴۶۹)

فوائد

1: خواہ دینی حکومت والے ہوں جیسے عالم، مرشد کامل فقیہ، مجتہد یا دنیاوی حکومت والے جیسے اسلامی سلطان اور اسلامی حکام۔ لیکن دینی حکام اطاعت دنیاوی حکام میں واجب ہے اگرچہ کو کسی قرآن کے خلاف ہی حکم دیں۔ اس کے حق میں وہی نص ہو گی۔ حضرت علی کو فاطمہ زہرا کی موجودگی میں دوسرے نکاح کی اجازت نہ ہونا۔ حضرت خزیمہ انصای کی ایک گواہی دو کے برابر ہونا اسی میں داخل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں رسول کو اولی الامر سے علیحدہ بیان فرمایا۔ اس کی تحقیق ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ میں ملاحظہ کرو۔ اس آیت سے مسئلہ تقلید بھی ثابت ہوتا ہے۔

2: تم میں اور حاکموں میں کسی مسئلہ شرعی میں اختلاف ہو جاوے (روح البیان) تو اسے نص سے سلجھاؤ۔ معلوم ہوا کہ حضور حاکموں کے حاکم، سلطانوں کے سلطان ہیں۔

3: فقہاء کی طرف رجوع کرنا بھی رسول ہی کی طرف رجوع کرنا ہے کیونکہ فقہاء حضور ہی کا حکم سناتے ہیں۔ جیسے حضور کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے ایسے ہی عالم دین کی فرمان برداری رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمان برداری ہے۔ یوں ہی سلطان اسلام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

4: اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دعوی ہے اور عمل اس کی دلیل ہے۔ جو منہ سے کہے کہ میں اللہ رسول کو مانتا ہوں اور عمل کرے کفار کے سے قانون کے امریکہ وانگلستان کے اس کا دعوی ناقص وبے دلیل ہے۔

5: یعنی اگرچہ شریعت کے بعض احکام نفس پر گراں ہیں جیسے زکوۃ، جہاد کا فرض ہونا، سود کا حرام ہونا لیکن انجام ان کا اچھا ہے مسلم قوم سود لے کفر فنا ہوگی زکوۃ دے کر زندہ رہے گی۔ (نور العرفان)

آیت مبارکہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖؕ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۶۰﴾

لغات القرآن:[اَلَمْ تَرَ : کیا تم نے نہیں دیکھا] [اِلَی: طرف (کو)] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [یَزْعُمُوْنَ : دعویٰ کرتے ہیں] [اَنَّهُمْ : کہ وہ] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [بِمَآ اُنْزِلَ : اس پر جو نازل کیا گیا] [اِلَيْكَ : آپ کی طرف] [وَمَآ اُنْزِلَ : اور جو نازل کیا گیا] [مِنْ قَبْلِكَ : آپ سے پہلے] [یُرِیْدُوْنَ : وہ چاہتے ہیں] [اَنْ : کہ] [یَّتَحَاكَمُوْٓا : مقدمہ لے جائیں] [اِلَی: طرف (پاس)] [الطَّاغُوْتِ : طاغوت (سرکش)] [وَقَدْ اُمِرُوْٓا : حالانکہ انہیں حکم ہوچکا] [اَنْ : کہ] [یَّكْفُرُوْا : وہ نہ مانیں] [بِهٖ : اس کو] [وَیُرِیْدُ : اور چاہتا ہے] [الشَّیْطٰنُ : شیطان] [اَنْ : کہ] [یُّضِلَّهُمْ : انہیں بہکادے] [ضَلٰلًا : گمراہی] [بَعِیْدًا : دور]

ترجمہ: کیا آپ نے ان (منافقوں) کو نہیں دیکھا جو (زبان سے) دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس (کتاب یعنی قرآن) پر ایمان لائے جو آپ کی طرف اتارا گیا اور ان (آسمانی کتابوں) پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئیں (مگر) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمات (فیصلے کے لئے) شیطان (یعنی احکام الٰہی سے

سرکشی پر مبنی قانون) کی طرف لے جائیں حالانکہ انھیں حکم دیا جاچکا ہے کہ اس کا (کھلا) انکار کردیں، اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں دور دراز گمراہی میں بھٹکاتا رہے۔

تفسیر و تشریح:

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ان آیتوں میں یہ بتایا ہے کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے اور آپ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتے اور اپنے مقدمات طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔

شان نزول

ایک منافق تھا جس کا نام بشر تھا اس کا ایک یہودی سے جھگڑا ہوا۔ یہودی نے کہا چلو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فیصلہ کرائیں۔ منافق سمجھتا تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلارعایت حقکا فیصلہ کریں گے اور اس طرح یہودی کا منشاء پورا ہوگا۔ اس منافق نے کہا چلو کعب بن اشرف یہودی سے فیصلہ کرائیں۔ قرآن کریم نے طاغوت فرما کر کعب بن اشرف مراد لیا ہے۔ یہودی جانتا تھا کہ کعب بن اشرف رشوت خور ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مقدسہ ان عیوب سے مبرا و منزہ ہے۔ اس نے باوجود ہم مذہب ہونے کے کعب کو پنچ تسلیم نہ کیا۔ مجبوراً منافق کو بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلے کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فیصلہ دیا اور وہ یہودی کے موافق تھا۔ بشر منافق نے فیصلہ سن کر یہودی کو مجبور کیا کہ حضرت صدیق اکبر (رض) کے پاس چلو یہ فیصلہ ان سے کرائیں یہ دونوں بارگہ صدیق میں آئے صدیق اکبر (رض) نے بھی یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بشر منافق بولا کہ میری تسلی اب بھی نہیں ہوئی چلو حضرت عمر کے پاس چل کر فیصلہ کرائیں۔ یہودی نے کہا اچھا چل۔ چنانچہ یہودی آیا اور اس نے حضرت عمر (رض) سے عرض کردیا کہ میرا فیصلہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صدیق (رض) طے فرما چکے ہیں لیکن یہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ پر راضی نہیں اسی وجہ سے آپ کے پاس مجھے لایا۔ آپ نے ان کو فرمایا اچھا میں ابھی آکر فیصلہ کرتا ہوں آپ مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لاکر اس منافق کو قتل کردیا اور فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ سے راضی نہ ہو اس کے لیے میرا یہ فیصلہ ہے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس سے ان نفاق کے مریضوں کا نقشہ دکھایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح حق سے بھاگتے ہیں۔
(حسنات، تقریباً تمام تفاسیر نے ایسا ہی واقعہ لکھا ہے)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا

(ھٰذَا قَضَآءِیْ مَنْ لَّمْ یَرْضَ بِقَضَآءِ رَسُوْلِ اللّٰہِ) [فتح الباری: کتاب المساقاۃ]
"جو رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو نہیں مانتا اس کے بارے میں میرا یہی فیصلہ ہے۔"
اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ (کیا تم نے ان لوگوں کی حالت کو دیکھا جن کا گمان یہ ہے) جبرائیلؑ نے کہا عمرؓ نے حق و باطل میں تفریق کردی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ تو فاروق ہے۔ (اسباب النزول للواحدی) چونکہ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ عمر (رض) نے حق کو باطل سے جدا کردیا اسی لیے آپ کا نام فاروق ہوگیا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْدًا۔ [الاحزاب : ۳۶]
"کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔"
طاغوت شیطان کو کہا جاتا ہے یہ دونوں شیطان' یہودی و منافق، (طاغوت سے مراد ہے کعب بن اشرف یا قبیلہ جہینہ کا کاہن (طغیان کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا) شیطان سے مشابہ تھے۔ یا یہ کہا جائے کہ ان دونوں کے پاس فیصلہ کے لیے جانا حقیقت میں شیطان کے پاس فیصلہ کے لیے جانا تھا۔
طاغوت سے مراد ہر وہ شخص، نظریہ، کام، اجتماع، سفر یا فیصلہ ہے جو قرآن وسنت کے مخالف ہو۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کے قریب نہ جائیں اور تمام معاملات کے لیے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کریں۔ (امداد)

ایمان کیلئے طاغوت کا انکار لازمی ہے

سو ارشاد فرمایا گیا کہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ پہلے تم طاغوت کے ساتھ کفر کرو پھر اللہ پر ایمان لاؤ تو تب ہی تمہارا ایمان معتبر ہوگا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس بارے ارشاد فرمایا گیا { فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا } الآیۃ (البقرۃ: 256)۔ اسی لیے کلمہ طیبہ میں پہلے نفی کا ذکر ہے، پھر اثبات کا۔ یعنی پہلے غیر اللہ سے الوہیت کی نفی کا ذکر ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں" اور پھر اللہ پاک کی معبودیت اور الوہیت کا ذکر و اثبات ہے کہ "معبود برحق وہی وحدہ لاشریک ہے"۔ پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان معتبر نہیں ہو سکتا لیکن اس طرح کے لوگ دونوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان کو صراط مستقیم سے بھٹکا کر اتنا دور کر دے کہ پھر ان کے لیے اس کو پانے کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے اور اس کے نتیجے میں تم لوگ ہلاکت و تباہی کے ہولناک کھڈے میں جا گرو۔ والعیاذ باللہ العظیم۔
شیطان تم لوگوں کو دور کی گمراہی میں ڈالنا چاہتا ہے : پس تم لوگ اس سے محتاط رہو۔ سو اس ارشاد سے دور کی گمراہی سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ ملعون ان کو ایسی دور کی گمراہی میں ڈالنا چاہتا ہے جہاں سے پھر ان کو راہ حق کی طرف پھر لوٹنا نصیب ہی نہ ہو سکے۔ اور اس طرح یہ لوگ ضلالت و گمراہی کے عمیق اور ہولناک گڑھے میں گر کر ہمیشہ کیلئے ہلاکت اور تباہی کا شکار ہو جائیں۔ والعیاذ باللہ۔ سو تمہیں شیطان کے مکر و فریب سے ہمیشہ محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے خواہ وہ شیاطین انس میں سے ہو یا شیاطین جن میں سے۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَشَرِّهٖ وَكَيْدِهٖ وَمَكْرِهٖ۔ اور اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ۔ اور اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ کہ ایسے لوگوں پر اس ملعون کا وار نہیں چل سکتا۔ (مدنی)

منافق کی ورثاء کی غلط تاویلیں اور ان کا جواب

جب اس شخص کا نفاق واضح ہوا اور سیدنا حضرت عمر فاروق (رض) نے اس کو قتل کر دیا تو اس کے ورثاء نے اس کو مسلمان ظاہر کرنے کے لیے اس کی باتوں کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں کہ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو ناحق سمجھ کر نہیں چھوڑا بلکہ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ ان کے درمیان کو صلح کی صورت نکل آئے، کسی طرح ان کے درمیان صلح کرا دی جائے اس قسم کی تاویلیں کرنے لگے (آیت) "فکیف اذا اصابتھم مصیبۃ"۔ جب ان کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچ جائے اس وقت ان کا کیا حال ہوگا (آیت) "ثم جاؤک یحلفون باللہ"۔ پھر وہ آئیں آپ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے (آیت) "ان اردنا الا احسانا وتوفیقا"۔ کہ نہیں تھا ہمارا ارادہ مگر احسان اور موافقت کا، ہم تو یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح موافقت اور مصالحت کی صورت نکل آئے، اس کے علاوہ ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا (آیت) "اولئک الذین یعلم اللہ مافی قلوبھم"۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ کو سب علم ہے اللہ ان کے نفاق سے خوب واقف ہے، ان کی تاویلیں جھوٹ اور غلط ہیں (آیت) "فاعرض عنھم"۔ آپ ان سے اعراض کریں، زجر و توبیخ سے کام نہ لیں، یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کا عذر قبول کرنے سے اعراض کریں اور مقتول کے خون کا دعوی جو انھوں نے کیا ہے اس کو رد کر دیں (آیت) "وقل لھم فی انفسھم"۔ اور ان کی ذاتوں کے بارے میں ان کو نصیحت کرتے رہیں، کبھی تو نصیحت کام آ ہی جائے گی، اور یہ لوگ پکے مسلمان بن جائیں گے۔

رسول مطاع بنا کر بھیجا جاتا ہے

(آیت) "وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ"۔ ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس لیے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے اب جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا تو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا جیسا کافروں کے ساتھ کیا جاتا ہے اس لیے سیدنا حضرت عمر فاروق (رض) نے اگر اس شخص کو قتل کر دیا جس نے رسول کی اطاعت نہیں کی تو بالکل درست کیا، اب وہ شخص تو قتل ہو گیا پھر اس کے ورثاء کو، متعلقین کو ایک مشورہ دیا جا رہا ہے کہ اس کے متعلقین نے جو غلط تاویلیں کیں اور شر کو خیر بنانے کی کوشش کی ان لوگوں نے بھی اللہ کی نافرمانی کی ہے، ان کو چاہیے تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت حاضر ہو کر استغفار کرتے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔

قبولیت توبہ کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضری کی شرط:

اس آیت میں توبہ کے قبول ہونے کے لیے یہ جو حاضری کی شرط لگائی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے لیے استغفار کرتے تو توبہ قبول ہوتی، یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے براہ راست منصب نبوت پر حملہ کیا تھا اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کیا تھا، غلط تاویلیں نکالی تھیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دکھ پہنچایا تھا اس لیے شرط لگا دی کہ ان کا یہ جرم تب معاف ہوگا جب یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگیں گے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لیے استغفار کریں گے، ورنہ تمام گناہوں سے توبہ کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضری اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا استغفار کرنا شرط نہیں ہے یہ خاص انہی لوگوں کے لیے حکم ہے، اور اسی سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جو شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اس کے لیے استغفار فرمادیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات مبارکہ میں ہوتی تھی روضہ اقدس پر حاضری بھی اسی کے حکم میں ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا کفر ہے

(آیت) "فلاوربک لایؤمنون حتی یحکموک "اس آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو پوری طرح تسلیم نہ کرے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ پر اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرے یعنی مومن ہونے کی شرط ہے کہ تمام معاملات میں فیصل رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلیم کریں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کسی فیصلہ سے اعراض وانحرف نہ کریں یہی وجہ ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ تسلیم نہ کرنے والے کو حضرت عمر (رض) نے قتل کر دیا اور آپ سے بدلہ بھی نہیں لیا گیا۔
اور پھر مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ بات حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دنیاوی زندگی کے ساتھ خاص نہیں ہے جس وقت تک آپ ﷺ دنیا میں موجود تھے اس وقت تک آپ ﷺ کی ذات سامنے تھی اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد آپ ﷺ کی شریعت اور قرآن وحدیث کا فیصلہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ ہی ہے اس لیے یہ حکم قیامت تک جاری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں بلاواسطہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو مغرب سے متاثر ہو کر اسلامی قوانین اور بالخصوص حدود کو ظالمانہ قرار دیتے ہیں اسلامی احکام پر راضی نہیں کافروں کے قوانین کو اچھا خیال کرتے ہیں یہ خیال کرنے کے بعد یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا دین اور اسلام سے کتنا تعلق باقی رہ جاتا ہے صرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فیصل تسلیم کرنا ہی ایمان کی شرط نہیں بلکہ آپ ﷺ کے فیصلہ کو دل وجان سے تسلیم کرنا اور اس کے بارے میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرنا بھی ایمان کی شرط ہے۔ (تبیان الفرقان)

مسائل

۱۔ قرآن وسنت کے خلاف فیصلہ کرنا اور کروانا شیطان کی پیروی کرنے کے مترادف ہے۔
۲۔ شیطان آدمی کو دور کی گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔
۳۔ منافق اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات سے انحراف کرتے ہیں۔
۴۔ اس سے معلوم ہوا کہ بخوشی کفار کو حکم بنانا ان کے قوانین پر فریفتہ ہونا سخت جرم ہے، مجبوری کی معافی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا ۚ‏ ﴿۶۱﴾

لغات القرآن:[وَاِذَا : اور جب] [قِيْلَ : کہا جاتا ہے] [لَهُمْ : انہیں] [تَعَالَوْا : آؤ] [اِلٰى: طرف] [مَآ اَنْزَلَ : جو نازل کیا] [اللّٰهُ : اللہ] [وَاِلَى: اور طرف] [الرَّسُوْلِ : رسول] [رَاَيْتَ : آپ دیکھیں گے] [الْمُنٰفِقِيْنَ : منافقین] [يَصُدُّوْنَ : ہٹتے ہیں] [عَنْكَ : آپ سے] [صُدُوْدًا : رک کر]

ترجمہ : اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف آ جاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیں۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

یہ آیات ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جو اپنا فیصلہ عدالت میں لے جانے کی بجائے سرداران یہود یا سرداران قریش کی طرف لے جانا چاہتے تھے تاہم اس کا حکم عام ہے اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو کتاب و سنت سے اعراض کرتے ہیں اور اپنے فیصلوں کے لئے ان دونوں کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف جاتے ہیں۔ ورنہ مسلمانوں کا تو یہ حال ہوتا ہے (اِنَّمَا كَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا) 024:051 کہ جب انہیں اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں کہ سَمِنَا وَاَطَعۡنَا ایسے لوگوں کے بارے میں آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ) 024:051 یہی لوگ کامیاب ہیں۔ (احسن)

اس سے معلوم ہوا کہ منافقین کی یہ عادت تھی کہ جس مقدمہ کے متعلق انھیں یہ یقین ہوتا کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کے تصفیہ کے لیے تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے اور جس کے متعلق یہ خیال ہوتا کہ ہم جھوٹے ہیں اس کے لیے ایسے حاکم کے پاس جاتے جہاں انھیں معلوم ہوتا کہ ہم اپنے اثر و رسوخ یا رشوت سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لیں گے۔ آج بھی بعض لوگ ایسے امور میں تو شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے پر بڑے مصر ہوتے ہیں جہاں انھیں فائدہ کی توقع ہو اور جہاں یہ خیال ہو کہ شریعت کا قانون ان کے خلاف ہے تو اس وقت دوسرے قوانین اور رسم و رواج وغیرہ کی آڑ لیتے ہیں اور شریعت کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ آپ خود سوچیں کہ ان کے درمیان اور عہد رسالت کے منافقین کے درمیان پھر کیا فرق ہوا۔ (ضیاء)

ابن جریج نے بیان کیا کہ جب مسلمان منافقوں سے کہتے تھے کہ آؤ اپنے مقدمہ کا فیصلہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کراؤ تو وہ منہ موڑ کر کتراتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ (جامع البیان ج ۵ ص ۹۹)

یہاں منافقوں کے بارے میں فرمایا کہ ویسے تو اے حبیب ! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، آپ سے منہ پھیرتے ہیں لیکن جب ان پر ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت آپڑے جیسے بِشر منافق پر آپڑی تو کیا پھر بھی یہ آپ سے اعراض کریں گے ؟ ہر گز نہیں۔ بلکہ اس وقت اپنی کرتوتوں کی تاویلیں کرنے کے لئے قسمیں کھاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی اور دو فریقوں میں اتفاق کرانا تھا، اس لئے ہمارا آدمی یہودیوں کے پاس فیصلے کیلئے جانے لگا تھا۔ (صراط)

جس منافق کو حضرت عمر (رض) نے قتل کیا تھا اس کا قصاص لینے کے لیے اس کے اہل آئے اور معذرت کر کے کہنے لگے کہ ہم نے جو حضرت عمر (رض) سے فیصلہ کرانے کے لیے کہا تھا اس سے ہمارا صرف یہ مقصد تھا کہ اس منافق کے ساتھ نیک سلوک ہو اور اس منافق اور اس کے مخالف یہودی کے درمیان صلح ہو جائے ' اس آیت میں اس مصیبت سے مراد اس منافق کا قتل کیا جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان منافقوں کے دلوں میں جو شر اور فتنہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے ' آپ ان کے بہانوں کو قبول کرنے سے اعراض کیجئے کیونکہ ان کے بہانوں کے قبول کرنے کا مطلب ہے حضرت عمر (رض) سے قصاص لینا اور جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ نہ مانے اس کا خون مباح ہے اور اس کا کوئی قصاص نہیں ہے ' آپ ان کو زبان سے نصیحت کیجئے اور ان کے نفاق سے درگذر کیجئے۔ (تبیان)

تفسیر القشیری میں یوں بیان ہوا

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافق تم سے سخت منہ پھیر لیتے ہیں۔ کلمہ حق کے علاوہ ہر چیز منافقوں کے لیے آسان ہے۔ [دوسری طرف] خدا کی وحدانیت کا اعلان صرف وہی لوگ سنتے ہیں جو مخلص ہیں۔ وہ لوگ جو مخالف ہیں وہ سچ نہیں سنتے کیونکہ جو مخلص نہیں ہیں ان کے لئے ذاتی خواہشات کی مخالفت کرنا مشکل ہے۔ جس طرح چمگادڑ کی آنکھ سورج کی طرف منہ کرنے سے عاجز ہوتی ہے منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ثابت قدم نہ رہ سکے اور یہی ان کی سختی سے منہ موڑنے کا سبب بنا۔

آیت مبارکہ:

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَـٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾

لغات القرآن: [فَكَیْفَ : تو کیسا ہوگا] [اِذَآ : جب] [اَصَابَتْہُمْ : آن لگے گی ان کو] [مُّصِیْبَۃٌم : کوئی مصیبت] [بِمَا : اس کے سبب سے جو] [قَدَّمَتْ : آگے بھیجا] [اَیْدِیْہِمْ : ان کے ہاتھوں نے] [ثُمَّ : پھر] [جَآئُ وْکَ : وہ آئیں گے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس] [یَحْلِفُوْنَ : قسم کھاتے ہوئے] [بِاللّٰہِ : اللہ کی] [اِنْ : (کہ) نہیں

] [اَرَدْنَآ : ارادہ کیا ہم نے] [اِلَّآ : مگر] [اِحْسَانًا : بھلائی کا] [وَّتَوْفِيْقًا : اور ہم آہنگ کرنے کا]

ترجمہ : پھر (اس وقت) ان کی حالت کیا ہوگی جب اپنی کارستانیوں کے باعث ان پر کوئی مصیبت آن پڑے تو اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں (اور یہ کہیں) کہ ہم نے تو صرف بھلائی اور باہمی موافقت کا ہی ارادہ کیا تھا۔

تفسیر و تشریح:

پروردگار منافقین کو آنے والے دنوں کا حوالہ دے کر اپنی حالت پر غور کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ آج تو ان کا حال یہ ہے کہ بڑھ چڑھ کر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات اللہ اور رسول کے سامنے پیش کرو تو کسی نہ کسی بہانے سے پہلو بچا کے نکل جاتے ہیں اور حتی الامکان ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنا کوئی معاملہ اللہ کے رسول کی عدالت میں لے کر نہ جائیں۔ حالانکہ ان کے ایمان کا تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات کو حرز جان بنائیں اور انہی کے فیصلوں کو آخری سند اور اتھارٹی سمجھیں۔ لیکن اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ان کے کرتوت ان کے راز افشا کر دیں گے اور ان کے عزائم بے نقاب ہو جائیں گے اور ان کی اصلیت واضح ہو جائے گی۔ تو پھر یہ دوڑے دوڑے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آئیں گے کیونکہ وہی ایک دروازہ ایسا ہے 'جس میں رحمت کے سوا اور کچھ نہیں اور پھر جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اب تک جو رویہ اختیار کیا۔ آخر اس کا سبب کیا تھا کیونکہ تمہیں تو دعویٰ تھا مومن ہونے کا اور مومن ہو کر پھر طاغوت کے پاس اپنے معاملات لے کے جانا ان دونوں باتوں میں تو کوئی جوڑ نہیں تو پھر وہ دور از کار باتیں بنانے کی کوشش کریں گے 'کہ ہمارے پیش نظر صرف مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور یہود کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھتی چلی جائے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یعنی ہمارے پیش نظر مصالحت اور موافقت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس مصیبت اور اس طرح کے حالات پیش آنے کا مفہوم کیا ہے۔ بعض مفسرین کا گمان یہ ہے کہ جس طرح بشر صریحاً اللہ کے رسول کے فیصلے سے انکار کر کے حضرت عمر (رض) کے غضب کا نشانہ بنا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ باقی لوگ بھی کبھی نہ کبھی اپنے کرتوتوں کے باعث پکڑے جائیں گے۔ ان کی حرکتیں بھی کھل کے رہیں گی۔ وہ بھی بشر کی طرح اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔ لیکن ان آیات کریمہ پر گہرے تدبر سے اگر کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستقبل کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے 'جس کی تعبیر اگرچہ پردہ غیب میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے کہ وہ منافقین کو قبل از وقت مطلع فرما رہے ہیں اور جن لوگوں کی حالات پر نظر گہری تھی 'ان کے لیے یہ باتیں بعید از قیاس نہ تھیں۔ بات یہ کہی جا رہی ہے کہ آج تو تم یہود کی پشت پناہی کے باعث اسلام کو اور مسلمانوں کو وہ اہمیت نہیں دے رہے جو بجا طور پر دینی چاہیے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں کہ جب اسلام کو غلبہ عمومی حاصل ہوگا اور یہود آہستہ آہستہ اپنا دم خم کھو بیٹھیں گے اور انھیں مدینے سے جانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا جائے گا کہ منافقین کے معاملہ میں وہ چشم پوشی اور اغماض کی روش بدل دیں اور جس طرح اب تک ان کو بہر صورت برداشت کرنے کی پالیسی چل رہی تھی 'اسے چھوڑ کر احتساب شروع کر دیں۔ پھر منافقین کو اندازہ ہوگا کہ ہم جن کے بل بوتے پر شرارتیں کرتے رہے اور جن مسلمانوں کی کریم النفسی اور وسعت ظرف کے باعث مہلت سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ اب صورتحال ایسی

تبدیل ہوئی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی ہے اور یہود پشت پناہی کے لائق نہیں رہے۔ تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آکر مختلف قسم کے عذر پیش کریں۔

قرآن کریم نے یہاں جس پیشگوئی کو ذکر فرمایا ہے۔ جنگ خندق کے بعد وہ وقت آگیا کہ جب یہ پیشگوئی حقیقت کی شکل اختیار کر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بنونضیر اور بنوقینقاع کو پہلے شہر بدر کیا جاچکا تھا۔ بنوقریظہ قتل کر دیے گئے۔ اب مدینے کے ماحول کو خالص اسلامی ماحول میں تبدیل کرنے کا وقت آگیا۔ اور حالات کا تقاضا ہوا کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کا مکمل غلبہ ہو۔ فتح مکہ کا معرکہ قریب آرہا تھا۔ اس کی تیاری کے لیے آستین کے سانپوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے اب تیزی سے منافقین کا احتساب شروع ہوا اور اس وقت منافقین کو اندازہ ہوا کہ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کریم النفسی اور نرم خوئی سے فائدہ نہ اٹھا کر بہت سخت غلطی کی۔ لیکن یہ وہ باتیں ہیں جو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں ' اس پیش گوئی میں ان باتوں کی تصویر دیکھی جاسکتی تھی۔ لیکن اس وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پروردگار فرمارہے ہیں کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ' آپ انھیں سن لیجیے لیکن ان کی حقیقت وہ نہیں جو کچھ کہا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلی ارادوں کو جانتا ہے۔ یہ تو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ہم توامت کی خیر خواہی اور سازگاری کے جذبے سے یہ سب کچھ کرتے رہے۔ حالانکہ یہ منافقت اور طاغوت پرستی کا فساد تھا جو انھیں اسلام کی طرف سے یکسو نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ دل میں امید لگائے بیٹھے تھے کہ اسلام اور یہود کی اس کشمکش میں ہوسکتا ہے کہ یہود کا پلڑا بھاری ہوجائے تو پھر یہ ہماری پالیسی ہمارے کام آئے گی اور ہم انھیں اپنی موجودہ پالیسی کا حوالہ دے کر مفادات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور فرض کریں اگر مسلمان ہی غالب آتے ہیں تو تب بھی مسلمانوں میں ہمارا شامل رہنا ہمارے مفادات کی حفاظت کے لیے ضمانت بن جائے گا۔ لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ ابھی ان سے کچھ نہ کہئے ' البتہ انھیں نصیحت فرمایئے اور فہمائش کیجیے۔ البتہ اس نصیحت میں پہلے نرم روی اور شبنمی انداز کا غلبہ رہتا تھا ' اب تھوڑی سی لہجے میں تبدیلی پیدا کیجیے۔ اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دیجیے کہ ان سے جو کچھ کہا جارہا ہے یہ خود ان کے لیے بہتر ہے ' ان کی اس روش سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور ان کو یہ بات اس انداز میں فرمایئے جو دل میں دھنس جانے والی ہو ' یعنی دل میں وہ ایک چبھن محسوس کریں اور سمجھ لیں کہ اگر ہم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ (روح)

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ میں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی کہ آپ اجازت دیں تو میں عبداللہ بن ابی منافق کا سر قلم کر دوں لیکن آپ نے منع فرمایا اور کہا لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کراتا ہے۔

[رواہ البخاری : تفسیر القرآن، قولہ یقولون لئن رجعنا إلی المدینۃ]

تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ابن ابی اپنے اصل کردار کی وجہ سے اس قدر لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوا کہ کوئی اس کے پروپیگنڈہ کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ اور اس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ (فہم)

مسائل

۱۔ مصیبت کے وقت منافق قسم اٹھا کر مسلمانوں کی رفاقت کا دعوی کرتا ہے۔

۲۔ منافقوں سے چشم پوشی کر کے انھیں اچھی نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔

آیت مبارکہ:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

لغات القرآن:[اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ : وہ لوگ ہیں کہ] [یَعْلَمُ : جانتا ہے] [اللّٰہُ : اللہ] [مَا : اس کو جو] [فِیْ قُلُوْبِہِمْ : ان کے دلوں میں ہے] [فَاَعْرِضْ : تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعراض کریں] [عَنْہُمْ : ان سے] [وَ : اور] [عِظْہُمْ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کریں ان کو] [وَقُلْ : اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہیں] [لَّہُمْ : ان سے] [فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ : ان کے جی (یعنی دل) میں] [قَوْلاً م بَلِیْغًا : ایک پہنچنے (یعنی اترنے) والی بات]

ترجمہ : یہ وہ (منافق اور مفسِد) لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کی ہر بات کو خوب جانتا ہے، پس آپ ان سے اعراض برتیں اور انھیں نصیحت کرتے رہیں اور ان سے ان کے بارے میں موثر گفتگو فرماتے رہیں۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

علم

العِلْمُ : إدراک الشيء بحقیقته،

(ع ل م) العلم

کسی چیز کی حقیقت کاادراک کرنا.

قلب

(ق ل ب) قلب الشئی کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے : وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ [العنکبوت/21] اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اعرض

(ع ر ض) العرض

اعرض عنی اس نے مجھ سے روگردانی کی اعراض کیا۔ قرآن میں ہے : ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْها [السجدة/22] تو وہ ان سے منہ پھیرے۔ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ [النساء/63] تم ان سے اعراض برتو اور نصیحت کرتے رہو۔

وعظ

(وع ظ) الوعظ

کے معنی ایسی زجر توبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہوا عظۃ و موعضۃ دونوں اسم ہیں قرآن میں ہے :۔ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ [النحل/90] نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔(مفردات)

مطلب یہ ہے کہ جو کفر و نفاق ان کے دلوں میں بھرا ہوا ہے اس کو اللہ تعالیٰ۔۔ جانتا ہے اور یہ اپنے کفر و نفاق کی بنا پر چونکہ شریعت اسلامیہ کے فیصلہ کو پسند نہیں کرتے اس لیے دوسروں کے پاس جاتے ہیں لیکن اس وقت مصلحت اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ان سے کوئی مواخذہ نہ کریں۔ البتہ ان کو نصیحت فرماتے رہیں کہ اس قسم کی حرکات سے باز آجاؤیہ باتیں بری ہیں اور ان کے حق میں سے ایسی بات کہو جو موثر ہو یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب کی باتوں کو جانتا ہے اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے تم اپنی اصلاح کرو اور اپنے نفسوں کو خصائل رذیل اور صفات ذمیمہ سے پاک کرو وغیرہ وغریہ

بلیغ وہ کلام ہے جس کا مدلول مقصود کے مطابق ہو بعض حضرات نے فاعرض عنھم کے یہ معنی کئے ہیں کہ ان کا عذر قبول کرنے سے اعراض کیجیے یا منافق مقتول کا جو خوں بہا طلب کر رہے ہیں اس سے اعراض کیجیے کیونکہ اس کا خون نا قابل التفات اور یہ خون کا مطالبہ بے کار ہے۔ (واللہ اعلم)

اب آگے ان منافقوں کے لیے دوسری بات فرماتے ہیں کہ اگر قسمیں کھا کر غلط بات کہنے کی بجائے یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اقرار کر لیتے اور توبہ استغفار کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا (تسہیل)

اس صریح سرکشی کے بعد بھی مولائے کریم اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان سے مواخذہ نہ کرنے اور ان کی اصلاح وہدایت کے لیے کوشاں رہنے کی تلقین فرمارہاہے۔ اسی کے متعلق تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ادبنی ربی فاحسن تادیبی میرے رب نے مجھے آداب اخلاق کی تعلیم دی ہے اور خوب دی ہے۔ (ضیاء)

منافقوں کا کچا چٹھا

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور ان کی معذرت سابقہ کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو کچھ زبانی باتیں بنائیں بنانے دو اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں یعنی ان کے نفاق اور ان کے جھوٹ کو خوب جانتا ہے۔ سو آپ بھی علم خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل کیجئے اور ان کی بات کی پروانہ کیجئے مگر ان کو نصیحت کرنے اور کام کی باتیں بتانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیں اور ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہوجیے۔

حضرت عمر (رض) کا لقب

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اسی واقعہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اور نبی کریم نے حضرت عمر کو فرمایا انت الفارق تو فاروق ہے اور جبرائیل نے یہ کہا، ان عمر فرق بین الحق والباطل فسمی الفاروق۔ تحقیق عمر نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا اس لیے ان کا نام فاروق رکھا گیا۔ اور اسی بارے میں یہ تمام آیتیں نازل ہوئیں۔

ایک غریب روایت

ایک زیادہ غریب روایت میں شان نزول یہ مروی ہے کہ دو شخص اپنا جھگڑا لے کر دربار محمد میں آئے آپ نے فیصلہ کر دیا لیکن جس کے خلاف فیصلہ تھا اس نے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ہمیں حضرت عمر (رض) کے پاس بھیج دیجئے آپ نے فرمایا بہت اچھا ان کے پاس چلے جاؤ جب یہاں آئے تو جس کے موافق فیصلہ ہوا تھا اس نے سارا ہی واقعہ کہہ سنایا حضرت عمر (رض) نے اس دوسرے سے پوچھا کیا یہ سچ ہے ؟ اس نے اقرار کیا آپ نے فرمایا اچھا تم دونوں یہاں ٹھہرو میں آتا ہوں اور فیصلہ کر دیتا ہوں تھوڑی دیر میں تلوار تانے آ گئے اور اس شخص کی جس نے کہا تھا کہ حضرت ہمیں عمر (رض) کے پاس بھیج دیجئے گردن اڑا دی دوسرا شخص یہ دیکھتے ہی دوڑا بھاگا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچا اور کہا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا ساتھی تو مار ڈالا گیا اور اگر میں بھی جان بچا کر بھاگ کر نہ آتا تو میری بھی خیر نہ تھی، آپ نے فرمایا میں عمر کو ایسا نہیں جانتا تھا کہ وہ اس جرات کے ساتھ ایک مومن کا خون بہا دے گا اس پر یہ آیت اتری اور اس کا خون برباد گیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر (رض) کو بری کر دیا۔ (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭوَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾

لغات القرآن: [وَمَآ : اور نہیں] [اَرْسَلْنَا : ہم نے بھیجا] [مِنْ رَّسُوْلٍ : کوئی رسول] [اِلَّا : مگر] [لِيُطَاعَ : تاکہ اطاعت کی جائے] [بِاِذْنِ اللّٰهِ : اللہ کے حکم سے] [وَلَوْ : اور اگر] [اَنَّھُمْ : یہ لوگ] [اِذْ ظَّلَمُوْٓا : جب انہوں نے ظلم کیا] [اَنْفُسَھُمْ : اپنی جانوں پر] [جَاۗءُوْكَ : وہ آتے آپ کے پاس] [فَاسْتَغْفَرُوا : پھر بخشش چاہتے وہ] [اللّٰهَ : اللہ]

[وَاسْتَغْفَرَ : اور مغفرت چاہتا] [لَهُمُ : ان کے لیے] [الرَّسُوْلُ : رسول] [لَوَجَدُوا : تو وہ ضرور پاتے] [اللّٰهَ : اللہ] [تَوَّابًا : توبہ قبول کرنے والا] [رَّحِيْمًا : مہربان]

ترجمہ : اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے، اور (اے حبیب !) اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بناپر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

رسولوں کی تشریف آوری کا مقصد

یہاں رسولوں کی تشریف آوری کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیجتا ہی اس لیے ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اَنبیاء ورُسُل (علیہ السلام) کو معصوم بناتا ہے کیونکہ اگر انبیاء (علیہ السلام) خود گناہوں کے مُرتکِب ہوں گے تو دوسرے ان کی اطاعت واِتّباع کیا کریں گے۔ رسول کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی اطاعت کا طریقہ ہی رسول کی اطاعت کرنا ہے۔ اس سے ہٹ کر اطاعت الٰہی کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں لہٰذا جو رسول کی اطاعت کا انکار کرے گا وہ کافر ہوگا اگرچہ ساری زندگی سر پر قرآن اٹھا کر پھرتا رہے۔ آیت کے اس حصے میں اگرچہ ایک خاص واقعے کے اعتبار سے کلام فرمایا گیا، البتہ اس میں موجود حکم عام ہے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو سَرورِ دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شفاعت طلب کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی بارگاہ میں آجائیں کہ یہ بارگاہ، رب کریم عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ ہے، یہاں کی رضا، رب عَزَّوَجَلَّ کی رِضا ہے اور یہاں کی حاضری، ربِ کریم عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ کی حاضری ہے، یہاں آئیں اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے ساتھ حبیب ربُّ العٰلمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں بھی شفاعت کیلئے عرض کریں اور نبی مُکَرَّم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کیلئے سفارش فرمادیں تو ان لوگوں پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت و مغفرت کی بارشیں برسنا شروع ہو جائیں گی اور اس پاک بارگاہ میں آکر یہ خود بھی گناہوں سے پاک ہو جائیں گے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں "بندوں کو حکم ہے کہ ان (یعنی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر توبہ واستغفار کریں۔ اللہ تو ہر جگہ سنتا ہے، اس کا علم، اس کا سمع (یعنی سننا)، اس کا شہود (یعنی دیکھنا) سب جگہ ایک سا ہے، مگر حکم یہی فرمایا کہ میری طرف توبہ چاہو تو میرے محبوب کے حضور حاضر ہو قال تعالیٰ :

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (٦٤)

اگر وہ جو اپنی جانوں پر ظلم کریں تیرے پاس حاضر ہو کر خدا سے بخشش چاہیں اور رسول ان کی مغفرت مانگے تو ضرور خدا کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

حضور کے عالم حیات ظاہری میں حضور (یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہونا) ظاہر تھا، اب حضور مزار پرانوار ہے اور جہاں یہ بھی مُیَسَّر نہ ہو تو دل سے حضور پرنور کی طرف توجہ، حضور سے تَوَسُّل، فریاد، اِستِغاثہ، طلب شفاعت (کی جائے) کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) اب بھی ہر مسلمان کے گھر میں جلوہ فرما ہیں۔ مولانا علی قاری عَلَیۡہِ رَحۡمَۃُ الۡبَارِی شرح شفا شریف میں فرماتے ہیں "رُوۡحُ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حَاضِرَۃٌ فِیۡ بُیُوۡتِ اَھۡلِ الۡاِسۡلَامِ "ترجمہ: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر مسلمان کے گھر میں جلوہ فرما ہیں۔ (فتاوی رضویہ، ۶۵۴/۱۵)

یاد رہے کہ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری حیات مبارکہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اور وصالِ ظاہری کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مزارِ پر انوار پر حاضری دے کر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے، اپنی مغفرت ونجات کی اِلتجاء کرنے اور اپنی مشکلات کی دوری چاہنے کا سلسلہ صحابہ کرام (رض) سے چلتا آرہا ہے۔ چنانچہ ذیل میں اس سے متعلق چند واقعات ملاحظہ ہوں

بارگاہِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہو کر گناہوں کی معافی چاہنے کے 3 واقعات

(1)۔۔ حضرت ابو لبابہ بن عبدالمنذر (رض) سے غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر ایک خطا سرزد ہوگئی تو آپ (رض) اس قدر نادم ہوئے کہ خود کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا: جب تک اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول نہیں فرمائے گا تب تک نہ میں کچھ کھاؤں گا، نہ پیوں گا، نہ کوئی چیز چکھوں گا، یہاں تک کہ مجھے موت آجائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب ان کے بارے میں پتا چلا تو ارشاد فرمایا: اگر یہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لیے مغفرت طلب کرتا لیکن اب اس نے خود کو باندھ لیا ہے تو جب تک اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہ فرمائے گا، میں نہیں کھولوں گا۔ سات دن تک حضرت ابو لبابہ (رض) نے نہ کوئی چیز کھائی، نہ پی، نہ چکھی، حتّٰی کہ ان پر غشی طاری ہوگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، جب انھیں توبہ کی قبولیت کے بارے میں بتایا گیا تو فرمایا: خدا کی قسم! میں اس وقت تک خود کو نہیں کھولوں گا جب تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لا کر اپنے دستِ اقدس سے مجھے نہیں کھولتے۔ چنانچہ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور اپنے پیارے صحابی (رض) کو بندشوں سے آزاد فرمادیا۔ (دلائل النبوہ للبیہقی، باب مرجع النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من الاحزاب ومخرجہ الی بنی قریظۃ۔۔ الخ، ۱۳/۴۔۱۴، خازن، الانفال، تحت الآیۃ: ۲۷، ۱۹۰/۲)

(2)۔۔ بارگاہِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں توبہ ورُجوع کی ایک دوسری روایت ملاحظہ فرمائیں، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ (رض) فرماتی ہیں: میں نے ایک ایسا بستر خریدا جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں جب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے دیکھا تو دروازے پر کھڑے ہوگئے اور گھر میں داخل نہ ہوئے، میں نے آپ کے روئے انور پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تو عرض گزار ہوئی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، مجھ سے جو نافرمانی ہوئی میں اس سے اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں توبہ کرتی ہوں۔ ارشاد فرمایا: یہ گدا یہاں کیوں ہے؟ عرض کی: میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے خریدا تھا تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پر تشریف فرما ہوں اور اس سے ٹیک لگائیں۔ سرکارِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ان تصویروں (کو بنانے) والے قیامت کے دن عذاب دیئے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: جو تم نے بنایا انھیں زندہ کرو۔ "اور ارشاد فرمایا: "جس گھر میں تصویریں ہوں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (بخاری، کتاب البیوع، باب التجارۃ فیما یکرہ لبسہ للرجال والنساء، ۲۱/۲، الحدیث: ۲۱۰۵)

(3)۔۔ حضرت ثوبان (رض) فرماتے ہیں کہ چالیس صحابہ کرام (رض) جن میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رض) بھی تھے جمع ہو کر جبر وقدر میں بحث کرنے لگے تو روح الأمین حضرت جبرائیل (علیہ السلام) حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ باہر اپنی امت کے پاس تشریف لے جائیں انھوں نے ایک نیا کام شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس حال میں باہر تشریف لائے کہ غصہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ مبارک سرخی میں اس طرح نمایاں تھا جیسے سرخ انار کا دانہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رخسار مبارک پر نچوڑا گیا ہو۔ صحابہ کرام (رض) حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس کیفیت کو دیکھ کر کھلے بازو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور ان کا حال یہ تھا کہ ان کے ہاتھ اور بازو کانپ رہے تھے اور عرض کی "تُبْنَا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" "ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں توبہ پیش کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قریب تھا کہ تم اپنے اوپر جہنم کو واجب کر لیتے، میرے پاس جبرائیل امینعَلَیْہِ السَّلَام تشریف لائے اور عرض کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر امت کے پاس تشریف لے جائیں، انھوں نے نیا کام شروع کر دیا ہے۔ (معجم الکبیر، ثوبان مولی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ۵۹/۲، الحدیث: ۱۴۲۳)

مزار پر انوار پر حاضر ہو کر حاجتیں اور مغفرت طلب کرنے کے 5 واقعات

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضری کا یہ طریقہ صرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری حیات مبارکہ میں نہ تھا بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال مبارک کے بعد بھی یہ عرض ومعروض باقی رہی اور آج تک ساری امت میں چلتی آ رہی ہے۔ چنانچہ

(1)۔۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق (رض) کے دور خلافت میں قحط پڑ گیا تو صحابی رسول حضرت بلال بن حارث المزنی (رض) نے سلطان دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر انور پر حاضر ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اپنی امت کے لیے بارش کی دعا فرما دیجئے وہ ہلاک ہو رہی ہے۔ سرکارِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خواب میں ان سے ارشاد فرمایا: تم حضرت عمر (رض) کے پاس جا کر میرا سلام کہو اور بشارت دے دو کہ بارش ہو گی اور یہ بھی کہہ دو کہ وہ نرمی اختیار کریں۔ حضرت بلال بن حارث (رض) بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے اور خبر دے دی۔ حضرت عمر فاروق (رض) یہ سن کر رونے لگے، پھر فرمایا: یا رب! عَزَّوَجَلَّ، میں کوتاہی نہیں کرتا مگر اسی چیز میں کہ جس سے میں عاجز ہوں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفضائل، ماذکر فی فضل عمر بن خطاب (رض)، ۴۸۲/۷، الحدیث: ۳۵، وفاء الوفائ، الباب الثامن فی زیارۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، الفصل الثالث، ۱۳۷۴/۲، الجزء الرابع)

(2)۔۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں شدید قحط پڑا، اہل مدینہ نے حضرت عائشہ صدیقہ (رض) کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا: سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر انور دیکھو اور چھت میں ایک روشندان بناؤ حتّٰی کہ روضہ منور اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے، اہل مدینہ نے جیسے ہی روشندان بنایا تو اتنی کثیر بارش ہوئی کہ سبز گھاس اگ آئی اور اونٹ موٹے ہو گئے یہاں تک کہ گوشت سے بھر گئے۔ (سنن دارمی، باب ما اکرم اللہ تعالیٰ نبیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بعد موتہ، ۵۶/۱، الحدیث: ۹۲)

(3)۔۔ بادشاہ ابو جعفر منصور نے حضرت امام مالک (رح) سے مسجد نبوی شریف میں مناظرہ کیا، دوران مناظرہ ابو جعفر کی آواز کچھ بلند ہوئی تو امام مالک (رح) نے اسے (ڈانٹتے ہوئے) کہا: اے امیر المومنین! اس مسجد میں اپنی آواز اونچی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کو ادب سکھایا کہ "تم اپنی آوازوں کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کرو۔" اور دوسری جماعت کی تعریف فرمائی کہ "بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں پست کرتے ہیں۔" اور ایک قوم کی مذمت بیان کی کہ "بیشک وہ جو تمہیں حجروں کے

باہر سے پکارتے ہیں۔ "بیشک آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عزت وحرمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری حیات میں تھی۔ یہ سن کر ابو جعفر خاموش ہو گیا، پھر دریافت کیا: اے ابو عبداللہ! میں قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگوں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف متوجہ ہو کر؟ فرمایا: تم کیوں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منہ پھیرتے ہو حالانکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے اور تمہارے والد حضرت آدم (علیہ السلام) کے بروز قیامت اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں وسیلہ ہیں بلکہ تم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی طرف متوجہ ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شفاعت مانگو پھر اللہ تعالیٰ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ (شفا شریف، القسم الثانی، الباب الثالث، فصل واعلم انّ حرمۃ النبی۔۔الخ، ص ۴۱، الجزء الثانی)

(4)۔۔ مروان نے اپنے زمانہ تسلطمیں ایک صاحب کو دیکھا کہ حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر انور پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہیں، مروان نے (ان کی گردن مبارک پکڑ کر) کہا: جانتے ہو کیا کر رہے ہو؟ اس پر ان صاحب نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ہاں، میں کسی اینٹ پتھر کے پاس نہیں آیا ہوں، میں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور حاضر ہوا ہوں۔۔ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دین پر نہ روؤجب اس کا اہل اس پر والی ہو، ہاں اس وقت دین پر روؤ جبکہ نااہل والی ہو۔ یہ صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری (رض) تھے۔ (مسند امام احمد، حدیث ابی ایوب الانصاری، ۱۴۸/۹، الحدیث: ۲۳۶۴۶)

(5)۔۔ حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات شریف کے بعد ایک اعرابی روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور روضہ انور کی خاک پاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہِ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو آپ نے فرمایا، ہم نے سنا اور جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا، اس میں یہ آیت بھی ہے "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا" میں نے بیشک اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں اللہ عَزَّوَجَلَّ سے اپنے گناہ کی بخشش چاہنے حاضر ہوا ہوں تو میرے رب عَزَّوَجَلَّ سے میرے گناہ کی بخشش کرائیے۔ اس پر قبر شریف سے ندا آئی کہ تجھے بخش دیا گیا۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۶۴، ص ۲۳۶)

الغرض یہ آیتِ مبارکہ سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم مدح وثنا پر مشتمل ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت (رح) نے بہت سے اشعار فرمائے ہیں۔ چنانچہ "حدائق بخشش" میں فرماتے ہیں:

مجرم بلائے آئے ہیں جَآءُوکَ ہے گواہ پھر رد ہو کب یہ شان کریموں کے در کی ہے

اور فرمایا:

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مَفَر مَقَر جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

اور فرمایا:

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا ہمیں بھیک مانگنے کو تیرا آستاں بتایا

آیت "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ" سے معلوم ہونے والے احکام:

اس آیت سے 4 باتیں معلوم ہوئیں۔

(1)۔۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاجت پیش کرنے کے لیے اس کے مقبولوں کو وسیلہ بنانا کامیابی کا ذریعہ ہے۔

(2)۔۔ قبرِ انور پر حاجت کے لیے حاضر ہونا بھی "جَآءُوْکَ" میں داخل اور خَیرُ القُرون کا معمول ہے۔

(3)۔۔ بعد وفات مقبولان حق کو "یا" کے ساتھ ندا کرنا جائز ہے۔

(4)۔۔ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی مدد فرماتے ہیں اور ان کی دعا سے حاجت روائی ہوتی ہے۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد

اور ہم نے ہر رسول کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو یہ آپ کے پاس آ جاتے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانیوالا پاتے۔ (النساء : ٦٤)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کو سرزنش کی ہے جو دعوی یہ کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ پر نازل والی کتاب پر ایمان لائے ہیں اپنے مقدمہ کا فیصلہ یہودی عالم کے پاس لے جاتے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرنے کیلیے جب انھیں بلایا جاتا تو وہ منہ موڑ کر کترا کر نکل جاتے تھے 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس نے ہر رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ' مجاہد نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ نعمت مقدر کر دی ہے۔

پھر فرمایا جب ان منافقوں نے کعب بن اشرف کے پاس اپنا مقدمہ پیش کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر ہی لیا تھا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ آپ کے پاس آکر معذرت کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی چاہتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو وہ ضرور اللہ کو بہت بخشنے والا اور مہربان پاتے۔ (تبیان)

شان نزول

آیہ کریمہ کا یہ ہے کہ پہاڑوں سے آنے والا پانی جس سے باغوں میں آب رسانی کرتے ہیں اس میں حضرت زبیر (رض) سے ایک انصاری کا تنازعہ ہوگیا۔ مقدمہ بارگاہ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فیصلہ دیا کہ زبیر اپنے باغ کو پانی دے کر اپنے ہمسایہ کی طرف وہ پانی چھوڑ دے۔ یہ فیصلہ انصاری کو گراں گزرا اور اس کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا کہ زبیر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پھوپھی زاد بھائی ہیں باآں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت زبیر کو انصاری کے ساتھ احسان کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ لیکن انصاری نے اس کی قدر نہ کی حضور ﷺ نے دوبارہ حکم دے دیا کہ زبیر اپنا باغ سیراب کر کے پانی روک لو انصافاً تم ہی بوجہ قرب کے مستحق ہو اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ (خازن، روح المعانی) اس کے بعد نظیر میں گزشتہ واقعہ پیش فرما کر جو بنی اسرائیل میں پیش آیا ایک صحابی کے دعویٰ کا رد کیا گیا۔ (حسنات)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ پر حاضر ہو کر شفاعت طلب کرنے کا جواز

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لیے اللہ سے درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت

توبہ قبول کرنے والااور بہت مہربان پائیں گے ' مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابو منصور الصباغ بھی ہیں ' انھوں نے اپنی کتاب الشامل میں عبتی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آکر کہا السلام علیک یارسول اللہ ! میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے۔ (آیت) "ولوانھم اذظلموا انفسھم جاؤک "۔الآیہ، اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں ' پھر اس نے دو شعر پڑھے :

اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبودار ہوگئے۔

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف وکرم ہے۔

پھر وہ اعرابی چلا گیا 'عبتی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آگئی میں نے خواب میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عتبی ! اس اعرابی کے پاس جاکر اس کو خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کردی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۲۹۔ ۳۲۸ 'الجامع لاحکام القرآن ج ۵ ص ۲۶۵ 'البحر المحیط ج ۳ ص ۶۹۴ 'مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج ا ص ۳۹۹)

چنانچہ ارشاد ہے۔

ومارسلنا من رسول الالیطاع باذن اللہ۔

اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ جب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھیجنا ہی اس لیے ہے کہ وہ مطاع بنائے جائیں تو واضح ہوا کہ رسل اکرام کی اطاعت فرض ہے اور جو ان کے حکم سے راضی نہ ہو گویا اس نے حقیقتاً تسلیم رسالت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہیں کیا اور ایسا شخص واجب القتل اور کافر ہے۔ حضرت ابو بکر عاصم (رض) فرماتے ہیں کہ کچھ منافقوں نے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا پہنچانے کی نیت کی جب یہ لوگ بری نیت سے حاضر ہوئے تو دربار رسالت پناہ میں مہاجرین وانصار کا مجمع تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگ اس مجلس میں بری نیت سے آئے ہیں جس میں وہ کامیاب نہ ہوسکیں گے وہ کھڑے ہوکر اخلاص سے اپنے رب کے حضور توبہ کریں ہم بھی دعا مغفرت کریں گے۔ پھر دوبارہ ارشاد فرمایا یہ لوگ نہ اٹھے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نام لے کر محفل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ بارہ تھے۔انھوں نے معذرت چاہی ان کی توبہ قبول نہ ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر علی الخصوص ذات مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کے منصب کو ظاہر کیا گیا اور فرمایا۔

الوانھم اذظلموا انفسھم جاءوک فاستغفر واللہ واستغفر لھم الرسول لوجدواللہ توابا رحیما۔ فلاوربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدو فی انفسھم حرجامما قضیت ویسلمو تسلیما۔ اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کرلیں تو (اے محبوب) وہ تمہارے حضور حاضر ہوں پھر بخشش مانگیں اللہ سے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی سفارش کریں تو ضرور اللہ کو پائیں توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ تو (اے محبوب) تیرے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھے حاکم نہ مانیں پھر جو کچھ تو حکم دے اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی مان لیں۔ اذظلمو۔ یعنی نافرمانی ومعصیت کرکے اپنے کو مجرم بنالیں تو آپ ہی کا ذریعہ وہ ذریعہ ہے جس سے وہ نجات پاسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہ احدیت میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی شفاعت ہی کار برآری کا ذریعہ ہے۔ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد ایک اعرابی روضہ اطہر پر حاضر ہوا انور قبر مبارک کی خاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم جو آپ نے فرمایا ہم نے سنا اور جو آپ پر نازل ہوا اس میں یہ آیت بھی ہے۔ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے حضور اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بخشش مانگنے حاضر ہوا ہوں تو اب آپ میرے رب سے میرے گناہوں کی بخشش کرا دیجئے۔ اس پر قبر شریف سے ندا آئی کہ او اعرابی جا تیری بخشش کی گئی۔

اس سے چند مسائل مستنبط ہوئے۔

1۔ بارگاہ الٰہی میں عرض حاجت کے لیے مقبولان بارگاہ کا وسیلہ لینا ذریعہ کامیابی ہے۔ 2

۔ قبر پر حاجت روائی کے لیے جانا بھی جاؤک میں داخل ہے اور خیر القرون کا معمول رہا ہے۔

3۔ بعد وفاقت مقبولان حق کو یا کے ساتھ ندا کرنا جائز ہے۔

4۔ مقبولان الٰہی مدد فرماتے ہیں ان کی دعا سے حاجت مندوں کی حاجتیں بر آتی ہیں۔

5۔ پھر ذات مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قسم کے بعد آپ کا دوسرا منصب ظاہر فرمایا کہ آپ کا حکم ہی حکم ہے اور آپ کا فیصلہ جب تک بصدیق دل نہ مانا جائے کوئی مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ (حسنات)

آیت مبارکہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

لغات القرآن: [فَلَا وَرَبِّكَ : پس قسم ہے آپ کے رب کی] [لَا يُؤْمِنُوْنَ : وہ مومن نہ ہوں گے] [حَتّٰي : جب تک] [يُحَكِّمُوْكَ : آپ کو منصف بنائیں] [فِيْمَا : اس میں جو] [شَجَرَ : جھگڑا اٹھے] [بَيْنَهُمْ : ان کے درمیان] [ثُمَّ : پھر] [لَا يَجِدُوْا : وہ نہ پائیں] [فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ : اپنے دلوں میں] [حَرَجًا : کوئی تنگی] [مِّمَّا : اس سے جو] [قَضَيْتَ : آپ فیصلہ کریں] [وَيُسَلِّمُوْا : اور تسلیم کرلیں] [تَسْلِيْمًا : خوشی سے]

ترجمہ: پس (اے حبیب ﷺ !) آپ ﷺ کے رب کی قسم یہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ ﷺ کو حاکم بنالیں پھر اس فیصلہ سے جو آپ ﷺ صادر فرما دیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ ﷺ کے حکم کو) بخوشی پوری فرماں برداری کے ساتھ قبول کرلیں۔

تفسیر و تشریح:

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اہل مدینہ پہاڑ سے آنے والے پانی سے باغوں میں آبپاشی کرتے تھے۔ وہاں ایک انصاری کا حضرت زبیر (رض) سے جھگڑا ہوا کہ کون پہلے اپنے کھیت کو پانی دے گا۔

شان نزول حضرت زبیر (رض) اس طرح بیان کرتے ہیں

(اِنَّ رَجُلاً مِّنَ الاَنْصَارِ خَاصَمَ الزُّبَيْرَ عِنْدَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فِيْ شِرَاجِ الْحَرَّةِ الَّتِيْ يَسْقُوْنَ بِهَا النَّخْلَ فَقَالَ الاَنْصَارِيُّ سَرِّحِ الْمَآءَ يَمُرُّ فَاَبٰى عَلَيْهِ فَاخْتَصَمَا عِنْدَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لِلزُّبَيْرِ اِسْقِ يَازُبَيْرُ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَآءَ اِلٰى جَارِكَ فَغَضِبَ الاَنْصَارِيُّ فَقَالَ اِنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ فَتَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ثُمَّ قَالَ اسْقِ يَازُبَيْرُ ثُمَّ احْبِسِ الْمَآءَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَى الْجُدُرِ فَقَالَ الزُّبَيْرُ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَحْسِبُ هٰذِهِ الاٰيَةَ نَزَلَتْ فِيْ ذٰلِكَ (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ) [رواہ البخاری: کتاب المساقاۃ، باب سکر الانھار]

"انصار کے ایک آدمی کا حضرت زبیر (رض) سے پانی کے نالے کے بارے میں اختلاف ہو گیا جس سے وہ کھجوروں کو پانی دیتے تھے۔ انصاری نے کہا پانی چھوڑ واسے آگے آنے دو۔ حضرت زبیر (رض) نے انکار کیا دونوں اپنا جھگڑا رسول گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں لائے تو آپ نے حضرت زبیر (رض) سے فرمایا زبیر! پانی لگا کر ہمسائے کے لیے چھوڑ دو۔ انصاری نے غضبناک ہو کر کہا وہ آپ ﷺ کی پھوپھی کا بیٹا ہوا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ متغیر ہو گیا پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا زبیر! پانی لگا جب تک وہ منڈیروں تک نہ پہنچ جائے پانی کو روکے رکھنا۔ حضرت زبیر (رض) فرماتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت "فَلَا وَرَبِّكَ" اس موقعہ پر نازل ہوئی ہے۔
"

بغوی نے لکھا ہے فیصلہ کے بعد جب دونوں باہر آئے اور مقداد (رض) کی طرف سے گزرے اور حضرت مقداد (رض) نے پوچھا کس کے حق میں فیصلہ ہوا تو انصاری نے منہ بگاڑ کر کہا ان کی پھوپھی کے بیٹے کے حق میں۔ حضرت مقداد (رض) کے پاس ایک یہودی موجود تھا اس نے انصاری کی حرکت محسوس کر لی اور بولا ان کو خدا کی مار شہادت بھی دیتے ہیں کہ (محمد) اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں پھر جو فیصلہ وہ کر دیتے ہیں اس پر (جانب داری کی) تہمت بھی لگاتے ہیں خدا کی قسم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی میں ہم سے ایک گناہ ہو گیا تھا اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ہم کو توبہ کی طرف بلایا اور حکم دیا کہ خود آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دو۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی کہ مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی آخر ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا۔ حضرت ثابت (رض) بن شماس بن قیس نے فرمایا سنو اللہ میری سچائی کا گواہ ہے۔ خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے خودکشی کا حکم دے دیں تو میں ضرور حکم کی تعمیل کروں گا۔ (مظہری)

خودکشی اسلام میں فعل مستحق عذاب ہے۔ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں؟ مصیبت وآلام کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے خودکشی کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

النساء، 4:29،30

"اور اپنی جانوں کو مت ہلاک کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے ۝ اور جو کوئی تعدّی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے (دوزخ کی) آگ میں ڈال دیں گے، اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے" ۝

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ یدل علی النهی عن قتل غیره وعن قتل نفسه بالباطل.

رازی، التفسیر الکبیر، 10:57

''(اور اپنی جانوں کو مت ہلاک کرو)۔ یہ آیت مبارکہ کسی شخص کو ناحق قتل کرنے اور خودکشی کرنے کی ممانعت پر دلیل شرعی کا حکم رکھتی ہے۔''

اور حدیث مبارکہ میں یوں آیا

احادیث مبارکہ میں حضور تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودکشی کے مرتکب شخص کو دُہرے عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملاحظہ ہوں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله عنه عَنِ النَّبِيِّ صلی الله علیه وآله وسلم قَالَ: مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ، يَتَرَدّٰى فِيْهِ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا. وَمَنْ تَحَسّٰى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَسُمُّهُ فِي يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا. وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ، فَحَدِيْدَتُهُ فِي يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ، خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا.

1. بخاری، الصحیح، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء به وبما یخاف منه والخبیث، 5:2179، رقم: 5442
2. مسلم، الصحیح، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم قتل الانسان نفسه وإن من قتل نفسه بشیء عذب به فی النار، 1:103، رقم: 109
3. ترمذی، السنن، کتاب الطب، باب ما جاء فیمن قتل نفسه بسم او غیره، 4:386، رقم: 2044
4. ابوداود، السنن، کتاب الطب، باب الأدویة المکروهة، 4:7، رقم: 3872

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے خود کو پہاڑ سے گرا کر ہلاک کیا تو وہ دوزخ میں جائے گا، ہمیشہ اس میں گرتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کیا تو وہ زہر دوزخ میں بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ میں کھاتا ہوگا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔ اور جس شخص نے اپنے آپ کو لوہے کے ہتھیار سے قتل کیا تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔'' تو پھر اس حدیث پاک میں کیوں آیا؟ دراصل جناب ثابتؓ نے یہودی کو یہودی کی سی زبان میں بات سمجھائی۔ کہ دیکھو ہم تو آقا ﷺ کے فرمان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں صرف ایک آیت و حدیث شریف بیان کی ہے اتنا کافی ہے۔

اس آیت کریمہ میں اس مضمون کو پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ کھول دیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے ایک قاری کی نگاہ قسم پر پڑتی ہے کہ "اے پیغمبر! تیرے رب کی قسم ہے۔" اور اس کے بعد منافقین کے بارے میں ان کے عدم ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب مخاطب کو بات کہنے والے کی بات کا اعتبار نہ ہو۔ اور اس کے نزدیک قائل کی حیثیت ایسی معتبر نہ ہو کہ اس کی ذات کا حوالہ باقی ہر چیز سے مستغنی کر دے۔ تو پھر بات کہنے والا اپنی بات کو موکد اور قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے قسم کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن جس کی ذات ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہو اسے ان سہاروں کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی۔ پروردگار کے بارے میں کوئی بدتر سے بدتر آدمی بھی تصور نہیں کر سکتا کہ اس کی کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔ خود قرآن کریم نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی

ہے وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا (اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے)۔ لیکن یہاں پروردگار بات کہنے سے پہلے قسم کھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ قسم کے ذریعے اپنی بات کا اعتبار پیدا کر رہا ہے۔ بلکہ یہاں دو وجہ سے قسم کھائی جا رہی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ منافقین کو اس بات کا اچھی طرح یقین آ جائے کہ اللہ کے نزدیک وہ ایمان کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں جس میں اللہ کے رسول کی اطاعت اور محبت میں کمی ہو۔ وہ ہزار ایمان کے دعوے کریں لیکن ایمان کے لیے لازمی سند وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں آگے پیش فرمائی جا رہی ہے۔ اور دوسری وجہ قسم کھانے کی شاید یہ ہے کہ اس سے پہلے آیت نمبر ۶۳ میں پروردگار نے منافقین کی قسم کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آپ کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے ایمان میں اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارے رویے میں منافقت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں پروردگار نے منافقین کی اس جھوٹی قسم کی تردید سچی قسم کے ساتھ فرمائی ہے کہ وہ اپنا اعتبار جمانے کے لیے ہزار قسمیں کھائیں وہ سب جھوٹی ہیں۔ سچی قسم یہ ہے کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ اور مزید یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وَرَبِّ۔کگے خطاب میں جس طرح پروردگار نے اپنی اضافت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کی طرف فرمائی ہے اور جس طرح التفاتِ خاص کا ثبوت دیا ہے اس سے منافقین اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ جس پیغمبر کی اطاعت اور محبت کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اس کا مقام و مرتبہ اللہ کی نگاہ میں کیا ہے؟ قسم تو یقیناً اللہ کے نام کی ہوتی ہے اس لیے پروردگار یہ بھی فرما سکتے تھے کہ "مجھے اپنی قسم ہے" لیکن بطور خاص یہ فرمانا کہ "تیرے رب کی قسم ہے" اس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جس طرح دلنوازی اور عظمت شان کا اہتمام کیا گیا ہے اس کی وضاحت کے لیے تو شہپر جبرائیل چاہیے' انسانی زبان یا قلم میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس کی نزاکتوں کا حق ادا کر سکے۔

ایمان کے ثبوت کے لیے تین شرائط

1 کہ تمہارے ایمان کا اس وقت تک کوئی اعتبار نہیں جب تک تم اپنی زندگی کے تمام اختلافات میں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آخری حکم' سند اور اتھارٹی نہ سمجھو۔ اس میں دو باتیں انتہائی قابل غور ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے رسول کی فیصلہ کن حیثیت صرف عبادات یا خالص دینی امور میں نہیں' بلکہ اعتقادات سے لے کر معاملات تک اور پھر عدالتوں سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک' قومی معاملات سے لیکر بین الاقوامی معاملات تک تک' کسی سطح پر بھی اور کسی دائرے میں بھی کوئی معاملہ سر اٹھائے جس میں امت کے اہل علم یا عوام اور حکمرانوں میں یہ اختلاف ہو جائے کہ اس معاملے میں راہ صواب اور نقطہ اعتدال کیا ہے؟ تو اس کے فیصلے کے لیے صرف اللہ کے رسول کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اگرچہ رجوع سب سے پہلے قرآن حکیم کی طرف کیا جائے گا' لیکن قرآن کریم کے اصولوں کی عملی تعبیر' اس کے مبہمات کی وضاحت' اس کے مجملات کی تشریح' چونکہ یہ صرف اللہ کے رسول کا کام ہے اس لیے عملی طور پر اللہ کے رسول کی ذات ہی مرجع ہوگی۔ کوئی آدمی یا کوئی گروہ صرف اعتقادات یا عبادات میں تو اللہ کے رسول کی طرف دیکھتا ہے لیکن باقی پوری زندگی میں وہ اللہ کے رسول کو حَکَم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ منافق ہے اور اس کے ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اور دوسری یہ بات کہ اگر کوئی شخص زندگی کے ہر معاملے میں زبانی طور پر تو اللہ کے رسول کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے' لیکن عملی طور پر وہ اللہ کے رسول یعنی قرآن و سنت کو حقیقی اہمیت دینے اور واقعی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جب کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اظہار عقیدت و محبت کا وقت آئے تو وہ سب سے پیش پیش ہو' لیکن جب اس سے اجتماعی' تہذیبی' تمدنی' حکومتی اور تعلیمی معاملات

میں آنحضرت یعنی قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ صاف پہلو بچا کر نکل جائے تو ایسا شخص بھی اللہ کی نگاہ میں مومن نہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے تمام معاملات اور اختلافی امور میں جب تک آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فیصلہ کن حیثیت تسلیم نہ کی جائے اس وقت تک ایمان ناقابل اعتبار رہتا ہے۔ اور ایسا شخص حقیقت میں مومن نہیں ہوتا۔

2 دوسری بات اس آیت کریمہ میں ایمان کے ثبوت کے لیے یہ فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ' سند اور اتھارٹی تسلیم کرلینا ہی کافی نہیں ' بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلوں کو جو قرآن و سنت کی شکل میں موجود ہیں اور قیامت تک کے لیے باقی رہیں گے انھیں دل و جان سے قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ یعنی زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ دل کی تصدیق اور دل کا میلان بھی ضروری ہے۔ جیسے ہی کسی معاملے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس معاملے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایت یہ ہے تو اگر دل اسے قبول کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں نفاق موجود ہے۔ حقیقی ایمان کے لیے انشراح قلب اور طبیعت کا یکسو ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے اہل علم اس کے بارے میں کوئی بھی رائے رکھیں ' لیکن ایک مومن کے لیے اللہ کے رسول کی رائے کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دل میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا حقیقی ایمان ہے ' جس کے بغیر اللہ کے یہاں ایمان کا اعتبار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی بات کا حکم دیتے تھے تو صحابہ (رض) فوراً سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ اٹھتے تھے اور ان کا انگ انگ اطاعت میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ جیسے جیسے اطاعت کی کلفتوں سے گزرتے تھے ویسے ویسے ان کے دلوں کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

3 تیسری چیز حقیقت میں متذکرہ دونوں چیزوں کا نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص اللہ کے رسول کی اصل حیثیت کو تسلیم کرلیتا ہے ' پھر اللہ کے رسول کے ہر فیصلے پر وہ دل و جان سے جھک جاتا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک ایک ادا پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری ذات کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دے دیتا ہے ' اپنی خواہشات سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنے نفع و ضرر کے پیمانوں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اب اس کے سامنے نفع وہ ہے جسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نفع قرار دیں اور نقصان وہ ہے جسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نقصان قرار دیں۔ ان تین باتوں کا خلاصہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث میں بیان فرما دیا۔ ارشاد فرمایا لایؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لماجئت بہ (تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی خواہشات نفس اس تعلیم اور شریعت کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کے آیا ہوں)۔ اس حدیث پر اگر غور کریں تو پوری زندگی اس میں سمٹ آتی ہے۔ گھر میں بھی حضور کی سنت حکومت کرتی نظر آتی ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر ادارے میں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی آنحضرت یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت کا ڈنکا بجتا سنائی دیتا ہے۔ (روح)

بعض مفسرین نے یہ واقعہ بھی شان نزول میں بیان کیا ہے

" حضرت معقل بن یسار (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور میں مسلمانوں کے ایک آدمی سے اپنی بہن کی شادی کی وہ اس کے پاس کچھ عرصہ رہی پھر اس نے اسے ایک طلاق دی اور عدت بھی گزر گئی لیکن رجوع نہ کیا۔ اب پھر دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے پھر اس آدمی نے منگنی کے لیے آدمی بھیجا تو معقل بن یسار (رض) نے کہا: کمینے ! میں نے تیری عزت کرتے ہوئے اس کے ساتھ شادی کی اور تو نے اسے طلاق دے دی۔ اللہ کی قسم اب کبھی یہ تیرے پاس نہیں لوٹے گی یہ آخری باری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں میاں بیوی کے جذبات کو قبول کیا

تو یہ آیت نازل فرمائی (وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ) جب معقل بن یسار (رض) نے یہ آیت سنی تو کہا کہ سَمْعًا لِرَبِّیْ وَطَاعَةً میں نے اپنے رب کی بات کو سنا اور مان لیا۔ پھر انھوں نے اس آدمی کو بلایا اور کہا میں تیری شادی بھی کرتا ہوں اور عزت بھی۔ " [رواہ الترمذی: کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ البقرۃ] (فہم)

مسائل

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیر مشروط اطاعت واتباع کو پھر نہایت واضح، موکد اور موثر پیرایہ میں بیان فرمایا جارہا ہے۔ واؤ قسم کے لیے ہے۔ نفی ایمان پر دلالت کرنے کے لیے لا نفی کو دو بار ذکر کیا ہے۔ ایک بار قسم سے پہلے اور دوسری مرتبہ قسم کے بعد۔ یعنی تیرے رب جلیل کی قسم وہ ہر گز ہر گز ایماندار نہیں ہوسکتے۔ اگر ایک لاء نفی پر اکتفا کیا جاتا تو عبارت لغوی لحاظ سے تو درست ہوتی لیکن یہ زور بیان مفقود ہوتا۔ امام ابن جریر وغیرہ کا قول ہے کہ اس آیت کا تعلق بھی اسی سابقہ واقعہ سے ہے اور یہ حکم بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری حیات تک نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ ہر شخص کے لیے ہے اور یہی ایمان کی اساس ہے۔ جو شخص اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سرتابی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق قسم سے موکد کرکے اپنا فیصلہ یہ دیتا ہے کہ وہ مومن نہیں۔ وہاں تو وہی اطاعت قبول ہے جو اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع و پیروی میں ہو اور وہی مطیع، مطیع ہوگا جو مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی غلامی کا طوق زیب گلو کئے حاضر ہوگا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ (ضیاء)

اور بتادیا گیا کہ حبیب خدا، محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کو تسلیم کرنا فرض قطعی ہے۔ جو شخص تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا وہ کافر ہے، ایمان کا مدار ہی اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کو تسلیم کرنے پر ہے۔

آیت "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ" سے معلوم ہونے والے مسائل:

اس آیتِ مبارکہ سے 7 مسائل معلوم ہوئے۔

(1)۔۔اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اپنے رب ہونے کی نسبت اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف فرمائی اور فرمایا اے حبیب ﷺ! تیرے رب کی قسم۔ یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پہچان اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعے سے کرواتا ہے۔

(2)۔۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ماننا فرض قرار دیا اور اس بات کو اپنے رب ہونے کی قسم کے ساتھ پختہ کیا۔

(3)۔۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ماننے سے انکار کرنے والے کو کافر قرار دیا۔

(4)۔۔ تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حاکم ہیں۔

(5)۔۔اللہ عَزَّوَجَلَّ بھی حاکم ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی البتہ دونوں میں لامتناہی فرق ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سی صفات جو اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوتی ہیں اگر وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے استعمال کی جائیں تو شرک لازم نہیں آتا جب تک کہ شرک کی حقیقت نہ پائی جائے۔

(6)۔۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم دل و جان سے ماننا ضروری ہے اور اس کے بارے میں دل میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا کہ پھر اپنے دلوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کے متعلق کوئی رکاوٹ نہ پائیں اور دل و جان سے تسلیم کرلیں۔

(7)۔۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی احکام کا ماننا فرض ہے اور ان کو نہ ماننا کفر ہے نیز ان پر اعتراض کرنا، ان کا مذاق اڑانا کفر ہے۔اس سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو کافروں کے قوانین کو اسلامی قوانین پر فَوقِیَّت دیتے ہیں۔(صراط)
اخذ مسائل:

علامہ قرطبی نے تفسیر قرطبی میں یہ مسائل بیان کئے

مسئلہ نمبر: (۲) جب اس آیت کے نزول کا سبب وہ ہے جو ہم نے حدیث سے ذکر کیا تو اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت زبیر (رض) اور اس کے خصم کے بارے فیصلہ دیا وہ بطور صلح تھا، آپ نے فرمایا: "اے زبیر تو پانی پلا"۔ کیونکہ پانی اس کے قریب تھا۔ "پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دے "یعنی اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور پورا پورا حق نہ لے اور اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑنے میں جلدی کر (۲) (صحیح بخاری، کتاب الصلح، جلد ۱، صفحہ ۳۷۳)
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت زبیر کو مسامحت اور آسانی کرنے پر ابھارا جب انصاری نے یہ سنا اور اس سے راضی نہ ہوا اور ناراض ہوا، کیونکہ ہو چاہتا تھا کہ حضرت زبیر (رض) بالکل پانی کو نہ روکے، تو اس نے اپنی زبان سے غلط ہلاک کرنے والا، شان رسالت کے جو لائق نہ تھا وہ کلمہ بولا، اس نے کہا: یہ اس لیے فیصلہ فرمایا ہے کہ زبیر تمہاری پھوپھی کا بیٹا ہے، اس کے جملہ میں آن ہے یہ ان مفتوحہ انکار کی جہت پر ہمزہ کی مد کے ساتھ ہے۔اس وقت نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا غصہ کی وجہ سے چہرہ متغیر ہو گیا، پھر آپ نے حضرت زبیر (رض) کے لیے پورا پورا حق لینے کا فیصلہ دیا وہ کسی قسم کی مسامحت کا مظاہرہ نہ کریں، اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حالت غضب میں کیسے فیصلہ فرمایا جب کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے"۔ (۳) (سنن ابی داؤد کتاب القضا، جلد ۲، صفحہ ۱۴۹) ہم کہیں گے: آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تبلیغ اور احکام میں خطا سے معصوم تھے عقل کی دلیل کے ساتھ جو دلالت کرتی ہے کہ آپ جو اللہ کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اس میں سچے ہیں، دوسرا کوئی آپ کی مثل نہیں ہے، اس حدیث میں ہے کہ حاکم جھگڑنے والوں کے درمیان اصلاح کا راستہ اختیار کرے اگرچہ اس پر حق ظاہر بھی ہو جائے، امام مالک (رح) نے اس سے منع کیا ہے امام شافعی (رح) کا قول اس میں مختلف ہے۔ اس حدیث میں جواز پر واضح حجت ہے۔اگر وہ صلح کر لیں تو فبہا ورنہ صاحب حق اپنا پورا حق وصول کرے گا اور حکم ثابت ہو گا۔
مسئلہ نمبر: (۳) امام مالک (رح) کے اصحاب کا اوپر والے کا نیچے والے کی طرف پانی چھوڑنے کی صفت میں اختلاف ہے۔ابن حبیب نے کہا: اوپر والا تمام پانی اپنے باغ میں داخل کرے گا اس سے اپنے باغ کو سیراب کرے گا حتی کہ پانی باغ میں اتنا ہو جائے کہ کھڑا ہونے والے کے ٹخنوں تک پہنچ جائے تو پھر پانی کا راستہ بند کرے اور ٹخنوں سے جو زائد مقدار میں پانی ہو وہ اپنے قریبی کی طرف چھوڑے معاملہ اسی طرح چلتا جائے حتی کہ پانی آخری کھیت والے کو پہنچ جائے میرے لیے مطرف اور ابن الماجشون نے اسی طرح تفسیر بیان کی ہے، یہ ابن وہب کا قول ہے ابن القاسم نے کہا: جب پانی باغ میں ٹخنوں کی مقدار تک پہنچ جائے، تو تمام پانی نیچے والے کی طرف چھوڑ دیں اور اپنے باغ میں کچھ بھی نہ روکے، ابن حبیب نے کہا: مطرف ابن الماجشون کا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے وہ اسے زیادہ جانتے تھے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں ان دونوں کا گھر تھا وہاں یہ واقعہ پیش آیا اور وہاں یہ عمل جاری تھا۔
مسئلہ نمبر: (۴) امام مالک (رح) نے حضرت عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ انھیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مہزور اور مذینب (مدینہ طیبہ کی دو وادیاں جن میں بارش کا پانی بہتا تھا) کے پانی کے بارے میں فرمایا: "(پہلے باغ والا) پانی کو ٹخنوں تک روک لے پھر وہ نیچے والے کی طرف چھوڑ دے"۔ (۱) (موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ ۶۴۳)

ابو عمر نے کہا: میں یہ حدیث نہیں جانتا کہ کسی طریق سے نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متصل مروی ہو اس کی ارفع سند یہ ہے محمد بن اسحاق عن ابی مالک بن ثعلبۃ عن ابیہ، نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مہزور والے آئے تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ پانی جب ٹخنوں تک پہنچ جائے اوپر والا پانی کو نہ روکے۔ (۲) (المعجم الکبیر اللطبرانی جلد ۲، صفحہ ۸۶۔ حدیث نمبر ۱۳۸۶)

عبدالرزاق نے ابو حازم قرطبیؒ سے انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے اپنے دادا سے، انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ "مہزور کے پانی میں یہ فیصلہ فرمایا کہ ہر کھیت میں پانی کو روک لیا جائے گا حتی کہ ٹخنوں تک پہنچ جائے گا تو پھر چھوڑ دیا جائے گا اس کے علاوہ پانیوں کا یہی حکم ہو گا"۔ ابو بکر البزار سے اس حدیث کے بارے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میں نے نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے بارے میں حدیث محفوظ نہیں کی جو ثابت ہو۔ ابو عمر (رض) نے کہا: اس معنی میں اگرچہ اس لفظ کے ساتھ حدیث ثابت نہیں ہے جس کی صحت پر اجماع ہے، اسے ابن وہب نے لیث بن سعد اور یونس بن یزید سے ان دونوں نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ عروہ بن زبیر نے انھیں بیان فرمایا کہ انھیں حضرت عبداللہ بن زبیر (رض) انھیں حضرت زبیر (رض) سے روایت کر کے بتایا کہ ان کا ایک انصاری شخص سے پانی کی نالی میں جھگڑا ہوا دونوں اس نالی سے اپنے کھجوروں کے باغات کو سیراب کرتے تھے، یہ انصاری شخص نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوا تھا، انصاری نے کہا: "تو پانی چھوڑ دے" زبیر نے انکار کیا، دونوں اپنا جھگڑا نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے گئے، آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ ابو عمر نے کہا: ایک حدیث میں یرسل کے الفاظ ہیں اور دوسری میں اذا بلغ الماء الکعبین لم یحبس الاعلی (جب پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اوپر والا نہ روکے) یہ ابن القاسم کے قول کی تائید کرتے ہیں، نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اوپر والا اگر پانی نہیں چھوڑے گا مگر جو ٹخنوں سے زائد ہو گا تو وہ پانی تھوڑی مدت میں ختم نہیں ہو گا اور وہ نہیں پہنچے گا وہاں تک جہاں اس نے پہنچنا ہے جب تمام پانی چھوڑے اور اوپر والا اگر ٹخنوں تک پانی لینے کے بعد چھوڑ دے تو اس میں عام فائدہ ہے اور زیادہ نفع ہے اس صورت میں تمام لوگوں شریک بنایا گیا ہے پس ہر حال میں ابن القاسم کا قول اولی ہے جب کہ اسفل (نیچے والا) کے لیے اس کی اصل ملک نہ ہو جو اس کے ساتھ خاص ہوا گر کوئی کسی عمل کی وجہ سے یا ملک صحیح کی وجہ سے یا قدیمی استحقاق اور ملک کے ثبوت کی وجہ سے پانی کا مستحق ہو تو ہر ایک اپنے حق پر قائم رہے گا جیسا کہ اس کا قبضہ ہے اور اصل مسئلہ ہے، وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر: (۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (آیت) "ثم لایجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت"۔ حرجا کا معنی تنگی اور شک ہے اسی وجہ سے گھنے درخت وحرج وحرجۃ کہا جاتا ہے، اس کی جمع حراج ہے، ضحاک (رض) نے کہا: اس کا معنی ہے جو اب آپ نے فیصلہ فرمایا اس کا انکار کر کے گناہ نہ پائیں (آیت) "ویسلموا تسلیما"۔ یعنی فیصلہ میں آپ کے امر کی اطاعت کریں، زجاج نے کہا: "تسلیما"۔ مصدر موکد ہے اور جب تو کہتا ہے: ضربت ضربا"۔ تو گویا تو کہتا ہے: میں اس میں شک نہیں کرتا اسی طرح (آیت) "ویسلموا تسلیما"۔ یعنی وہ آپ کے فیصلہ کو اس طرح تسلیم کریں کہ ان کے نفسوں میں کوئی شک نہ ہو۔ (قرطبیؒ)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾

لغات القرآن: [وَلَوْ : اور اگر] [اَنَّا كَتَبْنَا : ہم لکھ دیتے (حکم کرتے)] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [اَنِ : کہ] [اقْتُلُوْٓا : قتل کرو تم] [اَنْفُسَكُمْ : اپنے آپ] [اَوِ اخْرُجُوْا : یا نکل جاؤ] [مِنْ : سے] [دِيَارِكُمْ : اپنے گھر] [مَّا فَعَلُوْهُ : وہ یہ نہ کرتے] [اِلَّا : سوائے] [قَلِيْلٌ: چند ایک] [مِّنْهُمْ : ان سے] [وَلَوْ : اور اگر] [اَنَّهُمْ : یہ لوگ] [فَعَلُوْا : کرتے] [مَا : جو] [يُوْعَظُوْنَ : نصیحت کی جاتی ہے] [بِهٖ : اس کی] [لَكَانَ : البتہ ہوتا] [خَيْرًا : بہتر] [لَّهُمْ : ان کے لیے] [وَاَشَدَّ : اور زیادہ] [تَثْبِيْتًا : ثابت رکھنے والا]

ترجمہ : اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کر ڈالو یا اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل جاؤ تو ان میں سے بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے، اور انھیں جو نصیحت کی جاتی ہے اگر وہ اس پر عمل پیرا ہو جاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور (ایمان پر) بہت زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہوتا۔ (عرفان)

تفسیر و تشریح:

شان نزول

ثابت بن قیس بن شماس، اب مسعود، عمار بن یاسر وغیرہم علیہم رضوان کا کچھ یہود سے مناظرہ ہوا۔ یہودی بولے کہ ہم اپنے پیغمبر موسیٰ (علیہ السلام) کے ایسے مطیع ہیں کہ انھوں نے ہم کو ایک خطا کی معافی کے لیے جان دینے کو کہا تو ہم نے بلا عذر اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کر دیا اور ستر ہزار قتل ہو گئے تمہارا یہ حال ہے کہ تمہارے نبی برحق تم کو جہان کا حکم دیتے ہیں جس میں تمہارا ہی بھلا ہے تو تم سے بعض لوگ پس و پیش کرتے ہیں۔ صحابہ کرام نے جوابا فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ہماری جانیں ہیں اگر ہم کو ہمارے آقا جان دینے اور گھر
بار چھوڑنے کا حکم دیں تو بلا تامل تعمیل کریں گے۔ یہ آیت ان کی تائید اور منافقین کے رد میں نازل ہوئی۔ (روح المعانی) اس کے بعد اطاعت الٰہی و اطاعت رسالت پناہی کا حکم ظاہر فرمایا گیا۔ (حسنات)

منافقین مشکل حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے لوگوں پر ایسے احکام نازل کیے جو نرمی اور آسانی پر مبنی ہیں۔ اگر یہ احکام سخت اور مشکل ہوتے تو لوگوں کو ان پر عمل کرنا دشوار اور ناممکن ہوتا۔ اس صورت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اگر ہم لوگوں کو اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے جگر گوشوں کو گھروں سے نکال دینے کا حکم دیتے یعنی جو نافرمان اور سرکش ہیں انھیں قتل کرنے یا گھروں سے نکال باہر کرنے کا حکم دیتے تو چند لوگوں کے سوا کوئی بھی ان پر عمل نہ کر سکتا۔ یا جس طرح موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم پر شرک کی یہ سزا تجویز کی گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں تو انھیں قتل کرنا پڑا تھا۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے معاملات میں فیصل تسلیم کرو۔ اس میں تمہارے لیے نرمی بھی ہے اور بھلائی بھی۔

(عَنْ عَائِشَۃَ (رض) اِنَّھَا قَالَتْ مَا خُیِّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بَیْنَ اَمْرَیْنِ اِلَّآ اَخَذَ اَیْسَرَھُمَا مَا لَمْ یَکُنْ اِثْمًا فَاِنْ کَانَ اِثْمًا کَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْہُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لِنَفْسِہٖٓ اِلَّآ اَنْ تُنْتَھَکَ حُرْمَۃُ اللّٰہِ فَیَنْتَقِمُ لِلّٰہِ بِھَا)

[رواہ البخاری: کتاب المناقب، باب صفۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

”حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو آپ دونوں میں سے آسان کام کو اختیار کرتے جو کام گناہ کا نہ ہوتا۔ اگر وہ کام گناہ کا ہوتا تو لوگوں میں سب سے زیادہ اس سے دور رہتے اور آپ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیا البتہ جب اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا تو اللہ کے لیے انتقام لیتے۔“

اگر منافق اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے تو ان کے لیے یہ بہتر اور ایمان کی پختگی کا باعث ہوتا۔ اس کے بدلے انھیں عظیم اجر اور مزید صراط مستقیم کی رہنمائی سے بھی نوازا جاتا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام بظاہر عمل کرنے میں مشکل کیوں نہ ہوں پھر بھی ان پر عمل کرنا آدمی کے لیے بہتر ہوا کرتا ہے۔

ابن جریر طبری بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک آدمی نے کہا کہ اگر ہمیں ایسا کرنے کا حکم ہوتا تو ہم ضرور کر گزرتے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے درگزر فرمائی ہے یہ بات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہنچی تو آپ نے فرمایا میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن میں پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ایمان ہے۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا) تلاوت فرمائی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے عبداللہ بن رواحہ (رض) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: (لَوْ اَنَّ اللّٰہَ کَتَبَ ذٰلِکَ لَکَانَ ھٰذَا مِنْ اُولٰٓءِکَ الْقَلِیْلِ) ”اگر اللہ تعالیٰ یہ کام لازم کر دیتے تو عبداللہ بن رواحہ (رض) بھی انہی تھوڑے لوگوں میں سے ہوتے جو اللہ کا حکم مان کر اپنے آپ کو قتل کرتے۔“ (ابن کثیر)

حضرت عمر (رض) نے اظہار تشکر کے طور پر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا بے پناہ فضل و کرم ہوا ہے کہ اس نے ہمیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اگر یہ حکم نازل ہو جاتا تو ہم اس پر عمل کرنے سے ہرگز گریز نہ کرتے۔ اس بات کا عملی ثبوت انھوں نے غزوہ بدر کے موقعہ پر دیا تھا کہ جب قیدیوں کے بارے میں مشاورت ہوئی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ تو دو تجاویز سامنے آئیں جن میں حضرت صدیق اکبر (رض) کی رائے یہ تھی کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس میں مسلمانوں کی مالی امداد کے ساتھ کفار کے لیے ہدایت کا آخری موقعہ فراہم کرنا تھا۔ حضرت عمر (رض) کی تجویز یہ تھی کہ یہ لوگ ناقابل معافی اور ناقابل اصلاح ہیں۔ ان کو قتل کرنے سے ہمیشہ کے لیے

کفر کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ ان کی تجویز تھی کہ ہر کوئی اپنے قریبی رشتہ دار قیدی کو قتل کرے سب سے پہلے میں اپنے رشتہ دار قیدیوں کو قتل کروں گا۔ (فہم)

[الرحیق المختوم ،غزوہ بدر کے قیدیوں کا قضیہ]

نصیحت خداوندی

یعنی سب کی جانوں کا مالک چونکہ خدا تعالیٰ ہے اس لیے اس کے حکم میں کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے۔ سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں اپنی جانوں کے ہلاک کر ڈالنے اور جلاوطن ہو جانے کا حکم فرما دیتا جیسے کہ بنی اسرائیل پر حکم کر دیا تھا تو بجا نہ لاتے اس حکم کو مگر گنے چنے صرف سچے اور پکے ایمان والے۔ یہ منافق ایسے حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا نہ جلاوطن ہونے کا۔ اگر انہی آسان اور سہل حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور خالص مسلمان ہو جائیں مگر افسوس سمجھتے نہیں اور حالت موجودہ کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ ذرا سی بات میں دین و دنیا دونوں درست ہوئے جاتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی شان

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر یہ حکم نازل ہوتا تو خدا کی قسم میں سب سے پہلے اپنے آپ اور اپنے اہل بیت کو اس پر قربان کر دیتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود و دیگر صحابہ کی شان:

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر یہ حکم خودکشی یا ترک وطن کا اللہ کی طرف سے آجاتا تو ابن ام عبد یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود ضرور اس پر عمل کرتے اور رہا دوسرا معاملہ ترک وطن کا تو صحابہ کرام نے اس پر تو عمل کر کے دکھلا دیا کہ اپنے وطن مکہ اور اپنی تمام جائیدادوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت اختیار کر لی۔ (گلدستہ)

علمائے ظواہر میں سے سید قطب شاہ صاحب نے بہت خوب لکھا ہے

اسلام ایک ایسا نظام زندگی ہے جس پر ہر وہ شخص عمل کر سکتا ہے جو مستقیم اور سلیم الفطرت ہو ،اس پر عمل کرنے کے لیے کسی خارق العادت عزم اور کسی بڑے اولوالعزم شخص کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ تو دنیا میں چند ایک ہوتے ہیں اور اسلامی نظام حیات ان چند لوگوں کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ یہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہے ،اور دنیا میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں جو مختلف درجات کے ہوتے ہیں ۔بعض کی طاقتیں اور صلاحتیں زیادہ ہوتی ہیں اور بعض کی کم۔ یہ دین لوگوں کی اوسط تعداد کو مدنظر رکھ کا بھیجا گیا ہے ،جو احکام پر عمل کر سکتے ہیں اور معاصی سے رک سکتے ہیں۔

قتل نفس اور جلاوطن دو ایسے احکام ہیں جو نہایت ہی شاق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر یہ چیزیں بطور احکام وفرائض عائد کر دیتا تو ان احکام پر لوگوں کے لیے عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اللہ نے یہ احکام اس لیے عائد نہیں کئے گئے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شکست دینا نہیں چاہتا تھا اور یہ

بھی نہ چاہتا تھا کہ لوگ ان احکام سے انکار کر دیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ سب لوگ احکام الہی پر عمل کریں۔ احکام ایسے ہوں جو سب کے دائرہ قدرت میں ہوں۔ قافلہ ایمان کے اندر تمام اوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہوں اور یہ کہ اسلامی سوسائٹی میں مختلف طبقات کے لوگ ' مختلف ہمتوں کے لوگ 'مختلف استعدادوں اور صلاحیتوں کے لوگ شامل ہوں۔ یہ سب لوگ مل کر اسلامی سوسائٹی کو ترقی دیں۔ اور ایک ایسے کثیر التعداد قافلے کی شکل میں جو طویل و عریض ہو۔

ابن جریج 'اسحاق ابوالازھر 'اسماعیل 'ابواسحاق کی سند سے ابوالحاق کہتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ (آیت) "ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم (۴ : ٦٦) تو ایک شخص نے کہا اگر اللہ حکم دیتا تو ہم ضرور ایسا کرتے لیکن اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں معاف کر دیا۔ یہ بات حضرت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہنچی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میری امت میں ایسے لوگ ہیں کہ ان کے دل میں ایمان ان پہاڑوں سے بھی زیادہ بیٹھا ہوا ہے جو نہایت ہی اونچے ہیں۔"

ایک دوسری روایت ابن ابو حاتم نے حضرت مصعب (رض) سے روایت کی ہے۔ انھوں نے اپنے چچا عامر بن عبید ابن زبیر (رض) سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

(آیت) "ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم اواخرجوا من دیارکم مافعلوہ الا قلیل منھم (۴ : ٦٦)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر یہ حکم نازل ہوتا تو ابن ام عبد ان میں سے ہوتا۔" انھوں نے ایک روایت شریح ابن عبید سے نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں 'جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی۔ (آیت) "ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم (۴ : ٦٦) تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبداللہ ابن رواحہ (رض) کی طرف اشارہ فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ یہ فرائض عائد کرتا تو یہ ان قلیل لوگوں میں سے ہوتے۔"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو نہایت ہی گہرائی سے اور نہایت ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے خصائص اور صلاحیتیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نظر میں اس قدر درست تھیں کہ وہ خود بھی اپنے بارے میں اس قدر نہ جانتے تھے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت میں ایسے بیشمار واقعات ہیں جن سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ صلاحیت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے بارے میں گہری معلومات رکھتے تھے۔ نیز حضور کو ان قبائل کی صلاحیتوں کا بھی علم تھا جن سے آپ برسرپیکار تھے۔ آپ ایک بصیرت افروز قائد کی طرح اپنے ماحول سے اچھی طرح واقف تھے اور بعض اوقات یہ معلومات نہایت ہی معجزانہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ لدنی علم پر مبنی تھیں۔

اس جگہ ہمارا یہ موضوع نہیں ہے 'یہاں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معلوم تھا کہ آپ کے ساتھیوں میں اور آپ کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو ناقابل برداشت مشکلات کو برداشت کریں گے۔ اگر یہ مشکلات ان پر فرض کر دی جائیں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ صرف ان چند ممتاز لوگوں کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیدا کئے ہوئے انسان کی فطرت کے بارے میں اچھی طرح علم تھا 'اس کی محدود طاقت کا بھی اسے علم تھا 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے احکام میں وہی کچھ فرض کیا جس پر سب لوگ عمل کر سکتے تھے 'اس لیے کہ یہ دین سب کے لیے آیا تھا 'بشرطیکہ کسی کے اندر عزم ہو 'اس کی فطرت معتدل ہو 'اور اس کے اندر اطاعت کا داعیہ ہو اور وہ اس دین کو مذاق اور غیر ضروری نہ سمجھتا ہو۔

اس حقیقت کا ذہن نشین کرنا بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصاان تخریبی تحریکات کے حوالے سے جن کی دعوت یہ ہے کہ انسان مرتبہ حیوانیت تک اتر آئے اور وہ نفسانیت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح لت پت ہو۔اس کے لیے یہ لوگ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہی انسان کی حقیقی صورت حالات ہے اور یہی اس کی طبیعت ' فطرت اور اس کی طاقت ہے اور یہ کہ دین تو اس مقام کی طرف دعوت دیتا ہے جو ایک مثالی مقام ہے 'جس کا اس کرہ ارض پر حقیقت کا روپ اختیار کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔اگر کوئی ایک فرد دین کے فرائض پر عمل پیرا ہو بھی جائے تو سو عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔

یہ نہایت ہی جھوٹا دعوی ہے۔یہفریب پر مبنی ہے۔یہ جہالت پر مبنی ہے۔اس لیے کہ یہ مدعی انسان کو اس طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح اس کو خالق رب العالمین سمجھتا ہے۔جس نے اس کے لیے دینی فرائض مقرر کیئے۔وہ ذات خالق یہ جانتی ہے کہ یہ احکام اس کے دائرہ خدمت میں ہیں۔اس لیے کہ دین چند ممتاز لوگوں کے لیے تو نہیں بھیجا گیا۔

یہ تو صرف عزم کی بات ہے 'ایک عام آدمی کی عزیمت 'اخلاص نیت اور کام کے آغاز کی بات ہے اور جب عزم نیت اور آغاز ہو جائے تو (آیت) "ولوانھم فعلوامایوعظون بہ لکان خیرالھم واشد تثبیتا (٦٦) واذالا تینھم من لدنااجراعظیما (٦٧) ولھدینھم صراطامستقیما (٦٨) " حالانکہ جو نصیحت انھیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے۔اور انھیں سیدھا راستہ دکھادیتے۔"

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس دین میں آسانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو چھوٹ دے دی جائے۔ یہ دین ایسا نہیں ہے کہ اس میں ہر طرف سے چھوٹ دی جاتی رہے اور پھر بھی وہ نظام حیات ہو۔اس میں عزیمت بھی ہے اور رخصت بھی ہے۔عزیمت تو اصل دین ہے اور رخصت بعض عارضی حالات کی وجہ سے ہے۔ہمارے بعض مخلص لوگ جو اس دین کی طرف بلاتے ہیں وہ ان کے سامنے رخصتیں پیش کرتے ہیں۔وہ ایک ایک رخصت تلاش کرتے اور اسے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے دین اور پھر وہ لوگوں کو کہتے ہیں دیکھو اس دین میں یہ یہ سہولتیں ہیں۔بعض لوگ شیطان کی خواہشات یا عوام الناس کی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں ' وہ ایک سوراخ تلاش کرتے ہیں جہاں سے نکلا جا سکے اور پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے یدن۔

یہ دین درحقیقت نہ رخصتوں کا نام ہے اور نہ ہی عزیمتوں کا نام ہے۔اس میں مجموعی طور پر دونوں چیزیں موجود ہیں اور یہ دین ایسا ہے کہ اگر ایک عام انسان اس پر عمل کے لیے عزم کرلے تو وہ اس پر عمل کر سکتا ہے۔وہ اپنی حدود بشریت کے اندر رہتے ہوئے اس کے اندر ذاتی کمال حاصل کر سکتا ہے۔جیسے ایک ہی باغ میں وہ انگور ' شہتوت 'انجیر خربوزہ 'تربوز اور دوسرے پھل پیدا ہوتے ہیں اور سب کے ذائقے جدا ہوتے ہیں کسی کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پختہ نہیں ہے۔بشرطیکہ ہو پک گیا ہو 'اگرچہ ایک کا ذائقہ دوسرے سے کم درجے کا ہو۔

اس دین کے باغ میں ساگ 'ترکاری اور کھیرے ککڑی پیدا ہوتے ہیں۔کینو اور انار پیدا ہوتے ہیں۔سیب اور اخروٹ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انگور اور انجیر پیدا ہوتے ہیں اور سب کے سب پکتے ہیں۔سب کے ذائقے مختلف ہوتے ہیں اور سب پختہ ہوتے ہیں۔اپنے اپنے درجے میں کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔دنیا اللہ کا کھیت ہے۔اس میں انسان اللہ کی تربیت میں اللہ کی نگرانی میں سہولت کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

اب آخر میں 'اس سبق کے خاتمے پر دی جاتی ہے 'دلوں کے اندر جوش پیدا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو محبوب مال ومتاع کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔یہ دولت نبیوں 'صدیقین 'صالحین اور شہداء کے ساتھ ہم نشینی کی متاع ہے۔(تفسیر ظلال القرآن)

فوائد

1: اس پوری آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ اہل مدینہ پہاڑی پانی سے اپنے کھیت سیر اب کرتے تھے حضرت زبیر اور ایک انصاری کے کھیت ملے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا اس پانی کے متعلق جھگڑا ہو گیا کہ پہلے کون اپنے کھیت کو پانی دے۔ یہ مقدمہ بارگاہ رسالت میں پیش ہوا۔ حضور نے فیصلہ فرمایا کہ پہلے حضرت زبیر پانی دیں پھر انصای کیونکہ حضرت زبیر کا کھیت اوپر کی جانب تھا۔ یہ فیصلہ انصاری کو ناگوار گزرا۔ اس کے منہ سے نکل گیا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد قریبی ہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری۔ ظاہر یہ ہے کہ اس وقت اس انصاری پر مرتد ہونے کا حکم نہ دیا گیا ہو گا۔ کیونکہ ان کا یہ واقعہ اس قانون بننے اور اس آیت کے نزول سے پہلے تھا قانون کے احکام اس کے بن جانے کے بعد جاری ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی مسلمان شخص ایسا کرے تو مرتد ہے۔

2: جیسا کہ بنی اسرائیل پر توبہ کے لیے مجرم کا اپنے کو قتل کے لیے پیش کر دینا یا دیس نکالے کا حکم دیا جاتا تھا اس سے اسلامی ہجرت اور جہاد مراد نہیں وہ دونوں تو اسلام میں بھی ہیں لہٰذا آیت کریمہ پر کوئی اعتراض نہیں۔

3: یعنی ایسے سخت احکام صرف مخلص مومنین صحابہ ہی مانتے، منافقین و کفار نہ مانتے، لہٰذا اس آیت سے شیعہ دلیل نہیں پکڑ سکتے کیونکہ صحابہ کرام نے جس بہادرانہ طریقہ سے حضور پر جاں نثاری کی وہ دنیا جانتی ہے۔ (نور)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرنا ہر حال میں انسان کے لیے بہتر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو عظیم اجر اور مزید ہدایت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

۳۔ صراط مستقیم کی ہدایت اطاعت رسول میں پنہاں ہے۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾

لغات القرآن:[وَّاِذًا : اور اس صورت میں] [لَّاٰتَيْنٰهُمْ : ہم انہیں دیتے] [مِّنْ لَّدُنَّاۤ : اپنے پاس سے] [اَجْرًا : اجر] [عَظِيْمًا : بڑا عظیم]

ترجمہ: اور اس وقت ہم بھی انھیں اپنے حضور سے عظیم اجر عطا فرماتے

تفسیر و تشریح:

اجر عظیم کا اہم مصداق سے مقصود و مراد؟

سو اس سے یہاں پر جنت مراد ہے۔ (ابن کثیر (رح) محاسن التاویل وغیرہ)۔ جس کی نعمتوں کے بارے میں صحیح حدیث میں فرمایا گیا کہ وہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں، اور نہ کسی دل پر ان کا گزر ہی ہوا۔ "مَالَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ" سو جنت کی نعیم مقیم سے سرفرازی سب سے بڑا انعام اور حقیقی کامیابی ہے، جس سے اللہ پاک اپنے خاص بندوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا اور سرفراز فرماتا ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ اسی لیے قرآن حکیم میں اس کو حصر کے ساتھ "الفَوزُ العَظِيم" اور "الفَوزُ الكَبِير" وغیرہ الفاظ سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعنی سب سے بڑی کامیابی کہ اس کے سوا اور کوئی کامیابی حقیقی کامیابی ہے ہی نہیں۔ بہرکیف ارشاد فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ ان باتوں کو اپناتے اور ان پر عمل پیرا ہوتے تو یہ خود انہی کے حق میں بہتر ہوتا کہ اس سے ان کو ایمان و یقین میں قوت و پختگی بھی ملتی۔ یہ ضعف و اضطراب سے بھی دور اور محفوظ ہوتے۔ ان کو راہ حق و ہدایت میں استقامت بھی نصیب ہوتی۔ یہاں پر احکام خداوندی کو مواعظ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا کیونکہ ان میں وعد اور وعید کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ (محاسن التاویل وغیرہ) اور ان پر عمل پیرا ہونے میں خود بندوں ہی کا بھلا ہے۔ دنیا کی اس عارضی زندگی میں بھی اور آخرت کے اس ابدی جہاں میں بھی۔ و باللہ التوفیق۔

آیت مبارکہ:

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

لغات القرآن: [وَّلَهَدَيْنٰهُمْ : اور ہم ضرور ہدایت دیتے ان کو] [صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا : ایک سیدھے راستے کی]

ترجمہ: اور ہم انھیں واقعۃً سیدھی راہ پر لگا دیتے

تفسیر و تشریح:

اس آیہ مبارکہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں معانی پر غور کرنا ہو گا۔

(ھ دی) الھدایۃ

کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کیا ہے

۔ (1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے

اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :
۔ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى [طه/50] ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کی اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی

۔ (2) دوسری قسم ہدایت

کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ نجات کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت : ۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا [الأنبیاء/73] اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے۔ میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا : ۔ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى [محمد/17] جو لوگ ، وبراہ ہیں قرآن کے سننے سے خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

۔ (4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا

مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا : ۔ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بالَهُمْ [محمد/5] (بلکہ) وہ انھیں (منزل) مقصود تک پہنچادے گا۔ اور آیت وَنَزَعْنا ما فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ [الأعراف/43] میں فرمایا۔

(ص ر ط) الصراط

سیدھی راہ۔ قرآن میں ہے : وَأَنَّ هذا صِراطِي مُسْتَقِيماً [الأنعام/153] اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔ اسے سراط (بسین مھملہ) پڑھا جاتا ہے ملاحظہ ہو

(س ر ط) السراط

کے معنی آسان راستہ ، کے آتے ہیں اور اصل میں سرطت الطعام وزاردتہ سے مشتق ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ راہر کو گویا نگل لیتا ہے یار ہرد ، اس کو نگلتا ہوا چلا یا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ قتل ارضا عالھا وقتلت ارض جاھلھا کہ واقف کار رہر و توزمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کر دیتی ہے۔ ابو تمام نے کہا ہے۔ رعتہ الفیافی بعد ما کان حقبۃ رعاھا اذا ماالمزن ینھل ساکبہ اس کے بعد کو اس نے ایک زمانہ دراز تک سر سبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھالیا یعنی دبلا کر دیا۔ اسی طرح راستہ کو لقم اور ملتقم بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گو یا رہر و اس کو لقمہ بنالیتا ہے۔

الاستقامۃ (استفعال)

کے معنی راستہ خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی صراط مستقیم کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا : ۔ اهْدِنَا الصِّراطَ الْمُسْتَقِيمَ [الفاتحة/6] ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا : ۔ إِنَّ الَّذِينَ قالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقامُوا [فصلت/30] جس لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے
۔ (مفردات)

کیا خوب لکھا ہے علامہ بیضاوی نے۔ فرماتے ہیں۔ یصلون بسلوکہ جناب القدس ویفتح علیہم ابواب الغیب قال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم۔* یعنی اطاعت رسول کی برکت سے انھیں وہ رستہ مل جائے گا جو انھیں حریم قدس تک پہنچادے گا اور ان پر غیب کے دروازے کھل جائیں گے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہ علوم القا کرتا ہے جن کو وہ نہیں جانتا۔* (ضیاء)

شان نزول

ولہدینہم صراطا مستقیما اور ہم ان کو ضرور سیدھا راستہ بتادیتے جس پر چل کر وہ بارگاہ قدس تک پہنچ جاتے۔

طبرانی نے قابل قبول سند سے اور ابو نعیم وضیاء نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ مجھے اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ پیارے ہیں میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آجاتی ہے تو جب تک حاضر ہو کر شرف زیارت حاصل نہ کرلوں قرار نہیں آتا لیکن جب مجھے اپنی اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی موت کا تصور ہوتا ہے تو جانتا ہوں کہ (مرنے کے بعد یہ شرف زیارت حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ) آپ جنت میں انبیاء کے ساتھ اونچے درجہ میں ہوں گے اور میں اگر جنت میں پہنچ بھی گیا تو اندیشہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کو نہ دیکھ سکوں گا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کلام سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ جبرائیل (علیہ السلام) آیت ذیل لے کر آئے۔ (مظہری)

ہدایت سے یہاں مراد دین پر ثابت قدمی دینا ہے۔ (مدارک)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يُّطِعِ : اطاعت کرے گا] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَالرَّسُوْلَ : اور ان رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی] [فَاُولٰٓئِکَ : تو وہ لوگ] [مَعَ الَّذِيْنَ : ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے] [اَنْعَمَ : انعام کرے گا] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلَيْهِمْ : جن پر] [مِّنَ النَّبِيّٖنَ : نبیوں میں سے] [وَالصِّدِّيْقِيْنَ : اور کامل سچوں میں سے] [وَالشُّهَدَآءِ : اور شہیدوں میں سے] [وَالصّٰلِحِيْنَ : اور نیک لوگوں میں سے] [وَحَسُنَ : اور اچھے ہوئے] [اُولٰٓئِکَ : وہ لوگ] [رَفِيْقًا : بطور رفیق کے]

مترادفات: [يُّطِعِ : اطاعت ، مطیع ، اطاعت رسول ۔][مَعَ : مع اہل و عیال ، معیت ۔][انعَمَ : انعام یافتہ ، منعم حقیقی ، نعمت ۔][لصِّدِّيْقِيْنَ : صدیقہ کائنات ، صادق ، صدیق ۔][وَالشُّهَدَآءِ : شاہد ، شہید ، شہادت ۔][حَسُنَ : حسن ، حسین ، احسن ۔][رَفِيْقًا : رفیق ، رفیقہ حیات ، رفاقت ۔]

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرے تو یہی لوگ (روز قیامت) ان (ہستیوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا ہے جو کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔ (عرفان)

تشریح:

آیتِ مبارکہ کا شان نزول کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ثوبان (رض) تاجدارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کمال درجے کی محبت رکھتے تھے اور انھیں جدائی کی تاب نہ تھی۔ ایک روز اس قدر غمگیں اور رنجیدہ حاضر ہوئے کہ چہرے کا رنگ بدل گیا تھا تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دریافت فرمایا، آج رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ عرض کیا: نہ مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ درد سوائے اس کے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سامنے نہیں ہوتے تو انتہا درجہ کی وحشت و پریشانی ہو جاتی ہے، جب آخرت کو یاد کرتا ہوں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ

وہاں میں کس طرح دیدار پاسکوں گا؟آپ اعلیٰ ترین مقام میں ہوں گے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے جنت بھی دی تو اس مقام عالی تک رسائی کہاں ؟اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔اور انھیں تسکین دی گئی کہ منزلوں کے فرق کے باوجود فرمان بردار وں کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضری اور مَعِیّت کی نعمت سے سر فراز فرمایا جائے گا اور انبیاء (علیہ السلام) کے مخلص فرمان بردار جنت میں ان کی صحبت و دیدار سے محروم نہ ہوں گے۔ حدیث شریف میں ہے :آدمی اسی کے ساتھ ہو گا جس سے محبت کرے۔
(ابو داؤد، کتاب الادب، باب اخبار الرجل الرجل بمحبتہ ایاہ، ۴/۴۲۹،الحدیث : ۵۱۲۷)

صحابہ کرام (رض) کا شوق رفاقت

اس سے معلوم ہوا کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رفاقت صحابہ کرام (رض) کو بہت محبوب تھی اور دنیا کی رفاقت کے ساتھ ساتھ اخروی رفاقت کا شوق بھی ان کے دلوں میں رچا بسا تھا اور وہ اس کے لیے بڑے فکر مند ہوا کرتے تھے۔ذیلی سطور میں صحابہ کرام (رض) کے شوق رفاقت کے چند اور واقعات ملاحظہ ہوں، چنانچہ
حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی (رض) فرماتے ہیں ”میں رات کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں رہا کرتا تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کیلئے پانی لایا کرتا اور دیگر خدمت بھی بجالایا کرتا تھا۔ایک روز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: سَلْ (مانگو) میں نے عرض کیا ”اَسْئَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّۃِ ”میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنت میں آپ کا ساتھ مانگتا ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”اس کے علاوہ اور کچھ ؟میں نے عرض کی : میرا مقصود تو وہی ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ”تو پھر زیادہ سجدے کر کے اپنے معاملے میں میری مدد کرو۔
(مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل السجود والحث علیہ، ص ۲۵۲،الحدیث : ۲۲۶(۴۸۹))
جنگ اُحد کے موقع پر حضرت ام عمارہ (رض) نے عرض کی : یارسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ﷺ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو جنت میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت گزاری کا شرف عطافرمائے۔اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے لیے اور ان کے شوہر اور ان کے بیٹوں کے لیے اس طرح دعا فرمائی کہ ”اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھُمْ رُفَقَائِیْ فِی الْجَنَّۃِ ” یا اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، ان سب کو جنت میں میرا رفیق بنادے۔ حضرت ام عمارہ (رض) زندگی بھر علانیہ یہ کہتی رہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس دعا کے بعد دنیا میں بڑی سے بڑی مصیبت مجھ پر آجائے تو مجھ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔
(الطبقات الکبری لابن سعد، ومن نساء بنی النجار۔۔الخ، امّ عمارۃ بنت کعب، ۸/۳۰۵)
عاشقوں کے امام حضرت بلال (رض) کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کی زوجہ شدتِ غم سے فرمانے لگیں : ہائے غم۔آپ (رض) نے فرمایا: واہ !بڑی خوشی کی بات ہے کہ کل ہم اپنے محبوب آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب (رض) سے ملاقات کریں گے۔
(سیرت حلبیہ، باب استخفاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واصحابہ فی دار الارقم۔۔الخ، ۱/۴۲۲)
ایک جنگ کے موقع پر حضرت عمار بن یاسر (رض) نے حضرت ہاشم بن عتبہ (رض) سے فرمایا ”اے ہاشم ! (رض)، تم جنت سے بھاگتے ہو حالانکہ جنت تو تلواروں (کے سائے) میں ہے۔آج میں اپنی محبوب ترین ہستیوں محمد مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے ملاقات کروں گا۔ چنانچہ اسی جنگ میں آپ (رض) نے شہادت پائی۔ (اسد الغابہ، باب العین والمیم، عمار بن یاسر، ۴/۱۴۴)

جب حضرت خباب (رض) بیمار ہوئے تو صحابہ کرام (رض) ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے (جب انھوں نے دیکھا کہ یہ اسی مرض میں وفات پاجائیں گے) تو فرمایا "تم خوش ہوجاؤ، کل تم محبوب ترین ہستی محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اوران کے صحابہ (رض) سے ملاقات کروگے۔

(البدایہ والنہایہ، ثمّ دخلت سنۃ سبع وثلاثین، ذکر من توفی فیہا من الاعیان، ۴۱۷/۵)

اللہ تعالیٰ ان مقدس ہستیوں کے شوق رفاقت کے صدقے ہمیں بھی اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر وحشر اور جنت میں رفاقت نصیب فرمائے۔آمین۔

صدق کے معنی اور اس کے مَراتِب

اس آیت میں صِدّیقین کا لفظ آیا ہے۔ صدیقین انبیاء (علیہ السلام) کے سچے مُتَّبِعین کو کہتے ہیں جو اخلاص کے ساتھ ان کی راہ پر قائم رہیں۔

اسی مناسبت سے یہاں ہم اس کے معانی اور اس کے درجات بیان کرتے ہیں چنانچہ امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں : صدق 6 معانی میں استعمال ہوتا ہے : (1) گفتگو میں صدق۔ (2) نیت وارادہ میں صدق۔ (3) عَزم میں صدق۔ (4) عزم کو پورا کرنے میں صدق۔ (5) عمل میں صدق۔ (6) دین کے تمام مقامات کی تحقیق میں صدق۔ ان معانی کے اعتبار سے صادقین کے بہت سے درجات ہیں اور جس شخص میں کسی خاص چیز میں صدق پایا جائے تو وہ اسی چیز کی نسبت سے صادق کہلائے گا، چنانچہ :

پہلا صدق "زبان کا صدق "ہے اور یہ صرف خبریں دینے میں یا ان باتوں میں ہوتا ہے جو خبروں میں شامل ہوں اور ان سے آگاہی ہو اور اس میں وعدے کو پورا کرنا اور اس کی خلاف ورزی کرنا بھی داخل ہے، لہٰذا ہر بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے الفاظ کی حفاظت کرے اور (ہمیشہ) سچی بات ہی کہے۔

دوسرا صدق ارادے اور نیت سے متعلق ہے اور یہ اخلاص کی طرف لوٹتا ہے، یعنی بندے کی حرکات وسَکَنات کا باعث صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، اگر اس میں کوئی نفسانی غرض بھی آجائے تو صدق نیت باطل ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کو جھوٹا کہنا صحیح ہے لہٰذا ہر صادق کا مخلص ہونا ضروری ہے۔

تیسرا صدق "عزم کا صدق "ہے کیونکہ بعض اوقات انسان کسی عمل کا پختہ ارادہ کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں تمام مال صدقہ کردوں گا یا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کے راستے میں میرا دشمن سے مقابلہ ہوا تو میں اس سے لڑوں گا اور اس لڑائی میں اگر میں قتل بھی ہوجاؤں تو مجھے اس کی پروانہ ہوگی یا اگر اللہ تعالیٰ مجھے حکومت دے تو میں انصاف کروں گا اور ظلم کرنے اور مخلوق کی طرف میلان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ یہ عزم وارادہ دل میں ہوتا ہے اور انتہائی پختہ اور سچا ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس میں دوسری طرف میلان اور تَرَدُّد ہوتا ہے، نیز ایسی کمزوری ہوتی ہے جو عزم میں صدق کے مقابل اور اس کی ضد ہوتی ہے تو صادق اور صدیق وہ شخص ہے جس کا پختہ ارادہ تمام نیکیوں میں قوت تامہ کے ساتھ ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا میلان، تردد اور کمزوری نہیں ہوتی اور اس کا نفس ہمیشہ نیک کاموں پر پختہ ارادہ رکھتا ہے۔

چوتھا صدق "عزم کو پورا کرنے کا صدق" ہے کیونکہ بعض اوقات نفس فی الحال عزم کرلیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وعدے اور عزم میں کوئی مشقت نہیں ہوتی اور اس میں محنت بھی کم ہوتی ہے لیکن جب حقیقت کا سامنا ہوتا ہے اور قدرت حاصل ہوجاتی ہے اور شہوت کازور ہوتا ہے تو عزم ختم ہوجاتا ہے اور خواہشات غالب آجاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ عزم کو پورا نہیں کرسکتا اور یہ بات صدق کے خلاف ہے۔

پانچواں صدق "اعمال کا صدق" ہے، یعنی انسان کوشش کرے حتّٰی کہ اس کے ظاہری اعمال ایسی بات پر دلالت نہ کریں کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے وہ ظاہر کے خلاف ہے۔ یہ کوشش اعمال کو چھوڑنے سے نہ ہو بلکہ باطن کو ظاہر کی تصدیق کی طرف کھینچنے سے ہو اور یہ بات تَرکِ ریا سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ ریاکار تو یہی چاہتا ہے کہ اس کے ظاہر سے باطن کی اچھی صفات سمجھی جائیں البتہ کئی نمازی نماز میں خشوع و خضوع کی صورت میں کھڑے ہوتے ہیں اور ان کا مقصد دوسروں کو دکھانا نہیں ہوتا لیکن ان کا دل نماز سے غافل ہوتا ہے اور جو شخص اسے دیکھتا ہے وہ اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا دیکھتا ہے جبکہ باطنی طور پر وہ خواہشات میں سے کسی خواہش کے سامنے بازار میں کھڑا ہوتا ہے، اس طرح یہ اعمال زبان حال سے باطن کی خبر دیتے ہیں اور وہ اس میں جھوٹا ہوتا ہے اور اس سے اعمال میں صدق کی باز پرس ہوگی۔ اسی طرح کوئی شخص سکون و وقار سے چل رہا ہوتا ہے حالانکہ اس کا باطن سکون و وقار سے موصوف نہیں ہوتا تو یہ بھی اپنے عمل میں سچا نہیں اگرچہ اس کی توجہ مخلوق کی طرف نہ ہو اور نہ ہی وہ ان کو دکھا رہا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر ظاہر کا باطن کے خلاف ہونا قصد و ارادے سے ہو تو وہ ریا ہے اور اس سے اخلاص ختم ہوجاتا ہے اور قصد و ارادے کے بغیر ہو تو اس سے صدق فوت ہوجاتا ہے اور اس قسم کی خرابی سے نجات کی صورت یہی ہے کہ ظاہر و باطن ایک جیسا ہو بلکہ باطن ظاہر سے بہتر ہو۔

چھٹا اور سب سے اعلیٰ و مُعَزَّز درجے کا صدق "مقامات دین میں صدق" ہے، جیسے خوف، امید، تعظیم، زُہد، رضا، تَوَکُّل، محبت اور باقی امور دینیہ میں صدق پایا جانا۔ ان امور کی کچھ بنیادیں ہیں جن کے ظاہر ہونے سے یہ نام بولے جاتے ہیں، پھر ان کے کچھ مقاصد اور حقائق ہیں تو حقیقی صادق وہ ہے جو ان امور کی حقیقت کو پالے اور جب کوئی چیز غالب آجائے اور اس کی حقیقت کامل ہو تو اس سے موصوف شخص کو صادق کہا جاتا ہے۔

(احیاء العلوم، کتاب النیۃ والاخلاص والصدق، الباب الثالث، بیان حقیقۃ الصدق ومعناہ ومراتبہ، ۵/۱۱۷۔ ۱۲۲)

یاد رہے کہ اس آیت میں صدیقین سے سلطان دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اکابر صحابہ کرام (رض) سب سے پہلے مراد ہیں جیسے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق (رض)۔ شہداء سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے راہ خدا میں جانیں دیں اور صالحین سے مراد وہ دیندار لوگ ہیں جو حق العباد اور حقُّ اللہ دونوں ادا کریں اور ان کے احوال و اعمال اور ظاہر و باطن اچھے اور پاک ہوں۔

ربط کلام :

اطاعت رسول کے دنیا میں فوائد اور قیامت کے دن اس کے ثمرات

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ اور فرمان کو زندگی کے ہر شعبہ میں قطعی طور پر لائق اتباع اور باعث نجات سمجھنے والے کو دنیا اور آخرت کے آٹھ انعامات کی خوشخبری دی گئی ہے۔

دنیا میں ہر اعتبار سے بھلائی کا حصول۔ ایمان پر ثابت قدمی کی توفیق۔ عظیم اجر۔ صراط مستقیم کی رہنمائی کے ساتھ اور قیامت کو اللہ تعالیٰ کے عظیم المرتبت انبیاء، صدیق، شہداء اور صالح لوگوں کی رفاقت اور معیّت نصیب ہو گی۔ یہاں چار شخصیات کے حوالے سے در حقیقت چار قسم کے مراتب اور مقام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں لوگوں کی انہی چار مراتب کے لحاظ سے درجہ بندی کی جائے۔ آدمی کوشش کرے تو تین مراتب کو کسی نہ کسی حد تک حاصل کر سکتا ہے۔

جن میں صدیق بننا، شہادت کے مرتبہ پر فائز ہونا اور صالح کردار کا حامل بننا ہے۔

(۱) نبی وہ انسان ہے جس پر وحی نازل ہو اور جس کو اللہ نے مخلوق تک اپنے احکام پہنچانے کے لیے بھیجا ہو۔

جہاں تک نبوت کا مرتبہ اور مقام ہے وہ تو اعمال کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا انتخاب ہے۔ جس کو چاہے اپنے پیغام کے لیے منتخب فرما لے اور یہ سلسلہ بھی محمد کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات پر اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا اب کوئی شخص یا گروہ یہ دعوی کرے کہ حسن اعمال کی بنیاد پر آدمی منصب نبوت پر فائز یا نبوت میں حصہ دار ہو سکتا ہے یہ سراسر گمراہی ہے۔ اس لیے یہاں رفاقت کا لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی اسے نبی کی رفاقت نصیب ہو گی جس سے واضح طور پر اس باطل عقیدہ کی نفی ہوتی ہے کہ کوئی شخص قیامت تک ظلّی یا بروزی نبی نہیں بن سکتا یہ بحث سورۃ الاحزاب آیت : ۴۰ میں ختم نبوت کے سلسلہ میں ہو گی۔

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد سے باہر نکل رہے تھے دروازے پر آپ کو ایک آدمی ملا اور عرض کرنے لگا اللہ کے نبی ! قیامت کب برپا ہو گی ؟ آپ نے اس سے فرمایا کہ تو نے قیامت کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے ؟ عرض کرتا ہے کہ میں نے نفلی کام تو زیادہ نہیں کیے تاہم اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا : (فَأَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ) [رواہ مسلم : کتاب البر والصلۃ والآداب، باب المرء مع من احب] ”تو اسی کے ساتھ ہو گا جس کے ساتھ تو محبت کرتا ہے۔“

یہ مقام اور مراتب محض اعمال کی بنیاد پر نہیں بلکہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا صلہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کے افکار اور اعمال کو جانتا ہے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کے فضل کا ذکر کرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہو گا ؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ! ہاں میں بھی اللہ کی رحمت کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ [رواہ البخاری : کتاب المرضی، باب تمنی المریض الموت]

(2) صدیق :

صدیق وہ شخص ہے جو اپنے قول اور اعتقاد میں صادق ہو۔ جیسے حضرت ابو بکر صدیق (رض) اور دیگر فاضل صحابہ ' اور انبیاء سابقین (علیہم السلام) کے اصحاب کیونکہ وہ صدق اور تصدیق میں دوسروں پر فائق اور غالب ہوتے ہیں ' یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو دین کے تمام احکام کی بغیر کسی شک اور شبہ کے تصدیق کرے وہ صدیق ہے۔

صدیق سے مراد ایسا شخص جو ہر حال میں سچ بولنے والا ' سچ پر قائم رہنے والا اور سچ کے لیے ہر چیز قربان کر دینے والا ہو، امت میں اس مقام پر سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق (رض) فائز ہوئے۔ جن کے بارے میں رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زبان اطہر سے ان کے اعزاز کا اعلان فرمایا۔ باقی لوگ درجہ بدرجہ اس مقام کے حامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ

صدیق وہ صادق انسان ہے جس کی فطرت اتنی پاک اور صاف ہوتی ہے کہ اس کو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنے میں کوئی التباس نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ حق کا ساتھ دیتا ہے۔ نبوت کے بعد یہ سب سے بلند رتبہ ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کئی صحابہ کرام (رض) اس مرتبہ پر فائز تھے لیکن ان میں سب سے بلند رتبہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) کا ہے۔ اسی لیے آپ کو صدیق اکبر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد غیر انبیاء میں آپ سب سے افضل ہیں۔

شہید:

(۳) شہید وہ شخص ہے جو دلائل اور براہین کے ساتھ دین کی صداقت پر شہادت دے اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لڑتا ہوا مارا جائے جو مسلمان ظلما قتل کیا جائے وہ بھی شہید ہے۔ یعنی

ایسی شخصیت کو کہتے ہیں جو دل کی سچائی کے ساتھ اسلام میں داخل ہو اور دین کی سربلندی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ اور تیار رہے اور میدان کارزار میں کٹ مرنے والے کو شہید کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے خون جگر سے حق کی گواہی دیتا ہے۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شہادت کے کئی مراتب ذکر فرماتے ہوئے مختلف قسم کے لوگوں کو شہداء میں شامل فرمایا ہے۔ امام رازی نے سورۃ آل عمران آیت ۱۸ سے استدلال کیا ہے کہ عدل وانصاف کی گواہی دینے والے بھی شہداء میں شمار ہوں گے۔

صالحین:

(۴) صالح نیک مسلمان کو کہتے ہیں ' جس کی نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں۔ یعنی کہ

صالح سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم اور خلوص نیت کے ساتھ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنے والا ہو۔ اس طرح امت کے تمام موحّد اور نیک لوگ درجہ بدرجہ صالحیت کے مقام پر فائز اور اپنے عمل کے لحاظ سے جنت میں مقام پائیں گے۔

یہاں یہ بات اہم ہے کہ

اہل جنت کا ایک دوسرے کے ساتھ ہونا ان کے درجوں میں مساوات کو مستلزم نہیں:

اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرنے والے اور انبیاء ' صدیقین ' شہداء اور صالحین سب جنت کے ایک درجہ میں ہوں گے ' کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ فاضل اور مفضول کا ایک درجہ ہو جائے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جنت میں رہنے والے سب ایک دوسرے کی زیارت کرنے پر قادر ہوں گے اور ان کے درجات کا فاصلہ ایک دوسرے کی زیارت اور مشاہدہ کیلیے حجاب نہیں ہوگا۔

چونکہ اس آیت میں چونکہ صدیقین کا ذکر آیا ہے اس لیے ہم امام صادقین سیدنا ابو بکر صدیق (رض) کے بعض فضائل ذکر رہے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق (رض) کی بعض خصوصیات اور فضائل:

(۱) امام بخاری حضرت ابوالدرداء (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا ' تم لوگوں نے کہا آپ جھوٹے ہیں (العیاذ باللہ) اور ابو بکر (رض) نے تصدیق کی اور اپنی جان اور اپنے مال سے میری غم خواری کی۔ (صحیح بخاری ' رقم الحدیث: ۳۶۶۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ابو بکر (رض) نبی کریم (رض) کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے تھے جب اور لوگ آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔

(۲) حضرت ابو بکر (رض) نے امت میں سب سے پہلے تبلیغ اسلام کی اور ان کی تبلیغ سے حضرت عثمان ' حضرت طلحہ ' حضرت زبیر ' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ' حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عثمان بن مظعون (رض) ایسے اکابر صحابہ اسلام لائے۔

(۳) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سفر ہجرت میں اپنی رفاقت کے لیے تمام صحابہ میں سے حضرت ابو بکر (رض) کو منتخب کیا۔

(۴) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو بکر (رض) کو حج میں مسلمانوں کا امیر بنایا۔

(۵) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو مرتب حضرت ابو بکر (رض) کی اقتداء میں نماز پڑھی۔

(٦) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایام علالت میں حضرت ابو بکر (رض) کو امام بنایا اور حضرت ابو بکر (رض) نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔

(۷) واقعہ معراج کی جب کافروں نے تکذیب کی تو حضرت ابو بکر (رض) نے آپ کی سب سے پہلے تصدیق کی اور یہیں سے آپ کا لقب صدیق ہوا۔

(۸) غزوہ تبوک میں گھر کا سارا سامان اور مال لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

(۹) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے متعدد احادیث میں آپ کو صدیق فرمایا۔

(۱۰) قرآن مجید میں نبوت کے بعد جس مرتبہ کا ذکر ہے وہ صدیقیت ہے اور متعدد آیات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد حضرت ابو بکر صدیق (رض) کے ذکر کی طرف اشارہ ہے حضرت ابو بکر کے صدیق ہونے پر امت کا اجماع ہے اور چونکہ نبی کے بعد صدیق کا ذکر اور مقام ہے سو معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد حضرت ابو بکر صدیق (رض) خلیفہ ہیں۔

فوائد

1: اس سے ولایت اور قرب الہی کی راہ مراد ہے۔ کیونکہ وہ مخلص مومن تو پہلے ہی تھے اس سے معلوم ہوا کہ کبھی نیک اعمال سے بھی ولایت مل جاتی ہے جسے ولایت کسبی کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے صحابہ ولی اللہ ہیں کیونکہ ان سب نے حضور کی اطاعت کی بلکہ اگر منافقین بھی یہ اطاعت کر لیتے تو وہ بھی ولی بن جاتے۔

2۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی اطاعت کرنے والے نبی بن جاویں گے تاکہ آئندہ سلسلہ نبوت جاری رہے جیسا کہ قادیانیوں نے اس سے سمجھا۔ ورنہ رب فرماتا ہے ان اللہ مع الصبرین چاہیے کہ صابر اللہ بن جاویں۔ ساتھ ہونا اور چیز ہے اور خود وہی بن جانا اور چیز۔

3: خیال رہے کہ حضور کے چاہنے والے امتی کا حضور کے ساتھ جنت میں رہنا ایسا ہوگا جیسے سلطان کے خدام خاص کا سلطان کے ساتھ کوٹھی میں رہنا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اسی درجہ میں حضور کے برابر ہو جاوے گا۔

مسائل

۱۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والا قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء کے ساتھ ہوگا۔

۲۔ جنت میں نیک لوگوں کی رفاقت نصیب ہونا اللہ کا بڑا فضل ہوگا۔

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

لغۃ القرآن: [ذٰلِکَ الْفَضْلُ : یہ فضل] [مِنَ اللّٰہِ : اللہ (کے پاس) سے ہے] [وَکَفٰی بِاللّٰہِ : اور کافی ہے اللہ] [عَلِیْمًا : بطور جاننے والے کے]

مترادفات: [الْفَضْلُ : فضل وکرم ۔][وَکَفٰی: کافی ، کفایت ۔][عَلِیْمًا : علم ، عالم ، معلوم ، تعلیم ، معلومات ۔]

ترجمہ: یہ فضل (خاص) اللہ کی طرف سے ہے، اور اللہ جاننے والا کافی ہے

تشریح:

اعمال صالحہ پر اجر عظیم کا وعدہ فرمایا گیا ہے جو یقیناً پورا ہو گا۔ جنت، جنت کی بے پایاں نعمتیں، کیف بار اور سرورآگیں لذتیں، حور و قصور، ان کے علاوہ دیگر بیشمار انعام واکرام ان اعمال صالحہ کا اجر ہوں گے ۔ لیکن اپنے محبوب بندوں کی معیت خصوصا اپنے حبیب مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ اقدس میں شرف باریابی کی سعادت بطور اجر وثواب نہیں ہو گی بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور شان جود و عطا کی جلوہ گری ہو گی۔ اس کی لطافتوں سے وہی بہرہ ور ہو سکتے ہیں جن کو درد محبت اور سوز عشق کے انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ (ضیاء)

ذلک الفضل من اللہ . یہ مہربانی اللہ تعالیٰ کی ہے۔ یعنی انعام یافتہ لوگوں کے جیسے اعمال نہ ہونے کے باوجود ان کی رفاقت میسر آجانا اللہ کی مہربانی ہے۔

و کفی باللہ علیما . اور اللہ پورا پورا جاننے والا ہے۔

یعنی اللہ اس رفاقت کے سبب اور انعام یافتہ گروہ کے ساتھ شمول کی وجہ کو خوب جانتا ہے ' رفاقت کا اصل سبب محبت ہے محب کے اعمال اگرچہ محبوب کے اعمال کی طرح نہ ہوں مگر محبوب کی محبت محبوب کے ساتھ رفاقت کا سبب ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا یہاں تک کہ اعمال لکھنے والے فرشتے بھی واقف نہیں ہوتے۔ حضرت انس (رض) کی روایت ہے کہ ایک شخص نے

عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص کو ایک قوم سے محبت ہے مگر (اُس کے ساتھ اس شخص کا شمول نہیں ہو سکتا کیونکہ) وہ (عمل میں) اس قوم کو نہ پہنچ سکا۔ فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔ احمد۔ بخاری۔ مسلم۔
صحیحین میں حضرت ابن مسعود (رض) کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔ حضرت انس (رض) راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کی گھڑی کب ہوگی۔ فرمایا ارے تونے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے اس نے عرض کیا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی صرف اللہ اور اللہ کے رسول سے مجھے محبت ہے فرمایا تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہوگی۔ راوی کا بیان ہے ' مسلمانوں کو جتنی خوشی یہ الفاظ سن کر ہوئی اتنا خوش اسلام کے بعد میں نے مسلمانوں کو ہوتے نہیں دیکھا۔ صحیح بخاری و مسلم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذلک : سے اشارہ انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ کی طرف ہوگا یعنی انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ پر ان کا فائز ہونا محض اللہ کی مہربانی سے ہے ان کے عمل کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ ان مراتب تک پہنچنا عموماً اللہ کے انتخاب سے ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔
اعمال درست رکھو (مگر) یہ بھی سمجھے رہو کہ کسی کو عمل کی وجہ سے نجات نہیں ملے گی۔ صحابہ (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ کو بھی ' فرمایا نہ مجھے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت و فضل سے ڈھانک لے۔ صحیحین۔ (مظہری)

اللہ تعالیٰ کے کمال علم کا حوالہ و ذکر

سو ارشاد فرمایا گیا اور کافی ہے اللہ جاننے والا۔ پس وہ خوب جانتا ہے کہ کس کی اطاعت کس درجے کی ہے۔ اور کون کس درجے کے لائق ہے۔ اس لیے ہمیشہ اس سے اپنا معاملہ صاف رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہاں معاملہ صرف ظاہر پر نہیں چلتا کہ وہ انسان کے باطن اور اس کے سرائر سے بھی واقف و آگاہ ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ (مدنی)
حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ کا علم ہی کافی ہے۔ دل سے انسان کی تمنا ابھرتی ہے نا، کہ اللہ ہمیں ایسا ہی کردے۔ اللہ ہمیں ایسا ثابت قدم کردے سنت اور قرآن پر کہ ہمیں کوئی دنیا کا پریشر جو ہے، وہ ہٹا نہ پائے۔ کسی کی محبت اللہ کی محبت سے عزیز نہ ہو جائے۔ جن کو یہ انجام ملے گا وہ دنیا میں اپنے نبی ﷺ کی محبت کی تمنا کرتے رہے۔ ترستے رہے ان کے دل میں ارمان تھے کہ ہم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تو دیکھیں۔ لیکن زمانے نے ساتھ نہ دیا۔ اس زمانے میں ہم پیدا نہ ہوئے۔ اس زمانے میں نہیں تھے کہ ہم اپنے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ اپنی آنکھوں سے ان کا دیدار کر لیتے۔ تو اگر ان کی مجلس میسر نہیں آئی تو کیا ہوا۔ حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ سیرت کی کتابیں پڑھیں۔ آپ کو واقعی لگے گا کہ ٹائم میشن میں بیٹھ کر ٹرانسفر ہوگئے ہیں۔ آپ وہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدموں میں ہی پہنچ گئے ہیں۔ اور آخرت میں تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی زندگی ان ہی کے ساتھ گزروائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
جہاں تک عمل کا تعلق ہے تو عمل کے اعتبار سے تو لوگوں کے درجے مختلف ہوں گے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام مسلمان کو بھی وہی رتبہ اور وہی درجہ وہی جنت اور وہی مقام حاصل ہوگا جنت میں جو انبیاء صدیقین صالحین اور شہداء کو حاصل ہوگا۔ مراد ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی صورتحال ہوتی ایسی کہ ان کی کمپنی مل جائے۔ عمل کے حساب سے تو درجے مختلف ہوں گے۔ سب سے اعلیٰ مقام انبیاء کو ملے گا۔ پھر صدیقین کو ملے گا۔ سچے لوگ۔ نبوت کا دروازہ تو اب بند ہے۔ نبوت کا مقام تو کوئی حاصل کر ہی نہیں سکتا۔ پہلے بھی یہ مقام کسی کے عمل کی وجہ سے نہیں دے دیا جاتا تھا۔ یہ تو اللہ ہی انگلی رکھ کر کسی کو اپنے لیے پسند فرما لیا کرتا تھا۔ تو نبوت اور رسالت وھبی ہیں۔ کسبی نہیں ہیں۔

وھبی یعنی عطا کرنے والی چیز ہے۔ کسبی کمانے والی نہیں ہیں۔ یہ مقام کمایا نہیں جاسکتا نبوت کا مقام۔ اور اب تو دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے نبوت اور رسالت کا۔ ہاں باقی تین جو درجے ہیں وہ کسبی ہیں۔ یہ کمائے جاسکتے ہیں۔ اپنے اعمال کے لحاظ سے۔ صدیق بن سکتا ہے انسان۔ سچا انسان۔ سچے لوگ مشکلات اور نقصانات کی پرواکئے بغیر جو رسول کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ Calculating minds نہیں ہوتے۔ نفع نقصان نہیں تولتے۔ کون چھٹے گا کون ملے گا۔ کیا ملے گا کیا ہاتھ سے جائے گا۔ یہ دکانداری والا ایمان نہیں ہے ان کا۔ ان کا تو متقی تقوی والا ایمان ہے۔ دکانداری تجارت انھوں نے بھی کی ہے۔ مگر کسی کے ساتھ۔ اللہ کے ساتھ۔ اللہ کے ہاتھوں اپنے نفس کو بیچ دیا۔ تو یہ دنیا کے نقصانات کی پروا نہیں ہوتی۔ ایک طرح سے indifferent ہو جاتے ہیں۔ کہ جو ہو سو ہو۔

مجھے تو چلنا ہے اس راستے پر۔ اللہ نے نعمتیں دیں الحمد للہ۔ اللہ نے اگر آزمایا مشکلات کے ذریعے سے تو الحمد للہ۔ focus درست کرلے انسان کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ جو راستے مشکلات یا آسائش آئیں وہ من اللہ سمجھ کر اس کو قبول کرلیں۔ چلتے جائیں۔ اپنے عمل سے گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ کہ انھوں نے اللہ پر جو ایمان کا دعوی کیا ہے وہ سچا ہے۔ اور شھداء وہ بھی جو اللہ کی راہ میں جان اور مال قربان کردیا۔ انھوں نے گواہی دی کہ اللہ کے رسول کا پیغام ٪100 سچا ہے۔ اس کے بعد صالحین کا درجہ یہ بھی کسبی ہے۔ کمایا جاسکتا ہے۔ جو شہید کے درجے پر نہ پہنچ سکا۔ کوئی بات نہیں۔ A+ نہ ملا کوئی بات نہیں A ہی سہی اعمال صالحہ کے پابند لوگ صالحین۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کے اندر conscious رہتے ہیں۔ بات کریں تو صالح۔ بزرگوں کے ساتھ سلوک کریں تو صالح طریقے سے۔ ہر چیز میں یہ صالح عمل کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ بھی بڑے لوگ ہیں۔

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں۔ ایک صحابی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے دل میں آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ ہے۔ گھر میں بے چین رہتا ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آکر دیکھ لیتا ہوں تو مجھے سکون ملتا ہے۔ اب مجھے فکر ہے کہ آپ کی وفات ہو جائے اور مجھے بھی موت آجائے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنت کے اونچے درجے پر ہوں گے۔ اول تو معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا یا نہیں۔ اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ جنت میں بہت نیچے ہوگا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہ دیکھ سکوں گا تو مجھے صبر کیسے آئے گا۔ یعنی وہ جنت بھی کیا نامکمل جنت جہاں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دیدار نہ ہو۔ آپ سوچیں کہ دنیا میں عام اچھا انسان ہوتا ہے وہ ہمیں کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہم کیا تصور کرسکتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کیا شخصیت ہو گی۔ کیسے دل چاہتا ہوگا لوگوں کا ان کا ان کے پاس سے اٹھنے کا۔ دل نہیں چاہتا ہوگا۔ لوگوں کا اگر کسبی چلتا تو ایک سیکنڈ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہ چھوڑتے۔

ایسی چاشنی ایسی کشش ایسی attraction آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کے اندر ہو۔ نبی کی شخصیت آپ سوچیں نہ کہ کیا شخصیت ہوتی ہو گی انبیاء کی اور رسولوں کی۔ تو اس شخص نے بھی یہی سوال کیا۔ کہ مجھے صبر آئے گا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہ دیکھوں گا تو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سن کر کوئی جواب نہ دیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جو ابھی ہم نے پڑھی۔ آیت 69۔ اس آیت میں جواب دیا گیا۔ اور اس میں بشارت بھی دی گئی کہ اطاعت کرنے والوں کا مقام بھی اعلیٰ ہوگا۔ صحیح بخاری میں آتا ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا۔ جو کسی جماعت سے محبت یا تعلق رکھتا ہے لیکن عمل میں اس درجے تک نہیں پہنچا۔ دل چاہتا ہے اس کا بہت اعلی عمل کرنے کا۔ مگر وہ بہت اعلی درجے کی بہت زیادہ خوبصورت نیکیاں نہیں کرسکتا مگر بہر حال صالح عمل کرتا ہے۔ تو اس کا درجہ کیا ہوگا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا المرء معہ من احب۔ کہ ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ تو ہم

دیکھ لیں کہ ہماری چاہتیں کس کے ساتھ ہیں۔ ہمارے دل میں کون کھبا ہوا ہے۔ ہم کس کے جیسے بننا چاہتے ہیں۔ کون ہمارا رول ماڈل ہے۔ کون ہمارے حواسوں پر چھایا رہتا ہے۔ صحیح مسلم میں واقع ہے۔ کعب بن اسلمی (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ رات گزارا کرتے تھے۔ ساتھ سے مراد یہ نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حجرے کے اندر۔ مراد ہے باہر۔ اور اس لیے گزارا کرتے تھے کہ رات کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ فراہم کر دیں۔ ایک رات تہجد کے وقت وضو کا پانی لا کر رکھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خوش ہو کر فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو۔ کعب بن اسلمی نے عرض کیا جنت میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحبت چاہتا ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اور کچھ۔ انھوں نے فرمایا اور کچھ نہیں۔ اس پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ تو میری مدد کر کثرت سے سجدے کر کے۔ جتنے زیادہ سجدے ہوں گے اتنے ہی اللہ کے ہاں مقبولیت تیری زیادہ ہو گی۔ اور میرے ساتھ رہنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے ایک حبشی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سے رنگ میں شکل میں بھی بہت بہتر ہیں۔ اور نبوت اور رسالت میں بھی۔ اگر میں بھی اس پر ایمان لے آؤں۔ اور وہی عمل کروں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کرتے ہیں۔ تو کیا میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جنت میں ہو سکتا ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں ضرور۔ تو یہ بلند درجے جو کسی کو چاہیں تو ارمانوں سے تو نہیں آئیں گے۔ صرف خواہشوں سے تو نہیں آئیں گے۔ صرف باتوں اور وعدوں سے تو نہیں ہوں گے۔ یہ تو عمل سے اور جہاد سے ہوں گے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (تنویر)

آئیں لغوی اعتبار سے دیکھیں کہ فضل کیا ہے؟ اور کفیٰ کیا ہے؟

(ف ض ل) الفضل

کے معنی کسی چیز کے اقتضا (متوسط درجہ سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا لیکن عام طور الفضل اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے اور الفضول بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں (۔) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔ (2) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا: ۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ [الإسراء/70]

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔ (3) فضیلت بلحاظ ذات مثلا ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا مثلا گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لیے اس کا اکتساب عین ممکن ہے چنانچہ آیات کریمہ : ۔ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ [النحل/71] اور خدا نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ [الإسراء/12] تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی تلاش کرو۔ میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے

(ک ف ی) الكفاية

وہ چیز جس سے ضرورت پوری اور مراد حاصل ہو جائے۔قرآن میں ہے : ۔وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ [الأحزاب/25] اور خدا مومنوں کے لیے جنگ کی ضروریات کے سلسلہ میں کافی ہوا۔إِنَّا كَفَيْناكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ [الحجر/95] ہم تمہیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لیے جو تم سے استہزا کرتے ہیں کافی ہیں اور آیت کریمہ :
۔وَكَفى بِاللَّهِ شَهِيداً [النساء/79] اور حق ظاہر کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے
فائدہ

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے۔ایک یہ کہ جنت میں حضور کا قرب جنت کی بڑی نعمت ہو گی۔دوسرے یہ کہ ہر مدعی محبت عاشق رسول نہیں۔ یہ تو اللہ کو ہی خبر ہے۔

آیت مبارکہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوا جَمِيعًا ﴿٧١﴾

لغۃ القرآن: [يَآيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [خُذُوْا : تم لوگ پکڑوحذْرَكُمْ : اپنے بچاؤ کے ہتھیار کو] [فَانْفِرُوْا : پھر تم لوگ نکلو] [ثُبَاتٍ : گروہ در گروہ] [اَوِ : یا] [انْفِرُوْا : تم لوگ نکلو] [جَمِيْعًا : سب اکٹھا]

مترادفات: [خُذُوْا : اخذ ، ماخوذ ، ماخذ ، مواخذہ ۔][جَمِيْعًا : جمع ، جميع كائنات ، جماعت ، مجموعہ ۔]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اپنی حفاظت کا سامان لے لیا کرو پھر (جہاد کے لئے) متفرق جماعتیں ہو کر نکلو یا سب اکٹھے ہو کر کوچ کرو

تشریح:

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق وعید نازل فرمائی تھی ،اور ان کو اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تھا ،ان آیتوں میں مسلمانوں کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اور کافروں سے جہاد کے لیے سامان جنگ تیار رکھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کہیں کفار اچانک حملہ نہ کردیں ،پھر اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کا حال بیان فرمایا جو جہاد کی راہ میں روڑے اٹکانے والے تھے ،اس سے پہلی آیات میں مسلمانوں کے ملک کے داخلی اور اندرون ملک کی اصلاح کے لیے آیات نازل فرمائی تھیں اور اب بیرون ملک اور میدان جنگ کے سلسلہ میں ہدایت نازل کی ہیں۔

جہاد کی تیاری اور اس کی طرف رغبت کا بیان

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ کفار کے دفاع اور اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ اور ہتھیار فراہم کریں ،اور دشمن جس طرح کے ہتھیار استعمال کر رہا ہے ویسے ہی ہتھیار استعمال کریں ،حضرت ابو بکر (رض) نے جنگ یمامہ میں خالد بن ولید کو لکھا دشمنوں کے مقابلہ میں ان جیسے ہتھیار استعمال کرو۔ تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور نیزہ کے مقاملہ میں نیزہ سے لڑو۔ اب دنیا میں اپنی بقاء کے لیے ایٹمی طاقت بننا ضروری ہے اور دشمنان اسلام سے مقابلہ اور جہاد کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے لیکن ہمارے طالب علم جدید ثقافت کے نام پر بین الاقوامی کھیلوں کے میدان میں ہیرو بننا چاہتے ہیں ،ڈسکو میوزک ،لڑکے لڑکیوں کے مخلوط رقص ،اور اچھل کود کے شوز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور متوسط گھر ڈش انٹینا اور ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر کے سیلاب میں بہے جارہے ہیں۔ ایسے میں مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں جذبہ جہاد کہاں سے پیدا ہوگا۔ (تبیان)

اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کروڑہا کروڑ احسان ہے کہ اس نے ہمیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں اپنے احکام سے محروم نہیں رکھا بلکہ ہر جگہ ہماری رہنمائی فرمائی۔ ماں باپ، بیوی بچے، رشتے دار، پڑوسی، اپنے بیگانے سب کے متعلق واضح ہدایات عطافرمائیں۔ اسی سلسلے میں ہماری بھلائی کیلئے ہمیں ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ دنیا کے دیگر معاملات کی طرح دشمنوں کے مقابلے میں بھی ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لو، دشمن کی گھات سے بچو اور اسے اپنے اوپر موقع نہ دو اور اپنی حفاظت کا سامان لے رکھو پھر موقع محل کی مناسبت سے دشمن کی طرف تھوڑے تھوڑے ہو کر نکلو یا اکٹھے چلو۔ یعنی جہاں جو مناسب ہو امیر کی اطاعت میں رہتے ہوئے اور تجربات وعقل کی روشنی میں مفید تدبیریں اختیار کرو۔ یہ آیتِ مبارکہ جنگی تیاریوں، جنگی چالوں، دشمنوں کی حربی طاقت کے اندازے لگانے، معلومات رکھنے، ان کے مقابلے میں بھرپور تیاری اور بہترین جنگی حکمت عملی کے جملہ اصولوں میں رہنمائی کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسباب کا اختیار کرنا بھی نہایت اہم ہے۔ بغیر اسباب لڑنا مرنے کے مُتَرادِف ہے، تَوَکُّل ترکِ اَسباب کا نام نہیں بلکہ اسباب اختیار کرکے امیدیں اللہ عَزَّوَجَلَّ سے وابستہ کرنے کا نام ہے۔

جنگی تیاریوں سے متعلق ہدایات

جنگی تیاری کیلئے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) کی ہدایات ملاحظہ فرمائیں۔

(1)۔۔ حضرت عقبہ بن عامر (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اس آیت) "وَاَعِدُّوا لَھُم مَّا استَطَعتُم مِّن قُوَّةٍ "اوران کے لیے تیار رکھو جو قوت تم سے بن پڑے۔ (کی تفسیر میں) فرمایا "خبردار وہ قوت تیر اندازی ہے، خبردار وہ قوت تیر اندازی ہے، خبردار وہ قوت تیر اندازی ہے۔

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ۔۔ الخ، ص ۱۰۶۱، الحدیث : ۱۶۷(۱۹۱۷))

(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "مشرکین سے، اپنے مال، ہاتھ اور زبان سے جہاد کرو (یعنی دین حق کی اشاعت میں ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ)

(نسائی، کتاب الجہاد، باب وجوب الجہاد، ص ۵۰۳، الحدیث : ۳۰۹۳)

(3)۔۔ حضرت عقبہ بن عامر (رض) سے روایت ہے، سرور کائنات، شاہ موجودات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ ایک تیر کے بدلے تین افراد کو جنت میں داخل فرمائے گا (1) ثواب کی نیت سے تیر بنانے والے کو (2) تیر پھینکنے والے کو (3) تیر پکڑوانے والے کو۔ اور تیر اندازی اور گھڑ سواری میں مقابلہ کیا کرو، تمہارا تیر اندازی میں مقابلہ کرنا شہسواری میں مقابلہ کرنے سے زیادہ مجھے پسند ہے اور جو تیر اندازی سیکھنے کے بعد اس سے غفلت کرتے ہوئے چھوڑ دے تو اس نے ایک نعمت کو گنوادیا۔ (ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الرمی، ۱۹/۳، الحدیث : ۲۵۱۳)

(4)۔۔ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے اہل شام کو خط لکھا کہ اپنی اولاد کو تیر اکی اور گھڑ سواری سکھاؤ۔ (صراط)

اطاعت رسول کا حکم اور اس کے ثمرات بیان کرنے کے بعد جہاد کا حکم دیا ہے تاکہ اطاعت رسول کرنے والے جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ اسلام اور کفر کی پندرہ سالہ کشمکش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ معرکہ بدر میں مسلمانوں کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی اور احد میں کفار کا پلڑا بھاری رہا۔ جس سے کفار اور یہود و نصاریٰ کے حوصلے اس قدر بلند ہوئے کہ وہ سوچنے لگے کہ مسلمانوں کو ختم کرنا ناممکن کام نہیں لہٰذا اب فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا ہے کہ ایک فریق ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو جائے۔ اس بنا پر اہل مکہ اور یہود نے مدینہ کی چاروں جانب سازشوں کے جال بننا شروع کر دیئے جس کی وجہ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ (رض) کو گشت کے لیے بھیجا کرتے تھے تاکہ کفار کی نقل وحرکت کا بروقت علم ہو سکے۔ انہی حالات میں یہ حکم نازل ہوا کہ مسلمانوں! ہر وقت چاک وچوبند رہو اور اپنا اسلحہ پکڑے رکھو۔ مراد یہ ہے کہ اسلحہ اس قدر قریب اور تیار ہونا چاہیے کہ ہنگامی حالت میں وقت ضائع کیے بغیر دشمن کا مقابلہ کیا جاسکے۔ پھر جنگ کے بارے ہدایات دیں کہ حالات کے مطابق تم گوریلا جنگ کرو یا منظّم طریقہ کے ساتھ جماعت کی صورت میں حملہ آور ہو تمہیں ہر طرح میدان کارزار میں اترنے کے لیے آمادہ و تیار رہنا چاہیے۔ اسی سے جنگ کے متعلق قوموں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مضبوط دفاع ہی قوموں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے لہٰذا دشمن کی جارحیت سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکس رہنا چاہیے۔ اس کے بعد منافقوں کے عزائم سے آگاہ کیا گیا کہ یہ تمہاری آستینوں کے سانپ اور گھر کے بھیدی ہیں ان کی سازشوں سے آگاہ رہنا نہایت ضروری ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی مشکل اور افتاد آپڑتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر انعام کیا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر تمہیں کامیابی نصیب ہو تو حسرت وافسوس سے کہتے ہیں کہ کاش! ہم بھی اس عظیم کامیابی میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔

(عَنْ یَزِیدَ بْنِ اَبِی عُبَیْدٍ قَالَ سَمِعْتُ سَلَمَۃَ بْنَ الْاَکْوَعِ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَلَی نَفَرٍ مِنْ اَسْلَمَ یَنْتَضِلُونَ فَقَالَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارْمُوا بَنِی اِسْمَاعِیلَ، فَاِنَّ اَبَاکُمْ کَانَ رَامِیًا ارْمُوا وَاَنَا مَعَ بَنِی فُلَانٍ قَالَ فَاَمْسَکَ اَحَدُ الْفَرِیقَیْنِ بِاَیْدِیھِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا لَکُمْ لَا تَرْمُونَ قَالُوا کَیْفَ نَرْمِی وَاَنْتَ مَعَھُمْ قَالَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارْمُوا فَاَنَا مَعَکُمْ کُلِّکُمْ) [رواہ البخاری : باب التَّحْرِیضِ عَلَی الرَّمْیِ]

"حضرت یزید بن ابی عبید کہتے ہیں میں نے سلمہ بن اکوع (رض) سے سنا کہ ایک دن نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسلم قبیلہ کے چند لوگوں پر گذر ہوا جو تیر اندازی میں مقابلہ کر رہے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے اسماعیل کی اولاد تیر اندازی کرو یقیناً تمہارے آباء بھی تیر انداز تھے تیر اندازی کرو میں فلاں قبیلہ کے ساتھ ہوں تو دوسرے فریق نے مقابلہ کرنا چھوڑ دیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم تیر اندازی کیوں نہیں کرتے انھوں نے عرض کی کہ ہم تیر اندازی کیونکر کریں جبکہ آپ ان کے ساتھ ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم تیر اندازی کرو میں سبھی کے ساتھ ہوں"

مسائل

۱۔ امت کو انفرادی اور اجتماعی طور پر جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

۲۔ مسلمانوں کو ہر وقت اپنا دفاع مضبوط رکھنا چاہیے۔

۳۔ حالات کے مطابق جہاد انفرادی اور اجتماعی طور پر کرنا چاہیے۔

۴۔ منافق مسلمانوں کی آزمائش میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۵۔ منافق کو دنیا اور آخرت میں پچھتاوا ہوگا۔

تفسیر بالقرآن

ہر حال میں مضبوط دفاع :

۱۔ تھوڑے ہو یا زیادہ دفاع مضبوط رکھو۔ (النساء : ۷۱) ۲۔ کفار کے مقابلے میں ہر دم تیار رہو۔ (الانفال : ۶۰)

۳۔ دفاعی قوت کے ذریعے اسلام دشمنوں کو مرعوب رکھو۔ (الانفال : ۶۰) ۴۔ اسلحہ سے غافل نہ رہو۔ (النساء : ۱۰۲)

۵۔ نماز میں اسلحہ اپنے پاس رکھو۔ (النساء : ۱۰۲)

منافق کی حسرتیں :

۱۔ جنگ میں نہ جاتے تو زندہ رہتے۔ (آل عمران : ۱۵۶) ۲۔ بااختیار ہوتے تو قتل نہ ہوتے۔ (آل عمران : ۱۵۴)

۳۔ ہماری بات مان لیتے تو نہ مرتے۔ (آل عمران : ۱۶۸)

۴۔ کاش ہم فتح کے وقت مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔ (النساء : ۷۳) (فہم)

آیت مبارکہ:

وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ‌ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا ﴿۷۲﴾

لغۃ القرآن: [وَاِنَّ : اور یقینا] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [لَمَنْ : وہ بھی ضرور ہے جو] [لَّيُبَطِّئَنَّ : لازماً دیر لگائے گا] [فَاِنْ : پھر اگر] [اَصَابَتْكُمْ : آن لگی تم کو] [مُّصِيْبَةٌ : کوئی مصیبت] [قَالَ : تو وہ کہے گا] [قَدْ اَنْعَمَ : انعام کیا ہے] [اللّٰهُ : اللہ نے] [عَلَيَّ : مجھ پر] [اِذْ : جب] [لَمْ اَكُنْ : میں نہیں تھا] [مَّعَهُمْ : ان کے ساتھ] [شَهِيْدًا : موقع پر موجود]

مترادفات: [مِنْ كُمْ : منجانب ، منجملہ ، من وعن ، من حیث القوم ۔][مُّصِيْبَةٌ: مصیبت ، مصائب ۔][قَالَ : قول ،

قائل ، مقولہ ، اقوال ۔][انعَمَ : نعمت ، انعام یافتہ ، منعم حقیقی ۔][مَّعَ هُمْ : مع اہل و عیال ، معیت ۔][شَهِيْدًا : شاہد ، شہید ، شہادت ۔]

ترجمہ: اور یقیناً تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو (عمداً سستی کرتے ہوئے) دیر لگاتے ہیں، پھر اگر (جنگ میں) تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو (شریک نہ ہونے والا شخص) کہتا ہے کہ بیشک اللہ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ میں ان کے ساتھ (میدان جنگ میں) حاضر نہ تھا۔ (عرفان)

تشریح: ان دو آیات میں اندرونی دشمن کی نشاندہی کی جارہی ہے یعنی خارجی دشمن کے علاوہ تمہارے اندر منافق بھی موجود ہیں جو مختلف حیلے بہانوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں، پھر اگر جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو تو اسے اپنے لیے اللہ کا فضل شمار کر کے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اچھا ہوا ہم شریک نہیں ہوئے ورنہ ہمیں بھی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا، اور اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے تو یہ مال غنیمت سے محرومی کے باعث حسرت و پشیمانی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ (امداد)

مجاہد کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو شخص نکلتا ہے اور محض اللہ پر ایمان اور اللہ کے پیغمبروں کی تصدیق اس کو گھر سے نکالتی ہے (کوئی اور دنیوی غرض اس کے پیش نظر نہیں ہوتی) تو اللہ نے اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ (یا) ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ اس کو (جنگ سے) لوٹا دوں گا یا جنت میں داخل کر دوں گا۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابوہریرہ (رض) کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے (دن کو) روزہ رکھنے والا (رات کو) عبادت میں کھڑا رہنے والا۔ خشوع خضوع سے اللہ کا کلام پڑھنے والا کہ نہ روزہ سے تھکتا ہے نہ نماز سے (یعنی سستی نہیں کرتا) مجاہد کی یہ حالت اس وقت تک رہتی ہے کہ جہاد سے لوٹ آئے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اللہ اس کو مال غنیمت اور ثواب آخرت کے ساتھ لوٹا دے یا اس کو شہادت عطا کرے اور جنت میں داخل فرما دے۔

علامہ قرطبی کا قول

وان منکم الخ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مومنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ مومنین کی نہیں ہو سکتیں، اس لیے علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لیے خطاب میں ان کو مومنین کی ایک جماعت کہا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرتناک واقعہ بروایت ابن جریر وابن ابی حاتم عن مجاہد لکھا ہے کہ پہلی امتوں میں ایک عورت حاملہ تھی جب اسے درد ہونے لگے اور بچی تولد ہوئی تو اس نے اپنے ملازم سے کہا کہ جاؤ کہیں سے آگ لے آؤ وہ باہر نکلا تو دیکھا کہ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا لڑکی یا لڑکا؟ اس نے کہا لڑکی ہوئی ہے کہا سن یہ لڑکی ایک سو آدمیوں سے زنا کرائے گی پھر اس کے ہاں اب جو شخص ملازم ہے اسی سے اس کا نکاح ہو گا اور ایک مکڑی اس کی موت کا باعث بنے گی۔ یہ شخص یہیں سے پلٹ آیا اور آتے ہی ایک تیز چھری لے کر اس لڑکی کے پیٹ کو چیر ڈالا اور اسے مردہ سمجھ کر وہاں سے بھاگ نکلا اس کی ماں نے یہ حال دیکھ کر اپنی بچی کے پیٹ کو ٹانکے دیئے اور علاج معالجہ شروع کیا جس سے اس کا زخم بھر گیا اب ایک زمانہ گزر گیا ادھر یہ لڑکی بلوغت کو پہنچ گئی اور تھی بھی اچھی شکل و صورت کی بد چلنی میں پڑ گئی ادھر ملازم سمندر کے راستے کہیں چلا گیا کام کاج شروع کیا اور بہت رقم پیدا کی کل مال سمیٹ کر بہت مدت بعد یہ پھر اسی اپنے گاؤں میں آ گیا ایک بڑھیا عورت کو بلا کر کہا کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں گاؤں میں جو بہت خوبصورت عورت ہو اس سے میرا نکاح کرا دو، یہ عورت گئی اور چونکہ شہر بھر میں اس لڑکی سے زیادہ خوش شکل کوئی عورت نہ تھی یہیں پیغام بھیجا، منظور ہو گیا، نکاح بھی ہو گیا اور وداع ہو کر یہ اس کے ہاں آ بھی گئی دونوں میاں بیوی میں بہت محبت ہو گئی، ایک دن ذکر اذکار میں اس عورت نے اس سے پوچھا آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں یہاں کیسے آ گئے؟ وغیرہ اس نے اپنا تمام ماجرا بیان کر دیا کہ میں یہاں ایک عورت کے ہاں ملازم تھا اور وہاں سے اس کی لڑکی کے ساتھ یہ حرکت کر کے بھاگ گیا تھا اب اتنے برسوں کے بعد یہاں آیا ہوں تو اس لڑکی نے کہا جس کا پیٹ چیر کر تم بھاگے تھے میں وہی ہوں یہ کہہ کر اپنے اس زخم کا نشان بھی اسے دکھایا تب تو اسے یقین ہو گیا اور کہنے لگا جب تو وہی ہے تو ایک بات تیری نسبت مجھے اور بھی معلوم ہے وہ یہ کہ تو ایک سو آدمیوں سے مجھ سے پہلے مل چکی ہے اس نے کہا ٹھیک ہے یہ کام تو مجھ سے ہوا ہے لیکن گنتی یاد نہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے تیری

نسبت ایک اور بات بھی معلوم ہے وہ یہ کہ تیری موت کا سبب ایک مکڑی بنے گی، خیر چونکہ مجھے تجھ سے بہت زیادہ محبت ہے میں تیرے لیے ایک بلند و بالا پختہ اور اعلیٰ محل تعمیر کرادیتا ہوں اسی میں تو رہ تاکہ وہاں تک ایسے کیڑے مکوڑے پہنچ ہی نہ سکیں چنانچہ ایسا ہی محل تیار ہوا اور یہ وہاں رہنے لگی، ایک مدت کے بعد ایک روز دونوں میاں بیوی بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک چھت پر ایک مکڑی دکھائی دی اسے دیکھتے ہیں اس شخص نے کہا دیکھو آج یہاں مکڑی دکھائی دی عورت بولی اچھا یہ میری جان لیوا ہے؟ تو میں اس کی جان لوں گی غلاموں کو حکم دیا کہ اسے زندہ پکڑ کر میرے سامنے لاؤ نوکر پکڑ کر لے آئے اس نے زمین پر رکھ کر اپنے پیر کے انگوٹھے سے اسے مل ڈالا اس کی جان نکل گئی مکڑی تو ہلاک ہو گئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں جو اس کی موت کا پیغام بن گئی۔

مومنوں کی تکلیف منافقوں کی خوشی

پہلے گزر چکا کہ منافق لوگ نکلنے میں دیر لگاتے ہیں اور جہاد میں جانے والوں کی حالت کو تکتے رہتے ہیں کہ کیا گزری۔ اب فرماتے ہیں کہ جانے کے بعد اگر مسلمانوں کو جہاد میں کوئی صدمہ پہنچ گیا مثلاً مقتول ہو گئے یا شکست پیش آ گئی تو منافق بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے ورنہ ہماری بھی خیر نہ تھی الحمدللہ خوب بچے۔ (گلدستہ)

اس آیت کی تفسیر وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ائمہ حدیث نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کی ہے کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منافقین کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: "منافقوں پر بھاری ترین نماز عشاء اور فجر کی نماز ہے اگر وہ جانتے جو ان دو نمازوں میں فضیلت ہے تو وہ ان نمازوں کی طرف آتے خواہ انھیں گھٹنوں کے بل آنا پڑتا"۔ ایک روایت میں آیا ہے "اگر انھیں معلوم ہو کہ انھیں موٹی ہڈی ملے گی تو یہ عشاء کی نماز میں حاضر ہوتے"۔ (۱) (صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد ۱، صفحہ ۲۳۲) یعنی اگر دنیا کی کوئی چیز ظاہر ہو تو اس کو لے سکتے ہیں اور اس کے ملنے کا یقین ہو تو وہ اس کی طرف دوڑ کر آئیں گے۔ (قرطبیؒ)

الغرض

منافقوں کا مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا اس کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ مسلمان میدان جہاد کا رخ کریں تو یہ مختلف حیلوں بہانوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اگر میدان جنگ میں مسلمانوں کو مصیبت یعنی تکلیف اور شکست ہو تو بغلیں بجاتے ہیں اور اپنے پیچھے رہ جانے کو اللہ کا فضل شمار کرتے ہیں حالانکہ یہ عین اس کی ناراضگی کا نتیجہ ہے کہ انھیں شہادت کی سعادت اور جہاد کے ثواب سے محروم رکھا۔ اور اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو انھیں سانپ سونگھ جاتا ہے اور ان کے دلوں میں حسرت و پشیمانی کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ یہ پشیمانی اگر ثواب جہاد سے محرومی کے باعث ہوتی تو کوئی بات بھی تھی لیکن ان کی ندامت و پشیمانی تو فقط اس لیے ہے کہ انھیں اب مال غنیمت سے حصہ نہیں ملے گا۔ کان لم تکن کا جملہ ان کی ذہنیت کو خوب واضح کر رہا ہے۔ (ضیاء)

فوائد

1: یعنی منافقین، اس سے معلوم ہوا کہ عبادات میں سستی کرنا منافقوں کی علامت ہے۔

2: معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں علیحدہ رہنا اور اس پر خوش ہونا کفر ہے۔ اعمال میں، عقائد میں عام مسلمانوں کے ساتھ رہو۔ جو بکری ریوڑ میں رہے وہ بھیڑیئے سے محفوظ رہتی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾

لغۃ القرآن: [وَلَئِنْ : اور البتہ اگر] [اَصَابَكُمْ : آن لگے تم کو] [فَضْلٌ : کوئی فضل] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ (کے پاس) سے] [لَيَقُوْلَنَّ : تو وہ لازماً کہے گا] [كَاَنْ : جیسے کہ] [لَّمْ تَكُنْ : تھی ہی نہیں] [بَيْنَكُمْ : تمہارے درمیان] [وَبَيْنَهٗ: اور اس کے درمیان] [مَوَدَّةٌ : کوئی خیر خواہی] [يّٰلَيْتَنِىْ : اے کاش] [كُنْتُ : میں ہوتا] [مَعَهُمْ : ان کے ساتھ] [فَاَفُوْزَ : تب تو میں کامیابی پاتا] [فَوْزًا عَظِيْمًا : ایک شاندار کامیابی]

مترادفات: [فَضْلٌ: فضل وکرم ۔][بَيْنَ كُمْ : بین الاقوامی ، بین السطور ، بین بین ۔][مَوَدَّةٌ: محبت ومودت ۔][فَ اَفُوْز : فائز ، فوز و فلاح ۔][عَظِيْمًا : عظیم ، عظمت ، اعظم ، معظم ، تعظیم ۔]

ترجمہ: اور اگر تمہیں اللہ کی جانب سے کوئی نعمت نصیب ہو جائے تو (پھر) یہی (منافق افسوس کرتے ہوئے) ضرور (یوں) کہے گا گویا تمہارے اور اس کے درمیان کچھ دوستی ہی نہ تھی کہ اے کاش! میں ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: پس اللہ کی راہ میں ان لوگوں کو لڑنا چاہیے جو آخرت (کے ثواب) کے عوض دنیا کی زندگی فروخت کر چکے ہیں۔ اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آ جائے تو ہم عنقریب اسے اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ (النساء : ۷۴)

اخروی اجر و ثواب کے لیے جہاد کرنا

اس سے پہلی آیتوں میں جہاد سے منع کرنے والوں کی مذمت کی تھی اور اس آیت سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جہاد کی طرف راغب کر رہا ہے ' اس آیت میں فرمایا ہے مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے جو اخروی ثواب کے بدلہ میں اپنی دنیا کی زندگی فروخت کر چکے ہیں ' انسان طبعاً اپنی

زندگی خرچ کرنے کو بھاری سمجھتا ہے لیکن جب اس کو یقین ہوگا کہ یہ زندگی خرچ کرنے سے اس کو آخرت کی نعمتیں ملیں گی تو وہ بہت خوشی سے اس راہ میں زندگی خرچ کرے گا 'اور یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے فرمایا ہے اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے اور اخیر میں فرمایا پس تم نے جو اللہ سے بیع کی ہے 'اس بیع پر خوش ہو جاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم اس جنگ میں شہید ہوگئے تو اللہ کی راہ میں شہادت کا بڑا اجر ہے اور اگر تم غالب آگئے تو اخروی اجر کے ساتھ دنیاوی منفعت بھی حاصل ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے خلاف جنگ کرنے میں تمہارا سراسر فائدہ ہے خواہ تم غالب ہو یا مغلوب۔ (تبیان)

کچھ باتیں زبان زد عام و خاص ہوتی ہیں اور ان کا انحصار زبان کے استعمال پر ہے۔ اس لیے صرف زبان سے کسی بات کے نکل جانے کا کچھ اعتبار نہیں کیا گیا جب تک کہ عمل اس کا ساتھ نہ دے۔ اسلام میں یہ اصول اتنا واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے انھوں نے جب تمہاری کامیابی کی خبر سنی تو ان کی زبان پر یہ جملہ وارد ہو گیا "اے کاش ! میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا "اور ان کے اس ایک جملے نے ان کی ساری حقیقت واضح کر دی کیونکہ اس سے یہ بات خود بخود کھل کر سامنے آگئی کہ "اس میں اور تم میں کوئی خاص تعلق محبت نہ تھا "بلکہ اس کو اپنا وقتی فائدہ یاد آگیا کہ وہ کس طرح اس سے محروم ہو گیا "اگر وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بہت کامیابی حاصل کر لیتا۔

"آخر یہ کہہ کر اس نے کامیابی کس کو قرار دیا؟ دنیا کے مال کو حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کے مال کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ کامیابی کوئی اتنی بڑی کامیابی نہیں اصل کامیابی تو جہاد میں شریک ہو کر جنگ کرنا تھی۔ کیونکہ ایک سچا مسلمان میدان جنگ میں شریک ہو کر کبھی ناکام نہیں ہوتا وہ تو ہر حال میں کامیاب ہی رہتا ہے اگر شہید ہو گیا تو اس دنیا و آخرت کی دونوں کی کامیابی حاصل کر لی اور اگر غازی بن کر میدان جنگ سے واپس لوٹا تو دنیا کا مال بھی حاصل ہوا اور آخرت کا ثواب لازوال بھی۔ اس طرح دونوں حالتوں میں اس کو ایک سے ایک بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ ان لوگوں کے اس تاسف اور افسوس کا ذکر قرآن کریم نے بار بار کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے :

"اور اعرابیوں ہی میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ راہ حق میں خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر جرمانہ سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے تو الٹ پڑیں حقیقت یہ ہے کہ گردش کے دن خود انہی پر آنے والے ہیں۔ "(التوبہ : 98:9) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اور دیکھو کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کی بندگی تو کرتے ہیں مگر دل کے جماؤ سے نہیں اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہوگئے اگر کوئی آزمائش آگئی تو الٹے پاؤں اپنی کفر کی حالت پر لوٹ پڑے وہ دنیا میں بھی نامراد ہوئے اور آخرت میں بھی۔ "(الحج : 11:22) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے محبوب مکرم ﷺ ! اگر آپ کو کوئی اچھی بات پیش آجائے تو وہ انھیں بری لگے اور اگر کوئی مصیبت پیش آجائے تو کہنے لگیں اس خیال سے ہم نے اپنے لیے مصلحت بینی کر لی تھی اور پھر گردن موڑ کر خوش خوش چل دیں۔ "(التوبہ : 50:9) ایک جگہ ارشاد فرمایا :

"اے محبوب مکرم ﷺ ! آپ دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں نفاق ہے وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے کسی مصیبت کے پھیر میں نہ آجائیں۔ تو یقین کرو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تمہیں فتح دے گا یا اس کی طرف سے کامیابی کی کوئی اور بات ظاہر ہو جائے گی اور اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انھوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے۔ "(المائدہ : 53:5) (عروۃ)

جہاد اور اس کا اجر

جہاد کی تیاری کا حکم اور اس سلسلہ میں منافقوں کا عمل اس سے پہلے گزر چکا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو اسلام کا سپاہی قرار دیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ حق کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے ہر وقت تیار رہو انفرادی طور پر جنگ کا موقع ہو یا اجتماعی طور پر جہاد کی ضرورت ہو ہر صورت میں تیار رہنا لازم ہے منافقت جان بوجھ کر ٹال مٹول کریں گے اور شرکت سے باز رہیں گے اگر خدانخواستہ تمہیں تکلیف پہنچی تو خوشی کا اظہار کریں گے اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا تم کامیاب رہے اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹے تو بالکل اجنبیوں کی طرح کہیں گے کاش ہم ان کے ساتھ ہوتے اور خوب ہاتھ رنگتے لوٹ مار کرتے اور دھن دولت سمیٹ کر لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو لوگ آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں دین پر دنیا کو پسند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان کے خلاف جہاد کرو کامیابی اور ناکامی کو خاطر میں نہ لاؤ اس راہ میں مارے جاؤ یا غالب آؤ ہم دونوں صورتوں میں بہت زیادہ ثواب دیں گے۔ (ربانی)

منافقین کی دورنگی اور سیرت منافقانہ کو آشکار کیا ہے کہ مومنین کو جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو منافقین اپنی بے تعلّقی اور علیحدگی پر جھٹ اپنی مسرت و فخر کا اعلان کرنے لگتے ہیں کہ خوب ہوا جو ہم شریک نہ تھے ورنہ ہم بھی اسی بلا میں پھنستے اور مسلمانوں کو جب فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے تو رشک کرنے لگتے ہیں کہ کاش! مال غنیمت ہمارے حصہ میں بھی آتا۔ (آیت) "فضل من اللہ"۔ مثلاً جنگ میں فتح و نصرت۔ (آیت) "کان۔۔ مودۃ"۔ یعنی اس خود غرضی کے ساتھ کہتا ہے جیسے تم مسلمانوں کی خوشی سے اس منافق کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور اسے تاسف و حسرت صرف اپنی ہی قوت و دولت پر ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ امت اسلامیہ کی خوشی سے خوش ہونا علامات ایمان میں سے ہے۔ (آیت) "فافوز فوزا عظیما"۔ منافق کی زبان سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں بھی خوب دولت حاصل کرتا۔ مال غنیمت میں میرا بھی بڑا سا حصہ ہوتا! (ماجدی)

بے ایمانوں کے لیے دنیا ہی سب کچھ۔ والعیاذ باللہ!

سو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان و یقین سے محروم لوگوں کیلئے دنیا اور اس کا متاع فانی ہی سب کچھ ہے۔ سو ایسے لوگوں کا مطمح نظر دنیا اور اس کے مادی فوائد و منافع ہی ہیں اور بس۔ اسی کیلئے یہ لوگ جیتے اور اسی کیلئے مرتے ہیں۔ اور یہ چیز کوتاہ نظر انسان کو مہالک میں ڈالنے والی اور اس کو دارین کی سعادت و سرخروئی سے محروم کرنے والی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بہر کیف ایمان و یقین کی دولت سے محروم لوگوں کے نزدیک اصل چیز دنیا ہی دنیا ہے اور یہ نقطہ نظر محرومیوں کی محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو ایمان و یقین کی دولت اور حق و ہدایت کی روشنی سے محرومی کے نتیجے میں انسان ایسا اندھا اور اوندھا ہو کر رہ جاتا ہے کہ اس کی نظر بطن و فرج کے تقاضوں ہی تک محدود ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے آگے سوچنے اور دیکھنے کیلیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ (مدنی)

پتہ چلا مسلمانوں کی کامیابی سے پریشان اور ان کی تکلیف پر خوش ہونے والا منافق ہے مومن نہیں۔ مومن کی خوشی و غمی ملت کے اجتماعی مفاد سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن اللہ کے لیے لڑتا ہے مال غنیمت کے لیے نہیں یہ منافقوں کا حال تھا کہ جہاد میں مال ملے تو خوش تھے نہ ملے تو پریشان، مومن مال کے لیے نہیں بلکہ حسن مال کے لیے لڑتا ہے۔
شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (برہان)

فوائد

1: دشمن پر فتح اور مال غنیمت، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اپنی فتح کو رب تعالیٰ کا فضل جانیں محض اپنی بہادری کا نتیجہ نہ سمجھیں۔
2: اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی نفع کے لیے مسلمانوں کے ساتھ رہنا یا ساتھ رہنے کی تمنا کرنا ایمان نہیں۔ یہ تو خود غرضی اور منافقوں کا طریقہ ہے، دین و دنیا میں ہر طرح ان کے ساتھ رہو۔

آیت مبارکہ:

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

لغۃ القرآن: [فَلْيُقَاتِلْ : پس چاہیے کہ جنگ کریں] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے] [يَشْرُوْنَ : بیچ دیا] [الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا : دنیا کی زندگی کو] [بِالْاٰخِرَةِ : آخرت کے بدلے] [وَمَنْ : اور جو] [يُّقَاتِلْ : جنگ کرے گا] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [فَيُقْتَلْ : پھر وہ قتل کیا گیا] [اَوْ : یا] [يَغْلِبْ : غالب آیا] [فَسَوْفَ : تو عنقریب] [نُؤْتِيْهِ : ہم دیں گے اس کو] [اَجْرًا عَظِيْمًا : ایک شاندار بدلہ]

مترادفات: [فَ لْيُقَاتِلْ : قتل ، قتال ، مقتول ، مقتل ۔][فِيْ : فی الفور ، فی الحال ، اظہار مافی الضمیر ۔][يَشْرُوْنَ : بیع وشراء، مشتری ہوشیار باش ۔][يَغْلِبْ

: غلبہ دین ، غالب ، مغلوب ۔][اَجْرًا : اجر ، اجرت ، عنداللّٰہ ماجور ہوں ۔][عَظِيْمًا : عظیم ، عظمت ، اعظم ، معظم ، تعظیم ۔]

ترجمہ: پس ان (مؤمنوں) کو اللہ کی راہ میں (دین کی سر بلندی کے لئے) لڑنا چاہیے جو آخرت کے عوض دنیوی زندگی کو بیچ دیتے ہیں، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں جنگ کرے، خواہ وہ (خود) قتل ہو جائے یا غالب آ جائے تو ہم (دونوں صورتوں میں) عنقریب اسے عظیم اجر عطا فرمائیں گے۔ (عرفان)

تشریح:ی

ہاں اہل ایمان کا بیان ہے کہ جن لوگوں کی نگاہیں آخرت کی زندگی پر لگی ہوئی ہیں اور وہ آخرت کی خاطر دنیا کی زندگی قربان کرنے کو تیار ہیں انھیں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی راہ میں لڑنا چاہیے اور اس میں دنیوی نفع کا ہر گز خیال نہ کریں بلکہ ان کا مطلوب و مقصود اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا، دینِ اسلام کی سر بلندی اور حق کا بول بالا ہونا چاہیے۔ جب اس نیت سے کوئی جہاد کرے گا تو وہ شہید ہو جائے یا بچ کر آ جائے دونوں صورتوں میں بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو جائے گا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں عظیم اجر کا مستحق ہوگا۔ (صراط)

شرا

شرا خریدنے اور بیچنے دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہاں دوسرے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس فدائیت اور جاں نثاری کے میدان میں وہی قدم رکھے جو پہلے اپنی زندگی اور اس کی دل بستگیوں کا سودا اپنے رب کے ساتھ کر چکا ہو۔ وہ لوگ جو دنیا اور دنیاوی جاہ و جلال کے متلاشی ہیں وہ کسی اور منڈی کا رخ کریں۔ مسلمانوں کی صفوں میں اور اسلام کے پرچم کے نیچے ایسے دوں ہمت اور دنیا طلب لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ (ضیاء)

حضرت انس بن نضر (رض) کا جذبہ شہادت

حضرت انس بن مالک (رض) فرماتے ہیں " میرے چچا حضرت انس بن نضر (رض) غزوہ بدر میں نہ جا سکے، انھوں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی: آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین سے جو پہلی جنگ کی تھی میں اس میں حاضر نہ ہو سکا۔ اگر اب اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی غزوہ میں شرکت کا موقع دیا تو اللہ تعالیٰ دکھا دے گا جو میں کروں گا، پھر جب غزوہ احد کا موقع آیا تو کچھ لوگ بھاگنے لگے، حضرت انس بن نضر (رض) نے عرض کی: اے میرے پروردگار عَزَّوَجَلَّ! ان بھاگنے والوں میں جو مسلمان ہیں، میں ان کی طرف سے معذرت خواہ ہوں اور جو مشرک ہیں، میں ان سے بری ہوں۔ پھر آپ (رض) تلوار لے کر میدان جنگ کی طرف دیوانہ وار بڑھے۔ راستے میں حضرت سعد بن معاذ (رض) سے ملاقات ہوئی تو فرمایا "اے سعد! (رض)، جنت۔ اس پاک پروردگار عَزَّوَجَلَّ کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں

میری جان ہے ! میں احد پہاڑ کے قریب جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت سعد (رض) فرماتے ہیں : جیسا کارنامہ انھوں نے سر انجام دیا ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ حضرت انس (رض) فرماتے ہیں : ہم نے انھیں شہیدوں میں اس حال میں پایا کہ ان کے جسم مبارک پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کے اسّی (80) سے زائد زخم تھے، اور آپ (رض) کے اعضاء جگہ جگہ سے کاٹ دیئے گئے تھے، آپ (رض) کو پہچاننا بہت مشکل ہو چکا تھا۔ آپ (رض) کی ہمشیرہ نے آپ کو انگلیوں کے نشانات سے پہچانا۔

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب قول اللہ تعالیٰ : من المومنین رجال صدقوا۔ الخ، ۲/۲۵۵، الحدیث : ۲۸۰۵، عیون الحکایات، الحکایۃ العاشرۃ، ص ۲۷، ملتقطاً)

علامہ اقبالؒ نے اس کی کیا خوب ترجمانی کی ہے

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جب ایک مسلمان اللہ کے راستے میں لڑنے کے لیے نکلتا ہے ' اور یہ لڑائی وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کرتا ہے اور زندگی میں اسلامی نظام حیات کی حکمرانی کے لیے لڑتا ہے اور پھر وہ قتل ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک مقام شہداء پر فائز ہوتا ہے اور اگر وہ اس مقصد کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر لڑتا ہے تو وہ کسی صورت میں بھی شہید نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے کوئی اجر اور صلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صلہ ان مقاصد کے زعماء کے پاس ہوتا ہے جو لوگ ایسے لوگوں کو شہداء کہتے ہیں وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے ساتھ تقدس دیتے ہیں جس کی ساتھ اللہ کسی کو مقدس نہیں بناتا۔ (ظلال)

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ تَكَفَّلَ اللَّهُ لِمَنْ جَاهَدَ فِي سَبِيلِهِ، لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِهِ، وَتَصْدِيقُ كَلِمَاتِهِ، بِأَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، أَوْ يَرْجِعَهُ إِلَى مَسْكَنِهِ الَّذِي خَرَجَ مِنْهُ، مَعَ مَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ) [رواہ البخاری : کتاب التوحید، باب قولہ تعالیٰ ولقد سبقت کلمتنا]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کا ذمہ لے لیا جسے اس کے راستے میں صرف جہاد اور اس کے کلمے کی تصدیق نے نکالا ہو کہ اسے جنت میں داخل کرے گا یا اسے اس کے اس گھر میں اجر یا مال غنیمت کے ساتھ لوٹائے گا۔"

یاد رکھو کہ جہاد فی سبیل اللہ میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے خواہ تم غالب رہو۔۔ یا۔۔ مغلوب۔ (اور) ایسا کیوں نہ ہو ؟ اس لیے کہ خود ارشاد الٰہی ہے کہ (اللہ تعالیٰ) (کی راہ میں جو لڑے) اور جہاد کرے (پھر مار ڈالا جائے) شہید کر دیا جائے (یا جیت جائے تو) دونوں صورتوں میں (ہم جلد دیں گے اس کو اجر عظیم) قتل ہو جانے کی صورت میں شہادت کا عظیم درجہ حاصل ہو جائے گا اور دنیا کی فانی زندگی کو قربان کر کے وہ آخرت کی لافانی زندگی والا ہو جائے گا ایسا کہ اسے مردہ کہنا تو بڑی بات مردہ گمان کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا، اور غالب ہو جانے کی صورت میں اخروی اجر کے ساتھ ساتھ دنیاوی منفعت بھی حاصل ہوگی اور جب جہاد فی سبیل اللہ کی عظمتیں اور اس کے فوائد بیشمار ہیں تو اے ایمان والو ! سوچو۔ (اشرفی)

نیت میں اخلاص ہو۔ مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور دین کی سر بلندی ہو تو پھر کامیابی کا یہ معیار نہیں کہ خیر و عافیت سے مال غنیمت کے انبار سمیٹے ہوئے واپس آئے تو کامیاب ورنہ ناکام۔ نہیں وہ شخص ہر حالت میں کامیاب ہے سلامتی سے گھر واپس آئے تو، جام شہادت نوش کرے تو

فوائد

1: تاکہ اسلام بلند ہو اور کفر کا زور ٹوٹے۔ مسلمانوں کو رب کی عبادت میں کوئی آڑ نہ ہو۔ یہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

2: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جہاد میں اپنے نفس کے نفع کا بالکل خیال نہ ہو۔ ملک گیری صرف دین کی خدمت کے لیے ہو۔ دوسرے یہ کہ مجاہد اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جائے۔ یہ سمجھ لے کہ میں شہید ہونے جارہا ہوں جیسا کہ یشرون سے ظاہر ہے۔ اگر یہ دو وصف مومن میں جمع ہو جاویں تو اللہ اس کو فتح دیتا ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

3: فتح مند کو دنیا میں غنیمت دے کر اور آخرت میں جنت دے کر، شہید یا شکست خوردہ کو آخرت میں بڑا اجر عطا فرما کر۔ بہر حال یہ ایسا سودا ہے جس میں گھاٹا کوئی نہیں۔ (نور)

آیت مبارکہ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ؕ

لغۃ القرآن: [وَمَا لَكُمْ : تمہیں کیا ہے] [لاَ تُقَاتِلُوْنَ : (کہ) تم لوگ جنگ نہیں کرتے] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ : اور کمزور کیے ہوئے لوگوں کے لیے] [مِنَ الرِّجَالِ : مردوں میں سے] [وَالنِّسَآئِ : اور عورتوں میں سے] [وَالْوِلْدَانِ : اور بچوں میں سے] [الَّذِيْنَ : جو لوگ] [يَقُوْلُوْنَ : کہتے ہیں] [رَبَّنَآ : اے ہمارے ربّ] [اَخْرِجْنَا : تو نکال ہم کو] [مِنْ ہٰذِهِ الْقَرْيَةِ : اس بستی سے] [الظَّالِمِ : ظالم ہیں] [اَہْلُہَا : جس کے لوگ] [وَاجْعَلْ : اور تو بنا] [لَّنَا : ہمارے لیے] [مِنْ لَّدُنْکَ : اپنے پاس سے] [وَلِيًّا : کوئی کارساز] [وَّاجْعَلْ : اور تو بنا] [لَّنَا : ہمارے لیے] [مِنْ لَّدُنْکَ : اپنے پاس سے] [نَصِيْرًا : کوئی مددگار]

مترادفات: [تُقَاتِلُوْنَ : قتل ، قتال ، مقتول ۔][سَبِيْلِ : فی سبیل اللہ ، اللہ کوئی سبیل نکالے گا ۔][الْمُسْتَضْعَفِيْنَ : ضعیف وناتواں ، ضعیف الاعتقاد ۔][الرِّجَالِ : قحط الرجال ، رجال کار ۔][النِّسَآءِ : نسوانیت ، تربیت نسواں ، حقوق نسواں ۔][الْوِلْدَان : ولد ، اولاد ، مولود ۔][يَقُوْلُوْنَ : قول ، اقوال ، مقولہ ۔][اَخْرِجْ نَا : خارج ، خروج ، اخراج ۔][الْقَرْيَةِ : قریہ قریہ ، بستی بستی ۔][اَهْلُ هَا : اہل و عیال ، اہل خانہ ۔]

ترجمہ: اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں (مظلوموں کی آزادی کے لئے) جنگ نہیں کرتے حالانکہ کم زور، مظلوم اور مقہور مرد، عورتیں اور بچے (ظلم وستم سے تنگ آکر اپنی آزادی کے لئے) پکارتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جہاں کے (وڈیرے) لوگ ظالم ہیں، اور کسی کو اپنی بارگاہ سے ہمارا کارساز مقرر فرمادے، اور کسی کو اپنی بارگاہ سے ہمارا مددگار بنادے

تشریح:

شان نزول

مشرکین مکہ میں مسلمانوں کو ایذائیں دے رہے تھے قبل از ہجرت ایک جماعت صحابہ علیہم رضوان نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں کافروں سے مقابلہ کی اجازت دی جائے انھوں نے ہمیں بہت ستایا ہے۔بڑی ایذائیں پہنچائیں ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابھی جنگ سے ہاتھ روکے رہو اور نماز زکوۃ جو تم پر فرض ہے وہ ادا کرتے رہو اس کے بعد یہ جہاد اور قتل کا فرق ظاہر ہوا جس سے واضح کیا کہ جہاد اسلامی کیا ہے اور شیطانی کیا ہے۔ (حسنات)

جہاد کے متعلق خطاب جاری ہے اور اس میں مظلوم کی مدد کرنا لازم قرار دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے وطن اور گھر کی محبت انسان ہی نہیں درندوں اور پرندوں کے دل میں بھی پیدا فرمائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ درندے اپنی غار کی اور پرندے اپنے گھونسلے کے ایک ایک تنکے کی حفاظت کرتے ہیں اور ہر جاندار شام کو اپنے ٹھکانے کی طرف پلٹتا ہے۔ کوئی جاندار اپنے گھر اور وطن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن جب کسی کو اس قدر ستایا جائے کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑ جائیں تو وہ ہر چیز چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی صورت انسان کی ہے جب مکہ معظّمہ میں مسلمانوں پر اس قدر مظالم توڑے گئے کہ ظالم اور سفاک لوگوں نے مسلمان خواتین اور معصوم بچوں کو بھی معاف نہ کیا۔ جس کی وجہ سے مرد، عورتیں اور بچے بلبلا اٹھے کہ بارالٰہی! ظالموں کی بستی سے نکلنے کے لیے

اپنی طرف سے ہمارا سر پرست اور مدد گار پیدا فرما۔ تاکہ ہم اپنے ایمان اور جان و مال کو بچا سکیں۔ اس دعا میں کمزور مسلمانوں کی مظلومیت کا نقشہ پیش کرنے کے ساتھ ان کی ہمدردی اور مدد کے لیے مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت واضح کی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی جہاد کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں۔ ا۔ دفاعی۔ ۲۔ مظلوم مسلمان اور انسانیت کی مدد کرنا۔ ۳۔ اللہ کے باغیوں کو سرنگوں کر کے پرچم اسلام کو سر بلند رکھنا۔ کیونکہ زمین ومافیہا اللہ کی ملکیت ہے۔ لہٰذا باغی انسانوں کو سرنگوں کرنا اور رکھنا اللہ والوں کی ذمہ داری ہے۔

جہاں تک مظلوم انسانیت کی مدد کرنے کا معاملہ ہے دنیا میں دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان لازوال تاریخ رکھتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنی اغراض کے بجائے محض اللہ کی رضا اور انسانیت کی حمایت کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ ہسپانیہ کی تاریخ گواہ ہے کہ جب عیسائی حکمران راڈرک نے اپنے ہی گورنر کی معصوم بچی کے ساتھ زیادتی کی تو گورنر نے مجبور ہو کر اپنے ہم منصب مسلمان ملک کے سرحدی گورنر موسیٰ بن نصیر کو خط لکھا۔ جس کے جواب میں طارق بن زیاد نے اسپین پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں تقریباً 8 سو سال تک اسپین امن وامان کا گہوارہ بنا۔ ہسپانوی مورخ اسے ہسپانیہ کی تاریخ کا سنہری دور تصور کرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال سندھ میں پیدا ہوئی کہ جب مسلمان مسافروں پر راجہ داہر کے غنڈوں نے حملہ کیا تو ایک مسلمان بیٹی نے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو دہائی دی۔ حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو مظلوموں کی مدد کے لیے بھیجا۔ جس سے تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان میں اسلام کا پھریرا بلند رہا اور اس ملک میں وحدت پیدا ہوئی۔ لوگوں کو سیاسی ، علمی شعور ملنے کے ساتھ امن و سکون نصیب ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ اسی جہاد کی ترجمانی قادسیہ میں جو اس وقت ایرانی حکومت کا دارالحکومت تھا حضرت ربیع (رح) نے رستم کے سامنے ان الفاظ میں کی تھی :

(إِنَّا قَدْ أُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ إِلَى نُورِ الْإِيمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوكِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ)

[البدایہ والنہایہ]

” (ہم خود نہیں آئے) ہمیں بھیجا گیا ہے تاکہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور ایمان میں لا کھڑا کریں۔ عوام الناس کو بڑے لوگوں کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کے عادلانہ نظام میں زندگی گزارنے کا موقعہ فراہم کریں۔ “ (فہم)

فوائد

1 : اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فرض ہے۔ بلاوجہ نہ کرنے والا ایسا ہی گناہ گار ہوگا جیسے نماز چھوڑنے والا۔ خیال رہے کہ جہاد کی فرضیت کچھ شرائط پر موقوف ہے جب وہ پائی جاویں تو فرض ہے کبھی فرض عین کبھی فرض کفایہ۔

2 : اس سے پتہ لگا کہ عبادت الٰہی میں اللہ کی رضا کے ساتھ مسلمانوں کی خدمت کی نیت کرنا شرک نہیں ہے جائز ہے۔ دیکھو جہاد عبادت ہے مگر فرمایا گیا کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مسلمانوں کے لیے جہاد کرو۔ کمزور مرد و عورت وہ مسلمان تھے جو مکہ شریف سے ہجرت کرنے پر قادر نہ ہوئے مجبوراً وہاں رہے۔

3 : اس سے معلوم ہوا کہ متبرک مقام پر رہ کر اگر اللہ کی عبادت پر قدرت نہ ہو تو وہاں سے نکل جانا یا نکلنے کی دعا کرنا ضروری ہے۔ مکہ کے ضعیف مومن جو ہجرت نہ کرسکے وہ مکہ سے نکلنے کی دعائیں مانگتے تھے کیونکہ وہاں آزادی سے عبادت نہ کرسکتے تھے۔ حالانکہ اب مکہ شریف میں رہنا باعث برکت ہے۔ یہ بھی معلوم کہ تقیہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین ظالم نہ تھے۔ ورنہ علی مرتضیٰ پر مدینہ سے ہجرت کرنا واجب ہو جاتی۔ اور خلفاء ثلاثہ کے زمانے میں مدینہ میں بلا سخت مجبوری رہنا حرام ہوتا۔ رب فرماتا ہے۔ الم تکن

ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیہا۔ یہاں ظالم سے مراد جابر کفار ہیں جو مسلمانوں کو ستائیں اور دین پر انھیں قائم نہ رہنے دیں کسی ملک میں کفار کا صرف موجود ہونا ہجرت کو لازم نہیں کرتا۔

4: معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ جس پر مہربان ہوتا ہے اس کے لیے مددگار مقرر فرما دیتا ہے اور جس پر قہر فرماتا ہے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے مددگار بنانے کی دعا مانگنے کا حکم دیا۔ غیر خدا کی مدد شرک نہیں۔ بلکہ رب کی رحمت ہے۔ دعا کا مقصد یہ ہے کہ مولیٰ یا تو ہمیں مکہ سے نکال یا مددگار مجاہدین کو بھیج جو ہمیں کفار کے چنگل سے چھڑائیں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ غازیان اسلام نے مکہ فتح فرمایا۔ ان کمزوروں کو ظالموں سے چھڑایا۔

مسائل

۱۔ کفار کے مظالم سے مسلمانوں کو چھڑانا چاہیے۔

۲۔ مظلوم کو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہیے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

آیت مبارکہ:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾

لغۃ القرآن: [اَلَّذِیْنَ : جو لوگ] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [یُقَاتِلُوْنَ : وہ لوگ جنگ کرتے ہیں] [فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : اللہ کی راہ میں] [وَالَّذِیْنَ : اور جنہوں نے] [کَفَرُوْا : کفر کیا] [یُقَاتِلُوْنَ : وہ لوگ جنگ کرتے ہیں] [فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ : طاغوت کی راہ میں] [فَقَاتِلُوْآ : پس تم لوگ جنگ کرو] [اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ : شیطان کے کارندوں سے] [اِنَّ : یقینا] [کَیْدَ الشَّیْطٰنِ : شیطان کی چالبازی] [کَانَ ضَعِیْفًا : کمزور (ہوتی) ہے]

مترادفات: [اٰمَنُوْا : امن ، ایمان ، مومن ۔][اَوْلِیَآءَ : ولی ، اولیاء اللہ ۔][ضَعِیْفًا : ضعیف وناتواں ، ضعف جگر ۔]

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں (نیک مقاصد کے لئے) جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ شیطان کی راہ میں (طاغوتی مقاصد کے لئے) جنگ کرتے ہیں، پس (اے مومنو!) تم شیطان کے دوستوں (یعنی شیطانی مشن کے مددگاروں) سے لڑو، بیشک شیطان کا داؤ کمزور ہے۔

تشریح: عمل ایک ہی ہوتا ہے لیکن مقاصد کے اختلاف کے باعث وہ لائق تحسین یا قابل نفرین ہو جاتا ہے۔ جنگ کی اجازت اسلام نے بھی دی۔ اور دوسری قومیں بھی لڑائی کیا کرتی ہیں۔ دونوں جنگوں میں خون کے دریا بہتے ہیں۔ کشتوں کے پشتے لگتے ہیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار سے فضا سوگوار ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اسلام کی جنگ اور دوسری جنگوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مومن کی جنگ اعلائے کلمتہ اللہ کے لئے، عدل و انصاف، مساوات وحریت، نیکی و تقویٰ کی اقدار کو زندہ کرنے کے لیے ہوتی ہے اور غیر مومن کی جنگ کے پس پردہ صرف مادی فوائد کارفرما ہوتے ہیں۔ کسی ملک پر قبضہ، کسی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا، اپنے لیے تجارت کی منڈیاں قائم کرنا، مفتوحہ ممالک کی معدنیات اور قدرتی ذخائر سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو طاغوت (یعنی باطل) کے ایک لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ ان مقاصد کے لیے جو جنگ لڑی جائے گی خواہ لڑنے والوں کے سر پر ہلالی پرچم لہرا رہا ہو اور غلغلہ ہائے تکبیر سے ساری فضا تھرا رہی ہو وہ جنگ فی سبیل اللہ نہیں ہو گی۔ (ضیاء)

ترتیب کے لحاظ سے آخری آیت

یہ اس رکوع کی آخری آیت ہے اور ترتیب مضامین کے لحاظ سے اس میں آخری بات ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو آئے دن جنگیں لڑنی پڑتی ہیں کبھی اس قبیلے سے جنگ ہے اور کبھی اس قبیلے سے ، کبھی ایک طرف سے کفر کی گھٹا چڑھ رہی ہے تو کبھی دوسری طرف سے کفر کی باد سموم نے چلنا شروع کر دیا ہے مسلمان برابر ان میں سے ہر ایک کی زد میں ہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں ! تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان کا کام اللہ کے راستے میں جہاد و قتال کے سوا کچھ نہیں۔ اور کافر کا کام طاغوت اور شیطان کے لیے لڑنا ہے۔ روشنی چاہے شمع کی شکل میں ہو یا ایک ٹمٹماتے دیئے کی شکل میں اسے بہر صورت اندھیرے اور تاریکی سے لڑنا اور اس وقت تک جلنے کی کوشش کرنا ہے جب تک ماحول سے تاریکی دور نہ ہو جائے۔ بارش کا کام زمین کو سیراب کرنا ہے چاہے زمین کیسی بھی جھلسی ہوئی کیوں نہ ہو۔ ایک طبیب کا کام مریض کے مرض سے لڑنا ہے چاہے مریض بر لب مرگ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان کا کام ہر طرح کے کفر سے نبرد آزما ہونا ہے۔ چاہے وہ نظریاتی کفر ہو اور چاہے وہ عملی کفر ہو چاہے اس نے ظلم کی چادر اوڑھ رکھی ہو اور چاہے اس نے سیاست کا لبادہ پہن رکھا ہو۔ ایک مومن کا کام ہر رنگ اور ہر صورت میں اپنے جہاد کو جاری رکھنا ہے ، کبھی دماغی کاوشوں سے ، کبھی قلبی توانائیوں سے کبھی علمی دلائل سے ، کبھی سیاست کے صالح طور اطوار کے ساتھ۔ اور اگر معاملہ ظلم اور جارحیت

تک پہنچ جائے تو پھر موجود طاقت سے کام لے کر۔ چاہے جان دینی پڑے یا جان لینی پڑے۔ یہی کام عہد نبوت میں بھی مسلمانوں کا تھا اور یہی کام قیامت تک مسلمانوں کا رہے گا۔ کیونکہ ان کی پہچان ہی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اس کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہوتا۔ جس طرح کفر نے آج تک اپنے طریقے نہیں بدلے عہد نبوت اور عہد صحابہ میں بھی اہل کتاب اور دیگر کفار اسلام اور مسلمان دشمنی میں اکٹھے تھے۔ آج بھی اکٹھے ہیں۔ ان سب کا مقابلہ مسلمانوں نے ایمان کی قوت سے کیا تھا۔ آج بھی اسی قوت سے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہے نہ آئے گی۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے

وہی قوت اسد اللّٰہی وہ مرحبی وہی عنتری

مسلمان ریاستوں کے حکمران اور سیکولر سیاست دان آج کے کفر کے مقابلے میں چاہے کیسی خوش فہمی کا شکار ہوں اور وہ ہزار یہ سمجھیں کہ کفر نے اسلام کو برداشت کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن اے کاش انھیں سوچنے کی توفیق نصیب ہو:

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ تم بدلے

میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں

یہ آگہی دینے کے بعد حکم دیا فَقَاتِلُوٓا اَوۡلِيَآءَ الشَّيۡطٰنِ (پس شیطان کے دوستوں سے لڑو) خیر کی پشت پناہ قوت رحمان ہے۔ اور شر کا پشتیبان شیطان ہے۔ مسلمانوں کے سر پر رحمان کا سایہ ہے اور کفر کے ساتھ شیطان کی قوتیں ہیں۔ شیطان اپنے داؤ پیچ تو بدلتا ہے لیکن اپنے مقصد سے کبھی انحراف نہیں کرتا۔ اس لیے مسلمانوں کو کبھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ لڑے بغیر چارہ کار نہ ہو تو پھر بے تأمل شیطان کی قوتوں سے لڑو۔ اور ان کی قوتوں سے کبھی مرعوب ہونے کی غلطی نہ کرو۔ شیطان کی قوتیں چاہے کتنی عظیم بھی ہوں اور بظاہر ان کا چاہے کیسا ہی چرچا کیوں نہ ہو لیکن تم یاد رکھو تمہارے سروں پر اللہ کی نصرت کا سایہ ہے۔ اور اللہ کے مقابلے میں شیطان کی قوتیں کبھی پائیدار نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے آخر آیت میں فرمایا کہ شیطان کی تدبیریں ہمیشہ بودی اور کمزور ہوتی ہیں۔ ان سے خوفزدہ ہونے کی کبھی غلطی نہ کرنا۔ البتہ اس میں دو شرطیں ہیں۔ (۱) ایمان۔ (۲) فی سبیل اللہ۔ یعنی مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی قوت موجود ہو۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرنا نہ جانتے ہوں۔ ان کا سر اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ ان کے دل اللہ کی محبت سے دھڑکتے ہوں۔ ان کی زبانوں پر صرف اللہ کے دین کے ترانے ہوں اور ان کی اجتماعی زندگی میں صرف اللہ کا قانون نافذ ہو۔ اور دوسری شرط یہ کہ ان کا ہر کام فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ وہ کافروں سے اللہ کے دین اور اس کی رضا کے لیے لڑتے ہوں اپنے ذاتی مفادات یا قومی مفادات ہر گز ان کے پیش نظر نہ ہوں۔ ان دو شرطوں کے پورا کر دینے کے بعد شیطان کی تدبیریں اس لیے بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ اللہ کی نصرت و تائید صاف صاف نظر آنے لگتی ہے۔ جنگ بدر میں شیطان نے مشرکین مکہ کو پوری طرح یقین دلایا "انی معکم لا غالب لکم الیوم" (میں تمہارے ساتھ ہوں آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا) لیکن جب اس نے فرشتوں کو اترتے دیکھا اور اللہ کی تائید و نصرت نظر آئی تو ابو جہل سے ہاتھ چھڑا کے بھاگا اور کہا "جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔" ہر دور کے مسلمانوں کی کامیابی کے لیے یہی دو شرطیں لازمی ہیں مقدور بھر ظاہری اسباب کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان دو بنیادی شرطوں کو بروئے کار لانے سے تو میدان بدر کی طرح ہمیشہ فرشتے اتر سکتے ہیں۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی (روح)

قرآن مجید کی ترغیب جہاد کے نکات

اپنے ملک کے دفاع اور کفار کے خلاف جہاد کے لیے اسلحہ کو حاصل کرنا توکل کیخلاف نہیں ہے ' کیونکہ توکل کا معنی ترک اسباب نہیں ہے بلکہ کسی مقصود کے حصول کے اسباب کو فراہم کر کے اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کر کے نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا توکل ہے۔
اسی طرح آلات حرب کو حاصل کرنا بھی تقدیر کے خلاف نہیں ہے بلکہ جہاد کی تیاری کرنا بھی تقدیر سے ہے۔ اس رکوع کی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جہاد کیلیے پے در پے مجاہدوں کے دستے بھیجنا بھی جائز ہے اور یک بارگی مل کر حملہ کرنا بھی جائز ہے اور یہ کہ ہر دور میں کچھ لوگ اپنی بدنیتی یا بزدلی کی وجہ سے یا غداری اور منافقت کی وجہ سے جہاد سے منع کرنے والے بھی ہوتے ہیں ' لیکن مسلمان ان سے متاثر نہ ہوں بلکہ اخروی اجر وثواب کی وجہ سے جہاد کریں ' وہ جہاد میں غالب ہوں یا مغلوب ہر صورت میں ان کے لیے اجر ہے ' نیز یہ بتایا ہے کہ جہاد کا ایک داعیہ اور سب یہ ہے کہ جس خطہ زمین میں کافروں نے مسلمانوں کو غلام بنایا ہوا ہے یا ان کے ملک پر قبضہ کر کے ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہوا ہے ' ان کو کافروں اور ظالموں سے آزاد کرانے کے لیے بھی جہاد کرنا چاہیے اور آخر میں یہ بتایا کہ کافروں کا جنگ میں کیا مطمح نظر ہوتا ہے اور مسلمانوں کا ہدف کیا ہونا چاہیے۔

ترغیب جہاد کی متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:) جو شخص میرے راستہ میں جہاد کے لیے نکلا اور وہ شخص صرف مجھ پر ایمان رکھنے اور میرے رسول کی تصدیق کی وجہ سے نکلا ہو۔ میں اس کا ضامن ہوں کہ اس کو اجر یا غنیمت کے ساتھ لوٹاؤں یا جنت میں داخل کر دوں ' (آپ نے فرمایا:) اگر میری امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں کسی لشکر میں شامل ہوئے بغیر نہ رہتا ' اور بیشک میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں ' پھر قتل کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۳۶ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۱۸۷۶ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۵۰۴۴ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۲۷۵۳)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کرنا کس عبادت کے برابر ہے؟ آپ نے فرمایا تم اس کی طاقت نہیں رکھتے انھوں نے دو یا تین مرتبہ یہی سوال کیا آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے ' تیسری بار آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو دن کو روزہ رکھے ' رات کو قیام کرے اور اللہ کی آیات کی تلاوت کرے اور وہ روزے اور نماز سے تھکتا نہ ہو۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۱۸۷۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۱۶۲۵)

حضرت فضالہ بن عبید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر شخص کا خاتمہ اس کے عمل پر کر دیا جاتا ہے، ماسوا اس شخص کے جو اللہ کی راہ میں سرحد پر پہرہ دیتے ہوئے فوت ہو جائے اس کا عمل قیامت تک بڑھایا جاتا رہے گا۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۱۲۶۷ 'سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۲۵۰۰ 'المعجم الکبیر ج ۱۸ص ۸۰۲ 'المستدرک ج ۲ص ۱۴۴ 'مشکل الآثار ج ۳ص ۱۰۲)

حضرت ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ افضل اعمال ہیں 'ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! یہ بتلایئے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ درآں حالیکہ تم صبر کرنے والے ہو 'ثواب کی نیت کرنے والے ہو آگے بڑھ کر وار کرنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہ ہو 'پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ اس شخص نے کہا میں نے کہا یہ بتایئے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس سے میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں بشرطیکہ تم صبر پر قائم ہو 'اور تمہاری نیت ثواب کی ہو ' تم آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہ ہو تو قرض کے سوا تمہارے سب گناہ معاف ہو جائیں گے 'مجھ سے ابھی جبرائیل نے یہ کہا ہے۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۱۸۸۵ 'سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۱۷۱۸ 'سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۳۱۵۶)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: شہید کو قتل ہونے سے صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے سے۔ (سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۳۱۶۱ 'سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۱۶۶۸ 'سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۲۸۰۲)

حضرت معاذ بن جبل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس مسلمان شخص نے اونٹنی کا دودھ دوہنے کے وقت کے برابر بھی جہاد کیا اس کیلیے جنت واجب ہو گئی 'اور جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوا یا اس کا خوان بہا وہ جب قیامت کے دن اٹھے گا تو اس کا بہت زیادہ خون بہہ رہا ہو گا اس خون کا رنگ زعفران کا ہو گا اور خوشبو مشک کی ہو گی۔ سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۱۶۶۲ 'سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۲۵۴۱ 'سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۱۳۴۱ 'سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۲۷۹۲) (تبیان)

اے اہل ایمان! باطل کو نیست و نابود کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دو۔ تم حق کے علم بردار ہو۔ حق کو فتح اور غلبہ نصیب ہو گا تو انسانیت کے چمن میں بہار آ جائے گی۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بالادستی قائم ہو گی۔ نیکی کی روشنی اور مہک ہر سو پھیل جائے گی۔ امن و عافیت کا دور دورہ ہو گا۔ باطل کے سربراہوں کی فتنہ سامانیوں سے خوفزدہ اور دل گرفتہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہارے نعرہ اللہ اکبر سے اہل طاغوت کے قلعے لرز جائیں گے۔ تمہارے ایک حملہ کی دیر ہے ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ شیطان کا مکر و فریب بہت کمزور ہے۔

آیت مبارکہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

لغۃ القرآن: [اَلَمْ تَرَ : کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غور نہیں کیا] [اِلَى الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی طرف] [قِيْلَ : کہا گیا] [لَهُمْ : جن سے] [كُفُّوْٓا : کہ تم لوگ روکے رکھو] [اَيْدِيَكُمْ : اپنے ہاتھوں کو] [وَاَقِيْمُوا : اور قائم کرو] [الصَّلٰوةَ : نماز کو] [وَاٰتُوا : اور پہنچاؤ] [الزَّكٰوةَ : زکوۃ کو] [فَلَمَّا : پھر جب] [كُتِبَ : فرض کیا گیا] [عَلَيْهِمُ : ان پر] [الْقِتَالُ : جنگ کرنے کو] [اِذَا : تب ہی] [فَرِيْقٌ: ایک فریق] [مِّنْهُمْ : ان میں سے] [يَخْشَوْنَ : ڈرتا ہے] [النَّاسَ : لوگوں سے] [كَخَشْيَةِ اللّٰهِ : اللہ سے ڈرنے کی مانند] [اَوْ : یا] [اَشَدَّ : زیادہ سخت ہوتے ہوئے] [خَشْيَةً : بلحاظ ڈر کے] [وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا] [رَبَّنَا : اے ہمارے ربّ] [لِمَ : کیوں] [كَتَبْتَ : تو نے فرض کیا] [عَلَيْنَا : ہم پر] [الْقِتَالَ : جنگ کرنا] [لَوْلَآ : کیوں نہیں] [اَخَّرْتَنَآ : تو نے مؤخر کیا ہم کو] [اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ : ایک قریبی مدت تک] [قُلْ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہیے] [مَتَاعُ الدُّنْيَا : دنیا کا سامان] [قَلِيْلٌ : تھوڑا ہے] [وَالْاٰخِرَةُ : اور آخرت] [خَيْرٌ: بہتر ہے] [لِّمَنِ : اس کے لیے جس نے] [اتَّقٰى : تقویٰ کیا] [وَلَا تُظْلَمُوْنَ : اور تم لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا] [فَتِيْلًا : کسی دھاگے برابر بھی]

مترادفات: [قِيْلَ : قول ، قائل ، اقوال ، مقولہ ۔][اَيْدِيَ كُمْ : یدبیضائ، ید طولی ، رفع الیدین ۔][اَقِيْمُو : قائم ، قیام ، مقیم ، اقامت ، قیامت ۔][كُتِبَ : کاتب ، کتابت ، مکتوب ۔][عَلَيْ هِمُ : علیحدہ ، علی الاعلان ، علی العموم ۔][فَرِيْقٌ: فریق اول ، فرقہ ، تفریق ۔][كَخَشْيَةِ : خشیت الہی ۔][ال نَا سَ : عوام الناس ، عامۃ الناس ۔][اَشَدَّ : اشد ضرورت ، شدید ، شدت ۔][اَخَّرْتَ نَا : موخر ، تاخیر ۔][قَرِيْبٍ : قرب و جوار ، قریبی رشتہ دار ، مقرب ۔][مَتَاعُ : متاع کارواں ، مال ومتاع ۔][قَلِيْلٌ: الاقلیل ، قلت ۔][وَالْاٰخِرَةُ : یوم آخرت ، آخری ، اخروی زندگی ۔][خَيْرٌ: خیر ، خیروعافیت ، خیریت ۔][اتَّقٰی: تقوی ، متقی ۔][تُظْلَمُوْنَ : ظلم ، ظالم ، مظلوم ، مظالم ۔]

ترجمہ: کیاآپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہیں (ابتداءً کچھ عرصہ کے لئے) یہ کہا گیا کہ اپنے ہاتھ (قتال سے) روکے رکھو اور نماز قائم کئے رہو اور زکوۃ دیتے رہو (تو وہ اس پر خوش تھے)، پھر جب ان پر جہاد (یعنی کفر اور ظلم سے ٹکرانا) فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ (مخالف) لوگوں سے (یوں) ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر۔ اور کہنے لگے: اے ہمارے رب! تو نے ہم پر (اس قدر جلدی) جہاد کیوں فرض کر دیا؟ تو نے ہمیں مزید تھوڑی مدت تک مہلت کیوں نہ دی؟ آپ (انہیں) فرما دیجئے کہ دنیا کا مفاد بہت تھوڑا (یعنی معمولی شے) ہے، اور آخرت بہت اچھی (نعمت) ہے اس کے لیے جو پرہیزگار بن جائے، وہاں ایک دھاگے کے برابر بھی تمہاری حق تلفی نہیں کی جائے گی

تشریح:

شان نزول

اس آیت مبارکہ کا شان نزول یوں ہے کہ مشرکین مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو بہت ایذائیں دیتے تھے۔ ہجرت سے پہلے صحابہ کرام (رض) کی ایک جماعت نے تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہمیں کافروں سے لڑنے کی اجازت دیجئے، انھوں نے ہمیں بہت ستایا ہے اور بہت ایذائیں دی ہیں۔ حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ان کے ساتھ جنگ کرنے سے ابھی ہاتھ روک کر رکھو اور ابھی صرف نماز اور زکوۃ ادا کرو۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ کیا تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جن سے شروع اسلام میں مکہ مکرمہ میں کہا گیا کہ ابھی جہاد سے اپنے ہاتھ روکے رکھو اور ابھی صرف نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۷۷، ۱/۴۰۳)

لیکن پھر جب مدینہ منورہ میں ان پر جہاد فرض کیا گیا تو وہ اس وقت طبعی خوف کا شکار ہوگئے جو انسانی فطرت ہے اور حالت یہ تھی کہ ان میں ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرنا ہوتا ہے یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھا اور کہنے لگے : اے ہمارے رب ! عَزَّوَجَلَّ، تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا ؟ اس کی حکمت کیا ہے ؟ یہ سوال حکمت دریافت کرنے کے لیے تھا، اعتراض کرنے کیلئے نہیں۔ اسی لیے ان کو اس سوال پر توبیخ وزجر نہ فرمایا گیا بلکہ تسلی بخش جواب عطا کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، تم ان سے فرمادو کہ دنیا کا ساز و سامان تھوڑا سا ہے، فنا ہونے والا ہے جبکہ پرہیزگاروں کے لیے آخرت تیار کی گئی ہے اور وہی ان کیلئے بہتر ہے۔ لہٰذا جہاد میں خوشی سے شرکت کرو۔ (صراط)

اے محبوب ! (کیا) تم نے عبدالرحمٰن بن عوف بن ابی وقاص مقداد بن اسود اور ان جیسوں کی طرف نہیں دیکھا اور ان کے جذبات خیر کی طرف توجہ نہیں فرمائی جو مکہ شریف میں کفار کے مظالم سے تنگ آکر اصرار و مبالغہ کے ساتھ عرض کرتے تھے یا رسول اللہ ہمیں اجازت دیجے کہ مشرکوں سے ہم لڑیں اس واسطے کہ ان کی ایذارسانی اور تکلیف دہی حد سے گزر گئی ہے (جن) سے ان کی اس خواہش کے جواب میں حکم الٰہی سے کہا گیا کہ ابھ صبر کرو اور جب تک حکم الٰہی نہ آجائے اس وقت تک کفار کی لڑائی سے اپنے ہاتھ کو روکو کافروں سے جہاد نہ کرو۔

۔۔ بلکہ ۔۔ جو احکام تم پر فرض کیے جا چکے ہیں انھیں پر عمل کرتے رہو، چنانچہ۔ پابندی کے ساتھ نماز قائم کرو باضابطہ کماحقہ اسے ادا کرتے ہوئے اور صاحب نصاب ہونے کی صورت میں مستحقین کو زکوۃ دو فی الحال انہی فرائض پر عمل کرلینا تمہارے لیے کافی ہے اور پھر جب وہ ہجرت کرکے مدینہ میں آئے اور لازم کیا گیا ان پر کافروں کے ساتھ قتال تو اس وقت ان کی ایک ٹولی ہے جس کا حال اس جماعت جیسا ہے جو بوجہ ضعف قلب یا بوجہ نفاق لوگوں سے ڈرتی ہے یا ان میں سے بعض بوجہ ضعف قلب، فوت اور موت سے بالطبع ڈرنے والے تھے اور بعض بوجہ نفاق خوف زدہ بن کر اپنے کو جہاد سے بچانا چاہتے تھے اور ان کا خوف کچھ ہلکا پھلکا خوف نہیں تھا، بلکہ ایسا ڈرتے تھے جیسے کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈر بلکہ حد سے زیادہ ڈر، ان میں کمزور دل والوں کا خوف بشری تقاضا اور ضعف بشریت کی وجہ تھا حکم خدا کو مکروہ جاننے کی وجہ سے نہیں تھا۔

۔۔ المختصر ۔۔ حکم خدا کے آگے ان کا سر تسلیم جھکا ہوا تھا ۔۔ لیکن ۔۔ بشری کمزوری کے سبب موت کے خیال سے خوف زدہ تھے رہ گئے اہل نفاق تو وہ اپنی بزدلی کم ہمتی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے جہاد سے کترانا چاہتے تھے اور موت سے گھبراتے تھے ۔۔ کیونکہ ۔۔ ان کے کفر ونفاق نے ان کو کمزور بنادیا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا فائدہ تو ہماری زندگی سے وابستہ ہے مرنے کے بعد میں کیا ملنے والا ہے ؟ وہ مومن تھے ہی نہیں تو پھر شہادت کی موت کی عظمت کا ادراک کیسے کرسکتے ہیں المختصر ۔۔ ان کا مرنے سے ڈرنا ان کے کفر ونفاق کی فطرت کا تقاضا تھا۔

۔۔ الغرض ۔۔ یہ ڈرنے والے خاموش نہ رہ سکے (اور بولے پروردگارا) کیوضروری کردیا تو نے ہم پر لڑنے مرنے کو کیوں نہ مہلت دے دی تو نے ہم کو تھوڑی سی زندگی کی) کفار سے مقابلہ ہم پر واجب قرار دے کر مزید کچھ دنون کے لیے امن وامان اور بے خوفی کے ساتھ زندہ رہنے کا اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا نہیں فرمایا۔

اگر منافقوں سے یہ سوال صادر ہوا تو کچھ عجب نہیں اس لیے کہ ان کے نفاق کا تقاضا یہی تھا کہ جہاد سے پہلو تہی کے لیے وہ اس طرح کا سوال کر بیٹھیں، اور اگر بعض مسلمانوں سے بھی یہ سوال واقع ہوا ہو تو صرف طبعی خوف اور بددلی سے انھوں نے ایسی بات کہی اور پھر توبہ کرلی۔
ایک قول یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ آیت قتال نازل ہونے کے بعد منافقین ہوگیا اور جہاد سے انکار کردیا، یہ ان ہی کا قول تھا اور صحیح

تر بات یہ ہے کہ اس سوال کو تخفیف تکلیف کی تمنا پر محمول رکھیں وجہ انکار پر نہیں، الغرض۔۔ سوال کرنے والے جہاد کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ صرف اپنے لیے کسی آسان صورت حال کے خواہش مند تھے جس سے انھیں فی الحال جہاد کرنے سے رخصت مل جائے۔
تواے محبوب ! (تم) ان ڈرنے والوں سے جنہوں نے دنیا کے ساتھ اپنا دل اٹکا رکھا ہے (کہہ دو کہ دنیاداری) جس سے دنیا میں فائدہ اٹھاتے ہیں آخرت کے سامنے (چندروزہ ہے اور آخرت بہت بہتر ہے اس کے لیے جو ڈرا) اور پرہیز کرتا رہا شرک سے اور بری باتوں سے اور اے مجاہدین فی سبیل اللہ سن لو کہ (نہ ظلم کیے جاؤ گے دھاگ بھر) یعنی تمہارے جہاد کے ثواب کے درجوں میں کچھ کم نہ کرے گا، اس ڈورے کے برابر بھی جو کھجور پر ہوتا ہے پس پورا ثواب پانے کے وعدہ پر بھروسہ کیے رہو اور موت جو ضرور آنے والی ہے اس سے نہ ڈرو اس واسطے کہ کسی گردن کو اس کمند سے رہائی میسر نہیں اور کسی آڑ میں اس واقعہ سے چھٹکارا متصور نہیں۔۔ تو۔۔ (اشرفی)

مفسرین نے اس آیت کی متضاد مفہوم اخذ کیے ہیں

ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ آیت مظلوم مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جب انھوں نے مظالم سے تنگ آکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں مطالبہ کیا کہ ہمیں لڑنے کی اجازت عنایت فرمائی جائے۔
امام نسائی (رح) نے کتاب الجہاد میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) اور ان کے ساتھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ اللہ کے رسول ! ہم مشرک ہونے کے باوجود معزز اور باوقار لوگ تھے اب ایمان لانے کے بعد ہم ذلیل ہو رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں لڑنے کی اجازت دیں۔ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا ابھی تک اللہ تعالیٰ نے مجھے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ حضرت ابن عباس (رض) کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ پہنچے تو ہمیں قتال کا حکم ہوا لیکن بعض لوگوں نے لڑنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا ' جس پر یہ فرمان نازل ہوا۔ جبکہ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے بجائے منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
جہاد کا حکم آنے سے پہلے وہ ڈینگیں مارتے تھے کہ ہمیں مشرکوں کے مقابلے میں کٹ مرنا چاہیے۔ جس سے ان کا مطلب مصنوعی اخلاص کا اظہار تھا۔ یا پھر منافق چاہتے تھے کہ مسلمان طاقتور اور منظّم ہونے سے پہلے کفار کے ساتھ ٹکرا جائیں تاکہ مسلمانوں کی طاقت ابتداء ہی میں پاش پاش ہو جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کو سمجھایا اور روکا جارہا ہے کہ ابھی میدان جہاد میں اترنے کا وقت نہیں آیا۔ کیونکہ تم تعداد میں تھوڑے اور تربیت کے لحاظ سے ناپختہ اور غیر منظّم ہو۔ اس لیے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت میں مالی قربانی کا جذبہ پیدا کرو۔ اخلاقی، روحانی اور تنظیمی تربیت کے لیے نماز پڑھتے رہو۔ جب تم ایک امام کی اتباع میں قیام اور رکوع و سجود کرو گے تو تمہیں ہر حال میں نظم وضبط قائم رکھنے کا سلیقہ آئے گا۔ جہاد میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور نظم بھی ضروری ہوتا ہے جو زکوٰۃ اور نماز کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن جب جہاد فرض ہوا تو وہ اس طرح ڈر رہے تھے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو کر کہتے تھے کہ ہمارے رب نے ہم پر قتال کیوں فرض کیا ہے ؟ کاش کہ ہمیں مزید مہلت دی جاتی۔ ان کے جواب میں فرمایا گیا کہ اے رسول ! انھیں سمجھاؤ تم تھوڑی سی مہلت مانگتے ہو یہ دنیا تو بذات خود قلیل اور اس میں رہنے کی مدت انتہائی تھوڑی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں بیش بہا، دائمی اور اخروی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ وہاں کسی پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے کے برابر بھی زیادتی نہ ہوگی۔ بلکہ ہر کسی کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ کھجور کی گٹھلی کے درمیان لکیر میں جو دھاگہ نما پردہ ہوتا ہے۔ اسے عربی میں "فتیل" کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے

(لَاتَمَنَّوْالِقَآءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوااللّٰہَ الْعَافِیَۃَ فَاِذَالَقِیْتُمُوْھُمْ فَاصْبِرُوْا) [رواہ البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب لاتمنوالقاء العدو]

"دشمن سے ملنے کی آرزو نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، جب تمہارا ٹکراؤ دشمن سے ہو جائے تو پھر حوصلہ رکھو۔"

فوائد

ف 3: مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے جب کفار نے مسلمانوں کو بہت ستایا تو انھوں نے حضور سے اجازت چاہی کہ ہم کفار کو ترکی بہ ترکی جواب دیں، ان سے جنگ کریں۔ سرکار نے منع فرمایا اور فرمایا کہ نمازیں قائم کرو زکوۃ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد نماز وزکوۃ کے بعد فرض ہوا۔ نماز ہجرت سے پہلے معراج میں فرض ہوئی۔ زکوۃ 2ھ میں فرض ہوئی اور جہاد 2ھ روزے بھی 2ھ میں تحویل قبلہ کے بعد زکوۃ کے بعد فرض ہوئے۔

ف 4: ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ نے وہاں اسے فرض ہی نہ فرمایا

ف 5: اگر اس فریق سے مراد مومنین ہیں تو خوف سے خوف طبعی غیر اختیاری مراد ہے جو انسانیت کے عوارض میں سے ہے مگر اس خوف وہ خدا کی اطاعت کو نہیں چھوڑتا اور سوال سے مقصود حکمت دریافت کرنا ہے۔ تفسیر خزائن العرفان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا احتمال قوی ہے۔

ف 6: صحابہ کرام کو یہ خوف طبع بشری کی بنا پر تھا یہ خلاف ایمان نہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون وہامان سے خوف ہوا تھا۔ رب فرماتا ہے قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا اوان یطغی۔ یہ خوف ایذا ہے اور لا خوف علیہم میں خوف اطاعت مراد ہے۔ وہ کسی مومن کو غیر اللہ سے نہیں ہوتا۔ غرض خوف بہت قسم کے ہیں۔ لہٰذا آیت میں تعارض نہیں مرزا کو مخلوق کے خوف نے جہاد اور حج سے محروم رکھا۔ یہ خوف خلاف ایمان ہے۔

ف 7: اس سے معلوم ہوا کہ مرزا قادیانی نبی تو کیا مومن بھی نہیں کیونکہ مخلوق سے ڈرنا اور جہاد سے گھبرانا مومن کی شان نہیں۔ مرزا انسان سے اتنا ڈرتا تھا کہ اس ڈر سے حج کو نہ گیا۔ اور جہاد سے اتنا گھبراتا تھا کہ جہاد کو منسوخ کہتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد قیامت تک رہے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قوت ایمان کے دو نتیجے ہوتے ہیں۔ خالق کا خوف، مخلوق سے بے خوفی، جیسا کہ صحابہ کرام اور اللہ کے مقبول بندوں کو نصیب ہوا۔

ف 8: اس طرح کہ نیکی کا ثواب کم ملے یا نہ ملے یا بلا قصور عذاب دیا جاوے۔ لہٰذا خوشی سے جہاد کرو اجر پاؤ گے۔

مسائل

۱۔ جنگ کی خواہش کرنے کے بجائے نماز اور زکوۃ کی ادائیگی سے اپنا کردار مضبوط بنانا چاہیے۔

۲۔ جہاد فرض ہو جائے تو ڈرنے کے بجائے ڈٹ جانا چاہیے۔

۳۔ بنی اسرائیل پہلے جہاد کا مطالبہ کرتے اور پھر اس سے راہ فرار اختیار کیا کرتے تھے۔

۴۔ دنیا کا مال ومتاع آخرت کے مقابلے میں نہایت ہی تھوڑا ہے۔

۵۔ صاحب تقویٰ لوگوں کے لیے آخرت بہتر ہے۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ حَسَنَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾

لغۃ القرآن: [اَیْنَ مَا : جہاں کہیں بھی] [تَکُوْنُوْا : تم ہو گے] [یُدْرِکْکُّمُ : آئے گی تم کو] [الْمَوْتُ : موت] [وَلَوْ : اور اگر] [کُنْتُمْ : تم ہو] [فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ : کسی انتہائی مضبوط گنبد میں] [وَاِنْ تُصِبْہُمْ : اور اگر آ لگے ان کو] [حَسَنَۃٌ : کوئی بھلائی] [یَّقُوْلُوْا : تو وہ کہتے ہیں] [ہٰذِہٖ : یہ] [مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ : اللہ کے پاس سے ہے] [وَاِنْ تُصِبْہُمْ : اور اگر آلگے ان کو] [سَیِّئَۃٌ : کوئی برائی] [یَّقُوْلُوْا : تو وہ کہتے ہیں] [ہٰذِہٖ : یہ] [مِنْ عِنْدِکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے ہے] [قُلْ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہیے] [کُلٌّ : سب کچھ] [مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ : اللہ کے پاس سے ہے] [فَمَالِ ہٰٓـؤُلَآئِ الْقَوْمِ : تو کیا ہے اس قوم کے لیے] [لاَ یَکَادُوْنَ : قریب نہیں ہے] [یَفْقَہُوْنَ : کہ وہ سمجھیں] [حَدِیْثًا : کوئی بات]

ترجمہ: (اے موت کے ڈر سے جہاد سے گریز کرنے والو!) تم جہاں کہیں (بھی) ہو گے موت تمہیں (وہیں) آ پکڑے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں (ہی) ہو، اور (ان کی ذہنیت یہ ہے کہ) اگر انھیں کوئی بھلائی (فائدہ) پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ (تو) اللہ کی طرف سے ہے (اس میں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برکت اور واسطے کا کوئی دخل نہیں)، اور اگر انھیں کوئی برائی (نقصان) پہنچے تو کہتے ہیں: (اے رسول!) یہ آپ کی

طرف سے (یعنی آپ کی وجہ سے) ہے۔آپ فرمادیں: (حقیقۃً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے۔ پس اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتے

تشریح: جہاد وہی کر سکتا ہے جو موت سے ڈرنے والا نہ ہو۔ موت کا تعلق قتال کے ساتھ نہیں۔ موت کا وقت ' مقام اور سبب مقرر ہے۔ موت اپنے وقت اور مقام پر آئے گی چاہے کوئی قلعہ بند ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کسی کو زندگی عزیز، اولاد محبوب اور مال و جان پیارے ہوتے ہیں۔ لیکن مومن اور دوسروں کا فرق یہ ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے حکم کو دنیا جہاں کی ہر چیز سے عزیز تر سمجھ کر بے خوف و خطر میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے کہ گھر ہو یا باہر، امن ہو یا جنگ میرے لیے موت کا وقت اور جگہ مقرر ہے۔ پھر منافقوں کی طرح چھپنا اور بزدلوں کی طرح پیچھے ہٹنے کا کیا مقصد؟ یہ جذبہ اس کے دل سے موت کا خوف نکال دیتا ہے تبھی تو وہ چمکتی ہوئی تلواروں اور برستے ہوئے گولوں میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ موت اپنی مقررہ جگہ اور وقت کے بغیر ہرگز نہیں آسکتی۔

اچھائی اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے اور برائی ہمارے گناہوں کے نتیجہ میں

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے محترم اصحاب (رض) ہجرت کر کے مدینہ آئے اور اس کے بعد یہودیوں اور منافقوں کو اچھائیاں اور برائیاں ' راحتیں اور مصیبتیں پہنچی تو انھوں نے کہا جب سے یہ مدینہ میں آئے ہیں ہمارے پھلوں اور کھیتوں کی پیداوار کم ہو رہی ہے ' اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ' سختی ہو یا آسانی ' کامیابی ہو یا ناکامی فصلوں کی پیداوار زیادہ ہو یا کم ' فائدہ ہو یا نقصان ' اور بیماری ہو یا صحت ' تمام امور کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی قضا اور قدر سے ہوتا ہے ' البتہ جب تم پر رزق کی وسعت ' خوشحالی اور فراخ دستی ہو تو یہ محض اللہ کا فضل اور انعام ہے۔ سو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرو اور جب تم کو تنگی اور رزق میں کمی پہنچے تو یہ تمہارے گناہوں اور شامت اعمال کا نتیجہ ہے اس کی نسبت اپنی طرف کرو۔

بعض پڑھے لکھے جاہلوں نے "کل من عنداللہ" کا غلط معنی سمجھا ہے وہ کہتے ہیں نیک اعمال اور برے اعمال دونوں اللہ کی طرف سے ہیں تو اس میں بندے کا کیا قصور ہے! اور اس کو آخرت میں سزا کیوں ملے گی؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اچھائی اور برائی اور ہر چیز کا تعلق امور تکوینیہ سے ہے امور تشریعیہ سے نہیں ہے ' امور تکوینیہ سے مراد وہ امور ہیں جو بندوں کے دخل کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں جیسے پیدا ہونا ' مرنا ' صحت ' بیماری ' بارش کا ہونا نہ ہونا ' طوفانوں اور زلزلوں کا آنا وغیرہ ' اور امور تشریعیہ سے مراد وہ کام ہیں جن کرنے یا ان کو نہ کرنے کا بندوں کو حکم دیا ہے مثلاً نیک کام کرنا اور برے کاموں کو ترک کرنا ' نیک اور بد کاموں میں سے جس کا بھی بندہ قصد اور ارادہ کرتا ہے اللہ اس کو پیدا فرما تا دیتا ہے ' بندہ کے ارادہ کو کسب اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کو خلق اور ایجاد کہتے ہیں ' اور بندہ کو اس کے کسب کی وجہ سے جزاء یا سزا ملتی ہے ' جو کسب اور خلق کا فرق نہیں کرتے ان میں سے بعض کہتے ہیں انسان پتھروں کی طرح مجبور ہے اور ہر نیک اور بد کام کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں یہ جبریہ ہیں ' اور بعض کہتے ہیں انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے یہ معتزلہ ہیں ' اور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ بندہ کاسب ہے اور اللہ تعالیٰ خالق ہے ' جبریہ اور معتزلہ مردہ مذاہب ہیں لیکن ان کے نظریات اور آثار اب بھی بعض لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ (تبیان)

منافقین ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے یعنی ان کا شیوہ یہ ہے کہ اگر جنگ میں فتح ہو یا عام حالات خوشگوار ہوں تو کہتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔ اور اگر ان کی اپنی کمزوری سے پسپائی ہو یا غلہ گراں ہو جائے یا باغات اچھی طرح نہ پھلیں تو اس وقت سارا الزام اللہ کے رسول پر دھرتے ہیں کہ ان کی بے تدبیری کی وجہ سے پسپائی ہوئی ہے یا ان کے اور ان کے صحابہ کے ایسے سبز قدم آئے ہیں کہ ہر چیز سے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے عقل کے اندھو! ہر کام کا فاعل حقیقی اور مسبّب الاسباب تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تم میرے محبوب پر کیوں الزام لگاتے ہو۔ مولانا دریا آبادی نے یہاں خوب لکھا ہے کہ "منافقین کا یہ من عند اللہ کہنا بھی بطور حمد نہ تھا بلکہ بطور محاورہ زباں تھا جیسے اردو میں لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو تقدیری امور ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

بروج کا واحد برج ہے۔ وہ بلند عمارت جو دور سے نمایاں ہو۔ یعنی قلعہ یا قصر۔ مشیدہ کا معنی مضبوط بھی ہے اور بلند بھی۔ بتانا یہ ہے کہ موت سے خوفزدہ ہو کر نامردی اور بزدلی دکھانا عقلمندی نہیں۔ تم اپنے بچاؤ کے ہزاروں سامان کر لو موت آ کر رہے گی۔ (ضیاء)

موت ہر حال میں آنی ہے

یعنی کیسے ہی مضبوط اور محفوظ و مامون مکان میں رہو مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی کیونکہ موت ہر ایک کے واسطے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے اپنے وقت پر ضرور آئے گی کہیں ہو۔ سو اگر جہاد میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ سکتے تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقاتلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچے ہونے کی بات ہے۔

موت سے ڈر کر بزدلی دکھانا اور ضرورت پڑنے پر ملک وملت کے لیے جہاد سے جی چرانا کوئی عقل مندی نہیں کیونکہ جہاد میں جانے سے موت قریب نہیں آ جاتی اور احتیاطی تدابیر کرنے سے موت کو روکا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر حضرت خالد بن ولید (رض) متعدد جنگوں میں شریک ہوئے، تلواروں کے جھرمٹ میں بے خطر کودپڑتے، ہزاروں کافروں کو تہہ تیغ کیا، اس کے باوجود وہ کسی جنگ میں شہید نہیں ہوئے اور ان کی موت اپنے گھر میں بستر پر آئی۔ بہر حال موت کا وقت اور جگہ مقرر ہے جو آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں کتنے ہی سپہ سالار اور حکمران گزرے ہیں جن کی حفاظت کے لیے ہزاروں کمانڈوز حصار بنائے رکھتے تھے۔ لیکن جب موت کا وقت آیا تو کوئی بھی ان کی حفاظت نہ کر سکا۔ ماضی قریب میں امریکہ کا صدر کینیڈی گولی لگنے سے اس وقت ہلاک ہوا جب پولیس کے ہزاروں جوان، درجنوں انٹیلی جنس ایجنسیاں اور انتہائی چاک وچوبند مسلح گارڈز اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین کے صدر یاسر عرفات پر اسرائیل نے بارہا دفعہ سینکڑوں گولے برسائے یہاں تک کہ اس کے صدر مقام رملہ کا اسرائیل نے کئی مہینے محاصرہ کیے رکھا، مسلسل بمباری کی، اس کا دفتر اور رہائش کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا لیکن موت یاسر عرفات کے قریب نہ پہنچ سکی، جب وقت آیا تو فرانس کے ایک ہسپتال سے اس کا جسد خاکی اٹھا۔

امریکہ جسے اپنے سیٹلائٹ سسٹم پر بڑا ناز ہے۔ اس کی انٹیلی جنس سے مرعوب ہو کر جنگی جغاوری بھی کہتے ہیں کہ امریکہ سے زمین پر گری ہوئی سوئی بھی نہیں چھپ سکتی۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ 2002ء سے لے کر 2005ء ختم ہو چکا ہے۔ افغانستان کا چپہ چپہ چھان مارنے ' بستیوں کی بستیاں تباہ کرنے کے باوجود امریکہ اسامہ بن لادن تلاش کر سکا اور نہ کروڑوں ڈالر کی پیش کش کے باوجود کوئی اسامہ کو قتل کر سکا۔

یہاں منافقوں کی ایک اور عادت بد کا ذکر کیا گیا ہے کہ اگر ان کو کوئی فائدہ اور اچھائی پہنچے تو کہتے ہیں یہ ہماری حسن تدبیر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا ہے۔ جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اذیت اور صدمہ پہنچانے کے لیے ہرزہ سرائی کرتے ہیں کہ یہ تمہاری بے تدبیری کا نتیجہ ہے۔ اے نبی! انھیں فرمائیں کہ نفع و نقصان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔ کوئی کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو ہمیں جدوجہد کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جو ہمارے لیے لکھ چھوڑا ہے وہ ہو کر رہے گا دراصل یہ شیطان کا حربہ ہے جس کو استعمال کر کے یہ لوگ نیکی کے کاموں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ کیا ایسے لوگ دنیا کے معاملات کے بارے میں بھی یہ عقیدہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں؟ جہاں تک رسول گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تعلق ہے آپ دنیا کے لیے رحمت اور محسن اعظم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ تو کسی کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے بلکہ آپ تو انسانیت کی خاطر بڑی بڑی تکالیف اور نقصانات اٹھاتے رہے ہیں۔ منافق کیسے بد فطرت اور غیر دانشمند لوگ ہیں کہ اس حقیقت کو بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

فوائد

1: لہٰذا بستر پر برسوں یا مہینوں بیمار رہ کر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے میدان جہاد میں شہید ہو کر مرنا بہتر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ شہید کو موت کی تکلیف ایسی ہوتی ہے جیسے چیونٹی کا کاٹنا۔

2: منافق کہتے کہ جب سے آپ مدینہ میں آئے ہیں تب سے یہ آفتیں آرہی ہیں۔ معاذ اللہ۔ حضور کی برکت سے یثرب مدینہ شریف بن گیا۔ وبا کی جگہ شفا کا مقام ہو گیا وہاں کی خاک، خاک شفا ہو گئی۔

3: اس سے معلوم ہوا کہ ہر راحت و مصیبت اللہ کے ارادے سے آتی ہے ہاں ہم اس کے اسباب مہیا کر لیتے ہیں۔ نیکی راحت کا ذریعہ ہے، گناہ مصیبت کا سبب۔ لہٰذا اس آیت میں اور اگلی آیت فمن نفسک میں کوئی تعارض نہیں۔ دونوں آیتیں اپنے اپنے مقام پر درست ہیں۔

مسائل

۱۔ انسان قلعہ بند ہو یا جہاں بھی چھپ جائے موت اسے دبوچ لے گی۔

۲۔ منافقوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ دوسروں کے ذمہ لگاتے ہیں۔

۳۔ ہر تکلیف بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

۴۔ منافق اور کافر حقیقت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

آیت مبارکہ:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

لغۃ القرآن: [مَآ اَصَابَکَ : جو آ لگے تجھ کو] [مِنْ حَسَنَۃٍ : کوئی بھی بھلائی] [فَمِنَ اللّٰهِ : تو (وہ) اللہ کے پاس سے ہے] [وَمَآ اَصَابَکَ : اور جو آ لگے تجھ کو] [مِنْ سَیِّئَۃٍ : کوئی بھی برائی] [فَمِنْ نَّفْسِکَ : تو (وہ) تیرے نفس سے ہے] [وَاَرْسَلْنٰکَ : اور ہم نے بھیجا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو] [لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے] [رَسُوْلاً : رسول ہوتے ہوئے] [وَکَفٰی باللّٰهِ : اور کافی ہے اللہ] [شَہِیْدًا : بطور گواہ]

مترادفات: [مَآ :۔ ماحول ، ماتحت ، ماجرا ۔]] ٗصَابَ كَ : مصیبت ، مصائب ۔][حَسَنَۃٍ : محسن ، احسان ۔][سَیِّئَۃٍ : سوئے ادب ، علمائے سوئ ۔][نَّفْسِ كَ : نفس ، نفسانفسی ، نفسانی خواہشات ۔][رَسُوْلًا : اَرْسَلْنٰ كَ رسول ، رسالت ، ارسال ۔][لِلنَاسِ : لہذا الحمدللہ ، عوام الناس ، عامۃ الناس ۔][شَہِیْدًا : شاہد ، شہادت (گواہی)]

ترجمہ: (اے انسان ! اپنی تربیت یوں کر کہ) جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے حسن تدبیر کی طرف منسوب نہ کر) ، اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے اپنی خرابی نفس کی طرف منسوب کر) ، اور (اے محبوب !) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے ، اور (آپ کی رسالت پر) اللہ گواہی میں کافی ہے ۔

تشریح: یہاں خطاب نوع انسانی کے ہر فرد کو ہے یا خطاب حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے اور مراد آپ ﷺ کی امت ہے ۔ پہلی آیت میں فرمایا کل من عند اللہ یعنی ہر چیز سکھ اور دکھ ، آرام اور تکلیف ، خوشحالی اور تنگی سب اللہ کی طرف سے ہے اور یہاں یہ ارشاد ہے کہ سکھ آرام اور خوشحالی تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے اور دکھ ، تکلیف اور تنگی وغیرہ انسان کی اپنی طرف سے ہے ۔ بظاہر ان آیتوں میں تضاد کا گمان ہوتا ہے اس لیے دو مختصر سے فقروں میں علامہ بیضاوی نے اس کا جواب دے دیا فرماتے ہیں ۔ کل من عنداللہ ایجادا وایصالا غیران الحسنۃ احسان وامتحان والسیءۃ مجازاۃ وانتقام ۔ یعنی ہر کام کا موجد حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن آرام وخوشحالی کا باعث اس کا احسان ہے

اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے بندہ کا امتحان بھی لیا جائے کہ وہ اس انعام پر کیسے شکر ادا کرتا ہے۔ اور تکلیف و رنج کا باعث انسان کی اپنی کوتاہیوں اور غفلتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس کی واضح مثال آپ کو غزوہ احد میں ملے گی۔ جس ہزیمت سے مسلمانوں کو دو چار ہونا پڑا اگرچہ اس کا موجد تو رب تعالیٰ ہی تھا لیکن پہاڑی درہ پر متعین دستہ کی جلد بازی اس کا سبب بنی تھی۔ دوسروں بیجوں کی طرح انسان کے اعمال بھی اپنے مخصوص برگ و بار رکھتے ہیں۔ انسان کو ہر کام کرتے وقت اس کے مآل وانجام پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔ (ضیاء)

اس مقام پر یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس آیت کریمہ میں جس اچھائی اور برائی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق امور تکوینیہ سے ہے امور تشریعیہ سے نہیں ہے امور تکوینیہ سے مراد وہ امور ہیں جو بندوں کے دخل کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں جیسے پیدا ہونا، مرنا، صحت بیماری، بارش کا ہونا طوفانوں اور زلزلوں کا آنا وغیرہ وغیرہ اور امور تشر عیہ سے مراد وہ کام ہیں جن کے کرنے یا ان کے نہ کرنے کا بندوں کو حکم دیا گیا ہے مثلا نیک کام کرنا اور برے کاموں سے رکنا، نیک اور بد کاموں میں سے جس کا بندہ قصد و ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پیدا فرماتا ہے۔

کسب و ایجاد

بندہ کے ارادے کو کسب اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کو خلق اور ایجاد کہتے ہیں اور بندے کو اس کے کسب کی وجہ سے جزا یا سزا ملتی ہے کسب اور خلق کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان نہ تو پتھروں کی طرح مجبور محض ہے اور نہ ہی ایسا با اختیار کہ اس کو اس کے افعال کا خالق کہا جاسکے، جبر واختیار کے مذکورہ بالا نظریات اور اس کے آثار اب بھی بعض لوگوں میں پائے جاتے ہیں ۔ہر نبی کے فرائض نبوت کا تعلق امور شرعیہ سے ہوتا ہے نہ کہ امور تکوینیہ سے۔

تو اے محبوب ﷺ ! آپ ﷺ تو اس حقیقت سے واقف (اور) اچھی طرح باخبر ہیں کہ ہم نے بھیجا آپ ﷺ کو ہر انسان کے لیے رسول بنا کر، تاکہ تم میرے نازل فرمودہ احکام ان تک پہنچا دو۔ رہ گیا امور تکوینیہ میں دخل اندازی کرنا تو یہ تمہاری ذمہ داری نہیں اور نہ ہی تم اس کے لیے مبعوث کیے گئے ہو لہٰذا امور تکوینیہ کے تحت ہونے والی کسی بھلائی۔۔ یا۔۔ برائی کی نسبت تمہاری طرف کرنا، کوتاہ فکری اور کج فہمی کی نشانی ہے۔۔ المختصر۔۔ تم اللہ کے رسول اور اللہ تعالیٰ تمہاری رسالت پر کافی گواہ ہے لہٰذا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ۔۔ نیز۔۔ منافقین کے انکار سے تمہارے منصب رسالت پر آنچ نہیں آتی۔ ذہن نشین رہے کہ رسول کا کام خدا ہی کے دئے حکم خدا ہی کی عبادت و اطاعت کی طرف بلانا ہے تو رسول کی فرمان برداری خود خدا ہی کی فرمانبرداری ہے۔ (اشرفی)

سیاق کلام میں جب ہم پیش نظر آیت کریمہ کو دیکھتے ہیں کہ منافقین سے خطاب ختم کر کے اچانک رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب فرمایا جارہا ہے۔ تو یہ بات بالکل صاف دکھائی دیتی ہے کہ منافقین سے بے التفاتی کا سبب ان کی متذکرہ بالا دو باتیں ہیں ایک ان کی حماقت اور دوسرا ان کی گستاخی۔ کہ چونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مقام کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو ایسے احمقوں سے خطاب کا کیا فائدہ ؟ اور مزید یہ کہ وہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں گستاخی کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کی طرف پروردگار التفات فرمائیں اور انھیں خطاب کا مستحق سمجھیں۔ اور مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خطاب چونکہ دراصل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہی استحقاق ہے ' ان کے طفیل اور ان کی برکت سے مسلمان اس خطاب سے نوازے گئے اور منافقین کو اسلام ہی

کے بارے میں یکسو کرنے کے لیے خطاب کی ضرورت محسوس کی گئی اور یاان پر اتمام حجت کے لیے خطاب فرمایا گیا۔ جب ان میں سے کوئی بات بھی باقی نہ رہی تو پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات جو اصل اس کی مستحق ہے انھیں سے خطاب فرما کر اس حقیقت کو منکشف فرمایا گیا ہے جس میں منافقین الجھ کر رہ گئے تھے۔

چند مقدمات

الف۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فاعل چاہے انسان ہو یا کوئی اور وہ اللہ کی مشیت سے وجود میں آ رہا ہے۔ انسان ہی کو دیکھ لیجیے وہ چاہے کسی اچھائی کا ارتکاب کرے یا برائی کا اس کے ہر عمل کے پیچھے جو قوت ٗ ذہانت اور صلاحیت کارفرما ہے وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ خود اس کا جسم و جان اللہ کی عنایت ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اس کے مالک نے پیدا کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی دی ہوئی قوت ٗصلاحیت اور ذہانت سے کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان کے ہر عمل کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بظاہر اس کا فاعل انسان ہے لیکن حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لیے وسائل فراہم نہ کرتا یا اس کو بروئے کار آنے کی مہلت نہ دیتا تو یہ فعل کبھی وجود میں نہ آسکتا۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

ب۔ انسان کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے وسائل پیدا فرما دیتے ہیں اور کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اسباب پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن جب انسان نیکی کرتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے اور اپنی خوشنودی سے نوازتا ہے کیونکہ یہ اس کی رحمت کا اقتضاء ہے۔ لیکن جب انسان برائی کرتا ہے اگرچہ اس کے اسباب اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہ اللہ کی دی ہوئی مہلت سے برائی کرنے کے قابل ہوتا ہے ٗلیکن اس پر اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نیکی پر جزاء دے گا اور برائی پر سزا دے گا۔

ج۔ نیکی چونکہ اس کی رحمت سے وجود میں آتی اور اس کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے اس لیے اس کا انتساب اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے عنایات کا نزول ہوتا ہے۔ برائی اگرچہ اس کی مہلت سے وجود میں آتی ہے لیکن وہ اس کی رحمت کا اقتضاء نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف اس کے اس فیصلے کا نتیجہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک آزادی دے رکھی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے وہ اس کے لیے اسباب فراہم کر دے گا۔ اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ نیکی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور برائی کو برائی کرنے والے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی کوشش اور اس کے فیصلے سے وجود میں آئی ہے۔ اللہ کی رحمت کا اقتضاء اس کی تائید میں نہیں تھا۔ لیکن روکا اس لیے نہیں گیا کہ روکنے سے اس کی آزادی سلب ہو جاتی اور جزا اور سزا کا ترتب خلاف حقیقت ٹھہرتا۔

ان مقدمات پر اگر غور کر لیا جائے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور پھر اچھائی کہ جس کی نسبت اللہ کی طرف اور برائی کی نسبت نفس انسانی کی طرف کیوں کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کو سمجھ لینے سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اللہ کی رحمت اترتی ہے تو اس پر شکر ادا کرنے اور اپنی بندگی کے عمل میں اضافہ کرنے سے اس کی رحمت میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے انسان اسی کی طرف متوجہ رہ کر مانگنے کا عمل جاری رکھتا ہے لیکن جب برائی اور بدعملی کے نتیجے میں دنیا میں کوئی سزا ملتی ہے تو آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے سزا کی شکایت کرتا ہے تو اسے توجہ اس کے اپنے نفس اور اپنی ذات کی طرف دلائی جاتی ہے۔ کہ تم ہم سے شکایت نہ کرو بلکہ اپنے آپ سے شکایت کرو۔ کیونکہ اس طرح کی سزائیں تمہاری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ اکبر نے ٹھیک کہا:

جب میں کہتا ہوں کہ یااللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت پر اللہ کی گواہی

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا آیتِ کریمہ کے اس حصے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی جارہی ہے اور منافقین کی طرف سے رخ پھیر کر ایک حقیقت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ تسلی کی صورت یہ ہے کہ آپ سے کہا جارہا ہے کہ کافر اگر آپ پر ایمان نہیں لاتے یا منافق اپنے نفاق سے تائب نہیں ہوتے اور آپ کی نصیحتیں ان پر اثر انداز نہیں ہو رہیں تو آپ ﷺ کو ہر گز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے آپ ﷺ کو رسول بنا کے بھیجا ہے۔ رسول کا کام اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانا ' ان کے دل و دماغ کو اس پیغام کی قبولیت کے لیے مقدور بھر آمادہ کرنا اور ان کی طرف سے آنے والے سوالات کا جواب دینا ہے۔ اور اگر وہ مخالفت کے طوفان اٹھائیں تو انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔ آپ ﷺ نے نہایت حسن و خوبی سے ان میں سے ایک ایک فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ لوگ راہ راست پر نہیں آتے تو آپ ﷺ ہر گز دل گرفتہ نہ ہوں۔ ان کا ماننا یا نہ ماننا آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ ﷺ کی رسالت کے برحق ہونے اور آپ ﷺ کے سچے رسول ہونے کے لیے کسی انسان کی نہیں اللہ کی گواہی کافی ہے۔ کسی شہنشاہ کی طرف سے اگر کوئی وائسرائے یا گورنر متعین ہو کر کسی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کے عہدہ و منصب کے لیے صرف یہ گواہی کافی ہے کہ اس کے پاس شہنشاہ کا فرمان تقرر موجود ہے۔ اس کے وائسرائے یا گورنر ہونے کے لیے لوگوں کے ماننے یا نہ ماننے کا کوئی تعلق نہیں۔ رہی یہ بات کہ پیغمبر کے لیے اللہ کی طرف سے اس کے منصب کی گواہی کیا ہوتی ہے؟ اگر دیدہ بینا اور قلب سلیم میسر ہو تو اس گواہی کو دیکھنا اور سمجھنا نہایت آسان ہے۔ پیغمبر کی سب سے پہلی گواہی اس کی اپنی شخصیت ہے۔ دل میں اتر جانے والی شکل و صورت ' آنکھوں میں بس جانے والی دل آویز شخصیت ' دل و دماغ کو جھکا دینے والا سیرت و کردار ' پتھروں کے ڈھیر میں ہیرے کی مانند چمکنے والی درخشاں زندگی ' خود اپنی ذات میں ایک مستقل گواہی ہے۔ مزید برآں آپ ﷺ پر اترنے والی کتاب اپنی فصاحت و بلاغت ' اپنی وسعت و جامعیت اور اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے بے مثل اور بے بدل ' اپنے دیے ہوئے نظام شریعت کے اعتبار سے جامع و مانع اور اپنے علم اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے دماغوں کو حیرت میں ڈال دینے والی ' اور دنیا کو اپنی مثال کا چیلنج دے کر گنگ کر دینے والی اور اپنی ہر حیثیت سے منفرد شان کی حامل کتاب سے بڑھ کر اور گواہی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب شہنشاہ کائنات کا فرمان ہے جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغمبر اور نبی ہونے کی شہادت دی ہے۔ علاوہ ازیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی استقامت ' بپھرے ہوئے حالات کے مقابلے میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اطمینان اور صبر ' اپنے جانی دشمنوں کے لیے ہدایت کی دعائیں اور چند ہی سالوں میں ایک کامیاب حیرت انگیز انقلاب ' ان میں سے کون سی چیز ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شہادت کی کے لیے کافی نہیں ہے۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت چونکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ جس کا انکار اہل کتاب جیسے دشمنوں سے بھی ممکن نہ ہوا۔ بدترین مخالف بھی آپ ﷺ کا اعتراف کرنے پر مجبور رہے۔ اس لیے منافقین کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ یوں تو ہر رسول ہی دنیا میں اطاعت کرانے کے لیے آتا ہے لیکن یہ اللہ کا آخری اور عظیم رسول ﷺ تو اس قدر شان کا مالک ہے کہ اس کی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ اور صاف فرمایا کہ جس نے اس رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اس کی اطاعت سے روگردانی کی تو اے پیغمبر ﷺ ہم نے آپ ﷺ کو ان پر نگران بنا کے نہیں بھیجا کہ آپ ﷺ یہ دیکھتے پھریں کہ کون آپ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اور کون نہیں۔ آپ ﷺ کی اطاعت چونکہ اللہ کی اطاعت ہے اس لیے یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے رسول ﷺ کی کون اطاعت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ یہاں پہنچ کر خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کو اپنی اطاعت ٹھہرایا ہے اور اس پر اپنے رسول ﷺ کو نہیں خود اپنے آپ کو نگران بنادیا ہے تو اس کی نگرانی کے نتیجے میں جو لوگ عدم اطاعت میں پکڑے جائیں گے ان کو جس طرح کا عذاب ہوگا اس کے تصور سے بھی کپکپی چھوٹ جاتی ہے۔ منافقین کو درحقیقت اسی انجام کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تم اپنے رویے کو درست کرو ورنہ اس انجام کے لیے تیار رہو۔ (روح)

فوائد

1: یعنی نیک اعمال کی توفیق ملنا رب کا فضل ہے اور نیک اعمال پر اللہ کی رحمتیں آنا اس کی عنایت ہے۔ ہمارے اعمال خیر کی علت نہیں بلکہ ظاہری سبب ہیں۔

2: اس میں خطاب عام لوگوں سے ہے یعنی دنیاوی مصائب ہمارے گناہوں کی شامت سے آتے ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وما اصابک من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم اللہ کے مقبولوں کو مصیبت ان کے درجے بلند کرنے کے لیے آتی ہے لہذا مصیبت کی وجہ میں فرق ہے۔

3: یعنی اولین وآخرین سارے انسانوں کے آپ نبی ہیں۔ از آدم تا یوم قیامت سب انسان آپ ﷺ کے امتی ہیں۔ اسی لیے رب نے نبیوں سے حضور ﷺ کی اطاعت وایمان کا عہد لیا اور معراج میں سب نبیوں سے حضور ﷺ کی اطاعت وایمان کا عہد لیا اور معراج میں سب نبیوں نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔

آیت مبارکہ:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ؕ

لغۃ القرآن: [مَنْ : جو] [يُّطِعِ : اطاعت کرتا ہے] [الرَّسُوْلَ : رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی] [فَقَدْ اَطَاعَ : تو اس نے اطاعت کی ہے] [اللّٰهَ : اللہ کی] [وَمَنْ : اور جو] [تَوَلّٰى : منہ موڑتا ہے] [فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ : تو ہم نے نہیں بھیجا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [حَفِيْظًا : نگران بنا کر]

مترادفات: [يُّطِعِ : اطاعت رسول ، مطیع وفرمانبردار ۔][عَلَيْ هِمْ : علیحدہ ، علی العموم ، علی الاعلان ۔][حَفِيْظًا : حفاظت ، حافظ ، محافظ ۔]

ترجمہ: جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا، اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

تشریح:

شانِ نزول:

ایک بار سرکار نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے رب کی اطاعت کی۔ اس پر کچھ گستاخ منافقوں نے کہا کہ حضور یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو رب مان لیں۔ ان کی تردید اور حضور کی تائید کے لیے یہ آیت کریمہ اتری۔ کتنا کھول کر بتادیا کہ اللہ کا مطیع وہی ہے جو اس کے رسول کا مطیع ہو۔ لاکھ کوئی دعویٰ کرے اطاعت الٰہی اور اتباع قرآن کا وہ جھوٹا ہے جب تک اللہ کے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کا پابند نہ ہو۔ (ضیاء)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور کی اطاعت بہر حال لازم ہے قول میں فعل میں، خصوصیات میں، ہر طرح آپ کا فرمان واجب العمل ہے۔ اگر کسی کو ایسا حکم دیں جو بظاہر حکم قرآن کے خلاف ہو تو اس پر اطاعت لازم۔ اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اس کے لیے ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ دیکھو۔ اکیلے خزیمہ انصای کی گواہی دو کی طرح بنادی۔ حضرت علی کے لیے فاطمہ زہرا کی موجودگی میں دوسرا نکاح حرام فرمادیا۔ حضرت سراقہ کو سونے کے کنگن پہنادیے۔ (نور)

رسول اللہ کی اطاعت

تولّیٰ، (منہ موڑا) تولی سے ہے۔ اس کے معنی ہیں پیٹھ دکھانا۔ یعنی نافرمانی اور سرکشی کرنا۔
حفیظ، (نگہبان) یعنی نگرانی کرنے والا۔ روک ٹوک کرنے والا۔ اور حفاظت کرنے والا۔ حفظ۔ حفاظت۔ حافظ۔ محافظ۔ محفوظ۔ اور دوسرے متعدد لفظ اسی مادہ سے بنے ہیں۔ یہاں یہ لفظ نگہبان اور نگرانی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
اس آیت میں ایک قیمتی فائدے کا بیان ہے جو لوگوں کو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دنیا میں تشریف لانے سے پہنچ سکتا ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا اور سارے جہانوں کا پیدا کرنے والا، پالنے والا اور حاجتوں کو پورا کرنے والا مان چکے ہیں وہ ضرور اس کی فرمان برداری کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کتنی بڑی آسانی ہے کہ اللہ نے انہی میں سے ایک انسان کامل کو اپنا رسول مقرر کر کے ان کے پاس بھیج دیا اور اعلان کر دیا جو ہمارے رسول کی فرمان برداری کرے گا وہ ہماری فرمان برداری کرے گا۔ اور جو اس کا فرمان بردار نہ ہو گا وہ ہمارا نافرمان سمجھا جائے گا اور نہ وہ ہمیں کسی اور طریقے سے راضی کر سکے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ انسان کے لئے اپنی فرمان برداری اتنی آسان کر دی۔
خوشدلی کے ساتھ تابعداری کرنے کو اطاعت کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کرہ آتا ہے، جس کے معنی ناگواری اور کراہت قلبی کے ساتھ ایک کام کو سرانجام دینے کے ہیں۔ لہٰذا جو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرے گا، وہ کسی جبر و قہر کی وجہ سے نہ ہو گی بلکہ دل سے ہو گی۔ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت دل سے اس وقت ہو سکتی ہے جب ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام فرامین کو اللہ کی جانب سے مان لے۔ اسی وجہ سے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی دل سے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت نہیں کرتا تو اسلام تعقل و تفکر کا دین ہے، مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا، یہاں کسی قسم کے جبر و اکراہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف اللہ کا پیغام پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس پیغام کو طاقت کے ذریعے منوانے کے ذمے دار نہیں ہیں، کیونکہ اسلام ایمان قلبی اور منطق عقلی سے مربوط ہے، جبر اور طاقت سے نہیں۔ (الکوثر)

یعنی ہر وہ شخص جس نے اوامر و نواہی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کی (فقد اطاع) "اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ "کیونکہ اگر آپ کسی چیز کا حکم دیتے یا کسی چیز سے روکتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت۔۔ چونکہ اگر آپ ﷺ کسی چیز کا حکم دیتے ہے یا کسی چیز سے روکتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت، اس کی وحی اور تنزیل ہے۔ یہ آیت کریمہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عصمت کی دلیل ہے۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مطلق اطاعت کا حکم دیا ہے، لہٰذا اگر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچانے کے بارے میں معصوم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی مطلق اطاعت کا حکم نہ دیتا اور اطاعت کرنے والوں کی مدح نہ فرماتا۔
اور اس کا اطلاق مشترکہ حقوق میں ہوتا ہے۔ یہ حقوق تین اقسام میں منقسم ہوتے ہیں۔
(ا) اللہ تعالیٰ کا حق۔ یہ حق مخلوق میں سے کسی کے لیے نہیں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی طرف رغبت ہے اور ان کے توابع ہیں۔

(۲) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حق، جو صرف آپ کے ساتھ مختص ہے وہ ہے آپ کی توقیر و محبت، اطاعت، آپ کا احترام اور آپ کی مدد کرنا۔

(۳) حقوق کی تیسری قسم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان مشترکہ ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، ان سے محبت کرنا اور ان کی اطاعت کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان حقوق کو اس آیت کریمہ میں جمع کر دیا ہے: (لتومنوا باللہ و رسولہ و تعزروہ و توقروہ و تسبحوۃ بکرۃ واصیلًا) (الفتح: 38/9) "تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرتے رہو۔"

پس جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اس کے لیے وہی ثواب ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مترتب ہوتا ہے (ومن تولیٰ) "اور جس نے (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے) منہ موڑا" وہ صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکتا۔ (فما ارسلنک علیھم حفیظاً) "ہم نے آپ کو ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔" یعنی ہم نے آپ کو اس لیے مبعوث نہیں کیا کہ آپ ان کے اعمال و احوال کی نگہبانی کریں، بلکہ ہم نے تو آپ کو مبلغ، کھول کھول کر بیان کرنے والا اور ناصح بنا کر بھیجا ہے اور آپ ﷺ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا اجر واجب ہو گیا۔ خواہ وہ راہ راست اختیار کریں یا نہ کریں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (فذکر انما انت مذکر، لست علیھم بمصطیر) (الغاشیہ: 88/21-22) "تم ان کو نصیحت کرتے رہو اور تم صرف نصیحت کرنے والے ہی ہو۔ تم ان پر نگہبان نہیں۔"

نیز یہ بھی لازم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت میں ہو۔ رہا وہ شخص جو لوگوں کے سامنے اطاعت اور التزام کا اظہار کرتا ہے اور جب تنہا ہوتا ہے یا اپنے ہم مشرب ٹولے کے ساتھ ہوتا ہے تو اطاعت ترک کر دیتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جو اطاعت کی ضد ہوتے ہیں تو ایسی اطاعت جس کا اس نے اظہار کیا ہے اس کے لیے نفع مند اور مفید نہیں ہے۔ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ویقولون طاعۃ) "وہ کہتے ہیں مان لیا۔" یعنی جب وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہوتے ہیں تو اطاعت کا اظہار کرتے ہیں (فاذا برزوا من عندک) "جب وہ آپ کے پاس سے چلے جاتے ہیں" یعنی تنہا ہوتے ہیں اور ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی اس حالت سے مطلع نہیں ہوتا۔ (بیت طآئفۃ منھم غیر الذین تقول) "مشورہ کرتے ہیں رات کو کچھ لوگ ان میں سے اس کے خلاف جو آپ کہتے ہیں۔" تو راۃ کے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں اور وہاں ان کے پاس نافرمانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد (بیت طآئفۃ منھم غیر الذین تقول) میں اس امر کی دلیل ہے کہ وہ معاملہ جس کو انھوں نے دائمی و تیرہ بنایا ہوا تھا وہ عدم اطاعت کا رویہ تھا۔ کیونکہ (تبیت) سے مراد رات کے وقت اس طرح معاملات کی تدبیر کرنا ہے کہ اس پر رائے کا استقرار ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر وعید سناتے ہوئے فرمایا: (واللہ یکتب مایبیتون) "اور اللہ لکھتا ہے جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں" یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ان کارستانیوں کو محفوظ کر رہا ہے وہ عنقریب ان کو ان کارستانیوں کی پوری پوری جزا دے گا یہ ان کے لیے وعید ہے۔ (سعدی)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریفہ میں یہ قاعدہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقرر کر دیا کہ جو ہمارا فرمان بردار بننا چاہتا ہے وہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمان بر داری کرے اور اگر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمان بر داری نہ کرے گا تو وہ ہمارا نافرمان ہے۔ اس کو وہی سزا

ملے گی جو نافرمانوں کے لئے مقرر ہے۔ پہلی آیتوں میں بھی صاف کہہ دیا ہے کہ اگر سزا ملی تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گی اور اس کا سبب تمہارا اپنا فعل ہو گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور نہ ان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہے۔

اس آیت میں انسان کے لئے ایک آسان راستے کی طرف دعوت بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک زبردست وبال بھی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام مانو گے تو تمہاری دنیا اور آخرت کی زندگی درست ہو جائے گی کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار بندے بن جاؤ گے اور اس سے بڑھ کر زندگی کو سنوارنے والی کوئی چیز نہیں اور اگر نہ مانو گے تو پھر بزا ملنے پر رسول اللہ ﷺ کو الزام نہ لگانا رسول ﷺ کا کام فقط پیغام پہنچانا ہے۔ ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں زبردستی سیدھے راستے پر چلائیں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی کر کے تم نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اب وہ خود تم کو سزا دے گا۔

منصب رسالت

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے ' حسن بصری نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اطاعت ہے ' حسن بصری نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور رسول کی اطاعت حجت ہے ' امام شافعی نے الرسالہ میں ذکر کیا ہے کہ ہر وہ کام جس کو اللہ تعالیٰ کتاب میں فرض کیا ہے مثلا حج ' نماز اور زکوۃ ' اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کا بیان نہ فرماتے تو ہم ان کو کیسے ادا کرتے اور کسی بھی عبادت کو انجام دینا ہمارے لیے کس طرح ممکن ہوتا ' اور جب احکام شرعیہ کا آپ کے بیان کے بغیر ادا کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر آپ کی اطاعت کرنا حقیقت میں اللہ عزوجل کی اطاعت ہے۔ (الوسیط ج ۲ ص ۸۴ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری معصیت کی اس نے اللہ کی معصیت کی ' اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس امیر کی معصیت کی اس نے میری معصیت کی۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۸۳۵ ' صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ۷۱۳۷ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۸۵۹ ' مسند احمد ج ۲ ص ۴۷۱)

قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ امیر کی اطاعت غیر معصیت میں واجب ہے اور معصیت میں اس کی اطاعت حرام ہے۔ لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم دینا اللہ کا حکم دینا ہے ' آپ ﷺ کا منع کرنا اللہ کا منع کرنا ہے ' آپ ﷺ کا وعدہ اللہ کا وعدہ ہے اور آپ ﷺ کی وعید اللہ کی وعید ہے ' آپ ﷺ کی رضا اللہ کی رضا ہے اور آپ ﷺ کا غضب اللہ کا غضب ہے ' اور آپ ﷺ کو ایذاء پہنچانا اللہ کو ایذا پہنچانا ہے۔

اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معصوم ہونے کی دلیل ہے ' کیونکہ آپ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور سورۃ آل عمران : ۳۱ ' میں آپ کی اتباع کو واجب قرار دیا ہے ' اگر آپ کے قول یا عمل میں معصیت اور گناہ آسکے تو پھر معصیت اور گناہ میں بھی آپ کی اتباع واجب ہو گی اور یہ محال ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جس نے پیٹھ پھیری تو ہم نے آپ ﷺ کو اس کا نگران بنا کر نہیں بھیجا۔ اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱) اگر کوئی شخص زبان سے اسلام کو قبول کرلیتا ہے اور دل سے ایمان نہیں لاتا تو آپ اس نگران نہیں ہیں کیونکہ آپ ﷺ کے احکام صرف ظاہر پر ہیں۔

(۲) اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی تبلیغ کے باوجود ظاہراً بھی اسلام نہیں لاتا تو آپ ﷺ غم نہ کریں ' کیونکہ آپ کسی کو جبرا مسلمان بنانے والے نہیں ہیں اس کے بعد فرمایا: وہ آپ ﷺ سے کہتے ہیں ہم نے اطاعت کی اور جب وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو۔ الخ۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ منافقین موافقت اور اطاعت کو ظاہر کرتے ہیں اور جب آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو اس کے خلاف کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کہتے تھے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تاکہ اپنی جان اور مال کو محفوظ کرلیں ' اور جب ﷺ آپ کے پاس سے چلے جاتے تو اس کے خلاف کہتے تھے۔ (جامع البیان ج ۵ ص ۱۱۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو سرزنش فرمائی ہے ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ اس کو لکھ لیتا ہے جو کچھ وہ رات کو کہتے ہیں ' اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ جو کراما کاتبین مقرر کیے ہیں وہ ان کی باتوں کو لکھ لیتے ہیں ' اس کے بعد فرمایا آپ ﷺ ان اعراض کیجئے اور اللہ پر توکل کیجئے ' یعنی آپ ﷺ ان سے درگزر فرمائیں اور ان کا مواخذہ نہ کریں اور نہ (ابھی) ان کے نفاق کو لوگوں کے سامنے ظاہر کریں اور اللہ پر توکل کریں اور تمام معاملات کو اللہ پر چھوڑ دیں ' اللہ تعالیٰ ان کے شر کو آپ ﷺ سے دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾

لغۃ القرآن: [وَيَقُوْلُوْنَ : اور وہ لوگ کہتے ہیں] [طَاعَةٌ: فرماں برداری ہے] [فَاِذَا : پھر جب] [بَرَزُوْا : وہ نکلتے ہیں] [مِنْ عِنْدِکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے] [بَيَّتَ : تو. رات میں مشورہ کرتا ہے] [طَآئِفَةٌ : ایک گروہ] [مِّنْهُمْ : ان میں

سے] [غَيْرَ الَّذِیْ : اس کے علاوہ جو] [تَقُوْلُ : آپ کہتے ہیں] [وَاللّٰهُ : اور اللہ]
[يَكْتُبُ : لکھتا ہے] [مَا : اس کو جو] [يُبَيِّتُوْنَ : وہ لوگ رات میں مشورہ کرتے ہیں
] [فَاَعْرِضْ : تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعراض کریں] [عَنْهُمْ : ان سے] [
وَتَوَكَّلْ : اور بھروسہ کریں] [عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر] [وَكَفٰى : اور کافی ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ] [
وَكِيْلاً : بطور کارساز کے]

مترادفات:

[يَقُوْلُوْنَ : قول ، قائل ، مقولہ ، اقوال ۔][مِنْ : منجانب ، منجملہ ، من وعن ۔][
عِنْدِ : عندالطلب ، عنداللہ ماجور ہوں ۔][طَآئِفَةٌ: طائفہ منصورہ ، ثقافتی طائفہ ۔][
مِّنْ هُمْ : منجانب ، من وعن ، منجملہ ، من حیث القوم ۔][غَيْرَ : غیر اللہ ، دیار
غیر ، اغیار ۔][تَقُوْلُ : قول ، قائل ، مقولہ ، اقوال زریں ۔][يَكْتُبُ : کاتب ، کتابت
، مکتوب ۔][فَ اَعْرِضْ : اعراض کرنا ۔][تَوَكَّلْ : توکل ، متوکل علی اللہ ۔][وَكَفٰى:
کافی ، کفایت ۔][وَكِيْلًا : وکیل ، وکالت ۔]

ترجمہ: اور (ان منافقوں کا یہ حال ہے کہ آپ کے سامنے) کہتے ہیں کہ (ہم نے آپ کا حکم) مان لیا، پھر وہ آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کی کہی ہوئی بات کے برعکس رات کو رائے زنی (اور سازشی مشورے) کرتا ہے، اور اللہ (وہ سب کچھ) لکھ رہا ہے جو وہ رات بھر منصوبے بناتے ہیں۔ پس (اے محبوب!) آپ ان سے رُخِ انور پھیر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئیے، اور اللہ کافی کارساز ہے

تشریح: یہ آیت بھی منافقین کے حق میں نازل ہوئی، ان کی یہ عادت تھی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں ایمان و اطاعت کا اقرار و اعتراف کر لیتے اور کہہ دیتے کہ حضور ہمیں جو حکم فرمائیں اس کی اطاعت ہم اپنے لیے لازم سمجھتے ہیں اور جب علیحدہ ہو کر رات میں اپنی پنچایت کرتے ہیں تو اس میں اطاعت کی بجائے بغاوت کے منصوبے گانٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتا ہے۔ واللہ یکتب ما یبیتون اور اللہ لکھ رکھتا ہے ان کے رات کے منصوبے۔ اور اس آیہ کریمہ کا نزول قبل از جہاد ہے اس لیے ارشاد ہوا فاعرض عنھم اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے چشم پوشی فرمائیں۔ اس کے بعد نزول قرآن میں جو خبریں یا احکام اترتے تھے اسے شائع ذائع کر دینے والوں کے لیے حکم ہوا۔ (حسنات)

فاللہ تعالیٰ کی کارسازی کا کرشمہ دنیا بھر نے دیکھا کہ دشمنوں کی ساری سازشیں تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوئیں۔اور جو فتنہ اور شورش انھوں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ناکام کرنے کے لیے برپا کی وہ خود ان کی ہلاکت ورسوائی کا باعث بنی۔ (ضیاء)

منافق کی عادت

منافق کی عادت ہوتی ہے کہ وہ سامنے جی حضوری اور بعد میں اس کے الٹ بات کرتا ہے۔یہی عادت آپ کے دور کے منافقوں کی تھی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رعب اور مسلمانوں کے ماحول سے مرعوب ہو کر اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آتے تو ایسے الفاظ اور انداز اختیار کرتے کہ جن سے آپ کو یقین ہو جائے کہ یہ واقعتاً مخلص لوگ ہیں۔لیکن جونہی آپ کی محفل سے باہر جاتے بالخصوص رات کے وقت خفیہ میٹنگوں میں مشورے کرتے کہ اسلام سے کس طرح چھٹکارا پائیں اور آپ کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے؟ان کی خفیہ مجالس کو طشت از بام کر کے بتلایا جارہا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے اور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے لکھ رہا ہے اور کراماً کاتبین ان کا ایک ایک لفظ اور تمام حرکات کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔قیامت کے روز مکمل ریکارڈ ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ یہاں نہایت بلیغ انداز میں منافقوں کو ایسی حرکات سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔اس کے بعد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سمجھایا گیا کہ آپ ایسی باتوں کے پیچھے پڑنے کے بجائے درگزر فرمایا کریں۔کیونکہ صاحب عزیمت لوگ سفلہ مزاج لوگوں کی عادات سے صرف نظر ہی کیا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں اور اپنا کام کرتے جائیں۔اللہ تعالیٰ آپ کی پوری طرح حفاظت کرنے والا، کارساز اور ان کی سازشیں ناکام کرنے والا ہے۔ (فہم)

منافقین جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہر بات پر "طاعۃ" کا لفظ بولتے۔ممکن ہے یہی لفظ بولتے ہوں یا اس کے ہم معنی الفاظ کا تکرار کرتے ہوں۔لیکن مقصود یہ بتلانا ہے کہ وہ بات بات پر اپنے فدویت ' فدائیت اور غیر مشروط اطاعت کا اظہار کرتے 'کبھی کہتے سر تسلیم خم ہے 'کبھی کہتے بجاارشاد فرمایا 'کبھی کہتے اس میں شبہ ہی کیا ہے 'کبھی کہتے ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔اطاعت کے مفہوم میں اس طرح کی تمام باتیں شامل ہیں۔لیکن جب وہ حضور کی مجلس سے نکلتے اور اپنے لوگوں میں الگ ہو کر بیٹھتے تو رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر مشورے کرتے اور ان مشوروں میں جو کچھ طے کرتے یا جن عزائم کا اظہار کرتے ان میں سے ہر بات ان باتوں کے بالکل برعکس ہوتی جو وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں کہتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بات اطاعت کی ہوتی تو یہاں مشورے معصیت اور انکار کے ہوتے۔بلکہ جن چیزوں سے اسلام اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اور دعوت کو نقصان پہنچ سکتا 'ان پر غور کرتے اور ان کو بروئے کار لانے کے لیے سازشیں کی جاتیں 'تدبیریں لڑائی جاتیں اور منصوبے باندھے جاتے۔یہ سب کچھ چونکہ رات کی تنہائی یا نہایت خفیہ طریقے سے ہوتا تھا اس لیے پروردگار نے انہی منصوبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت خفیہ طریقے سے جو منصوبے تیار کرتے ہیں کسی کو ان کی خبر نہیں ہوتی۔انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دنیا سے تو اپنے منصوبوں کو چھپا سکتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں لیکن اللہ کو تو دھوکا نہیں سکتے۔وہ جو کچھ نہایت مخفی انداز میں رات کی تنہائی میں مشورے کرتے ہیں اللہ انھیں لکھ رہا ہے۔اللہ کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فرشتے اللہ کے حکم سے لکھ رہے ہیں۔ان کی ایک ایک بات کو محفوظ کیا جارہا ہے۔قیامت کے دن یہ سارا ریکارڈ ان کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا۔تب انھیں اندازہ ہوگا کہ ہم نے جو سرگوشیوں میں باتیں کی تھیں وہ بھی آج ہمارے سامنے ہمارے نامہ اعمال میں مرقوم

ہیں۔ لیکن اس وقت کا احساس انھیں کوئی کام نہیں دے گا۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ آج وہ اپنے رویے کو بدلنے کی کوشش کریں اور وہ اس بات کا یقین پیدا کرلیں کہ ان کی کوئی بات بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ وہ جب چاہتا ہے ان کی ان سازشوں سے اپنے رسول کو آگاہ کردیتا ہے۔ اس کے بعد آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی پروا کرنے کے بجائے ان سے اعراض کیجیے۔ وہ جو کرتے ہیں انھیں کرنے دیجیے۔ ان سے ڈرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ صرف اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ ہی آپ کا کارساز ہے۔ اور اللہ کی شان یہ ہے کہ جس کا وہ کارساز ہو اس کو کسی اور کی کارسازی کی حاجت نہیں رہتی۔ (روح)

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ محبوب بندے کے کام خود رب کے کام ہیں۔ نامہ اعمال لکھنا فرشتوں کا کام ہے۔ رب نے فرمایا، اللہ لکھتا ہے، ایسے ہی اللہ کے کام کو اس کے خاص بندے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا کام ہے عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں باذن اللہ مردے زندہ، بیماری اچھے کرتا ہوں حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ اے مریم میں تمہیں بیٹا بخشوں گا حالانکہ یہ کام رب کے ہیں۔

2: یعنی ان منافقوں کو منہ نہ لگاؤ یا انھیں قتل نہ کرو کیونکہ قتل کا حکم کفر کے ظاہر ہونے پر جاری ہوتا ہے۔ ان کا کفر چھپا ہوا ہے جس کی اطلاع ہم نے آپ کو دی۔ شریعت ظاہر پر ہے۔ لہٰذا یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے۔

آیت مبارکہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

لغۃ القرآن: [اَفَلاَ يَتَدَبَّرُوْنَ : تو کیا یہ لوگ غور وفکر نہیں کرتے] [الْقُرْاٰنَ : قرآن میں] [وَلَوْ : اور اگر] [كَانَ : وہ ہوتا] [مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ : غیر اللہ کے پاس سے] [لَوَجَدُوْا : تو یہ پاتے] [فِيْہِ : اس میں] [اخْتِلاَفًا كَثِيْرًا : بہت زیادہ اختلاف]

مترادفات: [يَتَدَبَّرُوْنَ : تدبر ، تدبیر ، مدبر کائنات ۔][عِنْدِ : عندالطلب عنداللہ ماجور ہوں ۔][اخْتِلَافًا : اختلاف ، اختلافات ، مختلف ۔]

ترجمہ: تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، اور اگر یہ (قرآن) غیر خدا کی طرف سے (آیا) ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

تشریح:

اس آیت میں قرآن مجید کی صداقت جانچنے کے لیے ایک معیار بیان کیا گیا ہے یعنی تئیس 23 سال کے طویل عرصہ میں نازل ہونے والی ضخیم کتاب میں کہیں اختلاف نہیں ہے۔ نہ الفاظ و معانی میں اور نہ احکام و مضامین میں۔ اگر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اتنے عرصہ میں مختلف احوال کے باعث اس میں اختلاف ضرور ہوتا لیکن اس میں اختلاف کا نہ ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ کاش غیر مسلم قرآن مجید کے الفاظ و مضامین میں غور و فکر کریں اور اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کے لیے اس سراسر صداقت کتاب پر ایمان لے آئیں۔ (امداد)

شانِ نزول

آیہ کریمہ کا یہ ہے کہ بدر صغریٰ کی جنگ جو ابو سفیان سے تھی جو ہو نا ٹھہر چکی تھی جب اس کا وقت آ پہنچا تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہاں جانے کے لیے لوگوں کو دعوت دی ان میں وہ بھی تھے جن پر یہ حکم گراں گزرا تو اللہ تعالیٰ عزوجل نے یہ حکم نازل فرمایا جس میں ارشاد ہوا۔ فقاتل فی سبیل اللہ۔ ’’اللہ کی راہ میں جہاد کرو تم تکلیف نہ دیئے جاؤ گے مگر اپنے دم کی اور مسلمانوں کو آمادہ کرو قریب ہے کہ اللہ کافروں کی سختی روک دے اور اللہ سخت تر ہے عذاب دینے میں اور سخت تر ہے انتقام میں‘‘۔ اس میں فرمایا اور مطلق حکم دیا کہ ضرور جہاد کرو خواہ کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے اللہ آپ کا ناصر ہے اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر صغریٰ کی جنگ کے لیے روانہ ہوگئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ صرف ستر سوار تھے اور بہ تعمیل حکم الٰہی عزوجل حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تحریض للجہاد فرمادی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں کا یہ مختصر سا لشکر کامیاب آیا اور کفار اتنے مرعوب ہوئے کہ مسلمانوں کے مقابلہ کی جرأت نہ کرسکے آگے باہمی حمایت واعانت کی تعلیم دی گئی (حسنات)

یہاں قرآن کی عظمت کا بیان ہے اور لوگوں کو اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ کیا یہ لوگ قرآن حکیم میں غور نہیں کرتے اور اس کے علوم اور حکمتوں کو نہیں دیکھتے کہ اس نے اپنی فصاحت سے تمام مخلوق کو اپنے مقابلے سے عاجز کر دیا ہے اور غیبی خبروں سے منافقین کے احوال اور ان کے مکروفریب کو کھول کر رکھ دیا ہے اور اوّلین وآخرین کی خبریں دی ہیں۔ اگر قرآن میں غور کریں تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کلام ہے اور اسے لانے والا اللہ عَزَّوَجَلَّ کا رسول ہے۔

قرآنِ مجید میں غور و فکر کرنا عبادت ہے لیکن

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں غور و فکر کرنا اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ امام غزالی (رح) احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ ایک آیت سمجھ کر اور غور و فکر کر کے پڑھنا بغیر غور و فکر کئے پورا قرآن پڑھنے سے بہتر ہے۔

(احیاء العلوم، کتاب التفکر، بیان مجاری الفکر، ۵/۱۷۰)

قرآن کا ذکر کرنا، اسے پڑھنا، دیکھنا، چھونا سب عبادت ہے۔ قرآن میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ قرآن میں وہی غور و فکر مُعتَبَر اور صحیح ہے جو صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرامین اور حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحبت یافتہ صحابہ (رض) اور ان سے تربیت حاصل کرنے والے تابعین (رح) کے علوم کی روشنی میں ہو کیونکہ وہ غور و فکر جو اس ذات کے فرامین کے خلاف ہو جن پر قرآن اترا اور اس غور و فکر کے خلاف ہو جو وحی کے نزول کا مشاہدہ کرنے والے بزرگوں کے غور و فکر کے خلاف ہو، وہ یقیناً معتبر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دور جدید کے ان نت نئے محققین سے بچنا ضروری ہے جو چودہ سو سال کے علماء، فُقہاء، محدثین و مفسرین اور ساری امت کے فہم کو غلط قرار دے کر قولاً یا عملاً یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ قرآن اگر سمجھا ہے تو ہم نے ہی سمجھا ہے، پچھلی ساری امت جاہل ہی گزر گئی ہے۔ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں۔

{ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ : اور اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا۔ } یہاں قرآن پاک کی حقانیت پر ایک نہایت آسان اور واضح دلیل دی جارہی ہے کہ اگر قرآن پاک اللہ عَزَّوَجَلَّ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا ہے تو اس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا، اس میں جو غیب کی خبریں دی گئی ہیں وہ سو فیصد پوری نہ ہوتیں بلکہ کوئی بات تو پوری ہو جاتی اور کوئی نہ ہوتی لیکن جب ایسا نہ ہوا بلکہ قرآن پاک کی تمام غیبی خبریں بالکل سچی ثابت ہو رہی ہیں تو ثابت ہوا کہ یقیناً یہ کتاب، اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے ہے نیز اس کے مضامین میں بھی باہم اختلاف نہیں کہ کہیں کوئی بات کہہ دی اور کہیں اس کے برخلاف کوئی دوسری بات کہہ دی۔ اسی طرح فصاحت و بلاغت میں بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ مخلوق کا کلام فصیح بھی ہو تو سب یکساں نہیں ہوتا کچھ بلاغت سے بھرپور ہوتا ہے تو کچھ رکیک و گھٹیا قسم کا ہوتا ہے جیسا کہ شعراء اور زبان دانوں کے کلام میں دیکھا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا کوئی کلام بڑا شاندار ہوتا ہے اور کوئی بالکل گیا گزرا۔ لیکن قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے کلام کی شان ہے کہ اس کا تمام کلام فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مرتبے پر ہے۔ (صراط)

قرآن مجید میں اختلاف نہ ہونے کا بیان

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ لوگ قرآن مجید کے معانی میں اور اس کے الفاظ بلیغہ میں غور کیوں نہیں کرتے ' اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ قرآن مجید میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ اضطراب ہے نہ تعارض اور تضاد ہے اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت اختلاف اور تعارض ہوتا ' اور جب ایسا نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

غیر اللہ کے کلام میں اختلاف تین وجہ سے ہو سکتا ہے ' اس کے الفاظ میں اختلاف ہو یا معنی میں یا ترتیب میں ' الفاظ میں اختلاف اس طرح ہو سکتا تھا کہ بعض الفاظ تو فصاحت اور بلاغت میں حد اعجاز کو پہنچے ہوں اور بعض اس حد سے کم ہوں اور جب قرآن مجید کا تمام متن کلام معجز ہے اور اس کی ہر سورت اور ہر آیت حد اعجاز کو پہنچی ہوئی ہے تو اس میں الفاظ کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے ' اور اس میں معانی کے اعتبار سے اس طرح اختلاف ہو سکتا تھا کہ اس میں غیب کی خبریں جو بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض صحیح ہوتیں اور بعض غلط ہوتیں ' اسی طرح مبداء اور معاد کے جو تکوینی احکام بیان کیے گئے ہیں وہ غلط ثابت ہوتے حالانکہ ہر زمانہ میں قرآن مجید کی صداقت تسلیم کی جاتی رہی ہے ' اور قرآن مجید نے ماضی کی جو خبریں اور گزشتہ انبیاء (علیہم السلام) اور ان کی امتوں کے جو احوال بیان کیے ہیں وہ حرف بہ حرف صادق ہوئے اسی طرح قرآن مجید نے جو عقائد اور احکام شرعیہ بیان کیے ان میں بھی کسی قسم کا کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے۔

قرآن مجید میں روز افزوں واقعات اور نئے نئے احوال کے مطابق آیات نازل ہوتی رہیں اور یہ یک وقت کئی کئی سورتوں کی آیات نازل ہوتی رہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر آیت کو اس سے متعلق سورت میں لکھواتے رہے اور کسی جگہ ترتیب میں کوئی خطا یا کوئی غلطی واقع نہیں ہوئی۔

دنیا کی ہر کتاب میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ سے کوئی خطاء اور کوئی غلطی اور کوئی تعارض اور تضاد واقع ہو جاتا ہے صرف اللہ کی کتاب قرآن مجید ایسی کتاب ہے جس میں کسی وجہ سے کہیں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے اور یہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ (تبیان)

تدبّرِ قرآن کی اہمیت

قرآن مجید کی تلاوت کے جو آداب اور تقاضے مقرر کیے گئے ہیں ان میں ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تلاوت کے دوران قرآن مجید کے الفاظ، انداز اور اس کے فرمان پر غور و خوض کیا جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عادت مبارکہ تھی کہ تہجد میں تلاوت کے دوران قرآن مجید کے احکامات پر غور کرتے اور عذاب کی آیات پر اللہ تعالیٰ سے پناہ اور معافی طلب کرتے اور زار و قطار روتے۔ جب بشارت کی آیات پڑھتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے حصول کے طلب گار ہوتے۔ قرآن مجید میں تدبّر و تفکّر کرنا حسب لیاقت ہر آدمی پر فرض ہے۔

تدبّر کے اصول

قرآن مجید کے تدبر کے بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ اور مفہوم وہی متعین کرنا چاہیے جو قرآن مجید کے الفاظ کے سیاق و سباق اور دعوت قرآن کے مطابق ہو۔ جہاں مفہوم سمجھنے میں مشکل پیش آئے تو حدیث رسول کے ذریعے اس کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔ اگر قرآن و حدیث کے حوالے سے بھی بات سمجھنے میں دقّت محسوس ہو۔ جس کی گنجائش بہت کم ہے تو صحابہ کرام (رض) کے اقوال کے مطابق قرآن کا مفہوم لینا ہوگا۔ کیونکہ صحابہ (رض) براہ راست قرآن کے مخاطب تھے اور انھوں نے بلاواسطہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرآن پڑھا، سنا اور سمجھا تھا۔ محض عربی لغت اور ادبی محاورات کی بنیاد پر قرآن مجید کا معنی و مفہوم متعین کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اس لیے علماء نے قرآن مجید سے مسائل اخذ کرنے اور اس کی تفسیر کے لیے کچھ اصول مقرر کیے ہیں۔ جب تک ان اصولوں کا خیال نہ رکھا جائے۔ آدمی نہ صرف خود بھٹک سکتا ہے بلکہ دوسروں کی گمراہی کا سبب ثابت ہوگا۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ دین اور قرآن پر علماء کی اجارہ داری چہ معنی دارد؟ ہر کسی کو قرآن و سنت سے مسائل کے استنباط کا حق ہونا چاہیے۔ اس مغالطہ کی عام طور پر دو وجوہات ہوتی ہیں۔ اکثر لوگ اپنی سادگی اور اخلاص کی بنیاد پر جبکہ دوسرے اس زعم میں مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم علماء سے زیادہ سمجھدار اور پڑھے لکھے ہیں۔ ذرا غور سے سوچا جائے تو دونوں قسم کے حضرات کا مطالبہ اور موقف دنیا کے مسلّمہ اصولوں پر پورا نہیں اترتا۔ دنیا میں کونسا ایسا فن ہے جسے مستقل اختیار کرنے کے لیے استاد اور تجربہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیا حکمت اور ڈاکٹری نہ جاننے والا مریض کا باقاعدہ علاج کر سکتا ہے؟ اسے مریض کی جان کے ساتھ کھیلنے کی اجازت ہونی چاہیے؟ کوئی معمولی عقل والا جان بوجھ کر اناڑی ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنے کے لیے آمادہ ہوگا؟ دور نہ جائیں ایک ان پڑھ اور دیہاتی نے اپنا مکان بنانا ہو تو وہ کسی ناتجربہ کار کاریگر سے کچا مکان بنانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ آپ دنیا میں کوئی ایسا

تعلیمی ادارہ دکھا سکیں گے جس میں ریاضی کے ٹیچر کو اردو پڑھانے کے لیے اور انگلش جاننے والے کو عربی کا سبجیکٹ دیا جاتا ہو ؟ کیا ایسی اجازت دینے والے ادارہ کا سربراہ دانشور تسلیم کیا جائے گا ؟ نہیں ! تو پھر دین کا معاملہ اتنا عارضی اور ہلکا ہے کہ اس کی باقاعدہ تبلیغ وتدریس اور مسائل کے استدلال کے لیے ہر کسی کو اجازت دے دی جائے۔ اس کا یہ معنیٰ ہر گز نہیں کہ غیر عالم قرآن سمجھنے یا کسی کو مسئلہ بتلانے کی کوشش نہ کرے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی باقاعدہ تدریس و تبلیغ اور قرآن و سنت سے مسائل مستنبط کرنا چاہتا ہے تو اسے باضابطہ طور پر عربی جاننا اور قرآن و حدیث کا علم سیکھنا چاہیے ورنہ وہ گمراہی کا سبب بنے گا جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوٹوک الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

[رواہ البخاری : کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم]

دیہاتی کی غلط فہمی اور مفکر اسلام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جواب

بسا اوقات اپنی کم فہمی اور علمی کم مائیگی کی بنیاد پر آدمی قرآن مجید میں تضادات محسوس کرتا ہے۔ ایسا ہی تاثر اس اعرابی کا تھا جس نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کے سامنے یہ اعتراضات کئے کہ دیکھئے اس مقام پر قرآن مجید میں تضادات پائے جاتے ہیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ میں جس شخصیت کے سامنے یہ اعتراضات رکھ رہا ہوں اسے تو سرور دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فہم دین کی دعا دی تھی جس کی برکت سے وہ مفکر اسلام ہوئے۔ چنانچہ جب حضرت ابن عباس (رض) نے ایک ایک کر کے تسلی بخش جواب دیے تو اعرابی پکار اٹھا کہ واقعی قرآن مجید میں کسی قسم کے تضاد اور اختلاف کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے انشراح صدر اور دلچسپی کے لیے من و عن اس مکالمے کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر (رض) فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے ایک آدمی نے کہا کہ قرآن میں کئی آیات ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ پھر اس نے قرآنی آیات کا اختلاف پیش کیا کہ ایک آیت میں ہے کہ قیامت کے دن لوگ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے دوسری آیت میں ہے کہ وہ آمنے سامنے آکر ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ ایسے ہی ایک آیت میں ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے کچھ چھپا نہیں سکے گا۔ دوسرے مقام میں ہے کہ مشرک کہیں گے کہ ہمارے رب ہم نے شرک نہیں کیا۔ پھر ایک آیت میں آسمان کی پیدائش زمین سے پہلے ذکر کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری آیت میں زمین کی پیدائش کا آسمان سے پہلے ذکر ہوا ہے۔ ایک اور مقام میں ہے اللہ تعالیٰ بخشنے اور رحم کرنے والا غالب، حکمت والا، سننے والا اور جاننے والا تھا گویا کہ اب نہیں۔

ان اعتراضات کا جواب عبداللہ بن عباس (رض) نے اس طرح دیا کہ جس آیت میں ہے کہ لوگ آپس میں سوال نہیں کریں گے۔ وہ پہلے نفخہ کا ذکر ہے اور جس آیت میں ایک دوسرے سے سوال کرنے کا تذکرہ ہے وہ دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا۔ وہ جو کہیں گے کہ ہمارے مالک ہم مشرک نہیں تھے۔ تو یہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ مومنوں کو بخش دیں گے تو مشرک آپس میں کہیں گے کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کو کہتے ہیں کہ ہم نے شرک نہیں کیا تھا۔ اس وقت ان کے مونہوں پر مہریں لگا دی جائیں گی پھر ان کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے۔ جب مجرم جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپایا نہیں جاسکتا تب کافر کہیں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے !!! زمین وآسمان کی پیدائش میں اختلاف کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرما کر پھر آسمان کو پیدا کیا آسمان کو دو دنوں میں برابر کر کے زمین کو پھیلایا اس میں سے پانی ' پہاڑ ' ٹیلے اور جو کچھ آسمان وزمین کے درمیان ہے دو دنوں میں بنایا لہٰذا زمین اور اس کی تمام اشیاء چار دن اور آسمان دو دنوں میں پیدا کیا گیا۔

آخری اعتراض تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ماضی میں تھیں اب نہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ ازل سے ہی یہ اللہ کی صفات ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ سارا قرآن اللہ کی طرف سے ہے تجھے اس میں اختلاف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔[رواہ البخاری : کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ ونفخ فی الصور۔۔۔](فہم)

یہ کتاب جو تئیس سال کے عرصہ دراز میں نازل ہوئی اس میں تضاد واختلاف کی بوتک نہیں۔ یہ وہ ہنگامہ خیز اور پرآشوب عرصہ ہے جس میں داعی اسلام، اس کے ماننے والوں اور خود اس دعوت کو شدید قسم کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ظلم وستم کے پہاڑ بھی توڑے گئے۔ عقیدت ومحبت کے پھول بھی برسائے گئے۔ایسے حالات بھی رونما ہوئے کہ ظاہر میں نگاہوں کو یقین ہونے لگا کہ چراغ حق ابھی بجھا چاہتا ہے۔اور ایسا دور بھی آیا کہ اس چراغ کو پھونکیں مار مار کر بجھانے والے پروانہ وار اس پر تصدق ہونے لگے۔ صلح بھی اور جنگ بھی، فتح بھی اور پسپائی بھی، خوف بھی اور امن بھی ہر قسم کے حالات رونپذیر ہوئے۔ان گونا گوں اور بوقلموں ادوار میں ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور اس میں ایک ایسی آیت کی بھی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جس سے اسلام کے اصولوں میں تضاد کا شائبہ تک ہو۔علامہ بیضاوی (رح) نے ایک جملہ میں سب کچھ بیان کر کے رکھ دیا۔ من تناقض المعنی وتفاوت النظم یعنی اس کی کوئی آیت نہ معنوی لحاظ سے دوسری آیت کے خلاف ہے اور نہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے کوئی حصہ دوسرے حصہ سے فروتر ہے۔ معانی وحقائق کا سمندر ہے جس کی لہروں میں آویزش نہیں۔ جس کی ہر موج اور ہر قطرہ کل کا رنگ وبو لیے ہے۔اس سے بڑھ کر اس کے کلام الٰہی ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔(ضیاء)

فوائد

1 : معلوم ہوا کہ قرآن میں غور وفکر کرنا بھی عبادت ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ایک آیت سمجھ کر پڑھنا بغیر سمجھے ہزار آیات پڑھنے سے افضل ہے۔ ذکر قرآن، نظر قرآن، فکر قرآن سب عبادت ہے۔ مگر خیال رہے کہ ہر شخص کو قرآن کے مسائل پر غور کرنے کی اجازت نہیں ورنہ دین برباد ہوجاوے گا۔ اگر جاہل علم طب میں خود غور کر کے علاج کرے تو جان لے گا اور اگر قرآن میں غور کر کے مسائل نکالے تو ایمان لے گا۔ مگر خیال رہے کہ ہر شخص کا غور علیحدہ ہے۔ مجتہدین قرآن میں غور کر کے اسرار معلوم کریں۔ علماء اس میں غور کر کے احکام کی حکمتیں معلوم کریں۔ عوام اس میں غور کر کے ایمان تازہ کریں۔ ہر شخص سمندر میں نہ کودے۔

2 : اس طرح کہ اس کی خبریں سچی نہ ہوتیں یا بعض آیات فصیح وبلیغ ہوتیں اور بعض اس کے خلاف نیز آیات میں تعارض ہوتا۔اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیات آپس میں متعارض نہیں۔ اگر کہیں تعارض معلوم ہو تو یہ ہمارے علم وفہم کا قصور ہے۔(نور)

مسائل

۱۔ قرآن مجید میں تدبر وتفکّر کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اس میں تعارض نہیں پایا جاتا۔

۳۔ قرآن مجید اگر اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو اس میں بیشمار اختلافات پائے جاتے۔

آیت مبارکہ:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب] [جَآئَہُمْ : آئے ان کے پاس] [اَمْرٌ : کوئی بات] [مِّنَ الْاَمْنِ : امن میں سے] [اَوِ الْخَوْفِ : یا خوف میں سے] [اَذَاعُوْا : تو وہ لوگ چرچا کرتے ہیں] [بِہٖ : اس کا] [وَ : حالانکہ] [لَوْ : اگر] [رَدُّوْہُ : وہ لوٹا دیتے اس کو] [اِلَی الرَّسُوْلِ : رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف] [وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ : اور اختیار والوں کی طرف] [مِنْہُمْ : اپنوں میں سے] [لَعَلِمَہٗ: تو علم حاصل کرتے اس کا] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ: حقیقت معلوم کرسکتے ہیں اس کی] [مِنْہُمْ : ان میں سے] [وَلَوْلاَ : اور اگر نہ ہوتا] [فَضْلُ اللّٰہِ : اللہ کا فضل] [عَلَیْکُمْ : تم لوگوں پر] [وَرَحْمَتُہٗ: اور اس کی رحمت] [لاَتَّبَعْتُمُ : تو تم لوگ پیروی کرتے] [الشَّیْطٰنَ : شیطان کی] [اِلاَّ قَلِیْلاً : سوائے تھوڑے سے لوگوں کے]

مترادفات: [الْاَمْنِ : امن و امان ، امن عامہ ،][رَدُّوْ ھُ : رد ، مردو ، تردید۔][لَعَ لِمَہٗ : عالم ، معلوم ، تعلیم ، معلومات۔][یَسْتَنْ بِ طُوْنَہٗ : استنباط (اخذ کرنا) ۔][مِنْ ھُمْ : منجانب ، من جملہ ، من وعن ، من حیث القوم۔][فَ ضْلُ : فضل وکرم۔][عَلَیْ کُمْ : علیحدہ ، علی الاعلان ، علی العموم۔][لَاتَّبَعْ تم : اتباع رسول ، متبع سنت ، تابع فرمان۔][اِلَّا : الاماشاء اللہ ، الایہ کہ][قَلِیْلًا : ، قلیل ، قلت۔]

ترجمہ: اور جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ (بجائے شہرت دینے کے) اسے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنے میں سے صاحبان امر کی طرف لوٹا دیتے تو ضرور ان میں سے وہ لوگ جو (کسی) بات کا نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں اس (خبر کی حقیقت) کو جان لیتے، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً چند ایک کے سوا تم (سب) شیطان کی پیروی کرنے لگتے

تشریح: مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو کفار کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کی تیاری، ایک یورش کے بعد دوسری یورش کا اندیشہ تھا۔ مسلمان مسلسل ایسے حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے جنہیں بجا طور پر زمانہ جنگ کہا جا سکتا ہے۔ ہر دن ہر لحظہ حملہ ہو سکتا تھا۔ ایسے ہنگامی حالات میں غلط افواہوں اور بے بنیاد خبروں کا پھیلنا ایک قدرتی امر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان افواہوں کو روکا نہ جائے تو صورت حال بڑی سنگین ہو سکتی ہے۔ مسلمان معاشرہ میں بھی کوئی ایسے کمزور دل اور بعض بیمار دل افراد تھے کہ کوئی بات کانوں تک پہنچی اور اسے سارے شہر میں مشہور کر دیا۔ جس سے طرح طرح کے نقصانات کا اندیشہ تھا۔ اس لیے اس سے روک دیا گیا اور ہدایت کر دی گئی کہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو بارگاہ رسالت میں عرض کر و یا تم میں جو صاحب عقل و دانش ہیں وہ اس کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اس کے متعلق مناسب اقدام کریں۔ جب عام دنیوی اور سیاسی امور میں عوام کو ان چیزوں میں دخل اندازی اور خودسری سے روک دیا گیا ہے تو آپ خود سوچیں کہ امور دینیہ میں یہ بد نظمی کب برداشت کی جا سکتی ہے۔ کہ ہر کہ ومہ مفتی بنا پھرے اور قرآن وسنت کو اپنی رائے سے ہم آہنگ کرتا رہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ حرص وہوا کے بندوں کی تقلید نہ شروع کر دیا کریں اور دینی امور میں فقط ان علماء کی طرف متوجہ ہوں جن کا علم و فضل، زہد و تقویٰ اور دینی بصیرت مسلمہ اور جن کی سیرت بے داغ ہو۔ (ضیاء)

یہاں اگرچہ ایک خاص سیاق و سباق میں ایک چیز بیان کی گئی ہے لیکن اس میں جو حکم بیان کیا گیا ہے یہ ہماری زندگی کے ہزاروں گوشوں میں اصلاح کیلئے کافی ہے۔ خلاصہ کلام یہ فرمایا گیا کہ جب کبھی امن مثلاً مسلمانوں کی فتح یا خوف مثلاً مسلمانوں کی شکست کی کوئی بات لوگوں کے پاس آتی ہے جو فساد کا باعث بن سکتی ہے تو وہ فوراً اسے پھیلانے لگتے ہیں حالانکہ اگر اس بات کو یہ لوگ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنے بااختیار لوگوں جیسے اکابر صحابہ (رض) جو صاحب رائے اور صاحب بصیرت ہیں کی خدمت میں پیش کرتے اور خود کچھ دخل نہ دیتے تو سمجھدار لوگ ضرور اپنی عقل و دانش یا اپنی تحقیق کی روشنی میں اُس خبر کی حقیقت کو جان لیتے اور یوں بات کا بتنگڑ بننے کی بجائے حقیقتِ حال کھل کر سامنے آ جاتی۔

زندگی کی اصلاح کا ایک اہم اصول

اس آیت کو سامنے رکھ کر ہم اپنے گھروں کے معاملات بلکہ ملکی و بین الاقوامی معاملات اور صحافتی معاملات کو جانچ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا حال یہ ہے کہ ایک بات کو کوئی شخص اچھالتا ہے اور پھر وہ موجودہ میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں گردش کرنے لگتی ہے اور کچھ عرصے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس بات کا کوئی سر پیر ہی نہیں اور وہ سراسر جھوٹی ہے۔ مسلمانوں کو اور اسلام کو بدنام کرنے کیلئے ایسی سازشیں، افواہیں اور خبریں دن رات پھیلائی جا رہی ہیں حتّٰی کہ بعض جگہوں پر یہ بات پھیلائی گئی ہے کہ مسلمانوں کا مذہب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک جنت میں نہیں جائے گا جب تک وہ کسی ایک کافر کو قتل نہیں کرلے گا۔ اَلْاَمان وَالْحفیظ، کیسا جھوٹ اور کیسی دیدہ دلیری ہے۔ کفار کے ممالک میں مسلمانوں کا جو تشخص پھیلایا جا رہا ہے وہ بھی اسی طرح کی جھوٹی افواہوں کے ذریعے ہے اور پھر ایسی ہی باتیں سن کر مغرب سے مرعوب کچھ پڑھے لکھے سمجھے جانے والے ہمارے لوگ ان باتوں کو اسلام کے نام پر پیش کر کے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ یہی معاملہ گھروں میں ہے کہ کسی نے کچھ بات کہی، وہ پھیلتے پھیلتے دس مرتبہ اضافوں کے ساتھ ایسی ہو گئی کہ خاندانوں میں لڑائیاں چھڑ گئیں اور تباہیاں مچ گئیں۔ ایسی سینکڑوں باتوں کا ہم سب کو تجربہ ہو گا۔ ان سب کیلئے قرآن نے یہ اصول دیا ہے کہ جب ایسی کوئی بات پہنچے تو اہل دانش اور سمجھدار لوگوں تک پہنچا دی جائے وہ

غور و فکر اور تحقیق سے اس کی حقیقت حال معلوم کرلیں گے اور یوں بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ نہیں بنے گا۔ حضرت حفص بن عاصم (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کر دے۔ (مسلم، باب النہی عن الحدیث بکلّ ما سمع، ص ۸، الحدیث : ۵(۵))

ایک اہم مسئلہ

مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ قیاس جائز ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک علم تو وہ ہے جو قرآن و حدیث سے صراحت سے حاصل ہوتا ہے اور ایک علم وہ ہے جو قرآن و حدیث سے اِستِنباط و قیاس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ امور دینیہ میں ہر شخص کو دخل دینا جائز نہیں جو اس کا اہل ہو وہی اس میں غور کرے۔ (صراط)

اس آیت میں استنباط کا معنی ہے کسی چیز کو نکالنا ' اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اپنی عقل اور علم سے کسی خبر میں غور و فکر کر کے اس سے صحیح نتیجہ نکالے ' قرآن اور حدیث میں غور و فکر کر کے ان سے احکام شرعیہ اخذ کرنے کو بھی استنباط کہتے ہیں۔

شان نزول :

یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوتے اور لشکر کو شکست ہوتی یا اس کو مال غنیمت حاصل ہوتا ' تو وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خبر دینے سے پہلے اس خبر کو اڑا دیتے تھے تاکہ مسلمانوں کے دل کمزور ہوں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اذیت پہنچے ' اگر وہ یہ خبر نہ پھیلاتے حتی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا آپ کے معظم اصحاب میں سے مثلا حضرت ابوبکر (رض) اور حضرت عمر (رض) وغیرہ اس خبر کی خود تحقیق کرتے تو وہ اس خبر سے صحیح نتیجہ نکال لیتے۔ (الوسیط ج ۲ ص ۸۷)

امام ابن جریر نے لکھا ہے ان لوگوں سے مراد منافق ہیں یا ضعفاء مسلمین (جامع البیان ج ۵ ص ۱۱۴)

اس آیت میں اولی الامر سے مراد یا تو ان لشکروں کے امیر ہیں یا اصحاب علم و فضل ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۲)

قیاس اور تقلید کے حجت ہونے کا بیان

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شریعت میں قیاس بھی حجت اور دلیل ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ واجب کیا ہے کہ خبر کے ظاہر پر عمل نہ کیا جائے بلکہ غور و فکر کر کے اس خبر سے صحیح نتیجہ اخذ کیا جائے ' اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام ظاہر نص سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ ظاہر نص سے جو حکم مستنبط کیا جائے اس پر عمل کرنا واجب ہے ' اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں ان میں عوام پر واجب ہے کہ وہ علماء کی تقلید کریں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی مسائل شرعیہ میں استنباط کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد پیش آمدہ واقعات اور مسائل حاضرہ میں اصحاب علم کو قرآن اور احادیث سے استنباط اور اجتہاد کرنا چاہیے۔ (تبیان)

منافقین کی افواہوں سے دلچسپی

منافقین پر تنقید جاری ہے اور ان کے منافقانہ رویے سے مسلمانوں کو حالات کو سمجھنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی تربیت دی جارہی ہے۔ جس زمانے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے لیے انتہائی تشویشناک دور تھا۔ قریش مکہ تو عداوت سے اندھے ہو ہی رہے تھے اور وہ کوئی موقع دشمنی کا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے 'لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہود بھی اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ برابر قریش مکہ سے رابطے میں رہتے تھے اور دونوں قوتیں مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی رہتی تھیں اور خود مدینے کے اندر منافقین مارِ آستین کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو اپنے مفادات کے ہاتھوں مجبور تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں یہود استعمال کر رہے تھے۔ قریش مکہ اور یہود کی دشمنی نے قریب و بعید کے قبائل کو بھی مسلمانوں پر دلیر کر دیا تھا۔ ان میں سے طاقتور قبائل برابر اس تاک میں تھے کہ موقع ملنے پر مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ مدینے کی ایک چھوٹی سی ریاست اور پوری سرزمین عرب اس کے خلاف دشمنی سے دہک رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں جب کہ چہار طرف اندیشوں کی فصل اگ رہی ہو معمولی سی غیر ذمہ داری بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ منافقین تو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہی تھے بعض سادہ دل مسلمان بھی اپنی سادگی کی وجہ سے ان کی باتوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ چنانچہ منافقین نے اپنا یہ وطیرہ بنالیا تھا کہ وہ آئے دن نئی نئی افواہیں گھڑتے اور انھیں پھیلاتے تھے۔ اچانک یہ افواہ پھیلا دی جاتی کہ فلاں قبیلہ مسلمانوں پر حملہ آوار ہونا چاہتا ہے 'فلاں طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے 'فلاں جگہ دشمن کو گھات لگا کر بیٹھے دیکھا گیا ہے اور سادہ دل مسلمان باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے باعث ان افواہوں سے خود بھی مضطرب ہوتے اور دوسروں کو بھی اضطرب میں مبتلا کر دیتے۔ اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا کہ مسلسل خطرات کی افواہوں سے مسلمانوں کے حوصلے توڑ دیے جائیں۔ وہ جب محسوس کریں گے کہ ہم ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے ہیں تو اعصاب کے تحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے آخر وہ کب تک ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ آہستہ آہستہ وہ خوف کی گرفت میں آکر عزائم کی بلندی سے محروم ہو جائیں گے۔ بجز چند سرفروشوں کے اور کوئی شخص بھی مسلسل ان افواہوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

افواہ سازی قوم کا حوصلہ توڑنے کا موثر ذریعہ

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا زمانہ حربی صلاحیت اور حربیت کے اعتبار سے ایک قدیم زمانہ ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج حربی ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ صرف میدان جنگ میں نہیں لڑی جاتی بلکہ اصل میدان جنگ قوم کے دل ہوتے ہیں۔ اگر وہ پوری توانائی اور اولوالعزمی کے ساتھ اپنی فوج کی پشت پر کھڑے ہوتے ہیں تو فوج میدان جنگ سے پسپا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر قوم ہمت ہار دیتی ہے اور اس کے سیاستدان اور اصحاب اقتدار اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر سمجھوتے کی میز پر آجاتے ہیں تو فوج کی جیتی ہوئی بازی بھی شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے نئی فوجی تکنیک یہ ہے کہ گرم جنگ سے پہلے سرد جنگ لڑی جاتی ہے۔ دشمن قوم کے دماغوں کو مسخر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے سوچنے سمجھنے والے افراد کی رائے کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے اندر پانچواں کلام تیار کیا جاتا ہے جن کا کام دشمن قوم کو ہر وقت افواہوں کی گرفت میں رکھنا ہوتا ہے اور افواہ سازی کے لیے مستقل سیل قائم کیے جاتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے دماغ عجیب و غریب افواہوں کو جنم دیتے ہیں اور پانچواں کلام اور ان کے جاسوس اسے دشمن قوم میں پھیلانے کا

کام کرتے ہیں۔ آج اسے نہایت منظّم طریقے سے کیا جارہا ہے۔ لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں اگرچہ یہ برائی منظّم طریقے سے انجام نہیں پارہی تھی لیکن اس کی اہمیت اور افادیت ماہرین جنگ کی نگاہوں میں آج ہی کی طرح مسلم تھی۔ چنانچہ اسی اہمیت کے پیش نظر منافقین کے بارے میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے تو وہ اسے مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے دوڑ بھاگ میں لگ جاتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو یہ تربیت دی جارہی ہے کہ منافقین تو دشمن کے ایجنٹوں کی طرح تمہارے حوصلے شکست کرنے کے لیے یہ حرکت کریں گے۔ لیکن تمہیں ان کے دیکھا دیکھی کبھی اس میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس بات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے تمہارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ جب بھی اس طرح کی بات سنو تو سب سے پہلے قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق یہ جاننے کی کوشش کرو کہ خبر لانے والا کون ہے۔ اگر کوئی فاسق یعنی بدکردار اور غیر معتبر آدمی ہے تو اس کی خبر کو مت قبول کرو۔ اور مزید یہ کہ جس بات کو سنو اسے بلا تحقیق دوسرے سے کہنا شروع نہ کردو کیونکہ جس طرح جھوٹ ایک بدترین برائی ہے اور اللہ کے یہاں اس کی بڑی سزا ہے اسی طرح وہ آدمی بھی جھوٹوں میں شمار ہوگا جو ہر سنی ہوئی بات کو بلا تحقیق دوسروں سے کہنا شروع کردیتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ (کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو سنے کہنا شروع کردے) جنگ کے دنوں میں اس طرح کی بے احتیاطی بڑے خطرناک نتائج پیدا کرسکتی ہے۔ مگر عام دنوں میں بھی اسلام مسلمانوں کا جو مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس بے احتیاطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اسلام کے نزدیک جھوٹ بدترین لعنت ہے اور جھوٹ بولنے والا لعنت کا سزاوار ہے۔ اس لیے ہر وہ بات جس پر جھوٹ کا شبہ بھی ہوتا ہو یا جھوٹ پر منتج ہوسکتی ہو یا جس سے جھوٹ کا مزاج پیدا ہو اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ ایسا رویہ زندگی کے ہر دائرے میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔ گھروں میں جہاں چند افراد بستے ہوں ایک آدمی بھی اس مزاج کا ہو تو گھر میں ناچاقی اور بے اتفاقی کا ماحول پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر معاشرے میں یہ رویہ عام ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی گھر، کوئی دفتر اور کوئی ادارہ حالات کی خرابی سے محفوظ نہیں رہتا۔ اس لیے اسلام کی یہ ہدایت صرف جنگی حالات تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کسی بھی معاشرے میں اس ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو ضرور تلخ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ سب سے پاکیزہ معاشرہ عہد نبوت کا معاشرہ ہے۔ لیکن اس میں بھی ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں سے ایک مثال کو اس آیت کے شان نزول کے طور پر بھی مفسرین بیان کرتے ہیں۔ کہ حضرت عمر فاروق (رض) کے دینی بھائی گئی رات حضرت عمر (رض) کے دروازے پر آئے دستک دی۔ آپ گھبرا کر باہر نکلے اور گھبراہٹ میں پوچھا کہ فلاں قبیلے نے حملہ کردیا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں، اس سے بے بھی بڑی بات ہوگئی۔ پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر (رض) کا دل بیٹھ گیا۔ ان کی پریشانی دوگونہ تھی۔ ایک تو پریشانی کا سبب وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے لیے تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر میں خدانہ کرے ایسی کیا بات ہوگئی ہے جب کہ وہ گھر پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی بیویوں کو طلاق دینے پر مجبور ہوگئے۔ اس سے دشمن فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور مسلمانوں کے معاشرے میں نہایت پریشان کن صورتحال پیدا ہوسکتی ہے۔ اور دوسرا پریشانی کا سبب یہ تھا کہ آپ (رض) کی صاحبزادی حضرت حفصہ (رض) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نکاح میں تھیں۔ صبح حضرت عمر (رض) مسجد میں پہنچے تو لوگوں کو اس صدمے سے نڈھال پایا۔ ہر آدمی یہی سمجھتا تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ آپ (رض) پریشانی میں باہر نکلے معلوم ہوا کہ گھر کے اوپر کے کمرے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف فرما ہیں۔ سیڑھی کے پاس ایک لڑکا دربان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آپ (

رض) نے اس سے کہا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت طلب کرو میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پھر مسجد میں جا بیٹھے۔ چین نہ آیا کچھ دیر کے بعد لوٹ کر آئے اور پھر اجازت مانگی اور نہ ملی۔ تیسری دفعہ پھر حاضر ہوئے اور بلند آواز میں پکار کر کہا کہ حضور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں حفصہ (رض) کی سفارش کے لیے آیا ہوں تو آپ مجھے حکم دیجیے میں اس کا سر اتار کر حاضر کر دیتا ہوں۔ تب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اجازت دی۔ حضرت عمر (رض) نے بڑے ادب سے جا کر پوچھا کہ کیا جناب نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہایت خوش ہوئے اور مسلمانوں کو آکر اطلاع دی کہ تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اس سے تمام اہل مسجد کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس ایک بات سے اندازہ کیجیے کہ بلا تحقیق بات کے پھیلا دینے سے کتنے بڑے حادثے پیش آسکتے ہیں۔ اور جنگ کے زمانے میں تو اس کی خطرناکی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اس آیت کریمہ میں منافقین کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ جس طرح خوف کی باتیں لوگوں میں اڑاتے ہیں اسی طرح امن سے متعلق کوئی بات ہو تو اسے بھی بلا تحقیق لے اڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن ہمیشہ صرف ایسی افواہیں نہیں پھیلاتا جس سے قوم کے حوصلے توڑنا مقصود ہوتے ہیں بلکہ وہ اس طرح کی افواہیں بھی اڑاتا ہے جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ حالات چاہے جتنے بھی نامساعد ہیں لیکن وہ مسلمانوں میں یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں جنگ کا دور دور تک کوئی امکان نہیں اور ہماری فوج ایسی ناقابل تسخیر ہو چکی ہے کہ کسی دشمن کو کبھی ہماری سرحدوں پر پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ وہ ہماری اسلحی برتری اور ہماری فوجی تربیت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس قوم سے ٹکر لینا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو سلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور پھر اندر ہی اندر دشمن کے ایجنٹ اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پتہ اس وقت چلتا ہے جب اس سوئی ہوئی قوم پر رات کی تاریکی میں دشمن وار کر دیتا ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں بھی جب کہ ہر چہار طرف خطرات اٹڈ رہے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو آج کی طرح مسلمانوں کو سلائے رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ہر طرف خیریت کی افواہیں اڑاتے تھے اور جو لوگ خطرات کی بات کرتے تھے ان کو دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جاتا تھا۔ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا کہ افواہ خوف کی ہو یا امن کی جب بھی ایسی کوئی بات تمہارے پاس پہنچے تو تمہیں منافقین کی طرح اسے پھیلانے کے بجائے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ کر صورت حال عرض کرنی چاہیے اور اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مصروفیت کے باعث ان تک نہ پہنچ سکو تو پھر ان لوگوں تک ایسی باتوں کو پہنچاؤ جن کے سپرد ایسے معاملات کیے گئے ہوں۔ جنھیں قرآن کریم کی زبان میں "اولوالامر" کہا گیا ہے۔ (اور ہم سورۃ النسآء آیت نمبر ۵۹ کی تشریح میں اولوالامر کے مفہوم کی وضاحت کر چکے ہیں) جن میں علماء، فقہاء اور قضاۃ بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جن کے سپرد انتظامی ذمہ داریاں ہیں۔ عہد نبوت اور عہد صحابہ میں چونکہ دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں تھی اس لیے انتظامی ذمہ داریاں بھی انہی لوگوں کے سپرد کی جاتی تھی جو علوم اسلامیہ سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ البتہ ایک بات جو ترجیح کے لائق تھی اور جس کو بطور خاص اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "تمہیں اولوالامر میں سے ان لوگوں کے پاس ایسے معاملات کو لے کر جانا چاہیے جنھیں اللہ نے استنباط کی صلاحیت سے بہرہ ور فرمایا ہے" استنباط کا معنی کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا ہے۔ پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی بات کی تہہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت

پانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ایسے نازک معاملات کسی کتابی آدمی کے پاس لے جانے سے فائدہ ہوتا ہے اور نہ ایسے آدمی کے پاس جو انتظامی صلاحیت تو رکھتا ہو لیکن بات کی تہہ تک اتر کر حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت سے تہی دامن ہو۔ اس کے لیے علم بھی درکار ہوتا ہے اور تجربہ بھی اور بطور خاص خداداد صلاحیت بھی۔ ایسے لوگوں کے پاس جب اس طرح کے معاملات پہنچتے ہیں تو وہ غور و فکر کے بعد معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ پھیلایا جارہا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے اور پھیلانے سے مقصود کیا ہے اور اس کے پیچھے کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ مختلف مصادر سے ڈانڈے ملانے کے بعد اندازہ ہو جاتا ہے کہ بات کی اصل حقیقت کیا ہے۔

فضل اللہ کا مفہوم

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ الخ اس کا ایک مفہوم تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین افواہ سازی اور افواہوں کی اشاعت میں اس حد تک سرگرم ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے پوری طرح اپنے کارندے ان کے ساتھ لگا رکھے ہیں اور ان کے دل و دماغ کو پوری طرح آلہ کار بنالیا ہے۔ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان کے پراپیگنڈے کی شدت کو دیکھتے ہوئے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ تم اس کار شیطان کا حصہ بن جاتے اور جو کچھ منافقین چاہتے ہیں ان کے اثرات کو تم بھی قبول کرنے لگتے۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد ایمان میں ثابت قدمی اور اس کے تقاضوں پر عمل یہ اللہ کا وہ فضل و کرم ہے جس کے نتیجے میں ایک مومن میں خاص مزاج پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کا کوئی وار بھی اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ اس کا ایمان ایک ایسا پیمانہ فکر بن جاتا ہے جس سے وہ ہر بات کو بڑی آسانی سے اندازہ کر کے جانچ لیتا ہے۔ اور اس کی ایمانی دانش بڑی آسانی سے فیصلہ کر لیتی ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ شیطان کی طرف سے ہے یا اس کی کوئی حقیقت بھی ہے۔ اس مزاج اور اس دانش کا نصیب ہونا اللہ کے رسول کی دعوت کی قبولیت اور پروردگار کے فضل و احسان کا نتیجہ ہے۔ اگر تم اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اتباع میں کامل نہ ہوتے تو یقینا تمہیں یہ دولت نہ ملتی اور تم اللہ کے فضل و کرم کے مستحق نہ ٹھہرتے اور پھر اس بات کا اندیشہ تھا کہ تم بھی منافقین کی طرح شیطان کے اتباع میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے منافقین کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

فوائد

1: یعنی ضعیف مسلمانوں کے پاس جن میں ابھی سمجھ بوجھ کامل نہیں، سیدھے سادے اور نیک ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ کونسی خبر اشاعت کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں۔ ہر بات سن کر لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر خبر پھیلا دینا بھی فساد کا سبب بن جاتا ہے۔

2: ان سے مراد اہل علم صحابہ ہیں جیسے خلفاء راشدین اور عبداللہ اب عباس وغیر ہم (رض) جو علم کے ساتھ سمجھ بھی رکھتے تھے۔

3: معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو مجتہدین پر پیش کرو اور ان سے سمجھ کر عمل کرو۔ خود اپنی رائے پر نہ اڑو ورنہ گمراہ ہو گے کیونکہ قرآن و حدیث ان امن و خوف کی باتوں سے زیادہ اہم ہے۔ جب ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ اولوالامر علماء پر پیش کرو تو یہ آیات و حدیث بھی پیش کرو۔

4: اس سے معلوم ہوا کہ کوئی صحابی گمراہ نہیں۔ کسی نے کسی وقت شیطان کی پیروی نہیں کی۔ سب اللہ کے فضل سے شیطان سے محفوظ ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام صحابہ یکساں درجہ والے نہیں بعض بہت ہی استقامت والے ہیں۔ بعض ان کے بعد ہیں۔

آیت مبارکہ:

فَقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْاؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا

لغۃ القرآن: [فَقَاتِلْ : پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنگ کریں] [فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : اللہ کی راہ میں] [لاَ تُکَلَّفُ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پابند نہیں کیا جاتا] [اِلاَّ : سوائے] [نَفْسَکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کے] [وَ : اور] [حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکسائیں مؤمنوں کو] [عَسَی : قریب ہے] [اللّٰہُ : اللہ] [اَنْ : کہ] [یَّکُفَّ : وہ روک دے] [بَاْسَ الَّذِیْنَ : ان لوگوں کی جنگ کو جنہوں نے] [کَفَرُوْا : کفر کیا] [وَاللّٰہُ : اور اللہ] [اَشَدُّ : زیادہ شدید ہے] [بَاْسًا : سختی کرنے میں] [وَّ : اور] [اَشَدُّ : زیادہ شدید ہے] [تَنْکِیْلاً : عبرت ناک سزا دینے میں]

مترادفات: [فَ قَاتِلْ : قتل ، قاتل ، قتال ، مقتول ، مقتل ۔][فِيْ : فی الفور ، فی الحال ، فی الحقیقت ۔][تُکَلَّفُ : تکلیف دہ ، تکالیف ، مکلف ، تکلف ۔][نَفْسَ کَ : نفس ، نفسانفسی ، نفسانی خواہشات ، ۔][الْمُؤْمِنِیْنَ : امن ، ایمان ، مومن ۔][کَفَرُوْا : کفر ، کافر ، کفار ۔][اَشَدُّ : اشد ضرورت ، شدید ، شدت ۔]

ترجمہ: پس (اے محبوب !) آپ اللہ کی راہ میں جہاد کیجئے، آپ کو اپنی جان کے سوا (کسی اور کے لئے) ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا اور آپ

مسلمانوں کو (جہاد کے لئے) اُبھاریں، عجب نہیں کہ اللہ کافروں کا جنگی زور توڑ دے، اور اللہ گرفت میں (بھی) بہت سخت ہے اور سزا دینے میں (بھی) بہت سخت

تشریح:

شان نزول:

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بدر صغریٰ (چھوٹا غزوہ بدر، اس) کی جنگ جو ابو سفیان سے طے تھی جب اس کا وقت آ پہنچا تو سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہاں جانے کے لیے لوگوں کو دعوت دی، بعض لوگوں پر یہ گراں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا کہ آپ ﷺ جہاد نہ چھوڑیں اگرچہ تنہا ہوں اللہ عَزَّوَجَلَّ آپ ﷺ کا ناصر و مددگار ہے، اللہ عَزَّوَجَلَّ کا وعدہ سچا ہے۔ یہ حکم پا کر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر صغریٰ کی جنگ کے لیے روانہ ہوئے اور صرف ستّر سوار ہمراہ تھے۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۸۴، ص ۲۴۲)

چنانچہ فرمایا گیا کہ آپ ﷺ جہاد کیلئے جائیں اور آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی خواہ کوئی آپ ﷺ کا ساتھ دے یا نہ دے اور اگرچہ آپ ﷺ اکیلے رہ جائیں، ہاں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو اور بس۔ پھر اللہ عَزَّوَجَلَّ نے فرمایا کہ اللہ کریم کافروں کی سختی کو روک دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر سے کفار ایسے مرعوب ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں میدان میں نہ آ سکے۔ (صراط)

سیدُ المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شجاعت

اس آیت سے ثابت ہوا کہ تاجدار مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شجاعت میں سب سے اعلیٰ ہیں کہ آپ ﷺ کو تنہا کفار کے مقابل تشریف لے جانے کا حکم ہوا اور آپ ﷺ آمادہ ہوگئے۔

حضرت انس بن مالک (رض) فرماتے ہیں: حبیبِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام لوگوں سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ (مسلم، کتاب الفضائل، باب فی شجاعۃ النبی (علیہ السلام) وتقدّمہ للحرب، ص ۱۲۶۲، الحدیث: ۴۸ (۲۳۰۷))

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ بہادر اور طاقتور، سخی اور پسندیدہ کسی کو نہیں دیکھا۔

(الشفاء القسم الاول، الباب الثانی، فصل واما الشجاعۃ والنجدۃ، ص ۱۱۶، الجزء الاول)

حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بے مثل شجاعت و بہادری کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی المرتضیٰ (رض) جیسے بہادر صحابی کا یہ قول ہے: جب لڑائی خوب گرم ہو جاتی تھی اور جنگ کی شدت دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کی آنکھیں پتھرا کر سرخ پڑ جایا کرتی تھیں اس وقت میں ہم لوگ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پہلو میں کھڑے ہو کر اپنا بچاؤ کرتے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سب لوگوں سے زیادہ آگے بڑھ کر اور دشمنوں کے بالکل قریب پہنچ کر جنگ فرماتے تھے اور ہم لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر وہ شخص شمار کیا جاتا تھا جو جنگ میں حضور سید المُرسَلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریب رہ کر دشمنوں سے لڑتا تھا۔

(الشفاء، القسم الاول، الباب الثانی، فصل واما الشجاعة والنجدة، ص ۱۱۶، الجزء الاول)

غزوہ حنین کے دن جب ابتداءً مسلمان کفار کے حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے میدان جنگ سے فرار ہوئے تو ایسے نازک وقت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے بلکہ اپنے سفید خچر پر سوار دشمنوں کی جانب پیش قدمی فرماتے رہے۔ (مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب فی غزوۃ حنین، ص ۹۷۸، الحدیث: ۷۶ (۱۷۷۵))

غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے ایک ایسی چٹان ظاہر ہوئی جو کسی سے نہ ٹوٹ سکی، سرکار کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وار سے وہ چٹان پارہ پارہ ہو گئی۔

(نسائی، کتاب الجہاد، غزوۃ الترک والحبشۃ، ص ۵۱۷، الحدیث: ۳۱۷۳)

ایک رات اہل مدینہ ایک خوفناک آواز سن کر دہشت زدہ ہوگئے تو اس آواز کی سمت سب سے پہلے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے گئے۔

(بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخائ۔۔ الخ، ۴/۱۰۸، الحدیث: ۶۰۳۳)

اعلیٰ حضرت (رح) فرماتے ہیں:

تم ہو حفیظ ومغیث کیا ہے وہ دشمن خبیث

تم ہو تو پھر خوف کیا تم پہ کروڑوں درود

بیٹھ رہنے والوں سے مجاہد افضل ہے۔ لہٰذا افضل کام کو اپنانے اور جہاد کو مضبوط رکھنے کے لیے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو چوکس ومستعد رکھ کر مسلمانوں کو ہر دم قتال کے لیے آمادہ و تیار رکھیں۔

مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے جہادی خطاب کا آغاز یوں کیا تھا کہ اپنے بچاؤ کے لیے ہر وقت اسلحہ پکڑے رکھو اور جنگی حالات کے مطابق گوریلا جنگ کرو یا پورے کے پورے دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ پھر منافقوں کی عادات کا ذکر کیا کہ وہ ابن الوقت اور اپنے مفاد کے بندے اور تمہارے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا اللہ کی راہ میں تمہیں لڑنا چاہیے۔ چاہے کمزور ہو یا طاقتور اور جو بھی رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرے گا حقیقتاً وہ اللہ تعالیٰ کا تابع فرماں اور مطیع ہو گا۔ اب رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو براہ راست اللہ کے راستے میں لڑنے کا یہ کہہ کر حکم دیا جارہا ہے کہ آپ ﷺ مومنوں کو قتال کے لیے ترغیب دیں اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر تنہا نکلنا پڑے تو نکلیں۔ گویا کہ پہلے مجاہدین کو خطاب تھا اور اب ان کے کمانڈر کو حکم دیا ہے پھر تسلی اور خوشخبری دی ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کفار کو بے بس کر دے گا۔ وقت آنے والا ہے کہ جب منافقوں کی سازشیں اور کفار کی شرارتیں دم توڑ جائیں گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی طاقت والا اور لڑنے میں جری نہیں ہو سکتا۔

دشمن کی جارحیت سے بچنے کے لیے یہ بنیادی اصول ہے کہ قوم کو ہر دم چوکس، مستعد اور چاک وچوبند رکھنے کے لیے قوم کے ذمہ دار اور فوج کے عہدہ دار نمونے کے طور پر اپنے آپ کو مرنے مارنے کے لیے تیار رکھیں۔ تب جا کر فوج اور قوم کے ایک ایک فرد میں دشمن کے خلاف صف آراء ہونے کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ولولہ انگیز جذبات کا یوں اظہار فرمایا:

(عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَة (رض) قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُوْلُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا تَطِيْبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنِّيْ وَلَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُوْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ أَنِّيْ أُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ)

[رواہ البخاری : کتاب الجھاد، باب تمنی الشھادۃ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ایمانداروں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ وہ مجھ سے پیچھے رہیں اور میرے پاس اتنی سواریاں نہیں کہ میں ان کو سوار کروں تو میں کسی غزوہ سے بھی پیچھے نہ رہتا۔ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستے میں شہید کر دیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں پھر زندہ کر دیا جاؤں پھر شہید ہو جاؤں۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا يُكْلَمُ أَحَدٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُّكْلَمُ فِيْ سَبِيْلِهٖ إِلَّا جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجُرْحُهٗ يَثْعَبُ اللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَالرِّيْحُ رِيْحُ مِسْكٍ) [رواہ مسلم : کتاب الإمارۃ،باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللہ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اللہ کے راستے میں زخمی ہو جاتا ہے اور یہ اللہ جانتا ہے کہ حقیقتاً کون اس کے راستے میں زخمی ہوا تو وہ زخمی قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا ' اس کا رنگ خون جیسا ہوگا مگر اس کی خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔ "

(عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ) [رواہ مسلم : کتاب الإمارۃ، باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے نہ تو جہاد کیا اور نہ ہی دل میں جہاد کا خیال لایا تو وہ منافقت کی ایک قسم پر فوت ہوا۔ "

مسائل

۱۔ مسلمانوں کے سربراہ کو لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنا چاہیے۔

۲۔ مسلمان مر مٹنے کے لیے تیار ہو جائیں تو اللہ کافروں کا زور توڑ ڈالے گا۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

لغۃ القرآن: [مَنْ يَّشْفَعْ : جو سفارش کرتا ہے] [شَفَاعَةً حَسَنَةً : کوئی اچھی سفارش] [يَّكُنْ : تو ہوجاتا ہے] [لَّهٗ: اس کے لیے] [نَصِيْبٌ: ایک حصہ] [مِّنْهَا : اس میں سے] [وَمَنْ يَّشْفَعْ : اور جو سفارش کرتا ہے] [شَفَاعَةً سَيِّئَةً : کوئی بری سفارش] [يَّكُنْ : تو ہوجاتی ہے] [لَّهٗ: اس کے لیے] [كِفْلٌ: ایک ذمہ داری] [مِّنْهَا : اس میں سے] [وَكَانَ اللّٰهُ : اور اللہ ہے] [عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز پر] [مُّقِيْتًا : قدرت رکھنے والا

مترادفات: [يَّشْفَعْ : شفاعت ، شافع محشر ۔][حَسَنَةً : احسان ، محسن ، حسنات ۔][نَصِيْبٌ: خوش نصیب ، باادب بانصیب ۔][كِفْلٌ: کفیل بننا ، کفالت کرنا ۔][سَيِّئَةً : علمائے سوئ، سوء ادب ، سوء ظن ۔][عَلٰي : علیحدہ ، علی الاعلان ، علی العموم ۔][كُلِّ : کل کائنات ، کل نمبر ، کلی طور پر ۔][شَيْءٍ : شے اشیائ ۔]

ترجمہ: جو شخص کوئی نیک سفارش کرے تو اس کے لیے اس (کے ثواب) سے حصہ (مقرر) ہے، اور جو کوئی بری سفارش کرے تو اس کے لیے اس (کے گناہ) سے حصہ (مقرر) ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح:

جہاد کے لیے مسلمانوں کو ابھارنا اور دین کی نشر و اشاعت کی تبلیغ کرنا بھی جہاد ہے

جہاد کے دوران پیدا ہونے والے ضمنی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے جہاد کی ترغیب اور دین کی تبلیغ کو اچھی سفارش اور اس کوشش کو جہاد کا حصہ شمار کیا ہے۔ کیونکہ ترغیب دلائے بغیر کوئی آدمی لڑنے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ترغیب اور تبلیغ کو قرآن مجید نے سورۃ الفرقان آیت ۵۲ میں جہاد کبیر قرار دیا ہے۔ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ افضل

ترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ [رواہ ابو داوٗد : کتاب الملاحم، باب الأمر والنھی] اسے یہاں سفارش کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور نیکی کی سفارش کرنے والے ہر شخص کو تسلی اور مسلسل ملنے والی جزائے خیر کی خوش خبری دی گئی ہے بشر طیکہ وہ خود بھی حتی المقدور اس پر عمل کرنے والا ہو۔ سفارش کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں۔ نیکی اور خیر کے کام کے لیے کسی کو آمادہ اور تیار کرنا ' اس کے مقابلے میں برائی کی سفارش اور اس کی ترغیب دینا۔ نیکی کی سفارش اور تبلیغ پر مسلسل اور برابر ثواب ملتا رہتا ہے جبکہ برائی پر آمادہ کرنا یا اس کی سفارش اور ترغیب دینے والا اس کے گناہ میں حصہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

امام راغب یہاں شفاعت کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ای من انضم الی غیر وعاونہ وصار شفیعا فی الخیر والشر فعاونہ وقواہ وشارکہ فی نفعہ وضرہ۔ یعنی کسی اچھے یا برے کام میں کسی کے ساتھ اس طرح شریک ہو جانا کہ اس کی اعانت اور تقویت پر اپنا پورا زور صرف کر دے اور اس کام کے نتائج میں بھی اپنے آپ کو برابر شریک سمجھے۔ اس توضیح کے پیش نظر آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ جو شخص حق وصداقت کے علم بردار کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیتا ہے اور اپنا تن من دھن اس مقصد کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر دیتا ہے وہ ضرور اپنے قائد کی طرح اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔ اسی طرح جس نے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو باطل کے سرغنوں کے حوالہ کر دیا اور فسق وفجور کو فروغ دینے میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا تو وہ بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔ اس آیت کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ کسی مشکل میں کسی بھائی کی امداد کرنا اس کے حقوق کی بازیابی کی سعی کرنا، اس کو نفع پہنچانا اور اس سے کسی تکلیف کو دور کرنے میں کوشاں ہونا بشر طیکہ اس سے کسی غیر کی حق تلفی نہ ہو تو یہ اچھی سفارش ہے اور اس پر سفارش کرنے والے کو اجر ملے گا۔ اور اگر ایسی سفارش کی جس سے کسی کی حق تلفی ہوئی یا کسی پر ظلم ہوا تو یہ بری سفارش ہے اور سفارش کرنے والا گناہ گار ہوگا۔ (ضیاء)

شفاعت کا معنی اور اس کی اقسام

شفاعت لفظ شفع سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے ایک انسان دوسرے ضرورت مند انسان کے ساتھ مل جائے اور دونوں مل کر اس ضرورت کے متعلق سوال کریں ' اور یہاں پر مراد ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیں اور جو مسلمان آپ کی ترغیب سے جہاد کریں گے تو ان کی اس نیکی میں آپ کا بھی حصہ ہوگا ' یہ شفاعت حسنہ ہے ' اور شفاعت سیئہ یہ ہے کہ منافق اپنے بعض منافقوں کو جہاد میں شریک نہ کرنے کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شفاعت کرتے تھے کہ ان کو فلاں فلاں عذر ہے اور اس شفاعت سے جہاد میں شریک نہ ہونے کا گناہ دونوں کو ہوگا ان کو بھی جو شریک نہیں ہوئے اور ان کو بھی جنہوں نے ان کے لیے اس کی سفارش کی۔

اسی طرح کسی بھی نیک کام میں سفارش کرنا اچھی شفاعت ہے مثلاً کسی طالب علم کو دینی مدرسہ میں داخل کرنے کے لیے سفارش کرنا ' کسی ضرورت مند عالم دین کے لیے کسی تونگر سے سفارش کرنا کہ ان کی ضرورت کی کتابیں ان کو خرید کر دیں ' مسجد اور دینی مدرسہ بنوانے کے لیے سفارش کرنا ' کسی مجاہد کے لیے اسلحہ کے حصول میں سفارش کرنا ' کسی غریب لڑکی کی شادی کے لیے رشتہ یا جہیز کی سفارش کرنا ' کسی بے روزگار کے لیے ملازمت کی سفارش کرنا بشر طیکہ وہ وہ اس ملازمت کا اہل ہو ' اللہ کے حضور کسی مسلمان کے لیے دعا کرنا اس کی مغفرت چاہنا ' یہ سب اچھی سفارشیں ہیں ' اور بری سفارش یہ ہے کہ شراب خانہ کے پرمٹ کے لیے سفارش کی جائے ' سنیما بنانے کے لیے کسی سے سفارش کی جائے ' آلات موسیقی کی دکان کے لیے کسی سے سفارش کی جائے ' بینک اور انشورنس کمپنی میں ملازمت کے لیے سفارش کی جائے یا کسی نااہل اور غیر مستحق کے لیے سفارش کی جائے وغیرہ۔

نیکی کے کاموں میں شفاعت کے متعلق احادیث

حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جب کوئی سائل آتا یا آپ سے کوئی شخص حاجت طلب کرتا تو آپ فرماتے تم شفاعت کرو تمہیں اجر دیا جائے گا 'اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۱۴۳۲ 'صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ۲۶۲۷ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۱۳۲ 'سنن نسائی 'رقم الحدیث : ۲۵۵۶ 'سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۲۶۸۱ 'مسند احمد ج ۴ص ۴۰۰ '۴۰۳ '۴۰۹ '۴۰۹ 'سنن کبری للبیہقی ج ۸ص ۱۶۷ 'صحیح ابن حبان ج ۲ص ۵۳۱)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جو آپ سے سواری طلب کرتا تھا 'آپ ﷺ کے پاس اس وقت کوئی سواری نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے اس کی کسی اور شخص کی طرف رہنمائی کی اس شخص نے اس کو سواری دے دی 'اس سائل نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آکر اس کی خبر دی 'آپ ﷺ نے فرمایا نیکی کی رہنمائی کرنے والا بھی نیکی کرنے والے کی مثل ہے۔ (سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۲۶۶۹ 'صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ۱۸۹۳ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۱۲۹ 'مسند احمد 'رقم الحدیث : ۱۷۰۸۳ 'الادب المفرد 'رقم الحدیث : ۱۴۲)

کسی برے کام کے حصول کے لیے شفاعت کی ممانعت پر اس آیت میں دلیل ہے :

(آیت) " ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان "۔ (المائدہ : ۲)

ترجمہ : اور گناہ اور سرکشی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو '۔ (تبیان)

(عَنۡ اَبِیۡ ذَرٍّ قَالَ قُلۡتُ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! اِلَا تَسۡتَعۡمِلُنِیۡ قَالَ فَضَرَبَ بِیَدِہٖ عَلٰی مَنۡکِبِیۡ ثُمَّ قَالَ یَااَبَا ذَرٍّ ! اِنَّکَ ضَعِیۡفٌ وَاِنَّھَا اَمَانَۃٌ وَاِنَّھَا یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ خِزۡیٌ وَّنَدَامَۃٌ اِلَّا مَنۡ اَخَذَھَا بِحَقِّھَا وَاَدّٰی الَّذِیۡ عَلَیۡہِ فِیۡھَا) [رواہ مسلم : کتاب الامارۃ، باب کراھۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ]

" حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی اے اللہ کے رسول ! کیا آپ مجھے عامل یا عہدیدار نہیں بنائیں گے ؟ آپ نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا ابوذر ! آپ کمزور ہیں اور یہ عہدہ امانت ہے جو روز قیامت باعث ذلت اور ندامت ہوگا۔ بچے گا وہی جس نے اس کا حق ادا کیا اور اس کو فرض سمجھا۔ "

عَنۡ اَبِیۡ مُوۡسٰی (رض) قَالَ دَخَلۡتُ عَلَی النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَنَا وَرَجُلَانِ مِنۡ بَنِیۡ عَمِّیۡ فَقَالَ اَحَدُ الرَّجُلَیۡنِ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ اَمِّرۡنَا عَلٰی بَعۡضِ مَاوَلَّاکَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَقَالَ الۡاٰخَرُ مِثۡلَ ذٰلِکَ فَقَالَ اِنَّا لَا نُوَلِّیۡ عَلٰی ھٰذَا الۡعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیۡہِ)

[رواہ مسلم : کتاب الامارۃ، باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا]

" حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں اور بنو عمیق کے دو آدمی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے کہا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! اللہ تعالیٰ نے جو علاقے آپ کے سپرد کیے ہیں ان پر ہمیں بھی والی بنائیں دوسرے نے بھی عہدے کا مطالبہ کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ہم یہ عہدے کسی مطالبہ کرنے اور اس کا لالچ رکھنے والے کو نہیں سونپتے۔ "

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

(مَنۡ دَلَّ عَلٰی خَیۡرٍ فَلَہٗ مِثۡلُ اَجۡرِ فَاعِلِہٖ) [رواہ مسلم : کتاب الامارۃ، باب فضل إعانۃ الغازی۔۔۔]

"جس نے کسی نیکی کے کام کی رہنمائی کی اس کو نیکی کرنے والے کے برابر اجر وثواب ملے گا۔" (فہم)

مسائل

۱۔ نیکی کی سفارش اور تبلیغ کرنے والے کو مسلسل اور برابر حصہ ملتا رہتا ہے۔

۲۔ برائی کی سفارش اور اشاعت کرنے والا برائی میں برابر کا ذمہ دار ہوگا۔

آیت مبارکہ:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب بھی] [حُيِّيْتُمْ : تم لوگوں کو سلام کیا جائے] [بِتَحِيَّةٍ : کوئی سلام] [فَحَيُّوْا : تو تم سلام کرو] [بِاَحْسَنَ مِنْہَآ : اس سے زیادہ اچھے سے] [اَوْرُدُّوْہَا : یا لوٹا دو اس کو] [اِنَّ اللّٰهَ : یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز پر] [حَسِيْبًا : حساب لینے والا]

مترادفات: [رُدُّوْ هَا : رد ، مردود ، تردید۔][حَسِيْبًا : حساب وکتاب ، محاسب ، محاسبہ ۔]

ترجمہ: اور جب (کسی لفظ) سلام کے ذریعے تمہاری تکریم کی جائے تو تم (جواب میں) اس سے بہتر (لفظ کے ساتھ) سلام پیش کیا کرو یا (کم از کم) وہی (الفاظ جواب میں) لوٹا دیا کرو، بیشک اللہ ہر چیز پر حساب لینے والا ہے۔

تشریح:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اور جب تم کو کسی لفظ سے سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر لفظ کے ساتھ سلام کرو یا اسی لفظ کو لوٹادو ' بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ (النساء : ۸٦)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا تھا اور جہاد کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ جب فریق مخالف صلح کرنے پر تیار ہو تو تم بھی اس سے صلح کرلو 'قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "وان جنحوا للسلم فاجنح لھا"۔ (الانفال : ٦١)

ترجمہ : اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوں۔

اسی طرح جب کوئی شخص سلام کرے تو اس کے سلام کا عمدہ طریقہ سے جواب دینا چاہیے ورنہ کم از کم اسی لفظ سے سلام کا جواب دیا جائے۔ مثلا السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃاللہ کہے اور اسلام علیکم ورحمۃاللہ کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃاللہ وبرکاتہ کہے۔

اسلام میں سلام کے مقرر کردہ طریقہ کی افضلیت

عیسائیوں کے سلام کا طریقہ ہے منہ پر ہاتھ رکھا جائے (آج کل پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں) یہودی ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں 'مجوسی جھک کر تعظیم کرتے ہیں عرب کہتے ہیں حیاک اللہ (اللہ تمہیں زندہ رکھے) اور مسلمانوں کا سلام یہ ہے کہ کہیں السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ 'اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام طریقوں سے افضل ہے کیونکہ سلام کرنے والا مخاطب کو یہ دعا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آفتوں 'بلاؤں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے 'نیز جب کوئی شخص کسی کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کو ضرر اور خوف سے مامون اور محفوظ رہنے کی بشارت دیتا ہے ' مکمل سلام یہ ہے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ 'اور تشہد میں بھی اتنا ہی سلام ہے 'جب کوئی شخص فقط السلام علیکم کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃاللہ کہنا چاہیے اور اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃاللہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃاللہ وبرکاتہ کہے اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃاللہ وبرکاتہ کہے 'اور بعض روایات میں ومغفرتہ کا اضافہ بھی ہے۔ (سنن ابوداؤد : ٥١٩٦) سلام کی ابتداء کرنے والا پہلے لفظ السلام کہتا ہے اور جواب دینے والا وعلیکم السلام کہہ کر بعد میں لفظ السلام کہتا ہے 'اس میں نکتہ یہ ہے کہ سلام اللہ کا نام ہے اور مجلس کی ابتداء بھی اللہ کے نام سے ہو اور انتہاء بھی اللہ کے نام پر ہو 'اور ابتداء بھی سلامتی کی دعا سے ہو اور انتہاء بھی سلامتی کی دعا پر ہو۔

مصافحہ اور معانقہ کی فضیلت اور اجر وثواب کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ اسلام کا کونسا وصف سب سے بہتر ہے آپ نے فرمایا : تم کھانا کھلاؤ اور ہر (مسلمان) کو سلام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہیں۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ١٢ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ٥١٩٤)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں داخل نہیں ہو گے 'اور جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرو گے تمہارا ایمان (کامل) نہیں ہوگا 'کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس کے کرنے کے بعد تم ایک دوسرے سے محبت کرو؟ ایک دوسرے کو بکثرت سلام کیا کرو۔ (صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ٥٤ 'سنن ابوداؤد 'رقم

الحدیث : ۵۱۹۳ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۲۶۹۷ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث : ۳۶۹۲ 'الادب المفرد 'رقم الحدیث : ۲۶۹ 'کشف الاستار عن زوائد البزار 'رقم الحدیث : ۲۰۰۲ 'شعب الایمان 'رقم الحدیث : ۸۷۴۵)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔ (سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۱۹۷ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۲۶۹۴ 'صحیح ابن حبان 'رقم الحدیث : ۹۱۱)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہوتے اگر ہم کسی درخت کی وجہ سے جدا ہو کر پھر مل جاتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ (المعجم الاوسط 'رقم الحدیث : ۷۹۸۳)

حضرت عمران بن الحصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: السلام علیکم آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دس (نیکیاں) 'پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ 'آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا پھر آپ نے فرمایا (تیس) نیکیاں 'امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے 'امام بیہقی نے بھی اس کو حسن کہا ہے 'امام ابوداؤد نے سہل سے مرفوعا روایت کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے: پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ، آپ نے فرمایا چالیس (نیکیاں) (سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۱۹۵ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۲۶۹۸ 'کتاب الآداب للبیہقی 'رقم الحدیث : ۲۸۰ 'الادب المفرد "رقم الحدیث : ۹۸۶ 'عمل الیوم واللیلۃ للنسائی 'رقم الحدیث : ۳۳۹)

حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بھی دو مسلمان ملاقات کے بعد مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے الگ ہونے سے پہلے ان کو بخش دیا جاتا ہے۔ (سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۲۱۲ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۲۷۳۶ ' سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث : ۳۷۰۳ 'کشف الاستار "رقم الحدیث : ۲۰۰۴)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے تو معانقہ کرتے۔ حافظ منذری نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۴۲۳ 'المعجم الاوسط ' رقم الحدیث : ۹۷)

حماد بن زید نے ابن المبارک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا

حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے تشہد کی تعلیم دی درآں حالیکہ میری دونوں ہتھیلیاں آپ کی دونوں ہتھیلیوں میں تھیں (صحیح البخاری کتاب الاستیذان 'باب ۲۸ 'الاخذ بالیدین 'رقم الحدیث : ۶۲۶۵)

حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملاقات کرے تو اس کو سلام کرے 'اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا پتھر حائل ہو جائے اور پھر ملاقات ہو تو دوبارہ سلام کرے (سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۵۲۰۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو شخص سلام کرنے میں ابتداء کرے وہ تکبر سے بری ہو جاتا ہے۔ (شعب الایمان 'رقم الحدیث : ۸۷۸۶)

کن لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سوار ' پیدل کو سلام کرے اور پیدل بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور کم لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔ (صحیح بخاری ' رقم الحدیث: ۶۲۳۲ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۱۶۰ ' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۱۹۸ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۷۱۲ ' الادب المفرد ' رقم الحدیث: ۹۹۵ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث: ۱۹۴۴۵)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھا آپ ﷺ کا بچوں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۶۲۴۷ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۱۶۸ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۵۲۰۲ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۷۰۵ ' عمل الیوم واللیلۃ للنسائی ' رقم الحدیث: ۳۳۱ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۳۷۰۰ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث: ۴۵۹ ' حلیۃ الاولیاء: ج ۶ ص ۲۹۱)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے ' اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے پر اور قلیل ' کثیر پر (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۶۲۳۱ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۷۱۳ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۵۱۹۸)

اسماء بنت یزید (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہم عورتوں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے ہم کو سلام کیا۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۵۲۰۴ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۶۹۷ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۳۷۰۱ ' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۷ ' المعجم الکبیر ' رقم الحدیث: ۲۴۸۶)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے میرے بیٹے جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اس سے تم پر برکت ہوگی اور تمہارے گھر والوں پر برکت ہوگی۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۰۷) حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کلام سے پہلے سلام کرو ' امام ترمذی نے کہا یہ حدیث منکر ہے (سنن ترمذی: ۲۶۹۸)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم کو اہل کتاب سلام کریں تو تم کہو وعلیکم (صحیح مسلم: ۲۱۶۳ ' سنن ابوداؤد ' ۵۲۰۷)

جن مواقع پر سلام نہیں کرنا چاہیے

(۱) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے یہودی کو سلام کی ابتداء نہ کرو ' امام ابوحنیفہ نے کہا ہے اس کو خط میں بھی سلام نہ کہو ' امام ابویوسف نے کہا نہ ان کو سلام کرو نہ ان سے مصافحہ کرو ' اور جب تم ان پر داخل ہو تو کہو " السلام علی من اتبع الھدی " اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت ان کو ابتداء سلام کرنا جائز ہے (مثلاً کسی کا افسر کافر یا بدمذہب ہو تو اس کو اس کے دائیں بائیں فرشتوں کی نیت کرکے سلام کرے) اور جب وہ سلام کریں تو وعلیک کہنا چاہیے حسن نے کہا ہے کہ کافر کو وعلیکم السلام کہنا تو جائز ہے لیکن وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ مغفرت کی دعا ہے اور کافر کے لیے مغفرت کی دعا جائز نہیں ' شعبی نے ایک نصرانی کے جواب میں کہا وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ ' ان پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے کہا کیا یہ اللہ کی رحمت میں جی نہیں رہا!

(۲) جب جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو تو حاضرین کو سلام نہ کرے کیونکہ لوگ امام کا خطبہ سننے میں مشغول ہیں۔
(۳) اگر حمام میں لوگ برہنہ نہا رہے ہوں تو ان کو سلام نہ کرے اور اگر ازار باندھ کر نہا رہے ہوں تو ان کو سلام کر سکتا ہے۔
(۴) جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو ' روایت حدیث کر رہا ہو ' یا مذاکرہ علم میں مشغول ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔
(۵) جو شخص اذان اور اقامت میں مشغول ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔
(۶) امام ابو یوسف نے کہا جو شخص چوسر یا شطرنج کھیل رہا ہو یا کبوتر اڑا رہا ہو ' یا کسی معصیت میں مبتلا ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔
(۷) جو شخص قضاء حاجت میں مشغول ہو اس کو سلام نہ کرے۔
(۸) جو شخص گھر میں داخل ہو تو اپنی بیوی کو سلام کرے اگر اس ساتھ کوئی اجنبی عورت ہو تو اس کو سلام نہ کرے۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۸۰)

سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے

اگر جماعت مسلمین کو سلام کیا تو ہر ایک پر جواب دینا فرض کفایہ ہے لیکن جب کسی ایک نے جواب دے دیا تو باقیوں سے جواب دینے کا فرض ساقط ہو جائے گا 'فساق اور فجار کو پہلے سلام نہیں کرنا چاہیے اگر کوئی اجنبی عورت کسی مرد کو سلام کرے تو اگر بوڑھی ہو تو اس کا جواب دینا چاہیے اور اگر جوان ہو تو اس کے سلام کا جواب نہ دے۔ (تبیان)

تحیۃ باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا اصلی معنی زندگی کی درازی کی دعا دینا ہے۔ واصل التحیۃ الدعاء بالحیاۃ (قرطبیؔ) اور اس کا معنی ملک بھی ہے التحیات للہ میں یہی معنی ملحوظ ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں تحیۃ سے مراد سلام کہنا ہے۔ سلام دینا حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پسندیدہ سنت ہے لیکن اس کا جواب دینا فرض ہے۔ سلام کا جواب دینے کے قرآن حکیم نے دو طریقے سکھائے ہیں یا تو وہی الفاظ دوہرا دو جن سے تمہیں سلام کہا گیا ہے یا ایسے الفاظ کا اضافہ کرو جو محبت و تکریم پر دلالت کرتے ہوں۔ (ضیاء)

فرمایا جو تمہیں ہدیہ دے تو تم بھی اسے اس سے بہتر یا اس جیسا تحفہ دو۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی پر محاسب و نگہبان اور وہی معبود برحق ہے۔ جو تمہیں دنیا میں پیار، محبت اور توحید کی بنیاد پر اکٹھا رہنے کا حکم دیتا ہے۔ وہی قیامت کے دن تمہیں اکٹھا کرے گا۔ لوگوں کو جمع کرنے اور قیامت کے آنے میں ذرہ برابر شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہر فرمان سچا اور اس سے بڑھ کر کسی کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا سچ سنو، اسے قبول کرو اور اس پر قائم ہو جاؤ۔

یہاں تحفہ سے مراد مفسرین نے دو قسم کے تحائف لیے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عام تحائف کے بارے میں فرمایا کہ مسلمانوں! ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو کیونکہ اس سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔
[موطا امام مالک: کتاب الجامع، باب ماجاء فی المھاجرۃ]

لیکن تحائف کے تبادلہ میں ایک بات نہایت ضروری ہے کہ اس میں تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ تکلف ایک دوسرے کے لیے بوجھ کا باعث بنتا ہے جس کی وجہ سے یہ سلسلہ دیرپا نہیں چلتا۔ ایسے تحائف میں نمائش کا عنصر غالب اور بسا اوقات فخر و غرور پیدا ہوتا ہے۔ جس سے محبت کی بجائے نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مسلمان کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرنے کا حکم اور تکلف سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں مفسرین نے تحفہ سے مراد ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنا بھی لیا ہے۔ ایک دوسرے کو سلام کہنے کی ابتداء حضرت آدم (علیہ السلام) سے ہوئی ہے۔

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا۔ جونہی آدم (علیہ السلام) نے آنکھیں کھولیں اور اپنے وجود میں جنبش محسوس کی تو اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے آدم وہ ملائکہ کا ایک گروہ بیٹھا ہوا ہے 'تم جاؤ اور انھیں سلام کرو۔ جواب میں ملائکہ جو الفاظ استعمال کریں گے وہی تیری اولاد کے لیے ملاقات کا طریقہ اور اسلوب مقرر کیا جائے گا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کے جواب میں فرشتوں نے "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" کے الفاظ کہے" [رواہ البخاری : اِحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم وذریتہ]

اس گھڑی سے لے کر ملاقات کا یہی طریقہ پسند کیا گیا۔ اس لیے ہمیں ادھر ادھر کے الفاظ کہنے کے بجائے فطری اور طبعی طریقے کو اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں اس قدر جامعیت ہے کہ ایک دوسرے کے لیے ہر لحاظ سے خیر سگالی کے جذبات، خیالات اور دعائیہ کلمات کا اظہار ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب اور سوسائٹی میں ملاقات کے وقت اس قدر سلامتی کے جامع الفاظ اور جذبات نہیں ہوتے۔

دنیا میں ہر قوم کے ایک دوسرے سے ملنے کے کچھ آداب ہیں۔ جن سے باہم خیر سگالی اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے مقابلے میں ہر قوم کے آداب میں وقتی اور جزوی جذبات کا اظہار ہے۔ ہندو ملنے کے وقت پرنام یعنی ہاتھ جوڑتے ہیں، انگریز گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کے الفاظ کہتے ہیں، مجوسی صرف جھکتے ہیں، یہودی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہیں، عیسائی منہ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے عرب صباح الخیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جب کہ اسلام کی تہذیب یہ ہے کہ ملاقات کے وقت "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا جائے۔ یہ کلمات پورے دین کے ترجمان اور ہر لمحہ سلامتی کی دعا ہے اور جنتی جنت میں ایک دوسرے سے انہی کلمات کے ساتھ ملاقات کریں گے اور جنت میں ہر جانب سے سلامتی کی صدائیں بلند ہوں گی۔ [یونس : ۱۰]

اس حقیقت کی ترجمانی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے الفاظ سے اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے سے ملاقات کرے تو اس کے چہرے پر تبسم اور مسکراہٹ ہونی چاہیے اور اس کو انسانی جسم کی سخاوت قرار دیا:

(اِنْ تَلْقٰی اَخَاکَ بِوَجْہٍ طَلْقٍ) [رواہ مسلم : کتاب البر والصلہ، باب استحباب طلاقۃ الوجہ عند اللقاء]

"کسی کو خوش روئی سے ملنا بھی نیکی ہے۔"

مسلمانوں میں باہمی الفت و عقیدت، احترام و اکرام کو فروغ دینے کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہاتھ ملانے یعنی مصافحہ کرنے کی فضیلت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

(إِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ فَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ وَاسْتَغْفَرَاہُ غُفِرَ لَھُمَا) [رواہ ابوداؤد : کتاب الأدب]

"جب دو مسلمانوں کی باہم ملاقات ہو اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اپنے لیے مغفرت طلب کریں تو ان دونوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔"

کچھ مدت کے بعد ملنے پر بغل گیر ہونا اسلامی معاشرت کا حصہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری (رض) اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے اپنے ہاں آنے کا پیغام بھیجا میں گھر میں موجود نہیں تھا۔ بعد ازاں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا (وَھُوَ عَلٰی سَرِیْرِہٖ فَالْتَزَمَنِیْ فَکَانَتْ تِلْکَ اَجْوَدَ وَاَجْوَدَ) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی چارپائی پر بیٹھے میرے ساتھ بغلگیر ہوئے۔ آپ کا ملنا بہت ہی اچھا تھا۔ [رواہ ابوداؤد : کتاب الأدب، باب فی المعانقۃ]

پھر ملاقات کے آداب میں مسلم معاشرے کو رعونت و غرور اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ اصول لاگو فرمایا کہ سوار پیدل کو اور چلنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے۔ اگر یہی اصول ٹھہرایا جاتا کہ ہر حال میں چھوٹا بڑے کو 'کمزور طاقتور کو اور محکوم حاکم کو سلام کرے تو مسلم سوسائٹی واضح طور پر طبقاتی کشمکش کا شکار ہو جاتی۔

ہاں اگر ملنے والے ایک جیسی حالت میں ہوں تو احترام کی طبعی اور بین الاقوامی قدروں کا بھی خیال رکھا گیا کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے تاکہ مسلم معاشرہ ادب و احترام کے ثمرات سے لطف اندوز ہو سکے۔ اونچ نیچ کے مرض کے تدارک کے لیے یہ اصول بھی وضع فرمایا کہ کوئی سر جھکا کر نہ ملے اس سے بندگی کا انداز ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد عالی ہے :

(لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَآءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ) [رواہ ابو داؤد : کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المراۃ]

"اگر میں نے کسی کو یہ حکم دینا ہوتا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر جھکائے تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کے سامنے سجدہ کیا کریں۔ "

معلوم ہوا کہ سلام کا جواب دینا فرض ہے : لطیف نکتہ : بعض سنتوں کا ثواب فرض سے زیادہ ہے۔ سلام سنت ہے اور جواب سلام فرض ہے۔ مگر ثواب سلام کرنے کا زیادہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ہر جگہ سے ہمارے سلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ ہر نماز میں حضور کو سلام کیا جاتا ہے اور جواب دینا فرض ہے۔ جو جواب نہ دے سکے اسے سلام کرنا منع۔ جیسے سونے والا یا استنجا کرنے والا وغیرہ۔ السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنا بہتر جواب ہے اور صرف وعلیکم السلام کہنا رد سلام ہے۔ پہلا باحسن منہا سے مراد اور دوسرا اور دوھا سے مراد۔ اچھا جواب دینا بہتر ہے۔ رد سلام فرض لہٰذا فحیوا امر استحبابی اور دوھا امر وجوب لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا اسلام کا جواب بھی ملتا ہے۔

سلام کے حکم کا پس منظر

گزشتہ رکوع میں ہم نے پڑھا ہے کہ منافقین کی مختلف عادات و خصوصیات کو بیان کرنے اور مسلمانوں کے خلاف ان کی درپردہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا گیا ہے کہ آپ ان کی سازشوں کی پروانہ کریں 'البتہ ان سے اعراض کا رویہ اختیار کریں۔ آپ کا بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے۔ وہی آپ کا کارساز ہے 'اس کی تائید و نصرت اگر میسر ہے تو پھر یہ منافقین آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی مخالفت سے آپ نہ اثر قبول کریں اور نہ ابھی ان کے خلاف کوئی اقدام کریں 'البتہ وہ شفقت اور توجہ جس کی پھوار ہر ایک پر برستی رہتی ہے اس میں آپ کمی فرمادیں اور ان سے اعراض اور بے نیازی کا رویہ اختیار کریں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ آپ ان کی سازشوں اور شرارتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

مسلمان چونکہ ہر معاملے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کرتے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ جیسے ہی منافقین سے آپ کو اعراض کرتے ہوئے دیکھیں گے تو انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ آپ یقیناً ان سے ناراض ہیں اور آپ کی ناراضگی کسی سے بھی اپنی ذات کی وجہ سے تو نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب غیرت دینی یا اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی یقیناً اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمان بھی منافقین سے اپنا رویہ بدل لیں اور جو لوگ مسلمانوں میں زیادہ پرجوش ہیں وہ ہو سکتا ہے منافقین کے خلاف کوئی اقدام کر ڈالیں۔ ابھی حالات اس سطح تک نہیں پہنچے تھے کہ منافقین کے خلاف کوئی کارروائی

کی جائے۔اس لیے اس آیت کریمہ کے ذریعے مسلمانوں کوتنبیہ کی گئی کہ منافقین کا طرز عمل کچھ بھی ہو تمہیں بہر حال اپنے طرز عمل میں سختی یا بیگانگی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ تمہاری حیثیت ایک داعی اور مبلغ کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے اگر تمہیں تلخیاں بھی ملیں تو تمہیں اس کا جواب تلخی سے نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معاملات ہمیشہ بگڑتے ہیں سدھرتے نہیں۔ اس لیے جب تم یہ دیکھو کہ کوئی تمہیں احترام کے ساتھ دعا دے رہا ہے تو تم بھی اس کی دعا کا جواب دعا سے دو۔ بلکہ تمہاری دعا میں اس کے لیے زیادہ محبت کا اظہار ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اسی کے دعائیہ کلمات کو دہرا دو۔

سلام کا مفہوم اور اس کی جامعیت

1 اللہ تعالیٰ کے خوبصورت اسمائے گرامی میں سے ایک سلام بھی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: } اللہ تعالیٰ وہی ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ بادشاہ ہے، نہایت پاک ہے، سلام ہے۔{ (قرآن: 59:23) اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین مرتبہ استغفار پڑھتے اور یوں دعا کرتے: اللّٰھم انت السلام ومنک السلام-۔ اے اللہ تعالیٰ! تو سلام ہے اور سلامتی تیری بارگاہ سے ملتی ہے۔ (مسلم: 1334: کتاب المساجد: باب 26)

جب آدمی کسی کو سلام کہتا ہے تو وہ گویا السلام کا لفظ بول کر اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی معنویت پر غور کرے تو اس کے احساس میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کا ذکر آدمی میں تذکیر کا کام بھی کرتا ہے۔ یعنی اسے یاد دلاتا ہے کہ تم اللہ کے بندے ہو خود رو یا آزاد مخلوق نہیں ہو۔ اللہ کی طرف سے جس طرح تم پر اس کے حقوق عائد کیے گئے ہیں اسی طرح بندوں کے حقوق بھی عائد کیے گئے ہیں دیکھو اللہ کا نام لے کر جب تم کسی بندے سے ہمکلام ہوتے ہو تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو مجروح نہ ہونے دینا۔ اور مزید یہ کہ تم اس کی معنویت پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ تم نے السلام کا لفظ بول کر کتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔

ابن العربی نے احکام القرآن میں ذکر کیا ہے کہ "السلام علیکم کے معنی ہیں "اللہ رقیب علیکم" (اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے) جب تم نے اسے اللہ کے محافظ ہونے کی خبر دی تو پھر اگر تمہاری طرف سے اسے کوئی بھی نقصان پہنچا یا تمہاری نیت میں اس کے حوالے سے کوئی بھی فساد پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے اللہ کی حفاظت کو چیلنج کیا ہے۔ اس صورت میں یہ معاملہ تمہارے اور دوسرے آدمی کے درمیان نہیں رہے گا بلکہ تمہارے اور اللہ کے درمیان ہو گا۔ تم جیسے جیسے اس کی حفاظت کے حصار کو توڑو گے ویسے ویسے تم خود غیر محفوظ ہوتے جاؤ گے۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں کہ السلام علیکم کہہ کر آدمی کتنی بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ ایک طرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے حوالے سے اپنے ملنے والے کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمان کی تعریف یہ فرمائی " المسلم من سلم المسلمون من لسانہٖ و یدہٖ " (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں) ابن العربی نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے "أتدری ما السلام؟ یقول انت آمن منی " (تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کہنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو) یعنی میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ حتیٰ المقدور میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

2 سلام دو مسلمانوں کے درمیان اظہار تعارف بھی ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو وہ دراصل ایک علامت کا اظہار کرتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور میرا تعلق امت مسلمہ سے ہے۔ اور جب دوسرا مسلمان وعلیکم السلام کہتا ہے تو وہ درحقیقت اس کے سلام کو قبول کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح سے دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا خدا ' ہمارا رسول اور ہمارا دین ایک ہے۔ ہمارے حسن و قبح کے معیارات ایک ہیں۔ ہمارے تحفظات یکساں ہیں۔ ہمارے مقاصد میں ہم آہنگی ہے۔ ہماری اجتماعی مصلحتیں یکساں ہیں۔ اس ایک لفظ سے یکسانیت اور وحدت کے تمام حوالے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ان دونوں کے درمیان سے اجنبیت کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے دیس میں ہوں تو محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں ایک محفوظ پناہ مل گئی ہے۔ اور اگر اپنوں میں ہوں تو محبت کا زمزم بہنے لگتا ہے۔

3 السلام کا لفظ دعا بھی ہے۔ اور اس دعا میں بڑی وسعت ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے کو سلام کہتا ہے تو وہ اس کے لیے دنیا وآخرت کی بھلائی کی دعا مانگتا ہے۔ اسے دنیا میں ہر دکھ اور ہر تکلیف سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور آخرت میں اسے جہنم کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کی دعا صبح و شام میں محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اور پھر دنیا سے آگے بڑھ کر آخرت کی بھلائیوں تک دراز ہو جاتی ہے۔ انہی تینوں حوالوں سے پروردگار نے سلام کو مسلمانوں کے لیے نہ صرف علامت بنایا ' بلکہ اس کو عبادت کا درجہ بھی دیا اور اسی کو ایک دوسرے کی حفاظت کی ضمانت بنا دیا اور اس کے عام کرنے اور اس کو رواج دینے کے لیے اس کی انتہائی تاکید فرمائی اور فضائل بیان فرمائے۔ سلام کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس پر نیکیوں کی عطا و بخشش کا ذکر بھی فرمایا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان اولی الناس باللہ من بدأ بالسلام" (حضرت ابو امامہ (رض) سے روایت ہے کہ لوگوں میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے)

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ ابن مسعود (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

" البادئ بالسلام بری من الکبر " (سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے)

"امام مالک (رح) نے ابی ابن کعب (رض) کے صاحبزادے طفیل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر (رض) کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر بازار جاتے تھے۔ اور جس دکان اور جس کباڑیے اور جس فقیر و مسکین کے پاس سے گزرتے اس کو بس سلام کرتے اور کچھ خرید و فروخت کیے بغیر واپس آ جاتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو معمول کے مطابق مجھے ساتھ لیکر بازار جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے؟ نہ تو آپ کسی دکان پر کھڑے ہوتے ہیں نہ کسی چیز کا سودا کرتے ہیں ' نہ بھاؤ ہی کی بات کرتے ہیں اور بازار کی مجلسوں میں بھی نہیں بیٹھتے (پھر آپ بازار کس لیے جاتے ہیں؟) یہیں بیٹھیے باتیں ہوں اور ہم استفادہ کریں۔ حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا کہ ہم تو صرف اس غرض اور اس نیت سے بازار جاتے ہیں کہ جو سامنے پڑے اس کو سلام کریں (اور ہر سلام پر کم از کم دس نیکیاں کما کر اللہ کی رحمتیں اور بندگان خدا کے جوابی سلاموں کی برکتیں حاصل کریں)

جس طرح ملاقات کے وقت سلام کہنا سنت اور اس کا جواب دینا واجب ہے اور یہ مسلمانوں کے طرز معاشرت اور ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے اسی طرح سلام کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعض دوسرے مواقع کے لیے بھی مسنون بنایا ہے۔ اب ہم ایک ترتیب سے ان مواقع کا ذکر کرتے ہیں:

سلام ملاقات کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی

1 حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "یا بنی اذا دخلت علی اہلک فسلم یکون برکتہ علیک و علی اہل بیتک " (بیٹا جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو یہ تمہارے لیے باعث برکت ہوگا اور تمہارے گھر والوں کے لیے) ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب گھر سے جانے لگو تو سلام کر کے نکلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے آداب میں یہ بھی ایک ادب ہے کہ اہل خانہ کو سلام کرو۔ اور بعض احادیث سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلام کہنے اور دعا کرنے سے گھر بہت سی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور جنات اس گھر میں بسیرا نہیں کر سکتے۔

2۔ اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو کہو: السلام علی النبی ورحمۃاللہ وبرکاتہ۔ (نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکتیں ہوں۔) ملا علی قاری (جن کا انتقال 1014 ھ میں ہوا) اس روایت کے ضمن میں لکھتے ہیں: یہ اس لیے ہے کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح مبارک اہل اسلام کے گھروں میں حاضر ہوتی ہے۔ (شرح شفا: قاضی عیاض: جلد دوم: ص 118)

3۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ جب کسی سے ملاقات کے لیے اس کے گھر یا کسی مجلس میں جانا پڑے تو پہلے سلام کہو اور اجازت مانگو۔ سلام اور اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا یا مجلس میں جا کر بیٹھ جانا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بتائے ہوئے آداب کے خلاف ہے۔ کوئی آدمی چاہے گھر میں اکیلا رہتا ہو بغیر سلام اور اجازت کے گھر میں داخل ہونا اس کے لیے اذیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس وقت مناسب حالت میں نہ ہو یا اس کی مصروفیت ملنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔ اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے استیذان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "تین دفعہ سلام کرو اگر جواب نہ آئے تو واپس پلٹ جاؤ اور برا نہ مانو۔" اور یہ سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا بعض مواقع پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور جب کسی نے اس میں تساہل برتا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے باہر بھیج دیا کہ دوبارہ اجازت لے کر اندر آؤ۔ فتح مکہ کے بعد حضور وادی مکہ کے بالائی حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے کلدہ بن حنبل کہتے ہیں کہ میں صفوان بن امیہ کی جانب سے چند تحائف لے کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں سلام کہے اور اجازت لیے بغیر اندر داخل ہو گیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچ گیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم واپس جاؤ اور قاعدہ کے مطابق "السلام علیکم أأدخل" کہہ کے اجازت مانگو۔ کلدہ چونکہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انھیں ان آداب سے آگاہی نہیں تھی اس لیے وہ حسب سابق اجازت طلب کیے بغیر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچ گئے لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں باہر بھیج دیا اور سلام اور اجازت کے بعد اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ اسی مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا مسلمانوں کی ثقافت کے بنیادی عناصر میں سے تھا۔ اور جب کسی نے اس پر عمل میں کوتاہی کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر تنبیہہ فرمائی۔ لیکن آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں نیچے سے لیکر اوپر تک ان آداب سے لاپرواہی برتی جاتی ہے۔

سلام کے لیے کچھ ضوابط

4۔ سلام کہنے کے کچھ آداب اور ضابطے بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تعلیم فرمائے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سلام صرف ملاقات کا ذریعہ ہی نہیں 'بلکہ تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ انسان کی بہت بڑی کمزوری جو اسے بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے وہ " کبر "ہے۔ جیسے ہی طبیعت میں غرور اور نخوت کا فساد پیدا ہوتا ہے انسانیت کا احترام 'انسانی اقدار کا احترام 'اخلاقِ حمیدہ کا احترام اور ہمدردی ' خیر خواہی 'محبت اور موَدت کے جذبات سلب ہونے لگتے ہیں۔ آدمی اپنے ذات کے گنبد میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔ "ہر مسلمان کو سلام کہنا اور پھر سلام میں پہل کرنا تکبر کی لعنت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سلام کے آداب میں یہ بات شامل فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔ کیونکہ یہ احترام اور اخلاق کا تقاضا ہے۔ اور جب چھوٹا بڑے کو سلام نہیں کہتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی تکبر داخل ہو گیا ہے۔ مزید فرمایا کہ گزرنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے۔ تاکہ وہ فٹ پاتھوں پر بیٹھنے والوں کو حقیر نہ سمجھے۔ سواری پر سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے بشر طیکہ سواری ایسی ہو جس سے سلام کہا جا سکتا ہو۔ اس سے سوار اور سواری سے محروم لوگوں میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیر کے جذبات بھی مٹ جاتے ہیں اور حسد کو بھی اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں ملتا

ہم جب کسی قبرستان کے پاس سے گزریں تو سنت یہ ہے کہ ہم انھیں السلام علیکم (تم پر سلام ہو) کہہ کر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ (ابن ماجہ: 1547: کتاب الجنائز: باب 36) حالانکہ ان کے جسم تو مٹی میں مٹی ہو چکے ہوتے ہیں۔ صرف ان کی روحوں کا ان قبروں سے ایک طرح کا رابطہ ہوتا ہے جن کو ہم السلام علیکم کہتے ہیں۔ اسی طرح ملا علی قاری کی توجیہ کے مطابق نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جسمانی اعتبار سے اگرچہ مدینہ منورہ میں آرام فرما ہیں مگر جب ان کی روح مبارک کا رابطہ اہل سلام کے گھروں سے ہے تو ہم اس روح مبارک کے توسط سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وہ سلام بھی عرض کر سکتے ہیں جو ہم تشہد میں کہتے ہیں۔ (یعنی السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے غربت اور تنگدستی کی شکایت کی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم گھر میں داخل ہو اگر اس میں کوئی شخص موجود ہو تو اسے سلام کیا کرو اور اگر اس میں کوئی شخص موجود نہ ہو تو مجھ پر سلام کیا کرو اور ایک مرتبہ (قل ھو اللہ احد۔۔ یعنی سورۃ اخلاص) پڑھا کرو۔ اس آدمی نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا کثیر رزق عطا فرمایا کہ وہ اپنے پڑوسیوں پر بھی سخاوت کرنے لگا۔ (تفسیر قرطبیؒ: سورۃ اخلاص)

جنت میں دعا سلام

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جنت میں اہل جنت کی (اللہ تعالیٰ کے حضور) دعا ہو گی: سبحانک اللھم (اے اللہ تو پاک ہے) اور ان کی آپس کی دعا ہو گی: السلام علیکم اور ان کی دعا کا آخری حصہ یہ ہو گا: الحمد للہ رب العالمین (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے (قرآن: 10:10) اس آیت میں اہل جنت کی دعا کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اگر آپ اس دنیا میں اس کا کچھ تصور کرنا چاہتے ہیں تو نماز میں غور کرو۔ اس کی ابتدا سبحانک اللھم سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام السلام علیکم پر ہوتا ہے اور بندہ مومن جب جائے نماز سے فارغ ہو کر اٹھتا ہے تو ان الفاظ یعنی الحمد للہ رب العالمین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے جس نے اسے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

فرشتوں کو سلام

حضرت آدم (علیہ السلام) نے سب سے پہلے فرشتوں کو سلام کیا، لہٰذا ہم جب کسی کو سلام کریں تو ہمیں اس کے ساتھ اس کی نیکی اور بدی لکھنے والے فرشتوں کی نیت بھی کرنی چاہیے تاکہ فرشتے بھی ہمارے سلام کا جواب دیں اور ہم ان کے معصوم سلام سے فیض یاب ہوں۔ اختتام جماعت پر سلام کہتے ہوئے امام اور مقتدی دونوں کو اطراف کے نمازیوں کے علاوہ اپنے دائیں بائیں متعین فرشتوں کو بھی سلام کہنا چاہیے اور اگر کوئی انسان اکیلے نماز پڑھ رہا ہے تو وہ سلام کہتے ہوئے صرف اپنے دائیں اور بائیں متعین فرشتوں کی نیت کرے۔ (الفقہ علی المذاھب الاربعۃ: جلد 1: ص 266) اگر ہم نے اپنے ساتھ رہنے والے فرشتوں کو کبھی سلام نہ کیا تو وہ کیا سوچیں گے کہ ہم ایک مسلمان کے ساتھ پچاس ساٹھ سال کا عرصہ رہے لیکن اس نے ہمیں کبھی سلام تک نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے فرشتے ہمیں نظر نہیں آتے مگر جب ہم اہل قبرستان کو سلام کرتے ہیں تو وہ بھی ہمیں نظر نہیں آتے، نیز فرشتوں کو سلام کرنے سے ہمیں ایک یاد دہانی بھی ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے یہ سکیورٹی کیمرے ہر وقت ہمارے ساتھ ہیں جو میدان حشر کے لیے ہماری ہر حرکت کی فلم بنارہے ہیں، لہٰذا ہمیں کوئی غلط کام کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا چاہیے کیونکہ کوئی بھی فرشتوں کے کیمرے سے بچ نہیں سکتا۔ (امداد)

مسائل

۱۔ تحفہ کے بدلے میں بہتر تحفہ دینا چاہیے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ قیامت کے دن سب کو اکٹھا کرے گا۔

۳۔ قیامت برپا ہو کر رہے گی۔

۴۔ اللہ کے فرمان سے کسی کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔

آیت مبارکہ:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾ؑ

لغۃ القرآن: [اَللّٰهُ : اللہ] [لَآ اِلٰہَ : کوئی الٰہ نہیں ہے] [اِلاَّ : مگر] [ہُوَ : وہ] [لَيَجْمَعَنَّكُمْ : وہ لازماً جمع کرے گا تم لوگوں کو] [اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن

کی طرف] [لاَ رَیْبَ : کوئی شک نہیں ہے] [فِیْہِ : جس میں] [وَمَنْ : اور کون] [اَصْدَقُ : زیادہ سچا ہے] [مِنَ اللّٰہِ : اللہ سے] [حَدِیْثًا : بلحاظ بات کے]

مترادفات: [لَیَجْمَعَنَّ کُمْ : جمع ، جماعت ، مجمع ، مجموعہ ۔][اِلٰی: مرسل الیہ ، مکتوب الیہ ، الداعی الی الخیر ۔][رَیْبَ : کتاب لاریب ، خدائے لاریب ۔][فِیْہِ : فی الحال ، فی الفور ، فی الحقیقت ۔][اَصْدَقُ : صادق ، مصدوق ، صدق وفا ۔][حَدِیْثًا : حدیث نبوی ، حدیث قدسی ، احادیث ۔]

ترجمہ: اللہ ہے (کہ) اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ تمہیں ضرور قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں، اور اللہ سے بات میں زیادہ سچا کون ہے.

تشریح: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سلام کا احسن طریقہ سے جواب دینے کا حکم دیا تھا ' اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو اجنبی شخص تم کو سلام کرے تم اس کو مسلمان جانو ' اور یہ نہ سمجھو کہ اس نے جان بچانے کے لیے سلام کیا ہے اور اس کے دل میں کفر ہے کیونکہ باطن کا حال صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے ' اور جس نے اسلام کو ظاہر کیا اور باطن میں وہ کافر تھا اس کا حساب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لے گا ' اس لیے اس کے بعد قیامت کا ذکر کیا اور فرمایا اور کون ہے جس کی بات اللہ سے زیادہ سچی ہو ' لہٰذا پہلے لفظ الہ کے بارے پڑھ لیں۔
الہ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو الاھۃ کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انھوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

الہ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں

1۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ الہ (ف) یالہ فلاو ثالہ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بناپر الہ کے معنی ہوں گے معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ الہ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے ادراک سے چونکہ عقول متحیر اور درماندہ ہیں اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی (رض) نے فرمایا ہے۔ **کل دون صفاتہ تحبیر الصفات وضل ھناك تصاریف للغات**۔ انسان جس قدر صفات الیہ میں غور و فکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے (11) **تفکروا فی آلاء اللہ ولا تفکروا فی اللہ** کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو.

2۔ بعض نے کہاہے کہ الہ اصل میں ولاہ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاہ بنالیاہے اور ولہ (س) کے معنی عشق و محبت میں دارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لیے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان اسی لیے بعض حکماء نے کہاہے ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ : { وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ } (سورۃ الإسراء 44) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔
3۔ بعض نے کہاہے کہ یہ اصل میں لاہ یلوہ لیاھا سے ہے جس کے معنی پر وہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :۔ {لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ} (سورۃ الأنعام 103) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ نیز آیت کریمہ ؛ {وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ} (سورۃ الحدید 3) میں الباطن ، کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الہ یعنی معبود در حقیقت ایک ہی ہے۔ (مفردات)

قیامت کا دن اور اس کا حساب و کتاب صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا نگران ہے جو انسان کے ذہن و ضمیر اور اس کے ظاہر و باطن میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اور کسی بھی غلط خیال یا برے اقدام پر اسے متنبہ کرتا ہے کہ تیری یہ کوتاہی لوگوں کی نگاہوں سے تو او جھل ہو سکتی ہے مگر آخرت کی سزا سے نہیں بچ سکتی۔ دنیا کے نوے فیصد جرائم اس امید پر کئے جاتے ہیں کہ وہ قانون کی نگاہ سے بچ جائیں گے یا رشوت وسفارش سے کام بن جائے گا لیکن جب کسی مجرم کی گرفت یقینی ہو تو نوے فیصد جرائم از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ جرائم کی دنیا بھی اتنی آگے جا چکی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی بھی جرائم کا راستہ روکنے میں ناکام ہو چکی ہے، لہٰذا آج دنیا کو عقیدہ آخرت کی ضرورت ہے جو صرف ظاہر نہیں بلکہ انسان کے ذہن و ضمیر پر بھی چوکیدار بٹھا دیتا ہے اور آخرت کی سخت سزا اسے جرائم کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔ (امداد)
اللہ تعالیٰ مطاع مطلق ہے اور ہم اس کی غیر مشروط بندگی کے پابند ہیں اس بندگی اور اطاعت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کا رسول اس کا نمائندہ ہے۔ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس کے کسی حکم سے انحراف اللہ کے حکم سے انحراف کے برابر ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اللہ کا علم ایسا وسیع ہے کہ ہم ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں۔ وہ ہمارے ایک ایک عمل کو جانتا ہے اور ہمیں ہر لمحہ دیکھتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور جانتا ہے اسی کے مطابق ہمارا نامہ عمل تیار ہو رہا ہے۔ تیسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ وہ تمام انسانوں کو جس طرح پیدا کرنے اور مارنے پر قادر ہے اسی طرح دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کب مرا اور کس سر زمین میں دفن ہو کر خاک ہو گیا۔ اس کی قدرت کے لیے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ وہ قیامت میں ان سب کو اٹھا کر ایک میدان میں جمع کرے گا جسے محشر یا میدان حشر کہتے ہیں۔ اور اس کے قیامت برپا کرنے ٗ میدانِ حشر میں ایک ایک شخص کا حساب کرنے اور اس کے جزاو سزا دینے میں کوئی شبہ نہیں۔ سب لوگ اپنا اپنا نامہ عمل ہاتھوں میں لیے اپنے اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اور چوتھی یہ بات کہ پروردگار نے جو کچھ قرآن کریم میں نازل کیا اس کی ایک ایک بات سچی اور ایک ایک حکم حق ہے۔ کیونکہ صدق اللہ کی صفت ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی سچا نہیں۔ یہ وہ بنیادیں ہیں جس پر اسلامی عقائد ٗ عبادات اور پوری زندگی کے معاملات کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان منافقین کی تمام کمزوریوں کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی یہ بنیادیں پختہ نہیں۔ وہ ریت کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ اس لیے جب جب ریت ان کے پاؤں کے نیچے سے پھسلتی ہے ان

کے اعمال میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔ ان کے معاملات کی دیواریں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کی ان بنیادی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جب وہ اپنے عقائد اور اپنی اساسی باتوں میں پختہ ہو جائیں تو پھر خود بخود ان کا ہر عمل اخلاص کی تصویر ہو گا۔ وہ خود نفاق کو ایک لعنت سمجھیں گے اور اللہ کے ساتھ ظاہر و باطن اپنا معاملہ درست کر لیں گے۔ اور جب تک یہ بنیادیں استوار نہیں ہوں گی تو محض سخن سازی سے ان کی زندگی میں اخلاص نہیں آسکتا۔ اکبر نے ٹھیک کہا تھا۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے

ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

آج بھی اگر امت کی بگڑی ہوئی حالت کا ہم جائزہ لیں تو ان کی تمام تر اخلاقی اور معاملات کی خرابیوں کا یہی سبب آپ کو ملے گا کہ وہ بنیادی ، نظریاتی اعتقادات میں کمزوریوں کا شکار ہیں۔ اللہ ہم سب کو اپنی عافیت میں رکھے۔ (آمین)

اللہ تعالیٰ واجب بالذات ہے اور اس کی تمام صفات قدیم اور واجب بالذات ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کا صدق بھی قدیم اور واجب بالذات ہے اور کذب صدق کی نقیض ہے جب کذب آئے گا تو صدق نہیں رہے گا اور کذب آ نہیں سکتا لہٰذا صدق جا نہیں سکتا ، اس لیے اللہ تعالیٰ کا کذب ممتنع بالذات ہے۔

امتناع کذب پر امام رازی کے دلائل

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا صدق واجب ہے اور اس کے کلام میں کذب اور خلف محال ہے ، ہمارے اصحاب کی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کاذب ہو تو اس کا کذب قدیم ہو گا اور جب اس کا کذب قدیم ہو گا تو اس کا زوال ممتنع ہو گا ، کیونکہ قدیم کا عدم ممتنع ہے ، اور جب کذب کا زوال ممتنع ہو گا تو اس کا صدق ممتنع ہو گا ، کیونکہ ایک ضد کا وجود دوسری ضد کے وجود سے مانع ہے ، اس لیے اللہ کو کاذب مانا جائے تو اس کا صادق ہونا ممتنع ہو گا ، لیکن اس کا کذب ممتنع ہے کیونکہ ہم بالبداہت جانتے ہیں کہ جس شخص کو کسی چیز کا علم ہو وہ اس علم کے مطابق اس چیز کی خبر دے سکتا ہے اور یہی صدق ہے اور جب اللہ تعالیٰ کا صادق ہونا ثابت ہو گیا تو اس کا کاذب ہونا ممتنع ہو گیا۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۸۱ ، مطبوعہ دار الفکر بیروت ، ۱۳۹۸)

نیز ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ کذب کا امکان صدق عدم کے امکان کو مستلزم ہے اور اللہ تعالیٰ کا صدق واجب ہے اور قدیم ہے اس کا عدم اور سلب ممکن نہیں ہے لہٰذا اس کے کلام میں کذب بھی ممکن نہیں ہے۔

امتناع کذب پر علامہ تفتازانی کے دلائل

اللہ تعالیٰ کا کلام ازل میں ماضی ، حال اور استقبال کے ساتھ متصف نہیں تھا ورنہ لازم آئے گا کہ ازل میں اللہ کا کلام مثلاً فعصی فرعون "فرعون نے معصیت کی" کاذب ہو کیونکہ ازل میں فرعون تھا نہ اس نے معصیت کی تھی ، اور اللہ تعالیٰ کا کذب محال ہے اولا ، اس لیے کہ اس پر علماء کا اجماع ہے ، ثانیا اس لیے کہ معجزہ کی دلالت سے انبیاء (علیہم السلام) کی خبروں کا صدق تواتر سے ثابت ہے اور ان کا صدق اللہ کے کلام پر

موقوف نہیں ہے چہ جائیکہ وہ اللہ کے کلام کے صدق پر موقوف ہو ' ثالثا اس لیے کہ تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ کذب نقص ہے اور نقص اللہ پر محال ہے کیونکہ نقص عجز ' جہل یا عبث کو مستلزم ہے ' رابعا ' اس لیے کہ اگر ازل میں اللہ تعالیٰ کی خبر کاذب ہو تو ازل میں اس کا صدق ممتنع ہوگا ' کیونکہ جس چیز کا قدم ثابت ہو اس کا عدم ممتنع ہوتا ہے ' جب ازل میں اللہ تعالیٰ صادق ہے تو ازل میں کذب محال ہوگا۔ (شرح المقاصد ملخصا ج ۴ ص ۱۵۹۔ ۱۵۸ ' مطبوعہ ایران)

امتناء کذب پر میر سید شریف کے دلائل:

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۲ ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کذب کے محال ہونے کی تین دلیلیں ہیں:

(۱) پہلی دلیل یہ ہے: کہ کذب نقص ہے اور نقص اللہ تعالیٰ پر محال ہے نیز اگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب واقع ہو تو لازم آئے گا کہ بعض اوقات ہم اللہ تعالیٰ سے زیادہ کامل ہوں یعنی جس وقت ہمارا کلام صادق ہو (اور اس کا کلام کاذب ہو)

(۲) دوسری دلیل یہ ہے: کہ اگر اللہ تعالیٰ کذب سے متصف ہو تو اس کا کذب قدیم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حوادث قائم نہیں ہو سکتے اور جب اس کا کذب قدیم ہوگا تو اس کا صدق سے متصف ہونا محال ہوگا جو کذب کا مقابل ہے ورنہ اس کی صفت کذب کا زوال ممکن ہوگا اور ہم پہلے اس کے زوال کو محال فرض کر چکے ہیں کیونکہ اس کی صفات قدیم ہیں اور جس کا قدم ثابت ہو اس کا عدم ممتنع ہوتا ہے اور لازم باطل ہے یعنی اللہ پر صدق کا ممتنع ہونا باطل ہے کیونکہ ہم بالبداہت جانتے ہیں کہ جس کو کسی چیز کا علم ہو اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس علم کے مطابق خبر دے۔

(۳) اور تیسری اور متعمد دلیل جو کلام لفظی اور کلام نفسی دونوں میں کذب بالبداہت معلوم ہے اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے ' لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ تواتر سے منقول ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں صادق ہے ' جس طرح تواتر سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے ' اگر اس دلیل پر یہ اعتراض کیا جائے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے صادق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق کی اور ان کو صادق فرمایا اب اگر اللہ کا صادق ہونا اور اس پر کذب کا ممتنع ہونا انبیاء (علیہم السلام) کے قول اور ان کی خبر سے ثابت ہو تو یہ دور ہو جائے گا انبیاء کا صادق ہونا اللہ کی خبر پر اور اللہ کا صادق ہونا انبیاء کی خبر پر موقوف ہوا اور یہ کسی شے کا اپنے نفس پر موقوف ہونا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کا صدق اللہ کی تصدیق پر موقوف نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت پر موقوف ہے ' انبیاء (علیہم السلام) اپنے دعوی نبوت پر معجزہ خارق عادت پیش کرتے ہیں جس سے ان کا صدق ثابت ہوتا ہے ' اور اللہ تعالیٰ کا صادق اور متکلم ہونا انبیاء (علیہم السلام) کی خبر پر موقوف ہے ' وہ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ متکلم اور صادق ہے۔ (شرح موافق ج ۸ ص ۱۰۳۔ ۱۰۱ ' مطبوعہ ایران)

شرح مواقف کے دلائل پر علامہ میر سید شریف کے اعتراضات

صاحب مواقف نے امتناع کذب پر پہلی دلیل یہ قائم کی کہ کذب نقص ہے اور نقص اللہ پر محال ہے ' پھر اس پر یہ اعتراض کیا کہ کلام نفسی میں کذب نقص ہے کلام لفظی میں کذب نقص نہیں ہے ' کیونکہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جسم میں کلام کاذب پیدا کر دے ' اس کا جواب یہ دیا کہ کلام کاذب کو پیدا کرنا بھی نقص ہے اور وہ اللہ پر محال ہے ' ثابت ہوا کہ اللہ کے کلام میں کذب مطلقا محال ہے ' اس پر علامہ میر شریف نے یہ اعتراض کیا کہ اشاعرہ افعال کا حسن اور قبح شرعی مانتے ہیں اور قبح عقلی کے قائل نہیں ہیں اور قبح عقلی اور نقص میں کوئی فرق نہیں ہے

اور جب اللہ پر قبح عقلی جائز ہے تو اس پر نقص بھی جائز ہونا چاہیے اور جب اللہ پر نقص جائز ہو گیا تو اس کے کلام میں کذب کا ممتنع ہونا ثابت نہیں ہوا۔ (شراح المواقف ج ۸ ص ۱۰۳ مطبوعہ ایران)

علامہ میر سید شریف کے اعتراضات کے جوابات :

ماتریدیہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ فی نفسہ حسن ہے اور جس چیز سے منع کیا ہے وہ فی نفسہ قبیح ہے مثلا منعم کا شکر ادا کرنا حسن ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کا حکم نہ بھی دیتا تب بھی فی نفسہ حسن ہی رہتا اور قتل ناحق فی نفسہ قبیح ہے اگر اللہ تعالیٰ اس سے منع نہ بھی فرماتا تب بھی یہ قبیح ہی رہتا 'کیونکہ اول الذکر کے حسن اور ثانی الذکر کے قبح کا ادراک کرنے میں عقل مستقل ہے اور یہ معنی ہے ان کے اس قول کا کہ افعال کا حسن اور قبح عقلی ہے 'اور اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ حسن اور قبح شرعی ہے یعنی جس کا شارع نے حکم دیا ہے وہ حسن ہے اور جس سے منع کیا ہے وہ قبیح ہے عقل کا اس میں کوئی دخل نہیں 'اگر بالفرض شارع قتل ناحق کا حکم دیتا تو وہ حسن ہوتا اور شکر منعم یا عبادت کرنے سے منع کرتا تو ہو قبیح ہوتی۔ اور اس بحث میں حسن کا معنی ہے جس کام کی وجہ سے انسان دنیا میں مدح کا اور آخرت میں ثواب کا مستحق ہو اور قبیح کا معنی ہے جس کام کی وجہ سے انسان دنیا میں مذمت کا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہو 'اس حسن اور قبح کو اشاعرہ کہتے ہیں کہ شرعی سے عقلی نہیں ہے یعنی عقل اس کے ادراک میں مستقل نہیں ہے مثلا عقل کیسے جان سکتی ہے کہ تیمّم سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے یا موزہ کے اوپر کے حصے پر مسح کرنے سے طہارت ہو جاتی ہے یا سونے اور ہوا خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے ان کا حسن اور قبح شرعی ہے اور ماتریدیہ یہ کہتے ہیں کہ افعال کا حسن اور قبح عقلی ہے یعنی عقل 'ان کے حسن اور قبح کی ادراک میں مستقل ہے۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا افعال کے حسن اور قبح کے عقلی ہونے یا نہ ہونے کا اختلاف اسی معنی میں ہے۔

حسن کا دوسرا معنی ہے صفت کمال جیسے علم اور صدق 'قبح کا دوسرا معنی ہے صفت نقصان جیسے جہل اور کذب اس میں ماتریدیہ اور اشاعرہ سمیت تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کا حسن اور قبیح عقلی ہے اور جب یہ واضح ہو گیا تو مواقف میں جو یہ لکھا ہے کہ کذب نقص ہے اور یہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے پھر اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ کذب کا نقص ہونا تو قبح عقلی ہے اور اس کو اشاعرہ نہیں مانتے یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ اشاعرہ حسن اور قبح جس معنی کو شرعی کہتے ہیں اور اس کے عقلی ہونے کی نفی کرتے ہیں وہ اور معنی ہے 'وہ یہ ہے کہ جس کام کی وجہ سے انسان دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہو وہ قبیح ہے اور جس کیوجہ سے دنیا میں میں تعریف اور آخرت میں ثواب کا مستحق ہو وہ حسن ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے لیے اس معنی کے لحاظ سے نہ کوئی فعل حسن ہے نہ قبیح 'اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے حسن وہ فعل ہے جس میں کمال ہو اور قبیح وہ ہے جس میں نقص ہو اور اس معنی کے لحاظ سے حسن اور قبح کا عقلی ہونا اشاعرہ سمیت سب کے نزدیک مسلم ہے اس لیے کذب صفت نقص ہے اور نقص اللہ پر محال ہے اور اس دلیل پر کوئی اعتراض نہیں ہے 'مسلم الثبوت اور اس کی شروحات میں بھی یہی لکھا ہے لیکن ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے اس کو بہت آسان 'سہل اور واضح کر کے پیش کیا۔ (شرح مسلم الثبوت للخیر آبادی ص ۸۳۔ ۵۲ ملخصا مطبوعہ کوئٹہ 'فوتح الرحموت مع المتصفی ج ۱ ص ۴۶۔ ۲۶ 'ملخصا مطبوعہ مصر)

صاحب مواقف نے دوسری دلیل یہ قائم کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کذب سے متصف ہو تو اس کا کذب قدیم ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حوادث قائم نہیں ہو سکتے اور جب اس کا کذب قدیم ہو گا تو اس کا صدق سے متصف ہونا محال ہو گا 'جو کذب کا مقابل ہے اور اگر کذب قدیم نہ ہو تو اس کا زوال ممکن ہو گا اور ہم پہلے فرض کر چکے ہیں کہ کذب اس کی صفت ہے اور قدیم ہے اور جس کا قدم ثابت ہو اس کا عدم

ممتنع ہوتا ہے پس اگر کذب کو اللہ کی صفت مانا جائے تو اس کا صادق ہونا محال ہوگا اور یہ باطل ہے کیونکہ ہم بداھۃ جانتے ہیں کہ جس کو کسی چیز کا علم ہو وہ اس کے مطابق خبر دے سکتا ہے۔

علامہ سید شریف نے اس دلیل پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس دلیل سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی میں کذب محال ہو ' کیونکہ قدیم کلام نفسی ہے ' رہا کلام لفظی تو وہ مخلوق اور حادث ہے اور کلام لفظی جو صادق ہو وہ ممکن اور حادث ہونے کی وجہ سے زائل بھی ہو سکتا ہے اور کلام لفظی میں صدق کے زوال کا امکان بعینہ کذب کا امکان ہے ' اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ اللہ کا کلام لفظی صادق اور حادث ہے اور حادث کا زوال بھی ممکن ہے لیکن کلام صادق کے زوال سے کلام کاذب کا امکان لازم نہیں آتا ' کیونکہ کذب کا معنی ہے ایسی خبر جو واقع کے خلاف ہو اور کلام صادق کے زوال اور عدم کے امکان سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ایسی خبر وجود میں آجائے جو واقع کے خلاف ہو ' خلاصہ یہ ہے یہ کلام لفظی صادق کے زوال کا امکان عام ہے اور کلام کاذب کا ثبوت خاص ہے اور عام کا ثبوت خاص کے ثبوت کو مستلزم نہیں ہوتا ' عام کی خاص پر دلالت نہ مطابقے ہوتی ہے نہ تضمنی نہ التزامی ' اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کلام صادق لفظی کے زوال کا امکان بعینہ کذب کا امکان ہے۔

امتناع کذب پر علامہ میر سید شریف کی تصریحات :

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں :

(فرق باطلہ میں سے) مزداریہ نے کہا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے اور ظلم کرنے پر قادر ہے ' علامہ میر سید شریف اس کا رد فرماتے ہیں : اگر اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا تو وہ جھوٹا خدا ہوگا ' اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔ (شرح مواقف ج ۸ ص ۳۸۱ ' مطبوعہ ایران)

امتناع کذب کے متعلق دیگر علماء کی تصریحات اور دلائل :

علامہ محمد عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کی ذات پر جہل اور کذب دونوں محال ہیں۔ (حاشیہ عبدالحکیم علی الخیالی ص ۲۵۷ ' مع مجموعہ الحواشی السجھیہ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ ۱۳۹۷ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے زیادہ صادق نہیں ہو سکتا اور کذب اللہ پر محال ہے کیونکہ کذب نقص ہے اور نقص اللہ پر محال ہے۔

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں : زیادہ صادق ہونے کی نفی کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص صدق میں اللہ کے مساوی بھی نہیں ہو سکتا ' اللہ تعالیٰ کے حق میں کذب عقلا اور شرعا محال ہے کیونکہ جھوٹ یا تو کسی ضرورت کی بناء پر بولا جائے گا یا بلاضرورت ' کسی ضرورت کی بناء پر جھوٹ بولنا اللہ پر اس لیے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے مستغنی ہے اور بلاضرورت جھوٹ عدم علم کی وجہ سے بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے ' کوئی چیز اس سے غائب نہیں ' یا بلاضرورت قصدا جھوٹ بولا جائے گا اور یہ حماقت ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس دلیل سے تو کلام نفسی میں جھوٹ محال ہوگا اور کلام لفظی میں تو جھوٹ ممکن رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی مخلوق میں ایسی خبر پیدا کر دے جو واقع کے خلاف ہو بایں طور کہ وہ اس مخلوق کا کلام نہ ہو بلکہ اللہ کا کلام ہو اور غیر کی طرف منسوب ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو جیسے قرآن کلام لفظی ہے ' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نقص ہے کیونکہ اس سے جہل تو لازم

نہیں آتا لیکن اس میں تجہیل ہے اور دوسروں کو جاہل بنانا ہے اور یہ بھی اللہ کے لیے نقص ہے اور نقص اللہ پر عقلا محال ہے ' علاوہ ازیں یہ محال شرعی بھی ہے۔

زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور کون ہے جس کی بات اللہ کی بات سے زیادہ سچی ہو۔ "اس کا معنی ہے ' اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سچا ہے نہ کوئی صدق میں اس کے برابر ہے اور نہ کوئی صدق میں اس سے زیادہ ہے ' مخلوق میں سب سے زیادہ سچے انبیاء (علیہم السلام) ہیں لیکن ان کا صدق واجب بالغیر ہے اور ان کے کلام میں کذب ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ' اگر اللہ کا صدق بھی اسی طرح ہو اس کے کلام میں بھی کذب ہو ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہو تو انبیاء (علیہم السلام) اور اللہ تعالیٰ صدق میں مساوی ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور کون ہے جس کی بات اللہ سے زیادہ سچی ہو ' یعنی وہ سب سے زیادہ سچا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کا صدق قدیم اور واجب بالذات ہو اور اس کا کذب ممتنع بالذات ہو۔

مفتی احمد یار خاں نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کا جھوٹ ممتنع بالذات ہے کیونکہ پیغمبر کا جھوٹ ممتنع بالغیر اور رب تعالیٰ تمام سے زیادہ سچا تو اس کا سچا ہونا واجب بالذات ہونا چاہیے ورنہ اللہ کے صدق اور رسول کے صدق میں فرق نہ ہوگا۔ (نور العرفان ص ۱۴۴ ' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ گجرات)

امتناع کذب کے متعلق علماء دیوبند کا عقیدہ :

شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی ۱۳۲۳ھ لکھتے ہیں :

آپ نے مسئلہ امکان کذب کو استفسار فرمایا ہے مگر امکان کذب بایں معنی کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کے خلاف پر وہ قادر ہے مگر باختیار خود اس کو وہ نہ کرے گا یہ عقیدہ بندہ کا ہے اور اس عقیدہ پر قرآن شریف اور احادیث صحاح شاہد ہیں اور علماء امت کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ مثلا فرعون پر ادخال نار کی وعید ہے مگر ادخال جنت فرعون پر بھی قادر ہے اگرچہ ہرگز اس کو نہ دیوے گا ' اور یہی مسئلہ مبحوث اس وقت میں ہے بندہ کے جملہ احباب یہی کہتے ہیں اس کو اعداء نے دوسری طرح پر بیان کیا ہو گا اس قدرت اور عدم ایقاع کو امکان ذاتی وامتناع بالغیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ فقط : (فتاوی رشیدیہ کامل مبوب ص ۸۵۔ ۸۴ مطبوعہ قرآن محل کراچی)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممتنع اور محال بالذات ہے اور محال بالذات تحت قدرت نہیں ہوتا ' مثلا اللہ تعالیٰ کا عدم محال بالذات ہے اور یہ تحت قدرت نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا جہل اور کذب بھی محال بالذات ہے اور یہ تحت قدرت نہیں ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل عبارت میں ہے۔

خلف وعید کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے کذب کو مستلزم نہیں ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں :

امام قرافی اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ کافر کی مغفرت کی دعا کرنا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر کی تکذیب کو طلب کرنا ہے اور یہ کفر ہے۔ (الی قولہ) کیا خلف فی الوعید جائز ہے ؟ مواقف اور مقاصد کی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ اشاعرہ خلف فی الوعید کے قائل ہیں کیونکہ خلف فی الوعید جود اور کرم ہے نقص نہیں ہے ' اور علامہ تفتازانی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ خلف فی الوعید جائز نہیں ہے ' علامہ نسفی نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے کیونکہ خلف فی الوعید محال ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : (آیت) " مایبدل القول لدی "۔ اور فرمایا ہے (آیت) " لن یخلف اللہ وعدہ ای وعیدہ " اور اشبہ بالحق یہ ہے کہ مسلمانوں کے حق میں خلف فی الوعید جائز ہے۔ اور کفار کے حق میں جائز نہیں ہے تاکہ دونوں طرف کے

دلائل میں تطبیق ہو جائے ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : (آیت) " ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشآء "۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ مشرک کی مغفرت نہیں ہوگی ' اور مسلمان نے خواہ کبیرہ گناہ کیا ہو اس کی مغفرت ہو جائے گی ' اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ دعا کی : (آیت) " ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب "۔ ان آیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ کافر کی مغفرت نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے عذاب کی جو وعید فرمائی ہے اس کا خلاف محال ہے اور گناہ گار مسلمانوں کے لیے جو عذاب کی وعید ہے اس کا خلاف ہو جائے گا کیونکہ مسلمان کے حق میں وعید کا یہ معنی ہے کہ اگر تم نے فلاں گناہ کیا تو میں تم کو عذاب دوں گا بشرطیکہ میں نے چاہا یا میں نے تم کو معاف نہ کیا اور اس سے کذب لازم نہیں آتا کیونکہ گناہ گار مسلمانوں کے لیے آیات وعید عدم عفو یا مشیت کے ساتھ مقید ہیں۔ (ردالمختار ج ا ص ۳۵۱' ملخصا وموضحا مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت ۱۴۰۷ھ)

شیخ خلیل احمد انبیٹھوی متوفی ۱۳۴۶ھ لکھتے ہیں :

امکان کذب کا مسئلہ تو اب جدید کسی نے نہیں نکالا بلکہ قدماء میں اختلاف ہوا ہے کی خلف وعید جائز ہے یا نہیں ؟ (براھین قاطعہ ص ۲ مطبوعہ مطبع بلالی ہند)

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اشاعرہ جو خلف وعید کے قائل ہیں وہ گناہ گار مسلمانوں کے حق میں خلف وعید کے قائل ہیں اور عذاب کی آیات کو عدم عفو کے ساتھ مقید کرتے ہیں اور کفار کے حق میں خلف وعید کے قائل نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کذب کے لزوم سے برات کا اظہار کرتے ہیں۔

علامہ کمال الدین بن ابی شریف اشعری المذہب متوفی ۹۰۵ھ لکھتے ہیں :

اشعریہ اور ان کے غیر کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر وہ شے جو بندوں کے حق میں نقص ہو وہ اللہ پر محال ہے اور کذب بندوں کے حق میں وصف نقص ہے سو وہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔ (مسامرہ ج ا ص ۱۸۴ ' مطبوعہ مکران)

اور علامہ بحرالعلوم عبدالعلی بن نظام الدین لکھنوی متوفی ۱۲۲۵ھ لکھتے ہیں :

حق یہ ہے کہ حقیقت سے عدول کرنے کا موجب موجود ہے اور وہ گناہ گار مسلمانوں ' نہ کہ مشرکوں کے لیے جواز عفو کا ثبوت ہے اور یہ ثبوت آفتاب نیم روز کی طرح قطعی اور یقینی ہے پس کفار کے غیر (گناہ گار مسلمانوں) کی وعیدوں میں ظاہر سے عدول کرنا ضروری ہے پس یا تو آیات وعید کو عدم عفو کے ساتھ مقید کیا جائے گا ' (یعنی اگر اللہ ان کو معاف نہ کرے تو یہ سزا دے گا) یا ان کو انشاء تخویف پر محمول کیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ نے گناہ گار مسلمانوں کو عذاب دینے کی خبر نہیں دی بلکہ ان کو عذاب سے ڈرانے کے لیے ایسا فرمایا ہے) رہا وعد تو اس میں حقیقت سے عدول کرنے کا کوئی موجب نہیں تو وہ آیات اپنی حقیقت پر ہیں۔ (فواتح الرحموت مع المستصفی ص ۶۲ ' مطبوعہ مصر ' ۱۲۹۴ھ)

(تبیان)

آیت مبارکہ :

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

لغۃ القرآن: [فَمَا لَكُمْ : تو تمہیں کیا ہے] [فِي الْ ْمُنٰفِقِيْنَ : منافقوں (کے بارے) میں] [فِئَتَيْنِ : (تم لوگ ہوتے ہو) دو گروہ] [وَ : حالانکہ] [اللّٰهُ : اللہ نے] [اَرْكَسَہُمْ : لوٹایا ان کو] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [كَسَبُوْا : انہوں نے کمایا] [اَ : کیا] [تُرِيْدُوْنَ : تم لوگ چاہتے ہو] [اَنْ : کہ] [تَہْدُوْا : تم ہدایت دو] [مَنْ : اس کو جسے] [اَضَلَّ : گمراہ کیا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [وَمَنْ : اور جسے] [يُّضْلِلِ : گمراہ کرتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [فَلَنْ تَجِدَ : تو ہرگز نہیں پائے گا تو] [لَہٗ: اس کے لیے] [سَبِيْلاً : کوئی راہ]

ترجمہ: پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقوں کے بارے میں تم دو گروہ ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کے اپنے کرتوتوں کے باعث ان (کی عقل اور سوچ) کو اوندھا کر دیا ہے۔ کیا تم اس شخص کو راہ راست پر لانا چاہتے ہو جسے اللہ نے گمراہ ٹھہرا دیا ہے، اور (اے مخاطب !) جسے اللہ گمراہ ٹھہرا دے تو اس کے لیے ہر گز کوئی راہ (ہدایت) نہیں پا سکتا۔

تشریح:

بعض لوگ اسلام تو قبول کر لیتے لیکن بال بچوں کی محبت، مال و جائیداد کا پیار اور وطن کی کشش انھیں ہجرت کرنے کی اجازت نہ دیتی اور اس طرح قبول اسلام کے بعد بھی انھیں مشرکوں کی معاندانہ سرگرمیوں میں شریک ہونا پڑتا اور بعض جو ہجرت کر کے مدینہ آ بھی جاتے لیکن وہاں کا نظام حیات، اخلاقی پابندیاں اور ان پر دشمن کے حملوں کا خطرہ انھیں وہاں قیام نہ کرنے دیتا۔ اور وہ آب و ہوا کی ناموافقت کا عذر کر کے واپس لوٹ آتے۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق مسلمانوں کی آرا مختلف تھیں۔ بعض انھیں مسلمان اور دوسرے انھیں خارج از اسلام خیال کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان کے متعلق مختلف الرائے کیوں ہو یہ تو اپنی بداعمالیوں کے باعث جدھر سے آئے تھے ادھر ہی لوٹا دیئے گئے۔ ارکس اور انکس دونوں ہم معنی ہیں۔ کسائی کہتے ہیں الرکس والنکس قلب الشیء علی راسہ والمرکوس المنکوس (القرطبیؒ) رکس اور نکس دونوں کا معنی کسی چیز کو سر کے بل اوندھا گرا دینا ہے۔ ارکس کا یہ لفظ یہاں کتنا موزوں ہے۔ بما کسبوا نے واضح کر دیا کہ ان کا جادہ حق سے منحرف ہونا ان کی اپنی غلط کاریوں کا طبعی ثمر ہے۔ (ضیاء)

شان نزول

یہ آیت ان منافقوں کے بارے میں اتری جن کو مدینہ کی ہوا موافق نہ آئی۔ اور وہ جنگ بدر میں حضور کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستہ میں مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر مکہ چلے گئے اور مشرکین سے مل گئے ان کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف ہوا کہ آیا یہ لوگ منافق ہیں یا مجاہر کافر ہیں اور بوقت موقعہ انھیں قتل کیا جائے یا نہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری لہٰذا آیت پر کوئی اعتراض نہیں (روح) معلوم ہوا کہ کفار سے محبت کبھی ارتداد کا سبب بن جاتی ہے۔ (نور)

حضرت زید بن ثابت (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احد کی طرف نکلے تو آپ کے لشکر میں سے کچھ لوگ واپس ہوگئے۔ آپ کے اصحاب میں سے ایک فریق نے کہا ہم ان کو قتل کریں گے اور دوسرے فریق نے کہا ہم ان کو قتل نہیں کریں گے۔

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: (آیت) " فما لکم فی المنافقین فئتین "۔ (النساء: ۸۸) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مدینہ لوگوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جسے لوہے سے زنگ نکال دیتی ہے۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۱۸۸۴ ' مسند احمد ج ۸ ' رقم الحدیث: ۲۱۶۵۵ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت)

دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کچھ لوگ مکہ سے مدینہ آگئے تھے ' انھوں نے مسلمانوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ مسلمان ہیں پھر وہ مکہ واپس چلے گئے اور مکہ والوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ مشرک ہیں:

مجاہد اس آیت کے شان نزول میں بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے اور انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مہاجر ہیں ' پھر اس کے بعد وہ مرتد ہوگئے ' انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت مانگی کہ وہ مکہ سے اپنا مال لا کر تجارت کریں گے تو ان کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا ' بعض مسلمانوں نے کہا وہ منافق ہیں اور بعض نے کہا وہ مومن ہیں ' اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کو بیان کر دیا اور ان سے قتال کا حکم دیا وہ اپنا مال لے کر مدینہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے تو ان سے ہلال بن عویمر اسلمی نے ملاقات کی ' اس کا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ تھا اور یہی وہ شخص تھا جس کا مسلمانوں سے لڑتے لڑتے دل تنگ ہو چکا تھا یا وہ اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے عاجز ہو چکا تھا ' اس نے ان لوگوں کی مدافعت کی اور کہا یہ مومن ہیں۔ (جامع البیان ج ۵ ص ' ۲۶۳۔ ۲۶۲ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ) دراصل

مکہ معظّمہ اور اس کے گردونواح میں ایسے لوگ اور قبائل موجود تھے جو دنیاوی اغراض اور تعلق داری کی بناپر کفار کے ساتھ مسلمانوں سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ جب ہجرت کا فیصلہ کن حکم آیا کہ دارالکفر کو چھوڑ کر سب مسلمان دارالاسلام مدینہ میں جمع ہو جائیں تاکہ طاقت مجتمع، مرکز مضبوط، اور دین پر عمل کرنے کیلئے بہتر ماحول پا سکیں تو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ترجیح دینے کی بجائے کفار کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ مدینہ میں رہنے والے منافقین کی حالت بھی یہی تھی کہ جب کبھی فیصلہ کا وقت آتا تو ان کی ہمدردیاں کفار اور یہود و نصاری کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ جس کا مظاہرہ وہ غزوہ احد کے وقت کر چکے تھے۔ جونہی مسلمانوں سے مشکل وقت گزر جاتا تو یہ لوگ قسمیں کھا کر اپنی صفائی پیش کرتے جس سے کئی سادہ لوح مسلمان متاثر ہو کر ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے حق میں اپنے ساتھیوں سے بحث کرتے تھے۔ اس صورت حال سے مسلمانوں کے درمیان فکری انتشار ہی نہیں بلکہ دو جماعتیں بننے کا خطرہ پیدا ہو گیا جس پر یہ کہہ کر توجہ دلائی گئی ہے

کہ مسلمانوں ! تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ تم منافقین کے بارے میں آپس میں ایک رہنے کے بجائے دو ہوتے جا رہے ہو۔ کیا منافقین کی خاطر باہمی محبت کمزور اور اتحاد کو پارہ پارہ کر لو گے ؟ حالانکہ انھوں نے تمہارے مقابلے میں کفار کو ترجیح دی ہے۔ تم انھیں مخلص سمجھتے ہو جبکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اندرون خانہ تمھیں گمراہ کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ کیا تم ایسے لوگوں کو ہدایت دینا چاہتے ہو جو ہدایت حاصل کرنے کے بجائے تمھیں بھی اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں ؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں گمراہی میں زیادہ کر دیا اور انھیں اسی طرف پھیر دیا ہے جدھر وہ رہنا اور جانا پسند کرتے ہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اسے کوئی بھی ہدایت پر نہیں لا سکتا۔ (فہم)

مسائل

ا۔ مسلمانوں کو منافقوں کی حمایت کرنا جائز نہیں۔ ۲۔ منافق کو اس کے کردار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ الٹا کر دیتا ہے۔

۳۔ جسے اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

آیت مبارکہ:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

لغۃ القرآن: [وَدُّوْا : انہوں نے چاہا] [لَوْ : (کہ) کاش] [تَكْفُرُوْنَ : تم کفر کرو] [كَمَا : اس طرح جیسے] [كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا] [فَتَكُوْنُوْنَ : تو تم ہو جاؤ] [سَوَآءً : برابر] [فَلاَ تَتَّخِذُوْا : پس تم مت بناؤ] [مِنْہُمْ : ان میں سے] [اَوْلِيَآءَ : کوئی کارساز] [حَتّٰى : یہاں تک کہ] [يُهَاجِرُوْا : وہ ہجرت کریں] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [فَاِنْ : پھر اگر] [تَوَلَّوْا : وہ منہ موڑیں] [فَخُذُوْہُمْ : تو تم گرفتار کرو ان کو] [وَاقْتُلُوْہُمْ : اور قتل کرو ان کو] [حَيْثُ : جہاں کہیں] [وَجَدْتُّمُوْہُمْ : تم پاؤ ان کو] [وَلاَ تَتَّخِذُوْا : اور مت بناؤ] [مِنْہُمْ : ان میں سے] [وَلِيًّا : کوئی کارساز] [وَّلاَ نَصِيْرًا : اور نہ ہی کوئی مددگار]

مترادفات: وَدُّوْا : محبت ومودت ۔][تَتَّخِذُوْا : ۔ اخذ ، ماخوذ ، مواخذہ ۔][مِنْ هُمْ : منجانب ، من حیث القوم ، من وعن][اَوْلِیَآءَ : ولی ، ولایت ، اولیاء اللہ ۔][حَتّٰی : حتی کہ ، حتی المقدور ، حتی الوسعت ۔][یُهَاجِرُوْا : ہجرت ، مدینہ ، مہاجر ۔][اقْتُلُوْ هُمْ : قتل ، قاتل ، مقتول ۔][حَیْثُ : حیثیت ، من حیث القوم ۔][جَدْتموْ هُمْ : وجود ، موجود ۔][مِنْ هُمْ : منجانب ، من حیث القوم ، من وعن ۔][وَلِیًّا : ولی ، ولایت ، اولیاء اللہ ۔][نَصِیْرًا : ۔ ناصر ، منصور ، انصار ۔]

ترجمہ: وہ (منافق تو) یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے انھوں نے کفر کیا تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ سو تم ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت (کر کے اپنا ایمان اور اخلاص ثابت) کریں، پھر اگر وہ روگردانی کریں تو انھیں پکڑ لو اور جہاں بھی پاؤ انھیں قتل کر ڈالو اور ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ اور نہ مددگار

تشریح: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا تھا تم ان منافقوں کو ہدایت یافتہ بنانا چاہتے ہو 'اور آیت میں فرمایا: حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ تم کو کافر بنانا چاہتے ہیں اس لیے تم ان کو دوست نہ بناؤ کفار کو دوست بنانے سے قرآن مجید اور احادیث میں منع کیا گیا ہے۔

(آیت) "یایھا الذین امنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیآء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بماجآءکم من الحق"۔ (الممتحنۃ: ۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ 'تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ انھوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت کے آخر میں کچھ لوگ ظاہر ہوں گے ' جو تمہارے سامنے ایسی حدیثیں بیان کریں گے جن کو تم نے سنا ہو گا نہ تمہارے باپ دادا نے 'تم ان سے دور رہنا وہ تم سے دور رہیں۔ (مقدمہ صحیح مسلم 'رقم الحدیث: ٦)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: آخر زمانہ میں دجال اور کذاب ہوں گے 'جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جن کو تم نے سنا ہو گا نہ تمہارے باپ دادا نے، تم ان سے دور رہنا وہ تم سے دور رہیں کہیں وہ تم کو گمراہ نہ کر دیں اور تم کو فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: منکرین تقدیر کے ساتھ مت بیٹھو اور نہ ان سے پہلے مخاطب۔ (سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث: ۴۷۱۰)

ہجرت کی تعریف اور اس کی اقسام

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم ان (منافقوں) کو دوست نہ بناؤ حتیٰ کہ وہ ہجرت کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں ' اس کا معنی یہ ہے کہ وہ منافق پہلے خلوص قلب سے اسلام لائیں پھر ہجرت کریں کیونکہ ایمان اور اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہے۔
ہجرت کا معنی ہے دارالحرب کو ترک کر کے دارالاسلام میں منتقل ہونا۔
جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے آگئے تو مکہ کے مسلمانوں پر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت واجب ہو گئی اور جب مکہ فتح ہو گیا تو اب یہ ہجرت منسوخ ہو گئی کیونکہ اب مکہ دارالاسلام بن گیا ' جو مسلمان کسی کافر ملک میں رہتے ہوں اور وہاں ایمان کے اظہار کی وجہ سے ان کی جان ' مال اور عزت کے ہلاک ہونے کا یقینی خطرہ ہو ان پر واجب ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں ' النساء : ۹۷ ' میں انشاء اللہ ہم اس ہجرت کی فرضیت کو بیان کریں گے۔
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہجرت کو سخت اور مشکل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے یہ ہجرت قیامت تک باقی رہے گی '

ہجرت کی ایک اور قسم ہے دارالخوف سے دارالامن میں منتقل ہونا
جیسے مسلمان مکہ سے حبشہ میں منتقل ہو گئے تھے یا جیسے مسلمان بھارت سے برطانیہ ' ہالینڈ ' جنوبی افریقہ اور جرمنی وغیرہ کافر ملکوں میں منتقل ہو جائیں ' اور ہجرت کی تیسری قسم ہے گناہوں سے ہجرت کرنا ' اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں۔
قیامت تک ہجرت کا مشروع ہونا :
حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو ' اور توبہ اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۲۴۷۹ ' مسند احمد ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۶۷۱ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت)
بعض احادیث میں مذکور ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں رہی۔
حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہجرت کے متعلق سوال کیا گیا آپ نے فرمایا فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے ' لیکن جہاد اور نیت ہے ' جب تم کو جہاد کے لیے طلب کیا جائے تو تم روانہ ہو جاؤ۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۸۶۴ ' ۱۸۶۳ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۱۸۳۴ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۲۴۸۰ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۱۵۹۰ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۴۱۸۰)
اس حدیث کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت منسوخ ہو گئی اور مطلقا دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت قیامت تک مشروع ہے۔
اصل ہجرت گناہوں کو ترک کرنا ہے۔
ہجرت کا دور معنی یہ ہے کہ برے کاموں کو چھوڑ کر توبہ کرنا اور نیک کاموں طرف منتقل ہونا ' اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مہاجر وہ ہے جس نے اللہ کی منع کیے ہوئے کاموں سے ہجرت کی (یعنی ان کو ترک کردیا) (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۱۰)

حضرت عبداللہ بن حبشی خثعمی (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کون سی ہجرت افضل ہے ؟ آپ نے فرمایا جس نے اللہ کے حرام کیے ہوئے کاموں سے ہجرت کرلی (سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۲۵۲۵ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۱۴۴۹ ' سنن دارمی ' رقم الحدیث : ۱۴۲۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہجرت کے متعلق دریافت کیا ' آپ نے کچھ دیر توقف کیا پھر فرمایا سائل کہاں ہے ' اس نے کہا میں حاضر ہوں یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ﷺ نے فرمایا ہجرت یہ ہے کہ تم تمام بےحیائی کے کاموں کو چھوڑ دو خواہ وہ کام ظاہر کیے جائیں یا چھپ کر اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو پھر تم مہاجر ہو خواہ تم اپنے شہر میں مرجاؤ (مسند احمد ج ۲ ' رقم الحدیث : ۷۱۱۷ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ ھ)

عبید بن عمیر لیثی بیان کرتے ہیں ہم نے حضرت عائشہ (رض) سے ہجرت کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا اب ہجرت نہیں رہی پہلے مسلمانوں میں کوئی شخص اپنے دین کی حفاظت کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بھاگ کر جاتا تھا ' اس کو یہ خطرہ ہوتا تھا کہ دین پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوجائے لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کردیا ' اب انسان جہاں چاہے اپنے رب کی عبادت کرے لیکن جہاد اور نیت باقی ہے۔ (صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ۳۹۰۰)

ہجرت کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

اس حدیث کی فقہ یہ ہے کہ اگر اب کسی جگہ اسلام کی وجہ سے مسلمان کو فتنہ کا خطرہ ہو تو اب بھی اس پر ہجرت فرض ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے کہ ابتداء اسلام میں ہجرت فرض تھی پھر فتح مکہ کے بعد ہجرت کرنا مستحب ہے ' علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک ہجرت وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے ایک مسلمان اپنے اہل مال اور گھربار کو چھوڑ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چلا جاتا تھا فتح مکہ کے بعد یہ ہجرت منسوخ ہوگئی ' اور دوسری ہجرت وہ ہے جیسے اعراب ہجرت کرتے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جہاد کرتے تھے اور اول الذکر کی طرح ہجرت نہیں کرتے تھے یہ ہجرت قیامت تک باقی ہے ' میں کہتا ہوں ہجرت کی ایک اور قسم بھی ہے وہ ہے گناہوں سے ہجرت کرنا ' امام احمد حضرت بن عمرو بن العاص (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک قسم یہ ہے کہ تم برائیوں اور گناہوں سے ہجرت کرو اور دوسری قسم یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرو اور جب تک توبہ منقطع نہ ہو یہ ہجرت منقطع نہیں ہوگی اور جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو توبہ منقطع نہیں ہوگی۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۳۰۔ ۲۹ ' مطبوعہ مصر)

فوائد

1۔ منافق کلمہ پڑھ کر تم میں نہیں آئے بلکہ تمہیں لینے آئے تھے کہ تم سے میل جول کر کے کفر میں داخل کریں۔ دیکھ لو اب وہ مکہ بھاگ گئے مشرکین سے مل گئے اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے کو کافر کرنے کی کوشش کرنا کفر ہے۔

2۔اس ایت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کافر، مرتد، بدمذہب کو دوست بنانا حرام ہے اگرچہ وہ کلمہ پڑتا ہو اور اپنے کو مسلمان کہتا ہو جیسے اس زمانے کے منافق تھے۔
4۔اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اصل کافر کے لیے یا اسلام یا جزیہ یا قید یا قتل ہے۔ مگر مرتد کے لیے یا اسلام یا قتل۔
5۔ معلوم ہوا کہ دینی امور میں مشرک سے مدد نہ لی جائے البتہ بوقت ضرورت الضرورات تبیح المحذورات پر عمل کرنا چاہیے۔

آیت مبارکہ:

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا ﴿۹۰﴾

لغۃ القرآن: [اِلاَّ الَّذِیْنَ : سوائے ان کے جو] [یَصِلُوْنَ : تعلق رکھتے ہیں] [اِلٰی قَوْمٍ : ایک ایسی قوم سے] [بَیْنَکُمْ : تمہارے درمیان] [وَبَیْنَہُمْ : اور جن کے درمیان] [مِّیْثَاقٌ: ایک معاہدہ ہے] [اَوْ : یا] [جَآئُ وْکُمْ : وہ آئیں تمہارے پاس] [حَصِرَتْ : گھٹن محسوس کریں] [صُدُوْرُہُمْ : جن کے سینے] [اَنْ : کہ] [یُّقَاتِلُوْکُمْ : وہ جنگ کریں تم سے] [اَوْ : یا] [یُقَاتِلُوْا : وہ جنگ کریں] [قَوْمَہُمْ : اپنی قوم سے] [وَلَوْ : اور اگر] [شَآئَ : چاہتا] [اللّٰہُ : اللہ] [لَسَلَّطَہُمْ : تو غلبہ دیتا ان کو] [عَلَیْکُمْ : تم پر] [فَلَقٰتَلُوْکُمْ : تو وہ ضرور جنگ کرتے تم سے] [فَاِنِ : پھر اگر] [اعْتَزَلُوْکُمْ : وہ کنارہ کش ہوں تم سے] [فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ : پھر جنگ نہ کریں تم سے] [وَاَلْقَوْا : اور وہ ڈالیں] [اِلَیْکُمُ : تمہاری طرف] [السَّلَمَ : صلح] [فَمَا جَعَلَ : تو نہیں بنایا] [اللّٰہُ : اللہ نے] [لَکُمْ : تمہارے لیے] [عَلَیْہِمْ : ان پر] [سَبِیْلاً : کوئی راستہ]

ترجمہ: مگر ان لوگوں کو (قتل نہ کرو) جو ایسی قوم سے جا ملے ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ (امان ہو چکا) ہو یا وہ (حوصلہ ہار کر) تمہارے پاس اس حال میں آ جائیں کہ ان کے سینے (اس بات سے) تنگ آ چکے ہوں کہ وہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں، اور اگر اللہ چاہتا تو (ان کے دلوں کو ہمت دیتے ہوئے) یقیناً انھیں تم پر غالب کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے، پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کر لیں اور تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لیے (بھی صلح جوئی کی صورت میں) ان پر (دست درازی کی) کوئی راہ نہیں بنائی

تشریح: ایسے منافقوں اور کافروں سے لڑنا اور انھیں قتل کرنا ضروری ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بر سر پیکار ہوں۔ یہاں ان کفار اور منافقوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا بقائے باہمی کا معاہدہ ہو یا وہ اسلام اور مسلمانوں کے راستے میں حائل نہ ہوں۔

دو طرح کے گروہ

یہ بات پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ اسلام جنگ جو مذہب نہیں اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ وہ ایسے لوگوں سے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا جو صلح جو ہوں اور اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ یہاں اس بات کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے لڑنے کی تمہیں اجازت نہیں جو تمہاری حلیف قوم کے ساتھی ہیں یا وہ تمہارے ساتھ مل کر لڑنا یا تمہارے مخالفوں کے ساتھ مل کر تم سے لڑنا پسند نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ تمہیں ہر گز نہیں لڑنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ لڑنے سے گریز کریں اور تم سے صلح کرنا چاہتے ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے لڑنے کا تمہارے لیے کوئی جواز نہیں بنایا۔ (فہم)

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا حکم بیان کیا جا رہا ہے جو مذکورہ بالا اخذ و قتل کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اس قوم یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ صلح ہے اور یا اس قبیلے کے پاس جا کر پناہ لے لیں اور وہ قبیلہ انھیں اپنے پناہ میں لے لے۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ معاہدہ صلح تو نہ ہوا البتہ وہ مسلمانوں کے پاس آ کر اپنی کمزوری کا اظہار کریں اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ہم نہ آپ سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ ہم لڑائی سے یکسر دور رہنا چاہتے ہیں۔ اگر لڑائی چھڑ جائے تو نہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور نہ ہم آپ کے خلاف اپنی قوم کا ساتھ دیں گے۔ ان دونوں گروہوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اگر وہ لوگ اپنے معاہدے اور اپنے اقرار پر قائم رہیں تو تم بھی ان سے کنارہ کش رہو۔ جنھوں نے معاہدہ کیا ہے وہ تو معاہدے کی وجہ سے مسلمانوں سے محفوظ ہوں گے اور جن لوگوں نے اپنی بے بسی اور پس ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ صلح سے رہنے کا ارادہ کیا ہے مسلمان ان سے بھی کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ ان کے خاموش رہنے کو غنیمت سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جرأت دے دیتا اور وہ مسلمانوں پر اپنی قوم کے ساتھ مل کر چڑھ دوڑتے۔ اب اگر وہ مسلمانوں سے تعرض نہیں کرتے اور لڑائی میں اپنی قوم کا ساتھ نہیں دیتے اور اپنے صلح جویانہ رویے پر قائم رہتے ہیں کہ پروردگار فرماتے ہیں تو تمہیں بھی ان کے خلاف اقدام کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ

سمجھا جائے کہ ان سے محبت اور آشتی کے تعلقات بڑھانے کی اجازت ہے نہیں بلکہ صرف یہ اجازت دی گئی ہے کہ تم ان کے خلاف لڑ نہیں سکتے ہو اور اپنے ہاتھوں کو ان سے روکے رکھو۔ لیکن ان سے محبت اور پیار کی پینگیں بڑھانے کی اجازت نہیں۔ (روح)

خلاصہ یہ ہے کہ جن کافروں سے مسلمانوں نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا تو سورۃ النساء : ۹۰ کی اس آیت کے مطابق ان سے جنگ نہیں کی جائے گی اور جن کافروں نے مسلمانوں سے لڑنا چھوڑ دیا ہے اور وہ جنگ سے تنگ آچکے ہیں ان سے نہ لڑنے کا حکم التوبہ : ۵ کے حکم سے منسوخ ہے۔

ابو مسلم اصفہانی نے کہا یہ استثناء مسلمانوں کے متعلق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر ہجرت کو فرض کردیا تو جو لوگ ہجرت کرنے سے معذور تھے ان کو مستثنیٰ کردیا یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کا قصد کریں لیکن ان کے راستہ میں کفار ہوں جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو جس کی وجہ سے وہ ہجرت نہ کریں یا جو مسلمان اس لیے کفار سے جہاد نہ کریں اور وہاں سے ہجرت نہ کریں کہ ان کافروں کے درمیان ان کے اہل اور رشتہ دار ہوں اور ان کو یہ خوف ہو کہ اگر انھوں نے وہاں سے ہجرت کی یا ان کافروں کے خلاف جہاد کیا تو وہ ان کے اہل اور رشتہ داروں کو قتل کردیں گے تو وہ بھی معذور ہیں اور ان مسلمانوں کے خلاف جنگ اور جہاد کرنے کا اللہ تعالیٰ نے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا۔ (تبیان)

فوائد

1 : یعنی ایسے نیوٹرل اور غیر جانبدار لوگوں کو قتل نہ کرو جو نہ تم سے لڑیں نہ اپنی کافر قوم کی تمہارے مقابلہ میں مدد کریں نہ تم سے مل کر ان سے جنگ کریں بہر حال اس استثناء کا تعلق و اقتلوھم سے ہے نہ ولیا سے کیونکہ کافر کو دوست بنانا جائز نہیں خواہ وہ حربی ہو یا ذمی مستامن ہو یا معاہد، اس سے معلوم ہوا کہ معاہدہ پورا کرنا ضروری ہے اگرچہ کافر سے کیا جاوے رب فرماتا ہے اوفوا بالعھد ان العھد کان مسؤلا۔

2 : یعنی جن کفار سے تمہارا معاہدہ ہوچکا ہے ان سے نہ لڑو۔ اپان عہد پورا کرو یہ استثناء صرف قتل سے ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ انھیں دوست بناؤ۔

3 : اس سے معلوم ہوا کہ کبھی مسلمانوں کی قوت ایمانی کفار کے دلوں میں رعب کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی اور اس کے کرم سے ہے۔

4 : پچھلی آیت میں ان کفار کا ذکر تھا جن سے پہلے ہی معاہدہ ہوچکا ہے کہ اب عہد نہ توڑو اور ان سے نہ لڑو۔ اور۔ اس آیت میں ان کفار کا ذکر ہے جو ہم سے معاہدہ اور صلح کرنا چاہیں۔ اب تک ان سے صلح نہ تھی لہٰذا آیت میں تکرار نہیں یا یہ حصہ پچھلے حصہ کی تفصیل و تفسیر ہے۔

5 : یعنی ان سے جنگ کی اجازت نہیں، صلح قبول کرلو۔ یہ آیت منسوخ ہے اقتلوا المشرکین سے اور اسلامی سلطان کو صلح کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع

لغۃ القرآن: [سَتَجِدُوْنَ : عنقریب تم پاؤ گے] [اٰخَرِيْنَ : دوسروں کو] [يُرِيْدُوْنَ : وہ چاہتے ہیں] [اَنْ : کہ] [يَّاْمَنُوْكُمْ : امن میں ہوں تم سے] [وَيَاْمَنُوْا : اور امن میں ہوں] [قَوْمَهُمْ : اپنی قوم سے] [كُلَّمَا : جب کبھی] [رُدُّوْٓا : وہ لوٹائے جاتے ہیں] [اِلَى الْفِتْنَةِ : آزمائش کی طرف] [اُرْكِسُوْا : تو وہ اوندھے کیے جاتے ہیں] [فِيْهَا : اس میں] [فَاِنْ : پھر اگر] [لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ : وہ کنارہ کش نہ ہوں تم سے] [وَيُلْقُوْٓا : اور نہ ڈالیں] [اِلَيْكُمُ : تمہاری طرف] [السَّلَمَ : صلح] [وَيَكُفُّوْٓا : اور نہ روکیں] [اَيْدِيَهُمْ : اپنے ہاتھوں کو] [فَخُذُوْهُمْ : تو تم گرفتار کرو ان کو] [وَاقْتُلُوْهُمْ : اور قتل کرو ان کو] [حَيْثُ : جہاں بھی] [ثَقِفْتُمُوْهُمْ : تم پاؤ ان کو] [وَاُولٰٓئِكُمْ : اور یہ لوگ ہیں] [جَعَلْنَا : ہم نے بنائی] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [عَلَيْهِمْ : جن پر] [سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا : ایک واضح دلیل]

ترجمہ: اب تم کچھ دوسرے لوگوں کو بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ (منافقانہ طریقے سے ایمان ظاہر کر کے) تم سے (بھی) امن میں رہیں اور (پوشیدہ طریقے سے کفر کی موافقت کر کے) اپنی قوم سے (بھی) امن میں رہیں، (مگر ان کی حالت یہ ہے کہ) جب بھی (مسلمانوں کے خلاف) فتنہ انگیزی کی طرف پھیرے جاتے ہیں تو وہ اس میں (اوندھے) کود پڑتے ہیں، سو اگر یہ (لوگ) تم سے (لڑنے سے) کنارہ کش نہ ہوں اور (نہ ہی) تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں اور (نہ ہی) اپنے ہاتھ (فتنہ انگیزی سے) روکیں تو تم انھیں پکڑ (کر قید کر) لو اور انھیں قتل کر ڈالو جہاں کہیں بھی انھیں پاؤ، اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے

تشریح:

شان نزول

مدینہ طیبہ میں قبیلہ ء اسد وغطفان کے لوگ ریاءً کلمہ ء اسلام پڑھتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے اور جب ان میں سے کوئی اپنی قوم سے ملتا اور وہ لوگ ان سے کہتے کہ تم کس چیز پر ایمان لائے تو وہ لوگ کہتے کہ بندروں بچھوؤں وغیرہ پر اس انداز سے ان کا مطلب یہ تھا کہ دونوں طرف سے رسم وراہ رکھیں اور کسی جانب سے انھیں نقصان نہ پہنچے یہ لوگ منافقین تھے ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن)

اس آیت میں منافقین کی ایک اور قسم بیان کی گئی ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کے سامنے اسلام کو ظاہر کرتے تھے تاکہ وہ قتل کیے جانے ' گرفتار ہونے اور اموال کے چھن جانے سے محفوظ رہیں اور درحقیقت وہ کافر تھے اور کافروں کے ساتھ تھے اور جب بھی کافر ان کو شرک اور بت پرستی کی پرستی کی طرف بلاتے تو یہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے ' ان کے مصداق میں اختلاف ہے ' ایک قول یہ ہے کہ وہ مکہ میں رہتے تھے اور بطور تقیہ اسلام لے آئے تھے ' تاکہ اپنے آپ کو اور اپنے رشتہ داروں کو قتل کیے جانے سے محفوظ رکھیں اور جب کفار ان کو بت پرستی کی طرف بلاتے تو وہ چلے جاتے تھے ' اس تقدیر پر فتنہ سے مراد شرک اور بت پرستی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تہامہ کا ایک قبیلہ تھا ' انھوں نے کہا تھا اے اللہ کے نبی ہم آپ سے قتال کریں گے نہ ہماری قوم آپ سے قتال کرے گی اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی امان میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی ' اس کے باوجود جب بھی مشرکین فتنہ اور فساد کی آگ بھڑکاتے تو وہ اس میں کود پڑتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: پس اگر وہ تم سے الگ نہ ہوں اور تمہیں صلح کا پیغام نہ بھیجیں اور (لڑائی سے) اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو پکڑ لو اور ان کو جہاں پاؤ قتل کردو ' یہ وہ لوگ ہیں جن پر (ہاتھ اٹھانے کے لیے) ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔ (النساء: ۹۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر یہ منافق اپنی روش پر قائم رہیں تو ان سے کھلا جہاد کرو۔ (تبیان)

مختصراً یہ کہ گزشتہ آیت میں دو قسم کے کفار کو قید یا قتل کرنے کی اجازت نہ ہونا بیان فرمایا گیا تھا ایک وہ جن سے مسلمانوں نے معاہدہ صلح وامن کرلیا ہو۔ دوسرے وہ جو بالکل الگ تھلگ غیر جانبدار رہیں۔ نہ کافروں کے طرف دار رہیں نہ مسلمانوں کے جانب دار اور اس طرح ان کا غیر جانبدار رہنا ان کی امن پسندی کی دلیل ہے اس لیے مسلمانوں کو ان سے بھی جنگ و قتال جائز نہیں

کافروں کی تین اقسام کا حکم

مسلمانوں پر فرض ولازمی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے معاہدہ کا احترام کرنا لازم ہے۔ ہاں جو قوم تخریب اسلام کے درپے اور مسلمانوں کی بیخ کنی چاہتی ہو ان سے جنگ وجہاد اور ان کو قتل وقید کرنا واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ آیات اور اس آیت میں تین فرقوں کا ذکر ہوا جن کے متعلق دو حکم مذکور ہوئے۔

ایک فرقہ جو ہجرت کے شرط کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے یا ہجرت کرنے کے بعد دارالسلام سے نکل کر پھر دارالکفر میں چلے جائیں۔ان کا حکم عام کفار کی مانند ہے اور ان کی سزا قتل و قید ہے۔ یہ صورت قبل فتح مکہ کے تھی اب صورت باقی نہیں رہی۔
دوسرا فرقہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کرلیں یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کرلیں تو ان کا حکم یہ ہے کہ یہ قتل وقید اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہیں اور اس حالت میں ان کے قتل وقید کی اجازت نہیں۔
تیسرا فرقہ جو محض دھوکا دینے اور دفع الوقتی کی غرض سے مسلمانوں سے صلح کرلے لیکن جب مسلمانوں کے خلاف ان کو جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہو جائیں اور اپنے عہد صلح پر قائم نہ رہیں۔ان کا حکم پہلے فریق کے قتل وقید ہے
دعاء کیجئے: اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین کے فتنوں سے اہل اسلام کی حفاظت فرمائیں اور اپنی حمایت اور نصرت سے اہل اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں اور اعدائے دین کو مغلوب اور ذلیل و خوار نہ کریں۔
اے اللہ اپنے دین کی بلندی کے لیے ہمیں کفار سے جہاد کرنے کا صحیح جذبہ اور عزم نصیب فرما اور ہمیں اعدائے دین کے مقابلہ ومقاتلہ کی قوت وطاقت عطا فرما۔
یا اللہ جب سے اہل اسلام کے جذبہ جہاد میں کمی آئی ان کا کفارہ مشرکین پر رعب وہیبت نہ رہا۔ بلکہ الٹا کفار کا ان پر غلبہ اور تسلط ہو گیا۔ یا اللہ اپنے دین کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی پھر اہل اسلام کی توفیق عطا فرما اور اس بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد کرنے کا عزم نصیب فرما۔
یا اللہ ہم کو پھر قرآنی تعلیمات وہدایات کا متبع بنادے اور دین کے لیے جینے اور مرنے کا جذبہ صادقہ عطا فرما۔
یا اللہ ہمیں اپنے عہد و معاہدہ کا ایفا اور احترام ہر حال میں کرنے کی توفیق مرحمت فرما اور وعدہ شکنی کے گناہ سے بچنے کا عزم نصیب فرما۔ آمین۔
واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِــيْمًا ﴿٩٢﴾

لغۃ القرآن: [وَمَا كَانَ : اور نہیں ہے (روا)] [لِمُؤْمِنٍ : کسی مؤمن کے لیے] [اَنْ : کہ] [يَّقْتُلَ : وہ قتل کرے] [مُؤْمِنًا : کسی مؤمن کو] [اِلاَّ : مگر] [خَطَـًٔا : غلطی سے] [وَمَنْ : اور جس نے] [قَتَلَ : قتل کیا] [مُؤْمِنًا : کسی مؤمن کو] [خَطَـًٔا : غلطی سے] [فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ : تو کسی مؤمن گردن کا آزاد کرنا ہے] [وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ: اور سپرد کیا ہوا خون بہا ہے] [اِلٰٓى اَہْلِہٖٓ: اس کے گھر والوں کی طرف] [اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ] [يَّصَّدَّقُوْا : وہ اپنا حق چھوڑ دیں] [فَاِنْ كَانَ : پھر اگر وہ تھا] [مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ : تمہاری دشمن قوم میں سے] [وَہُوَ : اور وہ] [مُؤْمِنٌ : مؤمن ہو] [فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ : تو کسی مؤمن گردن کا آزاد کرنا ہے] [وَاِنْ كَانَ : اور اگر وہ تھا] [مِنْ قَوْمٍ : ایک ایسی قوم سے] [بَيْنَكُمْ : تمہارے درمیان] [وَبَيْنَہُمْ : اور جن کے درمیان] [مِّيْثَاقٌ: کوئی معاہدہ ہے] [فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ: تو سپرد کیا ہوا خون بہا ہے] [اِلٰٓى اَہْلِہٖ : اس کے گھر والوں کی طرف] [وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ : اور کسی مؤمن گردن کا آزاد کرنا ہے] [فَمَنْ : پھر جو] [لَّمْ يَجِدْ : نہ پائے (اس کو)] [فَصِيَامُ شَہْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ : تو لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں] [تَوْبَةً : توبہ کرتے ہوئے] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ سے] [وَكَانَ اللّٰهُ : اور اللہ ہے] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ: اور کسی مسلمان کے لیے (جائز) نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے مگر (بغیر قصد) غلطی سے، اور جس نے کسی مسلمان کو نادانستہ قتل کر دیا تو (اس پر) ایک مسلمان غلام / باندی کا آزاد کرنا اور خون بہا (کا ادا کرنا) جو مقتول کے گھر والوں کے سپرد کیا جائے (لازم ہے) مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، پھر اگر وہ (مقتول) تمہاری دشمن قوم سے ہو اور وہ مومن (بھی) ہو تو (صرف) ایک غلام / باندی کا آزاد کرنا (ہی لازم) ہے اور اگر وہ (مقتول) اس قوم میں سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح کا) معاہدہ ہے تو خون بہا (بھی) جو اس کے گھر والوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مسلمان غلام / باندی کا آزاد کرنا (بھی لازم) ہے۔ پھر جس شخص کو (غلام / باندی) میسر نہ ہو تو (اس پر) پے در پے دو مہینے کے روزے (لازم) ہیں۔ اللہ کی طرف سے (یہ اس کی) توبہ ہے، اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

تشریح: اس آیت کا شان نزول میں متعدد اقوال ہیں ' ایک قول یہ ہے کہ جنگ احد میں مسلمانوں نے حضرت حذیفہ (رض) کے والد یمان کو غلط فہمی سے قتل کر دیا تھا ' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔
حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ جنگ احد کے دن مشرکین شکست کھا گئے تھے اس وقت ابلیس لعنت اللہ علیہ نے چلا کر کہا: اے اللہ کے بندو اے اللہ کے بندو اپنے پیچھے والوں پر حملہ کرو ' پھر اگلی صفوں نے پچھلی صفوں پر حملہ کیا اور وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اچانک حضرت حذیفہ (رض) نے دیکھا کہ مسلمان حضرت یمان پر حملہ کر رہے ہیں ' انھوں نے چلا کر کہا یہ میرے باپ ہیں ' یہ میرے باپ ہیں حضرت عائشہ (رض) بیان کیا بہ خدا وہ اس وقت تک باز نہیں آئے جب تک کہ انھوں نے حضرت یمان کو قتل نہیں کر دیا ' حضرت حذیفہ (رض) نے کہا اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۳۰۶۵)
دوسرا قول
یہ آیتِ مبارکہ عیاش بن ربیعہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا واقعہ یوں ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں مسلمان ہو گئے اور گھر والوں کے خوف سے مدینہ طیبہ جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔ ان کی ماں کو اس سے بہت بے قراری ہوئی اور اس نے حارث اور ابو جہل اپنے دونوں بیٹوں سے جو عیاش کے سوتیلے بھائی تھے یہ کہا کہ خدا کی قسم نہ میں سایہ میں بیٹھوں گی اور نہ کھانا چکھوں گی اور نہ پانی پیوں گی جب تک تم عیاش کو میرے پاس نہ لے کر آؤ۔ وہ دونوں حارث بن زید کو ساتھ لے کر تلاش کے لیے نکلے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر عیاش کو پا لیا اور ان کو ماں کے جزع فزع کرنے، بے قراری اور کھانا پینا چھوڑنے کی خبر سنائی اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نام پر یہ عہد کیا کہ ہم دین کے متعلق تجھ سے کچھ نہ کہیں گے، بس تم مکہ مکرمہ چلو۔ اس طرح وہ عیاش کو مدینہ سے نکال لائے اور مدینہ سے باہر آ کر اس کو باندھا اور ہر ایک نے سو سو کوڑے مارے پھر ماں کے پاس لائے تو ماں نے کہا میں تیری مشکیں نہ کھولوں گی جب تک تو اپنا دین ترک نہ کرے گا، پھر عیاش کو دھوپ میں بندھا ہوا ڈال دیا اور ان مصیبتوں میں مبتلا ہو کر عیاش نے ان کا کہا مان لیا اور اپنا دین ترک کر دیا۔ اس پر حارث بن زید نے عیاش کو ملامت کی اور کہا تو اسلام پر تھا، اگر یہ حق تھا تو تو نے حق کو چھوڑ دیا اور اگر باطل تھا تو تو باطل دین پر رہا۔ یہ بات عیاش کو بڑی ناگوار گزری اور عیاش نے حارث سے کہا کہ میں تجھے اکیلا پاؤں گا تو خدا کی قسم، ضرور تمہیں قتل کر دوں گا اس کے بعد عیاش اسلام لے آئے اور انھوں نے مدینہ طیبہ ہجرت

کر لی اور ان کے بعد حارث بھی اسلام لے آئے اور وہ بھی ہجرت کر کے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ گئے لیکن اس روز عیاش موجود نہ تھے اور نہ انھیں حارث کے اسلام کی اطلاع ہوئی۔ قباء شریف کے قریب عیاش نے حارث کو دیکھ لیا اور قتل کر دیا تو لوگوں نے کہا، اے عیاش! تم نے بہت برا کیا، حارث اسلام لا چکے تھے۔ اس پر عیاش کو بہت افسوس ہوا اور انھوں نے رحمت دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا اور کہا کہ مجھے قتل کے وقت تک ان کے اسلام کی خبر ہی نہ ہوئی اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور کفارے کی صورت بیان کی گئی۔ (بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۹۲، ۳۶۸/۱)

تیسرا قول

تیسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابوالدرداء (رض) نے ایک مسلمان کو غلط فہمی سے قتل کر دیا تھا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:
ابن زید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء کسی لشکر کے ساتھ جارہے تھے وہ قضاء حاجت کے لیے ایک گھاٹی میں اترے تو انھوں نے ایک شخص کو دیکھا وہ اپنی بکریوں کو لے جارہا تھا ' انھوں نے اس پر تلوار سے حملہ کیا اس نے کہا "لاالہ الااللہ" حضرت ابوالدرداء نے اس کو قتل کر دیا ' اور اس کی بکریاں لے کر اپنے اصحاب کے پاس آگئے پھر ان کے دل میں اضطراب ہوا ' انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس واقعہ کا ذکر کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم نے اس کا دل چیر کا کیوں نہیں دیکھا! اس نے تم کو اپنی زبان سے اسلام لانے کی خبر دی ' اور تم نے اس کی تصدیق نہیں کی ' حضرت ابوالدرداء نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب میرا کیا ہوگا ' آپ نے فرمایا "لاالہ الااللہ" کا کیا ہوگا ' میں بار بار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہی عرض کرتا اور آپ یہی فرماتے حتی کہ میں نے تمنا کی کاش یہ واقعہ میرے اسلام لانے سے پہلے کا ہوتا۔ (جامع البیان جز ۵ ص ۲۷۸ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۴۱۵ھ)
چوتھا قول سعید بن جبیر کا ہے ' انھوں نے کہا کہ یہ آیت حضرت اسامہ بن زید (رض) کے متعلق نازل ہوئی ہے انھوں نے غلط فہمی سے مرداس بن عمر کو خطاء قتل کر دیا تھا۔ (روح المعانی ' الدرالمنثور) اس کی تفصیل یہ ہے:
حضرت اسامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک لشکر میں بھیجا ' ہم صبح کے وقت جہینہ کے ایک مقام حرقات میں پہنچے ' میں نے ایک شخص کو پکڑ لیا اس نے کہا "لاالہ الااللہ" میں نے اس کو نیزہ سے مار دیا ' پھر مجھے اضطراب ہوا تو میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس واقعہ کا ذکر کیا ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا اس نے "لاالہ الااللہ" کہہ دیا تھا پھر تم نے اس کو قتل کر دیا ' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نے حملہ کے خوف سے "لاالہ الااللہ" کہا تھا ' آپ نے فرمایا تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھا حتی کہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس نے دل سے کہا ہے یا نہیں! آپ بار بار یہ کلمات فرماتے رہے حتی کہ میں نے تمنا کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۹۶ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۴۲۰۱ ' ۶۴۷۸ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۲۶۴۳)
{ وَمَن قَتَلَ: اور جو قتل کرے۔} یہاں آیت میں قتل کی چار صورتوں کا بیان ہے اور پھر تین صورتوں میں کفارے کا بیان ہے۔

پہلی صورت یہ کہ مسلمان کا کسی دوسرے مسلمان کو ناحق قتل کرنا حرام ہے

دوسری صورت یہ کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے جیسے شکار کو مار رہا ہو مگر گولی مسلمان کو لگ جائے یا کسی کو حربی کافر سمجھ کر مارا لیکن قتل کے بعد معلوم ہوا کہ مقتول تو مسلمان ہے۔ اس صورت میں قاتل پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا لازم ہے اور

اس کے ساتھ وہ دیت بھی ادا کرے گا جو مقتول کے وارثوں کو دی جائے گی اور وہ اسے میراث کی طرح تقسیم کرلیں۔ دِیت مقتول کے ترکہ کے حکم میں ہے، اس سے مقتول کا قرضہ بھی ادا کیا جائے گا اور وصیت بھی پوری کی جائے گی۔ ہاں اگر مقتول کے ورثاء دیت معاف کردیں تو وہ معاف ہو جائے گی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر وہ مقتول دشمن قوم سے ہو لیکن وہ مقتول بذات خود مسلمان ہو تو صرف ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم ہے اور دیت وغیرہ کچھ لازم نہ ہوگی۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اگر مقتول ذِمّی ہو یا مسلمان حکومت کی اجازت سے مسلمان ملک میں آیا ہو جسے مستامن کہتے ہیں تو اس کو قتل کرنے کی صورت میں اس کے گھر والوں کو دیت دی جائے گی اور ایک مسلمان غلام یا لونڈی کو آزاد کیا جائے گا البتہ اگر غلام لونڈی نہ ملے جیسے ہمارے زمانے میں غلام لونڈی ہیں ہی نہیں تو پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے جائیں گے۔ یہ یاد رہے کہ قتل خطا کے کفارہ میں کافر غلام آزاد نہ کیا جائے گا۔ باقی کفّارات میں حنفی مذہب میں ہر طرح کا غلام آزاد کرسکتے ہیں جیسے روزے کا یا ظہار کا کفارہ ہو۔

آیت مبارکہ:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّقْتُلْ : قتل کرتا ہے] [مُؤْمِنًا : کسی مؤمن کو] [مُّتَعَمِّدًا : قصداً] [فَجَزَآؤُهٗ : تو اس کی سزا] [جَهَنَّمُ : جہنم ہے] [خَالِدًا : ہمیشہ رہنے والا ہوتے ہوئے] [فِيْهَا : اس میں] [وَغَضِبَ : اور غضب کیا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [عَلَيْهِ : اس پر] [وَلَعَنَهٗ : اور اس نے لعنت کی اس پر] [وَاَعَدَّ : اور اس نے تیار کیا] [لَهٗ : اس کے لیے] [عَذَابًا عَظِيْمًا : ایک بڑا عذاب]

ترجمہ: اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے کہ مدتوں اس میں رہے گا اور اس پر اللہ غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تشریح: آیہ کریمہ کا شان نزول

یہ آیت مقیس بن خبابہ کے حق میں نازل ہوئی اس کے بھائی قبیلہ بنی نجار نے بحکم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیت ادا کر دی۔ اس کے بعد باغواء شیطان ایک مسلمان کو بیخبری میں قتل کر دیا۔ یہ فہری تھا اور دیت کے اونٹ لے کر مکہ بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا یہ اسلام میں پہلا شخص ہے جو مرتد ہوا ارتداد کے بعد اس نے یہ رباعی کہی۔

قتلت بہ فھرا وحملت عقلہ سراۃ بنی النجار ارباب قارع

وادرکت ثاری ورجعت موسدا وکنت الی الاوثان اول راجع

میں نے فہری کو قتل کر دیا اور اس کی دیت بنو نجار کے سرداروں پر ڈال دی جو گھوڑوں والے ہیں۔ اور میں نے اپنے خون کا بدلہ لے لیا اور بڑے آرام سے واپس آ گیا اور میں بتوں کی طرف سب سے پہلا رجوع کرنے والا ہوں۔ (روح المعانی)

چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اخرج احمد والنسائی عن معاویۃ سمعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یقول کل ذنب مرجو عن اللہ ان یغفرہ الا الرجل یموت کافرا والرجل یقتل مومنا متعمدا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ ہر ایک گناہ معاف فرما دے گا سوائے اس آدمی کے جس کی موت کفر پر ہو یا جو کسی مومن آدمی کو جان بوجھ کر قتل کر دے۔ (حسنات)

پہلے قتل خطا کا ذکر تھا اب قتل عمد کا بیان ہے۔ قرآن حکیم اور ارشادات نبویہ اس جرم کے عظیم ترین ہونے پر شاہد ہیں۔ قرآن کریم کی یہی آیت انسان غور سے پڑھے اور اس میں قاتل کی جو سزا بیان کی گئی ہے اس پر نگاہ ڈالے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا کہ دنیا کے فنا ہونے سے بھی بے گناہ مومن کا قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک شدید ترین ہے۔ معتزلہ کے نزدیک قاتل عمد کی توبہ قابل قبول نہیں۔ لیکن اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سچے دل سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ اور یہ وعید ان کے لیے ہے جو توبہ نہیں کرتے۔ اور حضرت ابن عباس (رض) سے قتل عمد کی جو تفسیر منقول ہے اس کے پیش نظر تو یہ الجھن پیدا ہی نہیں ہوتی۔ آپ نے فرمایا متعمدا مستحلا مقتلہ یعنی جو دانستہ اور مسلمان کے قتل کو حلال سمجھتے ہوئے قتل کرتا ہے اس کی یہ سزا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ (ضیاء)

قتل عمد

قتل عمد وہ قتل ہے جس میں جان نکالنے کے لیے ہتھیار سے ضرب لگائی جائے اور جن غیر محسوس ہے پس وہ جان نکالنے کے لیے ہتھیار کو استعمال کرے گا جو زخم ڈالنے والا ہو اور بدن کے ظاہر اور باطن میں موثر ہو۔ (المبسوط ج ۲۶ ص ۵۹، بیروت)

امام ابو حنیفہ کی اصل کے مطابق جس قتل کو ہتھیار یا ہتھیار کے قائم مقام کے ساتھ کیا جائے وہ قتل عمد ہے ' مثلا بانس کی کھپچی یا لاٹھی کے ٹکڑے یا کسی اور ایسی دھار والی چیز کے ساتھ قتل کر دے جو ہتھیار کا کام کرتی ہو یا آگ سے جلا دے ' امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ تمام قتل عمد کی صورتیں ہیں اور ان میں قصاص واجب ہے اور ہمارے علم کے مطابق ان صورتوں کے قتل عمد ہونے میں فقہاء کا اختلاف نہیں ہے (احکام القرآن ج ۲ ص ' ۲۲۸ مطبوعہ سہیل اکیڈمی ' لاہور ' ۱۴۰۰ ھ)

احادیث میں تلوار اور پتھر سے قتل کرنے کو قتل عمد قرار دیا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم نے فرمایا تلوار کے علاوہ ہر چیز خطاء ہے اور ہر خطاء کا ایک تاوان ہے۔ (مسند احمد ج ۶ ' رقم الحدیث : ۱۸۴۵۱ '۱۸۴۲۳ 'سنن کبری للبیہقی ج ۸ ص ۴۲)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں ایک یہودی نے ایک لڑکی پر حملہ کیا اور اس کے جسم سے زیورات اتار لیے اور اس کے سر کو پتھر سے کچل دیا 'اس لڑکی کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لایا گیا اس وقت اس میں آخری رمق حیات تھی 'اور اس کی گویائی ختم ہو گئی تھی 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے پوچھا تم کو کس نے قتل کیا ہے۔ کیا فلاں شخص نے ؟ اس کے قاتل کے سوا کسی اور کا نام لیا 'اس نے سر کے اشارہ سے کہا نہیں 'پھر فرمایا فلاں شخص اور اس کے قاتل کا نام لیا اس نے سر کے اشارے سے کہا ہاں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بلانے کا حکم دیا اور دو پتھروں کے درمیان اس کے سر کو کچل دیا۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۵۲۹۵ 'صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ۱۶۷۴ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۴۵۶۷ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۱۳۹۹ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث : ۲۶۶۵ 'مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۷۵۸ '۱۳۱۰۵ '۱۲۷۴۸ '۱۲۷۴۱)

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ تلوار ہو 'پتھر ہو یا کوئی اور دھار دار چیز ہو یا ہتھیار ہو اس سے قتل کرنا عمد ہے 'بندوق کلاشنکوف 'پستول وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں۔

حضرت مقداد بن اسود (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا یا رسول اللہ ! یہ بتایئے کہ میرا کسی کافر شخص سے مقابلہ ہو وہ مجھ سے قتال کرے اور تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے 'پھر وہ مجھ سے بچنے کے لیے ایک درخت کی آڑ میں آئے اور کہے میں اللہ کے لیے اسلام لے آیا 'یا رسول اللہ ! کیا میں اس کے کلمہ پڑھنے کے بعد اس کو قتل کر سکتا ہوں ؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو قتل مت کرو 'میں نے عرض کیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ میرا ایک ہاتھ کاٹ چکا ہے 'اور اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کے بعد کلمہ پڑھا ہے کیا میں اس کو قتل کر دوں ؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو مت قتل کرو اگر تم نے اس کو قتل کر دیا تو وہ تمہارے قتل کرنے سے پہلے درجہ میں ہو گا اور تم اس کے کلمہ پڑھنے سے پہلے والے درجہ میں ہو گے۔ (صحیح مسلم 'رقم الحدیث : ۹۵ 'صحیح بخاری 'رقم الحدیث : ۳۷۹۴ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۲۶۴۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل کی بنسبت پوری دنیا کا زوال زیادہ آسان ہے۔ (سنن ترمذی 'رقم الحدیث : ۱۴۰۲ 'المستدرک ج ۴ ص ۳۵۲ 'کنزالعمال 'رقم الحدیث : ۳۹۹۵۴)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان کے پاس کر آ کر کہا یہ بتایئے کہ ایک آدمی نے کسی شخص کو عمدا قتل کیا اس کی سزا کیا ہو گی ؟ انھوں نے کہا اس کی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا 'اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہو گا اور اس پر لعنت کرے گا اور اللہ نے اس کے لیے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے 'حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ وہ آتی ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی (النساء : ۹۳) حتی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا سے تشریف لے گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد وحی نازل نہیں ہوئی 'اس نے کہا یہ بتایئے اگر وہ توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے 'پھر وہ ہدایت یافتہ ہو جائے گا ؟ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کی توبہ کیسے ہو گی ؟ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے سنا ہے : اس شخص کی ماں اس پر روئے جس نے کسی مسلمان کو عمدا قتل کر دیا وہ مقتول اپنے قاتل کو دائیں یا بائیں جانب سے پکڑے ہوئے آئے گا اور دائیں یا بائیں ہاتھ سے اس نے اپنا سر پکڑا ہوا ہو گا اور

عرش کے سامنے اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہو گا اور وہ شخص کہے گا اے میرے رب اپنے اس بندہ سے پوچھ اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا۔
(مسند احمد ج ا رقم الحدیث : ۲۱۴۲ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت '۱۴۱۴ھ)

کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرنا شدید ترین کبیرہ گناہ ہے اور کثیر احادیث میں اس کی بہت مذمت بیان کی گئی ہے، ان میں سے 4 احادیث درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک کسی جان کو (ناحق) قتل کرنا ہے۔
(بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ: ومن احیاہا، ۳۵۸/۴، الحدیث: ۶۸۷۱)

(2)۔۔ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنے والا قیامت کے دن بڑے خسارے کا شکار ہو گا۔ حضرت ابو بکرہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اگر زمین وآسمان والے کسی مسلمان کے قتل پر جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے۔ (معجم صغیر، باب العین، من اسمہ علی، ص ۲۰۵، الجزء الاول)

(3)۔۔ حضرت ابو بکرہ (رض) سے مروی ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے لڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ راوی فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ ارشاد فرمایا: اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے پر مُصِر تھا۔
(بخاری، کتاب الایمان، باب وان طائفتان من المومنین اقتتلوا۔۔ الخ، ۲۳/۱، الحدیث: ۳۱)

(4)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کے قتل پر ایک حرف جتنی بھی مدد کی تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حال میں آئے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہو گا "یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت سے مایوس ہے۔"
(ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً، ۲۶۲/۳، الحدیث: ۲۶۲۰)

افسوس کہ آج کل قتل کرنا بڑا معمولی کام ہو گیا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جان سے مار دینا، غنڈہ گردی، دہشت گردی، ڈکیتی، خاندانی لڑائی، تَعَصُّب والی لڑائیاں عام ہیں۔ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جاتا ہے، گروپ اور جتھے اور عسکری ونگ بنے ہوئے ہیں جن کا کام ہی قتل و غارتگری کرنا ہے۔

مسلمانوں کا باہمی تعلق کیسا ہونا چاہیے؟

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تعلق کیسا ہونا چاہیے، اس بارے میں 5 احادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے مروی ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں۔

(بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون۔۔الخ،۱/۱۵،الحدیث : ۱۰) (2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، سرورکائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

(بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحبّ لاخیہ۔۔الخ،۱/۱٦،الحدیث : ۱۳)

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔نہ اس پر ظلم کرے نہ اسے حقیر جانے۔ تقویٰ یہاں ہے اور اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ فرمایا۔انسان کے لیے یہ برائی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ مسلمان پر مسلمان کی ہر چیز حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال، اس کی آبرو۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ۔۔الخ، ص۱۳۸٦،الحدیث : ۳۲ (۲۵٦۴))

(4)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے، سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے اور اچھی باتوں کا حکم نہ دے اور بری باتوں سے منع نہ کرے۔ (ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان، ۳/۳٦۹،الحدیث : ۱۹۲۸)

(5)۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔

(مسلم، کتاب الایمان، باب بیان قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : سباب المسلم۔۔الخ، ص۵۲،الحدیث : ۱۱٦ (٦۴))

مسلمان کو قتل کرنا کیسا ہے؟

اگر مسلمانوں کے قتل کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کیا تو یہ خود کفر ہے اور ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور قتل کو حرام ہی سمجھا لیکن پھر بھی اس کا ارتکاب کیا تب یہ گناہ کبیرہ ہے اور ایسا شخص مدتِ دراز تک جہنم میں رہے گا۔آیت میں ”خَالِدًا“ کا لفظ ہے اس کا ایک معنی ہمیشہ ہوتا ہے اور دوسرا معنی عرصہ دراز ہوتا ہے یہاں دوسرے معنی میں مذکور ہے۔ (صراط)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک موقع پر بیت اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اے اللہ کے گھر! تیرا احترام واکرام اور جلالت و منزلت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں مومن کی عزت تجھ سے بڑھ کر ہے۔

[رواہ ابن ماجۃ: کتاب الفتن، باب حرمۃ دم المؤمن ومالہ]

ایک مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک سفر سے واپس تشریف لارہے تھے راستے میں ایک جگہ پڑاؤ فرمایا۔ کچھ صحابہ کرام ”وَن“ کے درختوں پر چڑھ کر پیلو توڑ رہے تھے جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی شامل تھے۔آپ کے ساتھ کھڑا ایک صحابی عبداللہ بن مسعود (رض) کی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ یہ صورت حال دیکھ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مومن کی شان کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ یہ پنڈلیاں احد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہیں۔[مسند احمد: کتاب مسند العشرۃ المبشرین بالجنتہ، باب مسند علی (رض)]

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نزدیک ایمان اور کلمے کی اتنی قدر ہے کہ آپ سے حضرت مقداد بن اسود نے استفسار کیا اگر میری کسی کافر کے ساتھ مڈھ بھیڑ ہو اور وہ تلوار سے میرا ہاتھ کاٹ دے۔ جب میں اس پر وار کروں تو وہ درخت کی اوٹ میں جان بچانے کے لیے کلمہ شہادت پکار اٹھے تو ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے ؟آپ نے فرمایا تجھے اپنا ہاتھ روکنا ہوگا۔ بیشک اس نے تجھے زخمی کیا ہے اگر تو نے اس پر حملہ کیا۔ تو تو اس کے مقام پر کھڑا ہوگا یعنی وہ مظلوم اور تو ظالم ہوگا۔ [رواہ البخاری : کتاب المغازی، باب شھود الملائکۃ بدرا]

قرآن مجید کے اس فرمان میں مومن کو عمداً قتل کرنے والے کی پانچ سزاؤں کا بیان ہوا ہے : (۱) جہنم میں داخلہ (۲) اس میں ہمیشگی (۳) اللہ کا غضب (۴) اللہ کی لعنت (۵) عذاب عظیم۔

اس لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : (سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ) مومن کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ [رواہ البخاری : کتاب الایمان ' باب خوف المؤمن من إن یحبط عملہ]

مسائل

۱۔ بلاوجہ مومن کو قتل کرنے والے پر اللہ کا غضب، اس کی لعنت اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

فوائد

1۔ مسلمان کو عمداً قتل کرنا سخت گناہ اور اشد کبیرہ ہے

حدیث شریف میں ہے کہ دنیا کا ہلاک ہونا اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل ہونے سے ہلکا ہے پھر یہ قتل اگر ایمان کی عداوت سے ہو یا قاتل اس قتل کو حلال جانتا ہو تو یہ کفر بھی ہے

2 : خلود مدت دراز کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور قاتل اگر صرف دنیوی عداوت سے مسلمان کو قتل کرے اور اس کے قتل کو مباح نہ جانے جب بھی اس کی جزا مدت دراز کے لیے جہنم ہے '

3 : خلود کا لفظ مدت طویلہ کے معنی میں ہوتا ہے تو قرآن کریم میں اس کے ساتھ لفظ ابد مذکور نہیں ہوتا اور کفار کے حق میں خلود بمعنی دوام آیا ہے تو اس کے ساتھ ابد بھی ذکر فرمایا گیا ہے

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے] [اِذَا : جب بھی] [ضَرَبْتُمْ : تم نکلو] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [فَتَبَيَّنُوْا : تو تحقیق کرلیا کرو] [وَلاَ تَقُوْلُوْا : اور تم مت کہو] [لِمَنْ : اس کے لیے جس نے] [اَلْقٰٓى : ڈالا] [اِلَيْكُمُ : تمہاری طرف] [السَّلٰمَ : سلام] [لَسْتَ : کہ تو نہیں ہے] [مُؤْمِنًا : مؤمن] [تَبْتَغُوْنَ : تم جستجو کرتے ہو] [عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : دُنیوی زندگی کے عارضی سامان کی] [فَعِنْدَ اللّٰهِ : تو اللہ کے پاس ہی] [مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ : کثیر مال غنیمت ہیں] [كَذٰلِكَ : اس کی مانند] [كُنْتُمْ : تم تھے] [مِّنْ قَبْلُ : اس سے پہلے] [فَمَنَّ : پھر احسان کیا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [فَتَبَيَّنُوْا : پس تم تحقیق کرلیا کرو] [اِنَّ اللّٰهَ : یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [بِمَا : اس سے جو] [تَعْمَلُوْنَ : تم کرتے ہو] [خَبِيْرًا : باخبر]

ترجمہ: اے ایمان والو ! جب تم اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) سفر پر نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور اس کو جو تمہیں سلام کرے یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے، تم (ایک مسلمان کو کافر کہہ کر مارنے کے بعد مال غنیمت کی صورت میں) دنیوی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو تو (یقین کرو) اللہ کے پاس بہت اموال غنیمت ہیں۔ اس سے پیشتر تم (بھی) تو ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا (اور تم مسلمان ہوگئے) پس (دوسروں کے بارے میں بھی) تحقیق کر لیا کرو۔ بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبر دار ہے.

تشریح: اس آیت مبارکہ کا شان نزول کچھ اس طرح ہے

کہ مِرْدَاس بن نَہِیک جو فدک کے رہنے والے تھے اور ان کے سوا ان کی قوم کا کوئی شخص اسلام نہ لایا تھا، اس قوم کو خبر ملی کہ لشکرِ اسلام ان کی طرف آرہا ہے تو قوم کے سب لوگ بھاگ گئے مگر مِرْدَاس ٹھہرے رہے۔ جب انھوں نے دور سے لشکر کو دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں کوئی غیر مسلم جماعت نہ ہو یہ پہاڑ کی چوٹی پر اپنی بکریاں لے کر چڑھ گئے۔ جب لشکر آیا اور انھوں نے اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں سنیں تو یہ خود بھی تکبیر پڑھتے ہوئے اتر آئے اور کہنے لگے: لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، السّلام علیکم۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ اہل فدک تو سب کافر ہیں یہ شخص دھوکا دینے کے لیے ایمان کا اظہار کر رہا ہے۔ اس خیال سے حضرت اسامہ بن زید (رض) نے ان کو قتل کر دیا اور بکریاں لے آئے۔
جب تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور میں حاضر ہو کر تمام ماجرا عرض کیا تو حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہایت رنج ہوا اور فرمایا تم نے اس کے سامان کے سبب اس کو قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت اسامہ (رض) کو حکم دیا کہ مقتول کی بکریاں اس کے اہل خانہ کو واپس کر دو۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۹۴، ۱/۴۱۷)
یہ روایت الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ بخاری اور دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔ یہاں اسی کے متعلق فرمایا جارہا ہے کہ اے ایمان والو! جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلو تو خوب تحقیق کر لیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے یا جس میں اسلام کی علامت و نشانی پاؤ تو اس سے ہاتھ روک لو اور جب تک اس کا کفر ثابت نہ ہو جائے اس پر ہاتھ نہ ڈالو اور اسے یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔ ابو داؤد اور ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کوئی لشکر روانہ فرماتے تو حکم دیتے کہ اگر تم کوئی مسجد دیکھو یا اذان سنو تو قتل نہ کرنا۔ (ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین، ۳/۶۰، الحدیث: ۲۶۳۵، ترمذی، کتاب السیر، ۲۔ باب، ۳/۱۹۴، الحدیث: ۱۵۵۴)
کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ: پہلے تم بھی ایسے ہی تھے۔} مسلمانوں کو سمجھانے کیلئے مزید فرمایا کہ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے یعنی جب تم اسلام میں داخل ہوئے تھے تو تمہاری زبان سے کلمہ شہادت سن کر تمہارے جان و مال محفوظ کر دیئے گئے تھے اور تمہارا اظہار ایمان بے اعتبار نہ قرار دیا گیا تھا ایسا ہی اسلام میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تمہیں بھی سلوک کرنا چاہیے اور یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ تمہیں اسلام پر اِستقامت بخشی اور تمہارا مومن ہونا مشہور کیا، لہٰذا خوب تحقیق کر لیا کرو کہ کہیں تمہارے ہاتھوں کوئی ایمان دار قتل نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ جو مسلمان کافروں میں رہتا ہو اور اس کے ایمان کی مسلمانوں کو خبر نہ ہو تو اس کے قتل سے نہ کفارہ واجب ہو گا اور نہ دیت۔ یاد رہے کہ پچھلی آیت میں وہ صورت مذکور ہوئی جہاں مسلمان کا اسلام سب کو معلوم ہو مگر اندھیرے وغیرہ کی وجہ سے پتہ نہ لگے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا جائے اور اس آیت میں وہ صورت بیان ہوئی ہے جس میں مسلمان کا ایمان کسی کو معلوم نہیں۔ لہٰذا ان دونوں آیات میں تعارض نہیں۔ (صراط)

قتال فی سبیل اللہ میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ کسی پر ظلم یا غلطی سے مسلمان نشانہ نہ بن جائیں

اسلام میں جہاد و قتال کا یہ معنٰی نہیں کہ کفار کی دشمنی میں مجاہد اس حد تک آگے بڑھ جائے کہ اس کی تلوار کے سامنے جو آئے اسے تہ تیغ کرتا چلا جائے۔ اسلامی جہاد اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس علاقہ پر حملہ کرنا مقصود ہو۔ وہاں کے بارے میں پہلے اچھی طرح معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر وہاں مسلمان موجود ہوں تو اندھا دھند حملہ کرنے کے بجائے ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے جس

سے مسلمان محفوظ رہ سکیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا نقصان ملت کا نقصان اور مجاہدین کے لیے بدنامی کا باعث ہوگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب مکہ پر حملہ کیا تو ایسی منصوبہ بندی فرمائی کہ جس سے مکہ کی حرمت قائم رہے اور مسلمانوں کا نقصان بھی نہ ہونے پائے۔ اعلان فرمایا کہ جو شخص بھی بیت اللہ میں داخل ہو جائے یا اپنے گھر کے کواڑ بند کرلے یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے۔ اسے حفظ وامان دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے "سورۃ الفتح آیت ۲۵" میں اس حکمت عملی کو اپنا انعام قرار دیا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہمیشہ یہ معمول تھا کہ جس علاقے کے متعلق آپ کے پاس معلومات نہ ہوتیں وہاں حملہ آور ہونے کے بجائے رات بھر انتظار فرماتے اگر صبح کی اذان سنائی نہ دیتی تو آپ حملہ کرنے کا حکم دیتے جیسا کہ حدیث میں حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں:

(عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كَانَ إِذَا غَزَا بِنَا قَوْمًا لَمْ يَكُنْ يُغْزِي بِنَا حَتَّى يُصْبِحَ وَيَنْظُرَ فَإِنْ سَمِعَ أَذَانًا كَفَّ عَنْهُمْ وَإِنْ لَمْ يَسْمَعْ أَذَانًا أَغَارَ عَلَيْهِمْ۔۔) [رواہ البخاری: کتاب الأذان، باب مایحقن بالأذان من الدماء]

"نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی قوم پر صبح ہونے سے پہلے حملہ نہ کرتے، صبح کے وقت آپ دیکھتے اگر اذان سنتے تو ان پر حملہ نہ کرتے اور اگر اذان نہ سنتے تو ان پر حملہ کر دیتے۔۔"

اس کا مقصد یہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچ پائے۔ اس آیت میں اسی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! جب تم اللہ کے راستے میں نکلو اور کوئی تمہارے سامنے اپنا اسلام پیش کرے تو غنائم کے لالچ میں اسے ٹھکرانے کی بجائے اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔ پھر تنبیہ فرمائی کہ آخر تم بھی تو ان حالات سے گزرے ہو کہ جب تم میں کئی لوگ دشمنوں کے خوف کی وجہ سے اپنا ایمان چھپاتے تھے اور تم بھی پہلے کافر تھے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم فرمایا کہ تمہیں آزاد مملکت نصیب فرمائی اور دشمن پر غلبہ عطا کیا اور مسلمان ہونے کی توفیق دی۔

یہاں اس سانحہ کی طرف اشارہ ہے جو خالد بن ولید (رض) کے ہاتھوں رونما ہوا کہ جب ایک چھوٹی سی جھڑپ کے دوران کچھ لوگوں نے ان کے سامنے اپنے اسلام لانے کا اظہار کیا تو خالد بن ولید (رض) نے ان پر یقین کرنے کی بجائے انھیں شہید کر ڈالا۔ جس پر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے برأت کا اظہار کیا۔ [رواہ البخاری: کتاب المغازی]

کہاں مقاتلہ نہ کرو

ترمذی شریف میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کوئی لشکر روانہ فرماتے تو اسے حکم دیتے کہ اگر تم مسجد دیکھو یا اذان سنو تو وہاں مقاتلہ نہ کرو۔ فقہانے فرمایا کہ اگر یہودی یا نصرانی یہ کہے کہ میں مومن ہوں اور وہ معلوم ہے کہ یہ یہودی یا نصرانی یا مرزائی ہے تو اسے مومن نہ مانا جائے گا اگرچہ وہ السلام علیکم کہتا رہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کہے جب بھی اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہ کیا جائے گا کیونکہ اس کے عقیدہ میں ایمان ہی وہ ہے جس پر وہ ہے۔ مرزائی اسی وجہ میں تو بے دھڑک کہہ دیتا ہے کہ میں عقیدہ خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلیم کرتا ہوں اس لیے کہ اس کے

نزدیک خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نبوت ختم ہو جانے کو بھی اسی وجہ سے تسلیم کرتا ہے کہ اس کے نزدیک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معاذ اللہ وہی مرزا غلام احمد ہے۔ اس بناء پر ارباب عقائد نے تصریح کی کہ محض کلمہ پڑھ لینے سے کسی کو مسلمان ہونے کا حکم نہ دیا جائے گا جب تک وہ اپنے سابقہ دین سے بے زاری کا اظہار اور اس کے باطل ہونے کا اعتراف نہ کرے (حسنات)

قرآن مجید کی اس آیت اور اس کے شان نزول میں جو احادیث ذکر کی گئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں احکام شرعیہ کا مدار صرف ظاہر حال پر ہے اور کسی شخص کے باطن کو ٹٹولنے سے ہم کو منع کیا گیا ہے اور دل کے حال کو جاننا انسانوں کا منصب نہیں ہے ' یہ صرف اللہ عزوجل کی شان ہے جو علام الغیوب ہے اور کسی شخص کے متعلق بدگمانی کر کے اس کو قتل کرنا ممنوع ہے اس سے پہلے ہم صحیح مسلم کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت اسامہ نے ایک شخص کو کلمہ پڑھنے کے بعد اس خیال سے قتل کر دیا تھا کہ شاید اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت ناراض ہوئے ' آپ نے حضرت اسامہ سے اس شخص کے قصاص لینے کا حکم نہیں دیا ' اور مذکور الصدر احادیث میں جن صحابہ نے ایک شخص کو سلام کرنے کے بعد قتل کر دیا تھا آپ نے ان کو بھی قصاص میں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا کیونکہ اول تو یہ ابتداء اسلام کے واقعات ہیں ثانیا یہ کہ انھوں نے تاویل سے قتل کیا تھا ' البتہ اس آیت کے نازل کے بعد اور اس کا حکم معلوم ہونے کے بعد جس نے کسی کے متعلق بدگمانی کر کے اس کو قتل کر دیا اس سے قصاص لیا جائے گا ' بہر حال اس آیت سے فقہ کا یہ عظیم ضابطہ معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کا مدار صرف ظاہر حال پر ہے۔

نیز اس آیت میں یہ بھی تصریح ہے کہ مسلمانوں کا جہاد سے مقصود صرف اللہ کے دین کی سربلندی ہونا چاہیے اور مال غنیمت حاصل کرنا ان کا مطمح نظر نہیں ہونا چاہیے۔ (تبیان)

آیت کے آخر میں تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ جو کچھ اور جس نیت سے تم کوئی عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی اچھی طرح خبر رکھنے والا ہے۔

مسائل

۱۔ جہاد کے دوران کافر اور مسلمان کی تمیز اور تحقیق کرنا مجاہد پر لازم ہے۔

۲۔ دنیا کے مال کی خاطر کلمہ پڑھنے والے کو قتل کرنا جائز نہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

آیت مبارکہ:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

لغۃ القرآن: [لاَ يَسْتَوِی : برابر نہیں ہوتے] [الْقٰعِدُوْنَ : بیٹھنے والے] [مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں میں سے] [غَيْرُاُولِی الضَّرَرِ : جو بغیر تکلیف والے ہوں] [وَالْمُجٰہِدُوْنَ : اور جہاد کرنے والے] [فِیْ سَبِيْلِ اللّٰہِ : اللہ کی راہ میں] [بِاَمْوَالِہِمْ : اپنے اموال سے] [وَاَنْفُسِہِمْ : اور اپنی جانوں سے] [فَضَّلَ : زیادہ بلند کیا] [اللّٰہُ : اللہ نے] [الْمُجٰہِدِيْنَ : جہاد کرنے والوں کو] [بِاَمْوَالِہِمْ : اپنے اموال سے] [وَاَنْفُسِہِمْ : اور اپنی جانوں سے] [عَلَی الْقٰعِدِيْنَ : بیٹھ جانے والوں پر] [دَرَجَةً : درجے کے لحاظ سے] [وَكُلاًّ : اور سب سے] [وَّعَدَ : وعدہ کیا] [اللّٰہُ : اللہ نے] [الْحُسْنٰی : خوبصورت] [وَفَضَّلَ : اور زیادہ کیا] [اللّٰہُ : اللہ نے] [الْمُجٰہِدِيْنَ : جہاد کرنے والوں کو] [عَلَی الْقٰعِدِيْنَ : بیٹھ جانے والوں پر] [اَجْرًا عَظِيْمًا : ایک شاندار اجر کے لحاظ سے]

ترجمہ: مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو (جہاد سے جی چرا کر) بغیر کسی (عذر) تکلیف کے (گھروں میں) بیٹھ رہنے والے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والے ہیں (یہ دونوں درجہ وثواب میں) برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر مرتبہ میں فضیلت بخشی ہے اور اللہ نے سب (ایمان والوں) سے وعدہ (تو) بھلائی کا (ہی) فرمایا ہے، اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو (بہر طور) بیٹھ رہنے والوں پر زبردست اجر (وثواب) کی فضیلت دی ہے .

خطاب جہاد میں پہلے مسلمانوں کو حالات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی طور پر قتال فی سبیل اللہ کا حکم دیا اس کے بعد جہاد کے احکامات اور اس کے متعلق ضمنی ہدایات دیتے ہوئے قتال فی سبیل اللہ کی عظمت اور برکت بیان فرمائی پھر قتال میں ہونے والی کوتاہیوں اور غفلتوں کے بارے میں احتیاط کا حکم دیا۔ اب مجاہدین کا مرتبہ و مقام بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر مومن کی بڑی قدر و منزلت ہے

۔ لیکن ایسے مومن جو بغیر کسی مجبوری اور شرعی عذر کے قتال فی سبیل اللہ میں براہ راست حصہ لینے کی بجائے دنیاوی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مال نچھاور اور جانیں نثار کرتے ہیں ان کا مرتبہ و مقام دوسرے مومنوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گو اللہ تعالیٰ نے ہر ایمان دار کے ساتھ اس کے اعمال اور اخلاص کے مطابق درجات کی بلندی اور جنت کے وعدے کیے ہیں جو ہر صورت پورے ہو کر رہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود مومن مجاہدین کا مرتبہ جہاد سے پیچھے رہنے والوں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ عام مومنوں کی روحیں عالم برزخ میں مقام علّیین میں ہوتی ہیں جبکہ مجاہدین کی ارواح اللہ تعالیٰ کے عرش تلے جلوہ افروز اور براہ راست جنت کے نظارے کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخشتے ہوئے انھیں اپنی خصوصی رحمت سے نوازتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے۔

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ اٰمَنَ باللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَصَامَ رَمَضَانَ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّدْخِلَہُ الْجَنَّۃَ جَاھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ جَلَسَ فِیْ اَرْضِہِ الَّتِیْ وُلِدَ فِیْھَا فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! اَفَلَا نُبَشِّرُ النَّاسَ قَالَ : اِنَّ فِی الْجَنَّۃِ مِاءَۃَ دَرَجَۃٍ اَعَدَّھَا اللّٰہُ لِلْمُجَاھِدِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَا بَیْنَ الدَّرَجَتَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰہَ فَاسْاَلُوْہُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّہٗ اَوْسَطُ الْجَنَّۃِ وَاَعْلَی الْجَنَّۃِ اُرَاہُ قَالَ وَفَوْقَہٗ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَمِنْہُ تَفَجَّرُ اَنْھَارُ الْجَنَّۃِ) [رواہ البخاری : کتاب الجھاد والسیر]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو اللہ و رسول پر ایمان لایا اس نے نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھے۔ اسے جنت میں داخل کرنا اللہ پر حق ہے اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یا اپنی پیدائش کے علاقہ میں بیٹھا رہا۔ صحابہ نے کہا اللہ کے رسول ! تو کیا ہم لوگوں کو خوشخبری نہ دے دیں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فی سبیل اللہ جہاد کرنے والوں کے لیے جنت میں سو درجات بنائے ہیں ہر دو درجے کا درمیانی فاصلہ زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ جتنا ہے جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو جنت الفردوس مانگا کرو کیونکہ یہ جنت کا وسط اور اعلیٰ جگہ ہے راوی کہتے ہیں میرا خیال ہے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور وہاں سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔“

(عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْکَرِبَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لِلشَّھِیْدِ عِنْدَ اللّٰہِ سِتُّ خِصَالٍ یُغْفَرُ لَہٗ فِیْ اَوَّلِ دَفْعَۃٍ وَیَرٰی مَقْعَدَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ وَیُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَیَاْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَکْبَرِ وَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِہٖ تَاجُ الْوَقَارِ الْیَاقُوْتَۃُ مِنْھَا خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا وَیُزَوَّجُ اثْنَتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ زَوْجَۃً مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ وَیُشَفَّعُ فِیْ سَبْعِیْنَ مِنْ اَقَارِبِہٖ) [رواہ الترمذی : کتاب فضائل الجھاد، باب فی ثواب الشھید]

”حضرت مقدام بن معدیکرب (رض) بیان کرے ہیں کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ہاں شہید کے چھ انعامات ہیں (۱) اس کے سب گناہ معاف کر کے اسے جنت میں اس کا مقام دکھلایا جاتا ہے۔ (۲) قبر کے عذاب سے محفوظ ہو گا۔ (۳) روز

قیامت گھبراہٹ سے مامون ہو گا۔ (۴) قیامت کے دن اس کے سر پر عزت و وقار کا تاج رکھا جائے گا جس کا ایک موتی دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔ (۵) اس کی بہتر حوروں سے شادی کی جائے گی۔ (۶) اور اس کے ستر قریبی رشتہ داروں کے بارے میں سفارش قبول کی جائے گی۔"
(عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِیّ (رض) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ رِبَاطُ یَوْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا عَلَیْھَا) [رواہ البخاری : کتاب الجھاد والسیر، باب فضل رباط یوم فی سبیل اللّٰہ]
"حضرت سہل بن سعد ساعدی (رض) بیان کرتے ہیں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے راستے میں ایک دن کا پہرہ دینا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔"
بخاری شریف میں ہی حضرت انس (رض) سے مروی ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (غزوہ تبوک سے واپسی کے وقت) فرمایا: کچھ لوگ مدینہ میں رہ گئے ہیں ہم کسی گھاٹی یا آبادی میں نہیں چلتے مگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، انھیں عذر نے روک لیا ہے۔ (بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من حبسہ العذر عن الغزو، ۲/۲۶۵، الحدیث : ۲۸۳۹)

نیت کی عظمت اور جہاد کا ثواب

اس سے معلوم ہوا کہ نیت بہت عظیم عمل ہے کہ حقیقتاً عمل کئے بغیر بھی سچی نیت ہونے کی صورت میں ثواب مل جاتا ہے۔ ہاں یہ ہے جو عذر کی وجہ سے جہاد میں حاضر نہ ہو سکے اگرچہ وہ نیت کا ثواب پائیں گے لیکن جہاد کرنے والوں کو عمل کی فضیلت اس سے زیادہ حاصل ہے۔ راہ خدا میں جان و مال خرچ کرنے کی کتنی عظیم فضیلت ہے اس کیلئے ذیل کی 4 احادیث کو ملاحظہ فرمائیں۔
(1)۔۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) فرماتے ہیں، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں عرض کی گئی: یارسولَ اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، لوگوں میں سے کون سا شخص افضل ہے؟ ارشاد فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔
(بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب افضل الناس مومن یجاہد بنفسہ۔۔ الخ، ۲/۲۴۹، الحدیث : ۲۷۸۶)
(2)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی گئی: کیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے برابر بھی کوئی عبادت ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "تم اس کی اِستطاعت نہیں رکھتے۔ صحابہ کرام (رض) نے سوال پھر دھرایا، یا تین بار پوچھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر بار فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ تیسری بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا جہاد سے واپسی تک اس شخص کی طرح ہے جو روزے دار ہو، قیام کرنے والا ہو، اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر عمل کرنے والا ہو، روزے اور نماز سے تھکتا یا اکتاتا نہ ہو۔
(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ تعالیٰ، ص ۱۰۴۴، الحدیث : ۱۱۰(۱۸۷۸))
(3)۔۔ حضرت خریم بن فاتک (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ کیا اس کے لیے سات سو گنا ثواب لکھا جاتا ہے۔
(ترمذی، کتاب فضائل الجہاد، باب ماجاء فی فضل النفقۃ فی سبیل اللہ، ۳/۲۳۳، الحدیث : ۱۶۳۱)

(4)۔۔ حضرت معاذ (رض) سے روایت ہے، حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " بیشک اللہ تعالیٰ کی راہ میں (نکل کر) ذکر کرنے کا ثواب مال خرچ کرنے سے سات لاکھ گنا زیادہ ہے۔
(مسند امام احمد، مسند المکیین، حدیث معاذ بن انس الجہنی (رض)، ۵/۳۱۴، الحدیث : ۱۵۶۴۷)

غنی شاکر افضل ہے یا فقیر صابر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی بھی فضیلت بیان کی ہے ' اس سے معلوم ہوا کہ جو مال دار لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیگر فرائض اور واجبات کو بجالاتے ہیں اور جن کاموں سے شریعت میں منع کیا گیا ہے ان سے باز رہتے ہیں ان کو نفلی عبادت کرنے والوں پر فضیلت حاصل ہے ' کیونکہ وہ اپنے مال کو جہاد ' اسلام کی ترویج واشاعت اور دیگر نیکی کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں بحث کی گئی ہے کہ غنی شاکر افضل ہوتا ہے یا فقیر صابر افضل ہوتا ہے ' بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ غنی شاکر افضل ہوتا ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ان کو فضیلت اور درجہ حاصل ہے ' نیز غنی کو قدرت حاصل ہوتی ہے اور فقیر عاجز ہوتا ہے اور قدرت عجز سے افضل ہے ' اور بعض نے کہا فقیر صابر افضل ہوتا ہے ' کیونکہ غنی شاکر کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے جو اجر ملتا ہے وہ دس گنا ہے ' سات سو گنا ہے یا چودہ سو گنا ہے اور بہر حال حد اور حساب سے ہے اور صبر کرنے والوں کو اللہ بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے :

(آیت) " انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب "۔ (الزمر : ۱۰)

ترجمہ : صرف صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ غنی شاکر سے صابر افضل ہے ' نیز غنی دنیا کی طلب میں رہتا ہے جب کہ فقیر دنیا کو ترک کرتا ہے اور دنیا کو طلب کرنے سے دنیا کو ترک کرنا افضل ہے ' اس سے بھی معلوم ہوا کہ فقیر صبر غنی شاکر سے افضل ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک میں بھی یہ بھی یہ بحث رہتی تھی کہ فقیر صابر افضل ہے یا غنی شاکر افضل ہے اور ہر ایک اجر وثواب میں دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ فقراء مہاجرین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا مالدار لوگ تو بڑے بڑے درجات اور جنت کی نعمتیں لے گئے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ کیسے ؟ انھوں نے عرض کیا جس طرح ہم نماز پڑتے ہیں وہ نماز پڑھتے ہیں اور جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں وہ روزے رکھتے ہیں اور وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم صدقہ نہیں کر سکتے ' وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کر سکتے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز کی تعلیم نہ دوں جس سے تم ان سے بڑھ جاؤ گے جو تم پر سبقت کرتے ہیں اور تم اپنے بعد والوں سے بھی بڑھ جاؤ گے ؟ اور تم سے کوئی شخص افضل نہیں ہو سکے گا مگر وہ جو تمہاری طرح اس کام کو کرے ' فقراء مہاجرین نے کیوں نہیں ! یا رسول اللہ ! آپ نے فرمایا تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس

بار سبحان اللہ ' اللہ اکبر اور الحمد للہ کہو ' (دوسری روایت میں ہے سبحان اللہ ' الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھو) فقراء مہاجرین دوبارہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور عرض کیا: ہمارے مالدار بھائیوں نے بھی اس کام کو سن لیا اور وہ بھی اس طرح کرنے لگے ' تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا فرمائے، (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۵۹۵)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقیر صابر سے غنی شاکر افضل ہے کیونکہ اس کو اپنی عبادات انجام دینے کا موقع ملتا ہے جو فقراء کی پہنچ میں نہیں ہوتیں ' یہ بھی واضح رہے کہ فقیر صابر سے مراد آج کل کے گداگر نہیں ہیں اور نہ غنی شاکر سے مراد آج کل کے سرمایہ دار ہیں بلکہ فقراء سے مراد ایسے فقراء ہیں جیسے فقراء مہاجرین تھے مثلا حضرت بلال ' حضرت سلمان فارسی اور حضرت صہیب رومی وغیرہ ' اور اغنیاء سے مراد ایسے اغنیاء ہیں جیسے حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ تھے ' اور فقیر صابر سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ شاکر نہ ہو ' اور غنی شاکر سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ صابر نہ ہو ' بلکہ ہر دو کو جب کوئی نعمت ملے تو وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اس پر صبر کریں لیکن غنی کا غالب حال یہ ہے کہ اس شکر کرنے کے مواقع زیادہ ملتے ہیں اس لیے اس کو غنی شاکر سے تعبیر کرتے ہیں اور فقیر کا غالب اور شکر کرنا بھی عبادت ہے تاہم اگر اغنیاء کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کو ایسی عبادت کرنے کے زیادہ مواقع ملتے ہی جو فقراء کی دسترس میں نہیں ہیں تو فقراء کے لیے یہ فضیلت کچھ نہیں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو زندگی گزاری ہے وہ عیش ' نعمت اور اغنیاء کی زندگی نہیں ہے وہ فقراء کی زندگی ہے اگر اغنیاء کو عبادت میں سبقت کی فضیلت حاصل ہے تو فقراء کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات اپنانے کی فضیلت حاصل ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ عزوجل فرمائے گا ' اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی! وہ کہے گا اے میرے رب میں تیری کیسے عیادت کرتا تو رب العلمین ہے ' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھ کو علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا ' پھر فرمائے گا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا ' وہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے کھلاتا تو رب العلمین ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا ' پھر فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا! وہ کہے گا اے میرے رب! میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو تو رب العالمین ہے ' اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا اگر تو اس کو پانی پلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۵۶۹)

فقراء کے لیے یہ کچھ کم اعزاز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بیماری کو اپنی بیماری اور ان کی بھوک اور پیاس کو اپنی بھوک اور پیاس فرماتا ہے ' اگر اغنیاء کو کثرت عبادت کی فضیلت حاصل ہے تو فقراء کے لیے یہ کم فضیلت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حال کو اپنا حال فرماتا ہے، ان کی بیماری کو اپنی بیماری اور ان کی بھوک اور پیاس کو اپنی بھوک اور پیاس فرماتا ہے۔

مسائل

۱۔ گھروں میں بیٹھنے والے مومنوں سے مجاہدین بہتر ہیں۔ ۲۔ مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے بلند مرتبہ و مقام عطا فرمایا ہے۔
۳۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مومن کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق جزا کا وعدہ فرمایا ہے۔

۴۔ مجاہدین اور دوسروں کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش اور رحمت ہو گی۔

آیت مبارکہ:

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

لغۃ القرآن: [دَرَجٰتٍ : درجات ہوتے ہوئے] [مِّنْهُ : اس (کی طرف) سے] [وَمَغْفِرَةً : اور مغفرت ہوتے ہوئے] [وَّرَحْمَةً : اور رحمت ہوتے ہوئے] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا] [رَّحِيْمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا]

ترجمہ: اس کی طرف سے (ان کے لیے بہت) درجات ہیں اور بخشائش اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

تشریح: اس آیت میں اسلامی معاشرے کی ایک خاص صورت حال پر بحث کی گئی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں بعض لوگوں کی طرف سے سستی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اسلامی انقلاب کی راہ میں جان اور مال کی قربانی نہ دے رہے تھے۔ یہ لوگ وہ تھے جو مکہ میں اپنی دولت بچانے کے لیے ہجرت میں تاخیر کر رہے تھے ' اس لیے کہ اہل مکہ کسی مہاجر کو اپنے ساتھ کوئی چیز لے جانے کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ یہ سستی اس وجہ سے بھی پیدا ہو رہی تھی کہ ہجرت کی راہ میں سخت مشکلات ' مصائب اور خطرات تھے ' اس لیے کہ مشرکین کمزور لوگوں کو سرے سے ہجرت کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ وہ انھیں پکڑ کر قید کر دیتے ' اذیت دیتے یا اگر پہلے سے اذیت دی جا رہی ہوتی تھی تو جس کے بارے میں انھیں شبہ ہو جاتا کہ یہ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے مزید سخت اذیت دی جاتی چاہے ان آیات کا مدلول وہ لوگ ہوں جو دارالاسلام کو ہجرت کر کے منتقل نہ ہو رہے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شرعاً معذور ہیں جیسے اندھے، مریض اور اپاہج وغیرہ ان کو چھوڑ کر باقی لوگوں میں سے جہاد کرنے والے اور بیٹھ رہنے والوں کا فرق بیان فرمایا ہے اور مجاہدین کے ان درجات اور فضیلت اور مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا جو قاعدین کو میسر نہ ہوں گے اور چونکہ جہاد فرض کفایہ ہے اس لیے بیٹھنے والے بھی گناہ گار نہ ہوں گے البتہ ان درجات اور فضائل سے محروم رہیں گے جو مجاہدین کو نصیب ہوں گے البتہ جنت میں دونوں فریق جائیں گے کیوں جہاد نہ کرنے والے آخر دوسرے احکام تو بجالاتے ہی ہیں اس لیے وہ بھی جنتی ہیں جس طرح مجاہدین جنتی ہیں۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ جنت میں کوئی کہاں ہوتا ہے اور کوئی کہاں ہوتا ہے کون بڑے بڑے درجات کا وارث بنتا ہے اور کون کس مقام پر روک دیا جاتا ہے حسنیٰ اچھی چیز اور اچھے گھر کو کہتے ہیں یہاں حضرت قتادہ نے جنت کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

زید بن ثابت کا قول ہے کہ جب یہ آیت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھوا رہے تھے تو اسی وقت عبداللہ بن ام مکتوم آ نکلے انھوں نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر میں استطاعت رکھتا تو میں ضرور جہاد کرتا اسی وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہوئی اور حضرت جبرائیل غیر اولی الضرر کا جملہ لے کر آئے۔

انس بن مالک کی روایت میں ہے کہ یہ ابن مکتوم کے بارے میں نازل ہوا بہر حال اس استثنا میں ہر قسم کے اپاہج اور معذور لوگ داخل ہیں اور اس امر کی توقع ہے کہ جو لوگ معذور ہوں اور ان کی نیت جہاد کی ہو تو ان کو بھی مجاہدین کی مثل ثواب ملے گا۔

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک غزوہ میں فرمایا تھا۔

ان بالمدینۃ رجالا ما قطعتم وادیا ولا سرتم مسیرا الا کانوا معکم اولئک قوم حبسھم العذر۔ یعنی کچھ لوگ مدینے میں ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ تم جو میدان قطع کرتے ہو اور جو تم کہیں چلتے پھرتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کو مدینہ میں کسی عذر نے روک رکھا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث قدسی میں ہے کہ جب کوئی بندہ بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب تک یہ بندہ بیمار ہے اس کے وہ عمل لکھتے رہو جو یہ صحت کے زمانے میں کیا کرتا تھا یہاں تک کہ یہ تندرست ہو جائے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ معذور جہاد کے ثواب میں تو شریک ہوں گے لیکن وہ فضیلت ان کو نہ ہو گی جو جہاد کرنے والوں کو ہو گی۔ بعض اہل علم نے اس فرق سے بھی انکار کیا ہے۔ واللہ اعلم ہو سکتا ہے کہ مباشر اور عازم دونوں برابر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ کمیت ثواب میں فرق ہو۔ پہلے جو درجہ ذکر کیا تھا اسی کی آخر میں تاکید فرمائی اور تفصیل بیان فرمائی کہ وہ درجہ اجر عظیم ہے اور وہ اجر عظیم یہ ہے کہ اعمال مختلفہ پر بہت سے درجات مختلفہ کا حصول موقوف ہے اور مغفرت و رحمت ہے، منہ درجات کے ساتھ متعلق ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغفرت و رحمت میں بھی اس قید کا لحاظ ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ ان لوگوں کے لیے اللہ کی جانب سے درجات اور مغفرت و رحمت ہے۔ واللہ اعلم۔

ہر چند کہ جہاد کا اصل حکم فرض کفایہ ہے جیسا حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے لیکن بعض اوقات میں یہ فرض عین ہو جاتا ہے جس کی تفصیل کتب فقہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اب آگے جہاد کی مناسبت سے ہجرت کا ذکر فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ (تسہیل)

دَرَجٰتٍ مِّنۡہُ: اس کی طرف سے بہت سے درجات۔} اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کا اجر بیان فرمایا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کے بہت سے درجات، ان کے گناہوں کی بخشش اور جنت کی نعمتیں ہے اور اللہ تعالیٰ جہاد کرنے والوں کو بخشنے والا اور ان پر مہربان ہے۔ (تفسیر سمرقندی، النساء، تحت الآیۃ: ۹۶، ۱/۳۸۰)

جنت میں مجاہدین کے درجات اور مجاہدین کی بخشش

احادیث میں مجاہدین کے جنتی درجات کے بارے میں تفصیل بیان کی گئی ہے، چنانچہ اس سے متعلق 3 احادیث درج ذیل ہیں

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے جنت میں سو درجے مہیا فرمائے، ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہو گا جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب درجات المجاہدین فی سبیل اللہ۔۔ الخ، ۲/۲۵۰، الحدیث: ۲۷۹۰)

(2)-- حضرت ابو سعید خدری (رض) فرماتے ہیں، تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اے ابو سعید! (رض)، جو شخص اللہ تعالیٰ کے ربّ ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نبی ہونے پر راضی ہو گیا اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ حضرت ابو سعید (رض) کو یہ بات اچھی لگی تو عرض کرنے لگے: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اس بات کو دوبارہ ارشاد فرمائیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوبارہ اسی طرح فرمایا، پھر ارشاد فرمایا "ایک بات اور بھی ہے جس کی وجہ سے بندے کے سو درجات بلند ہوتے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین وآسمان جتنا فاصلہ ہے۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، وہ درجہ کس چیز سے ملتا ہے؟ ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے۔

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب بیان ما اعدّ اللہ تعالیٰ للمجاہد فی الجنۃ من الدرجات، ص ۱۰۴۵، الحدیث: ۱۱۶(۱۸۸۴))

(3)-- حضرت ابو ہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے اور اس کا گھر سے نکلنا صرف اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے اور اس کے دین کی تصدیق کی خاطر ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس بات کا ضامن ہو جاتا ہے کہ (اگر وہ شہید ہو گیا تو) اس کو جنت میں داخل کرے گا یا اجر اور غنیمت کے ساتھ اس کو اس کے مسکن میں واپس کر دے گا جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ، ص ۱۰۴۲، الحدیث: ۱۰۴(۱۸۷۶))

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓىٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ الَّذِیْنَ : بیشک وہ لوگ] [تَوَفّٰىهُمُ : پورا پورا لیتے ہیں جن کو (یعنی روح قبض کرتے ہیں)] [الْمَلٰٓىٕكَةُ : فرشتے] [ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ : خود پر ظلم کرنے والے ہوتے ہوئے] [قَالُوْا : وہ کہتے ہیں] [فِیْمَ : کس چیز میں] [كُنْتُمْ : تم تھے] [قَالُوْا : وہ کہتے ہیں] [كُنَّا : ہم] [مُسْتَضْعَفِیْنَ : کمزور تھے] [فِی الْاَرْضِ : زمین میں] [قَالُوْآ : وہ (فرشتے) کہتے ہیں] [اَ : کیا] [لَمْ تَكُنْ : نہیں تھی] [اَرْضُ اللّٰهِ :

اللّٰہ کی زمین] [وَاسِعَۃً : کشادہ] [فَتُہَاجِرُوْا : تو تم ہجرت کرتے] [فِیْہَا : اس میں] [فَاُولٰٓئِکَ : پس وہ لوگ ہیں] [مَاْوٰىہُمْ : جن کا ٹھکانا] [جَہَنَّمُ : جہنم ہے] [وَسَآءَ تْ : اور کتنی بری ہے وہ] [مَصِیْرًا : لوٹنے کی جگہ]

ترجمہ : بیشک جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں (تو) وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے (تم نے اقامت دین کی جدوجہد کی نہ سرزمین کفر کو چھوڑا) ؟ وہ (معذرۃً) کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و بے بس تھے، فرشتے (جواباً) کہتے ہیں : کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں (کہیں) ہجرت کر جاتے، سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

تشریح: حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو بعض مسلمان اپنے عزیز واقارب اور مال و جائیداد وغیرہ کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے۔ اور اس وقت جب کہ ہجرت فرض تھی ہجرت نہ کی۔ مرتے وقت فرشتوں سے جو ان کا مکالمہ ہوگا اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس وقت ہجرت کے فرض ہونے کے دو سبب تھے۔ ایک تو مکہ کی فضا ایسی ناساز گار تھی کہ کھلم کھلا شرک ہو رہا تھا۔ فسق وفجور کا بازار گرم تھا۔ عقیدہ اسلامی کا اظہار اور عبادات کی بجاآوری از حد مشکل تھی۔ ان حالات میں ایمان کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ تھا اس لیے ضروری تھا کہ جسے اپنا ایمان عزیز ہے وہ وہاں سے ہجرت کر جائے۔ اس کے علاوہ مدینہ طیبہ پر کفار ہر وقت حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ وہاں کے مسلمانوں کو شدید ضرورت تھی کہ ان کے دینی بھائی ان کے ساتھ آملیں اور ایسے مشکل اور نازل وقت میں ان کی تقویت کا باعث بنیں۔ (ضیاء)

یہ دنیا جب سے معرض وجود میں آئی ہے اسی وقت سے لے کر حق و باطل کے معرکے پیش آتے رہے ہیں۔ حق و باطل کی اس آویزش میں ہمیں بیشمار ہجرتیں دکھائی دیتی ہیں۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا عراق سے ہجرت کر کے شام ‘ مصر اور ارض مقدس کی طرف جانا اور پھر حجاز میں تشریف لا کر اپنے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کے ذریعے حجاز کو مرکز دعوت مقرر کرنا ‘ حضرت یعقوب (علیہ السلام) اور جناب یوسف (علیہ السلام) کی ہجرت مصر کی طرف، سیدنا لوط (علیہ السلام) کی ہجرت علاقہ سدوم کی جانب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی پہلی ہجرت مدین کی طرف اور اس کے بعد ہزاروں ساتھیوں سمیت فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کا ثبوت قرآن میں موجود ہے۔

شرعی اصطلاح میں دین کی خاطر وطن چھوڑنے والے کو مہاجر اور اس عمل کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نظریہ اسلام جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا دوسرا نام ہے اس کی خاطر ہر چیز قربان کرنا لازم ہے۔ جو شخص ایمان کے لیے قربانی نہیں دیتا اور اس پر دوسری باتوں کو مقدم جانتا ہے۔ ایسا شخص ایماندار ہونے کا حق دار نہیں۔ ہجرت میں بھی یہی فلسفہ ہے کہ ناگزیر حالات میں ہمیشہ دب کر اور کمزور رہنے کے بجائے مسلمانوں کو ایسے علاقے سے ہجرت کر کے اپنی افرادی قوت کو مجتمع کر کے کفار کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔

ہجرت ایمان کی کسوٹی ہے :

اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ایسی پل صراط ہے جس کی دھار تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے ہجرت کی تکالیف ومشکلات ایمان سے خالی دل کو ننگا کر دیتی ہیں یہ ایسا ترازو ہے جس میں ہر آدمی پورا نہیں اتر سکتا۔ اس پیمانے سے کھرے کھوٹے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے اسباب اور طاقت رکھنے کے باوجود ہجرت نہ کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایمان کی نعمت ٬ مسلمانوں کی اجتماعیت ٬ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر اپنے کاروبار ٬ مکانات اور دنیاوی مفاد کو ترجیح دی ہے۔ البتہ وہ لوگ جو ہجرت کے لیے کوئی سبیل اور وسیلہ نہیں پاتے انھیں معاف کر دینے کی امید دلائی گئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ در گزر کرنے اور معاف فرمانے والا ہے۔

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جن کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ فرض ہجرت ترک کر کے اور کافروں کا ساتھ دے کر اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، ان کی موت کے وقت فرشتے انھیں جھڑکتے ہوئے کہتے ہیں: تم اپنے دین کے معاملے میں کس حال میں تھے؟ وہ عذر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور لوگ تھے اور (کافروں کی سر زمین میں رہنے کی وجہ سے) دین کے احکام پر عمل کرنے سے عاجز تھے۔ تو فرشتے ان کا عذر رد کرتے اور انھیں ڈانٹتے ہوئے کہتے ہیں: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم کفر کی سر زمین سے ایسی جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے جہاں تم دین کے احکام پر عمل کر سکتے؟ تو جن لوگوں کے برے احوال یہاں بیان ہوئے یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخرت میں ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کتنی بری لوٹنے کی جگہ ہے۔

(جلالین، النساء، تحت الآیۃ: ۹۷، ص ۸۵، روح البیان، النساء، تحت الآیۃ: ۹۷، ۲/۲۶۸-۲۶۹، ملتقطاً)

فرضیت ہجرت کی آیات کا شان نزول

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہجرت کو فرض فرمایا ہے اور مکہ کے جن مسلمانوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی ان پر سخت وعید فرمائی ہے۔ عبدالرحمٰن بن اسود بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ سے جنگ کے لیے ایک لشکر تیار کیا گیا۔ میرا نام بھی اس میں لکھا گیا تھا اس وقت حضرت ابن عباس (رض) کے آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ (رض) سے میری ملاقات ہوئی انھوں نے مجھے اس جنگ میں شامل ہونے سے سختی سے منع کیا اور کہا حضرت ابن عباس (رض) نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ (مکہ کے) کچھ مسلمان (جنگ بدر میں) مشرکین (کی تعداد بڑھانے کے لیے ان) کے ساتھ تھے ٬ یہ لشکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے لڑنے کے لیے آیا تھا ٬ آپ کے لشکر کی طرف سے کوئی تیر آکر ان مسلمانوں کے لگتا اور وہ ہلاک ہو جاتا یا لڑائی میں مارا جاتا ٬ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (صحیح البخاری ٬ رقم الحدیث: ۴۵۹۶ ٬ سنن کبری للنسائی: ج ٦ ٬ رقم الحدیث: ۱۱۱۱۹)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میری ماں ان کمزور لوگوں میں سے تھے جن کا اللہ نے کفر کی سر زمین سے ہجرت کرنے کے حکم سے استثناء فرمایا۔ (صحیح البخاری ٬ رقم الحدیث: ۴۵۹۷)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت مکہ کے ان مسلمانوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی جو ان میں سے مکہ میں فوت ہو گئے ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: بیشک فرشتے جن لوگوں کی روحیں اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے (فرشتے کہتے ہیں) کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیسا برا

ٹھکانا ہے۔ مگر جو (واقعی) کم زور ہوں مردوں ' عورتوں اور بچوں میں سے۔ سو یہ لوگ ہیں کہ اللہ عنقریب ان سے در گزر فرمائے گا (النساء : ۹۸۔۹۷) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا میں اور میری والدہ ان کمزور لوگوں میں سے تھے۔ عکرمہ نے کہا حضرت ابن عباس (رض) بھی ان کمزور لوگوں میں سے تھے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور وہ اپنے اسلام کو مخفی رکھتے تھے ' جنگ بدر کے دن مشرکین ان کو اپنے ساتھ لے گئے ' ان میں سے بعض مسلمان جنگ میں مارے گئے ' مسلمانوں نے کہا ہمارے یہ اصحاب مسلمان تھے ان کو زبردستی جنگ میں لایا گیا تھا ' انھوں نے ان کے لیے استغفار کیا اس موقع پر سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی۔ تب مکہ میں باقی ماندہ مسلمانوں کو یہ آیت لکھ کر بھیجی گئی اور ان سے یہ کہا گیا کہ اب ان کے لیے ہجرت میں کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے وہ مکہ سے نکلے تو مشرکین ان کے مقابلہ میں آئے اور وہ فتنہ میں پڑ گئے اس وقت ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

(آیت) " ومن الناس من یقول امنا باللہ فاذااوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ "۔ (العنکبوت : ۱۰)

ترجمہ : اور کچھ لوگ کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب انھیں اللہ کی راہ میں کوئی تکلیف دی جائے تو وہ لوگوں کے فتنہ کو اللہ کے عذاب کی طرح کردیتے ہیں : (جامع البیان جز ۵ ص ۳۱۷ ' ۳۱۶ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ ھ)

نیز امام ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ظہر کی نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے : اے اللہ ! ولید ' سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات عطا فرما ' اور ان کمزور مسلمانوں کو جو مشرکین کے زیر تسلط ہیں ' جن کو وہاں سے نکلنے کے لیے کسی حیلہ پر قدرت ہے نہ وہ راستہ جانتے ہیں (جامع البیان ج ۴ ص ۳۱۷ ' ۳۲۱ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی " سمع اللہ لمن حمدہ " پڑھ کر آپ کھڑے ہوگئے اور سجدہ سے پہلے آپ نے یہ دعا مانگی : اے اللہ ! عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات عطا فرما ' اے اللہ ' سلمہ بن ہشام کو نجات عطا فرما ' اے اللہ ! ولید بن ولید کو نجات عطا فرما ' اے اللہ ! کمزور مسلمانوں کو نجات عطا فرما ' اے اللہ ! مضر پر اپنی گرفت سخت فرما ' اے اللہ ! ان پر ایسے سال مسلط کردے جیسے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں (قحط کے) سال مسلط کردیئے تھے۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۴۵۹۸) (تبیان)

ہجرت کب واجب ہے

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی شہر میں اپنے دین پر قائم نہ رہ سکتا ہو اور یہ جانے کہ دوسری جگہ جانے سے اپنے فرائض دینی ادا کرسکے گا اس پر ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔ اس حکم کو سامنے رکھ کر کافروں کے درمیان رہنے والے بہت سے مسلمانوں کو غور کرنے کی حاجت ہے۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ توفیق عطا فرمائے۔ حدیث میں ہے جو شخص اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا اگرچہ ایک بالشت ہی کیوں نہ ہو اس کے لیے جنت واجب ہوئی اور اس کو حضرت ابراہیم اور محمد مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رفاقت مُیَسَّر ہو گی۔

(تفسیر سمرقندی، العنکبوت، تحت الآیۃ: ۵۶، ۵۴۲/۲)

ہجرت کی اقسام اور ان کے احکام :

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) نے ہجرت کی اقسام بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک قسم کہ دارالاسلام سے ہجرت ہو، اس بارے میں فرماتے ہیں:

رہا دارالاسلام، اس سے ہجرت عامہ حرام ہے کہ اس میں مساجد کی ویرانی و بے حرمتی، قبور مسلمین کی بربادی، عورتوں بچوں اور ضعیفوں کی تباہی ہوگی اور ہجرت خاصہ میں تین صورتیں ہیں،

(1)۔۔اگر کوئی شخص کسی خاص وجہ سے کسی خاص مقام میں اپنے دینی فرائض بجانہ لاسکے اور دوسری جگہ انھیں بجالانا ممکن ہو تو اگر یہ خاص اسی مکان میں ہے تو اس پر فرض ہے کہ یہ مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلا جائے، اور اگر اس محلّہ میں معذور ہو تو دوسرے محلّہ میں چلا جائے اور اس شہر میں مجبور ہو تو دوسرے شہر میں چلا جائے۔

(2)۔۔یہاں اپنے مذہبی فرائض بجالانے سے عاجز نہیں اور اس کے ضعیف ماں یا باپ یا بیوی یا بچے جن کا نفقہ اس پر فرض ہے وہ نہ جاسکیں گے یا نہ جائیں گے اور اس کے چلے جانے سے وہ بے وسیلہ رہ جائیں گے تو اس کو دارالاسلام سے ہجرت کرنا حرام ہے،

حدیث میں ہے: کسی آدمی کے گناہ گار ہونے کیلئے اتنا کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کردے جس کا نفقہ اس کے ذمے تھا۔"

یا وہ عالم جس سے بڑھ کر اس شہر میں عالم نہ ہو اسے بھی وہاں سے ہجرت کرنا حرام ہے۔

(3)۔۔نہ فرائض سے عاجز ہے نہ اس کی یہاں حاجت ہے، اسے اختیار ہے کہ یہاں رہے یا چلا جائے، جو اس کی مصلحت سے ہو وہ کرسکتا ہے، یہ تفصیل دارالاسلام میں ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۱۴/۱۳۱-۱۳۲، ملخصاً)

مسائل

1۔ ایمان اور کفر کے درمیان تذبذب میں رہنے والوں اور ہجرت نہ کرنے والوں کو فرشتے موت کے وقت سوال کرتے ہیں کہ تم کس طرف تھے۔

2۔ کافروں سے مقابلہ کرسکتے تھے اور نہ ہجرت کرسکتے تھے۔

3۔ فرشتے ڈانٹ کر کہیں گے کہ تم کافروں کی سرزمین چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس آجاتے، اللہ کی وسیع زمین میں کہیں اور جاکر اسلامی زندگی بسر کرتے۔

4۔ جھوٹے بہانہ خوروں کی بات نہ مانی جائے گی اور ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

آیت مبارکہ:

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

لغۃ القرآن: [اِلاَّ : سوائے اس کے کہ] [الْمُسْتَضْعَفِيْنَ : کمزور ہوں] [مِنَ الرِّجَالِ : مردوں میں سے] [وَالنِّسَآئِ : اور عورتوں میں سے] [وَالْوِلْدَانِ : اور بچوں میں سے] [لاَيَسْتَطِيْعُوْنَ : وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں] [حِيْلَةً : کسی تدبیر کی] [وَّلاَ يَہْتَدُوْنَ : اور وہ نہ پاتے ہوں] [سَبِيْلاً : کوئی راستہ]

ترجمہ: سوائے ان واقعی مجبور و بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے، جو نہ کسی تدبیر پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ جانتے ہیں۔

تشریح: شان نزول

اس سے پہلی آیت جب نازل ہوئی تو جندع بن ضمیرہ لیثی نے بنایہ بہت بوڑھے تھے کہنے لگے کہ میں اس حکم سے مستثنیٰ ہوں یا مجھ پر بھی یہ حکم عائد ہوتا ہے میں اگرچہ ضعیف العمر اور کمزور ہوں مگر میرے پاس اتنا مال ہے جس سے مدینہ پاک ہجرت کر سکتا ہوں۔ میں قسم بخدا اب مکہ ایک رات نہ ٹھہروں گا۔ مجھے لے چلو چنانچہ انھیں چار پائی پر ڈال کر لے چلے۔ مقام تنعیم میں جب وہ آئے تو ان کا انتقال ہو گیا۔ بوقت انتقال انھوں نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور کہا الٰہی یہ تیرا اور یہ تیرے رسول کا ہاتھ ہے میں اس پر بیعت کرتا ہوں جس پر تیرے رسول نے بیعت کی۔ یہ خبر پا کر صحابہ کرام نے کہا کاش وہ مدینہ پہنچ جاتے تو ان کا اجر کتنا بڑا ہوتا اور مشرکین ہنسے اور کہنے لگے جس مطلب کے لیے جندع بن ضمیرہ نکلے تھے وہ نہ ملا اس پر ہی آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ الا المستضعفین من الرجان والنساء والولدان لایستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا، فاولئک عسی اللہ ان یعفو عنھم، وکان اللہ عفوا غفورا، ومن یھاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مرغما کثیرا وسعۃ، ومن یخرج من بیتہ مھاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ، وکان اللہ غفورا رحیما۔ اس امر کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے اور اس کے فضل و کرم سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن بہ طریق استحقاق کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں اس کی شان اس سے ارفع واعلیٰ ہے اس سے بھی چند مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ 1۔ جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس کو پورا کرنے سے عاجز ہو جائے اسے اس کا اجر ملے گا۔ 2۔ طلب علم، حج، جہاد، زیارت، طاعت، زہد و قناعت، رزق حلال کی طلب کے لیے ترک وطن کرنا خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہجرت ہے اس میں اگر وہ پورا کرنے سے قبل موت کے قبضہ میں آجائے تو اسے اجر ضرور ملے گا۔ حضرت زید بن ثابت (رض) فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی حضور علی الصلوٰۃ والسلام نے مجھے لکھوائی۔ آپ کی ران مبارک میری ران پر تھی آپ فرما رہے

تھے میں لکھ رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے جو نابینا تھے۔ نے رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر مجھ میں جہاد کی قوت ہوتی تو ضرور میں جہاد میں۔۔ اسی حالت میں وحی نازل ہوئی آپ کی ران مبارک اس قدر وزنی ہوگئی کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران ٹوٹ جائے گی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن)

ضعیفوں اور کمزوروں کی رعایت

سوارشاد فرمایا گیا کہ بجز ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی جو کوئی تدبیر نہیں کر سکتے۔ یعنی ایسے جو کمزور اور بے بس تھے کہ وہ کوئی تدبیر نہیں کر سکتے تھے کفار اور دارالکفر سے نکل بھاگنے کی، اپنی بیماری یا معذوری کی وجہ سے۔ یا اسباب ووسائل کے فقدان کے باعث۔ سوایسے کمزوروں اور ضعیفوں کا معاملہ مختلف ہے۔ اس لیے ان کا انجام وہ نہیں ہوگا جو دوسروں کا ہوگا۔ سو جن لوگوں کے پاس کوئی مجبوری بھی نہ ہو اور دارالاسلام کی طرف جانے کا راستہ بھی کھلا ہو، پھر بھی وہ دارالکفر سے ہجرت نہ کریں تو ان کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں جیسا کہ ابھی اوپر ایک ہی حاشیہ قبل تفسیر محاسن التاویل کے حوالے سے گزرا۔۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

صحیح راستے کے فقدان کے عذر کا ذکر

سوارشاد فرمایا گیا اور نہ ہی وہ کوئی راہ پا سکتے ہیں۔ یعنی ایسی راہ جو انھیں دارالامن والسلام تک پہنچا سکے، کہ انھیں نہ تو ایسی کوئی پناہ گاہ میسر ہے اور نہ وہ اس کے صحیح راستے سے واقف ہیں، جس کے بغیر نکلنے کے معنیٰ اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنے کے ہیں۔ جیسا کہ عربوں کی قدیم مثل ہے "قَتَلَتِ الْاَرْضُ جَاہِلَہَا" کہ زمین نے اپنے (راستوں کے) ناواقف کو ہلاک کر دیا۔ سو اس سے صحیح راستے اور اس کی معرفت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے ذریعے انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے یہاں راستہ نہ جاننے کو ان کیلئے عذر قرار دیا گیا ہے۔ سو جو کوئی اتنا بے بس اور اس قدر معذور ہو کہ نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو اور نہ ہی اس کے لیے نکلنے بھاگنے کی کوئی راہ کھل رہی ہو تو اس پر اپنے دین وایمان کی حفاظت تو اگرچہ پھر بھی لازم اور واجب ہے لیکن اس پر ہجرت فرض ولازم نہیں کہ وہ اس کے بس میں نہیں۔ اور جو چیز کسی کے بس میں نہ ہو وہ شرعی طور پر اس کا مکلّف نہیں ہو سکتا کہ ضابطہ عام اور قاعدہ کلیۃ بہر حال یہی ہے کہ { لا یکلّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا } یعنی کسی کو اس کی قدرت وطاقت سے زیادہ مکلّف نہیں بنایا جائے گا۔ (مدنی)

عاجز مردوں کی مثال ایسی ہے جیسے بہت زیادہ بوڑھا فرتوت بہت بیمار بہت کمزور اپاہج کہ پیدل سفر کر نہیں سکتا اور سواری کی استطاعت نہ ہو یا کوئی عیالدار ہو کہ سب کو لے کر جانے کی استطاعت نہ ہو اور تنہا جانے میں پیچھے اہل وعیال کی تباہی کا خطرہ ہو۔

استثناء میں بچوں کا ذکر صرف کلام میں زور پیدا کرنے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ (ہجرت کا حکم اتنا اہم ہے کہ) بچوں پر بھی لاگو ہے اگر وہ بالغ ہو جائیں اور ہجرت کر سکیں۔ یا بچوں سے مراد ان کے ولی ہیں کیونکہ بچوں کے ولی اگر بچوں کو لے کر منتقل ہو سکتے ہوں تو ان پر مع بچوں کے ہجرت واجب ہے ورنہ ان کو عاجز قرار دیا جائے گا۔ آیت میں غلاموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اگر غلام میں ہجرت کی قدرت ہو تو اس پر ہجرت واجب ہے آقا کا حق اس کے لیے سنگ راہ نہیں ہو سکتا فرض عینی سے حق عباد مانع نہیں ہے۔

محمد بن اسحاق نے یونس بن بکیر کی روایت میں بیان کیا ہے کہ محاصرہ طائف کے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منادی نے ندا دی جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے ' یہ سن کر قلعہ سے کچھ اوپر دس آدمی نکلے حافظ محمد بن یوسف صالحہ شافعی نے سبیل الرشاد میں ان کے نام ذکر کئے ہیں۔

امام احمد (رح) نے حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا غلاموں میں سے جو نکل کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے ' یہ سن کر غلام نکل آئے جن میں ابو بکرہ بھی تھے ' حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو آزاد کردیا صحیحین میں عثمان (رض) نہدی کی روایت سے نقل کیا گیا ہے۔ بقول سعد ابو عثمان (رض) نہدی ہی پہلے شخص تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا تھا۔ ابو بکرہ (رض) جو طائف کے قلعہ کی فصیل پر تھے ' اتر کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آگئے آپ طائف (کے قلعہ) سے نکل کر آنے والوں میں تیئیسویں آدمی تھے۔ یہ بات اہل طائف کو بہت ہی شاق گزری اور غلاموں پر ان کو سخت غصہ آیا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو آزاد کردیا اور ایک ایک غلام سپرد کردیا تاکہ اس کی ضروریات کی دیکھ بھال رکھے اور سوار کرلے ' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ غلاموں کو قرآن پڑھاؤ اور مسائل اسلام سکھاؤ۔ آخر جب بنی ثقیف مسلمان ہوگئے تو ان کے سردار نے ان آزاد کردہ غلاموں کے بارے میں درخواست کی کہ ان کو دوبارہ غلامی کی طرف لوٹا دیا جائے اور ہم کو دے دیا جائے انہی میں سے حارث (رض) بن کلدہ بھی تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں ' اب ان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

لایستطیعون حیلۃ ولا یہتدون سبیلا کہ نہ کوئی تدبیر کرسکتے ہیں نہ راستہ سے واقف ہیں۔

حیلہ کا معنی ہے مہارت اچھی نظر اور کام کرنے کی قدرت یعنی ہجرت کرنے کی ان کو قدرت نہیں نہ اسباب ہجرت ان کے پاس ہے اور راستہ سے خود واقف نہیں نہ کوئی راہ نما ملتا ہے۔ (مظہری)

آیت مبارکہ:

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

لغۃ القرآن: [فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ ہیں] [عَسَى اللّٰهُ اَنْ : امید ہے کہ اللہ] [يَّعْفُوَ : درگزر کرے] [عَنْهُمْ : جن سے] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَفُوًّا : بے انتہا درگزر کرنے والا] [غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا]

ترجمہ: سو یہ وہ لوگ ہیں کہ یقیناً اللہ ان سے در گزر فرمائے گا، اور اللہ بڑا معاف فرمانے والا بخشنے والا ہے۔

تشریح:

اس آیت میں اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ جو شخص اپنے دین کو بچانے کے لیے مشرکوں کے ملک سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بھاگے ' اور ارض اسلام اور دار ہجرت میں پہنچنے سے پہلے اس کو موت آلے تو اس کے اس عمل کا اجر اور ہجرت کا ثواب اللہ کے ذمہ کرم پر ہے ' اور اس نے اسلام کی خاطر اپنے وطن اور رشتہ داروں کو جو چھوڑا ہے اللہ اس کی جزاء اس کو عطا فرمائے گا۔
سعید بن جبیر اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام ضمرہ بن العیص یا العیص بن ضمرہ تھا ' جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو وہ بیمار تھا اس نے اپنے گھر والوں سے کہا وہ اس کو چارپائی پر ڈال کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے چلیں ' وہ اس کو لے کر روانہ ہوئے اور ابھی مقام تنعیم (مکہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے جہاں سے اہل مکہ احرام باندھتے ہیں) پر پہنچے تھے کہ اس شخص کی وفات ہو گئی اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ہجرت کا شرعی حکم

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ جس ملک یا شہر میں مسلمانوں کو دین اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے اور یہ کہ ابتداء میں مکہ کے مسلمانوں پر ہجرت کرنا فرض تھا اور مکہ فتح ہونے کے بعد جب مکہ دارالاسلام بن گیا تو یہ ہجرت منسوخ ہو گئی ' اور ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو مرد ' عورتیں اور بچے کمزور ہوں یا بیمار ہوں اور ان کو ہجرت کرنے کی کوئی تدبیر معلوم نہ ہو ' نہ راستے کا علم ہو ان کے ہجرت نہ کرنے کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا'
اور ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان نیک نیتی سے کوئی عبادت شروع کرے اور اس کو مکمل کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس مسلمان کو اس نیکی کام کا پورا پورا اجر عطا فرماتا ہے۔

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی فرضیت کے اسباب

ابتداء اسلام میں مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے حسب ذیل اسباب تھے
(۱) مدینہ منورہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وقتاً فوقتاً احکام شرعیہ نازل ہو رہے تھے اور دین کی مکمل تعلیم حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان ہر طرف سے اس مرکز علم کی طرف آئیں ' اسی طرح اب بھی اگر کوئی مسلمان کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہو جہاں علماء دین نہ ہوں تو اس پر واجب ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اس علاقہ کی طرف ہجرت کرے جہاں علماء دین ہوں ' اور وہاں جا کر علماء دین سے علم حاصل کرے نکاح سے پہلے نکاح اور طلاق کے ضروری مسائل سیکھے حج اور عمرہ سے پہلے حج اور عمرہ کے مسائل معلوم کرے ' تجارت کرنے سے پہلے تجارت ' بیع شراء اور سود کے مسائل کا علم حاصل کرے ' اور بالغ ہونے سے پہلے نماز ' روزہ اور زکوۃ کے مسائل کا علم حاصل کرے علی ھذا القیاس۔

(۲) مدینہ میں مسلمان آزادی سے احکام شرعیہ اور شعائر اسلام پر عمل کرتے تھے جبکہ فتح مکہ سے پہلے مکہ میں شعائر اسلام پر عمل نہیں کیا جا سکتا تھا سو اب بھی اگر کسی ملک میں کوئی مسلمان اسلام کے شعائر پر آزادی اور امن سے عمل نہ کر سکے تو اس پر اس علاقہ سے ہجرت کرنا فرض ہے۔

(۳) مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی فرضیت کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ بتلایا جائے کہ اسلام میں وطن کی اہمیت نہیں ہے بلکہ دین کی اہمیت ہے اور دین کی خاطر وطن کو چھوڑ دیا جائے گا اور یہ کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور آپ کی اتباع مسلمانوں پر فرض ہے اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ کی طرف ہجرت کر لی تو آپ کی اتباع میں مسلمانوں پر بھی ہجرت فرض کر دی گئی ' اور اس لیے بھی کہ مدینہ منورہ اسلام کی پہلی ریاست تھی سو اس ریاست کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے وہاں مسلمانوں کی عددی قوت بڑھانا ضروری تھا اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب مسلمان مدینہ میں جمع ہو جائیں۔

دفع ضرر کے لیے ہجرت کی اقسام

قاضی ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ نے ہجرت کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

(۱) دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا ' ہجرت کی یہ قسم قیامت تک کے لیے فرض ہے ' سو جو شخص دار الحرب میں اسلام قبول کرے اس پر دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا فرض ہے ' اگر وہ در الحرب میں ہی مقیم رہا تو گناہ گار ہو گا۔

(۲) جس علاقہ میں اہل بدعت کا غلبہ ہو اور سلف صالحین پر وہاں تبرا کیا جاتا ہو اور صالح مسلمان اپنی قوت سے اس بدعت کو مٹانے پر قادر نہ ہوں اس علاقہ سے ان مسلمانوں کا ہجرت کرنا واجب ہے ' اس کی اصل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

(آیت) "واذا رایت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین (الانعام: ٦٨)

ترجمہ: اور (اے مخاطب) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں میں بحثی کرتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے حتی کہ وہ کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں اور اگر تجھے شیطان بھلا دے یا یاد آنے کے بعد ظلم کرنے والی قوم کے ساتھ نہ بیٹھو،

(۳) جس سرزمین پر حرام کاموں کا غلبہ ہو اس سرزمین سے نکل جائے کیونکہ حلال کو طلب کرنا اور حرام سے بچنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(۴) جس علاقہ میں مسلمان کو اپنے جسم کے نقصان کا خطرہ ہو ' اس پر واجب ہے کہ وہ کسی محفوظ علاقہ میں چلا جائے جیسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا:

(آیت) "انی ذاھب الی ربی"۔ (العنکبوت: ٢٦)

ترجمہ: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "فخرج منھا خآئفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین"۔ (القصص: ٢١)

ترجمہ: سو موسیٰ اس شہر سے ڈرتے ہوئے نکلے ' وہ انتظار کرتے تھے (کہ اب کیا ہو گا) انھوں نے دعا کی اے میرے رب مجھے ظالم قوم سے بچا لے۔

(۵) جس شہر میں کوئی متعدی مرض پھیلا ہوا ہو ' اس شہر سے ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ وبا نہ ہو ' اس قاعدہ سے صرف طاعون مستثنیٰ ہے۔
(٦) جس علاقہ میں مسلمان کو اپنے مال کے ضائع ہونے یا مالی نقصان کا یقینی خطرہ ہو اس جگہ سے انسان کسی پر امن علاقہ میں چلا جائے۔
(٧) اسی طرح جس جگہ انسان کی عزت اور ناموس کو یقینی خطرہ ہو اس علاقہ سے بھی نکلنا واجب ہے ' کیونکہ مسلمان پر اپنی جان ' مال اور عزت کی حفاظت کرنا فرض ہے ' امام ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا: یہ حج اکبر کا دن ہے تمہارا خون ' تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر اس طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن اس شہر کی حرمت ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ٣٠٥٨ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ١٧٣٩ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ١٩٤٥)

تقیہ جائز نہیں

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تقیہ جائز نہیں ہے ورنہ ہجرت فرض نہ ہوتی کیونکہ انسان تقیہ کرکے کافروں اور فاسقوں سے ظاہری موافقت کرکے ایسی جگہ رہ سکتا ہے۔
یہ ہجرت کی وہ اقسام ہیں جن میں کسی ضرر سے بچنے کے لیے ہجرت کی جاتی ہے ' اور ہجرت کی بعض اقسام وہ ہیں جن میں کسی نفع کے حصول کے لیے ہجرت کی جاتی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

حصول نفع کے لیے ہجرت کی اقسام

(١) کسی علاقہ کے آثار عذاب سے عبرت حاصل کرنے کے لے اپنے ملک سے دوسرے ملک جانا ' قرآن مجید میں ہے :
(آیت) " افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم "۔ (یوسف : ١٠٩)
ترجمہ : کیا یہ لوگ زمین میں سفر نہیں کرتے تاکہ یہ دیکھیں کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیسا انجام ہوا۔
اس نوع کی قرآن مجید میں بہت آیتیں ہیں ' اور کہا جاتا ہے کہ ذوالقرنین نے زمین میں اس لیے سفر کیا تھا کہ زمین کے عجائبات دیکھے اور ایک قول یہ ہے کہ اس نے باطل کو مٹانے اور حق کو نافذ کرنے کے لیے زمین میں سفر کیا تھا۔
(٢) حج کرنے کے لیے سفر کرنا ' یہ سفر زندگی میں ایک بار بشرط استطاعت فرض ہے اور بار بار مستحب ہے۔
(٣) جہاد کے لیے سفر کرنا ' اگر دشمن اسلامی ملک کی سرحد پر حملہ آور ہو تو سربراہ ملک جن لوگوں کو جہاد کے لیے بلائے ان کا جانا فرض عین ہے اور تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے لیکن یہ بھی امام یا امیر کی دعوت پر موقوف ہے۔
(٤) اگر اپنے شہر میں رزق حلال اور معاش کا حصول متعذر اور مشکل ہو اور کسی دوسرے شہر میں رزق حلال کے ذرائع حاصل ہوں تو اس شہر میں جانا اس پر فرض ہے کیونکہ رزق حلال کو طلب کرنا فرض ہے ' قرآن مجید میں ہے :
(آیت) " واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ "۔ (المزمل : ٢٠)
ترجمہ : اور کچھ لوگ زمین میں سفر کریں گے ' اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے۔

(۵) تجارت کے لیے سفر کرنا اور ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں تجارت کے لیے جانا ' اللہ تعالیٰ نے سفر حج میں بھی تجارت کی اجازت دی ہے۔:

(آیت) "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم"۔ (البقرہ: ۱۹۸)

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کو تلاش کرو'۔

(۶) علم دین اور علم نافع کی طلب کے لیے سفر کرنا "قرآن مجید میں ہے:

علم دین اور علم نافع کی طلب کے لیے سفر کرنا "قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون"۔ (التوبہ: ۱۲۲)

ترجمہ: تو (مسلمانوں کے) (ہر گروہ سے کیوں نہ ایک جماعت دین سیکھنے کے لیے روانہ ہوئی تاکہ وہ واپس آکر اپنی قوم کو ڈرائیں۔ شاید وہ گناہ سے بچتے رہیں۔

(۷) متبرک مقامات کے لیے سفر کرنا ' حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین مسجدوں کے سوا سامان سفر نہ باندھنا میری یہ مسجد 'مسجد حرام اور مسجد اقصی۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۱۱۸۹ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۱۳۹۷ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۲۰۳۳ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۲۸۹۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۳۲۶ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۱۴۰۹ ' سنن کبری للبیہقی ج ۵ ص ۲۴۴ ' سنن دارمی ' رقم الحدیث: ۱۴۲۱ ' مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۴)

(۸) اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سفر کرنا اور دشمن سے مقابلوں کے لیے مجاہدوں کا جمع ہونا۔

(۹) ماں باپ کی زیارت کے لیے سفر کرنا ' رشتہ داروں اور بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے سفر کرنا۔

(۱۰) ملک کے نظم و نسق چلانے اور انتظامی امور کے لیے سفر کرنا۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۶۱۲۔ ۶۱۱ ' مع توضیح وزیادہ ' مطبوعہ دا الکتب العلمیہ بیروت ' ۱۴۰۸ ھ)

ایک سوال: معذور دین کی مجبوری ظاہر ہے وہ مکلّف نہیں۔ پھر یقین کی جگہ امید کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا اور جب وہ مکلّف ہی نہیں تو پھر معافی کی صراحت کیوں فرمائی۔

جواب: امید اور عفو کا لفظ استعمال کرنے پر اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ ترک ہجرت کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ معذور کو بھی بے خطر نہ ہونا چاہیے ' موقع کی تاک میں لگا رہے اور ہجرت سے دل کو وابستہ رکھے۔

وکان اللہ عفوا غفورا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا میں اور میری ماں ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ نے معذور قرار دیا تھا یعنی مستضعفین میں سے تھے اور رسول اللہ: (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان مستضعفین کے لیے نماز میں دعا کرتے تھے۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عشاء کی نماز کی آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اَنْجِ عَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَۃَ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدِ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْجِ سَلَمَۃَ بْنَ ہِشَامٍ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ اے اللہ عیاش بن ربیعہ کو رہائی عطا کر ' اے اللہ ولید (رض) بن ولید کو

نجات دے ' اے اللہ سلمہ (رض) بن ہشام کو خلاصی دے۔ اے اللہ مغلوب مسلمانوں کو بچا اے اللہ (قبائل) مضر کو سخت پامال کر دے اے اللہ ان کے سالوں کو یوسف کے سالوں کی طرح (قحط) کے بنادے۔ (مظہری)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ؑ

لغۃ القرآن: [وَمَنْ يُّهَاجِرْ : اور جو ہجرت کرے گا] [فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں] [يَجِدْ : تو وہ پائے گا] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [مُرٰغَمًا كَثِيْرًا : جانے کی کثیر جگہیں] [وَّ : اور] [سَعَةً : کشادگی] [وَمَنْ : اور جو] [يَّخْرُجْ : نکلتا ہے] [مِنْۢ بَيْتِهٖ : اپنے گھر سے] [مُهَاجِرًا : ہجرت کرنے والا ہوتے ہوئے] [اِلَى اللّٰهِ : اللہ کی طرف] [وَرَسُوْلِهٖ : اور اس کے رسول کی طرف] [ثُمَّ : پھر] [يُدْرِكْهُ : آلیتی ہے اس کو] [الْمَوْتُ : موت] [فَقَدْ وَقَعَ : تو واقع ہوچکا ہے] [اَجْرُهٗ : اس کا اجر] [عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا] [رَّحِيْمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے وہ زمین میں (ہجرت کے لئے) بہت سی جگہیں اور (معاش کے لئے) کشائش پائے گا، اور جو شخص بھی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے پھر اسے (راستے میں ہی) موت آپکڑے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا، اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اپنا وطن اور جائیداد چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں لیکن جو خوش نصیب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رضا کے لیے ہجرت کرتے ہیں وہ دنیا وآخرت میں اجر عظیم کے مستحق قرار پاتے ہیں اور جو ہجرت کرنے کے بعد منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے راستہ میں ہی فوت ہو جائیں انھیں بھی ہجرت کا اجر وثواب ضرور ملے گا۔ ہجرت کا لفظی معنی ہے "کسی چیز کو چھوڑ دینا "اسلام میں اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ایسے علاقہ کو چھوڑ دے جس میں اسے اسلامی احکام پر عمل کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ اس کی اسلام میں بڑی فضیلت ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یقیناً ہجرت ان سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔
(مسلم: 321: کتاب الایمان: باب 54)

لمحہ فکریہ: ہجرت کرنے کا مقصد اسلامی احکام پر عمل کرنا ہے اور اگر ایک مسلمان اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اسلامی احکام پر عمل نہ کرے تو اسے اپنے اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ اصل اور افضل مہاجر وہ ہے جو برائیوں اور گناہوں کو ترک کرتا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا: کون سی ہجرت سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: افضل ہجرت یہ ہے کہ انسان ہر اس چیز کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ (امداد)

شان نزول

اس سے پہلی آیت جب نازل ہوئی تو جندع بن ضمرۃُاللَّیثِیُ نے اس کو سنا یہ بہت بوڑھے شخص تھے کہنے لگے کہ میں مستثنیٰ لوگوں میں تو ہوں نہیں کیونکہ میرے پاس اتنا مال ہے کہ جس سے میں مدینہ طیبہ ہجرت کر کے پہنچ سکتا ہوں۔ خدا کی قسم مکہ مکرمہ میں اب ایک رات نہ ٹھروں گا مجھے لے چلو چنانچہ ان کو چارپائی پر لے کے چلے مقام تنعیم میں آکر ان کا انتقال ہو گیا۔ آخر وقت انھوں نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور کہا یارب یہ تیرا اور یہ تیرے رسول کا میں اس پر بیعت کرتا ہوں جس پر تیرے رسول نے بیعت کی یہ خبر پاکر صحابہ کرام نے فرمایا کاش وہ مدینہ پہنچتے تو ان کا اجر کتنا بڑا ہوتا اور مشرک ہنسے اور کہنے لگے کہ جس مطلب کے لیے نکلے تھے وہ نہ ملا اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (خزائن)

کفار اور منافقین نے پروپیگنڈہ کیا کہ یہ لوگ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ اس پر رحمت الٰہی جوش میں آئی اور خوشخبری سنائی کہ ہجرت کے لیے اپنے گھروں سے نکلنے والے خوش نصیبوں کے اجر اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیے ہیں جو ہرگز ضائع نہیں ہوں گے۔ (فہم)

نیکی کا ارادہ کر کے نیکی کرنے سے عاجز ہو جانے والا اس نیکی کا ثواب پائے گا

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کوئی نیکی کا ارادہ کرے اور اس کو پورا کرنے سے عاجز ہو جائے وہ اس نیکی کا ثواب پائے گا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے نیکی کا ارادہ کیا اور نیکی نہیں کی تو اس کی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور نیکی کر لی تو اس کے لیے دس سے لے کر سات سو گنا تک نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کا گناہ نہیں لکھا جاتا اور اگر وہ گناہ کر لے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔
(مسلم، کتاب الایمان، باب اذا ہمّ العبد بحسنۃ کتبت۔۔ الخ، ص۷۹، الحدیث: ۲۰۶ (۱۳۰))

کن کاموں کے لیے وطن چھوڑنا ہجرت میں داخل ہے

صدرُالاَفاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی (رح) کے فرمان کا خلاصہ ہے کہ طلب علم، جہاد، حج و زیارتِ مدینہ، نیکی کے کام، زہد و قناعت اور رزق حلال کی طلب کے لیے ترک وطن کرنا خدااور رسول کی طرف ہجرت ہے، اس راہ میں مر جانے والا اجر پائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جسے علم حاصل کرتے ہوئے موت آگئی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے اور انبیاء کرام (علیہ السلام) کے درمیان صرف درجہ نبوّت کا فرق ہو گا۔

(معجم الاوسط، باب الیائ، من اسمہ یعقوب، ۶/۴۷۵، الحدیث: ۹۴۵۴)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو حج کے لیے نکلا اور مر گیا، قیامت تک اس کے لیے حج کرنے والے کا ثواب لکھا جائے گا اور جو عمرہ کے لیے نکلا اور مر گیا، اس کے لیے قیامت تک عمرہ کرنے والے کا ثواب لکھا جائے گا۔

(مسند ابو یعلی، مسند ابوہریرہ، ۵/۴۴۱، الحدیث: ۶۳۲۷)

مہاجر کو تسلی دی گئی ہے کہ گھبرانے اور دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رزق کو ایک جگہ مقید نہیں رکھا ہوا رزق تو انسان کے ساتھ ' ساتھ رہتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے راستے میں بے دھڑک نکلو اللہ تمہارا رزق کشادہ کردے گا۔

ہجرت کا حکم دینے اور معذور لوگوں کو معاف کرنے کے اعلان کے بعد مہاجرین کو تسلی دی جارہی ہے۔ میرے نام اور کام پر بے خانماں ہونے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے والو ! دل چھوٹا کرنا نہ حوصلہ ہارنا۔ تم ایسے خالق ومالک کے حکم سے وطن چھوڑ رہے ہو جو پتھر کے کیڑے کو چٹان میں ' گوشت خور درندوں کو جنگل میں ' پانی کے جانوروں کو سمندر کی لہروں اور تہوں میں ' پرندوں کو صحراؤں میں رزق پہنچاتا ہے۔ تم تو اشرف المخلوقات اور اس کے راستے کے راہی ہو۔ وہ تمہیں کس طرح کسمپرسی کی حالت میں رہنے دے گا۔ ایسا ہر گز نہیں ہو گا ' اپنے رب پر اعتماد کرو۔

ذرا یقین کی آنکھ سے تاریخ کے دریچوں میں جھانک کر دیکھو۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے عراق چھوڑا تو ملک شام اور سرزمین مقدس کے مالک بنے۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) اور ان کا خاندان اپنے وطن سے نکلا تو سینکڑوں سال مصر کا فرمانروا ہوا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) مصر سے نکلے تو ان کے پیروکار بیت المقدس کے حکمران ہوئے۔ غرض یہ کہ ہر دور میں اور ہر قافلہ مہاجرین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ انھیں دنیا میں بے پناہ وسعت اور لامحدود فضل سے نوازا۔ صحابہ کرام (رض) کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ جب مہاجرین مکہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو بے خانماں اور کنگال تھے لیکن ہجرت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) اپنی روئیداد بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اب یہ حال ہے کہ مٹی اٹھاتا ہوں تو وہ بھی سونا بن جاتی ہے۔ زکوۃ کے علاوہ لاکھوں روپے صدقہ کیے۔ اس کے باوجود وفات کے وقت اڑھائی کروڑ کے مالک تھے۔ حضرت زبیر (رض) بے حساب صدقہ کرنے کے بعد بھی پانچ کروڑ کی جائیداد چھوڑ کر دنیا سے گئے۔ حضرت ابو طلحہ انصاری (رض) پر ایک وقت وہ تھاجب مہمان کا کھانا کم ہونے کی وجہ سے بیوی کو حکم دیتے ہیں کہ جب ہم کھانا شروع کریں تو دیا بجھا دینا۔ میں یوں ہی منہ سے آواز نکالتا رہوں گا تاکہ مہمان سیر ہو کر کھالے۔ پھر ایسا دور آیا کہ لاکھوں درہم کا باغ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتے ہیں۔ غرضیکہ جن صحابہ نے کاروبار کیا اللہ تعالیٰ نے انھیں بے حساب نعمتوں سے نوازا۔ [التجارات فی الاسلام] دنیا کی نعمتوں اور وسعتوں کے ساتھ ان لوگوں کو آخرت کے اجر کی گارنٹی بھی دی گئی ہے۔ جو اپنے

گھروں سے نکلے لیکن دارالہجرت نہ پہنچ پائے راستے ہی میں موت نے آلیا۔ ان میں حضرت خالد بن حزام (رض) بھی ہیں جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی دوران سفر سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے دنیا سے کوچ کر گئے۔ (فہم)

سو آدمیوں کے قاتل کا واقعہ

صحیین کی حدیث میں اس شخص کے بارے میں ہے جس نے ننانوے قتل کئے تھے پھر ایک عابد کو قتل کر کے سو پورے کئے پھر ایک عالم سے پوچھا کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے ؟ اس نے کہا تیری توبہ کے اور تیرے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تو اپنی بستی سے ہجرت کر کے فلاں شہر چلا جا جہاں اللہ کے عابد بندے رہتے ہیں چنانچہ یہ ہجرت کر کے اس طرف چلا راستہ میں ہی تھا جو موت آگئی۔ رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں اس کے بارے میں اختلاف ہوا بحث یہ تھی کہ یہ شخص توبہ کر کے ہجرت کر کے مگر چلا تو سہی یہ وہاں پہنچا تو نہیں پھر انھیں حکم کیا گیا کہ وہ اس طرف کی اور اس طرف کی زمین ناپیں جس بستی سے یہ شخص قریب ہو اس کے رہنے والوں میں اسے ملا دیا جائے پھر زمین کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بری بستی کی جانب سے دور ہو جا اور نیک بستی والوں کی طرف قریب ہو جا، جب زمین ناپی گئی تو توحید والوں کی بستی سے ایک بالشت برابر قریب نکلی اور اسے رحمت کے فرشتے لے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ موت کے وقت یہ اپنے سینے کے بل نیک لوگوں کی بستی کی طرف گھسیٹتا ہوا گیا۔

حدیث قدسی

طبرانی میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میری راہ میں غزوہ کرنے کے لیے نکلا صرف میرے وعدوں کو سچا جان کر اور میرے رسولوں پر ایمان رکھ کر بس وہ اللہ کی ضمانت میں ہے یا تو وہ لشکر کے ساتھ فوت ہو کر جنت میں پہنچے گا یا اللہ کی ضمانت میں واپس لوٹے گا اجر و غنیمت اور فضل رب لے کر۔ اگر وہ اپنی موت مر جائے یا مار ڈالا جائے یا گھوڑے سے گر جائے یا اونٹ پر سے گر پڑے یا کوئی زہریلا جانور کاٹ لے یا اپنے بستر پر کسی طرح فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔ ابوداؤد میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ وہ جنتی ہے بعض الفاظ ابوداؤد میں نہیں ہیں۔ ابو یعلی میں ہے جو شخص حج کے لیے نکلا پھر مر گیا قیامت تک اس کے لیے حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

حقیقی ہجرت

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے : یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ سو اس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے : یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذاء نہ پہنچائے۔

تاریخ کی شہادت :

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لیے وطن چھوڑا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان وطن کی عزت و شرف سے زیادہ عزت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے عراقی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لیے اپنے وطن مصر کو چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر وطن ملک شام کا عطا فرمایا اور پھر مصر بھی ان کو مل گا، ہمارے آقا حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے صحابہ نے اللہ و رسول کے لیے مکہ کو چھوڑا تو مہاجرین کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہوا، ہر طرح کی عزت و غلبہ اور راحت و ثروت عطا ہوئی، ہجرت کے ابتدائی دور میں چند روزہ تکلیف و مشقت کا اعتبار نہیں، اس عبوری دور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں اور ان کی کئی نسلوں میں جاری رہیں اسی کا اعتبار ہوگا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کا فقر و فاقہ

صحابہ کرام کے فقر و فاقہ کے جو واقعات تاریخ میں مشہور ہیں وہ عموماً ہجرت کے ابتدائی دور کے ہیں یا وہ فقہ اختیاری کے ہیں کہ انھوں نے دنیا و مال و دولت کو پسند ہی نہیں کیا اور جو حاصل ہوا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، جیسا کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنا حال یہی تھا کہ آپ کا فقر و فاقہ محض اختیاری تھا، آپ نے غناء و مال داری کو اختیار نہیں فرمایا اور اس کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال میں فتح خیبر کے بعد آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سب اہل و عیال کے گذارہ کا فی انتظام ہو گیا تھا، اسی طرح خلفائے راشدین میں سب کا یہی حال تھا کہ مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا تھا لیکن اسلامی ضرورت پیش آنے پر حضرت صدیق اکبر نے اپنے گھر کا پورا مال لا کر پیش کر دیا، ام المومنین حضرت زینب کو جو کچھ وظیفہ ملتا وہ سب فقراء و مساکین میں تقسیم کر کے خود فقیرانہ زندگی گذارتی تھیں اسی وجہ سے ان کا لقب ام المساکین ہو گیا تھا اور اس کے باوجود اغنیاء صحابہ جنہوں نے بڑی مقدار میں مال و جائیداد چھوڑی ان کی مقدار بھی صحابہ کرام میں کم نہیں، بہت سے حضرات صحابہ ایسے بھی تھے جو اپنے وطن مکہ مکرمہ میں مفلس و نادار تھے، ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دلت اور ہر طرح کی رفاہیت عطا فرمائی، حضرت ابوہریرہ (رض) جب ایک صوبہ کے والی بنا دیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ اتارا کرتے تھے اور اپنے نفس کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ابوہریرہ! تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو پیدل ان کے ساتھ چلے اور جب وہ کسی منزل پر اتریں تو تو ان کے لیے جلانے کی لکڑیاں چن کر لائے، آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا، تجھ کو امام اور امیر المومنین کہا جاتا ہے۔ (گلدستہ)

فوائد

1۔ جو ہمت کر کے ہجرت کے لئے نکل پڑے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہتر اسباب مہیا فرمائے گا اور اسے مناسب جگہ بھی مل جائے گی۔

2۔ جو کفار کے غلبہ سے نکلنے کے لئے ہجرت کرے اور راستے میں اسے موت آجائے یا کفار اسے ظلماً قتل کر دیں تو ان کو ہجرت کا ثواب مل جائے گا۔ کہ اللہ نیتوں کو جانتا ہے اور بہت مہربان ہے۔

مسائل

ا۔ اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والا وسعت اور کشادگی پائے گا۔

۲۔ ہجرت کے دوران فوت ہونے والے کو پورا پورا اجر ملے گا۔

آیت مبارکہ:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب کبھی] [ضَرَبْتُمْ : تم سفر کرو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [فَلَيْسَ : تو نہیں ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [جُنَاحٌ : کوئی گناہ] [اَنْ : کہ] [تَقْصُرُوْا : تم کمی کرو] [مِنَ الصَّلٰوةِ : نماز میں سے] [اِنْ : اگر] [خِفْتُمْ : تمہیں خوف ہو] [اَنْ : کہ] [يَّفْتِنَكُمُ : تمہیں تکلیف دیں گے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے] [كَفَرُوْا : کفر کیا] [اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ : یقینا کافر] [كَانُوْا : ہیں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [عَدُوًّا مُّبِيْنًا : کھلے دشمن]

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو (یعنی چار رکعت فرض کی جگہ دو پڑھو) اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ کافر تمہیں تکلیف میں مبتلا کر دیں گے۔ بیشک کفار تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

تشریح: دین اپنے ماننے والوں کو بے جا تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ حالت جنگ میں اور سفر کے دوران آدمی تکلیف میں ہوتا ہے۔ للذا جہاد ' اور سفر کی حالت میں نماز جیسی عظیم عبادت میں تخفیف فرما دی گئی ہے۔

ایمان لانے کے بعد مسلمانوں پر سب سے زیادہ زور نماز کی ادائیگی اور اس کے قیام پر دیا گیا ہے۔ قیام صلٰوۃ سے مراد اس کے ارکان کی سنت کے مطابق ادائیگی اور اس کے روحانی اور معاشرتی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے ہر قسم کی رعایت بخشی گئی۔ حالت مجبوری میں نماز کے لیے تیمّم ہی کافی سمجھا گیا۔ کسی وجہ سے قبلہ کی طرف منہ کرنا مشکل ہو تو یہ شرط بھی ختم کر دی گئی۔ نماز

میں قیام اور رکوع و سجود کرنے فرض ہیں۔ لیکن کوئی شخص کھڑا نہیں ہو سکتا تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے ' بیٹھ کر نماز ادا نہیں ہوتی تو لیٹ کر ادا کرے۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو اشارے کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن نماز چھوڑنا کفر کے مترادف قرار پایا۔ للذا نماز بقائمی ہوش و حواس ہر حال میں فرض ہے اور اسے جماعت کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

حالت جنگ میں خوف، اضطراب اور عجلت ہوتی ہے۔ اور حالت سفر میں بھی آدمی کو منزل مقصود تک پہنچنے کی جلدی اور گھر سے دور ہونے کی وجہ سے اضطراب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نہایت مہربانی فرماتے ہوئے سفر میں قصر کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ حالت جنگ میں نا صرف نماز فرض ہے بلکہ جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہوا ہے چاہے اسلحہ اٹھا کر ہی پڑھنی پڑے۔ تاہم اس کی رکعات میں تخفیف کر دی گئی کہ حالت جنگ میں سنن اور نوافل کی ادائیگی معاف کرنے کے ساتھ فرض کی چار رکعات کو دو میں تبدیل کر دیا گیا یہاں تک کہ شدید ہنگامی حالات میں ایک رکعت بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

قصر

قصر کے یہ معنی ہیں کہ جن نمازوں میں فرضوں کی چار رکعت پڑھی جاتی ہیں ان میں بجائے چار کے دو رکعت پڑھنا۔ اس آیت میں اس کی اجازت دی جارہی ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم مسافت کے مطابق سفر کرو (یہ اکسٹھ میل چھ سو چالیس گز ہے) تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم چار رکعت کی نماز کو قصر کر کے دو رکعت پڑھ لو ' قرآن مجید سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصر کی رخصت صرف اس صورت میں ہے جب کفار کے حملہ کرنے کا خطرہ ہو لیکن احادیث سے یہ ثابت ہے کہ سفر شرعی میں یہ رخصت زمانہ جنگ اور امن دونوں کو شامل ہے جیسا کہ ہم تفصیل سے عنقریب بیان کریں گے ' پہلے ہم اس آیت کا شان نزول بیان کریں گے ' اور صلوۃ خوف پڑھنے کا طریقہ بیان کریں گے ' پھر زمانہ امن میں نماز میں قصر پڑھنے کے دلائل ذکر کریں گے اور اخیر میں مسافت شرعیہ کا بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق :

نماز خوف کا شان نزول

ابو عیاش الزرقی بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ عسفان (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) میں تھے اور مشرکین کے امیر خالد بن ولید تھے ' ہم نے ظہر کی نماز پڑھی ' مشرکین نے کہا ہم نے ان کو غافل پایا کاش ہم ان پر اس وقت حملہ کر دیتے جب یہ نماز میں تھے ' اس موقع پر ظہر اور عصر کے درمیانی وقت میں قصر کے متعلق (یہ) آیت نازل ہو گئی ' جب عصر کی نماز آئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو عصر کی نماز پڑھائی ' آپ نے ہمارے دو گروہ کر دیئے ' ایک گروہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھتا رہا اور دوسرا گروہ آپ کی حفاظت کرتا رہا۔ (الحدیث) (سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۱۵۴۹ ' سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۱۲۳۶ ' المستدرک ج ۱ ص ۳۳۷ ' سنن کبری للبیہقی ج ۳ ص ۲۵۶۔ ۲۵۴)

نماز خوف پڑھنے کا طریقہ

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نجد کی طرف ایک غزوہ میں گیا ' ہم دشمن کے سامنے کھڑے ہوگئے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہماری صفیں بنائیں ' ایک صف نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک رکوع اور دو سجدوں میں ان کی امامت کی ' پھر یہ لوگ پہلے گروہ کی جگہ چلے گئے (جو دشمن کے سامنے تھا) جس نے نماز پڑھی تھی وہ آکر آپ کے پیچھے کھڑے ہوگئے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک رکوع اور دو سجدوں میں ان کی امامت کی پھر آپ نے سلام پھیر دیا ' پھر ان میں سے ہر گروہ نے (بقیہ) ایک رکوع اور دو سجدے کیے (جس نے آپ کے پیچھے پہلی رکعت پڑھی تھی اس نے بقیہ رکعت لاحق کی طرح پڑھی اور جس نے آپ کے پیچھے دوسری رکعت پڑھی تھی اس نے بقیہ رکعت مسبوق کی طرح پڑھی)

(صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۹۴۲ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۸۳۹ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۱۲۴۳ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۵۶۴ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۱۵۳۸ ' مصنف عبدالرزاق : ۴۲۴۱ ' مسند احمد ج ۲ ص ۱۴۸۔ ۱۴۷ ' سنن دارمی ج ۲ ص ۵۹ ' سنن کبری للبیہقی ج ۳ ص ۲۶۳)

جب امام اپنے اصحاب کو نماز خوف پڑھائے تو ایک جماعت امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسری جماعت امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسری جماعت دشمن کے سامنے کھڑی رہے ' جو جماعت امام کے ساتھ کھڑی ہے امام اس کو ایک رکعت نماز پڑھائے ' پھر جس جماعت نے امام کے ساتھ ایک رکعت نماز پڑھی وہ کوئی کلام کیے بغیر دوسری جماعت کی جگہ جا کر کھڑی ہو جائے اور وہ دوسری جماعت امام کے پیچھے آکر نماز پڑھے امام اس کے ساتھ دوسری رکعت پڑھے ' پھر یہ جماعت کوئی کلام کیے بغیر جماعت کی جگہ جا کر کھڑی ہو جائے اور پہلی جماعت آئے اور تنہا تنہا (بقیہ) ایک رکعت پڑھے ' پھر وہ جا کر دوسری جماعت کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور پھر دوسری جماعت آئے اور وہ بھی تنہا تنہا اپنی (بقیہ) پہلی رکعت پڑھے۔

امام محمد از امام ابوحنیفہ ' از حارث بن عبدالرحمٰن از حضرت عبداللہ بن عباس (رض) اس کی مثل روایت کرتے ہیں ' امام محمد نے کہا ہم اس پوری روایت پر عمل کرتے ہیں ' لیکن پہلی جماعت اپنی بقیہ دوسری رکعت کو بغیر قرات کے پڑھے گی کیونکہ اس نے امام کے ساتھ پہلی رکعت پالی ہے ' اور دوسری جماعت اپنی بقیہ پہلی رکعت کو قرات کے ساتھ پڑھے گی کیونکہ اس کی امام کے ساتھ ایک رکعت رہ گئی ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

امام محمد از امام ابوحنیفہ از حماد از ابراہیم روایت کرتے ہیں کہ جو شخص تنہا نماز خوف پڑھ رہا ہو وہ قبلہ کی طرف منہ کرے ' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو سواری پر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے ' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اشارے کے ساتھ نماز پڑھے ' منہ جس طرف بھی ہو ' اشارہ کرتے ہوئے کسی چیز پر سجدہ نہ کرے ' اپنے رکوع میں سجدہ سے زیادہ جھکے ' اور وضو کو ترک نہ کرے اور نہ دو رکعتوں میں قرات کو ترک کرے ' امام محمد نے کہا ہم اس پوری حدیث پر عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ (کتاب الآثار رقم الحدیث : ۱۹۶۔ ۱۹۵۔ ۱۹۴ ' ص ۴۰۔ ۳۹ ' مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

علامہ المرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ ٗاور علامہ حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ نے بھی نماز خوف کا یہ طریقہ لکھاہے۔ (ہدایہ اولین ص ۱۷۷ ٗ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان درالمختار علی ہامش ردالمختار ج اص ۵۶۹۔ ۵۶۸ ٗمطبوعہ داراحیاء التراث العربی ٗبیروت)

ویسے حالت جنگ میں نماز باجماعت کی ادائیگی کی کئی صورتیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت ہیں جن میں چند ایک صورتیں درج ذیل ہیں:

ا۔ کچھ مجاہد امام کے ساتھ نماز ادا کریں اور باقی پہرہ دیں اور امام دو رکعت پڑھ کر بیٹھا رہے اس کے ساتھ پڑھنے والے مجاہد دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرے لوگ آکر امام کی تیسری اور چوتھی رکعت کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کریں۔ اس طرح امام کی چار اور مجاہدین کی دو دو رکعت نماز ہو گی۔

۲۔ امام دو رکعت نماز پڑھائے گا ایک جماعت اس کے ساتھ ایک رکعت مکمل کرنے کے بعد پیچھے ہٹ کر دوسری رکعت از خود پڑھے گی۔ اب باقی لوگ امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت خود مکمل کریں گے۔ اور امام دو رکعت کے بعد سلام پھیرے گا۔

۳۔ تیسری صورت میں سب لوگ امام کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے۔ پہلی صفوں کے لوگ امام کے ساتھ سجدہ کریں گے جبکہ پچھلے لوگ اسی طرح کھڑے رہیں گے۔ اب یہ لوگ آگے بڑھ کر سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور پہلے لوگ پچھلی صفوں میں کھڑے ہو کر قیام اور رکوع کرنے کے بعد کھڑے رہیں گے۔ اب یہ لوگ سجدے کرتے ہوئے تشہد بیٹھنے کے بعد امام کے ساتھ اکٹھے سلام پھیریں گے۔ (مشکوٰۃ باب نماز خوف)

۴۔ شدید خوف، گھمسان کا رن یا موجودہ طرز جنگ کے مطابق فوجی اپنے اپنے مورچوں میں جس حالت میں مناسب سمجھیں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ بیشک تیمّم کے ساتھ جوتوں سمیت پڑھنی پڑھے۔ مجبوری کی حالت میں قبلہ کی پابندی بھی اٹھادی گئی۔ فرمان عالی ہے: (اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ) [البقرۃ: ۱۱۵] "تم جس طرف بھی اپنے چہرے کرو گے اسی طرف ہی اللہ تعالیٰ کی توجہ کارفرما ہو گی۔"

یہ رعایتیں اس لیے عنایت فرمائیں کہ کفار کی یہ خواہش ہے کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی غافل پا کر یکبارگی حملہ کر کے ختم کر دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی بقا اور ہر لحاظ سے ترقی اور ان کا تحفظ چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے عبادت کے دوران بھی دفاع سے غفلت کی اجازت نہیں دی گئی۔ کاش مسلمان اس نکتہ کو سمجھتے ہوئے دفاعی اور حربی طاقت کو بڑھاتے اور آج غیروں کے سامنے سرنگوں اور ذلیل نہ ہوتے۔ یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ان میں موجود ہوں تو بنفس نفیس امامت کروائیں کیونکہ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کا مقام نہیں کہ وہ امامت و قیادت کرے۔ اسی سے استدلال کرتے ہوئے صحابہ (رض) نے آپ ﷺ کے جسد اطہر کے ہوتے ہوئے صرف درود پڑھا تھا۔ نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ یہاں یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ سرکاری افسران اور قوم کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ میں اتنی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ امامت کروائیں۔ جب سے دینی اور دنیوی قیادت الگ الگ ہوئی۔ اسی وقت سے مذہب اور سیاست میں تفریق پیدا ہوئی۔ سیاست بے دین لوگوں کی وجہ سے کرپشن اور فساد کا منبع بنی اور امامت غریب لوگوں کی بنا پر غیر اہم ہو گئی۔

یہاں آیت کی مناسبت سے

نماز قصر سے متعلق4شرعی مسائل ملاحظہ ہوں

(1)۔۔اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں چار رکعت والی نماز کو پورا پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(2)۔۔کافروں کا خوف قصر کے لیے شرط نہیں، چنانچہ حضرت یعلی بن امیہ (رض) نے حضرت عمر (رض) سے کہا کہ ہم تو امن میں ہیں (پھر ہم کیوں قصر کرتے ہیں؟) آپ (رض) نے فرمایا، اس کا مجھے بھی تعجب ہوا تھا تو میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا۔ اس پر حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے لیے یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے صدقہ ہے تم اس کا صدقہ قبول کرو۔ (مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا، باب صلوۃ المسافرین وقصرہا، ص ۳۴۷، الحدیث: ۴(۶۸۶))

آیت کے نازل ہونے کے وقت چونکہ سفر اندیشہ سے خالی نہ ہوتے تھے اس لیے آیت میں اس کا ذکر ہوا ہے ورنہ خوف اور اندیشہ کا ہونا کوئی شرط نہیں ہے، نیز صحابہ کرام (رض) کا بھی یہی عمل تھا کہ امن کے سفروں میں بھی قصر فرماتے جیسا کہ اوپر کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور احادیث سے بھی یہ ثابت ہے۔

(3)۔۔جس سفر میں قصر کیا جاتا ہے اس کی کم سے کم مدت تین رات دن کی مسافت ہے جو اونٹ یا پیدل کی متوسط رفتار سے طے کی جاتی ہو اور اس کی مقداریں خشکی اور دریا اور پہاڑوں میں مختلف ہو جاتی ہیں۔ ہمارے زمینی، میدانی سفر کے اعتبار سے فی زمانہ اس کی مسافت بانوے کلومیٹر بنتی ہے۔

(4)۔۔قصر صرف فرضوں میں ہے، سنتوں میں نہیں اور سفر میں سنتیں پڑھنی چاہئیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضر کی نماز اور سفر کی نماز کو فرض فرمایا تو ہم حضر میں فرض نماز سے پہلے بھی نماز پڑھا کرتے تھے اور بعد میں بھی اور سفر میں فرض نماز سے پہلے بھی نماز پڑھا کرتے تھے اور بعد میں بھی۔ (ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیہا، باب التطوع فی السفر، ۱/۵۶۱، الحدیث: ۱۰۷۲)

دو نمازوں کو اکٹھا کرنا

(عَنْ عَلِیِّ بْنِ حُسَیْنٍ (رض) اِنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِذَا أَرَادَ أَنْ یَّسِیْرَ یَوْمَہٗ جَمَعَ بَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ وَإِذَا أَرَادَ أَنْ یَّسِیْرَ لَیْلَہٗ جَمَعَ بَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ) [موطا امام مالک: کتاب النداء للصلاۃ]

" حضرت علی بن حسین (رض) کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب دن کے وقت سفر کا ارادہ کرتے تو ظہر اور عصر کی نماز کو جمع فرماتے اور جب رات کو سفر کرنا چاہتے تو مغرب اور عشاء کی نماز کو اکٹھا کرتے تھے۔"

مسائل

۱۔ سفر کے دوران نماز قصر کرنے کی اجازت ہے۔

۲۔ کفار مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑتے۔

۳۔ کافر مسلمانوں کے کھلے دشمن ہیں۔

۴۔ جنگ کے دوران حالت نماز میں اسلحہ پہنے رکھنے کی اجازت ہے۔

۵۔ مسلمانوں کو سستی اور غفلت کی بنا اپنے آپ پر کفار کو حملہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔
۶۔ بارش اور جسمانی تکلیف کی وجہ سے حالت نماز میں اسلحہ رکھ دینا جائز ہے۔
۷۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو امامت کے فرائض خود سرانجام دینے چاہئیں۔
۸۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ذلیل کردینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب کبھی] [كُنْتَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں گے] [فِيْهِمْ : ان میں] [فَاَقَمْتَ : تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قائم کریں گے] [لَهُمُ : ان کے لیے] [الصَّلٰوةَ : نماز کو] [فَلْتَقُمْ : پس چاہیے کہ کھڑی ہو] [طَآئِفَةٌ : ایک جماعت] [مِّنْهُمْ : ان میں سے] [مَّعَكَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ] [وَلْيَاْخُذُوْٓا : اور چاہیے کہ وہ پکڑیں] [اَسْلِحَتَهُمْ : اپنے اسلحے] [فَاِذَا : پھر

جب] [سَجَدُوْا : وہ سجدہ کرلیں] [فَلْيَكُوْنُوْا : تو چاہیے کہ وہ ہوجائیں] [مِنْ وَّرَآئِكُمْ : تمہارے پیچھے] [وَلْتَاْتِ : اور چاہیے کہ آئے] [طَآئِفَةٌ اُخْرٰى : دوسری جماعت] [لَمْ يُصَلُّوْا : جس نے نماز نہیں پڑھی] [فَلْيُصَلُّوْا : تو چاہیے کہ وہ نماز پڑھیں] [مَعَکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ] [وَلْيَاْخُذُوْا : اور چاہیے کہ پکڑیں] [حِذْرَہُمْ : اپنا بچاؤ] [وَاَسْلِحَتَہُمْ : اور اپنے اسلحے] [وَدَّ : چاہا] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے] [كَفَرُوْا : کفر کیا] [لَوْ : (کہ) اگر] [تَغْفُلُوْنَ : تم غافل ہوتے] [عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ : اپنے اسلحوں سے] [وَاَمْتِعَتِكُمْ : اور اپنے سامانوں سے] [فَيَمِيْلُوْنَ : تو وہ پل پڑیں] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [مَّيْلَةً وَّاحِدَةً : یکبارگی حملہ کر کے] [وَلاَ جُنَاحَ : اور کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اِنْ : اگر] [كَانَ : ہو] [بِكُمْ : تم کو] [اَذًى : کوئی تکلیف] [مِّنْ مَّطَرٍ : بارش سے] [اَوْ : یا] [كُنْتُمْ : تم ہو] [مَّرْضٰٓى : مریض] [اَنْ : کہ] [تَضَعُوْٓا : تم رکھ دو] [اَسْلِحَتَكُمْ : اپنے اسلحوں کو] [وَخُذُوْا : اور پکڑو] [حِذْرَكُمْ : اپنا بچاؤ] [اِنَّ : یقینا] [اللّٰهَ : اللہ نے] [اَعَدَّ : تیار کیا ہے] [لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے] [عَذَابًا مُّهِيْنًا : ایک رسوا کرنے والا عذاب]

ترجمہ: اور (اے محبوب !) جب آپ ان (مجاہدوں) میں (تشریف فرما) ہوں توان کے لیے نماز (کی جماعت) قائم کریں پس ان میں سے ایک جماعت کو (پہلے) آپ کے ساتھ (اقتداءً) کھڑا ہونا چاہیے اور انھیں اپنے ہتھیار بھی لیے رہنا چاہئیں، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو (ہٹ کر) تم لوگوں کے پیچھے ہو جائیں اور (اب) دوسری جماعت کو جنہوں نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی آ جانا چاہیے پھر وہ آپ کے ساتھ (مقتدی بن کر) نماز پڑھیں اور چاہیے کہ وہ (بھی بدستور) اپنے اسباب حفاظت اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، کافر چاہتے ہیں کہ کہیں تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے اسباب سے غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر دفعۃً حملہ کر دیں، اور تم پر کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو یا بیمار ہو تو اپنے ہتھیار (اُتار کر) رکھ دو، اور اپنا سامان حفاظت لیے رہو۔ بیشک اللہ نے کافروں کے لیے ذلت انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے

اس آیت میں نماز خوف کی جماعت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے

اس کا شان نزول یہ ہے کہ غزوہ ذات الرِّقاع میں جب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مشرکین نے دیکھا کہ آپ نے تمام صحابہ (رض) کے ساتھ نماز ظہر باجماعت ادا فرمائی تو انھیں افسوس ہوا کہ انھوں نے اس وقت میں کیوں نہ حملہ کیا اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا ہی اچھا موقع تھا۔ ان میں بعضوں نے کہا کہ اس کے بعد ایک اور نماز ہے جو مسلمانوں کو اپنے ماں باپ سے زیادہ پیاری ہے یعنی نماز عصر، لہٰذا جب مسلمان اس نماز کے لیے کھڑے ہوں تو پوری قوت سے حملہ کر کے انھیں قتل کر دو۔ اس وقت حضرت جبرائیل امین (علیہ السلام) نازل ہوئے اور انھوں نے حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ نماز خوف ہے یعنی اب یوں نماز پڑھیں۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۲، ۱/۴۲۳)

آیت میں بیان کیا گیا نماز خوف کا طریقہ

اس آیت میں نماز خوف کا طریقہ یہ بیان کیا گیا کہ حاضرین کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں سے ایک آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ رہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انھیں نماز پڑھائیں اور ایک جماعت دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہے۔ پہلی جماعت ایک رکعت پڑھ کر اور مغرب میں دو رکعتیں پڑھ کر دشمن کے مقابل چلی جائے اور دوسری جماعت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے آجائے پھر بعد میں وہ اپنی ایک ایک بقیہ رکعت پڑھ لیں اور جن کی دو باقی ہیں وہ دو پڑھ لیں اور دونوں جماعتیں ہر وقت اسلحہ ساتھ رکھیں یعنی نماز میں بھی مُسلّح رہیں۔ معلوم ہوا کہ نماز کی جماعت ایسی اہم ہے کہ ایسی سخت جنگ کی حالت میں بھی جماعت کا طریقہ سکھایا گیا۔ افسوس ان پر جو بلاوجہ جماعت چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ اس میں ستائیس گنا زیادہ ثواب ہے۔

{ وَدَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: اور کافر چاہتے ہیں۔} ارشاد فرمایا کہ تمہیں حفاظت کا سامان اور ہتھیار ساتھ رکھنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ کافر یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ تو وہ ایک ہی دفعہ تم پر حملہ کر دیں اور اگر ہتھیار تمہارے پاس ہوں گے تو دشمن تم پر اچانک حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔ آیت کے اس حصے کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ ذات الرّقاع سے جب فارغ ہوئے اور دشمن کے بہت آدمیوں کو گرفتار کیا اور اموال غنیمت ہاتھ آئے اور کوئی دشمن مقابلے میں باقی نہ رہا تو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قضائے حاجت کے لیے جنگل میں تنہا تشریف لے گئے، دشمن کی جماعت میں سے غورث بن حارث یہ خبر پا کر تلوار لیے ہوئے چھپ چھپ کر پہاڑ سے اترا اور اچانک تاجدار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچا اور تلوار کھینچ کر کہنے لگا یا محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ پیارے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ۔ اور ساتھ ہی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا فرمائی۔ جب اس نے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تلوار چلانے کا ارادہ کیا تو اوندھے منہ گر پڑا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ تلوار لے کر فرمایا کہ تجھے مجھ سے کوئی بچائے گا؟ کہنے لگا، میرا بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ رحمتِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "اَشۡھَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰہِ "پڑھ تو تیری تلوار تجھے دے دوں گا، اس نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ میں کبھی آپ سے نہ

لڑوں گا اور زندگی بھر آپ کے کسی دشمن کی مدد نہ کروں گا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی تلوار اس کو دے دی کہنے لگا، یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ مجھ سے بہت بہتر ہیں؟ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ہاں! ہمارے لائق یہی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ہتھیار اور بچاؤ کا سامان ساتھ رکھنے کا حکم دیا گیا۔

(ابو سعود، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۲، ۵۷۹/۱)

اِن کَانَ بِکُمْ اَذًی: اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو۔} حکم تھا کہ اپنی حفاظت کا سامان ہر وقت ساتھ رکھو لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) زخمی تھے اور اس وقت ہتھیار رکھنا ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا، ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی اور حالت عذر میں ہتھیار کھول رکھنے کی اجازت دی گئی۔ (قرطبّی، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۲، ۲۵۶/۳، الجزء الخامس)

اسلام تدبیر اور توکل کا حسین امتزاج

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام دراصل تدبیر اور توکل کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ وہ ایک طرف تو مومن کو یہ عقیدہ دیتا ہے کہ تمہارے تمام معاملات کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ارادہ اسباب پر حکمرانی کرتا ہے۔ اسباب سے تعلق ٹوٹ جائے لیکن اللہ سے تعلق ٹوٹنے نہ پائے۔ وہی تمہاری مدد کرتا ہے اور وہی تمہیں فتح و نصرت سے نوازتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ آلات جنگ کی بہم رسانی تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ تمہارے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ اس میں کوتاہی کرو گے تو اللہ کے ہاں جوابدہی کرنا پڑے گی اور ممکن وسائل جنگ ساتھ لے کر میدان جنگ میں اترو۔ جنگ کے جو بظاہر اسباب ہو سکتے ہیں ان سے غفلت مت کرو۔ لیکن بھروسہ وسائل جنگ پر نہیں اللہ پر رکھو۔ تمہاری حقیقی کامرانی اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن وسائل جنگ کی فراہمی بھی اسی کا حکم ہے۔ حکم بجالاؤ گے تو اس کی نصرت آئے گی اور نافرمانی کرو گے تو اس کی تائید و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان اللہ کی تائید و نصرت حاصل کرنے کے لیے ان دونوں باتوں کے پابند ہیں۔ وہ امکانی حد تک حالات کے تقاضوں کے مطابق آلات جنگ تیار کریں "اَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ" کے حکم کے تحت امت مسلمہ ہر دور میں آلات جنگ تیار کرنے کی پابند ہے۔ تلوار کے دور میں تلوار تیار کرنا ضروری تھا 'گھوڑوں کے زمانے میں گھوڑے پالنا فرض تھا اور آج کے دور میں ایٹمی طاقت بننا اور ٹینک تیار کرنا مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے۔ یہ اسی طرح فرض ہے جیسے نماز پڑھنا فرض ہے۔ اس میں کوتاہی کا خمیازہ دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور آخرت میں بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر نماز کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اور نماز چونکہ منکرات سے روکتی ہے اس لیے تمام منکرات کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ یہ دو باتیں ہر دور میں فتح و نصرت کی ضمانت رہی ہیں اور آج بھی یہی ضمانت ہیں۔ اللہ کے قوانین ہر دور میں یکساں ہیں۔ سچ کہا ظفر علی خان نے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

آخر میں فرمایا کہ اطمینان کے طور پر یہ بات یاد رکھو کہ تم اگر اپنی مستعدی نماز کی پابندی اور اللہ کی اطاعت میں کوئی کمی نہ آنے دو تو یقیناً تمہیں اللہ کی نصرت شامل حال ہوگی۔ جہاں تک کافروں کا تعلق ہے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب اللہ نے پہلے ہی تیار کر رکھا ہے۔ وہ تو اس عذاب سے اس وقت تک بچے رہتے ہیں جب تک امت مسلمہ اپنا فرض انجام نہیں دیتی۔ لیکن جیسے ہی امت اپنا فرض انجام دینے کے لیے اٹھ

کھڑی ہوتی ہے اور اپنے فرض کے تقاضوں کو بروئے کار لاتی ہے تو کافروں کے لیے اللہ کا عذاب حرکت میں آجاتا ہے۔ یہ امت مسلمہ کے لیے ایک ایسی حوصلہ افزائی ہے جس پر جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

آیت مبارکہ:

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾

لغۃ القرآن: [فَاِذَا : پھر جب] [قَضَيْتُمُ : تم پورا کرو] [الصَّلٰوةَ : نماز کو] [فَاذْكُرُوا : تو تم یاد کرو] [اللّٰهَ : اللہ کو] [قِيٰمًا : کھڑے ہوئے] [وَّقُعُوْدًا : اور بیٹھے ہوئے] [وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ : اور اپنی کروٹوں پر] [فَاِذَا : پھر جب] [اطْمَاْنَنْتُمْ : تم مطمئن ہو] [فَاَقِيْمُوا : تو تم قائم کرو] [الصَّلٰوةَ : نماز کو] [اِنَّ : بیشک] [الصَّلٰوةَ : نماز] [كَانَتْ : ہے] [عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں پر] [كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا : مقرر وقت پر فرض]

ترجمہ: پھر (اے مسلمانو!) جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہر حال میں) یاد کرتے رہو، پھر جب تم (حالت خوف سے نکل کر) اطمینان پالو تو نماز کو (حسب دستور) قائم کرو۔ بیشک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔

تشریح:

نماز خوف کا طریقہ

تعلیم کرنے کے ساتھ یہ بتایا جارہا ہے کہ اگرچہ خوف کی حالت میں تم نماز کو اس کی اصلی ہیئت کے مطابق سکون وطمانینت سے ادا نہیں کر سکتے تو اپنی زبان ودل کو تم جس حالت میں بھی ہو ذکر الٰہی میں مصروف رکھو۔ تاکہ اس کی یاد میں غفلت نہ آنے پائے۔ اور جنگ کی حالت

میں کثرت سے ذکر الٰہی کرنے کی تاکید تو دوسری متعدد آیتوں میں آئی ہے مثلًا اذا لقیتم فءۃ فاثبواواذکروااللہ کثیرا۔ جب دشمن سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔

اور جب خوف دور ہو جائے تو پھر نماز کو اس کی اصلی ہیئت کے مطابق ادا کرو۔

نماز کے متعلق یہاں دو خصوصیتوں کا ذکر فرمایا کتابا اور موقوتا۔ کتاب کا مطلب تو یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی تم پر فرض ہے تمہاری مرضی پر اس کا انحصار نہیں کہ موج میں آئے تو ادا کرلی اور موج میں نہ ہوئے تو چھوڑ دی۔ بلکہ مالک الملک شہنشاہ دوجہاں کا تاکیدی حکم ہے اور اس کی ادائیگی تم پر فرض ہے موقوتا کا معنی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ والمعنی عند اھل اللغۃ مفروض لوقتہ بعینہ یقال وقتہ فھو موقوت ووقتہ فھو موقت (قرطبی)۔ اس لیے ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا فرض ہے یہ نہیں کہ جب جی چاہا اٹھ کھڑے ہوئے اور دو تین ایک ساتھ پڑھ ڈالیں۔ ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو ظہر اور عصر کی نماز اور مغرب اور عشا کی نماز ہمیشہ ملا کر پڑھتا ہے۔ پہلی دو نمازوں کا نام ظہرین اور دوسری دو نمازوں کا نام مغربین رکھ دیا ہے۔ انھیں چاہیے کہ خدا سے ڈریں۔ اس آیت میں غور کریں اور ہر نماز کو اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقرر کردہ اوقات میں ادا کریں۔ اتنے اہم فریضہ کی ادائیگی میں اپنی مرضی اور منشا سے کام لینا ان کے لیے روز قیامت پشیمانی ہوگا۔ (ضیاء)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر فرض کی ایک حد معیَّن فرمائی سوائے ذکر کے کہ اس کی کوئی حد نہ رکھی بلکہ فرمایا کہ ذکر کرو کھڑے بیٹھے کروٹوں پر لیٹے، رات میں ہو یا دن میں، خشکی میں ہو یا تری میں، سفر میں اور حضر میں، غناء میں اور فقر میں، تندرستی اور بیماری میں پوشیدہ اور ظاہر۔

(تفسیر طبری، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۳، ۲۶۰/۴)

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے متعلق 2 شرعی مسائل

یہاں آیت کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے متعلق 2 شرعی مسائل ملاحظہ ہوں

(1)۔۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازوں کے بعد جو کلمہ توحید کا ذکر کیا جاتا ہے وہ جائز ہے جیسا کہ مشائخ کی عادت ہے اور بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ سے بھی یہ ذکر ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ (رض) فرماتے ہیں: حضورِ اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر فرض نماز کے بعد یوں کہا کرتے تھے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْكُ، وَلَہُ الْحَمْدُ، وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، اللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ، وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ" یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے سب تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اے اللہ! جو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روکے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی دولت مند کو تیرے مقابلے پر دولت نفع نہیں دے گی۔

(بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلاۃ، ۲۹۴/۱، الحدیث: ۸۴۴)

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر (رض) ہر نماز میں سلام پھیرنے کے بعد یہ فرماتے تھے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ

الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِهَ الْکَافِرُوْنَ "اور حضرت عبداللہ بن زبیر (رض) نے کہا کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر نماز کے بعد یہ کلمات بلند آواز سے فرماتے تھے۔
(مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ و بیان صفتہ، ص ۲۹۹، الحدیث: ۱۳۹ (۵۹۴))

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: بلند آواز سے ذکر کرنا جبکہ لوگ فرض نماز سے فارغ ہو جاتے یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک میں رائج تھا۔ آپ (رض) فرماتے ہیں: جب میں اس (بلند آواز سے ذکر کرنے) کو سنتا تو اسی سے لوگوں کے (نماز سے) فارغ ہونے کو جان لیتا تھا۔
(بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلاۃ، ۱/۲۹۳، الحدیث: ۸۴۱، مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب الذکر بعد الصلاۃ، ص ۲۹۹، الحدیث: ۱۲۲ (۵۸۳))
البتہ یہ یاد رہے کہ ذکر کرتے وقت اتنی آواز سے ذکر کیا جائے کہ کسی نمازی یا سونے والے کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔
(2)۔۔ذکر میں تسبیح، تحمید تہلیل، تکبیر، ثنائ، دعا سب داخل ہیں۔
قرآن مجید کی بعض آیات میں ذکر کا اطلاق نماز پر کیا گیا ہے لیکن ذکر سے مراد ذکر بالقلب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت ' اس کے جلال اور اس کی قدرت میں غور و فکر کرنا ' اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور صنعت میں جو اپنی ذات اور اپنی وحدانیت پر دلائل رکھے ہیں ان میں غور و فکر کر کے اس کی ذات اور اس کی وحدانیت تک پہنچنا ' اور یا ذکر سے مراد زبان سے اس کی تسبیح ' تقدیس اور تہلیل کرنا ہے ' حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ کے ذکر کرنے میں صرف وہی شخص معذور ہے جس کی عقل زائل ہو چکی ہو (احکام القرآن ج ۲ ص ۲۶۵' مطبوعہ سہیل اکیڈمی ' لاہور ' ۱۴۰۰ھ)
اس آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ذکر سے مراد نماز ہو یعنی تم کفار سے کھڑے ہوئے لڑ رہے ہو اور اسی حال میں نماز کا وقت آ جائے تو عین لڑائی کے عالم میں کھڑے ہوئے نماز پڑھو ' یا تم بیٹھ کر تیر اندازی کر رہے ہو ' یا زخموں سے چور ہو کر پہلو کے بل گر گئے ہو تو اسی عالم میں نماز پڑھو ' اور یہ معنی امام شافعی کے مذہب کے مطابق ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر کفار سے دست بہ دست لڑائی کی حالت میں بھی نماز کا وقت آ جائے تو نماز پڑھ لی جائے اور پھر بعد میں اسی نماز کی قضاء کر لی جائے ' لیکن یہاں پر یہ معنی بعید ہے کیونکہ اس آیت کا معنی ہو گا جب تم نے نماز پڑھ لی ہے تو پھر نماز پڑھو نیز ذکر کا معنی نماز مجازا ہے اور بغیر ضرورت شرعیہ کے کسی لفظ کو مجاز پر محمول نہیں کیا جاتا (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۰۶ مطبوعہ دار الفکر بیروت ' ۱۳۹۸ھ)

حالت جنگ میں نماز پڑھنے کے متعلق مذاہب فقہاء

نماز کے اوقات مقرر ہیں اور کسی نماز کو اس کے وقت کے بغیر ادا نہیں کیا جا سکتا ' اس لیے سفر میں نماز کو اس کے وقت پر ادا کیا جائے گا ' اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ حضر میں چار رکعت نماز فرض کی گئی ہے اور سفر میں دو رکعت نماز فرض کی گئی سو ہر حال میں اس حال کے مطابق نماز ادا کی جائے گی ' امام شافعی اس کے قائل ہیں کہ جب کافر اور مسلمان کی تلواریں ٹکرا رہی ہوں تو اس وقت بھی مسلمان اپنے وقت پر نماز

پڑھے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس حالت میں نماز فرض نہیں ہے اور وہ شخص وقت نکلنے کے بعد اس نماز کی قضا کرے گا۔

امام ابو حنیفہ ' امام ابو یوسف ' امام محمد ' اور امام زفر یہ کہتے ہیں کہ حالت جنگ میں نماز نہیں پڑھی جائے گی ' اگر کسی شخص نے نماز پڑھتے ہوئے قتال کیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ' امام مالک ثوری یہ کہتے ہیں کہ جب رکوع اور سجود پر قادر نہ ہو تو اشارہ سے نماز پڑھے حسن بن صالح نے کہا جب لڑائی کے وقت رکوع پر قادر نہ ہو تو ہر رکوع کے بدلہ میں ایک تکبیر کہہ لے ' امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ نماز کی حالت میں ضرب لگائے یا نیزہ مارے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اس نے مسلسل نیزے مارے یا ضرب لگائی یا کوئی اور عمل طویل کیا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی '

امام ابو بکر رازی کہتے ہیں کہ قتال سے نماز باطل ہو جاتی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کئی مقامات پر نماز خوف پڑھائی ہے اور جنگ خندق میں آپ نے چار نمازیں نہیں پڑھیں حتی کہ رات داخل ہو گئی پھر آپ نے فرمایا اللہ ان کے گھروں اور ان کے پیٹوں کو آگ سے بھر دے کیونکہ ان کی وجہ سے ہم عصر کی نماز نہیں پڑھ سکے ' پھر آپ نے ان چاروں نمازوں کو ترتیب وار قضا کیا ' اس حدیث میں آپ نے یہ خبر دی ہے کہ قتال میں مشغول ہونے کی وجہ سے آپ کی چار نمازیں قضا ہو گئیں اگر حالت قتال میں نماز پڑھنا جائز ہوتا تو آپ نماز کو ترک نہ فرماتے ' جس طرح آپ نے بغیر قتال کے حالت خوف میں نماز کو ترک نہیں کیا۔ (احکام القرآن ج ٢ ص ٢٦٤ ' مطبوعہ لاہور)

{ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا: مقررہ وقت پر فرض ہے۔} نماز کے اوقات مقرر ہیں لہٰذا لازم ہے کہ ان اوقات کی رعایت کی جائے۔

نمازوں کے اوقات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہر نماز ایک وقت مقرر میں فرض کی گئی ہے۔ فجر کی نماز کا وقت فجر صادق کے طلوع سے شروع ہوتا ہے اور طلوع آفتاب تک رہتا ہے ظہر کی نماز کا وقت سورج کے استواء اور نصف النہار سے زوال کے بعد شروع ہوتا ہے (اور دو مثل سایہ تک رہتا ہے) اور عصر کا وقت دو مثل سائے کے بعد شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے اور مغرب کا وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور سرخی کے بعد جو سفیدی ظاہر ہوتی ہے اس کے مکمل چھپنے تک رہتا ہے اور عشاء کا وقت اس سفیدی کے چھپنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور فجر صادق کے طلوع تک رہتا ہے۔ (موطا امام مالک ' رقم الحدیث: ٩ ' ٦ ' ٣)

ایک نماز کے وقت میں دوسری نماز ادا کرنے کا عدم جواز

چونکہ یہ اوقات نمازوں کے لیے شرط ہیں اس لیے ہر نماز اپنے وقت میں ہو گی اور دوسری نماز کے وقت میں یا اپنا وقت آنے سے پہلے ادا نہیں ہو گی۔ ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ سفر میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً عصر کو ظہر کے وقت میں پڑھ لیا جائے یا عشاء کو مغرب کے وقت میں پڑھ لیا جائے ' ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کیونکہ دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا اس آیت کے خلاف ہے ' بعض

احادیث صحیحہ میں حضرت عمر (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سفر میں جلدی ہوتی تو آپ ظہر اور عصر ' یا مغرب اور عشاء جمع کر کے پڑھ لیتے (صحیح بخاری رقم الحدیث : ۱۱۰۷ ' ۱۱۰۶)

سفر میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا شرعی حکم

ہمارے نزدیک یہ جمع صوری پر محمول ہے یعنی آپ ظہر کو اس کے آخری وقت میں اور عصر کو اس کے ابتدائی وقت میں پڑھ لیتے تھے یا مغرب کو اس کے آخری میں اور عشاء کو اس کے ابتدائی وقت میں پڑھ لیتے تھے ہم نے ان حدیثوں کو حقیقۃ جمع پر اس لیے محمول کیا تاکہ اخبار آحاد سے قرآن مجید کے عموم کا نسخ لازم نہ آئے اور میدان عرفات میں جو ظہر کے وقت میں عصر کو پڑھا جاتا ہے اور مزدلفہ میں عشاء کے وقت میں مغرب کو پڑھا جاتا ہے تو یہ خبر واحد نہیں ہے بلکہ تواتر سے ثابت ہے اور یہ خبر متواتر اس آیت کے لیے مخصص ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر میں دو نمازیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ احادیث میں بھی سفر کے دوران دو نمازوں کو جمع کرنے کی نفی کی گئی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں "میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کوئی نماز اس کے غیر وقت میں پڑھی ہو مگر دو نمازیں کہ ایک ان میں سے نماز مغرب ہے جسے مزدلفہ میں عشاء کے وقت پڑھا تھا اور وہاں فجر بھی روز کے معمولی وقت سے پہلے تاریکی میں پڑھی تھی۔

(مسلم، کتاب الحج، باب استحباب زیادۃ التغلیس بصلاۃ الصبح۔۔ الخ، ص ۶۷۱، الحدیث : ۲۹۲ (۱۲۸۹))

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں "رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک بار کے سوا کبھی کسی سفر میں مغرب و عشاء ملا کر نہ پڑھی۔

(ابو داؤد، کتاب صلوۃ المسافر، باب الجمع بین الصلاتین، ۹/۲، الحدیث : ۱۲۰۹)

یاد رہے کہ جس سفر میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھا وہ حجۃ الوداع کا سفر تھا اور نویں ذی الحجہ کو مزدلفہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں نمازوں کو ملا کر پڑھا تھا اور دیگر جن احادیث میں دو نمازیں جمع کرنے کا ذکر ہے وہاں جمع صوری مراد ہے یعنی پہلی نماز آخری وقت میں اور دوسری نماز اول وقت میں ادا کی گئی جیسا کہ درج ذیل دو روایات سے واضح ہے، چنانچہ

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں "میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہنچنے کی جلدی ہوتی تو (آخری وقت سے کچھ دیر پہلے) مغرب کی اقامت کہہ کر نماز پڑھ لیتے، سلام پھیر کر کچھ دیر ٹھہرتے پھر عشاء کی اقامت ہوتی اور نماز عشاء کی دو رکعتیں پڑھتے۔

(بخاری، کتاب تقصیر الصلاۃ، باب یصلی المغرب ثلاثاً فی السفر، ۱/۳۷۴، الحدیث : ۱۰۹۲)

حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن واقد (رض) سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کے مؤذن نے نماز کے لیے کہا تو آپ (رض) نے فرمایا : چلتے رہو، یہاں تک کہ جب شَفَق ڈوبنے کے قریب ہوئی تو آپ (رض) نے اتر کر نماز مغرب پڑھی، پھر انتظار فرمایا یہاں تک کہ شفق ڈوب گئی، اس وقت آپ (رض) نے نماز عشاء پڑھی، پھر فرمایا "حضور سیّد عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب (کسی کام کی وجہ سے) جلدی ہوتی تو ایسا ہی کرتے جیسا میں نے کیا۔

(ابو داؤد، کتاب صلوۃ المسافر، باب الجمع بین الصلاتین، ۲/۱۰، الحدیث : ۱۲۱۲)

نوٹ : اس مسئلے سے متعلق تفصیلی اور تحقیقی معلومات حاصل کرنے لیے فتاوی رضویہ کی پانچویں جلد میں موجود اعلیٰ حضرت امام حمد رضا خان (رح) کی کتاب "حَاجِزُ الْبَحْرَیْنِ الْوَاقِیْ عَنْ جَمْعِ الصَّلَاتَیْنِ" (دو نمازیں ایک وقت میں پڑھنے کی ممانعت پر رسالہ) کا مطالعہ فرمائیں۔

قطبین میں نمازوں اور روزوں کا مسئلہ

اسی طرح یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قطبین میں چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے تو وہاں روزے اور نمازوں کی کیا صورت ہو گی ؟ اس کی جواب یہ ہے کہ :

اگر فی الواقع قطبین کے افق پر چوبیس گھنٹے کے بعد سورج اور چاند کا طلوع اور غروب ہوتا ہے اور وقت کی باقی علامات بھی افق پر ظاہر ہوتی ہیں جن سے ظہر اور عصر اور مغرب، وغیرہا کا تعین کیا جاسکتا ہے، تب تو وہاں چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازیں بھی فرض ہیں ' رمضان کے روزے بھی فرض ہیں اور لیلۃ القدر بھی متحقق ہو گی اور اگر وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے اور سورج اور چاند کا طلوع اور غروب چھ ماہ کے بعد ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والوں پر چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازیں فرض ہیں نہ رمضان کے روزے اور نہ وہاں شب قدر کا وجود ہو گا کیونکہ یہ تمام چیزیں چوبیس گھنٹہ کے بعد سورج کے طلوع اور غروب پر موقوف ہیں۔ البتہ نماز اور روزے میں عبادت کی مشابہت اختیار کرنی چاہیے اور قطبین کے قریب جس ملک میں چوبیس گھنٹے کے بعد سورج کا طلوع اور غروب ہوتا ہے اس کے اوقات کے مطابق نماز کے اوقات مقرر کیے جائیں اور اسی ملک کے حساب سے روزے رکھے جائیں اور شب قدر کی جائے یعنی جب اس قریب کے ملک میں رمضان ہو اس وقت وہاں رمضان کا اعتبار کرلیا جائے گا اور اسی ملک کے اوقات کے لحاظ سے سحر و افطار کا تعین کیا جائے لیکن یہ تشبہ فی العبادت ہے اور عبودیت اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اگرچہ ہم نے بعینہٖ نماز کے اوقات اور رمضان کا مہینہ نہیں پایا لیکن اس کے مشابہ اوقات میں ہم ان عبادات کو کر رہے ہیں 'آخر وہاں دنیا کے دوسرے تمام کاموں کے اوقات مقرر کیے جاتے ہیں 'کاروبار 'سیر و تفریح 'کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات مقرر کیے جاتے ہیں 'صبح سے لے کر شام تک کام کرنے والے لوگ وہاں چھ ماہ کی دن میں مسلسل کام کرتے ہیں ' یہ چھ ماہ سوتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا تین ماہ بعد یا شام کا کھانا چھ ماہ بعد تو نہیں کھاتے جس طرح زندگی کے باقی معمولات کو وہاں کے غیر معمولی حالات اور اوقات میں معین کیا جاتا ہے خواہ باقی دنیا کے اعتبار سے وہ غیر معمولی لگتا ہو کہ سورج نکلا ہوا ہے اور وہ شام کا کھانا کھا رہے ہیں 'اسی طرح عبادات کے نظام کو بھی قریب ترین ملک کے اوقات کے لحاظ سے ترتیب دینا چاہیے۔ جہاں معمول کے مطابق طلوع اور غروب ہوتا ہو ہرچند کے یہ معمول کے مطابق عبادات نہیں ہیں لیکن وہاں کے حالات سے اعتبار سے یہی ترتیب معمول ہو گی اس لیے وہاں چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازیں اور سال کے بعد روزے فرض عین تو نہیں لیکن فرض کے مشابہ ضرور ہیں اور وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو یہ عبادات کسی حال میں ترک نہیں کرنی چاہئیں اور جب وہ اپنے قریب ترین ملک کے لحاظ سے شب قدر مقرر کرکے اس میں عبادت کریں گے تو انشاء اللہ اس کا ثواب بھی ضرور ملے گا۔ (تبیان)

فوائد

ف 1 : یعنی نماز کے علاوہ پھر ہر طرح ذکر اللہ کرتے رہو۔ اس سے دو مسئلے ثابت ہوئے ایک تو یہ کہ جہاد میں غازی کی یہ شان چاہیے کہ ہاتھ میں تلوار اور زبان پر ذکر یار ہو۔ دوسرے یہ کہ فرض نماز کے بعد جو بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھتے یا درود شیرف پڑتے ہیں وہ جائز بلکہ بہتر ہے۔ یہ آیت اس کا ماخذ ہے۔ بعد نماز بلند آواز سے ذکر کی بہت سی احادیث ہیں۔

ف 2 : تمام شرائط وغیرہ ادا کر کے یعنی یہ چلنے پھرنے کی اجازت نماز خوف میں تھی۔ اس کے بعد نہیں ہے۔

3 : معلوم ہوا کہ سفر میں دو نمازیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ہر نماز کے لیے اس کا وقت قرآن سے ثابت ہے۔ جن احادیث میں دو نمازیں جمع کرنے کا ذکر اور دوسری نماز اول وقت میں ادا کی۔

آیت مبارکہ:

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾

لغت القرآن: [وَلاَ تَہِنُوْا : اور تم سست مت ہو] [فِي ابْتِغَـآءِ الْقَوْمِ : اس قوم کی جستجو میں] [اِنْ : اگر] [تَکُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ : تکلیف اٹھایا کرتے ہو تم] [فَاِنَّـہُمْ : تو وہ لوگ (بھی)] [یَاْلَمُوْنَ : تکلیف اٹھاتے ہیں] [کَمَا : اس کی مانند جیسی] [تَاْلَمُوْنَ : تم تکلیف اٹھاتے ہو] [وَتَرْجُوْنَ : اور تم امید رکھتے ہو] [مِنَ اللّٰہِ : اللہ سے] [مَا : اس کی ‘جس کی] [لاَ یَرْجُوْنَ : وہ امید نہیں رکھتے] [وَکَانَ : اور ہے] [اللّٰہُ : اللہ] [عَلِیْمًا : جاننے والا] [حَکِیْمًا : حکمت والا]

ترجمہ: اور تم (دشمن) قوم کی تلاش میں سستی نہ کرو۔ اگر تمہیں (پیچھا کرنے میں) تکلیف پہنچتی ہے تو انھیں بھی (تو ایسی ہی) تکلیف پہنچتی ہے جیسی تکلیف تمہیں پہنچ رہی ہے حالانکہ تم اللہ سے (اجر و ثواب کی) وہ امیدیں رکھتے ہو جو امیدیں وہ نہیں رکھتے۔ اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

تشریح: دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو۔ مانا کہ تمہیں اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن تمہارے دشمن جو کفر و شرک کو سر بلند کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں انھیں بھی تو اسی طرح تکلیف واذیت پہنچتی ہے۔ اگر وہ باطل کے لیے تمام سختیاں خوشی سے برداشت کر رہے ہیں تو تم حق کو فتح یاب کرنے کے لیے ان سے پیچھے کیوں رہتے ہو۔ تمہیں تو یہ امید ہے کہ اس جدوجہد سے اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوگا اور ان کے پیش نظر کوئی ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد بھی نہیں۔ تو پھر تمہارا سست و کاہل ہونا بہت تعجب خیز اور حیرت افزا ہے۔

شان نزول:

جنگ احد سے فارغ ہونے کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ کفار مکہ کا پیچھا کرو تاکہ وہ پھر پلٹ کر نہ آجاویں تو صحابہ نے سخت زخمی ہونے کی شکایت کی۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری۔ یعنی جب کفار اتنی ہمت کر جاتے ہیں کہ زخم کھا کر تمہارا پیچھا کرتے ہیں تو تم کیوں نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غازی کی ہمت بندھانے کے لیے کفار کی بہادری اور جرات کا ذکر کرنا جائز ہے۔ (نور)

جہاد کے مسائل اور احکامات کا اس موقعہ پر اختتام کرنے سے پہلے حسب معمول تربیت اور نصیحت کے پہلو کو نمایاں فرمایا۔ کیونکہ سفر میں نماز پڑھنا خاص کر اوّل وقت پر ادا کرنا عام حالات کی نسبت مشکل ہوا کرتا ہے۔ للذا نماز کی ادائیگی اور اس کے اوقات کی پابندی کا ذکر فرمانے کے بعد جہادی خطاب کے آخر میں مجاہدین کو تسلی اور امید دلائی گئی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہیں جہاد کے راستے میں مشکلات پہنچیں۔ تم زخمی ہوئے ہو تو وہ بھی زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن یاد رکھو تمہارے دشمن اس سے دگنی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اگر بدر و احد کو ملا کر دیکھا جائے تو وہ تم سے زیادہ قتل اور زخمی ہوئے ہیں۔ اگر وہ تمہارا تعاقب کرنے میں سست اور بزدل نہیں ہوئے تو تمہیں بھی سستی اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا وعدہ کیا ہے للذا جس رحمت کی تم امید رکھتے ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو مجاہد کو کثرت و قلّت اور بے سر و سامانی کی پروا کیے بغیر کفار کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اسی کی بدولت مسلمان کفار پر غالب آتے رہے ہیں۔ جس کی تاریخ میں سینکڑوں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ آج بھی مسلمان اسی جذبہ کے ساتھ کفار کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

(عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ (رض) قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَوْمَ أُحُدٍ أَرَأَیْتَ إِنْ قُتِلْتُ فَأَیْنَ أَنَا قَالَ فِی الْجَنَّةِ فَأَلْقٰی تَمَرَاتٍ فِی یَدِہٖ ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰی قُتِلَ) [رواہ البخاری: کتاب المغازی، باب غزوۃ احد]

”حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے غزوہ احد کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا اگر میں شہید ہو جاؤں تو میں کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا: جنت میں۔ اس کے ہاتھ میں جو کھجوریں تھیں اس نے وہ پھینک دیں پھر لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔“

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ احد ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو ہزیمت پہنچی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہاڑ پر پہنچ گئے ’ابوسفیان نے کہا یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو جو زخم پہنچے ہیں وہ ہمارے زخموں کے بدلہ ہیں اور جنگ کنویں کے ڈول کی طرح ہے ’ایک دن ہمارا ہوتا ہے اور ایک دن تمہارا ہوتا ہے ’رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس کو جواب دو ’آپ کے اصحاب نے کہا ہم اور تم برابر نہیں ہیں ’ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں ہیں ’ابوسفیان نے کہا ہمارا عزی ہے اور

تمہارا عزیٰ نہیں ہے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس سے کہواللہ ہمارا مولا ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں ہے ' ابوسفیان نے کہا ہبل بلند ہو ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ اعلیٰ اور اجل ہے ' ابوسفیان نے کہا: ہماری اور تمہاری ملاقات بدر صغریٰ میں ہوگی ' اور مسلمانوں کو زخمی ہونے کے باوجود نیند آگئی ' اس موقع پر آل عمران کی آیت نازل ہوئی) (آیت) "ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ " (ال عمران: ۱۴۰) اور سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی: (آیت) "ان تکونوا تالمون فانھم یالمون کما تالمون (النساء: ۱۰۴) (جامع البیان ج ۵ ص ۳۵۸' ۳۵۷ ' مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ' ۱۴۰۹ھ)

دشمن کے تعاقب کا حکم اور اہمیت

جنگ کے نتیجے میں جنگ کے دونوں فریق زخمی ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے لاشیں گرتی ہیں۔ دونوں زخم اٹھاتے ہیں۔ نقصان دونوں کا ہوتا ہے ' کسی کا کم کسی کا زیادہ۔ البتہ جب ایک فریق جنگ سے پسپا ہو جاتا ہے تو پھر اس شکست کو مکمل کرنے کے لیے فاتح فریق بھاگنے والوں کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی تعاقب سے فتح تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اور اگر تعاقب نہ کیا جائے تو اس بات کا بہت امکان ہوتا ہے کہ دشمن مجتمع ہو کر دوبارہ حملہ کر دے۔ اور یہ حملہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ حملہ کرے گا تو وہ مسلح ہوگا اور فاتح لشکر اپنی فتح کے زعم میں ہتھیار کھول چکا ہوگا۔ جس طرح جنگ احد میں جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ اسی تناظر میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر دشمن پسپائی اختیار کرے اور میدان جنگ سے بھاگ نکلے تو تمہیں اس کے تعاقب میں کمزوری نہیں دکھانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ تم زخموں سے چور ہو لیکن زخمی تو وہ بھی ہیں۔ تم نے اگر اس میں کمزوری دکھائی تو دشمن کو جمع ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور پھر اس وقت تم جو ان کی کمر توڑ سکتے ہو یہ موقع اللہ جانتا ہے پھر کب ہاتھ آتا ہے۔ اس لیے ایسے موقعوں پر زخموں سے نڈھال ہونے کے باوجود بھی تعاقب میں بزدلی اور تھڑدلاپن نہیں دکھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ تمہیں ایک ایسی خوش قسمتی اور سعادت حاصل ہے جس سے تمہارا دشمن محروم ہے۔ وہ یہ کہ دشمن تو اپنے لیے لڑ رہا ہے یا شیطان کے لیے دونوں صورتوں میں اس کے زخموں کی تلافی کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ خود اپنے زخم چاٹے گا اور ایک ایک زخم کو محرومی سمجھ کر غم واندوہ کی دلدل میں اترتا چلا جائے گا۔ لیکن تمہارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ تم حق کی سربلندی کے لیے لڑ رہے ہو۔ تمہارا ایک ایک زخم جنت کا پھول بننے والا ہے۔ تمہارے پاؤں میں چبھنے والا ایک ایک کانٹا جنت کی ابدی نعمتوں میں تبدیل ہونے والا ہے۔ تمہیں کل ان تکلیفوں کا جو بدلہ ملے گا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق تم میں ہر شخص اس بات کی آرزو کرے گا کہ کاش اللہ کے راستے میں میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج میں اس کا زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل کر سکتا۔ تو تم تو اپنی ہر تکلیف پر اللہ سے امیدیں رکھتے ہو۔ لیکن تمہارے دشمن کو تو اللہ سے کوئی امید نہیں۔ تمہاری یہی امید تمہارے لیے سب سے بڑے سہارے کا باعث ہے۔ اور ان کی ناامیدی ان کے لیے موت کا باعث ہے۔ وہ تو مال غنیمت کے لالچ اور فتح کی امید میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اور جب اس سے محروم رہتے ہیں تو پھر ان کی ناامیدی کا کچھ نہ پوچھئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

مسائل

۱۔ زخمی ہونے کے باوجود مجاہدین کو حالت جنگ میں ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔
۲۔ مجاہد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امید وار ہے جبکہ کافر کو کوئی امید نہیں ہوتی۔

آیت مبارکہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ۙ

لغۃ القرآن: [اِنَّآ اَنْزَلْنَآ : یقینا ہم نے اتارا] [اِلَیْکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف] [الْکِتٰبَ : اس کتاب کو] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [لِتَحْکُمَ : تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فیصلہ کریں] [بَیْنَ النَّاسِ : لوگوں کے درمیان] [بِمَآ : اس سے جو] [اَرٰکَ : سمجھایا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو] [اللّٰہُ : اللہ نے] [وَلاَ تَکُنْ : اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مت ہوں] [لِّلْخَآئِنِیْنَ : خیانت کرنے والوں کے لیے] [خَصِیْمًا : جھگڑا کرنے والے]

ترجمہ: (اے رسول گرامی !) بیشک ہم نے آپ کی طرف حق پر مبنی کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں میں اس (حق) کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے، اور آپ (کبھی) بد دیانت لوگوں کی طرف داری میں بحث کرنے والے نہ بنیں۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے چند آیتیں پہلے منافقین کے احوال اور ان کے احکام بیان فرمائے تھے ' اس کے بعد کفار سے جہاد کرنے کی ترغیب میں آیتیں نازل فرمائیں اور اس ضمن میں یہ فرمایا کہ اگر کسی نے کسی مسلمان یا ذمی کو خطاء قتل کر دیا تو اس کا کیا حکم ہے اور جس نے کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دیا تو اس کا کیا حکم ہے ' پھر اسی سلسلہ میں نماز خوف اور حالت جنگ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ہدایت دی ' اس کے بعد اللہ تعالیٰ پھر منافقوں کے ذکر کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا منافق یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حق کے خلاف اور باطل کے موافق فیصلہ کرنے پر ابھاریں ' اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مطلع فرمایا کہ منافقوں کا موقف باطل ہے ' اور اس مقدمہ میں یہودی حق پر ہیں آپ منافقوں کے قول اور قسموں کی طرف توجہ نہ کریں۔

دوسری وجہ مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا ہے 'لیکن ان کے خلاف جہاد کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے ساتھ بے انصافی کی جائے 'بلکہ واجب یہ ہے کہ اگر ان کا موقف صحیح ہو تو ان کے حق میں فیصلہ کیا جائے اور اگر ان کا موقف غلط ہو تو ان کے خلاف کیا جائے اور کسی شخص کے ظاہری اسلام کی وجہ سے کسی کافر کے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید صرف اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ اسے گلدانوں میں سجا کر رکھ دیا جائے۔ نزول قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اخلاص، توجہ اور غور وخوض کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے۔ تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے ہوئے اسے اللہ کا قانون سمجھ کر اللہ کے بندوں پر نافذ کیا جائے۔ تاکہ انفرادی اور اجتماعی معاملات عدل وانصاف کے ساتھ چلتے رہیں۔ باہمی اختلاف کی صورت میں قرآن مجید ہی ان کے درمیان فیصل ہو۔ اسی لیے تورات وانجیل نازل کی گئی تھیں۔ جس معاشرے میں قرآن مجید کا حکم جاری نہیں ہوتا ایسے لوگوں کو ظالم، فاسق اور کافر قرار دیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل سورۃ المائدہ آیت ۴۵ تا ۵۰ میں بیان ہوئی ہے۔

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِقَامَۃُ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنْ مَطَرِ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً فِیْ بِلَادِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ) [رواہ البخاری: کتاب الحدود، باب إقامۃ الحدود]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی حدود میں سے کسی حد کو کسی ملک میں نافذ کرنا چالیس دن کی بارش سے بہتر ہے۔"

یہاں ایک پیش آمدہ واقعہ اور مقدمہ کے سلسلہ میں آپ کو ہدایات دی گئی ہیں۔ جو عدل وانصاف کے اصولوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جج کا غیر جانب دار ہونا، کتاب وسنت کے مطابق فیصلے کرنا، وکیل ہو یا رشتہ دار اس کا مجرم کی حمایت سے اجتناب کرنا 'اس کے بعد شہادتوں کا درست ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ چار بنیادی تقاضے ہیں جن کے بغیر کسی معاشرے میں عدل وانصاف کا بول بالا نہیں ہو سکتا۔

جج کو اپنی معلومات کے مطابق صحیح فیصلہ کرنا چاہیے اگر وہ بے علمی میں غلط معلومات کی بنا پر غلط فیصلہ کرتا ہے تو اس کا سارا گناہ غلط معلومات دینے والوں کو ہوگا۔ جانتے بوجھتے غلط فیصلہ کی بنیاد پر لیا ہوا مال حلال نہیں آگ کا ٹکڑا ہوگا۔

شان نزول:

یہ چند آیات ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جو عہد رسالت میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ انصار کے بنی ظفر قبیلہ کے ایک شخص مسمّٰی طعمہ بن ابیرق نے اپنے ہمسایہ قتادہ (رض) بن نعمان کے مکان میں نقب لگا کر کچھ زرہیں اور آٹا کی بوری چرالی اور ایک یہودی زید بن سمین کے ہاں جا کر رکھ آیا۔ صبح ہوئی اور حضرت قتادہ کو جب چوری کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنے پڑوسی طعمہ سے دریافت کیا اس نے صاف انکار کر دیا اور قسم اٹھائی کہ مجھے اس کے متعلق علم تک نہیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ آٹے کی بوری میں سوراخ تھا جس سے آٹا گرتا گیا۔ انھوں نے اس گرے ہوئے آٹے کے نشانات کا پیچھا کیا۔ چنانچہ وہ یہودی کے مکان تک پہنچ گئے۔ تلاش کرنے پر مال مسروقہ برآمد ہو گیا۔ اس یہودی نے کہا کہ میں چور نہیں بلکہ میرے پاس طعمہ یہ چیزیں رکھ گیا ہے۔ کئی یہودیوں نے اس کی تصدیق کی۔ طعمہ کے قبیلہ والوں نے کہا۔ چلو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں چلیں۔ چنانچہ سب حاضر ہوئے۔ بنو ظفر کو اب علم ہو چکا تھا کہ چور یہودی نہیں بلکہ طعمہ ہے لیکن اپنی بدنامی کے خوف سے وہ طعمہ کو ہر طریقہ سے بری ثابت کرنا چاہتے تھے اس لیے اس کی حمایت میں بڑی سرگرمی دکھانے لگے۔ حتیٰ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جناب میں بھی عرض کرنے لگے کہ اگر فیصلہ طعمہ کے خلاف ہوا تو بے چارا ہلاک ہو جائے گا اور ذلت ورسوائی کی کوئی حد نہ رہے گی۔ اور یہودی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دشمن ہے وہ صاف بری ہو جائے گا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی خیال گزرا کہ بنو ظفر جو مسلمان ہیں سچے ہوں گے۔ چنانچہ کوئی فیصلہ صادر ہونے سے پہلے وحی الٰہی پہنچ گئی جس سے حقیقت حال آشکارا ہو گئی۔ ارشاد ربانی ہوا ہم نے یہ کتاب حق کے

ساتھ اتاری ہے تاکہ آپ ﷺ اس علم یقینی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا کریں جو آپ ﷺ کو اپنے رب کی طرف سے عطافرمایا گیا ہے۔ چنانچہ الشیخ رشید رضا لکھتے ہیں وتسمیۃ اعلامہ تعالیٰ لنبیہ بالاحکام اراۃ یشعر بان علمہ (علیہ السلام) بھا یقینی کالعلم بمایراہ بعینہ فی الجلاء والوضوح (المنار) یعنی احکام کے متعلق جو علم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عطافرمایا اس کی تعبیر اراءۃ (دکھادینا) سے کی ہے تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ اس علم میں ظن و گمان کا احتمال نہیں رہا بلکہ ایسا یقینی اور قطعی ہے جیسے کسی چیز کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا جاتا ہے۔ اب آپ خود انصاف فرمادیں کہ جس ذات قدسی صفات کے سامنے آنے والے ہر حجاب کو اٹھانے والا اللہ تعالیٰ ہو اس کے علم وسیع پر ہم ایسوں کو زیب دیتا ہے کہ اعتراض کرتے پھریں۔

حکام فیصلہ کرنے میں کوتاہی نہ کریں

اس آیت میں بظاہر خطاب حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے لیکن در حقیقت قیامت تک کے حکام کو سنانا مقصود ہے کہ فیصلہ کرنے میں کوتاہی نہ کیا کریں اور صحیح ملزم کو بغیر رو رعایت سزا پوری دیا کریں۔ طعمہ بظاہر مومن تھا اور یہودی کافر تھا مگر فیصلہ اس موقعہ پر یہودی کے حق میں ہوا۔

تَعَصُّب کارد

اسی آیت سے تعصب کارد بھی ہوتا ہے کہ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ آدمی اپنی قوم یا خاندان کی ہر معاملے میں تائید کرے اگرچہ وہ باطل پر ہوں بلکہ حق کی اِتّباع کرنا ضروری ہے۔ اس میں رنگ و نسل، قوم وعلاقہ، ملک وصوبہ، زبان و ثقافت کے ہر قسم کے تعصب کارد ہے۔ کثیر احادیث میں بھی تعصب کا شدید رد کیا گیا ہے، چنانچہ ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں: (1)۔۔ حضرت فُسیلہ (رض) فرماتی ہیں: میرے والد نے حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا اپنی قوم سے محبت رکھنا بھی تعصب ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، نے ارشاد فرمایا "نہیں، بلکہ اپنی قوم کی ظلم میں مدد کرنا تعصب ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العصبیۃ، ۴/۳۲۷، الحدیث: ۳۹۴۹)

(2)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو بلاوجہ جنگ کرے یا تعصب کی جانب بلائے یا تعصب کی وجہ سے غصہ کرے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العصبیۃ، ۴/۳۲۶، الحدیث: ۳۹۴۸)

(3)۔۔ حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہوگا جس نے کسی کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت برباد کرلی۔

(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب اذاالتقی المسلمان بسیفیھما، ۴/۳۳۹، الحدیث: ۳۹۶۶)

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منع فرمایا جارہا ہے کہ آپ خائنوں کی طرفداری نہ کیا کریں۔ کیونکہ آپ ﷺ کی ذات سے عدل وانصاف کی ساری عظمتیں وابستہ ہیں۔ انصاف کرتے وقت یہ دیکھنا کہ مسلمان کون ہے اور یہودی کون ہے آپ ﷺ کی شان سے بہت فروتر ہے۔ لیکن اس

نہی سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ معاذاللہ حضور ﷺ نے خائنوں کی طرفداری کی تھی اس لیے آپ ﷺ کو منع کیا گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے پہلے آپ ﷺ نے طرفداری نہیں کی ویسے آئندہ بھی طرفداری نہ کریں۔ چنانچہ مولانا تھانوی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ "پس آپ ﷺ کی حالت اور نہی کے مجموعہ سے حاصل یہ ہو گا کہ جیسے اب تک طرفداری نہیں کی آئندہ بھی نہ کیجئے۔ اور یہ انتظامات بھی مکمل عصمت نبویہ کے ہیں"۔ (بیان القرآن)

اگرچہ خائن اور چور ایک تھا لیکن کیونکہ اس کا قبیلہ بنو ظفر اس کی حمایت میں کھڑا ہو گیا تھا اس لیے سارے قبیلہ کو خائن کہا گیا۔ معلوم ہوا کہ خائن کی اعانت سے بھی آدمی کا شمار خائنوں میں ہو جاتا ہے۔ طعمہ کا انجام یہ ہوا کہ وہ وہاں سے بھاگ کر مکہ آ گیا۔ ایک رات وہاں بھی نقب لگا رہا تھا کہ دیوار گر پڑی اور وہ اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔

فوائد

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اکثر حضور کے فیصلے دو چیزوں پر مبنی ہوتے تھے۔ کتاب اللہ اور نور نبوت، لہٰذا حضور کے فیصلے ایسے اٹل تھے۔ جن کی اپیل ناممکن تھی۔ بعد میں علماء و قاضیوں کے فیصلے کتاب اللہ اور شہادتوں وغیرہ ہی پر ہوں گے لہٰذا کسی حاکم کا فیصلہ یقینی نہیں، قابل اپیل ہے۔

2: اس میں بظاہر خطاب حضور ﷺ سے ہے لیکن درحقیقت قیامت تک کے حکام کو سنانا مقصود ہے کہ فیصلہ کرنے میں کوتاہی نہ کیا کریں۔ صحیح ملزم کو بغیر رورعایت سزا پوری دیا کریں۔ دیکھو طعمہ بظاہر مومن تھا اور یہودی کافر تھا مگر فیصلہ اس موقعہ پر یہودی کے حق میں ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے صحابہ گناہوں سے محفوظ نہیں ہاں رب کے فضل سے گناہ پر قائم نہیں رہتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ اگرچہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اس سے انسان کافر نہیں ہوتا کہ رب تعالیٰ نے طعمہ کے حمایتیوں کو کافر نہ فرمایا خائن فرمایا۔

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے نازل فرمایا ہے۔
۲۔ کسی شخص کو مجرم کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔
۳۔ ہر دم اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنی چاہیے۔
۴۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی رحیم اور بخشنے والا ہے۔

آیت مبارکہ:

وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

لغۃ القرآن: [وَّاسۡتَغۡفِرِ : اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مغفرت چاہیں] [اللّٰهَ : اللہ سے] [اِنَّ اللّٰهَ : یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [غَفُوۡرًا : بےانتہا بخشنے والا] [رَّحِيۡمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور آپ اللہ سے بخشش طلب کریں، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

تشریح: سب سے پہلے بالخصوص دو الفاظ کے بارے جاننا ضروری ہے تاکہ وسعت معنی کی آگہی ہو سکے۔

الغفر

(ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے اسی سے محاورہ ہے اغفر ثوبک فی ولوعاء اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپادو۔ اصبغ ثوبک فانہ اغفر لوسخ کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے اللہ کی طرف سے مغفرۃ یا غفران کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے : ۔ غُفْرانَكَ رَبَّنا[البقرة/ 285] اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔

الرحم۔

الرحمۃ وہ رقت (نرمی) قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ اسی معنی میں آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے (152) **انه لما خلق الله الرحم قال له انا الرحمن وانت الرحم شفقت اسمك ميں اسمی فمن وصلك وصلته ومن قطعت قطعتة** ۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا :۔ میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرلے گا میں اسے پارہ پارہ کردوں گا،

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کردی ہے احسان کو اپنے لیے خاص کرلیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے : یہ دونوں فعلان و فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں جیسے ندمان و ندیم پھر رحمٰن کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سمالیا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے : َ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

رَحِيمٌ [البقرۃ/182] بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور آنحضرت کے متعلق فرمایا: لَقَدۡ جَاۤءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيصٌ عَلَيۡكُم بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ [التوبۃ/128] لوگو! تمہارے پاس تمہیں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔ بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:۔ وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٖۚ فَسَأَكۡتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ [الأعراف/156] ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل و نااہل) سب چیزوں کو شامل ہے۔ پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے۔ جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الہی عام ہے اور مومن و کافروں دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی اور کفار اس سے کلیۃ محروم ہوں گے) (مفردات)

خطیہ اولاثم کے درمیان فرق کے متعلق ایک قول ہے کہ اگر کوئی غلط کام جان بوجھ کر کیا جائے تو وہ اثم کہلاتا ہے، اگر عمداًنہ کیا جائے تو وہ خطیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ایک ساتھ اس لیے ذکر کیا کہ ان دونوں کا حکم بیان ہو جائے اور یہ واضح کر دیا جائے۔

کہ خواہ یہ عمداًہوا ہو یا عمد کے بغیر دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ جو شخص کسی بے گناہ انسان پر کوئی الزام لگائے گا وبڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لے گا۔ کیونکہ کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے پر ایسی بات کا الزام عائد کرے جس کا اسے علم نہ ہو۔ (احکام القرآن)

توبہ کی حقیقت

اور آیت ی "ومن یعمل سوء اویظلم نفسہ الخ" سے یہ معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے، ہر قسم کا گناہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتا ہے، البتہ توبہ و استغفار کی حقیقت جاننا ضروری ہے، محض زبان سے استغفر اللہ واتوب الیہ کہنے کا نام توبہ و استغفار نہیں ہے، اسی لیے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہے اس پر اس کو ندامت بھی نہیں اور اس کو چھوڑا بھی نہیں یا آئندہ کے لیے چھوڑنے کا عزم نہیں کیا اور اس حالت میں زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے تو یہ توبہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کے لیے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں، ایک گزشتہ پر نادم ہونا، دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا اور تیسرے آئندہ کے لیے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے ان کو انہی سے معاف کرانا یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔

کس کے لیے استغفار کرنے کا حکم ہو رہا ہے؟ امام رازی (رح) نے یہاں تین وجوہات بیان فرمائی ہیں:۔

(1) طعمہ کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کی نصرت کا جو (ہلکا سا) خیال خاطر مبارک میں گزرا تھا اس سے طلب مغفرت کا حکم مل رہا ہے۔

(2) طعمہ کی قوم بنی ظفر کی شہادت کے باعث یہودی کو مجرم ٹھہرانے کا جو واہمہ سا ہوا تھا اس کے متعلق استغفار کا حکم ہوا۔ امام فرماتے ہیں کہ اگر یہ وجوہات ہوں تو آپ کا یہ خیال حسنات الابرار سیئات المقربین کی قسم سے ہے کہ آپ کا مقام اتنا ارفع اور اتنا بلند ہے کہ ایسا واہمہ بھی اس کو زیبا نہیں۔

(3) اور تیسری وجہ امام رازی (رح) نے یہ ذکر کی ہے واستغفر لاولئک الذین یذبون عن طعمۃ ویریدون ان یظھروا براء تہ کہ آپ ان لوگوں کے لیے مغفرت طلب کیجئے جن سے طعمہ کی اعانت سرزد ہوئی ہے آخر وہ بھی مسلمان ہیں اور آپ کے غلام !

فریقین میں سے جب تک کسی پر پورا یقین نہ ہو کہ وہ حق پر ہے اس کی حمایت اور وکالت کرنا جائز نہیں۔

اگر کوئی فریق دھوکے اور فریب اور چرب زبانی سے عدالت یا حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرالے تو ایسے فیصلے کی عنداللہ کوئی حیثیت نہیں، اس بات کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے، خبردار میں ایک انسان ہی ہوں اور جس طرح میں سنتا ہوں اسی کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہوں ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی دلیل اور حجت پیش کرنے میں تیز طرار ہو اور ہوشیار ہو اور اس طرح میں ایک مسلمان کا حق دوسرے کو دیدوں، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آگ کا ٹکڑا ہے یہ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری)

روداد کے مطابق فیصلہ کرنا گناہ نہیں

اگرچہ قاضی کی حیثیت سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا روداد کے مطابق فیصلہ کردینا بجائے خود آپ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا، اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی رہتی ہیں کہ ان کے سامنے غلط روداد پیش کرکے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کرلئے جاتے ہیں، لیکن ایسے وقت جبکہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کشمکش برپا تھی، اگر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روداد مقدمہ کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپ کے خلاف بلکہ پوری اسلامی جماعت اور خود وحدت اسلامی کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق وانصاف کا کیا سوال ہے ؟ یہاں تو وہی جتھ بندی اور عصبیت کام کررہی ہے جس کے خلاف تبلغ کی جاتی ہے، اسی خطرے سے بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مقدمے میں مداخلت فرمائی۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اجتہاد کا حق حاصل تھا : اِنا انزلنا الیک الکتاب بالحق الخ، اس آیت سے پانچ باتیں ثابت ہوئیں،

(ا) ایک یہ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی صریح نص نہ ہو اپنی رائے سے اجتہاد کا حق حاصل تھا اور آپ نے مہمات میں بسا اوقات فیصلے اپنے اجتہاد سے فرمائے بھی ہیں،

(۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجتہاد وہی معتبر ہے جو قرآنی اصول اور نصوص سے ماخوذ ہو خالص اپنی رائے اور خیال معتبر نہیں

(۳) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آپ کا اجتہاد دوسرے ائمہ مجتہدین کے اجتہاد سے مختلف تھا اس لیے کہ ائمہ مجتہدین کے اجتہاد میں غلطی کا احتمال ہمیشہ باقی رہتا ہے بخلاف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے کہ اگر آپ سے کبھی اجتہادی خطا ہوجاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ کو متنبہ فرمادیتے اور حق کے مطابق کرادیتے، اور اگر آپ نے اجتہاد سے کوئی فیصلہ فرمایا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس میں تنبیہ وغیرہ نہیں آئی تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ آپ کا فیصلہ صحیح ہے،

(۴) چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ قرآن سے سمجھتے تھے وہ اللہ ہی کا سمجھایا ہوا تھا اس میں غلطی کا امکان نہ ہوتا تھا بخلاف دیگر علماء مجتہدین کے، یہ بات لفظ بِمَا اَرٰاک اللہ سے سمجھ میں آتی ہے، اسی وجہ سے جب ایک شخص نے فاروق اعظم (رض)، سے کہا فاحکم بما اراک اللہ تو آپ نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہے،

(۵) پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی جھوٹے مقدمہ کی دانستہ پیروی کرنا یا اس کی تائید وحمایت کرنا سب حرام ہے۔ (معارف ملحصّا) (جلالین)

مسائل

1۔ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بارگاہ خداوندی سے مغفرت طلب کرنے پر مامور ہیں۔ واستغفر اللہ

2۔ قاضیوں کیلئے بارگاہ خداوندی میں اس بات کی دعا کرنا ضروری ہے کہ ان کا نفس خیانتکاروں کی طرف مائل نہ ہو۔ ولا تکن للخائنین خصیماً ۔ واستغفر اللہ

3۔ قاضی کو ہمیشہ بارگاہ خداوندی سے مغفرت طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ لتحکم بین الناس۔۔ واستغفر اللہ

4۔ قضاوت کے عہدے پر فائز افراد کا اس بات کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے کہ خدا ان کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ لتحکم بین الناس۔۔ واستغفر اللہ

آیت مبارکہ:

وَلَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِيۡنَ يَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ خَوَّانًا اَثِيۡمًا ۚ ۝۱۰۷

لغۃ القرآن: [وَلاَ تُجَادِلْ : اور تم مناظرہ مت کرو] [عَنِ الَّذِيْنَ : ان کی طرف سے جنہوں نے] [يَخْتَانُوْنَ : خیانت کی] [اَنْفُسَہُمْ : اپنے آپ سے] [اِنَّ اللّٰہَ : یقینا اللہ] [لاَ يُحِبُّ : پسند نہیں کرتا] [مَنْ : اس کو جو] [كَانَ : ہو] [خَوَّانًا : بار بار خیانت کرنے والا] [اَثِيْمًا : ہمیشہ گناہ کرنے والا]

ترجمہ: اور آپ ایسے لوگوں کی طرف سے (دفاعاً) نہ جھگڑیں جو اپنی ہی جانوں سے دھوکہ کر رہے ہیں۔ بیشک اللہ کسی (ایسے شخص) کو پسند نہیں فرماتا جو بڑا بددیانت اور بدکار ہے

تشریح: گزشتہ آیت میں اور اس آیت میں فرمایا کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے نہ جھگڑو۔

لاتجادل، (مت جھگڑ) یہ جدال سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کی طرف سے لڑنا اور اس کی حمایت میں بولنا جدل اس کا مادہ ہے لاتجادل کے معنی ہیں مت جھگڑ، حمایت اور طرف داری نہ کر۔

خوانا، (بڑا دغا باز) خیانت سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی بددیانتی کرنے کے ہوتے ہیں۔ خائن (خیانت کرنے والا) اس سے ہے۔

یستخفون، شرماتے ہیں اس کا مادہ خفا ہے جس کے معنی چھپنا ہیں۔ یہ چھپنا ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے یا شرم کی وجہ سے یہاں آخری معنی مراد ہیں۔

محیطاً، (گھیرنے والا) یہ احاطہ سے بنا ہے محیط ایسے گھیرے کو کہتے ہیں جس سے باہر نہ نکلا جاسکے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ خائن لوگوں کو یوں گھیرے ہوئے اور قابو میں لئے ہوئے ہے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔

نافرمانوں کی معصیت کو ان کے نفوس کی خیانت فرمایا۔ کیونکہ اس کا نقصان بالآخر نفوس کی طرف لوٹتا ہے۔ اس سے مراد طعمہ ہے۔ اور اسی طرح اس کی قوم میں سے جو اس کے معاون تھے۔ حالانکہ ان کو علم تھا کہ وہ چور ہے۔ یا لفظ جمع سے اس لیے ذکر کیا تاکہ طعمہ اور ہر خائن کو شامل ہو جائے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ خَوَّانًا اَثِیۡمًا (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند فرماتے جو کہ بڑا خائن گناہ گار ہو) یہاں خَوَّانًا مبالغہ کا لفظ لایا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ طعمہ خیانت میں بہت بڑھنے والا ہے اور خیانت پر جم جانے والا ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ طعمہ راتوں رات مکہ بھاگ کر مرتد ہو گیا۔ اور وہاں ایک دیوار میں نقب زنی کی۔ وہ دیوار اس پر آ گری اور وہ ہلاک ہو گیا۔ (مدارک)

گناہ سے گناہ ملتا ہے

ایک امکان کی پیش بندی

پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی صاف بتلا دی گئی تو شاید رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بوجہ غلبہء شفقت جو آپ کو تمام خلق بالخصوص اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطاواروں کی معافی چاہیے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغا بازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو ایسے لوگ اللہ کو خوش نہیں آتے۔ یہ تو لوگوں سے چھپ چھپ کر راتوں کو ناجائز مشورہ کرتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے اور اگر آپ نے ان کی معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپ کی معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا۔ دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بابت (یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیۡبٌ ، ارشاد صریح موجود ہے۔ سو اس کی پیش بندی کے لیے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ان لوگوں کی سفارش سے آپ کو روک دیا۔ واللہ اعلم۔ (گلدستہ)

بعض علماء کا بیان ہے کہ آیت میں خطاب اگرچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کو ہے۔ مگر مراد خطاب دوسرے لوگ ہیں (کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں تو یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خیانت کاروں کے طرفدار ہوں گے) جیسے آیت فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ (میں اگرچہ مخاطب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں مگر مراد دوسرے لوگ ہیں کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کو تو قرآن کی صداقت میں شک ہونا ممکن ہی نہ تھا) استغفار سے مراد ہے حکم شرع کو ماننا اور اطاعت کرنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ انبیاء کی استغفار کی تین صورتیں ہیں (۱) نبوت سے پہلے کے گناہ کے لیے استغفار۔ (۲) اپنی امت اور اہل قرابت کے گناہوں کے لیے استغفار (۳) اس مباح فعل کے لیے استغفار جس کی شرعی ممانعت آنے پر اس کو چھوڑ دیا۔ (مظہری)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پیش ہونے والے مقدمہ کی روئیداد اس طرح ہے کہ انصار قبیلہ کے بنی ظفر خاندان میں سے ایک شخص نے انصاری کے گھر سے آٹے کی بوری اور ایک زرہ چوری کرلی۔ جب اس کا کھوج شروع ہوا تو اس نے اپنے آپ کو الزام سے بچانے کے لیے چوری کا سامان ایک یہودی کے گھر میں امانت رکھ دیا۔ اہل محلّہ نے سامان یہودی کے گھر پا کر اسے چور ٹھہرایا لیکن یہودی نے انصاری کا نام لیا۔ جس پر انصاری کے رشتے داروں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے یہودی کو چور ثابت کیا جائے۔ جب مقدمہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو انھوں نے یہودی کو چور ثابت کردیا۔ قریب تھا کہ آپ ﷺ یہودی پر حد جاری کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پوری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نبی ﷺ ! یہ آپ ﷺ کی شان نہیں کہ آپ ﷺ، ایسے لوگوں کی حمایت کریں۔ جو دھوکہ دے رہے ہوں، اب تک جو کچھ ہوا اس پر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے آئندہ آپ ﷺ کی طرف سے بددیانت لوگوں کی حمایت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خائن اور مجرموں کو پسند نہیں کرتا۔ ایسے لوگ دوسروں سے تو اپنے گناہ اور جرائم چھپا سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں چھپا سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اقتدار اور علم وخبر کے لحاظ سے ہر وقت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں تک یہ لوگ رات کے وقت ایسی باتیں کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہوتی ہیں اس وقت بھی اللہ تعالیٰ ان کی ہر بات اور عمل کا احاطہ کیے ہوتا ہے۔

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَامَ فِیْنَا النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَذَکَرَ الْغُلُوْلَ فَعَظَّمَہٗ وَعَظَّمَ اَمْرَہٗ قَالَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَلٰی رَقَبَتِہٖ شَاۃٌ لَھَا ثُغَاءٌ عَلٰی رَقَبَتِہٖ فَرَسٌ لَہٗ حَمْحَمَۃٌ یَقُوْلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِکُ لَکَ شَیْءًا قَدْ اَبْلَغْتُکَ وَعَلٰی رَقَبَتِہٖ بَعِیْرٌ لَہٗ رُغَاءٌ یَقُوْلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِکُ لَکَ شَیْءًا قَدْ اَبْلَغْتُکَ)

[رواہ البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب الغلو وقول اللّٰہ تعالیٰ ومن یغلل یأت بما غل]

”حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر خیانت کا تذکرہ کرتے ہوئے خیانت اور ایسے معاملہ کو خطرناک قرار دیتے ہوئے فرمایا میں قیامت کے دن تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر بکری ممیا رہی ہو اور کسی کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو وہ مجھ سے کہے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے۔ تو میں کہوں کہ میں تیرے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ میں نے تجھے پہنچا دیا اور کسی کی گردن پر اونٹ آواز نکال رہا ہو وہ کہے اللہ کے رسول میری مدد کیجئے۔ تو میں کہوں کہ میں تیرے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا میں نے تجھے آگاہ کردیا تھا۔“ (فہم)

خیانت کرنے والوں کا ساتھ دینے کی مذمت

اس سے وکالت کا پیشہ کرنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ وکیل کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موکل مجرم و خائن ہے لیکن وہ مال بٹورنے کے چکر میں مظلوم کو ظالم اور ظالم کو مظلوم بنا دیتا ہے اور ظالم کی طرف داری کرتا ہے، اس کی طرف سے دلائل پیش کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، دوسرے فریق کا حق مارتا ہے اور نہ جانے کن کن حرام کاموں کا مُرتکِب ہوتا ہے۔ کورٹ کچہری سے تعلق رکھنے والے

حضرات ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے اس فرمان کو بغور پڑھیں، نیز اللہ تعالیٰ کے ان فرامین پر غور کریں، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲) (بقرہ: ۴۲)

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق نہ چھپاؤ۔

اور ارشاد فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۱۸۸) (بقرہ: ۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر جان بوجھ کر کھالو۔

اور ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۱) (ال عمران: ۱۶۱)

اور جو خیانت کرے تو وہ قیامت کے دن اس چیز کو لے کر آئے گا جس میں اس نے خیانت کی ہو گی پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان ارشادات پر غور کریں اور اپنے برے افعال سے توبہ کریں، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کرے تو وہ بھی اس ہی کی طرح ہے۔

(ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب النہی عن الستر علی من غلّ، ۳/۹۳، الحدیث: ۲۷۱۶)

حضرت ابو بکر صدیق (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "وہ شخص ملعون ہے جو اپنے مسلمان بھائی کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکا کرے۔

(تاریخ بغداد، ۲۶۲۔ محمد بن احمد بن محمد بن جابر۔۔الخ، ۱/۳۶۰) یہ بھی یاد رہے کہ جھوٹی وکالت کی اجرت حرام ہے۔ (صراط)

مسائل

۱۔ خائن لوگوں کی حمایت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

۲۔ آدمی لوگوں سے چھپ سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے چھپ سکتا ہے اور نہ کچھ چھپا سکتا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ اپنے اقتدار، اختیار اور علم کی بنا پر ہر آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔

آیت مبارکہ:

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

لغۃ القرآن: [يَّسْتَخْفُوْنَ : وہ پوشیدگی چاہتے ہیں] [مِنَ النَّاسِ : لوگوں سے] [وَلاَ يَسْتَخْفُوْنَ : اور پوشیدگی نہیں چاہتے] [مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے] [وَہُوَ : اور وہ] [مَعَہُم : ان کے ساتھ ہوتا ہے] [اِذْ : جب] [يُبَيِّتُوْنَ : وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں] [مَا : اس کا] [لاَ يَرْضٰى : وہ (یعنی اللہ) راضی نہیں ہوتا] [مِنَ الْقَوْلِ : جس بات سے] [وَكَانَ اللّٰهُ : اور اللہ ہے] [بِمَا : اس کو جو] [يَعْمَلُوْنَ : وہ کرتے ہیں] [مُحِيْطًا : گھیرنے والا]

ترجمہ: وہ لوگوں سے (شرماتے ہوئے اپنی دغا بازی کو) چھپاتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے درآنحالیکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو (کسی) ایسی بات سے متعلق (چھپ کر) مشورہ کرتے ہیں جسے اللہ ناپسند فرماتا ہے، اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اسے) احاطہ کئے ہوئے ہے

تشریح:

اس میں بنو ظفر کو سرزنش کی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بندے کے ساتھ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ذات وہاں موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی مکان میں پایا جانا جسم کی صفت ہے اور ذات الٰہی اس سے منزہ اور پاک ہے۔ اہل سنت کے نزدیک معیت کا معنی ہے ای بالعلم والرؤیۃ والسمع یعنی اپنے علم سے وہ اپنے بندے کے ساتھ ہے اس کو اور اس کو ہر حرکت کر دیکھتا ہے اور اس کی ہر بات کو سنتا ہے۔ صاحب کشاف لکھتے ہیں۔ "یہ آیت ان لوگوں کو اپنا ماتم کرنے کے لیے کافی ہے جو یہ ایمان رکھتے ہوئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہیں اس کے درمیان اور ہمارے درمیان کوئی حجاب بھی نہیں اور وہ ہمارے کسی عمل سے غافل بھی نہیں اور پھر وہ اس سے نہیں شرماتے۔ اور نہ اس سے ڈرتے ہیں"۔ اگر ہم کسی آدمی کی موجودگی میں ہو کوئی بری حرکت کرنے کی جرات نہیں کرتے تو کیا یہ وقاحت و بے حیائی کی حد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم بے جھجک گناہ پر گناہ اور قصور پر قصور کرتے چلے جائیں۔ (ضیاء)

یعنی طعمہ اور اس کی قوم کے افراد لوگوں سے حیا کرنے کی بنا پر اور ان کی طرف سے نقصان پہنچنے کے ڈر سے ان سے تو شرماتے اور چھپتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے کیونکہ وہ ان کے احوال کو جانتا ہے اور اس سے ان کا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں حتی کہ وہ ان کے اس عمل سے بھی واقف ہے جب وہ اپنے دل میں ایسی بات

تجویز کرتے ہیں اور رات میں ایسی بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں جیسے بے گناہ پر الزام لگانا، جھوٹی قسم کھانا اور جھوٹی گواہی دینا، اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام ظاہری و باطنی تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ان کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں۔ (جلالین، النساء، تحت الآیۃ: ۹۷، ص ۸۶، روح البیان، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۸، ۲/۷۹-۲۸۰، ملتقطاً)

تقویٰ و طہارت کی بنیاد

یہ آیت مبارکہ تقویٰ و طہارت کی بنیاد ہے۔ اگر انسان یہ خیال رکھے کہ میرا کوئی حال اللہ عَزَّوَجَلَّ سے چھپا ہوا نہیں تو گناہ کرنے کی ہمت نہ کرے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ اسی چیز کے ذریعے لوگوں کو گناہوں سے رکنے کا حکم دیا ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ دیکھ رہا ہے۔ اس جملے کا اگر کوئی شخص مراقبہ کرلے اور اسے اپنے دل و دماغ میں بٹھالے تو گناہوں کا علاج نہایت آسان ہو جائے گا۔ حضرت سہل بنعبداللہ تستری (رح) فرماتے ہیں: میں تین سال کی عمر کا تھا کہ رات کے وقت اٹھ کر اپنے ماموں حضرت محمد بن سوار (رح) کو نماز پڑھتے دیکھتا۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے فرمایا: کیا تو اس اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا جس نے تجھے پیدا کیا ہے؟ میں نے پوچھا: میں اسے کس طرح یاد کروں؟ آپ (رح) نے فرمایا: جب لیٹنے لگو تو تین بار زبان کو حرکت دیئے بغیر محض دل میں یہ کلمات کہو:

"اللّٰہُ مَعِیَ، اللّٰہُ نَاظِرٌ اِلَیَّ، اللّٰہُ شَاہِدٌ"

اللہ عَزَّوَجَلَّ میرے ساتھ ہے، اللہ عَزَّوَجَلَّ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ تعالیٰ میرا گواہ ہے۔

(حضرت سہل (رح) فرماتے ہیں) میں نے چند راتیں یہ کلمات پڑھے اور پھر ان کو بتایا، انھوں نے فرمایا: ہر رات سات مرتبہ یہ کلمات پڑھو، میں نے ایسا ہی کیا اور پھر انھیں بتایا تو انھوں نے فرمایا: ہر رات گیارہ مرتبہ یہ کلمات پڑھو۔ میں نے اسی طرح پڑھا تو مجھے اپنے دل میں اس کی لذّت معلوم ہوئی۔ جب ایک سال گزر گیا تو میرے ماموں نے کہا: میں نے جو کچھ تمھیں سکھایا ہے اسے یاد رکھو اور قبر میں جانے تک ہمیشہ پڑھنا، یہ تمھیں دنیا و آخرت میں نفع دے گا۔ میں نے کئی سال تک ایسا کیا تو میں نے اپنے اندر اس کا مزہ پایا، پھر ایک دن میرے ماموں نے فرمایا: اے سہل! اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ ہو، اسے دیکھتا ہو اور اس کا گواہ ہو، کیا وہ اس کی نافرمانی کرتا ہے؟ تم اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھو۔ یہ ہیں صوفیاء جو معیت خداوندی میں رہتے ہیں۔ (احیاء العلوم، کتاب ریاضۃ النفس وتہذیب الاخلاق۔۔ الخ، بیان الطریق فی ریاضۃ الصبیان۔۔ الخ، ۹۱/۳) (صراط)

ایمان و یقین سے محرومی کی ایک نقد سزا

کہ اس سے انسان کی مت مار کر رکھ دی جاتی ہے اور وہ صحیح اور غلط کی پہچان اور نفع و نقصان کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ سو ایمان و یقین سے محرومی کا نتیجہ اور اس کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ لوگوں سے ڈرتے ہیں اللہ سے نہیں ڈرتے۔ یعنی ان کا معاملہ الٹا ہے۔ حالانکہ اصل حق اللہ پاک ہی کا ہے کہ بندہ اس وحدہ لاشریک سے شرماتا اور اس کی معصیت اور نافرمانی سے ہمیشہ بچتا رہے۔ اور ایک اور مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استخفاء کو یہاں پر لازم کی بجائے متعدی کے معنیٰ میں لیا جائے یعنی وہ لوگ اپنے کرتوتوں کو لوگوں سے تو

چھپاتے ہیں مگر اللہ سے تو نہیں چھپا سکیں گے۔ بھلااس سے یہ لوگ ایسی باتوں کو کس طرح چھپا سکیں گے اور اس کی گرفت اور پکڑ سے کس طرح بچ سکیں گے ؟ کہ یہ چیز نہ تو ان کے بس اور اختیار میں ہے اور نہ ممکن ہو سکتی ہے۔ (واختارہ صاحب المعارف وغیرہ)۔ بہر کیف ایمان و یقین کی دولت سے محرومی کا نتیجہ اور اس کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ اللہ سے ڈرنے کی بجائے لوگوں سے ڈرتے ہیں اور ان کو اس بات کا پاس واحساس نہیں کہ لوگوں سے اپنے کرتوتوں کو یہ اگرچہ چھپا لیتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ اپنے علم اور اپنی قدرت کے اعتبار سے ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے کسی کا چھپنا کچھ چھپا لینا ممکن نہیں اور حساب اسی کے یہاں دینا ہے۔ سو عقل وخرد کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے خالق ومالک سے ڈرے۔ وباللہ التوفیق۔

اللہ تعالیٰ کی صفت معیت

اللہ تعالیٰ صفت معیت کے ساتھ بھی متصف ہے، معیت الٰہی کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم، سمع، بصر اور احاطہ کے اعتبار سے اپنی مخلوق اور بندوں کے ساتھ ہے، اس کو معیت عامہ کہا جاتا ہے۔ دوسری معیت خاصہ ہے جو خاص مومنین کے لیے ہے اور اس معیت کا معنی بندوں کی نصرت، تائید اور حفاظت ہے، اس کی معیت اور قرب مخلوق کی معیت اور قرب کی طرح نہیں ہے۔ اس مقام پر صرف دو مقام پیش خدمت ہیں تفصیل معارف التبیان میں دیکھیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: (آیت) "یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ وھو معھم"۔ (النسآء: ۱۰۸)

ترجمہ: "یہ لوگوں سے تو شرماتے ہیں، اور اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ اللہ تو ان کے ساتھ ہوتا ہے"۔

(ا) (آیت) "وھو معکم این ما کنتم، واللہ بما تعملون بصیر"۔ (الحدید: ۴) ترجمہ: "اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے، اور جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھتا ہے۔" (ہود: ۶)

اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے رزق کا ذمہ لیا ہے، ہر شخص اپنا رزق خود کماتا ہے، البتہ رزق جیسے حلال ہوتا ہے حرام بھی رزق ہوتا ہے۔ آدمی اسباب کے ذریعے حلال یا حرام کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

قرب وبعد: نیک آدمی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے اور برا آدمی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے، یہ قریب اور بعد مسافت کے اعتبار سے نہیں بلکہ یہ قرب بلا کیف ہے اور یہ بعد بھی بلا کیف ہے۔

اللہ کے وجود کا منکر: جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر ہے وہ بے دین اور کافر ہے اور اس جرم کی پاداش میں وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہر عیب سے پاک: اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقص وعیب، کمزوری ومحتاجی اور تمام لوازمات وعادات بشریہ مثلاً پیدا ہونا، بیماری، صحت، بچپن، جوانی، بڑھاپا، نیند، اونگھ، تھکاوٹ، اور نسیان وغیرہ سے پاک ہے، فرمایا: "(آیت) "اللہ لا الہ الا ھو، الحہ القیوم، لا تاخذہ سنۃ ولا نوم"۔ ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، جس کو نہ کبھی اونگھ لگتی ہے نہ نیند"۔

(آیت) "لم یلد ولم یولد (۲) ولم یکن لہ کفوا احد"۔ (الاخلاص: ۴۔۳)

ترجمہ: "نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور اس کے جوڑ کا کوئی بھی نہیں"۔

(آیت) "سبحن ربک رب العزۃ عما یصفون"۔ (الصفت: ۱۸۰) ترجمہ: "تمہارا پروردگار، عزت کا مالک، ان سب باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بناتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا مؤثر حقیقی ہے: اللہ تعالیٰ ہی نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے اور ہر چیز کے خواص اور تاثیر کا بھی وہی خالق ہے کوئی چیز ذاتی طور پر مؤثر مفید یا نقصان دہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز میں مؤثر حقیقی ہے اور ہر چیز کا نفع و نقصان اسی کے قبضہ میں ہے، مخلوق کی زندگی اور موت، صحت اور بیماری، اچھائی اور برائی سب اسی کے قبضہ میں ہے، وہ جب چاہتا ہے مخلوق کو زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو موت دے دیتا ہے۔ اسی طرح جب تک چاہے گا کائنات کو باقی رکھے گا اور جب چاہے گا اس کو فنا کر کے قیامت برپا کر دے گا"۔ (آیت) "الا انہ بکل شیء محیط"۔ (فصلت: ۵۴) ترجمہ: "یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔"

نزول باری تعالیٰ: اللہ تعالیٰ جب آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں تو ان کا نزول بلا کیف ہوتا ہے اور جب قیامت کے دن میدان حشر میں نزول فرمائیں گے تو ان کا نزول بلا کیف ہوگا۔

ارشاد باری تعالیٰ: (آیت) "وجآء ربک"۔ (الفجر: ۲۲) ترجمہ: "اور آئے گا تمہارا رب"۔

(آیت) "ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ"۔ (البقرۃ: ۲۱) ترجمہ: "یہ اس کے سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود ان کے سامنے آموجود ہو"۔

باری تعالیٰ کا غیر فانی ہونا: اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں تغیر اور فنا نہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور اس کی صفات بھی ہمیشہ باقی رہیں گی، اس کے سوا ہر مخلوق فانی ہے اور فنا ہونے والی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: "لا الہ الا ھو، کل شیء ھالک الا وجھہ، لہ الحکم والیہ ترجعون"۔ (قصص: ۸۸)

ترجمہ: "اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، حکومت اسی کی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔"

(آیت) "کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام"۔ (الرحمٰن: ۲۶: ۲۷)

ترجمہ: اس زمین میں جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے، اور صرف تمہارے پروردگار کی جلال والی، فضل و کرم والی ذات باقی رہے گی"۔ (معارف)

فوائد

ف 1: یہ آیت تقویٰ و طہارت کی جڑ ہے۔ اگر انسان یہ خیال رکھے کہ میرا کوئی حال اللہ رسول سے چھپا ہوا تو گناہ کرنے کی ہمت نہ کرے۔

ف 2: یعنی اللہ اپنے علم و قدرت کے لحاظ سے ان کے ساتھ ہے اس سے شرم و حیا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بندہ اللہ کو اپنے ساتھ سمجھے تو گناہ کی ہمت نہ کرے۔ اسی طرح جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے پاس حاضر و ناظر جانے کبھی گناہ نہ کرے۔ اس آیت میں اشارۃ پتہ لگا کہ کوئی بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ بھی حضور کی نگاہ سے چھپا ہوا نہیں۔ کیونکہ یہاں یہ فرمایا کہ لوگوں سے چھپتے ہیں۔ یہ نہ فرمایا کہ آپ سے چھپتے ہیں اور لایستخفون میں رب نے اپنے حبیب کو اپنے ساتھ ذکر فرمایا یعنی مجھ سے اور میرے حبیب سے نہیں چھپ سکتے رب فرماتا ہے۔ یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدا۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے کرم سے، نبیوں ولیوں کے ساتھ ہے عنایت اور مہربانی سے کفار کے ساتھ ہے قہر و غضب سے سب کے ساتھ ہے علم و قدرت سے۔

ف 3 : یعنی طعمہ کی قوم طعمہ کی طرفداری کے لیے خفیہ طور پر تدبیریں سوچتی تھی کہ جیسے ہو سکے طعمہ کو بری کرایا جاوے تاکہ اپنی قوم بدنام نہ ہو۔

ف 4 : یعنی اللہ کا علم وقدرت انھیں گھیرے ہے کیونکہ اللہ کی ذات محیط ہے نہ محاط۔ وہ جگہ اور جگہ میں ہونے سے پاک ہے۔

آیت مبارکہ:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾

لغۃ القرآن: [ہٰٓاَنْتُمْ : ارے تم لوگ تو] [ہٰٓؤُلَآءِ : وہ ہو (کہ)] [جٰدَلْتُمْ : مناظرہ کرتے ہو] [عَنْہُمْ : ان کی طرف سے] [فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : اس دنیوی زندگی میں] [فَمَنْ : تو کون] [يُّجَادِلُ : مناظرہ کرے گا] [اللّٰهَ : اللہ سے] [عَنْہُمْ : ان کی طرف سے] [يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن] [اَمْ : یا] [مَّنْ : کون] [يَّكُوْنُ : ہوگا] [عَلَيْہِمْ : ان کا] [وَكِيْلاً : کارساز]

ترجمہ: خبردار ! تم وہ لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑے۔ پھر کون ایسا شخص ہے جو قیامت کے دن (بھی) ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ جھگڑے گا یا کون ہے جو (اس دن بھی) ان پر وکیل ہوگا؟

تشریح: جن لوگوں نے عزیزداری کی بنیاد پر چور کی حمایت اور تعصب کی بنا پر یہودی پر الزام لگایا تھا۔ اب انھیں مخاطب کیا جارہا ہے کہ تم ایسے لوگ ہو جو طرفداری اور تعصب کی بنیاد پر اس دنیا میں مجرم کے حق میں جھگڑتے ہو۔ بتاؤ قیامت کے دن رب ذوالجلال کے سامنے مجرموں کی طرف سے کون جھگڑا اور ان کی وکالت کرسکے گا؟

اس فرمان کا صاف مطلب ہے کہ کسی شخص کو مجرم کی پاسداری اور اس کے جرم کی وکالت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ فرمان ہر وکیل کے لیے تازیانہ عبرت رکھتا ہے۔ اس کے بعد چار مرتبہ لفظ "مَنْ" استعمال کیا کہ دنیا میں کوئی بھی جان بوجھ کر گناہ کرے یا بھول کر خطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو تو اللہ تعالیٰ یقیناً اسے معاف فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بڑی شفقت فرمانے والا ہے۔ اس کے بعد پھر فرمایا کہ جو بھی گناہ کرے گا اس کا بوجھ دنیا اور آخرت میں اسے ہی اٹھانا پڑے گا۔

قرابت یا دوستانہ تعلقات کی بناء پر لوگ مجرم کی اعانت کرنے باز نہیں آتے بلکہ بسا اوقات وہ اسے اپنی ذاتی یا قبیلہ کی عزت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ہر ممکن حیلہ سے اسے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح بنو ظفر کا طرز عمل آپ سن چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ اس دنیا میں تو تم جھوٹی قسمیں کھا کر اور جھوٹی گواہیاں دے کر ان کو بے گناہ ثابت کرلو گے ذرا یہ تو بتاؤ کہ قیامت کے روز ان کی صفائی کس منہ سے پیش کروگے۔ اس مجرم دوست اور گناہ گار رشتہ دار کو خداوند ذوالجلال کی گرفت سے کیونکر بچاؤ گے۔ کس میں یہ دم خم ہے کہ اس کا وکیل بن کر بارگاہ الٰہی میں پیش ہو اور اس کو رہا کرا سکے۔

مجادلہ کے معنی ہیں بہت زیادہ جھگڑا کرنا 'اور وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی طرف معاملات سپرد کردیئے جائیں اور محافظ اور حمایتی کو بھی وکیل کہتے ہیں 'اس آیت کا معنی یہ ہے کہ دنیا میں تو تم ان کی طرف سے جھگڑا کرلو گے لیکن قیامت کے دن اس خائن اور بدیانت کو اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا۔ (تبیان)

ان آیات میں امت مسلمہ کی تربیت کی جارہی ہے اور ان کو یہ سبق ذہن نشین کرایا جارہا ہے کہ وہ گناہ اور گناہ گار کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں تاکہ اسلامی معاشرہ گناہوں کی آلائش و عفونت اور گنہگاروں کی فساد انگیزیوں سے پاک ہو جائے۔ جرم کسی سے سرزد ہو اس کو اس کی سزا بھگتنے دی جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر لوگ مجرموں کی پشت پناہی کرنا ترک کردیں اور قانون کی تنفیذ میں آڑنہ بنیں تو جرائم کا استیصال کرنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مسلمان جو یوم الحساب پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے تو کسی حالت میں جائز نہیں کہ وہ گناہوں کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے گناہ گار کی اعانت کرنے لگیں اور اس طرح برائیوں کے فروغ کا باعث بنیں۔ (ضیاء)

بے جا حمایت کی مذمت

اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں کو جو چور کے طرف دار ہوئے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس بے جا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہو سکتا

دو انصاریوں کا واقعہ

مسند احمد میں ہے کہ دو انصاری ایک ورثے کے بارے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنا قضیہ لائے واقعہ کو زمانہ گذر چکا تھا دونوں کے پاس گواہ کوئی نہ تھا تو اس وقت آپ نے وہی حدیث بیان فرمائی اور فرمایا کہ میرے فیصلے کی بناپر اپنے بھائی کا حق نہ لے لے اگر ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اپنی گردن میں جہنم کی آگ لٹکا کر آئے گا اب تو وہ دونوں بزرگ رونے لگے اور ہر ایک کہنے لگا میں اپنا حق بھی اپنے بھائی کو دے رہا ہوں، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اب تم جاؤ اپنے طور پر جہاں تک تم سے ہو سکے ٹھیک ٹھیک حصے تقسیم کرو پھر قرعہ ڈال کر حصہ لے لو اور ہر ایک دوسرے کو اپنا رہا سہا غلطی کا حق معاف کردو۔ ابوداؤد میں بھی یہ حدیث ہے۔

چوری کے واقعہ کی تفصیل

ترمذی کتاب التفسیر میں بزبانی حضرت قتادہ اس طرح مروی ہے کہ ہمارے گھرانے کے بنو ابیرق قبیلے کا ایک گھر تھا جس میں بشر، بشیر اور مبشر تھے، بشیر ایک منافق شخص تھا اشعار کو کسی اور کی طرف منسوب کرکے خوب مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا، اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) جانتے تھے کہ یہی خبیث ان اشعار کا کہنے والا ہے، یہ لوگ جاہلیت کے زمانے سے ہی فاقہ مست چلے آ رہے تھے مدینے کے لوگوں کا اکثر کھانا جو اور کھجوریں تھیں، ہاں تونگر لوگ شام کے آئے ہوئے قافلے والوں سے میدہ خرید لیتے جسے وہ خود اپنے لیے مخصوص کر لیتے، باقی گھر والے عموماً جو اور کھجوریں ہی کھاتے، میرے چچا رفاعہ بن زید نے بھی شام کے آئے ہوئے قافلے سے ایک بورا میدہ کا خریدا اور اپنے بالا خانے میں اسے محفوظ کر دیا جہاں ہتھیار زرہیں تلواریں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں رات کو چوروں نے نیچے سے نقب لگا کر اناج بھی نکال لیا اور ہتھیار بھی چرا لے گئے، صبح میرے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا، اب ہم تجسّس کرنے لگے تو پتہ چلا کہ آج رات کو بنو ابیرق کے گھر میں آگ جل رہی تھی اور کچھ کھا پکا رہے تھے غالباً وہ تمہارے ہاں سے چوری کر گئے ہیں، اس سے پہلے جب اپنے گھرانے والوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو اس قبیلے کے لوگوں نے ہم سے کہا تھا کہ تمہارا چور لبید بن سہل ہے، ہم جانتے تھے کہ لبید کا یہ کام نہیں وہ ایک دیانتدار سچا مسلمان شخص تھا۔ حضرت لبید کو جب یہ خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے تلوار تانے بنو ابیرق کے پاس آئے اور کہنے لگے یا تو تم میری چوری ثابت کرو ورنہ میں تمہیں قتل کر دونگا ان لوگوں نے ان کی برات کی اور معافی چاہ لی وہ چلے گئے، ہم سب کے سب پوری تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ چوری بنو ابیرق نے کی ہے، میرے چچا نے مجھے کہا کہ تم جا کر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خبر تو دو، میں نے جا کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سارا واقعہ بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ آپ ہمیں ہمارے ہتھیار دلوا دیجئے غلہ کی واپسی کی ضرورت نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے اطمینان دلایا کہ اچھا میں اس کی تحقیق کروں گا، یہ خبر جب بنو ابیرق کو ہوئی تو انھوں نے اپنا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا جن کا نام اسید بن عروہ تھا انھوں نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ تو ظلم ہو رہا ہے، بنو ابیرق تو صلاحیت اور اسلام والے لوگ ہیں انھیں قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا چور کہتے ہیں اور بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے چور کا بدنما الزام ان پر رکھتے ہیں وغیرہ، پھر جب میں خدمت نبوی میں پہنچا تو آپ نے مجھ سے فرمایا یہ تو تم بہت برا کرتے ہو کہ دیندار اور بھلے لوگوں کے ذمے چوری چپکاتے ہو جب کہ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں، میں چپ چاپ واپس چلا آیا اور دل میں سخت پشیمان اور پریشان تھا خیال آتا تھا کہ کاش کہ میں اس مال سے چپ چاپ دست بردار ہو جاتا اور آپ سے اس کا ذکر ہی نہ کرتا تو اچھا تھا، اتنے میں میرے چچا آئے اور مجھ سے پوچھا تم نے کیا کیا؟ میں نے سارا واقعہ ان سے بیان کیا جسے سن کر انھوں نے کہا اللہ المستعان اللہ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں، ان کا جانا تھا جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی میں یہ آیتیں اتریں پس خائنین سے مراد بنو ابیرق ہیں، آپ کو استغفار کا حکم ہوا یہ یہی آپ نے حضرت قتادہ کو فرمایا تھا، پھر ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ اگر یہ لوگ استغفار کریں تو اللہ انھیں بخش دے گا، پھر فرمایا ناکردہ گناہ کے ذمہ گناہ تھوپنا بدترین جرم ہے، اجرا عظیما تک یعنی انھوں نے جو حضرت لبید کی نسبت کہا کہ چور یہ ہیں جب یہ آیتیں اتریں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنو ابیرق سے ہمارے ہتھیار دلوائے میں انھیں لے کر اپنے چچا کے پاس آیا یہ بیچارے بوڑھے تھے آنکھوں سے بھی کم نظر آتا تھا مجھ سے فرمانے لگے بیٹا جاؤ یہ سب ہتھیار اللہ کے نام خیرات کر دو، میں آج تک اپنے چچا کی نسبت قدرے بدگمان تھا کہ یہ دل سے اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے لیکن اس واقعہ نے بدگمانی میرے دل سے دور کر دی اور میں ان کے سچے اسلام کا قائل ہو گیا، بشیر یہ سن کر مشرکین میں جا ملا اور سلافہ بنت سعد بن سمیہ کے ہاں جا کر اپنا قیام کیا، اس کے بارے میں اس کے بعد کی (وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ سے بعیدا تک نازل ہوئیں اور حضرت حسان نے اس کے اس فعل کی مذمت اور اس کی ہجو اپنے شعروں میں کی، ان اشعار کو سن کر اس کی عورت کو بڑی غیرت آئی اور بشیر کا سب اسباب اپنے سر پر رکھ کر ابطح میدان میں پھینک آئی اور کہا تو کوئی بھلائی لے کر میرے پاس نہیں آیا بلکہ حسان کی ہجو کے اشعار لے کر آیا ہے میں تجھے اپنے ہاں نہیں ٹھہراؤں گی، یہ روایت بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں سے مطول اور مختصر مروی ہے۔ (گلدستہ)

شفاعت کا ثبوت

یاد رہے کہ اس آیت میں شفاعت کا انکار نہیں کیونکہ محبوبوں کی شفاعت اور چھوٹے بچوں کا اپنے ماں باپ کی بخشش کے لیے رب تعالیٰ سے ناز کے طور پر جھگڑنا آیات واحادیث سے ثابت ہے۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ فرماتا ہے:

مَن ذَاالَّذِی یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورۃ بقرہ: ۲۵۵)

کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے ہاں شفاعت کر سکے۔

اور حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن جب کچے بچے کے ماں باپ کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرے گا تو وہ اپنے رب عَزَّوَجَلَّ سے جھگڑے گا۔ فرمایا جائے گا "اَیُّھَا السِّقْطُ الْمُرَاغِمُ رَبَّہٗ" "اے کچے بچے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ سے جھگڑنے والے! اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا، تب وہ انھیں اپنے ناف سے کھینچے گا حتّٰی کہ انھیں جنت میں داخل کر دے گا۔

(ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فیمن اصیب بسقط، ۲/۲۷۳، الحدیث: ۱۶۰۸)

مگر یہ جھگڑا رب کریم کی بارگاہ میں ناز کا ہو گا نہ کہ مقابلے کا۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۱۰﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [یَّعْمَلْ : کرتا ہے] [سُوْٓءً : کوئی برائی] [اَوْ : یا] [یَظْلِمْ : ظلم کرتا ہے] [نَفْسَہٗ: اپنے آپ پر] [ثُمَّ : پھر] [یَسْتَغْفِرِ : مغفرت مانگتا ہے] [اللّٰہَ : اللہ سے] [یَجِدِ : تو وہ پاتا ہے] [اللّٰہَ : اللہ کو] [غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا] [رَّحِیْمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش طلب کرے وہ اللہ کو بڑا بخشنے والا نہایت مہربان پائے گا۔

قرآن کریم کا حکیمانہ اسلوب

سابقہ آیات میں درجہ بدرجہ تنقید کا حق ادا کرنے کے بعد ایک اصولی بات ارشاد فرمائی جو قرآن کریم کا عام حکیمانہ اسلوب ہے کہ وہ جب کسی برائی پر نکیر کرتا ہے اور پھر اس کے انجام سے ڈراتا ہے تو مخاطب کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ ساتھ ہی اسے مغفرت کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا کہ تمہاری غلطیاں کوتاہیاں اور حدود سے تجاوز اپنی جگہ لیکن تمہیں اللہ کی بے پایاں رحمت کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص کوئی بھی گناہ کرتا ہے اس کا تعلق چاہے حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے ' وہ اگر اپنے گناہ پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوتا ہے تو وہ یقینا اپنے رب کو رحم کرنے والا اور درگزر کرنے والا پائے گا۔ یہ انسانوں کی ریت ہے کہ وہ زیادتی کرنے والوں کو جلدی معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اللہ کی رحمت تو ایسی بے ساختہ ہے کہ جب بھی کوئی اسے اپنی طرف اخلاص سے متوجہ کرتا ہے تو وہ گھٹا بن کر برس جاتی ہے۔ (روح)

یہاں چند الفاظ خصوصی توجہ کے حامل ہیں لہٰذا انہیں دیکھ لیتے ہیں۔

عمل، ظلم، الغفر

(ع م ل) العمل

ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃ صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کردیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف البقر العوامل ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لیے استعمال ہوا ہے نیز عمل کا لفظ اچھے اور بری دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے، قرآن میں :۔إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ [البقرة/277] جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے۔ (مفردات)

(ظ ل م)۔

الظلم

اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کرکے یا اسے اس کی صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹاکر

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے

(1) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے اس کی سب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا

:إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ [لقمان/13] شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

(2) دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے

۔ چنانچہ آیت کریمہ : وَجَزاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ إلى قوله :إِنَّهُ لا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔

۔(3) تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے
۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهِ [فاطر/32] تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔(مفردات)
(غ ف ر) العفر
(ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے اسی سے محاورہ ہے اغفر ثوبک فی ولوعاء اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپادو۔ اصبغ ثوبک فانہ اغفر لوسخ کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے اللہ کی طرف سے مغفرۃ یا غفران کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے:۔ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا[البقرۃ/285] اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔(مفردات)
اہم معانی سمجھنے کے بعد
سوء اور ظلم سے بڑے اور چھوٹے گناہ مراد ہیں یا سوء سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو درد پہنچے جیسے کسی پر تہمت لگانی اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے ہی نفس تک رہے یعنی گناہ کیسا ہی ہو اس کا علاج استغفار اور توبہ ہے۔ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ معاف فرمادیتا ہے۔ اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر فریب سے کسی مجرم کی برات ثابت کردی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے تو اس سے اس کے جرم میں تخفیف بھی نہیں ہوسکتی۔ البتہ توبہ سے بالکل معاف ہوسکتا ہے۔ اس میں اس چور کو اور اس کے سب طرفداروں کو جو دیدہ دانستہ طرف دار بنے ہوں یا غلطی سے سبھی کو توبہ اور استغفار کا ارشاد ہوگیا اور اشارہ لطیف اس طرف بھی ہوگیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر جمارہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہوگا۔(گلدستہ)

معلوم ہوا کہ ہر گناہ کی توبہ ہے مگر طریقہ توبہ مختلف ہے۔ کفر کی توبہ ایمان ہے۔ اور حقوق العباد کی توبہ اداء حقوق ہے ترک نماز کی توبہ ان کی قضا ہے۔ پھر سب کے احکام جدا ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ چوری یا قتل کرکے، جوا کھیل کر صرف منہ سے توبہ توبہ کہہ لینا کافی ہے۔(نور)

گناہ کا سرزد ہوجانا بعید از امکان نہیں۔ بسا اوقات انسان جذبات سے مغلوب ہوکر یا نادانی اور ناسمجھی سے غلطی کر بیٹھتا ہے۔ اب اس کے لیے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش شروع کردے۔ اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ اپنے غفور ورحیم خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اپنے قصور کا اعتراف کرے۔ اس پر صدق دل سے ندامت وشرمندگی کا اظہار کرے اور پختہ وعدہ کرے کہ آئندہ وہ ایسی ناشائستہ حرکت ہرگز نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دامن رحمت میں پناہ دے گا اور اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔(ضیاء)

اس آیت اور اس کے بعد والی دو آیات میں تین چیزیں بیان فرمائی گئیں۔ پہلی یہ کہ جو شخص کوئی برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ عَزَّوَجَلَّ سے معافی کا طلبگار ہو اور سچی توبہ کرے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے تو وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو غفور ورحیم پائے گا۔ سُبۡحَانَ اللہ۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ جو گناہ کرے گا وہی اس گناہ کا وبال اٹھائے گا، یہ نہ ہوگا کہ گناہ کوئی کرے اور اس کا وبال کسی دوسرے کی گردن پر رکھ دیا جائے۔

گناہ جارِیَہ کا سبب بننے والے کو گناہ کرنے والے کے گناہ سے بھی حصہ ملے گا

یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو کسی گناہ جاریہ کا سبب بنا تو اسے گناہ کرنے والوں کے گناہ سے بھی حصہ ملے گا جیسے کسی نے سنیما کھولا یا شراب خانہ کھولا یا بے حیائی کا اڈا کھولا یا اپنی دکان وغیرہ پر فلمیں چلائیں جہاں لوگ بیٹھ کر دیکھیں یا کسی کو غلط راہ پر لگا دیا یا کسی کو شراب، جوا یا نشے کا عادی بنا دیا تو اس صورت میں گناہ کا کام کرنے والے اور اسے اس راہ پر لگانے والے دونوں کو گناہ ہو گا۔ احادیث میں یہ مضمون بکثرت ملتا ہے، چنانچہ ان میں سے 4 اَحادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ہر وہ جان جسے ظلماً قتل کیا جائے تو اس کے خون کا گناہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے پہلے بیٹے پر ہو گا کیونکہ اس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم صلوات اللہ علیہ وذرّیتہ، ۲/۴۱۳، الحدیث : ۳۳۳۵)

(2)۔۔ حضرت جریر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو عمل کرنے والے کے ثواب کی مثل ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہ ہو گی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو عمل کرنے والے کے گناہ کی مثل گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہ میں بھی کوئی کمی نہ ہو گی۔

(مسلم، کتاب العلم، باب من سنّ سنۃ حسنۃ او سیئۃ۔۔ الخ، ص ۱۴۳۷، الحدیث : ۱۵ (۲۶۷۳))

(3)۔۔ حضرت ابو مسعود انصاری (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے کسی بھلائی کے کام پر رہنمائی کی تو اس کے لیے وہ کام کرنے والے کی طرح ثواب ہے۔

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل اعانۃ الغازی فی سبیل اللہ۔۔ الخ، ص ۱۰۵۰، الحدیث : ۱۳۳ (۱۸۹۳))

(4)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو ہدایت کی طرف بلائے تو اسے ویسا ثواب ملے گا جیسا اس کی پیروی کرنے والے کو ملے گا اور ان پیروی کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہو گی اور جو گمراہی کی طرف بلائے تو اسے ویسا گناہ ملے گا جیسا اس کی پیروی کرنے والے کو ملے گا اور ان پیروی کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہو گی۔

(مسلم، کتاب العلم، باب من سنّ سنۃ حسنۃ او سیئۃ۔۔ الخ، ص ۱۴۳۸، الحدیث : ۱۶ (۲۶۷۴)) (صراط)

گناہ، ظلم اور ان کا علاج

صحابہ کرام کی حالت :

ابن راہویہ نے مسند میں لکھا ہے کہ حضرت عمر (رض) نے فرمایا جب آیت مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ ۙ وَلَا یَجِدۡ لَہٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا نازل ہوئی تو (غم کے مارے) ہمارے کھانے پینے کا فائدہ جاتا رہا آخر آیت وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا نازل ہوئی۔

گناہ بخشوانے کا طریقہ :

متعدد طریقوں سے حضرت علی (رض) کی روایت سے حضرت ابو بکر (رض) کا بیان آیا ہے کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرما رہے تھے جس شخص نے کوئی گناہ کرلیا ہو پھر اٹھ کر اچھی طرح وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور گناہ کی بخشش کا خواستگار ہو تو اللہ ضرور ہی معاف فرما دیتا ہے کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا رواہ ابن ابی حاتم وابن السنی وابن مردویہ۔]

خوشخبری:

حضرت ابودرداء فرماتے ہیں رسول اللہ کی عادت مبارکہ تھی کہ مجلس میں سے اٹھ کر اپنے کسی کام کے لیے کبھی جاتے اور واپس تشریف لانے کا ارادہ بھی ہوتا تو جوتی یا کپڑا کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنی جوتی چھوڑے ہوئے تھے اور ڈولچی پانی کی ساتھ لے کر چلے۔ میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ کچھ دور جا کر بغیر حاجت پوری کیے واپس آئے اور فرمانے لگے میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اور مجھے یہ پیغام دے گیا، پھر آپ نے یہ آیت (ومن یعمل) الخ پڑھی، اور فرمایا، میں اپنے صحابہ کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے راستے میں سے ہی لوٹ آیا ہوں۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ انسان کی زبان ہی وہ آلہ ہے جو جلد بازی کرتا ہے اور کئی باتیں بول جاتا ہے۔ چنانچہ

زبان کی تیزی:

زید بن اسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمر (رض) بن خطاب نے حضرت ابو بکر (رض) کو جھانک کر دیکھا حضرت ابو بکر (رض) اپنی زبان کھینچ رہے تھے حضرت عمر (رض) نے کہا اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلیفہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر (رض) نے جواب دیا اسی نے مجھے ہلاکت گاہوں میں ڈالا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ جسم کا ہر حصہ زبان کی تیزی کا شکوہ کرتا ہے (یعنی زبان کی تیزی کا دکھ ہر عضو کو پہنچتا ہے)۔ (تفسیر مظہری)

فوائد

1۔ جو شخص برائی یا ظلم کرے اور پھر سچے دل سے توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔

2۔ جو شخص گناہ کرے تو وہ اپنے گناہ کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

3۔ جو شخص گناہ کر کے اس کی تہمت کسی بے گناہ انسان پر لگا دے تو اس نے صرف گناہ ہی نہیں کیا بلکہ بہتان لگا کر ایک اور شخص کو بھی پریشان کر دیا ہے، لہٰذا اسے دگنی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۱۱﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّكْسِبْ : کماتا ہے] [اِثْمًا : کوئی گناہ] [فَاِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ] [يَكْسِبُهٗ : وہ کماتا ہے اس کو] [عَلٰی نَفْسِهٖ : اپنی ہی جان پر] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلِيْمًا : جاننے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ: اور جو شخص کوئی گناہ کرے تو بس وہ اپنی ہی جان پر (اس کا وبال عائد) کر رہا ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

تشریح:

بدکار مجرم در حقیقت اپنا ستیاناس کر رہا ہے۔ دوسروں کو تو اذیت یا نقصان بعد میں پہنچے گا اس کی تباہی و بربادی کا سامان پہلے ہو جائے گا۔ جس شخص کو اپنا مفاد عزیز ہو اور جو اپنی سلامتی کا خواہاں ہو اسے تو گناہوں کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ (ضیاء)

گناہ کرنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جب بھی اللہ کا کوئی حکم توڑتا ہے یا اللہ کے کسی بندے کی حق تلفی کرتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا اور نہ وہ مسلمانوں کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ البتہ اس کی ہر کرتوت کا وبال اسی پر پڑے گا۔ دنیا میں رسوائی اس کا مقدر ہو گی اور ایک وقت آئے گا جب وہ ہر چیز سے تہی دامن ہو جائے گا اور آخرت میں جہنم کے عذاب کا سزاوار ہو گا۔ اللہ علیم ہے وہ جب پکڑے گا تو انجانے میں نہیں پکڑے گا ' ہر شخص کا ایک ایک عمل اس کے علم میں ہے۔ وہ حکیم بھی ہے اس لیے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ یکسب (کمانے) کسب اس کا مادہ ہے "کاسب "اسی سے اسم فاعل ہے اس کے لفظی معنی کمانے اور محنت کرنے کے ہیں یہاں عمل کرنے اور ارتکاب کرنے کے معنوں (رح) میں آیا ہے۔ (روح)

(ک س ب) الکسب

۔ اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں جیسے کسب مال وغیرہ ایسے کام کے قصد پر بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہو گا لیکن الٹا اس کو نقصان اٹھانا پڑے۔ پس الکسب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لیے کرے آیت کریمہ : اَنۡفِقُوا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ [البقرۃ/267] جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو۔۔ اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔ کے متعلق آنحضرت سے سوال کیا گیا ای الکسب اطیب کہ کونسا کسب زیادہ پاکیزہ ہے تو

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عمل الرجل بیدہ کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا: ان طیب مایکل الرجل من کسبہ وان ولدہ من کسبہ سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہی جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اس کی اولاد۔

(اث م) الاثم والاثام۔ وہ اعمال وافعال جو ثواب سے روکتے اور پیچھے رکھنے والے ہوں اس کی جمع آثام آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بطء (دیر لگانا) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔

الحکمۃ

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے۔ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ [التین/8] کیا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے یا بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:، اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ [ہود/1] جس کی آیتہ (جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔ اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات محکم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہٰذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے قرآن محکم سے۔ حکم کا لفظ حکمۃ سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکم کے معنی کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ بعض اشعار مبنی بر حکمت ہوتے ہیں جیسا کہ کبید نے کہا ہے (ویل) کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین توشہ ہے۔ (مفردات)

اس آیت میں ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے جو بڑی توجہ اور غور کے قابل ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے قصد اور ارادہ سے کوئی گناہ کرے گا تو اس کا وبال اسی کے سر پرے گا اور اس کی سزا اسی کو دی جائے گی اس سے جو نقصان پہنچے گا وہ اسی کی جان کو پہنچے گا وہ اس کا نتیجہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کے بدلے کسی اور شخص کو جو اس کے گناہ میں شریک نہیں ہے۔ اس کے گناہ کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو ایسا ہی حاکم دے سکتا ہے جس کو اصل واقعہ کا صحیح علم نہیں ہونے پایا۔ اور مجرم کے طرفداروں اور وکیلوں نے باتیں بنا کر جھوٹی گواہیاں دلوا کر مجرم کو بچالیا اور کسی اور شخص کو اس کے بدلے مجرم ٹھہرا کر سزا دلوادی ایسا حاکم جس کو واقعات سے صحیح نتیجہ نکالنا نہیں آتا اور عقل سے صحیح کام نہیں لے سکتا۔ جلدی اور گھبراہٹ میں بے سمجھے بوجھے اندھادھند فیصلے کر دیتا ہے ایسے شخص کو حکیم نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ تو علیم بھی اور حکیم بھی اس کے ہاں ایسا اندھیر ناممکن ہے کہ جرم کوئی کرے اور سزا کوئی بھگتے۔ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اصل مجرم کی اطلاع دے سکتا ہے پھر آپ کے آگے چور کو بری ٹھہرانا اور ایک بے گناہ کے سر چوری لگانا کیا نفع دے گا۔

اس کے آگے ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص چھوٹا یا بڑا جرم کرے اور پھر اس کو دوسرے کے نام لگادے تو اس نے اپنے اصلی جرم میں ایک اور جرم کا اضافہ کر لیا اس لئے اس کو دہرا گناہ ہو گا ایک تو اس جرم کا جو اس نے کیا اور دوسرے اس تہمت کا جو اس نے بے گناہ کے سر لگائی اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے دہری سزا ملے گی۔ اس لئے گناہ کے اعتراف اور توبہ استغفار کے سوا مجرم کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ (درس)

آیت مبارکہ:

وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡٓـَٔةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓـــًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۱۲﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّكْسِبْ : کماتا ہے] [خَطِيْٓـَٔةً : کوئی خطا] [اَوْ : یا] [اِثْمًا : کوئی گناہ] [ثُمَّ : پھر] [يَرْمِ : وہ الزام ڈالتا ہے] [بِهٖ : اس کا] [بَرِيْٓـــًٔا : کسی بےگناہ پر] [فَقَدِ احْتَمَلَ : تو اس نے اٹھایا ہے] [بُهْتَانًا : ایکٰ بہتان] [وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا : اور ایک کھلا گناہ]

ترجمہ: اور جو شخص کسی خطا یا گناہ کا ارتکاب کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو اس نے یقیناً ایک بہتان اور کھلے گناہ (کے بوجھ) کو اٹھالیا.

تشریح: اس آیہ کی تشریح سمجھنے کے لئے چند الفاظ کو جاننا انتہائی ضروری ہے لہٰذا پہلے ان الفاظ کے معانی پر غور فرمالیں۔

(خ ط ء) الخطاء

والخطاءۃ کے معنی صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں

اس کی مختلف صورتیں ہیں

۔(1) کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔

یہ خطا تام ہے جس پر مواخذہ ہو گا اس معنی میں فعل خطئی یخطاء خطاء وخطاء بولا جاتا ہے قرآن میں ہے :۔إِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡـًٔا كَبِيرًا [الاسراء/31] کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔ وَإِن كُنَّا لَخَٰطِـِٔينَ [یوسف/91] اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے

۔(2) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔

کہا جاتا ہے : ۔اس میں اس کا ارادہ وہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ : «رفع عن اِمّتی الخَطأ والنسیان» میری امت سے خطا سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔ نیز فرمایا : وبقولہ : «من اجتھد فاخطأ فلہ اجر» جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہو گئی اسے پھر بھی اجر ملے گا قرآن میں ہے : ۔اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو ایک توغلام کو ازاد کر دے

۔(3) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔

اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہذا اس کا قصد مذموم ہو گا مگر فعل ہے لہذا اس کا قصد مذموم ہو گا مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہو گا۔

الخطیئۃ

یہ قریب قریب سیءۃ کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے : ۔وَاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ [البقرۃ/81] اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔ لیکن زیادہ تر خطیءۃ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بزات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدر کا سبب بن جائے

(ر م ی) الرمی (ض) کے معنی پھینکنے کے ہیں یہ اجسام (مادی چیزیں) جیسے تیر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا : ۔وَمَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی [الانفال/17] اے پیغمبر جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالٰی نے تیر چلائے۔ اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو "قذف" کی طرح اس کے معنی سب وشتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا : ۔وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ [النور/6] جو لوگ اپنی بیبیوں پر (زنا کا) عیب لگائیں۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ [النور/4] جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں

(ب ر ء) البرء والبراء والتبری

کے اصل معنی کسی مکردہ امر سے نجات حاصل کرتا کے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے۔ برءت من المریض میں تندرست ہوا۔ برءت من فلان وتبرءت میں فلاں سے بیزار ہوں۔ ابررتہ من کذا وبرءتہ میں نے اس کو تہمت یا مرض سے بری کر دیا۔

(ح م ل) الحمل

(ض) کے معنی بوجھ اٹھانے یا لادنے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لیے گو صیغہ فعل یکساں رہتا ہے مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ لادی جائے اس پر حمل (بکسر الحا) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھاہے ہوئے ہوتی ہے اس پر حمل کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دے کر درخت کے پھل کو بھی حمل کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے : ۔

وَاِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَۃٌ اِلٰی حِمۡلِہَا لَا یُحۡمَلۡ مِنۡہُ شَیۡءٌ [فاطر/18] اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ ہٹانے کو کسی کو بلائے تو اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا ۔ (مفردات)

اس آیت میں تیسری بات ارشاد فرمائی گئی کہ جس نے کسی بے گناہ پر الزام لگایا تو اس نے بہتان اور بہت بڑے گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ آیت میں گناہ سے مراد گناہ کبیرہ اور خطا سے مراد گناہ صغیرہ ہے۔

بے گناہ پر تہمت لگانے کی مذمت

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بے گناہ کو تہمت لگانا سخت جرم ہے وہ بے گناہ خواہ مسلمان ہو یا کافر کیونکہ طعمہ نے یہودی کافر کو بہتان لگایا تھا اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی۔ احادیث میں بھی بے گناہ پر تہمت لگانے کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ
حضرت ابو درداء (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی کی کوئی ایسی بات ذکر کی جو اس میں نہیں تاکہ اس کے ذریعے اس کو عیب زدہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں قید کر دے گا یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات ثابت کرے۔ (اس سے مراد یہ ہے کہ وہ طویل عرصے تک عذاب میں مبتلا رہے گا)
(معجم الاوسط، من اسمہ مقدام، ۶/۳۲۷، الحدیث: ۸۹۳۶)
حضرت عمرو بن العاص (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس مرد یا عورت نے اپنی لونڈی کو " اے زانیہ " کہا جبکہ اس کے زنا سے آگاہ نہ ہو تو قیامت کے دن وہ لونڈی انہیں کوڑے لگائے گی، کیونکہ دنیا میں ان کے لیے کوئی حد نہیں۔
(مستدرک، کتاب الحدود، ذکر حد القذف، ۵/۵۲۸، الحدیث: ۸۱۷۱)

اسلام کا اعلیٰ اخلاقی اصول

اس آیت سے ایک تو کسی پر بہتان لگانے کا حرام ہونا واضح ہوا اور دوسرا اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا علم ہوا کہ اسلام میں انسانی حقوق کا کس قدر پاس اور لحاظ ہے، حتّٰی کہ کافر تک کے حقوق اسلام میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واقعہ اور آیات مبارکہ کفار کے سامنے پیش کرنے کی ہیں کہ دیکھو اسلام کی تعلیمات کتنی حسین اور عمدہ ہیں۔ (صراط)
گناہ سرزد ہونے کے بعد چاہیے تو یہ کہ انسان اس پر نادم و شرمسار ہو کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں مغفرت کا طالب ہو لیکن جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس پر نادم ہونے کے بجائے اپنی برات ثابت کرنے کے لیے اس گناہ کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپتا ہے تو اس سے بڑھ کر کمینہ اور دوں فطرت کون ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص نے اپنے آپ کو دوہرے گناہ کا مجرم بنا دیا ہے ایک گناہ دوسرا بہتان۔ اسے سزا بھی اب دوہری ملے گی۔ ضیاء)
زید بن اسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمر (رض) بن خطاب نے حضرت ابو بکر (رض) کو جھانک کر دیکھا حضرت ابو بکر (رض) اپنی زبان کھینچ رہے تھے حضرت عمر (رض) نے کہا اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلیفہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر (رض)

نے جواب دیا اسی نے مجھے ہلاکت گاہوں میں ڈالا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ جسم کا ہر حصہ زبان کی تیزی کا شکوہ کرتا ہے (یعنی زبان کی تیزی کا دکھ ہر عضو کو پہنچتا ہے)] (مظہری)

خود گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد کسی بے قصور آدمی کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ کسی بے گناہ شخص پر تہمت لگانے کو بہتان کہا جاتا ہے۔ غلطی سے یا دانستہ ایک گناہ کسی بے قصور کے سر تھوپ دینے کی ایک مثال حدیث میں مذکور ہے، سیدہ عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ کسی عرب قبیلے کے پاس ایک کالی لونڈی تھی، جسے انھوں نے آزاد کر دیا تھا مگر وہ ان کے ساتھ ہی رہا کرتی۔ وہ لونڈی بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ اس قبیلے کی ایک لڑکی نہانے کے لیے نکلی، اس کے پاس لال تسموں والا کمر بند تھا، جسے اس نے، اتار کر رکھ دیا۔ ایک چیل نے جو گزر رہی تھی، اسے جو پڑا دیکھا تو گوشت سمجھ کر جھپٹ لے گئی۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ لوگوں نے کمر بند کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ آخر انھوں نے مجھ پر تہمت لگا دی۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے میری تلاشی لینا شروع کی، حتیٰ کہ میری شرمگاہ بھی دیکھی۔ اللہ کی قسم ! میں ان کے پاس ہی کھڑی تھی کہ وہی چیل گزری، اس نے کمر بند پھینک دیا اور وہ ان کے درمیان گرا۔ میں نے کہا، یہ ہے وہ کمر بند جس کی تم مجھ پر تہمت لگا رہے تھے، حالانکہ میں اس سے بری تھی، اب سنبھالو اسے۔ سیدہ عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ پھر وہ عورت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئی اور اسلام لے آئی، اس کا خیمہ مسجد میں تھا، کبھی کبھی وہ میرے پاس آکر باتیں کیا کرتی اور جب بھی وہ میرے پاس آتی تو یہ شعر ضرور پڑھتی :

وَيَوْمَ الْوِشَاحِ مِنْ تَعَاجِيْبِ رَبِّنَا

اَلَا اِنَّهٗ مِنْ بَلْدَةِ الْكُفْرِ اَنْجَانِيْ

”کمر بند کا دن ہمارے پروردگار کے عجائبات میں سے ہے، اسی واقعہ نے تو مجھے کفر کی سرزمین سے نجات بخشی تھی۔ “ [بخاری، کتاب الصلوۃ، باب نوم المراۃ فی المسجد : ۴۳۹] (دعوۃ)

آیت مبارکہ:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿١١٣﴾

لغۃ القرآن: [وَلَوْلاَ : اور اگر نہ ہوتا] [فَضْلُ اللّٰهِ : اللہ کا فضل] [عَلَيْکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر] [وَرَحْمَتُہٗ : اور اس کی رحمت] [لَہَمَّتْ : تو ارادہ کیا تھا] [طَّآئِفَةٌ : ایک گروہ نے] [مِّنْہُمْ : ان میں سے] [اَنْ : کہ] [يُّضِلُّوْکَ : وہ بہکادیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو] [وَمَا يُضِلُّوْنَ : اور وہ نہیں بہکاتے ہیں] [اِلَّآ : مگر] [اَنْفُسَہُمْ : اپنے آپ کو] [وَمَا يَضُرُّوْنَکَ : اور وہ نہیں نقصان کرتے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا] [مِنْ شَيْءٍ : کچھ بھی] [وَاَنْزَلَ : اور اتارا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [عَلَيْکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر] [الْکِتٰبَ : اس کتاب کو] [وَالْحِکْمَةَ : اور حکمت کو] [وَعَلَّمَکَ : اور سکھایا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو] [مَا : وہ جو] [لَمْ تَکُنْ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہیں تھے] [تَعْلَمُ : (کہ) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے] [وَکَانَ : اور ہے] [فَضْلُ اللّٰهِ : اللہ کا فضل] [عَلَيْکَ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر] [عَظِيْمًا : بہت زیادہ]

ترجمہ: اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان (دغا بازوں) میں سے ایک گروہ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ آپ کو بہکا دیں، جب کہ وہ محض اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کا تو کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے، اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

فضل

فضل، اصطلاح میں وہ عطیہ ہے جو استحقاق سے زیادہ دیا جائے یعنی نصف سے زیادہ غالب رجحان زیادہ۔ رحمتہ وہ ہے جو بغیر استحقاق کے دیا جائے یعنی جتنا حق تھا اس سے زیادہ دینا۔ فضل اللہ علیک کی تفسیر میں
ایک قول تو یہ ہے کہ باعلامک بماھم علیہ بالوحی وینبئنک بالحق، اللہ کا فضل یہ ہے کہ وحی کے ذریعے تمام حالات کا علم ملا اور اعانت حق کے ساتھ ہر بات سے تنبیہ کر دیا گیا۔
دوسرا قول یہ ہے کہ لولا فضلہ بالنبوۃ ورحمتہ بالعصمۃ فضل سے مراد نبوت ہے اور رحمت عصمت الٰہی میں حضور کو لینا ہے۔
تیسرا قول یہ ہے لولا فضلہ بالنبوۃ ورحمتہ بالوحی۔ فضل الٰہی عطاء نبوت اور رحمت نزول وحی ہے۔
چوتھا قول یہ ہے المراد لولا حفظہ لک وحرامتہ ایاک۔ اگر اللہ عزوجل آپ کی حفاظت نہ فرماتا۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگرانی خود نہ کرتا تو لھمت طائفۃ منھم،
ھمت کا لفظ ہم سے بنا یعنی بہکا دینا۔
دھوکہ دینا۔ اگر آپ پر اللہ کا فضل ورحمت نہ ہوتی تو یہ لوگ آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے۔
شان نزول
میں لھمت طائفۃ منھم سے مراد اسیر بن عروہ اور اس کی جماعت ہے۔ ایک واقعہ ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ ثقیف کے چند شرپسند دربار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر آئے اور کہنے لگے یا محمد قد جئنك نبا يعك على ان لا نكسر اصنامنا بايدينا ولى ان نتمتع بالعزى سنة فلم يجبهم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وعصمه الله تعالیٰ میں ذلك منزلت۔ ثقیف کے لوگ آئے اور عرض کی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں اس طرح پر کہ اپنے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے ہم نہ توڑں گے اور ایک سال عزیٰ میں متمتع رہیں گے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں کچھ جواب نہ دیا اللہ عزوجل نے ان کی اس چال سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی عصمت میں لے لیا اور اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ابو مسلم (رح) کہتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین کی جماعت ہے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قتل کے لیے تیاری کر رہی تھی تو اللہ تعالیٰ عزوجل نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور (ان یفتلوک) سے مراد قضاء حق سے روکنا یا اتباع ماجاء فی امر میں قاصر ہونا ہے تو فضل اور رحمت الٰہی کی وجہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سے محفوظ ومصوٗر ہے۔ (روح المعانی)
اس رکوع کے مضمون کا تعلق بھی گزشتہ رکوع کے مضمون سے ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے ایک ہی واقعہ ہے دونوں رکوعوں میں جس کے حوالے سے ہدایات دی جارہی ہیں۔ جس شخص نے چوری کی تھی اس کے قبیلے اور اس کے حمایتیوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے کہ جس شخص پر چوری کا الزام لگایا جارہا ہے وہ مسلمان ہے ' اس کا قبیلہ مسلمان ہے ' اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ چوری میں نے نہیں کی بلکہ یہودی نے کی ہے اور یہودی کے گھر سے مسروقہ سامان بھی برآمد ہو چکا ہے سامان کا برآمد ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہودی ہی اس جرم کا مرتکب ہے اور مزید یہ بات کہ اگر وہ جرم سے انکار کرتا ہے تو انکار تو یہ شخص بھی کر رہا ہے جس پر الزام لگایا جارہا ہے تو دو انکار کرنے والوں میں ایک یہودی ہے اور ایک مسلمان۔ دونوں میں اعتبار کس کا

ہونا چاہیے ؟ مسلمان کا یا یہودی کا ؟ یہ وہ منطق تھی جس کی بنیاد پر وہ اپنا کیس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دلائل سے جس طرح دوسرے مسلمان متاثر ہوگئے تھے اسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی سوچنا شروع کر دیا تھا ' لیکن اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسول کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا اور اگر اس کا امکان پیدا ہو جائے تو وہ خود مداخلت کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پروردگار نے مداخلت فرمائی اور جو اصل واقعہ تھا اس سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مطلع فرمایا۔ یہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ کا فضل آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نہ ہوتا اور وہ فضل یہ ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کی غلطیوں سے حفاظت کرتا ہے۔ تو کچھ لوگوں نے تو آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا سارا سامان کر دیا تھا۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے آپ سے غلط فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ کے فضل کی موجودگی میں وہ اس میں کس طرح کامیاب ہوسکتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے انھیں ناکام کر دیا اور صحیح صورتحال اپنے پیغمبر پر واضح کر دی۔ مزید فرمایا کہ اگر بفرض محال وہ آپ سے غلط فیصلہ کروا بھی لیتے تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ' کیونکہ ایک قاضی اور منصف کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ معاملے کو امکانی حد تک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اگر مدعی کے پاس گواہ ہوں تو گواہوں کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر گواہ نہ ہوں تو پھر مدعا علیہ سے قسم لے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر مدعی جھوٹے گواہوں کے ذریعے اپنے حق میں فیصلہ کروالے یا مدعا علیہ جھوٹی قسم اٹھا کر فیصلہ اپنے حق میں کرا دے تو اس میں الزام اور گناہ جھوٹ بولنے والے اور غلط فیصلے کے لیے کوشش کرنے والوں پر آئے گا قاضی پر نہیں۔ یہ لوگ بھی جھوٹ بول کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے غلط فیصلہ لے لیتے ہیں تو اس کا گناہ اور نقصان ان کے ذمے ہے حضور کا وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے تو اے پیغمبر آپ کو ہر طرح سے غلط فہمی میں مبتلا کر کے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ' لیکن آپ پر چونکہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اس لیے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکے اور آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ البتہ اپنی ان ناجائز کوششوں سے انھوں نے اپنی آخرت ضرور تباہ کر لی۔ آپ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن خود اپنا سب کچھ بگاڑ لیا۔ کیونکہ دوسروں کو گمراہ کرنے والے جب اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے اور جادہ حق پر استوار رہنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ خود ان کی اپنی گمراہی اور اپنی بدقسمتی اس قدر مستحکم ہو جاتی ہے کہ اب اس سے نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا (روح)۔

تو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل اور اپنی رحمت سے آپ پر وحی نازل فرما کر آپ کو اصل واقعہ سے مطلع نہ فرماتا اور آپ پر غیب کو منکشف نہ کرتا اور یہ نہ بتاتا کہ اصل مجرم طعمہ یا بشیر بن ابیرق منافق ہے اور جس یہودی یا مسلمان پر ان منافقوں نے خیانت یا چوری کی تہمت لگائی ہے وہ اس تہمت سے بری ہے ' تو یہ منافق ضرور اس بات کا قصد کر لیتے کہ آپ پر اصل مجرم کو ملتبس اور مشتبہ کر دیں گے ' اور جو یہودی یا مسلمان بے قصور ہے اس کو آپ کی نظر میں مجرم اور خائن ٹھیرا دیں گے ' اور اپنے منافق ساتھیوں کو خیانت سے بری کرالیں گے لیکن اپنی اس نامشکور سعی میں یہ خود ہی گمراہی میں پڑ گئے ' انھوں نے ایک شخص کا مال چرایا اس میں خیانت کی پھر اس برائی پر مزید برائی یہ کی کہ اپنی اس خیانت کا بہتان ایک بے قصور شخص پر باندھا ' اور انھوں نے اصل صورتحال کو آپ پر مشتبہ بنانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس سے وہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اصل صورت واقعہ سے آپ کو مطلع فرما دیا اور غیب آپ پر منکشف کر دیا۔ نیز فرمایا:

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور آپ کو ان تمام چیزوں کا علم عطا فرما دیا ہے جن کو آپ (پہلے) نہیں جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے (النساء : ۱۱۳)

ماکان ومایکون کا علم:(ماضی،حال و مستقبل کا علم---تھااور ہو گا کا علم)

زمانہ تین ادوار پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ماضی، حال اور مستقبل۔

یہاں ماضی ابتدائے آفرینش سے لیکر وقت اعلان نبوت تک حال گذران وقت نبوت اور مستقبل اعلان نبوت تا بعد حشر و نشر۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں :

اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے ' ہدایت اور نصیحت ہے اور آپ پر حکمت نازل کی ہے '

حکمت سے مراد یہ ہے کہ حلال 'حرام 'امر 'نہی 'دیگر احکام 'وعد 'وعید اور ماضی اور مستقبل کی خبریں 'ان چیزوں کا کتاب میں اجمالا 'ذکر کیا گیا ہے اور ان تمام چیزوں کی تفصیل ہم نے وحی خفی کے ذریعہ آپ پر نازل کی ہے اور یہی حکمت کو نازل کرنے کا معنی ہے اور جن تمام چیزوں کو آپ پہلے نہیں جانتے تھے ہم نے ان سب کا علم آپ ﷺ کو عطا فرمادیا 'اس کا معنی ہے تمام اولین اور آخرین کی خبریں اور ماکان ومایکون پر آپ کو مطلع فرمادیا

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ٦٠٦ لکھتے ہیں :

اس آیت کے دو محمل ہیں 'ایک محمل یہ ہے کہ : اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت کو نازل کیا اور آپ ﷺ کو کتاب کے اسرار پر مطلع فرمایا اور ان کے حقائق سے واقف کیا جب کہ اس سے پہلے آپ کو ان میں سے کسی چیز کا علم نہیں تھا 'اسی طرح اللہ آپ کو مستقبل میں بھی علم عطا فرمائے گا اور منافقین میں سے کوئی شخص آپ کو گمراہ کرنے اور بہکانے پر قادر نہیں ہو سکے گا۔

اور اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اولین کی خبروں کا علم عطا فرمایا 'اسی طرح اللہ آپ کو منافقین کے مکر اور ان کے حیلوں کی خبر دے گا 'پھر فرمایا یہ آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے 'یہاں غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو جو عطا فرمایا اس کے متعلق ارشاد فرمایا : (آیت) "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا " (الاسراء : ۸۵) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کو قلیل فرمایا : (آیت) " قل متاع الدنیا قلیل" ' (النساء : ۷۷) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو کچھ دیا اس کے متعلق فرمایا : (آیت) "وکان فضل اللہ علیک عظیما"۔ سو جس کے سامنے ساری دنیا کا علم اور خود ساری دنیا قلیل ہے تو جس کے علم کو وہ عظیم کہہ دے اس کی عظمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۱۲ 'البحر المحیط ج ۴ ص ٦۲ 'روح المعانی ج ۵ ص ۱۴۴)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں :

اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت کے متعلق تین قول ہیں۔

(۱) حضرت ان عباس (رض) کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وحی کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

(۲) مقاتل نے کہا اس سے مراد حلال اور حرام کا علم ہے۔

(۳) ابو سلیمان دمشقی نے کہا اس سے مراد کتاب کے معنی کا بیان اور دل میں صحیح اور نیک بات کا القا کرنا ہے۔

اور علمک مالم تکن تعلم کی تفسیر میں بھی تین قول ہیں :

(۱) حضرت ابن عباس (رض) اور مقاتل نے کہا اس سے مراد شریعت ہے۔

(۲) ابو سلیمان نے کہا اس سے مراد اولین اور آخرین کی خبریں ہیں۔

(۳) اور ماوردی نے کہا اس سے مراد کتاب اور حکمت ہے ۔
اور (آیت) "وکان فضل اللہ علیک عظیما "کی تفسیر میں بھی تین قول ہیں :
(۱) ایمان عطا کرنے کا احسان۔
(۲) نبوت عطا کرنے کا احسان ' یہ دونوں حضرت ابن عباس (رض) کے قول ہیں۔
(۳) ابو سلیمان دمشقی نے کہا اس سے مراد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام فضائل اور آپ کے تمام خصائص ہیں۔ (زادالمیسر ج ۲ ص ۱۹۷ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۴۰۷ ھ)

ماکان ومایکون "کے علم کے متعلق احادیث

حضرت عمرو بن اخطب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہو کر ہمیں خطبہ دیا حتی کہ ظہر کا وقت آگیا ' پھر آپ منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھائی 'آپ نے پھر منبر کو زینت بخشی اور ہمیں خطبہ دیا حتی کہ سورج غروب ہوگیا ' پھر آپ نے ہمیں ماکان ومایکون کی خبر دی سو ہم میں جس کا حافظہ زیادہ تھا اس کا علم زیادہ تھا۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۲۸۹۲)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : آج رات میرا رب تبارک وتعالیٰ میرے پاس بہت حسین صورت میں آیا ' یعنی خواب میں ' اس نے کہا یا محمد ! کیا تم جانتے ہو کہ مقرب فرشتے کس چیز میں بحث کر رہے ہیں میں نے کہا نہیں 'آپ نے کہا پھر اللہ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھ دیا حتی کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینہ کے درمیان محسوس کی ' سو میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ! کیا تم جانتے ہو کہ مقرب فرشتے کس چیز میں بحث کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں کفارات میں۔ الحدیث : (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۳۲۴۴ ' مسند احمد ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۳۴۸۴ ' مسند ابویعلی ' رقم الحدیث : ' ۲۶۰۸ ' الشریعہ الاآجری ' رقم الحدیث : ' ۴۹۶)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں : پس میں نے جان لیا جو کچھ مشرق اور مغرب کے درمیان۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۳۲۴۵)

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آنے میں دیر کردی حتی کہ سورج نکلنے کے قریب ہوگیا ' پھر آپ نے جلدی جلدی نماز پڑھائی پھر سلام پھیرنے کے بعد آپ نے بہ آواز بلند فرمایا تم جس طرح بیٹھے ہو اپنی اپنی صفوں پر بیٹھے رہو ' پھر آپ نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا : میں عنقریب تم سے بیان کروں گا کہ مجھے صبح آنے میں تاخیر کیوں ہوگئی 'آپ نے فرمایا میں رات کو اٹھا اور میں نے وضوء کر کے اتنی نماز پڑھی جتنی میرے لیے مقدر کی گئی تھی ' پھر مجھے نماز میں نیند آگئی اچانک میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو نہایت حسین صورت میں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اے محمد ! میں نے کہا اے میرے رب لبیک ' فرمایا مقرب فرشتے کس چیز میں بحث کر رہے ہیں ؟ میں نے کہا اے میرے رب مجھے (از خود) علم نہیں ' یہ مکالمہ تین بار ہوا ' پھر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھ دیا اور میں نے اس کی پوروں کی ٹھنڈک اپنے سینہ میں محسوس کی ' پھر ہر چیز مجھ پر منکشف ہوگئی اور میں نے جان لیا۔ الحدیث : امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے ' میں نے امام بخاری سے اس

حدیث کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث :': ۳۲۴۶ ' مسند احمد ج ۸ ' رقم الحدیث : ' ۲۲۷۰)

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : بیشک اللہ عزوجل نے دنیا کو میرے لیے اٹھالیا میں دنیا کی طرف اور جو کچھ قیامت تک دنیا میں ہونے والا ہے 'اس کی طرف دیکھ رہا ہوں 'جس طرح میں اپنی ان دو ہتھیلیوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ الحدیث اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ضعف کثیر کے باوجود اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۸۷ 'حلیۃ الاولیاء : ج ۶ ص ۱۰۱) (تبیان)

یہی وجہ ہے کہ عقیدہ اہل سنت میں تمام انبیاء وملائکہ (علیہم السلام) معصوم ہیں پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس تو بہ طریق اولیٰ معصوم ومصوئن ہوئی اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو سید الکل ہادی سبل ہیں امام انبیاء ہیں۔ سید الاصفیا ہیں۔ وانزل اللہ علیک الکتب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم۔ وکان فضل اللہ علیہ عظیما۔ اور نازل کی اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھادیا آپ کو وہ سب کچھ جو آپ نہ جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر بڑا فضل ہے۔ کتاب وحکمت سے مراد قرآن کریم جو جامع ہے دونوں عنوان کی یعنی تعلیم شریعہ اور سنت سنیہ اور علمک مالم تکن تعلم کی تفسیر یہ ہے کہ ای الذی لم تک تعلمہ من خفیات الامور وضمائر الصدور یعنی وہ سب چیز حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سکھادی گئیں جسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ جانتے تھے۔ مخفی امور اور دلوں میں محفوظ چیزیں اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عزوجل نے کید کائدین کا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ ابطال کرایا۔ اور امور دین احکام شرع اور خیر وشر تا قیامت بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر روشن ہیں۔ ضحاک (رح) فرماتے ہیں ای اخبار الاولین والاخرین اخبار اولین وآخرین بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر منکشف ہیں۔ (روح المعانی) اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام کائنات کے علوم عطا فرمائے اور کتاب وحکمت کے اسرار وحقائق پر مطلع کیا اور یہ فرمایا وکان فضل اللہ علیک عظیما اللہ کا زبردست فضل ہے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مختص ہے۔ (حسنات)

مختصر یہ کہ اللہ نے جس طرح قرآن کریم کی شکل میں علم ' قانون اور تہذیب کا ایک خزانہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمایا ہے اسی طرح آپ کو حکمت کی صورت میں گہری بصیرت 'بلند اخلاق اور فیصلہ معاملات کی صلاحیت بھی بخشی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے علماء نے حدیث اور سنت قرار دیا ہے۔ اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول کا علم جیسا اور جتنا بھی ہو وہ اللہ کی عطا ہوتا ہے ذاتی نہیں ہوتا 'اسی لیے قرآن کریم میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم کے خزانے عطا فرمائے۔ نبوت کے بعد رفتہ رفتہ اللہ کی طرف سے علم نازل ہوتا گیا اور اب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حال یہ ہے کہ خود پروردگار آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اپنے اس فضل کا ذکر فرماتے ہیں اور اسے اپنی رحمت قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کا رسول دنیا میں کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست تلمیذ رحمان ہوتا ہے۔ اللہ کا علم اس کے دل پر اترتا ہے یا حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے واسطے سے آتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنے پروردگار سے ایسا بھی تعلق ہوتا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔ کسی عالم کے علم کی وسعت اور اس کی پختگی کے حوالے کے لیے ہمیشہ اس کے استاد کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ اتنے بڑے عالم کا شاگرد ہے تو یقینا وہ خود بڑا عالم ہوگا۔ جس ذات عزیز کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ وہ براہ راست اللہ سے

علم حاصل کرتی ہے تو اس کی علم کی وسعتوں اور گہرائی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے ؟ اس لیے اجمالی طور پر صرف یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کو وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو آپ کی شان کے لائق تھا۔ اور اس میں کوئی نبی اور کوئی رسول بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہمسر نہیں۔ لیکن ہم آپ کے علم کو ناپنے کی گستاخی نہیں کر سکتے اور نہ ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں جس میں اللہ کے علم کے ساتھ ساتھ برابری کا شبہ بھی ہونے لگے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

لغۃ القرآن: [لاَ خَيْرَ : کسی قسم کی کوئی بھلائی نہیں ہے] [فِيْ كَثِيْرٍ : اکثر میں] [مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ : ان کی سرگوشی میں سے] [اِلاَّ : سوائے اس کے کہ] [مَنْ : جو] [اَمَرَ : ترغیب دے] [بِصَدَقَةٍ : کسی خیرات کی] [اَوْ مَعْرُوْفٍ : یا کسی بھلائی کی] [اَوْ اِصْلاَحٍ : یا کسی اصلاح کی] [بَيْنَ النَّاسِ : لوگوں کے درمیان] [وَمَنْ : اور] [يَّفْعَلْ : کرے گا] [ذٰلِکَ : یہ] [ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ : اللہ کی رضا چاہنے میں] [فَسَوْفَ : تو عنقریب] [نُؤْتِيْہِ : ہم دیں گے اس کو] [اَجْرًا عَظِيْمًا : ایک شاندار بدلہ]

ترجمہ: ان کے اکثر خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس شخص (کے مشورے) کے جو کسی خیرات کا یا نیک کام کا یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم دیتا ہے اور جو کوئی یہ کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے تو ہم اس کو عنقریب عظیم اجر عطا کریں گے۔

تشریح:

مجالس

منافقین کے کردار کے مختلف پہلو بیان کرنے کے ساتھ ان کی مجالس میں ہونی والی سازشوں کو طشت از بام کیا ہے۔
دو آدمی آپس میں جو سرگوشی کرتے ہیں اس کو عربی میں نجویٰ کہتے ہیں ' اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق فرمایا وہ رات کو ایسی بات کرتے ہیں جو اللہ ناپسند کرتا ہے ' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو بیان فرمایا ہے جو اللہ کو پسند ہیں ' اور وہ ہیں صدقہ و خیرات کا حکم دینا ' نیکی کا حکم دینا اور لوگوں میں صلح کرانا ' صدقہ اور خیرات کرنا جسمانی نیکی ہے ' نیکی کا حکم دینا روحانی نیکی ہے اور ان دونوں نیکیوں سے جلب منفعت ہوتی ہے اور لوگوں میں صلح کرانی سے ضرر اور نقصان دور ہوتا ہے۔
نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت ام المومنین ام حبیبہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ابن آدم کا کوئی کلام اس کے لیے نفع بخش نہیں ہے ' سوا اس کے کہ اس نے نیکی کا حکم دیا ہو یا برائی سے روکا ہو یا اللہ کا ذکر کیا ہو۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۲۴۲۰ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۳۹۷۴ ')

برے لوگوں کی مجالس بھی اکثر طور پر بری ہی ہوا کرتی ہیں۔ خاص کر ان کی خفیہ مجالس کبھی شر سے خالی نہیں ہوا کرتیں۔ ایسے لوگ برائی، بے حیائی، چوری چکاری، سازش اور شرارت کے لیے ہی سوچ و بچار کرتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قسم کے لوگوں کی مجلس کو لوہار کی بھٹی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔
(عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْکِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْکِ إِمَّآ اَنْ یُّحْذِیَکَ وَإِمَّآ اَنْ تَبْتَاعَ مِنْہُ وَإِمَّآ اَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا طَیِّبَۃً وَنَافِخُ الْکِیْرِ إِمَّآ اَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَکَ وَإِمَّآ اَنْ تَجِدَ رِیْحًا خَبِیْثَۃً) [رواہ البخاری : کتاب الذبائح والصید، باب المسک]
"حضرت ابو موسیٰ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اچھے اور برے ساتھی کی مثال کستوری بیچنے والے اور بھٹی میں پھونکنے والے کی طرح ہے۔ کستوری بیچنے والا یا تو تمہیں تحفہ دے گا یا تم اس سے خرید لوگے یا تم اس سے اچھی خوشبو پاؤ گے اور بھٹی میں پھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا یا تو اس سے بری بو محسوس کرے گا۔"
قرآن مجید نے ایسی مجالس کو خیر سے خالی قرار دیا ہے۔ سوائے اس کے جن میں صدقہ و خیرات، اچھے کام اور لوگوں کی فلاح اور اصلاح کے بارے میں کوئی پروگرام ترتیب دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس آیت میں باہم مل بیٹھنے اور مجالس کی غرض وغایت کا اشارہ دیا ہے کہ برے لوگوں کو مل کر سازش اور شرارت کے منصوبے بنانے کے بجائے نیکی اور خیر کے پروگرام ترتیب دینے چاہئیں یہ پروگرام محض نمود و نمائش کے لیے نہیں بلکہ ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہونی چاہیے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک موقعہ پر چوراہوں میں بیٹھنے سے منع فرمایا تو صحابہ (رض) نے سماجی اور معاشرتی مجبوریوں کا ذکر کیا آپ نے ہدایت فرمائی کہ اگر تمہارے لیے چوراہوں میں بیٹھنا ناگزیر ہو تو تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔
(عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِ عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ! مَالَنَا بُدٌّ مِنْ مَّجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِیْھَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِذْ آبَیْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَاَعْطُوا الطَّرِیْقَ حَقَّہٗ قَالُوْا وَمَا حَقُّہٗ ؟ قَالَ : غَضُّ الْبَصَرِ وَکَفُّ الْاَذٰی وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ)

[رواہ مسلم : کتاب السلام، باب من حق الجلوس علی الطریق رد السلام]

"حضرت ابو سعید خدری (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا رستوں اور چوراہوں میں بیٹھنے سے بچا کرو۔ صحابہ نے عرض کی کہ اللہ کے رسول ! بیٹھنا ہماری مجبوری ہے ہم وہاں تبادلہ خیال کرتے ہیں آپ نے فرمایا اگر تمہارا بیٹھنا ضروری ہے تو راستے کا حق ادا کیا کرو۔ صحابہ نے اس کا حق پوچھا تو آپ نے فرمایا نظر نیچی رکھنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔"

اس آیتِ مبارکہ میں اس گروہ کے لیے نصیحت ہے جن کے مشورے فضولیات پر مشتمل ہوتے ہیں یا جو مَعَاذَاللہ گناہ کو پروان چڑھانے کیلئے مشورے کرتے ہیں جیسے سنیما بنانے، بے حیائی کے سینٹر بنانے، فلمی صنعت کی ترقی کیلئے مشورے کرتے ہیں یہ مشورے صرف خیر سے خالی نہیں بلکہ شر سے بھرپور ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ ان کے مقابلے میں آیت مبارکہ میں ان لوگوں کیلئے بشارت ہے جو نیکی کے کام کیلئے مشورے کرتے ہیں، ملک کے مسائل حل کرنے کیلئے، قوم کی پریشانیاں دور کرنے کیلئے، عوام کے معاملات سلجھانے کیلئے، لڑنے والوں کے درمیان صلح کرنے والے کیلئے، میاں بیوی اور دیگر رشتے داروں کے جھگڑے ختم کروانے کیلئے، دوستوں میں ناراضگی ختم کر کے جائز دوستی کروانے کیلئے مشورے کرنے والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یونہی بطور خاص اس آیت میں جن حضرات کا تذکرہ ہے وہ ہے نیکی کی دعوت کیلئے مشورے کرنے والے۔ ایسے تمام لوگوں کے مشورے خیر اور بھلائی سے بھرپور ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ نیکی کی دعوت عام ہو، مسلمانوں کا بچہ بچہ نمازی بنے، لوگ سنتوں کے پابند ہوں، ان میں خوف خدا اور عشق مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا ہو، بے حیائی کا خاتمہ ہو، لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں، مسلمان باعمل بن جائیں، لوگوں کے گھر امن کا گہوارہ بن جائیں، گھروں میں اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر ہو، اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیاروں کا ذکر ہو۔ الغرض جو لوگ ان کاموں کیلئے مشورے کرتے ہیں وہ سب اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے ہیں۔ آیتِ مبارکہ کے چند پہلوؤں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ آیت نجی معاملات سے لے کر صوبائی، قومی، ملکی اور بین الاقوامی معاملات سب کو شامل ہے۔

اچھے مشوروں پر اجر و ثواب ملتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمادیا کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ کام اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا کیلئے کئے جائیں تب اجر عظیم ہے ورنہ اگر ریاکاری کیلئے، اپنی واہ واہ کروانے کیلئے، خود کو بڑا لیڈر، یا مُصلح کہلوانے کیلئے، لوگوں میں عزت و شہرت و دولت حاصل کرنے کیلئے، نیک نامی کیلئے، بڑا عالم یا مبلغ یا متحرک کہلوانے کیلئے یہ عمل کئے تو سراسر تباہی اور خسارہ ہے۔

اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ "جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں عموماً تلخیاں پائی جاتی ہیں۔ فتنہ و فساد کی آئے دن آگ بڑھکتی رہتی ہے۔ ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ اسے کیسے فرو کیا جائے اور لوگوں میں کس طرح محبت کی فضا پیدا کی جائے کہ لوگ ایک دوسرے کی ساتھ معاملات درست کرنے کی کوشش کریں۔ معروف کا لفظ اگرچہ ہر نیکی کو شامل ہے لیکن ناراض آدمیوں میں صلح کرانے کا الگ سے ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ وہ کام ہے جو سب کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔

كِتَابُ بَابُ إِصْلَاحِ ذَاتِ الْبَيْنِ حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ أُمِّ الدَّرْدَاءِ، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِدَرَجَةٍ أَفْضَلَ مِنَ الصَّلَاةِ وَالصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ؟)) قَالُوا: بَلَى، قَالَ: ((صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ))(الادب المفرد - حديث 391)

اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جس کا درجہ روزہ، نماز اور صدقہ سے بھی افضل ہے۔" صحابہ نے عرض کیا "ضرور فرمایئے۔" تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "وہ کام اصلاح ذات البین "یعنی دو شخصوں کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور ان کی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا "فساد ذات البین ہی الحالقۃ " (لوگوں کا آپس میں جھگڑا فساد مونڈ دینے والی چیز ہے) پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "یہ جھگڑا سر کو نہیں مونڈتا بلکہ انسان کے دین کو مونڈ ڈالتا ہے "

)ا(آپس کے معاملات کی اصلاح اور امن و سکون والا ماحول پیدا کرنا تاکہ لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں سے آسودگی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں، بہت عظیم کام ہے، لیکن جس قدر عظیم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اس لیے اسے نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ (۲) نماز، روزے اور صدقے سے افضل قرار دینے کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب تک لوگ باہمی طور پر شیر و شکر نہ ہوں ان فرائض کا ادا کرنا انسان کے لیے زیادہ سود مند نہیں ہے۔ انسان اگر ذہنی طور پر الجھا ہوا ہو تو وہ خشوع و خضوع سے نماز بھی ادا نہیں کر سکے گا، پھر اگر ادا کر بھی لے تو غیبت اور بدظنی سے اس کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔ (۳) باہمی بغض و عداوت، دوری اور فساد گھروں اور معاشروں کو جہنم بنا دیتا ہے۔ قرآن مجید نے فتنہ و فساد کو قتل سے بھی بدترین چیز قرار دیا ہے۔ اس لیے معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے والا قاتل سے بھی بدترین انسان ہے۔ اس کی نحوست سے انسان اطاعت کے کاموں سے محروم رہ جاتا ہے اور اگر کوئی نیکی کر بھی لے تو یہ فعل اس نیکی کو برباد کر دیتا ہے۔ جس طرح استرا بالوں کا صفایا کر دیتا ہے اسی طرح اس سے اعمال صالحہ بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اسلام میں جھوٹ بولنا بدترین گناہ ہے۔ لیکن دو شخصوں میں صلح کرانے کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صلح کرانے والا جب دو فریقوں سے ملے گا تو ہر فریق یقیناً دوسرے کی برائی کرے گا۔ صلح کرانے والے کو حضور نے اجازت دی ہے کہ دونوں فریق تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں گے لیکن تم دونوں سے باری باری یہ کہو کہ "تم تو بہت ناراض ہو اور دوسرے کے بارے میں بہت سخت باتیں کہہ رہے ہو لیکن وہ شخص تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے اور اسے اس بات کا شدید رنج ہے کہ ہمارے تعلقات آپس میں کیوں بگڑ گئے۔ اس طرح جب دونوں سے بات کی جائے گی تو یقیناً دونوں نرم پڑ جائیں گے اور صلح کی امکانات بڑھ جائیں گے۔

ان تین باتوں کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے کہ سرگوشی کرنے کی اگر ضرورت پیش آئے تو سرگوشی ان امور پر ہونی چاہیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو مسلمانوں کے فکر مندی کے موضوعات ہونے چاہئیں۔ لیکن بالواسطہ یہ بتانا بھی مقصود معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جب آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں تو ان کے سرگوشیوں کے موضوع بالکل اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ وہ بجائے مسلمانوں سے مالی تعاون اور ان کی ضروریات کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ جہاں جہاں سے بھی ان سے مالی تعاون روکا جا سکتا ہے اس کے لیے مقدور بھر کوشش کی جائے۔ عبداللہ بن ابیٔ اور اس کے ساتھیوں کا تذکرہ تو سورۃ المنافقون میں موجود ہے۔ اس نے اپنے احباب کو یہ مشورہ دیا ہوتا "لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ " (جو لوگ اللہ کے رسول کے پاس ہیں (یعنی مہاجرین) ان پر خرچ مت کرو) یہ بھوکے ننگے لوگ ہیں جب تم ہاتھ کھینچ لوگے تو یہ خود ہی چلتے بنیں گے۔ اسی طرح ان کی سرگوشیوں کا موضوع کوئی معروف نہیں ہوتا بلکہ ان کی سرگوشیاں مسلمانوں میں منکرات پھیلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ آج کے منافقین کو بھی دیکھ لیجیے جن کے قبضے میں ذرائع ابلاغ ہیں وہ بھی بڑی بلند جگہوں پر بیٹھ کر مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے اور دوسرے منکرات کو عام کرنے کی منصوبہ بندی میں لگے رہتے ہیں اور اسی کو بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

تیسری بات ارشاد فرمائی کہ ان کی سرگوشیاں اصلاح بین الناس کے لیے نہیں ہوتیں ' بلکہ افساد بین الناس کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ لڑانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ منافقین کا طرز عمل تو یہی ہے جس کا تذکرہ ہو چکا ' لیکن جو شخص مسلمانوں کی مالی ضرورتوں کے لیے پریشان ہے اور اس کا کوئی راستہ نکالنا چاہتا ہے وہ ایک ایک نیکی کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو ہموار کرنے کی تدبیر کرتا ہے اور اس کی تمام کوششیں لوگوں کے معاملات اور تعلقات کو درست کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ سب کچھ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے تو ہم اس کو اجر عظیم عطا کریں گے۔ یہ کام ایسے ہیں جن کا کرنے والا یقینا ایک بہت بڑے اجر کا مستحق ہو جاتا ہے۔

مسائل

۱۔ بے دین لوگوں کی اکثر مجالس خیر سے خالی ہوتی ہیں۔

۲۔ مجالس میں لوگوں کی فلاح و بہبود اور اچھے کاموں کی مشاورت ہونی چاہیے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے کام کرنے والا بڑا اجر پائے گا۔

آیت مبارکہ:

وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ‌ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يُّشَاقِقِ : مخالفت کرے گا] [الرَّسُوْلَ : ان رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی] [مِنْم بَعْدِ مَا : اس کے بعد کہ جو] [تَبَيَّنَ : واضح ہوئی] [لَہٗ: اس کے لیے] [الْہُدٰی : ہدایت] [وَيَتَّبِعْ : اور پیروی کرے گا] [غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کے راستے کے علاوہ کی] [نُوَلِّہٖ : تو ہم پھیر دیں گے اس کو] [مَا : ادھر ' جدھر] [تَوَلّٰی : وہ پھرا] [وَنُصْلِہٖ : اور ہم ڈالیں گے اس کو] [جَہَنَّمَ : جہنم میں] [وَسَآءَ تْ : اور کتنابرا ہے وہ] [مَصِيْرًا : لوٹنا]

ترجمہ: اور جو شخص رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت کی راہ واضح ہو چکی اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی (گمراہی) کی طرف پھیرے رکھیں گے جدھر وہ (خود) پھر گیا ہے اور (بالآخر) اسے دوزخ میں ڈالیں گے، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لوگوں کے لیے رہنما اور مقتدا بنا کر بھیجا ہے۔ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی اور اتباع کو اپنی اتباع قرار دیا، اپنی محبت اور بخشش کو رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط فرمایا ہے۔ اس لیے جلوت اور خلوت میں رسول کی اتباع ہر مسلمان پر فرض ہے۔
جو شخص یا جماعت رسول کی ہدایت اور سنت سامنے ہونے کے باوجود رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی سے انحراف اور صحابہ کرام کے طریقہ کو چھوڑتے ہیں وہ لوگ جدھر چاہیں اور جس طرح چاہیں منہ اٹھا کر چل نکلیں وہ جہنم میں ہی گرنے والے ہیں جو بدترین جائے قرار ہے۔ (فہم)

المشاقۃ:

المعاداۃ (قرطبیؒ) مشاقت کا معنی عداوت و مخالفت ہے۔ یہ دو آیتیں بھی سابقہ چور طعمہ بن ابیرق کے متعلق ہی نازل ہوئیں لیکن ان کا مفہوم عام ہے۔ طعمہ کا انجام آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔
علامہ بیضاوی اس جملہ کا معنی لکھتے ہیں۔ نجعلہ والیا لما تولی من الضلال ونخلی بینہ وبین ما اختارہ۔ جس کفر و گمراہی کی طرف وہ دانستہ پھر گیا ہے ہم اس میں حائل نہ ہوں گے اور اسے ادھر ہی پھرنے دیں گے۔ یہی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس بدنصیب کا کیا حال ہوگا رحمت و توفیق الٰہی نے جس کی دستگیری چھوڑ دی ہو۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت اور اجماع امت کی مخالفت سے انسان توفیق الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے اور شیطان کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے اور وہ جیسے چاہتا ہے اسے تگنی کا ناچ نچاتا ہے۔ (ضیاء)

شان نزول

یہ آیت طعمہ بن ابیرق کا مصداق ہے کیونکہ اس نے چوری کی تھی جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں تھا اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن مجید کے ذریعہ اس کی چوری کی خبر دے دی تو اس کو شرح صدر ہو گیا کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے نبی ہیں اور قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور تمام مسلمان جس دین پر ہیں وہ سچا دین اسلام ہے ' اس کے باوجود اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کیا ' اور تمام مسلمانوں کے خلاف طریقہ کو اختیار کیا اور اسلام کو چھوڑ کر شرک اور بت پرستی کو اپنا لیا ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ

جس گمراہی میں پھرا ہے ہم اس کو اسی گمراہی میں پھیر دیں گے ' یعنی اس کو اسی شرک اور بت پرستی میں رہنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کردیں گے۔ (تبیان)

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الہدی۔ (آیت نمبر 115) اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور دخول جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے ایک مخالفت رسول اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفت رسول کفر اور وبال عظیم ہے، دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ اجماع امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن وسنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے اسی طرح امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے جیسا کہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: ید اللہ علی الجماعۃ من شذ شذ فی النار: یعنی جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت مسلمین سے علیحدہ ہو گا وہ علیحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا۔ (گلدستہ)

مسلمانوں کا اجماع حجت اور دلیل ہے:

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کا اجماع واتفاق حجت ودلیل ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں جیسا کہ کتاب وسنت کی مخالفت جائز نہیں۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۱۱۵، ص ۲۵۳) (صراط)

اجماع کا حجت ہونا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معصوم ہونا اور دیگر مسائل

یہ آیت اجماع کے حجت ہونے پر دلیل ہے 'امام شافعی (رح) سے پوچھا گیا کہ قرآن مجید کی کون سی آیت اجماع کے حجت ہونے پر دلالت کرتی ہے: ؟ تو انھوں نے کہا میں نے قرآن مجید کو تین سو بار پڑھا تو میں نے اس آیت کو اجماع کے حجت ہونے دلیل پایا (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۱۳)

اس آیت کریمہ میں اس شخص کی سزا کا اعلان ہے جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی تعمیل نہ کرے مخالفت کرے حالانکہ صداقت واضح ہو گئی۔ لیکن انھوں نے حکم کے خلاف کیا اور اپنا راستہ علیحدہ بنالیا ایسے شخص کے لیے فیصلہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے راستہ اختیار کرے ایک دن ضرور اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا جو بہت بری جگہ ہے۔ مشرکوں کا راستہ اختیار کرنے والوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ اس آیت میں امت کا حجت ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ صاحب روح المعانی (رح) فرماتے ہیں کہ اس آیت سے امام شافعی (رح) اجماع کو حجت قرار دیتے ہیں۔ مزنی راوی ہیں کہ میں امام شافعی کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آئے۔ صوف کا لباس ملبوس کئے ہوئے اور ہاتھ میں ان کا عصا تھا۔ وہ امام صاحب کے زانو سے زانوں ملا کر بیٹھ گئے اور سوال کیا کہ دین الہی کے لیے کیا کیا حجت ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کتاب اللہ۔ اللہ کی کتاب وہ بولے وماذا؟ اور کیا ہے تو فرمایا سنۃ نبیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ حضور کی حدیث۔ تو وہ بولے اور کیا ہے تو امام صاحب نے فرمایا اتفاق الامۃ تو انھوں نے پوچھا من این ھو الاخیر اھو فی کتاب اللہ یہ کہاں سے آپ نے لیا کیا یہ قرآن پاک میں ہے تو امام صاحب نے کچھ سکوت فرمایا تو وہ صاحب الصوف بولے میں دن رات کی مہلت دیتا ہوں۔ اس میں آپ آیت پیش کر سکیں تو فبھا۔ تو امام شافعی (رح) لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک دن اپنے گھر کی گوشتہ تنہائی میں بیٹھ گئے تیسرے روز ظہر اور عصر کے مابین باہر تشریف لائے دیکھا آپ کا چہرہ اقدس کا رنگ

بدل گیا تھا۔ کہ حسب وعدہ وہ شیخ بھی آگئے اور بیٹھتے ہی بولے حاجتی میرا مقصد حل کیجئے امام صاحب نے فرمایا نعم۔ ہاں اور اعوذ و بسم اللہ پڑھ کر فرمایا اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتا ہے ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ماتولی ونصلہ جھنم، وساءت مصیرا۔ یہ آیہ کریمہ سن کر وہ شیخ بولے صدقت وقام وذھب آپ نے سچ کہا اور کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔ اس کے بعد امام شافعی (رح) نے فرمایا قرأت القرآن فی کل یوم وفی کل لیلۃ ثلاث مرات حتی ظفرت بھا۔ میں نے ہر دن میں تین بار اور رات میں تین بار تین دن قرآن پاک کی تلاوت کی تو اللہ تعالیٰ نے فتح یاب کیا۔ (حسنات)

ان کی دلیل کا بیان یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے طریقہ کو چھوڑنا حرام ہے لہٰذا تمام مسلمانوں کے طریقہ پر عمل کرنا واجب ہوا ' نیز اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام گناہوں سے معصوم ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ ' سہوا ہوں یا عمدا ' صورۃ ہوں یا حقیقۃ ' کیونکہ گناہ کے خلاف کرنا واجب ہے اور اس آیت کی رو سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کرنا حرام ہے ' نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنا واجب ہے ' نیز اس آیت میں ہدایت کے واضح ہونے کے بعد اس کی مخالفت کو حرام فرمایا ہے اور ہدایت نظر اور استدلال سے واضح ہوتی ہے ' اس سے معلوم ہوا کہ عقائد کی تصحیح کے لیے نظر اور استدلال سے کام لینا واجب ہے۔

کفر وشرک اور نبی کی مخالفت اور آپ کی گستاخی کرنے والوں سے توبہ کی توفیق چھین لی جاتی ہے ہاں اگر کفر وشرک کے سوا کوئی اور گناہ ہو چھوٹا یا بڑا تو اس کو بخش دیے جانے کا امکان ہے۔۔ چنانچہ جب ایک بوڑھے اعرابی نے بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا اے اللہ کے رسول میں بوڑھا ہو گناہوں میں ڈوبا ہوا مگر جب سے میں نے خدا کو پہچانا کسی کو اس کا شریک نہیں کیا، اور اس کے سوا کسی کو میں نے دوست نہیں رکھا اور خدا کے ساتھ جرات اور بے ادبی کر کے میں نے گناہ نہیں کیے اور کبھی میرے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ پلک مارتے میں بھاگ کر خدا کو عاجز کر دوں گا اور اس کی گرفت سے بچ جاؤں گا، اب گناہوں سے پشیمان ہو کر اللہ کی شانہ میں توبہ کرنے حاضر ہوا ہوں اب آپ میرے تعلق سے کیا ارشاد فرماتے ہیں اس عرض پر ارشاد خداوندی ہوا کہ ۔۔

نیز اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا راستہ ہی صراط مستقیم ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جماعت پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ہاتھ ہے (نسائی، کتاب تحریم الدم، قتل من فارق الجماعۃ۔۔ الخ، ص ۶۵۶، الحدیث : ۴۰۲۷)

ایک اور حدیث میں ہے کہ سوادِ اَعظم یعنی بڑی جماعت کی پیروی کرو جو اس گروہ سے جدا ہوا وہ جہنم میں گرا۔

(مستدرک، کتاب العلم، من شذّ شذّ فی النار، ۱/۳۱۷، الحدیث : ۴۰۳)

اس سے واضح ہے کہ حق مذہب اہل سنت وجماعت ہے کیونکہ یہی مسلمانوں کی اکثریت کا ہے اور یہی بڑی جماعت ہے۔ (تبیان)

علاوہ ازیں اس آیت میں چند بنیادی باتیں مزید ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اللہ کا رسول دنیا میں ہدایت کی شناخت بن کے آتا ہے۔ شناخت کیسی بھی مکمل ہو پہچاننے والوں کی نگاہیں یکساں نہیں ہوتیں اس لیے کوئی جلدی پہچان لیتا ہے اور کوئی دیر بعد پہچانتا ہے اور جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو وہ ساری عمر بھی نہیں پہچان پاتا۔ لیکن جو شخص ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ رسول اپنی بات نہیں کرتا اس کی ہر بات اللہ کی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح جو رسول پر ایمان لاتے ہیں وہ جس راستے پر چلتے ہیں وہی راستہ رسول کا راستہ ہے اور وہی راستہ اللہ کی ہدایت کا راستہ ہے۔ اب جو شخص رسول کی مخالفت میں دھڑے

بندی شروع کر دے اور بجائے ان کا اتباع کرنے کے اپنے گروہ اور اپنے دھڑے کے ساتھ چلنا شروع کر دے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی الگ پارٹی بنالے ایسا شخص اس قابل نہیں رہتا کہ وہ ہدایت قبول کر سکے۔ یا ہدایت کے راستہ پر چل سکے۔ اس کی مخالفت اسے اللہ اور اس کے رسول کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پوری طرح شیطان کو اپنا امام مان لیا ہے اور اس نے اپنی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں ہمارا قانون ہدایت و ضلالت حرکت میں آتا ہے تو پھر ہم اسے اسی راستے کی طرف پھیر دیتے ہیں جس پر وہ چلنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ دراصل اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور اللہ کو اپنا ولی بنالیتا ہے۔ اللہ پھر اسے ہر طرح کی تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور اسے ہر گمراہی سے بچاتا ہے۔ لیکن جو شخص اپنا ولی شیطان کو بنالیتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا مستقل ساتھی بن جاتا ہے اور اسے ہر روشنی سے بچا کر تاریکی کی طرف لے کے جاتا ہے۔ دنیا کی ہر برائی اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے اور ہر نیکی اسے بری لگنے لگتی ہے۔ اس کی یہ کیفیت بالآخر اسے جہنم کا مسافر بنا دیتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ پھر ہم ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دیتے ہیں اور جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ (روح)

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ جس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو اس پر احکام شرعیہ لازم نہیں، صرف عقیدہ توحید کافی ہے کیونکہ اس نے رسول کی مخالفت نہ کی نیز جو بے علمی میں گناہ کر بیٹھے اس پر مخالفت رسول کا گناہ نہ ہوگا۔ مخالفت رسول جب ہے کہ دیدہ و دانستہ حضور کی نافرمانی کرے۔ یہ بھی خیال رہے کہ مخالفت رسول فی العقیدہ کفر ہے اور فی العمل فسق۔

2: معلوم ہوا کہ تقلید ضوری ہے کہ یہ عام مسلمانوں کا راستہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ انتم شہداء اللہ فی الارض۔ اور فرمایا مارأہ المومنون حسنا فھو عند اللہ حسن۔ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿١١٦﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ اللّٰهَ : یقینا اللہ] [لاَ یَغْفِرُ : نہیں بخشے گا] [اَنْ : (اس کو) کہ] [یُّشْرَکَ : شریک کیا جائے (کچھ بھی)] [بِہٖ : اس کے ساتھ] [وَیَغْفِرُ : اور وہ بخش دے گا] [مَا : اس کو جو] [دُوْنَ ذٰلِکَ : اس کے علاوہ ہے] [لِمَنْ : جس کے لیے]

[یَّشَآئُ : وہ چاہے گا] [وَمَنْ : اور جو] [یُّشْرِكْ : شریک کرتا ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ کے ساتھ] [فَقَدْ ضَلَّ : تو وہ گمراہ ہوا ہے] [ضَلٰلاً م بَعِيْدًا : دور کا گمراہ ہونا]

ترجمہ: بیشک اللہ اس (بات) کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جو (گناہ) اس سے نیچے ہے جس کے لیے چاہے معاف فرما دیتا ہے، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ واقعی دور کی گمراہی میں بھٹک گیا۔

تشریح: نئے خطاب کا آغاز۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا انکار کرنا کفر ہے اور اس کی ذات وصفات اور عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے جو سب سے بڑا گناہ، ظلم عظیم اور پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

شان نزول

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ یہ آیت ایک معمر اعرابی کے حق میں نازل ہوئی اس نے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں حاضر آکر عرض کی حضور میں بوڑھا ہوں اور بے حد سیاہ کار مگر میں نے جب سے اللہ تعالیٰ پر یقین کیا اس پر ایمان لایا اس وقت سے کبھی میں نے اس کا شریک نہیں مانا اور اس کے سوا کسی کو اپنا حمایتی اور مددگار حقیقی نہ جانا اور جرأت کر کے کبھی گناہ میں مبتلا نہیں ہوا اور ایک پل بھی میں نے یہ گمان نہ کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے بھاگ سکتا ہوں۔ شرمندہ ہوں اور توبہ کرتا ہوں اس کی مغفرت چاہتا ہوں فکر مند ہوں کہ یوم حشر میرا کیا حال ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی یہ نص صریح ہے کہ شرک کرنے والا اگر شرک کرتا مر جائے تو بخشا نہ جائے گا۔ البتہ اگر مشرک اپنے شرک سے توبہ کرے اور اس کے بعد مرے تو اس کی توبہ اور ایمان مقبول ہے۔ (روح المعانی، مدارک)

توحید نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور شرک برائیوں کی بنیاد ہے۔ توحید جنت کا شاہراہ ہے اور شرک دوزخ کا راستہ ہے اور انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ توحید کی شاہراہ پر سفر کرتا ہوا اپنے آخری ٹھکانا یعنی جنت میں پہنچ جائے۔ اب مسافر کا رخ اگر منزل مقصود کی طرف ہو تو وہ جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا لیکن اگر اس کا رخ ہی غلط ہے تو اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور تر کرتا رہے گا اور قیامت تک بھی اگر وہ تیز رفتاری سے چلتا رہے تو بھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ غلط راستہ کو ترک نہ کرنے کی وجہ سے مشرک حصول رحمت کی ساری صلاحیتیں ضائع کر دیتا ہے، اس لیے وہ آخرت کی کسی نعمت کے قابل نہیں رہتا۔ (امداد)
کفر و شرک کے سوا اللہ تعالیٰ جسے چاہے اور جو چاہے معاف فرما دے گا اس میں حقوق العباد بھی شامل ہیں۔ خاص کر ایسا شخص جو دوسروں کے حق کی ادائیگی اور اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتا تھا لیکن غفلت یا عدم وسائل کی وجہ سے تلافی نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اسے معاف فرما کر حق دار کی دادرسی فرما دے گا۔ جیسا کہ بخاری شریف میں کئی مقامات میں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان درج ہے جس میں آپ نے توحید کی برکات کا یوں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محشر کے میدان میں اعلان فرمائیں گے جو دنیا میں کسی کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پاس چلا

جائے۔ مشرک اپنے اپنے معبودوں کے پاس چلے جائیں گے لیکن کچھ لوگ کھڑے رہیں گے۔ جن میں فاجر لوگ بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائیں گے کہ تم کیوں نہیں جاتے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہم دنیا میں تیرے ساتھ کسی کو مشکل کشا، حاجت روا، دستگیر اور آپ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں گردانتے تھے اب بھی تیری ذات کبریا کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ چنانچہ شرک سے اجتناب کرنے اور توحید کے صلہ میں انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ [رواہ البخاری تفسیر سورۃ النساء۔ مسلم: کتاب الایمان، باب معرفۃ طریق الرؤیۃ]

چند غلطیاں کارفرما ہیں، جن کی اصلاح ضروری ہے

پہلی تو یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے باقی گناہوں کے بخشنے کا امکان ظاہر فرمایا ہے وعدہ نہیں فرمایا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شہنشاہ جب کسی چیز کو عطا کرنے کا امکان ظاہر کرتے ہیں تو ان کی شان کریمی اور شان بے نیازی کو دیکھتے ہوئے امیدیں جوان ہو جاتی اور آرزوئیں کھل اٹھتی ہیں اور گمان یقین کو چھونے لگتا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کو اپنی مشیت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور قرآن کریم میں ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی حکمت سے الگ نہیں۔

مشیت حکمت کی پابند ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہوتا وہی ہے جو اس کی مشیت چاہتی ہے لیکن اس کی مشیت چونکہ حکمت کی پابند ہے اس لیے اس کی حکمت نے جو قوانین و آداب مقرر کر رکھے ہیں وہ اس کی مخالفت کبھی نہیں کرتی۔ اور تیسری یہ بات کہ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کو بخشنے کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ایک مومن جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے وہ قیامت کے دن بڑے بڑے گناہوں کی موجودگی میں پہلے ہی مرحلہ میں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ بلکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات اور قرآن کریم کی نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی فرائض کا تارک ہوا اور کبائر کا ارتکاب کرتا رہا، قیامت کے دن اسے ان بداعمالیوں کی پاداش میں جہنم میں اس وقت تک رکھا جائے گا جب تک وہ ان گناہوں کی سزا نہ بھگت لے گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ چاہیں تو ان تمام جرائم کی سزا معاف فرما دیں لیکن اس کا قانون یہی ہے کہ وہ فرائض کے ترک پر بھی سزا دے گا اور کبائر کے ارتکاب پر بھی مواخذہ کرے گا۔ جب اس گناہ گار کا دامن ان گناہوں کی آلودگی سے صاف ہو جائے گا تو پھر اس کی مغفرت فرما دی جائے گی اور اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

جہنم کے عذاب کی شدت کا استحضار ضروری ہے

ان غلطیوں کے ازالے کے بعد ایک اور بات بھی کہنا ضروری ہے وہ یہ کہ مسلمانوں میں عام طور پر جہنم کے عذاب کی طرف سے ایک لاپرواہی سی پائی جاتی ہے۔ جب بھی کبھی عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر سزا دیں گے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ سزا کے بعد مغفرت ہو جائے گی۔ اور جب مغفرت کا ہونا یقینی ہے۔ اور اللہ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے تو پھر جہنم کی سزا کی چنداں فکر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ رویہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ پروردگار نے بنی اسرائیل کی گمراہیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بالکل اسی رویے کا نہایت افسوس سے ذکر فرمایا ہے۔ انھوں نے جہنم کو ایسا لگتا ہے کہ غسل خانہ سمجھ رکھا ہے کہ

وہاں داخل کیے جائیں گے اور نہادھو کے واپس نکل آئیں گے۔ حالانکہ وہ ایسا دارالعذاب ہے جس کے عذاب کی شدت کا تو کیا کہنا "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ "جس شخص کو سب سے ہلکا عذاب ہوگا اسے آگ کا جوتا پہنایا جائے گا جس کی تپش سے اس کا دماغ اس طرح ابلے گا جیسے دیگچی میں پانی ابلتا ہے۔ جہنم کی بعض وادیاں ایسی ہیں جس کی آگ کی تپش اور جس کے عذاب کی شدت سے باقی جہنم پناہ مانگتا ہے۔ جہنم کا اگر ایک شعلہ زمین پر گرجائے تو ساری زمین بھسم ہوجائے۔ اس کے تصور سے بھی کپکپی طاری ہوجانی چاہیے چہ جائیکہ اسے اس طرح ہلکے انداز میں لیا جائے کہ جیسے ایک فارمیلٹی ہے جسے پورا کیا جائے گا۔ ورنہ اصل چیز تو اللہ کی بخشش ہے جس سے ہم نوازے جائیں گے۔

دور کی گمراہی میں پڑنے کا مفہوم

تیسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت بہت دور کی گمراہی میں جاپڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی شرم و حیا سے عاری ہوجاتا ہے وہ صرف بے حیا بنتا ہے ضروری نہیں کہ بدمعاملہ بھی ہوجائے۔ اسی طرح جو شخص نماز چھوڑ دیتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس کے ذہن میں اللہ کی وفاداری کا جذبہ ماند پڑنے لگتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ بے حیا بھی ہوجائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر گمراہی کا ایک طبعی نتیجہ ہے اور اس کا ایک دائرہ ہے۔ لیکن شرک ایک ایسا فساد اور ایک ایسی گمراہی ہے جس سے زندگی کا ہر دائرہ اور ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں شرک کا اثر عبادات پر بھی پڑتا ہے 'معاملات پر بھی 'اخلاق پر بھی 'طرز زندگی پر بھی 'معاشرتی طور اطوار پر بھی حرام اور حلال کے طریقوں پر بھی اور حکومت اور ریاست کے آئین و قانون پر بھی۔ کیونکہ جس پاور ہاؤس سے زندگی کی ایک ایک کرن نصیب ہوتی ہے اور جس مینارہ نور سے راستے روشن ہوتے ہیں اور جس سرچشمہ علوم سے علم کی وادیاں جگمگاتی ہیں اور جس سرچشمہ حیات سے زندگی کو صراط مستقیم ملتی ہے اس میں شرکت یقینا پوری زندگی کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ تلپٹ کرکے رکھ دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک ایسی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے جس گمراہی کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے 'اللہ سے دور اور شیطان کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جنت سے محروم اور جہنم کا مستحق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر دور کی گمراہی اور کیا ہوگی ؟" (روح)

فوائد

ف 1: شرک سے مراد کفر ہے۔ رب فرماتا ہے ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا اور مطلب یہ ہے کہ جو کفر پر مرجاوے اس کی مغفرت نہیں۔ گناہ پر مرنے والے کی مغفرت ہوسکتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے بھی کفر معاف نہیں ہوسکتا۔ عام اہل عرب پہلے کفار ہی تھے۔ ایمان لائے۔ کفر سے توبہ کی۔ بخشے گئے۔

ف 2: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ گمراہی جو کفر تک نہ پہنچی ہو گناہ کبیرہ، حقوق اللہ اور حقوق ال عبادت مام گناہ قابل مغفرت ہیں۔ اگرچہ حقوق العباد کی مغفرت کا طریقہ یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ صاحب حق سے معاف کرادے گا۔ دوسرے یہ کہ خلاف وعید جائز بلکہ واقع ہے وہ دراصل خلف ہی نہیں تمام گناہوں کی سزا مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ تیسرے یہ کہ اس بخشش کا یقین نہیں امید ہے کیونکہ لمن یشاء۔ فرمایا گیا۔ للہذا یہ آیت گناہ پر جرات پیدا نہیں کرتی بلکہ گناہ سے روکتی ہے۔ کیونکہ یاس گناہ کراتی ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنۡ يَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰـثًا‌ ۚ وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡـطٰنًا مَّرِيۡدًا ۙ‏ ﴿۱۱۷﴾

لغۃ القرآن: [اِنْ يَّدْعُوْنَ : وہ لوگ نہیں پکارتے] [مِنْ دُوْنِہٖ : اس کے علاوہ] [اِلَّآ : مگر] [اِنٰثًا : عورتوں کو] [وَاِنْ يَّدْعُوْنَ : اور وہ نہیں پکارتے] [اِلَّا : مگر] [شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا : سرکش شیطان کو]

ترجمہ: یہ (مشرکین) اللہ کے سوا محض زنانی چیزوں ہی کی پرستش کرتے ہیں اور یہ فقط سرکش شیطان ہی کی پوجا کرتے ہیں.

تشریح: یہاں شرک کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو حقیقتاً شیطان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے شرک نوح (علیہ السلام) کی قوم میں پیدا ہوا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنے بزرگوں کے مجسمے تراشے ان میں سب سے بڑے بت کا نام سواع تھا سواع عورت کی شکل پر بنایا گیا اس کا معنی ہے "انتظام و انصرام کرنے والی دیوی"۔ (فہم)

مشرکین کے بتوں کا مونث ہونا

اللہ تعالیٰ نے ان کے بتوں کو مونث فرمایا ہے کیونکہ یہ خود اپنے بتوں کو مونث کہتے تھے ' ابو مالک نے کہا کہ لات ' منات اور عزی سب مونث ہیں ' ابن زید نے کہا لات ' عزی ' سیاف اور نائلہ جن بتوں کی وہ عبادت کرتے تھے وہ مونث ہیں ' ضحاک نے اس کی تفسیر میں کہا وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے ' اور بعض نے یہ کہا کہ وہ اپنے بتوں کا نام مونث رکھتے ' اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے سوا صرف عورتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ (جامع البیان ج ۴ ص ۳۷۸۔ ۳۷۷ ' مطبوعہ دار الفکر بیروت)

مشرکین شیطان کی بلاواسطہ تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے شیطان کے بہلانے پھلانے سے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت چھوڑ کر ان دیویوں کی عبادت شروع کر دی تو گویا انھوں نے اپنے نفسوں کی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں دے دی اور اس کی اطاعت کاملہ پر راضی ہو گئے تھے اس لیے گویا وہ دوسرے معنوں میں شیطان ہی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ دیکھئے اول تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود بنانا، اس سے بڑھ کر ضلالت کیا

ہو سکتی ہے پھر بنایا تو کن کو؟ پتھروں کو جن میں کسی قسم کی حس و حرکت بھی نہیں اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اور کس کے بتلانے سے؟ شیطان مردود و ملعون خداوندی کے بہکانے سے۔ کیا اس ضلالت اور جہالت کی نظیر مل سکتی ہے (حاشیہ محمود الحسن صاحب) (ضیاء)

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں ہر صنم کے ساتھ ایک جینہ عورت ہے حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں، اناثا سے مراد بت ہیں۔ صحیحین میں ہے ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ پھرا سے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنالیتے ہیں، جیسے بکری صحیح سالم بچہ بالکل بے عیب ہوتا ہے لیکن پھر لوگ اس کے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور اسے عیب دار بنادیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے اللہ جل شانہ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کو یک سوئیوالے دین پر پیدا کیا لیکن شیطان نے آکر انھیں بہکا دیا، پھر میں نے اپنے حلال کو ان پر حرام کر دیا۔

شیطان کا پروگرام

یعنی جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون اور مردود کیا گیا تو اس نے تو اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولاد آدم میں سے اپنے لیے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤنگا جیسا کہ سورۃ حجر اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اول روز سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر کر چکا ہے تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتلادے بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر جہالت اور نادانی ہے۔

آیت مبارکہ :

لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

لغۃ القرآن: [لَّعَنَہٗ: لعنت کرے اس پر] [اللّٰهُ : اللہ] [وَ : اور] [قَالَ : اس نے کہا] [لَاَتَّخِذَنَّ : میں لازماً ہتھیا لوں گا] [مِنْ عِبَادِکَ : تیرے بندوں میں سے] [نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا : ایک مقرر حصہ]

ترجمہ: جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معیّن حصہ (اپنے لئے) ضرور لے لوں گا۔

تشریح:

(ل ع ن) اللعن

کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا لعنت کہلاتا ہے۔ لیکن خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے اور انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بد دعا کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے: اِلَا لَعۡنَۃُاللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ [ہود/18] سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔ (مفردات)

شیطان نے صرف آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ جرم پر جرم کرتا چلا گیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر معذرت کرنے کی بجائے اپنے جرم کے دلائل دیتے ہوئے قسمیں اٹھائیں کہ میں ہر حال میں بنی نوع انسان کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کثیر تعداد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ میں انھیں پر کشش اور دلفریب امیدیں دلاؤں گا اور انھیں جانوروں کے کان چیرنے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنے کا حکم دوں گا۔ جس نے شیطان کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا خیر خواہ اور دوست بنایا وہ بھاری اور صریح نقصان میں پڑ گیا۔
اس ابلیس ملعون نے کہا تھا کہ ضرور ایک بڑے حصے کو تیری اطاعت سے بے راہ کر کے اپنا حصہ اس سے لوں گا یا یہ کہ ہزار میں سے نو سو ننانوے کو دوزخ میں داخل کراؤں گا اور ہدایت سے گمراہی پر لاؤں گا اور جو شخص شیطان کی پوجا کرتا ہے وہ دنیا وآخرت کے برباد ہونے کی وجہ سے کھلے نقصان میں ہے۔
شیطان ان سے یہ وعدے کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ کچھ نہیں اور یہ جھوٹی امید دلاتا ہے کہ دنیا کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ (ابن عباس)

(قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَھُمۡ صِرَاطَکَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۔ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمۡ مِّنۡ م بَیۡنِ اَیۡدِیۡھِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِھِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِھِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِھِمۡ ط وَلَا تَجِدُ اَکۡثَرَھُمۡ شٰکِرِیۡنَ) [الأعراف: ١٧]
"شیطان نے کہا تو نے مجھے اس کی وجہ گمراہی میں مبتلا کیا ہے لہٰذا اب میں بھی تیرے صراط مستقیم پر ان (کو گمراہ کرنے) کے لیے بیٹھوں گا۔ پھر انسانوں کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے غرض ہر طرف سے گھیر لوں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"
دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
(لَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡھُمۡ لَاَمۡلَءَنَّ جَھَنَّمَ مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ) [الأعراف: ١٨]
"کہ جس نے لوگوں میں سے تیری پیروی کی میں تم سب سے جہنم کو ضرور بھروں گا۔"
لعنت کا معنٰی: اللہ کا کسی کو خیر سے دور اور محروم کرنا۔ لعنت کرنا (فہم)

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ شیطان لعنہ اللہ نے کہا میں ضرور تیرے بندوں میں سے ایک مقدار معین کو اپنا لوں گا اور یہ وہ لوگ ہیں جو شیطان کے وسوسوں کو قبول کریں گے ' اور اس کی اتباع کریں گے اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے متبعین کم لوگ ہوں گے

کیونکہ "من "تبعیض کے لیے آتا ہے حالانکہ شیطان کے متبعین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بہت کم ہیں 'کیونکہ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الاقلیلا"۔ (النساء : ۸۳)

ترجمہ : اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم (سب) شیطان کی پیروی کر لیتے سوا قلیل لوگوں کے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے شیطان سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا :

(آیت) "قال ارءیتک ھذاالذی کرمت علی لئن اخرتن الی یوم القیامۃلاحتنکن ذریتہ الاقلیلا"۔ (بنواسرائیل : ۶۲)

ترجمہ : اور (شیطان نے) کہا بھلا دیکھو تو ! جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے 'اگر تو مجھے قیامت تک کی مہلت دے دے تو میں اس (آدم) کی اولاد کو ضرور جڑ سے اکھاڑ دوں گا سوا قلیل لوگوں کے "۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قلیل انسانوں کے سوا سب شیطان کے پیروکار ہیں 'اور زیر تفسیر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیروکار بعض ہیں 'اس کا جواب یہ ہے کہ لاتعداد فرشتے اللہ کے عباد مخلصین ہیں اور ان کے اعتبار سے شیطان کے متبعین بعض ہی ہیں۔ (تبیان)

اس سے تین مسئلے معلوم ہوئے۔ایک یہ کہ تقیہ ایسی بری لعنت ہے۔کہ شیطان نے بھی رب کے سامنے تقیہ نہ کیا۔جو اسے کرنا تھا وہ صاف صاف کہہ دیا۔ دوسرے یہ کہ شیطان کو رب نے اتنا وسیع علم اور قدرت بخشی کہ وہ بہکانے کے طریقے جانتا ہے اور ہر ایک کو پہچانتا ہے۔ تیسرے یہ کہ انبیاء واولیاء کو شیطان بھی معصوم یا محفوظ جانتا ہے اس لیے اس نے من عبادک کہا جو انھیں گناہ گار مانیں وہ شیطان سے بھی بد تر ہیں۔

مسائل

۱۔ شیطان لعنتی ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔

۲۔ شیطان نے انسان کو ہر طرح سے گمراہ کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔

۳۔ شیطان کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہمیشہ نقصان پائے گا۔

آیت مبارکہ :

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

لغۃ القرآن: [وَّلَاُضِلَّنَّہُمْ : اور میں لازماً بہکاؤں گا ان کو] [وَلَاُمَنِّيَنَّہُمْ : اور میں لازماً تمناؤں میں مبتلا کروں گا ان کو] [وَلَاٰمُرَنَّهُمْ : اور میں لازماً ترغیب دوں گا ان کو] [فَلَيُبَتِّكُنَّ : پھر وہ لوگ لازماً چیریں گے] [اٰذَانَ الْاَنْعَامِ : چوپاؤں کے کان] [وَلَاٰمُرَنَّهُمْ : اور میں لازماً ترغیب دوں گا ان کو] [فَلَيُغَيِّرُنَّ : پھر وہ لازماً بدلیں گے] [خَلْقَ اللّٰهِ : اللہ کی خلقت کو] [وَمَنْ : اور جو] [يَّتَّخِذِ : بناتا ہے] [الشَّيْطٰنَ : شیطان کو] [وَلِيًّا : کارساز] [مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ] [فَقَدْ خَسِرَ : تو اس نے گھاٹا اٹھایا ہے] [خُسْرَانًا مُّبِيْنًا : کھلم کھلا ایک بہت بڑا گھاٹا]

ترجمہ: میں انھیں ضرور گمراہ کردوں گا اور ضرور انھیں غلط امیدیں دلاؤں گا اور انھیں ضرور حکم دیتا رہوں گا سو وہ یقیناً جانوروں کے کان چیرا کریں گے اور میں انھیں ضرور حکم دیتا رہوں گا سو وہ یقیناً اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدلا کریں گے، اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنالے تو واقعی وہ صریح نقصان میں رہا.

تشریح: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چار دعاوی ذکر کیے ہیں 'پہلا دعوی اس نے یہ کیا تھا کہ میں ان کو ضرور گمراہ کروں گا 'حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ شیطان کے گمراہ کرنے کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت کے راستہ سے ہٹادے گا 'اور دوسروں نے کہا کہ شیطان کے گمراہ کرنے کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف دعوت دے گا 'اور یہی صحیح ہے۔

امنیۃ

جھوٹی امید کو کہا جاتا ہے۔ شیطان متاع ایمان کو لوٹنے کے لیے انسان کے سامنے کس طرح امیدوں کے محلات تعمیر کرتا ہے۔ کس طرح وہ خواہشات کی حسین و جمیل دنیا آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کرتا ہے۔ کس طرح جاہ و منصب کے زرتار جال بن کر طائر عقل کو پھنساتا ہے یہ بات

کسی توضیح کی محتاج نہیں۔ اور اس کی مہارت کی داد دیجئے کہ وہ امیدوں اور توقعات کے سنہرے جال ایک ہی شکل کے تیار نہیں کرتا بلکہ جس امید سے وہ کسی کو زیادہ فریب دے سکتا ہے اس کے لیے اسی قسم کا جال بنتا ہے۔ واد عو کلا منہم الی مایمیل طبعہ الیہ فاصدہ بذالک عن الطاعۃ (روح) یعنی میں ہر شخص کو اس کی دعوت دوں گا جس کی طرف اس کی طبیعت مائل ہوتی ہے۔ اس طرح اسے اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری سے روک دوں گا۔ (ضیاء)

جھوٹی آرزوئیں ڈالنے کا معنی

شیطان کا دوسرا دعوی یہ تھا کہ میں ضرور لوگوں کے دلوں میں جھوٹی آرزوئیں ڈالوں گا ' اس کی تفسیر میں چار قول ہیں ' حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو ہوگی کہ نہ جنت ہو نہ دوزخ ' اور نہ حشر و نشر ہو ' دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں توبہ اور استغفار میں تاخیر کرنے اور اس کے ٹالنے کو ڈالتا رہے گا ' یہ بھی حضرت ابن عباس (رض) کا قول ہے ' تیسرا قول یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں یہ آرزو ڈالے گا کہ آخرت میں ہمیں بہت بڑا اجر و ثواب ملے گا۔ یہ زجاج کا قول ہے ' ہمارے زمانہ میں بعض جاہل پیر اپنے مریدوں سے کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے مجھے مقام وجاہت عطا کیا تو میں فلاں کو بخشوالوں گا ' اور جب میں محشر میں اٹھوں گا تو شور مچ جائے گا دیکھو فلاں آگیا ہے ' ہم اس قسم کے اقوال سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ' ہماری تو آرزو یہ ہے کہ اللہ ہمیں عذاب سے نجات دے دے اور یہ اس کا ہم پر بہت بڑا کرم ہے ' جنت اور اس کی نعمتوں کے ہم کب لائق ہیں ' چوتھا قول یہ ہے کہ وہ ان کی آرزوؤں کو ان کے لیے مزین کر دے گا۔

مویشیوں کے کان چیرنے کا معنی

شیطان کا تیسرا دعوی یہ تھا اور میں ان کو ضرور حکم دوں گا تو وہ ضرور مویشیوں کے کان چیر ڈالیں گے۔
کفار عرب اس اونٹنی کو جو پانچ بچے جنتی اور پانچواں نر ہوتا اس کے کان چھید کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کسی قسم کا کام نہ لیتے۔

قتادہ ' عکرمہ ' اور سدی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ بحیرہ کے کان چیرنے کا حکم دے گا ' بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے کہ جب کوئی اونٹنی پانچ بچے جنتی اور پانچواں بچہ نر ہوتا ' تو وہ اونٹنی کے کان چیر دیتے اور اس سے نفع اٹھانا بند کر دیتے ' وہ اونٹنی جس جگہ سے چاہے پانی پیے اور جس چراگاہ سے چاہے چرے اس کو کوئی منع نہیں کرتا تھا ' اور نہ کوئی شخص اس پر سوار ہوتا تھا شیطان نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ تمام کارروائی عبادت ہے۔ (زاد المسیر ج ۲ ص ۱۱۹)
سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ دوہنے سے بتوں کے لیے منع کیا جاتا تھا ' اور کوئی شخص اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۳۵۲۲)

تغییر خلق اللہ کا معنی

شیطان کا چوتھا دعوی یہ تھا کہ میں ان کو ضرور حکم دوں گا تو وہ ضرور اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو تبدیل کریں گے۔
تغیر خلق سے مراد کسی جانور کے کان کاٹ دینا، کسی مرد کو خصی کر دینا، عورتوں کا بال کٹا کر اپنی انوثیت کو بگاڑ کر مردوں کی مشابہت اختیار کرنا، مردوں کا داڑھی منڈانا وغیرہ اعمال ہیں۔ بعض علمائے کرام نے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ جس مقصد کے لیے کسی چیز کی تخلیق اس کے خالق نے فرمائی ہے اس کے خلاف اس کو استعمال کرنا مثلاً سورج، دریا اور پتھر وغیرہ جو انسان کی خدمت گذاری کے لیے پیدا کئے گئے ہیں ان کو اپنا معبود بنالینا بھی تغییر خلق میں داخل ہے۔ صاحب کشاف نے اس کی تشریح کی۔ "فطرۃ اللہ التیھی دین الاسلام۔ "یعنی تغییر خلق سے مراد دین اسلام جو دین فطرت ہے اس میں ردوبدل اور کانٹ چھانٹ کرنا اور اس کا حلیہ کچھ سے کچھ کر دینا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم کا یہ لفظ ان تمام معانی پر مشتمل ہے۔ ہر ایک نے اپنی فکر کے مطابق اس سے استفادہ کیا ہے۔ (ضیاء)

تغییر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو تبدیل کرنے کی بھی پانچ صورتیں ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) اور ایک روایت میں حسن بصری کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنے ہاتھ پیروں پر نقش ونگار گودواتی ہیں۔
علقمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے ان عورتوں پر لعنت کی جو اپنے جسم پر گودواتی ہیں اور اپنے بال اکھاڑتی ہیں اور خوب صورتی کے لیے اپنے دانتوں کے درمیان جھریاں کرواتی ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں ' ام یعقوب نے کہا آپ ان پر کوئی لعنت کرتے ہیں؟ کہا میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں جن پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لعنت کی ہے اور اللہ کی کتاب میں ان پر لعنت ہے۔ اس عورت نے کہا میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے۔ مجھے اس میں یہ آیت نہیں ملی ' حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا اگر تم قرآن پڑھتیں تو تم کو یہ آیت مل جاتی کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی:
(آیت) "وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا"۔
ترجمہ: اور رسول تم کو جو (احکام) دیں وہ لے لو ' اور جن کاموں سے تم کو منع کریں ان سے رک جاؤ۔
حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس عورت پر لعنت کی جو ایک عورت کے بالوں کے ساتھ دوسری عورت کے بال ملاتی ہے اور جو عورت اپنے بالوں کے ساتھ دوسری عورت کے بال لگواتی ہے اور جسم کو گودنے والی پر اور گودوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ' ۵۹۴۰ ' ۵۹۳۹ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ' ۲۱۲۷ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ' ۲۱۶۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ' ۲۷۹۱ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث: ' ۵۱۱۴ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ' ۱۹۸۹ ' المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۲۴۷ ' سنن کبری لل بیہقی ج ۲ ص ۴۲۶ ' مسند حمیدی ' رقم الحدیث: ' ۶۰۰ ' مسند احمد ج ۲ ' رقم الحدیث: ' ۴۱۲۹ ' ۴۳۴۳)

جو مرد ڈاڑھی منڈواتے ہیں ' عورتوں کی طرح چوٹی کرتے ہیں اور جو عورتیں مردوں کی طرح بال کٹواتی ہیں یا سر منڈاتی ہیں اور جو بوڑھے مرد بالوں کو سیاہ خضاب لگاتے ہیں یہ سب اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو تبدیل کر رہے ہیں ' سفید بالوں کو عنابی ' زرد یا مہندی کے رنگ سے رنگنا اس حکم میں داخل نہیں ہے ' کیونکہ اس رنگ کا خضاب حدیث سے ثابت اور مطلوب اور مستحب ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا قول حضرت ابن عباس (رض) اور حضرت ابن ابی طلحہ (رض) کا ہے۔ سعید بن جبیر ' سعید بن مسیب ' نخعی ' ضحاک ' ابن زید اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے ' ان کے نزدیک تغییر خلق اللہ کا معنی ہے اللہ کے دین کو بدلنا اور اس میں تغیر کرنا ' حرام کو حلال اور حلال کو حرام کہنا۔

تیسرا قول حضرت انس بن مالک (رض) مجاہد ' قتادہ اور عکرمہ کا ہے ان کے نزدیک کسی انسان کا خصی ہونا اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلنا ہے۔

چوتھا قول ابوشیبہ کا ہے کہ تغییر خلق اللہ کا معنی ہے اللہ کے امر میں تغیر کرنا۔

پانچواں قول زجاج کا ہے کہ تغییر خلق اللہ کا معنی ہے سورج ' چاند اور پتھروں کی عبادت کرنا ' کیونکہ سورج ' چاند اور پتھروں کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے نفع کے لیے بنایا تھا اور مشرکوں نے ان کی عبادت شروع کردی۔

شیطان کو کیسے علم ہوا کہ اس کے پیروکار بہت زیادہ ہوں گے ؟

ایک سوال یہ ہے کہ شیطان کو کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ ضرور لوگوں کو گمراہ کردے گا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا تو اکثر انسانوں کو شکر گزار نہیں پائے گا (الاعراف : ١٧) اور کہا میں قلیل لوگوں کے سوا آدم کی تمام ذریت کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا (بنواسرائیل : ٦٢) اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ابلیس کا گمان تھا جو واقع کے مطابق ثابت ہوا ' دوسرا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا : میں تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے ضرور جہنم کو بھر دوں گا (ص : ٨٥) تو شیطان نے جان لیا کہ اس کے پیروں کاروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی ' تیسرا جواب یہ ہے کہ جب اس کی وجہ سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو لغزش ہوگئی تو اس نے جان لیا کہ ان کی اولاد کو بہکانا تو زیادہ آسان ہے ' چوتھا جواب یہ ہے کہ فرشتوں نے جب اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ کیا تو اس کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا (البقرہ : ٣٠) تو اس نے جان لیا کہ اکثر انسان اس کے پیروکار بن جائیں گے۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ شیطان نے جو کہا تھا کہ میں ضرور ان کو گمراہ کروں گا اس کا معنی یہ ہے کہ میں ان کو ضرور گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا ' چھٹا جواب یہ ہے کہ جب اس نے جنت اور دوزخ کو دیکھا تو جان لیا کہ دوزخ میں رہنے کے لیے بھی ایک مخلوق بنائی جائے گی اس لیے اس نے کہا تھا : میں تیرے بندوں میں سے ضرور مقرر حصہ لوں گا۔ (النساء : ١١٨)تبیان)

لمبی امید رکھنے کی مذمت

شیطان مردود کا بڑا مقصد لوگوں کو بہکانا اور عملی اعتبار سے ایسا کر دینا ہے کہ نجات و مغفرت کا کوئی راستہ باقی نہ رہے، اس کے لیے وہ مختلف طریقے اپناتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لمبے عرصے تک زندہ رہنے کی سوچ انسان کے دل، دماغ میں بٹھا کر موت سے غافل رکھتا ہے،

حتّٰی کہ اسی آس امید پر جیتے جیتے اچانک وہ وقت آ جاتا ہے کہ موت اپنے دردناک شکنجے میں کس لیتی ہے پھر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، ناچار اپنے کئے اعمال کے انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فی زمانہ لوگوں کی اکثریت موت کو بھول کر دنیا کی لمبی امیدوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ امام غزالی (رح) فرماتے ہیں ” لمبی زندگی کی امید دل میں باندھ لینا جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر دنیا کی محبت کی وجہ سے۔ جہالت اور نادانی تو یہ ہے کہ آدمی اپنی جوانی پر بھروسہ کر بیٹھے اور بڑھاپے سے پہلے مرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے، اسی طرح آدمی کی ایک نادانی یہ ہے کہ تندرستی کی حالت میں ناگہانی موت کو ناممکن سمجھے۔ لہٰذا ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ ان باتوں میں غور کرے ’ ’ کیا لاکھوں بچے جوانی کی دہلیز پر پہنچنے سے پہلے ہی راہی عدم نہ ہوئے؟ کیا ہزاروں انسان چڑھتی جوانی میں موت سے ہم آغوش نہ ہوئے؟ کیا سینکڑوں نوجوان بھری جوانی میں لقمہ اَجَل نہ بنے؟ کیا دَسیوں نوجوان بیماریوں کا شکار نہ ہوئے؟ ان باتوں میں غور وفکر کے ساتھ ایک اور بات دل میں بٹھالے کہ موت اس کے اختیار میں نہیں کہ جب یہ چاہے گا تو اسی وقت آئے گی، اس طرح جوانی یا کسی اور چیز پر بھروسہ کرنا خود ہی ایک نادانی نظر آئے گی۔ لمبی زندگی کی امید کی دوسری وجہ دنیا کی محبت ہے، انسان اپنے دل کو تسلّی دیتا رہتا ہے کہ ابھی تو زمانہ پڑا ہے، ابھی کس نے مرنا ہے میں پہلے یہ مکان بنالوں، فلاں کاروبار شروع کرلوں، اچھی گاڑی خرید لوں، سہولیات سے اپنی زندگی بھر لوں جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کرنے لگ جائیں گے اس طرح ہر کام سے دس کام نکالتا چلا جاتا ہے حتّٰی کے ایک دن پیغام اجل آ پہنچتا ہے اب پچھتانے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ اس میں مبتلا شخص کو چاہیے کہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کی حقیقت کے بارے میں معلومات حاصل کرے کیونکہ جس پر دنیا کی حقیقت آشکار ہو جائے کہ دنیا کی لذت چند روزہ ہے اور موت کے ہاتھوں اسے ایک دن ختم ہونا ہی ہے وہ اسے عزیز نہیں رکھ سکتا۔

(کیمیائے سعادت، رکن چہارم: منجیات، اصل دہم، اسباب طول امل، ۲/۹۹۵-۹۹۶، ملخصاً)

دِلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

باغیچے چھوڑ کر خالی زمین اندر سمانا ہے

{ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ: اور میں ضرور انھیں حکم دوں گا۔ } یہ شیطان کا قول ہے کہ اس نے کہا میں لوگوں کو حکم دوں گا کہ وہ بتوں کے نام پر جانوروں کے کان چیریں یا اس طرح کی دوسری حرکتیں کریں۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا کہ اونٹنی جب پانچ مرتبہ بچہ جن دیتی تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور اس سے نفع اٹھانا اپنے اوپر حرام کر لیتے اور اس کا دودھ بتوں کے لیے وقف کر دیتے اور اس کو بَحِیرہ کہتے تھے۔ شیطان نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ایسا کرنا عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلاف شرع تبدیلیاں کرنے کا شرعی حکم

شیطان نے ایک بات یہ کہی کہ وہ لوگوں کو حکم دے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ضرور بدلیں گے۔

یاد رہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلافِ شرع تبدیلیاں حرام ہیں۔ احادیث میں اس کی کافی تفصیل موجود ہے۔ ان میں سے 4 احادیث درج ذیل ہیں

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں، سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مرد پر لعنت فرمائی جو عورت کا لباس پہنے اور اس عورت پر لعنت فرمائی جو مرد کا لباس پہنے۔

(ابو داؤد، کتاب اللباس، باب فی لباس النساء، ۸۳/۴، الحدیث : ۴۰۹۸)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں ’ ’نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زنانہ مردوں اور مردانی عورتوں پر لعنت فرمائی اور ارشاد فرمایا: ”انھیں اپنے گھروں سے باہر نکال دو۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب اخراج المتشبّہین بالنساء من البیوت، ۷۴/۴، الحدیث : ۵۸۸۶)

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ”عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مرد اور مردوں سے مشابہت کرنے والی عورتیں صبح شام اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے غضب میں ہوتے ہیں۔ (شعب الایمان، السابع والثلاثون من شعب الایمان۔۔ الخ، ۳۵۶/۴، الحدیث : ۵۳۸۵)

(4)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں ”تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے بالوں میں دوسرے کے بال لگانے والی اور لگوانے والی اور بدن گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت فرمائی۔

(مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم فعل الواصلۃ والمستوصلۃ۔۔ الخ، ص ۱۱۷۵، الحدیث : ۱۱۹ (۲۱۲۴)) (صراط)

آیت مبارکہ :

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

لغۃ القرآن: [يَعِدُهُمْ : وہ وعدہ کرتا ہے ان سے] [وَيُمَنِّيهِمْ : اور وہ تمناؤں میں مبتلا کرتا ہے ان کو] [وَمَا يَعِدُهُمُ : اور وعدہ نہیں کرتا ان سے] [الشَّيْطٰنُ : شیطان] [اِلاَّ : مگر] [غُرُوْرًا : دھوکوں کا]

ترجمہ: شیطان انھیں (غلط) وعدے دیتا ہے اور انھیں (جھوٹی) اُمیدیں دلاتا ہے اور شیطان فریب کے سواان سے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔

تشریح: یعنی شیطان کا تو کام ہی صرف وعدے کرنا اور امیدوں کے سبز باغ دکھانا ہے۔ اس کے بازار کی ساری رونقیں اور اس کی جنس عصیاں کی بڑھتی ہوئی مانگ کا سارا دارومدار انھیں کبھی نہ پورے ہونے والے وعدوں اور کبھی نہ بر آنے والی امیدوں پر ہے۔ ان آیات کے نزول کا مقصد بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کی جو صلاحیتیں ہم میں موجود ہیں ان کو خواب غفلت سے جھنجھوڑا جائے اور ہمیں غیرت دلائی جائے کہ یہ شیطان آنکھیں بند کئے جس کی ہر بات مانتے چلے جارہے ہو یہ وہی تو ہے جو تمہارا روز ازل کا دشمن ہے اور اس نے تمہیں اسی دن اپنا پخیر زبوں بنانے کا اعلان کیا تھا۔ وہ تمہاری متاع عقل ودیں لوٹتا چلا رہا ہے۔ اور تم ہو کہ اپنے رب کریم کی طرف سے منہ موڑ کر اپنے اس کھلے دشمن کے پیچھے

سر پٹ دوڑتے چلے جارہے ہو اور یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ خلد بریں سے نکال کر تمہیں سراب وہم و گمان کی طرف لیے جارہا ہے۔ اگر انسان کا ذوق سلیم بے حس نہ ہو چکا ہو تو خیر و تقویٰ کے جذبات کو سرگرم عمل کرنے کا یہ کتنا موثر اسلوب ہے۔ (ضیاء)

شیطان کے کیے ہوئے وعدہ کے غرور ہونے کا بیان

غرور (دھوکا) کا معنی ہے انسان کسی چیز کو لذیذ اور نافع گمان کرے اور وہ در حقیقت اس کے لیے بہت مضر اور تکلیف دہ ہو' اس کی مثال یہ ہے کہ شیطان انسان کے دل میں یہ ڈالتا ہے کہ اس کی عمر لمبی ہو گی' اور دنیا میں اس کا مطلوب اور مقصود حاصل ہو جائے گا اور وہ اپنے دشمنوں کو مغلوب کرے گا' کیونکہ بعض اوقات اس کی عمر لمبی نہیں ہوتی' اور بعض دفعہ اس کی عمر لمبی ہوتی ہے لیکن اس کا مقصود حاصل نہیں ہوتا اور کبھی اس کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے لیکن اچانک اس کو کوئی سخت بیماری آ لیتی ہے اور وہ اپنے مقصود سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا' اور یا اچانک وہ مر جاتا ہے' اور کبھی شیطان اس کے دل میں یہ آرزوئیں ڈالتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے نہ قیامت آنی ہے نہ حساب ہو گا نہ جنت اور دوزخ ہو گی اس لیے وہ انسان کو دنیا کی رنگینیوں اور عیش و عشرت میں منہمک کر دیتا ہے اور جب قیامت آیت ہے تو وہ ایمان اور نیک اعمال سے تہی دامن ہوتا ہے اور کبھی شیطان انسان سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کے راستوں پر چلتا رہے وہ اس کو آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچالے گا اور جب آخرت میں جزاء اور سزاء کا فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہے گا: "اور فیصلہ ہو چکنے کے بعد شیطان کہے گا اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ حق تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا سو میں نے اس کے خلاف کیا' اور میرا تم پر اس کے سوا اور کوئی زور نہ تھا کہ میں نے تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت قبول کر لی سو تم مجھ کو ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو' نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچنے والا ہوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے ہو' تم نے اس سے پہلے جو مجھے (اللہ کا) شریک بنایا تھا میں نے اس سے انکار کیا' بیشک ظالموں ہی کے لیے درد ناک عذاب ہے۔ (تبیان)

علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزی (رح) نے شیطان کے پھندوں اور دلفریب وعدوں پر "تلبیس ابلیس" کے نام پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے سینکڑوں ایسے واقعات درج کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان آدمی کی طبیعت اور اس کا رجحان دیکھ کر اسے گمراہ کرتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ وہ کسی سخی انسان کو کنجوسی کی طرف رغبت دے بلکہ وہ سخی کو فضول خرچی و اسراف پر آمادہ کرتا ہے۔ بخیل کو فقر کا خوف دلا کر مزید کنجوس بناتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسا آدمی اپنے آپ پر خرچ کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان توحید کے نام پر یہ کہہ کر گناہوں پر دلیری دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ سب کچھ معاف کر دے گا۔ وہ محبت کے نام پر بے حیائی کا سبق دیتا اور بزرگوں کی عقیدت کے ذریعے شرک کے راستے پر ڈالتا ہے۔ یہ سراسر دین کے نام پر جھوٹی امیدیں دلانا اور دھوکہ دینا ہے۔ دین کے نام پر دھوکے کو قرآن مجید نے سورۃ آل عمران میں یوں بیان فرمایا ہے۔

(وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔۔) [النساء: ۴۱]

"اور انھوں نے کہا ہمیں چند گنتی کے دنوں کے علاوہ ہرگز آگ نہ چھوئے گی۔"

یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم صرف چند دنوں کے لیے جہنم میں جائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دائمی عیش و عشرت ہو گی۔ اسی فریب کے ذریعے عیسائیوں کو شیطان نے عقیدہ سمجھایا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سولی پر لٹک کر تمہارے گناہوں کا کفارہ بن چکے ہیں۔ (فہم)

شیطان کا دھوکہ اور فریب

(كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيْءٌ مِّنْكَ إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ) [الحشر: ۱۶،۱۷]

”شیطان کی طرح جب اس نے انسان کو کہا کہ کفر کر پھر اس نے کفر کر لیا تو کہنے لگا میں تجھ سے بری ہوں یقیناً میں تو رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔“

بات کو سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ شیطان کا سارا کاروبار ضلالت صرف دو چیزوں پر چلتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ جھوٹے وعدے کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے۔ جس شخص نے مال و دولت ہی کو زندگی کا حقیقی مقصد بنالیا ہے اور اس کے سوا باقی ہر چیز ثانوی ہو کر رہ گئی ہے آپ کبھی اس سے بات کر کے دیکھ لیجیے ' آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اس کے سامنے دولت کے حصول اور اس کے نتیجے میں زندگی کا ایک ایسا خوبصورت نقشہ ہے ' جس کی حیثیت فریب نظر سے زیادہ نہیں اور اسے اس پر ایسا محکم یقین ہے جس میں شکست کا کوئی امکان نہیں۔ وہ اپنے آپ کو قارون اور شداد سے بڑھ کر دولت کے بل بوتے پر اپنے تصور کے مطابق کامیاب آدمی دیکھنے کا یقین رکھتا ہے۔ اسی طرح جس آدمی نے اقتدار کو اپنا معبود بنالیا ہے آپ اس کی زندگی کے طور اطوار کو دیکھ لیجیے کہ وہ اقتدار کی ہوس کے سوا باقی ہر چیز کو بھول چکا ہوگا۔ اسے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنے میں تامل نہیں ہوگا۔ آپ اس کی زندگی کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ شیطان کے وعدوں کی گرفت میں آچکا ہے۔ جس طرح سراب کے پیچھے بھاگنے والا فریب نظر سے کبھی جان نہیں چھڑا سکتا اس طرح ہر وہ شخص جو شیطان کے وعدے پر اعتبار کرتا ہے اور اس کی دی ہوئی امیدوں میں بھٹکتا ہے اسے بھی اس فریب نظر سے نکلنے کا کبھی موقع نہیں نکلتا اور بالآخر اسی میں برباد ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ أُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا

” ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے ' جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے۔ “(النسآء: ۱۲۱)

مسائل

۱۔ شیطان کے وعدے مکر و فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

۲۔ شیطان اور اس کے ساتھیوں کا ٹھکانا جہنم ہے اس سے کبھی نجات نہیں پائیں گے۔

آیت مبارکہ :

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾

لغۃ القرآن: [أُولٰٓئِکَ : یہ لوگ ہیں] [مَاْوٰىہُمْ : جن کا ٹھکانا] [جَہَنَّمُ : جہنم ہے] [وَلاَ یَجِدُوْنَ : اور وہ نہیں پائیں گے] [عَنْہَا : اس سے] [مَحِیْصًا : کوئی بچنے کی جگہ]

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ وہاں سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے

تشریح:

اس آیہ کا مطلب سمجھنے کے لئے درج ذیل الفاظ پر غور کرنا ہو گا۔

(او ی) الماویٰ۔

(یہ اوی (ض) اویا وماوی کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے یا پناہ حاصل کرنا کے

(ج ھ ن م) جھنم

دوزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل فارسی لفظ جنام سے معرب ہی واللہ علم۔

(م ح ص) المحص

کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں یہ فحص کے ہم معنی ہے مگر فحص کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیزوں سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل جائیں لیکن در حقیقت اس سے منفصل ہوں مگر محص کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو کسی چیز سے الگ کرنے کے لیے آتا ہے جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہوں۔۔ چنانچہ محاورہ ہے :۔ محصت الذھب ومحضتہ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو الگ کر دیا چنانچہ آیات کریمہ :۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا [آل عمران/141] اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص مومن بنادے وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ [آل عمران/154] اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کر دے۔ میں دلوں کے پاک کرنے پر تمحیص کا استعمال آیا ہے۔ (مفردات)

مومن کے متقابل

قرآن کریم میں جگہ جگہ مومن کی دو متقابل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ مومن سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبود واحد مان کر اس قانون کی اطاعت اختیار کرلے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بندوں تک بھیجا ہے۔ اس کے برعکس فاسق وہ ہے جو خراج

از طاعت الٰہی بالفاظ دیگر بغاوت خود مختاری اور اطاعت غیر اللہ کا رویہ کرے اور یہی لوگ وہ ہیں جو شیطان کے یار کہلاتے ہیں اور یقیناً ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جب کبھی وہ اس نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ " (حم السجدہ ۳۲ : ۲۰) اور یہ کہ وہ اس عذاب سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کریں گے لیکن یہ وہ وقت نہیں کہ جب کوئی اپنی کوشش سے اس چیز کو حاصل کرلے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ (عروہ)

یعنی جب شیطان کی خباثت و شرارت اور اس کی عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہ رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی اس کی موافقت کرے گا سخت نقصان میں پڑے گا۔اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں نتیجہ یہ ہو گا کہ ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو گی۔

جو ایسی دل ہلا دینے والی تنبیہات کے باوجود بھی شیطان کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ان کا انجام ملاحظہ ہو۔
یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ وہاں سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے

آیت مبارکہ :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [وَعَمِلُوا : اور عمل کیے] [الصّٰلِحٰتِ : نیکی کے] [سَنُدْخِلُهُمْ : ہم عنقریب داخل کریں گے ان کو] [جَنّٰتٍ : ایسے باغات میں] [تَجْرِيْ : بہتی ہیں] [مِنْ تَحْتِهَا : جن کے نیچے سے] [الْاَنْهٰرُ : نہریں] [خٰلِدِيْنَ : ایک حالت میں رہتے ہوئے] [فِيْهَآ : اس میں] [اَبَدًا : ہمیشہ] [وَعْدَ اللّٰهِ : (ہو چکا) اللہ کا وعدہ] [حَقًّا : حق ہوتے ہوئے] [وَمَنْ : اور کون] [اَصْدَقُ : زیادہ سچا ہے] [مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے] [قِيْلاً : بلحاظ بات کے]

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ہم انھیں عنقریب بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے، اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

تشریح:

گزشتہ آیات میں شیطان کی پیروی اور اتباع کرنے والوں کو وعید سنائی گئی تھی اور بتلایا گیا تھا کہ جو بھی شیطان کو اپنا ساتھی اور دوست بنائے گا اور اس کی پیروی کرے گا اور اس کے کہنے پر چلے گا اور اللہ و رسول کے فرمان کو نہ مانے گا تو اس کو کھلا ہوا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور آخرت میں اس کو تباہی کو سامنا ہو گا اور بالآخر ایسے سب لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

نیک عمل اور جنت

اب آگے ان لوگوں کے مقابل مومنین مخلصین کا ذکر فرمایا جاتا ہے جو دل و جان سے اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں اور ہر کام کرنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں کہ کہیں اللہ اور رسول نے اس سے منع تو نہیں کیا۔ اللہ کو راضی کرنے کے جو کام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتا دیئے ہیں اور ان کو کرنے کی جو شکل مقرر کر دی ہے اسی شکل میں خوشی خوشی کرتے ہیں اور کسی کے بہکانے میں نہیں آتے اور شیطان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کو جنت میں ہمیشہ رہنے کی بشارت دی جاتی ہے اور ان سے جنت کا سچا اور پکا وعدہ فرمایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالحہ یعنی نیک کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے محلات کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہو گا"۔

یعنی جنھوں نے اللہ اور رسول کے احکامات کو دل سے مانا اور حکم شرع کے مطابق نیک اعمال کئے وہ آخرت میں جنت کے باغات میں داخل کئے جائیں گے اور ان کا داخل ہونا عارضی نہ ہو گا بلکہ وہ ہمیشہ ابدالآباد وہیں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کا پکا اور سچا وعدہ فرما رہے ہیں۔ تو مقصود یہ بتلانا ہے کہ جب تم کو یہ معلوم ہو چکا تو تم کو چاہیے کہ اللہ کے وعدہ پر بھروسہ کر کے ایمان کے ساتھ عمل صالح کرو اور شیطان کے جھوٹے وعدوں پر بھروسہ کر کے اس کے دھوکا میں مت آؤ۔

اب یہاں مومنین سے جس جنت کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے اس کے متعلق آگے بتلایا جاتا ہے کہ یہ جنت کا داخلہ محض زبانی دعوؤں اور نری تمناؤں پر نہیں بلکہ مدار کار اطاعت پر ہے۔ پس جو شخص اطاعت میں کمی کرے گا اور کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائیگا۔

حضرت ابن عباس (رض) اور ایک جماعت تابعین نے ان آیات کا ایک خاص شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک بار چند یہودی اور چند عیسائی اور چند مسلمان ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہودی بولے ہمارے نبی سب سے افضل تھے اور ہم انبیاء کی اولاد ہیں اس لیے صرف ہم ہی جنت میں جائیں گے عیسائی بولے جنت میں تو صرف ہم ہی جائیں گے کیونکہ ہمارے پیغمبر عیسیٰ (علیہ السلام) (نعوذ باللہ) خدا کے بیٹے ہیں ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو کر سولی پر چڑھ چکے جس سے ہمارے سب گناہ معاف کر دیئے گئے اب ہم گناہوں سے پاک ہیں ہم پر کسی کا عذاب نہ

ہو گا۔ مسلمان کہنے لگے ہمارے نبی اور پیشوا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں جو خاتم الانبیاء اور تمام رسولوں کے سردار ہیں اس لیے ہم ہی جنت میں جائیں گے کیونکہ ہم ان کے ماننے والے ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں بتلایا گیا کہ صرف زبانی دعویٰ کرنے سے صداقت و حقانیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ ایماندار وہ ہے جس کا دل صاف ہو اور عمل شاہد ہوں اور خدائی دلیل اس کے ہاتھوں میں ہو۔ نرے دعوے کوئی وقعت نہیں رکھتے خواہ وہ اہل اسلام کے ہوں یا یہود و نصاری کے، نجات کا مدار صرف زبانی دعووں پر نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی فرمان برداری اور اس کے رسول کی تابعداری پر ہے۔ برائی کرنے والے محض کسی نسبت کی وجہ سے ناممکن ہے کہ اس برائی کے خمیازہ سے چھوٹ جائیں یعنی یہ تفاخر اور تعلق کسی کیلیئے زیبا نہیں اور محض خیالات اور تمناؤں اور دعووں سے کوئی کسی پر افضل نہیں ہوتا۔ مدار اعمال و اطاعت پر ہے۔ کسی کا نبی اور کتاب کتنی ہی افضل و اشرف ہوا گر وہ عمل غلط کرے گا تو اس کی سزپائے گا۔

روایات میں ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو من یعمل سوٓء ایجزبہ سن کر یعنی جو کوئی کچھ برائی کرے گا اس کی سزادی جائے گی صحابہ کرام (رض) بڑے متفکر ہوئے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ یہ سن کر ہم سخت غم اور فکر اور رنج میں پڑ گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ اس آیت نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ ذرا سی بھی برائی ہو گی تو اس کی جزا ملے گی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ فکر میں نہ پڑو۔ اپنی طاقت اور قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو کیونکہ تمہیں دنیا میں جو بھی کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ اور برائی کی جزا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بھی کفارہ گناہ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کو دنیا میں جو بھی کوئی غم یا تکلیف یا بیماری یا فکر لاحق ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اور حضرت صدیق اکبر (رض) سے روایت ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو یہ آیت من یعمل سوٓء ایجزبہ سنائی تو ان پر یہ اثر ہوا کہ جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا کیا بات ہے؟ تو صدیق اکبر (رض) نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی برائی نہیں کی اور جب ہر برائی کی جزا ملنی ہے تو ہم میں سے کون سزا سے بچے گا؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابو بکر تم اور تمہارے مومن بھائی کوئی فکر نہ کریں کیونکہ دنیا کی تکالیف کے ذریعہ تم لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تم کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہنچتا۔ حضرت صدیق اکبر (رض) نے عرض کیا کہ بیشک یہ سب چیزیں پہنچتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بس یہی جزا ہے تمہاری سیئات کی۔ اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے روایت ہے کہ بندہ کو جو بخار یا تکلیف پہنچتی ہے یا کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے مگر دوسری جیب میں ملے تو اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

الغرض خلاصہ یہ کہ یہاں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت دی ہے کہ محض دعووں اور تمناؤں میں نہ لگیں بلکہ عمل کی فکر کریں بلکہ کامیابی صرف اس سے نہیں کہ تم فلاں نبی یا فلاں کتاب کے نام لینے والے ہو بلکہ اصل فلاح اس میں ہے کہ اس کتاب اور نبی پر صحیح ایمان اور اس کے مطابق اعمال صالحہ ہوں اور اخیر میں نجات اخروی اور دخول جنت کا قانون یہ فرمایا:۔

ومن یعمل من الصلحت۔۔ یظلمون نقیرا۔ یعنی جو مرد یا عورت نیک عمل کرے بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ ایمان بھی ہو تو وہ ضرور جنت میں جائے گا اور ان کے اعمال خیر کا بدلہ پورا پورا ملے گا جس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی۔

تو اس میں اشارہ فرمادیا کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ یا دوسرے غیر مسلم اگر ان کے اعمال نیک بھی ہوں تو چونکہ ان کا ایمان صحیح نہیں۔ اس لیے آخرت میں وہ عمل مقبول نہیں اور اہل اسلام کا چونکہ ایمان بھی صحیح ہے اور عمل بھی نیک ہے اس لیے وہ کامیاب اور دوسروں سے افضل اور نجات اخروی کے مستحق ہیں۔ تو شان نزول کا خیال کرتے ہوئے مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ میں جو مکالمہ ہوا تھا اس پر فیصلہ فرمایا گیا اور اسی سلسلے میں آگے اللہ کے نزدیک مقبول اور افضل و اعلیٰ ہونے کا ایک معیار بتلایا گیا جس سے اس کا صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کون اللہ کے نزدیک مقبول ہے اور کون مردود ہے۔

دعا کیجئے :۔ حق تعالیٰ کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہم کو اسلام و ایمان سے نوازا اور یہودی یا نصرانی ہونے سے بچایا۔ یا اللہ ہمیں ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی توفیق عطا فرما اور اپنے فضل و کرم سے اپنی جنت میں ہم کو بے حساب داخلہ عطا فرما۔ یا اللہ ہمارے دکھ درد امراض اور پریشانیوں کو باعث کفارہ سیئات بنا اور جو برائیاں اور گناہ ہم سے سرزد ہو چکے ہیں ان کی دنیا ہی میں معافی فرما کر آخرت میں پاک صاف کر کے اٹھا۔ یا اللہ ہمیں آخرت کی فکر نصیب فرما اور آخرت کا سامان مہیا کرنے کی سعادت عطا فرما اور اپنے مومن مخلص و صالحین کے لیے جس جنت کا آپ نے سچا وعدہ فرمایا ہے اس جنت میں ہم کو بھی داخلہ نصیب فرما۔ آمین !

اطاعت ورضا

یا اللہ آخرت کی کامیابی کا دار و مدار آپ کی اطاعت رضا و بندگی پر ہے نہ کہ خالی تمناؤں اور زبانی دعوؤں پر یا اللہ ہمیں ایمان کے ساتھ ان اعمال صالحہ کی بھی توفیق عطا فرما کہ جو آپ کی رضا و خوشنودی کا باعث ہوں۔ یا اللہ ہم کو تو آپ نے بہترین دین، دین اسلام اور بہترین کتاب قرآن مجید اور نبیوں میں سب سے اعلیٰ و افضل نبی جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عطا فرمائے مگر ہم نے ان انعامات کی خاطر خواہ قدر دانی نہ کی۔ یا اللہ اب ہماری آنکھیں کھول دے اور ہم کو اسلام کے تقاضے صحیح معنی میں پورے کرنے کی توفیق حسن عطا فرما دے۔ قرآن کریم کا سچا اتباع اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی نصیب فرما دے۔ یا اللہ آخرت کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ اپنی رحمت سے ہم سب کو اخروی کامیابی نصیب فرما اور اپنی دائمی جنت میں ہمارا ٹھکانا بنا۔ آمین۔ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔ (درس آسٹریلیا)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا میرے بندوں نے جنت دیکھی ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر وہ جنت دیکھ لیں؟ تو فرشتے جواباً کہتے ہیں پھر تو وہ مزید اس کی جستجو کریں گے۔ [روہ البخاری : کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللّٰہ عزوجل] (فہم)

مسائل

ا۔ ایمان دار ' صاحب کردار لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل فرمائے گا۔

۲۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے ' اس کے وعدے اور بات سے سچی بات کسی کی نہیں ہو سکتی۔

آیت مبارکہ :

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

لغۃ القرآن: [لَيْسَ : (قیامت کا معاملہ) نہیں ہے] [بِاَمَانِيِّكُمْ : تمہاری آرزؤں کے مطابق] [وَلَآ اَمَانِيِّ اَہْلِ الْكِتٰبِ : اور نہ اہل کتاب کی آرزؤں کے مطابق] [مَنْ : جو] [يَّعْمَلْ : عمل کرے گا] [سُوْٓءًا : کسی برائی کا] [صلی اللہ علیہ وسلم يُّجْزَ : تو اس کو بدلہ دیا جائے گا] [بِہٖ : اس کا] [وَلاَ يَجِدْ : اور وہ نہیں پائے گا] [لَہٗ: اپنے لیے] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ] [وَلِيًّا : کوئی کارساز] [وَّلاَ نَصِيْرًا : اور نہ کوئی مددگار]

ترجمہ: (اللہ کا وعدہ مغفرت) نہ تمہاری خواہشات پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی خواہشات پر، جو کوئی برا عمل کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی اور نہ وہ اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی پائے گا اور نہ مددگار

تشریح:

جنت محض دعوؤں ،نعروں اور کسی فرقہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ جو برائی اور شرک سے بچے گا وہی جنت کا مستحق ہوگا۔ بصورت دیگر برا شخص جنت اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے محروم رہے گا۔

قرآن مجید ایک بار پھر اپنے اسلوب بیان کا اعادہ فرماتے ہوئے دو قسم کے اعمال اور ان کے انجام کا بیک مقام موازنہ کرتا ہے تاکہ قرآن کا قاری تجزیہ کرے کہ اسے کس کردار کا انتخاب اور آخرت کی کونسی منزل کے لیے کوشش کرنی چاہیے ؟ یہ حقیقت بار بار واضح کی گئی ہے کہ کسی شخص کی نجات نعروں اور دعوؤں کی بنیاد پر نہیں ہوگی بلکہ نجات سچے ایمان اور صالح عمل پر ہوگی۔ یہاں ایک مرتبہ پھر اہل کتاب کے دعوے کی تردید کی جارہی ہے کہ نجات کا دارومدار کسی خاندانی نسبت یا محض دعویٰ محبت پر نہیں بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور شرک سے بچنا لازم ہے۔ (فہم)

یعنی اللہ کی جانب سے جس اجر عظیم اور جنت الخلد کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے تم اس طرح مستحق نہیں بن سکتے کہ کرو کچھ نہیں اور سمجھو یہ کہ سب کچھ ہمارے لیے وقف ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ یہ تو اس کو ملے گا جو سچا مومن بھی ہو اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوں۔ کیا صاف صاف بتادیا تاکہ کوئی کسی دھوکہ میں مبتلا ہو ان فرصت کے لمحات کو ضائع ہی نہ کردے۔ اب بھی اگر کوئی عمل صالح کی اہمیت کا اعتراف نہیں کرتا تو اسے خود فریب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ اہل کتاب کے ذکر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی قوم کی زندہ مثال پیش کی جارہی ہے جو صرف توقعات اور امیدوں کی آغوش کی پروردہ تھی۔ یہی ڈینگیں مارتے رہے کہ نحن ابناؤاللہ وحباء ہ اور ہمیں دوزخ کی آگ

نہیں جلائے گی اور ہم افضل ترین امم ہیں اور زندگی کے وہ سنہری لحات ضائع کر دیئے یعنی حضور رحمۃ للعالمین ﷺ کے حلقہ غلامی کے شرف سے محروم رہ گئے۔ آفتاب ہدایت طلوع ہوا زمین کے دور افتادہ تاریک ترین گوشے بھی جگمگا اٹھے لیکن ان بیہوشوں کو ہوش نہ آیا۔ اپنی برتری کے نشہ میں آنکھیں بند ہی رہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت عظمت کے تخت سے نیچے پھینک دیئے گئے۔ غلامان مصطفٰی علیہ اجمل الصلوٰۃ واطیب الثنا کو بھی بتایا جارہا ہے کہ تم ان کے نقش قدم پر نہ چلنا تمہارا بھی کہیں یہی حسرت ناک انجام نہ ہو۔ کاش اپنے آپ کو عاشقان رسول کہلانے والے اس آیت کو بار بار پڑھیں۔ دعوٰی عشق و محبت اور محبوب کی اطاعت میں سستی اور کاہلی ! ذرا غور کرو کتنی بے جوڑ سی بات ہے۔ (ضیاء)

شان نزول

حضرت ابن جریر۔ ابن ابی حاتم نے حضرت امام سدی رحمہم اللہ سے روایت کی کہ ایک دفعہ مسلمانوں اور اہل کتاب میں مناظرہ ہوا۔ یہود بولے ہمارے نبی موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے نبی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے اور افضل ہیں ہماری کتاب توراۃ تمہاری کتاب قرآن کریم سے پہلے ہے اور ہمارا قبلہ بیت المقدس تمہارے قبلہ سے پہلے ہے لہٰذا ہم جنتی ہیں خواہ کچھ بھی کریں۔ اور یہی بات عیسائیوں نے بھی کہی۔ مسلمانوں نے جواب دیا ہمارے نبی خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ ہمارا قرآن غیر منسوخ ہے ہمارا قبلہ بیت المقدس سے افضل ہے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح المعانی) اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ کا جو گمان ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے بیٹے اور دوست ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ ہے نحن ابنوا اللہ واحباؤہ۔ اس کا رد فرمایا کہ یہ تمہارے خیال باطل ہیں تم ابناء اللہ نہیں اور کوئی اس کا رشتہ دار یا ابناء اللہ ہو بھی نہیں سکتا۔ لم یلد، ولم یولد، ولم یکن لہ کفوا احد۔ اس کی صفات قدیمہ سے ہے اور بارگاہ الٰہی عزوجل ہیں جو جیسا عمل کرے گا مرد ہو یا عورت اسے اس کا بدلہ ملے گا اور بقدر نقیر بھی اس پر ظلم نہ ہو گا۔ (حسنات)

اس آیت کے سبب نزول میں تین قول ہیں

(۱) قتادہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور اہل کتاب نے ایک دوسرے پر فخر کیا 'اہل کتاب نے کہا ہمارے نبی تمہارے نبی ﷺ سے پہلے ہیں اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے نازل ہوئی لہٰذا ہم کو تم پر فضیلت ہے 'مسلمانوں نے کہا ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب تمہاری کتابوں کی ناسخ ہے اس لیے ہم افضل ہیں 'اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان ج ۴ ص ۳۹۰ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت)
(۲) مجاہد نے کہا یہ آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی ہے انھوں نے کہا تھا ہم مرکر دوبارہ اٹھیں گے نہ حساب و کتاب ہو گا 'نہ ہم و عذاب دیا جائے گا امام ابن جریر نے اس کو ترجیح دی ہے (جامع البیان ج ۵ ص ۳۹۲')
(۳) مجاہد کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا یہ قول ہے : یہود نے کہا ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا 'اگر ہمیں عذاب ہوا بھی تو صرف چند دن ہو گا 'اور نصاریٰ نے کہا ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا مشرکین عرب نے کہا : ہم مرکر دوبارہ اٹھیں گے نہ ہمیں عذاب ہو گا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (اللہ کا وعدہ) نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی خواہشوں پر۔ الآیہ (جامع البیان جز ۵ ص ۳۹۲')

ہر گناہ پر سزا ہونے کے اشکال کا جواب

اس آیت میں فرمایا ہے کہ جس نے بھی کوئی برا کام کیا اسے اس کی سزدی جائے گی اور برا کام عام ہے خواہ صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ۔
اس آیت کی دو تفسیریں ہیں
ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے گناہوں کے متعلق ہے، اس تقدیر پر یہ اشکال ہے کہ اگر ہر گناہ کی سزملے تو پھر مسلمانوں کی نجات

بہت مشکل ہو گی اس اشکال کے حسب ذیل جوابات ہیں

پہلا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں پر دنیا میں جو مصائب آتے ہیں وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت "من یعمل سوء یجزبہ" نازل ہوئی تو مسلمانوں پر یہ آیت بہت دشوار ہوئی ' اور ان کو بہت تشویش لاحق ہوئی اور انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کی شکایت کی آپ ﷺ نے فرمایا نیک عمل کر نیکی کوشش کرتے رہو 'مسلمان کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ اس (کے گناہوں) کا کفارہ ہو جاتی ہے حتی کہ اگر اس کے کوئی کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ بھی اس کے لیے کفارہ ہو جاتا ہے۔ (مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث : ۷۳۹۰ 'سنن کبری للبیہقی ج ۳ ص ۳۷۳)
حضرت ابو بکر صدیق (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عرض کیا : یا نبی اللہ ! ﷺ اس آیت کے بعد کس طرح بہتری ہو گی؟ آپ ﷺ نے پوچھا : کون سی آیت کے بعد 'عرض کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا نہ اہل کتاب کی خواہشوں کے مطابق ہو گا جو بھی برا کام کرے گا اس کو اس کی سزادی جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تم غم گین نہیں ہوتے؟ کیا تم کو مصیبت نہیں پہنچتی؟ فرمایا تمہاری برائیوں کی یہی سزا ہو جاتی ہے۔ (مسند احمد ج ا رقم الحدیث : ۷۱ '۷۰ '۶۹ '۶۸ 'سنن کبری للبیہقی ج ۳ ص ۳۷۳)
حضرت عائشہ (رض) سے بھی اسی کی مثل مثل مروی ہے۔ (مسند احمد ج ۹ رقم الحدیث : ۲۴۶۵۹ '۲۴۲۵۵)

دوسرا جواب یہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کی وجہ سے بھی گناہ مٹ جاتے ہیں اور نیک کاموں کی وجہ سے بھی برے کام مٹا دیئے جاتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :
(آیت) "ان تجتنبوا کبائر ماتنھون عنہ نکفر عنکم سیاتکم وندخلکم مدخلا کریما"۔ (النساء : ۳۱)
ترجمہ : اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہے جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے صغیرہ گناہوں کو مٹا دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کر دیں گے۔
(آیت) "ان الحسنات یذھبن السیات (ھود : ۱۱۴)
ترجمہ : بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

وضو کرنے سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ایک نماز سے دوسری نماز کے درمیان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں ایک نماز جمعہ سے دوسری نماز جمعہ کے درمیان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک پچھلے اور ایک اگلے سال کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور حج کرنے سے ساری عمر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جب مسلمان اپنے گناہوں پر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
(آیت) "وھو الذی یقبل التوبہ عن عبادہ ویعفوا عن السیات"۔ (الشوریٰ: ۲۵)
ترجمہ: وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گناہوں کو انبیاء (علیہم السلام) ،ملائکہ ،اولیاء کرام ،علماء شہداء اور نیک اولاد کی شفاعت کی وجہ سے معاف فرمادے گا۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گناہوں کو اپنے فضل محض سے بھی معاف فرمائے گا۔قرآن مجید میں بہت جگہ ہے (آیت) " یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء "وہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔
صفوان بن محرز مازنی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عمر (رض) کے ساتھ ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے جارہا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا آپ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نجوی (سرگوشی کرنا) کی کیا تفسیر سنی ہے ؟انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب کرکے اس کے اوپر (اپنی رحمت کا) پردہ رکھ دے گا اور اس کو چھپالے گا اور فرمائے گا تو فلاں گناہ کو پہچانتا ہے ؟وہ کہے گا ہاں اے میرے رب ! حتی کہ اللہ اس شخص سے اس کے تمام گناہوں کا اقرار کرالے گا ،اور وہ شخص یہ سمجھے گا کہ وہ اب ہلاک ہوگیا ،اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرا پردہ رکھا تھا ،اور آج میں تجھے بخش دوں گا پھر اس کو اس کی نیکیوں کی کتاب دی جائے گی اور رہے کافر اور منافق تو اللہ لوگوں کے سامنے فرمائے گا ان لوگوں نے اپنے رب کی تکذیب کی ،سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے (صحیح البخاری ،رقم الحدیث : ۲۴۴۱ ،۴۶۸۵ ،۶۰۷۰ ،صحیح مسلم ،رقم الحدیث : ۲۷۶۸ ،سنن ابن ماجہ ،رقم الحدیث : ۱۸۳ ،مسند احمد ج ۵ ،رقم الحدیث : ۱۶۲۰۰)
اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ آیت کفار اور مشرکین کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد مومنوں کے متعلق الگ آیت نازل فرمائی ہے: اور جن لوگوں نے حالت ایمان میں نیک کام کیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے ،نیز جب کفار کو ان کے ہر برے کام کی سزا دی جائے گی تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ کفار فروع کے مخاطب اور مکلّف ہیں اور یہی صحیح مذہب ہے۔ (تبیان)
فوائد
1۔ یہود کہتے تھے کہ ہم کو صرف چالیس، روز عذاب ہو گا بقدر مدت بچھڑے کی پوجا کے۔ عیسائی کہتے تھے کہ حضرت عیسیؑ سولی کھا گئے وہ ہمارا کفارہ ہو گیا۔ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ ہمارے بت ہم کو عذاب نہ پہنچنے دیں گے۔ان سب کی تردید کے لیے یہ آیت اتری۔

2: یعنی اے یہودیو، عیسائیو، مشرکو! تمہارا یہ عقیدہ غلط ہے کہ تمہیں کوئی گناہ مضر نہیں۔ تم میں سے جو بھی گناہ کرے گا۔ سزا پائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار احکام شرعیہ کے مکلّف ہیں عذاب اخروی کے لحاظ سے لہٰذا انھیں کفر کی بھی سزا ملے گی اور گناہوں کی بھی۔

3: اس سے معلوم ہوا کہ مدد گار نہ ہونا کفار کے لیے عذاب ہے۔ مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ بہت سے مدد گار بنادے گا۔ رب فرماتا ہے۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الخ۔ (نور)

آیت مبارکہ :

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓٮِٕكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا ﴿۱۲۴﴾

لغة القرآن: [وَمَنْ : اور جو] [يَّعْمَلْ : کرے گا] [مِنَ الصّٰلِحٰتِ : نیکیوں میں سے '] [مِنْ ذَكَرٍ : مذکر ہو] [اَوْ اُنْثٰى : یا مونث '] [وَ : اس حال میں کہ] [ہُوَ : وہ] [مُؤْمِنٌ : مؤمن ہو] [فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ] [يَدْخُلُوْنَ : داخل ہوں گے] [الْجَنَّۃَ : جنت میں] [وَلاَ يُظْلَمُوْنَ : اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا] [نَقِيْرًا : اِک تل بھر بھی

ترجمہ: اور جو کوئی نیک اعمال کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت درآنحالیکہ وہ مومن ہے پس وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی تل برابر (بھی) حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

تشریح: مومنوں کو دوبارہ تسلی دی گئی ہے کہ نیک عمل کرنے والا ایماندار خواہ مرد ہو یا عورت اسے بہترین جزا ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذات پات اور مذکر و مونث کا کوئی امتیاز نہیں۔

اعمال کا انجام ذکر کرنے کے بعد حسب معمول صالح کردار لوگوں کا صلہ بیان کرتے ہوئے مرد و زن کو تسلی دی گئی ہے کہ نیک عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ اس نے نیک عمل حالت ایمان میں کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشے گا اور اس کو جنت میں ضرور داخل فرمائے گا اور ان کے اجر و ثواب میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اسی بات کو تفصیل کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے۔

"بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صبر کرنیوالے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزے دار مرد اور روزے دار عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی

عورتیں، اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ”[الاحزاب : ۳۵]

اس آیت کریمہ نے پہلی آیت کریمہ کے مضمون کو مکمل کیا ہے۔ اس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ لیکن ایمان کا ذکر نہیں کیا۔ اور اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ اس معاملے میں کافر اور مومن اور سابقہ اہل کتاب شاید سب برابر ہیں۔ کیونکہ بات صرف عمل کی کی گئی ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔ اس میں پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی

نجات کا دارومدار

نجات کا دارومدار کسی نسبت پر نہیں ' اعمال پر ہے۔ اور یہ وہ ہمہ گیر اور انقلاب انگیز اعلان ہے جو اسلام سے پہلے اس اہمیت کے ساتھ کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ افراد اور اقوام کی پہچان ان کے حسب و نسب ' ان کی قوت و شوکت اور ان کی نسبتیں نہیں ' بلکہ حسن عمل اور حسن کردار ہے۔ یہ نہیں دیکھا جائے گا یہ شخص کون ہے ' یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا کردار کیا ہے ' اس کی صلاحیتیں کیسی ہیں۔ اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اس بنیادی شناخت میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں۔ بلکہ دونوں میں سے جو بھی اپنے آپ کو حسن عمل اور حسن کردار سے آراستہ کرے گا وہی اللہ کے ہاں نجات کا مستحق بنے گا اور مسلمان معاشرے میں اسے ہی عزت نصیب ہو گی۔ اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اس عمل کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اگر وہ شخص صاحب ایمان نہیں تو اس کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں۔ آخری پیغمبر ﷺ اور آخری کتاب آجانے کے بعد یہ ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھنے والے اس آخری پیغمبر ﷺ اور آخری شریعت پر ایمان لائیں۔ اور اگر وہ اس سے انکار کریں گے تو محض ان کا عمل ان کی نجات کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ لیکن اگر وہ ان شرائط کو پورا کر دیں تو پھر عربی اور عجمی اور کالے گورے میں کوئی تقسیم نہیں ہو گی۔ اللہ کے یہاں سب کو ایمان و عمل کا اجر ملے گا اور کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی بے انصافی نہیں ہو گی۔ (روح)

اعمال صالحہ کے لئے ایمان شرط

یہاں اس بات کو واضح کر دیا کہ اعمال صالحہ کی قبولیت کے لیے ایمان کا ہونا شرط اولین ہے۔ آپ خود دیکھئے ایک آدمی ایک قطعہ زمین کو ہموار کرتا ہے۔ اس سے جڑی بوٹی کو اکھاڑ کر باہر پھینکتا ہے۔ پھر اس کی آبپاشی کرتا ہے اور رات دن اس کی نگرانی میں مصروف رہتا ہے لیکن اس میں بیج نہیں ڈالتا۔ تو کیا اس کی طویل محنت و مشقت کا کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔ جب بیج ہی نہیں تو ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اسی طرح اگر ایمان کا تخم نہیں تو دنیا جہان کی ساری نیکیاں بے ثمر ہوں گی۔ اور اگر ذرا وقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عمل صالح ہو ہی نہیں سکتا جب تک عامل میں صفت ایمان موجود نہ ہو کیونکہ ایمان کے بغیر ہر عمل کے پیچھے کوئی پست جذبہ کارفرما ہو گا۔ مثلاً دنیاوی منفعت، شہرت، ذکر دوام وغیرہ وغیرہ۔ تو جس عمل کا محرک ایسی پست چیز ہو وہ عمل صالح نہیں کہلا سکتا۔ صرف ایمان ہی وہ قوت ہے جو ہر عمل کا رخ صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اسی نسبت کی برکت سے انسان کا ہر عمل صالح بن جاتا ہے۔ اس پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان سے عامل کی زندگی کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کی قوم اور ملک کو بھی عزت و ناموری حاصل ہوتی ہے۔ (ضیاء)

مسائل

ا۔ جنت میں داخل ہونے کے لیے مرد یا عورت کی تخصیص نہیں ہے بلکہ جو بھی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایمان دار ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس کے ساتھ ذرہ بھر بھی زیادتی نہیں ہوگی۔ یہ آیت اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان اعمال اور جزائے اعمال کے اعتبار سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے۔

2۔ نیک اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے اس لیے غیر مسلم اگر نیک عمل کریں تو بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ایمان دار نہیں ہیں اور ایمان ہی نیک اعمال کا اصل محرک ہے، لیکن برے اعمال کی سزا کے لیے کفر شرط نہیں ہے کیونکہ گناہ کرنے والا کافر ہو یا مسلمان دونوں سزا کے مستحق ہیں۔

3۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جنت میں وہ مومن داخل ہوں گے جن کے سارے اعمال نیک ہوں اور کوئی برائی نہ ہو حالانکہ ہر شخص پر قادر نہیں ہے، لہٰذا اس میں ہم عام مسلمانوں کے لیے بشارت بھی ہے کہ نیکیوں کے ساتھ اگر برائیاں بھی ہوں گی تو ایمان کی برکت اور اللہ کی رحمت سے جنت مل جائے گی کیونکہ نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔

آیت مبارکہ :

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور کون] [اَحْسَنُ : زیادہ اچھا ہے] [دِيْنًا : بلحاظ دین کے] [مِّمَّنْ : اس سے جس نے] [اَسْلَمَ : فرماں بردار کیا] [وَجْهَہٗ: اپنے چہرے کو] [لِلّٰهِ : اللہ کا] [وَ : اس حال میں کہ] [هُوَ : وہ] [مُحْسِنٌ : احسان کرنے والا ہے] [وَّاتَّبَعَ : اور اس نے پیروی کی] [مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے کی] [حَنِيْفًا : یکسو ہو کر] [وَاتَّخَذَ : اور بنایا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیم (علیہ السلام) کو] [خَلِيْلاً : دوست]

ترجمہ: اور دین اختیار کرنے کے اعتبار سے اس شخص سے بہتر کون ہو سکتا ہے جس نے اپنا رُوئے نیاز اللہ کے لیے جھکا دیا اور وہ صاحب احسان بھی ہوا، اور وہ دین ابراہیم (علیہ السلام) کی پیروی کرتا رہا جو (اللہ کے لئے) یک سو (اور) راست رو تھے، اور اللہ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا مخلص دوست بنا لیا تھا (سو وہ شخص بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی نسبت سے اللہ کا دوست ہو گیا)۔

تشریح: اس آیت کریمہ نے سابقہ آیات کے مضمون کو تکمیل کی معراج تک پہنچا دیا ہے اور اس بات کا بھی جواب دے دیا کہ تم جو آپس میں افضیلت کی بحث میں پڑے ہوئے ہو ' ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ دین کے اعتبار سے کون بہتر ہے۔ اس کی دو علامتیں بیان فرمائی ہیں '

سب سے بہتر کون؟

ایک تو یہ فرمایا کہ دین کے اعتبار سے سب سے بہتر وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل و جان سے جسم کی پوری توانائیوں کے ساتھ اس راستے پر پڑ گیا جس راستے کا نام اسلام ہے۔ اور جسے قرآن و سنت نے واضح کیا ہے۔ پھر صرف اس راستے کا مسافر ہی نہیں بنا ' بلکہ اس نے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا اور پورے اخلاص کے ساتھ وہ اللہ کی رضا کو اپنی منزل بنا کر شریعت کے سفر پر چل نکلا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ وہ شریعت پر عمل نہ تو خود ساختہ طریقے سے کرتا ہے کہ جسے شریعت سمجھ لیا ویسے عمل کر لیا ' بلکہ وہ عمل کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیتا ہے اس کا کوئی عمل سنت سے ہٹا ہوا نہیں ' اور دوسری یہ بات کہ عمل کرنے میں روایتی طریقے کا پابند نہیں کہ رواروی میں جیسے لوگ کر رہے ہیں ویسے ہی اس نے بھی کر لیا۔ جس طرح عادتاً بعض نیکیاں کر لی جاتی ہیں اسی طرح وہ بھی عادتاً بعض نیکیوں کو کر لیتا ہے لیکن اس کی اصل روح اس میں موجود نہیں ہوتی۔ یہاں اسے "محسن" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔
محسن وہ ہوتا ہے جو ہر نیکی کو صحیح طریقے کے ساتھ ساتھ اس کے آداب اور حسن کے ساتھ انجام دے۔ جسے سنت کی زبان میں "مقام احسان" کہا گیا ہے۔ جس شخص میں یہ دو علامتیں پائی جائیں کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے شریعت و سنت کا پابند اور عمل کو بدرجہ کمال انجام دینے والا اور باطن کے اعتبار سے اخلاص کا پیکر ہو۔ یہ وہ دولت ہے جو انسان کو اصل عزت و کرامت کا مستحق بناتی ہے۔ اور یہی ملت ابراہیمی کی پیروی ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا تھا اور ان کو وہ مقام عطا فرمایا تھا جو اس وقت تک کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور یہ مقام انھیں اس لیے ملا تھا کہ وہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے ہو گئے تھے۔ (روح)
جو سر تا پا اطاعت ہی اطاعت ہو۔ اور محسن کا مطلب یہ ہے ات بالحسنات تارک للسیئات یعنی اس سے نیکی ہی نیکی صادر ہو برائی کا اس سے ظہور نہ ہو۔ حنیف۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر جو اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے والا ہو۔ اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

خلیل کی تحقیق

لفظ خلیل کی تحقیق کرتے ہوئے صاحب المنار لکھتے ہیں۔ یطلق الخلیل بمعنی الحبیب او المحب لمن یحبہ اذا کانت ھذہ المحبۃ خالصۃ من کل شائبۃ بحیث لم تدع فی قلب صاحبھا موضعا لحب اخر وھو من الخلۃ ای المحبۃ والمودۃ التی تتخلل النفس و تمازجھا کما قال الشاعر :

قد تخللت مسلک الروح منی وبہ سمی الخلیل خلیلا

یعنی خلیل کا لفظ اس حبیب اور محب پر بولا جاتا ہے جس کے دل میں اپنے محبوب کی محبت یوں بس جائے کہ کسی غیر کی محبت کی گنجائش تک نہ رہے۔ خلۃ اس محبت کو کہتے ہیں جو نفس میں رچ جائے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔ اے محبوب ! جہاں جہاں میری روح ہے تیرا عشق وہاں سما گیا ہے اسی وجہ سے تو خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ محبت کا جو مقام محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمایا گیا ہے وہ اتنا بلند ہے کہ حضرت خلیل کا طائر آرزو بھی وہاں پر نہیں مار سکتا۔ وان من مراتب المحبۃ مالم تبلغہ ابہیۃ الخلیل (علیہ السلام) وھی المرتبۃ الثابتۃ لہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (روح المعانی) (ضیاء)

مشرکین عرب اور یہود و نصاری سب کے نزدیک حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بہت معزز اور مکرم تھے اور ان کے شخصیت سب کے نزدیک مسلم اور واجب القبول تھی ' حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت اور ان کی شریعت کے احکام صرف دین اسلام میں ہیں ' ختنہ کرنا ' ڈاڑھی بڑھانا ' مونچھیں کم کرنا ' زیر ناف بال مونڈنا ' ناک میں پانی ڈالنا ' غرارہ کرنا ' اور دیگر طہارت کے احکام یہ صرف دین اسلام میں ہیں ' دس ذوالحجہ کو قربانی کرنا ' حج میں احرام باندھنا ' صفا اور مردہ میں سعی کرنا ' منی میں جمرات پر شیطان کو کنکریاں مارنا ' کعبہ کا طواف کرنا یہ تمام امور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی یادگار ہیں اور صرف دین اسلام میں بہ طور عبادت کے داخل ہیں تو پھر اسلام سے اچھا اور کونسا دین ہوگا ' لہذا اسی دین کو قبول کرنا سب پر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد : اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا مخلص دوست بنالیا۔ (النساء : ۱۲۵)

قول باری ہے (واتبع ملۃ ابراہیم حنیفا واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی۔ اس ابراہیم کے طریقہ کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا) یہ آیت اس قول باری کی نظیر ہے (ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراہیم حنیفا پھر ہم نے تمہیں وحی کی یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو) یہ بات اس امر کی موجب ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مدت کی جو باتیں ثابت شدہ ہوں ہم پر ان کی پیروی لازم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سے یہ بات ضروری ہوتی جاتی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت وہی ہو جائے جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی شریعت تھی۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ لسلام کی شریعت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت میں داخل ہے۔

ہمارے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی لائی ہوئی شریعت دراصل حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی شریعت پر اضافے کی صورت ہے۔ اسی بنا پر شریعت ابراہیمی کا اتباع واجب ہے کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت میں داخل ہے اس لیے جو شخص حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت کا متبع ہوگا وہ ملت ابراہیمی کا بھی متبع کہلائے گا۔ حنیف کے مفہوم کے بارے مییں ایک قول ہے اس کے معنی مستقیم کے ہیں۔ اس لیے جو شخص استقامت کے راستے پر چلے گا وہ حنیفیت پر گامزن متصور ہوگا۔ ٹیڑھے پاؤں والے کو تفاؤل یعنی اچھا شگون لینے کے طور پر احنف کہا جاتا ہے جس طرح ہلاک خیزی کو مفارۃ (کامیابی) اور سانپ کے ڈسے ہوئے انسان کو سلیم (محفوظ، بچ جانے والا) کہا جاتا ہے۔ قول باری (واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا) کی تفسیر میں دو اقوال ہیں۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو چن لیا تھا اور اپنی سرگوشی کے لیے انھیں مخصوص کرلیا تھا یہ مرتبہ کسی اور کو عطا نہیں ہوا تھا۔ دوم یہ کہ خلیل کا لفظ خلۃ معنی حاجت سے بنا ہے۔ اللہ کا خلیل وہ ہے جو صرف اس کا محتاج ہے اور اپنی حاجتوں کے لیے صرف اس کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ اگر لفظ خلیل سے پہلا مفہوم مراد ہو تو یہ کہنا جائز ہوگا حضرت ابراہیم اللہ کے خلیل تھے اور اللہ

تعالیٰ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خلیل تھا لیکن اگر دوسرا مفہوم مراد ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خلیل قرار دینا جائز نہیں ہو گا البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اللہ کے خلیل تھے۔ (احکام القرآن)

خلیل کا معنی اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خلیل اللہ ہونے کی وجوہات

اس آیت کے پہلے جز میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی پیروی کا حکم دیا تھا ' اور اس کے بعد اس کی وجہ بیان فرمائی ہے ' کہ ابراہیم (علیہ السلام) اللہ کے خلیل ہیں اس لیے ان کی ملت کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

خلیل کا لفظ خلی سے بنا ہے ' خلی کا معنی ہے کسی چیز کو دو چیزوں میں درمیان رکھنا خلہ (بالکسر) کے معنی ہیں تلوار کی میان یا غلاف کیونکہ تلوار اس کے درمیان ہوتی ہے۔ خلہ (بالفتح) کا معنی اختلال اور پریشانی ہے اور اس کی تفسیر احتیاج کے ساتھ کی گئی ہے اور خلہ (بالضم) کے معنی ہیں محبت کیونکہ محبت نفس میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کے وسط میں ہوتی ہے ' اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا خلیل فرمایا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں صرف اللہ کے محتاج تھے یا اس لیے خلیل فرمایا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے تھے یا اللہ تعالیٰ آپ سے بہت محبت کرتا تھا ' حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ سے محبت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہر کام اور ہر بات کرنا اور ہر حال میں اس سے راضی رہنا ' اور اللہ کی آپ سے محبت کا معنی ہے آپ پر اکرام اور احسان کرنا اور دنیا اور آخرت میں آپ کی ثناء جمیل کرنا (المفردات ص ۱۵۶۔ ۱۵۵ ' مطبوعہ المکتبہ المرتضویہ ایران)
انسان کا خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت انسان کے قلب کے خلال (درمیان) میں سرایت کر جائے ' اور یہ انتہائی درجہ کی محبت ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمینوں کی ملکوت (نشانیوں) پر مطلع فرمادیا ' اور حضرت براہیم (علیہ السلام) نے ستاروں ' چاند اور سورج کی الوہیت کو ساقط الاعتبار قرار دیا اور بتوں کی عبادت کرنے کو مسترد کر دیا اور بت پرستوں کے بڑے بت کے سوا تمام بت توڑ ڈالے اور فرمایا اس بڑے بت سے پوچھو کہ ان چھوٹے بتوں کو کس نے توڑا ہے ؟ اور قوم سے فرمایا کہ افسوس تم ان کی عبادت کرتے ہو جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے اور کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے ' اور قوم نے اس کی پاداش میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالا ' اور انھوں نے اللہ کے لیے خود کو آگ میں ڈلوانا قبول کیا ' اپنے بیٹے کو قربان کیا اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کیا ' اس طرح ' اللہ کے لیے انھوں نے اپنی جان ' اپنے بیٹے اور اپنے مال کی قربانی دی ' تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنالیا ' اور ان کی اولاد میں ملک اور نبوت کو رکھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے اخلاق اور اوصاف سے کامل درجہ کے متخلق اور متصف تھے ' اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنالیا ' تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ اطاعت گذار اور بہت متواضع تھے ' قرآن مجید میں ہے : (آیت) " اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین " (البقرہ : ۱۳۱) " جب ابراہیم سے ان کے رب نے کہا اسلام لاؤ ' (اطاعت کرو) تو انھوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا " لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنالیا اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی فطرت بہت پاکیزہ تھی وہ جسمانی علائق اور ان کے تقاضوں سے مبرا تھے ' اور ان پر روحانیت کا غلبہ تھا ان کا ہر عمل اللہ کی رضا کے لیے تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کا نور جلال اور اس کا خاص فیضان ان کے تمام اعضاء اور قوی میں جذب ہو گیا تھا جیسا کہ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تہجد کی نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے اے اللہ میرے دل میں نور کر دے میری آنکھوں میں نور کر دے ' اور میرے کانوں میں نور کر دے 'اور میرے دائیں نور کر دے 'اور میرے بائیں نور کر دے اور میرے اوپر نور کر دے اور میرے نیچے نور کر دے اور میرے آگے نور کر دے اور میرے پیچھے نور کر دے اور مجھے سراپا نور کر دے۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث: ٦٣١٦) اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے تمام اعضاء اور قوی میں نور جذب ہو گیا تھا اور ان کی بشریت صیقل اور مجلی اور مصفی ہو گئی تھی 'سو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنالیا۔

علامہ قرطبیؒ نے اس بات کو اس انداز سے پیش کیا ہے

ثعلب نے کہا: خلیل کو خلیل اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ محبوب کی محبت اس کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے، اور اس میں کوئی خلل نہیں چھوتی مگر اسے بھر دیتی ہے، شاعر نے کہا:

تخللت مسلک الروح منی وبہ سمی الخلیل خلیلا:

اے محبوب! جہاں جہاں میری روح کا گزر ہے وہاں تیرا عشق سمایا ہوا ہے اس وجہ سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔

خلیل فعیل کا وزن ہے بمعنی فاعل ہے جیسے علیم بمعنی عالم ہے، بعض فرمایا: یہ معنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب ہے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے تھے اور اللہ کے محبوب بھی تھے، بعض نے فرمایا: الخلیل اختصاص کے معنی سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس نے ابراہیم کو ان کے دور میں رسالت کے لیے خاص فرمایا نحاس نے اس قول کو اختیار کیا اور فرمایا: اس پر دلیل نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قول ہے، وقد اتخذ اللہ صاحبکم خلیلا (۱) (صحیح مسلم فضائل الصحابہ، جلد ۲ صفحہ ۲۷۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھی کو خلیل بنایا، اس سے مراد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اپنی ذات ہے اور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "لوکنت متخذا خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا"۔ (۱) (صحیح مسلم، فضائل صحابہ، فضائل ابی بکر الصدیق، جلد ۲، صفحہ ۲۷۳، صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۳۸۱، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)

یعنی اگر میں کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرتا تو ابو بکر کو کرتا، اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعض صحابہ کو دین کی کسی چیز کے ساتھ خاص فرمایا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: الخلیل کا معنی محتاج ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کا معنی ہوگا وہ اللہ کی بارگاہ کے محتاج اور فقیر ہیں گویا وہ جس کو حاجت ہو، زہیر نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا:

ان اتاہ خلیل یوم مسغبۃ یقول لا غائب مالی ولا حرم:

یعنی اگر بھوک کے دن کوئی محتاج اس کے پاس آتا ہے تو وہ کہتا ہے، نہ میرا مال غائب ہے اور نہ کوئی ممانعت ہے۔

زجاج نے کہا خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت میں خلل نہ ہو، یہ جائز ہے کہ ان کو اللہ کا خلیل کہا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے محبت کی تھی اور اسے چن لیا تھا اور اس سے مکمل محبت کی تھی، اور اس اعتبار سے خلیل اللہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ اللہ کے فقیر تھے کیونکہ انھوں نے فقر و فاقہ اختیار نہیں کیا تھا مگر اللہ کے لیے، وہ اس میں مخلص تھے۔ الاختلال کا معنی فقر ہے روایت ہے کہ جب انھیں منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا اور وہ ہوا میں تھے تو جبرائیل امین ان کے پاس آئے اور کہا کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟ ابراہیم نے کہا: تجھ سے تو نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے خلت، اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مدد کرنا ہے، بعض نے فرمایا خلیل کو خلیل اس لیے کہا

گیا کہ وہ اپنے دوست سے ملنے گئے تھے جو مصر میں تھا بعض نے کہا: وہ موصل میں تھا آپ اس لیے اس کے پاس گئے تھے تا کہ اس کے پاس سے کھانا لے آئیں آپ نے اپنے ساتھی کو نہ پایا، آپ نے اپنی زنبیل میں ریت بھر لی اور گھر کی طرف چل پڑے، آپ نے وہ زنبیل رکھ دی اور خود سو گئے، گھر والوں نے اسے کھولا تو انھوں نے اس میں آٹا پایا اس نے اسے روٹی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے تیار کی، جب کھانا پیش کیا تو آپ نے پوچھا: یہ تمھیں کہاں سے ملا ہے، گھر والوں نے کہا: یہ وہی ہے جو تم اپنے مصری دوست سے لائے ہو، آپ نے فرمایا: یہ میرے خلیل یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو خلیل اللہ کہا جاتا ہے۔
اس بات کو علامہ محمد اسحاق صاحب آسٹریلیا یوں بیان کرتے ہیں:

حضرت ابراہیم کا ایک عجیب واقعہ

عبدالرزاق اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں زید بن اسلم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ زمین پر سب سے اول جبار نمرود تھا لوگ اس سے آکر کھانے کے لیے اناج مانگتے اور وہ دیتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک بار حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بھی اس سے غلہ لینے گئے جب لوگ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا تمہارا پالنہار کون ہے لوگوں نے کہا آپ (اس نے غلہ دے دیا) جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی باری آئی اور آپ پہنچے تو نمرود نے پوچھا تیرا رب کون ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میرا مالک وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و زندگی ہے نمرود نے کہا میں بھی موت و زندگی دیتا ہوں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے (اگر تجھے رب ہونے کا دعویٰ ہے تو) تُو اس کو مغرب کی طرف سے لے آ۔ یہ بات سن کر وہ منکر خدا لاجواب ہو گیا اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو بغیر اناج دیئے واپس کر دیا ' واپسی میں آپ کا گزر خاکستری رنگ کے ایک ریت ٹیلے کی طرف سے ہوا آپ نے سوچا کہ گھر والوں کو بہلانے کے لیے مجھے یہی ریت کچھ لے لینا چاہیے تا کہ میرے پہنچتے ہی ان کو مایوسی نہ ہو (رات گزرنے کے بعد صبح ہو گی تو دیکھا جائے گا) یہ سوچ کر آپ نے کچھ ریت لے لی اور گھر پہنچ کر سامان اتار کر رکھ دیا اور سو گئے (رات میں) بیوی نے اٹھ کر سامان کھولا تو اندر سے اعلیٰ قسم کا غلہ نکلا ' اس نے فوراً اس میں سے کچھ لے کر کھانا تیار کیا اور ابراہیم (علیہ السلام) کے سامنے لے آئی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جس وقت گئے تو گھر میں کچھ کھانا نہیں تھا اب کھانا سامنے آیا تو پوچھا یہ کہاں سے تیار کیا گیا بیوی نے کہا اسی غلہ سے تیار کیا گیا ہے جو آپ لے کر آئے تھے اس وقت آپ سمجھ گئے کہ یہ اللہ نے عطا فرمایا ہے اس پر اللہ کا شکر کیا۔
بعض نے فرمایا: آپ نے کفار کے روساء کی مہمان نوازی کی اور انھیں تحائف دیئے اور ان سے حسن سلوک کیا، روساء نے پوچھا تمہاری کیا حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: میری حاجت یہ ہے کہ تم سجدہ کرو، انھوں نے سجدہ کیا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے اللہ! میرے لیے جو ممکن تھا وہ میں نے کر دیا اب تو وہ کر جو تیری شان کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں اسلام قبول کرنے کی توفیق دی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنا لیا، کہا جاتا ہے جب ملائکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس انسانوں کی شکل میں وٓئے اور آپ ان کے لیے بھونا ہوا موٹا بچھڑا لائے تو انھوں نے اسے نہ کھایا اور کہا؛ ہم بغیر قیمت کے کوئی چیز نہیں کھاتے، آپ نے انھیں فرمایا: اس کی قیمت دو اور کھاؤ، انھوں نے پوچھا: اس کی قیمت کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی ابتدا میں تم بسم اللہ کہو اور اس کے آخر میں الحمد للہ کہو فرشتوں نے آپس میں کہا: اللہ تعالیٰ کو اس کو اپنا خلیل بنانا چاہیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا خلیل بنا دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنایا، کیونکہ وہ کھانا کھلاتے تھے اور اسلام پھیلاتے تھے اور رات کو نماز پڑھتے تھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے تھے "
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے جبرائیل! اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل کیوں بنایا؟ اے پیارے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھانا کھلانے کی وجہ سے (۱) (شعب الاایمان، باب اکرام الضیف، جلد ۷ صفحہ ۹۸)
بعض نے فرمایا: خلیل وہ ہوتا ہے جو اللہ کے لیے دوستی رکھتا ہے اور اللہ کے لیے دشمنی رکھتا ہے، دو آدمیوں کے درمیان خلت کا مطلب دوستی ہے یہ تخلل الاسرار بین المتخالین "سے مشتق ہے، بعض نے فرمایا: یہ الخلۃ سے ہے دونوں دوستوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حاجت پوری کرتا ہے۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: الرجل علی خلیلہ فلینظر احدکم من یخالل "۔ (۲) (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد ۲، صفحہ ۳۰۸)
انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:
من لم تکن فی اللہ خلتہ فخلیلۃ منہ علی خطر:
جس کی دوستی اللہ کی رضا کے لیے نہیں اس کا دوست اس سے خطرے میں ہے۔
ایک اور شاعر نے کہا:
اذاماکنت متخذ اخلیلا فلا تثقن بکل اخی اخاء:
فان خیرت بینھم فالصق باھل العقل منھم والحیاء:
فان العقل لیس لہ اذا ما تفاضلت الفضائل من کفائ:
جب تو کسی کو خلیل بنانے والا ہو تو ہر بھائی چارہ رکھنے والے پر وثوق نہ کر، جب تو ان میں سے چناؤ کرے تو ان میں اہل عقل اور حیاداروں کا چناؤ کر، کیونکہ عقل کا کوئی ہم پلہ نہیں جب فضائل کا مقابلہ ہوتا ہے۔
حضرت حسان (رض) نے کہا تھا:
اخلاء الرجل ھم کثیر ولکن فی البلاء ھم قلیل:
فلا تغررک خلۃ من تواخی فمالک عند نائبۃ خلیل:
وکل اخ یقول انا وفی ولکن لیس یفعل مایقول:
سوی کل لہ حسب ودین فذاک لما یقول ھو المفعول:
مردوں کے دوست بہت ہوتے ہیں لیکن مصیبت میں وہ کم ہوتے ہیں۔ جس کو تو بھائی بنائے ہوئے ہے اس کی دوستی تجھے دھوکے میں نہ ڈالے، تیرا مال مصیبت کے وقت خلیل ہوتا ہے، ہر بھائی کہتا ہے کہ میں وفادار ہوں لیکن جو وہ کہتا ہے کرتا نہیں ہے، سوائے اس دوست کے جو حسب والا اور دین دار ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اسے کرنے والا ہوتا ہے۔ (قرطبیؒ)
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خلیل اللہ اور آپ کا حبیب اللہ ہونا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں اور حبیب کا مرتبہ خلیل سے زیادہ ہے'۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب بیٹھے ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتظار کر رہے تھے 'آپ تشریف لائے 'ان کے قریب پہنچے وہ بیٹھے ہوئے انبیاء (علیہم السلام) کا ذکر کر رہے تھے 'ان میں سے بعض نے کہا کس قدر حیرت کی بات ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنایا 'دوسرے نے کہا اس سے بھی زیادہ حیرت اس پر ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ نے اپنا کلیم بنایا 'ایک اور نے کہا عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں 'اور دوسرے نے کہا آدم کو اللہ نے صفی بنایا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے پاس آئے ان کو سلام کیا اور فرمایا میں نے تمہارا کلام سنا اور تمہارے تعجب کرنے پر مطلع ہوا 'بیشک ابراہیم اللہ کے خلیل ہیں اور وہ اسی طرح ہیں 'اور موسیٰ اللہ کے نجی ہیں (جن سے اللہ نے سرگوشی میں بات کی) اور وہ اسی طرح ہیں اور عیسیٰ اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں 'اور وہ اسی طرح ہیں اور آدم اللہ کے صفی ہیں اور وہ اسی طرح ہیں 'سنو! میں اللہ کا حبیب ہوں اور فخر نہیں اور میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا ہوں گا اور فخر نہیں ہے 'اور میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا 'اللہ میرے لیے جنت کو کھولے گا اور میرے ساتھ فقراء مومنین داخل ہوں گے اور فخر نہیں اور فخر نہیں اور میں تمام اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ عزت والا ہوں اور فخر نہیں۔ (سنن ترمذی 'رقم الحدیث: ۳۶۳۶)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور موسیٰ کو نجی بنایا اور مجھے حبیب بنایا پھر اللہ نے فرمایا مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم میں اپنے حبیب کو اپنے خلیل اور اپنے نجی پر فضیلت دوں گا۔ (شعب الایمان 'رقم الحدیث: ۱۴۹۴)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام خلت کا فرق:

ان دونوں حدیثوں کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے ترمذی کی سند میں زمعہ بن صالح جندی اور بیہقی کی سند میں مسلمہ بن علی کو بعض ائمہ نے ضعیف کہا ہے لیکن فضائل میں ان کی روایت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شان نبی کریم ﷺ خلیل سے بھی بلند

محققین کی رائے یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی خلیل ہونے کا مقام حاصل ہے۔آپ کا مرتبہ اپنے جد کریم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے مقام سے بہت بلند ہے 'حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی نشانیاں دکھائیں اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آسمان وزمین کے علاوہ خود اپنی ذات کا بے حجاب دیدار کرایا 'حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ کی صفات سے متصف تھے اور آپ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے مظہر تھے 'قرآن مجید آپ کا خلق تھا 'حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی مغفرت کی دعا کی: اور جس سے مجھے امید ہے کہ وہ قیامت کے دن میری (ظاہری) خطا معاف فرمائے گا (الشعراء: ۸۲) اور بغیر دعا اور طلب کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی بظاہر خطاؤں کی مغفرت کا اعلان کر دیا۔ (الفتح: ۲) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا کی مجھے حشر کے دن شرمندہ نہ کرنا (الشعراء: ۸۷) اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اللہ تعالیٰ نے بغیر دعا اور طلب کے فرمایا: حشر کے دن اللہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو کیا شرمندہ ہونے دے گا؟۔ (التحریم: ۸)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا کی میرے بعد آنے والوں میں میرا ذکر جمیل جاری رکھنا (الشعراء ۸۴) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے از خود فرمایا اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند کر دیا (الانشراح : ۴) یہ سب خلیل ہونے کے آثار ہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے حبیب ہیں اور حبیب ہونے آثار کا کون احاطہ کر سکتا ہے ' آپ تمام انبیاء اور رسل کے قائد ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں آپ کی رضا اللہ کی رضا ہے ' آپ کا حکم ' اللہ کا حکم ہے۔ آپ کی اطاعت ' اللہ کی اطاعت ہے۔ حشر کے دن آپ کی عزت دیکھنے والی ہو گی جب تمام نبیوں اور رسولوں کو آپ کی حاجت ہو گی ' جب آپ مقام محمود پر فائز ہوں گے اور آپ اس وقت اللہ سے گنہگاروں کی شفاعت کریں گے جب بہ شمول نبیوں اور رسولوں کے کسی کو اللہ سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کے خلیل و حبیب

یہ یاد رہے کہ تمام انبیاء (علیہ السلام) کے جو کمالات ہیں وہ سب کے سب سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاصل ہیں۔ حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ عَزَّوَجَلَّ کے خلیل بھی ہیں جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا خلیل بنایا اسی طرح مجھے بھی اپنا خلیل بنایا ہے۔

(مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب النہی عن بناء المساجد علی القبور۔۔ الخ، ص ۲۷۰، الحدیث : ۲۳ (۵۳۲))

اور اس سے بڑھ کر اللہ عَزَّوَجَلَّ کے حبیب بھی ہیں جیسا کہ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ : میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کا حبیب ہوں اور یہ فخراً نہیں کہتا۔

(ترمذی، کتاب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ا۔ تابع باب، ۵/۳۵۴، الحدیث : ۳۶۳۶)

خلیل اور حبیب کا فرق

بزرگانِ دین نے خلیل و حبیب کے فرق کو یوں بیان فرمایا ہے۔

(1)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے قیامت کے دن رسوائی سے بچنے کی دعا مانگی۔ (سورۃ الشعراء : ۸۷)

جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے صدقے ان کے صحابہ (رض) کو قیامت کی رسوائی سے بچانے کا مژدہ سنایا۔ (سورۃ التحریم : ۸)

(2)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے رب تعالیٰ سے ملاقات کی تمنا کی۔ (سورۃ الصافات : ۹۹)

جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خود بلا کر شرف ملاقات سے سرفراز فرمایا۔

(سورۃ بنی اسرائیل : ۱)

(3)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ہدایت کی آرزو فرمائی۔ (سورۃ الصافات : ۹۹)

اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا : اور تمہیں سیدھی راہ دکھا دے۔ (سورۃ الفتح : ۲)

(4)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس فرشتے معزز مہمان بن کر آئے۔ (سورۃ الذاریات: ۲۴)
اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیلیئے رب تعالیٰ نے فرمایا: فرشتے ان کے لشکری وسپاہی بنے۔
(سورۃ التوبہ: ۱۰، ال عمران: ۱۲۵، التحریم: ۴)
(5)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی امت کی مغفرت کی دعا مانگی۔ (سورۃ ابراہیم: ۴۱)
اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ: اپنی امت کی مغفرت مانگو۔ (سورۃ محمد: ۱۹)
(6)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بعد والوں میں اپنا ذکر جمیل باقی رہنے کی دعا کی۔ (الشعراء: ۸۴)
اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خود ربِّ کریم عَزَّوَجَلَّ نے ارشاد فرمایا: اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔ (الم نشرح: ۴)
(7)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے واقعے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انھوں نے قوم لوط سے عذاب دور کئے جانے میں بہت کوشش کی۔
(ہود: ۷۴، ۷۶۔ عنکبوت: ۳۲)
اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ربِّ غفّار عَزَّوَجَلَّ نے ارشاد فرمایا: اللہ ان کافروں پر بھی عذاب نہ کرے گا جب تک اے رحمت عالم تو ان میں تشریف فرما ہے۔ (انفال: ۳۳)
(8)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کی: اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔ (ابراہیم: ۴۰)
اور حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ماننے والوں سے اللہ ربُّ العٰلمین عَزَّوَجَلَّ نے ارشاد فرمایا: تمہارا رب فرماتا ہے مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ (المومن: ۶۰)
(فتاوی رضویہ، ۳۰/۱۷۸۔ ۱۸۲، ملخصاً)
یہاں ایک اور پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہئیے وہ یہ کہ

امت کے اعمال اور کمال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعمال و کمال ہیں

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا اس کو اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ہوگا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی ثواب ہوگا جو اس طریقہ پر چلیں گے مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا کہ نیکی کا راستہ بتانے والا بھی نیکی کرنے والے کی طرح ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امت کے اعمال اور کمالات کا شمار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعمال اور کمالات میں ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے لیے اور اپنی امت کے لیے ان تفصیلی کمالات کو طلب کرنے کے لیے ہی دعا کی تھی اللھم صلی علی محمد و علی ال محمد کما صلیت علیٰ ابراہیم و علی ال ابراہیم اللہ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور ہزار برس کے بعد یہ مقام حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو عنایت فرمایا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام

ترمذی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابراہیم (علیہ السلام) خلیل اللہ تھے اور واقع میں وہ ایسے ہی تھے (لیکن) سن لو کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور (یہ) فخر نہیں ہے (اظہار واقعہ ہے) سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہو گی اور (یہ) فخر نہیں ہے اور سب سے پہلے میں ہی جنت کی زنجیر ہلاؤں گا اور اللہ اس کو کھول کر مجھ کو اندر داخل فرمائے گا اس وقت میرے ساتھ فقراء مومنین بھی ہوں گے اور (یہ) فخر نہیں ہے اور میں قیامت کے دن تمام اگلوں پچھلوں سے زیادہ معزز ہوں گا اور (یہ) فخر نہیں ہے۔ ابن جریر اور طبرانی نے حضرت ابن عباس (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کو خلت کے لیے اور موسیٰ کو کلام کے لیے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیدار کے لیے چن لیا۔

امت محمدیہ کی مثال

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا میری امت کی حالت بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخر حصہ یا باغ کی طرح ہے جس سے ایک سال ایک جماعت کو اور دوسرے سال دوسری جماعت کو کھانے کو ملتا ہے ہو سکتا ہے کہ دوسرے سال والی جماعت پہلی جماعت سے زیادہ فراخ اور وسیع رزق والی اور اس سے زیادہ خوش حال ہو۔ رواہ رزین من حدیث جعفر بن محمد۔
عمل کے مقبول ہونے کی شرطیں :

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں

اخلاص اور حسن عمل اور حسن عمل نام ہے اتباع سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اس لیے اخلاص کے ساتھ حسن عمل کرنے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس عمل کو کس طرح کیا ہے اور اس کے متعلق کیا ہدایتیں دی ہیں، ہمارا جو عمل سنت کے طریقہ سے ہٹے گا نامقبول ہو گا نماز روزہ حج زکوۃ صدقات و خیرات اور ذکر اللہ اور درود و سلام سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس عمل کو کس طرح انجام دیا اور کس طرح کرنے کے لیے ارشاد فرمایا ہے آخر آیت میں اخلاص اور حسن عمل کی ایک مثال حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کی پیش کر کے ان کے اتباع کا حکم دیا گیا اور واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ حضرت خلیل کے اس مقام بلند کا سبب یہی ہے کہ وہ مخلص بھی اعلیٰ درجے کے تھے اور ان کا عمل بھی باشارت خداوندی صحیح اور درست تھا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خطبہ

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آخری خطبہ میں فرمایا تھا، لوگو، اگر میں زمین میں سے کسی کو خلیل اور ولی دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکر بن ابو قحافہ کو بناتا بلکہ تمہارے ساتھی (محمد) خدا کے خلیل ہیں (بخاری و مسلم)۔

ابراہیم (علیہ السلام) کی ملک الموت سے گفتگو

ابن ابی حاتم میں ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عادت تھی کہ مہمانوں کے ساتھ کھائیں۔ایک دن آپ مہمان کی جستجو میں نکلے لیکن کوئی نہ ملا واپس آئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہوا ہے پوچھا اے اللہ کے بندے تجھے میرے گھر میں آنے کی اجازت کس نے دی؟ اس نے کہا اس مکان کے حقیقی مالک نے، پوچھا تم کون ہو؟ کہا میں ملک الموت ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں اسے یہ بشارت سنا دوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا خلیل بنالیا ہے، یہ سن کر حضرت نے کہا پھر تو مجھے ضرور بتایئے کہ وہ بزرگ کون ہیں؟ اللہ عزوجل کی قسم اگر وہ زمین کے کسی دور کے گوشے میں بھی ہوں گے میں ضرور جا کر ان سے ملاقات کروں گا پھر اپنی باقی زندگی ان کے قدموں میں ہی گزاروں گا یہ سن کر حضرت ملک الموت نے کہ وہ شخص خود آپ ہیں۔آپ نے پھر دریافت فرمایا کیا سچ مچ میں ہی ہوں؟ فرشتے نے کہا ہاں آپ ہی ہیں۔آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ آپ مجھے یہ بھی بتائیں گے کہ کس بنا پر کن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا خلیل بنایا؟ فرشتے نے فرمایا اس لیے کہ تم ہر ایک کو دیتے رہتے ہو اور خود کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حالت خوف

صحیح حدیث میں جناب رسول ﷺ کی نسبت بھی وارد ہے کہ جس وقت خوف خدا آپ ﷺ پر غالب آجاتا تھا تو آپ کے رونے کی آواز جسے آپ ﷺ ضبط کرتے تھے اس طرح دور و نزدیک والوں کو سنائی دیتی تھی جیسے کسی ہنڈیا کی کھدبدی کی آواز ہو۔ (گلدستہ)

فوائد

1: وجہ کے لفظی معنی چہرہ کے ہیں۔ مگر یہاں مراد ذات ہے۔ کیونکہ کسی کے آگے سر جھکا دینا گویا اپنی ذات کو اس کے سپرد کر دینا ہے۔

2: یعنی اعمال بھی نیک کرے۔ اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ ایمان کے بعد انسان نیک اعمال سے بے نیاز نہیں ہو جاتا۔ حتی المقدور نیکی کرنی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ایمان اعمال سے پہلے ہے۔ اس لیے محسن کو اسلم وجھہ کے بعد بیان کیا۔

3: اس سے معلوم ہوا کہ اب دین محمدی میں پائی جاتی ہے۔ اس سے منہ موڑ کر صدقہ و خیرات وغیرہ سب برباد ہے۔ جب جڑ کٹ گئی ہو تو شاخوں کو پانی دینا عبث ہے۔

4: خلت کے معنی ہیں غیر سے منقطع ہو جانا۔ اب اس گہری دوستی کو کہا جاتا ہے۔ جس میں دوست کے غیر سے انقطاع ہو جاوے۔ خلیل وہ ہے کہ اللہ کی رضا چاہے۔ محبوب و حبیب وہ ہے جس کی خود رب تعالیٰ رضا چاہے۔ ہمارے حضور اللہ کے خلیل بھی ہیں حبیب بھی ہیں۔ رب فرماتا ہے ولسوف یعطیک ربک فترضی۔

آیت مبارکہ :

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿١٢٦﴾ع

لغۃ القرآن: [وَلِلّٰهِ : اور الله ہی کے لیے ہے] [مَا : وہ ٗجو] [فِی السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے] [وَمَا : اور وہ ٗجو] [فِی الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَکَانَ : اور ہے] [اللّٰہُ : الله] [بِکُلِّ شَیْءٍ : ہر چیز کا] [مُّحِیْطًا : احاطہ کرنے والا]

ترجمہ: اور (سب) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔

تشریح:

قرآن کریم میں جہاں یہ بات آتی ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی الہ ہے تو اس کے ساتھ یہ بات بھی آتی ہے کہ وہی مالک اور نگہبان بھی ہے۔ (ملک۔ مہیمن) یعنی وہی بادشاہ اور کنڑول کرنے والا ہے۔ پس اسلام کا نظریہ توحید صرف یہ نہیں ہے کہ ذات میں اللہ وحدہ لاشریک ہے بلکہ وہ مثبت توحید ہے اور اس کائنات میں فاعل اور موثر بھی وہی ہے اور حکومت اور نگہبانی بھی اسی کی ہے۔

جب نفس انسانی کے اندر یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ زمین و آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور وہ ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ کوئی چیز خدا کے علم اور اس کی سلطنت سے باہر نہیں ہے ٗتو اس طرح ایک انسان اس امر پر بسہولت آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کو ایک الہ اور حاکم تسلیم کرے اور صرف اسی کی بندگی کرے اور پھر اللہ کو راضی کرنے کی سعی کرے اور اللہ کے احکام کو تسلیم کرے۔ اس لیے کہ سب کچھ اس کا ہے ٗاس کے قبضے میں ہے اور وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ (ظلال)

اللہ عَزَّوَجَلَّ ہر شے کو محیط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا علم اور قدرت ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور کسی شے کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں وہ تمام کے تمام اللہ عَزَّوَجَلَّ کے علم میں ہیں کوئی اس سے خارج نہیں۔

اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنایا ہے 'اس آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ نے اس لیے خلیل نہیں بنایا کہ اس کو کسی خلیل کی حاجت تھی جس طرح دنیا میں لوگ اپنی ضرورت کی وجہ سے کسی کو دوست بناتے ہیں 'اور اللہ کو کیا ضرورت ہو گی کہ وہ کسی کو دوست بنائے جب کہ آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اللہ کی ملکیت میں ہے 'نیز اس پوری سورت میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی اطاعت اور اس کی بندگی کریں اور لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں جس کی قدرت کامل ہو اور کوئی شخص اس کی گرفت اور پکڑ سے باہر نہ ہو سکے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں جس کا علم کامل ہو اور کسی شخص کا کوئی کام اس کے علم سے مخفی نہ ہو سکے 'اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کو بیان کرنے کے لیے فرمایا آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے اور کمال علم کو بیان کرنے کے لیے فرمایا اللہ ہر چیز کو محیط ہے سو جب وہی علم اور قدرت میں کامل ہے تو اس کے سوا اور کوئی اطاعت اور عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ (تبیان)

سب کے اعمال کا بدلہ دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

وکان اللہ بکل شی محیطا. اور اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے مگر اس کا احاطہ ہر کیفیت سے پاک ہے۔

مطلب یہ کہ کوئی چیز اپنی ہستی مستقل اور خود بخود نہیں رکھتی بلکہ باری تعالیٰ کی ہستی سے وابستہ ہے اسی کی محتاج ہے کسی کا وجود ذاتی نہیں ہر چیز کے تمام صفات وافعال اور خود اس کی ذات اللہ کی مہربانی اور فضل کی ممنون ہے لہٰذا کسی کے لیے جائز نہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا رخ کرے۔ اللہ کے محیط ہونے کا معنی اس کے علم وقدرت کا محیط ہونا بھی بعض علماء نے بیان کیا ہے یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر اور قدرت محیط کل ہے لہٰذا وہ لوگوں کو اعمال کے موافق بدلہ دے گا نیکی کا بدلہ اچھا اور برائی کا بدلہ برا۔ واللہ اعلم۔ (مظہری)

آیت مبارکہ :

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿١٢٧﴾

لغۃ القرآن: [وَيَسْتَفْتُوْنَکَ : اور یہ پوچھتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے] [فِي النِّسَآءِ : عورتوں کے بارے میں] [قُلِ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہیے] [اللّٰهُ : اللہ] [يُفْتِيْكُمْ : بتاتا ہے تم کو] [فِيْهِنَّ : ان عورتوں کے بارے میں] [وَمَا : اور جو] [يُتْلٰى عَلَيْكُمْ : پڑھ کر سنایا گیا تم کو] [فِي الْكِتٰبِ : اس کتاب میں] [فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ : ایسی عورتوں کے یتیموں کے بارے میں] [لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ : تم نہیں دیتے جن کو] [مَا : وہ جو] [كُتِبَ : فرض کیا گیا] [لَهُنَّ : ان کے لیے] [وَ : اور (یعنی پھر بھی)] [تَرْغَبُوْنَ : رغبت رکھتے ہو] [اَنْ : کہ] [تَنْكِحُوْهُنَّ : تم نکاح کرو ان سے] [وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ : اور لڑکوں میں سے کمزوروں کے بارے میں] [وَاَنْ : اور یہ کہ] [تَقُوْمُوْا : تم قائم رہو] [لِلْيَتٰمٰى : یتیموں کے لیے] [بِالْقِسْطِ : انصاف پر] [وَمَا : اور جو] [تَفْعَلُوْا : تم کرو گے] [مِنْ خَيْرٍ : کوئی بھی بھلائی] [فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [بِهٖ : اس کو] [عَلِيْمًا : جاننے والا]

ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) لوگ آپ سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ آپ فرمادیں کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور جو حکم تم کو (پہلے سے) کتاب مجید میں سنایا جارہا ہے (وہ بھی) ان یتیم عورتوں ہی کے بارے میں ہے جنہیں تم وہ (حقوق) نہیں دیتے جو ان کے لیے مقرر کئے گئے ہیں اور چاہتے ہو کہ (ان کا مال قبضے میں لینے کی خاطر) ان کے ساتھ خود نکاح کرلو اور نیز بے بس بچوں کے بارے میں (بھی حکم) ہے کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہا کرو، اور تم جو بھلائی بھی کروگے تو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔

تشریح: قرآن کریم کی ترتیب میں اللہ تعالیٰ کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے چند احکام بیان فرماتا ہے ' پھر ان احکام کے عمل پر اجر و ثواب کی بشارت دیتا ہے اور ان احکام کی معصیت کرنے پر عذاب کی وعید سناتا ہے ' اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے علم اور قدرت کی کبریائی بیان فرماتا ہے تاکہ واضح ہو کہ کسی کی معصیت اس کے علم سے باہر نہیں اور اس پر گرفت اس کی قدرت سے خارج نہیں ' پھر اس کے بعد دوبارہ ان احکام کا بیان شروع فرما دیتا ہے اور اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے ' کہ مسلسل ایک ہی قسم کی عبارت سے بعض اوقات قاری کا ذہن اکتا جاتا ہے اس لیے قاری کے ذہن کو اکتاہٹ ' غفلت اور بے توجہی سے دور رکھنے اور اس کے ذہن کو بیدار ' اس کے ذوق و شوق کو تازہ اور اس کی توجہ کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کلام میں تنوع ہو اور ایک مضمون کو مختلف پیرایوں سے بیان کا جائے ' اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور یتیم بچوں کے حقوق کو بیان فرمایا تھا ' پھر اس کے بعد اور مختلف نوعیت کے احکام بیان فرمائے وعد اور وعید ' ترغیب اور ترہیب اور اپنی عظمت اور کبریائی کے متعلق آیات نازل فرمائیں اس کے بعد اب بھی عورتوں کے حقوق کے متعلق احکام بیان فرما رہا ہے۔

شانِ نزول

زمانہِ جاہلیّت میں عرب کے لوگ عورت اور چھوٹے بچوں کو میت کے مال کا وارث قرار نہیں دیتے تھے۔ جب آیت میراث نازل ہوئی تو انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا عورت اور چھوٹے بچے وارث ہوں گے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اس آیت سے جواب دیا۔ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا کہ یتیموں کے اولیاء کا دستور یہ تھا کہ اگر یتیم لڑکی صاحب مال و جمال ہوتی تو اس سے تھوڑے مہر پر نکاح کر لیتے اور اگر حسن و مال نہ رکھتی تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر حسن صورت نہ رکھتی اور ہوتی مالدار تو اس سے نکاح نہ کرتے اور اس اندیشہ سے دوسرے کے نکاح میں بھی نہ دیتے کہ وہ مال میں حصہ دار ہو جائے گا اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرما کر انھیں ان عادتوں سے منع فرمایا۔

(خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱۲۷، ۱/۴۳۵)

سعید بن جبیر اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں

زمانہ جاہلیت میں صرف بالغ مرد وارث ہوتا تھا ' نابالغ بچہ وارث نہیں ہوتا تھا اور نہ عورت وارث ہوتی تھی ' جب سورۃ نساء کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور بچوں کے حقوق کے متعلق آیات نازل فرمائیں تو یہ مسلمانوں پر شاق گزریں انھوں نے کہا جو یتیم بچہ مال کما سکتا ہے نہ مال کی حفاظت کر سکتا ہے ' اور عورت بھی مال کما سکتی ہے نہ اس کی حفاظت کر سکتی ہے ' یہ دونوں کیسے مال کے وارث بنائے جائیں گے ان کو یہ امید تھی کہ شاید یہ حکم منسوخ ہو جائے گا اور اس کے متعلق کوئی اور حکم نازل ہو جائے گا ' پھر جب انھوں نے دیکھا کہ اور کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا تو انھوں نے کہا لگتا ہے یہ حکم واجب ہے اور اس پر عمل کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ' پھر انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی : اور (مسلمان) آپ سے عورتوں کے متعلق حکم معلوم کرتے ہیں آپ کہئے کہ اللہ تمہیں عورتوں کے متعلق (وہی سابق) حکم دیتا ہے۔ الایہ۔

سعید بن جبیر نے کہا اگر عورت خوب صورت اور مال دار ہوتی تو اس کا سرپرست اس میں رغبت کرتا اور اس سے نکاح کر لیتا اور جب وہ خوب صورت نہ ہوتی تو وہ اس سے نکاح نہ کرتا اور کسی اور سے بھی اس کا نکاح نہ کرتا بلکہ نکاح کرنے سے منع کرتا کہ کہیں کوئی اور شخص اس کے مال کا وارث نہ بن جائے۔ بعض روایات میں ہے وہ اس کو تاحیات نکاح نہیں کرنے دیتے تھے۔ (جامع البیان جز ۵ ص ۴۰۵۔ ۴۰۴ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت)

فتوی کا معنی اور اس کے تقاضے اور مسائل

اس آیت میں استفتاء اور افتاء کا لفظ استعمال ہوا ہے 'استفتاء کا معنی ہے فتوی معلوم کرنا 'اور فتاء کا معنی ہے فتوی دینا 'فتوی کا لفظ فتی سے ماخوذ ہے 'فتی کا معنی ہے جوان آدمی 'اور جوان آدمی قوی ہوتا ہے اس لیے فتوی کا معنی ہے قوی حکم۔

اس آیت میں مذکور ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فتوی معلوم کیا اور فتوی اللہ تعالیٰ نے دیا۔ سوال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کیا گیا اور اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا 'اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کرنا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا ہے 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ معاملہ اللہ کے ساتھ معاملہ ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں 'اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فتوی دیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو مفتی کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے افعال کے اطلاق سے مشتقات کا اطلاق لازم نہیں آتا مثلاً علم کا اطلاق معلم کے اطلاق کو مستلزم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات سماع شرع پر موقوف ہیں جن اسماء صفات کا قرآن مجید اور احادیث میں اطلاق آگیا ہے ان ہی کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا جائز ہے۔ از خود اللہ تعالیٰ پر کسی اسم صفت کا اطلاق کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اسم ذات کا اطلاق کرنا جائز ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو خدا کہہ سکتے ہیں۔

فتوی میں جب کسی سوال کا جواب ذکر کیا جائے تو اگر اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت مل جائے تو پہلے اس کو ذکر کیا جائے۔ پھر حدیث شریف کو ذکر کیا جائے اور اس کے بعد آثار صحابہ اور اپنے امام کا قول ذکر کیا جائے 'ہمارے زمانہ میں مفتی حضرات بعض اردو یا عربی کی فقہ کی کتابوں کی عبارات کو نقل کر دینا فتوی کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ یہ درحقیقت مفتی نہیں ہیں بلکہ ناقل مذہب ہیں اگر یہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرنے کے بعد امام کا قول ذکر کریں گے تو لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے امام کا قول محض رائے اور قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ پر مبنی ہے اور تب ہی یہ واضح ہوگا کہ یہ قوی جواب ہے اور صحیح معنی میں فتوی کا مصداق ہے۔

پیش آمدہ مسائل میں اہل علم سے رجوع کر کے فتوی لینا اور اس مسئلہ کا حل معلوم کرنا قرآن مجید 'احادیث صحیحہ اور صحابہ وتابعین کے تعامل سے ثابت ہے 'قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون"۔ (النحل: ۴۳)

ترجمہ: سو اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے سوال کرو۔

یتیم لڑکیوں کے حقوق کا بیان

اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے جس حق کا ذکر کیا گیا ہے اس حق کے متعلق دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کی میراث ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کا مہر ہے ' اور اس آیت کے مخاطبین کے متعلق بھی دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کے سرپرست ہیں وہ عورتوں کے مہر پر خود قبضہ کر لیتے تھے اور ان عورتوں کو ان کا مہر نہیں دیتے تھے ' دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یتیم لڑکی کا ولی ہے جب وہ اس یتیم لڑکی سے نکاح کرتا تھا تو اس کے مہر میں انصاف نہیں کرتا تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم ان سے نکاح کی رغبت رکھتے ہو ' حضرت عائشہ (رض) نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ تم ان یتیم لڑکیوں کے حسن و جمال اور ان کے مال و دولت کی وجہ سے ان کے ساتھ نکاح کرنے میں رغبت رکھتے ہو ' اور حسن نے اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ تم ان کی بدصورتی کی وجہ سے ان کے ساتھ نکاح میں رغبت نہیں رکھتے اور ان کے مال و دولت میں رغبت کی وجہ سے ان کو اپنے پاس روکے رکھتے ہو اور ان کو کہیں اور نکاح نہیں کرنے دیتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور کمزور بچوں کے متعلق (بھی تمہیں حکم دیتا ہے) اور یہ کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو ' اور تم جو بھی نیک کام کرتے ہو تو بیشک اللہ کو اس کا علم ہے۔ (النساء: ۱۲۷)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ پہلے لوگ لڑکوں اور لڑکیوں کو وارث نہیں بناتے تھے ' اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرمایا اور ہر حصہ دار کو حصہ مقرر فرما دیا ' اور یتیموں کے متعلق انصاف کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کا مہر مقرر کرنے میں اور وراثت میں ان کا حصہ ادا کرنے میں انصاف سے کام لیا جائے۔ (زاد المسیر ج ۲ ص ۱۲۸)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عورتوں کے حقوق کے متعلق نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ عورتوں ' یتیم لڑکیوں اور کمزور بچوں کے وہی احکام ہیں جو پہلے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے تھے اور یہاں مسلمانوں کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پھر ان ہی احکام کی طرف متوجہ کیا ہے تاکہ مسلمان ان آیات میں غور و فکر کریں اور ان کے تقاضوں پر عمل کریں۔

عورتوں اور کمزور لوگوں کو ان کے حقوق دلانا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے

قرآن پاک میں یتیموں، بیواؤں اور معاشرے کے کمزور و محروم افراد کیلئے بہت زیادہ ہدایات دی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یتیموں، بیواؤں، عورتوں، کمزوروں اور محروم لوگوں کو ان کے حقوق دلانا اللہ عَزَّوَجَلَّ کی سنت ہے اور اس کیلئے کوشش کرنا اللہ عَزَّوَجَلَّ کو بہت پسند ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

(1)۔۔ حضرت ابو درداء (رض) سے روایت ہے، ایک شخص نے تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے دل کی سختی کی شکایت کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تیرا دل نرم ہو جائے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ ارشاد فرمایا: تیرے پاس کوئی یتیم آئے تو اس کے سر پہ ہاتھ پھیرو اور اپنے کھانے میں سے اسے کھلاؤ، تیرا دل نرم ہو جائے گا اور تیری حاجتیں بھی پوری ہوں گی۔

(مصنف عبد الرزاق، کتاب الجامع، باب اصحاب الاموال، ۱۰/۱۳۵، الحدیث: ۲۰۱۹۸)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے تین یتیموں کی پرورش کی وہ رات کو قیام کرنے والے، دن کو روزہ رکھنے والے اور صبح شام اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی تلوار سونتنے والے کی طرح ہے اور میں اور وہ جنت میں دو بھائیوں کی طرح ہوں گے جیسا کہ یہ دو بہنیں ہیں۔ "اور اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملایا۔ (ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حقّ الیتیم، ۴/۱۹۴، الحدیث: ۳۶۸۰)

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "بیواؤں اور مسکینوں پر خرچ کرنے والا راہ خدا عَزَّوَجَلَّ میں جہاد کرنے والے اور رات کو قیام اور دن کو روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الحث علی المکاسب، ۳/۶، الحدیث: ۲۱۴۰)

(4)۔۔ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو میرے کسی امتی کی حاجت پوری کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ اس کے ذریعے اس امتی کو خوش کرے تو اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کو خوش کیا اور جس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کو خوش کیا اللہ عَزَّوَجَلَّ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ (شعب الایمان، الثالث والخمسون من شعب الایمان۔۔ الخ، ۶/۱۱۵، الحدیث: ۷۶۵۳)

آیت مبارکہ :

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

لغۃ القرآن: [وَاِنِ : اور اگر] [امْرَاَةٌ : کوئی عورت] [خَافَتْ : خوف رکھتی ہے] [مِنْم بَعْلِهَا : اپنے شوہر سے] [نُشُوْزًا : بدمزاجی کا] [اَوْ : یا] [اِعْرَاضًا : بےتوجہی کا] [فَلَاَ جُنَاحَ : تو کوئی گناہ نہیں ہے] [عَلَيْهِمَآ : ان دونوں پر] [اَنْ : کہ] [يُّصْلِحَا : وہ دونوں سمجھوتہ کرلیں] [بَيْنَهُمَا : آپس میں] [صُلْحًا : صلح کا] [وَالصُّلْحُ : اور صلح] [خَيْرٌ: بہتر ہے] [وَاُحْضِرَتِ : اور حاضر کی گئی (یعنی رچابسا دی گئی)] [الْاَنْفُسُ : طبیعتوں میں] [الشُّحَّ : لالچ] [وَاِنْ : اور اگر] [تُحْسِنُوْا : تم احسان کرو]

[وَتَتَّقُوْا : اور تقویٰ کرو] [فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [بِمَا : اس سے جو] [تَعْمَلُوْنَ : تم کرتے ہو] [خَبِيْرًا : باخبر]

ترجمہ: اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی جانب سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف رکھتی ہو تو دونوں (میاں بیوی) پر کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں کسی مناسب بات پر صلح کرلیں، اور صلح (حقیقت میں) اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں (تھوڑا بہت) بخل (ضرور) رکھ دیا گیا ہے، اور اگر تم احسان کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو بیشک اللہ ان کاموں سے جو تم کر رہے ہو (اچھی طرح) خبردار ہے۔

تشریح: تسلسل جاری ہے یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق کا تعین کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار مردوں کو حکم دیا ہے کہ عورتوں کے حق مہر خندہ پیشانی اور دل کی رغبت کے ساتھ دیا کرو۔ اگر وہ اپنی خوشی سے حق مہر معاف کریں تو بھی اس انداز سے کھاؤ اور استعمال کرو کہ انھیں تمہارے بارے میں ہلکے پن اور حریص ہونے کا گمان پیدا نہ ہو۔ یہاں عورتوں کو تلقین فرمائی جارہی ہے کہ اگر کسی عورت کو ایسے خاوند کے ساتھ واسطہ پڑا ہے جو حریص اور لالچی ہے یا کسی وجہ سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ اسے حق مہر معاف کر دیا جائے ' بصورت دیگر خاوند کی طرف سے اعراض اور اختلاف کا خطرہ ہے تو تنازعہ کھڑا کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ عورت اپنے خاوند کے اختلاف اور اعراض سے بچنے کے لیے اپنے حقوق سے دست بردار ہونے کے بارے میں غور کرے۔ ایسا کرنے کا اسے اختیار ہے اس پر اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ گھر اجاڑنے سے بہتر ہے کہ عورت اپنے حقوق میں نرمی اختیار کرلے۔ اس سے عورت کا بھرم قائم رہنے کے ساتھ گھریلو ماحول میں خوشگوار تبدیلی آئے گی۔ یہ ہدایت اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں خوش حال اور تمہارے گھروں کو آباد دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں دونوں کو ہر حال میں صلح کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے گو انسان حریص واقع ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کر کے اختلافات سے بچنا چاہیے۔ اگر عورت بوڑھی ہو چکی ہو یا خاوند کو اس کی کوئی عادت پسند نہیں تو بھی نباہ کرنا چاہیے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ اچھی طرح خبر گیر ہے کہ کون تم میں صلح جو، ایثار پسند اور گھر آباد رکھنا چاہتا ہے اور کون ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ (فہم)

شان نزول

عمرہ بنت محمد بن مسلمہ جن کو خولہ (رض) بھی کہا جاتا تھا سعد بن ربیع (رض) کی نکاح میں تھیں جن کو رافع بن خدیج (رض) کہتے ہیں۔ سعد نے ایک اور نکاح کرلیا اور اس کی طرف بہت مائل ہوگئے حضرت عمرہ (رض) نے دربار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ان کی بے رخی کی شکایت کی اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح المعانی) حضرت عمرہ راضی ہوگئی کہ مجھے طلاق نہ دی جائے میں اپنے حقوق کم کرتی ہوں اس پر صلح ہوگئی۔ (روح المعانی) (حسنات)

سورۃ النسآء کی ابتدائی آیات میں یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر جو احکام دیے گئے تھے ان میں چونکہ یتیم بچیوں یا ان کی ماؤں سے نکاح کی بھی اجازت دی گئی تھی تو اس سلسلے میں تین پابندیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔

دوسری یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل کو شرط قرار دیا گیااور تیسرے یہ کہ حق مہر کی ادائیگی لازم ٹھہرائی گئی۔ چنانچہ جب اس پر سوال ہوا تو انہی آیات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سوال اگرچہ ان خاص احکام کے حوالے سے ہوا تھا لیکن شوہر کا کسی بیوی سے مساویانہ سلوک نہ کرنے کا سبب صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی یتیم بچے کی ماں ہے اور یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر اس سے نکاح کیا گیا ہے بلکہ اس کے اسباب اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بیوی بانجھ ہے یا دائمی مریض ہے یا زن و شو کے قابل نہیں رہی یا اس کی شکل و صورت واجبی سی ہے تو قرآن کریم نے اپنی عادت کے مطابق ان اسباب اور فطری اعذار کو سامنے رکھتے ہوئے چند اصولی احکام دیے کہ اگر بیوی یہ محسوس کرے کہ میری کسی کمزوری کے باعث شوہر کا تعلق مجھ سے کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ یا تو مجھے چھوڑ دے گا اور یا مجھے بالکل معلق بنا کر رکھ دے گا تو ایسی صورت میں پروردگار اجازت دیتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں کے لیے کوئی حرج نہیں کہ بجائے عقد نکاح توڑنے کے وہ کسی سمجھوتے پر راضی ہو جائیں ' مثلاً بیوی اسے اپنا حق مہر معاف کر دے یا کم کر دے یا وہ دوسری بیوی کے حق میں اپنے حقوق زوجیت سے دستبردار ہو جائے یا دوسری بیوی کے برابر تمام مراعات لینے کا اصرار چھوڑ دے۔ اس طرح کوئی بھی مصالحت کی صورت نکل آئے تو بہتر یہ ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے کیونکہ عقد نکاح کو آخر حد تک بچانا مسلمان معاشرے ' اولاد اور میاں بیوی کی مصلحت کا تقاضا ہے۔ کسی گھر کے اجڑ جانے سے ایک ایسا راستہ کھل جاتا ہے جس کے اثرات بعض دفعہ نہایت ناگوار صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ایک حکمت کی بات ارشاد فرمائی گئی۔ "شُحّ" کا ترجمہ "بخل" بھی ہو سکتا ہے اور "حرص" بھی۔ بخل کا معنی ہے ادائے حقوق میں تنگدلی دکھانا۔ یہ رویہ بہر حال مذموم ہے۔ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ اپنے آپ کو بخل سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حرص کا تعلق ہے حرص ایک اضافی چیز ہے۔ یہ اچھی بھی ہوتی ہے بری بھی۔ نیکی کی حرص ' ہر خیر میں سبقت کی حرص ' یہ وہ چیز ہے جو ایک مومن کا مطلوب ہے۔ اس کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔ یہ اگر نہ رہے تو فطرت گہنا کر رہ جائے۔ لیکن اگر ایک شخص اپنی ذات کی حرص میں مبتلا ہے اور وہ ہر صورت میں اپنی بات منوانا چاہتا ہے تو ایسے شخص کے ساتھ گزر بسر کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ دوسرا فریق ایثار اور قربانی سے کام لے۔ اس لیے بیوی کو حکم دیا گیا کہ اگر شوہر کی حرص بڑھ گئی ہے چاہے اس کے جائز اسباب بھی ہوں تو اب اس گھر کی بقا کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ تم ایثار سے کام لو اور اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہو کر کوئی تصفیہ کر لو تاکہ اس گھر میں رہ سکو۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تمہارا ایثار شوہر کو بدلنے پر مجبور کر دے۔

عورت ایثار تو کر سکتی ہے لیکن اس کے تحمل کی بھی ایک حد ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ بار ڈالنا قرین انصاف نہیں۔ اس مصلحت کے پیش نظر فرمایا گیا کہ ہم نے اگرچہ عورت کو ایثار کی ترغیب دی ہے لیکن احسان و تقویٰ اور ایثار و قربانی درحقیقت مرد کے زیادہ شایان شان ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے۔ اور بجائے اس کے کہ بیوی کو ایثار و قربانی کی وجہ سے اپنے اوپر ایک اخلاقی تفوق دے دے اسے چاہیے کہ ہر نیکی میں اس کے لیے نمونہ بنے۔ جائز شکایات بھی ہوں تو ان سے درگزر کرے اور حتیٰ الامکان ہر نیکی میں سبقت کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرے گا۔ کیونکہ وہ ان دونوں کی ایک ایک بات کو جانتا ہے اور دیکھتا ہے۔ (روح)

صاف ظاہر ہے کہ بیوی کے کچھ لازمی حقوق ہونگے تبھی تو اتنی تاکید ہے لیکن جاننا چاہیئے وہ ہیں کیا

نان، نفقہ، سکنہ اور زوجیت کا حصول بیوی کا حق اور شوہر کے ذمہ فرض ہے۔ مالی حالات کے مطابق کھانے، پینے، ضروریات زندگی اور رہائش کی اچھی سہولیات فراہم کرنا شوہر کے ذمہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي.

”تم میں سے اچھا وہی ہے جو اپنے اہل (یعنی بیوی بچوں) کے لیے اچھا ہے۔“

1. ترمذی، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب فضل ازواج النبی ﷺ، 5: 907، رقم: 3895

اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔

گھر کے خوشگوار ماحول کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دُوسرے کے حقوق ادا کریں، خوش خلقی کا معاملہ کریں، نرمی اور شیریں زبان اختیار کریں اور اگر کوئی ناگوار بات پیش آئے تو اس کو برداشت کر لیں۔ خصوصاً مرد کا فرض ہے کہ وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے۔ عورت فطرتاً کمزور اور جذباتی ہوتی ہے، اس کی کمزوری کی رعایت کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ حجۃالوداع میں عورتوں کے بارے میں خصوصی تاکید اور وصیت فرمائی، اس کا لحاظ رکھے۔

اگر شوہر کے مالی حالات ناگفتہ بہ ہوں تو بیوی کا فرض ہے کہ اس ساتھ تعاون کرے اور ٹھاٹھ باٹھ کی بجائے سادہ زندگی پر اکتفاء کرے۔ اس سے یہ بھی مراد نہیں کہ عورت کا ٹھرکی ہو جائے اور کوئی اور بات یاد ہی نہ رہے۔ اعتدال برتے

حضرت عائشہ (رض) اس آیت کی تفسیر میں فرماتی ہیں ایک شخص کے نکاح میں کوئی عورت ہوتی وہ اس عورت سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کرتا ' اور اس کو طلاق دینا چاہتا تو وہ عورت کہتی میں اپنے معاملہ میں تمہارے لیے فلاں چیز کی اجازت دیتی ہوں ' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ امام نسائی نے اس میں یہ زیادہ روایت کیا ہے کہ وہ عورت کہتی تم مجھے طلاق نہ دو مجھے اپنے نکاح میں برقرار رکھو اور میں اپنا خرچ اور اپنی باری تم سے ساقط کرتی ہوں۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۲۰۱ ' سنن کبری للنسائی ' رقم الحدیث : ۱۱۱۲۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور دلوں میں مال کی حرص رکھی گی ہے۔ اور اگر تم نیک کام کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو ' تو بیشک اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھنے والا ہے۔ (النساء : ۱۲۸)

صلح کرنے کے لیے اپنے بعض حقوق کو چھوڑنا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی جبلت اور طبیعت کا بیان فرمایا ہے کہ وہ فطرتا بخل پر حرص کرتا ہے ' عورتیں اپنے حقوق پر حریص ہیں وہ چاہتی ہیں کہ ان کو اپنی باریوں سے حصہ ملتا رہے اور ان کو رہائش ' کھانے اور کپڑوں کا خرچ ملتا رہے اور شوہر ان کے ساتھ خوشگوار عائلی زندگی گزارے اور ان کا پورا مہر ادا کرے اور طلاق کی صورت میں عدت کا خرچ اٹھائے ' اسی طرح مرد مال کو اپنے پاس رکھنے پر حریص ہوتے

ہیں ٗ وہ اپنی پسند کی بیوی کے پاس زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہیں اور جو بیوی ناپسند ہو اس کو طلاق دے کر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مہر معاف کرالینا چاہتے ہیں ٗ سو دونوں میں سے ہر فریق اپنا حق زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا ہے اور دوسرے کا حق کم سے کم دینا چاہتا ہے لیکن صلح کرنے کے لیے ہر فریق کو اپنے کچھ حقوق چھوڑنے پڑتے ہیں اور دوسرے فریق کو کچھ حقوق دینے پڑتے ہیں ہر چند کہ دلوں میں حرص رکھی گئی ہے لیکن صلح کرنے کے لیے اپنے کچھ حقوق سے دستبردار ہونا ناگزیر ہے۔ جیسا کہ حضرت سودہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھیں اور ان کو معلوم تھا کہ آپ کو حضرت عائشہ (رض) سے بہت محبت ہے تو انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہ (رض) کے لیے ہبہ کردی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ آپ ان کو طلاق نہ دیں۔ (تبیان)

المختصر مردوں کو ہی ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ احسان اور عالی ظرفی سے کام لیں اور اپنی نامرغوب بیوی کے ساتھ بھی حسن سلوک کریں اور اس کے حقوق کی پاسداری میں اللہ سے ڈرتے رہیں۔

مسائل

ا۔ میاں بیوی کے درمیان صلح جوئی اور اصلاح کا ماحول ہونا چاہیے۔

٢۔ اللہ تعالیٰ نیکی اور تقویٰ اختیار کرنے والے کو جانتا ہے۔

3۔ خاوند کی زیادتی یہ ہے کہ اسے کھانے پینے کو نہ دے یا کم دے، مارے پیٹے یا بدزبانی کرے اور اعراض یہ ہے کہ بیوی سے دل سے محبت نہ کرے۔ بول چال ترک کردے۔

4۔ اس طرح کہ عورت اگر اس خاوند کے پاس رہنا ہی چاہے تو اپنے کچھ حقوق کا بوجھ خاوند سے کم کردے یا مرد کچھ مشقت برداشت کرے کہ باوجود رغبت کم ہونے کے اس بیوی سے اچھا برتاؤ بہ تکلف کرے۔

5۔ یعنی جدائی اور طلاق سے صلح بہتر ہے۔ کیونکہ طلاق اگرچہ جائز ہے مگر بری چیز ہے۔

6۔ اس سے معلوم ہوا کہ فطرت انسانی میں لالچ داخل ہے۔ ہر شخص اپنے آرام وآسائش کو بہت مقدم رکھتا ہے۔ اپنے پر مشقت گوارا کر کے دوسروں کے آرام کی کوشش نہیں کرتا۔ الا ماشاء اللہ۔

7۔ یعنی اے خاوندو ! اگر تم اس کے باوجود کہ تم کو اپنی موجودہ بیوی ناپسند ہو پھر بھی اس سے اچھی طرح نبھادو اور یہ سمجھو کہ عورت تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے تو ہم بھی تم پر فضل و کرم فرمائیں گے۔

آیت مبارکہ :

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٢٩﴾

لغۃ القرآن: [وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا : اور تم ہرگز استطاعت نہیں رکھتے] [اَنْ : کہ] [تَعْدِلُوْا : عدل کرو] [بَيْنَ النِّسَآءِ : عورتوں] [بیویوں) کے مابین] [وَلَوْ : اور اگر (یعنی خواہ)] [حَرَصْتُمْ : تم خواہش کرو] [فَلاَ تَمِيْلُوْا : تو پھر تم ایک (ہی) کے مت ہو رہو] [كُلَّ الْمَيْلِ : بالکل ایک طرف کا ہونا] [فَتَذَرُوْہَا : کہ چھوڑدو اس کو (یعنی دوسری بیوی کو)] [كَالْمُعَلَّقَةِ : لٹکائی ہوئی کی مانند] [وَاِنْ : اور اگر] [تُصْلِحُوْا : تم اصلاح کرو] [وَتَتَّقُوْا : اور تقویٰ کرو] [فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا] [رَّحِيْمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور تم ہرگز اس بات کی طاقت نہیں رکھتے کہ (ایک سے زائد) بیویوں کے درمیان (پورا پورا) عدل کر سکو اگرچہ تم کتنا بھی چاہو۔ پس (ایک کی طرف) پورے میلان طبع کے ساتھ (یوں) نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو (درمیان میں) لٹکتی ہوئی چیز کی طرح چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کرلو اور (حق تلفی و زیادتی سے) بچتے رہو تو اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

تشریح: اس سورت کی تیسری آیت میں عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ بیک وقت چار تک عورتیں نکاح میں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ اب ایک سوال کے جواب میں اس کے متعلقات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ پہلے حکم میں عدل کا مفہوم مالی اور اخلاقی معاملات کے ساتھ ہے۔ اب اخلاقی معاملے میں حکم ہے۔

جہاں تک قلبی میلان کا تعلق ہے اس میں تم بیویوں کے درمیان مساوات اور انصاف کرنا چاہو بھی تو پوری طرح انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ دل کے رجحانات اور جذبات پر قابو پانا انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اگر کسی بیوی کا حسن و جمال اور اس کے اخلاق کی وجہ سے تمہارا دل اس کی طرف زیادہ مائل ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن کوشش کرو کہ تم ایک ہی کے ہو کر نہ رہ جاؤ۔ بلکہ ظاہری محبت میں سب کی دلجوئی کرنی چاہیے تاکہ ایک بیچاری تمہارا منہ تکتے ہوئے معلق ہو کر نہ رہ جائے۔ لہٰذا جذبات محبت پر کنٹرول کرتے ہوئے بے انصافی سے بچو۔ اگر تم منصفانہ برتاؤ اور سب کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہاری کمزوریوں کو معاف کرنے والا مہربان ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا ہے

(اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَآ اَمْلِکُ) [رواہ ابو داؤد: کتاب النکاح]

"اے اللہ! میرا عدل اور مساوات اسی حد تک ہے جو میرے اختیار میں ہے جو تیرے اختیار میں ہے وہ میرے اختیار میں نہیں اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے گا۔"

(مَنْ کَانَتْ لَہٗ امْرَاَتَانِ فَمَالَ اِلٰی اِحْدَاھُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَشِقُّہٗ مَاءِلٌ)

[رواہ ابوداود: باب القسمۃ بین النساء]

بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے والا روز قیامت فالج زدہ انسان کی طرح اٹھایا جائے گا۔ (فہم)

شان نزول

حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات میں بے مثل عدل وانصاف تھا لیکن سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قدرتی طور پر حضرت ام المومنین عائشہ (رض) سے بہت انس و محبت تھا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تائید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

قرآن کریم نے بیویوں میں جو عدل اور مساویانہ برتاؤ کرنے کا حکم دیا اس سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس حکم پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ لوگوں نے اپنے طور پر یہ سمجھا کہ اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی معاملات میں بھی اپنی تمام بیویوں سے یکساں سلوک کرے ' جو کچھ ایک بیوی کو دے وہی دوسری بیوی کو دے۔ ایک جیسا لباس ' ایک جیسی رہائش ' ایک جیسی غذا اور ایک جیسا برتاؤ۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اور دوسری یہ بات کہ جس طرح کی محبت اور محبت کے جذبات ایک بیوی کے لیے اپنے دل میں رکھو ' بالکل اسی طرح کے جذبات دوسری کے لیے بھی رکھو۔ صرف یہی نہیں کہ بیویوں میں باریاں مقرر کردو اور اس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تمہارا قلبی رجحان بھی ہر ایک کی طرف یکساں ہونا چاہیے۔ دوسری چیز چونکہ آدمی کے بس میں نہیں ' فرض کیجیے ایک بیوی خوبصورت ہے اور دوسری بدصورت ' ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ ' ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست ' ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج ' ایک خوش سلیقہ ہے اور دوسری پھوہڑ ' اسی طرح کے اور بھی اختلاف اور تفاوت کے اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں دونوں طرح کی بیویوں کے ساتھ یکساں قلبی رجحان اور محبت کیسے ہوسکتی ہے۔ ایک خوبصورت ' تعلیم یافتہ ' سلیقہ شعار ' حسن کلام سے دل موہ لینے والی بیوی کے ساتھ شوہر کو جو تعلق خاطر ہوسکتا ہے وہ ان صفات سے محروم بیوی کے ساتھ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اگرچہ حسن سلوک بھی طبعی رجحان اور جذباتِ محبت کا عکاس ہوتا ہے۔ جو بیوی اچھی لگتی ہے اس سے خود بخود سلوک بھی اچھا ہوگا اور جو بیوی پسند نہیں اس کے ساتھ سلوک میں بھی یقینا سرد مہری ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ فرماتے ہوئے صاف صاف فرمایا کہ تمہیں اس بات کا حکم ہی کب دیا گیا ہے کہ تم تمام بیویوں سے دل کے رجحان اور جذبات محبت میں یکسانی رکھو۔ تم اگر چاہو بھی تو ایسا نہیں کرسکتے۔ لیکن تمہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ تم ایک ہی بیوی کی طرف جھک کر رہ جاؤ۔ اسی سے بات کرو ' اسی کی تنہائیوں میں شرکت کرو ' وہی

تمہاری توجہ کا مرکز ہو اور دوسری بیوی گھر میں اس طرح رہے جیسے کوئی گری پڑی چیز ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ تمہارا رویہ اس طرح کا ہو جیسے وہ نہ بیوی ہے اور نہ غیر ہے بلکہ درمیان میں اسے معلق کر کے رکھ دو کہ نہ اسے طلاق دو اور نہ بیوی کے حقوق دو۔ قلبی رجحان چونکہ تمہارے بس میں نہیں اس لیے اس پر تو گرفت نہیں ہوگی لیکن سلوک اور معاملات میں یکسانی چونکہ تمہارے بس میں ہے اس لیے اس میں تمہیں کسی بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہیں دینا چاہیے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نو بیویاں ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی بیوی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ عصر کے بعد سب بیویوں سے ملنے کا معمول تھا۔ سب کی باریاں مقرر تھیں۔ سفر میں ساتھ جانے کا موقع اسے ملتا جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلتا۔ سال بھر کا غلہ سب پر برابر تقسیم کر دیا جاتا۔ ازواج مطہرات میں سے ہماری ہر ماں یہی سمجھتی تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفقت کی نظر سب سے زیادہ اس پر ہے۔ مرض الوفات میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ہر بیوی کے گھر میں جانے کے قابل نہ رہے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سب کو جمع کر کے اجازت لی کہ آپ مجھے عائشہ (رض) کے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ چنانچہ سب نے بخوشی اجازت دی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر بیماری کے ایام وہیں گزارے اور وہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ یہی طریقہ سلف صالحین اور خلف صالحین کا رہا۔ تمام بزرگان دین ہمیشہ اپنے اہل خانہ سے محبت کا سلوک کرتے رہے اور اگر بیویاں ایک سے زیادہ تھیں تو ہمیشہ منصفانہ برتاؤ کیا۔ ایک بزرگ کے بارے میں میں نے پڑھا کہ ان کے پاس دو خربوزے آئے۔ آپ نے دونوں کو کاٹا اور دونوں کا ایک ایک ٹکڑا اپنی دونوں بیویوں کے گھر بھیجا۔ دیکھنے والوں نے پوچھا کہ حضرت! دو ٹکڑے مل کر بھی ایک ہی تربوز بنتا ہے تو آپ نے ایک ایک تربوز ایک ایک گھر میں کیوں نہ بھیج دیا۔ فرمایا ہو سکتا تھا کہ ایک تربوز میٹھا نکلتا اور دوسرا پھیکا۔ تو دونوں کے ساتھ حسن سلوک میں برابری نہ ہوتی۔ اس لیے میں نے دونوں کو کاٹ کر برابر برابر دونوں کو بھیج دیا۔ تاکہ دونوں جیسے بھی ہوں دونوں کے حصے میں آئیں۔ اس طرح سے قلبی رجحان کی پابندی تو نہیں لگائی البتہ سلوک اور معاشرت میں برابری کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس میں بھی کبھی نہ کبھی کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ تمہیں اپنے طرز عمل کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور ہر وقت اپنی اصلاح کی فکر جاری رہنی چاہیے اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے ہو سکتا ہے تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس نہ ہو سکے۔ اگر یہ اصلاح اور تقویٰ کی کوشش جاری رہی تو اللہ سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ غلطیوں سے صرف نظر فرمائے اور رحم اور درگذر کا سلوک فرمائے۔

اسلام انسانی نفس کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو ایک مٹھی بھر مٹی اور اس میں نفخ روح سے پیدا کی گئی ہے اور اس کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں ہیں ان کے بالکل مطابق۔ نیز وہ انسان کے ساتھ ایک مثالی حقیقت پسندی یا حقیقی مثالیت کے مطابق اس کے ساتھ ڈیلنگ کرتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو ' جس کے قدم زمین پر ہوں اور اسے روحانی بلندی حاصل ہو جس میں نہ تو تناقض ہو اور نہ ٹوٹ پھوٹ ہو۔

یہی ہے اسلام ' حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انسانی اعتبار سے اوج کمال پر تھے۔ آپ کے اندر تمام قوتیں متوازن تھیں ' باہم متناسق تھیں اور انسان کی حدود و فطرت کے اندر تھیں۔ (روح)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم اور منصفانہ تقسیم پر تو قادر تھے ایک بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ لیکن دلی جذبات پر کنٹرول کسی کی طاقت میں نہیں ہوتا۔ (الھم ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما لا املک) (اے اللہ یہ ہے میری تقسیم جن معاملات میں میرا اختیار ہے اور آپ مجھے ملامت نہ کریں ان معاملات میں جو میرے اختیار سے باہر ہیں) یعنی دل (ابو داؤد)

ہاں جب دل خشک ہو جائیں تعلقات بہت ہو جائیں اور زوجین کے درمیان باہم زندگی گزارنا مشکل ہو جائے تو پھر جدائی ہی بہتر ہے۔ اسلام زوجین کو رسیوں اور زنجیروں میں باندھ کر اکٹھا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ نہ قید وبند کے ذریعے زوجین کو اکٹھا رکھا جاسکتا ہے۔ صرف محبت اور باہم رحم دلی کے جذبات میں فریقین کو باندھا جاسکتا ہے یا پھر ان کو واجبات اور فرائض کی انجام دہی اور حسن سلوک کے ذریعے یکجا رکھا جاسکتا ہے ' خصوصا ایسے دلوں کو جن کے درمیان نفرت پیدا ہو چکی ہو۔ اس لیے کہ نفرت کے قلعوں میں دلوں کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ تعلق کہ بظاہر تو باہم تعلق ہو اور اندرونی طور پر مکمل کاٹ ہو۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور وہ اپنی پیدا اور وہ اپنی پیدا کردہ مخلوقات کے بارے میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بعد میلانات ایسے ہیں جن پر اس کے لیے قابو پانا ممکن نہیں ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ میں تکیل دے دی کہ وہ ان میلانات کو قابو میں رکھے 'ان میلانات کی حرکت کو حدود میں رکھے لیکن انھیں بالکل ختم کرنے کی کوشش بھی نہ کرے۔

ان میلانات میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی متعدد بیویوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو۔ یہ میلان ایسا ہوتا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ انسان اسے ختم نہیں کر سکتا تو اس کا حل کیا ہے ؟ اسلام کسی شخص سے اس بات پر مواخذہ نہیں کرتا جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔ نہ اسے گناہ قرار دیتا ہے اور نہ اس پر سزا دیتا ہے۔ اس بات کو اسلام اس کھاتے میں ڈالتا ہے جو اس کی قدرت سے ہی باہر ہو۔
چنانچہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان ہرگز مکمل عدل نہیں کر سکتے اگرچہ تم ایسا کرنے کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ یہ تمہاری قدرت سے باہر ہے۔ تمہارے ارادے میں جو چیز داخل ہے وہ یہ ہے کہ تم معاملہ کرنے میں انصاف کرو ' تقسیم میں انصاف کرو ' خرچہ دینے میں انصاف کرو ' حقوق زناشوئی میں انصاف کرو ' یہاں تک کہ مسکرانے میں بھی انصاف کرو ' زبانی الفاظ کہنے میں بھی انصاف کرو۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ یہ ہے وہ تکیل جو ان میلانات کو کنٹرول میں رکھے گی۔ ضبط مطلوب ہے 'میلانات کا قتل مطلوب نہیں ہے۔ (آیت) "فلا تمیلوا کل المیل فتذورھا کالمعلقۃ"۔ (۴ : ۱۲۹) (ایک بیوی کی طرف اس طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو) (ظلال)

مسائل

۱۔ بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرنا فرض ہے۔
۲۔ اپنی اصلاح کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو گے تو اللہ کو بخشنے والا پاؤ گے۔

آیت مبارکہ :

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [يَّتَفَرَّقَا : وہ دونوں الگ ہوجائیں] [يُغْنِ : تو بے نیاز کر دے گا] [اللّٰهُ : اللہ] [كُلًّا : سب کو] [مِّنْ سَعَتِهٖ : اپنی وسعت سے] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [وَاسِعًا : وسعت دینے والا] [حَكِيْمًا : حکمت والا]

ترجمہ: اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے (ایک دوسرے سے) بے نیاز کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا بڑی حکمت والا ہے۔

تشریح: اسلام انسانی شعور اور نفس کے پوشیدہ میلانات کے ساتھ جس طرح برتاؤ کرتا ہے اور جس طرح زندگی کے طور طریقوں کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھتا ہے وہ اس قدر حیران کن ہے کہ اگر لوگ رات دن اللہ کا شکر ادا کریں تو بھی ان کے لیے اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں انسانی سہولت کا بہت ہی خیال رکھا گیا اور نظر آتا ہے کہ یہ نظام انسانوں کے لیے تجویز ہوا ہے۔ وہ انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو نہایت ہی گری ہوئی حالت سے اٹھاتا ہے اور انھیں نہایت ہی سر بلندی تک لے جاتا ہے اور یہ عمل انسان کی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ وہ ان کے لیے بلندی اور رفعت کا کوئی ٹارگٹ اس وقت تک تجویز نہیں کرتا جب تک ان کی فطرت میں اس کے حصول کے لیے داعیہ نہ ہو اور ان کے مزاج میں اس کی کوئی نہ کوئی جڑ موجود نہ ہو۔ اس طرح اسلام ان کو پھر اس بلند مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک انھیں کوئی دوسرا نظام نہیں لے جاسکتا۔ یہ کام وہ اس طرح مثالی واقعیت پسندی یا ایسی واقعیت کے ساتھ کرتا ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو اور پھر ایسی صورت میں کہ اس عجیب مخلوق انسانی کی اصل طبیعت اور مزاج کے مطابق۔

خاندانی نظم کے یہ احکام جن کا تعلق خاص زوجین کی ازدواجی زندگی سے ہے اسلامی نظام حیات کا ایک حصہ ہیں اور اسلامی نظام حیات اس کائنات کے ناموس اکبر کا ایک حصہ ہے جو اللہ نے اس پوری کائنات کے اندر جاری فرمایا ہے۔ اس لیے اسلامی نظام بھی اس کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جب کہ دوسری طرف وہ انسانی فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ اس لیے کہ انسانی بھی اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ اسلامی نظام زندگی کا نہایت ہی گہرا راز ہے اس لیے عائلی اور خاندانی نظام کے مسائل کے متصلا بعد اللہ تعالیٰ کائنات کا ذکر فرماتے ہیں جس سے یہ عائلی احکام پوری کائنات کے نظام فطرت کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں۔ گویا جس طرح انسانی زندگی میں اللہ کی حاکمیت ہے 'اسی طرح اس کائنات میں بھی وہی حاکم ہے۔ وہی ہے جو زمین وآسمان کا مالک ہے اور یہ وہی ذات ہے جس نے تمھیں یہ احکام دیئے ہیں۔ وہی ہے جس نے تم سے پہلی امتوں کو یہ احکام دیئے تھے اور یہ تمام احکام اور وصایا ایک ہیں اور ایک ہی منبع سے ہیں اور اسلامی نظام اس پر قائم ہے کہ اس نے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ اصول ہیں جو سچائی 'عدل اور خدا ترسی پر استوار ہیں۔

گھر کی چار دیواری اور میاں بیوی کے تعلقات معاشرے کی اکائی اور بنیادی یونٹ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ یونٹ جس قدر خوشحال اور اس کا ماحول جتنا خوشگوار ہوگا۔ اتنا ہی معاشرہ مضبوط اور اچھے خطوط پر استوار ہوگا۔ اس یونٹ کو توڑ پھوڑ سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے متعدد ہدایات جاری فرمائی ہیں۔

بیوی کی طرف سے تمام تر ایثار و قربانی یا شوہر کی طرف سے احسان و مروت کے باوجود دونوں میں علیحدگی ناگزیر ہو جائے اور نبھا کی ہر صورت ناکام ہو جائے تو پھر دونوں کو سوچ سمجھ کر علیحدگی کا فیصلہ کرلینا چاہیے۔ اسلام نے جو طریق معاشرت رائج کیا ہے اور مسلمانوں کو جن آداب معاشرت سے مہذب بنایا ہے اس میں اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ حتیٰ الامکان ایک گھر وجود میں آنے کے بعد تباہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو بھی ممکن صورت ہو میاں بیوی کے تعلق کو باقی رکھنے کے لیے بروئے کار لانی چاہیے۔ لیکن اگر طبیعتوں کی ناموافقت اور مزاجوں کی ناآشنائی اس حد تک پہنچ جائے کہ علیحدگی کے بغیر کوئی صورت نظر نہ آئے تو پھر عقد نکاح کے ٹوٹنے کو شرافت ' تہذیب اور خاندانی روایات کے ٹوٹنے کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔ اولاً تو میاں بیوی مل کر علیحدگی کا فیصلہ کرلیں۔ اور اگر جانبین کے جذبات میں آگ لگی ہوئی ہو تو پھر دونوں خاندانوں کے بڑوں کی ذمہ داری ہے کہ معقول طریقے سے علیحدگی کا انتظام کریں۔ اور میاں بیوی کو ایسے موقع پر خاص طور پر سہارا دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لیے علیحدگی کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے تو وہ کڑھ کڑھ کر اپنی زندگی کو عذاب نہ بنائیں۔ بیوی یہ نہ سمجھے کہ گھر کی یہ چھت میرے سر پر نہ رہی تو وقت کی دھوپ مجھے جھلسا دے گی۔ آوارہ نگاہیں میرا تعاقب کریں گی۔ ممکن ہے دوسرا کوئی جیون ساتھی میسر نہ آئے اور شوہر بھی یہ گمان نہ کرے کہ ایک خاتون کو طلاق دینے کے بعد کون مجھ پر اعتماد کرے گا اور کون اپنی بیٹی دینے کے لیے ایک ایسے آدمی کو تیار ہوگا جو ایک دفعہ ناکام ہو چکا ہے۔ اور اگر شادی ہو بھی گئی تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انجام بھی پہلی شادی جیسا نہ ہو۔ فرمایا علیحدگی اگر ضروری ہے تو پھر یہ اندیشے اور وسوسے تمہارے فیصلے اور راستے میں رکاوٹ نہیں بننے چاہئیں۔ معاملہ عزت نفس اور خودداری کے ساتھ طے ہونا چاہیے۔ تم نے چاہتوں سے یہ عقد باندھا تھا ' چاہتیں ختم ہو گئیں امیدیں ختم نہیں ہونی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے اس کے لیے کوئی بعید نہیں کہ وہ دونوں کو ایک دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کردے۔ خاتون کو اچھا شوہر نصیب ہو اور مرد کو اچھی بیوی مل جائے اور دونوں کے گھر آباد ہو جائیں۔ دل اللہ کے قبضے میں ہیں ' امکانات بھی وہی پیدا فرماتا ہے اس لیے اس سے بہتری کی امید رکھو اور اس کے لیے دعائیں مانگتے رہو۔ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور حکمت والا ہے۔ وہ اپنی وسعتوں سے تمہیں نوازے گا اور اپنی حکمت و دانش کے ساتھ تمہارے ساتھ معاملہ کرے گا۔ (روح)

اسلام میں طلاق اگرچہ سخت ناپسندیدہ ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال (کاموں میں) سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ عمل طلاق ہے۔ (ابوداؤد: 2178: کتاب الطلاق: باب 3) لیکن اس کے باوجود اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ فریقین کی بہتری اسی میں ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ (امداد)

جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس (رض) کی بیوی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ ! میں ثابت بن قیس (رض) کے اخلاق اور دین پر کوئی عیب نہیں لگاتی لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تو اس کا باغ اس کو واپس کرے گی ؟ اس نے کہا ہاں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ثابت بن قیس کو فرمایا باغ کو قبول کر و اور اسے ایک طلاق دے دو۔ "

[رواہ البخاری : کتاب الطلاق، باب الخلع و کیف الطلاق فیہ] (فہم)
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جب خاوند اور بیوی کے مزاج ہم آہنگ نہ ہوں اور ان میں موافقت اور صلح مشکل ہو جائے تو پھر وہ الگ الگ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ مرد کو عورت سے غنی کر دے گا 'اس کو پہلی بیوی سے بہتر زوجہ عطافرمائے گا اور عورت کو مرد سے غنی کر دے گا اس کو پہلے خاوند سے بہتر خاوند عطافرمائے گا اور بہت فضل والا اور بڑے احسان والا ہے اور اس کے تمام تکوینی اور تشریعی کاموں میں بہت حکمتیں ہیں۔ (تبیان)

عورت اور مرد بالکل ایک دوسرے کے محتاج نہیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نہ عورت بالکل مرد کی محتاج ہے اور نہ مرد بالکل عورت کا حاجت مند، سب رب عَزَّوَجَلَّ کے حاجت مند ہیں، ایک دوسرے کے بغیر کام چل سکتا ہے۔ عام طور پر طلاق کے بعد عورت اور اس کے گھر والے بہت غمزدہ ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر یہ آیت مبارکہ بار بار پڑھی جائے تو اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ دل کو تسکین ملے گی اور اللہ عَزَّوَجَلَّ مناسب حل بھی عطافرمادے گا۔ اس میں شوہروں کو بھی ہدایت ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیویوں کے مالک و مختار نہ سمجھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اگر انھوں نے چھوڑ دیا تو اب کائنات میں کوئی ان عورتوں کا سہارا نہیں رہے گا۔ نہیں نہیں، اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کو سہارا دے گا۔ اسی سلسلے میں یہاں ایک مفید وظیفہ پیش خدمت ہے۔ اُم المومنین حضرت ام سلمہ (رض) فرماتی ہیں "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس بندے کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ یہ دعا پڑھ لے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ اَللّٰھُمَّ اْجُرۡنِیۡ فِیۡ مُصِیۡبَتِیۡ وَاَخۡلِفۡ لِیۡ خَیۡرًا مِّنۡھَا" تو اللہ تعالیٰ اسے مصیبت پر ثواب عطافرمائے گا اور اس سے بہتر چیز اسے عطا کرے گا۔ فرماتی ہیں: جب میرے شوہر حضرت ابو سلمہ (رض) کا انتقال ہوا تو میں نے یہی دعا پڑھی، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے بہترین شوہر یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عطافرمادیئے۔ (مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند المصیبۃ، ص ۴۵۷، الحدیث: ۴ (۹۱۸)) (صراط)

مسائل

۱۔ ناگزیر صورت حال میں میاں 'بیوی رشتہ توڑ سکتے ہیں۔
۲۔ میاں بیوی کے درمیان تفریق ہونے کی صورت میں ہر کسی کا اللہ کفیل ہے

آیت مبارکہ :

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

لغۃ القرآن: [وَلِلّٰهِ : اور اللہ ہی کے لیے ہے] [مَا : وہ ٗجو] [فِي السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے] [وَمَا : اور وہ ٗجو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَلَقَدْ وَصَّيْنَا : اور بیشک ہم تاکید کرچکے ہیں] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں کو جن کو] [اُوْتُوا الْكِتٰبَ : دی گئی کتاب] [مِنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے] [وَاِيَّاكُمْ : اور تم کو بھی] [اَنِ : کہ] [اتَّقُوا : تقویٰ کرو] [اللّٰهَ : اللہ کا] [وَاِنْ : اور اگر] [تَكْفُرُوْا : تم انکار کرو گے] [فَاِنَّ : تو یقینا] [لِلّٰهِ : اللہ ہی کے لیے ہے] [مَا : وہ ٗجو] [فِي السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے] [وَمَا : اور وہ ٗ جو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [غَنِيًّا : بےنیاز] [حَمِيْدًا : حمد کیا ہوا]

ترجمہ: اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور بیشک ہم نے ان لوگوں کو (بھی) جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی حکم دیا ہے اور تمہیں (بھی) کہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور اگر تم نافرمانی کرو گے تو بیشک (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ٗاور بیشک ہم نے ان لوگوں کو حکم دیا جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اگر تم نہیں مانو گے تو اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ٗاور اللہ بے نیاز ہے حمد وثنا کیا ہوا اور اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ٗاور اللہ کافی ہے حمایت کرنے والا۔ (النساء: ۱۳۲-۱۳۱)

انسان میں اللہ تعالیٰ نے خیر کے داعیات بھی رکھے ہیں اور شر کے بھی

ان دونوں کو بروئے کار لانے کے لیے دونوں کی تائید وحمایت کے عوامل بھی رکھے گئے ہیں۔ عقل شعور اور تمیز کی صلاحیتیں دے کر فی الجملہ آزادی عطا کی گئی ہے کہ جو چاہو راستہ اختیار کرو۔ لیکن تمہارے اختیار کردہ راستے کے مطابق عناصر قدرت تمہارے لیے ہموار ہوتے جائیں گے اور اسی کے مطابق تمہارے ساتھ آخرت میں سلوک ہو گا۔

انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ چونکہ رحم وکرم کا ہے اس لیے اس نے ان کی ہدایت اور نجات کو آسان بنانے کے لیے انبیاءِ کرام مبعوث کیے اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ انسان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب خواہش نفس کی پیروی اور شیطان کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے شر کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ خواہش نفس کی پیروی میں چونکہ ایک لذت اور آسانی ہے اس لیے انسان اس کی طرف لپکتا ہے۔ اور وہ یہ بات سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ اس کے اس رویے کا انجام کیا ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہشات بڑھتی چلی جاتی ہیں اور شیطان کو زیادہ سے زیادہ گمراہ کرنے کے مواقع ملتے چلے جاتے ہیں۔ میاں بیوی کا نازک تعلق اس کی بہترین مثال ہے۔ میاں بیوی دونوں یا ان میں سے ایک اگر خواہش نفس کی پیروی اور شیطان کے اتباع میں حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تو گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا ' لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کبھی انجام کی فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن جب شیطان انھیں علیحدگی تک پہنچا دیتا ہے اور جانبین میں نفرتوں کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو تب انھیں کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے غلط راستہ راختیار کر کے خود اپنی زندگی برباد کی ہے۔ زندگی کے مجموعی سفر کے لیے عموماً اور عائلی زندگی کے لیے خصوصاً اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ زمین وآسمان کی ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے۔ اللہ ان سب کا آقا ہے۔ اسے بجا طور پر انھیں حکم دینے کا حق پہنچتا ہے۔ اسی حق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جن امتوں کو بھی کتاب دی انھیں اس بات کا حکم دیا اور مسلمانوں کو اب کتاب دی گئی ہے انھیں بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ خواہشات نفس اور شیطان کی پیروی کرنے کی بجائے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اس کی نافرمانی کے انجام سے ڈرو۔ اس کے احکام کی زنجیریں اپنے قدموں میں ڈال لو۔ خواہش نفس کو اس کی رضا کے سامنے سپر انداز کر دو۔ شیطان اللہ کا باغی اور تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کی پیروی کرنے کی بجائے اللہ کے احکام کی پیروی کرو۔ اور دل کی اس طرح تطہیر اور تعمیر کرو کہ وہ نیکی کی طرف لپکتا چلا جائے اور گناہ کی ہر بات سے اسے نفرت ہو جائے۔ یہی حکم پہلے بھی دیا گیا اور تمہیں بھی دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے تم اپنے اللہ کو راضی کر سکتے ہو اور اسی سے تم اپنی عائلی زندگی سے لے کر زندگی کے تمام دائروں میں کامیابی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔ اور اگر تمہیں اس بنیادی حقیقت کو ماننے سے انکار ہو تو پھر اس حقیقت کا سامنا کرو اور تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل ہو تو اسے پیش کرو کہ اللہ ہی کی مخلوق اور مملوک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب کو زندگی وہیں سے ملی ہے ' ہر مخلوق اسی سے غذا پاتی ہے اللہ ہی کی حفاظت سے ہر مخلوق زندہ ہے اور انسان بھی اسی کی حفاظت میں اور اسی کی توفیق سے زندگی کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار کرنا ایک بدیہی بات سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ انکار کے باوجود انسانوں کی طرف اپنے نبی علیہم السلام بھیجتا اور کتابیں نازل کرتا ہے تو کیا اس میں اس کی اپنی کوئی ذاتی احتیاج ہے جس کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے؟ فرمایا کہ اس کی اپنی کوئی احتیاج نہیں کیونکہ وہ تو غنی اور بے نیاز ہے۔ چونکہ وہ حمید بھی ہے اس لیے بے نیاز ہونے کے باوجود ساری مخلوق کو اپنے جود وکرم سے نواز رہا ہے۔ وہ انکار بھی کرتے ہیں تب بھی انھیں ہدایت عطا فرماتا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو اپنی تباہی سے بچ جائیں۔

جو کتابیں مختلف زمانوں میں انبیاء ورسل علیہم السلام پر نازل ہوئیں اور یہ کتاب جو تمہاری ہدایت کے لیے اتاری گئی ہے، ان سب میں تمام امتوں کو تقویٰ کا ہی حکم دیا گیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس میں شک ہی نہیں رہتا کہ دین الٰہی کا دارومدار ہی تقویٰ پر ہے۔ دل میں خوف خدا پیدا ہو گیا تو انسان کا ظاہرہ و باطن سنور گیا اور اگر دل خوف خدا سے ہی آشنا نہیں تو پھر زبان سے پارسائی کے ہزاروں دعوے کئے جائیں نفس اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

و قال بعض العارفین ھذہ الایۃ رحی ای القرآن لان جمیعہ یدور علیھا (قرطبیؒ) یعنی کاملین امت نے اس آیت کو سارے قرآن کا محور قرار دیا ہے۔

اہل عرب مدت ہائے دراز سے جس رسم و رواج کے پابند چلے آتے تھے ان سے کنارہ کش ہو جانا اور بالکل نئے قواعد ضوابط کا پابند ہو جانا کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے مالک الملک ہونے، زمین و آسمان کی ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھنے اور کسی کا محتاج نہ ہونے کا ذکر فرما کر انھیں تنبیہ فرما رہے ہیں کہ ان قواعد و ضوابط کی پابندی میں تمہارا ہی دنیا و دین کا فائدہ ہے اگر تم ان سے سرتابی کر کے اپنی جاہلانہ رسوم کی پابندی کرو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ پادری صاحبان بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام نے انسان کی اصلاح کے لیے دوزخ کی آگ اور عذاب کا سہارا لیا ہے جب کہ عیسائیت کا انحصار محض محبت الٰہی پر ہے۔ افسوس ! بائیبل ان کے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتی۔ ملاحظہ ہو۔ "جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ " (متی 28:10) اس سے ڈرو جس کو اختیار ہے کہ قتل کرنے کے بعد جہنم میں ڈالے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی سے ڈرو۔ (لوقا 12:5) (ضیاء)

مزید تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک گھر آباد نہیں رہا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان کا مالک ہے وہ تمہارے لیے کسی اور گھر کا انتظام کر دے گا۔ یہی ہدایات ان لوگوں کو دی گئیں جنہیں تم سے پہلے توراۃ، انجیل، زبور اور آسمانی کتابیں دی گئیں تھیں۔ تمہیں بھی یہی نصیحت کی جاتی ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اگر تم کفر، نافرمانی اور آپس میں ظلم و زیادتی کا رویہ اختیار کرو گے تو اللہ کی بادشاہی میں کوئی خلل واقع نہیں ہو گا۔ آسمانوں کا چپہ چپہ اور زمین کا ذرہ ذرہ اسی کے زیر اقتدار ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور حمد و ستائش کے لائق ہے کیونکہ کسی گھر کا اجڑنا اور خاندان کا بکھرنا معمولی بات نہیں لہٰذا بار بار اللہ تعالیٰ اپنی بادشاہی اور اختیارات کا ذکر فرما کر دونوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے باز رہنے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین فرما رہا ہے تا کہ میاں بیوی اپنے معاملات درست رکھنے کی کوشش کریں۔

(عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ (رض) اِنَّ رَجُلًا جَاءَہُ فَقَالَ اَوْصِنِیْ فَقَالَ سَاَلْتُ عَمَّا سَاَلْتُ عَنْہُ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مِنْ قَبْلِکَ اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ رَاْسُ کُلِّ شَیْءٍ ۔۔)

[مسند احمد : کتاب باقی مسند المکثرین، باب مسند ابی سعید الخدری]

"حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک آدمی نے آکر کہا مجھے نصیحت کیجئے انھوں نے کہا تو نے مجھ سے اس چیز کا سوال کیا ہے جس کے متعلق میں نے تجھ سے پہلے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا تھا۔ میں تجھے اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ ہر خیر کا سرچشمہ ہے۔"

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ سُءِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَنْ اَکْثَرِ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّۃَ قَالَ تَقْوَی اللّٰہِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ) [رواہ الترمذی : کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حسن الخلق]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کثرت کے ساتھ لوگوں کو جنت میں داخل کرنے والے عمل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ کا ڈر اور اچھا اخلاق۔" (فہم)

بندوں کی اطاعت اور ان کے شکر سے اللہ کے غنی ہونے کا بیان

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یتیموں اور کمزوروں کے ساتھ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیا تھا 'اور اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم اس لیے نہیں فرمایا تھا کہ اس میں اللہ کا کوئی فائدہ ہے یا اللہ کو اس کی کوئی احتیاج ہے 'کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اللہ کی ملکیت میں ہے اور وہ ہر چیز سے غنی ہے اور ہر چیز پر قادر ہے لیکن وہ بندوں کو نیکی اور خیر پر برانگیختہ کرتا ہے۔

اس آیت میں اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اور ان میں حاکم ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی مخلوق اور اس کی مملوک ہے 'اور جس طرح ہم نے تم کو احکام دیئے ہیں اس سے پہلے یہود اور نصاری کو بھی احکام دیئے تھے اور ہم نے ان کو بھی یہ حکم دیا تھا کہ اللہ سے ڈریں اور صرف تنہا اس کی عبادت کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت پر عمل کریں 'اسی طرح ہم نے تم کو بھی یہ حکم دیا ہے 'اور اگر تم اللہ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو کفر (انکار) کرو تو تمہارے کفر اور معصیت سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا جس طرح تمہارے ایمان 'اطاعت اور شکر سے اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا 'کیونکہ وہ مالک الملک ہے اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے 'اس نے یہ احکام اپنی رحمت سے صرف تمہارے فائدہ کے لیے دیئے ہیں اس کا ان میں کوئی فائدہ نہیں ہے 'اور یہ اس کی وصیت قدیمہ ہے صرف تم اس وصیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہو اور ہم نے پچھلی امتوں سے بھی کہا تھا اور تم سے بھی کہتے ہیں کہ اگر تم اللہ کے ان احسانات کو نہ مانو اور اس کی اطاعت نہ کرو 'اور اس کا شکر نہ بجالاؤ تو تمام آسمان اور زمینیں اللہ کی مالک میں ہیں اور ان میں سارے فرشتے اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں اور اللہ اپنی ہر مخلوق اور اس کی عبادت سے غنی ہے وہ اپنی بے پایاں نعمتوں اور احسانات کی وجہ سے بذاتہ حمد وثناء کا مستحق ہے کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

دوسری آیت میں پھر ذکر فرمایا اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو آسمانوں اور جو کچھ زمینیوں میں ہے 'یہ تاکید کے لیے ہے کہ زمین وآسمان میں وہ جس طرح چاہے تصرف فرماتا ہے 'زندہ کرنا 'مارنا 'صحت دینا 'بیمار کرنا 'مالدار اور مفلس کرنا یہ سب اللہ ہی کے تصرف سے ہوتا ہے 'وہی اپنی تمام مخلوق کا محافظ اور ان کا کفیل ہے اور یہ اس لیے بھی دوبارہ ذکر کیا کہ بندے اس سے ڈریں اور اس کی اطاعت کریں کیونکہ وہی تمام آسمانوں اور زمینوں کا اور جو کچھ ان میں ہے اس کا مالک ہے اور ان کا حاکم ہے 'ان کا محافظ ہے اور ان میں متصرف ہے۔ (تبیان)

فوائد

1: یعنی ہر چیز کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ اپنے فضل سے جس کو جس چیز کا چاہے عارضی طور پر مالک بنادے۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ کسی کی عارضی ملکیت کے منافی نہیں۔ قرآن کریم کی بہت سی حصر کی آیات میں ذاتی حصر ہے جیسے اسی کے پاس ہے قیامت کا علم وغیرہ۔ لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

2: معلوم ہوا کہ تقوی وطہارت کا حکم دائمی ہے۔ ہر دین میں اس کا حکم دتھا۔ لہٰذا یہ سنت متوارثہ ہے بلکہ روزہ، اعتکاف، نکاح وغیرہ، عبادات بھی قدیمی عبادتیں ہیں۔

3: یعنی اگر تم سب کافر ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ سارا عالم اس کی ملک ہے اس کے ہاں تمہاری اطاعتوں کی حاجت نہیں۔ محتاج تم ہو نہ کہ وہ۔

4: عالم کا ہر ذرہ اس کی حمد کرتا ہے۔ رب سارے عالم کا محمود ہے۔

آیت مبارکہ :

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾

لغۃ القرآن: [وَلِلّٰهِ : اور اللہ ہی کے لیے ہے] [مَا : وہ ٗجو] [فِي السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے] [وَمَا : اور وہ ٗجو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَكَفٰى : اور کافی ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ] [وَكِيْلاً : بطور کام نکالنے والے کے]

ترجمہ: اور اللہ ہی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہے۔

تشریح:

اس آیت کریمہ میں جو حقیقت سابقہ آیت میں بیان فرمائی تھی اسے تیسری دفعہ دہرایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے جب بھی خود سری دکھائی ہے اور اپنی طاقت و قوت کے زعم میں کمزور انسانوں پر مظالم توڑے ہیں۔ اور خود طاغوت بن کر لوگوں کو اپنی بندگی پر مجبور کیا ہے۔ اور اپنے جیسے انسانوں کو اپنے غلام بنا کر انھیں ایک فروختنی چیز بنا دیا ہے اور یا انسانیت کی تذلیل کرتے ہوئے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے سر جھکایا ہے ٗ کبھی مظاہر قدرت کی پوجا کی ہے ٗ کبھی دیوتاؤں سے مرادیں مانگی ہیں اور کبھی جنات سے پناہ طلب کی ہے ٗ یعنی کبھی تو اتنی سرکشی اختیار کی کہ خود خدا بن گیا اور کبھی اتنی فروتنی میں اترا کہ پتھروں تک کو مسجود بنا لیا۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ اللہ کو معبود سمجھا ٗ حاکم بھی مانا لیکن اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے سے انکار کر دیا۔ اللہ کے مقابلے میں شیطان کے احکام کا اتباع کیا۔ اپنے وضعی قوانین کے مطابق زندگی گزاری۔ اپنی عدالتوں میں طاغوتی نظام کے مطابق فیصلے کیے اور کرائے۔ انسانی زندگی میں یہ تینوں قباحتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب انسان اس بنیادی تصور سے تہی دامن ہو جاتا ہے کہ آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ اسی کی مخلوق ٗ اسی کی مملوک ٗ اسی کی اطاعت گزار اور اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ چونکہ اسی تصور کے دماغوں سے نکل جانے کے باعث انسان گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور ہر دور میں یہی وہ بیماری ہے جس نے انسانیت کو مریض بنایا ہے۔ اس لیے تین دفعہ اس کے علاج کو دہرایا گیا اور بار بار تنبیہ کی گئی کہ اس بنیادی تصور کے ہل جانے کے باعث انسانیت کی پوری تعمیر تباہی کا شکار ہوئی ہے۔ اس لیے جب تک اس خشت اول کو درست نہیں کیا جائے گا اس وقت تک انسان کی بگڑی قسمت کبھی نہیں بنے گی۔

کائنات کی بقا انسان کی مرضی سے وابستہ نہیں

دوسری آیت کریمہ میں وارننگ دی گئی ہے کہ قرآن کے مخاطبین کو اچھی طرح اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح کائنات کی کوئی چیز اپنی مرضی سے وجود میں نہیں آئی اسی طرح کسی چیز کی بقا بھی اس کی اپنی مرضی سے وابستہ نہیں۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے مٹا دیتا ہے۔ زمین بھی اسی نے بنائی ہے اور اس پر بسنے والے بھی اسی نے بسائے ہیں۔ جب تک وہ زندگی کی مہلت دیتا ہے ایک فرد بھی اور ایک قوم بھی زندگی گزارتی ہے اور اپنے گھروں اور اپنے شہروں میں آباد رہتی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کی تباہی کا فیصلہ فرماتے ہیں تو ان کی تباہی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ خاص طور پر رسول کی بعثت کے بعد رسول جس علاقے اور جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے ان کی زندگیوں کا دارومدار رسول کی دعوت کو قبول کرنے یا رد کرنے پر ہوتا ہے۔ اگر وہ قبول کر لیتے ہیں تو زندگی دراز ہو جاتی ہے اور اگر وہ رد کر دیتے ہیں تو عموماً رسول کو ہجرت کا حکم ملتا ہے اور اس کی قوم کو عذاب کے ذریعے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ قوم نوح ' قوم عاد ' قوم ثمود اور قوم لوط کی تاریخ عربوں کی جانی پہچانی تاریخ تھی۔ وہ اپنے تجارتی اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے۔ ذرا غور کریں کہ یہ قومیں اب کہاں ہیں۔ اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے جب یہ قومیں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں اور آج ان علاقوں میں دوسری قومیں آباد ہیں ' اسی طرح اگر اللہ چاہے تو تمہیں بھی مٹا دے اور تمہاری جگہ دوسری کسی قوم کو بسا دے۔ اللہ اس پر قادر ہے۔ اس کے لیے کسی قوم کو مٹا دینا اور اس کی جگہ کسی اور کو بسا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے کھنڈرات صرف یہ بتانے کے لیے نہیں کہ یہاں کبھی صنعت ' حرفت ' تجارت پر مبنی تہذیب آباد تھی ' بلکہ وہ یہ بتانے کے لیے ہیں کہ یہاں کبھی زندہ انسان رہتے تھے۔ ذرا غور کرو وہ کیوں مٹا دیے گئے ؟ یہاں کلچر نہ ڈھونڈو عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے

عبرت کی ایک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے (روح)

اور) یہ بھی تو غور کرو کہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہیں فرشتے و ستارے وغیرہ اور جو کچھ زمین میں ہے از قسم نباتات حیوانات، اور جمادات وغیرہ۔ اور یہ سب کے سب اللہ کی تسبیح و تہلیل اور توصیف و تحمید میں لگے ہوئے ہیں تو پھر مخلوقات کا ایک چھوٹا طبقہ جو جنوں اور انسانوں سے تعلق رکھتا ہے اس کا حمد الٰہی نہ کرنا اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف سے باز رکھنا کس شمار و قطار میں ہے اور یہ بھی تو اپنی جگہ حقیقت ہے کہ نقش کی تعریف دراصل نقاش کی تعریف ہوتی ہے۔

مخلوق کی تعریف اس کے خالق کی تعریف

۔۔یونہی۔۔ مخلوق کی تعریف اس کے خالق کی تعریف، مصنوع کی تعریف اس کے صانع کے تعریف قرار پاتی ہے اور اب کائنات میں کسی بھی شے کی تعریف کی گئی تو وہ خالق کائنات کی ہو گی تو حمد ہو گی اور اگر یہ سب کچھ بھی نہ ہو تو خدا کی کامل و اکمل حمد تو وہی ہے جو خود اس نے اپنی فرمائی ہے چونکہ اس کی اپنی معرفت کامل تو اب اس معرفت کی بنیاد پر جو حمد ہو گی وہ حمد بھی کامل ہو گی تو اب اس کی اپنی کی ہوئی حمد سب سے اعلی وارفع ہے لہٰذا۔ وہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے تب جا کے وہ محمود حمید بنے۔

یادرہے کہ بندے جو خدا کی حمد کرتے ہیں اس سے خود اس کے کمالات میں کسی طرح کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ خود تعریف کرنے والا اپنے کو قابل تعریف بناتا ہے۔۔الغرض۔۔اس حمد و ثنا سے خود تعریف کرنے والے کا فائدہ وابستہ وہم رشتہ ہے، اس ارشاد ربانی میں :
للہ مافی السماوات ومافی الارض۔ کی تکرار بڑی ہی خوبیوں پر مشتمل ہے پہلی جگہ اسے اپنے مالک کل ہونے کی تمہید بنایا دوسری جگہ اپنے غنی اور حمید ہونے کا عنوان قرار دیا اور تیسری جگہ اپنے کارساز ہونے کو مدلل فرمایا۔۔ چنانچہ فرمایا اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے اور تمہارے امور کی تدبیر فرمانے والا اور تمہارا وکیل ہے تمہیں بھی چاہیے کہ تم اپنے جملہ امور اسی کے سپرد کر دو اور صرف اسی پر سہارا کرو غیروں کے سہارے بالکل ترک کر دو، سہارا تو ایسے قادر مطلق کا جس کی قدرت کاملہ کا حال یہ ہے کہ ۔(اشرفی)

آیت مبارکہ :

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

لغۃ القرآن: [اِنْ : اگر] [يَّشَاْ : وہ چاہے] [يُذْہِبْكُمْ : تو وہ لے جائے گا تم کو] [اَيُّهَا النَّاسُ : اے لوگو] [وَيَاْتِ : اور وہ لے آئے گا] [بِاٰخَرِيْنَ : دوسروں کو] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلٰى ذٰلِکَ : اس پر] [قَدِيْرًا : قدرت رکھنے والا]

ترجمہ: اے لوگو ! اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) دوسروں کو لے آئے، اور اللہ اس پر بڑی قدرت والا ہے۔

تشریح:

اللہ عَزَّوَجَلَّ کائنات سے غنی ہے

ساری کائنات اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا اور ساری دنیا اس کی نافرمان ہو جائے تو اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ غنی، بے پرواہ ہے وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے، تمہیں موت دے کر دوسری قوم کو یہاں آباد کر دے جیسے فرعون کے ملک کا دوسروں کو مالک بنادیا۔ اس کی شان بلند ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ حضرت ابوذر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : اے میرے بندو ! تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دوں لہٰذا مجھ سے ہدایت مانگو میں تمہیں ہدایت دوں گا اور تم سب فقیر ہو سوائے اس کے جسے میں غنی کر دوں لہٰذا مجھ سے مانگو، میں تمہیں روزی دوں گا

اور تم سب مجرم ہو سوائے اس کے جسے میں سلامت رکھوں تو تم میں سے جو یہ جان لے کہ میں بخش دینے پر قادر ہوں پھر مجھ سے معافی مانگے تو میں اسے بخش دوں گا اور پروا بھی نہ کروں گا اور اگر تمہارے اگلے پچھلے، زندہ مردے، تر و خشک سب میرے بندوں میں سے سب سے نیک بندے کے دل پر ہو جائیں (یعنی سارے انسان اس نیک آدمی کی طرح ہو جائیں) تو یہ ان کی نیکی میرے ملک میں مچھر کے پر برابر اضافہ نہ کرے گی اور اگر تمہارے اگلے پچھلے زندہ مردے تر و خشک میرے بندوں میں سے بدبخت ترین آدمی کے دل کے مطابق ہو جائیں تو ان کے یہ جرم میرے ملک سے مچھر کے پر برابر کم نہ کریں گے اور اگر تمہارے پچھلے زندہ مردے تر و خشک ایک میدان میں جمع ہوں اور پھر تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی تمنا و آرزو مجھ سے مانگے پھر میں ہر مانگنے والے کو دیدوں تو یہ میرے ملک کے مقابل ایسے ہی کم ہو گا جیسے تم میں سے کوئی دریا پر گزرے اور اس میں سوئی ڈبوئے پھر اسے اٹھائے (یعنی کچھ بھی کم نہ ہو گا۔) یہ اس لیے ہے کہ میں عطا کرنے والا ہوں، بہت دینے والا ہوں، جو چاہتا ہوں کرتا ہوں میری عطا کیلئے صرف میرا فرما دینا کافی ہے اور میرے عذاب کیلئے صرف میرا فرما دینا ہی کافی ہے۔ میرا حکم کسی شئے کے متعلق یہ ہے کہ جب کچھ چاہتا ہوں تو صرف اتنا فرماتا ہوں "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے۔ (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، ۴۸۔ باب، ۲۲۲/۴، الحدیث : ۲۵۰۳) (صراط)

دنیا کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر معاشرے کے کمزور طبقہ کو غالب کر دیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کی کشمکش اس بات پر زندہ ثبوت ہے۔ یہودی اپنی حد سے باہر ہوئے تو ان پر عیسائیوں کو مسلط فرمایا۔ عیسائی حدود پھلانگنے لگے تو کسی دوسری قوم کو غلبہ عطا ہوا۔ مسلمانوں کی تاریخ بھی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک گروہ کو دوسرے پر کس طرح مسلط فرمایا۔ مکہ مکرمہ مرکز ہونے کے باوجود مدینہ والوں کے زیر نگین ہوا۔ حجاز پر شامیوں نے حکومت کی۔ امویوں کو اقتدار سے ہٹایا تو پانچ سو سال تک عباسیوں کا پھریرا بلند ہوا۔ پھر عباسیوں پر ترکوں کا غلبہ ہوا۔ علیٰ ھذا القیاس ہر دور اور قوم پر اللہ تعالیٰ کا فرمان غالب رہا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر قادر اور فیصلہ صادر کرنے والا ہے۔ لہٰذا جو دنیا کے صلہ کے لیے کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی کوشش اور اپنی حکمت و مشیّت کے مطابق اسے دنیا نصیب فرمائے گا۔ جو دنیا کے ساتھ آخرت کا خواہاں ہو گا اللہ اسے بھی اس کی کوشش اور اپنی حکمت اور تقسیم کے مطابق اجر عطا فرمائے گا۔ یہاں دنیا کے طالب کو دنیا کے اجر کا اشارہ فرما کر آخرت کے ثواب کا ذکر اس لیے کیا تاکہ لوگ صرف دنیا کے لیے نہیں بلکہ دنیا و آخرت کے صلہ و ثواب کے لیے کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔ (فہم)

اللہ کی بے نیازی

یعنی اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھا لے اور دوسرے لوگ مطیع و فرمان بردار پیدا کر دے۔ اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی خوب ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید اور تخویف بھی ہو گئی۔

حضرت سلیمان (رض) کی قوم

سعید بن منصور اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دست مبارک حضرت سلمان (رض) کی پشت پر مار کر فرمایا تھا یقیناً وہ لوگ اس کی قوم والے ہوں گے۔ اس حدیث کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم ویسا ہی ہو گا جیسے آیت اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ الخ کا۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ (رض) کا بیان منقول ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ اتری تو عرض کیا گیا یارسول اللہ یہ کون لوگ ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دست مبارک حضرت سلمان (رض) پر رکھ کر فرمایا اگر ایمان ثریا پر بھی ہوگا (یعنی زمین پر ایمان کا کہیں وجود نہیں رہے گا) تب بھی کچھ لوگ ان (کی قوم) میں کے ایمان کو حاصل کرلیں گے۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آیت وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ اگر تم منہ پھیر لو گے تو اللہ تمہارے علاوہ کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا پھر وہ لوگ تم جیسے (کافر بداعمال) نہ ہوں گے تلاوت فرمائی صحابہ (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کون لوگ ہوں گے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دست مبارک سلمان (رض) کی ران پر مار کر فرمایا یہ اور اس کی قوم والے اگر دین ثریا پر بھی ہوگا تو فارس کے کچھ لوگ اس کو پالیں گے۔ ترمذی نے ابوہریرہ کی روایت سے یہ بھی بیان کیا کہ رسول اللہ کے سامنے عجمیوں کا تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا میں ان پر یا (فرمایا) ان میں سے بعض پر تم سے یا (فرمایا) تمہارے بعض لوگوں سے زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔

مشائخ ومحدثین ماوراء النہر

میں کہتا ہوں شاید ان احادیث میں حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی اور آپ جیسے دوسرے مشائخ ماوراء النہر کی طرف اشارہ ہے یہ بزرگ اگرچہ عجمی النسل نہ تھے مگر وطنیت کے اعتبار سے عجمی تھے اکثر حضرات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آل اور صحابہ کرام (رض) کی نسل سے تھے انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مردہ سنت کو زندہ کیا اور کبھی بدعت کو سئیہ ہو یا حسنہ پسند نہیں کیا۔ مولٰنا جامی نے کیا خوب کہا ہے۔

سکہ کہ در یثرب وبطحازند

نوبت آخر بنجار ازدند !

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماوراء النہر کے محدثین کرام اور فقہاء عظام کی طرف اشارہ ہو جیسے امام ابوعبداللہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

امام ابوحنیفہ

شیخ محمد بن یوسف صالحہ نے کہا کہ شیخ نے یعنی شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس حدیث میں امام ابوحنیفہ اور آپ کے ساتھی مراد ہیں۔ شیخ بن یوسف صالحہ نے کہا سیوطی کے اس کوئی میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اہل فارس میں سے کوئی بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھیوں کے علمی درجہ کو نہیں پہنچا اور سلمان فارسی (رض) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے جداعلیٰ تھے۔

(تفسیر مظہری)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو موجودہ انسانوں کو ختم کر کے دوسروں کو لاسکتا ہے۔

۲۔ دنیا اور آخرت میں اجر سے نوازنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

آیت مبارکہ :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

لغۃ القرآن: [مَنْ : جو] [كَانَ يُرِيْدُ : ارادہ کرے گا] [ثَوَابَ الدُّنْيَا : دنیا کے ثواب کا] [فَعِنْدَ اللّٰهِ : تو اللہ کے پاس (تو)] [ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ : دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [سَمِيْعًا : سننے والا] [بَصِيْرًا : دیکھنے والا]

ترجمہ: جو کوئی دنیا کا انعام چاہتا ہے تو اللہ کے پاس دنیا و آخرت (دونوں) کا انعام ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

تشریح:

اس کی قدرت کا عالم تو یہی ہے کہ وہ جب تک چاہے کسی کو اس دنیا میں زندگی گزارنے دے اور جب چاہے انھیں مٹا کر ان کی جگہ کسی دوسری قوم کو لا بسائے۔ لیکن اس وقت اس نے اپنا رسول بھیج کر تمہارے سامنے دونوں راستے کھول دیے ہیں۔ اگر رسول کی دعوت کو قبول کرتے ہو تو اس میں دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔ اور اگر تم اس کا انکار کر کے صرف دنیا اور اس کی نعمتوں کے حصول کے طلبگار ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا بھی اسی کے قبضے میں ہے اور آخرت بھی اسی کے قبضے میں۔ وہ چونکہ غنی ہے اس لیے اگر کوئی صرف دنیا طلبی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ فوراً اُس کا رستہ نہیں روکتا بلکہ اسے دنیا کی طلب میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ البتہ جو شخص اللہ کی رسول کا اتباع کر کے آخرت کا مسافر بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت دونوں سے نوازتے ہیں۔ تو کس قدر عجیب بات ہے کہ تمہیں جس جگہ سے دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں مل سکتی ہیں تم اس سے منہ پھیر چکے ہو۔ اور جو رویہ تمہیں آخرت سے محروم کر رہا ہے اس کی طرف بگٹٹ بھاگے جا رہے ہو۔ کاش تمہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ کیونکہ تمہارا ہر عمل اور تمہاری ہر بات اللہ سن بھی رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے۔ (روح)

انسان کی اپنی کوتاہ نظری اور کم ہمتی ہے کہ وہ بارگاہ رب العلمین سے صرف دولت، شہرت، عزت و جاہت کا ہی سوال کر کے رہ جائے۔ ورنہ اس کریم، رحیم اور وہاب کی جناب سے تو جو مانگا جائے وہ ملتا ہے۔ انسان فقط فنا ہونے والی نعمتوں کے سوال پر کیوں اکتفا کرے۔ کیوں نہ اس کی محبت کا جام رنگیں مانگے اور اس کی رضا کے لیے دامن طلب پھیلائے۔ جب دینے والا بخیل نہیں تو مانگنے والا مانگنے میں کیوں بخل کرے۔ (ضیاء)

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

حضرت عبداللہ بن رواحہ کا تقویٰ

حضرت عبداللہ بن رواحہ کو جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیبر والوں کی کھیتیوں اور باغوں کااندازہ کرنے کو بھیجاتو انھوں نے آپ کو رشوت دینا چاہی کہ آپ مقدار کم بتائیں توآپ نے فرمایا سنواللہ کی قسم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں اور تم میرے نزدیک کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو لیکن باوجود اس کے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت میں آکر یا تمہاری عداوت کو سامنے رکھ کر ناممکن ہے کہ میں انصاف سے ہٹ جاؤں اور تم میں عدل نہ کروں۔ یہ سن کر وہ کہنے لگے بس اسی سے توزمین وآسمان قائم ہے۔ (گلدشتہ)

صرف دنیاوی اجر طلب کرنے کی مذمت اور دنیااور آخرت میں اجر طلب کرنے کی مدح

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اپنے اعمال اور جہاد سے دنیاوی مال اور عزوجاہ کے حصول کاارادہ کرتا ہے تواللہ کے پاس دنیااور آخرت دونوں کا اجر وثواب ہے ٗمثلاجو مجاہد اپنے جہاد سے مال غنیمت کے حصول کاارادہ کرتا ہے تو اسے کیا ہوا کہ وہ فقط خسیس اور گھٹیا چیز کاارادہ کر رہاہے ٗاس پر لازم ہے کہ وہ دنیااور آخرت دونوں کی خیر اور اجر وثواب کاارادہ کرے ٗاسی طرح جو موذن ٗامام ٗخطیب ٗواعظ ٗمفتی ٗمحدث اور فقیہ اپنی دینی ٗتبلیغی اور تدریسی خدمات سے صرف دنیاوی وظائف اور نذرانوں کاارادہ کرتے ہیں وہ عارضی اور فانی اجر کے طالب ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی خدمات میں اجر اخروی کی نیت رکھیں اور دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بقدر حاجت اور فراغت وظائف کو حاصل کریں ٗاور ہمارے دور میں جو امراء اور حکمرانوں کا طبقہ ہے اور اسکولوں اور کالجوں میں ماسٹروں اور پروفیسروں کا جو شعبہ ہے اور جو لوگ جو عوام کو انتظامی اور تعلیمی خدمات مہیا کرتے ہیں ان کے ہاں توان خدمات کے مقابلہ میں اجر آخرت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ یہ لوگ علماء پر طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگوں کے چندوں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں جب کہ امراء ٗحکام اور پروفیسروں کو جو تنخواہیں ملتی ہیں وہ عوام سے ٹیکس وصول کرکے دی جاتی ہیں اور ہمارے زمانہ میں (اکتوبر ۱۹۹۶ء) ایک متوسط امام مسجد کی تنخواہ دوہزار سے تین ہزار تک ہوتی ہے اور دینی تک ہوتی ہے اور دینی مدرس کی تنخواہ دوہزار سے چارہزار تک ہوتی ہے اور اس مہنگائی کے دور میں جب کہ دودھ بیس روپے لیٹر ٗآٹا آٹھ روپے کلو ٗاور گوشت ۱۲۵روپے کلو ہے اس آمدنی سے بمشکل ضروریات زندگی پوری ہوتی ہیں ٗاس کے مقابلہ میں ایک متوسط پروفیسر کی تنخواہ ۱۰ہزار روپے ہوتی ہے ٗانتظامی افسروں ٗحکمرانوں ٗوزراء اور گورنروں کی تنخواہیں ٗان کے الاؤنسز اور دیگر مراعات کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے ٗجب یہ لوگ غیر ملکی دوروں پر جاتے ہیں تواپنے ساتھ چالیس ٗپچاس افراد کولے جاتے ہیں اور ان کی شاہ خرچیاں لاکھوں سے متجاوز ہو کر کروڑوں تک پہنچتی ہیں اور ان کے یہ تمام اخراجات عوام سے وصول کیے ہوئے جبری ٹیکسوں سے پورے ہوتے ہیں ٗجب کہ علماء کی جو خدمات کی جاتی ہیں وہ ظلم اور جبر سے نہیں بلکہ خوشی اور اختیار کے ساتھ دیئے ہوئے چندوں اور نذرانوں سے ہوتی ہیں ٗپھر بھی ان لوگوں کی زبانیں علماء کو یہ طعنہ دینے سے نہیں تھکتیں کہ یہ چندوں سے پلنے والے لوگ ہیں ٗجب کہ علماء اپنی خدمات پر اجر اخروی کے طالب ہوتے ہیں اور دنیا سے صرف بقدر ضرورت لیتے ہیں اور یہ

امراء ٗحکام ٗوزراء اور گورنر ملکی اور ملی خدمات کا جو معاوضہ لیتے ہیں اس میں ان کے ہاں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے ان کے پیش نظر صرف دنیا ٗاس کی زیب وزینت اور عیاشیاں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اور آیات میں بھی اس طرز عمل کی مذمت کی ہے اور ان کی مدح فرمائی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کے طالب ہیں :

(آیت) ”فمن الناس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا ومالہ فی الاخرۃ من خالق، ومنھم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار“۔ (البقرہ : ٢٠٠)

ترجمہ : پھر لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب ! ہمیں دنیا میں دے اور ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ٗاور بعض وہ ہیں جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب ! ہمیں دنیا میں (بھی) اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

(آیت) ”من کان یرید حرث الاخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا ومالہ فی الاخرۃ من نصیب“۔ (الشوری : ٢٠)

ترجمہ : جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اس کو اس میں سے دیں گے ٗاور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

(آیت) ”من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا مانشآء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلھا مذموما مدحورا، ومن اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مومن فاولئک کان سعیھم مشکورا، کلا نمد ھؤلآء وھؤلآء من عطآء ربک وماکان عطآء ربک محظورا، انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض وللاخرۃ اکبر درجات واکبر تفضیلا، (الاسراء : ٢١۔ ١٨)

ترجمہ : جو لوگ صرف دنیا کے خواہش مند ہیں ہم ان میں سے جس کو جتنا چاہیں اسی دنیا میں دے دیتے ہیں ٗپھر ہم نے اس کے لیے دوزخ بنادی ہے وہ اس میں ذلت سے اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا، اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لیے عمل کرے بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کا عمل مقبول ہوگا، ہم سب کی مدد فرماتے ہیں ان کی بھی اور ان کی بھی، اور آپ کے رب کی عطا (کسی سے) رد کی ہوئی نہیں ہے، دیکھیے ہم نے کس طرح ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور یقینا آخرت کا درجہ بہت بڑا ہے اور اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ (تبیان)

مسائل

1۔ اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا وآخرت کا سب کچھ ہے اس لئے اس سے دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی دونوں طلب کرنی چاہئیں۔

2۔ تم زبان سے یا دل سے جو مانگو اور چاہو وہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ تمہیں اس کا اجر وبدلہ دے سکتا ہے۔

آیت مبارکہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے ہو] [كُوْنُوْا : تم ہو جاؤ] [قَوّٰمِيْنَ : بہت زیادہ نگرانی کرنے والے] [بِالْقِسْطِ : انصاف کی] [شُهَدَاۗءَ : (اور) گواہی دینے والے] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [وَلَوْ : اور اگرچہ (وہ پڑے)] [عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ : تمہارے اپنے آپ پر] [اَوِالْوَالِدَيْنِ : یا والدین پر] [وَالْاَقْرَبِيْنَ : اور قرابت داروں پر] [اِنْ يَّكُنْ : اگر وہ ہوں] [غَنِيًّا : مالدار] [اَوْ فَقِيْرًا : یا محتاج] [فَاللّٰهُ : تو اللہ] [اَوْلٰى : زیادہ حمایتی ہے] [بِهِمَا : ان دونوں کا] [فَلاَ تَتَّبِعُوا : پس تم پیروی مت کرو] [الْهَوٰٓى : خواہش کی] [اَنْ : کہ] [تَعْدِلُوْا : انصاف (نہ) کرو] [وَاِنْ : اور اگر] [تَلْوٗٓا : تم مروڑتے ہو (زبانوں کو)] [اَوْ : یا] [تُعْرِضُوْا : بے رخی کرتے ہو] [فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقینا اللہ] [كَانَ : ہے] [بِمَا : اس سے جو] [تَعْمَلُوْنَ : تم لوگ کرتے ہو] [خَبِيْرًا : باخبر]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ (گواہی) خود تمہارے اپنے یا (تمہارے) والدین یا (تمہارے) رشتہ داروں کے ہی خلاف ہو، اگرچہ (جس کے خلاف گواہی ہو) مال دار ہے یا محتاج، اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش نفس کی پیروی نہ کیا کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ (گے) ، اور اگر تم (گواہی میں) پیچ دار بات کرو گے یا (حق سے) پہلو تہی کرو گے تو بیشک اللہ ان سب کاموں سے جو تم کر رہے ہو خبر دار ہے۔

تشریح:

شان نزول

حضرت سید المفسرین ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام اور اسد اور اسید بن کعب اور تعلبہ بن قیس اور عبداللہ بن سلام کے بھانجوں اور یامین بنیامین کے معاملہ میں نازل ہوئی یہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت آئے اور عرض کیا حضور ہم آپ پر اور قرآن پر موسیٰ (علیہ السلام) اور توراۃ پر اور حضرت عزیر پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے سوا سب سے انکار کرتے ہیں اس کے جواب میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بل امنوا باللہ تعالیٰ و محمد وبکتابہ القرآن وبکل کتاب کان قبلہ فقالوالا نفعل۔ نہیں بلکہ اللہ پر ایمان لاؤ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور ان کی کتاب قرآن پر اور تمام کتابوں پر جو پہلے تھیں تو وہ بولے ایسا تو نہیں کریں گے اس پر یہ حکم نافذ ہوا۔ (روح المعانی) آیہ کریمہ کا مفہوم منطوق واضح کررہا ہے کہ قرآن پاک پر ایمان لانے کے ساتھ ان تمام کتب پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جو سابقہ انبیاء کرام (علیہم السلام) پر نازل ہوئیں ان میں سے ایک نبی یا ایک کتاب کا انکار سب کا انکار ہے جیسے متنبّی قادیاں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شان میں کہتا ہے کہ انھیں جو وحی ہوئی وہ سب شیطانی تھیں معاذ اللہ عزوجل (حسنات)

اس سے پہلی آیتوں میں عورتوں 'یتیم لڑکیوں اور کمزور بچوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا تھا 'اور عورتوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ اگر انھیں اپنے شوہروں سے بے رغبتی اور علیحدگی کا خطرہ ہو تو وہ اپنے بعض حقوق ترک کر کے صلح کرلیں 'اور شوہروں کو حکم دیا تھا کہ وہ بیویوں کے ساتھ عدل اور انصاف کریں 'غرض یہ کہ اس پورے رکوع میں عائلی اور خانگی معاملات میں عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا تھا اور اس آیت میں عمومی طور پر عدل اور انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔

بنیادی طور پر امت مسلمہ فریضہ شہادت کی ادائیگی کے لیے منتخب کی گئی ہے تاکہ دنیا میں اپنے قول اور فعل کے ساتھ حق کے ترجمان اور توحید کی گواہی دیتے رہیں۔ آخرت میں پہلی امتوں کے بارے میں انبیاء کی تائید اور ان کی نبوت کی شہادت دیں گے۔ جسے قرآن مجید اور رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں بیان فرمایا ہے:

(لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) [البقرۃ: ۱۴۳]

"تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔"

(اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ) [رواہ البخاری: کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت]

"مسلمانو! تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔"

لیکن اس آیت میں لفظ "قسط" استعمال فرما کر عدل وانصاف قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے رسولوں کو واضح دلائل اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں اور لوہا نازل کیا جس میں بڑی قوت اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد ہیں۔ [الحدید: ۲۵]

یہاں شہادت سے مراد وہ گواہی ہے جو کسی واقعہ یا مقدمہ کے ثبوت کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ اس پر قائم ہونے کا حکم دیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اس پر پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ قائم رہا جائے۔ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل اور احترام کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے تاکہ معاشرے میں حق وانصاف کا بول بالا اور عدالتوں میں عدل کا ترازو قائم رہے۔ اس کے لیے گواہی کا عدل وانصاف کے اصول پر پورا اترنا اور قائم ہونا بے حد ضروری ہے۔ مقدمے کا ریکارڈ بھی تحریری شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ جج اس کا پابند ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ

اچھی طرح گواہی کی چھان بین کرے کیونکہ گواہی کا مقدمے میں بنیادی کردار ہوتا ہے۔ کتنے مقدمات کے فیصلے اس بات پر شاہد ہیں کہ جھوٹی شہادتوں کی وجہ سے بے گناہ شخص پھانسی کے پھندے پر لٹک گیا اور اصل مجرم نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ مزید جرائم کا ارتکاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا گواہی اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر بلا رعایت اور لحاظ واقعات کے مطابق دینی چاہیے۔ بیشک یہ گواہی انسان کے اپنے نفس، والدین، اعزہ واقرباء، مالدار یا کنگال کے خلاف ہو خواہ تمہیں ان کا مفاد اور جان کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ والدین کا رشتہ مقدس اور قابل صد احترام، اعزہ واقرباء تمہیں بڑے پیارے، دولت مند موثر اور غریب قابل رحم اور خیر خواہی کے لائق ہے لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب کا تم سے زیادہ خیر خواہ اور ہمدرد ہے تم اچھے برے جذبات کے پیچھے لگنے کے بجائے شہادت عدل پر قائم ہو جاؤ۔ اس میں بے انصافی، لچک اور کسی قسم کا اغراض نہیں ہونا چاہیے۔ یقین جانو اللہ تعالیٰ تمہاری نیت اور عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

(عَنْ اِنَسٍ (رض) قَالَ سُ ءِلَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَنِ الْکَبَآءِرِقَالَ الْاِشْرَاکُ باللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَھَادَۃُ الزُّوْرِ) [رواہ البخاری: کتاب الشھادات، باب ما قیل فی شھادۃ الزور]

”حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کبیرہ گناہوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہ ہیں۔“ (روح)

قوام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد کثرت عددی نہیں بلکہ اس سے ثبات اور استحکام فی الشادۃ کی تاکید مقصود ہے یعنی جب شہادت دو تو خوب مستحکم ہو کر۔ پہلے زوجین، یتیم بچوں بچیوں کے حقوق کا ذکر چلا آیا ہے۔ اس میں کبھی عدالت تک جانے کی نوبت آجاتی ہے۔ وہاں فیصلہ گواہوں کی گواہی سے کیا جاتا ہے۔ اگر گواہ سچی گواہی نہ دے تو حق دار کی حق تلفی ہو جاتی ہے اور ظلم جس کے انسداد کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ہے اس کو الٹا قانون کا سہارا مل جاتا ہے اس لیے گواہوں کو سچی سچی گواہی دینے کا حکم دیا جا رہا ہے اور ان تمام امور کو جو سچی گواہی دینے سے انسان کو روکتے ہیں مثلاً اپنا ذاتی فائدہ، ماں باپ کا پاس، قریبی رشتہ داروں کی رعایت وغیرہ کو ذکر کر کے ان کو خاطر میں نہ لانے کی تاکید کی جارہی ہے۔ مندرجہ بالا موانع کے علاوہ کبھی یہ خیال انسان کو حق کے اظہار سے روک دیتا ہے کہ جس کے خلاف میں گواہی دے رہا ہوں وہ امیر کبیر ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی مسکین کی مسکنت اور غربت کا احساس انسان کے دل میں رحم وشفقت کے جذبات ابھار دیتا ہے اور اس غریب کے خلاف سچی بات کہنے سے اس لیے ہچکچاتا ہے کہ اس سے اس غریب کو نقصان نہ پہنچے۔ انسانی نفسیات کا کتنا دقیق محاسبہ ہے۔ فرمایا عدالت میں کھڑے ہو کر ان احساسات کو بالکل دل سے نکال دو اور بڑی سچائی کے ساتھ گواہی دو۔ ”فاللہ اولی بھما“۔ کتنا پیارا جملہ ہے یعنی تم کسی کی خیر خواہی بھلا کیا کرو گے۔ تم اپنے رب کا حکم مانو۔ تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ خود ان (غریب وامیر) کا خیر خواہ ہے۔ اس آیت کی ابتدا میں دو لفظ ”شھداء للہ“ کتنے پر شکوہ اور اثر آفرین ہیں۔ یعنی یہ نہ سمجھو کہ تم کسی انسان کے لیے گواہی دے رہے ہو اور جو تمہارے دل میں آئے کہہ دیا تو کوئی تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ نہیں یہ گواہی کسی انسان کے لیے نہیں بلکہ اللہ ذوالمجد والعلی کے لیے ہے۔ اب سوچ لو کیا تم اس کو ناراض کرنے کی ہمت رکھتے ہو۔ سبحان اللہ ! کیا جلال وشکوہ ہے کلام احکم الحاکمین ہیں۔ (ضیاء)

مسائل

١۔ مسلمانوں کو صرف اللہ کے لیے عدل وانصاف پر قائم ہونا چاہیے۔

٢۔ عدل وانصاف کے راستے میں کسی رشتہ دار اور خواہش کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

فوائد

1: اس میں حاکموں، گواہوں، عالموں اور درویشوں اور بادشاہوں سب سے خطاب ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق انصاف کرے۔ قوامین مبالغہ فرما کر یہ بتایا گیا کہ مسلمان کی ہر بات، ہر عمل، زندگی کا ہر شعبہ انصاف پر مبنی ہو، اپنے گناہوں کا اقرار، نیکیوں میں قصور کا اعتراف غرضیکہ ہزارہا چیزیں انصاف میں داخل ہیں۔

2: اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے۔ایک یہ کہ ماں باپ کی خدمت، قرابت داروں سے سلوک اچھی چیز ہے مگر ذاتی معاملہ میں۔ دینی، قومی معاملات میں کسی کا لحاظ نہیں۔ دوسرے یہ کہ غنی کا رعب، فقیر پر رحم، انصاف کے لیے آڑ ہیں۔ اس آڑ کو ہٹانا لازم ہے۔ تیسرے یہ کہ رحم سے عدل افضل ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ کا حق سب سے زیادہ ہے۔

3: یعنی تاویلیں کرکے انصاف کا خون کرو اور ظلم کو انصاف کے رنگ میں دکھاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجرم کو ناحق چھڑانے کی کوشش کرنا۔ حاکم کا غلط فیصلہ کرنا اور اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا، عالم کا غلط تاویلوں سے غلط مسئلہ کا درست ثابت کرنا، لیڈروں کا ناحق کو حق ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ سب ظلم میں داخل ہے اور سخت جرم ہے۔ قرآن کی صحیح تاویل بوقت ضرورت شرعیہ عین عبادت ہے اور غلط تاویل، تحریف و کفر ہے۔

آیت مبارکہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو] [اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے ہو] [اٰمِنُوْا : تم ایمان لاؤ] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَرَسُوْلِهٖ : اور اس کے رسولوں پر] [وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ : اور اس کتاب پر جو] [نَزَّلَ : اس نے بتدریج اتاری] [عَلٰي رَسُوْلِهٖ : اپنے رسول پر] [وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ : اور اس کتاب پر جو] [اَنْزَلَ : اتاری] [مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے] [وَمَنْ : اور جو] [يَّكْفُرْ : انکار کرے گا] [بِاللّٰهِ : اللہ کا] [وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ : اور اس کے فرشتوں کا] [وَكُتُبِهٖ

: اور اس کی کتابوں کا] [وَرُسُلِہٖ : اور اس کے رسولوں کا] [وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ : اور آخری دن کا] [فَقَدْ ضَلَّ : تو وہ گمراہ ہوا ہے] [ضَلٰلاً م بَعِیْدًا : دور کی گمراہی میں]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم اللہ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمائی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے (اس سے) پہلے اتاری تھی ایمان لاؤ، اور جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا انکار کرے تو بیشک وہ دور دراز کی گمراہی میں بھٹک گیا۔

تشریح:

شانِ نزول

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ آیت عبداللہ بن سلام اور اسد واسید و ثعلبہ بن قیس اور سلام و سلمہ و یامین کے حق میں نازل ہوئی یہ لوگ مومنین اہل کتاب میں سے تھے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم آپ پر اور آپ کی کتاب پر اور حضرت موسیٰ پر اور توراۃ پر اور عُزیرؑ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے سوا باقی کتابوں اور رسولوں پر ایمان نہ لائیں گے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور قرآن پر اور اس سے پہلی ہر کتاب پر ایمان لاؤ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن)

قرآن مجید میں یہی آیت مبارکہ ہے جس میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے دوبارہ ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے تین آراء قائم کی ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ یہاں ایمان داروں سے مراد صرف دعوی ایمان رکھنے والے منافقین کو خطاب کیا گیا ہے۔ امام رازی (رح) اور ان کے ہمنوا اہل علم کا خیال ہے "اٰمَنُوْا" سے مراد یہودی ہیں کیونکہ یہودی علماء کا ایک وفد رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ ہم حضرت موسیٰ (علیہ السلام)، حضرت عزیر (علیہ السلام) اور توراۃ پر ایمان رکھتے ہوئے آپ اور قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ عیسیٰ (علیہ السلام) اور دوسرے انبیاء اور آسمانی کتابوں کو نہیں مانتے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ اے لوگو ! جو موسیٰ (علیہ السلام) اور عزیر (علیہ السلام) اور محمد کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کا اظہار کرتے ہو تمہیں اللہ، اس کے رسول اور قرآن مجید کے ساتھ تمام انبیاء پر ایمان لانا چاہیے۔ تیسرے طبقہ کا خیال ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ہی خطاب کیا گیا ہے جس کا معنی ہے اے ایمان کے دعویدار لوگو ! اسلام کو مکمل طور پر اپناتے ہوئے اس پر پوری استقامت کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ یہاں اللہ، اس کے رسول اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے ساتھ پہلے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ پھر ایمان کے پانچ اجزاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جو ان کا انکار کرتا ہے وہ صرف گمراہ ہی نہیں بلکہ دور کی گمراہی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ (فہم)

صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کا مفہوم

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو صاحب ایمان کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد انھیں پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سرسری نظر میں یہ بات بہت عجیب سے معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی صاحب ایمان ہیں انھیں دوبارہ ایمان لانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے ؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی کپڑے پہنے کھڑا ہو اسے یہ کہا جائے کپڑے پہن کے آؤ۔ حقیقت یہ ہے یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں تعجب یا اجنبیت کی کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے تو لفظی حیثیت سے دیکھئے۔ عربی زبان کا یہ طریقہ ہے کہ فعل کبھی اپنے ابتدائی اور ظاہری معنی میں استعمال ہوتا اور کبھی حقیقی اور کامل معنی میں۔ یہاں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" میں "اٰمَنُوْا" ابتدائی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس کے بعد "اٰمِنُوْا" حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

معنوی حیثیت سے اگر آپ دیکھیں تو ایمان کا لفظی معنی تو ہے صرف مان لینا۔ یعنی زبان سے اقرار کر لینا۔ دل کی تصدیق ٗ دماغ کا اطمینان اور عمل کی تائید بیشک اس میں شامل نہ ہو۔ ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو مانتا ہوں اور میں مسلمان ہوں۔ تو سننے والا اسے مومن سمجھے گا چاہے اس کے دل و دماغ کی کوئی بھی کیفیت ہو اور خواہ اس نے پوری زندگی اسلام کے مطابق کوئی کام نہ کیا ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے جن میں منافقین بھی شامل ہیں۔ اور یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب صرف منافقین سے ہو۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو مومن کہتے تھے اور مسلمانوں میں بڑھ چڑھ کر اپنے ایمان کا یقین بھی دلاتے تھے۔ تو پروردگار نے انھیں خطاب اسی حیثیت سے کیا ہے کہ "اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو تم واقعی اگر اپنے دعوے میں مخلص ہو تو پھر اس میں حقیقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ محض ایمان کا دعویٰ کرنے سے ایک ایسی صورت وجود میں آجاتی ہے جو حقیقت سے خالی ہے۔ لیکن صورت بے حقیقت کا تو دنیا میں کوئی اعتبار نہیں اللہ کے ہاں کیا اعتبار ہوگا۔ بازار میں پلاسٹک کے بنے ہوئے خوبصورت پھل ملتے ہیں ٗ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ سچ مچ کا کیلا ٗ سیب ٗ انگور یا نارنگی ہے ٗ لیکن نہ اس میں خوشبو ٗ نہ اس میں مزہ ٗ نہ وہ کھانے کے قابل ٗ اس سے بچے کھیل تو سکتے ہیں لیکن کوئی عقلمند آدمی انھیں پھل سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ کھلونوں کی شکل میں درندے نظر آتے ہیں ٗ ہاتھی ٗ چیتے ٗ شیر ٗ بعض دفعہ بچے انھیں دیکھ کے ڈر جاتے ہیں ٗ لیکن سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ یہ محض صورتیں ہیں جو حقیقت سے خالی ہیں۔ اسی پر ایمان کو قیاس کر لیجیے۔

ایمان کی ایک حقیقت ہے اور ایک صورت۔ صورت صرف مان لینے کا نام ہے اور حقیقت وہ ہے جو انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ انسان کی سوچ ٗ رویہ ٗ احساسات ٗ محبت و نفرت کے حوالے ٗ تعلقات کی دنیا ٗ پسند و ناپسند ٗ زندگی کا ایک ایک عمل ٗ غرضیکہ ہر چیز بدل کے رہ جاتی ہے۔ وہ شخص جو صرف ذاتی غم کو جانتا ہے ایمان کی حقیقت آجانے کے بعد وہ اجتماعی غم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی منزل دنیا نہیں آخرت بن جاتی ہے۔ اب وہ دنیا چھن جانے سے نہیں روتا ٗ بلکہ نماز قضا ہونے سے روتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر اسے نیند میٹھی معلوم نہیں ہوتی ٗ بلکہ اس کی آنکھوں سے برسنے والی برکھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے کہ بیشک زبان سے ایمان کا اقرار کر چکے ہو لیکن اگر تم حقیقت میں ایمان سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو پھر ضروری ہے اللہ اس کے رسول ٗ قرآن کریم اور پہلی آسمانی کتابوں پر بھی اس طرح ایمان لاؤ جس طرح ایمان لانے کا حق ہے۔ لیکن اگر زبان سے اقرار کے بعد بھی تمہارے اندر اقرار و انکار کی وہی مصنوعی دنیا باقی رہتی ہے تو پھر تم حقیقت میں مومن نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو شخص اللہ ٗ اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرتا ہے اسے ایمان تو کیا نصیب ہوگا وہ تو بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ کیونکہ

ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی چیز انہی حقائق کو تسلیم کرنا ہے۔ جس نے ان کا انکار کر دیا اس نے تو تاریک رات میں اپنے ہاتھ کی مشعل توڑ ڈالی۔ اب وہ جیسے جیسے ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا چلے گا ویسے ویسے وہ اپنے راستے سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس آیت میں ایمان کے جن اجزاء کا ذکر کیا گیا ہے اور کتابوں کے نزول کے لیے "اَنْزَلَ" اور "نَزَّلَ" دو فعل ذکر کیے گئے ہیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس سے پہلے ہم مختلف مقامات پر پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ (روح)

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا تقاضا ہے کہ اسے اس کی ذات اور صفات کے لحاظ سے تنہا اور یکتا تسلیم کرتے ہوئے اس کے احکام کی پورے اخلاص کے ساتھ اطاعت کرو۔ ملائکہ کو اس کی بیٹیاں یا خدائی اختیارات میں شریک سمجھنے کے بجائے اس کی مخلوق تصور کیا جائے۔ پہلی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے داعی اور اس کے فرستادہ تھے۔ آخرت پر ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا قائم ہونا یقینی ہے اور ہر کسی نے دوبارہ زندہ ہو کر اپنے اچھے اور برے اعمال کا اچھا یا برا صلہ پانا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس سے آدمی کے نظریات اور کردار میں سنوار اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ آدمی اپنے آپ کو دنیا اور آخرت کے حوالہ سے ذمہ دار سمجھتا ہے۔

(عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (رض) قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذَاتَ یَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیدُ سَوَادِ الشَّعَرِ لَا یُرَی عَلَیْہِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُہُ مِنَّا أَحَدٌ حَتَّی جَلَسَ إِلَی النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَأَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ إِلَی رُکْبَتَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ عَلَی فَخِذَیْہِ قَالَ فَأَخْبِرْنِی عَنِ الْإِیمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہِ وَکُتُبِہِ وَرُسُلِہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِہِ وَشَرِّہِ) [رواہ مسلم : باب مَعْرِفَۃِ الْإِیمَانِ وَالْإِسْلَامِ]

"حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی سفید کپڑوں میں ملبوس سیاہ بالوں والا جس پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے اور ہم سے کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا وہ آکر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنی رانوں پر رکھتے ہوئے عرض کی مجھے ایمان کے متعلق بتایئے آپ نے فرمایا کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے۔"

مسائل

۱۔ مسلمانوں کو اللہ، اس کے رسول، قرآن مجید اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا چاہیے۔

۲۔ کامل ایمان ہی نجات کا ذریعہ ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب آسمانی، رسولوں اور قیامت کا انکار کرنے والا پرلے درجے کا گمراہ ہوتا ہے۔

فوائد

ف 1 : معلوم ہوا کہ تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر عمل صرف قرآن شریف پر ہی ہوگا۔ ان کتب کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ رب کی ہیں۔

ف 2 : یعنی ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے یا یہ کہا جاوے کہ ان میں سے ایک کا انکار سب کا انکار ہے۔ لہٰذا جس نے حضور ﷺ کو نہ مانا اس نے اللہ کو بھی نہ مانا۔ فرشتوں، رسولوں، قیامت، کسی کو نہ مانا، اس صورت میں واوٴ اپنے ظاہری معنی پر ہی ہے۔

ف 3 : یعنی ایسی گمراہی میں جو ہدایت سے بہت دور ہے۔ خیال رہے کہ گمراہی دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جس سے انسان اسلام سے خارج ہو کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے تبرائی رافضی، بے ادب گستاخ، وہابی، قادیانی، دوسری وہ گمراہی جس سے انسان اسلام سے خارج ہو کر کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ جیسے تفضیلی رفض یا غیر مقلدین پہلی قسم کی گمراہی کا نام گمراہی بعید ہے۔ اور دوسری کا نام گمراہی قریب ہے۔ یہاں پر پہلی گمراہی کا ذکر ہے۔

4 : یعنی اے زبانی ایمان لانے والو، دل سے ایمان لاؤ۔ یا اے دل سے ایمان لانے والو، ہمیشہ ایمان پر قائم ہو۔ للذا آیت میں تحصیل حاصل نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان وہی قابل قدر ہے۔ جو دنیا سے اپنے ساتھ جاوے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر ایمان کا وہی درجہ ہے۔ جو اللہ پر ایمان لانے کا درجہ ہے۔ یہ بھی معلوم کہ رسول کا ذکر اللہ کے ساتھ کرنا اچھا ہے۔

5 : حضور محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یعنی قرآن شریف، چونکہ قرآن کریم کا نزول آہستہ ہوا، للذا یہاں نزل فرمایا اور آگے انزل ارشاد فرمایا۔ معلوم ہوا کہ حضور پر ایمان لانا قرآن پر ایمان سے مقدم ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ :

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَلَا لِیَہۡدِیَہُمۡ سَبِیۡلًا ﴿۱۳۷﴾ؕ

لغۃ القرآن: [اِنَّ الَّذِیْنَ : بیشک جو لوگ] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [ثُمَّ : پھر] [کَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا] [ثُمَّ اٰمَنُوْا : پھر ایمان لائے] [ثُمَّ کَفَرُوْا : پھر کفر کیا] [ثُمَّ : پھر] [ازْدَادُوْا : وہ زیادہ ہوئے] [کُفْرًا : بلحاظ کفر کے] [لَّمْ یَکُنِ : تو ہرگز نہیں ہے] [اللّٰہُ : اللہ] [لِیَغْفِرَ : کہ وہ معاف کرے] [لَہُمْ : ان کو] [وَلاَ لِیَہْدِیَہُمْ : اور نہ (یہ) کہ وہ ہدایت دے ان کو] [سَبِیْلاً : راستے کی]

ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے، پھر ایمان لائے پھر کافر ہوگئے، پھر کفر میں اور بڑھ گئے تو اللہ ہرگز (یہ ارادہ فرمانے والا) نہیں کہ انھیں بخش دے اور نہ (یہ کہ) انھیں سیدھا راستہ دکھائے۔

تشریح: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اللہ پر رسول پر اور آسمانی کتابوں پر ایمان برقرار رکھیں اور اس میں ثابت قدم رہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان دو قسموں کا ذکر فرما رہا ہے جو ایمان سے خارج ہیں ، ان میں پہلی قسم وہ ہے جو نفاق سے بظاہر

ایمان لائے تھے ' پھر کفر کی طرف لوٹ گئے اور گمراہی میں مرگئے ' انھوں نے توبہ کا موقع ضائع کر دیا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا ' اور دوسری قسم ان منافقوں کی ہے جو ظاہری اسلام پر برقرار رہے اور درپردہ کافروں کے ہم نوا رہے۔ (تبیان)

شان نزول

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے حق میں نازل ہوئی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے پھر بچھڑا پوج کر کافر ہوئے پھر اس کے بعد ایمان لائے پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور انجیل کا انکار کر کے کافر ہوگئے پھر سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کا انکار کر کے اور کفر میں بڑھے ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے ایمان کے بعد پھر ایمان لائے یعنی انھوں نے اپنے ایمان کا اظہار کیا تاکہ ان پر مومنین کے احکام جاری ہوں۔ پھر کفر میں بڑھے یعنی کفر پر ان کی موت ہوئی۔ (خزائن)

جو لوگ اتنے ڈھلمل یقین ہوں کہ اسلام کی کوئی کامیابی دیکھی تو مسلمان ہوگئے ذرا شدت کا زمانہ آیا تو جھٹ کفر اختیار کرلیا۔ پھر کوئی معجزہ دیکھا یا مسلمانوں کے غالب آنے کے آثار نمایاں ہوئے تو پھر اسلام قبول کرلیا پھر کسی شیطان نے وسوسہ ڈالا یا مسلمان کسی آزمائش میں مبتلا ہوگئے تو اسلام سے رشتہ توڑ کر کفر سے ناطہ جوڑ لیا۔ ایسے مجرم ناقبل عفو ہیں اور توفیق خداوندی ان لوگوں کی دستگیری کرنے کے لیے بے چین نہیں جو گمراہی کے گڑھے میں گرنے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں۔ روی عن ابن عباس ان الایۃ فی المرتدین (بحر)
اس آیت کا مفہوم مفسرین نے دو طرح اخذ کیا ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس آیت کے مخاطب یہود ہیں جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے اور انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ جب موسیٰ (علیہ السلام) چالیس دن کے اعتکاف کے بعد طور پہاڑ سے نیچے اترے تو ان کے سمجھانے پر یہودی دوبارہ ایمان لائے۔ جب موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد عیسیٰ (علیہ السلام) تشریف لائے تو انھوں نے ان پر ایمان لانے سے انکار کردیا اور پھر کفر میں یہ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بھی منکر ہوئے۔ دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا پھر ایمان لانا اور اس کے بعد ایسا کفر اختیار کرنا کہ اس میں سخت سے سخت ہوتے گئے۔ ان سے مراد منافق ہیں جو ہمیشہ کفر و نفاق کی کشمکش میں رہتے ہیں۔
اس آیت کا یہی مفہوم لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہاں مسلسل آٹھ آیات میں منافقوں کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کے مفاد کی خاطر کبھی اسلام کی طرف آتے ہیں اور کبھی کفر میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ حال ہو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نہ معاف کرتا ہے اور نہ ہی صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے کیونکہ ہدایت کے لیے اخلاص اور استقامت نہایت ضروری ہے۔ مگر منافقین دنیا کے مفاد کی خاطر دونوں کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مرتد کو دنیا میں ہی قتل کردینے کا حکم ہے۔
(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) قَالَ قَالَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ)
[رواہ البخاری : کتاب الجھاد والسیر، باب لایعذب بعذاب اللّٰہ]
" حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے اپنا دین تبدیل کرلیا اسے قتل کردو۔ "

(عَنۡ اَنَسِ بۡنِ مَالِکٍ (رض) قَالَ کَانَ مِنَّا رَجُلٌ مِنۡ بَنِی النَّجَّارِ قَدۡ قَرَاَ الۡبَقَرَۃَ وَآلَ عِمۡرَانَ وَکَانَ یَکۡتُبُ لِرَسُوۡلِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَانۡطَلَقَ ھَارِبًا حَتّٰی لَحِقَ بِاَھۡلِ الۡکِتَابِ قَالَ فَرَفَعُوۡہُ قَالُوۡا ھٰذَا قَدۡ کَانَ یَکۡتُبُ لِمُحَمَّدٍ فَاُعۡجِبُوۡا بِہٖ فَمَا لَبِثَ اَنۡ قَصَمَ اللّٰہُ عُنُقَہٗ فِیۡھِمۡ فَحَفَرُوۡا لَہٗ فَوَارَوۡہُ فَاَصۡبَحَتِ الۡاَرۡضُ قَدۡ نَبَذَتۡہُ عَلٰی وَجۡھِھَا ثُمَّ عَادُوۡا فَحَفَرُوۡا لَہٗ فَوَارَوۡہُ فَاَصۡبَحَتِ الۡاَرۡضُ قَدۡ نَبَذَتۡہُ عَلٰی وَجۡھِھَا ثُمَّ عَادُوۡا فَحَفَرُوۡا لَہٗ فَوَارَوۡہُ فَاَصۡبَحَتِ الۡاَرۡضُ قَدۡ نَبَذَتۡہُ عَلٰی وَجۡھِھَا فَتَرَکُوۡہُ مَنۡبُوۡذًا)

[رواہ مسلم: کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب]

”حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بنی نجار قبیلے کا ایک آدمی تھا جو سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران پڑھ چکا تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کتابت کیا کرتا تھا۔ بھاگ کر اہل کتاب کے ساتھ جاملا۔ راوی کہتے ہیں انھوں نے یہ کہتے ہوئے اسے مقام دیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کاتب تھا تو وہ اس وجہ سے متعجب ہوئے کچھ ہی عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں ہی اس کی گردن توڑ دی۔ انھوں نے گڑھا کھود کر اسے دفن کیا صبح زمین نے اسے باہر پھینکا ہوا تھا۔ انھوں نے پھر گڑھا کھود کر اسے دفن کیا زمین نے اسے پھر باہر پھینک دیا پھر انھوں نے گڑھا کھود کر دفنایا زمین نے پھر اسے باہر پھینک دیا پھر انھوں نے اسے باہر ہی رہنے دیا۔“ (فہم)

دراصل اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کی تصویر کھینچی گئی ہے جنھیں سابقہ آیت میں ایمان کے دعویٰ کے باوجود حقیقی ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے ' پھر کفر کیا۔ پھر ایمان لائے پھر کفر کیا۔ پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اس کا ایک مطلب تو یہ لیا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں کہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے ' پھر بچھڑے کی پوجا کر کے کافر ہوگئے۔ عجل پرستی سے توبہ کر کے پھر مسلمان ہوئے ' ان کی نسلیں عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان نہ لا کر پھر کافر ہوگئیں۔ اب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بظاہر ایمان لا کر اور حقیقت میں کفر کا رویہ اختیار کر کے کفر میں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ لیکن بعض مفسرین اسے منافقین کا ذہنی رویہ قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے دین کو ایک غیر سنجیدہ تفریح سمجھ رکھا ہے۔ گویا ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اٹھی مسلمان ہوگئے ' جب دوسری لہر اٹھی کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا مسلمان بن گئے اور جب معبود منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔

بعض اہل علم نے اسے ذہنی رویہ ہی سمجھا ہے۔ لیکن ان کی تعبیر یہ ہے کہ یہ منافقین ہیں جنھوں نے ایمان و کفر کو ہمیشہ کھیل سمجھا ہے۔ ایک کھیل تو وہ ہے جو تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں۔ اسے مانا بھی اور اسے بگاڑا بھی۔ اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ انھوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اب اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں رہے۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ اللہ نہ تو ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ان کے لیے ہدایت کا کوئی اور راستہ کھولے گا۔ یہ اسلام دشمنی میں جس طرح بڑھتے جا رہے ہیں ان کی یہی روش بالآخر انھیں جہنم لے جائے گی۔ (روح)

صحبت بد سے بچو

حضرت علی (رض) اس آیت کی تلاوت فرما کر فرماتے تھے مرتد سے تین بار کہا جائے کہ توبہ کر لے۔ پھر فرمایا یہ منافقوں کا حال ہے کہ آخر ش ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ مومنوں کو چھوڑ کافروں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں، ادھر بظاہر مومنوں سے ملے جلے رہتے ہیں اور کافروں میں بیٹھ کر ان مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو انھیں بیوقوف بنا رہے ہیں دراصل ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، پس اللہ تعالیٰ ان کے مقصود اصلی کو ان کے سامنے پیش کر کے اس میں ان کی ناکامی کو بیان فرماتا ہے کہ تم چاہتے ہو ان کے پاس تمہاری عزت ہو مگر یہ تمہیں دھوکا ہوا ہے اور تم غلطی کر رہے ہو بگوش ہوش سنو عزتوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور آیت میں ہے (مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا) 35۔ فاطر : 10) یعنی عزت اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول اور مومنوں کا حق ہے، لیکن منافق بے سمجھ لوگ ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر حقیقی عزت چاہتے ہو تو اللہ کے نیک بندوں کے اعمال اختیار کرو اس کی عبادت کی طرف جھک جاؤ اور اس جناب باری سے عزت کے خواہاں بنو، دنیا اور آخرت میں وہ تمہیں وقار بنا دے گا، مسند احمد بن حنبل کی یہ حدیث اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص فخر و غرور کے طور پر اپنی عزت ظاہر کرنے کے لیے اپنا نسب اپنے کفار باپ دادا سے جوڑے اور نو تک پہنچ جائے وہ بھی ان کے ساتھ دسواں جہنمی ہوگا۔ پھر فرمان ہے جب میں تمہیں منع کر چکا کہ جس مجلس میں اللہ کی آیتوں سے انکار کیا جا رہا ہو اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اس میں نہ بیٹھو، پھر بھی اگر تم ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے رہو گے تو یاد رکھو میرے ہاں تم بھی ان کے شریک کار سمجھے جاؤ گے۔ ان کے گناہ میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے جیسے ایک حدیث میں ہے کہ جس دستر خوان پر شراب نوشی ہو رہی ہے اس پر کسی ایسے شخص کو نہ بیٹھنا چاہیے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس آیت میں جس ممانعت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سورۃ انعام کی جو مکیہ ہے یہ (وَاِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ) 6۔ الانعام : 68) جب تو انھیں دیکھے جو میری آیتوں میں غوطے لگانے بیٹھ جاتے ہیں تو تو ان سے منہ موڑ لے۔ حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں اس آیت کا یہ حکم (اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡكٰفِرِيۡنَ فِىۡ جَهَنَّمَ جَمِيۡعَا ۙ) 4۔ النسآء : 140) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (وَمَا عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّلٰـكِنۡ ذِكۡرٰى لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ) 6۔ الانعام : 69) سے منسوخ ہو گیا ہے یعنی متقیوں پر ان کے احسان کا کوئی بوجھ نہیں لیکن نصیحت ہے کیا عجب کہ وہ بچ جائیں۔ پھر فرمان باری ہے اللہ تعالیٰ تمام منافقوں کو اور سارے کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ یعنی جس طرح یہ منافق ان کافروں کے کفر میں یہاں شریک ہیں قیامت کے دن جہنم میں بھی اور ہمیشہ رہنے والے وہاں کے سخت تر دل ہلا دینے والے عذابوں کے سہنے میں بھی ان کے شریک حال رہیں گے۔ وہاں کی سزاؤں میں وہاں کی قید و بند میں طوق و زنجیر میں گرم پانی کے کڑوے گھونٹ اتارنے میں اور پیپ کے لہو کے زہر مار کرنے میں بھی ان کے ساتھ ہوں گے اور دائمی سزا کا اعلان سب کو ساتھ سنا دیا جائے گا۔ (ابن کثیر)

جب تک نفس انسانی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے ' اس وقت تک وہ اوضاع واقدار اور مصالح اور مفادات کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ حرص اور لالچ سے پاک ہو سکتا ہے اور نہ وہ مصلحتوں اور امیدوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ اور یہ نفس کبھی بھی عزت نفس ' بلندی ' ہمت اور آزادی سے سرشار نہیں ہو سکتا جس طرح وہ نفس ہوتا ہے جو محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہو۔ جب کوئی دل محبت الٰہی سے بھر جائے تو وہ دنیاوی اقدار

'دنیاوی طور طریقوں 'دنیا کے واقعات 'دنیا کے لوگوں 'دنیا میں پائے جانے والی تمام قوتوں 'حکومتوں اور ان کے اہالی و موالی کے مقابلے میں برتر ہوتا ہے۔

یہاں سے پھر نفاق کا پودا پھوٹتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ نفاق کی حقیقت کیا ہے؟ نفاق صرف یہ ہے کہ انسان سچائی پر بظاہر تو ثابت ہو جائے مگر اس کے لیے لڑنے اور باطل کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ضعیف ہو۔ یہ ضعف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں خوف اور لالچ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خوف اور لالچ دونوں اللہ سے نہیں ہوتے بلکہ غیر اللہ سے ہوتے ہیں۔ انسان پھر زمین کے حالات اور زمین کی شخصیات کا قیدی بن جاتا ہے اور اسلامی نظام سے دور ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس سبق میں ایمان کی بات بھی ہونی ہے 'قیام شہادت اور عدل کی بات بھی ہوئی اور نفاق کی بات بھی ہوئی اور تینوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ عمومی مناسبت تو یہ ہے کہ یہی اس سورۃ کے اصل موضوعات ہیں یعنی جماعت مسلمہ کی اسلامی نظام حیات میں تربیت اور اس کی اجتماعی زندگی سے جاہلیت کے آثار کو مٹانا 'جماعت کے افراد کے نفوس کو بشری فطری کمزوریوں کے مقابلے میں تیار کرنا اور پھر اسے ارد گرد پھیلے ہوئے مشرکین اور منافقین کے ساتھ ہونے والے معرکے کے اندر اتارنا۔ اس پوری سورۃ کے اندر یہی مرکزی مضمون ہے جس کے ارد گرد یہ سورۃ گھومتی ہے 'اول سے آخر تک۔

یہی وجہ ہے کہ اس سبق کے باقی ماندہ حصے میں بات منافقین تک محدود ہے اور اس پر یہ پارہ بھی ختم ہوتا ہے کیونکہ یہ پانچویں پارہ کا آخری رکوع ہے۔ جبکہ اس سے قبل منافقین کی ایک خاص جماعت کا تذکرہ ہوا کہ وہ بار بار اعلان اسلام کرتے ہیں اور پھر کفر کرتے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں سے منافقین پر تنقید شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں قرآن نے تفصیلات بیان کر دی ہیں اور مختلف انداز میں ان کی بیماری کا مطالعہ کیا ہے تاکہ اسلامی نظام کا مزاج اچھی طرح سامنے آجائے فطرت کے مطابق اس پر عمل ہو اور دلوں میں اور عمل میں اسلامی نظام واضح طور پر نظر آئے۔ (ظلال)

مسائل

ا۔ بار بار کفر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نہ معاف کرتا ہے اور نہ ہی انھیں ہدایت دیتا ہے۔

آیت مبارکہ :

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۳۸﴾

لغۃ القرآن: [بَشِّرِ : آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بشارت دیجیے] [الْمُنٰفِقِیْنَ : منافقوں کو] [بِاَنَّ : اس کی کہ] [لَهُمْ : ان کے لیے] [عَذَابًا اَلِیْمًا : ایک درد ناک عذاب ہے]

ترجمہ: (اے نبی!) آپ منافقوں کو یہ خبر سنادیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح: اس سے پہلی آیت مبارکہ میں منافقوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے اور پھر منافقوں کی ایک کرتوت بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اسلام غالب نہ ہوگا اور اس لیے وہ کفار کو صاحب قوت و شوکت سمجھ کر ان سے دوستی کرتے تھے اور ان سے ملنے میں عزت جانتے تھے حالانکہ کفار کے ساتھ دوستی ممنوع ہے اور ان سے ملنے میں عزت سمجھنا باطل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافروں سے محبت اور دوستی رکھنا منافقوں کی علامت ہے خصوصاً مسلمانوں کے مقابلہ میں۔ ایسے سب لوگوں کے متعلق فرمایا جارہا ہے کہ کیا یہ لوگوں کے پاس جاکر عزت تلاش کرتے ہیں حالانکہ تمام عزتوں کا مالک اللہ عَزَّوَجَلَّ ہے تو وہی خداوندِ کریم ہی عزت والا ہے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عطا سے وہ عزت والے جنہیں اللہ عَزَّوَجَلَّ عزت دے جیسے انبیاء (علیہ السلام) اور مومنین۔ منافقوں کے مذکورہ بالا طرز عمل کو سامنے رکھ کر آج دنیا کے حالات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ مرض آج کل بکثرت پایا جارہا ہے، اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں سے دوستیاں، مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے پیار، باہمی اتحاد سے عزت حاصل کرنے کی بجائے کفار کے قدموں میں بیٹھ کر عزت حاصل کرنے کی کوشش کرنا مسلمان قوم میں کس طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ (صراط)

بشارت کا عام استعمال تو خوشخبری کے معنی میں ہوتا ہے اور اس عذاب الیم کی خبر کو بشارت سے تعبیر کرنا بطور طنز ہے۔ اور علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ہر اس اچھی یا بری خبر کو بشارت کہتے ہیں جس کے سننے کے بعد اس کے اثرات چہرہ پر نمایاں ہو جائیں۔ التبشیر الاخبار بمایظھر اثرہ علی البشرۃ (قرطبیؒ)

ہم آج کسی کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ منافق ہے۔ لیکن ان علامتوں کے ذکر نے منافقین کی پہچان آسان کر دی ہے۔ ہم کسی پر منافق ہونے کا فتویٰ نہ بھی دیں جب بھی مسلمان ایسے منافقین کو پہچان کر اپنی صفوں کو درست کر سکتے ہیں۔ اور اجتماعی پالیسیاں بناتے ہوئے اور قومی معاملات کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسے لوگوں کے بارے میں ہوشیار اور چوکنا رہ سکتے ہیں۔ جب تک وہ مسلمانوں کے مشترکہ مطالبات کا ساتھ دیں تو انھیں ساتھ لیا جائے لیکن نہایت بیدار مغزی سے ان کی ایک ایک حرکت کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے ہوشیار منافق ساتھ چلتے چلتے مسلمانوں کی سادگی سے اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہاتھ کر گئے؟ اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے باہمی فیصلوں اور ان کے اندر کے احساسات سے باخبر ہو کر دشمن کو اپنے دفاعی اقدامات کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

منافقین کی پہلی علامت

سب سے پہلی علامت یہ بیان فرمائی گئی کہ تم ایسے منافقین کو دیکھو گے جن کا رجحان اور جن کی دوستیاں مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں یعنی مسلمانوں کے دشمنوں سے ہوتی ہیں۔ جب بھی انھیں موقع ملتا ہے یہ ان کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں ' بہانے بہانے سے ان سے راہ و

رسم پیدا کرتے ہیں۔آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمعصر منافقین زیادہ تر یہود سے تعلقات رکھنے اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابیّ نے تو ایک دفعہ صاف کہہ بھی دیا کہ ہم یہود سے تعلقات توڑ کر کسی مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ ابھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے مسلمانوں کو غلبہ مل جائے اور ممکن ہے یہود یا مشرکین ان پر غالب آ جائیں تو ہم صرف مسلمانوں کے ساتھ نتھی ہو کر اپنا مستقبل مخدوش نہیں بنانا چاہتے۔ بلکہ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین بظاہر اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کافروں کی ایسی مجالس میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کے خلاف بکواس کی جاتی ہے اور اللہ کے دین کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے پاس صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ راہ و رسم کو اپنے لیے عزت کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ چونکہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں اپنی ایک حیثیت اور ایک اثر رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ اپنے آپ کو ان سے وابستہ رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑے لوگوں کی پناہ لے رکھی ہے۔ عربی زبان میں "عزۃ" کا لفظ ذلت کے متضاد کے طور پر ہی استعمال نہیں ہوتا ' بلکہ اس میں عزت کا مفہوم کسی شخص کو ایسی حیثیت کا مالک سمجھنا ہے جب کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ منافقین یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں یہ تحفظ انہی کے ساتھ رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔ پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر یہ واقعی مومن ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ' دبدبہ اور غلبہ سراسر اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ یہ دولت جسے بھی ملتی ہے اسی کی عطا سے ملتی ہے۔ اور مزید فرمایا کہ ہم اس سے پہلے سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۶۸ میں یہ حکم نازل کر چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کا جذباتی رشتہ بھی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جڑ جائے۔ اس کی حمیت و غیرت کبھی گوارا نہ کرے کہ کوئی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کے دین سے متعلق نازیبا بات کہنے کی جرأت کر سکے۔ اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اگر طاقت میسر ہو تو کہنے والی زبان نہیں رہنی چاہیے۔ اور طاقت میسر نہ ہو تو پھر ایمانی غیرت و حمیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں شرکت کا تصور بھی نہ کیا جائے۔ اور اگر کبھی بھول کر ایسی کسی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہو ہی جائے تو یاد آنے پر فوراً اٹھ جائے۔ لیکن اس واضح حکم کے باوجود ان کا رویہ یہ تھا کہ یہ یہود یا دوسرے منافقین کی مجالس میں جاتے ' وہاں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کے بارے میں نامناسب باتیں کہی جاتیں اور مذاق اڑایا جاتا ' لیکن ان کے سر پر جوں تک نہ رینگتی۔ اگر ان میں ایمان کی رتی بھی ہوتی تو یہ کبھی ایسی مجالس میں بیٹھنا گوارا نہ کرتے۔ لیکن ان کی ایسی مجالس میں شرکت اور پھر ایسی باتوں کا برداشت کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی زبانوں پر ایمان کا اقرار ضرور موجود ہے ' لیکن ان کے دلوں میں بالکل ایمان نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اگر تم یہ سب کچھ سن کر برداشت کرتے ہو تو پھر تم انہی میں سے ہو۔ جیسے وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمن ہیں تم بھی دشمن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں منافقین کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مومن اور مسلم ہونے کا دعویٰ صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ مسلمان معاشرے سے جو فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں ان میں کمی نہ آنے پائے۔ ورنہ ان کا قلبی رشتہ اور ان کا دماغی رجحان چونکہ مفادات کے تابع ہے اس لیے وقت کی غالب قوت چاہے وہ اسلام اور مسلمانوں کی کیسی ہی بدترین دشمن کیوں نہ ہو یہ ان سے اپنا تعلق عزت اور فخر کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں آپ متعصب مسلمان نہ سمجھیں ' اسلام سے ہمارا محض نام کا رشتہ ہے ' ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تو سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اسلام اور کفر کی کشمکش میں آپ دیکھیں گے کہ ہمارا وزن آپ کے پلڑے میں ہوگا۔ ہمیں آپ کا قرب عزیز ہے۔ اس کے لیے ہمیں مسلمانوں کو خون میں بھی نہلانا پڑے اور ان کی عزت و حرمت کا سودا کرنا پڑے تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہیں ہے۔ غلامی کے زمانے میں بھی ہمارے جاگیردار ' ہمارے وڈیرے ' حتیٰ کہ بعض علماء اور بعض گدی

نشین بھی اسی نفاق کا شکار تھے۔ اورانھی کی وجہ سے انگریز تعداد کے اعتبار سے محدود ہونے کے باوجود دوسو سال تک حکومت کرتا رہا۔ ظفر علی خان نے اسی صورت حال سے آزردہ ہو کر کہا تھا:

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا
تمسخر کرنے والے دین سے ہی گر مہذب ہیں
تو ان تہذیب کے پتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھا

اور آج مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس میں بھی ہمارے نام نہاد حکمران ' ہمارا طبقہ امراء ' ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت ' ہمارے بعض علماء و مشائخ یہی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم کی اتنی واضح تنقید اور تنبیہ کے بعد بھی ان مسلمان کہلانے والے منافقین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

منافقین کی دوسری علامت

منافقین کی دوسری علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی ہمدردیاں اور خیر خواہیاں مسلمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اولیائِ نعمت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یعنی اس قوت کے ساتھ جو علاقے کی غالب کافر قوت ہے۔ اور مسلمان جن کے ساتھ حق و باطل کی کشمکش میں مصروف ہیں۔ یہ ہمیشہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے اور ہم مسلمانوں کے دشمن اور اپنے آقاؤں کے پاس جا کر انھیں یقین دلائیں کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی ہے اور آپ کو فتح ہوئی ہے اس میں ہمارا بھی ایک کردار ہے؟ اگر ہم پیچھے رہ کر تمہارے لیے یہ یہ کام نہ کرتے اور مسلمانوں سے تمہیں محفوظ نہ رکھتے تو یقینا تمہارے لیے فتح حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ اور اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو مسلمانوں کے پاس آکر مال غنیمت میں حصہ بٹانے کے لیے بار بار یقین دلاتے ہیں کہ ہم تو اس معرکے میں قدم قدم پر آپ کے معاون و مددگار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ایسے منافقین اور کفار کو جہنم میں جمع کریں گے۔ اور اسی دن اللہ ان کے تمام کرتوتوں سے پردہ اٹھائے گا اور ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھے گی کہ یہ لوگ حقیقت میں کس قدر مسلمانوں کے دشمن تھے۔

آیت مبارکہ :

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩؁ۭ﴾

لغۃ القرآن: [الَّذِيْنَ : (یہ) وہ لوگ (ہیں) جو] [يَتَّخِذُوْنَ : بناتے ہیں] [الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کو] [اَوْلِيَآءَ : کارساز] [مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کے علاوہ] [اَ : کیا] [يَبْتَغُوْنَ : یہ لوگ تلاش کرتے ہیں] [عِنْدَھُمُ : ان کے پاس] [الْعِزَّةَ : عزت کو] [فَاِنَّ الْعِزَّةَ : تو یقینا عزت تو] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے عزت] [جَمِيْعًا : ساری]

ترجمہ: (یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو مسلمانوں کی بجائے کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ پس عزت تو ساری اللہ (تعالیٰ) کے لیے ہے۔

تشریح:

جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ومالک ہے اسی طرح وہ عزت وذلت کا بھی مالک ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس کے حسن کردار کی وجہ سے عزت سے نوازتا ہے اور جسے چاہے اس کے گناہوں کی وجہ سے ذلت سے دوچار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ کوئی عزت دے سکتا ہے اور نہ ہی آدمی کو کوئی ذلیل وخوار کرسکتا ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس عقیدہ کی ترجمانی اور عزت کی طلب، ذلت سے محفوظ رہنے کے لیے آل عمران آیت 26 میں دعا سکھلائی گئی ہے۔

دعا کیجیے کہ اے کائنات کے مالک تو جسے چاہتا ہے حکومت سے سرفراز کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے اور جسے تو چاہے عزتوں سے سرفراز فرماتا اور جس کو چاہے ذلیل وخوار کردیتا ہے۔ ہر قسم کی خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ بلاشک تو ہر چیز پر قدرت وسطوت رکھنے والا ہے۔

لیکن منافق کا حال یہ ہے کہ وہ دنیا کی عزت کی خاطر کافر اور بے ایمان شخص سے بھی عزت کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی کاسہ لیسی اور چاپلوسی کرتا ہے چاہے اسے اپنی غیرت اور ایمان کا سودا کرنا پڑے حالانکہ ہر قسم کی عزت ورفعت اللہ ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے۔ (فہم)

مدینہ کا دور ایک انقلابی دور تھا

کفار کا بتدریج زوال ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے پاس بتدریج اقتدار آ رہا تھا اس لیے لوگوں کو اطمینان نہیں تھا خالص مسلمان ایک جانب تھے اور کھلے ہوئے مخالف ایک جانب تھے کچھ کمزور لوگ زمانہ کا رنگ دیکھ رہے تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھا ہے۔ اس لیے وہ دونوں طرف تعلقات رکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ جس طرف غلبہ اور قوت دیکھیں گے اسی طرف ہو جائیں گے وہ لوگ مسلمانوں کی مجلس میں بھی آتے تھے اور کفار سے بھی ساز باز رکھتے تھے اور ان سے بھی دوستانہ لگائے رکھتے تھے ان ہی لوگوں کو اس آیت میں تنبیہہ اور توبیخ ہے توبیخ کو بشارت کے الفاظ میں بطور تحکم ادا فرمایا ہے۔ جیسے کہ گزشتہ آیت میں فرمایا ورنہ ظاہر ہے کہ عذاب کی خبر بشارت نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بشارت ہر اس خبر کو کہتے ہیں جس سے چہرے میں تغیر واقع ہو خواہ وہ خوشی کی خبر ہو یا رنج کی بعضوں نے اور طرح توجیہہ کی ہے۔ لیکن سیدھی بات وہ ہے جو ہم نے عرض کر دی ہے اور ایک یہ بھی حاکمانہ انداز ہے کہ مجرم کو سزا کی خبر یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ ہم تم کو بشارت دیتے ہیں کہ تم کو جیل خانے بھیجیں گے اور تم کو قید کریں گے۔

عزت کے معنی قوت اور غلبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ کیا کفار کی دوستی سے ان کی خاہش یہ ہے کہ کافروں سے مل کر اور کافروں کے پاس جا کر عزت مل جائے گی اور عزت کی تلاش میں ان ک واپنا رفیق بتاتے ہیں تو سن لیں کہ تمام تر عزت اللہ ہی کے قبضے میں ہے جس کو وہ چاہے اعزاز عطا فرمائے جیسا کہ اپنے دوستوں کو اس نے اعزاز بخشا ہے واللہ اعلزۃ ولرسولہ وللمومنین اور جب ہر قسم کا اعزاز اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو وہ جس کو چاہے معزز فرمائے اور ظاہر ہے کہ یہ اعزاز اس نے کفار کو نہیں بخشا تو کافروں کے پاس جا کر کوئی معزز نہیں ہو سکتا۔

بعض حضرات نے عزت کا ترجمہ اعزاز کے ساتھ کیا ہے اس صورت میں اس عزت کے مغائر ہے جس کا ذکر سورۃ منافقون میں آیا ہے۔ یہاں عزت سے وہ عزت مراد ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور سورۃ منافقون میں جو عزت ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے اس لیے وہاں فرمایا ہے۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین واللہ اعلم۔

بہر حال! منافقین چونکہ کافروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے ان کی مجالس میں شریک ہوتے تھے اور وہاں قرآن کریم کے ساتھ استہزا کیا جاتا تھا اور اس قسم کی مجالس مکہ میں بھی ہوا کرتی تھیں چنانچہ سورۃ انعام جو مکہ میں نازل ہوئی تھی اس میں بھی ارشاد فرمایا تھا۔ واذا رایت الذین یخوضون فی ایتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ

مدینہ منورہ میں اس قسم کی مجالس یہود کے ہاں ہوتی تھیں اور یہ منافق اس میں شریک ہوتے تھے اور بعض مسلمان بھی ان کے ساتھ چلے جاتے تھے اس لیے مسلمانوں کو تنبیہہ فرمائی اور سابقہ حکم کا حوالہ دے کر فرمایا کہ تم اس قسم کی غیر شرعی مجالس میں شرکت نہ کرو جن میں دین حق کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اور اس وقت تک علیحدہ رہو جب تک اہل مجلس کوئی اور گفتگو شروع نہ کریں اور جو منافقین اس قسم کی مجالس میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے ان کو اور کافروں کو شامل کر کے جہنم میں داخل کرنے کا اعلان فرمایا اور منافقین کی مذمت فرمائی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ (تسہیل)) کشف)

منافقین کفار کے ساتھ محبت کی پینگیں اس لیے بڑھاتے تھے کہ وہ دیکھتے تھے کہ ان مسلمانوں کے پاس کیا رکھا ہے۔ نہ دولت، نہ شوکت اور ہر لحہ دشمن کے حملوں کے سیلاب میں بہ جانے کا خدشہ اور کافروں کے پاس دولت وثروت کے علاوہ قوت و شوکت بھی ہے۔ ان سے روابط پیدا کر کے ہم عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب تمہاری خام خیالیاں ہیں۔ عزت عطا فرمانے والا اللہ تعالیٰ رب العزت ہے۔ ابھی چند دنوں میں تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کا آفتاب اقبال دنیا بھر کو منور کرتا ہے اور کن کے قدموں میں دولت لونڈی بن کر حاضر ہوتی ہے۔ (ضیاء)

المختصر۔۔ کفار نہ تولائق اعزاز غلبہ والے ہیں اور نہ ہی قابل تعریف عزت والے ہیں تو پھر یہ کسی کو حقیقی عزت اور لائق تحسین غلبہ کس طرح دے سکتے ہیں یہ کفار ومشرکین تو اس قدر بے باک، منہ زور اور شرم وحیاء سے عاری ہیں کہ جو کتاب ان کی ہدایت اور ان کو راہ نجات دکھانے کے لیے نازل فرمائی گئی وہ اس کا برملا انکار کر دیتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔
۔۔ چنانچہ۔۔ مکہ شریف میں بھی ان کی یہی روش تھی اور مدینہ شریف میں بھی انھوں نے اسی چلن کو اپنا رکھا ہے منافقین بھی ان کے ساتھ ان کی ہنسی مذاق میں شریک ہو جاتے تھے ایسوں سے اعراض اور ان کی ہنسی مذاق والی مجلس سے دور رہنے کی ہدایت ایمان والوں کو ان کی مکی زندگی میں بھی دی جا چکی ہے۔ (اشرفی)

فوائد

ا: معلوم ہوا کہ کافروں سے محبت، دوستی رکھنا منافقوں کی علامت ہے خصوصاً مسلمانوں کے مقابلہ میں
۲: اس سے معلوم ہوا کہ دینی قومی غدار نہ اپنی قوم میں عزت پائے نہ دوسری قوموں میں۔ عزت دین پر قائم رہنے میں ہے۔ اسی طرح صلح کل عالم کہیں عزت نہیں پاتا۔ عزت اللہ کی ہے اس کی عطا سے اس کے رسول ﷺ کی اور ان کے صدقہ سے سچے مسلمانوں کی۔

مسائل

ا۔ ہر قسم کی عزت اللہ کے اختیار میں ہے۔ ۲۔ کفار کو دوست نہیں بنانا چاہیے۔

آیت مبارکہ :

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۨ ﴿۱۴۰﴾

لغۃ القرآن: [وَقَدْ نَزَّلَ : اور وہ (یعنی اللہ) اتار چکا ہے] [عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر] [فِي الْكِتٰبِ : کتاب میں] [اَنْ : کہ] [اِذَا : جب کبھی] [سَمِعْتُمْ : تم لوگ سنو]

[اٰیٰتِ اللّٰہِ : اللہ کی آیات کو] [یُکْفَرُ : (کہ) انکار کیا جاتا ہو] [بِہَا : ان کا] [وَیُسْتَہْزَاُ : اور مذاق اڑایا جاتا ہو] [بِہَا : ان کا] [فَلَا تَقْعُدُوْا : تو مت بیٹھو] [مَعَہُمْ : ان کے ساتھ] [حَتّٰی : یہاں تک کہ] [یَخُوْضُوْا : وہ لوگ بے پر کی اڑائیں] [فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ : ان کے علاوہ کسی اور بات میں] [اِنَّکُمْ : یقینا تم لوگ] [اِذًا : پھر تو] [مِّثْلُہُمْ ط : ان جیسے ہو گے] [اِنَّ اللّٰہَ : بیشک اللہ] [جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ : منافقوں کو جمع کرنے والا ہے] [وَالْکٰفِرِیْنَ : اور کافروں کو] [فِیْ جَہَنَّمَ : جہنم میں] [جَمِیْعًا : سب کو]

ترجمہ: اور بیشک (اللہ نے) تم پر کتاب میں یہ (حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ (انکار اور تمسخر کو چھوڑ کر) کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ بیشک اللہ منافقوں اور کافروں سب کو دوزخ میں جمع کرنے والا ہے۔

تشریح:

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر فرما دیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں جب وہ اس خبیث فعل میں مصروف ہوں تو ان کے پاس نہ بیٹھو بلکہ حکم یہ ہے کہ ایسی جگہ پر جاؤ ہی نہیں اور اگر جانا پڑ جائے تو جب ہاتھ سے روکنا ممکن ہو تو ہاتھ سے روکو اور اگر زبان سے روک سکتے ہو تو زبان سے روکو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو دل میں اس حرکت سے نفرت کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ جاؤ اور ان کی ہم نشینی ہر گز اختیار نہ کرو کیونکہ جب قرآن، شریعت یا دین کا مذاق اڑایا جا رہا ہو، لہٰذا مسلمانوں کو گمراہ فرقوں کی مجالس اور جلسوں میں شرکت کرنے، ان کے لٹریچر پڑھنے، ریڈیو اور ٹی وی کے خلاف اسلام پروگرام سننے سے اجتناب لازمی ہے، نیز بدکاری، بے حیائی، جوا اور شراب نوشی کی محافل سے بھی باز رہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ "مسلمان برائی کو طاقت سے روکے۔ اگر اس کی طاقت نہیں تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے۔ برائی کو برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ (مسلم : 177 : کتاب الایمان : باب 20) یعنی دل سے برا جاننے والا ان محافل میں نہیں بیٹھ سکتا اور اگر بیٹھے گا تو ظاہر ہے وہ انھیں دل سے برا نہیں سمجھتا تو ایسے مسلمان کو اپنے ایمان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہاں کسی حکمت، مجبوری یا دینی فائدے کی خاطر اگر ایسی مجالس میں بیٹھنا پڑے تو پھر کوئی حرج نہیں جیسا کہ مکہ میں کفار کے غلبہ کی وجہ سے مسلمان ان کی مجالس میں بیٹھنے پر مجبور تھے اگرچہ دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔

نوٹ : دنیاوی معاملات میں کفار سے اچھے تعلقات رکھنے اور اجتماعی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اجازت ہے۔ (امداد)

اور اس کے باوجود کوئی آدمی وہاں بیٹھا رہے تو یا تو یہ خود اس فعل میں مبتلا ہو جائے گا یا ان کی صحبت کی نحوست سے متاثر ہو گا یا کم از کم اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ اس شخص کے دل میں بھی دین کی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ اگر اللہ عَزَّوَجَلَّ، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، قرآن مجید اور دین مبین سے محبت ہوتی تو جہاں ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں ہر گز نہ بیٹھتا کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ جہاں آدمی کے پیارے

کو برا کہا جائے وہاں وہ نہیں بیٹھتا جیسے کسی کے ماں باپ کو جس جگہ گالی دی جائے وہاں بیٹھنا آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ تو جب ماں باپ کی توہین اور گالی والی جگہ پر بیٹھنا آدمی کو گوارا نہیں تو جہاں اللہ تعالیٰ، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن و دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو وہاں کوئی مسلمان کیسے بیٹھ سکتا ہے ؟ کیا مَعَاذَاللہ، اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قدر ماں باپ کے بھی برابر نہیں ہے۔

بری صحبت کی مذمت

اس آیت سے وہ لوگ سبق حاصل کریں جو فلموں، ڈراموں، گانوں، تھیٹروں، دوستوں کی گپوں اور بدمذہبوں کی صحبتوں میں دین کا مذاق اڑتا ہوا دیکھتے ہیں اور پھر بھی وہاں بیٹھتے رہتے ہیں بلکہ مَعَاذَاللہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے ہیں۔ بری صحبت کے بارے میں احادیث بکثرت ہیں۔ ان میں سے 5 احادیث درج ذیل ہیں

(1)۔۔ رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”برے ساتھی سے بچ کہ تو اسی کے ساتھ پہچانا جائے گا (یعنی جیسے لوگوں کے پاس آدمی کی نشست و برخاست ہوتی ہے لوگ اسے ویسا ہی جانتے ہیں۔)
(ابن عساکر، الحسین بن جعفر بن محمد بن حمدان۔۔ الخ، ۴۶/۱۴)

(2)۔۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نیک اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کے پاس مشک ہے اور دوسرا دھونکنی دھونک رہا ہے مشک والا یا تو تجھے مشک ویسے ہی دے گا یا تو اس سے خرید لے گا، اور کچھ نہ سہی تو خوشبو تو آئے گی اور وہ دوسرا تیرے کپڑے جلادے گا یا تو اس سے بدبو پائے گا۔ (بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار وبیع المسک، ۲/۲۰، الحدیث: ۲۱۰۱)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو کسی بدمذہب کو سلام کرے یا اس سے بہ کشادہ پیشانی ملے یا ایسی بات کے ساتھ اس سے پیش آئے جس میں اس کا دل خوش ہو تو اس نے اس چیز کی تحقیر کی جو اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتاری۔
(تاریخ بغداد، ۵۳۸۷- عبد الرحمٰن بن نافع، ابوزیاد المخرّمی۔۔ الخ، ۲۶۲/۱۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”تم ان سے دور رہو اور وہ تم سے دور رہیں کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنے میں نہ ڈال دیں۔
(صحیح مسلم، باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء والاحتیاط فی تحمّلہا، ص۹، الحدیث: ۷ (۷))

(4)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان عالیشان ہے: ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دیکھے کس سے دوستی کر رہا ہے۔
(ترمذی، کتاب الزہد، ۴۵- باب، ۱۶۷/۴، الحدیث: ۲۳۸۵)

مولانا معنوی قدّس سرّہ فرماتے ہیں :

صحبت صالح ترا صالح کُنَد صحبت طالح ترا طالح کند

یعنی اچھے آدمی کی صحبت تجھے اچھا کر دے گی اور برے آدمی کی صحبت تجھے برا بنا دے گی۔ (صراط)

ایسی مجالس میں جن میں کتاب الٰہی کا انکار کیا جائے اور اس کی آیتوں کا مذاق اڑایا جائے شرکت کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔اسی حکم کی یاد تازہ کرائی جارہی ہے کہ جو شخص ایسی مجلسوں میں شرکت کرتا ہے وہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ تمام گمراہ فرقوں کی مجلسوں اور جلسوں میں جا کر بیٹھنے کا یہی حکم ہے۔ کیونکہ صحبت کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ (ضیاء)

منافقین ' علماء یہود کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور وہ قرآن مجید کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کی تکذیب کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے سے منع فرما دیا۔ (الوسیط؛ج ۲ص ۱۲۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

اس آیت کا معنی یہ بھی ہے کہ اے منافقو ! تم بھی کفر میں ان علماء یہود کی مثل ہو 'اہل علم نے کہا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص کفر سے راضی ہو وہ بھی کافر ہے اور جو شخص کسی برے کام سے راضی ہو اور برا کام کرنے والوں کے ساتھ مل جل کر رہے تو خواہ اس نے وہ برا کام نہ کیا ہو پھر بھی وہ ان کے ساتھ گناہ میں برابر کا شریک ہے 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔" (ورنہ) تم بھی ان کی مثل قرار دیئے جاؤ گے۔ "یہ اس وقت ہے جب ان کی مجلس میں بیٹھنے والا وہاں بیٹھنے پر راضی ہو 'لیکن اگر وہ وہاں بیٹھنے سے بیزار ہو اور ان کی کفریہ باتوں پر غضبناک اور متنفر ہو لیکن کسی مجبوری اور خوف کی وجہ سے وہاں بیٹھا ہو تو پھر وہ ان کی مثل نہیں ہو گا 'اسی وجہ سے ہم یہ فرق کرتے ہیں کہ منافق، مدینہ میں یہود کے پاس بیٹھتے تھے اور وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید کے خلاف باتیں کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے اور منافق خوش ہوتے تھے اس لیے وہ بھی ان کافروں کی مثل قرار پائے 'اور مکہ میں جب مسلمان مشرکوں سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید کے خلاف باتیں سنتے تھے تو ان کے دل ان باتوں سے بیزار اور متنفر ہوتے تھے اور مسلمان مشرکوں کے غلبہ اور ظلم کی وجہ سے مجبور تھے اس لیے ان مسلمانوں کا یہ حکم نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک شخص کسی کے پاس مسلمان ہونے کے لیے جائے اور وہ اس سے یہ کہے کہ تم کل آنا 'یا شام کو آنا تو وہ شخص کافر ہو جائے گا کیونکہ وہ شخص اتنی دیر کے لیے اس کے کفر پر راضی ہو گیا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار کے پاس بیٹھنا ان سے ملنا جلنا اور باتیں کرنا مطلّقا منع نہیں ہے 'ان کے پاس بیٹھنا اس وقت ممنوع ہے جب وہ اسلام کے خلاف باتیں کر رہے ہوں 'ہاں کفار کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنا ممنوع ہے اور معاشی 'عمرانی 'ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں ضرورۃ ان سے ملنا جلنا اور باتیں کرنا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : یہ منافق تمہارا جائزہ لے رہے ہیں 'اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح نصیب ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے 'اور اگر کافروں کو (کامیابی سے) حصہ ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں آگئے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا تھا'۔ (النساء : ۱۴۰)

منافقوں کا مسلمانوں اور کافروں کو فریب دینا

ابو سلیمان نے کہا ہے کہ یہ آیت بالخصوص منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے ' مقاتل نے کہا منافقین مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے رہتے تھے ' اگر مسلمانوں کو فتح ہوتی تو وہ کہتے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ سو تم ہم کو غنیمت میں سے حصہ دو ' اور اگر کافروں کو غلبہ ہو جاتا تو کہتے کیا ہم تمہاری رائے پر غالب نہیں آگئے تھے یا ہم تمہاری دوستی میں غالب نہیں تھے یا کیا ہم نے تمہاری مدد نہیں کی تھی ' یا کیا ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم دین میں تمہارے ساتھ ہیں ' اور کہتے کیا ہم نے تم مسلمانوں سے نہیں بچایا تھا یعنی کیا ہم نے تم ان کے رسوا کرنے سے نہیں بچایا تھا ' یا کیا ہم نے تم کو ان کے منصوبوں سے آگاہ نہیں کیا تھا یا کیا ہم نے تم کو اسلام میں داخل ہونے سے نہیں روکا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس کلام سے کافروں پر احسان جتانا چاہتے تھے۔ (تبیان)

فوائد

۱: یعنی جہاں دین کا مذاق ہو رہا ہو وہاں بادل نخواستہ بھی نہ جاؤ اور اگر تم وہاں پہلے سے تھے کہ یہ جرم شروع ہو گئے تو وہاں سے ہٹ جاؤ اور اگر روک دینے کی طاقت ہو تو زور بازو یا زور زبان سے روک دو۔

۲: اس سے معلوم ہوا کہ کفر کرنا کفر کرانا کفر سے راضی ہونا سب کفر ہے اور سب درجہ میں برابر ہیں۔ بلکہ کفر کی مجلس میں جانا بھی حرام ہے شرکت کی غرض سے۔ للذا بد مذہبوں کے جلسوں، ماتم کی مجلسوں نوحہ، تبرا کی محفلوں میں شریک ہونا حرام اگرچہ خود نہ کرے ہاں تردید کے لیے جانا اس سے خارج ہے۔

۳: یعنی منافق و کافر سب دوزخ میں ہوں گے اگرچہ ان کے مقامات علیحدہ ہوں رب فرماتا ہے۔ ان المنفقین فی الدرک الاسفل من النار یا یہ لوگ کبھی اکٹھے بھی کئے جایا کریں گے۔ للذا آیتوں میں تعارض نہیں۔

آیت مبارکہ :

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾ ع

لغۃ القرآن: [الَّذِيْنَ : (یہ) وہ لوگ (ہیں) جو] [يَتَرَبَّصُوْنَ : انتظار کرتے ہیں] [بِكُمْ : تمہارے بارے میں] [فَاِنْ : تمہارے بارے میں] [كَانَ : ہوتی ہے] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [فَتْحٌ : کوئی فتح] [مِّنَ اللّٰهِ : اللہ (کی طرف) سے] [قَالُوْٓا : تو وہ لوگ کہتے ہیں] [اَلَمْ نَكُنْ : کیا ہم نہیں تھے] [مَّعَكُمْ : تمہارے ساتھ] [وَاِنْ : اور اگر] [كَانَ : ہوتا ہے] [لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے] [نَصِيْبٌ : کوئی حصہ] [قَالُوْٓا : تو وہ کہتے ہیں] [اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ : کیا ہم قابو یافتہ نہ تھے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَنَمْنَعْكُمْ : اور کیا ہم نے نہیں بچایا تم کو] [مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں سے] [فَاللّٰهُ : پس اللہ] [يَحْكُمُ : فیصلہ کرے گا] [بَيْنَكُمْ : تم لوگوں کے درمیان] [يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن] [وَلَنْ يَّجْعَلَ : اور ہرگز نہیں بنائے گا] [اللّٰهُ : اللہ] [لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے] [عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں پر] [سَبِيْلاً : کوئی الزام]

ترجمہ: وہ (منافق) جو تمہاری (فتح و شکست کی) تاک میں رہتے ہیں، پھر اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو (ظاہری فتح میں سے) کچھ حصہ مل گیا تو (ان سے) کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہیں ہوگئے تھے اور (اس کے باوجود) کیا ہم نے تمہیں مسلمانوں (کے ہاتھوں نقصان) سے نہیں بچایا؟ پس اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا، اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر (غلبہ پانے کی) ہرگز کوئی راہ نہ دے گا۔

منافق ابن الوقت اور مفاد کا بندہ ہوتا ہے

منافق ابن الوقت اور مفاد کا بندہ ہوتا ہے اس لیے کافر اور مسلمان کا ساتھ دینے میں مخلص نہیں ہوتا۔ اپنے مفاد کا غلام ہونے کی وجہ سے وہ اس انتظار میں ہوتا ہے کہ جدھر سے اسے فائدہ پہنچے وہ اس فریق کے ساتھ اپنی رفاقت اور ہمدردی کا اظہار کر دے۔

رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ کے منافقوں کی یہی حالت تھی۔ غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں سے الگ ہو کر کفار کی تقویّت کا باعث بنے اور فتح مکہ کے وقت مسلمانوں کی قوت دیکھ کر ان سے وفا کا دم بھرتے رہے۔ جب بھی صحابہ کرام (رض) کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیابی حاصل ہوتی تو وہ اپنی نمازوں اور ظاہری مسلمانی کا واسطہ دے کر یقین دہانی کرواتے کہ ہم ذاتی مجبوریوں اور جماعتی مصلحت کی خاطر کفار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ جبکہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا تمہارے ساتھ ہے لیکن جوں ہی کفار کا پلڑا بھاری دیکھتے ہیں تو انھیں اعتماد دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھی ہیں۔ حقیقت میں ہم ہی نے تمہیں مسلمانوں سے بچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو انتباہ کر رہا ہے کہ دنیا میں تمہیں مہلت دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے تم مسلمانوں اور کافروں کے ساتھ خلط ملط ہوئے رہتے ہو۔ قیامت کے دن کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر کے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کو مومنوں پر ہرگز فوقیت نہیں دے گا۔ آیت کے آخر میں منافق کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے کافر کا لفظ استعمال فرما کر واضح کیا ہے کہ یہ لوگ حقیقتاً کافر ہیں۔ اس آیت کے آخری الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اے مومنو! پورے اخلاص اور استقامت کے ساتھ ڈٹے رہو۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ایسے حالات پیدا کرے گا کہ منافق مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ چنانچہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر منافقوں کو آپ سے سرعام معافی مانگنا پڑی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا:

(یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْکُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْھِمْ ط قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ ط وَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ فَیُنَبِّءُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْھِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْھُمْ ط فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمْ ط اِنَّھُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ جَزَآءًم بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ ج فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ) [التوبۃ: ۹۴تا۹۶]

”جب تم ان کے پاس آؤ گے وہ تمہارے سامنے معذرت کریں گے۔ ان سے کہہ دیجیے بہانے نہ بناؤ ہم تمہاری باتوں پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ اللہ نے ہمیں تمہارے حالات بتلا دیے ہیں اور آئندہ بھی اللہ اور اس کا رسول تمہارے کام دیکھ لیں گے پھر تم ایسی ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب حالات جانتا ہے وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے۔ “

حضرت عمر (رض) فرماتے ہیں ایک دفعہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت چاہی کہ میں عبداللہ بن ابی کو قتل کروں لیکن آپ نے مجھے یہ فرما کر منع کیا کہ اس طرح لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ساتھیوں کو قتل کروانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ کی حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ منافقین ہمارے سامنے بے بس ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ دنیا میں ہی پورا ہوا۔ [البدایۃ والنہایۃ]

منافقین کی دورخی روش

منافقین کی دورخی روش کو بے نقاب کیا جارہا ہے یعنی ان کا کوئی دین نہیں کوئی عقیدہ نہیں جس کے لیے جینے اور مرنے کی تڑپ ان کے دلوں میں موجود ہو۔ ان کا دین، ان کا کعبہ مقصود صرف عروس دولت ہے۔ اپنا عہد و پیمان توڑنا پڑے، اپنے ضمیر کو کچلنا پڑے پروا نہیں دولت مل جائے۔ حق و باطل میں جو کشمکش جاری ہے اس میں وہ کسی ایک کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ نہیں کرتے بلکہ اس تاڑ میں رہتے ہیں کہ پلہ کس کا بھاری رہتا ہے اور مال غنیمت پر قابض کون ہوتا ہے۔ میدان جنگ کسی کے ہاتھ رہے وہ اسی کے پاس جاکر اپنی دوستی کا حق جتلا کر مال غنیمت میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ شاید دنیا کے پرستاروں کا ازل سے یہی شیوہ ہے اور ابد تک یہی شیوہ رہے گا۔ مسلمان ہونے میں ترقی کے امکانات دکھائی دیئے تو حضرت پکے مسلمان ہیں۔ اور اگر وزارتیں اور عہدے، خطابات اور جاگیریں کفر کے تصرف میں دیکھیں تو تسبیح و سجادہ کو دور سے سلام کیا۔ قشقہ لگایا، زنار پہنا اور باطل و کفر کی خدمت میں جاں نثار اور وفادار غلاموں کی طرح حاضر ہوگئے۔

اس کے متعلق علامہ قرطبیؒ نے تفصیلی بحث کی ہے اور سب سے پسندیدہ قول یہ ہے کہ اگر مسلمان اللہ کی نافرمانی کر کے اور سنن الٰہیہ سے آنکھیں بند کر کے اپنی شکست کے اسباب خود مہیا نہ کرلیں تو کوئی طاغوتی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی مسلمانوں کی ہزیمت ہوئی ہے اپنے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اگر وہ احکام الٰہی کے صحیح معنوں میں پابند ہوں۔ دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے جس اتفاق و اتحاد کا انھیں حکم دیا گیا ہے اور تمام ممکن وسائل سے جنگ کے لیے مستعد ہونے کا ارشاد ہوا ہے۔ اگر وہ اس کو ملحوظ رکھیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں مغلوب نہیں کرسکتی۔ ان اللہ سبحانہ لایجعل للکفرین علی المومنین سبیلا الا ان یتواصوا بالباطل ولاتیناھوا عن المنکر ویتقاعدوا عن التوبۃ فیکون تسلیط العد و من قبلھم۔ قال ابن العربی ھذا نفیس جدا (القرطبیؒ) بعض علماء نے سبیل سے مراد دلیل لی ہے یعنی دلیل و برہان کے میدان میں کافر کبھی مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ (ضیاء)

فوائد

۱: یعنی تمہارے ساتھ تھے کہ کلمہ نماز وغیرہ میں تمہارے ساتھ رہتے تھے یا جنگ میں تمہارے ساتھ چلے گئے تھے لہٰذا ہمیں بھی غنیمت کا حصہ دو۔ غرضیکہ زبان سے تمہارے ساتھ اور دل سے کافروں کے ساتھ رہ کر دو گھر کے مہمان بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دو گھر کا مہمان بھوکا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زبانی، جسمانی ہمراہی بے کار ہے۔ جب دل سے دور ہو۔

۲: یعنی اے کافرو! تمہاری فتح کا بڑا سبب ہم ہیں۔ اولا تو اس لیے کہ ہم اگرچہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آگئے مگر تم سے لڑے نہیں اس لیے مسلمانوں کا حملہ بالکل ہلکا رہا۔ دوسرے ہم تمہارا کام کرنے جہاد میں آئے تھے کہ مسلمانوں کے جنگی راز سے تمہیں باخبر رکھتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا کافروں کی خفیہ پولیس بننا اور مسلمانوں کے راز انھیں بتانا منافقوں کا طریقہ ہے جس میں آج بہت مسلمان گرفتار ہیں

۳: یعنی عملی فیصلہ قیامت میں ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے ساتھ رکھا جاوے گا، جس سے اسے محبت ہوگی۔ قولی فیصلہ دنیا میں بھی ہو چکا ہے۔

۴: اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا کے کافر و منافق متفق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کو نہیں مٹا سکتے۔ مسلمان جہاں کہیں نقصان اٹھاتے ہیں اپنی غداری اور شامت اعمال کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔ اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ مسلمان کے خلاف کافر کی گواہی جائز نہیں۔

مسلمان عورت کا کسی کافر مرد سے نکاح حلال نہیں۔ کسی کافر کو مسلمان غلام خریدنے کا حق نہیں۔ کافر مسلمان کا وارث اور مورث نہیں۔ (نور)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کفار کو مومنوں پر ہرگز فوقیت نہیں دے گا۔

۲۔ مسلمان فتح حاصل کریں تو منافق ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

۳۔ کفار فاتح بنیں تو منافق ان کے ساتھ ہمدری کا اظہار کرتے ہیں۔

۴۔ قیامت کو اللہ تعالیٰ سب کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

آیت مبارکہ :

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿142﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک] [الْمُنٰفِقِیْنَ : منافق لوگ] [یُخٰدِعُوْنَ : دھوکہ دیتے ہیں] [اللّٰہَ : اللہ کو] [وَہُوَ : اور وہ] [خَادِعُہُمْ : ان کو دھوکہ دینے والا ہے] [وَاِذَا : اور جب بھی] [قَامُوْآ : وہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں] [اِلَی الصَّلٰوۃِ : نماز کے لیے] [قَامُوْا : تو وہ کھڑے ہوتے ہیں] [کُسَالٰی : انتہائی سستی سے] [یُرَآءُ وْنَ : دکھاتے ہوئے] [النَّاسَ : لوگوں کو] [وَلاَ یَذْکُرُوْنَ : اور وہ لوگ نہیں یاد کرتے] [اللّٰہَ : اللہ کو] [اِلاَّ : مگر] [قَلِیْلاً : بہت کم]

ترجمہ: بیشک منافق (بزعم خویش) اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں (اپنے ہی) دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ (محض) لوگوں کو دکھانے کیلئے کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کو یاد (بھی) نہیں کرتے مگر تھوڑا۔

تشریح:

یہاں منافقوں کی ایک اور بری خصلت کا بیان ہے وہ یہ کہ یہ اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حقیقتاً تو مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کیونکہ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ کو فریب دینا ممکن نہیں۔ ان کے اس فریب کا جواب انھیں اللہ عَزَّوَجَلَّ دے گا کہ انھیں غافل کر کے مارے گا، دنیا میں انھیں رسوا کرے گا اور قیامت میں انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔ ان منافقوں کی علامت یہ ہے کہ جب مومنین کے ساتھ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو مرے دل سے اور سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں ایمان تو ہے نہیں جس سے عبادت کا ذوق اور بندگی کا لطف انھیں حاصل ہو سکے، محض لوگوں کو دکھانے کیلئے نماز پڑھتے ہیں۔ (صراط)

نماز میں سستی کرنا منافقوں کی علامت ہے

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں سستی کرنا منافقوں کی علامت ہے۔ نماز نہ پڑھنا یا صرف لوگوں کے سامنے پڑھنا جبکہ تنہائی میں نہ پڑھنا یا لوگوں کے سامنے خشوع و خضوع سے اور تنہائی میں جلدی جلدی پڑھنا یا نماز میں ادھر ادھر خیال لیجانا، دلجمعی کیلئے کوشش نہ کرنا وغیرہ سب سستی کی علامتیں ہیں۔ نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کا آسان نسخہ :

کسی نے حضرت حاتم اصم (رح) سے ان کی نماز کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: جب نماز کا وقت قریب آتا ہے تو میں کامل وضو کرتا ہوں پھر جس جگہ نماز ادا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے وہاں آ کر اتنی دیر بیٹھ جاتا ہوں کہ میرے اعضا اکٹھے ہو جائیں، اس کے بعد یہ تصور باندھ کر نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں کہ کعبہ معظّمہ میرے سامنے ہے، پل صراط میرے قدموں کے نیچے ہے، جنت میرے دائیں طرف اور جہنم بائیں طرف ہے، مَلَکُ الْموت (علیہ السلام) میرے پیچھے کھڑے ہیں اور میرا یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ میری آخری نماز ہے، پھر میں امید اور خوف کے درمیان قیام کرتا ہوں اور جیسے تکبیر کہنی چاہیے ویسے تکبیر کہتا ہوں اور ٹھہر ٹھہر کر قراءت کرتا ہوں، عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں، ڈرتے ہوئے سجدہ کرتا ہوں، بائیں پنڈلی پر بیٹھ کر اپنے قدم کا پچھلا حصہ بچھا دیتا ہوں اور دایاں قدم انگوٹھے پر کھڑا کر دیتا ہوں، پھر اخلاص کے ساتھ باقی افعال ادا کرتا ہوں اب میں نہیں جانتا کہ میری نماز قبول بھی ہوئی یا نہیں۔

(احیاء العلوم، کتاب اسرار الصلاۃ و مہماتہا، الباب الاول، فضیلۃ الخشوع، ۲۰۶/۱)

حسن نے بیان کیا ہے کہ مومن اور منافق دونوں پر ایک نور ڈالا جائے گا جس میں چلتے ہوئے وہ پل صراط تک پہنچیں گے ' پل صراط پر پہنچنے کے بعد منافقین کا نور بجھا دیا جائے گا اور مومن اپنے نور کی وجہ سے پل صراط پر چلتے رہیں گے اس وقت منافقین مومنوں سے کہیں گے :

(آیت) "یوم یقول المنفقون والمنفقت للذین امنوا انظرونا نقتبس من نورکم قیل ارجعوا ورآءکم فالتمسوا نورا فضرب بینھم بسور لہ باب باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب، ینادونھم الم نکن معکم قالوا بلی ولکنکم فتنتم انفسکم وتربصتم وارتبتم وغرتکم الامانی حتی جآء امر اللہ وغرکم باللہ الغرور "۔ (الحدید : ۱۴۔ ۱۳)

ترجمہ : جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے یہ کہیں گے 'ہمیں دیکھو ہم تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں ' ان سے کہا جائے گا اپنے پیچھے واپس جاؤ پھر وہاں کوئی نور تلاش کرو ' پس ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی 'جس کی اندرونی جانب کے دروازہ میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب کے دروازہ میں عذاب ہوگا، منافق مسلمانوں کو پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے وہ کہیں گے کیوں نہیں لیکن تم نے خود کو (نفاق کے) فتنہ میں ڈال دیا 'اور تم (مسلمانوں کی مصیبتوں کے) منتظر رہے 'اور تم (اسلام کے متعلق)

شک کرتے رہے اور تمہاری جھوٹی آرزوؤں نے تم کو دھوکے میں ڈالے رکھا ٬حتی کہ اللہ کا حکم آگیا اور (شیطان کے) دھوکے نے تم کو اللہ کے متعلق دھوکے میں رکھا۔

حسن نے کہا اللہ تعالیٰ، جو ان کو دھوکے کی سزا دے گا ٬اس کا بھی یہی معنی ہے ٬ابن جریج نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے (جامع البیان ج ۴ ص ۴۴۹)

خداع کے معنی ہیں کسی شخص کو کسی شے کی حقیقت کے خلاف وہم میں ڈالنا ٬اللہ کو ان کے دھوکا دینے کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے باطن میں جو کفر چھپایا ہوا تھا اس کے خلاف زبان سے اسلام کو ظاہر کرتے تھے ٬تاکہ اس نفاق کے ذریعہ وہ دنیا میں اپنی جان اور مال کو محفوظ کرلیں ٬اور جو فوائد مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں مثلا صدقات اور مال غنیمت اس میں بھی حصہ دار بن جائیں۔

اکثر منافقین اللہ کو مانتے تھے ٬اب یہ سوال ہوگا کہ وہ اپنے زعم میں اللہ کو کس طرح دھوکا دیتے تھے ٬کیونکہ ان کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ٬اس کا جواب یہ ہے کہ وہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے منکر تھے اور وہ اپنے زعم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھوکا دیتا تھے اور اللہ نے یہ فرما کر کہ وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں یہ ظاہر فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھوکا دینا ٬اللہ کو دھوکا دینا ہے ٬کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا بعینہٖ اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا ہے ٬اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے دھوکے کی یہ سزا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے نفاق پر مطلع فرمادیا اور آپ نے مسلمانوں کو اس کی خبر دے دی ان کا راز فاش ہوگیا اور وہ دنیا میں رسوا ہوگئے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو الگ سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے اور اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں۔ (النساء: ۱۴۲)

اس آیت میں منافقوں کی تین علامتیں ذکر فرمائی ہیں سستی سے نماز پڑھنا ٬لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنا اور اللہ کا ذکر بہت کم کرنا ٬سستی اور کم ذکر کرنے پر حسب ذیل احادیث میں دلیل ہے:

گراں باری اور سستی سے نماز پڑھنے کے متعلق احادیث

علاء بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ وہ بصرہ میں حضرت انس بن مالک (رض) کے گھر گئے جب وہ ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوگئے تھے ٬ان کا گھر مسجد کے ساتھ تھا ٬جب ہم ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی ہے ہم نے کہا ابھی ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے ہیں انھوں نے کہا عصر کی نماز پڑھو ٬ہم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ٬جب ہم فارغ ہوئے تو حضرت انس (رض) نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اتنی تاخیر کرنا منافق کی نماز ہے ٬وہ بیٹھ کر سورج کو دیکھتا رہتا ہے حتی کہ جس وقت سورج دو سینگھوں کے درمیان ہوتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں مارتا ہے اور اس میں اللہ کا ذکر بہت کم کرتا ہے۔ (صحیح مسلم ٬رقم الحدیث: ٬ ۶۲۲ ٬سنن ابوداؤد ٬رقم الحدیث: ٬۴۱۳ ٬سنن ترمذی ٬رقم الحدیث: ٬۱۶۰ سنن نسائی ٬رقم الحدیث: ٬۵۱۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عشاء اور فجر کی نماز منافقوں پر سب سے بھاری ہے 'اور فرمایا کاش ان کو معلوم ہوتا کہ عشاء اور فجر کی نماز میں کتنا اجر ہے۔ (صحیح البخاری ': کتاب مواقیت الصلوۃ 'باب: ۲۱ 'صحیح مسلم 'رقم الحدیث: '۶۵۱)

ریاکاری سے عبادت کرنے کے متعلق احادیث

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں: کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک ریا شرک ہے۔ (سنن ترمذی 'رقم الحدیث: ۱۵۴۰)

حضرت محمود بن ولید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ شرک اصغر ہے 'صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ! شرک اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ریا 'قیامت کے دن جب اللہ عزوجل لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا تو فرمائے گا: جاؤ انہی لوگوں کے پاس جن کے لیے تم ریاکاری کرتے تھے 'دیکھو ان سے تمہیں کوئی جزا ملتی ہے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۴۲۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

حضرت شداد بن اوس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے اپنی امت پر شرک اور شہوت خفیہ کا خوف ہے 'میں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک کرے گی 'آپ نے فرمایا ہاں 'لیکن وہ سورج 'چاند 'پتھروں اور بتوں کی عبادت نہیں کرے گی 'لیکن وہ اپنے اعمال میں ریا کرے گی 'اور شہوت خفیہ یہ ہے کہ ایک شخص روزہ رکھے 'پھر کسی نفسانی خواہش کی بناء پر وہ روزہ ترک کردے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۴ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

حضرت بشیر بن عقربہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے محض لوگوں کے دکھانے اور سنانے کے لیے خطبہ دیا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ریا اور سمعہ (دکھانے اور سنانے) کے مقام پر کھڑا کرے گا۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۵۰۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

اللہ کا ذکر کم کرنے کا معنی

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ منافق صرف دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور صرف سنانے کے لیے نیک کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس جب دوسرے لوگ ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھتے ہیں اور جب کوئی نہیں ہوتا تو وہ نماز نہیں پڑھتے اور یہ جو فرمایا ہے کہ وہ اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ نماز میں جو تکبیرات بلند آواز سے پڑھی جاتی ہیں ان کو پڑھتے ہیں اور نماز میں اللہ کا جو ذکر پست آواز سے کیا جاتا ہے اس میں خاموش رہتے ہیں۔ مثلا قرات اور تسبیحات وغیرہ کو نہیں پڑھتے یا معنی یہ ہے کہ نماز کے علاوہ وہ اور کسی وقت میں اللہ کا ذکر نہیں کرتے ' آج کل ہم اکثر لوگوں کا یہی حال دیکھتے ہیں وہ اکثر اوقات گپ شپ 'دوسروں کی غیبت 'کہانیوں 'لطیفوں اور کاروباری باتوں میں گزار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تکبیر و تقدیس تسبیح و تہلیل 'توبہ استغفار اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود شریف پڑھنے کا ذکر ان کی زبانوں پر نہیں آتا 'یا بہت کم آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وہ اس (کفر اور ایمان) کے درمیان متزلزل ہیں ' نہ ان (کافروں) کی طرف ہیں نہ ان (مسلمانوں) کی طرف ہیں ' اور جس کو اللہ گمراہ کردے تو آپ اس کے لیے کوئی راہ نہ پائیں گے۔ (النساء : ۱۴۲)

منافق کا مذبذب ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافق کو مذبذب فرمایا ہے ' مذبذب اس شخص کو کہتے ہیں جو دو چیزوں یا دو کاموں کے درمیان متردد ہو ' تذبذب کا اصل معنی تحیر اور اضطراب ہے ' کیونکہ منافق اپنے دین میں متحیر ہوتا ہے ' اور وہ کسی صحیح اعتقاد کی طرف رجوع نہیں کرتا ' منافقین نہ مشرکین کی طرح صراحۃً شرک کرتے تھے اور نہ مومنوں کی طرح مخلص تھے ' وہ اس کے درمیان مذبذب تھے اس کا معنی ہے وہ اسلام اور کفر کے درمیان مذبذب ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : منافق کی مثال اس بکری کی طرح ہے جو بکریوں کے دو ریوڑوں کے درمیان حیران ہو کبھی اس ریوڑ کی طرف کی طرف جاتی ہو اور کبھی اس ریوڑ کی طرف۔

(صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۲۲۸۴ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۵۰۵۲ ' مسند احمد ج ۲ ' رقم الحدیث : ۵۰۷۹ ' ۵۷۹۴)

ہدایت کے دو معنی اور ان کے محمل

" جس کو اللہ گمراہ کردے ' اس کا معنی یہ ہے کہ جس کے کفر اور خباثت کی وجہ سے اللہ اس سے ہدایت کی استعداد اور صلاحیت کو سلب کرلے آپ اس کو ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتے ' یہاں آپ سے ہدایت کے جس معنی کی نفی کی ہے اس کا معنی ہے کسی شخص کو ہدایت یافتہ اور مومن بنانا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے ' اور ہدایت کا دوسرا معنی ہے سیدھا راستہ دکھانا ' سو اس معنی میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو بھی ہدایت دیتے تھے اور دیگر کافروں ' منافقوں کو بھی بلکہ تمام مخلوق کو ہدایت دیتے تھے اور اس معنی میں ہدایت دینا آپ کا منصب ہے ' اور قرآن مجید میں جہاں بھی آپ سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں ہدایت کا معنی ہدایت یافتہ اور مومن بنانا ہے یعنی سیدھے راستہ پر چلانا اور جہاں آپ کی طرف ہدایت کی نسبت کی گئی ہے وہاں ہدایت سے مراد ہے سیدھا راستہ دکھانا۔ (تبیان)

آیت مبارکہ :

مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

لغۃ القرآن: [مُّذَبْذَبِيْنَ : مضطرب ہوتے ہوئے] [بَيْنَ ذٰلِکَ : اس کے دوران] [لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ : اور نہ اس طرف ہوتے ہوئے] [وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ : نہ اس طرف ہوتے ہیں] [وَمَنْ : اور جس کو] [يُّضْلِلِ : گمراہ کرتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [فَلَنْ تَجِدَ : تو 'تو ہرگز نہیں پائے گا] [صلی اللہ علیہ وسلم لَہٗ: اس کے لیے] [سَبِيْلاً : کوئی راہ]

ترجمہ: اس (کفر اور ایمان) کے درمیان تذبذب میں ہیں نہ ان (کافروں) کی طرف ہیں اور نہ ان (مؤمنوں) کی طرف ہیں، اور جسے اللہ گمراہ ٹھہرادے تو آپ ہرگز اس کے لیے کوئی (ہدایت کی) راہ نہ پائیں گے۔

تشریح:

منافقین کی دوسری حالت

منافقوں کی دوسری حالت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا (مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِکَ) کہ وہ اس کے درمیان ادھر میں لٹکے ہوئے ہیں۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ذلک مجموعہ ایمان وکفر کی طرح اشارہ مانا جائے تو یہ بھی صحیح ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عالم حیرانی میں تردد میں پڑے ہوئے ہیں شیطان نے ان کو حیرت میں ڈال دیا ہے پھر امام راغب سے التذبذب کا معنی نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں صوت الحرکۃ للشیء المعلق ثم استعیر لکل اضطراب وحرکۃ اور تردد بین الشیئین یعنی ذبذبہ اس آواز کو کہا جاتا ہے جو کسی لٹکی ہوئی چیز سے نکل رہی ہو۔ پھر بطور استعارہ ہر اضطراب اور ہر حرکت کے لیے یا دو چیزوں کے درمیان متردد ہونے کے لیے استعمال کر لیا گیا۔ منافقین کفر وایمان کے درمیان اپنی حالت ظاہری کے اعتبار سے متردد ہیں ورنہ حقیقت میں تو کافر ہی ہیں۔

مزید فرمایا (لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ) یعنی منافقین بظاہر دونوں طرف ہیں مسلمانوں سے بھی ملتے ہیں اور کافروں سے بھی اور ہر ایک کے ساتھ اپنی محبت اور دوستی ظاہر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ ان کی طرف ہیں نہ ان کی طرف۔ جو لوگ منافق ہوتے ہیں اپنے خیال میں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے چالاک ہیں دیکھو دونوں جماعتوں کو اپنا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کو کوئی جماعت بھی اپنا نہیں سمجھتی۔ منافق کا کردار خواہ وہ کتنی ہی قسمیں کھائے کسی فریق کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہ مثل المنافق کالشاۃ العائرۃ بین الغنمین تعیر الی ھذہ مرۃ والی ھذہ مرۃ (رواہ مسلم عن ابن عمر (رض) یعنی منافق کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بکری دو ریوڑوں کے

درمیان ہو کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے اور کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے۔ شراح حدیث نے لکھا ہے کہ اس سے وہ بکری مراد ہے جو گابھن ہونے کے لیے کبھی اس ریوڑ میں اپنے لیے نر تلاش کرتی ہے اور کبھی دوسرے ریوڑ میں۔ (ذکرہ القاری فی المرقاۃ)

فائدہ: معلوم ہوا کہ نماز میں سستی کرنا کسلاتے ہوئے نماز کے لیے اٹھنا بد دلی سے نماز کے افعال ادا کرنا منافقوں کا طریقہ ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ خوب خوشی اور بشاشت اور نشاط کے ساتھ نماز پڑھیں۔

حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس میں زردی آجاتی ہے اور شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو کھڑے ہو کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے۔ ان میں اللہ کو نہیں یاد کرتا مگر تھوڑا سا۔ (رواہ مسلم)

چار ٹھونگیں مارنے کا مطلب یہ ہے کہ لپ جھپ سجدہ کرتا ہے، سر رکھا بھی نہیں کہ اٹھالیا جیسا کہ مرغا جلدی جلدی ٹھونگیں مار کر دانہ اٹھاتا ہے۔ اور شیطان ایسی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے جو سورج کے اور اس کے دیکھنے والوں کے درمیان ہو وہاں کھڑا ہو کر سر ہلاتا ہے جس سے دیکھنے والوں کو سورج کی شعاعوں کی جگمگاہٹ معلوم ہوتی ہے وہ یہ حرکت اس لیے کرتا ہے کہ سورج کی پرستش کرنے والے اس وقت اس کی عبادت کریں۔

چونکہ منافقین مسلمانوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے تھے نماز کی فرضیت اور فضیلت اور اس کے اجر وثواب کا یقین نہیں تھا اس لیے۔برے دل سے نمازوں میں حاضر ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فجر کی نماز پڑھائی اور سلام پھیر کر فرمایا کیا فلاں حاضر ہے؟ حاضرین نے عرض کیا نہیں، پھر فرمایا کہ فلاں حاضر ہے؟ عرض کیا گیا کہ نہیں، آپ نے فرمایا بلاشبہ یہ دو نمازیں (عشاء اور فجر) منافقین پر سب نمازوں سے زیادہ بھاری ہیں اور اگر تم کو معلوم ہو جائے کہ ان میں کیا اجر وثواب ہے تو ان نمازوں میں حاضر ہوتے اگرچہ گھٹنوں کے بل چل کر آنا پڑتا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی کما فی المشکوٰۃ صفحہ ۹۶)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر ان میں سے (یعنی جماعت میں غیر حاضر ہونے والوں میں سے) کسی کو پتہ چل جائے کہ اسے ایک چکنی ہڈی مل جائے گی یا بکری کے دو اچھے کھر مل جائیں گے تو عشاء کی نماز کے لیے حاضر ہو جائے (رواہ البخاری صفحہ ۸۹: ج ۱) طالب دنیا کو ذرا سی دنیا بھی مل جائے تو تکلیف اٹھانے اور نیند قربان کرنے کو حاضر ہو جاتا ہے اور جسے اعمال صالحہ پر اجر وثواب ملنے کا یقین نہیں وہ اپنے نفس کو اجر والے عمل کے لیے آمادہ نہیں کر سکتا اس بات کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بکری کے کھر کی مثال دے کر واضح فرمایا۔

فائدہ: معلوم ہوا کہ آنحضرت سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک میں نماز اور جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ منافقوں کو بھی اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے نماز پڑھنی پڑتی تھی جب دینی فضا بن جاتی ہے تو جو اپنے دل سے دین دار نہ ہو اسے بھی مجبوراً دینداروں کے ساتھ گھسٹنا پڑتا ہے۔ اور یہی حال بد عملی اور بے دینی کا ہے جب بد عملی اور بے دینی کی فضا ہوتی ہے تو اچھے جذبات والا بھی بے عملوں اور بے دینوں کے طور طریق اختیار کر لیتا ہے۔ آج بے دینی اور بے عملی کی فضا ہے۔ بے نمازی بغیر کسی شرم وحیا کے دینداروں میں گھل مل کر رہتے ہیں اور اپنا کوئی قصور محسوس نہیں کرتے، انھیں ایک نماز چھوٹنے کا ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔ اگر دوبارہ دینی فضا بن جائے تو پھر وہی عمل کی فضا لوٹ آئے جو زمانہ نبوت میں تھی۔ (انوار)

منافقوں کی پریشان حالی

یعنی منافقین تو بالکل تردّد اور حیرت میں گرفتار ہیں۔ نہ ان کو اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف اور اللہ جس کو بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

نماز شوق سے پڑھو:

حضرت ابن عباس تھکے ہوئے بدن سے کسمسا کر نماز پڑھنا مکروہ جانتے تھے اور فرماتے تھے کہ نمازی کو چاہیے کہ ذوق و شوق سے راضی خوشی پوری رغبت اور انتہائی توجہ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہوا اور یقین مانے کہ اس کی آواز پر اللہ تعالیٰ کے کام میں، اس کی طلب پوری کرنے کو خدا تیار ہے۔

منافقوں پر بھاری نمازیں:

بخاری مسلم میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں سب سے زیادہ بوجھل نماز منافقوں پر عشاء اور فجر کی ہے، اگر دراصل یہ ان نمازوں کے فضائل کے دل سے قائل ہوتے تو گھٹنوں کے بل بھی چل کر آنا پڑتا یہ ضرور آجاتے ہیں تو ارادہ کر رہا ہوں کہ تکبیر کہلوا کر کسی کو اپنی امامت کی جگہ کھڑا کر کے نماز شروع کرا کر کچھ لوگوں سے لکڑیاں اٹھوا کر ان کے گھروں میں جاؤں جو جماعت میں شامل نہیں ہوتے اور لکڑیاں ان کے گھروں کے ارد گرد لگا کر حکم دوں کہ آگ لگادو اور ان کے گھروں کو جلادو، ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ کی قسم اگر انھیں ایک چرب ہڈی یا دو اچھے کھر ملنے کی امید ہو تو دوڑے چلے آئیں لیکن آخرت کی اور اللہ کے ثوابوں کی انھیں اتنی بھی قدر نہیں۔ اگر بال بچوں اور عورتوں کا جو گھروں میں رہتی ہیں مجھے خیال نہ ہوتا تو قطعاً میں ان کے گھر جلادیتا۔

منافق کی مثال

رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ منافق کی مثال ایسی ہے جیسی دو ریوڑ کے درمیان کی بکری کہ کبھی تو وہ میں میں کرتی اس ریوڑ کی طرف دوڑتی ہے کبھی اس طرف اس کے نزدیک ابھی طے نہیں ہوا کہ ان میں جائے یا اس کے پیچھے لگے۔ اور حدیث میں ہے منافق کی مثال اس بکری جیسی ہے جو ہرے بھرے ٹیلے پر بکریوں کو دیکھ کر آئی اور سونگھ کر چل دی، پھر دوسرے ٹیلے پر چڑھی اور سونگھ کر آگئی۔ پھر فرمایا جسے اللہ ہی راہ حق سے پھیر دے اس کا ولی و مرشد کون ہے؟ (گلدستہ)

(۱) ابن ابی حاتم نے ابن مسعود (رض) سے روایت کیا کہ مومن منافق اور کافر کی مثال تین آدمیوں کی طرح ہے جو ایک وادی کی طرف گئے ان میں سے ایک اس میں داخل ہو گیا اور اس نے اس کو عبور کر کے (دوسرے کنارے پر) آگیا۔ پھر ان میں سے دوسرا اس میں داخل ہوا جب وادی کے نصف پر پہنچا تو اس کو آواز دی اس آدمی نے جو وادی کے کنارے پر تھا ہلاکت ہو تیرے لیے تو کہاں ہلاکت کی طرف جا رہا ہے۔ لوٹ آ جہاں سے تو چلا تھا اور وہ آدمی اس کو آواز دیتا ہے جو (وادی) کو عبور کر چکا تھا ادھر آ جا نجات اس طرف ہے تو اس نے کبھی ادھر اور کبھی ادھر دیکھنا شروع کیا اس درمیان ایک سیلاب آیا اور وہ اس میں غرق ہو گیا جو عبور کر گیا وہ مومن ہے جو غرق ہوا وہ منافق ہے جو کنارے پر ٹھہرا رہا وہ ادھر ادھر تذبذب کا شکار رہا وہ کافر ہے۔

(۲) ابن جریر وابن المنذر نے قتادہ (رح) سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا کہ لفظ آیت "مذبذبین بین ذلک، لاالی ھؤلاء ولاالی ھؤلاء "یعنی (یہ لوگ) یہ مخلص ایمان والے ہیں اور نہ مشرک ہیں کہ جن کا شرک واضح ہو پھر فرمایا ہم کو یہ بات ذکر کی گئی کہ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مومن، کافراور منافق کے لیے ایک مثال بیان فرماتے تھے جیسے مثال تین آدمیوں کی جو ایک نہر پر پہنچے مومن اس میں کود کر پار ہو گیا پھر منافق کودا یہاں تک کہ قریب تھا کہ مومن کے پاس پہنچ جائے کافرنے اس کو آواز دی کہ میری طرف آجاؤ مجھے تجھ پر ڈر ہے کہیں ڈوب نہ جاؤ۔ مومن نے اس کو آواز دی کہ میری طرف آجاؤ میرے پاس تیرے لیے نجات ہے اور اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی طرف پھینکتا ہے منافق برابر ان دونوں کے درمیان متردد رہتا ہے یہاں تک کہ اس پر پانی آتا ہے اور وہ غرق ہو جاتا ہے منافق برابر شک اور شبہ میں رہتا ہے یہاں تک کہ اس پر موت آجاتی ہے اور اس حال میں ہوتا ہے۔

۳۔ عبد بن حمید و بخاری نے اپنی تاریخ میں و مسلم وابن جریر اور ابن المنذر نے ابن عمر رجی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی مثال دو ریوڑوں میں بھاگنے والے بکری کی طرح ہے کبھی اس طرف بھاگتی ہے کبھی دوسری طرف بھاگتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ کس کے پیچھے چلے۔

۴۔ احمد و بیہقی نے ابن عمر (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی مثال قیامت کے دن اس بکری کی طرح ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان دوڑتی پھرتی ہے جب اس ریوڑ کے پاس آئے تو اسے سینگ مارتی ہے۔ اور جب دوسرے ریوڑ کے پاس جائے تو وہ اسے ٹکر مارتی ہے۔ (درمنثور)

منافقوں کو ان کے نفاق کی ایک نقد سزا

یہ لوگ تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ بلکہ ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ہوتے ہیں کہ کبھی ہوا کے جھونکوں نے یہاں مارا، کبھی وہاں پٹکا۔ سکون واطمینان اور امن وقرار کی دولت سے یہ لوگ محروم اور بے قرار ہی رہتے ہیں۔ وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ۔ سو یہ نفاق کی ایک فوری اور نقد سزا ہے جو منافق کو اس کے اپنے ہی اختیار کردہ نفاق کی بناء پر یہاں ملتی رہتی ہے۔ والعیاذ باللہ۔ سو ایمان سے محرومی امان و سکون سمیت ہر خیر سے محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ۔ اور ایمان و یقین کی دولت سے بہرہ مندی و سرفرازی دارین کی سعادت و سرخروئی کی کفیل وضامن ہے۔ "ذَبْذَبَ" کے معنیٰ کسی چیز کو حرکت پر حرکت دینے کے ہوتے ہیں۔ "ذَبْذَبَ الشَّیْئَ" اس وقت بولتے ہیں جب کہ فضاء میں ٹنگی ہوئی کسی چیز کو حرکت دی جاتی ہے۔ ایسی چیز چونکہ لگاتار ہلتی اور حرکت کرتی رہتی ہے اس لیے اس کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سو یہی حال ہوتا ہے منافق کا۔ وہ ہر وقت ڈانواڈول رہتا ہے۔ اس کو کسی بھی طرف قرار نہیں ہوتا اور "مذبذب" اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو ہر طرف سے دھتکارا جائے۔ جس سے وہ نہ ادھر کا رہتا ہے نہ ادھر کا۔ (محاسن التاویل وغیرہ)۔ سو اس طرح منافقوں کو ان کے نفاق کی یہ ایک نقد سزا برابر ملتی رہتی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

منافقوں کو ایک اور نقد سزا، بے اعتباری

کہ نہ ادھر ان کا کوئی اعتبار نہ ادھر۔ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ دورخی کی جس پالیسی کو یہ لوگ اپنی چالاکی سمجھتے ہیں وہ الٹا ان کو اس درجہ ذلیل و بے قدر کر کے کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتی۔ اس طرح یہ ان کے نفاق کی ایک اور سزا ہے جو ان کو یہیں ملتی رہتی ہے کہ نہ ان کا کوئی وزن ہوتا ہے نہ اعتبار کہ مومن تو یہ ہوتے نہیں لیکن ایمان کے زبانی کلامی دعوے کی بناء پر یہ کافروں کا اعتماد بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ سو منافقت کی جس روش کو یہ لوگ اپنی چالاکی اور ہوشیاری سمجھتے ہیں حقیقت میں وہ ان کی حماقت کا کھلا ثبوت ہوتی ہے، مگر منافقت کی وجہ سے ان کی مت ایسی مار دی جاتی ہے کہ ان کو یہ حقیقت سمجھ نہیں آتی اور یہ برابر اسی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم ۔(مدنی)

جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کیلئے تم کوئی راہ نہیں پاسکو گے :

جس سے اس کی بگڑی بن سکے، اور یہ راہ حق و صواب کی طرف رجوع کر سکے کہ یہ طلب صادق کی دولت سے ہی محروم و بے بہرہ ہے۔ اور مزید یہ کہ اپنے سوئے اختیار کی بناء پر انھوں نے اپنے باطن کو مزید سیاہ کر دیا ہے۔ تو پھر ایسوں کو راہ حق و ہدایت ملے تو کس طرح اور کیونکر؟ سو ایسے بد بختوں کیلئے تم کوئی راہ نہیں پاسکو گے اور یہ ہمیشہ کفر و باطل کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ والعیاذ باللہ۔ سو ایسوں کی محرومی ان کی اپنی بدنیتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

آیت مبارکہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو ! جو] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے ہو] [لَا تَتَّخِذُوا : تم لوگ مت بناؤ] [الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کو] [اَوْلِيَآءَ : کارساز] [مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کے علاوہ] [اَ : کیا] [تُرِيْدُوْنَ : تم لوگ چاہتے ہو] [اَنْ : کہ] [تَجْعَلُوْا : تم بناؤ] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [عَلَيْكُمْ : اپنے خلاف] [سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا : ایک واضح دلیل]

ترجمہ: اے ایمان والو! مسلمانوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ (نافرمانوں کی دوستی کے ذریعے) اپنے خلاف اللہ کی صریح حجت قائم کرلو۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اے ایمان والو ! مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم اپنے خلاف اللہ کے لیے ایک واضح حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔ (النساء : ۱۴۴)

کافروں کے نابالغ بچوں پر عذاب نہیں ہو گا

اس آیت کی دو تفسیریں ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ "اے ایمان والو ! "اس سے مراد مخلصین مومنین ہیں ' اور کافروں سے مراد یہودی یا منافق ہیں اور معنی یہ ہے کہ اے اخلاص کے ساتھ ایمان لانے والو ! یہودیوں یا منافقوں کو دوست نہ بناؤ '
جیسا کہ منافق کافروں کو دوست بناتے ہیں ورنہ تم بھی منافقوں کی مثل ہو جاؤ گے 'اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ "اے ایمان والو ! " سے مراد منافق ہیں اور معنی یہ ہے کہ اے بظاہر ایمان لانے والو ! کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ 'بلکہ مخلص مومنین کو اپنا دوست بناؤ تا کہ تمہیں بھی اخلاص نصیب ہو لیکن پہلی تفسیر راجح ہے۔
پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم اپنے خلاف واضح حجت قائم کرنا چاہتے ہو ؟ یعنی تم ایسی حجت اور دلیل قائم کرنا چاہتے ہو جس کی بناء پر تم عذاب کے مستحق ہو جاؤ 'اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی شخص کو بغیر دلیل کے عذاب نہیں دے گا '
حالانکہ اگر وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کی مخلوق کو عذاب دے تو یہ اس کا عین عدل ہو گا کیونکہ وہ سب مخلوق کا مالک ہے اور مالک اپنے ملک میں جو چاہے کر سکتا ہے 'لیکن اس نے اپنی حکمت سے اور اپنے فضل سے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے مخلص اور صالح بندوں کو عذاب نہیں دے گا اور خلف وعد محال ہے اس لیے مخلصین اور صالحین کو عذاب ہونا بھی محال ہے 'نیز اس آیت سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ وہ بغیر دلیل کے عذاب نہیں دیتا تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مشرکوں اور کافروں کے نابالغ بچوں کو عذاب نہیں ہو گا کیونکہ نابالغ بچوں کے حق میں بعث متحقق نہیں ہوئی اور نہ ہی نابالغ بچے مکلّف ہوتے ہیں۔
کفار کے کفر اور منافقین کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے قرآن مجید مسلمانوں کو بار بار حکم دیتا ہے کہ ان کے ساتھ قلبی دوستی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ یہ غیرت ایمانی اور ملّی مفاد کے خلاف ہے۔ (تبیان)

کفار اور منافقین کے ساتھ معاشرتی، سیاسی اور کاروباری تعلقات رکھے جاسکتے ہیں لیکن انھیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھنا مسلمانوں کا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہو گا کیونکہ یہ ملت اسلامیہ کے نقصان کے خواہاں، اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں جس کا مشاہدہ میدان احد سے لے کر ہر دور میں کیا گیا ہے۔ 2003ء میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کا فیصلہ کیا تو ابتداء میں روس سمیت کئی ملکوں نے مخالفت کی لیکن جونہی امریکہ نے انھیں مفادات کا لالچ دیا تو روس عراق کا پرانا حلیف ہونے کے باوجود امریکہ کے ساتھ کھڑا ہوا۔ اس طرح پوری دنیا کا کفر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گیا۔ جب مسلمان کسی نکتہ پر اکٹھا ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو کفار مسلمانوں کو تنگ نظری کا طعنہ دیتے ہیں حالانکہ ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم 1939 میں برطانیہ نے اپنے کئی شہریوں کو اس لیے حراست میں رکھا تھا کہ ان کے تعلقات جرمن قوم کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ متحدہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کا والد جو برطانوی بحری فوج کا اعلیٰ افسر تھا اسے بھی زیر حراست رکھا گیا کیونکہ وہ جاپان نژاد تھا۔ حتیٰ کہ جرمنوں کے ساتھ اس جنگ میں امریکہ نے اپنے ملک میں بعض

لوگوں کے ساتھ بھی یہی رویّہ اختیار کیا جب کہ اسلام کفار کے ساتھ دلی دوستی اور کفار کو مسلمانوں سے مقدم سمجھنے کے سواان کے ساتھ سیاسی معاشرتی اور کاروباری تعلقات رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ (فہم)

دوست نہ بنانے کا مفہوم

اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی کا معنی ہے "دوست 'ہمراز 'مددگار"۔ قرآن کریم میں متعدد مواقع پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ اور اس آیت کریمہ میں بھی شدت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت شاید آگے چل کر کسی اور جگہ آئے اس وقت صرف دو باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو کبھی بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایسا تعلق پیدا نہیں کرنا چاہیے جس کو "بطانۃ "کہا جاتا ہے۔ یعنی مسلمان حکمران کافروں کے اتنے قریب ہو جائیں کہ اپنے راز ان تک پہنچانے لگیں۔ اور اپنی کمزوریاں کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں اور اپنے ملک کے بعض ایسے گوشے جنھیں پردہ حجاب میں رہنا چاہیے وہ ان کی فورسز کے سامنے کھول دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب کبھی اختلافات پیدا ہوں تو دشمن ان اسرار و رموز سے واقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچانا چاہے پہنچائے۔ اور مسلمان چونکہ اپنی کمزوریاں ان کے سامنے کھول چکے ہیں اس لیے اس کا ازالہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔
دوسری بات یہ کہ عام معمول کے تعلقات غیر مسلموں سے بنا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے کہ ملک ملک سے حکومتیں حکومتوں سے مختلف قسم کے تعلقات رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ کوئی ملک بھی اپنی تمام ضرورتوں میں خود کفیل نہیں ہوتا۔ لین دین کا سلسلہ ملکوں میں بھی جاری رہتا ہے اور اب تو حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن ایسے تعلقات جس کی زد مسلمانوں پر پڑتی ہو اور کافران تعلقات کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کر سکتا ہو اسطرح کے تعلقات رکھنے کی ہر گز اجازت نہیں۔ بقائے باہمی کی پالیسی ایک حکمت اور ایک مصلحت ہے۔ لیکن اس کا نقصان کسی دوسرے مسلمان ملک یا مسلمان رعایا کو اگر پہنچنے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جائے تو ایسے تعلقات ناجائز ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیل کفر ہے

اس آیت کریمہ میں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کے خلاف کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ وہ چونکہ آج کل مسلمانوں کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی تدبیریں کر رہے ہیں اور تم ایک طرح سے حالت جنگ میں ہو۔ ایسی حالت میں تمہارا ان سے تعلق صریحاً کفر کی حمایت اور اسلام سے دشمنی ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جو کبھی قابل معافی نہیں ہوتا۔ بے عملی یا بد عملی "گوارا ہو سکتی ہے لیکن اسلام کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی کے ہاتھ میں کھیلنا یہ نرم سے نرم الفاظ میں غداری ہے۔ اسے تو کبھی کوئی ملک یا کوئی قوم برداشت نہیں کرتی۔ اگر تم نے یہ رویہ نہ بدلا اور اپنے تعلقات تم نے یہود سے نہ توڑے اور اپنی دلی ہمدردیاں تم نے مسلمانوں سے وابستہ نہ کیں تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے نتیجے میں تم پروردگار کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو گے کہ وہ تمہاری ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کر دے اور یا تمہیں اپنے عذاب کا نشانہ بنا دے۔ (روح)

ابن ابی حاتم میں حضرت عبداللہ بن عباس کا فرمان مروی ہے کہ آپ نے فرمایا قرآن میں جہاں کہیں ایسی عبارتوں میں سلطان کا لفظ ہے وہاں اس سے مراد حجت ہے یعنی تم نے اگر مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دلی دوستی کے تعلقات پیدا کئے تو تمہارا یہ فعل کافی ثبوت ہوگا اور پوری دلیل ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے، کئی ایک سلف مفسرین رحمۃاللہ علیہم اجمعین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ پھر منافقوں کا انجام بیان فرماتا ہے کہ یہ اپنے اس سخت کفر کی وجہ سے جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں داخل کئے جائیں گے درک درجہ کے مقابل کا مظہر ہے بہشت میں درجے ہیں ایک سے ایک بلند اور دوزخ میں درک ہیں ایک سے ایک پست۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں انھیں آگ کے صندوقوں میں بند کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا اور یہ جلتے بھنتے رہیں گے، حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں یہ صندوق لوہے کے ہوں گے جو آگ لگتے ہی آگ کے ہو جائیں گے اور چاروں طرف سے بالکل بند ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا جو ان کی کسی طرح کی مدد کرے۔ جہنم سے نکال سکے یا عذابوں میں ہی کچھ کم کروا سکے۔ ہاں ان میں سے جو توبہ کرلیں نادم ہو جائیں اور سچے دل سے منافقت چھوڑ دیں اور رب سے اپنے اس گناہ کی معافی چاہیں۔ پھر اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کریں صرف خوشنودی اللہ اور مرضی مولی کے لیے نیک اعمال پر کمر کس لیں۔ ریا کاری کو اخلاص سے بدل دیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں تو بیشک اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا اور انھیں سچے مومنوں میں داخل کر دے گا اور بڑے ثواب اور اعلیٰ اجر عنایت فرمائے گا، ابن ابی حاتم میں ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں اپنے دین کو خالص کرلو تو تھوڑا عمل بھی تمہیں کافی ہو جائے گا، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ غنی ہے بے نیاز ہے بندوں کو سزا کرنی وہ نہیں چاہتا، ہاں جب گناہوں پر دلیر ہو جائیں تو گوش مالی ضروری ہے، پس فرمایا اگر تم اپنے اعمال کو سنوار لو اور اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سچے دل سے ایمان لے آؤ تو کوئی وجہ نہیں جو اللہ تمہیں عذاب دے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی بھی قدر دانی کرنے والا ہے، جو اس کا شکر کرے وہ اس کی عزت افزائی کرتا ہے وہ پورے اور صحیح علم والا ہے۔ جانتا ہے کہ کس کا عمل اخلاص والا اور قبولیت اور قدر کے لائق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس دل میں قوی ایمان ہے اور کونسا دل ایمان سے خالی ہے، جو اخلاص اور ایمان والے ہیں انھیں بھرپور اور کامل بدلے اللہ تعالیٰ عنایت فرمائے گا (اللہ ہمیں ایمان واخلاص کی دولت سے مالا مال کرے اور پھر اجر وثواب سے نہال کرے آمین) (ابن کثیر)

مسائل

۱۔ کفار کو دوست بنا کر ایمانداروں کو اپنے خلاف حجّت قائم نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ منافق جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔

آیت مبارکہ:

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ : یقینا منافق لوگ] [فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ : سب سے نچلی گہرائی میں] [مِنَ النَّارِ : آگ میں سے] [وَلَنْ تَجِدَ : اور تو ہرگز نہیں پائے گا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [نَصِيْرًا : کوئی مددگار]

ترجمہ: بیشک منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور آپ ان کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہ پائیں گے۔

تشریح:

الدرک اور الدرک دونوں لغتیں ہیں۔ بلندی کی طرف جو یکے بعد دیگرے درجے ہوتے ہیں انھیں اہل عرب درجات کہتے ہیں۔ اور پستی کی طرف یکے بعد دیگرے جو درجے ہوتے ہیں انھیں درکات کہتے ہیں۔ جہنم کے مختلف طبقات کے علی سبیل التنزیل یہ نام ہیں۔ (1)۔ جہنم۔ (2) لظی۔ (3) حطمہ۔ (4) سعیر۔ (5) سقر۔ (6) جحیم۔ (7) ہاویہ۔ سب سے نیچے۔ منافقوں کا یہی ٹھکانا ہے۔ (قرطبیؒ) اللہ تعالیٰ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے طفیل دوزخ کی لو سے بھی ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ (ضیاء)

اس آیت سے تین مسئلے معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ منافق کھلے کافروں سے بدتر ہیں اور ان کا عذاب سخت ہے۔ دوسرے یہ کہ دوزخ کے تمام طبقوں میں نیچا طبقہ زیادہ خطرناک کہ وہاں تمام دوزخیوں کے پیپ اور خون وغیرہ بہہ کر پہنچتے ہیں۔ جیسے کہ جنت کے تمام طبقوں میں سب سے اونچا طبقہ اعلیٰ علیین بہترین ہے۔ تیسرے یہ کہ منافقوں کا مددگار کوئی نہیں، مومنوں کے مددگار رب نے بہت مقرر فرمادیئے ہیں جو کہتا ہے کہ میرا مددگار کوئی نہیں وہ اپنے منافق ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ (نور)

نفاق کی علامتوں پر اشکال کے جوابات

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : '٢٦٨٢ '٣٣ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : '٥٩ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : '٣٦ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : '٩١٦٩ ' سنن کبری للبیہقی ج ٦ ص ٢٨٨)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہوگا ' اور جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی خصلت ہوگی حتی کہ وہ اس خصلت کو چھوڑ دے ' جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے ' اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب عہد کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب جھگڑا کرے تو بدکلامی کرے۔

(صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ٢٦٨٢ ' ٣٣ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ٥٩ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث: ٣٦ ' مسند احمد: ج ٣ ' رقم الحدیث: ٩١٦٩ ' سنن کبری للبیہقی ج ٦ ص ٢٨٨)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہوگا ' اور جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی خصلت ہوگی حتی کہ وہ اس خصلت کو چھوڑ دے ' جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب عہد کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب جھگڑا کرے تو بدکلامی کرے۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ٢٤٥٩ ' ٣٤ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ٥٨ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ٢٦٤١ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ٤٦٨٨ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث: ٥٠٣ ' مسند احمد ' ج ٢ ' رقم الحدیث: ٦٧٨٢، سنن کبری: ج ٩ ص ٢٣٠)

بظاہر اس حدیث میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے اس میں نفاق کی خصلت ہوگی ' محدثین کرام نے اس حدیث کے متعدد جوابات ذکر کیے ہیں بعض ازاں یہ ہیں:

(١) یہ علامتیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک کے ساتھ مخصوص تھیں کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو وحی کے نور سے لوگوں کے دلوں میں کے حال پر مطلع تھے ' اور آپ جانتے تھے کہ کون منافق ہے اور کون منافق نہیں ہے اور چونکہ یہ غیب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص تھا اس لیے آپ نے اپنے اصحاب کو یہ نشانیاں بتائیں تاکہ وہ ان علامتوں سے منافقوں کو پہچان لیں اور ان سے احتراز کریں اور آپ نے معین کر کے نہیں بتایا کہ فلاں فلاں منافق ہے تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو اور یہ لوگ مرتد ہو کر مشرکین کے ساتھ نہ مل جائیں۔

(٢) دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ جو شخص حلال اور جائز سمجھ کر یہ چار کام کرے وہ منافق کے حکم میں ہوگا۔

(٣) جو شخص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو وہ منافقین کے مشابہ ہوگا ' اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر تغلیظا اور تہدیدا منافق کا اطلاق فرمایا ہے اور یہ اس شخص کے متعلق فرمایا ہے جو عادۃ یہ چار کام کرتا ہو اور اس کے متعلق نہیں فرمایا جس سے نادرا یہ کام سرزد ہوں۔

(٤) عرف میں منافق اس شخص کو کہتے ہیں جس کا ظاہر باطن کے خلاف ہو سو ایسا شخص عرفا منافق ہے شرعا منافق نہیں لہذا ایسے شخص کا کافر نہیں قرار دیا جائے گا نہ وہ اس آیت کی وعید کا مصداق ہوگا۔

(٥) دینی معاملات میں ایسے شخص کا حکم منافق کا ہوگا اور اس کی خبر معتبر نہیں ہوگی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور (اے مخاطب) تو ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا اس آیت میں منافقین کی نصرت کی نفی کی تخصیص کی ہے اور یہ تخصیص اس وقت صحیح ہوگی جب مخلص مسلمانوں کی نصرت اور ان کی شفاعت کی جاسکے ' اور تب ہی منافقین کی مدد کا نہ کیا جانا

ان کے لیے باعث حسرت اور افسوس ہو گا اور اگر مخلص مسلمانوں کی بھی مدد نہ کی جائے تو منافقین کو کیوں ندامت اور حسرت ہو گی!
(تبیان)
معلوم ہوتا ہے یہ منافقین کو آخری تنبیہہ ہے کہ تم نہ جانے کیا سمجھتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نفاق اللہ کے یہاں تمام جرائم میں سے بدترین جرم ہے۔ اس کا ارتکاب کرنے والا کافروں سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ جہنم کا سب سے نچلا درجہ جس سے خود جہنم بھی پناہ مانگتا ہے اس درجے میں انھیں رکھا جائے گا۔ انھوں نے اگرچہ کلمہ پڑھا ' اللہ اور رسول کا اقرار کیا ' مسلمانوں کے ساتھ بظاہر نمازیں بھی پڑھیں ' لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے ساتھ ان کا یہ ظاہری تعلق نہ صرف یہ کہ کام نہیں آئے گا بلکہ بدترین جرم شمار ہو گا۔ اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر مسلمان بن کر مار آستین کی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پس پردہ اذیتیں پہنچائیں۔ شمع اسلام کو بجھانے اور کفر کو غالب و منصور کرنے میں تمام طاقتیں صرف کر ڈالیں۔ اس لیے تمہارا انجام بھی سب سے خطرناک ہو گا۔ اور تم ایک ایسی بے بسی کی کیفیت میں مبتلا کیے جاؤ گے جس میں تمہارا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

دوزخ کا درک اسفل

ابن وہب (رح) نے کعب بن احبار کا قول نقل کیا ہے کہ دوزخ میں ایک بند کنواں ہے بند کرنے کے بعد اس کو کھولا ہی نہیں گیا ہے آغاز آفرینش سے روزانہ دوزخ اس کی گرمی سے اللہ کی پناہ مانگتی ہے۔ دوزخ کا درک اسفل یہی ہے۔ منافق دوزخ کے نچلے طبقہ کے مستحق اس لیے قرار پائے کہ یہ تمام کافروں سے زیادہ خبیث ہیں۔ ان کے اندر کفر کے ساتھ اللہ ' رسول اور اسلام سے استہزاء کرنے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی بھی خباثت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ (باوجود کافر ہونے کے) یہ قتل اور جزیہ سے بچ گئے اس کے عوض درک اسفل کے مستحق قرار پائے۔
ولن تجد لہم نصیرا. اور (اے مخاطب) تجھے ان کا کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ جو ان کو دوزخ سے نکال دے اور اللہ کے عذاب سے بچائے۔ (مظہری)

انسانوں کے جس گروہ کے اس طرح کے جرائم ہوں ان کے لیے معافی کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ کے کرم اور اس کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ وہ ایسے بڑے مجرموں کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ فرمایا کہ ہم تمہیں پھر ایک موقع دینا چاہتے ہیں کہ تم اپنی ان حرکتوں سے توبہ کر لو ' اپنے گناہوں کی اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگو۔ اور اس توبہ کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ایک ایک بد عملی کی اصلاح کرو۔ اور اللہ کی رسی یعنی اس کے دین کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور اللہ اور اس کے رسول سے مخلصانہ اطاعت کا رشتہ قائم کرو۔ اگر تم نے اس طرح اپنے آپ کو پوری طرح بدل دیا تو تمہارے گزشتہ کرتوتوں کا تم سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ تم نے جو بڑے بڑے نقصانات پہنچائے ہیں ان کا انتقام نہیں لیا جائے گا ' بلکہ تمہارے تمام جرائم کو عفو و درگزر سے مٹا دیا جائے گا اور تمہیں ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع ملے گا جن میں ابو بکر و عمر اور عثمان و علی (رض) جیسے فرشتہ صفت مجاہد اور ایثار پیشہ مخلصین موجود ہیں۔ وہ برسوں کی قربانیوں کے بعد جہاں کھڑے ہیں تم توبہ کے بعد وہیں ان کے ساتھ کھڑے ہو گے۔ اور جب اللہ قیامت کے دن انھیں بے پناہ اجر سے نوازے گا تو اس اجر عظیم سے تم بھی نوازے جاؤ گے۔ اور آخری آیت میں منافقین کی طرف التفات فرمایا اور رحمت کی انتہا کر دی اور نہایت پیار سے فرمایا کہ اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ وہ جذبہ انتقام سے پاک ہے۔ اس لیے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے کسی کو عذاب نہیں دیتا اور نہ کوئی اس

کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس لیے کسی کو مٹا کر اسے سکون نہیں ملتا کہ میں نے اپنی برابری کرنے والے کو مٹا دیا ہے۔ وہ ان تمام جذبات اور تاثرات سے پاک ہے۔ تمہاری بندگی کے تقاضے اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ تم شکر بجالاؤ۔ اور ایمان سے اس شکر کو مستحکم کرو۔ اگر تم یہ دونوں صفات اپنے اندر پیدا کرلو تو تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہو جاؤ گے۔ کیونکہ وہ بہت شکر قبول کرنے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے مگر شرط یہ ہے کہ منافقت چھوڑ دو، ہمیشہ کے لئے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

لغۃ القرآن: [اِلاَّ الَّذِیْنَ : سوائے ان کے جنہوں نے] [تَابُوْا : توبہ کی] [وَاَصْلَحُوْا : اور اصلاح کی] [وَاعْتَصَمُوْا : اور مضبوطی سے پکڑا] [بِاللّٰهِ : اللہ کو] [وَاَخْلَصُوْا : اور خالص کیا] [دِیْنَہُمْ : اپنے دین کو] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [فَاُولٰٓئِکَ : تو وہ لوگ] [مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ : مؤمنوں کے ساتھ ہیں] [وَسَوْفَ : اور عنقریب] [یُؤْتِ : دے گا] [اللّٰهُ : اللہ] [الْمُؤْمِنِیْنَ : مومن (جمع)] [اَجْرًا : اجر] [عَظِیْمًا : بڑا]

ترجمہ: مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی وہ سنور گئے اور انھوں نے اللہ سے مضبوط تعلق جوڑ لیا اور انھوں نے اپنا دین اللہ کے لیے خالص کرلیا تو یہ مومنوں کی سنگت میں ہوں گے اور عنقریب اللہ مومنوں کو عظیم اجر عطا فرمائے گا۔

تشریح:

کفر اور منافقت سے سچی توبہ اور اپنے کیے کی اصلاح کرنے والوں کے لیے اجر عظیم کا وعدہ اور اس بات کی وضاحت کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے کفر پر نہیں شکر پر راضی ہوتا ہے کیونکہ وہ مومنوں اور شکر گزاروں کا قدر دان ہے۔

توبہ کا دروازہ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی انتہا ہے کہ منافقوں کا کردار اور ان کا انجام ذکر کرنے کے باوجود ان کے لیے نہ صرف توبہ اور بخشش کا دروازہ کھلا رکھا بلکہ انھیں توبہ کرنے کی صورت میں انعام و اکرام اور مومنوں کی رفاقت کی خوشخبری سنائی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مومنوں کے ساتھ اجر عظیم سے سرفراز کرے گا اور تمہارے اعمال و خدمات کی قدر افزائی کی جائے گی بشرطیکہ گناہوں پر اصرار کرنے کے بجائے توبہ کرو، فساد اور بگاڑ کی جگہ اپنی اصلاح کرتے ہوئے مومنوں کا ساتھ دو، متذبذب رہنے اور ابن الوقت بننے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان کا مضبوط رشتہ قائم کر کے اس کی رضا کے لیے اپنے دین میں مخلص ہو جاؤ۔ تمہارے عمل اور اخلاص کو نہایت ہی نظر استحسان سے دیکھا اور تمہیں بے پناہ اجر دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سزا دینے کی بجائے جزا دینا زیادہ پسند کرتا ہے بشرطیکہ وہ تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کریں۔ بندے کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور نعمتوں پر دل سے مطمئن ہو، زبان سے شکر و اعتراف کرے اور اپنے عمل سے محسن حقیقی کا اطاعت گزار بن کر رہے۔ اللہ تعالیٰ کے شاکر ہونے سے مراد بندے کی حقیر اور ناچیز اطاعت کی قدر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِّنْ کَسْبٍ طَیِّبٍ وَّلَا یَقْبَلُ اللّٰہُ اِلَّا الطَّیِّبَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتَقَبَّلُھَا بِیَمِیْنِہٖ ثُمَّ یُرَبِّیْھَا لِصَاحِبِہٖ کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فُلُوَّہٗ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ)

[رواہ البخاری : کتاب الزکوۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو آدمی کھجور کے برابر اپنی حلال کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ کے ہاں صرف پاک چیز ہی قبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول کر کے اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اس کو اس طرح پالتا اور بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی بچھڑے کو پالتا ہے حتیٰ کہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔“

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

(اَلتَّاءِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ) [رواہ ابن ماجۃ : کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ]

”گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کی طرح ہے۔“

امام احمد (رح) اور ابن ابی شیبہ (رح) نے ابو ثمامہ (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے دریافت کیا یا روح اللہ ! اللہ کا مخلص کون ہے فرمایا وہ شخص مخلص ہے جو اللہ کے لیے عمل کرے اور اس عمل پر لوگوں کی تعریف کو پسند نہ کرے۔ حکیم ترمذی (رض) نے نوادر الاصول میں حضرت زید بن ارقم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہو گیا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ کلمہ پڑھنے میں اخلاص کیا ہے فرمایا پڑھنے والے کو یہ کلمہ ممنوعات سے باز رکھے (یہ اخلاص کلمہ ہے)

بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے حضرت معاذ (رض) بن جبل کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے (حاکم بنا کر) یمن کو بھیجا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔ فرمایا اپنے دین کو خالص رکھنا ‘ تیرے لیے تھوڑا عمل بھی کافی ہو گا۔

ابن ابی الدنیانے الاخلاص میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ثوبان (رض) کی روایت سے لکھا ہے حضرت ثوبان (رض) نے کہا میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے سنا آپ فرمارہے تھے خوشی ہو مخلصوں کے لیے یہی لوگ ہدایت کے چراغ ہیں ' ہر تاریک فتنہ کی ظلمت ان سے چھٹ جاتی ہے۔

فاولئک مع المومنین تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے یعنی جنت کے اندر ان مخلص مومنوں کے ساتھ ہوں گے جو ایمان واخلاص کی وجہ سے ان سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ (مظہری)

عفو درگذر

سبحان اللہ ! کیا ٹھکانا ہے اس کے عفو و درگزر کا، کیا حد ہے اس کے جود و کرم کی۔ منافقین نے انتہا کردی، اللہ کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اذیت پہنچانے، شمع اسلام کو بجھانے، کفر کو غالب و منصور کرنے اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے میں۔ اور اس طرح اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کے افق کو تیرہ وتار کردیا۔ اس کے باوجود کریم ورحیم خدا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رحمۃ للعالمین کا خدا انھیں بتارہا ہے کہ دیکھو ادھر دیکھو ! توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ سچے دل سے تائب ہو جاو۔ معاف کردیئے جائیں گے تمہارے گناہ اور تمہیں ابوبکر وعمر اور حمزہ و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معیت و سنگت نصیب ہو گی۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ واقعی اسلام کا خدا رب العالمین ہے اور اس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے اور یہ دین۔ دین انسانیت ہے۔ (ضیاء)

نفاق کے عذاب سے نجات کی چار شرطیں

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین سے عذاب کو دور کرنے کے لیے چار شرائط بیان فرمائی ہیں ' پہلی شرط یہ ہے کہ وہ توبہ کریں اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ نیک عمل کریں کیونکہ نفاق سے توبہ کے بعد کیے ہوئے نیک اعمال لائق اعتبار ہوتے ہیں اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کا دامن پکڑ لیں ' کیونکہ توبہ اور نیک اعمال سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اخروی فلاح اور سعادت حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنے اوپر لازم کرلینے سے ہی یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے ' اور چوتھی شرط ہے اخلاص ' یعنی ان کا ہر کام کو کرنا اور چھوڑنا محض اللہ کی خاطر ہو ' یعنی نیک کاموں کو کرنا اور برائیوں کو چھوڑنا دونوں اللہ کی وجہ سے ہوں ' اور ان کے کسی کام سے غیر اللہ کی نیت اس کی خوشنودی اور اس کی داد و تحسین کا دخل نہ ہو۔ اور جب یہ چار شرائط حاصل ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ جزاء بیان کی ہے کہ وہ آخرت میں مخلص مومنوں کے ساتھ ہوں گے ' اور اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ (تبیان)

مسائل

۱۔ توبہ اور اپنی اصلاح کرنے اور اللہ سے تعلق مضبوط رکھنے والے مومن کو اجر عظیم دیا جائے گا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو عذاب دے کر خوش نہیں ہوتا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ ایمان لانے اور شرک سے بچنے والے کی قدر افزائی کرتا ہے۔

فوائد

۱: یعنی منافقت سے توبہ کریں اور آئندہ اپنے حالات بدل دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بد سے بدتر کافر کی بھی توبہ قبول ہے اگر درست ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ کی صحت کی شرط یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اپنا گزشتہ حال بدل دے۔ اگر منہ سے توبہ کرتا رہے مگر کام وہی کیے جاوے تو وہ توبہ نہیں مذاق کرتا ہے۔

۲: دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھوں کا ساتھ بڑی اعلی نعمت ہے کہ رب نے طور انعام یہاں اس کا ذکر فرمایا۔

۳: جو تمہارے خیال و گمان اور وہم سے بھی وراء ہے غرضیکہ رب کی عطا اپنی شان کے لائق ہو گی نہ کہ تمہارے استحقاق کے لائق۔ (نور)

آیت مبارکہ:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

لغۃ القرآن: [مَا : کیا] [يَفْعَلُ : کرے گا] [اللّٰهُ : الله] [بِعَذَابِكُمْ : تمہارے عذاب سے] [اِنْ : اگر] [شَكَرْتُمْ : تم لوگ شکر کرو] [وَاٰمَنْتُمْ : اور ایمان لاؤ] [وَكَانَ : اور ہے] [اللّٰهُ : الله] [شَاكِرًا : قدردان] [عَلِيْمًا : خوب جاننے والا]

ترجمہ: اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان لے آؤ، اور اللہ (ہر حق کا) قدر شناس ہے (ہر عمل کا) خوب جاننے والا ہے۔

تشریح:

اللہ قدر دان ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدرداں ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے۔ سو جو شخص اس کے حکم کو ممنونیت اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ عادل رحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں یعنی ایسے شخص کو ہرگز عذاب نہ دے گا وہ تو سرکش اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔

شکر گزاروں کا انعام

اللہ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا کیونکہ بندوں کو عذاب دینے سے نہ اس کے اقتدار میں اضافہ ہو جاتا ہے نہ عذاب دینے سے حکومت میں کوئی کمی آجاتی ہے۔ کسی فائدہ کا حاصل کرنا یا ضرر کو دفع کرنا تو عذاب دینے کا مقصد ہی نہیں ہے۔

ایمان و شکر سے علاج :

جیسے مزاج کے بگڑنے سے مرض پیدا ہوتا ہے اگر ایمان اور شکر کی وجہ سے آدمی کی قلبی بیماری یعنی نفاق و کفر کا ازالہ ہو جائے اور دل کو پاک کر لیا جائے تو آدمی ہر برے نتیجہ سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

شکر اور ایمان

میں کہتا ہوں شاید شکر سے مراد ہے ایمان مجازی عامی جو کفر کی ضد ہے اور ایمان سے مراد ہے ایمان حقیقی (اور ایمان مجازی ایمان حقیقی کا زینہ ہے ظاہری مجازی ایمان سے ہی ترقی کر کے آدمی ایمان حقیقی تک پہنچتا ہے اسی لیے شکر کو ایمان سے پہلے ذکر کیا)۔ (تفسیر مظہری)

(پارہ پنجم ختم ہوا۔ الحمدللہ)۔ (گلدستہ)

خیال رہے کہ دنیا کے بادشاہ تین وجہ سے سزا دیتے ہیں۔ اپنے نقصان کے اندیشہ سے، نفسانی غصہ کی آگ بجھانے کے لیے۔ مجرم کے جرم کی وجہ سے۔ تیسری وجہ کی معافی ہو جاتی ہے۔ مگر پہلی دو صورتوں میں معاف نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ مجرموں کو صرف تیسری وجہ سے سزا دے گا وہ پہلی دو وجہوں سے پاک ہے۔ اس آیت میں اسی کا بیان ہے۔ (نور)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو اور (خالص) ایمان لے آؤ اور اللہ شکر کی جزا دینے والا ' بہت جاننے والا ہے۔ (النساء : ۱۴۷)

اس آیت میں بھی منافقین سے خطاب ہے ' ایک ضعیف قول یہ ہے کہ مومنین سے خطاب ہے ' اور اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ منافقین کو عذاب دینے یا نہ دینے کا مدار صرف ان کے کفر پر ہے اور کسی اور چیز پر نہیں ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا ' کیا اس سے اس کا غیظ و غضب ٹھنڈا ہو گا ' یا اس کو اسے کوئی نفع حاصل ہو گا یا اس سے کوئی ضرر دور ہو گا؟ جیسے بادشاہوں کو عموماً کسی مجرم کو سزا دینے سے تسکین ہوتی ہے ' ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی مطلق ہے ' اور ان تمام چیزوں سے بلند اور منزہ ہے ' منافقوں کو عذاب دینے کی وجہ صرف ان کا نفاق ہے جب وہ نفاق سے توبہ کر لیں اور ایمان لا کر اللہ کا شکر ادا کریں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو عذاب کیوں دے گا!

شکر کو ایمان پر مقدم کرنے کے اسرار

اس آیت میں فرمایا ہے۔ " اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ " اور شکر کو ایمان پر مقدم فرمایا ہے ' بظاہر ایمان کو شکر پر مقدم ہونا چاہیے تھا کیونکہ ایمان تمام اعمال پر مقدم ہے ' امام رازی نے اس کے دو جواب دیئے ہیں ایک جواب یہ ہے کہ اصل عبارت میں تقدیم اور تاخیر ہے یعنی

اصل عبارت یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور شکر ادا کرو 'اور دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ واو ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۳۶) لیکن بلیغ کے کلام میں جب کوئی عبارت ظاہری ترتیب کے خلاف ہو تو وہ کسی رمز اور نکتہ پر مبنی ہوتی ہے 'اس لیے اس پر غور کرنا چاہیے کہ یہاں کس حکمت یا کس رمز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے شکر کو ایمان پر مقدم کیا ہے۔

شکر کا ایک معنی ہے کسی نعمت کی بنا پر منعم کی تعظیم کرنا 'اور یہ تین امور پر موقوف ہے پہلے اس شخص کو نعمت کی معرفت ہو اور جب نعمت کی معرفت حاصل ہو جائے تو اس کا ذہن کسی نہ کسی منعم کو تلاش کرے تاکہ وہ اس کی تعظیم کرے اور اس تلاش کے بعد وہ منعم حقیقی تک پہنچ جائے تو بے اختیار تعظیم کرتا ہوا اس کے آگے جھک جائے اور یہی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے 'اور اس طرح شکر ادا کرنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا موجب ہوتا ہے اور اسی نکتہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے شکر کو ایمان پر مقدم فرمایا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شکر میں منعم کی تعظیم دل سے بھی ہوتی ہے 'زبان سے بھی اور باقی ظاہری اعضاء سے بھی تعظیم ہوتی ہے، منافق کلمہ پڑھ کر زبان سے منعم کی تعظیم کرتے تھے 'اور نماز پڑھ کر باقی اعضاء سے بھی تعظیم کرتے تھے لیکن دل سے اللہ کی تعظیم نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے باطن میں کفر تھا 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ کیا کہ وہ صحیح اور کامل شکر ادا نہیں کرتے اگر وہ صحیح اور کامل شکر ادا کریں اور اخلاص سے ایمان لے آئیں تو اللہ انھیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ شکر کا دوسرا معنی اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے خرچ کرنا جس مقصد کے لیے وہ نعمتیں دی گئی ہیں 'جس زمانہ میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث کیا گیا تھا 'اس زمانہ میں سب سے بڑی نعمت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذات مقدسہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل میں بھی آپ کا ذکر فرمایا ہے (آیت) "یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورۃ والانجیل"۔ (الاعراف : ۱۵۷) "وہ آپ کا ذکر توراۃ اور انجیل میں بھی لکھا ہوا پاتے ہیں۔ "اور اس نعمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ آپ پر دل و جان سے ایمان لاتے اور تن من 'دھن کی بازی لگا کر آپ کی اطاعت اور اتباع کرتے۔

جس نبی کے وسیلہ سے حضرت آدم (علیہ السلام) کی توبہ قبول ہوئی 'حضرت ابراھیم (علیہ السلام) پر آگ گلزار ہوئی 'حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کا گلا جس کے نور کی برکت سے کٹنے سے بچا 'حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جس کی بعثت کی دعا کی 'حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جس کے امتی ہونے کی تمنا کی 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جس کے آنے کی بشارت دی 'عالم میثاق میں تمام نبیوں نے جس پر ایمان لانے اور جس کی نصرت کرنے کا قول واقرار اور عہد کیا اور اللہ اس عہد پر خود گواہ ہوا ایسا عظیم الشان نبی ﷺ کو اللہ نے ان کے عہد میں پیدا کیا 'ان کو چاہیے تھا کہ وہ اس جلیل القدر اور رفیع المرتبت نعمت پر اللہ کا احسان اور امتنان مانتے اور اس کا بے پایاں شکر ادا کرتے اور اس عظیم الشان نبی پر اخلاص سے ایمان لاتے اور دل و جان سے اس کی تصدیق کرتے 'اس لیے فرمایا : اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ ہماری اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اس آیت میں شکر کو ایمان پر مقدم کرنے میں کیا رمز ہے 'کیا لطافت ہے اور کیا بلاغت ہے !

شاکر 'علیم میں ربط اور مناسبت

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور "اللہ تعالیٰ شاکر علیم ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے بطور استعارہ شکر کی جزاء کو بھی شکر فرمایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تم کو شکر ادا کرنے کی جزا دے گا اور ثواب عطا فرمائے گا 'اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی نعمتیں ہیں ان کا شکر کیسے ادا ہو سکتا ہے 'بلکہ اس کی کسی ایک نعمت کا بھی

شکر ادا نہیں ہو سکتا اس لیے فرمایا وہ علیم ہے وہ جاننے والا ہے کہ محدود انسان لا محدود نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا وہ اپنے بندہ کے عجز کو جاننے والا ہے اور وہ جاننے والا ہے کہ کون اس کی نعمتوں کے مقابلہ میں اپنی بے مائیگی ' کم ہمتی اور قصور عبادت کا اعتراف اور اقرار کرتا ہے اور وہ جاننے والا ہے کہ کون اس کی نعمتوں اور اس کے احسانوں کا اعتراف کر کے اس کے سامنے نیاز مندی اور اطاعت سے سر جھکا کر اس کی تعظیم بجا لاتا ہے اور وہ جاننے والا ہے کہ کون اس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے سو وہ اس کو اس کے اس عمل کی اور اس کے شکر ادا کرنے کی جزا عطا فرمائے گا ' یہاں بھی بظاہر پہلے علیم اور پھر شاکر کا ذکر ہونا چاہیے تھا 'لیکن اس کے عکس ترتیب میں رمز یہ ہے کہ جس صفت کا بندوں پر اثر مرتب ہونا تھا یعنی شکر کی جزا دینا اس کا پہلے ذکر کیا اور جس صفت میں صرف اس کی شان کبریائی تھی جس کا صرف اس کے ساتھ تعلق تھا اس کا بعد میں ذکر فرمایا۔ اس نے بندوں کا حق مقدم رکھا ہم بندے ہیں اور ہم اس کے زیادہ لائق ہیں کہ ہم اپنے مولی کے حق کو پہچانیں اور اس کے ذکر پر اور اس کے حق کو اپنے حق پر مقدم رکھیں۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

لغۃ القرآن: [لَا : نہیں][يُحِبُّ : پسند کرتا][اللّٰهُ : اللہ][الْجَهْرَ : ظاہرکو][بِالسُّوْٓءِ : برائی][مِنَ : سے][الْقَوْلِ : بات کو][اِلَّا : مگر][مَنْ : جو][ظُلِمَ: ظلم کیا گیا ہو][وَكَانَ : اور ہے][اللّٰهُ : اللہ][سَمِيْعًا : خوب سننے والا][عَلِيْمًا : خوب جاننے والا]

ترجمہ: اللہ کسی (کی) بری بات کا بآواز بلند (ظاہراً وعلانیۃً) کہنا پسند نہیں فرماتا سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو (اسے ظالم کا ظلم آشکار کرنے کی اجازت ہے)، اور اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

تشریح: سابقہ آیات میں منافقوں کی دین اور مسلمانوں کے بارے میں ہرزہ سرائی اور نماز میں جان بوجھ کر غفلت اختیار کرنے کی سزا بیان کرنے کے بعد تائب ہونے والوں کو قدر افزائی کا مژدہ سنایا۔ ہرزہ سرائی سے باز نہ آنے والوں کی ایذا رسانی کے مقابلے میں مومنوں کو ایک حد تک ان کے خلاف لب کشائی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ بداخلاقی کے مقابلے میں بھی بد خلقی کو پسند نہیں کرتا لیکن انسان کمزور اور کم حوصلہ واقع ہوا ہے اس لیے دشمن کی ایذارسائی کے مقابلہ میں مظلوم اور دکھیارے مسلمانوں کو اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کو آشکارا کر سکیں تاکہ مظلوم کے ردّ عمل اور معاشرے کے اخلاقی دباؤ کی وجہ سے ظالم اپنے آپ میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ظلم سے باز آجائے۔ دکھی انسان کو اس لیے بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ غم میں اس کا دم گھٹنے نہ پائے اور اظہار غم سے اس کا دکھ ہلکا اور جذبات ٹھنڈے ہو جائیں۔ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رض) اور ان کے شاگرد رشید حضرت قتادہ (رض) کا قول ہے کہ اس فرمان میں مظلوم کو ظالم کے خلاف بددعا کرنے کا مکمل حق دیا گیا ہے اور یہ بھی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بپتا دوسروں کو سنائے اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکے۔ البتہ احتجاج کرتے ہوئے کسی مظلوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اخلاقی حدوں سے تجاوز کرتے ہوئے ظلم کی حدود میں داخل ہو جائے کیونکہ قرآن کا طے شدہ اصول ہے۔ تاہم مظلوم کو بدزبانی کے مقابلہ میں لب کشائی کا حق دینے کے باوجود بردباری اور حوصلہ مندی کا سبق دیا ہے کہ تم اعلانیہ معاف کرو یا دل ہی دل میں اس تکلیف کی ٹیس کو برداشت کرو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو درگزر سے کام لینا چاہیے۔ اس سے برائی بڑھنے کی بجائے دب جائے گی اور یہ اس لیے بھی بہتر ہے کہ جو لوگ منافقوں اور ان کی سازشوں کو نہیں جانتے وہ یہ پروپیگنڈہ بھی نہ کر سکیں گے کہ مسلمان آپس میں دست و گریبان ہیں جس سے مسلمانوں کی ساکھ اور وقار کو دھچکا لگنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک موقعہ پر حضرت عمر (رض) نے عبداللہ بن ابی کی شرارتوں اور سازشوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت طلب کی تھی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں عبداللہ بن ابی کا سر قلم کر دوں لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ لوگ کہیں گے (اِنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ) [رواہ مسلم: کتاب البر والصلۃ، بَاب نَصْرِ الْاَخِ ظَالِمًا۔۔۔] ”کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔“

معافی اور درگزر کا سبق دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی چار صفات کا ذکر فرمایا ہے کہ تمہارا رب سب کچھ سننے اور جاننے کے باوجود لوگوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اس لیے اللہ والوں کی یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ ظلم کا بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں کو معاف کرنے کی عادت اپنائیں۔ سننے اور جاننے کی صفت بیان فرما کر ظالم اور مظلوم کو آگاہ کیا ہے کہ ظالم کا ظلم اور مظلوم کی مظلومیت اللہ سے پوشیدہ نہیں اس میں ظالم کو انتباہ اور مظلوم کو ایک گنا تسلی دی گئی ہے۔ (روح)

شان نزول

ایک شخص ایک قوم کا مہمان ہوا تھا انھوں نے اچھی طرح اس کی میزبانی نہ کی جب وہ وہاں سے نکلا تو ان کی شکایت کرتا نکلا اس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق (رض) کے باب میں نازل ہوئی ایک شخص سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آپ کی شان میں زباں درازی کرتا رہا آپ نے کئی بار سکوت کیا مگر وہ باز نہ آیا تو ایک مرتبہ آپ نے اس کو جواب دیا اس پر حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اٹھ کھڑے ہوئے حضرت صدیق اکبر نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ شخص مجھ کو برا کہتا رہا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کچھ نہ فرمایا میں نے ایک مرتبہ جواب دیا تو حضور اٹھ گئے، فرمایا ایک فرشتہ تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا جب تم نے جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آگیا اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن)

مہمان نوازی سے خوش نہ ہونے والوں کو نصیحت

پہلے یعنی مہمان نوازی والے شانِ نزول کو لیں تو اس سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو میزبان کی مہمان نوازی سے خوش نہیں ہوتے اگرچہ گھر والے نے کتنی ہی تنگی سے کھانے کا اہتمام کیا ہو۔ خصوصاً رشتے داروں میں اور بِالخُصوص سسرالی رشتے داروں میں مہمان نوازی پر شکوہ شکایت عام ہے۔ ایک کھانا بنایا تو اعتراض کہ دو کیوں نہیں بنائے؟ دو بنائے تو اعتراض کہ تین کیوں نہیں بنائے؟ نمکین بنایا تو اعتراض کہ میٹھا کیوں نہیں بنایا؟ میٹھا بنایا تو اعتراض کہ فلاں میٹھا کیوں نہیں بنایا؟ الغرض بہت سے مہمان ظلم و زیادتی اور ایذاء رسانی سے باز نہیں آتے اور ایسے رشتے داروں کو دیکھ کر گھر والوں کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ حدیث مبارک میں مہمان کو حکم دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان شخص کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے پاس اتنا عرصہ ٹھہرے کہ اسے گناہ میں مبتلا کر دے، صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، وہ اسے گناہ میں کیسے مبتلا کرے گا؟ ارشاد فرمایا: وہ اپنے بھائی کے پاس ٹھہرا ہو گا اور حال یہ ہو گا کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو گی جس سے وہ اس کی مہمان نوازی کر سکے۔

(مسلم، کتاب اللقطۃ، باب الضیافۃ ونحوہا، ص۹۵۱، الحدیث: ۱۵(۱۷۲۶))

ظالم کے ظلم کو بیان کرنا جائز ہے

آیت میں مظلوم کو ظلم بیان کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مظلوم، حاکم کے سامنے ظالم کی برائی بیان کر سکتا ہے، یہ غیبت میں داخل نہیں۔ اس سے ہزارہا مسائل معلوم ہو سکتے ہیں۔ حدیث کے راویوں کا فسق یا عیب وغیرہ بیان کرنا، چور یا غاصب کی شکایت کرنا، ملک کے غداروں کی حکومت کو اطلاع دینا سب جائز ہے۔ غیبت کے جواز کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب کسی نہ کسی بڑے فائدے کی وجہ سے ہیں۔ (صراط)

بعض لوگوں کا مشغلہ ہی دوسروں کی عیب جوئی ہوتا ہے۔ کسی کے حقیقی یا فرضی عیوب کو اچھالنے اور ان کی تشہیر کرنے میں انھیں خاص لطف آتا ہے۔ اور بعض منہ پھٹ ایسے ہوتے ہیں کہ چلتے چلتے کسی کی پگڑی اچھال دی۔ دو چار بے نقط سنا کر اپنی بڑائی کی تسکین کر لی۔ ایسے لوگ جس دل آزاری کا باعث بنتے ہیں اور باہمی محبت و پیار کو جتنا نقصان پہنچاتے ہیں اس کا اندازہ ہر اس شخص کو اچھی طرح ہے جس کو اس قماش کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو۔ اسلام جو مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح یکجان دیکھنا چاہتا ہے وہ ان یاوہ گوئیوں کو کب برداشت کر سکتا ہے۔ اس لیے اس آیت میں واضح ہدایت فرما دی کہ ایسی باتیں اللہ تعالیٰ ناپسند ہیں ان سے باز آ جاؤ۔ کسی کی پس پشت غیبت۔ کسی کی منہ پر توہین اور ہتک عزت سب کی ممانعت کر دی گئی۔ ہاں وہ شخص جس پر واقعی ظلم ہوا ہو اس کی حق تلفی کی گئی اسے رخصت ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کا برملا اظہار کرے اور اپنی مظلومیت کی داستان بے دھڑک سنائے۔ (ضیاء)

اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو گالی دے۔

ایک دوسرے کو گالی دینے کی مذمت

گالی دیناگناہ اور مسلمان کی شان سے بعید ہے۔اس کے بارے میں 3 اَحادیث درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اسے گالی دیتا ہے۔

(شرح السنہ، کتاب البر والصلۃ، باب الستر، ۶/۴۸۹، الحدیث: ۳۴۱۲)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کف رہے۔

(بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): لاترجعوابعدی کفّاراً۔الخ، ۴/۴۳۴، الحدیث: ۷۰۷۶)

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آپس میں گالی دینے والے دوآدمی جو کچھ کہیں تو وہ (یعنی اس کا وبال) ابتداء کرنے والے پر ہے جب تک کہ مظلوم حد سے نہ بڑھے۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النہی عن السباب، ص۱۳۹۶، الحدیث: ۶۸ (۲۵۸۷))

بری بات کااعلان اللہ عَزَّوَجَلَّ کو پسند نہیں البتہ مظلوم کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کو بیان کرے، لہٰذا وہ چور یا غاصب کی نسبت کہہ سکتا ہے کہ اس نے میرا مال چرایا یا غصب کیا ہے۔ (جمل، النساء، تحت الآیۃ: ۱۴۸، ۲/۱۴۵)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کو چھوڑ دو ' اور اس کو برا نہ کہو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : '۴۸۹۹)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اپنے فوت شدہ لوگوں کی نیکیاں بیان کرو اور ان کی برائیوں کے ذکر سے باز رہو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : '۴۹۰۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا چیز ہے ' صحابہ (رض) نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں ' آپ نے فرمایا تم اپنے بھائی کے اس وصف کا ذکر کرو جس کو وہ ناپسند کرتا ہو ' آپ سے عرض کیا گیا یہ بتایئے اگر میرے بھائی میں وہ عیب ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں ' آپ نے فرمایا اگر تمہارے بھائی میں وہ عیب ہو جس کو تم بیان کرتے ہو تب ہی تو تم اس کی غیبت کرو گے اور اگر اس میں وہ عیب نہ ہو تو پھر تم اس پر بہتان باندھو گے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۸۹ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : '۴۸۷۴)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا آپ کے لیے صفیہ سے اتنا اتنا (قد) کافی ہے ! ان کا ارادہ تھا کہ ان کا قد چھوٹا ہے ' آپ نے فرمایا تم نے ایسا کلمہ کہا ہے کہ اگر اس کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو اس سے سارا پانی آلودہ ہو جائے گا۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ آپ کے سامنے کسی انسان کی نقل اتاری آپ نے فرمایا میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ میں کسی کی نقل اتاروں اور مجھے اس کے بدلہ فلاں فلاں چیز مل جائے۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ' ۴۸۷۵)
حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا ایک قوم کے پاس سے گزر ہوا جس کے پیتل کے ناخن تھے جس سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو کھرچ رہے تھے ' میں نے کہا اے جبرائیل یہ کون ہیں ' انھوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی بے عزتی کرتے تھے) یعنی غیبت کرتے تھے)
حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابو طلحہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان کی اس جگہ بے عزتی کرتا ہے جہاں اس کی عزت نہ کی جارہی ہو اور اس کی توقیر میں کمی کی جارہی ہو تو اللہ اس کو ایسی جگہ بے عزت کرے گا جہاں وہ اپنی نصرت چاہتا ہو ' اور جو شخص کسی مسلمان کی ایسی جگہ نصرت کرے گا جہاں اس کی توقیر میں کمی کی جارہی ہو اور اس کی بے حرمتی کی جارہی ہو تو اللہ اس کی ایسی جگہ مدد فرمائے گا جہاں وہ اپنی مدد پسند کرتا ہو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ' ۴۸۸۴)
حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جنت میں چغل خور داخل نہیں ہوگا۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ' ۴۸۷۲)

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں تو ہمارے متعلق اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں ' اگر تو سیدھی رہی تو ہم سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۲۴۱۵ ' حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۳۰۹)
حضرت نعمان بن بشیر نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ فاسد ہو تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے سنو وہ دل ہے۔ (صحیح بخاری : ۵۲)
سنن ترمذی کی روایت میں ہے تمام اعضاء کی صحت اور فساد کا مدار زبان پر ہے اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے اس کا مدار دل پر ہے اور یہ تعارض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان ہے ' اور اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ حضرت سہل بن سعد (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : کون ہے جو میرے لیے اس کا ضامن ہو جو دو جبڑوں کے درمیان اور جو دو ٹانگوں کے درمیان ہے۔ میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۲۴۱۶ ' صحیح بخاری ' رقم الحدیث : ' ۶۴۷۴ ' مسند احمد ج ۸ ' رقم الحدیث : ' ۲۲۸۸۶ ' سنن کبری للبیہقی ج ۸ ص ۱۶۶)
اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظالم و مظلوم دونوں کو احساس دلایا جارہا ہے۔ ظالم یہ نہ سمجھے کہ اس کے مظالم کس کو علم ہی نہیں یا دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ظالم کے کرتوتوں سے واقف ہے۔ اور اگر دنیا کی کوئی عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی تو اللہ تعالیٰ کی عدالت سے اسے سزا مل کر رہے گی۔ اور مظلوم کو تسلی دی جارہی ہے کہ اگر کوئی دوسرا تمہاری دادرسی نہیں کرتا تو صبر کرو اللہ تعالیٰ تیرا فریادرس ہے۔ تیری مظلومیت اور بے کسی کا اسے خوب علم ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا ﴿۱۴۹﴾

لغۃ القرآن: [اِنْ : اگر][تُبْدُوْا : تم علانیہ کرو][خَيْرًا : کوئی بھلائی][اَوْ تُخْفُوْهُ : یا اسے خفیہ کرو][اَوْ تَعْفُوْا : یا تم معاف کردو][عَنْ : سے][سُوْٓءٍ : برائی][فَاِنَّ : تو یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][كَانَ : ہے][عَفُوًّا : معاف کرنے والا][قَدِيْرًا : بڑی قدرت والا]

ترجمہ: اگر تم کسی کار خیر کو ظاہر کرو یا اسے مخفی رکھو یا کسی (کی) برائی سے در گزر کرو تو بیشک اللہ بڑا معاف فرمانے والا بڑی قدرت والا ہے۔

تشریح: اسلام کا منہاج تربیت نفس مومن اور جماعت مسلمہ کو ایک قدم اور بلند کر دیتا ہے پہلا مرحلے میں کہا جاتا ہے کہ کسی شریف انسان کیلئے بد گوئی کے ساتھ منہ کھولنا اچھا نہیں ہے۔ اس مرحلے میں ایک استثنائی صورت یہ رکھی جاتی ہے کہ مظلوم بد گوئی کر کے بدلہ بھی لے سکتا ہے اور حصول انصاف کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھلائی کیلئے ہر وقت کوشاں رہیں اور جس شخص پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ بد گوئی کر کے اپنا بدلہ لے سکتا ہے اسے بھی یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے اور صرف نظر کرے تو یہ نہایت ہی اچھا فعل ہے۔ یہ نہایت ہی بلند اخلاقی ہے 'بشر طیکہ وہ انتقام پر قادر ہو اور وہ انتقام کے بجائے عفو و در گزر کو ترجیح دے۔ کیونکہ قدرت انتقام کے بغیر عفو کیا معنی ؟ گدا اگر تواضع کند خوائے اوست۔

اگر عفو و در گزر کی نیکی کھل کر کریں تو معاشرہ میں عفو و در گزر کی رسم چلے گی اور نیکی پھیلے گی اور اگر وہ یہ نیکی خفیہ طور پر کریں گے تو بھی تزکیہ نفوس کا کام ہو گا۔ بھلائی اگر اعلانیہ کی جائے تو بھی مفید ہے اور اگر خفیہ کی جائے تو بھی مفید ہے۔ جب لوگوں کے درمیان عفو و در گزر عام ہو گا تو بد گوئی کرنے کے مواقع خود ہی کم ہوتے چلے جائیں گے بشر طیکہ یہ عفو و در گزر وہ شخص کرے جو انتقام پر قدرت رکھتا ہو۔ لیکن اگر کسی شخص کی کمزوری اسے عفو پر مجبور کر رہی ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ یہ عفو و در گزر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپناتے ہوئے ہونا چاہیے۔ اللہ قدرت کے باوجود عفو سے کام لیتا ہے۔ (آیت) "(فان اللہ کان عفوا قدیرا) (۴ : ۱۴۹) (اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ وہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے)

ارشاد فرمایا کہ اگر تم کوئی نیک کام اعلانیہ کرو یا چھپ کر یا کسی کی برائی سے در گزر کرو تو یہ افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سزا دینے پر ہر طرح سے قادر ہونے کے باوجود اپنے بندوں کے گناہوں سے در گزر کرتا اور انھیں معاف فرماتا ہے لہٰذا تم بھی اپنے اوپر ظلم و ستم کرنے والوں کو معاف کر دو اور لوگوں کی غلطیوں سے در گزر کرو۔

(تفسیر سمرقندی، النساء، تحت الآیۃ: ۱۴۹، ۱/۴۰۱، روح البیان، النساء، تحت الآیۃ: ۱۴۹، ۲/۳۱۲، ملتقطاً)

معاف کرنے کے فضائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظالم سے بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے لیکن ظالم سے بدلہ لینے پر قادر ہونے کے باوجود اس کے ظلم پر صبر کرنا اور اسے معاف کر دینا بہتر اور اجر و ثواب کا باعث ہے، اسی چیز کے بارے میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ (نحل: ۱۲۶)

اور اگر تم (کسی کو) سزا دینے لگو تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہو اور اگر تم صبر کرو تو بیشک صبر والوں کیلئے صبر سب سے بہتر ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ (شوریٰ: ۴۳)

تو بیشک جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو یہ ضرور ہمت والے کاموں میں سے ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ (شوریٰ: ۴۰)

اور برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہے تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے، بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد فرمایا:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۚ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (نور: ۲۲)

اور انہیں چاہیے کہ معاف کر دیں اور در گزر کریں، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری بخشش فرما دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "بیشک اللہ تعالیٰ در گزر فرمانے والا ہے اور در گزر کرنے کو پسند فرماتا ہے۔

(مستدرک، کتاب الحدود، اول سارق قطعہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ۵/۵۴۶، الحدیث: ۸۲۱۶)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کی: اے میرے رب! عَزَّوَجَلَّ، تیرے بندوں میں سے کون تیری بارگاہ میں زیادہ عزت والا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وہ بندہ جو بدلہ لینے پر قادر ہونے کے باوجود معاف کر دے۔

(شعب الایمان، السابع والخمسون من شعب الایمان۔۔۔ الخ، فصل فی ترک الغضب۔۔۔ الخ، ۶/۳۱۹، الحدیث: ۸۳۲۷)

مخلوقِ خدا پر شفقت کے فضائل

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخلوق خدا پر شفقت و رحم کرنا اللہ عَزَّوَجَلَّ کو بہت محبوب ہے۔ اَحادیث میں لوگوں پر شفقت و مہربانی اور رحم کرنے کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں، ترغیب کے لیے 4 اَحادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمانوں کی بادشاہت کا مالک تم پر رحم کرے گا۔
(ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ المسلمین، ۳/۳۷۱، الحدیث : ۱۹۳۱)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کی مدد چھوڑے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت (پوری کرنے کی کوشش) میں ہو اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کی حاجت پوری فرما دیتا ہے اور جو شخص مسلمان سے کسی ایک تکلیف کو دور کرے اللہ عَزَّوَجَلَّ قیامت کی تکالیف میں سے اس کی ایک تکلیف دور کرے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ عَزَّوَجَلَّ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب لایظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ، ۲/۱۲۶، الحدیث : ۲۴۴۲)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے اور اچھی بات کا حکم نہ دے اور بری بات سے منع نہ کرے۔ (ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان، ۳/۳۶۹، الحدیث : ۱۹۲۸)

(4)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "تم میں اچھا وہ شخص ہے جس سے بھلائی کی امید ہو اور جس کے شر سے امن ہو اور تم میں برا وہ شخص ہے جس سے بھلائی کی امید نہ ہو اور جس کے شر سے امن نہ ہو۔ (ترمذی، کتاب الفتن، ۷۶۔ باب، ۴/۱۱۶، الحدیث : ۲۲۷۰)

برائی ظاہر کرنا یا چھپانا دونوں باتوں کا ذکر بطور تمہید ہے اور اصل مقصود تو صرف یہ بتانا ہے کہ عمدہ عمل تو یہی ہے کہ بندہ کو اگر بدلہ لینے کی قدرت ہو تب بھی معاف کردے کیا بندہ دیکھتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ باوجودیکہ بڑی قدرت رکھتا ہے کہ بندوں سے ان کے گناہوں کا مواخذہ کرسکتا ہے تاہم انھیں معاف فرما دیتا ہے۔

تو بیشک اللہ تعالیٰ) (معاف کرنے والا) اور قدرت والا ہے) اور جب وہ باوجود قدرت کے درگزر فرما دیتا ہے تو بندوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے طریقے پر عمل کریں اس میں مظلوم کی ترغیب ہے کہ باوجود اس کے کہ اسے ظالم سے بدلہ لینے کی اجازت ہے، لیکن اسے معاف کردینا بہت اچھا ہے اس میں مکارم اخلاق کی عادت ڈالنے کی ترغیب و تحریص ہے اللہ تعالیٰ کسی کے قبائح و فضائح کا اظہار پسند نہیں فرماتا، ہاں، اس ظالم کے قبائح و فضائح کا اظہار جائز ہے جس کا ضرر، دجل، اور مکروفریب حد سے بڑھ جائے۔

ارشاد رسول ہے کہ : فاسق کے فسق کو ظاہر کرو تاکہ دوسرے لوگ اس کے شروفساد سے بچ جائیں۔ اس لیے ظالم حاکم کھلم کھلا فسق و فجور کا عادی اور بدعت سئیہ کا مرتکب اور اس کی دعوت دینے والا۔۔ نیز۔۔ ایسا شریر جس کے شروفساد اور کذب وفریب سے دوسروں کو نقصان

پہنچ سکتا ہے وتودوسروں کوان کی حرکتوں کے شر سے بچانے کے لیے ان کی نقصان پہنچانے والی برائیوں کو ذکر کر دینے کی رخصت ہے اور صرف رخصت ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ذکر کر دینا ضروری ہے۔۔۔
اس مقام پر یہ ضابطہ ذہن نشین رہے کہ ہر انسان کے عیبوں اور برائیوں کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں ایک وہ برائی جس کا دنیوی اور اخروی وبال اس فرد کے ساتھ مخصوص ہے اس برائی سے کسی اور کا نہ دنیوی نقصان ہے اور نہ ہی اخروی تو ایسوں کے ایسے عیبوں اور برائیوں کا دوسروں کے سامنے ذکر معیوب ہے اس لیے کہ اس سے صرف اس فرد کی تحقیر وتذلیل مقصود ہوتی ہے اور یہ کوئی اچھا عمل نہیں۔۔ دوسری وہ برائی جس کے شر کاء، شکار، دوسرے افراد بھی ہوتے ہیں۔ مثلا کذب، وفریب، چوری ڈکیتی اور بدکرداری وبدفعلی وغیرہ تو ایسے کاذب وفریبی چور وڈا کو اور بدکرداروں سے لوگوں کو ہوشیار رکھنا ضروری ہیں تاکہ کوئی ان کے شر کاء شکار نہ ہو جائے۔
۔۔یونہی۔۔ مجروح روایوں پر جرح کرنا اور فاق گواہوں کے عیوب نکالنا ہر گز ہر گز معیوب نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے واجب ہے ایسے ہی اگر کوئی شخص سے کسی بھی قسم کا معاملہ کرنے کے لیے مشورہ کرے اور اس شخص میں کوئی عیب ہو تو مشورہ دینے والے پر واجب ہے کہ اس عیب کو ظاہر کر دے۔اس طرح کسی فاسق۔۔ یا۔۔ بدعتی معلم سے علم حاصل کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہو تو جانکار کو چاہیے کہ اس علم حاصل کرنے والے متعلّم کو اس معلم کی بدعت اور فسق سے متنبہ کر دے ایسے ہی نااہل۔ یا غافل۔ یا عیبی۔۔ حاکم کی نااہلی اور اس کی غفلت شعاری ۔۔نیز۔۔ اس کے عیبوں سے اس کے حاکم اعلی کو باخبر کر دینا بالکل درست ہے تاکہ اس کو برطرف کر کے کسی لائق کا تقرر کر دے۔
اب اگر کوئی علی الاعلان فسق وفجور اور بدعات کا ارتکاب کرتا ہو تو ایسے شخصوں کے ان عیبوں کو پس پشت بیان کرنا جائز ہے جن کو وہ علی الاعلان کرتا ہو اس کے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا رد فرمایا تھا اب یہود ونصاری کا رد فرمارہا ہے (اشرفی)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١٥٠﴾ۙ

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک][الَّذِيْنَ : لوگ][يَكْفُرُوْنَ : کفر کرتے ہیں][بِاللّٰهِ : اللہ کے ساتھ][وَرُسُلِهٖ : اور اس کے رسولوں][وَيُرِيْدُوْنَ : اور وہ چاہتے ہیں][اَنْ : یہ کہ][يُّفَرِّقُوْا : تفریق کریں][بَيْنَ : درمیان][اللّٰهِ : اللہ][وَرُسُلِهٖ : اور اس کے رسولوں][

وَيَقُوْلُوْنَ : اور وہ کہتے ہیں][نُؤْمِنُ : ہم ایمان لاتے ہیں][بِبَعْضٍ : بعض کے ساتھ][وَّنَكْفُرُ : اور ہم انکار کرتے ہیں][بِبَعْضٍ ۙ: بعض کا][وَّيُرِيْدُوْنَ : اور وہ چاہتے ہیں][اَنْ يَّتَّخِذُوْا : یہ کہ اختیار کریں][بَيْنَ : درمیان][ذٰلِكَ : اس کے][سَبِيْلًا : کوئی راہ]

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس (ایمان و کفر) کے درمیان کوئی راہ نکال لیں۔

تشریح:

منافقوں کے بعد کفار کی ایک اور قسم اور ان کے کفر کا بیان

یہاں کفار کے ایسے کفر کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے کچھ لوگ مخلص مسلمانوں کو مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا کسی ایک نبی کا انکار کرتا ہے تو اسے اسلام سے خارج نہیں سمجھنا چاہیے ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ایمان کا پہلا اور آخری تقاضا یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا حکم تسلیم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جس ایمان کا انسان سے مطالبہ کیا ہے اس کے کئی اجزاء ہیں جسے شرعی اصطلاح میں ایمان مفصّل کہا جاتا ہے جب تک ایمان کے تمام اجزاء کو تسلیم نہیں کیا جاتا کسی آدمی کو ایمان دار کہلوانے کا حق نہیں پہنچتا۔ ایمان کے تین بنیادی اجزاء ہیں ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان باآخرت۔ یہ مجمل ایمان ہے باقی اجزاء اس کی تفصیل ہیں یہاں ایمان کے دوسرے بنیادی جزء یعنی ایمان بالرسالت کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ جو شخص کچھ انبیاء کو مانتا ہے اور کچھ یا کسی ایک کا انکار کرتا ہے اس کا ایمان نہ صرف قابل قبول نہیں بلکہ وہ حقیقت میں پکا کافر ہے۔

اس لیے کہ تمام کے تمام انبیاء (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے فرستادہ اور ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرنے والے تھے کسی ایک نبی کے منکر کو اس لیے بھی ایماندار تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ہر نبی اور اس کی تعلیمات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کرتی ہیں لیکن انکار کرنے والا محض ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنیاد پر نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا کسی نبی کا انکار کرتا ہے یہ احمقانہ بات ہے اور اسلام ایسی حماقت کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

اسی بنیاد پر یہودی اور عیسائی کافر قرار پاتے ہیں کیونکہ یہودی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور نبی آخر الزمان حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی نہیں مانتے اور عیسائی رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منکر ہیں۔ کفر کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص قرآن کو مانتا ہے لیکن مستند حدیث کو یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ بس ہمیں قرآن ہی کافی ہے۔ ایسا شخص اللہ اور اس کے رسول کے فرامین کے درمیان تفریق پیدا کرتا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص بھی دائرہ اسلام سے خارج تصور ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان پر کما حقہ عمل کرنے کے لیے نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

کو مبعوث کیا گیا ہے جس کی عملی تفسیر نمونہ حدیث ہے۔ جو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تفسیر اور آپ کی سنت نہیں مانتا اسے کیونکر مسلمان تسلیم کیا جائے؟ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان میں تفریق کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ ان کے لیے ذلیل کر دینے والا عذاب تیار کیا گیا ہے۔

(عَنْ اَبِی رَافِعٍ (رض) وَغَیْرِہٖ رَفَعَہٗ قَالَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِءًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَاْتِیْہِ اَمْرٌ مِّمَّا اَمَرْتُ بِہٖ اَوْ نَہَیْتُ عَنْہُ فَیَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اتَّبَعْنَاہُ) [رواہ الترمذی : کتاب العلم]

"حضرت ابورافع (رض) ان کے علاوہ اور صحابہ کرام (رض) بھی اس حدیث کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم سے کسی کو اس طرح نہ پاؤں کہ اس کے پاس میرا کوئی فرمان آئے جس میں کسی چیز کا حکم یا کسی کام سے منع کیا گیا ہو تو وہ کہے میں اسے نہیں جانتا ہم تو فقط اس کی پیروی کریں گے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے۔" (فہم)

اب یہ امر غور طلب ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور انبیاء کے ساتھ کفر کرتا ہے اسے پکا کافر کیوں کہا گیا؟ اس لیے کہ جو سلسلہ وحی و نبوت کو تسلیم نہیں کرتا نہ اسے اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا صحیح علم ہوتا ہے اور نہ اسے عبادت کا وہ طریقہ معلوم ہو سکتا ہے جو قرب الٰہی کا باعث ہو۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفات تقدس و کمال کو نہ پہچانا اور اس کی عبادت کے صحیح طریقوں کو نہ جانا تو اللہ کو کیا پہچانا۔ آپ ان قوموں کے رسول عبادت کو دیکھئے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن کسی نبی کے پیروکار نہیں۔ آپ حیران ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی طرح فلاسفہ قدیم وجدید نے جن صفات الٰہیہ کا اثبات کیا ہے وہ بھی انسان کے لیے کچھ کم پریشان کن نہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو بعض انبیاء کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں اور جن دلائل وبراہین اور معجزات کی وجہ سے انھوں نے ان بعض کی نبوت کا اقرار کیا۔ اب جب ان سے بھی محکم تر دلائل وبراہین اور روشن تر معجزات ایک دوسری ہستی میں پائے جاتے ہیں تو وہ اس کی نبوت پر کیوں ایمان نہیں لاتے۔ ان کا یہ ایمان نہ لانا پہلے انبیاء کے انکار کے مترادف ہے اور خصوصاً ذات پاک محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرنا جن کی آمد کی بشارت اور ان پر ایمان لانے کی تاکید ہر زمانے کے نبی نے فرمائی صرف آپ کا انکار بلکہ تمام سابقہ انبیاء ومرسلین کی تکذیب ہے۔

اللہ اور رسولوں کے درمیان فرق کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تو ایمان لے آئے اور وحی ورسالت کا سرے سے انکار کر دیا۔ اس انکار میں ان کی انانیت اور خود بینی جھلک رہی ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات تو ناقص و ناکافی ہیں۔ اس لیے ان کی عقلی موشگافیوں کی ضرورت ہے۔ اب وہ لوگ جو اللہ کی اطاعت کے تو قائل ہیں لیکن اللہ کے رسول کی اطاعت سے گریزاں ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے وہ ذرا غور کریں کہ وہ بھی کہیں اللہ اور اس کے رسول میں تفریق کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔

اسلام اور کفر کی معجون مرکب بنانے کا خیال بہت پرانا ہے ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے ہماری اپنی تاریخ بھی ان نوادر روزگار ہستیوں سے خالی نہیں۔ اکبر اور دارا شکوہ کے بعد آج بھی توکئی افراد موجود ہیں۔ (ضیاء)

مسائل

۱۔ کسی ایک نبی کا انکار کرنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات میں تفریق کرنا کفر ہے۔

۳۔ کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ جس نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو اسلام و ایمان سے نوازا اور اپنی ذات پر اور اپنے تمام رسولوں پر ایمان لانے والا بنایا۔

دعا کیجئے:

اے اللہ ہم کو ایمان کامل اور اسلام صادق نصیب فرما اور ہم کو اپنے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پکا اور سچا امتی ہونا نصیب فرما۔ اے اللہ ہمارے تمام عقائد اور اعمال شریعت مطہرہ کے موافق ہوں اور ہم سے جو اعمال میں کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں ان کو اپنی رحمت سے معاف فرما دیجئے اور ہم کو اپنی مغفرت نصیب فرمایئے۔ آمین

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ:

اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

لغۃ القرآن: اُولٰٓىِٕكَ : یہ لوگ][هُمُ : وہی ہیں][الْكٰفِرُوْنَ : کافر][حَقًّا : حقیقتاً][وَاَعْتَدْنَا : اور ہم نے تیار کیا ہے][لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے][عَذَابًا : عذاب][مُّهِيْنًا : ذلیل کرنے والا]

ترجمہ:

ایسے ہی لوگ درحقیقت کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تشریح: اسلام نام ہے آئین فطرت کا اور حقائق و محسوسات کا اور پیغمبر کہتے ہیں ترجمان رحمٰن کو، اس لیے اس میں کسی تفریق و اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، جس طرح سے سورج ایک ہے، آسمان ایک ہے اسی طرح ادیان مختلفہ میں وحدت و یکسانی ہے البتہ حالات وظروف کے اختلاف و تضاد کی وجہ سے ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا پیغام انتقام مسیح ناصری کے پیغام عفو سے الگ اور جدا معلوم ہوتا ہے، ورنہ مقصد و مصداق کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں دونوں کا مقصد اصلاح نفس و انسانیت ہے۔

سارے مذاہب اور سارے پیغمبر اس لیے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئے ہیں تاکہ افق انسانیت کو زیادہ سے زیادہ تابندہ و روشن بنادیا جائے سب کا موضوع اصلی اور مقصود انسان کی خدمت و رہنمائی ہے پس یہ کس درجہ ظلم و جہل ہے کہ اس سلسلہ کے ایک مؤید کو تو مانا جائے اور دوسروں کا انکار کردیا جائے۔

اسلام کہتا ہے کہ تعصب و جہالت کو چھوڑ دو اور یہ جان لو کہ صداقت ہمہ گیر ہے، اللہ کی رحمتیں ہر گز گوشہ زمین پر پھیلی ہوئی ہیں، جس عقیدت اور نیاز مندی سے تم موسیٰ (علیہ السلام) کو مانتے ہو اسی طرح محبت و شیفتگی سے مسیح (علیہ السلام) پر ایمان لاؤ اور جس طرح تمہارے ہاں مسیح ناصری فخر و مباحات کے اہل ہیں ' اسی طرح تمام پیغمبرانہ ستائشوں اور تعریفوں کے حامل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ تم سب کو یکساں اللہ کی جانب سے تصور کرو اور ہر تعصب و تحزب کا خاتمہ کرو۔ (سراج)

ایک پیغمبر کا انکار بھی کفر ہے

قرآن کی یہ آیت اس معاملہ میں بالکل صاف اور واضح ہے اور کسی ایک پیغمبر کے انکار کو بھی کفر بتاتی ہے شاید یاد ہوگا کہ ہم نے پہلے پارہ میں ان الذین امنوا والذین ھادوا کی تسہیل میں بتایا تھا کہ اگر اس آیت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے تو اس کو یہ مستلزم نہیں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے بغیر کوئی نجات یافتہ ہوسکتا ہے خواہ توحید الٰہی ہو خواہ اعمال صالحہ ہوں۔ یا قیامت پر ایمان لانا ہو یہ سب باتیں پیغمبر کی رہنمائی کی محتاج ہیں جو شخص یہ چاہے کہ میں پیغمبر کو نظر انداز کر کے نجات کی صحیح راہ معلوم کرلوں تو یہ کھلا کفر ہے۔

اب چھٹے پارے کی اس آیت کو سامنے رکھ کر اس آیت کی تفسیر کرنی چاہیے اور آج کل جدت پسند لوگوں کے خیال سے اجتناب کرنا چاہیے جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر میں بڑی جرأت اور بے باکی اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ قرآن کریم سب باتیں ایک ہی آیت میں بیان نہیں کردیا کرتا اس لیے تفسیر کرتے وقت سب آیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے جب قرآن بعض رسولوں کے ماننے اور بعض کے نہ ماننے کو کفر بتارہا ہے تو خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نہ ماننے والے کس طرح نجات دائمی اور فلھم اجرھم عندربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون کے مستحق ہوسکتے ہیں۔

پیغمبر پر ایمان لانا تو قانون کی ایک بنیادی دفعہ ہے اگر قانون کی دوسری دفعات میں اس کا ذکر نہ آئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جبزل اور بنیادی دفعہ ترک کردی گئی ہے آگے کی آیت میں طرفین کے عہدے کا اظہار ہے پھر اس کے بعد یہود کی حرکات قبیحہ کا ذکر ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ (تسہیل)

کسی بھی رسول کا انکار کفر ہے : سو رسولوں کا انکار کرنے والے ایسے لوگ پکے کافر ہیں۔ اور جس ایمان کے یہ دعویدار ہیں وہ معتبر نہیں۔ کیونکہ وہ شرعی ایمان نہیں کہ شرعی ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سب ہی رسولوں پر سچا پکا ایمان لایا جائے۔ سو کسی بھی رسول کا انکار کفر ہے۔ اور ایسے لوگ جو اپنے زعم اور گھمنڈ کے مطابق بعض رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو جو چاہیں سمجھیں مگر وہ پکے کافر ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

ایسے سب لوگ پکے کافر ہیں۔ یہ کن کو کافر کہا جارہا ہے۔ جو بعض پیغمبروں کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اس سے ایک بہت اہم بات ہم سب کو پتہ چلتی ہے کہ اسلام کے علاوہ نجات کسی اور دین میں نہیں۔ نہ یہودی ہونے میں نہ عیسائی ہونے میں۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عیسائی کیوں نہیں جنت میں جائیں گے۔ وہ تو اللہ کو مانتے ہیں۔ رسولوں کو مانتے ہیں۔ کتابوں کو مانتے ہیں۔ کیا ہوا جو ایک نبی کو نہیں مانتے۔ تو ایک نبی کو بھی نہ ماننا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا ایمان معتبر نہیں۔ آپ دیکھیں "ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض۔ اولئک ھم الکفرون حقا" یہ پکے کافر ہیں۔ اسلام ہمیں کیا سکھاتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تو سکھاتا ہے کہ ہم غیر مسلموں کے ساتھ روا داری کا مظاہرہ کریں۔ ہمدردی اور خیر خواہی کا مظاہر کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے غلط عقائد۔ غلط طریقے غلط رسم ورواج ان سے اعلان برات کریں۔ ان سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ان دو باتوں میں فرق ہے نا۔ بطور انسان سب کا احترام۔ خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن جہاں اصول کی بات ہو وہاں کوئی کمپرومائز نہیں۔ کسی کی اچھائی کسی کی نیکی کسی کی بھلائی دیکھ کر اس سے متاثر ہو کر آپ اپنے دین کے خلاف جا کر فتوے صادر نہ کریں۔ اگر ہم سوچیں کہ مدر ٹریسا نے اتنی بھلائیاں کیں۔ اتنی خدمت کی جو کسی بھی عام مسلمان سے اتنی زیادہ ہیں تو جنت میں کیوں نہیں جائے گی۔ جنت میں بھیجنا یا نہ بھیجنا میرا اور آپ کا کام نہیں۔ نہ ہمیں یہ اختیار ہے۔ نہ ہمیں یہ حق دیا گیا کہ کسی پر فتوے لگائیں۔ لیکن اپنے طور پر یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ جو شخص نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر ایمان نہیں لائے گا۔ قرآن اس کو کیا کہتا ہے کہ اولئک ھم الکفرون حقا۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں۔ اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ایمان کا معیار کیا قرار دیا گیا۔

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ۔ فقد اھتدوا۔ کہ اگر وہ بھی ایمان لائیں ایسا ہی ایمان جیسا تم ایمان لائے ہو۔ تو پھر وہ ہدایت پر ہیں۔ فان تولوا۔ پھر اگر وہ منہ موڑ جائیں اولئک ھم فی شقاق۔ تو پھر وہ شقاق کا شکار ہیں۔ مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے ہمیں وحدت ادیان کی نفی ہوتی ہے۔ وحدت ادیان کا فلسفہ موجودہ دور میں پیش کیا جاتا ہے کہ سارے دین اچھائی کا سبق دیتے ہیں۔ اس لیے سارے ہی سچے ہیں۔ تو سچائی تو ایک وقت میں ایک ہی ہوسکتی ہے۔ مثلاً دس لوگوں کی ایک منزل ہے۔ اور دس کے دس مختلف سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔ اور آپ کہیں کہ سب ہی ٹھیک جارہے ہیں تو کیا یہ بات درست ہوگی۔ سب کیسے ٹھیک جارہے ہیں۔ صرف وہ ٹھیک جارہے ہیں جو سیدھے راستے پر ہیں۔ آپ اگر دس لوگوں کو دیکھ لیں کہ وہ سائیکلوں پر گھوم رہے ہیں ایک ادھر کو گیا ایک ادھر کو۔ دو مشرق دو مغرب۔ کوئی شمال کوئی جنوب۔ اور جو صحیح ڈائیریکشن تھی اس پر ایک ہی گیا تو سب کو ہم سائیکلیں چلاتے دیکھ کر کہیں کہ سب محنت کر رہے ہیں۔ سب بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ سب ہی ٹھیک ہیں۔ تو صرف بھاگ دوڑ ہی سے تو بات نہیں بنتی۔ صحیح منزل کا تعین درست ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم کو ہر نماز میں سکھایا گیا اھدنا الصراط المستقیم۔ سب سے زیادہ اہم ترین دعا کہ سیدھا راستہ دے ہم کو یا رب۔ کیونکہ اگر راستہ سیدھا نہیں تو ساری کوشش بے کار ہے۔ سارا کام فضول ہر چیز ضائع۔ تو ان آیات سے کیا پتہ چلتا ہے کہ نجات کے لیے ضروری ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی ایمان لایا جائے۔ (تنویر)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ع

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو][اٰمَنُوْا : ایمان لائے][بِاللّٰهِ : اللہ کے ساتھ][وَرُسُلِهٖ : اور اس کے رسولوں][وَلَمْ : اور نہیں][يُفَرِّقُوْا : انہوں نے تفریق کی][بَيْنَ : درمیان][اَحَدٍ : کسی ایک کے][مِّنْهُمْ : ان میں سے][اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ][سَوْفَ : جلد][يُؤْتِيْهِمْ : وہ دے گا ان کو][اُجُوْرَهُمْ: ان کے اجر][وَكَانَ : اور ہے][اللّٰهُ : اللہ][غَفُوْرًا : بخشنے والا][رَّحِيْمًا : نہایت رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور اس کے (سب) رسولوں پر ایمان لائے اور ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان (ایمان لانے میں) فرق نہ کیا تو عنقریب وہ انھیں ان کے اجر عطا فرمائے گا، اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

تشریح:

ایمان کامل کا تقاضہ

ایمان کامل کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے کہ وہ اپنے اپنے زمانے میں اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور انھوں نے ٹھیک ٹھیک طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچایا۔ جس بنا پر مقام رسالت کے حوالے سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے انبیاء پر صحیح ایمان لانے کا تقاضا تبھی پورا ہو سکتا ہے کہ جب جناب رسالت مآب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آخری نبی تسلیم کیا جائے کیونکہ تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کی نبوت کا اقرار کر چکے ہیں۔ (آل عمران : ۸۱)

انہوں نے اپنی اپنی امت کو یہی پیغام دیا تھا بالخصوص حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آپ کے لیے دعا کی اور آپ کی جائے نبوت کی نشان دہی فرمائی۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جو کہ آپ سے پہلے نبی ہیں انھوں نے بنی اسرائیل کو آپ کی تشریف آوری کی خوشخبری دی اور آپ کے اسم گرامی سے آگاہ فرمایا۔ لہٰذا جو لوگ اس طرح ایمان لائیں گے وہ اللہ کے ہاں بے حد و حساب اجر پائیں گے۔ بتقاضائے بشریت سرزد ہونے والی ان کی خطاؤں اور گناہوں کو معاف کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

(رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) [البقرہ : ۱۲۹]

"اے ہمارے رب ان میں ایک رسول بھیج جو انہی میں سے ہو وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ بنائے بلاشبہ تو غالب اور حکمت والا ہے"

(وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ) [الصّف : ٦]

"اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں اور پہلے سے نازل شدہ توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہو گا۔"

(وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ) [آل عمران : ٨١]

"اور جب اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا کہ اگر میں تمہیں کتاب و حکمت عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے تمہیں لازماً ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنا ہو گی اللہ تعالیٰ نے پوچھا کیا تم اقرار کرتے ہو اور میرے اس عہد کی ذمہ داری قبول کرتے ہو؟ انبیاء نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں فرمایا گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں"

(عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ السُّلَمِيِّ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ وَسَأُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِ ذَلِكَ دَعْوَةِ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَبِشَارَةِ عِيسَى (علیہ السلام) قَوْمَهُ وَرُؤْيَا أُمِّي الَّتِي رَأَتْ أَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ لَهُ قُصُورُ الشَّامِ وَكَذَلِكَ تَرَى أُمَّهَاتُ النَّبِيِّينَ صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ) [رواہ احمد]

"حضرت عرباض بن ساریہ سلمی (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں قرآن مجید میں مجھے خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے اس وقت سے جب حضرت آدم (علیہ السلام) ابھی مٹی اور روح کے درمیان تھے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہوں میری والدہ نے دیکھا کہ ان کے وجود سے ایک روشنی نکلی جس سے ملک شام کے محلات روشن ہوگئے۔ اور اسی طرح ہی انبیائے کرام (علیہ السلام) کی مائیں دیکھا کرتی تھیں۔" (فہم)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ اسلوب ہے کہ مومنوں کے ذکر کے بعد کافروں کا اور کافروں کے ذکر کے بعد مومنوں کا ذکر فرماتا ہے کیونکہ ایک ضد دوسری ضد سے پہچانی جاتی ہے 'سو پہلے ان لوگوں کا ذکر فرمایا تھا جو بعض نبیوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں اور جو رسولوں میں فرق کرتے ہیں اور ان کے متعلق فرمایا یہ یقینا کافر ہیں اور ان کو ذلت والا عذاب دیا جائے گا 'اس کے بعد مسلمانوں کا ذکر فرمایا جو رسولوں کے درمیان ایمان لانے کا فرق نہیں کرتے اور سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں پھر آخرت میں ان کے اجر وثواب کا ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان سے اجر کا وعدہ فرمایا اور مغفرت کا بھی 'یعنی ان مسلمانوں میں سے کامل اطاعت گزار اور فرمان بردار ہیں ان کو اپنے فضل سے ثواب عطا فرمائے گا 'اور جن سے کچھ کوتاہیاں اور گناہ ہوگئے ان کو بخش دے گا 'یا ان کی توبہ سے ان کو بخش دے گا 'یا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا کسی فرشتے یا کسی اور نبی 'یا کسی اور مقبول بندہ کی شفاعت سے معاف کردے گا 'یا محض اپنے فضل سے بخش دے گا 'یا پھر ان کو کچھ عرصے کے لیے دوزخ میں داخل کرے گا اور پھر نکال لے گا اور جنت میں داخل کردے گا۔

اے بار الہ ! اس کتاب کے مصنف کو اور اس کے خیر خواہ قاری کو بلا عذاب و حساب و کتاب اپنے محبوب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے بخش دینا، آمین !۔ (تبیان)

کبیرہ گناہ کرنے والا کافر نہیں

مُعتَزِلہ فرقے والے کبیرہ گناہ کرنے والوں کیلئے ہمیشہ کے عذاب جہنم کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس آیت سے ان کے اس عقیدہ کا بطلان (یعنی غلط ہونا) ثابت ہو گیا۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَاِنۡ طَآئِفَتَانِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا (حجرات : ۹)

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کفر نہیں کیونکہ جنگ و جدال گناہ ہے لیکن دونوں گروہوں کو مومن فرمایا گیا۔ نیز صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابوذر (رض) فرماتے ہیں "میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سفید کپڑے پہن کر آرام فرما رہے تھے، پھر میں دوبارہ حاضر ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیدار ہو چکے تھے، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو بندہ یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی وعدے پر اس کا انتقال ہو جائے تو وہ جنت میں داخل ہوا۔ میں نے عرض کی : خواہ اس نے زنا یا چوری کی، ارشاد فرمایا "خواہ اس نے زنا یا چوری کی۔ میں نے پھر عرض کی : اگرچہ وہ زنا یا چوری کرے ! ارشاد فرمایا "اگرچہ وہ زنا یا چوری کرے، میں نے پھر عرض کی : خواہ اس نے زنا یا چوری کی، ارشاد فرمایا "خواہ اس نے زنا یا چوری کی، خواہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو جائے۔ (بخاری، کتاب اللباس، باب الثیاب البیض، ۴/۵۷، الحدیث : ۵۸۲۷)

اور حضرت انس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہے جو کبیرہ گناہوں کے مُرتَکِب ہوں۔

(ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، ۱۱۔ باب منہ، ۴/۱۹۸، الحدیث : ۲۴۴۴)

ان احادیث سے بھی معلوم ہوا کبیرہ گناہ کرنے والا کافر نہیں کیونکہ کافر نہ تو کبھی جنت میں جائے گا اور نہ ہی سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی شفاعت فرمائیں گے بلکہ جنت میں صرف مسلمان جائیں گے اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت بھی صرف مسلمانوں کو نصیب ہو گی اگرچہ وہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں۔

یاد رہے کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ مومن کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا، چنانچہ شرح عقائدِ نَسفِیَہ میں ہے "نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے سے لے کر آج تک امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کے لیے دعا و استغفار بھی کی جائے گی اگرچہ اس کا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونا معلوم ہو حالانکہ اس بات پر پہلے ہی امت کا اتفاق ہے کہ مومن کے علاوہ کسی اور کے لیے نماز جنازہ اور دعاء و استغفار جائز نہیں۔ (شرح عقائد نسفیہ، مبحث الکبیرۃ، ص ۱۱۰)

شرح فقہِ اکبر میں ہے "ہم خارجیوں کی طرح کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے کسی مسلمان کی تکفیر نہیں کریں گے اگرچہ وہ گناہ کبیرہ ہو البتہ اگر وہ کسی ایسے گناہ کو حلال جانے جس کی حرمت قطعی دلیل سے ثابت ہو تو وہ کافر ہے، اور ہم معتزلہ کی طرح کسی کبیرہ گناہ کرنے والے سے ایمان کا وصف ساقط نہیں کریں گے اور کبیرہ گناہ کرنے والے کو حقیقی مومن کہیں گے کیونکہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے جبکہ عمل کا تعلق کمال ایمان سے ہے (شرح فقہ اکبر، الکبیرۃ لاتخرج المومن عن الایمان، ص ۷۱ و ۷۴)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں "آدمی حقیقۃً کسی بات سے مشرک نہیں ہوتا جب تک غیر خدا کو معبود یا مُستَقِل بالذّات وواجب الوجود نہ جانے۔ بعض نصوص میں بعض افعال پر اطلاق شرک تشبیہاً یا تَغلیظاً یا بارادہ ومقارنت باعتقاد منافی توحید وامثال ذٰلک من التاویلات المعروفۃ بین العلماء وارد ہوا ہے، جیسے کفر نہیں مگر انکار ضروریات دین اگرچہ ایسی ہی تاویلات سے بعض اعمال پر اطلاق کفر آیا ہے یہاں ہر گز علی الاطلاق شرک وکفر مصطلح علم عقائد کہ آدمی کو اسلام سے خارج کردیں اور بے توبہ مغفور نہ ہوں زنہار مراد نہیں کہ یہ عقیدہ اجماعیہ اہلسنّت کے خلاف ہے، ہر شرک کفر ہے اور کفر مزیل اسلام، اور اہلسنّت کا اجماع ہے کہ مومن کسی کبیرہ کے سبب اسلام سے خارج نہیں ہوتا ایسی جگہ نصوص کو علی اطلاقہا کفر وشرک مصطلح پر حمل کرنا اشقیائے خوارج کا مذہب مطرود ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۱۳۱/۲۱)

خلاصہ عبارت یہ ہے کہ آدمی صرف دو چیزوں سے مشرک ہوتا ہے (1) غیرِ خدا کو معبود ماننے سے، (2) اللہ کے علاوہ کسی کو مستقل بالذّات ماننے سے۔ ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری چیز سے آدمی حقیقتاً مشرک نہیں ہوتا۔ اور بعض احادیث وغیرہ میں جو کچھ کاموں کو بغیر کسی قید کے شرک یا کفر کہا گیا ہے ان کی تاویلات وتَوجِیہات علماء میں مشہور ہیں یعنی یا تو وہاں کفر وشرک سے تشبیہ مراد ہوتی ہے یا اس کام پر شریعت نے شدت ظاہر کرنے کیلئے لفظِ شرک استعمال کیا ہوتا ہے یا وہاں شرک سے مراد وہ صورت ہوتی ہے کہ جب اس فعل کے ساتھ کوئی ایسا ارادہ یا اعتقاد ملا ہو جو توحید کے منافی ہو۔ (جیسے غیر خدا کو سجدہ کرنا مطلقاً شرک نہیں لیکن اگر اس کے ساتھ ارادۂ شرک موجود ہو تو یقیناً شرک ہے۔) تو غیر شرک کو جہاں شرک کہا گیا ہو وہاں وہ حقیقی کفر وشرک مراد نہیں ہوتا جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے خارج اور بغیر توبہ کے مرنے پر دائمی جہنمی قرار پائے کیونکہ اہلسنّت کا اجماع ہے کہ مسلمان کبیرہ گناہ کی وجہ سے اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ قرآن وحدیث کی مذکورہ بالا قسم کی تصریحات کو ہماری بیان کردہ تفصیل کے ملحوظ رکھے بغیر حقیقی کفر وشرک قرار دینا خارجیوں کا مردود مذہب ہے۔ (صراط)

مسائل

۱۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ بلا تفریق تمام انبیاء پر ایمان لایا جائے۔

۲۔ کامل ایمان والوں کے لیے بے حد وحساب اجر ہو گا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

آیت مبارکہ:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

لغۃ القرآن: [يَسْـَٔلُكَ : وہ آپ سے سوال کرتے ہیں][اَهْلُ الْكِتٰبِ : اہل کتاب][اَنْ : یہ کہ][تُنَزِّلَ : آپ اتار لائیں][عَلَيْهِمْ : ان پر][كِتٰبًا : کتاب][مِّنَ : سے][السَّمَآءِ : آسمان][فَقَدْ : بیشک][سَاَلُوْا : انہوں نے سوال کیا][مُوْسٰۤى : موسیٰ سے][اَكْبَرَ : بڑی بات کا][مِنْ ذٰلِكَ : اس سے بھی][فَقَالُوْۤا : اور انہوں نے کہا][اَرِنَا : تو دکھا ہم کو][اللّٰهَ : اللہ][جَهْرَةً : بالکل سامنے][فَاَخَذَتْهُمُ : توپکڑ لیا انہیں][الصّٰعِقَةُ : بجلی نے][بِظُلْمِهِمْ : ان کے ظلم کے سبب][ثُمَّ : پھر][اتَّخَذُوا : انہوں نے پکڑ لیا][الْعِجْلَ : بچھڑے کو (معبود)][مِنْۢ: سے][بَعْدِ : بعد اس کے][مَا : جو][جَآءَتْهُمُ : آچکے ان کے پاس][الْبَيِّنٰتُ : واضح دلائل][فَعَفَوْنَا : تو ہم نے معاف کردیا][عَنْ : سے][ذٰلِكَ : یہ][وَاٰتَيْنَا : اور ہم نے دیا][مُوْسٰى : موسیٰ کو][سُلْطٰنًا : غلبہ][مُّبِيْنًا : واضح]

ترجمہ: (اے حبیب !) آپ سے اہل کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے (ایک ہی دفعہ پوری لکھی ہوئی) کوئی کتاب اتار لائیں، تو وہ موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے ہیں، انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں اللہ (کی ذات) کھلم کھلا دکھا دو، پس ان کے (اس) ظلم (یعنی گستاخانہ سوال) کی وجہ سے انھیں آسمانی بجلی نے آپکڑا (جس کے باعث وہ مر گئے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے زندہ ہوئے)، پھر انھوں نے بچھڑے کو (اپنا معبود) بنالیا اس کے بعد کہ ان کے پاس (حق کی نشاندہی کرنے والی) واضح نشانیاں آچکی تھیں، پھر ہم نے اس (جرم) سے بھی در گزر کیا اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (ان پر) واضح غلبہ عطا فرمایا۔

تشریح: اہل کتاب موقعہ بموقعہ مختلف الفاظ اور انداز میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر اعتراض اٹھاتے رہتے تھے اسی سبب سے وہ آپ کی نبوت کا انکار اور انبیاء کے درمیان تفریق کرتے تھے جس کا سورۃ الانعام، آیت : ۱۲۴ میں یہ جواب دیا گیا۔
کسی کو نبوت عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوا کرتا ہے جس کے بارے وہی جانتا ہے کہ کون سے کندھے بار نبوت اٹھا سکتے ہیں اور کس کا سینہ انوار نبوت کو سما سکتا ہے اور کون سی زبان اس کا حق ادا کر سکتی ہے اہل کتاب کے اعتراض کا مقصد یہ تھا کہ نبوت ہماری بجائے اسماعیل (علیہ السلام) کے خاندان کو نہیں ملنی چاہیے تھی اب اہل کتاب اس بات کو دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ اے محمد کتاب تجھ پر نازل ہوئی ہے اور ہم پر نہیں اتری۔ ہم تب ایمان لائیں گے کہ جب ہم پر کتاب نازل کی جائے اور اس میں ہمیں براہ راست ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ یہاں اس بیہودہ سوال کا جواب فقط اتنا ہی دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس سے بڑھ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو لایعنی سوال کر چکے ہیں۔ جب کوہ طور سے موسیٰ (علیہ السلام) لکھی ہوئی کتاب ان کے پاس لائے تو یہ کہنے لگے کہ ہم اس کتاب کی تصدیق تب ہی کر سکتے ہیں کہ جب ہم براہ راست اللہ تعالیٰ کو خود دیکھ لیں ہمیں یقین ہو کہ واقعی ہی اللہ تعالیٰ کوہ طور پر آکر آپ سے ہم کلامی کرتا ہے تب ان کے گستاخانہ مطالبے کی پاداش میں کڑک نے انھیں آلیا اور وہ اس وقت مر گئے لیکن موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کے صلہ میں انھیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔ (الاعراف : ۱۵۵)
اس جواب کے ساتھ ان کے جرائم پر مشتمل درج ذیل فرد جرم عائد کر دی گئی جس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی گئی ہے کہ ایسی باتیں کرنا ان کا پرانا وطیرہ ہے اس کے ساتھ بھی مسلمانوں کو بے مقصد سوال کرنے سے احتراز کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور یہود کو انتباہ کیا گیا ہے کہ باز آجاؤ تمہاری بھلائی اسی میں ہے ورنہ تمہارے آباؤاجداد کی طرح تمہیں بھی نیست و نابود کر دیا جائے گا۔
ہاں تم وہی لوگ ہو جنہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے بڑے بڑے معجزات دکھائے جن میں موسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ کا چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکنا، لاٹھی کا اژدہا بن کر جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل جانا، ملک کے جادوگر جو مصر کے چنے ہوئے دانشور تھے ان کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانا، بنی اسرائیل یعنی تمہارا بحفاظت دریا عبور کرنا، فرعون اور اس کے لشکروں کا غرقآب ہونا۔ ان عظیم معجزات کے باوجود جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) طور پر گئے تو تمہارا بچھڑے کو مشکل کشا اور معبود بنانا ان بڑے جرائم کے باوجود ہمارا تم کو معاف کر دینا۔

یہودیوں کی گستاخیاں اور بے ہودہ اعتراض

۱۔ سرور دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اعتماد اور یقین کرنے کے بجائے اپنے آپ پر کتاب نازل کیے جانے کا مطالبہ کرنا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کو براہ راست دیکھنے کا مطالبہ کرنا۔ ۳۔ بچھڑے کو معبود بنانا۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے پختہ عہد کو توڑنا۔
۵۔ سجدہ کرنے کی بجائے کلام اللہ کو بدلنا اور تمرد اختیار کرنا۔ ۶۔ ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنا۔ ۷۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنا۔
۸۔ انبیاء (علیہ السلام) کو ناحق قتل کرنا۔ ۹۔ تعصب اور حسد کی وجہ سے اپنے دلوں کو ملفوف قرار دینا۔
۱۰۔ حضرت مریم [پر بدکاری کا الزام لگانا۔ ۱۱۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کا دعوی کرنا۔ (فہم)

یہ حقیقت حال ہے کہ اگر سوال طلب رشد کے لیے ہوتا تو پورا کر دیا جاتا مگر وہ تو کسی صورت میں ایمان لانے والے ہی نہ تھے۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) سے علانیہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا بھی مطالبہ کیا گیا جس پر صاعقہ محرقہ سے جلا دیئے گئے اور پھر زندہ کئے گئے مگر وہ کافر کے کافر ہی رہے پھر بچھڑا پوجنے پر اتر آئے پھر توبہ کے بعد انھیں معافی دی گئی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی صداقت پر واضح الدلالت تھے اور باوجودیکہ ہم نے توراۃ یکبارگی ہی نازل کی تھی خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ بجائے اطاعت کرنے کے انھوں نے خدا کے دیکھنے کا سوال کر دیا۔ آخر ش اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قصور معاف کر دیا۔ (روح المعانی)

قطع نظر اس کے یہ سوال بھی معقول نہ تھا اس لیے کہ جسے دیکھنا چاہتے تھے وہ یدرک الابصار ہے نہ کہ ابصار اس کا احاطہ کر سکتی ہیں قرآن کریم میں فرمایا گیا لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار دوسرے وہ ذات والا صفات وہ ہے جس نے اپنے تقرب کو نحن اقرب الیہ من حبل الورید کہہ کر ظاہر فرمایا تو جو اقرب من حبل الورید ہے اس کا نظر آنا اقرب من حبل الورید کے دعویٰ کو رد کرنا ہے پھر مشاہدہ ہے کہ ہماری نظر تو قریب کے دیکھنے سے بھی قاصر ہے تو اقرب کا مشاہدہ کیونکر کر سکتی ہے۔ روح انسان، انسان کے اندر ہے مگر باصرہ انسان اس کے مشاہدہ پر قادر نہیں۔ آنکھ، ناک، کان، سر یہ انسان کے جسم میں قریب ہیں۔ لیکن باصرہ اس کے دیکھنے سے قاصر ہے۔ سرمہ جب تک بعید من الانسان رہتا ہے باصرہ اسے دیکھتا ہے مگر جب وہ سرمہ چشم انسان میں چلا جاتا ہے اور اقرب ہو جاتا ہے تو نظر سے نظر نہیں آتا البتہ جب آنکھ کا سرمہ کوئی دیکھنا چاہے تو شیشہ لاتا ہے اس میں اس کا پر تو دیکھ لیتا ہے اسی طرح جو ذات باری کو دیکھنا چاہے وہ آئینہ جمال حق ذات مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھ یتومن رانی فقد رای الحق کے نشان پا کر جلوہ حق دیکھ لے گا۔ فاخذ تھم الصعقۃ۔ تو کڑک نے ان کو پکڑ لیا یعنی آسمان سے آگ آئی اور ان کو ہلاک کر گئی۔ غرضیکہ ضدی، ہٹیلے، ہٹ دھرم، گمراہ، بے دین، جاہل، باغی ایسے سوالات غیر معقول کرتے اور کفر و طغیان میں پڑتے ہیں۔ ان کا مقصد قبول حق ہر گز نہیں ہوتا آگے ارشاد ہے۔ واتینا موسیٰ سلطنا مبیناً۔ اور ہم نے موسیٰ کو روشن غلبہ دیا۔ وہ غلبہ یہی تھا کہ جب بنی اسرائیل کی توبہ کے لیے انھیں خود ان کے قتل کا حکم دیا تو وہ انکار نہ کر سکے اور پیروی کرنی پڑی۔ (روح المعانی)

(حسنات)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ یہود کی سرکشی اور عناد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر انھوں نے واضح دلائل آنے کے باوجود بچھڑے کو معبود بنالیا ' ان واضح دلائل سے مراد آسمانی بجلی ہے جو اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں پر گری اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر زندہ کر دیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے تام اور کامل ہونے پر دلالت ہوتی ہے اور اسی پر مدار الوہیت ہے اور اس میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت پر دلیل ہے کہ ان کی دعا سے وہ دوبارہ زندہ کر دیئے گئے ' بظاہر آسمانی بجلی ایک دلیل ہے لیکن یہ کئی دلائل کو متضمن ہے ' اس کے علاوہ انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا دیکھا ' ید بیضا دیکھا ' سمندر کو چیر کر اس میں بارہ رستوں کو بنانا دیکھا ' ان کے تعاقب میں آنے والے فرعون اور ان کے لشکر کا ان ہی راستوں میں ڈوبنا دیکھا ان تمام معجزات کو دیکھنے کے بعد انھوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنالیا اور اس کی پرستش کی ' تو اے رسول مکرم آپ سے ان کا یہ مطالبہ کرنا کہ ان کے پاس آسمان سے لکھی ہوئی کتاب آئے انشراح صدر کے لیے نہیں ہے یہ ان کی وہ سرکشی اور ہٹ دھرمی ہے جو ان میں نسل در نسل چلی آرہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی گوسالہ پرستی کی سزا میں ' میں نے ان کو بالکل صفحہ ہستی سے نہیں مٹا دیا بلکہ ان کی سرکشی اور عناد کے باوجود ان کو معاف کر دیا اور ہم نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو کھلا غلبہ عطا فرمایا یعنی ان کی قوم کو ان

کے مخالفین پر غلبہ عطافرمایااس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے یہ رمزاور بشارت ہے کہ اگرچہ کفار آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور آپ کے خلاف معاندانہ کاروائیوں میں مصروف ہیں لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ اور فتح عطافرمائے گا۔(تبیان)

مسائل

۱۔بے مقصد سوال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

۲۔اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کرنا پرلے درجے کی گستاخی ہے۔

۳۔اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو واضح دلائل عطافرمائے۔

۴۔اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو بار بار معاف کیا۔

آیت مبارکہ:

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾

لغۃ القرآن: [وَرَفَعْنَا : اور ہم نے بلند کیا][فَوْقَهُمُ : ان پر][الطُّوْرَ : طور][بِمِيْثَاقِهِمْ : ان سے پختہ عہد لینے کے لیے][وَقُلْنَا : اور ہم نے کہا][لَهُمُ : ان کے لیے][ادْخُلُوا : تم داخل ہوجاؤ][الْبَابَ : دروازے (میں)][سُجَّدًا : سجدہ کرتے ہوئے][وَّقُلْنَا : اور ہم نے کہا][لَهُمْ : ان کے لیے][لَا : نہ][تَعْدُوْا : تم زیادتی کرو][فِي : میں][السَّبْتِ : ہفتہ کے دن][وَاَخَذْنَا : اور ہم نے لیا][مِنْهُمْ : ان سے][مِّيْثَاقًا : عہد][غَلِيْظًا : پکا]

ترجمہ: اور (جب یہود توراۃ کے احکام سے پھر انکاری ہوگئے تو) ہم نے ان سے (پختہ) عہد لینے کے لیے (کوہ) طور کو ان کے اوپر اٹھا (کر معلّق کر) دیا، اور ہم نے ان سے فرمایا کہ تم (اس شہر کے) دروازے (یعنی باب ایلیاء) میں سجدہ (شکر) کرتے ہوئے داخل ہونا، اور ہم نے ان سے (مزید) فرمایا کہ ہفتہ کے دن (مچھلی کے شکار کی ممانعت کے حکم) میں بھی تجاوز نہ کرنا اور ہم نے ان سے بڑا تاکیدی عہد لیا تھا۔

تشریح:

یہاں اہل کتاب سے مراد صرف یہودی ہیں جو کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے پختہ اقرار کرنے کے باوجود اپنے عہد سے منحرف ہوگئے فتح ایلیاء یعنی بیت المقدس کی کامیابی کے وقت انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ تم اللہ کے حضور سجدہ کرتے اور معافی مانگتے ہوئے شہر کے دروازے میں داخل ہونا۔ لیکن انھوں نے نہ صرف استکبار اور جور واستبداد کا مظاہرہ کیا بلکہ سرے سے ہی فرمان الٰہی حِطَّۃٌ کو حِنْطَۃٌ میں تبدیل کر دیا، جب انھیں ہفتہ کے دن میں عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے مچھلیاں پکڑنے کے لیے حیلہ بازی سے کام لیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی آیات کا مسلسل انکار کرنے اور انبیائے کرام (علیہ السلام) کو ناحق قتل کرنے کے سنگین جرم میں ملوث ہوئے، جب انھیں ان جرائم سے باز رہنے کی تلقین کی جاتی تو دنیاوی مفادات کے حصول اور طبعی رعونت کی بنا پر انبیاء اور صالحین کو جواب دیتے کہ ہمیں تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں جس کا دوسرا معنی یہ تھا کہ تم جس قدر چاہو ہمیں سمجھاؤ۔ ہم اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اس طرح حق کے مقابلہ میں تعصب کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ جس تعصب اور رعونت پر وہ فخر کرتے تھے وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے غضب کا نتیجہ تھا۔ جس وجہ سے ان کے دلوں پر کفر کی مہریں ثبت کر دی گئیں اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے حضرت مریمؑ [جیسی پاکدامنہ خاتون پر بدکاری کا سنگین الزام عائد کیا اور اب تک یہودی ایسی یاوا گوئی کرتے ہیں۔ اسی لیے یہودیوں میں بہت کم لوگ اسلام قبول کرتے ہیں۔ (فہم)

یہود کی سرکشی

یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ توراۃ کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے اور اس وقت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی فرمان بر داری سے بیزاری ظاہر کی تو ان کے سروں پر طور پہاڑ کو معلق کھڑا کر دیا اور ان سے کہا کہ اب بولو ! پہاڑ گرا کر پاش پاش کر دیں یا احکام قبول کرتے ہو ؟

ورفعنا فوقھم الطور بمیثاقھم "اس آیت میں یہودیوں کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے عہد لیتے وقت ہم نے طور پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کیا تھا بعض مفسرین اس کی غلط تاویل کرتے ہیں کہ پہاڑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے سروں پر نہیں کھڑا کیا گیا تھا بلکہ ان لوگوں کو پہاڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا تھا کہ پہاڑ کا کچھ حصہ ان پر جھکا ہوا تھا یہ بالکل غلط ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ جب ہم نے پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کیا۔ "نَتَقْ "کا معنی ہے : اکھاڑنا، اور مطلب صاف ظاہر ہے کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے اوپر لا کھڑا کیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانتے تو یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا اور تم چکنا چور ہو جاؤ گے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی جائز نہیں اللہ تعالیٰ کا حکم واضح طور پر موجود ہے کہ "لااکراہ فی الدین "دین میں زبردستی نہیں۔ مگر یہودیوں کو پہاڑ کے خوف سے زبردستی منوایا گیا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی ملی اور صحرائے سینا میں پہنچے تو انہوں نے خود حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کوئی قانون کی کتابیں لائے جس پر ہم عمل کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اپنا قانون کی شکل میں اتارا تورات کا معنی ہی قانون (Law) ہے۔ جب کتاب آگئی تو کہنے لگے اس کے حکم بڑے مشکل ہیں ہم ان پر عمل نہیں کر سکیں گے بہر حال اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ اس لیے کیا تھا کہ ایک چیز انہوں نے خود مانگ کر لی ہے اور اب اس پر عمل کرنے سے منہ موڑ رہے ہیں۔

"وقلنا لھم ادخلوا الباب سجدا "یہ ایسے بدعہد اور بدخصلت لوگ ہیں کہ ہم نے ان سے کہا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا مگر انہوں نے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جب یہودیوں نے کہا کہ ہم صرف ایک ہی قسم کے کھانے یعنی "من و سلوی "پر صبر نہیں کر سکتے

لہٰذا ہمارے لیے اپنے رب سے سبزیاں پیاز اور دال وغیرہ کا مطالبہ کیجئے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں کہو کہ اس شہر ایلیا کی بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ وہاں تمہیں مانگی ہوئی چیزیں حاصل ہوں گی البتہ یہ کہ شہر میں سجدہ کرتے ہوئے یعنی جھکتے ہوئے داخل ہونا مگر یہ ایسے بد خصلت لوگ تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف جھکنے کی بجائے اکڑ کر داخل ہوئے۔ صحیح (بخاری و مسلم) کی روایت میں آتا ہے کہ سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے تاکہ جھکنا نہ پڑے۔ (ربانی)

سجدے کے حکم کی نافرمانی

یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہوں سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے انھوں نے سجدہ کے بدلے سرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کیا۔ جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں قریب ستر ہزار کے مر گئے۔

ہفتہ والے حکم کی نافرمانی

یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں بکثرت نظر آتیں۔ یہودیوں نے یہ حیلہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بنائے۔ ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند کر رکھتے پھر دوسرے دن حوضوں میں سے شکار کرتے۔ اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر کر دیا جو جانوروں میں بہت خسیس اور مکار ہے۔ (گلدستہ)
ایسے لوگ دنیا کی عزت۔ مال و دولت اور فوج و لشکر ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ عالم غیب کے قائل نہیں ہوتے ظاہری چیزوں ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ اللہ رسول اور ان کے احکام ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ نہ اللہ کی کتابوں کو مانتے ہیں۔ نہ اس کے فرشتوں کی کوئی حقیقت سمجھتے ہیں۔ آخرت کے حساب کتاب کو گھڑی ہوئی بات قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کو للہ کے مقرر کیے ہوئے قوانین کے مطابق پوری پوری سزا دینا اور آخرت میں مل کر رہے گی۔

احکام و مسائل

مسئلہ: کسی شخص کو دین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا جس کا دل چاہے ایمان لائے اور نہ چاہے تو کفر پر اڑا رہے اسے اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اگر کفر کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا خلاصہ یہ کہ اسے زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا البتہ اگر اسلام لانے کے بعد کوئی شخص اس کے حکموں کو نہ مانے تو اس پر شرعی سزائیں نافذ ہوں گی بہر حال دین میں داخل کرنے کے لئے تو زبردستی جائز نہیں بلکہ دین کا قانون توڑنے پر زبردستی کرنا جائز ہے اور یہ اس آیت کے خلاف نہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو عاجزی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔
۲۔ بنی اسرائیل عہد شکن قوم ہے۔
۳۔ یہودی انبیاء کے قاتل ہیں۔
۴۔ آدمی کی بار بار سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

آیت مبارکہ:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

لغۃ القرآن: [فَبِمَا : تو بوجہ][نَقْضِهِمْ : ان کے توڑنے کے][مِّيْثَاقَهُمْ : اپنے عہد کو][وَكُفْرِهِمْ : اور ان کا کفر کرنا][بِاٰيٰتِ : آیات کے ساتھ][اللّٰهِ : اللہ کی][وَقَتْلِهِمُ : اور ان کا قتل کرنا][الْاَنْۢبِيَآءَ : انبیاء کو][بِغَيْرِ : بغیر][حَقٍّ : حق][وَّقَوْلِهِمْ : اور ان کا کہنا][قُلُوْبُنَا : ہمارے دل][غُلْفٌ: پردوں (میں ہیں)][بَلْ : بلکہ][طَبَعَ : مہر لگادی][اللّٰهُ : اللہ نے][عَلَيْهَا : ان پر][بِكُفْرِهِمْ : بوجہ ان کے کفر کے][فَلَا : سو نہیں][يُؤْمِنُوْنَ : وہ ایمان لائیں گے][اِلَّا قَلِيْلًا : مگر تھوڑے]

ترجمہ: پس (انہیں جو سزائیں ملیں وہ) ان کی اپنی عہد شکنی پر اور آیات الٰہی سے انکار (کے سبب) اور انبیاء کو ان کے ناحق قتل کر ڈالنے (کے باعث)، نیز ان کی اس بات (کے سبب) سے کہ ہمارے دلوں پر غلاف (چڑھے ہوئے) ہیں، (حقیقت میں ایسا نہ تھا) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے باعث ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، سو وہ چند ایک کے سوا ایمان نہیں لائیں گے۔

تشریح: یہاں سے اہل کتاب کے جرائم کی ایک فہرست اور اس پر غضب الٰہی عَزَّوَجَلَّ کا بیان شروع ہے۔ یہودیوں کے جرائم کی فہرست طویل ہے۔ اس آیت اور اس سے اگلی آیات میں ان کے نصف درجن سے زائد جرائم بیان کئے گئے ہیں:

یہود پر عذاب کے اسباب

یعنی یہود نے اس عہد کو توڑ دیا تو حق تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور آیات الٰہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء (علیہم السلام) کے ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل تو غلاف میں ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط فرمائے۔ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے ہمارے دل پردہ میں ہیں تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ کفر کے سبب ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے جس کے باعث ان کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔

انکار عیسیٰ اور بہتان

یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے منکر ہو کر دوسرا کفر کمایا اور حضرت مریم پر طوفان عظیم باندھا اور ان کے اس قول پر کہ فخر سے کہتے تھے ہم نے مار ڈالا عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول اللہ تھا ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا

اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب فرماتا ہے کہ یہودیوں نے نہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا۔ یہود جو مختلف باتیں اس بارے میں کہتے ہیں اپنی اپنی اٹکل سے کہتے ہیں اللہ نے ان کو شبہ میں ڈال دیا۔ خبر کسی کو بھی نہیں واقعی بات یہ ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان پر اٹھالیا اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا عزم کیا تو پہلے ایک آدمی ان کے گھر میں داخل ہوا حق تعالیٰ نے ان کو تو آسمان پر اٹھالیا اور اس شخص کی صورت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی صورت کے مشابہ کردی جب باقی لوگ گھر میں گھسے تو اس کو مسیح سمجھ کر قتل کر دیا پھر خیال آیا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو مسیح کے چہرہ کے مشابہ ہے اور باقی بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے کسی نے کہا کہ یہ مقتول مسیح ہے تو ہمارا آدمی کہاں گیا اور ہمارا آدمی ہے تو مسیح کہاں ہے اب صرف اٹکل سے کسی نے کچھ کہا علم کسی کو بھی نہیں حق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہرگز مقتول نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اللہ نے اٹھالیا اور یہود کو شبہ میں ڈال دیا۔

یہود کو اشتباہ کس طرح پیش آیا؟

ولکن شبہ لھم کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے قتل کا ارادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہوگئے، حضرت مسیح (علیہ السلام) بھی ان کے پاس تشریف لے آئے، ابلیس نے یہود کے اس دستہ کو جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے قتل کے لیے تیار کھڑا تھا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا پتہ دیا اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے حواریین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لیے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کر دیا جائے اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو، ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا، آپ نے اس کو اپنا کرتہ، عمامہ عطا کیا، پھر اس پر آپ کی مشابہت ڈال دی گئی اور جب وہ باہر نکل آیا تو یہود اسے پکڑ کر لے گئے اور سولی پر چڑھا دیا، اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اٹھالیا گیا۔

مولانا سید ابو منصور امام فن مناظرہ، نوید جاوید ص 382 میں لکھتے ہیں اور قرآن مجید کے اس ترجمہ میں جس پر عیسائی علماء نے اپنے طور کا حاشیہ لکھا اور پریز بیٹرین مشن پریس آلہ آباد میں 1844ء کو چھاپا۔

نوید جاوید، کی عبارت:

ترجمہ آل عمران آیت ۵۳ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ زمانہ اسلام سے آگے عیسائیوں میں باسیلیدی ایک فرقہ تھا جو خیال کرتے تھے کہ آپ مسیح آپ مصلوب نہ ہوا پر شمعون قرینی جو صلیب اٹھا کر چل رہا تھا اس کے عوض پکڑا گیا اور مصلوب بھی ہوا پھر سر نہ تھی اور کار پوک راتی اور دوسیتی تین فرقے تھے جو زمانہ اسلام سے پیشتر یہی خیال رکھتے تھے انتہی وتم کلامہ نوید جاوید۔ ص ۳۸۲)

گناستی فرقہ کا خیال

گناستی فرقہ کے عیسائیوں کا یہ قول تھا کہ دنیا مادہ سے پیدا ہوئی اور مادہ کے لیے شرارت اور معصیت ضرور ہے اور مسیح مادہ سے پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے مصلوب نہیں ہو سکا کیونکہ اس کا جسم نہ تھا چنانچہ تعلیم الایمان چھاپہ لدھیانہ ۱۸۶۹ص ۲۳۶۔

کتاب تعلیم الایمان کا حوالہ:

صفحہ 136 لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں ایک فرقہ نے یہ گمان کیا کہ مسیح کا حقیقی جسم نہ تھا اور نہ وہ پیدا ہوا نہ اس نے دکھ اٹھایا پر اس کا جسم ایک مجازی طور پر تھا جیسا کہ فرشتے اکثر اوقات انسانیت کو اختیار کر لیتے تھے یا جیسا کہ روح کبوتر کی مانند اتری تھی چنانچہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اسی تعلیم کو اختیار کر کے اپنے تابعین کو تلقین کی کہ مسیح خود نہیں مارا گیا انتہ

پادری اسمتھ کی گواہی:

اور دیکھو رومن تواریخ کلیسا چھاپہ مرزا پور ۱۸۵۶ص ۹۶ دین حق کی تحقیق مصنفہ پادری اسمتھ صاحب وغیرہ مطبوعہ الہ آباد ارفن پریس ص ۸۸ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ مسیح کا احوال کس طرح وہ ہندولے میں بولا مٹی کی چڑیاں بنائیں اور یہودیوں کو بندر بنایا اور یہ کہ نہیں مارا گیا بلکہ دوسرا اس کے عوض مصلوب ہوا یہ باتیں اس نے یعنی محمد رسول اللہ نے ناصریوں کے قصے سے نکالیں جن کو دو تین شخصوں نے مسیح کو چار یا پانچ سو برس بعد بنایا تھا انتہی۔

انجیل برنباس کی شہادت

اور برنباس کی انجیل میں مسیح نے اپنی مصلوبی کا بطلان صاف بیان کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ میں صلیب پر کھینچا گیا پر یہ ساری ہتک اور رسوائی محمد رسول اللہ کے آنے تک رہے گی جب وہ دنیا میں آئے گا تو ہر ایک ایمان دار کو اس غلطی سے آگاہ کر دے گا اور یہ دھوکا لوگوں کے دل سے اٹھا دے گا انتہی ترجمہ قرآن شریف مصنفہ سیل صاحب صفحہ ۴۳، انتہ

نوید جاوید کی عبارت

دیکھو (نوید جاوید ص ۳۸۳) اور دیکھو دلیل ثانی عشر از کتاب الفارق ص ۲۸۹)۔

۔اے نصاری خدارا یہ تو بتلاؤ کہ کیا خدا کو بھی مجبوری لاحق ہو سکتی ہے اور کیا سولی پر چلا کر دم دیدینا خدا کی شان کے شان شایان ہے۔

حضرت عیسیٰ خدا کا ایک بندہ تھا:

انجیل لوقا باب ہشتم آیت ۲۲ و ۲۳ میں ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اور اس کے شاگرد کشتی پر چڑھے اور اس نے ان سے کہا کہ آو جھیل کے پار چلیں پس وہ روانہ ہوئے مگر جب کشتی چلی جاتی تھی تو وہ سو گیا اور جھیل پر بڑی آندھی آئی اور کشتی پانی سے بھری جاتی تھی اور وہ خطرے میں تھے اور انھوں نے پاس آکر اسے جگایا اور کہا کہ صاحب ہم ہلاک ہوئے جاتے ہیں۔

(1) پس مسیح اگر خدا ہوتے تو اس قدرے بیخبر نہیں ہو سکتا اور نہ اس پر نیند طاری ہو سکتی ہے۔

(2) 2۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو باوجود صاحب جسم و صاحب لحم و دوم ہونے کے خدا اور خالق عالم ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ رب معبود کا کچھ حصہ تو قدیم اور ازلی ہے اور کچھ حصہ مخلوق اور احادیث ہے اس لیے کہ جسم اور لحم دم بلا شبہ مخلوق اور احادیث ہے اور بقول نصاری اندر کی روح قدیم ہے۔

(3) 3۔ نیز انصاری ایک طرف تو حضرت عیسیٰ کو ساری دنیا کا خالق مانتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ دنیا کا ایک جز تھے تو نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کا یہ خالق بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔

(4) 4۔ نیز انجیل سے یہ ثابت ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے بال بھی کٹواتے تھے اور ناخن ترشواتے تھے جو زمین میں گر کر لاشی بن جاتے تھے تو نصاری کے مذہب پر نتیجہ یہ نکلے گا کہ خالق ازلی کے بعض اجزاء کا کٹ جانا اور کٹ کر زمین میں مل جانا اور پھر ان کا فنا ہو جانا سب جائز ہے۔

(5) 5۔ نیز نصاری کے نزدیک یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے پیدا ہونے کے بعد بتدریج کی نشو و نما پایا اور ان کے طول و عرض میں زیادتی ہوئی حتی کہ جوان ہوئے۔

یہودیوں شبہ میں کیسے پڑے:

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت دے کر بھیجا اور آپ کے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے دکھائے مثلاً بچپن کے اندھوں کو بینا کرنا، کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مٹی کے پرند بنا کر پھونک مارنا اور ان کا جاندار ہو کر اڑ جانا وغیرہ تو یہودیوں کو سخت طیش آیا اور مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور ہر طرح سے ایذاء رسانی شروع کر دی، آپ کی زندگی تنگ کر دی، کسی بستی میں چند دن آرام کرنا بھی آپ کو نصیب نہ ہوا، ساری عمر جنگلوں اور بیابانوں میں اپنی والدہ کے ساتھ سیاحت میں گذاری، پھر بھی انھیں چین نہ لینے دیا۔

اور بادشاہ کو حضرت عیسیٰ کے خلاف اکسایا اور کہا کہ یہ شخص بڑا مفسد ہے۔ لوگوں کو بہکا رہا ہے، روز نئے فتنے کھڑے کرتا ہے، امن میں خلل ڈالتا ہے۔ لوگوں کو بغاوت پہ اکساتا ہے وغیرہ۔ بادشاہ نے اپنے گورنر کو جو بیت المقدس میں تھا، ایک فرمان لکھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرلے اور سولی پر چڑھا کر اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر لوگوں کو اس دکھ سے نجات دلوائے۔ اس نے فرمان شاہی پڑھ کر یہودیوں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ لے کر اس مکان کا محاصرہ کرلیا جس میں روح اللہ تھے، آپ کے ساتھ اس وقت بارہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ سترآدمی تھے، جمعہ کے دن عصر کے بعد اس نے محاصرہ کیا اور ہفتہ کی رات تک مکان کو گھیرے میں لیے رہا جب حضرت عیسیٰ نے یہ محسوس کرلیا کہ اب وہ مکان میں گھس کر آپ کو گرفتار کرلیں گے یا آپ کو خود باہر نکلنا پڑے گا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس پر میری مشابہت ڈال دی جائے یعنی اس کی صورت اللہ مجھ جیسی بنادے اور وہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہو اور مجھے اللہ مخلصی دے ؟ میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔ اس پر ایک نوجوان نے کہا مجھے یہ منظور ہے لیکن حضرت عیسیٰ نے انھیں اس قابل نہ جان کر دوبارہ یہی کہا، تیسری دفعہ بھی کہا مگر ہر مرتبہ صرف یہی تیار ہوئے (رض)۔ اب آپ نے یہی منظور فرمالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صورت قدرتاً

بدل گئی بالکل یہ معلوم ہونے لگا کہ حضرت عیسیٰ یہی ہیں اور چھت کی طرف ایک روزن نمودار ہو گیا اور حضرت عیسیٰ کی اونگھ کی حالت ہو گئی اور اسی طرح وہ آسمان پر اٹھالیے گئے۔

یہودیوں کی جماعت نے اس بزرگ صحابی کو جس پر جناب مسیح (علیہ السلام) کی شباہت ڈال دی گئی تھی، عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیا اور راتوں رات اسے سولی پر چڑھا کر اس کے سر کانٹوں کا تاج رکھ دیا، اب یہود خوشیاں منانے لگے۔ وہ لوگ جو مسیح (علیہ السلام) کے ساتھ اس مکان میں تھے ، اور جنہیں یقینی طور پر معلوم تھا کہ مسیح آسمان پر چڑھا لیے گئے اور یہ فلاں شخص ہے جو دھوکے میں ان کی جگہ شہید ہو گیا باقی عیسائیوں بھی یہودیوں کی سی راگنی الاپنے لگے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نازل ہونا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری علیہ رحمتہ والرضوان کتاب ذکر انبیاء میں یہ حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے۔ عادل منصف بن کر صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیہ ہٹا دیں گے۔ مال اس قدر بڑھ جائے گا کہ اسے لینا کوئی منظور نہ کرے گا، ایک سجدہ کر لینا دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے محبوب تر ہو گا۔

صحیح بخاری میں ہے اس وقت کیا ہو گا، جب تم میں مسیح بن مریم اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہو گا۔ ابو داؤد، مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انبیاء کرام (علیہم السلام) سب ایک باپ کے بیٹے بھائی کی طرح ہیں، مائیں جدا جدا اور دین ایک۔ عیسیٰ بن مریم سے زیادہ تر نزدیک میں ہوں اس لیے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی اور نبی نہیں، یقیناً وہ اترنے والے ہیں پس تم انھیں پہچان رکھو۔ درمیان قد ہے، سرخ سفید رنگ ہے۔ وہ دو گیروے رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے اوڑھے اور باندھے ہوں گے، بال خشک ہونے کے باوجود ان کے سر سے قطرے ٹپک رہے ہوں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ قبول نہ کریں گے، لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں گے، ان کے زمانے میں تمام ملتیں مٹ جائیں گی، صرف اسلام ہی اسلام رہے گا، ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو ہلاک کرے گا۔ پھر زمین پر امن ہی امن ہو گا یہاں تک کہ کالے ناگ اونٹوں کے ساتھ، چیتے گایوں کے ساتھ اور بھیڑیئے بکریوں کے ساتھ چرتے پھریں گے اور بچے سانپوں سے کھیلیں گے، انھیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے، چالیس برس تک ٹھہریں گے، پھر فوت ہوں گے اور مسلمان آپ کے جنازے کی نماز ادا کریں گے۔

صحیح مسلم میں ہے قیامت قائم نہ ہو گی، جب تک رومی اعماق یا وابق میں نہ اتریں اور ان کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے مسلمانوں کا لشکر نہ نکلے گا، جو اس وقت تمام زمین کے لوگوں سے زیادہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہوں گے، جب صفیں بندھ جائیں گی تو رومی کہیں گے تم سے ہم لڑنا نہیں چاہتے، ہم میں سے جو دین بدل کر تم میں ملے ہم ان سے لڑنا چاہتے ہیں تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ لیکن مسلمان کہیں گے واللہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم اپنے ان کمزور بھائیوں کو تمہارے حوالے کر دیں۔ چنانچہ لڑائی شروع ہو گی مسلمانوں کے اس لشکر کا تہائی حصہ تو شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہو گا، ان کی توبہ اللہ تعالیٰ ہر گز قبول نہ فرمائے گا اور تہائی حصہ شہید ہو جائے گا، جو اللہ کے نزدیک سب سے افضل شہید ہیں لیکن آخری تہائی حصہ فتح حاصل کرے گا اور رومیوں پر غالب آ جائے گا، پھر یہ کسی فتنے میں نہ پڑیں گے، قسطنطنیہ کو فتح کریں گے، ابھی تو وہ اپنی تلواریں زیتون کے درختوں پر لٹکائے ہوئے مال غنیمت تقسیم کر ہی رہے ہوں گے جو شیطان چیخ کر کہے گا کہ تمہارے بال بچوں میں دجال آ گیا، اس کے اس

جھوٹ کو سچ جان کر مسلمان یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے، شام میں پہنچیں گے، دشمنوں سے جنگ آزما ہونے کے لیے صفیں ٹھیک کر رہے ہوں گے کہ دوسری جانب نماز کی اقامت ہو گی اور حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے، ان کی امامت کرائیں گے، جب دشمن رب انھیں دیکھے گا تو اسی طرح گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اسے یونہی چھوڑ دیں، جب بھی وہ گھلتے گھلتے ختم ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اسے آپ کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور آپ اپنے حربے پر اس کا خون لوگوں کو دکھائیں گے۔

دجال

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ایک خطبہ کا کم و بیش حصہ دجال کا واقعہ بیان کرنے اور اس سے ڈرانے میں ہی صرف کیا، جس میں یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی ابتداء سے لے کر انتہا تک کوئی فتنہ اس سے بڑا نہیں، تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کو اس سے آگاہ کرتے رہے ہیں، میں سب سے آخری نبی ہوں اور تم سب سے آخری امت ہو، وہ یقیناً تمہیں میں آئے گا، اگر میری موجودگی میں آگیا تو میں آپ اس سے نمٹ لوں گا اور اگر بعد میں آیا تو ہر شخص کو اپنے آپ کو اس سے بچانا پڑے گا۔ میں اللہ تعالیٰ کو ہر مسلمان کا خلیفہ بناتا ہوں۔ وہ شام و عراق کے درمیان نکلے گا، دائیں بائیں خوب گھومے گا، لوگو اے اللہ کے بندو! دیکھو دیکھو تم ثابت قدم رہنا، سنو میں تمہیں اس کی ایسی صفت بتاتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں بتائی۔ وہ ابتداء میں دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں، پس تم یاد رکھنا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، پھر وہ اس سے بھی بڑھ جائے گا اور کہے گا میں اللہ ہوں، پس تم یاد رکھنا کہ اللہ کو ان آنکھوں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا، ہاں مرنے کے بعد دیدار باری تعالیٰ ہو سکتا ہے اور سنو وہ کانا ہو گا اور تمہارا رب کانا نہیں، اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہو گا جسے پڑھا لکھا اور ان پڑھ غرض ہر ایمان دار پڑھ لے گا۔ اس کے ساتھ آگ ہو گی اور باغ ہو گا اس کی آگ دراصل جنت ہو گی اور اس کا باغ دراصل جہنم ہو گا، سنو تم میں سے جسے وہ آگ میں ڈالے، وہ اللہ سے فریاد رسی چاہے اور سورۃ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے، اس کی وہ آگ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جائے گی جیسے کہ خلیل اللہ پر نمرود کی آگ ہو گئی، اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہو گا کہ وہ ایک اعرابی سے کہے گا کہ اگر میں تیرے مرے ہوئے باپ کو زندہ کر دوں تو تو مجھے رب مان لے گا وہ اقرار کرے گا، اتنے میں دو شیطان اس کی ماں اور باپ کی شکل میں ظاہر ہوں گے اور ان سے کہیں گے بیٹے یہی تیرا رب ہے تو اسے مان لے، اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہو گا کہ وہ ایک شخص پر مسلط کر دیا جائے گا اسے آرے سے چروا کر دو ٹکڑے کروا دے گا، پھر لوگوں سے کہے گا میرے اس بندے کو دیکھنا اب میں اسے زندہ کر دوں گا، لیکن پھر بھی یہی کہے گا کہ اس کا رب میرے سوا اور ہے، چنانچہ یہ اسے اٹھا بیٹھائے گا اور یہ خبیث اس سے پوچھے گا کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دے گا میرا رب اللہ ہے اور تو اللہ کا دشمن دجال ہے۔ اللہ کی قسم اب تو مجھے پہلے سے بھی بہت زیادہ یقین ہو گیا۔ دوسری سند سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ مومن میری تمام امت سے زیادہ بلند درجہ کا جنتی ہو گا۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) فرماتے ہیں اس حدیث کو سن کر ہمارا خیال تھا کہ یہ شخص حضرت عمر بن خطاب ہی ہوں گے آپ کی شہادت تک ہمارا یہی خیال رہا۔

دجال اور حضرت عیسیٰ کا مقابلہ

ام شریک (رض) نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دن عرب کہاں ہوں گے؟ فرمایا اولاً تو ہوں گے ہی بہت کم اور اکثریت ان کی بیت المقدس میں ہوگی، ان کا امام پچھلے پیروں پیچھے ہٹے گا تاکہ آپ آگے بڑھ کر امامت کرائیں لیکن آپ اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے کہ آگے بڑھو اور نماز پڑھاؤ، اقامت تمہارے لیے کی گئی ہے پس ان کا امام ہی نماز پڑھائے گا، فارغ ہو کر آپ فرمائیں گے، دروازہ کھول دو، پس کھول دیا جائے گا، ادھر دجال ستر ہزار یہودیوں کا لشکر لیے ہوئے موجود ہوگا، جن کے سر پر تاج اور جن کی تلواروں پر سونا ہوگا، دجال آپ کو دیکھ کر اس طرح گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے اور ایک دم پیٹھ پھیر کر بھاگنا شروع کر دے گا لیکن آپ فرمائیں گے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تو میرے ہاتھ سے ایک ضرب کھائے تو اسے ٹال نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ اسے مشرقی باب لد کے پاس پکڑ لیں گے اور وہیں اسے قتل کریں گے، اب یہودی بدحواسی سے منتشر ہو کر بھاگیں گے لیکن انھیں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی، ہر پتھر ہر درخت ہر دیوار اور ہر جانور بولتا ہوگا کہ اے مسلمان یہاں یہودی ہے، آ اسے مار ڈال، ہاں ببول کا درخت یہودیوں کا درخت ہے یہ نہیں بولے گا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں اس کا رہنا چالیس سال تک ہوگا، سال آدھے سال کے برابر اور سال مہینہ بھر جیسا اور مہینہ جمعہ جیسا اور باقی دن مثل شرارہ کے۔ صبح ہی ایک شخص شہر کے ایک دروازے سے چلے گا، ابھی دوسرے دروازے تک نہیں پہنچا تو شام ہو جائے گی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ پھر ان چھوٹے دنوں میں ہم نماز کیسے پڑھیں گے؟ آپ نے فرمایا اندازہ کر لیا کرو جیسے ان لمبے دنوں میں اندازہ سے پڑھا کرتے تھے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں پس عیسیٰ بن مریم میری امت میں حاکم ہوں گے، عادل ہوں گے، امام ہوں گے، باانصاف ہوں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو ہٹادیں گے صدقہ چھوڑ دیا جائے گا پس بکری اور اونٹ پر کوشش نہ کی جائے گی، حسد اور بغض بالکل جاتا رہے گا، ہر زہریلے جانور کا زہر ہٹادیا جائے گا، بچے اپنی انگلی سانپ کے منہ میں ڈالیں گے لیکن وہ انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا، شیروں سے لڑکے کھیلیں گے نقصان کچھ نہ ہوگا، بھیڑئے بکریوں کے گلے میں اس طرح پھریں گے جیسے رکھوالا کتا ہو۔

قیامت کی دس علامتیں

مسند میں ہے کہ عرفہ سے آتے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ کے ایک مجمع کے پاس سے گذرے اس وقت وہاں قیامت کے ذکر اذکار ہو رہے تھے تو آپ نے فرمایا جب تک دس باتیں نہ ہولیں، قیامت قائم نہ ہوگی، آفتاب کا مغرب کی جانب سے نکلنا، دھوئیں کا آنا، دابتہ الارض کا نکلنا، یاجوج ماجوج کا آنا، عیسیٰ بن مریم کا نازل ہونا، دجال کا آنا، تین جگہ زمین کا دھنس جانا، شرق میں، غرب میں اور جزیرہ عرب میں اور عدن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہنکا کر ایک جگہ کر دے گی وہ شب باشی بھی انہی کے ساتھ کریں گے اور جب دوپہر کو وہ آرام کریں گے یہ آگ ان کے ساتھ ٹھہری رہے گی۔ یہ حدیث مسلم اور سنن میں بھی ہے۔

جامع دمشق

صبح کی نماز کی اقامت کے وقت شام کے شہر دمشق کے شرقی مینارہ پر آپ اتریں گے۔اس زمانہ میں یعنی سن سات سو اکتالیس میں جامع اموی کا مینارہ سفید پتھر سے بہت مضبوط بنایا گیا ہے، اس لیے کہ آگ کے شعلہ سے یہ جل گیا ہے آگ لگانے والے غالباً ملعون عیسائی تھے کیا عجب کہ یہی وہ مینارہ ہو جس پر مسیح بن مریم (علیہ السلام) نازل ہوں گے۔

معراج کی رات انبیاء سے ملاقات

بخاری مسلم میں ہے کہ لیلتہ المعراج میں میں نے حضرت موسیٰ سے ملاقات کی وہ درمیانہ قد صاف بالوں والے ہیں، جیسی شنوہ قبیلے کے لوگ ہوتے ہیں اور حضرت عیسیٰ سے بھی ملاقات کی، وہ سرخ رنگ میانہ قد ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابھی حمام سے نکلے ہیں، حضرت ابراہیم کو بھی میں نے دیکھا بس وہ بالکل مجھ جیسے تھے۔ بخاری کی اور روایت میں ہے حضرت عیسیٰ سرخ رنگ، گھنگریالے بالوں والے، چوڑے چکلے سینے والے تھے، حضرت موسیٰ گندمی رنگ کے جسم اور سیدھے بالوں والے تھے، جیسے زط کے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح آپ نے دجال کی شکل وصورت بھی بیان فرمادی ہے کہ اس کی داہنی آنکھ کانی ہو گی، جیسے پھولا ہوا انگور، آپ فرماتے ہیں مجھے کعبہ کے پاس خواب میں دکھلایا گیا کہ ایک بہت گندمی رنگ والے آدمی جن کے سر کے پٹھے دونوں کندھوں تک تھے، صاف بالوں والے جن کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، دو شخصوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے طواف کر رہے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ مسیح بن مریم ہیں، میں نے ان کے پیچھے ہی ایک شخص کو دیکھا جس کی داہنی آنکھ کانی تھی، ابن قطن سے بہت ملتا جلتا تھا، سخت الجھے ہوئے بال تھے، وہ بھی دو شخصوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے، میں نے کہا یہ کون ہے؟ کہا گیا یہ مسیح دجال ہے۔ بخاری کی اور روایت میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عیسیٰ کو سرخ رنگ نہیں بتایا بلکہ آپ نے گندمی رنگ بتایا ہے

وما قتلوہ وماصلبوہ ولکن شبہ لھم۔ اور انھوں نے عیسیٰ کو نہ قتل کیا نہ صلیب دی بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا۔ روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور آپ کی والدہ کو گالیاں دیں آپ نے ان کے لیے بددعا کی حضرت کی بددعا سے اللہ نے ان کی صورتیں بندروں اور سوروں کی طرح کر دیں اس پر سب یہودی آپ کے قتل پر متفق الرائے ہو گئے مگر اللہ نے آپ کو اطلاع دے دی کہ تم کو آسمان کی طرف اٹھالیا جائے گا۔

کلبی کی روایت سے حضرت ابن عباس (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے سردار یہودا نے ایک شخص کو جس کا نام طیطانوس تھا مقرر کیا تھا کہ گھر میں گھس کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر دے مگر اللہ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو اٹھالیا اور طیطانوس کی صورت عیسیٰ (علیہ السلام) جیسی بنادی جب وہ باہر نکل کر آیا تو لوگوں نے اس کو عیسیٰ سمجھ کر پکڑ کر مار ڈالا اور صلیب دے دی۔ بعض کا قول ہے کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایک مکان میں بند کر دیا تھا اور ایک چوکیدار نگرانی کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ اللہ نے اس چوکیدار کی صورت عیسیٰ جیسی کر دی اور لوگوں نے اسی کو قتل کر دیا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

چار وجوہ سے یہود کا کفر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے کفر کی چار وجوہ بیان فرمائی ہیں ' ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بار بار عہد شکنی کی ' دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کا کفر کیا۔ آیتوں سے مراد معجزات ہیں اور معجزہ کا انکار کرنا نبوت کا انکار ہے اور ایک نبی کا انکار تمام نبیوں کا انکار کیا جائے ' اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء (علیہم السلام) کا ناحق قتل کرتے تھے یہاں ناحق کے لفظ کو بطور تاکید ذکر فرمایا ہے ' کیونکہ نبی کو قتل کرنا ہوتا ہی ناحق ہے ' اور چوتھی وجہ ان کا یہ قول ہے کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں ' یعنی ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ' اس کی نظیر کافروں کا یہ قول ہے۔

(آیت) " وقالو قلوبنا فی اکنۃ مماتد عونا الیہ وفی اذ ننا ومن بیننا بینک حجاب "۔ (حم السجدۃ : ۵)

ترجمہ : اور انھوں نے کہا جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس پر ہمارے دلوں میں پردے پڑے ہوئے ہیں ' اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان پردہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے ' یعنی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں اور آپ کی بات ہم تک نہیں پہنچتی ' یہ بات نہیں ہے بلکہ تمہارے دل اس قابل نہیں ہیں کہ ہم اپنے معظم رسول کی بات تم تک پہنچنے دیں کیونکہ تم مسلسل کفر اور گستاخیاں کر کے اپنے دلوں کو ارشادات رسول سننے کا نااہل بنا چکے ہو ' اس لیے یہ نہ کہو کہ تم نہیں سنتے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ تم سننے کے اہل نہیں رہے ' اس کے بعد فرمایا تو وہ بہت ہی کم ایمان لائیں گے ' اس آیت کے تین محمل ہیں ' ایک محمل یہ ہے کہ وہ بہت ہی کم چیزوں پر ایمان لائیں گے ' یعنی صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور تورات پر ایمان لائیں گے اور باقی نبیوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان نہیں لائیں گے لیکن یہ ایمان بھی صرف ان کے زعم میں ہے حقیقت میں ایمان نہیں ہے ' کیونکہ ایک نبی کا انکار تمام نبیوں کا انکار ہے ' دوسرا محمل یہ ہے کہ وہ بہت ہی کم وقت کے لیے ایمان لائیں گے اور تیسرا محمل یہ ہے کہ ان میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لائیں گے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کی امثال۔

آیت مبارکہ:

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

لغۃ القرآن: [وَّبِكُفْرِهِمْ : اور بوجہ ان کے کفر کے][وَقَوْلِهِمْ : اور ان کا کہناکے][عَلٰي : پر][مَرْيَمَ : مریم][بُهْتَانًا : بہتان][عَظِيْمًا : بہت بڑا]

ترجمہ: اور (مزید یہ کہ) ان کے (اس) کفر اور قول کے باعث جو انھوں نے مریم (علیہا السلام) پر زبردست بہتان لگایا۔

تشریح: اب اس آیت کریمہ میں ان کے اسی بدترین قومی مزاج اور قابل نفرت رویہ کا ذکر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حوالہ سے کیا جارہاہے۔ کہ ان بدبختوں نے اللہ کے کسی نبی اور کسی رسول کے ساتھ بھی کبھی شرافت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اور اس پر حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ قتل جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب اور بڑے بڑے الزامات لگانے کی جرأت اس حال میں کی کہ یہ اس پیغمبر کے بارے میں یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ بے خبری میں کوئی شخص یا کوئی قوم کسی جرام کا ارتکاب کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نے بے خبری میں ایسا کیا ' اگر اسے حقیقت کا علم ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ لیکن ان بدبختوں کا حال تو یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کیا جان بوجھ کر اور علم کی پوری روشنی میں کیا۔ عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ان کے سامنے ہوئی۔ اور ان کی والدہ اور ان کے خاندان کی شرافت نسبی اور کرامت حسبی سے یہ پوری طرح آگاہ تھے۔ حضرت مریم سے بچپن سے جوان ہونے تک جو حیرت انگیز کرامات ظہور میں آتی رہیں یہ اس سے بھی واقف تھے۔ حضرت مریم ان کی نگاہوں میں ایک پاکیزہ عفیفہ اور مقدس خاتون تھیں۔ وہ جیسے ہی ان کے سامنے ایک نوازائیدہ بچے کو لے کے آئیں اور انھیں معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا بچہ ہے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی ' کیونکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ مریم کنواری لڑکی ہیں۔ انھوں نے انتہائی تعجب اور برہمی کے انداز میں کہا "یٰٓاُخْتَ ہٰرُوْنَ مَاکَانَ اَبُوْکِ امْرَاَسَوْئٍ وَّمَاکَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا" (اے ہارون کی بہن ! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدچلن تھی) تو نے یہ کیا حرکت کی ؟ اور کنوارپن میں یہ کس کے بچے کو جنم دیا۔
حضرت مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اسے ہی پوچھ لو۔ انھوں نے حیران ہو کر کہا کہ ایک نومولود سے ہم کیسے بات کریں ؟ اس پر قرآن کریم کہتا ہے ' جس سے زیادہ سچی کتاب دنیا میں کوئی نہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) گویا ہوئے اور اپنے پنگوڑھے سے بولے "اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا" (میں اللہ کا بندہ ہوں ' مجھے اللہ نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے) اس حیرت انگیز گواہی کے بعد زبانیں بند ہوگئیں اور لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس بچے کی پیدائش بغیر باپ کے ایک غیر معمولی معجزہ ہے۔ یہ بچہ نہ صرف کہ پاکیزہ ہے اور اس کی ماں ہر طرح کے گناہ سے پاک ہے بلکہ یہ اللہ کی ایک غیر معمولی نشانی ہے جسے اللہ نے بچپن میں نبوت دی ہے اور کتاب سے نوازا ہے اور اس کی ذات اور اس کی کتاب آگے چل کر دنیا کی ہدایت کا سامان بنے گی۔ چنانچہ اسی یقین اور اطمینان کے باعث تیس سال تک قوم یہود نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے اللہ کی طرف بلانا شروع کیا اور اپنی نبوت کی دعوت دینا شروع کی اور یہود کے احبار و رحبان کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا اور ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاریوں اور بداعمالیوں پر ملامت اور ان کی عوام و خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہوگئے تھے تو تب قوم یہود نے اپنے بدنما داغوں کا علاج کرنے اور اپنی بداعمالیوں کی اصلاح کرنے کی بجائے اس آئینے پر تھوکنا شروع کردیا اور اسے توڑ ڈالنا چاہا جو انھیں ان کی اصل شکل دکھا رہا تھا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے گھٹیا حربوں اور ناپاک ہتھیاروں سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ذات مبارک پر حملہ آور ہوئے اور اس وقت انھوں نے آپ کی والدہ پر نعوذ باللہ زانیہ ہونے کا الزام لگایا اور آپ (علیہ السلام) کو معاذ اللہ ولد الزنا کہنے لگے۔ ان کا یہ بہتان چونکہ کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا ' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اصل حقیقت کیا ہے اور وہ دل میں حضرت مریم اور ان کے صاحبزادے کی پاکیزگی کا یقین رکھتے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس الزام کو بہتان عظیم قرار دیا۔ (روح)

آیت مبارکہ:

وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۙ‏ ﴿۱۵۷﴾

لغۃ القرآن: [وَّقَوۡلِهِمۡ : اور ان کا کہنا][اِنَّا : یقیناً ہم نے][قَتَلۡنَا : قتل کیا][الۡمَسِيۡحَ : مسیح][عِيۡسَى: عیسیٰ][ابۡنَ : بن][مَرۡيَمَ : مریم کو][رَسُوۡلَ اللّٰهِ : رسول اللہ کا][وَمَا : اور نہیں][قَتَلُوۡهُ : انہوں نے ان کو قتل کیا][وَمَا : اور نہ][صَلَبُوۡهُ : انہوں نے ان کو سولی پر دیا][وَلٰـكِنۡ : اور بلکہ][شُبِّهَ : شک میں ڈال دیا گیا][لَهُمۡ: ان کے لیے][وَاِنَّ : اور بیشک][الَّذِيۡنَ : وہ لوگ][اخۡتَلَفُوۡا : انہوں نے اختلاف کیا][فِيۡهِ : اس کے بارے میں][لَفِىۡ : البتہ نہیں ہیں][شَكٍّ : شک][مِّنۡهُ: اس کے متعلق][مَا : نہیں][لَهُمۡ : ان کے لیے][بِهٖ : ان کے متعلق][مِنۡ : سے][عِلۡمٍ : کوئی علم][اِلَّا : سوائے][اتِّبَاعَ : پیچھے لگنے][الظَّنِّ : ظن کے][وَمَا : اور نہیں][قَتَلُوۡهُ : انہوں نے اس کو قتل کیا][يَقِيۡنًا : یقینا]

ترجمہ: اور ان کے اس کہنے (یعنی فخریہ دعویٰ) کی وجہ سے (بھی) کہ ہم نے اللہ کے رسول، مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کر ڈالا ہے، حالانکہ انھوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ انھیں سولی چڑھایا مگر (ہوا یہ کہ) ان کے لیے (کسی کو عیسیٰ (علیہ السلام) کا) ہم شکل بنادیا گیا، اور بیشک جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ یقیناً اس (قتل کے حوالے) سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، انھیں (حقیقت حال کا) کچھ بھی علم نہیں مگر یہ کہ گمان کی پیروی (کر رہے ہیں)، اور انھوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

تشریح:

اس آیت میں یہود کے ایک کفریہ قول کا ذکر فرمایا ہے اور وہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا کفر ہے ' کیونکہ اس قول سے یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں بہت کوشش کرتے تھے ' ہرچند کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے قاتل نہیں تھے لیکن چونکہ وہ فخریہ طور پر یہ کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا ہے ' اس لیے ان کا یہ قول کفریہ قرار پایا۔

یہود کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشابہ کو قتل کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا انھوں نے (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل نہیں کیا نہ انھوں نے ان کو سولی دی لیکن ان کے لیے کسی شخص کو (عیسیٰ کا) مشابہ بنادیا گیا تھا۔

وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ سترہ حواریوں کے ساتھ ایک گھر میں اس وقت داخل ہوئے جب یہودیوں نے ان کو گھیر لیا تھا ' جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کی صورت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی صورت کی طرح بنادی ' یہودیوں نے ان سے کہا تم نے ہم پر جادو کردیا ہے ' تم یہ بتلاؤ کہ تم میں سے عیسیٰ کون ہے ورنہ ہم سب کو قتل کردیں گے ' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے اصحاب سے کہا تم میں سے کون آج اپنی جان کو جنت کے بدلہ میں فروخت کرتا ہے ؟ ان میں سے ایک حواری نے کہا میں ! وہ یہودیوں کے پاس گیا اور کہا میں عیسیٰ ہوں اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت حضرت عیسیٰ کی طرح بنائی ہوئی تھی ' انھوں نے اس کو پکڑ کر قتل کردیا اور سولی پر لٹکادیا ' اس وجہ سے وہ شخص ان کے لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشابہ کردیا گیا تھا ' یہودیوں نے گماں کیا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا ہے اور عیسائیوں نے بھی یہی گمان کرلیا ' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اسی دن اٹھالیا تھا۔ (جامع البیان جز ٦، ص ' ١٧ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

امام ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں اور بھی کئی روایات ذکر کی ہیں لیکن ان کا اعتماد صرف مذکور الصدر روایت پر ہے ' ہم اس سلسلہ میں بعض دیگر روایات کا بھی ذکر کررہے ہیں :

سدی بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کے انیس حواریوں کو ایک مکان میں بند کردیا ' حضرت عیسیٰ نے اپنے اصحاب سے کہا کون شخص میری صورت کو قبول کرے گا ؟ تاکہ وہ قتل کردیا جائے ! اور اس کو جنت مل جائے گی ! تو ان میں سے ایک شخص نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی صورت لے لی ' اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان کی طرف چڑھ کر چلے گئے ہیں ' یہودیوں نے ان کو گنا تو ان میں سے ایک شخص کو کم پایا ' اور وہ ان میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شکل کا ایک آدمی دیکھتے تھے ' سو وہ شک میں پڑگئے ' اس کے باوجود انھوں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کردیا جو ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تھے انھوں نے اس کو سولی پر چڑھادیا اور یہ آیت کی تفسیر ہے۔ (جامع البیان جز ٦، ص ١٩ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

حسن بصری نے کہا ہے کہ ان کا اختلاف یہ تھا کہ بعض نے کہا عیسیٰ الہ ہیں اور بعض نے کہا عیسیٰ ابن اللہ ہیں ' ایک قول یہ ہے کہ ان کے عوام نے کہا ہم نے عیسیٰ کو قتل کردیا اور جنہوں نے ان کا آسمان کی طرف اٹھنا دیکھا تھا انھوں نے ان کو نہیں قتل کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ نصاریٰ میں سے نسطوریہ نے کہا عیسیٰ کو بہ حیثیت ناسوت (جسم) کے سولی دی گئی اور بہ حیثیت لاہوت کے سولی نہیں دی گئی ' اور فرقہ ملکانیہ نے کہا کہ عیسیٰ کو ناسوت اور لاہوت دونوں اعتبار سے قتل بھی کیا گیا اور سولی بھی دی گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کا اختلاف یہ تھا کہ انھوں نے کہا اگر یہ ہمارا صاحب ہے تو عیسیٰ کہاں ہیں اور اگر یہ عیسیٰ ہے تو ہمارا صاحب کہاں ہے ' ایک قول یہ ہے کہ یہود نے کہا کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کیا ہے کیونکہ یہودیوں کے سردار یہوذا نے ان کو قتل کرنے کی سعی کی تھی اور عیسائیوں کے ایک گروہ نے کہا بلکہ ہم نے ان کو قتل کیا اور اس میں سے ایک گروہ نے کہا بلکہ ان کو اللہ نے آسمان کی طرف اٹھالیا اور ہم ان کو دیکھ رہے تھے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ٦ ص ٩ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ١٣٨٧ ھ) (تبیان)

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری بن جاتا ہے کہ عیسائی تو وہ لوگ ہیں ہونے چاہئیں جو سیدنا عیسیٰؑ پر ایمان رکھتے ہوں، لیکن کیسا؟اور ان کی اقسام کیا ہیں ؟اور انہیں کافر کیوں کہا گیا؟

مَسیحیّت ایک تثلیث (تین ایک میں) کا عقیدہ رکھنے والا مذہب ہے، جو یسوع کو مسیح، خدا کا بیٹا اور خدا کا ایک اقنوم (اب، ام، روح القدس) مانتا ہے۔ اور اسے بھی عین اسی طرح خدا مانتا ہے، جیسے خدا اور روح القدس کو۔ جنہیں بالترتیب باپ، بیٹا اور روح القدس کا نام دیا جاتا ہے۔ مسیحیوں کے ابتدا تین فرقے تھے۔ یعقوبیہ، نسطوریہ اور ملکانیہ۔ یہ تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ تین ایک ہے اور ایک تین ہے۔ یعنی اب (باپ)، ابن اور روح القدس۔ اب عین ابن ہے اور ابن عین اب ہے۔ اسی طرح دوسرے کئی عقائد بھی ہیں۔ اپنے پیروکاروں کی تعداد کی اعتبار سے مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے 2019 ء میں رومی کاتھولک، مشرقی راسخ الاعتقاد (Eastern Orthodox) اور پروٹسٹنٹ Protestantism گروہوں کی تعداد 2.4 ارب تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین میں بسنے والے تقریباً ہر تین افراد میں سے کسی نہ کسی ایک کا تعلق مسیحیت سے ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اتنے زیادہ لوگوں پر مشتمل مذہب میں عقائد و وظائف کی وسیع تعداد ہو گی۔ عمومی لحاظ سے مسیحیوں میں یسوع ناصری کی انفرادیت کے بارے میں عقیدہ مشترک ہے کہ وہ خدا کے بیٹے تھے اور انہوں نے اپنی صلیبی موت کے ذریعہ انسانیت کا کفارہ ادا کیا اور اپنی موت کے تیسرے دن ہی قبر سے جی اٹھے۔ مسیحی لوگ مذہب میں داخلے کے لیے پیتسمہ پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ ایمان لانے والے کے پاس ایک زندگی ہے جس میں اُسے حیات بعد الموت کے لیے اپنی تقدیر کے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس تقدیر میں عموماً جنت کی ابدی رحمت یا جہنم کا دائمی عذاب شامل ہے۔

مسیحیت میں کئی فرقے ہیں، جن میں دو بڑے فرقے ہیں کاتھولک اور پروٹسٹنٹ۔

پچھلے 100 سالوں میں سب سے تیزی سے بڑھنے والا گروپ وہ ہیں جو ہولی اسپرٹ موومنٹ کے اندر ہیں (روح القدس خدا کی روح ہے)۔

یہ تحریک بنیادی طور پر Pentecostal-Charismatics پر مشتمل ہے،

جو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں کے اندر ہیں۔

یہ تحریک خدا کی طرف سے بہت سے معجزاتی، مافوق الفطرت اور روحانی انکشافات کو دیکھتی ہے۔

نصاریٰ کے نسطوریہ فرقے نے کہا کہ وہ ابن اللہ ہیں۔ ملکیہ یا سلطانیہ (کیتھولک) فرقے نے کہا وہ ثَالِثُ ثَلَاثَۃٍ (تین خداؤں میں سے تیسرے) ہیں اور تیسرے فرقے یعقوبیہ (آرتھوڈکس) نے کہا، وہ اللہ ہیں۔ پس یہودیوں نے تفریط اور تقصیر کی عیسائیوں نے افراط و غلو (الیسر التفاسیر، فتح القدیر) یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ہاں وہ کافر ہیں اگرچہ اہل کتاب۔ عام عیسائیوں مین شرک مشترک ہے۔

دوسرا جرم جس کا یہاں پہلی دفعہ ذکر ہو رہا ہے ان کا یہ دعویٰ کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح کو قتل کر دیا۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ جب وہ آپ کو رسول مانتے تھے تو پھر قتل کیوں کیا؟اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ (1) انھوں نے یہ الفاظ بطور تمسخر بڑھائے تھے۔ وہ آپ کو رسول مانتے نہیں تھے یا یہ کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شان و توقیر بیان کرنے کے لیے بڑھائے ہیں۔ لیکن اگر یہود کی گزشتہ تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ کچھ بعد بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کو رسول اللہ مانتے ہوئے انھوں نے آپ کو قتل کرنے کی ٹھانی ہو۔ حضرت زکریا اور یرمیا (علیہما السلام) کو نبی مانتے تھے لیکن جب ان بزرگواروں نے انھیں ان کی بداخلاقیوں پر ٹوکا تو انھیں اپنے ہاتھوں شہید کر دیا۔ بہر حال ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا (اگرچہ اس کی تغلیط آگے آ رہی ہے) اور پھر اس پر ان کا اترانا اور فخر کرنا اس سے بڑھ کر ان کے کفر کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ حضرت مسیح کے دشمن یہود بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا اور سولی دے دیا اور آپ کے ماننے والے اور پرستار بھی یہی یقین رکھتے ہیں کہ یہود نے حضرت مسیح کو سولی دے دیا۔ گویا بیٹا سولی پر لٹکتے ہوئے ایلی ! ایلی تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا فریاد کرتا رہا اور باپ نے اس کی کچھ مدد نہ کی۔ جب دشمن اور دوست سب اس بات پر متفق ہو چکے تھے تو قرآن نے آکر حضرت مسیح کی عظمت وجلالت شان سے پردہ اٹھایا اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ یہودی اپنی سازش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس اللہ کے رسول کو اپنے اللہ کا پیغام سنانے کے باعث انھوں نے قتل کرنے کی سر توڑ کوشش کی اللہ رب العزت نے ان کی اس ناپاک سازش کو ناکام بنا دیا۔ اور اپنے رسول کا بال بھی بیکانہ ہونے دیا۔ دونوں چیزوں کی نفی کر دی یعنی یہودی نہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ سولی پر چڑھا کر تذلیل کر سکے۔ جیسے مختلف انجیلوں میں مذکور ہے۔ مرزائیوں کی لاہوری پارٹی کے امیر مولوی محمد علی نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں اس جگہ توضیحی نوٹ لکھا ہے اس میں اس بات کی بڑی زحمت اٹھائی ہے کہ آیات قرآن کو انجیلوں میں بیان کردہ حکایت پر منطبق کریں۔ چنانچہ وہ ان تمام تفصیلات کو جو انجیلوں میں موجود ہیں بڑی فراخدلی سے تسلیم کرتے چلے جاتے ہیں کہ حضرت مسیح کو سولی دیا گیا۔ چنانچہ وہ نیم جان ہو کر دوسرے دو مجرموں کی طرح نیچے گر پڑے۔ آپ کے پہلو میں ضربیں لگا لگا کر چھلنی کر دیا گیا اور خون کے فوارے بہ نکلے وغیرہ۔ پھر آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن ان چیزوں کا انکار نہیں کرتا کیونکہ قرآن نے بھی سولی پر مرنے کی نفی کی ہے۔ لیکن اگر وہ ذرا سا تامل کرتے تو قرآن کا ایک لفظ ہی ان کو اس زحمت لاطائل سے بچالیتا۔ وہاں دونوں چیزوں کی نفی ہے مرنے کی بھی اور سولی پر چڑھائے جانے کی بھی۔ کیونکہ صلب کا معنی ہے الصلب هو تعليق الانسان للقتل : کسی انسان کو لٹکا دینا تاکہ وہ مر جائے۔ مر جانا صلب کے معنی موضوع لہ میں داخل نہیں بلکہ اس فعل کا مقصد ہے۔ اور مقصد وغایت مفہوم کو مستلزم ہو تو ہو لیکن معنی میں داخل نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہود اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ آپ کو پکڑا بھی گیا۔ آپ کے منہ پر تھوکا بھی گیا۔ کانٹوں کا تاج بھی پہنایا گیا اور پھر سولی بھی چڑھا دیا گیا۔ گویا اپنی طرف سے انھوں نے اس منحوس منصوبہ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ مسیح توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوئے اور بچ گئے۔ یہود کا مقصد تو پورا ہو گیا۔ انھوں نے آپ کی تذلیل و تحقیر اور اذیت رسانی کے سارے ارمان پورے کر لئے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کی ناپاک سازشوں کو ناکام کر دیا اور اپنے برگزیدہ بندے اور جلیل القدر رسول کی توہین کرنے کا انھیں قطعاً موقع نہیں دیا اور یہی قرآن کا واضح اعلان ہے۔

تفاسیر میں اگرچہ ایسی روایات کثرت سے مندرج ہیں جن میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کو گرفتار کرنے اور آپ کے بچ جانے اور کسی دوسرے انسان کو سولی چڑھائے جانے کی تفصیلات موجود ہیں۔ لیکن محقق علمائے تفسیر نے صراحت کر دی ہے کہ کوئی روایت بھی یقینی نہیں۔ اور حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔ واختلف الرواة فی کیفیة القتل والصلب ولم یثبت عن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فی ذلک شیء (بحر المحیط) بہر حال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے فلسطین کے رومی گورنر پیلاطس کی عدالت میں آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور آپ پر یہ الزام لگایا کہ آپ دین موسوی میں تحریف کرتے ہیں اور جھوٹی شہادتیں پیش کر کے اسے مجبور کیا کہ آپ کو پھانسی کی سزا دے۔ اور جب اسے پس وپیش کرتے دیکھا تو اس کو فتنہ وبغاوت کی دھمکی دی۔ انجیل کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ "جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو ! سب لوگوں نے کہا اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر "۔ انجیل متی۔ تو جب پیلاطس نے ان کے دباؤ کے زیر اثر آپ کو بے گناہ اور معصوم یقین کرتے ہوئے سولی دینے کا حکم دے دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت غالبہ اور حکمت کاملہ سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو تو بچا لیا اور ایک منافق کی شکل کو آپ کے مشابہ کر دیا اور یہودی اسی کو مسیح سمجھ کر پکڑ لے گئے اور اسے پھانسی دے دیا۔ اغلباً وہ منافق یہوداہ تھا جو آپ کا

حواری تھا۔ اور جب یہودیوں نے اسے تیس روپیہ کا لالچ دیا تو اس نے اپنے پیغمبر کی مخبری کی اور آپ کو گرفتار کرانے کی کوشش میں یہود کا ساتھ دیا۔

اس بارے میں نصاریٰ کے مختلف اقوال کی تو حد ہی نہیں۔ امام رازی (رح) نے تین مشہور فرقوں کی آرا نقل کی ہیں۔ (1) نسطوریہ۔ (2) ملکانیہ۔ (3) یعقوبیہ۔ نسطوریہ فرقہ کا یہ قول ہے کہ مسیح کا ناسوت تو مصلوب ہوا لیکن ان کا لاہوت مصلوب نہیں ہوا۔ ملکانیہ کا خیال ہے کہ لاہوت بھی مصلوب ہوا لیکن بالذات نہیں بلکہ بواسطہ ناسوت اور یعقوبیہ کا نظریہ یہ ہے کہ ناسوت اور لاہوت دونوں کو سولی دی گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ آرا کسی دلیل پر مبنی نہیں بلکہ سب کچھ ظن و گمان کی نقش آرائیاں ہیں۔

مسیح کے نام سے واقف جتنی قومیں جہاں کہیں بستی تھیں سب اس غلط فہمی کا شکار تھیں کہ آپ کو سولی دیا گیا۔ اس عالمی غلط فہمی کا ازالہ اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کی عظمت کا اعلان اگر قرآن حکیم نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ اس لیے بار بار اس حقیقت کو دہرایا جارہا ہے۔ (ضیاء)

آیت مبارکہ:

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِـيْمًا ۝۱۵۸

لغۃ القرآن: [بَلْ : بلکہ][رَّفَعَهُ : اٹھا لیا ان کو][اللّٰهُ : اللہ نے][اِلَيْهِ: اپنی طرف][وَكَانَ : اور ہے][اللّٰهُ : اللہ][عَزِيْزًا : نہایت غالب][حَكِـيْمًا : خوب حکمت والا]

ترجمہ: بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف (آسمان پر) اٹھالیا، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

تشریح:

حضرت مسیح کے بارے میں پھیلے ہوئے تمام نظریات کا بطلان کر کے اب قرآن خود بتاتا ہے کہ وہ کہاں گئے۔ فرمایا انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ اب قدرتًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں اٹھالیا۔ کہیں وہ خود بیٹھا تو ہے نہیں کہ وہاں بلالیا ہو تو اس کو صاف جواب یہ ہے کہ آسمان پر۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث معراج میں اس کی تصریح موجود ہے۔ کیونکہ رفع کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور اگر دونوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں یعنی بلندی مقام اور بلندی شان تو رفع کا استعمال کیں دل میں کھٹکے۔ بات اتنی سی تھی۔ بالکل مختصر اور دوٹوک۔ یہودی عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر لٹکانے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی تائید میں عیسائیوں کی اکثریت نے اپنے مفاد کی خاطر یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) واقعی ہی فوت ہو چکے ہیں۔ حالانکہ عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے۔ یہودیوں کے دلائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزائی کہتے ہیں کہ واقعی عیسیٰ (علیہ السلام) مصلوب ہو چکے ہیں جس عیسیٰ مسیح کے دوبارہ آنے کا حدیث میں ذکر ملتا ہے وہ حضرت

عیسیٰ (علیہ السلام) نہیں بلکہ مرزا ہے (العیاذ باللہ) جو مسیح بن کر آ چکا ہے لہٰذا عیسیٰ (علیہ السلام) دوبارہ نہیں آئیں گے۔ احادیث مبارکہ میں یوں تذکرہ ہے۔

(عَنْ اَبِی ہُرَیْرَۃَ (رض) عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا تَقُومُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَنْزِلَ فِیکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا مُقْسِطًا فَیَکْسِرَ الصَّلِیبَ وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیرَ وَیَضَعَ الْجِزْیَۃَ وَیَفِیضَ الْمَالُ حَتّٰی لَا یَقْبَلَہُ اَحَدٌ) [رواہ البخاری : کتاب المظالم، باب کَسْرِ الصَّلِیبِ وَقَتْلِ الْخِنْزِیرِ]

حضرت ابوہریرہ (رض) نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) عادل حکمران کی حیثیت سے نہیں آئیں گے وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کردیں گے۔ جزیہ ختم کردیں گے۔ مال و دولت کی اس قدر بہتات ہوگی کہ صدقہ و خیرات لینے والا نہیں ہوگا۔"

(عن عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سَلَامٍ (رض) عَنْ اَبِیہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ مَکْتُوبٌ فِی التَّوْرَاۃِ صِفَۃُ مُحَمَّدٍ وَصِفَۃُ عِیسَی ابْنِ مَرْیَمَ [یُدْفَنُ مَعَہٗ] [رواہ الترمذی : کتاب المناقب، بَابٌ فِی فَضْلِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

"حضرت عبداللہ بن سلام (رض) اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ تورات میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کی صفات لکھی ہوئی ہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ دفن ہوں گے۔"

(عَنْ اَبِی ہُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ، وَالْاَنْبِیَاءُ اِخْوَۃٌ لِعَلَّاتٍ، اُمَّہَاتُہُمْ شَتّٰی، وَدِینُہُمْ وَاحِدٌ)

[رواہ البخاری : باب وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَہْلِہَا]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں دنیا و آخرت میں عیسیٰ بن مریم کے زیادہ قریب ہوں اور تمام انبیاء (علیہ السلام) علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں مختلف ہیں اور دین ایک ہی ہے۔" (فہم)

اور حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتادیا کہ آپ کو آسمان پر اٹھالیا گیا۔ لیکن انسان کی کج بحثی یا ندرت آفرینی کا کیا علاج؟ جب تک سیدھی اور صاف بات میں اپنی پخ نہ لگالے حضرت قرار نہیں آتا۔ جناب مرزا صاحب آنجہانی تشریف لائے اور اپنے نبی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کردیا۔ اور اپنی نبوت کے ثبوت کے لے وفات مسیح کو بطور اساس قرار دیا حالانکہ ختم نبوت کے مسئلہ کو حیات مسیح کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر بفرض محال حیات مسیح ثابت نہ ہوسکے تو بھی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ سلم کے بعد کسی کا کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرنا آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا صریح انکار اور کفر ہے۔ مزید برآں مرزا صاحب کا مسیح موعود ہونے کا دعویٰ اور استدلال بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ آپ مسیح کیوں ہیں؟ اس لیے کہ احادیث میں موجود ہے کہ حضرت مسیح آئیں گے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی فرمان غلط نہیں ہوسکتا۔ اور اگر پوچھا جائے کہ جناب! جن احادیث میں مسیح کی آمد کا ذکر ہے ان میں تو مسیح کا نام، ولدیت، محل نزول اور جو جو کارہائے نمایاں آپ انجام دیں گے ان سب کا تفصیلی ذکر ہے اور حسن اتفاق کہ آپ میں ان تفصیلات میں سے کوئی ایک چیز بھی تو نہیں پائی جاتی تو پھر آپ وہ مسیح کیوں کر ہوئے جس کی آمد کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ (ان احادیث کثیرہ میں سے ایک حدیث کا ذکر ابھی آرہا ہے) تو پھر انھیں احادیث پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور جب اس میں بھی کامیابی نظر نہیں آتی تو پھر تاویلات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اگر بنی اسرائیل کے دانشوروں نے بچھڑے کو خدا مان لیا تھا تو آج اگر کوئی مرزا صاحب کو نبی یا مسیح موعود مان لے تو کیا تعجب ہے؟ (ضیاء)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا بیان

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کی کیفیت کا علم اس روایت سے ہوتا ہے:

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عیسیٰ اپنے اصحاب کے پاس آئے اور اس وقت گھر میں بارہ حواری تھے 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جس وقت گھر میں داخل ہوئے تو ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے 'آپ نے فرمایا تم میں سے ایک شخص ایسا ہے جو مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ میرا کفر کرے گا پھر فرمایا تم میں سے کون شخص ایسا ہے جس پر میری شبہ ڈال دی جائے اور اس کو میری جگہ قتل کر دیا جائے اور وہ میرے ساتھ جنت میں ہو 'تو ان میں سے ایک کم عمر نوجوان اٹھا 'آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ پھر دوبارہ سوال دہرایا پھر وہ جوان اٹھا 'اور کہا میں حاضر ہوں 'آپ نے فرمایا ہاں تم ہی اس کے اہل ہو 'پھر اس پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شبہ ڈال دی گئی 'اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مکان کے روشن دان سے آسمان کی طرف اٹھالیا گیا پھر یہود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تلاش میں آئے انھوں نے حضرت عیسیٰ کے مشابہ کو پکڑ لیا اور اس کو قتل کر دیا پھر اس کو سولی پر لٹکا دیا 'پھر ان میں سے بعض نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ ان کا انکار کیا اور ان کے تین فرقے ہوگئے ایک فرقہ نے کہا ہمارے درمیان خود اللہ تھا 'جب تک اس نے چاہا ہم میں رہا پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اس فرقہ کا نام یعقوبیہ ہے 'دوسرے فرقے نے کہا وہ ابن اللہ تھا جب تک چاہا ہم میں رہا اور جب چاہا آسمان پر چڑھ گیا اس فرقہ کا نام نسطوریہ ہے 'اور ایک فرقہ نے کہا ہمارے درمیان اللہ کا بندہ اور اس کا رسول تھا جب تک اللہ نے چاہا وہ ہم میں رہا پھر اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا اور یہ فرقہ مسلمان تھا 'پھر دونوں کافر فرقے اس پر غالب آگئے اور اس کو قتل کر دیا پھر اس وقت سے دین اسلام کا چراغ بجھا رہا حتی کہ اللہ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا اس حدیث کی حضرت ابن عباس تک سند صحیح ہے امام نسائی نے اس حدیث کو از ابو کریب از ابو معاویہ اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

اسی طرح اس کو متعدد اسلاف نے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے حواریوں سے فرمایا تھا کہ تم میں سے کس شخص پر میری شبہ ڈالی جائے اور اس کو میری جگہ قتل کر دیا جائے اور وہ جنت میں میرا رفیق ہو۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۰۔۴۲۹ 'مطبوعہ ادارہ اندلس 'بیروت '۱۳۸۵ھ)

اس آیت میں یہودیوں کے اس دعوی کا انکار ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی طرف اٹھالیا 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اب بھی دوسرے آسمان میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث معراج میں ہے 'اور وہ وہیں پر مقیم ہیں حتی کہ اللہ تعالیٰ دجال کو قتل کرنے کے لیے انھیں زمین پر نازل فرمائے گا اور وہ زمین کو اسی طرح عدل سے بھر دیں گے جس طرح پہلے ظلم سے بھری ہوئی تھی اور زمین پر چالیس سال زندہ رہیں گے جس طرح انسان زندہ رہتے ہیں پھر اس طرح وفات پا جائیں گے جس طرح انسانوں کو موت آتی ہے 'قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی طرف اٹھا لیا ان کو نور کا لباس پہنایا اور ان کے پر لگا دیئے اور ان کو کھانے پینے سے منقطع کر دیا اور وہ ملائکہ کے ساتھ عرش کا طواف کرنے لگے اور وہ ایسے انسان بن گئے جو ملکی سماوی اور ارضی تھے 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے اور حکمت کا معنی کمال علم اور عزت کا معنی کمال غلبہ ہے 'اس صفت کے لانے میں یہ تنبیہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دنیا سے آسمانوں کی طرف اٹھانا اگرچہ بشر پر متعذر اور

دشوار ہے لیکن میری حکمت اور میرے غلبہ کے سامنے اس میں کوئی دشواری نہیں ہے ' حکمت اور غلبہ کی یہ تفسیر بھی ہے کہ یہود نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا ' اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہودیوں سے بچایا جائے اور اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے انھیں آسمان پر لے جائے۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ تیس سال کی عمر میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر وحی کی گئی اور تنتیس (۳۳) سال کی عمر میں آپ کو اوپر اٹھالیا گیا ' لہٰذا آپ کی نبوت کی مدت تین سال ہے ' ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو بھیجا انھوں نے حضرت عیسیٰ السلام کو چھت کے ایک سوارخ میں داخل کیا ' اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سوراخ سے آسمان کی طرف اٹھالیا۔ (البحر المحیط ج ۴ ص ۱۲۹۔ ۱۲۸ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۱۲ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ علامہ ابوالحیان اندلسی کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ لوقا کی انجیل میں بھی اس عبارت کی تائید ہے ' اور بعض حواریوں نے سولی کے واقعہ کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھا تو وہ ان کی روح کے متشکل ہونے کے باب میں ہے کیونکہ قدسیوں کی روح کو اس عالم میں تشکل اور تطور (یعنی روح کا مختلف شکلوں میں متشکل ہوکر آنا) کی قوت حاصل ہوتی ہے خواہ ان کی ارواح کسی بلند مقام پر ہوں ' اور اس امت کے بکثرت اولیاء مختلف شکلوں میں آتے ہیں اور ان کی حکایات اس قدر زیادہ ہیں کہ حصر اور بیان سے باہر ہیں۔ (روح المعانی جز ۶ ص ۱۲ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

یہاں ایک اور دلچسپ واقعہ بھی بعید از بیان نہیں ہوگا جسے ابوالحسن دمشقی نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ ہم ابن تیمیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اس نے وعظ کیا اور استواء کی آیات کو بیان کیا ' اس نے کہا اللہ عرش پر اس طرح بیٹھا ہے جس میں یہاں بیٹھا ہوں یہ سن کر لوگ اس پر پل پڑے اور اس کی جوتیوں سے مرمت شروع کردی ' اور اس کو بعض حکام تک پہنچایا ' انھوں نے اس کا علماء سے مناظرہ کرایا ' اس نے یہ آیت پیش کی (آیت) "الرحمٰن علی العرش استوی"۔ علماء اس پر ہنسے اور انھوں نے جان لیا کہ یہ قواعد علم کو جاری کرنے سے جاہل ہے ' پھر علماء نے اس پر یہ آیت پیش کی (آیت) "اینما تولوا فثم وجہ اللہ"۔ البقرہ: ۱۱۵) "تم اللہ حقیقۃ ہمارے ساتھ ہے ' اور اللہ عرش پر بھی حقیقۃ مستوی ہے ' اور یہ شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی عداوت رکھتا تھا ' علماء نے اس کو مارنے اور اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا ' قاضی مالکی کے حکم سے اس کو اور اس کے بھائیوں کو قید کردیا گیا ' اس کو قید کرنے کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ اس نے کہا انبیاء (علیہم السلام) مثلا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ، کی قبروں کی زیارت کے لیے رخت سفر نہ باندھا جائے ' امام برہان الدین فنزاری نے اس کے خلاف چالیس سطروں کا فتوی لکھا جس میں اس کو کافر قرار دیا ' اور شیخ شہاب الدین بن جہبل شافعی نے اور مالکی علماء نے بھی اس کی موافقت کی اور اس کے گمراہ ' بدعتی اور زندیق ہونے پر اتفاق کیا ' سلطان نے تمام قاضیوں کو جمع کیا اور قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعہ نے اس فتوی کو پڑھ کر اس پر مہر لگائی اور لکھا کہ اس قول کا قائل بدعتی اور گمراہ ہے اور حنفی اور حنبلی علماء نے اس فتوی کی موافقت کی لہٰذا اس کے کفر پر اجماع ہوگیا (کتاب دفع شبہ من شبہ وتمرد ص ۴۵۔ ۴۱ ' ملخصا مطبعہ دارالکتاب العربیہ حلب ' ۱۳۵۰ھ)

مشہور سیاح ابن بطوطہ لکھتے ہیں:

ابن تیمیہ دمشق کا بہت بڑا عالم تھا ' لیکن اس کی عقل میں کمی تھی ' دمشق کے علماء کے اس پر اعتراض تھے اس کو قاضی القضاۃ کے سامنے پیش کیا گیا اور اس سے کہا ان اعتراضات کے جواب دو ' اس نے کہا لا الہ الا اللہ اور کوئی جواب نہیں دیا ' دوبارہ کہا دوبارہ اس نے یہی جواب دیا اس کو قاضی القضاۃ نے قید کردیا ' میں نے دمشق کے قیام کے دوران ایک دن اس کے پیچھے جمعہ پڑھا ' یہ مسجد کے منبر پر وعظ کررہا تھا ' دوران

وعظ اس نے کہا اللہ آسمان دنیا سے اس طرح اترتا ہے یہ کہہ کر اس نے منبر سے اتر کر دکھایا ' پھر اس سے ابن الزھراء مالکی نے معارضہ کیا اور لوگوں نے ہاتھوں اور جوتوں سے اس کو اس قدر مارا کہ اس کی پگڑی گر گئی اور اس کا لباس پھٹ گیا۔ اس کو ایک حنبلی قاضی کے پاس لے گئے انھوں نے اس کو قید کرنے اور تعذیر لگانے کا حکم دیا۔ اس کے مردود اقوال میں سے یہ ہیں: اس نے کلمہ واحدہ سے تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا 'قبر انور کی زیارت کرنے والے کے لیے نماز قصر کرنے کو ناجائز کہا 'مالک ناصر نے اس کو قلعہ میں قید کرنے کا حکم دیا اور یہ وہیں مر گیا۔ (رحلہ ابن بطوطہ ج۱ ص ۱۱۲۔۱۱۱ 'مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت) (تبیان)

تاہم ایک بات مسلمہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی **الصارم المسلول** علی شاتم الرسول جو ناموس رسالت پر ایک سند ہے۔ اس جیسی کتاب آج تک کسی نے نہیں لکھی۔ ہو سکتا ہے مسابقت علمی سے انحراف اس کو یہاں تک لے آیا ہو۔ واللہ اعلم ورسولہ

مسائل

۱۔ یہودیوں نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو نہ قتل کیا اور نہ ہی انھیں سولی پر لٹکایا۔

۲۔ عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت کے بارے میں لوگ اپنی طرف سے اٹکل پچو لگاتے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہر کام کرنے پر غالب اور اس کے ہر کام میں حکمت پنہاں ہوتی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ؕ

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور نہیں][مِّنْ : سے][اَهْلِ : اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][اِلَّا : مگر][لَيُؤْمِنَنَّ : وہ ضرور ایمان لائے گا][بِهٖ : اس پر][قَبْلَ مَوْتِهٖ : پہلے ان کی موت (سے)][وَيَوْمَ : اور دن][الْقِيٰمَةِ : قیامت کے][يَكُوْنُ : وہ ہوں گے][عَلَيْهِمْ : ان پر][شَهِيْدًا : گواہ]

ترجمہ: اور (قرب قیامت نزول مسیح (علیہ السلام) کے وقت) اہل کتاب میں سے کوئی (فرد یا فرقہ) نہ رہے گا مگر وہ عیسیٰ (علیہ السلام) پر ان کی موت سے پہلے ضرور (صحیح طریقے سے) ایمان لے آئے گا، اور قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) ان پر گواہ ہوں گے۔

تشریح: اس آیت کی تفسیر میں چند قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنی موت کے وقت جب عذاب کے فرشتے نظر آتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آتے ہیں جن کے ساتھ انھوں نے کفر کیا تھا اور اس وقت کا ایمان مقبول و معتبر نہیں دوسرا قول یہ ہے کہ قریب قیامت جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان سے نزول فرمائیں گے اس وقت کے تمام اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ الصلٰوۃ والتسلیمات شریعت محمدیہ کے مطابق حکم کریں گے اور اسی دین کے ائمہ میں سے ایک امام کی حیثیت میں ہوں گے اور نصاریٰ نے ان کی نسبت جو گمان باندھ رکھے ہیں ان کا ابطال فرمائیں گے دین محمدی کی اشاعت کریں گے اس وقت یہود و نصاریٰ کو یا تو اسلام قبول کرنا ہوگا یا قتل کر ڈالے جائیں گے جزیہ قبول کرنے کا حکم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کرنے کے وقت تک ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر کتابی اپنی موت سے پہلے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئے گا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے گا لیکن وقت موت کا ایمان مقبول نہیں نافع نہ ہوگا۔ (خزائن)

سدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ہر یہودی اور نصرانی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ بن مریم پر ایمان لے آئے گا ' ان پر ان کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا جو شخص ڈوب رہا ہو ' یا آگ میں جل رہا ہو ' یا اس پر اچانک دیوار گرجائے یا اس کو درندہ کھا جائے وہ مرنے سے پہلے کیسے ایمان لائے گا ' حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کے جسم سے اس کی روح اس وقت تک نہیں نکلے گی جب تک کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان نہ لائے۔ (جامع البیان جز ٦ ص ٢٨۔ ٢٧ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت)

یہ تفسیر مرجوع ہے کیونکہ جو یہودی یا نصرانی لڑائی میں اچانک دشمن کے حملہ سے مر جاتا ہے یا خودکشی کرلیتا ہے یا وہ کسی بھی حادثہ میں اچانک مر جاتا ہے اس کو کب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے کا موقع ملے گا ' اور راجح دوسری تفسیر ہے جس میں یہ ضمیر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف راجع ہے ' امام ابن جریر نے بھی اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے اور اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت سے پہلے آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے ' واضح رہے کہ مرزائی پہلی تفسیر کو راجح قرار دیتے ہیں تاکہ نزول مسیح نہ ثابت ہو ' بہرنوع اس صورت میں معنی یہ ہے: اور (نزول مسیح کے وقت) اہل کتاب میں سے ہر شخص عیسیٰ کی موت سے پہلے ضرور ان پر ایمان لے آئے گا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کی حکمتیں

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان سے نازل کرنے کی حسب ذیل حکمتیں ہیں:

(١) یہود کے اس زعم اور دعوی کا رد کرنا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا ہے ' اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو نازل کر کے ان کے جھوٹ کو ظاہر فرما دے گا۔

(٢) جب ان کی مدت پوری ہونے کے قریب ہوگی تو زمین پر ان کو نازل کیا جائے گا تاکہ ان کو زمین میں دفن کیا جائے کیونکہ جو مٹی سے بنایا گیا ہو اس میں یہ اصل ہے کی اس کو مٹی میں دفن کیا جائے۔

(۳) جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات اور آپ کی امت کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ آپ کو ان میں سے کر دے ' اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کو باقی رکھا حتی کہ آپ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے ' احکام اسلام کی تجدید کریں گے اور آپ کا نزول دجال کے خروج کے زمانہ کے موافق ہو گا سو آپ اس کو قتل کریں گے۔
(۴) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول سے نصاری کے جھوٹے دعوؤں کا رد ہو گا جو وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق کرتے رہے وہ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور یہ کہ یہودیوں نے ان کو سولی دی اور وہ مرنے کے تین دن بعد زندہ ہو گئے۔
(۵) نیز حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آنے کی بشارت دی تھی اور مخلوق کو آپ کی تصدیق اور اتباع کی دعوت دی تھی اس لیے خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو نازل فرمایا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے ' احکام نافذ کرنے والے ' عدل کرنے والے ' وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے ' خنزیر کو قتل کریں گے ' جزیہ موقوف کر دیں گے اور اس قدر مال لٹائیں گے کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہیں ہو گا ' حتی کہ ایک سجدہ کرنا دنیا اور مافیہا سے بہتر ہو گا ' اور تم چاہو تو (اس کی تصدیق میں) یہ آیت پڑھو: (آیت) " وان من اھل الکتب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ " " اہل کتاب میں سے ہر شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا۔ " (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۳۴۴۸ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۴۲ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۲۴۰ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۴۰۷۸ ' مسند احمد ج ۳ ' رقم الحدیث: ' ۱۰۹۴۴ ' صحیح ابن حبان ج ۱۵ ' رقم الحدیث: ۶۸۱۸ ' مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۳۹۹ ' رقم الحدیث: ۲۰۸۴۰ ' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ ' ص ۱۴۴ ' رقم الحدیث: ۱۹۳۴۱ ' شرح السنۃ ج ۷ ' رقم الحدیث: ۴۱۷۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس وقت تمہاری کیا شان ہو گی جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہو گا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۳۴۴۹ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۴۴ ' مسند احمد ج ۲ ص ۳۳۶ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث: ۲۰۸۴۱ ' شرح السنہ ج ۷ ' رقم الحدیث: ۴۱۷۲)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہکر جنگ کرتی رہے گی اور وہ قیامت تک غالب رہے گی کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نازل ہوں گے ' ان (مسلمانوں) کا امیر کہے گا آئیے آپ ہم کو نماز پڑھائیے۔ حضرت عیسیٰ اس امت کی عزت افزائی کے لیے فرمائیں گے نہیں تمہارے بعض ' بعض پر امیر ہیں۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۳۸۴ ' ۳۴۵ ' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے ' عیسیٰ بن مریم فج روحاء (مدینہ سے چھ میل دور ایک جگہ) میں ضرور بلند آواز سے تلبیہ (لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک) کہیں گے در آں حالیکہ وہ حج کرنے والے ہوں گے ' یا عمرہ کرنے والے ہوں گے یا (دونوں کو ملا کر) حجِ قران کرنے والے ہوں گے۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۱۲۵۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم ضرور نازل ہوں گے ' احکام نافذ کرنے والے ' انصاف کرنے والے امام عادل ہوں گے ' وہ ضرور راستوں پر حج یا عمرہ کرنے جائیں گے وہ ضرور میری قبر آئیں گے اور مجھ کو سلام کریں گے اور میں ان کے سلام کا جواب دوں گا ' حضرت ابوہریرہ (رض) نے (راوی سے) کہا اے میرے بھتیجے اگر تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان کو میرا اسلام کہنا ' یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور امام بخاری اور امام مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا ' امام ذہبی نے یہ حدیث صحیح ہے۔ (المستدرک ج ۲ ص ۵۹۵ ' مطبوعہ مکتبہ دارالباز مکہ مکرمہ ' المطالب العالیہ ج ۴ ص ۲۳)

حضرت نواس بن سمعان کلابی (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دجال کا ذکر فرمایا اور اس کے ذکر میں آپ نے آواز پست بھی کی اور بلند بھی ' (یا اس کو بہت معمولی بھی قرار دیا اور بہت ہول ناک بھی) حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں (یہیں کہیں) ہے ' ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہوئے اور پھر حاضر ہوئے ' آپ نے ہمارے چہروں کو وحشت زدہ دیکھ کر پوچھا: تمہیں کیا ہو گیا؟ ہم نے کہا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے دجال کا ذکر کیا اور اس کی حقارت اور ہول ناکی کو بیان کیا حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں ہے ' آپ ﷺ نے فرمایا دجال سے زیادہ مجھے ایک اور چیز کا تم پر خدشہ ہے اگر (بالفرض) دجال کا ظہور میرے سامنے ہوا تو تمہارے بجائے میں اس کے خلاف حجت پیش کروں گا ' اور اگر دجال کا ظہور اس وقت ہوا جب میں تم میں نہ ہوں گا تو ہر شخص خود اس کے مقابلہ میں حجت پیش کرے گا ' اور میری طرف سے ہر مسلمان کا اللہ محافظ ہے ' دجال گھنگریالے بالوں والا جوان ہوگا ' اس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہوگی (کانا ہوگا) گویا کہ میں اس کو (زمانہ جاہلیت کے ایک شخص) عزیٰ بن قطن کے غلام کے مشابہ پاتا ہوں ' تم میں سے جو شخص اس کو دیکھے وہ سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے ' آپ ﷺ نے فرمایا وہ شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا ' اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا ' ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اس کا زمین میں قیام کتنی مدت کے لیے ہوگا؟ آپ نے فرمایا چالیس دن تک ' ایک دن دن ایک سال کی طرح ہوگا ' اور ایک دن ایک مہینہ کی طرح ہوگا ' اور ایک دن ایک جمعہ (سات دنوں) کی طرح ہوگا ' اور باقی دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے ' ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ بتلایئے جو دن ایک سال کی طرح ہوگا اس میں ہمیں ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن تم اندازہ سے نماز کے اوقات مقرر کرلینا ' ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ زمین میں کس قدر تیز رفتاری سے چلے گا؟ آپ نے فرمایا: جس تیز رفتاری سے ہوا بادلوں کو چلاتی ہے ' پھر وہ لوگوں کے پاس جا کر ان کو اپنی دعوت دے گا وہ اس کی تکذیب کریں گے ' اور اس پر رد کریں گے ' جب وہ وہاں سے واپس ہوگا تو ان لوگوں کے اموال اس کے ساتھ چل پڑیں گے اور صبح کو وہ لوگ خالی ہاتھ رہ جائیں گے ' پھر وہ دوسرے لوگوں کے پاس جائے گا اور ان کو دعوت دے گا وہ اس کی دعوت قبول کرلیں گے ' اور اس کی تصدیق کریں گے ' وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش ہونے لگے گی ' زمین کو درخت اگانے کا حکم دے گا تو وہ درخت اگائے گی ' شام کو ان کے مویشی اپنی چراگاہوں سے اس طرح لوٹیں گے کہ ان کے کوہان لمبے ' کولہے چوڑے اور پھیلے ہوئے اور تھن دودھ سے بھرے ہوں گے ' پھر وہ ایک ویران زمین سے کہے گا کہ اپنے خزانے نکالو ' اور جب لوٹے گا تو زمین کے خزانے اس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کے سرداروں کی طرح (بکثرت) چل رہے ہوں گے ' پھر وہ ایک جوان شخص کو بلائے گا جو بھرپور جوان ہوگا ' اور تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کردے گا پھر اس کو بلائے گا تو وہ خوشی سے ہنستا ہوا اس کے پاس آئے گا ' وہ اسی حال میں ہوگا کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ جامع مسجد دمشق کے سفید مشرقی منارہ پر اس حال میں اتریں گے کہ انھوں نے ہلکے زرد رنگ کے دو حلے پہنے ہوئے ہوں گے اور انھوں نے دو فرشتوں کے بازؤں پر ہاتھ رکھے ہوئے

ہوں گے جب آپ سر نیچا کریں گے تو پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے اور جب آپ سر اوپر اٹھائیں گے تو موتیوں کی طرح سفید چاندی کے دانے جھڑ رہے ہوں گے ' جس کافر تک آپ کے سانس کی بو پہنچے گی وہ مر جائے گا اور آپ کے سانس کی بو حد نگاہ تک پہنچے گی ' پھر حضرت عیسیٰ دجال کو تلاش کریں گے حتیٰ کہ اس کو لد کے دروازے پر پاکر قتل کر دیں گے ' پھر جب تک اللہ چاہے گا وہاں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) رہیں گے ' پھر اللہ تعالیٰ آپ کی طرف وحی کرے گا کہ میرے بندوں کو پہاڑ طور کی طرف جمع کرو ' کیونکہ میں وہاں اپنی ایک ایسی مخلوق اتاروں گا جس سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے ' آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ اللہ کے ارشاد کے مطابق ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے آئیں گے ' آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ پہلے بحیرہ طبریہ سے گزریں گے اور اس کا سارا پانی پی جائیں گے ' پھر یہاں سے ان کے آخری لوگ گزریں گے اور کہیں گے کہ شاید کبھی یہاں پانی تھا ' پھر وہ چلتے چلتے بیت المقدس کے پہاڑ تک پہنچیں گے ' اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو تو اب قتل کر لیا چلو اب آسمان والوں کو قتل کریں ' وہ آسمان کی طرف تیر پھنکیں گے ' اللہ ان کے خون آلودہ تیر واپس بھیج دے گا ' اور حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب کا محاصرہ کیا جائے گا ' حتیٰ کہ (بھوک کی وجہ سے) ان کے نزدیک بیل کا سر تمہارے سو دیناروں سے زیادہ قیمتی ہوگا ' پھر حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان (یاجوج ماجوج) کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا کرے گا حتیٰ کہ وہ سب یک لخت مر جائیں گے ' پھر جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے اصحاب کے ساتھ اتریں گے تو ان کی بدبو ' اور ان کی چربی اور ان کے خون سے ایک بالشت جگہ بھی خالی نہیں پائیں گے ' پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب دعا کریں گے تو اللہ لمبی گردن والے اونٹوں کی مثل پرندے بھیجے گا ' جو انھیں اٹھا کر پہاڑ کے غار میں پہنچا دیں گے ' مسلمان ان کے تیر و ترکش سات سال تک جلائیں گے ' پھر اللہ ایک بارش بھیجے گا جو ہر گھر اور ہر خیمہ تک پہنچے گی ' اور تمام زمین کو دھو کر شیشہ کی طرح صاف شفاف کر دے گی ' پھر زمین سے کہا جائے گا اپنے پھل باہر نکال اور اپنی برکتیں لوٹا ' سو اس دن ایک جماعت ایک انار کھائے گی اور اس کے چھلکے کے سائے میں بیٹھے گی ' دودھ میں اتنی برکت ہوگی کہ ایک اونٹنی کا دودھ پوری جماعت کے لیے کافی ہوگا ' ایک گائے کے دودھ سے ایک قبیلہ سیر ہو جائے گا اور ایک بکری دودھ ایک چھوٹے قبیلہ کے لیے کافی ہوگا ' وہ اس حال میں ہوں گے کہ اللہ ایک ہوا بھیجے گا جو ہر مومن کی روح کو قبض کر لے گی پھر (برے) لوگ باقی رہ جائیں گے وہ عورتوں سے اس طرح کھلم کھلا جماع کریں گے جس طرح گدھے کرتے ہیں ' ان ہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی ' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۲۲۴۷ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ' ۲۹۳۷ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ' ۴۳۲۱ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ' ۴۰۷۵ ' مسند احمد ۴ ' رقم الحدیث : ' ۱۸۱ ' المستدرک ج ۴ ص ۹۲) (تبیان، ابن کثیر)

(۸) امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں دجال نکلے گا وہ چالیس۔۔تک ٹھہرے گا ' پتا نہیں آپ نے چالیس دن فرمایا تھا ' یا چالیس ماہ یا چالیس سال فرمایا تھا ' پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا ' گویا کہ وہ عروہ بن مسعود کی مثل ہوں گے ' وہ دجال کو ڈھونڈ کر اس کو ہلاک کر دیں گے ' پھر لوگ سات سال تک ٹھہرے رہیں گے ' پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا ' اور روئے زمین میں جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی خیر یا ایمان ہوگا وہ اس کی روح کو قبض کرے گی اور زمین میں برے لوگ باقی رہ جائیں گے نہ وہ کسی نیکی کو پہچانیں گے نہ کسی برائی کا انکار کریں گے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث : ۲۹۴۰ ' مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۶ ' المستدرک ج ۴ ص ۵۴۳)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ رومی اعماق یا دابق (شام کے دو مقامات جو حلب کے قریب ہیں) نہ پہنچ جائیں ' پھر ان (سے لڑنے) کے لیے مدینہ سے ایک لشکر روانہ ہوگا ' وہ اس وقت روئے زمین پر سب سے نیک لوگ ہوں گے ' جب دونوں لشکر صف آراء ہوں گے تو رومی (مسلمانوں سے) کہیں گے تم ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان نہ آؤ جنہوں نے ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنالیا ہے ' مسلمان کہیں گے نہیں بخدا ہم تم کو اپنے بھائیوں سے لڑنے کے لیے نہیں چھوڑیں گے ' پھر وہ ان سے لڑیں گے تو ان میں سے ایک تہائی مسلمان بھاگ جائیں گے ' اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کبھی قبول نہیں کرے گا ' اور ایک تہائی مسلمان قتل کردیئے جائیں گے ' وہ اللہ کے نزدیک افضل الشہداء ہوں گے ' بقیہ تہائی فتح حاصل کریں گے وہ کبھی آزمائش میں مبتلا نہیں ہوں گے ' وہ قسطنطنیہ کو فتح کرلیں گے ' جس وقت وہ مال غنیمت کو تقسیم کریں گے اور اپنی تلواریں زیتوں کے درختوں پر لٹکادیں گے ' تو اچانک شیطان چیخ مار کر کہے گا ' تمہارے بال بچوں کے پاس مسیح دجال پہنچ گیا ہے ' مسلمان وہاں سے نکل پڑیں گے ' اور نماز قائم کی جائے گی تو حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے اور وہ مسلمان کو نماز پڑھائیں گے ' اور جب اللہ کا دشمن (دجال) ان کو دیکھے گا تو وہ اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے ' اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس کو چھوڑ دیتے تب بھی وہ پگھل کر ہلاک ہوجاتا ' لیکن اللہ ان کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ سے قتل کرے گا اور ان کے نیزے پر اس پر خون (لوگوں کو) دکھائے گا۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۸۹۷)

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری طرف متوجہ ہوئے ہم اس وقت مذاکرہ کر رہے تھے ' آپ نے پوچھا تم کس چیز کا ذکر کر رہے ہو ' صحابہ نے کہا ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں ' آپ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس علامتیں نہ دیکھ لو پھر آپ نے دخان (دھوئیں) دجال ' دابۃ الارض ' سورج کا مغرب سے طلوع ' عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا نزول ' یاجوج ماجوج ' تین بار زمین کا دھنسنا ' مشرق میں دھنسنا ' مغرب میں دھنسنا ' جزیرۃ العرب کا دھنسنا ' اس کی آخری علامت آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث: ۲۹۰۱ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث: ۴۳۱۱ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۲۱۹۰ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۴۰۴۱ ' مسند احمد ج ۵ ' رقم الحدیث: ۱۶۴۴ ' مسند الطیالسی " رقم الحدیث: ۱۰۶۷ ' مسند الحمیدی ' رقم الحدیث: ۸۲۷ ' شرح السنہ ' رقم الحدیث: ۴۲۵۰)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ ارشاد فرمایا میری امت کے دو جماعتوں کو اللہ آگ سے محفوظ رکھے گا ' ایک وہ جماعت جو ہند میں جہاد کرے گی ' دوسری وہ جماعت جو عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے ساتھ ہوگی۔ (سنن نسائی ' رقم الحدیث: ۳۱۷۵ ' مسند احمد ۵ ص ۲۸۷ ' المعجم الاوسط ' رقم الحدیث: ۶۷۳۷ ' اس کے تمام راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۸۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میرے اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے ' اور وہ (آسمان سے) نازل ہوں گے ' جب تم ان کو دیکھو گے تو پہچان لوگے ' ان کا رنگ سرخی آمیز سفید ہوگا ' قد متوسط ہوگا دو ہلکے زرد حلے پہنے ہوں گے ' ان پر تری نہیں ہوگی لیکن گویا ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے ' وہ لوگوں سے اسلام پر قتال کریں گے ' صلیب کو توڑ دیں گے جزیہ موقوف کردیں گے ' اللہ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کو مٹادے گا ' وہ مسیح دجال کو ہلاک کریں گے ' چالیس سال زمین

میں قیام کرنے کے بعد وفات پائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۴۳۲۴ 'مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۷ 'جامع جز ۶ ص ۱۶ 'طبع دارالمعرفہ)

حضرت مجمع بن جاریہ انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن مریم 'دجال کو لد (بیت المقدس کے قریب فلسطین کی ایک بستی ہے) کے دروازے کے قریب قتل کریں گے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۲۲۵۱ 'مسند احمد ج ۵ ' رقم الحدیث : '۱۵۴۶۶ 'المعجم الکبیر ج ۱۹ ' رقم الحدیث : '۱۰۷۷ 'مسند الطیالسی ' رقم الحدیث : '۱۲۲۷ 'مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : '۲۰۸۳۵ 'مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ ' رقم الحدیث : '۱۹۳۳۹)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک تم میں عیسیٰ بن مریم نازل نہ ہو جائیں احکام نافذ کرنے والے 'عدل کرنے والے 'وہ صلیب کو توڑیں گے 'خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ کو موقوف کردیں گے 'اور اس قدر مال عطا کریں گے کہ اس کو لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : '۲۴۷۶ 'نحوہ صحیح مسلم ' رقم الحدیث : '۱۵۵ 'سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : '۴۰۷۸ 'مسند احمد ج ۲ ص ۴۹۴ 'مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ ' رقم الحدیث : ' ۱۹۳۴۱)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گا ' پس میں شفاعت کروں گا 'اور میری امت کے لوگ عنقریب عیسیٰ بن مریم کو پائیں گے اور دجال سے قتال کا مشاہدہ کریں گے۔ (المعجم الاوسط ج ۵ ' رقم الحدیث : '۴۱۷۲ 'حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے المستدرک ج ۴ ص ۵۴۴ 'مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۴۹)

(۱۶) امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے جو شخص عیسیٰ بن مریم کو پائے ان کو میری طرف سے سلام کہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ (المستدرک ج ۴ ص ۵۴۵)

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب تک دس علامتیں (ظاہر) نہ ہوں قیامت قائم نہیں ہوگی 'مشرق میں زمین دھنس جائے گی 'اور مغرب میں اور جزیرہ عرب میں 'اور دجال کا خروج ہوگا اور دھوئیں کا ظہور ہوگا 'اور عیسیٰ کا نزول ہوگا 'اور یاجوج ماجوج اور دابۃ الارض 'اور سورج کا مغرب سے طلوع 'اور عدن کے وسط سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔ (المعجم الکبیر ج ۲۲ ص ۸۰۔ ۷۹ 'المستدرک ج ۴ ص ۴۲۸ 'مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۲۸)

حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا مجھے امید ہے کہ اگر میری عمر طویل ہوئی تو میں عیسیٰ بن مریم کو پالوں گا 'اور اگر مجھے جلدی موت آگئی تو جو ان کو پائے وہ ان کو میرا سلام کہہ دے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۹۹ '۳۹۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت)

حضرت عبداللہ بن سلام اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ تورات میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت لکھی ہوئی ہے اور عیسیٰ بن مریم آپ کے ساتھ دفن کیے جائیں گے 'ابو مودود نے آپ کے روضہ میں ایک قبر کی جگہ رکھی ہوئی ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب (سنن ترمذی رقم الحدیث : ۳۶۳۷ 'مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۰۶)

حضرت اوس بن اوس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) جامع دمشق کے سفید مشرقی کنارہ کے پاس نازل ہوں گے۔ (المعجم الکبیر ج ا رقم الحدیث: ۵۹۰ 'مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۰۵ 'الجامع الصغیر ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۰۰۲۳ 'الجامع الکبیر ج ۹ 'رقم الحدیث: ۲۸۹۰۴ 'تہذیب تاریخ دمشق ج ۵ ص ۳۰۴)

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت میں سے بعض لوگ ہمیشہ حق پر قائم رہیں گے 'جو ان سے عداوت رکھے گا ان پر غالب رہیں گے 'حتی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم آجائے گا 'اور عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نازل ہوں گے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۴۲۹ 'یہ حدیث صحیح ہے 'اقامۃ البرہان ص ۵۸)

حضرت سیدتنا عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس تشریف لائے درآں حالیکہ میں رو رہی تھی ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم کس وجہ سے رو رہی ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں دجال کو یاد کرکے رو رہی ہوں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر (بالفرض) وہ میری زندگی میں نکلا تو میں اس کے لیے کافی ہوں 'اور اگر میرے بعد دجال نکلا تو تمہارا رب عزوجل کانا نہیں ہے 'وہ اصفہان (ایران کا ایک شہر) کے یہودیوں میں سے نکلے گا 'حتی کہ مدینہ پہنچے گا اور اس کی ایک جانب میں ٹھہرے گا 'اس دن مدینہ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ میں دو فرشتے ہوں گے 'اور سب برے لوگ دجال کے ساتھ آملیں گے 'حتی کہ وہ شام میں پہنچے گا 'اور فلسطین کی بستی لد کے دروازہ میں آئے گا 'پھر عیسیٰ (علیہ السلام) نازل ہوں گے اور اس کو قتل کردیں گے 'پھر عیسیٰ (علیہ السلام) زمین پر چالیس سال ٹھہریں گے 'درآں حالیکہ وہ امام عادل 'اور انصاف کرنے والے حاکم ہوں گے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ 'رقم الحدیث: '۱۹۳۲۰ 'مسند احمد ج ۶ ص ۷۵ 'اس حدیث کے راوی صحیح اور ثقہ ہیں مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۳۸)

(۲۲) امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مغفل (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب سے اللہ نے آدم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے قیامت تک دجال سے بڑا فتنہ روئے زمین پر نازل نہیں کیا 'اور میں تم کو اس کے متعلق ایسی بات بتاتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں بتائی 'وہ گندمی رنگ کا ہوگا 'اس کے بال گھنگریالے ہوں گے اور اس کی بائیں آنکھ رگڑی ہوئی ہوگی۔ اس کی دونوں آنکھوں پر دبیز گوشت چڑھا ہوا ہوگا 'ہو کہے گا میں تمہارا رب ہوں 'سو جس نے کہہ دیا کہ میرا رب اللہ ہے وہ کسی آزمائش میں نہیں پڑے گا اور جس نے کہہ دیا تو میرا رب ہے وہ آزمائش میں پڑ جائے جائے گا 'جب تک اللہ چاہے گا وہ تم میں سے ٹھہرے گا 'پھر عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے 'درآں حالیکہ وہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے 'اور آپ کی ملت پر ہوں گے 'امام مہدی 'حاکم اور عادل ہوں گے سو وہ دجال کو قتل کردیں گے۔ (المعجم الاوسط ج ۵ 'رقم الحدیث: '۴۵۷۷ 'اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۳۶)

(۲۳) امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوامامہ باہلی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے دجال کے متعلق ہمیں بہت طویل خطبہ دیا 'اور ہمیں دجال دے ڈرایا 'اور فرمایا جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو زمین میں پھیلایا ہے دجال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے 'اور اللہ عزوجل نے جس نبی کو بھی بھیجا اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا اور میں نبیوں میں سب سے آخر ہوں اور تم امتوں میں سب سے آخر ہو 'اور وہ لامحالہ نکلنے والا ہے

اگر وہ (بالفرض) تمہارے درمیان میری موجودگی میں نکلا 'تو میں ہر مسلمان کی طرف سے اس سے مقابلہ کروں گا 'اور اگر وہ میرے بعد نکلا تو ہر شخص خود اس سے مقابلہ کرے گا اور ہر مسلمان میری طرف سے نگہبان ہے 'اور وہ شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا 'وہ اپنے دائیں اور بائیں فساد برپا کرے گا 'اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا 'میں عنقریب تمہارے لیے اس کی صفات بیان کروں گا جو مجھ سے پہلے کسی نبی نے بیان نہیں کیں وہ ابتداء یہ کہے گا کہ میں نبی ہوں 'حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے 'پھر دوبارہ یہ کہے گا 'میں تمہارا رب ہوں 'حالانکہ تم موت سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھو گے 'اور وہ کانا ہو گا اور تمہارا رب کانا نہیں ہے اور اس کی آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہو گا 'جس کو ہر مومن پڑھے گا خواہ وہ لکھنے والا ہو یا نہ ہو۔ اور دجال کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ اس کے ساتھ جنت اور دوزخ ہو گی 'حالانکہ اس کی دوزخ جنت جنت ہو گی اور اس کی جنت دوزخ ہو گی 'جو شخص اس کی دوزخ میں مبتلا ہو وہ اللہ سے مدد طلب کرے 'اور سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے 'تو اس پر وہ دوزخ ٹھنڈک اور سلامتی والی ہو جائے گی جیسا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی 'اور اس کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ وہ ایک اعرابی سے کہے گا یہ بتا کہ اگر میں تیرے لیے تیرے ماں باپ کو زندہ کر دوں تو کیا تو یہ گواہی دے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ کہے گا ہاں! پھر وہ دو شیطانوں کو اس کے ماں باپ کی صورتوں میں متمثل کر دے گا اور وہ کہیں گے اے میرے بیٹے اس کی اطاعت کرو یہ تمہارا رب ہے 'اور اس کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ وہ ایک شخص پر مسلط ہو کر اس کو قتل کر دے گا اس کے آری سے دو ٹکڑے کر دے گا 'پھر کہے گا اب میرے اس بندے کی طرف دیکھو میں اس کو زندہ کرتا ہوں پھر کیا یہ گمان کرے گا کہ میرے سوا اس کا کوئی رب ہے؟ اللہ اس شخص کو زندہ کر دے گا 'اور وہ خبیث اس شخص سے کہے گا 'تیرا رب کون ہے 'وہ کہے گا میرا رب اللہ ہے! اور تو اللہ کا دشمن ہے اور تو دجال ہے بہ خدا مجھے آج سے پہلے تیرے متعلق اتنی بصیرت نہ تھی!

ابوالحسن طنافی (امام ابن ماجہ کے شیخ) نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوسعید (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: وہ شخص میری امت میں سے جنت کے سب بلند درجہ میں ہو گا 'ابوسعید نے کہا بہ خدا ہمیں یہ یقین تھا کہ وہ شخص حضرت عمر بن خطاب (رض) ہیں 'حتی کہ وہ شہید ہو گئے 'محاربی نے کہا اب ہم پھر ابورافع (حضرت ابوامامہ باہلی) کی روایت کی طرف رجوع کرتے ہیں!

آپ نے فرمایا: اور دجال کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش ہو گی 'اور زمین کو درخت اگانے کا حکم دے تو زمین درخت اگائے گی 'اور اس کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ وہ ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے گا تو وہ اس کی تکذیب کریں گے سو ان کے تمام مویشی ہلاک ہو جائیں گے 'اور اس کے فتنوں میں سے یہ ہے کہ وہ ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے گا وہ اس کی تصدیق کریں گے تو وہ آسمان کو بارش کا حکم دے گا تو بارش ہو جائے گی اور زمین کو سبزہ اگانے کا حکم دے گا تو زمین سبزہ اگائے گی حتیٰ کہ ان کے مویشی چریں گے 'اور وہ پہلے سے بہت موٹے اور فربہ ہو جائیں گے ان کی کوکھیں بھری ہوئی ہوں گی اور ان کے تھن دودھ سے پر ہوں گے 'وہ تمام روئے زمین کا سفر کر کے اس پر غلبہ حاصل کرے گا ماسوا مکہ اور مدینہ کے 'ان کے درمیان پہاڑی راستوں پر وہ نہیں جا سکے گا اور ہر راستہ پر فرشتے تلواریں سونتے کھڑے ہوں گے 'حتیٰ کہ وہ بنجر زمین میں ایک چھوٹی پہاڑی پر اترے گا 'پھر مدینہ میں تین زلزلے آئیں گے 'اور ہر منافق مرد اور ہر منافق عورت نکل کر اس کی اس کی طرف آ جائیں گے۔ سو مدینہ اپنے میل کچیل کو اس طرح نکال دے گا جس طرح بھٹی لوہے کے زنگ کو نکال دیتی ہے 'اور وہ دن یوم نجات کہلائے گا 'پھر ام شریک بنت العکر نے کہا یا رسول اللہ! اس دن عرب کہاں ہوں گے؟ آپ نے فرمایا عرب اس دن کم ہوں گے 'اور وہ سب بیت المقدس میں ہوں گے 'اور ان کا امام ایک نیک شخص ہو گا جس وقت ان کا امام ان کو صبح کی

نماز پڑھا رہا ہوگا 'اس وقت صبح کو عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے 'وہ امام الٹے پیر پیچھے ہٹ جائے گا 'تا کہ حضرت عیسیٰ آگے بڑھ کر نماز پڑھائیں۔ پھر عیسیٰ (علیہ السلام) اپنا ہاتھ اس کے دو کندھوں پر رکھ کر فرمائیں گے 'آگے بڑھو 'نماز پڑھو 'نماز پڑھاؤ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے 'پھر ان کا امام ان کو نماز پڑھائے گا 'جب وہ نماز پڑھ لے گا تو عیسیٰ (علیہ السلام) فرمائیں گے (مسجد کا) دروازہ کھول دو 'دروازہ کھولا جائے گا تو اس کے پیچھے ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ دجال ہوگا 'وہ سب موٹی چادریں اوڑھے تلواروں سے مسلح ہوں گے 'جب دجال حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے اور وہ وہاں سے بھاگے گا 'عیسیٰ فرمائیں گے میں تجھے ایک ایسی ضرب لگاؤں گا جس سے تو زندہ نہ رہ سکے گا پھر اس کو لد (فلسطین کی ایک بستی) کے مشرقی دروازہ کے پاس قتل کر دیں گے 'پھر یہودی شکست کھا جائیں گے وہ جس چیز کے پیچھے جا کر چھپیں گے وہ چیز بتادے گی یہاں چھپا ہوا ہے خواہ وہ پتھر ہو 'درخت ہو 'دیوار ہو یا کوئی جانور ہو۔ اس سے آواز آئے گی اے اللہ کے مسلمان بندے یہ یہودی ہے؟ اس کو قتل کر دے۔ الحدیث بطولہ۔ سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث : ۴۰۷۷ 'المستدرک ج ۴ ص ۵۳۶ 'شرح المواہب اللدنیہ ج ۶ ص ۵۳ '۶۱)

(۲۴) امام جعفر صادق اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خوش ہو جاؤ اور لوگوں کو خوش خبری دو 'میری امت کے مثال بارش کی طرح ہے پتا نہیں اس کے اول میں خیر ہے یا آخر میں 'یا اس باغ کی طرح ہے جس سے ایک سال تک ایک فوج کھاتی رہی 'پھر دوسرے سال ایک اور فوج کھاتی رہی اور شاید دوسری فوج زیادہ وسیع 'عریض اور حسین تھی اور وہ امت کیسے ہلاک ہوگی جس کے اول میں میں ہوں وسط میں مہدی ہے اور آخر میں مسیح ہے لیکن ان کے درمیان ایسے ٹیڑھے لوگ بھی ہوں گے جو نہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اس سے ہوں۔ (مشکوۃ ص ۵۸۳ مطبوعہ دہلی)

(۲۵) امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں :

طاؤس روایت کرتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے درآں حالیکہ وہ امام اور ہادی ہوں گے اور عدل وانصاف کرنے والے 'جب وہ نازل ہوں گے تو صلیب کو توڑ دیں گے 'اور خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے 'اور بھیڑیا بکریوں کے ساتھ کتے کی طرح۔ الحدیث : (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ 'رقم الحدیث : ۲۰۸۴۳ 'مطبوعہ بیروت '۱۳۹۰ھ)

(۲۶) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نازل نہ ہو جائیں ' وہ امام عادل ہوں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے۔ جزیہ کو موقوف کریں گے۔

رب العلمین کے لیے ایک (طرح کا) سجدہ ہوگا 'جنگ اپنے بوجھ اتار دے گی اور زمین اسلام سے اس طرح بھر جائے گی جس طرح کنواں پانی سے بھر جاتا ہے اور زمین کو دستر خوان بنا دیا جائے گا اور عداوت اور بغض کو اٹھا لیا جائے گا بھیڑیا بکریوں میں کتے کی طرح ہوگا 'اور شیر اونٹنیوں میں ان کے نر کی طرح ہوگا۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۸ 'رقم الحدیث : ۲۰۸۴۴)

(۲۷) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تمام انبیاء باپ شریک بھائی ہیں۔ ان کا دین واحد ہے اور ان کی مائیں (شریعتیں) مختلف ہیں۔ ان میں میرے سب سے قریب عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ہیں کیونکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی رسول نہیں ہے 'وہ ضرور تم میں نازل ہوں گے ان کو پہچان لینا وہ متوسط القامت اور سرخی مائل سفید ہوں گے 'خنزیر کو قتل کر دیں گے 'صلیب کو توڑ دیں گے 'جزیہ کو موقوف کر دیں گے 'اسلام کے سوا اور کسی دین کو قبول نہیں کریں گے 'ان کی دعوت صرف ایک ہوگی رب العلمین کے لیے۔ ان کے زمانہ میں عدل ہوگا 'حتی کہ شیر گایوں کے ساتھ اور بھیڑیا بکریوں اور بچے سانپوں کے ساتھ

کھیلیں گے اور کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ رقم الحدیث : ۲۰۸۴۵ 'مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ رقم الحدیث : ۱۹۳۷۲)

(۲۸) یزید بن اصم بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہ (رض) کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم دیکھتے ہو کہ میں بہت بوڑھا ہوچکا ہوں 'اور بڑھاپے کی وجہ سے میں جاں بلب ہو رہا ہوں اور بہ خدا مجھے امید ہے میں عیسیٰ کو پالوں گا اور ان کو میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث بیان کروں گا اور وہ میری تصدیق کریں گے۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ رقم الحدیث : ۲۰۸۴۶)

امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ عبسی متوفی ۲۳۵ ھ روایت کرتے ہیں :

(۲۹) حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نازل ہوں گے جب دجال ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جس طرح چربی پگھل جاتی ہے، پھر دجال قتل کردیا جائے گا اور یہود اس سے منتشر ہوجائیں گے 'پس ان کو قتل کیا جائے گا حتی کہ پتھر کہے گا اے اللہ کے مسلمان بندے یہ یہودی ہے اس کو قتل کردے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ رقم الحدیث : ۱۹۳۴۰)

(۳۰) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے۔فج روحاء میں ضرور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حج یا عمرہ یا قران کا تلبیہ پڑھیں گے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ 'رقم الحدیث : ۲۰۸۴۲ 'شرح السنہ ج ۷ رقم الحدیث : ۱۹۳۷۲)۔

(۳۱) حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا مسیح کے خروج کے لیے مساجد کی تجدید کی جائے گی وہ عنقریب نکلیں گے 'صلیب کو توڑ دیں گے 'اور خنزیر کو قتل کریں گے 'جو شخص ان کو پائے گا وہ ان پر ایمان لے آئے گا تم میں سے جو شخص ان کو پائے وہ ان کو میرا اسلام پہنچائے پھر انھوں نے میری طرف (یعنی ابن المغیرہ کی طرف) توجہ کی اور کہا میرے خیال میں تم سب سے کم عمر ہو پس اگر تم ان کو پاؤ تو میرا اسلام کہنا (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ 'رقم الحدیث : ۲۰۸۴۳')

(۳۲) امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : سنو عیسیٰ بن مریم اور میرے درمیان کوئی نبی ہے نہ کوئی رسول ہے۔ سنو وہ میری امت میں میرے بعد خلیفہ ہوں گے 'سنو وہ دجال کو قتل کریں گے 'اور صلیب کو توڑ دیں گے 'اور جزیہ کو موقوف کریں گے اور جنگ اپنے بوجھ اتار دے گی 'سنو تم میں سے جو شخص ان کو پائے وہ انھیں میرا اسلام پہنچا دے۔ (المعجم الصغیر 'رقم الحدیث : ۷۲۵ 'المعجم الاوسط ج ۵ 'رقم الحدیث : ۴۸۹۵)

(۳۳) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے اور لوگوں میں چالیس سال ٹھیریں گے۔ (المعجم الاوسط ج ۶ 'رقم الحدیث : ۵۴۶۰)

(۳۴) حضرت سمرہ بن جندب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دجال نکلنے والا ہے 'وہ کانا ہوگا اس کی بائیں آنکھ پر ناخن کے برابر دبیز گوشت ہوگا 'وہ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرے گا 'اور مردوں کو زندہ کرے گا 'اور لوگوں سے کہے گا میں تمہارا رب ہوں 'پس جس نے کہا تو میرا رب ہے 'ہو فتنہ میں پڑگیا اور جس نے کہا میرا رب اللہ ہے حتی کہ مرگیا 'وہ دجال کے فتنہ سے بچ گیا اور اس پر کوئی فتنہ نہیں ہوگا 'جب تک اللہ چاہے گا وہ زمین پر ٹھیرے گا 'پھر مغرب کی طرف سے عیسیٰ بن مریم

نکلیں گے ٬وہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کریں گے ٬اور دجال کو قتل کریں گے ٬اور یہی قیامت کا قائم ہونا ہے۔
(المعجم الکبیر ج ۷ ٬رقم الحدیث : ۶۹۱۸ ٬مسند احمد ج ۵ ص ۱۳ ٬کشف الاستار عن زوائد البزار ٬رقم الحدیث : ۳۳۹۸)

(۳۵) امام احمد بن عمرو بن عبد الخالق بزار متوفی ۲۹۲ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابو القاسم صادق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس زمانہ میں لوگوں کا اختلاف اور فرقے ہوں گے اس زمانہ میں کانا دجال مسیح الظلالہ مشرق کی طرف سے نکلے گا ٬پھر اللہ تعالیٰ اس کو چالیس دن میں جہاں تک چاہے گا زمین پر پہنچائے گا ٬اس کی مسافت کی مقدار کا اللہ ہی کو علم ہے ٬اور مسلمان بہت سختی اٹھائیں گے ٬پھر عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے نازل ہوں گے ٬پس وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں گے ٬جب وہ رکوع سے سر اٹھائیں گے ٬تو کہیں گے "سمع اللہ لمن حمدہ "اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو قتل کر دے گا اور مسلمانوں کو غالب کر دے گا ٬اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (کشف الاستار عن زوائد البزار ٬رقم الحدیث : ۳۳۸۷)

(۳۶) امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دجال مدینہ میں داخل نہیں ہوگا ٬کیونکہ خندق اور مدینہ کے ہر راستہ میں فرشتے اس کی حفاظت کر رہے ہیں ٬سب سے پہلے عورتیں اور باندیاں اس کی اتباع کریں گی ٬پھر وہ چلا جائے گا پھر لوگ اس کی اتباع کریں گے پھر وہ غصہ میں بھر جا کر واپس جائے گا حتیٰ کہ خندق میں گر جائے گا اس وقت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔
(المعجم الاوسط ج ۶ رقم الحدیث : ۵۴۶۱)

(۳۷) حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

امام محمد بن سعد حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے ٬وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور لوگوں کو ایک دین پر جمع کریں گے ٬اور جزیہ کو موقوف کریں گے۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج ۹ ٬رقم الحدیث : ۲۸۹۰۵)

(۳۸) امام دیلمی نے حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : روئے زمین کے آٹھ سو بہترین مرد اور چار سو بہترین عورتوں پر عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا (جامع الاحادیث الکبیر ج ۹ ٬رقم الحدیث : ۲۸۹۰۵)

(۳۹) امام ابو داؤد الطیالسی نے حضرت ابوہریرہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ دجال پر حضرت عیسیٰ بن مریم کے سوا اور کسی کو مسلط نہیں کیا جائے گا۔ (الجامع الصغیر ج ۲ ٬رقم الحدیث ٬: ۷۲۶۳)

(۴۰) امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اللہ کی قسم ! ابن مریم ضرور نازل ہوں گے ٬احکام نافذ کرنے والے ٬عدل کرنے والے ٬وہ صلیب کو ضرور توڑیں گے ٬خنزیر کو ضرور قتل کریں گے ٬اور جزیہ ضرور موقوف کریں گے اور ضرور اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور کوئی ان پر ڈاکہ نہیں ڈالے گا ٬اور کینہ بغض اور حسد ضرور نکل جائے گا اور وہ مال کی طرف بلائیں گے سو اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ (شرح السنہ ج ۷ ٬رقم الحدیث ٬: ۴۱۷۱ ٬مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۷ ٬۴۰۶)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کے متعلق یہ چالیس احادیث میں نے کتب صحاح ستہ ٬مسانید اور معاجم سے منتخب کی ہیں اور ان تمام احادیث کی اسانید صحیح اور ثقہ راویوں پر مشتمل ہیں ٬اکثر احادیث صحیح ہیں اور بعض حسن ہیں اور کوئی سند بھی درجہ اعتبار سے ساقط نہیں ہے

کتب احادیث میں ان احادیث کے علاوہ اور بھی صحیح اور معتبر احادیث ہیں لیکن میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت اور بشارت کے حصول کے لیے چالیس احادیث پر اکتفاء کی نیز یہ خیال بھی تھا کہ کہیں قارئین اکتاہٹ اور ملال کا شکار نہ ہو جائیں اور ان احادیث کو جمع کرنے کا محرک اور باعث یہ تھا کہ مرزائی بڑے شدومد سے نزول مسیح کا انکار کرتے ہیں۔ سو میں نے پہلے قرآن مجید کی زیر تفسیر آیت سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کو واضح کیا۔ بعد ازاں یہ احادیث بیان کی ہیں جو اپنی کثرت کے اعتبار سے معنی متواتر ہیں۔

آیت مبارکہ:

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ۙ﴿۱۶۰﴾

لغۃ القرآن: [فَبِظُلۡمٍ : تو وجہ ظلم کرنے][مِّنَ : سے][الَّذِيۡنَ : وہ لوگ][هَادُوۡا : جو یہودی ہوئے][حَرَّمۡنَا : ہم نے حرام کردیں][عَلَيۡهِمۡ : ان پر][طَيِّبٰتٍ : کچھ پاک چیزیں][اُحِلَّتۡ : حلال کی گئی تھیں][لَهُمۡ : ان کے لیے][وَبِصَدِّهِمۡ : اور وجہ ان کے روکنے کے][عَنۡ : سے][سَبِيۡلِ : راہ][اللّٰهِ : اللہ][كَثِيۡرًا : بہت زیادہ کو]

ترجمہ: پھر یہودیوں کے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر (کئی) پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو (پہلے) ان کے لیے حلال کی جاچکی تھیں، اور اس وجہ سے (بھی) کہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بکثرت روکتے تھے۔

تشریح: یہ کوئی معمولی جرم نہیں کہ انسان خود اطاعت خداوندی سے محروم رہے لیکن جو شخص دوسروں کے لیے ہدایت کا راستہ بند کرتا ہے اور دعوت حق قبول کرنے سے روکتا ہے اس سے بڑھ کر اور کون مجرم ہوگا۔ دین سے روکنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان زبان اور قوت سے لوگوں کو سچا دین قبول کرنے سے روکے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری صورت بھی ہے جو زیادہ خطرناک ہے وہ یہ کہ انسان دین حق کو قبول تو کرلے لیکن اس کے احکام، اس کے ضابطہ اخلاق اور اس کے قواعد معاشرت وغیرہ پر عمل کرکے اپنی حالت کو نہ سنوارے تو دوسری قومیں خود بخود اس دین سے متنفر ہو جائیں گی کہ جب اس کے قدیم ماننے والے کسی حیثیت سے بھی دوسری قوموں سے بلند اور بہتر نہیں تو پھر اس دین کو کیوں قبول کیا جائے۔ کیا ہم مسلمان کہلانے والے اپنی زشتی اعمال سے دوسری قوموں کے لیے اسلام قبول کرنے میں حجاب اور رکاوٹ تو نہیں؟ یہ غور طلب مسئلہ ہے۔ (ضیاء)

یہود کی سرکشی کی وجہ سے بعض طیبات کی ممانعت

گزشتہ آیت کی حیثیت جملہ معترضہ کی تھی۔اس کے بعد پھر وہی سلسلہ تقریر شروع ہوگیا ہے۔اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یہود پر ایسی پاکیزہ نعمتیں بھی حرام کردی تھیں جنھیں پہلے ان کے لیے حلال کیا گیا تھا۔اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی سرکشی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔جس طرح کسی شخص کے بگاڑ کو روکنے کے لیے اس پر سختی کی جاتی اور پابندیاں لگائی جاتی ہیں اسی طرح اس قوم کو بھی تنبیہ کے لیے بعض حلال چیزوں سے محروم کردیا گیا تھا۔لیکن ان کی یہ محرومی یا ان پر ان سختیوں کا کیا جانا اللہ کی طرف سے ظلم نہیں تھا 'بلکہ ان کے ظلم اور سرکشی کی سزا تھی۔اور مقصود انھیں اس سرکشی سے روکنا تھا۔اس کے بعد چند جملوں میں ان کے اس سرکش رویے کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔سب سے پہلا ان کا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ صرف خود ہی اللہ کے راستے سے منحرف نہیں تھے بلکہ ان کی بیباکی کا عالم یہ تھا کہ وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی سرکشی کے راستے پر ڈالتے اور انھیں ترغیب دیتے تھے کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کی جائے۔چونکہ اس قوم پر ان کے اسی رویے کے باعث لعنت کی گئی ہے اس کا آج تک اثر یہ ہے کہ جہاں بھی اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے کوئی تحریک اٹھتی ہے تو عموماً اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ کام کرتا نظر آتا ہے۔اور خیر کی ہر قوت کا راستہ روکنے اور انھیں ناکام کرنے کے لیے یہودی ہی سب سے پیش پیش ہوتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ وہ سامنے آکر مخالفت کم کرتے ہیں لیکن پس پردہ رہ کر اس مخالفت کے اصل دماغ وہی ہوتے ہیں۔ہماری قریبی تاریخ میں ایک ایسا نظام جو سراسر منفی بنیادوں پر اٹھا اور جس نے ستر سال تک نوع انسانی کو بے پناہ نقصان پہنچایا بہت کچھ شکست ریخت اور ہزیمت اٹھانے کے بعد بھی وہ پوری طرح ختم نہیں ہوا میری مراد کمیونزم ہے 'جس نے دنیا میں پہلی مرتبہ اللہ کے وجود کے انکار پر نظام زندگی کی بنیاد رکھی۔عجیب بات یہ ہے کہ اس کا بانی اور سرغنہ بھی کارل مارکس ایک یہودی تھا۔اور اسی طرح ایک دوسرا نظام زندگی جس نے عقل کے نام پر دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور جس نے ہر سطح پر اخلاق کا انکار کیا اس گمراہی کا امام بھی فرائیڈ ایک یہودی تھا۔

دوسرا جرم ان کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سود لیتے تھے 'حالانکہ انھیں اس سے روکا گیا تھا۔تورات میں سود کی ممانعت کے احکام آج تک موجود ہیں۔مثلاً "اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور سود مت لے۔ "(خروج ۲۲: ۲۵) "تو اس سے سود اور نفع مت لے اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے۔تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے 'نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔ "(احبار ۳۵: ۳۶: ۳۷) عجیب بات یہ ہے کہ ان احکام کے باوجود بھی یہودی دنیا کی سب سے بڑی سود خور قوم ہے۔اور اپنی تنگدلی اور سنگدلی کے لیے مشہور ہے۔اور ان کے شایلاک دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

اور تیسرا جرم ان کا یہ بیان فرمایا گیا کہ وہ لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے ہضم کر جاتے تھے۔تورات میں سود 'رشوت 'خیانت وغیرہ آمدنی کے جن ذریعوں کو حرام قرار دیا گیا تھا انہی کو اختیار کر کے وہ دنیا کے ذرائع پر بہت حد تک قابض ہو چکے ہیں۔

ان کے یہ جرائم ہیں جس کی وجہ سے اللہ نے ان پر بہت ساری حلال نعمتیں حرام کر دیں۔یہاں اگرچہ ان نعمتوں کا ذکر نہیں فرمایا گیا. (روح)

یہودیوں کے خود ساختہ حلال و حرام

اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ حرام کام ان کا مقدر تھا یعنی اللہ کی طرف سے لکھا جا چکا تھا کہ یہ لوگ اپنی کتاب کو بدل دیں، اس میں تحریف کر لیں اور حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالیں، صرف اپنے تشدد اور اپنی سخت گیری کی وجہ سے، دوسرا یہ کہ یہ حرمت شرعی ہے یعنی نزول توراۃ سے پہلے جو بعض چیزیں ان پر حلال تھیں، توراۃ کے اترنے کے وقت ان کی بعض بدکاریوں کی وجہ سے وہ حرام قرار دے دی گئیں جیسے فرمان ہے آیت (كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِھٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ) 3۔ آل عمران: 93) یعنی اونٹ کا گوشت اور دودھ جو حضرت اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، اس کے سوا تمام طعام بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے پھر توراۃ میں ان پر بعض چیزیں حرام کی گئیں، جیسے سورۃ انعام میں فرمایا آیت (وَعَلَي الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ) 16۔ النحل: 118) یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن دار جانور حرام کر دیا اور گائے بکری کی چربی بھی جو الگ تھلگ ہو، ہم نے ان پر حرام قرار دے دی، یہ اس لیے کہ یہ باغی، طاغی، مخالف رسول اور اختلاف کرنے والے لوگ تھے پہلے یہاں بھی یہی بیان ہو رہا ہے کہ ان کے ظلم و زیادتی کے سبب وہ خود اللہ کے راستہ سے الگ ہو کر اور دوسروں کو بھی بہکانے کے باعث (جو ان کی پرانی عادت تھی) رسولوں کے دشمن بن جاتے تھے۔ انھیں قتل کر ڈالتے تھے، انھیں جھٹلاتے تھے، ان کا مقابلہ کرتے تھے اور طرح طرح کے حیلے کر کے سود خوری کرتے تھے جو محض حرام تھی اور بھی جس طرح بن پڑتا لوگوں کے مال غصب کرنے کی تاک میں لگے رہتے اور اس بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ نے یہ کام حرام کئے ہیں جرات سے انھیں کر گذرے تھے، اس وجہ سے ان پر بعض حلال چیزیں بھی ہم نے حرام کر دیں، ان کفار کے لیے دردناک عذاب تیار ہیں۔ ان میں جو سچے دین والے اور پختہ علم والے ہیں۔ (ابن کثیر)

سود تمام ادیان میں حرام رہا ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭوَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا۔

پس ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہیں ہم نے حرام کر دیں ان پر کچھ پاکیزہ چیزیں جو حلال تھیں ان کیلئے اور ان کے روک دینے کی وجہ سے اللہ کے رستے سے بہتوں کو۔ اور اس سبب سے کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انھیں ممانعت تھی اس کی اور کھاتے تھے مال لوگوں کے ناجائز طور پر اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے ان میں سے عذاب دردناک

وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے، اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ درج ذیل اسباب کی بنا پر ہم نے یہودیوں پر کچھ چیزیں حرام کر دیں۔ جو پہلے ان پر حلال تھیں۔

1۔ وہ ظلم عظیم کے مرتکب ہوئے۔

2۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو دین حق اختیار کرنے سے روکا۔

3۔ کتاب اللہ میں بہت تحریف کی اور اس طرح دین حق کے سمجھنے میں لوگوں کے لیے رکاوٹیں پیدا کیں۔

4۔ وہ سود لیتے تھے حالانکہ توراۃ میں انھیں سود لینے کی ممانعت تھی۔

5۔ رشوت وغیرہ کے ذریعہ لوگوں کے اموال ناجائز طور پر ہڑپ کر جاتے تھے۔

ان گناہوں کی سزا دنیا میں یہ ملی کہ کچھ حلال چیزیں ان پر حرام ہو گئیں اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ لیکن دنیا و آخرت کی سزا صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو کفر و عصیان پر ڈٹے رہے۔ جنہوں نے کفر و عصیان سے توبہ کر کے دین حق اختیار کیا وہ نجات پانے والے ہیں

جو حلال و طیب چیزیں ان پر حرام کی گئیں ان کا تذکرہ سورۃ انعام کی آیت وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر الخ میں ہے جس کا بیان انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گا۔ یہ اشیاء ہمارے لیے حلال ہیں اور توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے ان پر بھی حلال تھیں توراۃ نازل ہونے کے بعد ان کے گناہوں کے سبب ان پر حرام کر دی گئیں۔

روایت ہے کہ یہود نے نبی (علیہ السلام) پر طعن کیا کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں اونٹ کا گوشت ابراہیم (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل پر حرام ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ آپ اونٹوں کا گوشت کھاتے اور ان کا دودھ پیتے ہیں اس کے باوجود آپ دین ابراہیم پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ۔

بنو اسرائیل پر کھانے کی تمام اشیاء حلال تھیں مگر وہ چیزیں جو یعقوب (علیہ السلام) نے توراۃ سے پہلے از خود اپنے آپ پر حرام کر لیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یعقوب (علیہ السلام) عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے نذر مانی کہ اگر وہ اس بیماری سے شفاء پا گئے تو اپنا محبوب ترین کھانا اونٹ کا گوشت اپنے اوپر حرام کر لیں گے۔ یہ واقعہ توراۃ نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

امام زاہد اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے گناہ ظلم اور سرکشی زیادہ ہو گئی تو توراۃ نازل ہونے کے بعد ہر نبی علی نبینا و علیہ السلام کی زبان سے ان پر اونٹ کا گوشت اور گائے بکری کی چربی قسم کی حلال چیزیں حرام کر دی گئیں۔

بعض فقہاء و مفسرین نے آیت زیر بحث فبظلم من الذین الایۃ سے یہ استدلال کیا ہے کہ کفار بھی شرائع و احکام کے مخاطب ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حلال چیزیں حرام کر کے انھیں دنیوی سزا دی ہے اور اخروی سزا ان کے لیے جہنم بتائی ہے۔

لیکن یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ مختلف فیہ مسئلہ عبادات کا ہے، یہ مسئلہ اتفاقی ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ معاملات اور محرمات کے ارتکاب میں وہ ہمارے احکام کے مخاطب ہیں، کیونکہ ان پر زنا چوری ڈاکہ اور قذف کی حدود جاری ہوئی ہیں۔ ہذا کلامہ ہمارا مقصد اس آیت کے ذکر سے یہ بتلانا ہے کہ

1۔ مذکورہ اشیاء حلال ہیں۔

2۔ سود تمام ادیان سماویہ میں حرام ہے کیونکہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہود کو سود لینے سے منع کیا گیا تھا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہود کے علاوہ دوسرے لوگ بھی سود کی ممانعت میں ان کے شریک تھے اور سود غیر یہود سب حرام ہے۔

اسی لیے فقہا لکھتے ہیں کہ سود مطلقاً حرام ہے اسی طرح زنا بھی مطلقاً حرام ہے۔ لیکن شراب و خنزیر ان کے لیے حلال تھے جیسا حدیث میں ہے شراب ان کے لیے ایسا ہی تھا جیسے ہمارے لیے سرکہ۔ اور خنزیر ان کے لیے ایسا ہی تھا جیسا ہمارے لیے بکری۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہماری طرح کفار کو بھی حکم ہے کہ وہ ایمان لائیں۔ نیز معاملات اور سزاؤں کے احکام ہماری طرح ان پر بھی لاگو ہیں۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک عبادات ادا نہ کرنے پر روز قیامت انھیں مواخذہ ہو گا، لیکن ایمان لائے بغیر دنیا میں عبادت بجالانے کے وہ مکلّف نہیں لیکن بعض فقہاء کے نزدیک وہ عبادت ادا کرنے پر بھی مامور ہیں۔

اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو چیزیں ان کے اپنے دین میں حرام ہیں وہ ان کے نہ کرنے کے پابند ہیں۔ خصوصاً جب ان کا کوئی مقدمہ مسلم حکام کے سامنے پیش ہو تو ان کے دین کے مطابق فیصلہ سنایا جائے گا۔ زنا و سود ان کے دین میں بھی حرام ہیں۔ لہٰذا ان پر انھیں سزا دی جائے گی ہاں شراب و خنزیر کے سلسلہ میں انھیں اپنے حال پر چھوڑا جائے گا۔ کفار کا محرمات سے نکاح، بغیر گواہوں کے نکاح، عدت میں نکاح، بغیر مہر کے نکاح، اس شرط پر نکاح کہ مہر نہیں ملے گا یا مردار شراب، خنزیر کو مہر بنانا اور دیگر کئی مسائل کی تفصیل و اختلاف ہدایہ میں مذکور ہے۔ یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ (تفسیرات احمدیہ۔ ملا جیونؒ)

آیت مبارکہ:

وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ‌ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

لغت القرآن: [وَّاَخْذِهِمُ : اور بوجہ ان کے لینے][الرِّبٰوا : سود][وَقَدْ : حالانکہ یقیناً][نُهُوْا : وہ روکے گئے تھے][عَنْهُ : اس سے][وَاَ كْلِهِمْ : اور ان کے کھانے کی وجہ][اَمْوَالَ النَّاسِ : لوگوں کے مال (جمع)][بِالْبَاطِلِ: ناجائز][وَاَعْتَدْنَا : اور ہم نے تیار کر رکھا ہے][لِلْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے لیے][مِنْهُمْ : ان میں سے][عَذَابًا : عذاب][اَلِيْمًا : اذیت ناک]

ترجمہ: اور ان کے سود لینے کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے، اور ان کے لوگوں کا ناحق مال کھانے کی وجہ سے (بھی انھیں سزا ملی) اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تشریح: اگرچہ آج یہود دنیا میں سب سے بڑی سود خور قوم ہے اور دولت جمع کرنے میں ہر حیلہ وفریب سے کام لینے میں ضرب المثل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دین نے ان کو ایسے قبائح کی اجازت دی۔ اس لیے قرآن نے بتایا کہ ان باتوں سے انھیں منع کیا گیا تھا لیکن باز نہ آئے۔ ان کی توراۃ میں اب بھی ایسی واضح آیات موجود ہیں جن میں انھیں سود لینے سے روکا گیا ہے۔ تورات میں ہے: "اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ (خروج 22: 25)۔ (ضیاء)

مزید یہ کہ ، یہود کو سود لینے سے منع کیا گیا مگر اس کے باوجود وہ سود بھی لیتے اور کئی اور ناجائز طریقوں (رشوت ، دھوکا ، چوری ، ڈاکہ وغیرہ) سے بھی لوگوں کے مال ہضم کر جاتے۔ توراۃ میں سود کے متعلق آج بھی یہ حکم موجود ہے۔

If your brother becomes poor, you ard responsible to help him; invite him to live with " Fear your God and let your brother live with you; and -you as a guest in your home Remember-no interest; and give -don't charge him interest on the money you lend him him what he needs, at your cost: don't try to make profit," (The Living Bible: British Edition 1975: Leviticus:26:35 to 37)

" اگر تیرا بھائی محتاج ہو جائے تو اس کی مدد کرنا تیری ذمہ داری ہے ، اسے اپنے گھر میں بطور مہمان رہنے کی دعوت دو۔ خدا سے ڈرو اور اسے اپنے ساتھ رہنے دو۔ جو رقم اس کو ادھار دو اس پر سود نہ لو۔ یاد رکھو کوئی سود نہیں لینا۔ جو بھی اس کو ضرورت ہو اپنی قیمت خرید پر اسے دو اور اس سے نفع لینے کی کوشش نہ کرو۔ " (احبار : 35:26 تا 37) (امداد)

الربا (سود) راس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھوتی لی جائے وہ ربو کہلاتی ہے۔ لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرمایا : ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ [الروم / 39] اور تم کو جو چیز (عطیہ) زیادہ لینے کے لیے دو تا کہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔

اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ میں محق کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ ربا ، یعنی سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوۃ کے متعلق فرمایا : ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُضْعِفُوْنَ [الروم / 39] اور تم (محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوۃ دیتے ہو تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے ہاں بڑھا رہے ہیں۔ (المفردات)

سود کی دو قسمیں ہیں ربا النسیہ اور ربا الفضل کی تعریف یہ ہے کہ مدت میں تاخیر کی بنا پر مقروض سے اصل رقم سے ایک معین شرح کے ساتھ زائد وصول کی جائے ' اور ربا الفضل کی جامع تعریف یہ ہے کہ جن دو چیزوں کی جنس ایک ہو ان میں سے ایک چیز کو دوسری چیز کے بدلہ میں زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا خواہ یہ زیادتی وزن میں ہو یا پیمانہ سے ماپ میں ہو یا عدد میں ہو ' یہود مقروض سے سود بھی لیتے تھے اور لوگوں کا مال ناحق بھی کھاتے تھے ' اور لوگوں کا مال ناحق کھانے کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ لوگوں سے رشوت لے کر کتاب میں تحریف کر دیتے تھے۔ (تبیان)

سود اور رشوت کی مذمت

اس آیت سے سود کی حرمت اور رشوت کی قباحت و خباثت بھی معلوم ہوئی۔ سود لینا شدید حرام ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے ، سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : " بیشک سود ستر گناہوں کا مجموعہ ہے ، ان میں سب سے چھوٹا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔

(ابن ماجہ ، کتاب التجارات ، باب التغلیظ فی الربا ، ۳/۷۲ ، الحدیث : ۲۲۷۴)

سود سے متعلق مزید کلام سورۃ بقرہ آیت نمبر 275 تا 278 اور سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر 130 کے تحت گزر چکا ہے، اور رشوت کے بارے میں حضرت ثوبان (رض) سے روایت ہے کہ "سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رشوت لینے والے، دینے والے اور ان کے مابین لین دین میں مدد کرنے والے پر لعنت فرمائی۔ (صراط)

سود کا لین دین کرنا بہت بڑے بڑے جرائم میں سے ایک جرم ہے۔ آپ دیکھیں کہ سود سے نہ صرف اللہ کا حکم پامال ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات basic human rights جو ہیں ان کی بھی violation ہوتی ہے۔ ہر انسان کو جینے کا حق ہے۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کا حق ہے۔ لیکن جب لوگ کسی دوسرے سے یہ حق چھینتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ اس جرم میں ہم بھی کچھ پیچھے نہیں۔ اسی لیے اللہ کی رحمت کے بجائے اللہ کے غضب کے مستحق ہوتے جا رہے ہیں۔ بینک میں جو سود کا لین دین ہوتا ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن انفرادی سطح پر بھی لوگوں کے اندر یہ کچھ کم نہیں۔ اور مسلمان اس کو اپنے لیے حلال قرار دیئے ہوئے ہیں۔ اور اس کو اپنا ایک بزنس سمجھتے ہیں۔ اور قرض خواہ کا بری طرح خون چوستے ہیں۔ کوئی کافر ایسا کرے تو کرے لیکن ایک مسلمان ایسا کر سکتا ہے کیا۔ آپ دیکھیں کہ پھر ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت کیوں نہ ہو۔ تو یہود پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اس لیے ہوئی کہ واخذھم الربوا۔ کہ سود لیتے تھے۔ حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے۔ پھر آپ دیکھیں دنیا کی تاریخ میں جو بنکنگ کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ یہودی کی کی ہوئی ہے۔ 1694ء میں انگلینڈ کے بادشاہ Loies نے یہودی سناروں سے gold smiths سے قرضہ لے کر اپنی آرمی کو equipped کرتا تھا۔ اس نے فرانس کے ساتھ لمبی جنگ کا پلان بنایا۔ اور انہی یہودیوں سے پیسہ مانگا۔ انھوں نے کچھ شرائط لگائیں کہ آپ اجازت دیں کہ ہم ایک bank of England بنائیں۔ حکومت کا سارا خزانہ اس میں ہوگا۔ اور ملک کے جتنے اکاؤنٹ بھی ہوں گے وہ اسی میں ہوں گے۔ کرنسی ہم issue کریں گے۔

دوسرے یہ کہ آپ جو بھی قرضہ لیں وہ واپس نہ کریں بلکہ 8 فیصد سود دیں۔ اور یہ تجاویز بادشاہ کو بہت پسند آئیں کہ ایک بنک بنالیا جائے جس میں کہ لوگوں کے پیسے بھی ہوں۔ کیا ہوا جو کرنسی یہ issue کریں گے۔ اس کے بعد جو قرض ہے وہ نہیں دینا بلکہ صرف اس کا ٪8 دینا ہے۔ کیونکہ وہ ایک تھوڑی رقم ہے اور ایک لمبے عرصے تک دی جاسکتی ہے۔ تو یہ تجاویز Loies کو پسند آئیں اور اس طرح ایک نیا اکنامک پلان کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے پیسہ لے کر جنگی سامان خریدا۔ یہ سامان بیچنے والے بھی یہود تھے۔ اور جس مارکیٹ کے لیے infrareds پیسہ بنک میں رکھوایا۔ وہ بنک بھی یہودیوں کا تھا۔ اسلحہ بھی ان کا بکا۔ اور اسلحہ بیچ پیسہ کہار کھا گیا۔ بینک میں۔ اور پھر لوگوں کے اکاؤنٹ بھی اس میں۔ اس طریقے کو رواج دے کر انھوں نے مال کو خوب سمیٹا۔ اور پھر وہ پیسہ جو دراصل پورا لوگوں کا تھا انھوں نے اس کو آگے دے کر مزید اس پر سود وصول کیا۔ اور اس طرح ساری دنیا کی جو اکنامک ایکٹیویٹی تھی اس پر قابض ہوگئے۔ اور آج یہ قبضہ بڑھتا چلا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی بہت سی تنظیمیں بہت سے ملکوں سے بھی زیادہ پاور فل ہیں۔ کہ جو ملکوں کو یعنی ملٹی نیشنل کمپنیاں ملکوں کو قرضہ دیتی ہیں۔ آج پاکستان بھی جو قرضے لیتا ہے سود پر۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ صرف سود واپس کرنے کے لیے۔ اصل قرضہ تو ہاتھ بھی نہیں لگتا صرف سود لوٹانے کے لیے قرضہ لینا پڑتا ہے۔ اور پھر وہ بال بال مزید جکڑا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان تمام مالیاتی اداروں کی طرف سے ہمیں ڈکٹیشن ملتی ہیں۔ کہ آپ بجلی کی قیمت اتنی بڑھا دیں۔ گیس اتنی کر دیں۔ فلاں چیز کی قیمت اتنی کر دیں تو یہ اس مال کی غلط تقسیم اور اس طریقے کی وجہ سے ہم اپنے نہ سیاسی زندگی میں آزاد ہیں اور نہ دینی زندگی میں۔ آج ہمارے پاس کوئی دوسرا alternate نہیں کہ ہم حلال طریقے سے کچھ interest کر سکیں یا کسی طرح بھی اس سود کے وبال سے نجات حاصل کر سکیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ کوئی شخص اگر سود نہیں بھی لے گا تو اس کا جو غبار ہے وہ اس تک ضرور پہنچے گا۔ آج ہمارے ہاں جو تنخواہیں ہیں وہ بنک کے

through آتی ہیں۔ اور اس کے اندر جتنے دن بھی پیسہ رہتا ہے۔ ایک طرح سے سود ہی ہے۔ اور ہماری یہ مجبوری ہے کہ ہم پیسہ گھر میں رکھ نہیں سکتے۔ تو جب وہ بنک میں جاتا ہے خواہ ہم کرنٹ اکاؤنٹ کھولے ہوئے ہوں۔ لیکن جس خزانے میں وہ جاتا ہے۔ وہ سود کے لین دین میں ملوث ہے تو directly نہیں تو indirectly کسی نہ کسی طرح اس شر کا شکار ہو کر رہتے ہیں۔ یہ بتانا اس واقعے سے مقصود ہے کہ اس کی ابتدا کسی کافر نے نہیں کی بلکہ ایک مسلمان قوم نے کی اپنے وقت کی۔ یہ یہود اپنے وقت کے مسلمان لوگ تھے۔ تو جب کوئی لوگ اپنے آپ کو مسلمان مان بھی رہے ہوں اور پھر اتنی دیدہ دلیری سے اللہ کے احکام کی نافرمانی کرے پھر ان پر اللہ کا غضب نہ ہو تو پھر کیا ہو اور ان کا ایک اور بڑا کیا تھا۔ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانا۔ یعنی رشوت کے ساتھ اور ہر دوسرے حرام طریقے۔ اب اس میں آپ دیکھیں کہ دو تین بڑے بڑے جرائم کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۱)۔ ظلم۔ (۲)۔ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنا۔ (۳) اور (۴)۔ مال سے متعلق۔ اب آپ دیکھیں کہ کہیں ہم تو ان خرابیوں کا شکار نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان جرائم کا شکار ہو کر اللہ کی رحمت سے دور ہو اور تیار کیا ہم نے ان کافروں کے لیے عذاب الیم۔ دردناک عذاب یعنی جو لوگ اس روش پر قائم رہیں۔ اور یہ طریقے اختیار کریں پھر وہ اللہ کے غضب سے بچ نہیں سکتے۔ ہاں یہودی ہوتے ہوئے بھی کون لوگ اس عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ (تنویر)

یہودیوں کی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر زیادتیوں اور پے در پے حیلہ سازیوں، گستاخیوں اور تہمتوں کی وجہ سے جن میں انبیاء کو قتل کرنا، شرک کا ارتکاب کرنا، سود کو جائز قرار دینا حالانکہ ان پر حرام کیا گیا تھا، دوسروں کا ناجائز طریقے سے مال کھانے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد میں کمی لانے اور ان کی ہوس زر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے چند حلال چیزوں کو ان پر حرام قرار دے دیا۔ جس طرح مریض کو بیماری سے بچانے کے لیے حکیم حاذق اس پر کچھ پابندیاں اور احتیاطیں لازم قرار دیتا ہے اگر مریض صحت یاب ہو جائے تو پابندیاں اٹھالی جاتی ہیں ورنہ انہی پابندیوں کے ساتھ مریض موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے یا مراعات یافتہ آدمی کو اس کی غلطی پر سرزنش کرنے کے لیے اس سے کچھ مراعات اور اختیارات واپس لے لیے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا تاکہ وہ اپنی سرکشی و بغاوت سے باز آجائیں لیکن انھوں نے اپنی روایتی بغاوت کو برقرار رکھا اور پابندیوں اٹھائے ہوئے ان کی نسلیں ختم ہو گئیں جنہیں قیامت کے دن ہولناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تقریباً پانچ سو سال کے بعد عیسیٰ (علیہ السلام) نے آکر کچھ پابندیاں ختم فرمائیں جن کا تذکرہ قرآن مجید کی آیت میں کیا گیا ہے۔ یہودیوں پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں سورۃ الانعام ۱۴۶ میں بیان ہوئی ہیں۔

(وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ)

[الأنعام : ۱۴۶]

"اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے ہر ناخن والا جانور حرام کیا تھا نیز ان پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کی الا یہ کہ وہ پشتوں، آنتوں سے لگی ہو یا ہڈیوں سے چمٹی ہوئی ہو۔ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ایسا کیا اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" (فہم)

مسائل

۱۔ آدمی کی ناشکری کی وجہ سے اللہ کی نعمتیں چھن جاتی ہیں۔

۲۔ یہودیوں کی سرکشی کم کرنے کے لیے چند حلال چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔

۳۔ اللہ کے راستے سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔
۴۔ سود اور ناجائز مال کھانے والوں کو دردناک عذاب ہوگا۔

آیت مبارکہ:

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

لغۃ القرآن: [لٰكِنِ : لیکن][الرّٰسِخُوْنَ : پختگی حاصل کرنے والے][فِي : میں][الْعِلْمِ : علم][مِنْهُمْ : ان میں سے][وَالْمُؤْمِنُوْنَ : اور مومن (جمع)][يُؤْمِنُوْنَ : وہ ایمان لاتے ہیں][بِمَآ : اس پر جو][اُنْزِلَ : نازل کیا گیا][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کیا گیا][مِنْ : سے][قَبْلِكَ : پہلے آپ][وَالْمُقِيْمِيْنَ : اور قائم کرنے والے ہیں][الصَّلٰوةَ : نماز][وَالْمُؤْتُوْنَ : اور ادا کرنے والی ہیں][الزَّكٰوةَ : زکوۃ][وَالْمُؤْمِنُوْنَ : اور ایمان رکھنے والے][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ کے][وَالْيَوْمِ : اور یوم][الْاٰخِرِ: آخرت][اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ][سَنُؤْتِيْهِمْ : عنقریب ہم ان کو دیں گے][اَجْرًا : اجر][عَظِيْمًا : بہت بڑا]

ترجمہ: لیکن ان میں سے پختہ علم والے اور مومن لوگ اس (وحی) پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اس (وحی) پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (برابر) ایمان لاتے ہیں، اور وہ (کتنے اچھے ہیں کہ) نماز قائم کرنے والے (ہیں) اور زکوۃ دینے والے (ہیں) اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے (ہیں)۔ ایسے ہی لوگوں کو ہم عنقریب بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔

تشریح:

قران مجید کے اسلوب بیان اور انصاف پسندی پر قربان جائیں جو نہی یہود و نصاریٰ کے جرائم کی فہرست اور ان کے مذہبی اور سیاسی راہنماؤں کے گھناؤنے کردار کا ذکر کرتا ہے۔ معاًان کے نیک علماء اور زعما کے اچھے کردار کی تحسین کرتا ہے کہ بیشک ان کی اکثریت برے لوگوں پر مشتمل ہے لیکن یہ تمام کے تمام ایسے نہیں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں اور ہوں گے کہ جب بھی ان کے سامنے حقائق منکشف ہوتے ہیں تو وہ مذہبی تعصب اور گروہ بندی کی دیواریں توڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں اور تمام اعمال بجالاتے ہیں جن کا اسلام انھیں کرنے کا حکم دیتا ہے۔

یہود کی کثرت غالبہ اگرچہ ہدایت آسمانی کو عملی طور پر چھوڑ چکی تھی لیکن ان میں بھی خال خال ایسے علما موجود تھے جن کی معلومات اپنے دین کے متعلق سطحی قسم کی نہ تھیں بلکہ ٹھوس قابلیت کے مالک تھے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ اور اپنے علم کے مطابق عمل پیرا تھے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ قرآن حکیم ان نفوس قدسیہ کا ذکر نہ فرماتا۔

اس طرح وہ اپنے دامن عمل میں ہر خیر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ان کا رب راضی ہوتا ہے۔ ایسے خوش نصیب اور عظیم لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ عنقریب ان کو دنیا میں عزت ور فعت ملے گی اور آخرت میں اجر عظیم سے نوازا جائے گا۔ راسخ العلم کی سورۃ آل عمران آیت ۷ میں تعریف کی گئی ہے کہ وہ متشابہات کے پیچھے لگنے کی بجائے مرکزی اور بنیادی احکام کو سامنے رکھتے ہوئے متشابہ آیات کا مفہوم متعین کرتے ہیں اور ان کے اوصاف یہ ہیں کہ یہ لوگ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے استقامت اور رحمت کے طلبگار رہتے ہیں یہاں دین کے چار بنیادی عناصر کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتب آسمانی اور قرآن مجید پر مکمل ایمان لانا نماز کو اس کے تقاضوں کے ساتھ ادا کرنا، زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانا شامل ہے ایسے لوگوں کے اجر عظیم کے بارے میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

(عن اَبِی بُردَۃَ (رض) اِنَّہٗ سَمِعَ اَبَاہُ عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ ثَلَاثَۃٌ یُؤتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَرَّتَیْنِ الرَّجُلُ تَکُوْنُ لَہُ الْاَمَۃُ فَیُعَلِّمُھَا فَیُحْسِنُ تَعْلِیمَھَا وَیُؤَدِّبُھَا فَیُحْسِنُ اَدَبَھَا ثُمَّ یُعْتِقُھَا فَیَتَزَوَّجُھَا فَلَہُ اَجْرَانِ وَمُؤْمِنُ اَھْلِ الْکِتَابِ الَّذِی کَانَ مُؤْمِنًا ثُمَّ اٰمَنَ بالنَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَلَہُ اَجْرَانِ وَالْعَبْدُ الَّذِی یُؤَدِّی حَقَّ اللّٰہِ وَیَنْصَحُ لِسَیِّدِہٖ)

[رواہ البخاری : کتاب الجھاد والسیر، باب فَضْلِ مَنْ اَسْلَمَ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابَیْنِ]

دہرا اجر

"حضرت ابوبردہ (رض) نے اپنے والد گرامی کو نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان بیان کرتے ہوئے سنا سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین طرح کے افراد کو دوہرا اجر عنایت فرمایا جائے گا ان میں سے ایک وہ ہوگا جس کے پاس لونڈی ہو اس نے اسے اچھی طرح تعلیم دی اور اس کو ادب سکھایا اچھے انداز سے اس کی تربیت کی پھر وہ اس کو آزاد کرتے ہوئے اس سے نکاح کرلے۔ دوسرا یہود و نصاریٰ کا وہ شخص جو اپنے دین میں پکا تھا اور بعد ازاں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آیا اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے تیسرا وہ شخص جو غلام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہوئے اپنے مالک کے کام اور خدمت میں اس کی خیر خواہی کرتا ہے۔" (فہم)

غرض پختہ علم اور اس پر روشن ایمان انسان کو اس طرح ہدایت دیتے ہیں کہ انسان پورے دین پر ایمان لانے والا بن جاتا ہے۔ انسان اپنے علم کی پختگی اور صاف ایمان کی وجہ سے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ دین اللہ وحدہ کی طرف سے آیا ہے اور یہ کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے دین ایک ہی ہے۔

قرآن کریم کی جانب سے یہ اشارہ دینا کہ علم کی گہرائی کے نتیجے میں صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دل کے دروازے نور ایمان کے لیے کھل جاتے ہیں "نزول قرآن کے دور میں نہایت ہی معنی خیز ہے یہ قرآن کریم کے اشارات میں سے ایک اہم اشارہ ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانے میں صورت حال کیا تھی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نفس انسانی کی صورت حال کیا ہوتی تھی۔ سطحی علم کی مثال اس طرح ہوتی ہے جس طرح کفر اور انکار۔ یہ کفر اور انکار ان کے دل کے اندر صحیح معرفت کے اترنے میں حائل ہو جاتے ہیں۔ ہر دور میں یوں ہوتا ہے کہ سطحی علم کی وجہ سے حقیقت کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ جو لوگ علم میں گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور انھیں حقیقی علم حاصل ہو جاتا ہے تو ان کی آنکھوں کے سامنے شواہد آ جاتے ہیں جو اس کائنات کے اندر پنہاں ہیں۔ اگر ان کے سامنے شواہد نہیں آتے تو کم از کم ایسے سوالات آ جاتے ہیں جن کا جواب ان کے پاس نہیں ہوتا اور محض کسی سماوی نظریہ حیات کو قبول کر کے ہی وہ ان سوالات کے جواب سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کائنات کا ایک الہ ہے۔ وہ اس پر حاوی ہے ' اس کا مدبر ہے ' اور اس پر پوری طرح متصرف ہے۔ اس کا ایک ہی ارادہ ہے۔ اس نے اس کائنات کے اندر یہ ناموس اعظم جاری کیا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کے دل ہدایت کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر راز کھول دیتے ہیں اور ان کی روح ہدایت کو پا لیتی ہے۔ وہ لوگ جو ادھر ادھر سے کچھ معلومات چن لیتے ہیں اور اپنے آپ کو علماء سمجھنے لگتے ہیں ' ان کے اس سطحی علم کا پردہ ان کے اور ان دلائل ایمان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں پوشیدہ ہوتے ہیں ' اس لیے وہ ایمان تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان پر ایمان ظاہر ہی نہیں ہوتا ' اس لیے کہ ان کا علم ناقص اور سطحی ہوتا ہے اور یہ سطحی علم اس کائنات کے سوالات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ ان کے دل مائل بہ ایمان وہدایت نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اس کے شائق ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جب دل میں ہوں وہ ایمان کا ذوق نہیں رکھتا اور نہ اسے نور ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو اس دین پر رکھتا ہے جو اسے بطور عصبیت جاہلیہ وراثت میں ملا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس دین سے دور ہو جاتا ہے جو خدائے متعال کی جانب سے نازل ہوا ہے اور جسے سلسلہ رسل کے ذریعے بھیجا گیا ہے۔ جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں صلی اللہ علیہم وسلم اجمعین۔ (ظلال)

فوائد

1: راسخ فی العلم وہ عالم ہے جس کا علم اس کے دل میں اتر گیا ہو جیسے مضبوط درخت وہ ہے جس کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ چکی ہوں اس سے مراد خوش عقیدہ اور باعمل علماء ہیں جیسے سیدنا عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی جو یہود کے علماء تھے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابی ہوئے۔

2: خواہ وحی جلی سے جیسے قرآن شریک یا وحی خفی سے جیسے حدیث شیرف لہٰذا قرآن و حدیث سب پر ہی ایمان چاہیے۔

3: خیال رہے کہ پچھلی کتابوں پر ہمارا صرف اجمالی ایمان ہے اور قرآن کریم پر تفصیلی ایمان بھی ہے اور عمل بھی، اسی فرق کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اترنے کا الگ الگ ذکر فرمایا۔

4: اس سے معلوم ہوا کہ عالم باعمل کا ثواب دوسرے سے زیادہ ہے کیونکہ باعمل عالم دوسرے کو بھی نیک بنادیتا ہے۔ چاہیے کہ عالم کا عمل سنت نبوی کا نمونہ ہو اور اس کی ہر ادا تبلیغ کرے اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوا کہ بے دین۔ یا بے عمل، عالم کا عذاب بھی دوسروں سے زیادہ ہے کیونکہ وہ گمراہ بھی ہے اور گمراہ کن بھی اور اس کی بد عملی دوسروں کو بھی بد عمل بنادے گی۔

مسائل

۱۔ ارکان اسلام پر عمل کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

۲۔ آخرت پر یقین ایمان کا حصہ ہے۔

۳۔ قرآن مجید کے ساتھ پہلی کتب سماوی پر بھی ایمان لانا فرض ہے۔

آیت مبارکہ:

إِنَّآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ كَمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰ نُوحٖ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعۡدِهِۦۚ وَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيۡمَٰنَۚ وَءَاتَيۡنَا دَاوُۥدَ زَبُورٗا ﴿١٦٣﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّآ : یقینا ہم][اَوْحَيْنَآ : ہم نے وحی کی][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][كَمَآ : جیسے][اَوْحَيْنَآ : ہم نے وحی کی][اِلٰي : طرف][نُوْحٍ : نوح][وَّالنَّبِيّٖنَ : اور انبیاء][مِنْۢ: سے][بَعْدِهٖ : اس کے بعد][وَاَوْحَيْنَآ : اور ہم نے وحی کی][اِلٰٓي : طرف][اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیم][وَاِسْمٰعِيْلَ : اور اسماعیل] وَاِسْحٰقَ : اور اسحق][وَيَعْقُوْبَ : اور یعقوب][وَالْاَسْبَاطِ : اور اس کی اولاد (جمع)][وَعِيْسٰى: اور عیسیٰ][وَاَيُّوْبَ : اور ایوب][وَيُوْنُسَ : اور یونس][وَهٰرُوْنَ : اور ہارون][وَسُلَيْمٰنَ : اور سلیمان][وَاٰتَيْنَا : اور ہم نے د ی][دَاوٗدَ : داؤد کو][زَبُوْرًا : زبور]

ترجمہ: (اے حبیب !) بیشک ہم نے آپ کی طرف (اُسی طرح) وحی بھیجی ہے جیسے ہم نے نوح (علیہ السلام) کی طرف اور ان کے بعد (دوسرے) پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق و یعقوب اور (ان کی) اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف (بھی) وحی فرمائی، اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو (بھی) زبور عطا کی تھی۔

تشریح: یہودیوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ دین کے بنیادی احکامات ہمیشہ سے ایک تھے اور ہیں۔ وہ لوگوں پر براہ راست نازل ہونے کی بجائے وحی کے ذریعے انبیاء (علیہ السلام) پر نازل ہوتے رہے۔ جو مختلف انداز اور الفاظ میں اتارے گئے۔ قرآن مجید تحریری مسودہ کے بجائے لوگوں کی سہولت اور اصلاح احوال کی خاطر خطاب در خطاب کی صورت میں نازل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر خطاب میں نصیحت کے جامع پہلو کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اسی اسلوب کے پیش نظر یہودیوں کے اس مطالبہ پر کہ ان پر براہ راست کتاب کیوں نہیں نازل کی جاتی اس کے جواب میں نصیحت کے کئی پہلو اختیار کیے گئے ہیں۔

۱۔ پہلے سرزنش کی گئی کہ تم موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بڑھ کر سوالات کر چکے ہو جن میں تمہارے اکثر سوال پورے ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود تم بڑے بڑے جرائم میں ملوث رہے اور اب بھی ان گناہوں کا اعتراف کرتے ہو۔ ان سے تائب ہونے کی بجائے ان پر فخر کرتے اور ان کا ارتکاب کیے جا رہے ہو۔

۲۔ کسی امت پر بھی براہ راست کتاب نازل نہیں کی گئی اللہ تعالیٰ کے احکام وحی کے ذریعے ہی انبیاء پر نازل ہوتے رہے ہیں جن اولوالعزم شخصیات پر وحی نازل ہوئی ان میں چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے جو شان و مرتبہ اور جد و جہد کے اعتبار سے سب سے نمایاں تھے جن کی اکثریت کا تعلق تمہارے آباؤ اجداد سے ہے۔

۳۔ ان انبیاء کرام (علیہ السلام) کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ توحید خالص پر ایمان لانا، تمام آسمانی کتب کو تسلیم کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور آخرت پر کامل یقین رکھنا ہے۔

۴۔ تمام انبیاء (علیہ السلام) کی دعوت کا مقصد لوگوں کے اچھے اعمال کے بدلے دنیا اور آخرت کی کامیابی کی خوشخبری دینا اور برے اعمال کے برے انجام سے لوگوں کو ڈرانا تھا۔

۵۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد لوگوں کو سینہ زوری سے منوانا نہیں ان کا کام بتلانا اور سمجھانا تھا تاکہ محشر میں لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔

۶۔ بڑے بڑے انبیاء کرام (علیہ السلام) کے تذکرے کا مقصد نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا ہے۔ اس لیے آدم (علیہ السلام) سے انبیاء کا ذکر کرنے کی بجائے حضرت نوح (علیہ السلام) سے شروع کیا ہے کیونکہ آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضرت نوح (علیہ السلام) کی تشریف آوری سے کچھ عرصہ پہلے تک لوگ توحید اور فطرت سلیم پر قائم رہے بعد ازاں لوگ شرک میں مبتلا اور دین سے منحرف ہوگئے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے ساڑھے نو سو سال بڑی جانفشانی سے جد و جہد فرمائی لیکن چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب گمراہی پر قائم رہے جنھیں طوفان نے آلیا اور وہ نیست و نابود کر دیے گئے۔ ان کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان میں نسل در نسل انبیاء (علیہ السلام) کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ جن میں ایسے انبیاء بھی تھے جو نبوت کے منصب کے ساتھ حکمران بھی تھے ان میں موسیٰ (علیہ السلام) ایسے

پیغمبر ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف پایا۔ ان کی شخصیت، جدو جہد اور حالات و واقعات کو نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مماثل قرار دیا گیا ہے (المزمل : ۱۵) ان انبیاء کے آخر اور نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے عیسیٰ (علیہ السلام) عظیم الشان معجزات کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ تمام کے تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری دینے والے اور اس کی نافرمانیوں سے ڈرانے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چیدہ چیدہ انبیاء کا ذکر فرمایا ہے باقی کا ذکر نہیں کیا۔ جن کے ذکر نہ کرنے کی وہی حکمت جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہر بات اور ہر کام پر غالب ہے اور اس کے ہر فرمان اور کام میں حکمت ہوتی ہے۔

(عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ، وَالأَنْبِیَاءُ إِخْوَۃٌ لِعَلَّاتٍ، اُمَّھَاتُھُمْ شَتّٰی، وَدِیْنُھُمْ وَاحِدٌ)

[رواہ البخاری : باب واذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَہْلِہَا]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں دنیا وآخرت میں عیسیٰ ابن مریم کے زیادہ قریب ہوں اور تمام انبیاء (علیہ السلام) علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں مختلف ہیں اور دین ایک ہی ہے۔" (فہم)

وحی کیا؟

لغت عربی میں وحی کا معنی اشارہ کرنا ہے جیسے فاوحی الیہم ان سبحوا بکرۃ وعشیا۔ حضرت زکریا (علیہ السلام) نے انھیں اشارہ کیا کہ صبح وشام اللہ کی تسبیح کیا کریں اور اس کا اطلاق مختلف مفہوموں پر ہوتا رہتا ہے۔ بطریق الہام کسی چیز کو دل میں ڈال دینے کو بھی وحی کہتے ہیں جیسے واوحینا الی ام موسیٰ۔ نیز اپنے طبعی اور عزیزی فرائض کی انجام دہی کے لیے جو ہدایت کسی کو فطری طور پر اپنے خالق کی طرف سے ہوتی ہے اسے بھی وحی کہا جاتا ہے جیسے اوحی ربک الی النحل۔ اور کسی کو پراسرار طریقہ سے کسی امر کی تعلیم دینے کو بھی وحی کہتے ہیں۔ جیسے شیاطین الانس والجن یوحی بعضہم الی بعض۔ اور انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو وحی کی جاتی ہے اس کا مفہوم یہ ہے وحی اللہ الی انبیاہ ھو ما یلقیہ الیہم من العلم الضروری الذی یخفیہ عن غیر ہم بعد ان یکون اعدار واحہم لیلقیہ بواسطۃ الملک او بغیر واسطۃ (المنار) ترجمہ :۔ اس علم یقینی اور قطعی کو وحی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں سے پنہاں اپنے انبیاء کے دلوں میں القا فرماتا ہے۔ جن کے ارواح طیبہ کو اس نے پہلے سے اس علم کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا ہوتا ہے۔ یہ القا کبھی فرشتہ کے واسطہ سے ہوتا ہے اور کبھی بلاواسطہ براہ راست۔ وحی کی حقیقت ذہن نشین کرلینے کے بعد اب آیت پر غور فرمایئے۔ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو یہود بڑے شک کی نگاہ سے دیکھتے اور بہت حیران ہوتے تھے کہ یہ کیونکر نبی ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ سے پہلے اور انبیاء بھی مبعوث ہوئے اور ان پر اللہ کی وحی نازل ہوئی ہے اور جب وہ ان کی نبوت اور ان پر نزول وحی کو تسلیم کرتے ہیں تو آپ کو کیوں نبی نہیں مانتے۔ چند انبیاء کے اسماء گرامی ذکر کردیئے تاکہ انھیں مجال انکار نہ رہے۔ (ضیاء)

شان نزول

یہود و نصاریٰ نے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جو یہ سوال کیا تھا کہ ان کے لیے آسمان سے یکبارگی کتاب نازل کی جائے تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائیں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور ان پر حجت قائم کی گئی کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے سوا بکثرت انبیاء ہیں جن میں سے گیارہ کے اسماء شریفہ یہاں آیت میں بیان فرمائے گئے ہیں اہل کتاب ان سب کی نبوت کو مانتے ہیں ان سب حضرات میں سے کسی پر

یکبارگی کتاب نازل نہ ہوئی توجب اس وجہ سے ان کی نبوت تسلیم کرنے میں اہل کتاب کو کچھ پس و پیش نہ ہوا تو سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت تسلیم کرنے میں کیا عذر ہے اور مقصود رسولوں کے بھیجنے سے خلق کی ہدایت اور ان کو اللہ تعالیٰ کی توحید و معرفت کا درس دینا اور ایمان کی تکمیل اور طریق عبادت کی تعلیم ہے کتاب کے متفرق طور پر نازل ہونے سے یہ مقصد بروجہِ اَتم حاصل ہوتا ہے کہ تھوڑا تھوڑا بہ آسانی دل نشین ہوتا چلا جاتا ہے اس حکمت کو نہ سمجھنا اور اعتراض کرنا کمال حماقت ہے۔ (خزائن)

غرض یہ ایک قافلہ ہے جو شاہراہ تاریخ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس سلسلے کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں۔ یہ ایک ہی رسالت ہے اور اس کا ایک ہی نصب العین ہے کہ انسان کو قبل از وقت خبردار کر دیا جائے اور اچھے لوگوں کو قبل از وقت ہی اچھے انجام کی خوشخبری دی جائے، اس قافلے میں آگے پیچھے مختاران درگاہ الٰہی اور انسانوں میں سے چیدہ لوگ آگے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ یہ رہے حضرت نوح (علیہ السلام) یہ رہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) یہ آئی سواری حضرت اسماعیل کی۔ ان کے بعد یہ چلے آ رہے ہیں حضرت اسحاق (علیہ السلام) ان کے بعد متصلا حضرت یعقوب آ رہے ہیں۔ اب کچھ مختلف گروہ نمودار ہوئے حضرت ایوب (علیہ السلام) یونس (علیہ السلام) ہارون (علیہ السلام)، سلیمان (علیہ السلام)، داؤد (علیہ السلام)، موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تشریف لائے اپنی اپنی باری پر اور بعض ایسے لوگ بھی چلے آئے ہیں جن کے نام سے ہم واقف نہیں ہیں۔ آخر میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتم النبیین تشریف لا رہے ہیں اور اب اس قافلے کا آخری سرا اختتام کو پہنچا۔ اس قافلے میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس قافلے میں مختلف رنگوں اور مختلف نسلوں کے نبی ہیں اور کرہ ارض کے مختلف علاقوں میں یہ قافلہ نظر آتا ہے۔ اور مختلف ادوار اور مختلف زمانوں میں، مختلف معاشروں اور مختلف خاندانوں میں یہ رسول کام کرتے رہے۔ یہ سب ایک ہی مصدر اور منبع سے پیغام لاتے رہے۔ یہ سب راہ دکھانے والی ایک ہی روشنی کے حامل رہے۔ سب کے سب متنبہ اور خبردار کرتے رہے اور خوشخبری دیتے رہے۔ یہ سب کے سب قافلہ انسانیت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیکر اسے نور ہدایت میں داخل کرتے رہے۔ چاہے کوئی کسی ایک خاندان کیلئے آیا ہو، چاہے کوئی کسی ایک قوم کیلئے آیا ہو، چاہے کوئی ایک شہر اور ایک علاقے کیلئے آیا ہو، چاہے کوئی تمام انسانوں کیلئے آیا ہو اور خاتم النبیین کا لقب پایا ہو۔

یہ سب کے سب وحدہ سے وحی پاتے رہے۔ ان میں سے کسی نے کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں کی۔ ان میں سے اگر اللہ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے براہ راست بات کی تو وہ بھی وحی کا ایک رنگ تھا۔ اس کیفیت سے ہم آگاہ نہیں ہیں نہ اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ قرآن کریم آخری وحی کا ریکارڈ ہے اور یہ اس قدر درست ریکارڈ ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے اور قرآن نے اس ہم کلامی کی کوئی تفصیل یا کیفیت بیان نہیں کی ہے۔ اس کی کیفیت کیا تھی؟ موسیٰ (علیہ السلام) اپنے کن خواص اور کس قوت ادراک سے اسے پا رہے تھے۔ یہ سب باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں کی ہے۔ اور قرآن کریم کے علاوہ اس موضوع پر جو کوئی بھی اپنے ذہن سے بات کرے گا وہ بے سند، فلسفہ یا قصہ کہانی ہو گی۔

یہ رسول، جن میں سے بعض کے نام ذکر ہوئے اور بعض کے نام نہیں لیے گئے کیوں بھیجے گئے؟ اللہ کی شفقت اور رحمت اور عدالت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رسول بھیجے۔ تاکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے مومنین اور اطاعت کندگان کو خوشخبری دیدیں کہ اللہ نے ان کیلئے کیا کیا نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں۔ بیشمار نعمتیں اور اللہ کی رضامندی ان کے انتظار میں ہے۔ اور کافروں اور نافرمانوں کو ڈرائیں کہ اللہ کا غضب اور ایک دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اور یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ (آیت) "لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل"۔ (۴ : ۱۶۵) (تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ "اور یہ رسول لوگوں کو بتادیں کہ ان کے نفس اور ان کے

ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر کیا کیا دلائل ہیں۔ انھیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ جنس بشر کو متاع عقل سے نوازا ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے نفسوں اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر دلائل تلاش کریں۔ عقل کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس رسول بھیجے گئے، یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر خاص شفقت اور رحمت تھی کہ اس نے رسول بھیجے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اس کے میلانات اس کی عقل پر غالب آجائیں گے اور ان کے نتیجے یہ عظیم قوت دب کر رہ جائے گی۔ اسی لیے اللہ نے اپنی رحمت خاصہ کے تحت ان کے پاس رسول بھیجے جو مبشرین اور منذرین تھے۔ وہ ان کے سامنے یاد دہانی کراتے رہے۔ انھیں بصارت اور بصیرت دیتے رہے۔ وہ ان کی فطرت اور ان کی قوت عقلیہ کو شہوات نفسانیہ کے ڈھیروں کے نیچے سے نکال کر آزاد کراتے رہے۔ جن ڈھیروں کے نیچے رہتے ہوئے اس کی عقل اور فطرت کیلئے دلائل ہدایت اور ایمان کے تقاضوں کو پانا مشکل ہو گیا تھا چاہے یہ دلائل خود نفس انسانی کے اندر ہوں یا اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے اندر ہوں۔ (ظلال)

قرآن مجید کو یک بارگی نازل نہ کرنے کی حکمتیں

قرآن مجید کی قسط وار نازل ہونے کو یہود نے اپنی کم عقلی سے نقص گردانا حالانکہ اس میں ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بڑی فضیلت ہے کیونکہ کتاب نازل کرنے کو جو رابطہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے زندگی میں صرف ایک بار قائم ہوا وہ رابطہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تاحیات قائم رہا ' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) توراۃ لینے پہاڑ طور پر گئے تھے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن مجید کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا ' بلکہ آپ جہاں تشریف فرما ہوتے تھے ' قرآن مجید وہی نازل ہو جاتا تھا ' خواہ آپ بدر کے میدان میں ہوں ' احد کی گھاٹیوں میں ہوں ' غار ثور میں ہوں ' کسی سواری پر ہوں ' حضرت عائشہ (رض) کے بستر پر ہوں ' جہاں آپ ہوتے تھے قرآن کریم وہیں نازل ہو جاتا تھا ' لوگ آپ سے سوالات کرتے تھے ان کے جواب میں آیتیں نازل ہوتیں ' یہود اور نصاریٰ کے اعتراضات کے جوابات میں ' اور مختلف پیش گوئیوں کے سلسلہ میں آیات نازل ہوتی تھیں ' یہ سہولت یک بارگی نزول میں کہاں ہے پھر اگر یکبارگی کتاب نازل ہوتی تو تمام احکام یک بارگی فرض ہو جاتے اور لوگوں کے لیے ایک دم ان پر عمل کرنا اور پرانی عادتوں اور رسموں کا چھوڑنا مشکل ہوتا ' بہ تدریج کتاب کے نزول سے لوگوں پر اسلام کا قبول کرنا آسان ہو گیا ' قرآن مجید کو یک بارگی نازل نہ کرنے میں یہ فضیلت ' باریکیاں اور فوائد ہیں جو یہود کی سمجھ میں نہیں آئے اور ان کو سمجھایا گیا تو انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے مانا نہیں۔ (تبیان)

مسائل

۱۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پہلے انبیاء کرام (علیہ السلام) ہی کی طرح وحی نازل ہوئی۔

۲۔ قرآن کی طرح پہلے انبیاء (علیہ السلام) پر بھی کتابیں نازل کی گئیں۔

۳۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے از خود کلام فرمایا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کچھ انبیاء (علیہ السلام) کے واقعات بیان فرمائے اور کچھ کا ذکر نہیں فرمایا۔

آیت مبارکہ:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۞۱۶۴ ۚ

لغۃ القرآن: [وَرُسُلًا : اور کئی رسول][قَدْ : بلاشک][قَصَصْنٰهُمْ : ہم نے بیان کیا ان کا حال][عَلَيْكَ : آپ پر][مِنْ : سے][قَبْلُ : پہلے][وَرُسُلًا : اور کئی رسول][لَّمْ : نہیں][نَقْصُصْهُمْ : بیان کیا ہم نے ان کا حال][عَلَيْكَآپ پر][وَكَلَّمَ : اور کلام کیا][اللّٰهُ : اللہ نے][مُوْسٰى: موسیٰ سے][تَكْلِيْمًا : کلام کرنا]

ترجمہ: اور (ہم نے کئی) ایسے رسول (بھیجے) ہیں جن کے حالات ہم (اس سے) پہلے آپ کو سنا چکے ہیں اور (کئی) ایسے رسول بھی (بھیجے) ہیں جن کے حالات ہم نے (ابھی تک) آپ کو نہیں سنائے اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (بلاواسطہ) گفتگو (بھی) فرمائی۔

تشریح:

ارشاد فرمایا گیا کہ بہت سے رسول وہ ہیں جن کا قرآن شریف میں نام لے کر ذکر ہو چکا اور بہت سے وہ ہیں جن کا اب تک ان کے ناموں کی تفصیل کے ساتھ قرآن پاک میں ذکر نہیں فرمایا گیا۔ ان سب رسولوں (علیہ السلام) میں وہ کتنے ہیں جن پر یکبار گی کتاب اتری۔ تو جب سب نبیوں (علیہ السلام) پر یکبار گی کتاب نہیں اتری تو نبی آخر الزّمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یکبار گی کتاب نہ اترنا یہودیوں کیلئے کیوں باعث اعتراض بنا ہوا ہے؟

یہاں سے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہے کہ انبیاء صرف اتنے ہی ہوئے ہیں جن کے نام قرآن مجید میں موجود ہیں اس لیے فرمایا کہ بعض ایسے انبیاء بھی ہیں جن کا نام قرآن حکیم میں نہیں آیا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ دوسرے انبیاء کا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی علم نہ تھا۔ علامہ آلوسی (رح) فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب انبیاء کا علم تھا۔ یہاں نفی زمانہ گزشتہ کی ہو رہی ہے۔ یہ اس کو مستلزم نہیں کہ آئندہ بھی نہ بتایا ہو۔ لان نفی قصہم من قبل لایستلزم نفی قصہم مطلّقا۔ (روح المعانی)

یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ کی گفتگو موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی بذریعہ فرشتہ ہوئی اور کلام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازی ہے۔ بلکہ حقیقتہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے بغیر کلام فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ جس بندے کو اپنے خاص فضل سے ممتاز کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ بے واسطہ گفتگو ہمارے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی ہوئی۔ لیکن موسیٰ (علیہ السلام) سے وادی ایمن میں اور مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بالائے عرش۔ بس وہی فرق جو کلیم اور حبیب میں ہے۔ علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو جو معجزہ عطا ہوا وہ معجزہ اللہ تعالیٰ نے بمعہ اضافہ اپنے محبوب کو بھی مرحمت فرمایا۔ بل ما من ذرۃ نور شعت فی العلمین الا تصدقت بھا شمس ذاتہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وللہ سجادر البوصیری حیث یقول۔

وکل ای اتی الرسل الکرام بھا   فانمااتصلت من نورہ بھم (روح المعانی)

یعنی سارے جہانوں میں نور کی کوئی کرن جو کہیں چمک رہی ہے وہ آفتاب محمدی کا صدقہ ہے۔ اور علامہ بوصیری (رح) نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ اللہ کے معزز و مکرم رسولوں کو جو معجزہ بھی ملا ہے وہ در حقیقت آپ کے نور فیضان ہے۔ (ضیاء)

اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انبیاء کرام صرف اسی قدر ہی نہیں جن کا ذکر کیا گیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے بعض کا ذکر کر دیا بعض کا ذکر نہ کیا بعض پر کتاب بعض پر صحیفے ہوئے اور بعض پر نہ کتاب نازل ہوئی نہ صحیفے۔

حضرت ابوذر (رض) نے فرمایا کہ میں نے بارگاہ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں عرض کیا یا رسول اللہ سب سے پہلے کون نبی تھا فرمایا حضرت آدمؑ جن سے کلام کیا گیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کل تعداد انبیاء کی کس قدر ہے ؟ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار جن میں سے تین سو پندرہ رسول ہوئے۔ رواہ احمد وابن ابی حاتم۔ حضرت انس (رض) فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار انبیاء مبعوث فرمائے ان میں چار ہزار بنی اسرائیل میں سے چار ہزار باقی سے تمام انبیاء پر ایمان لانا اجمالاً لازم ہے۔ (حسنات)

وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً۔ اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا

اللہ کا کلام کرنا وحی کا انتہائی درجہ ہے۔ انبیاء (علیہم السلام) میں یہ فضیلت کلام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو عطا فرمائی گئی۔ مگر رحمت مجسم سید عالم جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بے مثل فضیلت عطا کی گئی۔ فکانقاب قوسین کا مقام کسی دوسرے نبی (علیہ السلام) کو عطا نہ ہوا سوائے حبیب کبریا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے۔ اس پر صاحب روح المعانی (رح) فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) گویا کہ فرمایا گیا ہم نے وحی کی تمہاری طرف جیسے وحی کی فلاں فلاں کی طرف اور عطا کیا ہم نے مثل اس کے کہ عطا فرمایا فلاں کو اور بھیجا ہم نے تمہیں مثل بھیجے ان رسولوں جن کے اوپر ذکر فرمایا وغیرہ

جن انبیاء اور رسولوں کے اسمائے گرامی اور ان کے واقعات قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں ان کی تعداد 25 ہے۔ یعنی حضرت آدم، ادریس ، نوح، ھود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلمان، الیاس، الیسع، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ذوالکفل اور سب نبیوں کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین وسلم۔

(تفسیر ابن کثیر)

انبیاء اور رسولوں کے اسمائے گرامی اور ان کے واقعات قرآن مجید میں بیان نہیں کئے گئے ان کی حقیقی تعداد تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے مگر اس سلسلہ میں مشہور حدیث یہ ہے کہ انبیائے کرام کی تعداد ایک لاکھ 24 ہزار ہے، ان میں سے رسولوں کی تعداد 313 ہے۔

(تفسیر ابن کثیر)

امام عبد بن حمید ، حکیم ترمذی نے نوادر الاصوال میں ، امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں ، حاکم نے اور امام ابن عساکر نے حضرت ابوذر (رض) سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبی کتنے ہیں ؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں ، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں سے رسول کتنے ہیں ؟ آپ نے فرمایا تین سو اور تیرہ جم غفیر ہیں۔ پھر فرمایا اے ابوذر ! چار سریانی: آدم ، شیث ، نوح اور خنوع اور وہ ادریس ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا ، اور چار عرب ہیں

: ہود ' صالح 'شعیب اور تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور بنو اسرائیل کے انبیاء میں سب سے پہلے موسیٰ ہیں اور سب سے آخری عیسیٰ (علیہ السلام) ہیں 'اور سب سے پہلے آدمی ہیں اور سب سے آخری نبی تمہارے نبی ہیں۔ (تبیان)

امام ابن عساکر نے کعب احبار سے روایت کیا ہے اللہ نے حضرت آدم پر انبیاء اور مرسلین کی تعداد کے برابر لاٹھیاں نازل فرمائیں 'پھر انھوں نے اپنے بیٹے شیث کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے بیٹے تم میرے بعد میرے خلیفہ ہو گے 'تم اس لاٹھی کو مضبوطی اور تقوی کے ساتھ پکڑ لو 'اور جب تم اللہ کا نام لو تو اس کے ساتھ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لینا 'کیونکہ میں نے ان کا نام عرش کے پائے پر اس وقت لکھا دیکھا جب میں ہنوز روح اور مٹی (کے پتلے) کے درمیان تھا 'پھر میں نے آسمان کا طواف کیا تو میں نے آسمانوں میں ہر جگہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لکھا ہوا دیکھا 'پھر اللہ نے مجھے جنت میں ٹھہرایا تو میں نے جنت کے ہر محل اور ہر بالاخانہ میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لکھا ہوا دیکھا 'اور میں نے بڑی آنکھ والی حوروں پر سر کنڈوں پر شجرہ طوبی کے پتوں پر اور سدرۃ المنتہی کے پتوں پر اور ملائکہ کی آنکھوں کے درمیان بھوؤں پر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لکھا ہوا دیکھا۔

امام ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آدم اور نوح کے درمیان ایک ہزار سال ہیں 'اور نوح اور ابراہیم کے درمیان ایک ہزار سال ہیں 'اور ابراہیم اور موسیٰ کے درمیان ایک ہزار سال ہیں 'اور موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان چار سو سال ہیں 'اور عیسیٰ اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان چھ سو سال ہیں۔

امام ابن ابی حاتم نے اعمش سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار سال ہیں۔

لیکن امام حاکم نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ آدم اور نوح کے درمیان ایک ہزار سال ہیں اور نوح اور ابراہیم کے درمیان ایک ہزار سال ہیں 'اور ابراہیم اور موسیٰ کے درمیان سات سو سال ہیں 'اور موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار پانچ سو سال ہیں اور عیسیٰ اور ہمارے نبی (علیہ السلام) کے درمیان چھ سو سال ہیں۔ (الدرالمنثور ج ۲ ص ۲۴۸۔ ۲۴۷ 'مطبوعہ ایران)

علم نبوت پر ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے کلی علم (تمام مخلوق کا علم) نہیں عطا فرمایا 'کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے بعض انبیاء کا قصہ آپ کو بیان فرمایا ہے اور بعض کا قصہ بیان نہیں فرمایا 'اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں زمانہ ماضی میں بعض انبیاء کا قصہ بیان کرنے کی نفی ہے 'اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ آپ کی آخر عمر شریف تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان بعض انبیاء کے احوال کی خبر سے مطلع نہیں فرمایا نیز اس بحث میں اس آیت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے :

(آیت) "وکلا نقص علیک من انبآء الرسل ماتثبت بہ فؤادک"۔ (ھود : ۱۲۰)

ترجمہ : اور رسولوں کی خبروں میں سے ہم سب باتیں آپ پر بیان فرماتے ہیں جن سے ہم آپ کے دل کو ثابت رکھتے ہیں۔

ہر چند کہ سورۃ نساء مدنی ہے اور سورۃ ہود مکی ہے لیکن اہل علم پر روشن ہے کہ ان سورتوں کا مکی یا مدنی ہونا اکثر آیات کے اعتبار سے ہوتا ہے ' ہر ہر آیت کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔

احادیث میں مذکور ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتایا کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں اور رسول تین سو تیرہ ہیں 'اور اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کا قصہ آپ سے بیان نہیں فرمایا 'اس کا جواب یہ ہے کہ بعض انبیاء کا قصہ بیان نہ کرنے سے یہ

لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان انبیاء کا عدد بھی نہ بیان فرمایا ہو ' اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان خبروں سے مطلع نہ فرمایا ہو لیکن یہ اطلاع دی ہو کہ کل نبی اتنے ہیں ' اس تقریر سے بعض معاصرین کا یہ اعتراض دور ہو گیا کہ اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عدم علم کی تصریح ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سے منزہ ہیں کہ آپ کو انبیاء کی تعداد کا علم نہ ہو۔ (روح المعانی ج ٦ ص ١٨' ١٧ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

{ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا : اور اللہ نے موسیٰ سے کلام فرمایا۔ } یہ بھی یہودیوں کے اعتراض کے جواب کا حصہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بے واسطہ کلام فرمانا دوسرے انبیاء (علیہ السلام) کی نبوت کیلئے انکار کا ذریعہ نہیں ہو سکتا جن سے اس طرح کلام نہیں فرمایا گیا تو ایسے ہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر کتاب کا یکبارگی نازل ہونا بھی دوسرے انبیاء (علیہ السلام) کی نبوت کے انکار کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ١٦٤، ١/٤٥٢)

آیت کے اس حصے سے دو مسئلے معلوم ہوئے : ایک یہ کہ حضرت موسیٰ عَلٰی نَبِیِّنَا وَ (علیہ السلام) انبیاءِ بنی اسرائیل (علیہ السلام) میں بہت شان والے ہیں کہ ان کا ذکر خصوصیت سے علیحدہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء (علیہ السلام) کو خاص عظمتیں بخشی ہیں، ایک نبی کی خصوصیت تمام نبیوں میں ڈھونڈنا غلطی ہے جیسے ہر نبی کَلِیْمُ اللہ نہیں۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر خصوصی کرم فرمایا اور وادی ایمن میں آپ سے براہ راست بغیر فرشتہ کے گفتگو فرمائی لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات نہ صرف یہ کہ براہ راست کلام فرمایا بلکہ شرف زیارت سے بھی مشرف فرمایا۔ (تفسیر روح المعانی : سورۃ النجم)

جزء بن جابر الخثعمی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے یہودی علماء سے سنا ' جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان کے سوا ہر زبان میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان کے سوا ہر زبان میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے ' اے میرے رب میں اس کلام کو نہیں سمجھ رہا ' حتی کہ اللہ نے ان کی زبان میں ان کی آواز کے مشابہ آواز میں کلام فرمایا ' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب کیا تیرا کلام اسی طرح ہے ؟ فرمایا اگر میں اپنے کلام کے ساتھ تم سے کلام کروں تو تم فنا ہو جاؤ گے ' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب ! کیا مخلوق میں کوئی چیز تیرے کلام کے مشابہ ہے ؟ فرمایا آسمانی بجلی کی گرج دار کڑک میری آواز کے مشابہ ہے۔ (جامع البیان جز ٦ ص ٤١۔ ٤٠ ' مطبوعہ دار الفکر بیروت ١٤١٥ ھ) اگر دیکھا جائے تو یہودی علمأ بات کو سمجھ نہیں پائے ورنہ تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بغیر آواز کے ہر جہت اور ہر طرف سے سنا ' جس طرح اللہ تعالیٰ بغیر رنگ کے دکھائی دے گا اسی طرح اس کا کلام بغیر آواز کے سنائی دیتا ہے۔

اس آیت سے بھی یہود کا رد کرنا مقصود ہے انھوں نے کہا تھا کہ جب طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر آسمان سے کتاب نازل ہوئی تھی اسی طرح آپ پر بھی آسمان سے کتاب نازل کی جائے تو ہم آپ کو نبی مان لیں گے ' اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو شرف کلام سے نوازا اور باقی نبیوں سے ہم کلام نہیں ہوا حالانکہ تم ان سب کو نبی مانتے ہو جس طرح حضرت موسیٰ کی خصوصیت کلام کی وجہ سے تم باقی انبیاء (علیہم السلام) کی نبوت کا انکار نہیں کرتے تو اگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر خصوصیت کے ساتھ آسمان سے کتاب نازل کی گئی ہے تو تم اس وجہ سے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کیوں کرتے ہو !

ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اللہ سے ہم کلام ہونا اور تمام معجزات کا بہ درجہ اتم جامع ہونا

واضح رہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی خصوصیت ہم کلامی ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ دوسرے انبیاء کے اعتبار سے ہے اور یہ خصوصیت اضافی ہے حقیقی نہیں ہے ' اللہ تعالیٰ شب معراج ' ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی ہم کلام ہوا! اور آپ ﷺ کو زیادہ شرف اور فضیلت سے نوازا ' بلکہ ہر وہ معجزہ جو دوسرے نبیوں کو دیا گیا وہ زیادہ کمال اور حسن کے ساتھ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمایا ہے ' دیکھئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی مار کر زمین سے پانی نکالا ' لیکن زمین میں پانی ہوتا ہے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انگلیوں سے پانی جاری کر دیا جہاں پانی ہوتا ہی نہیں ' حضرت داؤد (علیہ السلام) کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا وہ اس سے زرہ بنا لیتے تھے ' لیکن لوہے کی طبیعت میں نرمی ہے وہ آگ سے نرم ہو جاتا ہے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہاڑ میں سر اقدس داخل کر دیا تو وہ موم کی طرح نرم ہوتا چلا گیا جب کہ پتھر کی طبیعت میں نرمی نہیں وہ ٹوٹ جاتا ہے یہ حسی نرمی تھی اور معنوی نرمی یہ تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا احد پہاڑ ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں ' پتھر میں محبت نہیں ہوتی جو محبت نہ کرے اس کو سنگ دل کہتے ہیں لیکن یہ تو ان کا کمال ہے کہ جس کی طبیعت میں محبت نہیں ہوتی اس میں بھی اپنی محبت پیدا کر دی ' حضرت سلیمانؑ کے لیے دور کی مسافت سے پلک جھپکنے سے پہلے تخت لایا گیا ' لیکن تخت ایسی چیز ہے جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے ' معراج کے بعد آپ ﷺ مشرکوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کر رہے تھے کسی نے آپ ﷺ سے مسجد اقصیٰ کی نشانیاں پوچھیں ایک لمحہ کے لیے آپ ﷺ کو تردد ہوا تو جبرائیلؑ نے مسجد اقصیٰ آپ ﷺ کے سامنے لا کر رکھ دی اور آپ ﷺ مسجد کو دیکھ کر نشانیاں بتاتے رہے ' حالانکہ مسجد ایسی چیز ہے جس کو صحیح وسالم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا سو تخت لانے سے یہ زیادہ بعید ہے ' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے چار مردے زندہ کیے لیکن ان کے بدن موجود تھے جس بدن میں ایک بار حیات آ چکی ہو اس میں دوبارہ حیات جاری کرنا ' اتنا بعید نہیں ہے ' آپ ﷺ کی توجہ سے پتھروں نے کلام کیا ' درخت چل کر آئے ' کھجور کا ستون آپ ﷺ کے فراق میں چلا چلا کر رونے لگا ' گوشت کا ایک ٹکڑا آپ ﷺ کے دہن میں بول اٹھا ' پتھروں ' درختوں اور ستونوں میں آپ ﷺ کی توجہ سے حیات آئی جن میں عادۃ حیات نہیں ہوتی! سو واضح ہو گیا کہ ہر نبی کو جو معجزہ دیا گیا اس نوع کا معجزہ آپ ﷺ کو زیادہ کمال اور زیادہ شرف کے ساتھ دیا گیا ' بلکہ اس کائنات میں جس صاحب کمال کو کوئی کمال ملا ہے وہ آپ ﷺ ہی کا تصدق ہے ' جس کو جو روشنی ملتی ہے وہ آپ ﷺ کے نور نبوت سے ملتی ہے اور حقیقت میں کمال وہی ہے جس کی اصل آپ ﷺ میں ہو اور جس چیز کی اصل میں آپ ﷺ نہ ہوں جس کی آپ ﷺ سے نسبت نہ ہو وہ کمال نہیں وہ سراسر نقص اور سرتاپا زوال ہے۔ (تبیان)

اللھم صلی وسلم وبارك علی سیدنا محمد وعلی ال سیدنا محمد کما صلیت وسلمت علی سیدنا ابراھیم وعلی ال سیدنا ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید سبحان ربك رب العزہ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین

آیت مبارکہ:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

لغۃ القرآن: [رُسُلًا : رسول (جمع)][مُّبَشِّرِيْنَ : خوشخبری دینے والے][وَمُنْذِرِيْنَ : اور ڈرانے والے][لِئَلَّا يَكُوْنَ : تاکہ نہ ہوجائے][لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے][عَلَي : پر][اللّٰهِ : اللہ][حُجَّةٌ : کوئی حجت][بَعْدَ : بعد][الرُّسُلِ: رسولوں][وَكَانَ : اور ہے][اللّٰهُ : اللہ][عَزِيْزًا حَكِيْمًا : غالب حکمت والا]

ترجمہ: رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈر سنانے والے تھے (اس لیے بھیجے گئے) تاکہ (ان) پیغمبروں (کے آجانے) کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ بڑا غالب حکمت والا ہے۔

تشریح: اس آیت کریمہ میں دو باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ رسولوں کے بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ اور دوسری یہ بات کہ ان کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ رسولوں کے بھیجنے کا مقصد اور رسولوں کا مشن یہ تھا کہ وہ انسانوں کو یہ بتانے کے لیے بھیجے جاتے تھے کہ تمہیں اللہ نے باقی تمام مخلوقات پر ایک شرف اور فضیلت بخشی ہے۔ تم کسی صحرا کے خود رو پودے نہیں ہو ' بلکہ اللہ نے تمہارے جدامجد کو اپنے دست قدرت سے بنایا ' پھر اس میں روح پھونکی ' فرشتوں کا اسے مسجود بنایا اور زمین پر اسے اپنا خلیفہ اور نبی بنا کر بھیجا۔ وہیں سے اس نبوت و رسالت اور ہدایت کے سلسلے کا آغاز ہوا اور ہر آنے والے نبی نے انسانوں پر واضح کیا کہ تم ایک مکلّف مخلوق ہو ' اللہ نے تمہیں زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ عطا فرمایا ہے جسے شریعت کہتے ہیں۔ تم اگر اپنی زندگی میں اس کی اطاعت کرتے اور ان احکام کی پابندی کرتے ہو تو تمہیں زندگی میں بھی آسانیاں ملیں گی ' آسودگی نصیب ہوگی ' حقوق و فرائض کی ادائیگی سے اس زمین کے رہنے والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور ایک دوسرے کی خوشیوں کا باعث ہوں گے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی زندگیوں کے دکھوں کو آسان کردے گی ' تم جب یہ زندگی گزار کے اپنے اللہ کے پاس پہنچو گے تو وہاں ایسی ایسی نعمتیں اور ایسی خوشیاں تمہاری انتظار میں ہوں گی جن کا کبھی تصور بھی تمہارے دل و دماغ میں نہیں گزرا ہوگا۔ اس کامیاب زندگی کی بشارت دینے کے لیے اللہ کے نبی تشریف لاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ یہ بتانے کے لیے آتے ہیں کہ تم نے اگر اپنے مالک ' اپنے آقا اور اپنے معبود حقیقی کو نہ پہچانا ' اس کے احکام کی اطاعت نہ کی ' اس کی نازل کردہ شریعت کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ نہ کیا تو تم دنیا میں بھی دکھ بھری زندگی گزارو گے ' ہمدردی و غمگساری کے بجائے ایذاء دہی اور خوں ریزی کا

چلن عام ہو جائے گا 'انسان حیوان اور درندے بن جائیں گے 'ہر طرف تباہی مچ جائے گی 'بر و بحر میں فساد پھیل جائے گا 'ہر طاقتور کمزور کا شکار کرے گا اور ہر ظالم کے ہاتھوں کمزور پناہ مانگیں گے اور جب تم یہ زندگی گزار کے اللہ کے حضور پہنچو گے تو وہاں سخت جواب دہی کے مراحل سے گزرو گے 'ناکامی کی صورت میں جہنم کا وہ عذاب تمہارا مقدر بن جائے گا جس کی ہولناکی کا تم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے وہ مشن جسے لیکر دنیا میں انبیاء و رسل آتے تھے۔ (روح)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر زمین میں اپنا خلیفہ نامزد فرمایا اور اسے عقل و فکر کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کم از کم اتنی عقل و فکر ضرور عطا فرمائی ہے کہ وہ اچھے و برے اور نفع و نقصان میں تمیز کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی پہچان کے لیے دنیا میں بیشمار شواہد و قرائن پیدا فرمائے پھر جزوی تشریحات کو چھوڑ کر دین کے بنیادی ارکان کو ہمیشہ سے ایک رکھا۔ تاکہ جس دین کے بغیر گزارہ نہیں اسے سمجھنا اور اپنانا انسان کے لیے آسان رہے۔ اس فطری، ماحولیاتی، اور آفاقی رہنمائی کے باوجود انسان پر یہ کرم کیا کہ پے در پے انبیاء کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیائے کرام (علیہ السلام) ایسی بے مثال شخصیات تھیں جو پیدائشی طور پر گفتار کے سچے، کردار کے پکے اور اس قدر خیر خواہ اور مخلص ہوا کرتے تھے کہ جن کو دیکھ کر پتھر بھی پکار اٹھے کہ یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے۔ پھر ہر نبی کو اس کے حالات کے مطابق ایسے ایسے معجزات عطا کے گئے کہ ان کے جانی دشمن بھی تنہائی میں ان کے سچے ہونے کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ انبیاء اس قدر مخلصانہ اور بے پناہ جد و جہد کرتے اور اس کے بدلے ایک پائی بھی وصول کرنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے مشن کے لیے جان کی بازی لگادی اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار اور انبیاء (علیہ السلام) کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر تھے یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو لوگوں کے لیے اختیاری رکھا ہے اور انبیاء (علیہ السلام) کو صرف بتلانے اور سمجھانے والا بنا کر بھیجا تھا۔ جن کی تبلیغ و تعلیم کا مقصد لوگوں کو اچھے برے اعمال اور ان کے انجام سے آگاہ کرنا ہے۔

تاکہ محشر کے دن خدا کے حضور مجرم پیش ہوں تو ان کے پاس یہ حجت نہ ہو کہ ہمیں یاد دلانے اور سمجھانے والا نہیں آیا تھا۔ اس لیے فرمایا ہے کہ اے رسول ! یہود و نصاریٰ کی سازشوں اور لوگوں کے انکار سے دلبرداشتہ اور ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں اگر یہ لوگ ہٹ دھرمی اور دنیا پرستی کی وجہ سے آپ کی رسالت کا انکار اور اللہ تعالیٰ کے احکامات سے انحراف کرتے ہیں تو اس سے خدا کی خدائی اور آپ کی پیغمبرانہ شان اور کام میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ دنیا کا منصب اور عہدہ نہیں کہ جس کو لوگ مسترد کر دیں گے تو اسے نامزد کرنے والا بالآخر واپس بلانے پر مجبور یا صاحب منصب خود بھاگ جائے گا۔ یہ تو نبوت کا مقام عالی ہے کہ ساری مخلوق بھی ٹھکرا دے تو نبی کی نبوت اور اس کے اجر و ثواب میں رائی کے دانے کے برابر بھی کمی نہیں آتی۔ اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچاتے جائیں اسے معلوم ہے کہ کون اس کے پیغام کا حق ادا کرتا ہے اور کس کس نے اس کا انکار کرنا ہے زمین و آسمان کا مالک گواہی دیتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اسی نے اپنے علم کے مطابق آپ پر قرآن مجید نازل فرمایا ہے لہٰذا اپنا کام جانفشانی اور پورے اخلاص کے ساتھ جاری رکھیں لوگ تائید نہیں کرتے تو نہ کریں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ کی نبوت، اخلاص اور کار نبوت کی ادائیگی پر گواہ ہیں یاد رکھیں کہ اللہ کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی گواہی معتبر نہیں ہو سکتی ہے۔

صاحب روح المعانی (رح) فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) رسولوں کا شریعت لانا اس لیے ضرور تھا تاکہ جو ایمان لائے اطاعت و فرمان برداری کرے اسے جنت کی بشارت دیں اور انھیں ڈر سنائیں جو کفر کریں نافرمان بنیں جہنم اور عذاب کا تاکہ کوئی عذر باقی نہ رہے اور یوں کہنے کی جرائت نہ ہو کہ ہماری طرف تو نے رسول کیوں نہ بھیجا کہ وہ ہم پر شریعت ظاہر فرما دیتا اور جو ہم نہ جانتے تھے وہ سکھا دیتا تیرے احکام سے کیونکہ ہم میں نقص قوی بشری ہے جو ادراک مصالح دنیا اور آخرت سے قاصر

رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بعث رسل سے قبل خلق پر عذاب نہیں فرماتا چنانچہ دوسری جگہ فرما بھی دیا وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً

علامہ بغوی (رح) فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ثبوت اس آیت کا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو بھیجے بغیر کسی کو عذاب نہیں دے گا اور نبی کے احکام پر عذاب اللہ کی طرف سے اسی وقت ہو گا جب لوگ اس سے سرکشی کریں گے۔

دوسرے یہ بھی روشن ہو گیا کہ معرفت الٰہی اور بیان شرع زبان انبیاء ہی سے حاصل ہوتی ہے محض عقل کی روشنی اس منزل تک پہنچانے سے عاجز ہے۔ جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے وہ کہتے ہیں ان العقل کاف وان ارسال الرسل انما ھو للتنبیہ احناف کا مذہب یہ ہے۔ فالایۃ ظاھرۃ فی انہ لابد من الشرع وارسال الرسل وان العقل لا یغنی عن ذلک لازمی ہے شرع اسلام میں ارسال رسل اس لیے کہ عقل محض اس سے مستغنی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ یہی ارشاد ہوا کہ ہم نے رسل کرام کی بعثت اس لیے فرمائی کہ بعد میں کوئی کافر لولاارسلت الینار سولاً کہہ کر عذر پیش نہ کر سکے۔ (روح المعانی)

یک بارگی کتاب نازل نہ کرنے کے اعتراض کا ایک اور جواب

اس آیت میں بھی یہود کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یک بارگی پوری کتاب کیوں نہیں نازل کی گئی ' جواب کی تقریر یہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کو بھیجنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیں اور عبادت کرنے والوں اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے والوں کو ثواب کی بشارت دیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں اور یہ مقصد صرف نبی پر کتاب نازل کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ کتاب الواح (تختیوں) کی صورت میں یکبارگی نازل کی جائے یا متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام نازل کیے جائیں ' بلکہ تھوڑے تھوڑے احکام وقتاً فوقتاً نازل کرنا مصلحت اور حکمت کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ اگر تمام احکام ایک دم نازل کر دیئے جائیں تو ان سب پر فوراً عمل کرنا دشوار ہو گا ' اور بنو اسرائیل کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان پر یکبارگی تمام احکام کا بوجھ ڈال دیا گیا تھا ' اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور آپ کے وسیلہ سے ہم پر یہ رحمت فرمائی کہ تھوڑے تھوڑے کر کے احکام نازل کیے شراب کی حرمت تدریجاً نازل کی ' کتوں سے اجتناب کا حکم بھی بہت بعد میں دیا ' جوئے کو بھی بعد میں حرام کیا کیونکہ جو لوگ برسوں سے ان کاموں کے عادی تھے ان کے لیے ان کاموں کو یک لخت چھوڑنا آسان نہ تھا ' مکہ کی زندگی میں پہلے ان کو نماز کا پابند کیا ' پھر مدینہ منورہ میں جہاد ' زکوۃ اور روزے کے احکام نازل کیے اس کے بعد حج فرض کیا ' پھر بتدریج مسلمانوں کو تمام برے کاموں کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ سو واضح ہوا کہ قرآن مجید میں جو تھوڑے تھوڑے کر کے احکام نازل کیے گئے ہیں۔ مصلحت اور اللہ کی رحمت کے بہت زیادہ قریب ہیں اور اس پر یہود کا اعتراض بالکل بے جا اور ان کی کم عقلی پر مبنی ہے۔ (تبیان)

مسائل

۱۔ انبیاء (علیہ السلام) کی بعثت کا مقصد لوگوں تک اللہ کے پیغامات پہنچانا ہے۔

۲۔ رسول لوگوں کو جنت کی خوش خبری اور عذاب سے ڈرانے والے تھے۔

۳۔ رسول اتمام حجت کے لیے مبعوث کیے جاتے تھے۔
۴۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا وہ حق ہے۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾ؕ

لغۃ القرآن: [لٰكِنِ : لیکن][اللّٰهُ : اللہ][يَشْهَدُ : گواہی دیتا ہے][بِمَآ : اس کی جو][اَنْزَلَ : اس نے نازل کیا][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][اَنْزَلَهٗ : نازل کیا ہے اس نے اس کو][بِعِلْمِهٖ : اپنے علم کے ساتھ][وَالْمَلٰٓئِكَةُ : اور فرشتے][يَشْهَدُوْنَ : گواہی دیتے ہیں][وَكَفٰى : اور کافی ہے][بِاللّٰهِ شَهِيْدًا : اللہ گواہ]

ترجمہ: (اے حبیب ! کوئی آپ کی نبوت پر ایمان لائے یا نہ لائے) مگر اللہ (خود اس بات کی) گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے، اسے اپنے علم سے نازل فرمایا ہے اور فرشتے (بھی آپ کی خاطر) گواہی دیتے ہیں، اور اللہ کا گواہ ہونا (ہی) کافی ہے۔

تشریح:

اس آیت میں یہود کا اعتراض کا جواب ہے ' یہود نے کہا تھا کہ وہ اس قرآن کو منزل من اللہ نہیں مانتے ' جو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے ' سو آیت کا معنی یہ ہے کہ ہر چند کہ یہود آپ کی کتاب اور آپ کی نبوت کو نہیں مانتے لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے آپ کی طرف جو کچھ نازل فرمایا وہ اپنے علم کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزات عطا فرمائے اور ان معجزات کی وجہ سے آپ کی تصدیق کرنا واجب ہے ' اور اگر یہود آپ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے تو اس سے آپ کو کیا کمی ہوتی ہے جب کہ اس کائنات کا رب اور آپ کا معبود آپ کی تصدیق کرتا ہے اور عرش کرسی اور آسمانوں اور زمینوں کے فرشتے آپ کی تصدیق کرتے ہیں اور یہود تو لوگوں میں سب سے خسیس درجہ کے ہیں اس لیے یہ اگر آپ کی تصدیق نہیں کرتے تو آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔
حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہود کی ایک جماعت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے ان سے فرمایا واللہ میں جانتا ہوں کہ تم اس امر کو بخوبی جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں انھوں نے جواب دیا ہم نہیں جانتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جانیں نہ جانیں اور آپ کو مانیں یا نہ مانیں مگر اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اس کی شہادت کا ذریعہ یہ قرآن ہے جو اس نے اپنے کمال علمی اور علم خاص کے ساتھ آپ کی جانب بھیجا ہے یہ قرآن کریم ہی اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کیونکہ یہ کتاب اعجاز ہی اعجاز ہے جو آپ کی نبوت کے لیے ایک دلیل قاطع ہے ایسی معجز کتاب کا نازل کرنا جس کے جواب سے تمام دنیا عاجز ہے یہی آپ کی نبوت کے لیے کافی دلیل ہے اور چونکہ یہ کتاب ہم نے نازل فرمائی ہے اور علم خاص سے نازل فرمائی ہے لہٰذا یہی ہماری گواہی ہے کہ آپ ہمارے رسول ہیں۔

علم خاص سے مراد وہ مغیبات ہیں جو گزشتہ دور میں ہو چکے یا آئندہ ہونے والے ہیں اور یہ قرآن کریم ان مغیبات ماضیہ اور مستقبلہ کو شامل ہے یا علم خاص سے مراد قرآن کی تالیف و ترتیب ہے کہ جس کی چھوٹی چھوٹی سی سورت کا بھی جواب دینے سے تمام فصحا عاجز ہیں۔ یا علم خاص سے مراد وہ علم ہے جو نبوت کے لائق اور مناسب ہے اور جس علم کی مخلوق محتاج ہے اور جو مخلوق کی اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم مراد ہو اللہ تعالیٰ کی مرضیات و مکروہات کی جانب اشارہ ہو بہر حال ! اس کلام کا معجز ہونا اور انواع واقسام کے علوم پر مشتمل ہونا جو پیغمبر آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شایان شان ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے لیے کھلی برہان ہے اور چونکہ اس قرآن کریم کو ہم نے نازل کیا ہے اس لیے اس قرآن کے ذریعہ ہم آپ کی نبوت پر شاہد ہیں۔ اگر یہ اعتراف نہیں کرتے تو نہ کریں مخلوق میں سے وہ مخلوق آپ کی تصدیق کرتی ہے جو ان سے بہتر اور برتر ہے یعنی فرشتے اس لیے کہ وہ اس کتاب کو لے کر آتے ہیں اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور آپ کی حفاظت و اعانت کرتے ہیں اس لیے وہ آپ کی نبوت کے مصدق اور شاہد ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کی شہادت کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ان کی شہادت تو ظاہری تھی وہ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان ہی لائے تھے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت آپ کے لیے کافی ہے اور آپ کی نبوت پر جو دلیل اس نے قائم کی ہے وہی کافی ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔ (کشف)

اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے تسلی ہے اب آگے منکروں کے توبیخ اور ظالموں کے لیے وعید مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ (تسہیل)

قرآن کی حقانیت

اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اے پیغمبر (علیہ السلام) ! یہ لوگ قرآن پاک کی حقانیت تسلیم کریں یا نہ کریں لکن اللہ یشھد بما انزل الیک مگر اللہ تعالیٰ اس چیز کی گواہی ضرور دیتا ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے قرآن پاک کی سچائی کی ایک دلیل یہ بھی ہے انزلہ بعلمہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ علیم کل ہے۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی (رح) حدیث کے راوی اور بڑے بزرگ آدمی ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق امام ابن کثیر (رح) نے نقل کیا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کرتا تو کہتے اخذت بعلم اللہ تم نے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل کر لیا ہے۔ اب تم سے افضل دنیا میں کوئی نہیں الا بعمل ہاں جو اس پر عمل کرے گا، وہ تجھ سے بہتر ہوگا، مقصد یہ کہ قرآن پاک اللہ کا علم ہے جس نے اسے حاصل کر کے اس پر عمل کیا وہ افضل ترین آدمی ہے۔ اس عظیم کتاب کے مطابق اللہ نے فرمایا قسم ہے اس عزت والے قرآن کی نیز یہ بھی فرمایا ! اے پیغمبر ! بیشک یہ کتاب آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے باعث شرف ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے اللہ نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا۔

آ گے فرمایا والملیکۃ یشھدون اللہ کے فرشتے بھی اس کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ مقدس مخلوق ہے جس کی تعداد خود اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے "قل ای شیٔ اکبر شہادۃ قل اللہ شہید بینی وبینکم "سب سے بڑی گواہی تو خدا تعالیٰ کی ہے۔ خدا تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ یہ سچی کتاب ہے۔ توحید کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی کا ذکر آتا ہے۔ یعنی اللہ، اس کے فرشتے اور انصاف پر قائم رہنے والے صاحب عقل لوگ بھی گواہی دیں گے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح قرآن پاک کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ آخری کتاب اپنے آخری نبی پر اپنے علم سے اتاری۔ اس کے علوم، معارف اور حقائق کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اس کی کسی چیز پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں کہیں کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما! (معالم)

راستے کا پتھر

اس آیت کریمہ میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی قبولیت حق سے روکتے ہیں۔ مگر آج جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج خود مسلمان اسلام کے راستے میں سب سے بڑا پتھر ہے۔ انگریز نو مسلم محمد پکھتال (رح) نے مدارس میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ میرا دنیا بھر کا مشاہدہ ہے کہ خود مسلمان اسلام کے راستے کا سنگ گراں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمان توحید اور قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہونگے تو وہ سنگ گراں ہی ہیں۔ مسلمان کے لیے تو لازم تھا کہ وہ اسلام کی حفاظت کرتا۔

جاپان کے ایک نو مسلم پروفیسر ہشام سے دریافت کیا گیا کہ تمہارے اسلام لانے کی کیا وجہ بنی، تو کہنے لگا، میں مسلمانوں کے کردار کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوا، بلکہ خوش قسمتی سے مجھے قرآن پاک کا نسخہ میسر آ گیا جسے پڑھ کر مجھے یقین آ گیا کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ البتہ مسلمان خود جھوٹے ہیں۔

مقام افسوس ہے۔ اگر آدمی نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہوں تو اللہ کی پکار اس کو عین اپنی تلاش کا جواب معلوم ہو گی۔ اس کو محسوس ہو گا کہ وہ حق جو انسانی باتوں میں ڈھک کر رہ گیا تھا، اللہ نے اس کی بے آمیز شکل میں اس کے اعلان کا انتظام کیا ہے، یہ اللہ کے علم اور حکمت کا ظہور ہے نہ کہ کسی شخص کے ذاتی جوش کا کوئی معاملہ۔

یہاں یہ بھی یاد رہے:

قرآن علم الٰہی کا خزانہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ قرآن علم الہٰی کا مخزن ہے۔ وحی کے ذریعہ انسان کو ایسی باتوں کا علم ہوا جنہیں معلوم کرنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا مثلاً دشمنوں کی سازشوں کی بروقت اطلاع، مسلمانوں کی بروقت امداد، ہنگامی پس منظر میں احکام الٰہی کا فوری نزول، مستقبل کے متعلق بہت سی پیشین گوئیاں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ مثلاً روم کا ایران پر غلبہ، دین اسلام کی تمام ادیان پر سربلندی، قیامت سے پہلے اور مابعد کے حالات نشر و حشر اور جنت دوزخ سے متعلق معلومات وغیرہ۔ اور اسی وحی الہٰی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک مبتدی اور ایک منتہی دونوں ہی قرآن سے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق فیض یاب ہوتے ہیں۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ جوں جوں انسان آیات الٰہی میں غور کرتا ہے نئے نئے حقائق اس کے سامنے آنے لگتے ہیں۔ اور یہ سب باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے نازل فرمایا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت لامحدود ہے اسی طرح اس کے کلام کی پہنائیاں اور حقائق بھی لامحدود ہیں۔

فوائد

1 : اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اس نے گزشتہ کتابوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خبر دی اور حضور کو معجزات عطافرمائے جیسے وزیر یا حاکم کا شاہی تمغہ بادشاہ کی گواہی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ایسے شاندار نبی ہیں کہ رب ان کی نبوت کا گواہ ہے۔

2 : یعنی آپ خاص علوم غیبیہ اس قرآن میں ودیعت رکھے تاکہ قرآن کے ذریعہ سے اپنے محبوب کو وہ علوم عطافرمائے۔ رب فرماتا ہے فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔ اور فرماتا ہے نزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شئی اس صورت میں بعلمہ کی ب تلبس کی ہے یا یہ معنی ہیں کہ یہ عظیم الشان کتاب جس شاندار بندے پر اتاری جان کر ہی اتاری۔ انھیں ہی اس کتاب کے لائق پایا۔ مصرعہ

خدا نے خدائی میں تجھ سا نہ پایا۔

رب فرماتا ہے۔ اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ۔ اس بے مثل کتاب کے لیے ایسا بے نظیر ہی نبی چاہیے تھا۔ (روح البیان)

3 : معلوم ہوا کہ فرشتے بھی ہمارے رسول کا کلمہ شہادت پڑھتے ہیں بلکہ قیامت میں سارے رسول ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلمہ پڑھیں گے۔ معراج کی رات سارے پیغمبروں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے جو نماز پڑھی وہ ہمارے حضور کی نماز تھی نہ کہ ان کے اپنے دینوں کی۔

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۶۷﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک][الَّذِیْنَ : وہ لوگ][کَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا][وَصَدُّوْا : اور انہوں نے روکا][عَنْ : سے][سَبِیْلِ : راستہ][اللّٰہِ : اللہ][قَدْ : یقیناً][ضَلُّوْا : وہ گمراہ ہوگئے][ضَلٰلًا : گمراہ ہونا][بَعِیْدًا : بہت دور]

ترجمہ: بیشک جنہوں نے کفر کیا (یعنی نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی) اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، یقینا وہ (حق سے) بہت دور کی گمراہی میں جا بھٹکے۔

تشریح:

انبیاء (علیہ السلام) کے مشن کی مخالفت کرنے والوں کی سزا

کفر کا معنٰی ہے حقیقت پر پردہ ڈالنا، شرعی اصطلاح میں اللہ اور اس کے رسول اور قیامت کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ جو لوگ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں وہی لوگ اللہ کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد صراط مستقیم اور دین کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کی درج ذیل صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو سکتی ہے۔

۱۔ خود کفر اختیار کرنا، اپنے کردار اور طریقہ کار سے لوگوں کو دین سے روکنا۔

۲۔ اسلام کا اقرار کرنے کے باوجود جان بوجھ کر کفار جیسا عقیدہ اور کردار رکھنا جس سے لوگوں کی نظروں میں اسلام اور مسلمانوں کا وقار ختم ہو جائے ایسے لوگ بیک وقت کفر اور ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نہ انھیں معاف کرتا ہے اور نہ ہی صراط مستقیم کی توفیق دیتا ہے۔ ان کے پسندیدہ راستے پر چلنے کے لیے انھیں کھلا چھوڑ دیتا ہے جو راستہ جہنم کا راستہ ہے۔ اس جہنم میں انھیں ابدالاباد تک رہنا نافرمان بڑا ہو یا چھوٹا اسے جہنم میں پھینکنا اللہ تعالیٰ کے لیے ذرّہ برابر مشکل نہیں۔ یہاں ان کی نہ فریاد سنی جائے گی اور نہ کوئی ان کی مدد کرنے والا ہو گا۔ (فہم)

سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب مکہ مکرمہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تو مالداروں میں صرف ابو بکر صدیق (رض) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے اور وہ بھی درمیانہ قسم کے مالدار تھے باقی جتنے بھی تھے وہ غریب تھے جیسے حضرت بلال (رض) خباب بن ارت (رض) حضرت عمار (رض) حضرت ابو فکیہہ (رض) یہ غلام تھے لوگوں کی مزدوریاں کرتے تھے کسی وقت کھانا نصیب ہوتا تھا اور کسی وقت نصیب نہیں ہوتا تھا لوگ ان کو فقیر سمجھتے تھے مگر کافروں نے ان مسکینوں پر بھی ظلم کے پہاڑ گرائے ان کو مارتے پیٹتے ان کے ٹخنوں میں رسیاں باندھ کر گھسیٹتے تھے مکہ مکرمہ کا علاقہ پتھریلا ہے اب تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سڑکیں بنی ہوئی ہیں اس زمانے میں اس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا تھا تو اس پتھریلی زمین پر ان کو گھسیٹتے کہ ایمان چھوڑ دو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جانا چھوڑ دو تو ایسے لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکا قد ضلوا ضللا بعیداً تحقیق وہ گمراہ ہوگئے گمراہی دور کی اگر گمراہی نزدیک کی ہو تو اس کے راہ راست پر آنے کی امید ہوتی ہے اور جو صحیح راستے سے دور نکل جائے تو اس کا راہ راست پر آنا خاصہ مشکل ہوتا ہے

ان الذین کفروا وظلموا بیشک وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا اور انھوں نے ظلم کیا شرک کیا بعض مفسرین کرام (رح) فرماتے ہیں کہ ظلموا کا معنی ہے انھوں نے شرک کیا کیونکہ شرک بھی ظلم ہے حضرت لقمان (رح) نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: یٰبنی اے میری بیٹے ! لا تشرک باللہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرنا ان الشرک لظلم عظیم (پارہ: ۲۱ سورۃ لقمان) بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے

ظلم کا لغوی معنیٰ تو ہے ” وضع الشیء غیر محلّہ “ کسی شیئ کو اس کے محل میں نہ رکھنا یعنی جس کا جو حق بنتا ہے اس کو نہ دینا کسی اور کو دے دینا ۔ بعض ظلم سے عام ظلم مراد لیتے ہیں مثلا: کسی کے ساتھ زبانی طور پر زیادتی کی ہے فعلا زیادتی کی ہے کسی کو ناجائز مارا ہے یا کسی کا حق کھا گیا ہے تو ایسوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا جب تک صاحب حق نہ معاف کرے اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے کر تو سکتا ہے مگر اس کا ضابطہ ہے کہ حق والا معاف کرے گا تو معافی ہو گی اس لیے حقوق العباد کا مسئلہ بہت سخت ہے اس کا خیال رکھنا۔ ظلم کرنے والے کو سیدھے راستہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی راہ راست کے لیے بڑا صاف دل چاہیے الا طریق جھنم سوائے جہنم کے راستے کے خٰلدین فیھا ابداً ہمیشہ رہنے والے ہوں گے جہنم میں برے لوگوں کے لیے برے راستہ پر چلنا آسان ہوتا ہے اور نیکی کے راستہ پر چلنا بھاری لگتا ہے ان کو نماز پڑھنا روزہ رکھنا مسجد میں داخل ہونا ایسے معلوم ہو گا جیسے پہاڑ اٹھانا ہے لیکن چوری ڈکیتی کیلئے ساری رات جاگنا چاہے سردی کا موسم ہو لوگوں کے گھر میں نقب زنی کرنا اور لوٹنا آسان ہے

انسان کا جب مزاج بدل جاتا ہے تو اچھے برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے آدمی کی آنکھیں درست ہوں تو اپنے اپنے محل میں درست نظر آتی ہے اور اگر بھینگا ہو تو اس کو ایک کی دو نظر آتی ہیں کیونکہ زاویہ بگڑا ہوا ہوتا ہے اور صفراوی مزاج والے آدمی کو بخار ہو جائے تو اس کو میٹھی چیز کڑوی لگتی ہے چینی شہد تک کڑوا لگتا ہے کیونکہ مزاج بگڑ جائے تو اس کو حق کی بات کڑوی لگتی ہے اور سچی بات سے اس کو کوفت ہوتی ہے اور جہنم کا راستہ اس کو آسان لگتا ہے وکان ذلک علی اللہ یسیرا اور ہے یہ چیز اللہ تعالیٰ پر آسان کہ مشرک کو جہنم میں ڈالے اور ہمیشہ جہنم میں ہی رکھے

آگے اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو خطاب فرماتے ہیں چاہے یہودی عیسائی ہوں مشرک ہوں گورے ہوں کالے ہوں مشرق میں رہنے والے ہو یا مغرب میں فرمایا یاایھا الناس اے لوگو! دنیا کے جس خطے میں بھی رہتے ہو قد جآء کم الرسول بالحق تحقیق آگیا تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمام رسولوں کے سردار ہیں امام ہیں تمام مخلوق سے افضل ہیں حق لے کر تمہارے پاس یہ قرآن پاک اول سے آخر تک حق ہی حق ہے جو وحی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ملی ہے وہ حق ہے اور جو معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے ہیں حق ہیں من ربکم تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے خود نہیں آیا للذا تم یہ کرو فامنوا خیر الکم بس تم ایمان لاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے شان والے پیغمبر ہیں خاتم النبیین ہیں ان پر ایمان لاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے

وان تکفروا اور اگر تم انکار کرو گے ایمان لانے سے تو اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا تمہارا ہی نقصان ہو گا کہ فان للہ ما فی السمٰوٰت والارض پس بیشک اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے آسمانوں میں سورج ہے چاند ہے ستارے ہیں فرشتے ہیں بیشمار مخلوق ہے حدیث پاک میں آتا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ عبادت میں مشغول نہ ہو کعبۃ اللہ کے عین محاذات میں ساتویں آسمان پر ایک مقام ہے جس کا نام ہے بیت المعمور فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں جس طرح انسان کعبۃ اللہ کا طواف کرتے ہیں حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور جس فرشتے نے ایک دفعہ طواف کر لیا ہے اس کو دوبارہ قیامت تک موقع نہیں ملتا اور زمین میں بھی اللہ تعالیٰ کی بیشمار مخلوق ہے انسان ہیں حیوانات ہیں چرند ہیں پرند ہیں پہاڑ ہیں دریا ہیں حشرات الارض ہیں زمین کی سطح پر بھی بہت کچھ ہے اور اس کی تہہ میں بھی بہت کچھ ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور وہی مالک ہے وہی ان میں تصرف کرنے والا ہے اور یاد رکھنا وکان اللہ علیما حکیما اور ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا تمہارا کوئی قول فعل اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے اگر مجرم کو فوری طور پر سزا نہیں دیتا تو یہ اس کی حکمت ہے اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا اللہ تعالیٰ اپنی پکڑ اور گرفت سے سب کو محفوظ فرمائے آمین۔ (ذخیرہ)

تو قرآن مجید اور حضرت محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ ﷺ سے منکر ہوئے اور توراۃ میں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو چھپالیا اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دین حق سے باز رکھا۔ سوایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہوئی نہ ہدایت جس سے خوب واضح ہو گیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے جس سے یہود کو پوری سرزنش ہو گئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہو گئی۔

نکات

1۔ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرتے۔

2۔ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت وصفت چھپا کر اور لوگوں کے دلوں میں شبہ ڈالا کرتے (یہ حال یہود کا ہے)

آیت مبارکہ:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک][الَّذِیْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا][وَظَلَمُوْا : اور انہوں نے ظلم کیا][لَمْ : نہیں][یَكُنِ : وہ ہے][اللّٰهُ : اللہ][لِیَغْفِرَ : کہ وہ بخش دے][لَهُمْ : ان کو][وَلَا : اور نہ][لِیَهْدِیَهُمْ : تاکہ وہ دکھلائے ان کو][طَرِیْقًا : راہ]

ترجمہ: بیشک جنہوں نے (االلہ کی گواہی کو نہ مان کر) کفر کیا اور (رسول کی شان کو نہ مان کر) ظلم کیا، اللہ ہر گز (ایسا) نہیں کہ انھیں بخش دے اور نہ (ایسا ہے کہ آخرت میں) انھیں کوئی راستہ دکھائے۔

تشریح:

اس آیت میں یہود پر عذاب کی وعید ہے

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہود نے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا کفر کیا ' اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شبہات ڈال کر ان کو اسلام لانے سے روکا مثلاان سے کہا اگر یہ واقعی رسول ہوتے تو آسمان سے یک بار گی کتاب لے کر آتے جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) توراۃ لائے تھے ' اور یہ کہا کہ توراۃ میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی شریعت قیامت تک تبدیل نہیں ہو گی نہ اس میں کوئی نسخ ہو گا ' اور انھوں نے کہا کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) اور حضرت داؤد کے سوااور کسی کی نسل سے نبی مبعوث نہیں ہو سکتا ' ان اقوال کی وجہ سے یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں جاپڑے اور وہ اپنی اس گمراہی کو حق باور کرتے تھے ' اور اسی گمراہی کی وجہ سے دنیا کا مال اور دنیاوی مناصب حاصل کرتے تھے ' اللہ تعالیٰ نے ان کو وعید سنائی کہ ان کی ان گمراہیوں کی وجہ سے اور ان پر قائم رہنے اور ان کی حق سمجھنے کی وجہ سے اللہ ان کی نہیں بخشے گا اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ (تبیان)

یاد رہے کہ بعض کفر ' کفر کرنے والوں تک محدود ہوتا ہے لیکن بعض کفر ایسے بھی ہوتے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہ گار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں۔ کفر کے ساتھ ظلم کا لفظ جب بھی اور جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے یہ ایسے کفر کا ذکر ہے جو صرف کفر کرنے والے تک محدود نہیں ہوتا یہ وہی کفر ہوتا ہے جو پوری سوسائٹی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے یہ کفر وہی کفر جس کے کرنے والے ہی اس کی زد میں نہیں آتے بلکہ یہ ان کے لیے بھی

اتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے جتنا کرنے والوں کے لئے۔اس کی مثال اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا ' زمین اور پانی ہر چیز میں پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں جو وباء آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندہ رہنے والے اور اسی گندے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آجاتے ہیں۔اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال بھی ہے کہ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود ہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے 'جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی جب اس کے درمیان برے اور بے حیاء اور بد اخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو اعلانیہ اچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور اچھے لوگ بد عملی اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر خاموش ہو جاتے ہیں تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہوتا ہے جس میں گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :

بچو فتنے سے

"بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھیں لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہے "ظلموا منکم خاصہ "اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ' "الانفال 8:25) اور اس ظلم سے مراد شرک بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بھی دراصل وبائی مرض ہے اور جس معاشرہ میں پھیلتا ہے پھیلتا ہی چلا جاتا ہے اور کوئی علاج بھی اس پر اتنا جلد اثر نہیں کرتا اس وبائی پھوڑے کا نشتر کے سوا کوئی علاج نہیں۔چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ "اس پر شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے ؟یقینا ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ "(الانعام 6:21) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹ بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے یقینا اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ "(الانعام 6:144) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیت کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے ؟جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔ "(الانعام 6:107) ظاہر ہے کہ اللہ کی آیت سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کریم کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جارہے تھے اور وہ نشانیاں بھی جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آرہی تھیں اور وہ آثار کائنات بھی جنہیں قرآن کریم اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

فرمایا کہ "جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم میں بھی بے باک ہوگئے اور مرتے دم تک اسی حالت میں سرشار رہے تو خدا نہیں کبھی بخشنے والا نہیں نہ انھیں کامیابی کی کوئی راہ دکھائے گا۔ "کیوں ؟اس لیے کہ وہ ایسی راہ پر چلنے کے لیے تیار نہیں اور مجبور کر کے سیدھی راہ پر لگانا قانون الٰہی کے خلاف ہے اور اللہ اپنے قانون کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ (عروۃ)

فوائد

1: اس طرح کہ توراۃ پر ظلم کیا کہ اسے بدل دیا۔ لوگوں پر ظلم کیا کہ انھیں ایمان سے روکا۔ اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ شرک کیا۔
2: جب تک وہ کافر ہیں یا اگر کفر پر مریں۔
3: حدیث شریف میں ہے۔ کہ مومن جنت میں اپنے ٹھکانے پر ایسے بے تکلف پہنچ جائے گا۔ جیسے ہمیشہ کا آنے جانے والا تھا۔ (نور)

آیت مبارکہ:

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾

لغۃ القرآن: [اِلَّا : مگر][طَرِيْقَ : راہ][جَهَنَّمَ : جہنم کی][خٰلِدِيْنَ : وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں][فِيْهَآ : اس میں][اَبَدًا: ہمیشہ][وَكَانَ : اور ہے][ذٰلِكَ : یہ][عَلَي : پر][اللّٰهِ : اللہ][يَسِيْرًا : آسان]

ترجمہ: سوائے جہنم کے راستے کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ کام اللہ پر آسان ہے۔

تشریح:

دوزخیوں کو دوزخ میں ڈالنا بھی عدل وانصاف کا تقاضا ہے

کہ باغیوں اور سرکشوں کو سزا دینا اس کے عدل وانصاف کا تقاضا ہے اور اس کے لیے اس نے اپنی مخلوق کو پوری طرح خبردار بھی کردیا، تاکہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ سو انذار و تبلیغِ حق سے اعراض وانکار کرنے والوں کو دوزخ میں ڈالنا بھی حضرت حق۔ جل مجدہ۔ کے عدل وانصاف کا تقاضا ہے تاکہ ہر کسی کو اپنے کیے کرائے کا پورا صلہ اور بدلہ ملے۔ (مدنی)

بہشت میں پہنچنے کے تمام راستے اب ان کے لیے بند ہو چکے ہیں صرف ایک جہنم ہی کا راستہ ہے، جو ان کے لیے کھلا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے اعمال قبیحہ پیدا فرمائے ہیں جو انھیں جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال اس وقت پیدا فرمائے جب انھوں نے اپنی قدرت وطاقت اور اختیار کا رخ برائیوں کی طرف پھیر دیا۔۔ یا۔۔ اس سے قیامت کے دن کا معاملہ مراد ہے کہ ملائکہ کرام انھیں جہنم کی طرف ہانک کرلے جائیں گے۔ اور پھر وہ ہمیشہ ہمیش اسمیں رہیں گے)۔

لفظ خلود کبھی عرصہ دراز تک ٹھہرنے کے معنی میں آتا ہے اس لیے، خالدین فیھا ابدا، فرما کر اس احتمال کو اٹھا دیا گیا ہے تاکہ کوئی کافر یہ نہ سمجھ لے کہ اسے فقط چندروز جہنم میں ٹھہرایا جائے گا۔ اور یہ یعنی ان کو دائمی طور پر جہنم میں ٹھہرانا (اللہ تعالیٰ) (کے لیے آسان ہے) اس لیے کہ یہ محال ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو پورا نہ کرسکے، اور وہ بھی بآسانی پورا نہ کرسکے۔۔

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دلائل کثیرہ کے ساتھ یہود کے قول باطل کا رد کیا، اور رسول عربی کی نبوت کے صادق اور برحق ہونے کو ظاہر کیا، اور اب اس آیت میں نبی کی نبوت کو ماننے کی عام دعوت دی جارہی ہے خواہ یہودیوں یا غیر یہودیوں ہوں سب کو رسول عربی کی نبوت کو ماننے کی دعوت دی ہے۔۔ (اشرفی)

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر جو دلائل قاطعہ بیان کئے گئے ہیں ان کے باوجود بھی جو شخص ان کی نبوت اور ان کے لائے ہوئے مذہب سے کفر کرے گا اور امر حق کے قبول کرنے سے انکار کرے گا اور نہ صرف انکار بلکہ دوسروں کو بھی اس امر حق کے قبول کرنے سے روکے گا خواہ کتمان حق کے ذریعہ روکے جیسا کہ یہود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت کو چھپاتے ہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہیں پہچانتے یا کوئی اور ذریعہ اختیار کرے۔ جیسے منافق کہ چپکے چپکے لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرتے رہتے ہیں تو ایسے لوگ انتہائی گمراہی میں جاپڑے جو گمراہی راہ حق سے بہت دور ہے دوسری آیت میں اخروی سزا کا بیان ہے دنیا میں تو یہ لوگ انتہائی گمراہی میں مبتلا ہیں اور آخرت میں ان لوگوں کی جو امر حق کے منکر ہیں اور کتمان حق سے دوسروں کو ہی نقصان پہنچارہے ہیں اور راہ حق تلاش کرنے والوں پر ظلم کررہے ہیں کہ ان کو بہکا کر راہ حق سے ہٹارہے ہیں۔

تو ان کو اللہ تعالیٰ کبھی نہیں بخشے گا اور سوائے دوزخ کی راہ اور کوئی راہ ان کو نہیں دکھائے گا یعنی جنت میں جانا تو کیسا جنت کا راستہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا بلکہ دوزخ کی جانب ان کی رہنمائی کی جائے گی اور یہ اس دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

آخر میں فرمایا ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں بلکہ اس پر بہت آسان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ انما امرہ اذاارادشیئاًان یقول لہ کن فیکون۔ (کشف)

یعنی جب حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت سے انکار کرکے خود پر ظلم کرنے والوں کے دلوں پہ ان کے مسلسل کفر کے سبب مہر لگادی گئی تو اب ان پر دوزخ کے راستہ کے سوا ہر راستہ بند ہوگیا۔ یاد رہے اللہ از خود کسی پر ہدایت کا راستہ بند نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ہدایت کا راستہ بند کرلیتے ہیں جیسے معدہ کا مریض اگر ڈاکٹر کی بات ٹھکرا کر نقصان وہ چیزیں کھاتا جائے تو ایک وقت آتا ہے جب کوئی دوا اثر نہیں کرتی یہی حال دل کو لگنے والے مرض کفر کا ہے۔ (برہان)

جہنم کیا ہے؟

جہنم کیا ہے؟ آپ ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھیں کہ جیسے "چوہوں کا پنجرا" کہ اس کی باہر کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے گویا دروازہ لگایا ہی نہیں گیا۔ لیکن اندر اتنی گہری کھائی ہے کہ جو داخل ہوگیا بس ہوگیا اب نکلنا اس کے اختیار کی بات نہ رہی۔ لیکن داخل ہونا؟ ہاں! داخل ہونا اس کے اختیار کی بات تھی۔ کسی نے اسے مجبور کرکے داخل نہیں کیا اس لیے کہ اس کا داخلہ تو ہر وقت کھلا ہے۔ جب چاہے اور جو چاہے داخل ہوجائے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ اجازت لینے کے عادی تو ہوتے ہی نہیں بلکہ اجازت لینا ان کی بڑائی کے بالکل خلاف ہے اس لیے وہ بے دھڑک داخل ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں تازہ حقہ بھی وہاں موجود ہے اور دوزخیوں کے بچھونے اور اوڑھنے بھی جیسا کہ اشاد الٰہی: "ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزاء جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔" (الاعراف 7:41) اور پیاسے اونٹ کی طرح پی جانے والی چیز کو میں نے حقہ کہہ دیا ہے اور قرآن کریم میں ہے "فشربون شرب الھیم دوزخی پیاسے اونٹ کی طرح پییں گے۔ (الواقعہ 52:50)

غور کرلو کہ ان کا کام ہی کیا تھا؟ "ظلم اور انکار "اس کا نتیجہ کیا ہوتا چاہیے تھا؟ وہی جو پیچھے ذکر کیا گیا۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ گندم سے گندم پیدا ہوتی ہے اور جو سے جو اسی لیے کسی نے کہہ دیا ہے
گندم از گندم بروید جو زجو واز مکافات عمل غافل مشو
فرمایا "اللہ کے لیے ایسا کرنا بالکل آسان ہے۔ "قانون کے مطابق جو ہوتا ہے ہمیشہ آسان ہی ہوتا ہے۔ مشکلات ساری قانون کی خلاف ورزی ہی میں ہیں۔ کاش کہ یہ بات مسلمانوں اور خاص کر آج کل کے راہنمایاں اسلام کی سمجھ میں بھی آجائے۔ (عروہ)

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہونی چاہئیے

اب ذرا اس آیت کا تقابل کیجیے آیت ۱۴۷ کے ساتھ (مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ ۔۔) اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔۔؟ یقیناً اللہ ایذا پسند (sadist) نہیں ہے 'اسے لوگوں کو عذاب دے کر خوشی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اس کا ضابطہ اور قانون ہے 'اسی پر اس نے دنیا بنائی ہے 'اور اپنے اسی ضابطے اور قانون کے عین مطابق وہ مستحقین کو جزا و سزا دے گا۔ یہ اس پر کوئی بھاری گزرنے والی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی ہی مخلوق کو سزا دے۔ بعض لوگ اس طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ اللہ بڑا رحیم ہے 'کیا وہ اپنی ہی مخلوق کو جہنم میں جھونک دے گا؟ یہ تو ایسے ہی ڈراوے کے لیے 'لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے عذاب اور سزا کی باتیں کی گئی ہیں۔ جیسے باپ بچوں کو ڈانٹتا ہے میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا 'ماں کہتی ہے میں تیرا قیمہ کر دوں گی۔ تو کیا وہ سچ مچ اپنے بچوں کا قیمہ کر دے گی؟ للذا یہ تو صرف ڈراوا ہے 'حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا 'وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے خیالات و نظریات گمراہ کن ہیں۔ ماں کے لیے تو اپنے بچے کو بڑے سے بڑے قصور پر بھی آگ میں ڈالنا ممکن نہیں ہے 'مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا 4) اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے 'بہت ہلکی بات ہے۔ (بیان)

آیت مبارکہ:

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ فَاٰمِنُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ ؕ وَاِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۷۰﴾

لغۃ القرآن: [یٰۤاَیُّہَا : اے][النَّاسُ : لوگو !][قَدْ : یقیناً][جَآءَکُمُ : آگیا تمہارے پاس][الرَّسُوْلُ : یہ رسول][بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ][مِنْ : سے][رَّبِّکُمْ : تمہارا رب

][فَاٰمِنُوْا : تو تم ایمان لاؤ][خَيْرًا : بہتر ہوگا][لَّكُمْ: تمہارے لیے] وَاِنْ : اور اگر][تَكْفُرُوْا : تم کفر کروگے][فَاِنَّ : تو یقیناً][لِلّٰهِ : اللہ ہی کا ہے][مَا فِي : جو کچھ][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَ : اور][الْاَرْضِ: زمین][وَكَانَ : اور ہے][اللّٰهُ : اللہ][عَلِيْمًا : جاننے والا][حَكِيْمًا : حکمت والا ہے]

ترجمہ: اے لوگو ! بیشک تمہارے پاس یہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تشریف لایا ہے، سو تم (ان پر) اپنی بہتری کے لیے ایمان لے آؤ اور اگر تم کفر (یعنی ان کی رسالت سے انکار) کرو گے تو (جان لو وہ تم سے بے نیاز ہے کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً (وہ سب) اللہ ہی کا ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

تشریح:

بنی نوع انسان کو خوشخبری

تمام بنی نوع انسان کو عظیم خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ اے لوگو ! تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حق کے ساتھ تشریف لاچکے، وہ خود بھی حق ہیں اور ان کا ہر قول، ہر ادا حق ہے، ان کی شریعت حق ہے، ان کی طبیعت حق ہے، ان کی تعلیم حق ہے، وہاں باطل کا گزر نہیں۔ لہٰذا ان پر ایمان لے آؤ، اس میں تمہارے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر تم خاتَمُ الْمُرْسَلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا انکار کرو گے تو اس میں ان کا کچھ ضرر نہیں اور اللہ عَزَّوَجَلَّ تمہارے ایمان سے بے نیاز ہے۔ (صراط)

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دلائل کثیرہ کے ساتھ یہود کے قول باطل کا رد کیا ' اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے صادق اور برحق ہونے کو ظاہر کیا ' اور اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو ماننے کی عام دعوت دی ہے۔ خواہ یہود ہوں یا غیر یہود ہوں سب کو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو ماننے کی دعوت دی ہے ' نیز فرمایا وہ اللہ کے پاس سے حق لے کر آئے ہیں اس سے مراد یا تو قرآن عظیم ہے کیونکہ قرآن عظیم کلام معجز ہے اور یہ معجزہ آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا ' سو قرآن عظیم کے اعجاز کو دیکھ کر تم آپ کو نبی مان لو اور آپ کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور یا حق سے مراد دین اسلام ہے آپ نے یہ دعوت دی ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور باطل خداؤں کی پرستش نہ کرو اور یہی عقل سلیم کا تقاضا ہے ' سو تم اس دعوت کو قبول کرلو اور آپ کو نبی مان کر اسلام میں داخل ہو جاؤ اور اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نہ صرف تمہارے اسلام لانے سے بلکہ سارے جہانوں سے مستغنی ہے تمام آسمان اور زمینیں اس کی ملک میں ہیں اور وہ بہت علم والا اور بڑی حکمت والا ہے ' اور اس کے علم اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کافر اور مومن اور نیکوکار اور بدکار کو ایک درجہ میں نہیں رکھے گا۔ (تبیان)

سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاؤ۔ جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں۔ یہی تمہارے لیے بہتر راستہ ہے اگر تم ایمان لانے اور حق کا ساتھ دینے سے گریزاں ہو تو یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں کوئی فرق نہیں پڑتا

زمین وآسمان کا ذرّہ ذرّہ اور چپہ چپہ اس کے تابع فرمان ہے۔ صرف باغی انسان ہی پوری کائنات کے طرزِ عمل کے خلاف طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ ڈھیل انسان کو اس لیے نہیں دی گئی کہ انسان کے اعمال وخیالات اللہ کے علم سے باہر ہیں اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے کے باوجود اپنی حکمت ومشیّت کے تحت انسان کو ایک وقت مقرر تک چھوڑے ہوئے ہے جب اس کی گرفت اور عتاب کا وقت آئے گا تو باغی اور ظالم کو چھڑانے اور بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

حق (اَلْحَقُّ) اللہ کے ۹۹ صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (مشکوٰۃ: باب اسماء اللہ) "حق" سے مراد قرآن اور اللہ کا پیغام ہے آپ کی نبوت کے بارے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے نہ صرف دعا کی بلکہ مکہ شہر کی نشاندہی بھی فرمائی کہ اس شہر اور اس قوم میں آخری نبی ہونا چاہیے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس سے آگے بڑھ کر آپ کا اسم گرامی لے کر بنی اسرائیل کو آپ کی نبوت کی بشارت سے نوازا۔

(عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ السُّلَمِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) یَقُولُ إِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ فِی أُمِّ الْکِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِیِّینَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِی طِینَتِہِ وَسَأُنَبِّءُکُمْ بِتَأْوِیلِ ذٰلِکَ دَعْوَۃِ أَبِی إِبْرَاہِیمَ وَبِشَارَۃِ عِیسَی قَوْمَہُ وَرُؤْیَا أُمِّی الَّتِی رَأَتْ أَنَّہُ خَرَجَ مِنْہَا نُورٌ أَضَاءَتْ لَہُ قُصُورُ الشَّامِ وَکَذٰلِکَ تَرَی أُمَّہَاتُ النَّبِیِّینَ صَلَوَاتُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ) [رواہ احمد]

"حضرت عرباض بن ساریہ سلمی بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں قرآن مجید میں مجھے خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے جب حضرت آدم (علیہ السلام) ابھی مٹی اور روح کے درمیان تھے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہوں انھوں نے دیکھا کہ ان کے وجود سے ایک روشنی نکلی جس سے ملک شام کے محلات روشن ہوگئے۔ اور اسی طرح ہی انبیاء کرام (علیہ السلام) کی مائیں دیکھا کرتی تھیں۔"

(یَا عِبَادِی لَوْ أَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَإِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوا عَلَی أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مَا نَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُلْکِی شَیْءًا) [رواہ مسلم: باب تَحْرِیمِ الظُّلْمِ]

"اے میرے بندو اگر تمہارے پہلے، پچھلے جن وانس سارے کے سارے فاجر انسان کی طرح ہو جائیں میری بادشاہت میں کسی چیز کی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔" (فہم)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عالمگیر نبی ہیں اس لیے دنیا تمام انسانوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ سچائی کے پیکر رسول یعنی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچائی کا پیغام لے کر تمہارے اندر جلوہ گر ہو چکے ہیں، لہٰذا تم اس پر ایمان لے آؤ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے انکار کیا تو یاد رکھو زمین وآسمان کے ہر ذرہ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ تمہارے ایمان نہ لانے سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑے گا، البتہ تمہیں نافرمانی کی سزا کے طور پر ہمیشہ جہنم میں رہنا پڑے گا۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کا مختصر مفہوم یہ ہے: اے میرے بندو! اگر تم سارے متقی اور نیک بن جاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں اضافہ نہیں ہوگا اور اگر تم سارے سرکش اور نافرمان بن جاؤ تو میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اے میرے بندو! اگر تم سب ایک میدان میں جمع ہو کر مجھ سے سوال کرو اور میں ہر انسان کو اس کے سوال کے مطابق عطا کر دوں تو میرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ (مسلم: 6572: کتاب البر: باب 15) (امداد)

مسائل

۱۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔

۲۔ کفر وشرک کرنے والے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔

فوائد

1: معلوم ہوا کہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود بھی حق ہیں اور ان کا ہر قول ہر فعل ہر ادا حق ہے، وہاں باطل کا گزر نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جھوٹ یا باطل یا گناہ سرزد نہیں ہوتے

2: معلوم ہوا کہ دنیا میں ہمارا آنا اور ہے۔ حضور کا آنا اور ہم اپنی ذمہ داری پر آئے ہیں اور حضور رب کی ذمہ داری پر بھیجے گئے ہیں۔ جیسے ملک میں سیاح کا جانا اور وزیر اعظم کا دورہ۔

آیت مبارکہ:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع

لغۃ القرآن: [يٰۤاَهْلَ : اے اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][لَا تَغْلُوْا : نہ تم غلو (حد سے بڑھو) کرو][فِيْ : میں][دِيْنِكُمْ : اپنے دین][وَلَا تَقُوْلُوْا : اور نہ تم کہو][عَلَي اللّٰهِ : پر اللہ][اِلَّا الْحَقَّ: مگر حق بات][اِنَّمَا : یقیناً][الْمَسِيْحُ : مسیح][عِيْسَى: عیسیٰ][ابْنُ : بن][مَرْيَمَ : مریم][رَسُوْلُ : رسول][اللّٰهِ : اللہ کا][وَكَلِمَتُهٗ : اور اس کا کلمہ ہے][اَلْقٰىهَاۤ : جس کو اس نے ڈالا][اِلٰي مَرْيَمَ : طرف مریم کی][وَرُوْحٌ: اور روح][مِّنْهُ : اس کیطرف سے][فَاٰمِنُوْا : پس تم ایمان لاؤ][بِاللّٰهِ : اللہ کے ساتھ][وَرُسُلِهٖ : اور اس کے رسولوں][وَلَا : اور نہ][تَقُوْلُوْا : تم کہو][ثَلٰثَةٌ : (الٰہ) تین][اِنْتَهُوْا : باز

آجاؤ][خَيْرًا : بہتر ہوگا][لَّكُمْ: تمہارے لیے] [اِنَّمَا : یقیناً][اللّٰهُ : اللہ ہی ہے][اِلٰهٌ: معبود][وَّاحِدٌ : واحد (ایک)][سُبْحٰنَهٗٓ: وہ پاک ہے][اَنْ : اس سے کہ][يَّكُوْنَ : ہو][لَهٗ : اس کے لیے][وَلَدٌ: کوئی اولاد][لَهٗ : اسی کا ہے][مَا : جو کچھ][فِي : میں][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَمَا : اور جو کچھ][فِي : میں][الْاَرْضِ: زمین][وَكَفٰي : اور کافی ہے][بِاللّٰهِ : اللہ][وَكِيْلًا : کار ساز]

ترجمہ: اے اہل کتاب ! تم اپنے دین میں حد سے زائد نہ بڑھو اور اللہ کی شان میں سچ کے سوا کچھ نہ کہو، حقیقت صرف یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جسے اس نے مریم کی طرف پہنچادیا اور اس (کی طرف) سے ایک روح ہے۔ پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ (معبود) تین ہیں، (اس عقیدہ سے) باز آجاؤ، (یہ) تمہارے لیے بہتر ہے۔ بیشک اللہ ہی یکتا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لیے کوئی اولاد ہو، (سب کچھ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہے۔

تشریح:

خطاب کا آغاز یہود سے ہوا تھا جس میں انھیں مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا۔ ان کے بعد تمام لوگوں کو دعوت حق قبول کرنے کی تلقین کی گئی۔ اب عیسائیوں کی دین کے بارے میں بنیادی خرابی یعنی "غلو" کرنے سے روکا جارہا ہے جو ان کی گمراہی کا اصل سبب ہے غلو کا معنی ہے محبت یا تعصب میں آکر افراط و تفریط کرنا۔ یہودیوں نے تعصب کی بنا پر عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں غلو کیا اور وہ اس میں اتنا آگے نکل گئے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی پاکباز والدہ پر الزامات لگائے جناب عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل کا انکار کیا حالانکہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے بارہا دفعہ فرمایا تھا کہ میں کوئی الگ شریعت لے کر نہیں آیا بلکہ توراۃ کی تعلیمات کی تکمیل کے لیے آیا ہوں لیکن ستیاناس ہو اس غلو کا جس کے نتیجہ میں یہودیوں نے ہر سچائی کو ٹھکرادیا۔ ان کے برعکس عیسائیوں نے دوسری انتہا کو اختیار کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا اور مریم [کو خدا کی بیوی قرار دیا یہودی عداوت کی بنیاد پر گمراہ ہوئے اور عیسائی محبت میں غلو کرنے کی وجہ سے گمراہ ٹھہرے۔ عیسائیوں کو اس لیے روکا اور ٹوکا جارہا ہے کہ تمھیں عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں غلو نہیں کرنا چاہیے ان کی حیثیت تو یہ تھی کہ وہ مریم کے بیٹے اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں خدا کی خدائی میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں اور یہودیوں کے عقیدہ کے حوالے سے ہر شخص کے باطل نظریہ کی نفی فرمائی ہے کہ کوئی ذات ادنیٰ ہو یا اعلیٰ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ اور اس کی صفات کی حامل نہیں ہوسکتی اس عقیدہ کو سورۃ اخلاص میں کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ رسول کا مقام

دنیا میں انسان تو کروڑوں اور اربوں گزرے ہیں اور ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کے لیے ایسے انسانوں کو منتخب فرماتا ہے جو ظاہری و باطنی کمال، کردار کی پاکیزگی اور قلبی طہارت کے لحاظ سے اپنے دور کے سب سے بلند اور ممتاز انسان ہوا کرتے تھے۔ انسان اور ضرورتوں کے

ناتے سے وہ لوگوں کے ہم شکل اور ہم مثل ہوتے تھے لیکن خوبیوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسانوں کے ساتھ ان کی کوئی نسبت نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس لیے آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا "اَیُّکُمْ مِثْلِیْ "تم میں سے کون میری مثل ہے ؟ گویا کہ رسول شرف انسانیت کی انتہا اور خدا کی مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے۔ لہٰذا عیسیٰ (علیہ السلام) رسول اللہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعزاز سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

عیسیٰ (علیہ السلام) کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ رسول کا معنی ہے پیغام پہنچانے والا، ظاہر ہے کہ جس کی طرف سے کوئی پیغام دینے والا ہو اس کا بھیجنے والا اس سے اعلیٰ اور بہتر ہوا کرتا ہے۔ بھیجنے والا جب چاہے اپنے رسول کو واپس بلا سکتا ہے اس لیے ہر پیغمبر اپنی زندگی گزار کر موت کی آغوش میں چلا گیا اور یہی بات رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں ارشاد ہوئی ہے۔ "ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کو ہیشگی نہیں دی۔ اگر آپ فوت ہو جائیں تو کیا وہ ہمیشہ رہیں گے ؟ "[الانبیاء : ۳۴]

۳۔ عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں :

قرآن مجید میں کلمہ کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے :

ا۔ کلمہ کا معنی ہے خوشخبری اور بشارت سورۃ آل عمران کی آیت ۴۵ میں اس طرح استعمال ہوا ہے۔

"اور جب فرشتوں نے مریم سے کہا : بلاشبہ اے مریم ! اللہ تجھے اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا وہ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ "[آل عمران : ۴۵]

۲۔ کلمہ کا معنیٰ آیت اور نشانی ہے۔

"اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی پھر ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار تھی۔ "[التحریم : ۱۲]

۳۔ کلمہ کا معنیٰ کلام۔

"امید ہے اب میں نیک عمل کروں گا جسے میں چھوڑ آیا ہوں ہر گز نہیں۔ یہ بس ایک بات ہوگی جسے اس نے کہہ دیا اور ان کے درمیان دوبارہ اٹھنے تک کے دن تک ایک آڑ ہوگی۔ "[المومنون : ۱۰۰]

عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ اور کلمتہ اللہ ہونے کے ساتھ ان کا تیسرا اعزاز یہ ہے کہ وہ اللہ کی روح ہیں یہی وہ لفظ ہے جس سے عیسائی مغالطہ کا شکار ہوئے یا وہ جان بوجھ کر مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اپنی روح قرار دے کر مریم میں اس کا القاء فرمایا لہٰذا مریم اور اللہ تعالیٰ کو ملا کر ایک مثلّث بنتی ہے جسے وہ عرف عام میں تثلیث قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ان کی من ساختہ اختراع ہے کیونکہ قرآن مجید میں لفظ روح کا استعمال مختلف انداز میں ہوا ہے۔

"تو جب میں اسے درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔ "[الحجر : ۲۹]

اگر عیسائیوں کی باطل دلیل کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر فرد اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی روح کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس سے حلول جیسے بدترین شرک کا تصور سامنے آتا ہے جس کی تائید معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی نہیں کر سکتا اس بنیاد پر اہل کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے سمجھایا گیا

ہے کہ بس اللہ اور اس کے رسولوں پر اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح تمہیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور تثلیث کے باطل عقیدہ کو یک لخت چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دینے میں ہی تمہاری بہتری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے یکتا اور تنہا ہے اس کی ذات اور صفات میں اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں ہے۔ اس کی ذات ان سہاروں اور رشتوں سے ممتاز اور پاک ہے۔ تم عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو اللہ تعالیٰ کو اولاد کی ضرورت نہیں ہے اولاد تو انسان کی ضرورت اور کمزوری ہے۔

۱۔ اولاد کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کا سلسلہ نسب جاری رہے تاکہ اس کا نام اور کام باقی رہے۔

۲۔ اولاد نہ ہو تو انسان اپنے آپ میں تنہائی اور اداسی محسوس کرتا ہے۔ ۳۔ اولاد آدمی کا سہارا اور اس کی ضروریات میں معاون ہوتی ہے۔ ۴۔ ماں، باپ اولاد کے ساتھ محبت کرنے میں طبعاً مجبور ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہے اور نہ ہی تنہائی محسوس کرتا ہے نہ اس کو خدمت اور سہارے اور معاون کی ضرورت ہے۔ وہ تو محبت عطا کرنے والا اور کائنات کی ہر چیز کو سہارا دینے والا ہے وہ ان کمزوریوں سے یکسر بے نیاز ہے اسے کسی کی حاجت نہیں کیونکہ زمین و آسمان کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ اس کی غلامی اور فرماں برداری میں لگا ہوا ہے۔ اس کا تعلق مخلوق کے ساتھ باپ اور بیٹے یا کسی کا حصہ ہونے کی بنا پر نہیں اس کا تعلق مخلوق کے ساتھ خالق اور مالک اور مملوک کا ہے جسے دنیا کے کسی رشتے کے ساتھ نسبت نہیں دی جاسکتی۔

(عَنْ اَبِی ہُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَال النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُرَاہُ یَقُول اللّٰہُ شَتَمَنِی ابْنُ آدَمَ وَمَا یَنْبَغِی لَہٗ اَنْ یَّشْتِمَنِی، وَتَکَذَّبَنِی وَمَا یَنْبَغِی لَہٗ ، اَمَّا شَتْمُہٗ فَقَوْلُہٗ اِنَّ لِی وَلَدًا وَاَمَّا تَکْذِیبُہٗ فَقَوْلُہٗ لَیْسَ یُعِیدُنِی کَمَا بَدَاَنِی)

[رواہ البخاری : باب مَاجَاءَ فِی قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالَی (وَہُوَالَّذِی یَبْدَاُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیدُہٗ)]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا آدم کا بیٹا مجھے گالیاں دیتا ہے اور یہ اس کے لیے لائق نہیں اور وہ میری تکذیب کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لیے لائق نہیں اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ میں نے اولاد پکڑی ہے اور مجھے جھٹلانا اس کا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے دوبارہ نہیں لوٹایا جائے گا جس طرح مجھے پہلی بار پیدا کیا گیا۔ (فہم)

عیسائیوں کے فرقے اور ان کے عقائد

عیسائی چار بڑے فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے (1) یعقوبیہ۔ (2) ملکانیہ۔ (3) نسطوریہ۔ (4) مرقوسیہ۔ ان میں سے ہر ایک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں جداگانہ کفریہ عقیدہ رکھتا تھا۔ یعقوبیہ اور ملکانیہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کہتے تھے۔ نسطوریہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے جبکہ مرقوسیہ فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ تین میں سے تیسرے ہیں، اور اس جملے کا کیا مطلب ہے اس میں بھی ان میں اختلاف تھا، بعض تین اُقْنُوم (یعنی وجود) مانتے تھے اور کہتے تھے کہ باپ، بیٹا، روح القدس تین ہیں اور باپ سے ذات، بیٹے سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور روح القدس سے ان میں حُلُول کرنے والی حیات مراد لیتے تھے گویا کہ ان کے نزدیک اِلٰہ تین تھے اور اس تین کو ایک بتاتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ناسُوتِیَّت (یعنی انسانیت) اور الوہیت کے جامع ہیں، ماں کی طرف سے ان میں ناسوتیت آئی اور باپ کی طرف سے الوہیت آئی ”تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا“ (اللہ تعالیٰ ظالموں کی بات سے پاک ہے اور بہت ہی بلند و بالا ہے) یہ فرقہ بندی عیسائیوں میں ایک یہودی نے پیدا کی جس کا نام بُولَس تھا، اس نے انھیں گمراہ کرنے کے لیے اس طرح کے عقیدوں کی تعلیم دی۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱۷۱، ۱/۴۵۴)

اس آیت میں اہل کتاب کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں افراط و تفریط سے باز رہیں، انھیں خدا اور خدا کا بیٹا بھی نہ کہیں اور حلول واِتّحاد کے عیب لگا کر ان کی تنقیص بھی نہ کریں، بلکہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت مریم (رض) کے بیٹے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی نسب نہیں، صرف اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جو رب تعالیٰ نے حضرت مریم (رض) کی طرف بھیجا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص روح ہیں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں اور تصدیق کریں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ ایک ہے، بیٹے اور اولاد سے پاک ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کریں اور اس کی کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ عَزَّوَجَلَّ کے رسولوں میں سے ہیں۔
{ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: اور نہ کہو (کہ معبود) تین ہیں۔ } بعض عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، بعض انھیں تیسرا خدا مانتے تھے اور بعض انھیں کو خدا مانتے تھے، ان تینوں فرقوں کی تردید کے لیے یہ آیت کریمہ اتری۔ لفظ "اللّٰہُ" میں ایک فرقے کی تردید ہے۔ "وّٰحِد" میں دوسرے کی اور "سُبْحٰنَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ" میں تیسرے کی۔ عقل مند انسان خود ہی غور کرلے آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، جتنے انسان ہیں سب اسی کے بندے اور مملوک ہیں انہی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم (رض) بھی داخل ہیں اور جب یہ بھی بندے اور مملوک ہیں تو ان کا بیٹا اور بیوی ہونا کیسے مُتَصَوَّر ہوسکتا ہے؟ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان سب بیہودہ باتوں سے پاک اور مُنَزَّہ ہے۔ (صراط)

اس سے پہلے یہود کا ذکر تھا جنھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مقام بلند کو نہ پہچانا اور آپ کو نبی ماننا تو کجا ایک شریف آدمی بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ آپ کی ذات مقدسہ اور آپ کی والدہ طاہرہ پر گندے سے گندے بہتان لگائے۔ یہاں تک کہ آپ کو قتل کرنے کی بھی مذموم کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ ان کی تردید کے بعد روئے سخن دوسری قوم کی طرف ہوتا ہے جنھوں نے حضرت مسیح کو یوں بڑھایا کہ انھیں خدا یا خدا کا بیٹا ماننا شروع کردیا۔ اب انھیں اس غلو سے روکا جارہا ہے اور انھیں بتایا جارہا ہے کہ وہ خدا نہیں، خدا کے بیٹے نہیں بلکہ خدا کے برگزیدہ رسول اور مقبول بندے ہیں۔ غلو کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا الغلوا التجاوز فی الحد (قرطبی) قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر کے ساتھ کلمہ اور روح کے الفاظ کا ذکر اکثر ملتا ہے اس لیے ان کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنا از حد ضروری ہے تاکہ کسی کی وسوسہ اندازی سے انسان متاثر نہ ہو۔
کلمہ کا لغوی معنی تو ہے ومایںنطق بہ الانسان جس کے ساتھ نطق کیا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پر اس کا اطلاق حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازاً ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وجہ مجاز کیا ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر کلمہ کے اطلاق کی وجہ یہ ہے کہ ہر مولود کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کی تخلیق سے متعلق ہو اور وہ اپنی زبان قدرت سے "کن" فرما کر اسے اذن ظہور دے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مادہ منویہ شکم مادر میں قرار پکڑے اور وقت معین گزرنے کے بعد اس کی ولادت ہو۔ پہلا سبب اگرچہ حقیقی ہے لیکن نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس لیے اسے سبب بعید کہہ لیجئے اور دوسرا سبب کیونکہ عادی اور عام ہے اور اسے ہر ایک جانتا ہے مومن ہو یا غیر مومن اس لیے اسے سبب قریب کہہ لیجئے۔ اب یہاں دلائل قطعیہ سے ثابت ہے کہ سبب قریب یعنی مادہ منویہ موجود نہیں اس لیے ان پر سبب بعید یعنی کلمہ "کن" کا اطلاق کردیا اور آپ کو کلمۃ اللہ یا کلمۃ منہ کہہ دیا۔ اور عربی لغت میں سبب کا اطلاق مسبّب پر عام ہوتا رہتا ہے۔ جیسے حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے متعلق فرمایا۔ انا دعوۃ ابی ابراہیم یعنی میں اپنے پدر بزرگوار ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا ہوں حالانکہ آپ دعا نہ تھے بلکہ دعا کا جواب تھے۔ دعا ابراہیمی کیونکہ آپ کی تشریف آوری کا سبب بنی تھی اس لیے آپ پر دعا کا اطلاق کردیا۔ نیز کلمہ کا لفظ بشارت اور آیت کے معنی میں

بھی مستعمل ہوتا رہتا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ آپ وہ بشارت ہیں جو حضرت مریم (علیہ السلام) کو دی گئی یا آپ اللہ کی قدرت کی آیت (نشانیوں میں سے ایک روشن نشانی) ہیں۔

روح کا معنی ہے مابہ الحیاۃ جس کے ساتھ زندگی قائم ہو۔ اور زندگی دو قسم کی ہوتی ہے۔ حسی اور معنوی۔ حسی زندگی وہ ہے جس کے ذریعے چلنا پھرنا، بولنا، سننا اور سمجھنا اور یاد کرنا وغیرہ قسم کے افعال صادر ہوتے ہیں اور معنوی وہ ہے جس سے مکارم اخلاق رحم، سخاوت، محبت وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم کو بھی کئی بار روح کہا گیا ہے کیونکہ وہ حیات معنوی کا سبب ہے وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا۔ اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح یعنی قرآن نازل فرمایا۔ اور حضرت مسیح کیونکہ حیات حسی اور معنوی دونوں کے مظہر اتم تھے اس لیے اس لیے آپ کو بطور مبالغہ روح یعنی سراپا روح کہہ دیا جیسے ہم کسی بہت خوب صورت انسان کو "حسن مجسم" کہہ دیتے ہیں۔

منہ۔ روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف جزئیت کی نہیں بلکہ تشریف و تفضیل کی ہے اور یہ اضافت قرآن اور کلام عرب میں عام ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ شیطان کو فرماتے ہیں ان عبادی لیس لک علیھم سلطان۔ یعنی میرے بندوں پر تو قابو نہیں پا سکتا۔ بندے تو سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں مومن ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بد۔ لیکن اطاعت شعار بندوں کی اضافت اپنی طرف کی اور ان کو اپنا مخصوص اور مخلص بندہ ہونے کا شرف وعزت بخشی۔ یہاں بھی روح منہ یا روح اللہ کے لفظ سے یہ کہنا کہ قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اللہ کی جزء ہیں بالکل ناحق ہے۔ کیونکہ آپ اس طرح جزئیت ثابت کرنے پر بضد ہوں تو پھر اس میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ قرآن میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق صاف موجود ہے کہ نفخت فیہ من روحی کہ میں نے اپنی روح آدم میں پھونک دی۔ صرف آدم نہیں بلکہ تمام اولاد آدم کے متعلق ارشاد ہے ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر بچہ آدم کو مادہ منویہ سے تخلیق کر کے اور اس کے اعضاء کو درست کر کے اس میں اپنی روح پھونکی۔ صرف آدم و بنی آدمی ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کا جز ماننا پڑے گا وسخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعا منہ۔ اگر من روحی اور من روحہ اور منہ کے الفاظ سے کسی چیز کی جزئیت ثابت نہیں ہوتی تو پھر اگر وہی لفظ حضرت مسیح کے لیے استعمال ہوں تو ان سے جزئیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ انجیل میں اب بھی ایسی آیات موجود ہیں جن سے قرآن کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ روح الامین کے پھونک مارنے سے آپ کی ولادت ہوئی۔ ملاحظہ ہو۔ اما ولادۃ یسوع المسیح فکانت ھکذا: لما کانت مریم امہ مخطوبۃ لیوسف قبل ان یجتمعا وجدت حبلی من الروح القدس۔ اس عربی عبارت کا ترجمہ اردو میں ملاحظہ ہو:۔

"اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی"۔ (انجیل متی 1:18)

قرآن حکیم نے حضرت مسیح کی ہستی کے متعلق جو صدیوں سے ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی صاف الفاظ میں صراحت کر دی کہ وہ مریم کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں اور بن باپ اس کے کلمہ کن سے ان کی پیدائش ہوئی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی مقرب روحوں میں سے ایک مقدس روح ہیں۔

اب ان الفاظ سے عیسائیوں کو ان کے غلط عقیدہ سے باز رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی ایک اور روشن دلیل ہے کہ ثلٰثۃ جو خبر ہے اس کو ذکر کیا اور اس کی مبتدا کو محذوف کر دیا۔ کیونکہ تثلیث میں تو عیسائیوں کے تقریباً تمام فرقے متحد ہیں لیکن ان کی تفصیل میں ان کا باہمی اتنا اختلاف اور تضاد ہے کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک بھی ایک چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اگر کوئی ایک مبتدا بیان کر دی جاتی تو تثلیث کی ایک صورت تو ممنوع ہو جاتی اور تثلیث کی دوسری اقسام کا حکم معلوم نہ ہو سکتا۔ اس لیے خبر کے ذکر پر اکتفا کیا تاکہ موقع اور محل کے مطابق مبتدا مقدر مان لی جائے۔ یہاں یہ تو ممکن نہیں کہ عیسائیوں کے تمام فرقوں کا تثلیث کے بارے میں جو جو عقیدہ ہے ان سب کو بیان کروں لیکن ان کے چند اہم فرقوں کے نظریات بیان کرنے کی ضرور جسارت کروں گا۔

اس بات پر تو تقریباً سب عیسائی فرقے متفق الرائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بحیثیت جوہر ہونے کے واحد ہے۔ اور بحیثیت اقانیم تین ہے۔ وجود، علم اور حیات کو اقانیم کہتے ہیں (اقانیم کا واحد اقنوم ہے) جس کا معنی شخص اور اصل ہے۔ الاقنوم : الشخص، الاصل ج اقانیم والکلمۃ من الدخیل (المنجد) وجود کو باپ، علم کو بیٹا اور حیات کو روح القدس کہتے ہیں۔ ان کا اختلاف اس میں ہے کہ ان تین اقانیم کا تعلق جوہر (یعنی اللہ) سے کیسا ہے۔

1۔ ایک فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ یہ تین اقانیم اور جوہر قدیم الگ الگ ہیں اور ہر ایک ان میں سے خدا ہے۔ اور اقنوم ثانی (یعنی علم) حضرت مسیح کے جسم سے متحد ہو گیا جیسے شراب اور پانی ملنے کے بعد یک جان ہو جاتے ہیں اور مسیح بھی ازلی قدیم ہے۔ اور مریم نے ازلی قدیم کو جنا ہے۔

2۔ ایک اور فرقہ یہ کہتا ہے کہ بیٹا یعنی مسیح کی دو حیثیتیں ہیں ایک لاہوتی اور ایک ناسوتی۔ اس حیثیت سے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ وہ خدائے کامل ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کا ظہور اس جسد عنصری میں ہوا انسان کامل ہے۔ اس لیے یہ قدیم بھی ہے اور حادث بھی۔ اور قدیم وحادث کا یہ اتحاد نہ قدیم کی قدامت کو متاثر کرتا ہے اور نہ حادث کے حدوث کو۔

3۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ کلمہ یعنی اقنوم ثانی گوشت اور خون میں بدل گیا اور خدا کا مسیح کی شکل میں رونما ہوا۔

4۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ الہ قدیم کے جوہر اور انسان حادث کے جوہر میں یوں امتزاج ہوا جیسے نفس ناطقہ کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دونوں ایک چیز بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جوہر قدیم اور جوہر حادث کے مجموعہ کا نام مسیح ہے اور وہی خدا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اگرچہ خدا انسان نہ بن سکا لیکن انسان خدا بن گیا۔ جیسے اگر آگ کوئلہ نہیں بن سکتی تو کوئلہ تو آگ بن جاتا ہے۔

اس سلسلہ کو کہاں تک طول دیں۔ مشتے نمونہ از خروارے بس ست۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے عقل سمجھ سکے۔ بہر حال ایک چیز واضح ہو گئی کہ ان تمام اختلافات کے باوجود تثلیث کے عقیدہ پر سب متفق ہیں۔ گو عنوان جدا جدا ہیں لیکن معنون ایک ہی ہے۔ اور یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنے کے لیے عیسائیت کے بڑے بڑے مدبروں اور دانشوروں نے سر توڑ کوشش کی لیکن نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ آخر ایک ہی چیز کو قدیم اور حادث، خدا اور بندہ اور لاہوت ناسوت کا مجموعہ کیسے تصور کر لیا جائے۔ اگر تاریخ مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو تثلیث کا عقیدہ تمام مشرکانہ مذاہب میں مشترک نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں "تری مورتی "یعنی برہما، وشنو اور شیو کی عبادت کی جاتی ہے۔ جن کے لیے وہ ان تین حروف (ا۔و۔م) کو بطور رمز استعمال کرتے ہیں۔ چین میں "تاوو "ایک ایسا خدا ہے جس کی تین اقانیم ہیں۔ مصر قدیمہ میں معبد منیفس کے قسیس ثالوث مقدس کی تعلیم دیتے تھے اور یہ بتاتے تھے کہ پہلے نے دوسرے کو اور دونوں نے مل کر تیسرے کو پیدا کیا۔ ان کے اعتقاد میں اقنوم ثانی کو کلمہ، نیز دوسرا خدا اور اللہ کا پلوٹھی کا بیٹا کہا جاتا (بالکل ویسے جیسے اب عیسائی کلمہ کو ابن اللہ اور الہ مانتے ہیں) اور فارش میں بھی ایک ایسے الہ کی پرستش کی جاتی تھی جو مثلث الاقانیم تھا۔ جن کے نام یہ تھے ازمرد، مترات اور اہرمن۔ مترات کو وہ بھی ابن اللہ کہا کرتے۔ اور خود یورپ میں مسیحیت سے پہلے تثلیث کا عقیدہ رائج تھا۔ چنانچہ یونانی ایک ایسے خدا کے قائل تھے جس کی تین اقانیم تھیں۔ اور روم کے قدیم بت پرست بھی تثلیث کے قائل تھے۔ اور اللہ، کلمہ اور روح پر ایمان رکھتے تھے۔ اس مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ جب عیسائیت مشرق اوسط سے یورپ میں پہنچی اور قسطنطین شاہ روم نے اسے قبول کیا تو وہی تثلیث جو اہل یورپ کے عقیدہ میں غیر معلوم زمانہ سے چلی آرہی تھی منتقل ہو کر ایک ایسے دین میں آگئی جو سراسر توحید خالص کا علم بردار تھا۔ انجیل مقدس کی یہ آیت اب بھی اعلان کر رہی ہے کہ اس دین حق کا اور اس کے پیغمبر کا دامن شرک کی ان آلودگیوں سے پاک ہے۔ حضرت مسیح (علیہ السلام) فرماتے ہیں :۔

ھذ ھی الحیاۃ الابدیۃ ان یعرفوک انت الالہ الحقیقی وحدک ویسوع المسیح الذی ارسلتہ۔ (انجیل یوحنا)

"ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں"۔

(انجیل یوحنا باب 17:3)

(ضیاء)

فوائد

ف 1: معلوم ہوا کہ غیر فرض کو فرض سمجھ لینا یا غیر حرام کو حرام مان لینا یا نبیوں میں خدا کے اوصاف ماننا، یہ سب دین میں زیادتی ہے اور

یہود کا طریقہ

ف 2: معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بغیر والد پیدا ہوئے ورنہ آپ کو باپ کی طرف نسبت کیا جاتا، رب فرماتا ہے ادعوھم لا بائھم اسی لیے قرآن کریم نے مریم کے سوا کسی بی بی کا نام نہ لیا۔ اور آپ کو روح اللہ اور کلمتہ اللہ بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ بغیر نطفہ محض ربانی فیضان سے پیدا ہوئے جیسے بیت اللہ اور کلمتہ اللہ میں نسبتیں ہیں۔ ایسی ہی روح اللہ میں ہے۔

ف 3: کہ انھیں فقط کن سے پیدا فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش نطفہ سے نہیں ہوئی نہ ماں کے نہ باپ کے۔

ف 4: بعض عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، بعض انھیں تیسرا خدا مانتے تھے اور بعض انھیں کو خدا مانتے تھے ان تینوں فرقوں کی تردید کے لیے یہ آیت کریمہ اتری۔ اللہ میں ایک فرقہ کی تردید ہے واحد میں دوسرے کی اور لہ ولد میں تیسرے کی۔

ف 5: کیونکہ بچہ اختیار کرنا مجبوری اور مغلوبی سے ہوتا ہے۔ موت کا خطرہ دشمنوں کا ڈر، شہوت کی مغلوبیت بچہ کا باعث ہے، رب ان سب سے پاک ہے۔

ف 6: اس سے معلوم ہوا کہ بیٹا باپ کا غلام نہیں بن سکتا۔ ملکیت اور نبوت جمع نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے اپنی ملکیت عامہ کو اس پر دلیل بنایا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) رب کے بیٹے نہیں ورنہ وہ اس کے بندے نہ ہوتے۔ (خزائن)

مسائل

۱۔ دین کے معاملہ میں افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔
۲۔ اللہ کی نسبت سے صرف حق بات ہی کہنی چاہیے۔
۳۔ الٰہ صرف ایک ہے۔
۴۔ اللہ تعالیٰ اولاد اور بیوی سے پاک ہے۔

آیت مبارکہ:

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ‌ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾

لغۃ القرآن: [لَنْ : ہرگز نہیں][يَّسْتَنْكِفَ : وہ عار محسوس کرے گا][الْمَسِيْحُ : مسیح][اَنْ : کہ][يَّكُوْنَ : وہ ہے][عَبْدًا : بندہ][لِّلّٰهِ : اللہ کا][وَلَا : اور نہ][الْمَلٰٓئِكَةُ : فرشتے][الْمُقَرَّبُوْنَ: مقرب][وَمَنْ : اور جو کوئی][يَّسْتَنْكِفْ : عار محسوس کرتا ہے][عَنْ : سے][عِبَادَتِهٖ : اس کی عبادت][وَيَسْتَكْبِرْ : اور وہ تکبر کرتا ہے][فَسَيَحْشُرُهُمْ : تو عنقریب وہ ان کو جمع کریگا][اِلَيْهِ : اپنی طرف] [جَمِيْعًا : سب کو
[

ترجمہ: مسیح (علیہ السلام) اس (بات) سے ہر گز عار نہیں رکھتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرّب فرشتوں کو (اس سے کوئی عار ہے)، اور جو کوئی اس کی بندگی سے عار محسوس کرے اور تکبر کرے تو وہ ایسے تمام لوگوں کو عنقریب اپنے پاس جمع فرمائے گا۔ (عرفان)

تشریح:

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدائی کا مرتبہ دیا حالانکہ وہ اللہ کے بندے تھے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا بندہ یعنی اس کا غلام اور فرمان بردار ہونے سے قطعاً کوئی انکار نہ تھا جو اپنے آپ کو اللہ کا بندہ ہونے سے انکار کرے گا اس کی سزا دردناک عذاب ہے۔
عبد کا معنی ہے۔۔انسان اور غلام (المنجد) قرآن مجید نے دوٹوک الفاظ اور انداز میں واضح کیا ہے کہ جتنے پیغمبر دنیا میں مبعوث کیے گئے وہ سارے کے سارے عبد اور انسان تھے خاص طور پر جن انبیاء (علیہ السلام) کی عبدیت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی ان کی سوانح حیات کو قرآن مجید نے اتنا واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ جس سے ان کے عبد ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔ یہودیوں نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کے بارے میں جب یہ نظریہ گھڑا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تو اس باطل نظریہ کی تردید کے لیے حضرت عزیر (علیہ السلام) کی زندگی کا اہم ترین واقعہ یوں بیان کیا کہ اس شخص کی مثال سامنے رکھیے کہ جو ایک بستی کے قریب سے گزرا اور اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کس طرح زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے سو سال تک فوت کیے رکھا پھر اسے اٹھا کر پوچھا کہ اے میرے پیغمبر تم کتنی دیر یہاں ٹھہرے ہو؟ حضرت عزیر (علیہ السلام) کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ کتنی مدت تک مردہ پڑے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جواب دیا کہ بارالٰہا! میں ایک دن یا اس

کا کچھ وقت یہاں ٹھہرا ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں تم سو سال تک مردہ پڑے رہے ہو۔ اب اپنے کھانے پینے کو دیکھو کہ وہ جوں کا توں تر و تازہ ہے اور اس میں کوئی سڑاندھ پیدا نہیں ہوئی۔ پھر اپنے گدھے کی طرف دیکھو کہ ہم تجھے کس طرح لوگوں کے لیے دلیل بناتے ہیں اپنے گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھیے پھر ان کے سامنے گدھے کی ہڈیاں جڑیں اور اس کے اوپر گوشت چڑھا اس پر کھال اور بال اگے جب یہ سب کچھ واضح اور ثابت ہوا تو حضرت عزیر (علیہ السلام) پکار اٹھے کہ میں جان چکا ہوں کہ اللہ ذرے ذرے پر اقتدار اور اختیار رکھنے والا ہے۔ (البقرہ : ۲۵۹) معجزات کی بناپر ہی عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں عیسائیوں نے من گھڑت عقیدہ قائم کیا کہ وہ تین میں سے ایک ہیں یعنی عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں تو اس باطل نظریہ کی تردید کے لیے قرآن مجید میں آل عمران کے نام سے ایک مفصل سورت نازل کی گئی جس میں عیسیٰ (علیہ السلام) کے خاندانی پس منظر، ان کی نانی محترمہ کا اللہ تعالیٰ کے حضور نذر ماننا، بیٹے کی بجائے حضرت مریم کا پیدا ہونا، حضرت زکریا (علیہ السلام) کا مریم کی کفالت کرنا، مریم کی والدہ کا مریم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے وقف کرنا۔ اس طرح عیسیٰ (علیہ السلام) کے خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی سوانح حیات کو پوری طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح یحییٰ (علیہ السلام) کا خدا کا بیٹا ہونے کی نفی کرتے ہوئے ان ہی کی زبان سے وضاحت کروائی گئی کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوں۔ (مریم : ۳۰)

انبیاء کرام (علیہ السلام) شرف انسانیت کی شان اور ترجمان ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ان کو عبد اور انسان ہونے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں تھا۔ اس ضمن میں سند کی طرف توجہ کیے بغیر ہم تفسیر ضیاء القرآن سے ایک حوالہ نقل کرتے ہیں۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعتراف اور اپنے بندہ ہونے کا اعتراف باعث ہزار فخر و نازش ہے وہ بھلا کیوں اس کو عار سمجھیں۔ اور حقیقتہ یہ ہی انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے کہ اپنے معبود حقیقی کو پہچان لے اور اپنے گلے میں اس کی بندگی کا طوق ڈال کر اس کی جناب میں حاضر ہو۔

"حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معراج کی رات مقام قرب کی انتہا تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے پوچھا "بما اشرفک یا محمد"۔ اے سراپا ستائش و خوبی! میں آج تجھے کس اعزاز سے مشرف کروں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عرض کی "بنسبتی الیک بالعبودیۃ" " مجھے اپنا بندہ ہونے کا شرف عطا فرما "شاید یہی حکمت ہے کہ جس سورۃ میں معراج کا ذکر ہے وہاں حضور کے متعلق عبدہ کا لفظ مذکور ہے۔ "اسی لیے اس فرمان کے آخر میں فرمایا کہ جو لوگ عیسیٰ (علیہ السلام) کی اس حیثیت پر ایمان لائیں گے اور صالح کردار اپنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ دینے کے ساتھ اپنی طرف سے مزید اجر سے نوازیں گے۔ اور جنھوں نے عقیدہ توحید اور اللہ کی الوہیت سے انکار کیا۔ ان کے لیے اذیت ناک عذاب ہوگا۔ کوئی ان کی خیر خواہی اور مدد نہیں کر سکے گا۔ (فہم)

شان نزول

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس نجران کا وفد آیا اور انھوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ﷺ ہمارے صاحب کو برا کیوں کہتے ہیں ' آپ ﷺ نے پوچھا تمہارا صاحب کون ہے؟ انھوں نے کہا عیسیٰ (علیہ السلام) آپ ﷺ نے فرمایا میں ان کے متعلق کیا کہوں وہ اللہ کے بندے ہیں'! انھوں نے کہا نہیں وہ اللہ ہے ' آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے اللہ کا بندہ ہونا عار نہیں ہے ' انھوں نے کہا نہیں بلکہ عار ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی مسیح اللہ کا بندہ ہونے میں عار نہیں سمجھیں گے اور نہ مقرب فرشتے (زاد المیسر ج ۲ ص ' ۲۶۲ مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۴۰۷ھ)

اس کے بعد اللہ نے فرمایا اور نہ مقرب فرشتے (اللہ کا بندہ ہونے میں ہرگز عار سمجھیں گے) امام رازی متوفی ۶۰۶ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کے خدا ہونے یا خدا کا بیٹا ہونے کا شبہ اس وجہ سے ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) غیب کی خبریں دیتے تھے' اور ان سے کئی امور خارقہ للعادت ظاہر ہوئے۔ انھوں نے مردوں کو زندہ کیا اور بیماروں تندرست کیا' اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ صرف اتنی قدر سے کسی کو اللہ کی عبادت سے عار نہیں آتی۔ دیکھو ملائکہ مقربین کو اس سے زیادہ غیب کا علم ہے کیونکہ وہ لوح محفوظ کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں' اور ان کی قوت بھی بہت زیادہ ہے' کیونکہ ان میں آٹھ فرشتے اللہ کے عظیم عرش کو اٹھائے رہتے ہیں' پھر جب مقرب فرشتے اس قدر عظیم علم اور قدرت کے حامل ہونے کے باوجود اللہ کی عبادت کرنے میں عار نہیں سمجھتے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس سے کم علم اور کم قدرت کے ساتھ متصف ہونے پر کیسے اللہ کی عبادت کرنے کو باعث عار قرار دیں گے؟

نبیوں کے فرشتوں سے افضل ہونے کی بحث

معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مقرب فرشتوں کا علم اور ان کی قدرت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ ہے تو ثابت ہو گیا کہ فرشتوں کو نبیوں پر فضیلت حاصل ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ انبیاء (علیہم السلام) فرشتوں سے افضل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کو فرشتوں سے زیادہ اجر و ثواب حاصل ہوگا' اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقرب فرشتوں کا علم اور ان کی قدرت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا اجر و ثواب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے زائد ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۴۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ نے معتزلہ کے جواب کی زیادہ عمدہ تقریر کی ہے' وہ لکھتے ہیں:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ ہر مقرب فرشتہ نبی سے افضل ہے اور اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مقرب فرشتے مل کر بہ حیثیت مجموع مسیح سے افضل ہیں۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ہر نبی ہر مقرب فرشتہ سے افضل ہو اور مقرب فرشتوں کا مجموعہ کسی ایک نبی سے افضل ہو' دوسرا جواب سب سے عمدہ ہے اس کی تقریر یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا خدا یا خدا کا بیٹا اس لیے کہتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے سے زیادہ عجیب و غریب وہ فرشتے ہیں جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اور ملائکہ مقربین ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تو جب وہ اللہ کی عبادت کرنے میں عار نہیں سمجھے تو مسیح (علیہ السلام) جو صرف باپ کے بغیر پیدا ہوئے وہ عبادت کرنے کو کیسے باعث عار قرار دیں گے! (روح المعانی جز ۶، ص ۴۰-۳۸ ملخصا' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت) (تبیان)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے اللہ کی بندگی باعث شرف و کمال ہے جس پر خود ان کو فخر ہے کیونکہ ممکنات میں کمال وصفی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان کا انتساب اللہ کی طرف نہ ہو لہٰذا عبدیت ہی ان کے لیے باعث کمال ہے۔ متذکرہ آیت سے ملائکہ (علیہ السلام) کی فضیلت انسانوں پر لازم نہیں آتی۔ جزئی فضیلت ضرور ہے انسان جو اپنی شخصی اور نوعی بقاء کے لیے کھانے پینے جماع کا محتاج ہے۔ اس کا زمانہ حدوث میں قریب ہے وہ اللہ کی عبدیت اور مخلوق ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ ملائکہ جو مادی کثافت سے پاک ہیں ان کو کوئی حاجت نہیں۔ قوت بھی زائد ہے عمریں بھی زائد ہیں لیکن پھر بھی وہ عبدیت سے انکار نہیں کرتے۔ (حسنات)

اس مقام پر فرشتوں کے ذکر سے یہ بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ فرشتے جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تو جب وہ اللہ کی عبادت میں عار نہیں سمجھتے تو مسیح (علیہ السلام) جو صرف باپ کے بغیر پیدا ہوئے وہ عبادت کرنے کو کیسے باعث عار قرار دیں گے ؟ لہٰذا ملائیکہ پرست لوگوں کا ان فرشتوں کو خدا کا فرزند کہنا اسی طرح باطل ہے جس طرح نصاریٰ کا حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنا باطل ہے۔

خدا کی بندگی کو اپنے لیے کسر شان سمجھنے والے سن لیں (اور) یاد رکھیں ! کہ (جو برا مانیں اس کے بندہ ہونے سے) اور اسمیں اپنی کسر شان سمجھیں (اور غرور کریں) اور سرکشی کا مظاہرہ کریں تو بہت جلد وہ ہانک کر لائے گا ان سب ننگ و عار رکھنے والے مغروروں (کو اپنی طرف) تا کہ جزا اور مکافات انھیں پہنچائے چونکہ یہی مغرور دین اور استنکاف والے، یعنی سرے ہی سے عبادت الٰہی کے استحقاق کا انکار کرنے والے اور استکبار کرنے والے یعنی استحقاق مان کر انکار کرنے والے، یہی سب وہ لوگ ہیں جو عذاب آخرت اور غضب خداوندی کی شدید گرفت میں ہوں گے۔ اس لیے حشر میں ان کو جمع کر کرنے کا خصوصی طور پر ذکر کر دیا گیا ہے ویسے ہی حشر کے میدان میں سبھی کو اکٹھا ہونا ہے خواہ وہ مستنکف ہو یا مستکبر۔ مقر ہو یا مطیع۔ پھر سب کو سزا یا جزا دی جائے گی۔ (اشرفی)

مسائل

۱۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے تھے اور بندہ ہونا اپنے لیے عار نہیں سمجھتے تھے۔

۲۔ اللہ کی بندگی کو عار نہیں سمجھنا چاہیے۔ ۳۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عار نہیں سمجھتے۔

۴۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کو عار سمجھے گا اسے اذیت ناک سزا دی جائے گی۔

۵۔ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نوازتے ہیں۔

آیت مبارکہ:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

لغۃ القرآن: [فَاَمَّا : لیکن][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][وَعَمِلُوا : اور انہوں نے عمل کیے][الصّٰلِحٰتِ : نیک (جمع)][فَيُوَفِّيْهِمْ : وہ پورا دے گا ان کو][اُجُوْرَهُمْ : ان کے اجر][وَيَزِيْدُهُمْ : اور وہ زیادہ دے گا انکو][مِّنْ : سے][فَضْلِهٖ : اپنے فضل][وَاَمَّا : اور مگر][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اسْتَنْكَفُوْا : انہوں نے عار محسوس

کی][وَاسْتَكْبَرُوْا : اور انہوں نے تکبر کیا][فَيُعَذِّبُهُمْ : تو وہ ان کو عذاب دے گا][عَذَابًا : عذاب][اَلِيْمًا ۙ اذیت ناک][وَّلَا : اور نہیں][يَجِدُوْنَ : وہ پائیں گے][لَهُمْ : اپنے لیے][مِّنْ : سے][دُوْنِ : سوائے][اللّٰهِ : اللہ کے][وَلِيًّا : کوئی دوست][وَّلَا : اور نہ][نَصِيْرًا : کوئی مدد گار]

ترجمہ: پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ انھیں پورے پورے اجر عطا فرمائے گا اور (پھر) اپنے فضل سے انھیں اور زیادہ دے گا، اور وہ لوگ جنھوں نے (اللہ کی عبادت سے) عار محسوس کی اور تکبّر کیا تو وہ انھیں دردناک عذاب دے گا، اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔

تشریح:

اس آیت میں نیکوکار مومنوں کو جو زیادہ اجر کی بشارت دی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں آخرت میں اس کی شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ان کا اجر یہ ہے کہ اللہ انھیں جنت میں داخل کر دے گا اور اپنے فضل سے جو ان کو زیادہ اجر دے گا ' وہ ان لوگوں کے لیے شفاعت کرنا ہے جنھوں نے ان کے ساتھ دنیا میں کوئی نیکی کی تھی (المعجم الکبیر ج ١٠ ' رقم الحدیث : ١٠٤٦٢ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) (تبیان)

اس سے پچھلی آیت کریمہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی طرف جمع کرے گا اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا بیان ہے فاما الذین اٰمنوا پس بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے و عملوا الصلحت اور عمل کئے انھوں نے اچھے ایمان کے ساتھ نیک کام بھی کئے بیشک ایمان بڑی چیز ہے مگر عمل کے بغیر اس طرح سمجھو جس طرح بغیر شاخوں اور پھل کے درخت کا تنا ہو حالانکہ درخت سے مقصود شاخیں پتے اور پھل ہوتا ہے کہ شاخوں اور پتوں کے سامنے بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے اور اگر شاخیں پتے اور پھل ہی نہ ہو تو خالی تنے سے کیا حاصل ہوگا؟ تو جو لوگ ایمان لائے اور ساتھ اچھے عمل بھی کئے فیوفیھا اجورھم پس پورے پورے دے گا ان کے اجر بلکہ ویزیدھم من فضلہ اور زیادہ اجر دے گا ان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے۔

اجر

اجر، (بدلہ، ثواب) اردو زبان میں اجر صرف اچھے بدلہ کو کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اچھے برے دونوں قسم کے بدلوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اچھے بدلے (ثواب) کے معنوں میں آیا ہے۔

زیادہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ضابطہ بیان فرمایا ہے من جآء بالحسنۃ عشر امثالھا (پارہ : ٨ سورۃ الانعام) جو شخص ایمان کی حالت میں اخلاص کے ساتھ اتباع سنت میں ایک نیکی لائے گا تو اس کو دس گنا اجر ملے گا نیکی تو ایک کی اس کے ساتھ نو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے دے

گا دیکھو آدمی کہتا ہے السلام علیکم اس کو دس نیکیاں مل گئیں اسی طرح سلام کے جواب میں کہا وعلیکم السلام دس نیکیاں مل گئیں ایک دفعہ کہا سبحان اللہ دس نیکیاں مل گئیں الحمد للہ کہا دس نیکیاں مل گئیں لاالہ الااللہ کہا دس نیکیاں مل گئیں اللہ اکبر کہا دس نیکیاں مل گئیں نیکی ایک کی ثواب دس کا مل گیا اور یہ کم از کم ہے زیادہ جتنا چاہے اللہ تعالیٰ عطا فر دے پھر یہ ضابطہ عام نیکیوں کے بارے میں ہے جو نیکی فی سبیل اللہ کی مد میں آتی ہے اس کے متعلق ضابطہ تیسرے پارے میں بیان فرمایا ہے کہ جو شخص فی سبیل اللہ کی مد میں نیکی کرے گا اس کا ادنیٰ ترین بدلہ سات سو ہے واللہ یضٰعف لمن یشآء اور اللہ تعالیٰ بڑھائے گا جس کا چاہے گا یعنی سات سو سے بھی زیادہ دے گا فی سبیل اللہ کی مد میں تو بہت ہیں ان میں ایک مد علم دین کا حاصل کرنا ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کافروں کے ساتھ جہاد کرنا بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے اور حج کے سفر پر جانا بھی فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے، نماز کے لئے مسجد جانا اس کا اطلاق بھی ہوگا اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ جمعہ پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا یہ بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے کیونکہ جمعہ میں مسائل بیان ہوتے ہیں اور جو شخص حلال کمانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اس پر بھی فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے

واماالذین استنکفوا اور بہر حال وہ لوگ جنھوں نے ناک چڑھایا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اس کو اپنے لیے عار سمجھا واستکبروا اور تکبر کیا فیعذ بھم عذابا الیما پس ان کو اللہ تعالیٰ سزا دے گا دردناک

دنیا کی آگ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے جہنم کی آگ اس سے ۶۹ گنا تیز ہے اور حال یہ ہے کہ اس آگ میں لوہا پگھل جاتا ہے تانبا پگھل جاتا ہے اور جتنی بھی دھاتیں ہیں پگھل جاتی ہیں پتھر جل جاتے ہیں اس سے آگ کا اندازہ خود لگالو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہر مومن ہر مومنہ ہر مسلم ہر مسلمہ کو اس آگ سے بچائے آمین (ذخیرہ)

تکبر کا انجام :۔ تکبر اور بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کو لائق ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی اللہ کے سامنے اکڑے گا، تو یقینا دوزخ میں جائے گا۔ عہد آدم میں سب سے پہلے ابلیس نے تکبر کیا تو راندہ بارگاہ الٰہی قرار پایا۔ جس شخص میں بھی کبر و نخوت ہو لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ اللہ اسے دنیا میں بھی ذلیل کرتا ہے اور آخرت میں بھی ذلیل کر کے اس کی اکڑ توڑ دے گا اور جہنم میں داخل کرے گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ پروردگار کے سامنے جنت اور دوزخ کا جھگڑا ہوا۔ جنت نے کہا ''پروردگار! میرا تو یہ حال ہے کہ مجھ میں وہی لوگ آ رہے ہیں جو دنیا میں ناتواں اور حقیر تھے۔'' اور دوزخ کہنے لگی ''کہ مجھ میں وہ لوگ آ رہے ہیں جو متکبر تھے۔'' اللہ نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے اور دوزخ سے فرمایا تو میرا عذاب ہے (بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی قول اللہ إن رحمۃ اللہ قریب من المحسنین) ــــــ اور ایک دفعہ آپ نے فرمایا ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بہشتی کون ہیں اور دوزخی کون؟ جنتی ہر وہ کمزور اور منکسر المزاج ہے کہ اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اسے سچا کر دے۔ اور دوزخی ہر موٹا، اجڈ اور متکبر آدمی ہوتا ہے۔'' (بخاری۔ کتاب الایمان، باب قول اللہ تعالیٰ واقسموا باللہ جھد ایمانھم) (تیسیر)

اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی نیکی بھی ضائع نہیں کی جائے گی۔ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی آدمی اللہ کی رضا کے لئے ایک کام کرے اور پھر اس کے اجر سے محروم رہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں! اپنی نیکیوں کو خود کوئی برباد کر جائے تو وہ دوسری بات ہے۔ نیکیاں برباد کس طرح ہوتی ہیں؟ اس کی تشریح پیچھے بہت سے مقامات پر گزر چکی ہے۔ مثلاً روپیہ پیسہ خرچ کیا لیکن دکھاوے کے لیے پیسہ خرچ ہو گیا اور دکھاوا بھی ہو گا اس لیے کہ جن کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا تھا وہ خوب داد دے گئے۔ اس طرح بالا شبہ اس کا صلہ اس نے حاصل کر لیا تاہم اس کی وہ نیکی اگر اس کو دکھا دی

جائے اواس کا اجر بھی اور پھر اس اجر کی اضاعت بھی تو اس کے لیے کیا ہو گا؟ آخر افسوس ہی تو ہو گا لیکن اس افسوس کا باعث کون ہوا؟ وہ خود ہی تو ہوا گویا نیکی کی اور اس کو برباد کر دیا۔ (عروہ)

سو اللہ تعالیٰ کی عنایات اور اس کی نوازشوں سے سرفرازی کا ذریعہ ووسیلہ، اور بندوں کیلئے صحیح طریقہ، یہ ہے کہ وہ ایمان صادق اور عمل صالح کی دولت کو اپنائیں، اس پر اللہ تعالیٰ ان کو ان کے ان اجور سے نوازے اور سرفراز فرمائے گا، جسکے وہ اپنے صدق واخلاص، اور اپنے ایمان و عمل کی بناء پر مستحق ہوں گے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ ان کو اپنے فضل و کرم سے بھی نوازے گا۔ کہ اس کے یہاں کا معاملہ صرف عدل اور برابری پر مبنی نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے یہاں معاملہ فضل و کرم، عفو و درگزر اور انعام واحسان ہی کا ہوتا ہے، اور اسی کا ہو گا۔ جو کہ تقاضا ہے اس کی بے پایاں شان کرم و عطاء کا سبحانہ و تعالیٰ۔ اَللّٰهُمَّ فَعَامِلْنَا بِفَضْلِكَ وَإِحْسَانِكَ وَلَا تُعَامِلْنَا بِعَدْلِكَ وَحِسَابِكَ۔

فوائد

ف 1: اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو نیک اعمال کی صرف جزاہی نہ ملے گی۔ بلکہ رب کا وہ عطیہ جو رب کی شان کے لائق ہے وہ بھی ملے گا چنانچہ رب کا دیدار، جزا کا اضافہ، اور رب کا ہمیشہ راضی رہنا۔ یہ محض اس کے فضل سے ملے گا۔

ف 2: معلوم ہوا کہ بے یار و مددگار ہونا کفار کا عذاب ہے۔ رب نے مومن کے لیے بہت مددگار بنادیئے ہیں۔

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ : اے لوگوں][قَدْ : یقیناً][جَآءَكُمْ : آگئی تمہارے پاس][بُرْهَانٌ: دلیل][مِّنْ : سے][رَّبِّكُمْ : تمہارا رب][وَاَنْزَلْنَآ : اور ہم نے نازل کی][اِلَيْكُمْ : تمہاری طرف][نُوْرًا : روشنی][مُّبِيْنًا : واضح]

ترجمہ: اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ذات محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ذات حق جل مجدہ کی سب سے زیادہ مضبوط، کامل اور واضح) دلیلِ قاطع آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف (اسی کے ساتھ قرآن کی صورت میں) واضح اور روشن نور (بھی) اتار دیا ہے۔ (عرفان)

تشریح:

سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا برھان اور قرآن مجید کا نور ہونا:

اس سے پہلی آیتوں میں سیدنا محمد کی نبوت اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کے متعلق کفار ' منافقین اور یہود و نصاری کے تمام شبہات کا ازلہ کیا اور اب اس آیت میں اس وقت کے تمام فرقوں کو عمومی طور پر آپ کی دعوت قبول کرنے کا حکم دیا ' اس آیت میں فرمایا ہے کہ تمہارے پاس برہان یعنی قوی دلیل آ گئی اس سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے اور یہ جو فرمایا ہے تمہاری طرف نور مبین نازل کیا گیا ہے۔ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔

سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو برہان فرمانے میں یہ اشارہ ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی نبوت اور رسالت کو منوانے کے لیے کسی الگ اور خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کا وجود مسعود اور آپ کی ذات گرامی بجائے خود آپ کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے ' یہی وجہ ہے کہ دوسرے نبیوں اور رسولوں نے اپنی نبوت اور رسالت پر خارجی معجزات پیش کیے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی نبوت اور رسالت پر اپنی زندگی پیش کی۔ قرآن مجید ہے :

(آیت) " فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون "۔ (یونس : ١٦)

ترجمہ : میں تم میں اس (نزول قرآن) سے پہلے اپنی عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں تو کیا تم نہیں سمجھتے۔

حضرت خدیجۃ الکبری (رض) حضرت ابوبکر (رض) ' حضرت علی (رض) اور حضرت زید بن حارثہ (رض) یہ سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں اور یہ سب بغیر کسی معجزہ کے ایمان لائے تھے ' ان کے لیے یہی دلیل کافی تھی کہ انھوں نے آپ کی زندگی کو دیکھا تھا اور آپ کی زندگی ہی آپ کے دعوی نبوت پر قوی دلیل تھی۔

اس آیت میں قرآن مجید کو نور مبین فرمایا ہے ' نور اس چیز کو کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کر دے ' قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت میں حد اعجاز کی وجہ سے خود ظاہر ہے اور احکام شرعیہ ' ماضی اور مستقبل کی خبروں ' اور عقائد صحیحہ اور اسرار کونیہ کو بیان کرنے والا اور ظاہر کرنے والا ہے۔ (تبیان)

یہاں تمام انسانوں سے خطاب ہے، وہ کہیں کے ہوں اور کبھی بھی ہوں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان کا بیان

اس سے معلوم ہوا کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کسی زمانے، کسی جگہ اور کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں۔ عام اعلان فرما دیا گیا، اے لوگو ! تمہارے پاس وہ تشریف لائے جو سر تا پا اللہ عَزَّوَجَلَّ کی معرفت کی دلیل ہیں جن کی صداقت پر ان کے معجزے گواہ ہیں اور وہ منکرین کی عقلوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ جس قدر معجزے پہلے پیغمبروں (علیہ السلام) کو ملے ان سے زائد حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا ہوئے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) از سر تا قدم پاک خود اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت اور ذات

وصفات کی دلیل ہیں چنانچہ سرکار کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بال شریف معجزہ کہ حضرت خالد (رض) کی ٹوپی میں رہا تو ان کو ہمیشہ دشمنوں پر فتح ہوتی رہی۔ ہر قل کی پگڑی میں رہا تو اس کے سر کے درد کو آرام رہا۔ حضرت سید نا عمرو بن عاص (رض) نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے کفن میں تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بال شریف رکھ دیئے جائیں تاکہ قبر کی مشکل آسان ہو۔ حضرت امیر معاویہ (رض) نے وصیت فرمائی کہ مجھے غسل دے کر میری آنکھوں اور لبوں پر سلطان دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ناخن اور بال شریف رکھ دیئے جائیں تاکہ حساب قبر میں آسانی ہو۔ معلوم ہوا کہ بال مبارک قبر کی مشکل آسان کرتے ہیں۔ صحابہ کرام (رض) بیماروں کو بال مبارک کا غسل شدہ پانی پلایا کرتے تھے۔ حضرت طلحہ (رض) کے گھر ایک بار بال مبارک پہنچ گئے تو انھوں نے ساری رات ملائکہ کی تسبیح و تہلیل سنی۔

سوکھے دھانوں پہ ہمارے بھی کرم ہو جائے چھائے رحمت کی گھٹا بن کے تمہارے گیسو

ہم سیہ کاروں پہ یارب تپش محشر میں سایہ افگن ہوں ترے پیارے کے پیارے گیسو

آنکھ شریف کا معجزہ کہ قیامت تک کے واقعات کو دیکھا، جنت و دوزخ، عرش و کرسی کو ملاحظہ فرمایا، بلکہ خود رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھا۔ نمازِ کسوف میں جنت و دوزخ کو مسجد کی دیوار میں دیکھا۔ پیچھے مقتدی جو کچھ کریں اس کو ملاحظہ فرمادیں۔ ناک مبارک کا معجزہ کہ جس نے محبت کی خوشبو یمن سے آتی ہوئی سونگھی۔ زبان کا معجزہ کہ جن کی ہر بات وحی خدا اور وہ زبان جو کہ کن کی کنجی ہے۔ منہ کا لعاب معجزہ کہ حضرت جابر (رض) کے گھر ہانڈی میں ڈال دیا تو ہانڈی کی ترکاری میں برکت ہوئی۔ آٹے میں ڈال دیا تو چار سیر آٹا ہزاروں آدمیوں نے کھایا پھر بھی اتنا ہی رہا۔ خیبر میں حضرت علی (رض) کی دکھتی آنکھ میں لگا دیا تو آنکھ کو آرام ہو گیا۔ حضرت صدیق (رض) کے پاؤں میں غار میں سانپ نے کاٹا اس پر لگا دیا تو اس کو آرام۔ کھاری کنویں میں ڈال دیا تو اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔ ہاتھ مبارک بھی دلیل کہ بدر کے دن ایک مٹھی کنکر کفار کو مارے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ "آپ نے نہ پھینکے بلکہ ہم نے پھینکے۔ اسی ہاتھ میں آکر کنکروں نے کلمہ شریف پڑھا۔ اس ہاتھ سے بیعت لی گئی تو رب عَزَّوَجَلَّ نے فرمایا کہ "ان کے ہاتھوں پر ہمارا ہاتھ ہے۔ انگلیاں معجزہ کہ ایک پیالہ پانی میں انگلیاں رکھ دیں، اس سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔ انگلی ہی کے اشارے سے چاند چیر دیا۔

پاؤں مبارک بھی معجزہ کہ پتھر پر چلیں تو پتھر ان کا اثر لے لے اور فرش پر بھی چلیں اور عرش پر بھی۔ غرض کہ ان کا ہر ہر عُضْوِ پاک اور ہر ہر بال مبارک رب عَزَّوَجَلَّ کے پہچاننے کی دلیل ہے۔ پسینہ مبارک معجزہ کہ جس میں گلاب کی بے مثل خوشبو۔ جاگنا اور سونا معجزہ کہ ہر ایک کی نیند وضو توڑ دے مگر سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نیند وضو نہیں توڑتی۔ تمام جسم پاک سایہ سے محفوظ کہ سایہ بھی کسی کے قدم کے نیچے نہ آئے غرض کہ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر وصف معجزہ اور ہر حالت رب تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا : اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل کیا۔} روشن نور سے مراد قرآن پاک ہے جو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعے ہمیں ملا۔ (صراط)

یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اہل علم دیوبندی حضرات اس بارے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ تو تفسیر محمود میں مولانا مفتی محمود صاحب فرماتے ہیں:

"نور سے مراد قرآن کریم ہے جیسا کہ آگے سورۃ مائدہ آیت 15 میں ہے۔ اگر نور سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارک مراد لی جائے تب بھی درست ہے لیکن اس معنی میں جو بشریت اور جسمیت کی منافی ہو کیونکہ نور کی ضد ظلمت ہے جسم نہیں ہے اور بشر کی ضد و

مقابل ملائکہ و جن ہیں۔ لہٰذا نور کو بشریک کے مقابلہ سمجھنا یا نور کو بشریت کے منافی سمجھنا جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فوق اور ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن فوق کا تقابل فوق سے یا تحت کا مقابلہ تحت سے کرنا غلط ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔
دیوبندی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور ضرور مانتے ہیں لیکن اس نور کو بشریک کے منافی نہیں سمجھتے، بلکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو من وجہ نور مانتے ہیں اور من وجہ بشر مانتے ہیں، کیونکہ بشریک و نورانیت میں کوئی تضاد نہیں، دونوں ایک ذات و محل واحد میں جمع ہو سکتے ہیں۔"

مزید جناب مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں یوں رقمطراز ہیں:
"برہان سے کیا مراد ہے ؟: (قولہ تعالیٰ) قدجآءکم برھان من ربکم برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس ہے (روح)
حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس کو لفظ برہان سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ آپ کی ذات مبارک اور آپ کے اخلاق کریمانہ، آپ کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپ کی نبوت اور آپ کی رسالت کے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی احتیاج باقی نہیں رہتی تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔
اور نور سے مراد قرآن مجید ہے (روح) جیسا کہ سورۃ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے قدجآءکم من اللہ نور و کتب مبین (۵: ۵۱) " یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے " (بیان القرآن) اس آیت میں جس کو نر کہا گیا ہے آگے اسی کو کتاب مبین کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغائر کو چاہتا ہے لہٰذا نور اور کتاب ایک چیز نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ تغائر عنوان کا کافی ہے اگرچہ مصداق اور معنون ایک ہی ہے (روح)
اور اگر نور سے مراد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس ہو، اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو یہ بھی صحیح ہے (روح) لیکن اس سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایسا نور محض ہونا ثابت نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو۔"

جب بات عامی علماء یا عوام تک پہنچتی ہے تو ایک تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب کیا جانا چاہئیے۔ اور حق کو سمجھنے کی دعا کرنی چاہئیے۔

قرآن کریم ایک ایسا کلام ہے جس کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اس کے اندر ربانی کاریگری کے شواہد پائے جاتے ہیں اور اس کو یہ شواہد انسانوں کے کلام سے ممتاز کرتے ہیں۔ کلام الٰہی میں الفاظ کی نشست و برخاست اور روانی قابل دید ہوتی ہے۔ اور کلام اللہ کی فصاحت اور بلاغت ایک ایسا معاملہ ہے کہ جس سے نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض واقعات ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو ناقابل یقین نظر آتے ہیں مثلاً وہ لوگ جو عربی زبان سے بالکل ناواقف ہیں وہ بھی جب قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ بحری جہاز پر سوار تھے۔ بحر اوقیانوس میں جانب امریکہ سفر کر رہے تھے۔ ہم نے عرشہ پر جمعہ کی نماز کا اہتمام کیا۔ ہم میں سے چھ آدمی مختلف عرب ممالک کے باشندے تھے اور کچھ دوسری قومیتوں اور نوبہ کے حبشی بھی تھے جو جہاز کے عملے میں شامل تھے۔

میں نے خطبہ دیا اور خطبے میں قرآن کریم کی بعض آیات تلاوت کیں۔اس جہاز کے تمام باشندے ہمارے نماز کے اس اجتماع کو گھیرے ہوئے تھے۔یہ مختلف قومیتوں کے لوگ تھے۔غور سے دیکھ رہے تھے۔

نماز کے بعد بہت سے لوگ ہمارے پاس آتے اور اپنے تاثرات بیان کرتے رہے۔لیکن ان میں یوگوسلاویہ کی ایک محترمہ بہت ہی متاثر تھی۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے وہ اپنی وہ اپنی کمزور انگریزی میں ہم سے یوں کہنے لگی کہ تمہاری عبادت کے اندر جو خشوع و خضوع ہے میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔مجھے تمہاری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا لیکن اس زبان کے اندر ایک ایسا صوتی ترنم ہے جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔اس کے بعد اس نے کہا کہ خطیب کے خطبہ میں بعض جملے نہایت ہی ممتاز ہیں اور ان کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا ہے۔میں سمجھ گیا کہ وہ خاص فقرے قرآنی آیات کے وہ حصے اور ٹکڑے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اندر نہایت ہی ممتاز ہوتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے ہاں یہ قاعدہ کلیہ ہے اور ہر قاری کی تلاوت قرآن کا سامعین پر ضرور ایسا ہی اثر ہوتا ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ یہ قرآن کا بالکل ایک واضح وصف ہے کہ اس کی آواز ایسے لوگوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے جو بالکل عربی نہیں جانتے۔

رہے وہ لوگ جو عربی کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور جو عربی کے مختلف اسالیب سے واقف ہیں ' ان پر قرآن کے اثرات کی عجیب و غریب حکایات تاریخ کا حصہ ہیں۔جب حضور خود اہل کعبہ پر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔تو اخنس ابن شریق 'ابوسفیان ابن حرب 'اور ابو جہل کا قصہ بہت ہی مشہور ہے۔سیرت ابن ہشام میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ابوسفیان ابن حرب 'ابو جہل اور اخنس ابن شریق ثقفی 'بنی زہرہ کے حلیف رات کے وقت اپنی اپنی جگہ سے چل پڑے تاکہ حضور کا کلام سنیں جبکہ آپ رات کے وقت اپنے گھر میں نماز کے وقت تلاوت فرماتے تھے۔ہر شخص ایک بیٹھ گیا اور قرآن کریم کی تلاوت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ان میں سے کسی کو بھی دوسرے کے بارے میں خبر نہ تھی۔وہ رات کے وقت کلام الہی سنتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو گئی۔جب واپس ہونے لگے تو یہ سب ایک دوسرے سے راستے میں مل گئے۔انھوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا اور یہ بات نوٹ کی گئی کہ اگر کسی عام شخص نے دیکھ لیا تو وہ اس تحریک کا شکار ہو جائے گا 'پھر وہ واپس چلے گئے ،جب دوسری رات ہوئی تو پھر تینوں نہ رہ سکے اور پھر اپنے اپنے خفیہ مقامات پر بیٹھ گئے 'رات کو قرآن کریم سنتے رہے 'جب صبح ہونے لگی تو اتفاقا پھر راستے میں تینوں کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے پہلے طرح ایکدوسرے کو ملامت کی۔جب تیسری رات ہوئی تو پھر یہ تینوں قرآن کریم کو سننے کیلئے پہنچ گئے ،رات گئے تک قرآن کریم سنتے رہے اور جب صبح کو لوٹنے لگے تو پھر راستے میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔اب کے انھوں نے کہا کہ جب تک ہم حلف نہ اٹھالیں گے ہم رک نہ سکیں گے۔اس کے بعد انھوں نے حلف پر معاہدہ کیا اور گھروں کو چلے گئے۔

یہ تو ایک قصہ تھا 'ان لوگوں کا جن کو زبان عربی اور قرآن کریم کے اندر ایک ذوق ہے۔وہ جس دور میں بھی ہوں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم بذات خود ایک سطان اور برہان ہے اور لفظی اور معنوی لحاظ سے معجزہ ہے۔

جہاں تک معنوعی اعجاز کا تعلق ہے تو قرآن کریم نے جو فکر پیش کی ہے 'جو نظام زندگی اس نے پیش کیا ہے 'اور زندگی کا جو نقشہ اس نے تجویز کیا ہے اس جگہ ہم اس کی تفصیلات نہیں دے سکتے۔لیکن ان تمام پہلوؤں سے بھی قرآن کریم معجزہ ہے اور اس کے اندر برہان اور سلطان موجود ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا مصدر اور منبع کیا ہے اور یہ کہ وہ انسانی کلام نہیں ہے۔اس کا انداز اور طرز ادا ایسی ہے جو کسی انسانی کلام کے اندر نہیں ہوتی۔اس لیے (آیت) "وانزلنا الیکم نورا"۔(۴ : ۱۷۴) "اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو

تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ "۔۔ایسی روشنی جس کی شعاعوں میں اشیاء کی صحیح حقیقت نظر آتی ہے اور بہت ہی واضح نظر آتی ہے اور جس کی روشنی میں زندگی کے دوراہے پر انسان کو حق و باطل کے راستوں میں سے حق کا راستہ صحیح نظر آتا ہے۔ نفس کی داخلی راہوں کے اندر بھی اور زندگی کی خارجی شاہراہوں پر بھی۔ جو نفس قرآن کی روشنی سے منور ہوا اسے اپنا ماحول اچھی طرح نظر آتا ہے۔

اس نور کے مقابلے میں دھند چھٹ جاتی ہے 'فضا کھل جاتی ہے اور پھر حقیقت واضح اور کھلی نظر آتی ہے۔ جب یہ روشنی نفس انسانی کو حاصل ہو جاتی ہے تو انسان اپنے اوپر ہنسنے لگتا ہے کہ حقیقت تو بہت ہی کھلی تھی 'لیکن تعجب ہے کہ اسے نظر نہ آرہی تھی۔

اور جب کوئی انسان اپنی روح کے ساتھ کچھ عرصہ قرآنی فضا کے اندر رہے اور قرآن سے اپنے تصورات 'حسن و قبح کے پیمانے اور اپنی اقدار اخذ کرلے تو وہ تمام معاملات کو نہایت ہی آسانی 'نہایت ہی سادگی اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ دیکھتا ہے اور پھر اسے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کئی ایسے فیصلے جو اس نے کئے اور جو اس کے لیے خلجان کا باعث تھے 'اور وہ اسے سمجھ نہ آتے تھے 'اب بڑی آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اب حقائق بڑی آسانی سے نکھر جاتے ہیں اور حقائق کے ساتھ جو مزید آلودگیاں تھیں ختم ہو جاتی ہیں اور تمام حقائق اس طرح ذہن میں اتر جاتے ہیں جس طرح ابھی اللہ کی جانب سے صاف و شفاف ہو کر سامنے آئے ہوں۔

کس قدر کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ (آیت) "(وانزلنا الیکم نورا مبینا) (۴ : ۱۷۴) "اور ہم نے تم پر واضح کرنے والی روشنی اتاری ہے"۔ میں نے ان الفاظ کی تشریح اور ان پر تبصرہ صرف اس شخص کی خاطرہ کیا ہے جس نے اپنے اندر کتاب اللہ کی کچھ روشنی پائی ہو 'اس شخص کیلئے نہیں جس کے اندر اس روشنی کی کوئی چمک ہی نہ ہو۔ یہ روحانی روشنی اس وقت حاصل کی جاسکتی ہے جب انسان اس کیلئے دلی کوشش کرے اور ذاتی ذوق پیدا کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ قرآنی علوم کے اندر تجربہ رکھتا ہوں اور براہ راست قرآن سے روشنی پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (ظلال)

کمال معجزہ ہے نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو اللہ نے عطافرمایا اور رہتی دنیا تک وہ اپنا کام کرتا رہے گا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے بعد جو بھی آیا اور جس نے بھی دعویٰ کیا خواہ وہ کتنے ہی بکھیڑے کرتا رہا کہ میں بروزی ہوں۔ ظلی ہوں۔ نبی نہیں ہوں مہدی موعود ہوں لیکن "برہان "الٰہی نے اس طرح نکال پھینکا جس طرح مکھن سے بال نکالا جاتا ہے کہ اس کا اس جگہ کیا کام۔ یہاں تو وہ ذات اقدس جس کی تعلیم نے ہر مشکل کو آسان اور ہر پتھر کو پانی کر دیا اس کے بعد کسی نئے یا پرانے کی قطعاً ضرورت نہیں اور "نور مبین" سے مراد قرآن کریم ہے اور یہ کہہ کر اس کے عملی پہلو کو واضح کر دیا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے او تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور اس نور اور روشنی کی بدولت انسان کو غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچاتا ہے اس لیے کہ ان کے نتائج سے محفوظ رہتا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔ چنانچہ ارشد الٰہی ہوا کہ :

"اے اہل کتاب ! ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے در گزر بھی کر جاتا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ "ا (المائدہ 5:15، 5) ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"اے پیغمبر اسلام ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ " (ابراہیم 14:1)

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔ " (ابراہیم 14:5) ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"اے پیغمبر اسلام ! ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے ؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں ؟ " (الرعد (13:16

(عروہ)

آخر میں

برھان سے مراد سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور نور مبین سے مراد قرآن کریم۔ حضرت سفیان ثوری (رض) سے مروی ہے : برھان من ربکم قال محمد یعنی اس برہان سے مراد محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ (منثور جلد ۲ صفحہ ۷۵۳) امام ابن جریر طبری (رح) فرماتے ہیں : البرھان ھو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امام فخر الدین رازی (رح) فرماتے ہیں : ھو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امام قرطبیؒ (رح) کا ارشاد ہے : یعنی محمدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، امام ابوحیان (رح) کا فرمان ہے : الجمھور علی ان البرھان ھو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)،

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کن معانی میں اللہ کی برھان ہیں

یاد رہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چند لحاظ سے اللہ کی عظیم برہان (پختہ دلیل) ہیں۔

اول : حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے ہزارہا معجزات عطا فرمائے جس نے جو معجزہ مانگا آپ نے دکھادیا بشر طیکہ اذن مولیٰ ساتھ ہو۔ کسی نے کہا آپ درخت سے کہیں وہ آپ کے پاس چل کر آئے تو میں ایمان لاؤں گا آپ نے اسی وقت کہا چاند توڑ کر دکھائیں آپ نے دکھادیا جبکہ پہلے انبیاء کو کوئی مخصوص معجزہ ہی دیا جاتا تھا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی معجزہ

دوم : حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ساری زندگی معجزہ ہے۔ آپ کی ولادت پہ سینکڑوں معجزات ظاہر ہوئے، مثلاً آتشکدہ ایران بجھ گیا۔ شاہ کسریٰ کے محلات کے منارے گر گئے۔ بتان کعبہ منہ کے بل آپڑے۔ جبین کعبہ بیت آمنہ (رض) کی طرف جھک گئی وغیر ذالک۔ (اتفاق سے یہ تحریر میں عمرہ شریف کی حاضری کے دوران کعبہ شریف کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہا ہوں ب تاریخ ۴ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ)

حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بچپن معجزات سے معمور ہے۔ آپ سیدہ حلیمہ سعدیہ (رض) کے گھر جلوہ فرما ہوئے تو وہاں معجزات برسنے لگے، ان کے کمزور جانور توانا ہوگئے، بکریوں کے خشک تھن دودھ سے بھر گئے، وہیں آپ کا شق صدر ہوا۔ جوانی میں آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام گئے تو وہاں کئی معجزات ظاہر ہوئے۔ بادل آپ پر سایہ کرتا تھا جس درخت کے نیچے آپ بیٹھتے اس کی ٹہنیاں آپ کی طرف جھک جاتیں۔

پھر آغاز وحی سے وصال مبارک تک ہر قدم پہ معجزات ظاہر ہوتے گئے، ہجرت کے معجزات، بدر کے معجزات، احد و حنین کے معجزات اور مقام حدیبیہ کے معجزات، اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قد جاء کم برھان من ربکم،

سوم: حضور جان عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سارا جسم مبارک سراپا معجزہ ہے، آپ کے بال مبارک معجزہ ہیں، بالوں کی برکات بیان سے باہر ہیں آج دنیا بھر میں آپ کے بال مبارک موجود ہیں اور ان سے مزید بال پھوٹ کر جدا ہو رہے ہیں اور یہ برکت پھیل رہی ہے، بال جسم سے کٹ جائے تو خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے مگر آپ کے بال زندہ ہیں اور بڑھ رہے ہیں جو آپ کی زندگی کی بین دلیل ہے۔ آپ کی زندگی کی بین دلیل ہے۔

آپ کی پیشانی مبارک معجزہ، چشمان مبارک معجزہ، آپ کی چشمان مبارک میں قدرتی سرمہ لگا ہوا تھا۔

آپ کا لعاب دہن مبارک معجزہ ہے جس مریض کو مل گیا اسے شفا مل گئی۔ حضرت جابر (رض) کی ہنڈیا میں لعاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ڈالا گیا تو دو تین افراد کا کھانا کئی سو صحابہ کرام کے لئے کافی ہو گیا۔ آپ کا لعاب مبارک مولیٰ علی شیر خدا کی آنکھوں میں اور ابو بکر صدیق کی ایڑی پہ لگا تو ان کی سب تکلیف دور ہو گئی، حضرت قتادہ کی آنکھ میں لگا تو بے نور آنکھ میں نور آگیا اور وہ درست آنکھ سے بھی زیادہ روشن ہو گئی۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انگشتان مبارک معجزہ ہیں۔ میدان حدیبیہ میں حضور مختار عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک پیالہ پانی میں انگلیاں ڈبو دیں تو ان سے گویا پیالے میں پانچ چشمے ابل پڑے اور ایک پیالہ پانی نے تیرہ سو صحابہ کرام (رض) اور ان کی سواریوں کو سیراب کر دیا

آپ کی پشت مبارک پر مہر نبوت معجزہ ہے اور آپ کے قدم ہائے مبارک معجزہ ہیں پتھروں میں ان کے نشانات ثبت ہو گئے۔

پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن مجید جیسی کتاب دی گئی جس کی ہر آیت اپنی ذات میں معجزہ ہے کیونکہ کفار اس کی ایک آیت کی مثل نہ لاسکے گویا قرآن کریم چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ معجزات کا مجموعہ ہے۔ الغرض ہمارے آقا و مولیٰ تاجدار انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سراپا برہان ربی ہیں۔

معجزات مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہ مفسر کی لکھی ہوئی ایک نعت مبارک

یاد نبی نے دل کا گلشن کھلا دیا ہے آنکھوں میں مصطفیٰ کا مدینہ بسا دیا ہے

ذرے کو تو نے دیکھا مہتاب کر دیا ہے تیری نظر نے قطرے کو دریا بنا دیا ہے

انگشت ہائے دست نبی کی یہ شان دیکھو پانی کے ایک پیالے میں دریا بہا دیا ہے

تھوڑا سا کھانا حضرت جابر نے تھا بنایا آقا نے پوری فوج کو اس سے کھلا دیا ہے

اک دودھ کا پیالہ ستر تھے پینے والے مدنی نے پیٹ بھر کر سب کو پلا دیا ہے

یہ بارگاہ حق میں توقیر مصطفیٰ ہے خورشید رفتہ آقا نے واپس چڑھا دیا ہے

آتے ہیں دوڑے حکم پہ تیرے درخت آقا اور پتھروں کو تم نے کلمہ پڑھا دیا ہے

قرآں وہ معجزہ ہے پیارے نبی کا جس نے فصحاء اہل ارض کے سر کو جھکا دیا ہے

یہ صدقہ نبی ہے طیب کو بھی خدا نے کچھ ٹوٹی پھوٹی نعتیں کہنا سکھا دیا ہے (برہان)

فوائد

1: اس ناس میں سارے انسانوں سے خطاب ہے کہیں ہو یا کبھی ہوں اس سے معلوم ہوا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کسی زمانہ کسی جگہ اور کسی قوم سے خاص نہیں جس کا اللہ رب ہے اس کے حضور نبی ہیں خدا کی خدائی میں حضور کی مصطفائی اور بادشاہی ہے۔

2: یعنی اے تمام لوگو۔ تمہارے پاس وہ تشریف لائے جو سر تا پا اللہ کی معرفت کی دلیل ہیں۔ یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کا نور بھی ہیں، اللہ کی دلیل بھی ہیں حق بھی ہیں۔ حضور کے یہ تمام القاب قرآن میں ہیں۔

3: یعنی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیونکہ حضور اللہ کی پہچان کی دلیل ہیں، دلیل کی تائید دعوی کی تائید ہوتی ہے اور دلیل پر اعتراض دعوی پر چوٹ ہے۔ نیز حضور از سر تا پائے اقدس حق کی دلیل ہیں۔ آپ کا ہر عضو ایک معجزہ نہیں بلکہ بیشمار معجزات کا مجموعہ ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لعاب شریف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں کا سرمہ، عبداللہ ابن عتیک کی ٹوٹی ہڈی کا سریش، کھاری کنویں کو میٹھا کرنے والا، جابر (رض) کے تھوڑے آٹے میں پڑ کر بے بہا برکت دینے والا ہے۔ غرض کہ آپ خود سراپا معجزہ اور رب کی دلیل یعنی قرآن ہیں۔ اس کی تفصیل ہمارے کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو

4: اس ترتیب سے معلوم ہوا کہ حضور کی آمد مقدم ہے، اور قرآن کی موخر۔ اسی لیے پہلے حضور پر ایمان لاتے ہیں پھر قرآن پڑھتے ہیں رب نے حضور کو نور بھی فرمایا ہے اور برھان بھی، برھان عقل سے اور نور حواس سے معلوم ہوتا ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ؕ

لغۃ القرآن: [فَاَمَّا : لیکن][الَّذِيْنَ : لوگ][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ][وَاعْتَصَمُوْا : اور انہوں نے مضبوط پکڑا][بِهٖ : اسکو][فَسَيُدْخِلُهُمْ : تو وہ ضرور داخل کریگا انکو][فِيْ : میں][رَحْمَةٍ : رحمت][مِّنْهُ : اس سے][وَفَضْلٍ ۙ: اور فضل][وَّيَهْدِيْهِمْ : اور وہ انکو ہدایت دے گا][اِلَيْهِ : اسکی طرف][صِرَاطًا : راستہ][مُّسْتَقِيْمًا : سیدھا]

ترجمہ: پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس (کے دامن) کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو عنقریب (اللہ) انھیں اپنی (خاص) رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا، اور انھیں اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا راستہ دکھائے گا۔

تشریح:

سب شریعت محمدی ﷺ پر عمل کریں

جب اللہ تعالیٰ نے تمام دنیاوالوں پر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رسول ہونا اور قرآن مجید کا کتاب الہی ہونا ثابت کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت پر ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ آپ کی شریعت کو مضبوطی سے پکڑ لیں ' اور ان سے آخرت میں اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ' اللہ پر ایمان لانے کا معنی ہے کہ اللہ کی ذات ' صفات ' اس کے اسماء اس کے احکام اور اس کے افعال پر ایمان لایا جائے ' اور اللہ کے دامن رحمت کو مضبوطی سے پکڑنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو اپنی طرف پہنچانے والا سیدھا راستہ بتائے گا ' اس آیت میں ان سے تین وعدے کیے ہیں رحمت ' فضل اور ہدایت کے ' حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا رحمت سے مراد جنت ہے ' اور فضل سے مراد جنت کی وہ نعمتیں ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا ' اور صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد ہے دین مستقیم کی ہدایت ' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد ہو اللہ عزوجل کی ذات کا دیدار اور عالم قدس کے انوار ' یعنی پہلی دو نعمتیں جسمانی لذتوں پر مشتمل ہیں اور آخری نعمت روحانی لذت کے حصول کا نام ہے۔ (تبیان)

(عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ قَالَ (رض) خَطَّ رَسُوۡلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَطًّا بِیَدِہٖ ثُمَّ قَالَ ھٰذَا سَبِیۡلُ اللّٰہِ مُسۡتَقِیۡمًا قَالَ ثُمَّ خَطَّ عَنۡ یَّمِیۡنِہٖ وَشِمَالِہٖ ثُمَّ قَالَ ھٰذِہٖ السُّبُلُ وَلَیۡسَ مِنۡھَا سَبِیۡلٌ اِلَّا عَلَیۡہِ شَیۡطَانٌ یَدۡعُوۡ اِلَیۡہِ ثُمَّ قَرَأَ (وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ) [رواہ احمد]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے ایک لکیر کھینچی پھر فرمایا یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے پھر اس کے دائیں اور بائیں خط کھینچ کر فرمایا یہ راستے ہیں ان سب میں سے ہر ایک پر شیطان کھڑا ہے اور وہ اس کی طرف بلاتا ہے پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تلاوت کی (بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلتے رہنا اور پگڈنڈیوں پر نہ چلنا۔) " (الانعام : ۱۵۳) (فہم)

جب کسی انسان کے اندر ذوق ایمان پیدا ہو جائے تو وہ فوراً اللہ کی پناہ میں آنے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ ایمان صحیح ہو اور نفس انسانی اللہ کی حقیقت کو پا چکے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ حقیقت کوئی پالے تو اس کے سامنے اللہ کی پناہ میں پہنچ جانے کے سوا اور کوئی راہ ہی نہیں رہتی اس لیے کہ اللہ ہی بادشاہت اور قدرت کا مالک ہے۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل کے سائے میں لے لیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی ان پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان پر رحمت اور فضل و کرم ہوتا ہے ' وہ عاجلہ میں بھی کامیاب اور آجلہ میں بھی کامیاب۔ پس صحیح ایمان ایک گھنے سائے والا ایک ایسا پرنم باغ ہے جس کے اندر انسانی روح ' بے چین روح ' حیران و پریشان روح نہایت ہی خوشگوار باد نسیم پاتی ہے اور اطمینان و سکون حاصل کرتی ہے۔ جبکہ اجتماعی لحاظ سے ایمان ایک ایسا اصول حیات ہے جس کے اوپر اجتماعی زندگی پاکیزگی ' احترام شرافت ' آزادی اور استحکام کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ ہر انسان کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے اور اس کے سوا جس قدر اشیاء اس کائنات میں ہیں ان کا وہ سردار ہے۔ اسلام کے ایمانی نظام زندگی کے سوا کسی اور نظام کے اندر یہ تصور ناپید ہے۔ صرف اسلام اس دنیا میں ایک ایسا نظام ہے جس کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے جیسے لوگوں کی غلامی سے نکالا جائے اور صرف اللہ کی بندگی میں داخل کیا جائے۔ یہ نظریہ انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ صرف اللہ کو اپنا حاکم سمجھتا ہے اور لوگ تمام کے تمام لوگ ' اللہ کے بندے ہو کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہت اور

حاکمیت صرف اللہ کیلئے خاص ہو جاتی ہے اور انسان انسان کا غلام نہیں رہتا۔ دوسرے نظاموں میں اگرچہ بظاہر وہ آزاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً وہ دوسروں کا غلام ہوتا ہے۔

پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ بہر حال اللہ کی رحمت اور فضل میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں اور اخروی زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں۔ (آیت) "ویھدیھم الیہ صراطا مستقیما"۔ (۴ : ۱۸۵) "اللہ ان کو اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھا دے گا"۔ اس فقرے میں لفظ الیہ "اپنی طرف" سے یوں نظر آتا ہے کہ انسان قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہاتھ پکڑ کر مومنین کو اپنی طرف آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف آنے کے لیے بالکل سیدھے راستے کے ذریعے لے جا یا رہا ہے۔ وہ قدم بہ قدم اللہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس ایک لفظ سے عبادت کی خوبی اور حسن کو صرف وہ شخص ہی پا سکتا ہے جس نے علی وجہ البصیرت اللہ پر ایمان اپنے اندر پیدا کر لیا ہو اور اس نے راہ ایمان کو پختہ طور پر پکڑ لیا ہو۔ اسے راہ حق پر ہونے کا پختہ یقین ہو۔ اسے ہر لمحہ یہ بات محسوس ہوتی ہو کہ وہ راہ حق کا مسافر ہے۔ اور راستے اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ ہر لمحہ آگے ہی بڑھ رہا ہے۔ سیدھے راستے پر واضح پالیسی کے ساتھ۔ یہ ایک مفہوم ہے جس کا تعلق ذوق یقین کے ساتھ ہے اور اس کا احساس اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ذوق اور ذائقہ درست نہ ہو۔

مسائل

۱۔ قرآن مجید ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ قرآن کو مضبوطی سے تھامنے والے اللہ کے فضل و کرم سے ہمکنار ہوں گے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۴۔ قرآن مجید چمکتا ہوا نور ہے۔

آیت مبارکہ:

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع

لغۃ القرآن: [يَسْتَفْتُوْنَكَ: وہ آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں][قُلِ : کہہ دیجیے][اللّٰهُ : اللہ][يُفْتِيْكُمْ : وہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے][فِي الْكَلٰلَةِ : میں کلا لہ][اِنِ : اگر][امْرُؤٌا : کوئی مرد][هَلَكَ : مرجائے][لَيْسَ : نہیں][لَهٗ : اس کی][وَلَدٌ: اولاد][وَّلَهٗۤ: اور اس کی][اُخْتٌ: بہن][فَلَهَا : اسکے لیے][نِصْفُ : آدھا][مَا : جو][تَرَكَ : اس نے چھوڑا][وَهُوَ : اور وہ][يَرِثُهَاۤ : وارث ہوگا اس کا][اِنْ : اگر][لَّمْ : نہ][يَكُنْ : ہو][لَّهَا وَلَدٌ: اس کی اولاد][فَاِنْ : پھر اگر][كَانَتَا : وہ ہوں][اثْنَتَيْنِ : دونوں][فَلَهُمَا : ان دونوں کے لیے][الثُّلُثٰنِ : دوتہائی][مِمَّا تَرَكَ: اس سے جو چھوڑا اس نے][وَاِنْ : اور اگر][كَانُوْۤا : ہوں][اِخْوَةً : کئی بھائی][رِّجَالًا : مرد][وَّنِسَآءً : اور عورتیں][فَلِلذَّكَرِ : تو مرد کے لیے ہے][مِثْلُ : برابر][حَظِّ : حصہ][الْاُنْثَيَيْنِ: دو عورتوں کے][يُبَيِّنُ : وہ بیان کرتا ہے][اللّٰهُ : اللہ][لَكُمْ : تمہارے لیے][اَنْ : تاکہ][تَضِلُّوْا: تم گمراہ ہو][وَاللّٰهُ : اور اللہ][بِكُلِّ : ساتھ ہر][شَيْءٍ : چیز][عَلِيْمٌ: خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ: لوگ آپ سے فتویٰ (یعنی شرعی حکم) دریافت کرتے ہیں۔ فرمادیجئے کہ اللہ تمہیں (بغیر اولاد اور بغیر والدین کے فوت ہونے والے) کلالہ (کی وراثت) کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جو بے اولاد ہو مگر اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس (مال) کا آدھا (حصہ) ہے جو اس نے چھوڑا ہے، اور (اگر اس کے برعکس بہن کلالہ ہو تو اس کے مرنے کی صورت میں اس کا) بھائی

اس (بہن) کا وارث (کامل) ہوگا اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر (کلالہ بھائی کی موت پر) دو (بہنیں وارث) ہوں تو ان کے لیے اس (مال) کا دو تہائی (حصہ) ہے جو اس نے چھوڑا ہے، اور اگر (بصورت کلالہ مرحوم کے) چند بھائی بہن مرد (بھی) اور عورتیں (بھی وارث) ہوں تو پھر (ہر) ایک مرد کا (حصہ) دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ (یہ احکام) اللہ تمہارے لیے کھول کر بیان فرمارہا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے

تشریح: اس سورۃ کی ابتدا معاشرہ کے پسماندہ طبقہ یعنی یتیموں کے مالی حقوق سے ہوئی تھی اور اس کا اختتام بھی معاشرتی اعتبار سے کمزور افراد کے مالی تحفظ سے کیا گیا ہے۔

معاشرتی اعتبار سے کمزور افراد کا مالی تحفظ

سورۃ النساء کی ابتدا میں بنی نوع انسان کو ایک کنبہ قرار دیتے ہوئے یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اس سورۃ کا اختتام خاندانی لحاظ سے کمزور ترین انسان کے متعلقہ مسائل سے کیا جارہا ہے۔ جسے قرآن نے کلالہ کے نام سے متعارف کروایا ہے۔

کلالہ اس مرد یا عورت کو کہا جاتا ہے جس کی موت کے وقت نہ اس کی ماں باپ زندہ ہوں اور نہ ہی اولاد یعنی لڑکی یا لڑکا بھی زندہ نہ ہو۔

حضرت جبار بن عبداللہ (رض) نے کہا: حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابو بکر (رض) میری بیمارپرسی کے لیے تشریف لائے، میں بے ہوش تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا بچا ہوا پانی مجھ پر ڈالا تو مجھے ہوش آگیا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اپنے مال کو کس طرح تقسیم کروں تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (مسلم: 4147: کتاب الفرائض: باب 2) نیز فرمایا: اے جابر! تو اس بیماری سے مرنے والا نہیں ہے۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر 2887: کتاب الفرائض: باب 3) چونکہ حضرت جابر (رض) اس وقت کلالہ تھے یعنی ان کے والدین اور اولاد زندہ نہیں تھے صرف بہنیں تھیں اس لیے انھوں نے اپنی وراثت کی تقسیم کے بارے میں سوال کیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بابرکت پانی سے حضرت جابر کی بیماری اور بے ہوشی ختم ہوگئی، نیز حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیبی اطلاع کے مطابق حضرت جابر (رض) اس بیماری سے فوت نہیں ہوئے بلکہ بعد میں بھی زندہ رہے اور فرمایا کرتے تھے: سورۃ النساء کی یہ آیت میرے حق میں نازل ہوئی تھی۔

(ابوداؤد: 2887: کتاب الفرائض: باب 3)

کلالہ

کلالہ مرد اگر فوت ہوجائے اور اس کا ترکہ تین لاکھ پونڈ ہو تو اس کی وہ بہن جو صرف ماں کی طرف سے ہو لیکن اس کا باپ الگ ہو تو اس بہن کا حکم اسی سورت کی آیت نمبر 12 میں بیان ہوچکا ہے۔ یہاں اس بہن کا ذکر ہے جو سگی اور باپ کی طرف سے ہو (خواہ ان کی ماں ایک ہو یا الگ الگ) تو اس بہن کو کلالہ کی وراثت سے آدھا حصہ یعنی ڈیڑھ لاکھ پونڈ ملیں گے اور اگر اس کا کوئی شرعی وارث نہ ہو تو بقیہ نصف بھی بہن کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور اگر کلالہ مرد یا عورت ہو اور اس کا وارث صرف ایک بھائی ہو تو یہ بھائی کلالہ کے سارے ترکہ کا وارث ہو گا یعنی پورے تین لاکھ پونڈ بھائی کو مل جائیں گے۔

اگر کلالہ کی دو یا دو سے زائد بہنیں ہوں تو کلالہ کے ترکہ سے دو حصے یعنی دو لاکھ پونڈ ان بہنوں میں برابر تقسیم ہوں گے اور ایک لاکھ پونڈ دوسرے شرعی وارثوں میں اور اگر اس کے دیگر شرعی وارث نہ ہوں تو یہ تیسرا لاکھ بھی اس کی بہنوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔

اگر کلالہ کے وارثوں میں بہن بھائی دونوں ہوں تو مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ کے لحاظ سے دیا جائے گا۔

اس سورت کی آیت نمبر 12 میں اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے میراث کے احکام تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں تاکہ لوگ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر گمراہی کا شکار نہ ہو سکیں، نیز یہ حصص اس قادر مطلق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں جو ہر ایک کی ضروریات اور ذمہ داریوں کو خوب جانتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (امداد)

سورۃالنسآء میں احکام میراث کا تین جگہ ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عربوں میں چونکہ احکام میراث کے معاملے میں بہت افراط و تفریط تھی۔ اور کمزور وارث ظلم کا شکار ہوتے تھے اس لیے قرآن کریم نے تین جگہ ان مسائل کو بیان فرمایا تاکہ مسلمان کسی گمراہی کا شکار نہ ہوں۔ لیکن اس بات پر جتنا بھی دکھ کا اظہار کیا جائے تھوڑا ہے کہ آج مسلمان میراث کی تقسیم میں نہ صرف گمراہی میں مبتلا ہو گئے بلکہ کمزور وارثوں کے ساتھ انھوں نے بھی ظلم کا رویہ اختیار کر لیا۔ صنف نازک اس وقت بھی محرومی کا شکار تھی اور اسلام نے اس کی محرومیوں سے اسے نجات دی اور آج پھر عملی طور پر اسے میراث سے محروم کر دیا گیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ یعنی تمہیں جو نظام زندگی دیا جارہا ہے اور احکام میراث جو تم پر نافذ کیے گئے ہیں یہ کسی ایسے قانون ساز کی تخلیق نہیں جس کی معلومات ناقص اور جس کا علم نارسا ہو۔ بلکہ یہ اس پروردگار کے نازل کردہ احکام ہیں جو ہر حکم کی رعایتوں اور مصلحتوں سے واقف ہے۔ (روح)

خلاصہ مسئلہ یہ ہوا کہ کلالہ کی تین صورتیں ہیں اور کلالہ کا بیان قرآن کریم میں دو جگہ ہے اور تین صورتوں کی تفصیل یہ ہے کہ کلالہ عینی بھائی بہن چھوڑے یعنی ایک ماں باپ کے سگے بہن بھائی۔ دوسرے علاتی یعنی سوتیلے ایک باپ کی اولاد جن کی مائیں مختلف ہوں۔ تیسرے اخیافی یعنی سوتیلے جن کی ماں اور باپ مختلف ہوں۔ قرآن کریم میں وان کان رجل یورث کللۃ اوامراۃ ولہ اخ اواخت فلکل واحد منھما السدس۔ میں۔ اس تیسری صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں بھائی بہن ہر ایک برابر چھٹے حصہ کا حقدار ہے للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ یہاں نہیں چلے گا اور اگر دو سے زائد ہوں تو تہائی کے بالمساوات مالک ہیں۔ رہیں بہنیں اور دو صورتیں ان کے احکام آخر میں مذکور ہیں جو اپنے مقام میں ذکر کئے گئے۔ (حسنات)

اس سورت کے شروع میں فرمایا تھا اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس سورت کے آخر میں فرمایا اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور یہ آیت اللہ کے کمال علم پر دلالت کرتی ہے اور علم اور قدرت ہی دو ایسے وصف ہیں جن پر بناء الوہیت ہے ' کیونکہ جس کو علم نہ ہو کہ اس کی مخلوق اس کی اطاعت کر رہی ہے یا نہیں وہ خدا نہیں ہو سکتا اور جس کو علم تو وہ لیکن وہ اطاعت کرنے والوں کو جزا دینے پر اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے پر قادر نہ ہو وہ بھی خدا نہیں ہو سکتا ' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) سے خصوصیت کے ساتھ ان کے ذاتی علم اور ذاتی قدرت کی نفی کی ہے ' حالانکہ ان کا کوئی وصف بھی ذاتی نہیں ہے۔

اختتامی کلمات اور دعا

آج 22 ذوالحجہ ۱۴۴۴ھ۔ 12 جولائی 2023ء بروز بدھ کو بعد نماز فجر کے مبارک وقت میں اس سورت کی تفسیر ختم ہو گئی " فالحمد اللہ رب العالمین۔ الہ العلمین "جس طرح سورۃالنساء تک آپ نے اس تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق دی، مجھے اس تفسیر میں خطاء اور ذلل سے محفوظ رکھنا اور ہدایت پر ثابت قدم رکھنا اور اس تفسیر کو اپنی بارگاہ میں مقبول کرنا اور اس کو تا قیام قیامت باقی اور فیض آفرین رکھنا اور اس کو میرے لیے ذریعہ نجات اور صدقہ جاریہ بنا دینا ' مجھے اس تفسیر کے ناشر ' اس کے مصحح اور اس کے معاونین ' قارئین اور محبین کو دنیا اور آخرت کے ہر شر اور ہر بلا سے محفوظ رکھنا اور دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی نعمتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند کرنا۔ "امین یارب العالمین بجاہ حبیبک سیدنا محمد خاتم النبیین و علی الہ و صحابہ وازواجہ و علمآء ملتہ واولیآء امتہ اجمعین

کتابیات

تفسیر و تراجم

نمبر ترجمہ / تفسیر: نام کتاب- القاب نام مترجم- سال ھ سال ء

1۔ ترجمہ: عرفان القرآن- ڈاکٹر طاہر القادری صاحب- (1411ھ 1991ء)

.2 تفسیر: تبیان القرآن- مولانا غلام رسول سعیدی- (1415ھ 1995ء)

.3 تفسیر: اشرفی- سید محمد مدنی اشرفی جیلانی- (1369ھ 1950ء)

.4 تفسیر: ابن عباس- پروفیسر محمد سعید احمد عاطف صاحب- (818ھ 1416ء)

.5 تفسیر: تفسیرات احمدیہ- ملا احمد جیون- (1069ھ 1659ء)

.6 تفسیر: جلالین- جلال الدین سیوطی- (911ھ 1505ء)

.7 تفسیر: خزائن العرفان- علامہ نعیم الدین مراد آبادی- (1364ھ 1945ء)

.8 تفسیر: درمنثور- جلال الدین سیوطی- (910ھ 1505ء)

.9 تفسیر: روح القران- ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی- (1433ھ 2012ء)

.10 تفسیر: الحسنات- علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری- (1375ھ 1956ء)

.11 تفسیر: ابن کثیر- حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر صاحب- (770ھ 1370ء)

.12 تفسیر: ابن مسعود- مولانا شمس الدین- (300ھ 913ء)

.13 ترجمہ: صراط الجنان- ابوصالح محمد قاسم القادری- (1430ھ 2013ء)

.14 تفسیر: ضیاء القرآن- پیر پیر کرم شاہ صاحب- (1333ھ 915ء)

.15 تفسیر: امداد الکرم- محمد امداد حسین پیرزادہ- (1421ھ 2000ء)

.16 تفسیر: بغوی- ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی- (516ھ 1122ء)

.17 تفسیر: فہم القرآن- میاں محمد جمیل- (1426ھ 2005ء)

.18 تفسیر: احکام القرآن للجصاص- ابو احمد بن علی الرازی- (365ھ 975ء)

.19 تفسیر: صراط الجنان- ابوصالح محمد قاسم القادری- (1430ھ 2013ء)

.20 ترجمہ لفظی: فہم القرآن- میاں محمد جمیل صاحب- (1425ھ 2005ء)

21. تفسیر: مدارک- ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمد بن محمود النسفی- (710ھ 1310ء)

22. تفسیر: مظہری- قاضی ثناءاللہ پانی پتی- (1235ھ 1820ء)

23. تفسیر: قرطبی- ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی- (671ھ 1273ء)

24. تفسیر: مظہر القرآن- مفتی شاہ محمد مظہر اللہ- (1369ھ 1950ء)

25. تفسیر: مفردات القرآن- مولانا محمد عبدہٗ فیروز پوری- (502ھ 1108ء)

26. تفسیر: نورالعرفان- مفتی احمد یار خان نعیمی- (1369ھ 1950ء)

27. تفسیر: گلدستہ تفاسیر- محمد اسحاق- (1428ھ 2007ء)

28. تفسیر: احسن البیان فی تفسیر القرآن- سید فضل الرحمن- (1410ھ 1990ء)

29. تفسیر: احسن التفاسیر- حافظ محمد سید احمد حسن- (1315ھ 1897ء)

30. تفسیر: البیان (الغامدی)- جاوید احمد غامدی- (1412ھ 1992ء)

31. تفسیر: المنار- عبدالکریم اثری صاحب- (1411ھ 991ء)

32. تفسیر: انوار الفرقان- محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب- (1419ھ 1998ء)

33. تفسیر: تدبر قرآن- مولانا امین احسن اصلاحی- (1400ھ 1980ء)

34. تفسیر: تیسیر القرآن- مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب- (1416ھ 1996ء)

35. تفسیر: حقانی- ابومحمد عبدالحق حقانی صاحب- (1388ھ 1969ء)

36. تفسیر: درس قرآن- محمد احمد صاحب- (1397ھ 1977ء)

37. تفسیر: درس قرآن- مرتب محمد اسحاق- (1430ھ 2009ء)

38. تفسیر: ذخیرۃ الجنان- مولانا سرفراز خان صفدر صاحب- (1419ھ 1998ء)

39. تفسیر: عروۃ الوثقی- عبدالکریم اثری صاحب- (1415ھ 994ء)

40. تفسیر: فی ظلال القرآن- سید قطب شہید- (1382ھ 1962ء)

41۔ تفسیر: فیوض القرآن- ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی- (1387ھ 1967ء)

42. تفسیر: کشف الرحمن- مولانا احمد سعید دہلوی- (1382ھ 1962ء)

43. تفسیر: محمود- مفتی محمود صاحب- (1389ھ 1970ء)

44. تفسیر: مدنی- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)- (1433ھ 2012ء)

45. تفسیر: مدنی کبیر- مولانا اسحاق مدنی صاحب(آزاد کشمیر)- (1433ھ 2012ء)
46. تفسیر: معارف القرآن- مفتی محمد شفیع صاحب- (1388ھ 1969ء)
47. تفسیر: معالم العرفان- مولانا صوفی عبدالحمید سواتی- (1404ھ 1984ء)
48. تفسیر: مکی- مولانا صلاح الدین یوسف صاحب-(1414ھ 1994ء)
49. تفسیر (اہل تشیع): الکوثر(اہل تشیع)- محسن علی نجفی- (1432ھ 2011ء)

کتب احادیث

صحیح بخاری - محمد بن اسماعیل بخاری) المتوفی 256ھ

صحیح مسلم - مسلم بن حجاج) المتوفی 261ھ

سنن نسائی - احمد بن شعیب النسائی) المتوفی 303ھ

سنن ابی داوٗد - ابو داوٗد السجستانی) المتوفی 275ھ

سنن ترمذی - ابو عیسی محمد ترمذی) المتوفی 279ھ

سنن ابن ماجہ - ابن ماجہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی)المتوفی 273ھ

کتب صحاح کے علاوہ کتابیں

دیگر بنیادی کتب / اہم مجموعے

موطاًامام مالک - امام مالک بن انس) المتوفی 179ھ

مسند احمد بن حنبل - امام احمد بن حنبل) المتوفی 241ھ

سنن الدارمی - عبد الرحمن دارمی)المتوفی 255ھ

صحیح ابن خزیمہ - امام ابن خزیمہ (المتوفی 311ھ

صحیح ابن حبان - ابن حبان) المتوفی 354ھ

مستدرک علی الصحیین حاکم - حاکم نیشاپوری)المتوفی 405ھ

معجم الکبیر طبرانی - امام طبرانی)المتوفی 360ھ